محمد بن فرج المعروف بابن الطلاع الاندلسی

أقضية الرسول ﷺ

اردو ترجمہ

رسولِ اکرم ﷺ کے فیصلوں پر مشتمل جامع کتاب

تحقیق و حواشی: ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمن اعظمی مدینہ یونیورسٹی

ادارہ معارف اسلامی
منصورہ لاہور پاکستان

أَقضِيَةُ الرَّسُول ﷺ

اردو ترجمہ

تالیف

محمد بن الفرج ابن الطلاع الاندلسی

تحقیق وحواشی

پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمن اعظمی
فیکلٹی آف حدیث ○ مدینہ یونیورسٹی

ادارہ معارفِ اسلامی
منصورہ ــــــ لاہور

نام کتاب : اقضیۃ الرسولؐ

تالیف : محمد بن الفرج ابن الطلاع الاندلسی

تحقیق وحواشی : پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی
فیکلٹی آف حدیث' مدینہ یونیورسٹی

اردو ترجمہ : زیر اہتمام ادارہ معارف اسلامی منصورہ

مطبع : میٹرو پرنٹرز۔لاہور

اشاعت اول : ۱۹۸۷ء (۱۰۰۰)

اشاعت دوم : ۱۹۹۱ء (۱۰۰۰)

اشاعت سوم : مئی ۲۰۰۲ء (۱۰۰۰)

قیمت : 400/-- روپے

تقسیم کنندہ : مکتبہ معارف اسلامی
منصورہ' ملتان روڈ' لاہور 54570
فون 7448022-5419520-7830033

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مندرجات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارۂ معارفِ اسلامی لاہور

یہ ادارہ اسلامی علوم و معارف کی ترویج و تحقیق کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے جولائی ۱۹۶۳ء میں رکھی تھی اور اس کا پہلا مرکز کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۷۹ء میں لاہور کو دوسرا مستقر بنایا گیا۔ اب کراچی اور لاہور کے ادارۂ معارفِ اسلامی کے دونوں مرکز داخلی طور پر خودمختارانہ اور مقصدی اور آئینی طور پر ہم آہنگی سے کام کر رہے ہیں۔

عصرِ حاضر کے تقاضوں کی رعایت سے بلند پایہ لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ محترم مؤسس کے پیشِ نظر خاص مقصد یہ تھا کہ اسلامی موضوعات پر کام کرنے والے مصنفین اور محققین کے لیے ایسا سازگار اور پُرسکون ماحول مہیا کیا جائے جس میں وہ پورے انہماک اور فراغت کے ساتھ اپنی کوششیں جاری رکھ سکیں۔

بحمداللہ اپنی تشکیل کے پہلے دن ہی سے یہ ادارہ ان دونوں مقاصد کے لیے قابلِ فخر انداز میں کام کر رہا ہے۔ اب تک جو منصوبے زیرِ عمل آ چکے ہیں اُن کا مجمل سا خاکہ یہ ہے:

(۱) مختلف موضوعات کی بہت سی بلند پایہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

(۲) ایسے مصنفین اور محققین کا پُرخلوص تعاون حاصل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے جو نئی کتابیں تصنیف کرنے اور غیر زبانوں کی اہم کتابیں اُردو میں ترجمہ کرنے کے علاوہ اُردو زبان میں شائع شدہ بہترین کتابوں کو عربی، انگریزی، فارسی، فرانسیسی، جرمن اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ ایسی کتابوں میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی کتب کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

(۳) مصنفین، محققین اور طلباء کے استفادے کے لیے ایک لائبریری کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس میں اُردو کے علاوہ عربی اور دُوسری زبانوں کی ضروری کتابیں جمع کی جا رہی ہیں۔

(۴) اُردو اور انگریزی کے اخبارات و جرائد کے تراشوں سے بہت احتیاط اور توجہ کے ساتھ ایسا ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے جس سے کسی بھی موضوع پر کام کرنے والے مصنفین اور محققین استفادہ کر سکتے ہیں۔

اِن مساعی کو بہت وقیع قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن یہ بات بہت اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ جن مشکلات و مسائل سے دوچار ہے، اُن سے عہدہ برآ ہونے اور اتحاد و ترقّی کی کوششوں کو آگے بڑھانے میں یہ حقیر مساعی ضرور معاون ثابت ہوں گی اور انشاء اللہ ان میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب ان فیصلوں اور محاکمات پر مشتمل ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں مختلف مواقع پر صادر فرمائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ بیش قیمت ذخیرہ ہم وطنِ عزیز کے قانون و قضاء کے اداروں سے تعلق رکھنے والے حضرات، طلبائے قانون، علمائے کرام اور عام تعلیم یافتہ حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

یہ کتاب اُندلس کے نامور فقیہ و محدث امام ابو عبداللہ محمد بن فرَج المالکیؒ کی جو ابن الطلاع کے نام سے معروف ہیں شہرۂ آفاق کتاب أقضیۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اردو ترجمہ ہے۔ موصوف پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں ۴۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور علم و تحقیق کے میدان میں غیر معمولی خدمات سرانجام دیتے ہوئے ۴۹۷ھ میں وفات پا گئے۔ اس کتاب میں امام ابن الطلاع نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام و قضایا کو الگ الگ موضوعات کے تحت جمع کر دیا ہے جو حدیث کی معتمد علیہ کتب میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے انھوں نے اپنے غیر معمولی علم و فضل اور اسلامی قانون میں اپنی گہری بصیرت کو بروئے کار لا کر اسلامی قوانین و احکام کا ایک نہایت گراں قدر مجموعہ تیار کر دیا ہے۔

یہ عظیم الشان کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ اس کے صرف چند نسخے دنیا کی دور دراز لائبریریوں میں موجود تھے وہ بھی قدیم رسم الخط میں اور ہاتھ سے لکھے ہوئے۔ ان تک رسائی اور ان سے استفادہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی تمام اہلِ علم کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس گرانقدر کتاب کو نئی زندگی بخشی اور اسے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے (THESIS) کا موضوع بنا کر گوشۂ گمنامی سے نکال لائے اور اسے دنیائے علم و آگہی کی زینت بنا دیا۔ موصوف نے اس کی تحقیق و تدقیق میں انتہائی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ کتاب میں شامل تمام احادیث کی تخریج کی ہے۔ فنِ جرح و تعدیل کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق ان کی صحت و عدم صحت کو واضح کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان احادیث سے مستنبط ہونے والے فقہی اور قانونی احکام کے بارے میں مختلف فقہی مسالک بھی بیان کر دیے ہیں، اور کتاب کے آخر میں انھوں نے "استدراکات" کے عنوان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مزید ان احادیث و قضایا کا اضافہ بھی کر دیا ہے جو کسی وجہ سے اصل کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے کتاب کے شروع میں ایک مفصل مقدمہ لکھ کر اسلامی قانون کی اہمیت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں اور افراد کے کردار اور ذمہ داریوں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے آخر میں مراجع، اعلام اور عنوانات کی تفصیلی فہارس کا اضافہ کر کے اس سے استفادہ کو زیادہ سے زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ الغرض ان ساری باتوں نے کتاب کی افادیت و اہمیت اور قدر و قیمت میں کئی

گنا زیادہ اضافہ کر کے اسے ہمارے قانون دان حضرات اور اسلامی آئین و قانون کے نفاذ سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے لوگوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ بنا دیا ہے۔

سنت نبوی، کتاب اللہ کے بعد اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جب کبھی اور جہاں بھی اخلاص اور سنجیدگی کے ساتھ اسلامی قانون کی تدوین و تنفیذ کی کوئی کوشش کی جائے گی، اسلامی قانون کے اس دوسرے بنیادی مصدر کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہو گا۔ اس مصدر کو نظر انداز کر کے اسلامی قانون و شریعت کو سمجھنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ اس بات کے پیش نظر یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات و فرامین اور احکام کو، جن کا تعلق آئینی و قانونی پہلوؤں سے ہے، زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے، تاکہ اہل علم کو بھی اور عامۃ المسلمین کو بھی شریعت کو سمجھنے اور اس کے محاسن سے آگاہ ہونے کا موقع ملے۔ یہ گرانقدر کتاب جسے ہم قارئین کرام کو پیش کر رہے ہیں نہ صرف اس ضرورت کو بخوبی پورا کرتی ہے بلکہ وہ اس باب میں اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ کئی مراحل سے گزرا ہے۔ اس کا پہلا ترجمہ مولانا غلام احمد حریری صاحب نے کیا۔ اس کی پہلی نظر ثانی پروفیسر محمد عثمان غنی صاحب نے کی اور اس میں بڑی اہم اصلاحات کیں۔ دوسری نظر ثانی جناب پروفیسر لطیف الدین ترابی رکن ادارہ معارف اسلامی نے بڑی دقت ریزی سے کی اور قدم قدم پر دیگر اہل علم سے بھی مشورے لیتے رہے اور اب ہم بڑے اطمینان سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ یہ ترجمہ الحمد للہ نہایت قابل اعتماد صورت اختیار کر گیا ہے۔

ہم صمیم قلب سے اپنے اللہ کے حضور دست بدعا ہیں کہ وہ ہماری اس کوشش کو قبول اور کامیاب فرمائے اور اسے وطن عزیز میں اسلامی آئین و قانون کی تدوین و تنفیذ کا ایک مؤثر ذریعہ بنائے۔ نیز دعا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہونے والی ہماری لغزشوں اور کوتاہیوں سے بھی درگزر فرمائے۔ یقیناً وہ انتہائی رحیم و کریم ہے۔ واللہ ھو ولی التوفیق۔

خلیل احمد حامدی

ڈائرکٹر ادارۂ معارف اسلامی منصورہ

لاہور ۱۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی ــــ ایک تعارف

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی کا تعلق یو۔پی (بھارت) کے مردم خیز خطے اعظم گڑھ سے ہے۔اس خطے نے کئی ایسی عظیم شخصیتوں کو پیدا کیا ہے جنھوں نے علمی میدان میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کی وجہ سے وہ جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی ۱۹۴۳ء میں اعظم گڑھ کے ایک قصبے میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد اپنی برادری کے سرخیل تھے، اور ان کا خود اپنے قصبے کے علاوہ کلکتہ میں بھی خاصا بڑا کاروبار تھا۔

مڈل تک کی تعلیم اپنے قصبے کے سکول میں حاصل کرنے کے بعد انھوں نے شبلی کالج اعظم گڑھ میں، جس کے ساتھ ہائی کلاسز بھی تھیں، داخلہ لیا، جہاں سے انھوں نے ۱۹۵۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

امتحان کے بعد اعلان نتیجہ تک کا وقفہ فراغت کا ہوتا ہے، اسی فراغت کے زمانے میں انھیں کسی نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "دین حق" کا ہندی ترجمہ پڑھنے کے لیے دیا، اس کتاب کے مطالعے نے ان کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ انھیں محسوس ہوا کہ اس کتاب نے انھیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکلنے کا راستہ دکھا دیا ہے، اپنے ایک انٹرویو میں، جو جنوری ۱۹۷۶ء کے اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب اپنی اس کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اس کتاب کے مطالعے نے میرے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی، مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اب تک جن مہیب تاریکیوں میں کھویا ہوا تھا، وہ چھٹ رہی ہیں اور پہلی بار روشنی کی کرنیں دکھائی دے رہی ہیں۔ اس احساس نے میرے دل میں اس روشنی سے ہمکنار ہونے کی تڑپ پیدا کر دی۔ میں نے اس کتاب کو کئی بار پڑھا اور ہر بار گرمیٔ شوق دو آتشہ ہوتی گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس مصنف کی ہندی میں ترجمہ شدہ تمام کتابیں حاصل کر کے پڑھوں گا۔"

اور پھر اپنے اس عزم کے مطابق فی الواقع انھوں نے چند مہینوں میں مولانا مودودیؒ کی اس وقت تک ہندی میں ترجمہ شدہ ساری کتابیں پڑھ لیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایسے حلقۂ درس قرآن سے بھی وابستہ ہو گئے جو کالج کے ایک استاد نے جو مولانا مودودیؒ کی دعوت سے متاثر تھے، قائم کر رکھا تھا۔ اسلامی لٹریچر کے مسلسل مطالعے اور درس قرآن کے حلقے سے وابستگی

---

[1] یہ ایمان افروز انٹرویو، جو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور کے جنوری ۱۹۷۶ء کے شمارے میں "گنگا سے زمزم تک" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جناب پروفیسر عبدالغنی فاروق کی کتاب "ہم کیوں مسلمان ہوئے؟" میں بھی شامل ہے۔ یہ گرانقدر کتاب ادارۂ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور نے شائع کی ہے۔

کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہندیاہ کے اندر اندر حلقہ بگوش اسلام ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔

قبولِ اسلام کے بعد کچھ عرصے تک تو انھوں نے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا، لیکن پھر اپنے اسلام کا اعلان کرنا پڑا۔ اور اس کے نتیجے میں انھیں آلام و مصائب کے ایک صبر آزما دور سے گزرنا پڑا جس کی نظیر قرنِ اوّل کے علاوہ بمشکل ملے گی۔ مخالفت کے ان مراحل میں انھیں وہ سب کچھ پیش آیا جو اس راہ میں اہلِ ایمان کو ہمیشہ پیش آتا رہا ہے۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید ان پر کسی جن یا بھوت کا سایہ ہو چکا ہو، مختلف پنڈتوں اور پروہتوں سے ان کا علاج کرانے کی کوشش کی گئی۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پنڈتوں اور پروہتوں نے ان کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی ایک انتہائی گھناؤنی تصویر پیش کرتے ہوئے انھیں اسلام سے بدگمان کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کے حوالے سے ان پر زور دیا کہ اگر وہ ہندو مذہب چھوڑنا ہی چاہتے ہیں تو انھیں اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کو ترجیح دینی چاہیے۔ جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو ان کے اہلِ خانہ نے انھیں اسلام سے باز رکھنے کے لیے ایک انتہائی جذباتی ہتھکنڈہ اختیار کیا، اور وہ یہ کہ وہ سب لوگ اس وقت تک بھوک ہڑتال جاری رکھیں گے جب تک کہ وہ اسلام ترک نہ کر دیں۔ لیکن بحمداللہ انھیں اسلام سے باز رکھنے کی یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

اسی دوران میں وہ ایک دن مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ہندو غنڈوں نے مسجد میں داخل ہو کر نمازیوں پر دھاوا بول دیا اور انھیں بہت بری طرح زدوکوب کیا، اور خود ان پر بہ شدت ستم دوسروں کی نسبت زیادہ کی گئی۔

جب نوبت یہاں تک آن پہنچی تو انھوں نے اپنے اسلام کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ اس پر انھیں آلام و مصائب کے ایک نئے اور نسبتاً خوفناک تر مرحلے سے دوچار ہونا پڑا۔ مقامی ہندوؤں نے آخری چارۂ کار کے طور پر انھیں انتہا پسند ہندوؤں کی تنظیم آر۔ایس۔ایس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ وہ انھیں زبردستی دوبارہ ہندو بننے پر مجبور کریں، لیکن خوش قسمتی سے انھیں اس کی بروقت اطلاع مل گئی اور وہ شہر سے باہر رہنے والے اپنے ایک مسلمان دوست کے ہاں پناہ گزیں ہو گئے اور اس نے انھیں اپنے مویشی خانے میں چھپا دیا۔ یہ رمضان المبارک کے دن تھے۔ لہٰذا انھیں اسی مویشی خانے میں سحری و افطاری کا اہتمام بھی کرنا پڑتا اور نماز کی ادائیگی کا بھی۔

اسی دوران میں اس انتہا پسند ہندو تنظیم نے ان کی تلاش میں شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ کچھ دنوں بعد جب ان لوگوں نے مایوس ہو کر اپنی تلاش کا رُخ دوسرے شہروں کی طرف کیا، تو وہ بھیس بدل کر رات کی تاریکی میں وہاں سے نکل کر ایک دوسرے قریبی شہر میں پہنچے اور وہاں ایک دینی درس گاہ میں داخلہ لے لیا۔ لیکن اس درس گاہ میں داخل ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ہندو غنڈے ان کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے، لہٰذا انھیں وہاں سے ایک بار پھر ٹیپی جا بکدستی سے ہجرت کر کے بدایون کی ایک دور افتادہ درس گاہ میں جا کر داخلہ لینا پڑا جہاں انھوں نے ڈیڑھ سال تک دین کی تعلیم بھی حاصل کی اور اردو زبان بھی سیکھی۔

بدایون میں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدراس (جنوبی ہند) کی مشہور دینی درس گاہ "دارالاسلام" میں داخل ہو گئے اور وہاں تقریباً چار سال رہ کر پوری یکسوئی اور دلجمعی سے دینی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۶۶ء میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے، تو انھیں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ مل گیا اور چار سال جوار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں رہ کر انھوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے گریجویشن کی اور ۱۹۷۰ء میں مزید تعلیم کے حصول کے لیے جامعۃ الملک عبدالعزیز (حال جامعۃ ام القری) مکہ مکرمہ میں ماجستیر (ایم-اے) میں داخلہ لیا۔

یہاں ان کے رسالہ (THESIS) کا عنوان تھا "ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فی ضوء مرویاتہ، فی شواھدہ وانفرادہ" اپنے اس رسالے (مقالے) میں انھوں نے صحابی جلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ احادیث کو الگ الگ ابواب وفصول میں مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تخریج بھی کی اور دوسرے صحابۂ کرامؓ کی روایات سے ان کے شواہد بھی پیش کیے اور ساتھ ہی مستشرقین اور ان کے "مسلمان تلامذہ" کی طرف سے حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کے حوالے سے سنتِ نبوی پر کیے جانے والے اعتراضات کے مسکت جوابات بھی دیے۔ اس طرح یہ رسالہ ایک گراں قدر علمی تصنیف کی حیثیت اختیار کر گیا، اور ممتحن نے اسے غیر معمولی خراج تحسین پیش کیا۔

جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ سے ماجستیر (ایم-اے) کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں وہ رابطۂ عالم اسلامی سے وابستہ ہو گئے اور کئی سال رابطہ کے سیکرٹری جنرل کے آفس انچارج کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور جامعہ ازہر (مصر) سے امتیاز کے ساتھ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی۔ایچ۔ڈی میں انھوں نے اندلس کے جلیل المرتبت فقیہ امام ابوعبداللہ محمد بن فرج المالکی المعروف بابن الطلاع (المتوفی ۴۹۷ھ) کی شہرہ آفاق تصنیف "اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" پر تحقیق کا کام کیا (جس کا ترجمہ ہم زیر نظر کتاب کی صورت میں ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

رابطۂ عالم اسلامی میں کچھ عرصہ خدمات انجام دینے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف ۱۹۷۹ء میں جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ سے وابستہ ہو گئے۔ اور آج کل جامعہ اسلامیہ کے کلیۃ الحدیث (حدیث فیکلٹی) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی یہ خصوصی عنایت ہے کہ تالیف و تحقیق کے شہسوار ہونے کے ساتھ ساتھ تدریس میں بھی غیر معمولی ملکہ رکھتے ہیں۔

تصانیف

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی کئی بلند پایہ علمی و دینی کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں، ان میں سے کئی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، کچھ زیر طبع ہیں اور کچھ زیر تالیف یا زیر تحقیق ہیں۔ یہاں ہم ان کی بعض اہم تصانیف کا اجمالی تعارف پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ **قرآن کے سائے میں (ہندی)** یہ کتاب ہندی میں ہے اور پڑھے لکھے ہندوؤں میں ان کے مخصوص مزاج کی مناسبت سے دعوتِ اسلامی پیش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب جماعت اسلامی ہند کے آرگن کانتی دہلی میں قسط وار شائع ہو چکی ہے اور اب عنقریب شائع ہو کر منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔

۲۔ **تلواروں کے سائے میں (اردو)** اس کتاب میں قرنِ اول سے لے کر عصر حاضر تک کے ان صاحب عزیمت بزرگوں کا ذکر ہے

جنھوں نے اپنی زبان وقلم اور جان ومال سے راہ حق میں جہاد کی تابناک مثالیں قائم کی ہیں۔ اس گرانقدر کتاب سے جہاں داعیانِ حق کے لیے نقوشِ راہ واضح ہوتے ہیں، وہاں یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے، جس کا دامن تاریخ کے ہر دور میں اصحابِ عزیمت واستقامت کی متاعِ گرانمایہ سے مالا مال رہا ہے۔

۳۔ الدراسة فی ادیان الهند (عربی) اس کتاب میں ہندوستان کے چار مذاہب، ہندومت، بدھ مت، جین مت، اور سکھ مذہب کا علمی اور تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں مذاہب اپنے بعض بنیادی اختلافات کے باوجود اپنی موجودہ صورت میں بہت سی باتوں میں مشترک ہیں اور ان کی بنیادیں بعض ایسے دیومالائی عقائد وتصورات اور بے مقصد مذہبی رسوم پر کھڑی ہیں جنھیں عقل سلیم گوارا نہیں کرتی ہے۔ یہ گرانقدر کتاب قبل ازیں جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کے مجلہ میں قسط وار شائع ہو چکی ہے اور ان شاء اللہ جلد ہی کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہے۔

۴۔ ابوھریرة فی ضوء مروياته، فی شواهده وانفراده (عربی) یہ کتاب، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے ماجستیر (ایم۔اے) کے رسالہ (THESIS) پر مشتمل ہے، یہ کتاب دس جلدوں میں ہوگی، جن میں سے دو جلدیں (کتاب العبادات تک) مکمل ہو چکی ہیں۔

۵۔ الیهودية والنصرانية (عربی) اس کتاب میں یہودیت ونصرانیت کے آغاز، ارتقا، تحریف اور انحطاط پر خالص علمی انداز میں بحث کی گئی ہے اور ٹھوس علمی وعقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہودیت ونصرانیت کے نام سے آج دنیا میں جو مذاہب پائے جاتے ہیں، ان کا اس دین سے کوئی تعلق نہیں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اس کتاب کے آغاز میں ممتاز مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک گراں قدر مقدمہ بھی ہے۔

۶۔ دراسات فی الجرح والتعديل (عربی) علم جرح وتعدیل علوم حدیث کی ایک انتہائی اہم قسم ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی صاحب نے حدیث کی معتبر کتابوں سے جرح وتعدیل کے اصول کو جمع کر کے اس گرانقدر کتاب میں ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں علم جرح وتعدیل کے اصول واصطلاحات کی تشریح بھی کی گئی ہے اور ۲۵ جلیل القدر ائمہ حدیث کے سوانحی خاکوں کے ساتھ ان کے اسلوبِ نقد اور خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح یہ گرانقدر تصنیف اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب بن گئی ہے۔

۷۔ المدخل فی السنن الکبریٰ للبیهقی (عربی) یہ دراصل امام بیہقی کی مشہور کتاب السنن الکبریٰ کے مقدمہ کی تحقیق ہے۔ یہ مقدمہ عرصہ سے نایاب تھا۔ اس کا صرف ایک نسخہ ایشین سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر تحقیق بھی کی ہے اور اس کا ایک گرانقدر مقدمہ بھی لکھا ہے۔

۸۔ السنن الصغریٰ للبیهقی (عربی) یہ امام بیہقی کی شہرۂ آفاق کتاب السنن الصغریٰ کی تحقیق ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں تحقیق احادیث کے ساتھ ساتھ

فقہ الحدیث کا اہتمام بھی کیا گیا ہے، جس سے اس کتاب کی افادیت و اہمیت کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے۔

۹۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا (ہندی۔ زیرِ تصنیف) یہ ہندی زبان میں اسلام کے بارے میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہوگی، اس کے چھ باب ہوں گے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلا باب: قرآن کریم کے بارے میں، جس میں قرآن پاک کا ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے تعارف ہوگا اور ساتھ ہی قرآن کریم کے بارے میں اعتراضات کا جواب بھی ہوگا۔

دوسرا باب: سنتِ نبوی کے بارے میں، جس میں ساتھ ساتھ تدوینِ حدیث کی تاریخ بھی ہوگی۔ اور سنتِ نبوی کے بارے میں شکوک و شبہات اور اعتراضات کے مستند اور مدلل جوابات بھی ہوں گے۔

تیسرا باب: اسلامی عقائد و ایمانیات کے بارے میں جس میں ایمان اور عملی زندگی کے باہمی تعلق پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

چوتھا باب: اسلامی عبادات کے بارے میں، جس میں ان عبادات کے عملی زندگی پر اثرات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

پانچواں باب: سیرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین کے بارے میں، جس میں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے برپا کردہ عظیم انقلاب اور اس کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

چھٹا باب: اسلامی نظامِ حیات کے بارے میں، جس میں اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کیا جائے گا کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے اور اس میں ہر دور کی طرح موجودہ دور میں بھی نوعِ انسانی کی قیادت کرنے اور اس کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

اس انسائیکلو پیڈیا پر کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ مزید چند برسوں تک تکمیل کی توقع ہے۔

یہ گرانقدر کتاب کئی پہلوؤں سے غیر معمولی اہمیت و افادیت کی حامل ہوگی۔

اوّلاً: اس لیے کہ اس کے ذریعے ایک عام تعلیم یافتہ ہندو کے لیے اسلام کو اس کی صحیح شکل میں سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

ثانیاً: اس لیے کہ اس کے ذریعے وہ غیر متعصب ہندو اہلِ علم و اہلِ قلم بھی اسلام کو اس کی صحیح شکل میں سمجھ اور پیش کر سکیں گے۔ جو محض اس لیے ایسا نہیں کر سکتے کہ ہندی میں اسلام کے بارے میں مستند علمی لٹریچر دستیاب نہیں ہے۔

ثالثاً: اس لیے کہ بھارت میں جس طریقے سے ہندی زبان کو مسلّط کیا جا رہا ہے، اس کے نتیجے میں شاید آئندہ چند سالوں میں خود مسلمان بھی اردو زبان سے بیگانہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا وہاں خود مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان زندہ رہنے کے قابل بنانے کے لیے اس طرح کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔

لہٰذا امید کی جاتی چاہیے کہ یہ کتاب مستقبل قریب میں بھارت میں اسلام کی دعوت کو پھیلانے میں ایک مؤثر کردار ادا کرے گی۔

۱۰۔ گنگا سے زمزم تک (اُردو) اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب اپنے قبولِ اسلام کے حالات، واقعات اور تاثرات بیان کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اس کتاب میں بیسویں صدی عیسوی کی احیائے اسلام کی تحریکوں اور اس دَور کی ممتاز اسلامی شخصیتوں کا بھی ذکر ہوگا۔

۱۱۔ اقضیۃ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عربی) جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے، یہ کتاب دراصل اس تحقیق پر مشتمل ہے، جو ڈاکٹر صاحب نے جامعہ ازہر سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے اسلامی اُندلس کے ممتاز عالم اور فقیہہ امام ابوعبداللہ محمد بن فرج المالکی (م سنہ ۴۹۷ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب "اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" پر کی ہے۔ جس کا ترجمہ زیرِ نظر کتاب کی صورت میں ادارہ کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔

الیف الدین ترابی

رکن ادارہ معارف اسلامی

منصورہ۔ لاہور!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدّمہ

مقدمہ تمہید اور چار فصلوں پر مشتمل ہے:۔

تمہید:۔ اس میں میں نے علماء کی ان کاوشوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف عنوانوں کے تحت احادیث نبویہ کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں انجام دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس موضوع کو تحقیق کے لیے منتخب کرنے کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔

فصل اول:۔ القضاء فی الاسلام۔

اس فصل میں میں نے قضا کے مفہوم، اس کی شرائط اور عہد رسالت میں اس کی کیفیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان صحابہ کا ذکر کیا ہے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں قاضی مقرر فرمایا۔

فصل دوم:۔ اندلس کی علمی تحریک پہلی صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک۔

اس فصل میں میں نے اندلس کے فتح ہونے سے لے کر مؤلف (ابن الطلاع) کے دور تک کی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس دور کی علمی تحریک اور سیاسی حالات کے متعلق بھی گفتگو کی ہے۔

فصل سوم:۔ مؤلف کا تعارف:۔

اس فصل میں میں نے مؤلف کے حالات زندگی، ان کے اساتذہ و تلامذہ، ان کی تصانیف اور ہم عصر علماء میں ان کے مرتبہ و مقام کا جائزہ لیا ہے۔

فصل چہارم:۔ کتاب کے نسخوں کا تعارف:۔

اس فصل میں میں نے امام ابو عبداللہ المعروف ابن الطلاع کی کتاب "اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے مختلف نسخوں کا ذکر کیا ہے اور چند ایک قلمی صفحات کی عکسی نقول دی ہیں۔

اس کے بعد میں نے احادیث کی نقد و جرح کے سلسلہ میں محدثین کے معروف طریق کار کے مطابق ان کے وضع کردہ قواعد کی روشنی میں کتاب کی تحقیق شروع کی ہے۔

اللہ کرے اس کتاب کی تحقیق کے ذریعہ سنت رسول اللہ کی خدمت کا جو ارادہ میں نے کیا تھا اس میں اللہ کی توفیق سے مجھے کامیابی ہوئی ہو۔ میں اللہ کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ اپنی رحمت سے اس کاوش کو قبولیت سے نوازے اور اسے اپنی ذات کے لیے خالص فرمادے۔ یقیناً وہ بہترین کارساز اور بہترین مددگار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

انتخاب موضوع کے بارے میں: سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے اور درود و سلام سرورِ انبیاء اور آپ کی آل اور صحابہ کرام پر۔ امابعد:۔

اس میں شبہ نہیں کہ محدثین رحمہم اللہ نے احادیث نبویہ پر مشتمل بے شمار کتابیں تالیف کیں۔ پھر ان کو مختلف انواع میں تقسیم کیا، چنانچہ اہل علم کے ہاں وہ کتابیں صحاح، سنن، مسانید، جوامع، معاجم، اجزاء، مستدرکات، مستخرجات، مصنفات، اطراف اور اسی طرح کے دوسرے ناموں سے معروف و متداول ہیں۔ اسی طرح مؤرخین اور سیرت نگاروں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روز و شب کے معمولات اور آپ کی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق ہر قسم کا مواد جمع کرنے میں دلچسپی لی، لیکن انھوں نے بالعموم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کے موضوع پر ایسی مستقل کتابیں مرتب نہیں کیں جن سے عہدِ رسالت میں فیصلوں کی نوعیت و کیفیت کا پتہ چلتا اور اسلام کے نظام عدل و انصاف کی خوبیاں اجاگر ہوتیں، البتہ دو جلیل القدر علما نے اس موضوع پر کام کیا ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔[1]

۱۔ ان میں سے ایک تو مشہور فقیہ شیخ ظہیر الدین مرغینانی حنفی ہیں جن کی وفات ۶۱۰ھ میں ہوئی۔

۲۔ دوسرے شیخ امام ابوعبداللہ ابن الطلاع قرطبی ہیں۔

علاوہ ازیں حافظ شمس الدین ابوبکر ابن القیمؒ (متوفی ۷۵۱ھ) نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" کی چوتھی جلد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند فیصلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے محدث اور عالم نواب صدیق حسن خاں والیٔ بھوپال نے ان فیصلوں کو اپنی کتاب "بلوغ السؤل فی اقضیۃ الرسول ﷺ" میں ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔[2]

علامہ مرغینانی کی کتاب اب نایاب ہے۔ لائبریریوں میں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا، البتہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ امام ابن الطلاع کی تصنیف باقی رہے، چنانچہ اسلام کے قدیم علمی ورثہ کو مناسب شکل میں منظرِ عام پر لانے کے شائق، قاہرہ کے شیخ عیسیٰ البابی الحلبی، مالک مطبع دار احیاء الکتب العربیۃ کو یہ کتاب کہیں سے مل گئی اور انھوں نے محرم ۱۳۴۶ھ میں اسے شائع کر دیا، مگر اس کتاب کا کوئی مقدمہ نہیں لکھا گیا جس سے یہ پتہ چلتا کہ اس کی طباعت میں کس نسخے پر اعتماد کیا گیا ہے۔ نہ ہی معروف علماء میں سے کسی کو اس بات کی زحمت دی گئی کہ وہ اس کتاب کے متن کی تصحیح، اس کی احادیث اور اس کے آثار کی تخریج، اس کے اہم اور مشکل مقامات کی تشریح اور اس میں مذکور شخصیات کے تعارف کا کام کرے۔ اس

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۳۷

[2] یہ کتاب لکھنؤ کے مطبع علوی میں ۱۲۹۲ھ میں طبع ہوئی تھی مگر اب تقریباً ناپید ہے خوش قسمتی سے پاکستان میں المکتبۃ السلفیہ لاہور کے مالک مولانا محمد عطاءاللہ حنیف کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس کی فوٹو کاپی انھوں نے ازراہِ کرم مجھے عنایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب ایک ایسی شکل میں سامنے آئی کہ نہ تو علماء اسے دیکھ کر مطمئن ہو سکے اور نہ ہی طلبہ اس سے کما حقہٗ استفادہ کر سکے۔ اس عدم اطمینان اور استفادے میں اس کمی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ غیر معروف یا نایاب کتابوں سے بہت زیادہ اقتباسات اس میں دیئے گئے ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ کتاب بھی عالمِ اسلام میں تقریباً ناپید ہوگئی۔ علماء کے ہاں اس کا کوئی ذکر باقی نہ رہا۔ تقریباً نصف صدی سے کتب خانوں میں وہ اس طرح بند پڑی تھی کہ لوگوں کی اس کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ تھکا دینے والی جدوجہد اور پیہم جستجو کے بعد مجھے اس کا ایک نسخہ مکہ مکرمہ کے ایک عالم کے ہاں مل گیا تو میں نے جلدی سے اس کا عکس لے لیا۔

یہ کتاب عرصۂ دراز تک اس حالت میں رہی کہ نہ اس کے متن کی تحقیق کی گئی، نہ اس کی احادیث کی تخریج کی گئی، نہ اس میں مذکور فقہی مسائل کے بارے میں ائمہ کے اختلافات، اور ان کے دلائل کا جائزہ لیا گیا، نہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فیصلوں کو شامل کیا گیا جن کا ذکر مؤلف اپنی اس کتاب میں نہیں کر سکے، نہ اس پر ایسا مفصّل مقدمہ لکھا گیا جس میں وضاحت سے بیان کیا جاتا کہ اسلام میں قضا کی اہمیت، اس کی شرائط اور اس کی کیفیت و نوعیت کیا ہے اور جس دور میں مؤلف نے زندگی گزاری اس میں اندلس کی سیاسی اور علمی حالت کیسی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس مقدمہ میں مؤلف کا مکمل تعارف ہوتا اور دنیا کی مختلف لائبریریوں میں کتاب کے جو قلمی نسخے پائے جاتے ہیں ان کا موازنہ کر کے متن کی صحت اور اصل موضوع سے متعلق دوسری چیزوں کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جاتا تاکہ یہ کتاب ایسی مناسب شکل میں سامنے آتی کہ علماء، طلبہ اور محققین اسے دیکھ کر پسند کرتے اور اسلامی لٹریچر میں اس کو اس کا صحیح مقام حاصل ہوتا۔

شیخ قضاعی کی کتاب پر "التراتیب الاداریة فی نظام الحکومة النبویة" کے نام سے اپنی مشہور تعلیقات لکھنے کی وجہ سے عرب و عجم میں شہرت کے حامل، فاضل اور محدّث شیخ عبدالحی کتانی کی یہ تمنا تھی کہ وہ امام ابن الطلاع کی اس کتاب پر تحقیقی کام کر کے اسے موزوں صورت میں عالمِ اسلام کے سامنے پیش کریں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ان شاء اللہ ارادہ یہ ہے کہ ابن الطلاع کی اس کتاب کی طرف خصوصی توجہ دے کر اس پر مناسب تحقیق کی جائے اور اس کے شایانِ شان اس پر مقدمہ لکھ کر اس کو عامِ اسلام کے سامنے ہدیہ کے طور پر پیش کیا جائے۔" التراتیب الاداریة- (۱-۲۵۲)

مگر موت نے انھیں مہلت نہ دی اور اپنی اس خواہش کی تکمیل سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ بلاشبہ مرحوم علمِ حدیث میں اپنی ماہرانہ بصیرت اور وسعتِ مطالعہ کی بنا پر اس عظیم کام کے لیے موزوں ترین شخصیت تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کتاب پر تحقیق کرنے اور عالمِ اسلام کے سامنے اسے پیش کرنے کی توفیق اور سعادت عطا فرمائی ہے۔ میری آرزو اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اسے میری بھلائیوں میں شمار کرے۔

میں یہاں جامعۃ الازہر میں حدیث کے استاذ، جن کی خدمات اس وقت جامعۃ ام القریٰ مکہ معظمہ میں مستعار

لی گئی ہیں[1]، صاحب الفضیلہ ڈاکٹر محمد بن محمد ابو شہبہ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جامعۃ الازہر سے ڈاکٹریٹ کی سند لینے کے لیے اس مقالے کی تیاری کے دوران انھوں نے بڑی محنت سے میری مسلسل رہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزاء خیر عطا فرمائے۔ اسی طرح اس کتاب کو بہترین انداز میں طبع کرانے اور شائع کرنے پر میں دار الکتاب المصری کے مالک محترم بھائی الاستاذ حسن الزین کا بھی خلوص دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

---

[1] ڈاکٹر محمد بن محمد ابو شہبہ جو اس مقدمہ کی تحریر کے وقت زندہ تھے اور ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھاتے تھے اب فوت ہو چکے ہیں۔ موصوف ایک بلند پایہ عالم دین، مفسر اور محقق تھے۔ انھوں نے کتاب و سنت کے مختلف پہلوؤں پر بڑی قابل قدر کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) المدخل لدراسۃ القرآن الکریم (۲) اعلام المحدثین (۳) السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والسنۃ (۴) دفاع عن السنۃ النبویہ ورد شبہ المستشرقین والکتاب المعاصرین (۵) فی رحاب السنۃ ـــــ الکتب الستۃ (۶) الربا فی نظر الاسلام وحلول لمشکلۃ (۷) الإسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر (۸) الحدود فی الاسلام مقارنۃ بالقانون الوضعی۔

فصل اوّل

القَضَاءِ فِي الْاِسْلَامِ

قضاء کا لغوی مفہوم قضاء کے لغوی معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:
"وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ" (الاسراء۔ ۲۳) اور تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ عبادت نہ کرو مگر صرف اسی کی۔

قَضَاءٌ دراصل قَضَایٌ تھا۔ یاء چونکہ الف کے بعد واقع ہوئی ہے اس لیے ہمزہ میں تبدیل ہو گئی۔
قضاء کی جمع اَقْضِیَۃٌ آتی ہے۔ لفظ قَضِیَّۃٌ بھی اسی طرح ہے۔ اس کی جمع قَضَایَا ہے۔
عربی میں کہتے ہیں قضٰی علیہ یَقْضِی (اس نے اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا) مصدر قَضَاءٌ اور قَضِیَّۃٌ ہے۔
دیکھیے لسان العرب ۲ ۔

قضاء کا شرعی مفہوم ابنِ رُشد فرماتے ہیں:۔
قضاء کی حقیقت یہ ہے کہ کسی شرعی حکم کا اظہار واجب التعمیل فیصلے کی صورت میں کیا جائے۔

ابن عابدین علامہ قاسم سے نقل کرتے ہیں:۔
"دنیوی معاملات میں جو جھگڑے پیدا ہوں ان کے بارے میں کسی اجتہاد کے مطابق فیصلے کو لازمی قرار دینے کا نام قضاء ہے"[1]۔

تھانوی کہتے ہیں:۔
"کسی مجاز حاکم کے اس فیصلے کو قضاء کہتے ہیں جس پر عمل درآمد لازمی ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شریعت میں مقدمات اور تنازعات کے فیصلے کرنے کو قضاء کہتے ہیں۔[2]

ان تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ قضاء میں یہ بات شامل ہے کہ حاکمِ وقت قاضی کے فیصلے کے نفاذ کو ضروری قرار دیتا ہے اور یہ بات فتویٰ سے مختلف ہے۔ اس لیے کہ فتویٰ اور قضاء دونوں کے مفہوم میں کسی شرعی حکم کا بتانا شامل ہے، البتہ دونوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ فتویٰ واجب التعمیل نہیں ہوتا جسے فتویٰ دیا گیا ہو، ضروری نہیں کہ وہ اس پر عمل بھی کرے۔
طاش کبری زادہ نے فتویٰ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

---

[1] حاشیہ ابن عابدین۔ ج ۵۔ ص ۳۵۲۔   [2] اصطلاحات العلوم الاسلامیہ۔ ج ۵۔ ص ۱۲۳۲

"علم الفتویٰ میں وہ احکام نقل کیے جاتے ہیں جو فقہاء نے جزئی واقعات کے بارے میں صادر کیے ہوں۔ اس کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان فقہا کے بعد آنے والے ان لوگوں کے لیے سہولت پیدا ہو جو علم فقہ میں مہارت نہ رکھتے ہوں۔"
اس تعریف میں انھوں نے یہ الفاظ نہیں لکھے کہ اس پر عملدرآمد لازمی ہوتا ہے۔

اس بنا پر قاضی کی نسبت مفتی کی پوزیشن زیادہ محفوظ ہوتی ہے کیونکہ محض فتویٰ دینے سے کسی پہ کوئی حکم لازم نہیں آتا۔ جو شخص فتوی پوچھتا ہے مفتی صرف اسے جواب دیتا ہے وہ چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو اسے رد کردے۔ اس کے برعکس قاضی جو فیصلہ کرتا ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح مفتی اور قاضی دونوں شرعی حکم بتانے کے سلسلے میں تو مساوی ہیں، لیکن قاضی کے صادر کردہ فیصلے پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے قاضی کا معاملہ مفتی کی نسبت نازک تر اور زیادہ پر خطر ہے۔ اس رائے کا اظہار حافظ ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب "اعلام الموقعین" (۱-۳۶) میں کیا ہے۔

علماء نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ قاضی اپنی عدالت میں بیٹھ کر فتویٰ صادر کرے کیونکہ اس صورت میں عوام قضا اور فتویٰ میں فرق نہیں کر سکیں گے یہ بات قاضی شریح رحمہ اللہ وغیرہ سے منقول ہے۔ ایک مرتبہ قاضی شریح سے کسی کو قید کرنے کے بارے سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا "میں فیصلہ کرتا ہوں فتویٰ نہیں دیتا"۔[1]

اسلام میں قضا کی اہمیت

پوری دنیا میں اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو دین و دنیا کا جامع ہے۔ وہ ایک طرف انسان کا رابطہ خالق کے ساتھ استوار کرتا ہے اور دوسری طرف وہ مخلوق کے ساتھ اس کا تعلق جوڑتا ہے۔ دینی امور میں ایک مسلمان توحید، رسالت، آخرت، فرشتوں، کتابوں اور تقدیر کے اچھا یا برا ہونے پر ایمان لانے کا پابند ہے۔ ارکان دین میں سے نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی پابندی اور استطاعت ہونے کی صورت میں حج بیت اللہ کی ادائیگی اس کے لیے ضروری ہے۔ دنیوی امور میں سے نکاح، طلاق، خرید و فروخت، وراثت، ہبہ، وقف، وصیت اور اسی طرح کے دوسرے معاملات میں شریعت پر عمل پیرا ہونا اس پر فرض ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیوی اور دینی امور ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں، بلکہ یہ ایک دوسرے کا جزو اور باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ بظاہر دینی و دنیوی امور میں جو تفریق نظر آتی ہے وہ صرف بیان و توضیح کے لیے ہے۔ فقہاء شرعی احکام کو جب عبادات اور معاملات میں تقسیم کرتے ہیں تو ان کے نزدیک ان دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جس طرح ایک مسلم کو بنیادی عقائد میں سے بعض کو ماننے اور بعض سے انکار کرنے کا اختیار نہیں، ٹھیک اسی طرح دنیوی امور سے متعلق احکام میں بھی اسے بعض کی پیروی کرنے اور بعض کی پیروی نہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

" وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى   کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب

---

[1] المبسوط (۱۶-۸۵)

اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ۔ (الاحزاب - ۳۶)

اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ صادر کردیں تو پھر اسے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ جائے گا۔

اس طرح اسلام نے عقائد اور معاملات کو ایک دوسرے کے ساتھ نہایت مضبوطی سے اس طرح جوڑ دیا ہے کہ کسی حالت میں بھی ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس طرح یہ ذمہ داری تھی کہ آپ لوگوں کی تربیت فرمائیں اور ان کا تزکیہ کریں ٹھیک اسی طرح آپ کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ آپ لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ فرمائیں اور ان کے جھگڑوں کے فیصلے کریں تاکہ کوئی طاقتور کمزور پر ظلم کر کے اُسے اس کے حقوق سے محروم نہ کر دے۔ اس چیز کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انسانی سرشت میں طمع و لالچ اور دوسروں پر غلبہ و تسلط کا جذبہ موجود رہے اور اس کے شر سے دوسرے کو محفوظ رکھنے کے لیے نظامِ عدل ناگزیر ہے۔

قرآن عزیز نے توحید کے اثبات اور شرک کی تردید کے بعد جس مسئلے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ ہے انسانوں کے درمیان عدل وانصاف کا قیام، ظالموں اور غاصبوں کو سزا دے کر بنی نوع انسان کے حقوق کا تحفظ اور جابر لوگوں کو حق و انصاف کی قوت اور اقتدار کے سامنے جھکانا۔

چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (النساء: ۵۸)

اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقین کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھی اسی لیے بھیجا کہ وہ اس کی شریعت کو اس دنیا میں جاری و ساری کر کے عدل وانصاف قائم کریں۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرۃ: ۳۰)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔

قضاء کا بنیادی تقاضا

دینی تعلیمات کی رُو سے قاضی کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ کسی واقعہ کے بارے میں شرعی حکم بتا دے اور اسے اس کے تقاضوں کے مطابق نافذ کر دے بلکہ اس کی ذمہ داری اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور وہ یہ کہ جس مسئلہ کے بارے میں نص صریح موجود نہ ہو اس کے متعلق وہ اپنی ذہانت اور فہم و فراست سے مدد لے اور پیش آمدہ واقعہ کی جزئیات کے بارے میں شرعی حکم کا استنباط کرے۔ معاملہ فہمی اور استنباط کا یہ ملکہ خالص عطیہ خداوندی ہے اور قاضی کے لیے کتاب و سنت، اجماعِ امت

اور فقہی اختلافات کا جو علم ضروری ہے یہ اس سے زائد ایک صفت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے علم کی صفت کو حضرت داؤد و سلیمان میں مشترک قرار دیا۔ مگر معاملہ فہمی کو حضرت سلیمان کی جداگانہ خصوصیت ٹھہرایا۔

قرآن کریم میں فرمایا:

"وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ○ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (الانبیاء: ۷۸-۷۹)

اور داؤد و سلیمان (کو یاد کیجیے) جب وہ اس کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم ان کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔

اسی معاملہ فہمی کا نتیجہ تھا کہ ایک شخص نے حضرت یوسف کی پیچھے کی جانب سے پھٹی ہوئی قمیص دیکھ کر یہ بھانپ لیا تھا کہ آپ سچے اور الزام سے بری ہیں:

"قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ○ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ○ (سورۂ یوسف: ۲۶-۲۸)

(یوسف نے کہا اسی نے مجھ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا۔ اسی کے قبیلے میں سے ایک فیصلہ کرنے والے نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو تو یہ سچی اور یوسف جھوٹا۔ اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو تو یہ جھوٹی اور وہ سچا۔ جب اس کا کرتہ دیکھا (تو) پیچھے سے پھٹا تھا (تب اس نے زلیخا سے کہا) کہ یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں اور کچھ شک نہیں کہ بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمھاری چالیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اپنے مشہور مکتوب گرامی میں اسی طرف توجہ دلائی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خط میں لکھا "تمھارے سامنے جو بھی ایسا معاملہ پیش کیا جائے جس کا فیصلہ کتاب و سنت میں مذکور نہ ہو تو اس پر خوب غور کرو۔ اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"صحیح فہم اور حسن نیت اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعامات میں سے ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ اسلام کی نعمت کے بعد کسی بندے کے لیے ان دونوں سے بڑھ کر کوئی انعام ہو سکتا ہی نہیں۔ یہ دونوں اسلام کے عظیم ستون ہیں اور اسلام کی عمارت ان دونوں کے سہارے کھڑی ہے۔" (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۷)

حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ۔

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اس کو دین کا فہم عطا کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں حضورؐ نے دعا فرمائی :۔

"اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ" (صحیح بخاری۔ کتاب فضائل الصحابہ۔ باب ذکر ابن عباسؓ) اے اللہ! اس کو دین کا فہم عطا کر اور اس کو قرآن کی تفسیر و تاویل سکھا دے۔

مسند احمد میں یہ الفاظ ہیں۔ آپؐ نے دعا فرمائی: "اے اللہ! اس کے علم و فہم میں اضافہ فرما"۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۳۳۰)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فہم و فراست میں سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا چنانچہ آپؓ اپنی خداداد ذہانت و فراست سے کام لے کر ان مسائل میں اجتہاد کیا کرتے تھے جن کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی۔ اور اکثر و بیشتر آپ کا اجتہاد صحیح ہوتا۔ اس میں غلطی کا احتمال بہت کم ہوا کرتا تھا۔ حتّٰی کہ حضورؐ نے فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ" (سنن الترمذی، ابواب المناقب) اللہ تعالیٰ نے حق کو عمرؓ کی زبان پر جاری کر دیا ہے۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں :۔

"حضرت عمرؓ جس چیز کے بارے میں کہتے "میرا خیال ہے کہ یہ یوں ہونی چاہیئے" تو وہ ویسے ہی ہوتی"۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابہ میں فہم و فراست کے اعتبار سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے کرنے کے بارے میں ان کا ایک واقعہ سنیے جو ان کی ذہانت و فراست کی واضح دلیل ہے۔

حضرت زیدؓ بن ارقم کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ یمن سے ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ یمن کے رہنے والے تین آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مقدمہ لے کر آئے۔ ان کا جھگڑا ایک لڑکے کے بارے میں تھا اس لیے کہ تینوں نے ایک ہی طہر میں ایک عورت کے ساتھ ہم بستری کی تھی۔ حضرت علیؓ نے ان میں سے دو سے کہا کہ یہ لڑکا اس تیسرے آدمی کو مبارک ہو۔ اس پر وہ دونوں بھڑک اٹھے۔ پھر آپ نے دوسرے دو آدمیوں سے کہا کہ لڑکا تیسرے آدمی کو مبارک ہو۔ وہ دونوں بھی یہ بات سن کر غضبناک ہو گئے۔ اسی طرح آپؓ نے تیسری دفعہ بھی کیا جس سے وہ دونوں بھی غصے میں آ گئے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم جھگڑالو قسم کے حصہ دار ہو۔ اب میں تمہارے درمیان قرعہ اندازی کروں گا۔ جس کے نام کا قرعہ نکلے گا، لڑکا اسے دیا جائے گا اور اس کے ذمے اس کے باقی دو حصہ داروں کے لیے دو تہائی دیت کے برابر رقم کی ادائیگی ہوگی، چنانچہ حضرت علیؓ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی اور جس کے نام قرعہ نکلا لڑکا اس کے حوالے کر دیا۔ یہ واقعہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح ہنسے کہ آپ کی ڈاڑھیں نظر آنے لگیں۔

ابوداؤد[1] اور ابن ماجہ[2] نے بھی یہ روایت نقل کی ہے البتہ بعض اہل علم نے اس روایت کو اس بنا پر ضعیف قرار دیا ہے کہ یہ مرسل ہے لیکن ابن حزمؒ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔

صحیح بخاری[3] اور صحیح مسلم[4] میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے جس سے فیصلے

---

[1] سنن ابوداؤد (۲ : ۲۸۰) کتاب الطلاق۔ [2] سنن ابن ماجہ کتاب الاحکام، باب القضاء بالقرعۃ۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الفرائض "باب اذا ادعت المرأۃ ابنا" [4] صحیح مسلم، کتاب الاقضیۃ۔

صادر کرنے کے سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی فراست و ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا:

كَانَتْ امْرَأَتَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا، جَاءَ الذِّئْبُ فَذَهَبَ بِابْنِ إِحْدَاهُمَا فَقَالَتْ لِصَاحِبَتِهَا إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ وَقَالَتِ الْأُخْرَى، إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ، فَتَحَاكَمَتَا إِلَى دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَضَى بِهِ لِلْكُبْرَى، فَخَرَجَتَا عَلَى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ فَأَخْبَرَتَاهُ، فَقَالَ ائْتُونِي بِالسِّكِّينِ أَشُقُّهُ بَيْنَهُمَا، فَقَالَتِ الصُّغْرَى لَا تَفْعَلْ يَرْحَمُكَ اللَّهُ هُوَ ابْنُهَا، فَقَضَى بِهِ لِلصُّغْرَى۔

دو عورتیں تھیں جن کے دو بیٹے تھے۔ بھیڑیا آیا اور وہ ان میں سے ایک کے لڑکے کو اٹھا کر لے گیا۔ اس عورت نے دوسری سے کہا کہ بھیڑیا تو تیرے بیٹے کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ اس پر ان دونوں کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ مقدمہ حضرت داؤد کی عدالت میں لے گئیں۔ سیدنا داؤد علیہ السلام نے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ وہاں سے نکل کر دونوں حضرت سلیمانؑ کے پاس گئیں اور ان کو سارا قصہ سنایا۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا۔ چھری لاؤ، میں اس بچے کو دو ٹکڑے کر کے تم دونوں میں برابر تقسیم کیے دیتا ہوں۔ یہ سن کر چھوٹی پکار اٹھی کہ اللہ آپ پر رحم کرے، ایسا ہرگز نہ کیجیے۔ یہ لڑکا اسی کا ہے (اسی کو دے دیجیے) تب حضرت سلیمانؑ نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اپنے والد حضرت داؤدؑ کے فیصلے کے خلاف فیصلہ دینا کیسے جائز ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک بہترین تدبیر کے ذریعے صحیح صورتِ حال کا انکشاف کیا۔ آپ نے ان دونوں کی بات سن کر چھری لانے کے لیے اس لیے نہیں کہا تھا کہ آپؑ واقعی بچے کے ٹکڑے کرنا چاہتے تھے بلکہ یہ سارا کچھ محض اس لیے کیا گیا تھا کہ صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے۔ جب چھوٹی عورت اپنی ممتا کی وجہ سے اس خیال ہی سے سخت پریشان ہو گئی کہ بچے کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں گے اور اس نے اپنے حق سے دستبرداری کا اعلان یہ کہہ کر کر دیا کہ بچہ اس بڑی عورت ہی کا ہے، اسی کو دے دیا جائے تو حضرت سلیمانؑ کا مقصد پورا ہو گیا۔ آپؑ سمجھ گئے کہ وہ عورت محض اس بچے کی جان بچانے کے لیے یہ بات کہہ رہی ہے جبکہ بڑی کے یہ جذبات نہ تھے اس لیے آپ نے صحیح فیصلہ صادر فرما کر بچہ اس کی حقیقی ماں کو دے دیا۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

اس واقعہ سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ کسی مقدمے میں حق ایک ہی فریق کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب اگر قاضی سمجھ دار اور عبقری نہ ہو تو فیصلے میں حق وانصاف تک پہنچنا اس کے لیے بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریقین اپنے اپنے حق میں بعض اوقات دلائل اس انداز میں دیتے ہیں کہ صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شیخینؒ نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشہادات، باب من اقام البینۃ بعد الیمین۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے ابواب میں بھی (باقی برصفحہ آئندہ)

یں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اسی بات کی طرف ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ مِنْ بَعْضٍ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ، فَلَا يَأْخُذْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ۔

میں تمھاری طرح انسان ہوں۔ تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے مدِ مقابل کی نسبت زبان پر زیادہ قدرت رکھتا ہو۔ پس اگر ایسی صورت ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں حالانکہ حقیقت میں وہ اس کے بھائی کا حق ہو تو وہ اس میں سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ لے کیونکہ یہ تو اس کے لیے آگ کا ٹکڑا ہے۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قاضی کا فیصلہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرسکتا لیکن اس کا فیصلہ بہرحال نافذ ہوگا چاہے وہ حق کے مطابق ہو یا اس کے خلاف۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فیصلہ شہادتوں اور دلائل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اب اگر حاکم یا قاضی میں اتنی معاملہ فہمی اور فراست نہ ہو کہ وہ معاملات کی تہہ تک پہنچ سکتا ہو تو لوگوں کے حقوق پامال ہوتے رہیں گے، طوائف الملوکی کا دور دورہ رہے گا، لوگوں میں اضطراب کی لہر دوڑ جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کا نظام معطل ہو کر رہ جائے گا جیسا کہ عملاً یہی صورتِ حال ان تمام ممالک میں پیش آتی ہے جہاں وہ لوگ انصاف کی مسند پر لا بٹھائے جاتے ہیں جو اپنے دین، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے اس کے اہل نہیں ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کے چند نمونے

پہلا نمونہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح، کتاب "الدیات" باب "اذا قتل بحجر وبعصا" میں حضرت انسؓ بن مالک کی روایت نقل کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ مدینہ منورہ میں ایک لڑکی یا لونڈی چاندی کا زیور پہنے ہوئے گھر سے باہر نکلی تو ایک یہودی نے اسے پتھر مارا۔ وہ لڑکی زخمی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی گئی جبکہ ابھی اس میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

فُلَانٌ قَتَلَكِ؟ فَرَفَعَتْ رَأْسَهَا۔ فَأَعَادَ عَلَيْهَا قَالَ: فُلَانٌ قَتَلَكِ؟ فَرَفَعَتْ رَأْسَهَا۔ فَقَالَ لَهَا فِي الثَّالِثَةِ فُلَانٌ قَتَلَكِ؟ فَخَفَضَتْ رَأْسَهَا۔ فَدَعَا بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ فَقَتَلَهُ بَيْنَ الْحَجَرَيْنِ۔

فلاں شخص نے تجھے قتل کیا ہے؟ اس لڑکی نے اپنا سر اٹھایا۔ حضورؐ نے اس سے دوبارہ وہی سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا تجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے؟ اس نے پھر اپنا سر اٹھایا۔ تیسری بار آپؐ نے پھر پوچھا کہ فلاں نے تجھے قتل کیا ہے؟ تو اس نے اپنا سر اثبات میں نیچے کر دیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو بلوایا اور دو پتھروں کے درمیان رکھ کر اسے قتل کرا دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ روایت ہے۔ صحیح مسلم: کتاب الاقضیہ۔ باب "الحکم بالظاھر"۔

صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، باب "ثبوت القصاص فی القتل بالحجر وغیرہ من المحددات و المثقلات وقتل الرجل بالمرأۃ" میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا، چنانچہ اسے رجم کیا گیا یہاں تک کہ وہ مرگیا۔

یہ حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ قاتل کو اسی طرح قتل کیا جائے گا جس طرح اس نے قتل کیا ہوگا۔ مثلاً پتھر یا لاٹھی کے ذریعے یا گلا گھونٹ کر یا اسی طرح کسی دوسرے ایسے طریقے سے جس سے اس نے قتل کیا ہو۔

جمہور فقہاء کا مسلک یہی ہے، البتہ اہل کوفہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قصاص صرف تیز دھار آلے کے ذریعے ہی لیا جائے گا۔ ان کے اس مسلک کی بنیاد حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا، لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ (ابن ماجہ کتاب الدیات) (قصاص صرف تلوار کے ذریعے ہی لیا جائے گا)۔ امام کاسانی جو کبار علماء احناف میں سے ہیں انھوں نے یہ مسلک اپنی کتاب البدائع والصنائع (۷: ۲۴۵) میں بیان کیا ہے۔

حضرت نعمانؓ بن بشیر کی یہ حدیث امام ابن ماجہ نے سنن (۲: ۸۸۹) میں نقل کی ہے۔ اس روایت کی سند میں جابر الجعفی راوی ہے جو معروف کذاب ہے۔ البزار، بیہقی، طبرانی طحاوی اور دارقطنی نے بھی یہ روایت مختلف لفظوں میں بیان کی ہے لیکن سب کی سندیں کمزور ہیں۔ ابن ماجہ نے "سنن" میں اسی طرح کی حدیث ابی بکرہ سے روایت کی ہے۔ اس روایت کی سند میں مبارک بن فضالہ راوی ہے جو مدلّس ہے۔ اس نے حضرت حسن بصریؒ سے "عن الحسن" کے اسلوب میں روایت بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس بارے میں دارقطنی اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بھی نقل کی ہے لیکن اس میں سلیمان بن ارقم راوی ہے جو متروک ہے۔ دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت بھی نقل کی ہے جس میں معلی بن ہلال نامی راوی کذاب ہے۔ طبرانی اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ اس کی سند نہایت ہی ضعیف ہے۔ شیخ عبدالحق کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سب سندیں ضعیف ہیں۔ امام ابن جوزی کی رائے بھی یہی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سند پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ دیکھیے "التلخیص الحبیر" (۴: ۱۹)

دوسری مثال

مؤطا، کتاب "العقول" باب "عقل الجنین" میں امام مالک حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ قبیلہ ہذیل کی ایک عورت نے دوسری عورت کو پتھر مارا جس سے اس کا حمل گر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت کے طور پر ایک لونڈی یا غلام دینے کا فیصلہ فرمایا۔ صحیح بخاری، کتاب "الفرائض" باب "میراث المرأۃ والزوج مع الولد" میں امام بخاری نے اس کے ساتھ اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے کہ جس عورت پر آپ نے دیت عائد کی تھی وہ مرگئی تو حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اس کی وراثت تو اس کے خاوند اور اس کی اولاد کو ملے گی لیکن اس کی طرف سے دیت اس کے عصبہ (ددھیالی قریبی رشتہ دار) ادا کریں گے۔ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ باب "دیۃ الجنین" میں امام مسلم نے اضافہ بھی کیا ہے کہ اس بارے میں حمل بن نابغۃ الہذلی نے کہا کہ میں اس کی دیت کیسے ادا کروں جس نے کھایا پیا نہ چیخا چلایا اور نہ ہی بات کی۔ اس کا خون تو رائیگاں جائے گا۔ یہ بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ تو کاہنوں کی طرح تک بندی کر رہا ہے"۔

ھُذَیل: ہذیل بن مدرکہ کی طرف منسوب قبیلہ ہے۔ مکہ معظمہ کے قریب وادیٔ نخلہ میں اس قبیلے کی اکثریت ہے۔

بعض روایات میں امام ابوداؤد نے ان دونوں عورتوں کے نام بھی نقل کیے ہیں۔ ایک کا نام ملیکہ تھا اور دوسری کا نام عظیف۔ طبرانی کہتے ہیں کہ جسے پتھر لگا وہ ملیکہ تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لونڈی یا غلام دیت میں دینے کا فیصلہ فرمایا، اس دور میں اس کی قیمت پچاس دینار یا چھ سو درہم تھی۔ امام مالک کا یہی قول ہے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ اس کی اصل قیمت تو پانچ سو دینار تھی لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسواں حصہ قیمت ادا کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ ہوسکتا ہے کہ رحم میں جو بچہ تھا وہ مردہ ہو۔ اسی لیے علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر حمل زندہ گرے، پھر کچھ دیر بعد وہ اس ضرب کی وجہ سے مرجائے جس سے وہ گرا تھا تو مکمل دیت عائد کی جائے گی کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ایک "جان" بن چکا تھا۔ امام مالک کی یہی رائے ہے اور اس کا موطا میں انھوں نے ذکر فرمایا ہے۔

تیسری مثال

مؤطا میں امام مالک نے حضرت ابوہریرہؓ اور خالد الجہنی کی روایت نقل کی ہے کہ دو آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مقدمہ لائے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ! ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیے۔ دوسرا آدمی زیادہ سمجھ دار تھا۔ اس نے کہا: "ہاں یا رسول اللہ! آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیے اور مجھے صورت حال پیش کرنے کی اجازت عطا فرمائیے۔" آپ نے فرمایا: "بات کرو۔"

اس شخص نے کہا: "میرا بیٹا اس آدمی کے ہاں مزدوری کرتا تھا اور اس نے اس کی بیوی سے بدکاری کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کو رجم کیا جائے گا، تو میں نے اسے کو فدیہ کے طور پر ایک لونڈی اور سو بکریاں دے دیں۔ پھر میں نے اہل علم سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میرے بیٹے کو تو سو دُرے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لیے اسے جلاوطن کیا جائے گا البتہ اس کی بیوی کو رجم کیا جائے گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَاَقْضِیَنَّ بَیْنَکُمَا بِکِتَابِ اللّٰہِ جَلَّ ذِکْرُہٗ: اَمَّا غَنَمُکَ وَجَارِیَتُکَ فَرَدٌّ عَلَیْکَ وَجَلَدَ ابْنَہٗ مِائَۃً وَغَرَّبَہٗ عَامًا۔

اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تم دونوں کے درمیان اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ تیری لونڈی اور تیری بکریاں تو واپس تجھے دے دی جائیں گی البتہ تیرے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔

پھر آپ نے اس کے بیٹے کو سو دُرّے لگوائے اور ایک سال کے لیے اسے جلاوطن کردیا، ساتھ ہی آپ نے اُنیس اسلمی کو حکم دیا کہ دوسرے شخص کی بیوی کے پاس جاکر اس سے پوچھے۔ اگر وہ اعتراف جرم کرلے تو اسے رجم کردے۔ چنانچہ اُنیس اسلمی نے جاکر پوچھا تو اس نے زنا کا اعتراف کرلیا اور اسے رجم کردیا گیا۔

امام بخاری نے صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب "الاعتراف بالزنا" اور کتاب الاحکام، باب "ھل یجوز للحاکم ان یبعث رجلا وحدہ للنظر فی الامور" میں متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔ امام مسلم نے صحیح مسلم،

کتاب الحدود، باب "من اعترف علی نفسه بالزنا" میں یہ روایت بیان کی ہے۔ اسی طرح ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی اور ترمذی نے بھی اپنی اپنی "سنن" میں یہ حدیث روایت کی ہے۔

لڑکے کو سو کوڑے مارنے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کرنے کی سزا اس لیے دی گئی تھی کہ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ یہ سزا اسے اس بنیاد پر دی گئی کہ اس نے جرمِ زنا کا اعتراف کیا تھا اور نہ صرف باپ کا اعتراف حد قائم کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "لَاَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ" اس میں کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید نہیں، کیونکہ قرآن میں نہ تو رجم کا حکم ہے اور نہ ہی جلاوطنی کا۔ اس سے مراد ہے اللہ کا وہ فیصلہ جس کا اعلان اس نے اپنے نبی کی زبان سے کرایا کیونکہ نبیؐ اپنی خواہشِ نفس کے تحت تو کوئی بات نہیں فرماتے تھے (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى)۔ (النجم: ۳، ۴)

بعض علماء کہتے ہیں کہ کتاب اللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف تھا جس کی تلاوت تو منسوخ ہو چکی ہے لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ "الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا" لیکن یہ رائے نہایت ہی کمزور ہے کیونکہ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو بھی اس میں جلاوطنی کا حکم تو موجود نہیں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے کو ایک سال کے لیے جلاوطنی کی سزا بھی دی۔ جمہور شارحینِ حدیث کے نزدیک پہلی تاویل ہی صحیح ہے۔

(اُنَیْسؓ مشہور صحابی انیسؓ بن ضحاک اسلمی ہیں۔ جن لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ انسؓ بن مالک تھے وہ غلطی پر ہیں کیونکہ اس وقت حضرت انسؓ کی عمر اتنی چھوٹی تھی کہ حد قائم کرنے کے لیے انھیں حکم نہیں دیا جا سکتا تھا)۔

چوتھی مثال

مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی اور ساتھ ہی وہ اس سے بچہ بھی چھین لینا چاہتا تھا۔ اس عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی کہ یہ بچہ میرے پیٹ میں رہا، میری چھاتیوں سے اس نے دودھ پیا اور میری گود اس کے لیے آرام کا گہوارہ بنی رہی اور اب یہ شخص اسے مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا "اَنْتِ اَحَقُّ بِهٖ مَا لَمْ تَنْكِحِيْ" (جب تک تو دوسری شادی نہ کرے، تو اس کی زیادہ حق دار ہے)۔

اس کی سند میں مثنیٰ بن صباح راوی ضعیف اور امام نسائی کے نزدیک متروک ہے لیکن مثنیٰ والی اس سند کے علاوہ دو اور صحیح سندوں کے ساتھ بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے، چنانچہ مسند امام احمد میں ابن جریج سے اور ابوداؤد اور حاکم کے ہاں امام اوزاعی سے بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ وہ دونوں (ابن جریج اور اوزاعی) عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده عن رسول الله صلی الله علیه وسلم کی سند کے ساتھ یہی حدیث بیان کرتے ہیں۔ حاکم کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ حافظ ذہبی نے بھی حاکم کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔ عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده کی سند کے ساتھ روایت کو حجت

ماننے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف تو پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس حدیث کے بارے میں لوگ عمرو بن شعیب ہی کی سند کو قبول کرنے اور دوسری شادی کے بعد عورت کے حق حضانت (بچے کی پرورش اور تربیت) کے ساقط ہو جانے پر اسے حجت ماننے پر مجبور ہیں۔ ائمۂ اربعہ کا مسلک یہی ہے جیسے حافظ ابن القیم نے "زاد المعاد" میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنی ایک بیوی کو طلاق دی تو اس کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی فیصلہ دیا۔ آپؓ نے فرمایا کہ وہ (بچے کی ماں) اپنے بچے کے لیے باپ سے زیادہ شفیق، مہربان اور رحم دل ہے اور جب تک وہ دوسری شادی نہ کرے (پرورش اور تربیت کی خاطر) اس کا بچے پر حق مقدم ہے۔ یہ روایت عبدالرزاق نے ثوری سے، انھوں نے عاصم سے اور انھوں نے عکرمہ سے بیان کی ہے۔

اصحاب سنن (ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی) کے ہاں ایک روایت اس طرح کی بھی ہے کہ اس عورت نے کہا کہ میرا یہ خاوند (جس نے طلاق دی تھی) میرے لڑکے کو مجھ سے لے جانا چاہتا ہے حالانکہ وہ مجھے ابوعنبہ کے کنوئیں سے پانی لا کر دیتا اور فائدہ پہنچاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یَا غُلَامُ هٰذَا أَبُوكَ وَهٰذِهٖ أُمُّكَ فَخُذْ بِيَدِ أَيِّهِمَا شِئْتَ" — لڑکے یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں، تو ان میں سے جس کا ہاتھ چاہے پکڑ لے۔

تو اس لڑکے نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلی گئی۔

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ بظاہر ان دونوں روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ دونوں دو الگ الگ مقدمات سے متعلق ہیں۔

پانچویں مثال

صحیح بخاری، کتاب "المغازی"، باب "عمرة القضاء" میں امام بخاری نے روایت نقل کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ سال (عام الحدیبیہ) کا قضا شدہ عمرہ ادا کیا اور جتنی مدت قیام مکہ کے لیے طے کی تھی وہ گزر گئی تو اہل مکہ نے حضرت علیؓ سے جا کر کہا کہ اپنے ساتھی سے کہو کہ وہ مکہ سے نکل جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے تو حضرت حمزہؓ کی بچی "چچا چچا" پکارتے ہوئے پیچھے دوڑی۔ حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ یہ لو اپنے چچا کی بیٹی۔ اس پر حضرت علیؓ اور ان کے بھائی حضرت جعفر اور حضرت زید بن حارثہ میں نزاع پیدا ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور پہلے میں نے ہی اس کا ہاتھ پکڑا ہے اس لیے اس پر میرا حق مقدم ہے۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی بھی ہے۔ حضرت زیدؓ نے کہا کہ یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ اس کی خالہ کے حق میں کیا اور فرمایا: "الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ" کہ خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے۔ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "أَنْتَ مِنِّي وَأَنَا مِنْكَ" (تم میرے ہو اور میں تمھارا ہوں) حضرت جعفرؓ سے فرمایا "أَشْبَهْتَ خَلْقِي وَخُلُقِي" (تو صورت اور سیرت میں مجھ سے مشابہت رکھتا ہے) اور حضرت زیدؓ سے فرمایا "أَنْتَ أَخُونَا وَمَوْلَانَا" (تو ہمارا بھائی اور ساتھی ہے)

حضرت حمزہؓ کی بیٹی کا نام عمارہ یا امامہ تھا اور اس کی کنیت ام الفضل تھی۔

"خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے" اس ارشاد کا مطلب ہے حق حضانت (تربیت و پرورش) میں نہ کہ حق وراثت میں۔ "اَنْتَ مِنِّی وَاَنَا مِنْکَ" کا مفہوم ہے کہ خاندانی رشتہ کے لحاظ سے، داماد ہونے کے اعتبار سے، اسلام میں مسابقت کے پہلو سے اور نبی کے ساتھ محبت کے نقطۂ نظر سے۔ اس سے مراد صرف چچازاد بھائی ہونا نہیں کیونکہ اس لحاظ سے تو حضرت جعفرؓ کا بھی یہی تعلق بنتا تھا۔ یہ وضاحت حافظ ابن حجر نے کی ہے۔

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کے چند نمونے ہیں لیکن علماء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق باقی ہر چیز کو جمع کرنے، مرتب کرنے اور ان میں سے ایک ایک کی چھان پھٹک کرنے کا جس طرح اہتمام کیا ہے اس طرح کا کوئی اہتمام ان فیصلوں کو بھی مستقل تصانیف کی شکل میں جمع و مرتب کرنے کا دو جلیل القدر علماء۔ شیخ ظہیر الدین المرغینانی حنفی (وفات ۵۰۶ھ) اور امام ابوعبداللہ محمد بن فرج الطلاع قرطبی (وفات ۴۹۷ھ) ۔ کے سوا کسی اور نے نہیں کیا، اللہ تعالی کو منظور تھا کہ امام ابن الطلاع کی کتاب کو بقا حاصل ہو تو اس نے مجھے اس کی تحقیق، اس کی احادیث اور اس کے آثار کی تخریج اور اس کے اہم مقامات پر حاشیے لکھنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فیصلے مصنف کے قلم سے چھوٹ گئے تھے انھیں اس کتاب میں شامل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس طرح یہ ایک ضخیم کتاب بن گئی۔ اس پر ہم اللہ رب العالمین کا شکر ادا کرتے اور اس کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔

سنت میں مذکور آداب قضاء

صحاح اور سنن کی کتابوں میں علماء نے قاضی کے ان آداب اور اوصاف کا ذکر کیا ہے جنھیں فیصلے کرتے وقت ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ ہم ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔ ان کا استنباط سنت کی کتابوں میں سے کیا گیا ہے۔

۱۔ غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرنا امام مسلم، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوبکرہؓ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لَایَحْکُمُ اَحَدُکُمْ بَیْنَ اثْنَیْنِ وَھُوَ غَضْبَانُ" (تم میں سے کوئی شخص دو آدمیوں کے درمیان ایسی حالت میں فیصلہ نہ کرے جب وہ غصے کی حالت میں ہو)

امام بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "لَایَقْضِی الْقَاضِی بَیْنَ اثْنَیْنِ وَھُوَ غَضْبَانُ" (قاضی دو آدمیوں کے درمیان ایسی حالت میں فیصلہ نہ کرے جب وہ غصے میں ہو)

اس کی وجہ جیسا کہ ماہرین نفسیات کہتے ہیں، یہ ہے کہ غصہ خون کے کھولنے سے پیدا ہوتا ہے اور اس حالت میں آدمی کی آنکھوں پر جذبات کا اس طرح پردہ پڑ چکا ہوتا ہے کہ وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتا، جبکہ اللہ کی شریعت تو قائم ہی حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرنے پر ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا کہ قاضی اس وقت تک فیصلہ نہ کرے جب تک اس کو اپنے اوپر ضبط حاصل نہ ہو تاکہ کہیں غصہ کی حالت میں وہ حق کے خلاف فیصلہ نہ دے دے۔

۲۔ فریقین کی بات سُنے بغیر فیصلہ نہ کرنا

ابوداؤد، ترمذی نے "سنن" میں اور حاکم نے "مستدرک" میں حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

إِذَا تَقَاضَى إِلَيْكَ رَجُلَانِ فَلَا تَقْضِ لِلْأَوَّلِ حَتَّى تَسْمَعَ كَلَامَ الْآخَرِ فَسَوْفَ تَدْرِي كَيْفَ تَقْضِي.

جب دو آدمی تمھارے پاس اپنا مقدمہ لائیں تو دوسرے کی بات سُنے بغیر پہلے کے حق میں فیصلہ نہ دے دینا کیونکہ دوسرے کی بات سن کر تمھیں معلوم ہوگا کہ کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔

ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں شیخین نے یہ روایت نقل نہیں کی۔

۳۔ قاضی کے سامنے فریقین کے بیٹھنے میں مساوات

محمد بن نعیم اپنے باپ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ کو فیصلہ کرتے ہوئے دیکھا ہے

انھوں نے کہا کہ حارث بن حکم آئے اور اس گدے پر بیٹھ گئے جس کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سمجھے کہ وہ مقدمے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے آئے ہیں۔ اتنے میں ایک دوسرا آدمی آکر حضرت ابوہریرہؓ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اس سے پوچھا کہ کیسے آئے؟ اس نے کہا "حارث نے مجھ پر زیادتی کی ہے۔" حضرت ابوہریرہؓ نے حارث سے کہا کہ اٹھو اور اپنے فریقِ مخالف کے ساتھ بیٹھو کیونکہ یہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ وکیع نے "اخبار القضاۃ" میں اور حارث بن ابواسامہ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے۔

دونوں کو ایک ساتھ بٹھانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر اس سلسلے میں ایک فریق کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جائے گا تو اس کی عزت افزائی ہوگی اور دوسروں پر زیادتی کرنے کے لیے اُس کا حوصلہ بڑھے گا۔

۴۔ نظر اور اشارہ میں فریقین میں مساوات

بیہقی اور دارقطنی نے اپنی "سنن" میں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنِ ابْتُلِيَ بِالْقَضَاءِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ فَلْيَعْدِلْ بَيْنَهُمْ فِي لَحْظِهِ وَإِشَارَتِهِ وَمَقْعَدِهِ وَمَجْلِسِهِ.

جسے مسلمانوں کا قاضی بننے کی آزمائش میں ڈالا گیا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے اشاروں، کنایوں اور نشست میں ان کے درمیان انصاف کرے۔

یہ اس لیے کہ فریقین میں سے کسی ایک کو اس بات کا شبہ تک نہیں گزرنا چاہیے کہ قاضی دوسرے فریق کی طرف مائل ہے کہ کہیں اس وجہ سے وہ اپنے حق کے مطالبے میں کمزوری نہ محسوس کرے۔

۵۔ کسی ایک فریق کو زیادہ بلند آواز سے نہ پکارنا

بیہقی اور دارقطنی نے اپنی "سنن" میں حضرت ام سلمہؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنِ ابْتُلِيَ بِالْقَضَاءِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ فَلَا يَرْفَعْ صَوْتَهُ عَلَى أَحَدِ الْخَصْمَيْنِ مَا لَمْ

جسے مسلمانوں کا قاضی بننے کے امتحان میں ڈالا گیا ہو وہ فریقین میں سے کسی ایک پر دوسرے کی نسبت آواز

يَرْفَعُ عَلَى الْآخِرِ ۔ زیادہ بلند نہ کرے۔

یہ پہلی حدیث ہی کا ایک حصہ ہے۔

۶۔ ایک فریق کو مہمان بنانے کی ممانعت

اسماعیل بن مسلم نے حسن سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت علیؓ جب کوفہ میں تھے اس زمانے میں ایک آدمی ان کے ہاں مہمان بن کر آیا، پھر اس نے ایک مقدمہ آپ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ اب تم فریق مقدمہ ہو اس لیے میرے گھر سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤ کیونکہ رسول اللہ نے ہمیں فریقین میں سے ایک فریق کو مہمان بنانے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ ہم دوسرے فریق کو بھی مہمان نہ بنائیں۔ یہ حکم فریقین میں مکمل مساوات ملحوظ رکھنے کے لیے ہے۔

یہ حدیث مرسل ہے۔ طبرانی نے اسے متصل سند کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن اس سند میں ہیثم بن غصن یا قاسم بن غصن راوی ہے جو مجہول ہے۔

۷۔ فریقین جب تک اطمینان سے بیٹھ نہ جائیں اس وقت تک مقدمہ کی سماعت نہ کرنا

ابو داؤد اور بیہقی نے اپنی "سنن" میں اور حاکم نے "مستدرک" میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ فریقین (سماعت شروع ہونے سے پہلے) قاضی کے سامنے بیٹھ جائیں۔

حاکم کہتے ہیں کہ صحیح بخاری اور مسلم میں شیخین نے یہ روایت نقل نہیں کی اور حافظ ذہبی نے ان کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔

۸۔ معزز اور غیر معزز، آزاد اور غلام کے درمیان مساوات

امام بخاری اور مسلم نے صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا النَّاسُ كَالْإِبِلِ الْمِائَةِ لَا تَكَادُ تَجِدُ فِيهَا رَاحِلَةً ۔ (صحيح البخاري۔ كتاب الرقاق)

لوگوں کی مثال ان سو اونٹوں کی سی ہے جن میں شاید تمہیں سواری کے قابل ایک بھی نہ ملے۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام میں لوگ برابر ہیں۔ یہاں حسب و نسب کی بنیاد پر کوئی معزز اور غیر معزز اور کوئی ادنیٰ اور کوئی اعلیٰ نہیں ہے۔ جیسے کہ سو اونٹوں میں کوئی بھی سواری کے قابل نہ ہو اور اس لحاظ سے وہ سب برابر ہوں۔ اس لیے قاضی کا فرض ہے کہ وہ فیصلوں میں معزز اور غیر معزز، غلام اور آزاد، بڑے اور چھوٹے اور مالدار اور مفلس میں کوئی فرق روا نہ رکھے۔ اس طرح انسانی معاشرے میں مکمل مساوات کی فضا پیدا ہوگی۔

۹۔ شدید بھوک اور پیاس کی حالت میں فیصلہ نہ کرنا

بیہقی اور طبرانی نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا يَقْضِي الْقَاضِي إِلَّا وَهُوَ شَبْعَانُ رَيَّانُ" (قاضی صرف ایسی حالت میں فیصلے کرے جب وہ اچھی طرح سے سیر ہو، یعنی وہ شدید بھوک اور پیاس کی حالت میں فیصلے نہ کرے)۔

چنانچہ قاضی شریح کو جب غصہ آجاتا یا شدید بھوک اور پیاس لگ جاتی تو وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور اس وقت فیصلے نہ کرتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی شدت آدمی کی سوچ پر اثرانداز ہوتی ہے اور بسا اوقات اس حالت میں وہ صحیح حقیقت تک نہیں پہنچ پاتا۔

اس حدیث کی سند میں قاسم بن عبداللہ بن عمر راوی ہے جو متروک ہے اور بعض کے نزدیک وہ ضعیف ہے۔

یہ وہ بعض آداب ہیں جن کا استنباط ہم نے اللہ کے فضل سے سنت کی کتابوں سے کیا ہے اور قاضی کے لیے ان کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

رسول اللہ کے مقرر کردہ قاضی

پچھلے صفحات میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے سب سے بڑے قاضی تھے اور اس منصب پر آپ کو خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرمایا تھا۔ ارشاد باری ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النسآء: ۶۵)	تمہارے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے سامنے سر تسلیم پوری طرح خم کر دیں۔

لیکن جب اسلامی قلمرو میں اضافہ ہو گیا اور وعظ و ارشاد، تزکیہ و تربیت، جہاد کی تیاری، وفود کے استقبال، صدقات و خیرات کی تقسیم اور اسی نوعیت کی دوسری سرگرمیوں کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں تو آپ نے مختلف صحابہ کو مختلف علاقوں میں داعی، حاکم اور قاضی مقرر کر کے بھیجا جو آپ کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ آپ نے حدود اللہ کے قیام اور لوگوں کی حق رسی کے لیے عدل و انصاف کے جو مستقل اور مستحکم اصول متعین فرما دیے تھے ان کے مطابق آپ کے یہ نمائندے فیصلے کرتے تھے تاکہ اسلامی شریعت کے تحت قائم کردہ انسانی معاشرے میں کسی قوت والے کو اس بات کا حوصلہ نہ ہو سکے کہ وہ کسی کمزور کا حق مار کھائے یا اس پر کوئی زیادتی کر بیٹھے۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اپنے نمائندے کے طور پر جن لوگوں کو اس مقصد کے لیے قاضی مقرر فرمایا کہ وہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے کریں، ان میں سے چند ایک کا ہم یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ تھے جو معلم اکبر اور مربی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں فیصلے کرتے تھے تاکہ انھیں عملی تربیت ہو اور بعض مدینے سے دور دراز علاقوں میں تعینات کیے گئے۔ ان کے فیصلے حضور تک پہنچتے، پھر آپ یا تو ان کو صحیح قرار دے کر بحال رکھتے یا ان میں کوئی غلطی ہوتی تو اس کی تصحیح فرما دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز رحلت کے وقت تک رہا اور آپ اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوئے کہ ان صحابہ کے کام سے آپ راضی تھے۔

۱۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب | یہ علی بن ابی طالب ابن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف قرشی ہاشمی ہیں۔ کنیت

ابوالحسن ہے۔ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے مردوں میں سے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ پرورش اور تربیت پائی۔ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوہر تھے۔ حضرت عثمان بن عفان کی شہادت کے بعد خلیفہ بنے۔ ساڑھے تین ماہ کم پانچ سال تک خلیفہ رہے۔ سنہ ۴۰ھ میں رمضان المبارک کی سترھویں رات کو شہید ہوئے۔ آپ کے فضائل و مناقب اَن گنت ہیں۔ وکیع نے "اخبار القضاۃ" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی نقل کیا ہے: اِنَّ عَلِیًّا اَقْضیٰ اُمَّتِیْ (علی میری امت میں سے سب سے بہتر فیصلے کرنے والے ہیں)۔ اب منصب قضا پر ان کی تقرری کا قصہ سنیے۔

سنن ابوداؤد کتاب القضاء، باب "کیف القضاء" میں ابوداؤد نے اور جامع ترمذی کتاب "الاحکام"، باب "ماجاء فی القاضی لَایَقْضِی بَیْنَ الْخَصْمَیْنِ حتی یَسْمَعَ" میں امام ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ مجھے قاضی بنا کر بھیج رہے ہیں حالانکہ میں تو نو عمر ہوں اور مجھے قضاء کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ عزّوجلّ تمہارے قلب کی راہنمائی فرمائے گا اور تمہاری زبان سے صحیح فیصلے کرائے گا۔ پھر آپ نے ہدایت فرمائی کہ جب فریقین تمہارے سامنے آکر بیٹھ جائیں تو ایک کی بات سن کر فیصلہ صادر نہ کرنا بلکہ دوسرے فریق کی بات بھی اسی طرح سننا جس طرح پہلے کی سنی تھی۔ اس سے صحیح فیصلے تک پہنچنے میں تمہیں مدد ملے گی۔ اس کے بعد فیصلہ صادر کرنا[1]۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں مسلسل قاضی رہا اور مجھے کسی فیصلے کے بارے میں تردد نہیں ہوا۔

حضرت علیؓ کی اس روایت پر معتزلہ، جہمیہ اور معطلہ جیسے گمراہ فرقوں کے بعض کم عقل لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں۔ ان لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ شریعت کو اپنی عقل کی میزان میں تولتے ہیں پھر جو بات ان کی عقل میں آجائے اسے قبول

---

[1] ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ صحیح الاسناد ہے البتہ شیخین نے اس کی روایت نہیں کی۔ حافظ ذہبی، حاکم کی اس رائے سے متفق ہیں۔ بیہقی نے "السنن الکبریٰ" میں اور ابوداؤد طیالسی نے اپنی "مسند" میں یہ روایت نقل کی ہے۔ ان سب روایتوں میں حنش بن معتمر الکنانی الکوفی راوی ہے جو حضرت علیؓ کا ساتھی تھا۔ منذری نے مختصر ابی داؤد میں لکھا ہے کہ ترمذی نے اسے حسن کے درجہ کا راوی قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ "التقریب" میں لکھتے ہیں کہ یہ تھا تو سچا لیکن وہم کا شکار تھا۔ ابن حزم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ "المحلی" (۱-۱۰ ۵۱۹) میں لکھتے ہیں کہ یہ راوی درجۂ اعتبار سے گرا ہوا ہے اور اس کی روایت ناقابلِ قبول ہے۔ امام ابن حزم جرح و تعدیل میں اپنی شدت کے سلسلے میں معروف ہیں۔

اس روایت کی تائید میں دوسری روایات بھی موجود ہیں چنانچہ ابن ماجہ، حاکم اور دیگر نے بختری عن علی کی سند کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے مگر بختری کی حضرت علیؓ سے نہ ملاقات ہوئی اور نہ ان سے اس نے حدیث کا سماع کیا۔ ابوحاتم وغیرہ کہتے ہیں کہ اس کا نام سعید بن فیروز تھا۔ بزار نے ایک اور سند (عن حارثة بن مضرب عن علیؓ) کے ساتھ روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے اس روایت کی یہ بہترین سند ہے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابن حبان نے ایک اور سند کے ساتھ (عن ابن عباس عن علی) بھی یہ روایت بیان کی ہے۔ حاکم نے ایک اور طریقے سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف روانہ کیا اور فرمایا کہ لوگوں کو شریعت کی تعلیم دینا اور ان کے باہمی اختلافات کے فیصلے کرنا۔ دیکھیے (الدرایة: ۲-۱۶۵) اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سی سندوں اور شواہد کی بنا پر یہ حدیث ان شاء اللہ صحیح الاسناد ہوگی۔

کرلیتے ہیں اور جو نہ آئے اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت یہ بات ان کے ذہن میں نہیں رہتی کہ شریعت کی حکمتیں بعض اوقات تو عقل کی گرفت میں آجاتی ہیں لیکن بعض اوقات ذہن کی رسائی اللہ کی شریعت کی حکمتوں تک نہیں ہو پاتی۔ اس موٹی سی بات کو نہ سمجھنے اور غلط بنیاد پر فیصلے کرنے کی وجہ سے وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی انھوں نے گمراہ کیا۔

اس روایت پر معتزلہ کے اعتراضات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے حق میں جو دعا فرمائی اس پر معتزلہ اور بعض دوسرے گمراہ گروہوں نے متعدد اعتراضات کیے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے حضرت علیؓ کے اس قول پر بھی تنقید کی ہے کہ اس دعا کے بعد مجھے کسی فیصلے کے بارے میں شک یا تردد نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا دعویٰ ہے جس کی عقل اور نقل دونوں ہی سے تکذیب ہوتی ہے۔

عقلی نقطۂ نظر سے وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے لیے یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی زبان سے صحیح فیصلے کرائے اور کسی فیصلے میں ان سے غلطی سرزد نہ ہو جبکہ غلطی اور خطا و نسیان تو بشری تقاضوں میں سے ہیں۔ نقل کے پہلو سے وہ کہتے ہیں کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد ایسے فیصلے کیے جن سے صحابہ کرام نے اختلاف کیا اور خود انھوں نے ان سے رجوع کر لیا۔ یہ وہ فیصلے ہیں جنھیں تابعین اور فقہاء نے بھی قبول نہیں کیا۔ مثال کے طور پر ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ ام الولد کے بارے میں ان کے مختلف اقوال ہیں۔ پہلے انھوں نے اس سلسلے میں ایک بات کہی پھر اس سے رجوع کر لیا۔

۲۔ حد دو کے بارے میں انھوں نے ایسے فیصلے کیے جو ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

۳۔ مرتدین کو جلانے کی سزا دی لیکن جب حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ ان تک پہنچا تو اپنے فیصلے پر نادم ہوئے۔

۴۔ ان کی رائے یہ تھی کہ حاطب کی آزاد کردہ لونڈی کو رجم کیا جائے لیکن جب انھوں نے حضرت عثمانؓ کا یہ قول سنا کہ حد تو اس پر نافذ ہوتی ہے جو اس کا علم رکھتا ہو" اور وہ لونڈی عجمی تھی، عربی زبان سے بے خبر ہونے کی وجہ سے اسے حد کا علم نہ تھا تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کی رائے کو قبول کر لیا۔

۵۔ انھوں نے ایک پچاس سالہ آدمی کو اسّی کوڑوں کی سزا دی جس سے وہ مر گیا۔ اس پر آپ نے اس کی دیت ادا کی اور فرمایا کہ دیت میں نے اس لیے ادا کی ہے کہ اس کی موت واقع ہونے پر ہم نے باہم مشورے سے یہ فیصلہ کیا ہے۔

آپ کو اپنے مندرجہ ذیل فیصلوں سے رجوع کرنا پڑا۔

(۱) یہ کہ کھانے پینے کی چیزوں میں اللہ کی حرام کردہ چیزیں صرف تین ہیں۔ (۲) یہ کہ چور کا ہاتھ انگلیوں کی جڑوں سے قطع کیا جانا چاہیے (۳) یہ کہ چوری کرنے والے بچوں کی انگلیوں کو رگڑ کر یا کھرچ کر ختم کر دینا چاہیے۔ (۴) یہ کہ بچوں کے معاملات میں بچوں کی شہادت قبول کر لینی چاہیے۔

اعتراضات کا جواب

ان سب اعتراضات کا جواب عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (وفات ۲۷۶ھ) نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" (ص ۱۵۹) میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علیؓ کے دل اور زبان کے برسر حق رہنے کی دعا فرمائی تو اس سے آپ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان سے کبھی کسی حالت میں بھی کوئی سہو یا نسیان یا غلطی نہ ہو کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو کسی مخلوق میں ہو ہی نہیں سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ ان کے اکثر فیصلے درست ہوں اور ان کی اکثر باتوں میں صحت کا پہلو غالب ہے۔

یہ اسی طرح ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو دین کا فہم اور قرآن کی سمجھ عطا فرمائے لیکن حضرت ابن عباسؓ حضور کی اس دعا کے باوجود سارے قرآن پاک کا مکمل علم نہیں رکھتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ "حنانا" "اواہ" "غسلین" اور "الرقیم" کا کیا مطلب ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حضرت علیؓ نے بہت سے ایسے مقدمات کے بالکل درست فیصلے فرمائے جن کو سمجھنے سے حضرت عمرؓ سمیت دوسرے جلیل القدر صحابہ قاصر رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ علیؓ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔ یہ بھی حضرت عمرؓ ہی کا قول ہے کہ میں ہر اس مشکل سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جسے حل کرنے کے لیے ابوالحسن (حضرت علیؓ) موجود نہ ہو۔

مختلف صحابہ کرام مثلاً حضرت عمر، ابوہریرہ، حسان بن ثابت، امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں مانگی ہیں ان کا مفہوم یہی لیا جائے گا کہ وہ اکثر حالات کے لیے ہیں نہ کہ ہر وقت اور ہر حالت کے لیے۔

۲۔ معاذ بن جبل

یہ معاذؓ بن جبل بن عمرو بن اوس ابو عبدالرحمٰن انصاری خزرجی ہیں۔ حلال و حرام کے علم میں یہ امامت کے منصب پر فائز ہیں۔

ابوادریس خولانی کہتے ہیں کہ ان کا رنگ سفید، چہرہ روشن، دانت چمکدار اور آنکھیں سرمگیں تھیں۔ کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ معاذؓ حسین و جمیل، فیاض طبع اور اپنی قوم کے بہترین نوجوانوں میں سے تھے۔ واقدی کہتے ہیں کہ یہ سب غزوات میں شریک ہوئے۔ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ سے حضرات ابن عباس، ابن عمر، ابن عدی، ابن ابواوفی اشعری، عبدالرحمٰن بن سمرہ، جابر بن انس اور دوسرے کبار تابعین نے احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت عمرؓ ان کا اعزاز و تکریم کرتے اور فرماتے کہ عورتیں معاذ جیسے بیٹے جننے سے قاصر ہیں اور اگر معاذ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔ کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ معاذؓ بن جبل مدینہ منورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں فتوے دیا کرتے تھے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ بات بیان کی ہے۔

سیف نے "الفتوح" میں اپنی سند کے ساتھ عبید بن صخر سے روایت بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ کو یمن بھیجا تو فرمایا:

إِنِّي قَدْ عَرَفْتُ بَلَاءَكَ فِي الدِّيْنِ	میں دین کے بارے میں تمھاری مشکل کو جانتا
وَالَّذِي قَدْ رَكِبَكَ مِنَ الدَّيْنِ وَقَدْ	ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم قرض میں دبے
طَيَّبْتُ لَكَ الْهَدِيَّةَ فَإِنْ أُهْدِيَ	ہوئے ہو۔ اس لیے میں تمھارے لیے تحفہ کو حلال و طیب قرار دیتا
إِلَيْكَ شَيْءٌ فَاقْبَلْ۔	ہوں اور اگر کوئی شخص تمھیں ہدیہ پیش کرے تو اسے قبول کر لیا کرنا۔

اسی سند کے ساتھ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو الوداع کہتے ہوئے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں سامنے سے، پیچھے سے، دائیں جانب سے اور بائیں طرف سے اور اوپر اور نیچے سے اپنی حفاظت میں رکھے اور تمام جن و انس کی شرارتوں سے تمھیں محفوظ فرمائے۔ حافظ ابن حجر نے "الاصابہ" میں یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں جن کا ذکر سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اب آپ وہ ہدایات ملاحظہ کیجیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں منصب قضا پر فائز کرتے ہوئے ارشاد فرمائیں۔

ابوداؤد نے اپنی "سنن" میں کتاب الاقضیۃ باب فی اجتھاد الرای فی القضاء میں اور ترمذی نے اپنی "جامع" میں کتاب الاحکام "باب ما جاء فی القاضی کیف یقضی" میں حارث بن عمرو بن اخی المغیرۃ بن شعبہ سے اور انھوں نے حضرت معاذ بن جبل کے حمص سے تعلق رکھنے والے بعض ساتھیوں سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو آپ نے پوچھا کہ معاذ جب کوئی مقدمہ پیش ہوا تو تم کیسے فیصلہ کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضورؐ نے پوچھا۔ اگر کتاب اللہ میں تمھیں (وہ فیصلہ) نہ ملا تو؟ حضرت معاذؓ نے کہا۔ پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضورؐ نے فرمایا اگر سنت رسول اور کتاب اللہ دونوں ہی میں نہ ملا؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا۔ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ	اس اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہؐ کے فرستادہ کو اس
لما یرضی رسول اللہ۔[1]	بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

یہ واقعہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرت معاذؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یمن میں فیصلے کرتے تھے۔ حضرت معاذؓ بن جبل کی ۱۸ھ میں شام میں طاعون کی بیماری سے وفات ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر چونتیس برس تھی۔

۳۔ العلاء بن الحضرمیؓ

یہ عبد اللہ بن عماد بن اکبر بن ربیعۃ الحضرمی ہیں۔ ان کا باپ مکہ معظمہ میں رہتا تھا۔ وہ ابوسفیان کے والد حرب بن امیہ کا حلیف تھا۔ حضرت عبد اللہ کے کئی بھائی تھے۔ ان میں ایک عمرو بن الحضرمی تھا جو مشرکین میں سے پہلا مقتول تھا، اسے عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں نے محرم کے مہینے میں مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے مقام پر قتل کیا۔ محرم کے مہینے میں قتل کے اس واقعہ کو قریش نے مشرکین کو بھڑکانے

---

[1] ترمذی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ روایت اس سند کے علاوہ کسی اور طریقے سے ہمارے علم میں نہیں اور میرے نزدیک اس کی سند متصل ہے۔

اس حدیث پر علماء نے طویل بحثیں کی ہیں حتیٰ کہ بعض نے تو اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں کیونکہ اس سے شریعت کے ایک اہم اصول یعنی قیاس پر روشنی پڑتی ہے۔ میرے خیال میں اس پر سب سے بہتر بحث حافظ ابن القیمؒ نے "اِعْلَامُ الْمُوَقِّعِین" (۱-۲۰۲) میں کی ہے جہاں وہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس حدیث کے ان راویوں کے ناموں کا ذکر نہیں کیا گیا جو حضرت معاذ کے ساتھی تھے لیکن اس سے حدیث کی اہمیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ حارث بن عمروؓ نے یہ حدیث حضرت معاذؓ کے ایک نہیں بلکہ متعدد ساتھیوں سے روایت کی ہے۔ جن کا دین، صداقت، فضیلت اور شہرت میں مقام اتنا معروف ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی جھوٹ یا کسی اور برائی کی تہمت نہیں لگائی جاسکتی۔ ان میں سے کوئی مجروح نہیں۔ اہل علم کو اس کے بارے میں کوئی شک نہیں۔

کے لیے خوب استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں نے محرم کے مہینے کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے اس میں خونریزی کی، مال لوٹے اور لوگوں کو قیدی بنایا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ (البقرۃ ۲۱۷)	لوگ آپؐ سے حرام مہینوں میں لڑائی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ ان میں لڑنا بہت برا ہے مگر خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی برا ہے اور فتنہ قتل سے بڑا گناہ ہے۔

اس آیت کے نزول سے مسلمانوں کا وہ غم دور ہوا جس میں وہ قریش کے پراپیگنڈہ کی وجہ سے مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کی تفصیلات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

علاء بن الحضرمی نے اسلام قبول کر لیا، یہ مستجاب الدعا تھے۔ یہاں تک کہ وہ بعض دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے بلاخوف وخطر سمندر میں داخل ہو گئے۔ صحابہ میں سے سائبؓ بن یزید اور ابوہریرہؓ نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بحرین کا قاضی مقرر کیا اور ان کے لیے ایک طویل خط لکھوایا جس کا ذکر حارث بن اسامہ نے اپنی مسند میں کیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ یوں ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ محمد بن عبد اللہ النبی الامی القرشی الہاشمی جو تمام انسانوں کے لیے اللہ کے رسول اور نبی ہیں کی طرف سے علاء بن الحضرمی اور ان کے ساتھی مسلمانوں کے لیے لکھا جانے والا ایک عہد نامہ ہے۔ اے مسلمانو! حتی الوسع اللہ کا تقویٰ اپنے اندر پیدا کرو۔ میں نے علاء بن حضرمی کو تمھارے ہاں قاضی بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے اسے ہدایت کی ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا رہے، تمھارے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، حسن سلوک سے پیش آئے اور تمھارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرے۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ جب تک وہ ایسا کرتا ہے اور تمھارے ساتھ انصاف کرے اور رحمت سے پیش آتا ہے تو اس کی بات اچھی طرح سنو، اس کی اطاعت کرو اور بہترین انداز میں اس کے ساتھ تعاون کرو۔ بیشک میرا تم پر اطاعت کا اتنا عظیم حق ہے کہ تم وہ حق ادا نہیں کر سکتے۔[1]

یہ اس طویل گرامی نامہ کا ایک حصہ ہے جو نبی کریم کے ارشاد کے مطابق حضرت عثمانؓ نے حضرت معاویہؓ کو املا کرایا۔ ان دنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف فرما رہے۔ جب حضورؐ نے یہ مکتوب حضرت علاءؓ بن الحضرمی اور خالدؓ بن ولید کے حوالے کیا تو اس وقت متعدد صحابہ مثلاً حضرت ابوذر غفاریؓ، حذیفہ بن الیمان العبسی، سعد بن عبادؓ الانصاری وغیرہ وہاں موجود تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو حضرت علاءؓ بن الحضرمی کا نائب مقرر فرمایا کہ اگر کوئی آفت یا ناگہانی حادثہ پیش آ جائے

---

[1] حافظ ابن حجرؒ نے "المطالب العالیۃ" (۲ : ۲۳۷) میں اس گرامی نامہ کا ذکر کیا ہے۔ آپؐ نے یہ تین ذی القعدہ ۸ھ میں لکھوایا۔ البوصیریؒ نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ جس تابعی سے یہ روایت کیا گیا ہے وہ مجہول ہے۔

تو وہ ان کی جگہ کام کریں گے۔

یہ مکتوبِ گرامی دنیا و آخرت کے بے شمار فوائد، متعدد شرعی احکام اور حضورؐ کی طرف سے کئی ایک ہدایات پر مشتمل ہے۔ یہاں اس مکتوب کا صرف وہ حصہ نقل کیا گیا ہے جس میں حضورؐ نے حضرت علاءؓ بن الحضرمی کو حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کریں۔

۴۔ معقلؓ بن یسار

ان کی کنیت ابو علی اور بعض لوگوں کے نزدیک ابو عبداللہ المزنی ہے۔ مُزنی کی نسبت مُزینہ کی طرف ہے جو عثمان بن عمرو کی والدہ تھی۔ حضرت معقل صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہوئے۔ بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔ بغوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے حکم کے تحت انھوں نے بصرہ میں نہر کھدوائی جس کا نام "نہر معقل" ہے۔ اس کی نسبت انہی کے نام کی طرف ہے۔ حضرت معقل نے بصرہ ہی میں اپنا گھر تعمیر کیا اور وہیں حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں ان کی وفات ہوئی۔

انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت نعمان بن مقرن، عمران بن حصین، عمرو بن میمون الاودی، ابو عثمان النہدی اور حسن بصری سے احادیث کی روایت کی ہے۔ آپ کی روایت کردہ احادیث "صحاح" اور "سنن" کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

حضرت معقل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ قاضیوں میں سے تھے۔ امام احمد نے "مسند" اور حاکم نے "مستدرک" میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت معقل فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کا حکم دیا۔ میں نے عرض کیا "مجھ میں صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ حضورؐ نے فرمایا "اللّٰہُ مَعَ القاضی مالم یَحِفْ عَمْدًا" کہ اللہ تعالیٰ کی تائید اس وقت تک قاضی کے ساتھ ہوتی ہے جب تک وہ دانستہ ظلم و زیادتی نہ کرے (دیکھیے کنز العمال (۹۲ - ۵۰)

اس حدیث کے شواہد دوسرے صحابہ کرام کی روایات سے بھی ملتے ہیں، چنانچہ طبرانی میں حضرت زید بن ارقم سے اسی طرح کی حدیث مروی ہے جس میں ان لفظوں کا اضافہ ہے کہ "جب تک قاضی اللہ کے علاوہ کسی اور کی رضا کو مقصود نہ بنائے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی راہنمائی جنت کی طرف کرتا رہتا ہے۔" (مسند احمد ۵ : ۲۶) جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْقَاضِیْ مَا لَمْ یَجُرْ	اللہ کی تائید اس وقت تک قاضی کو حاصل رہتی ہے
فَاِذَا جَارَ تَخَلّٰی عَنْہُ وَلَزِمَہُ	جب تک وہ ظلم نہ کرے۔ جب وہ ظلم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا
الشَّیْطَانُ[۱]	ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور شیطان اس کے ساتھ چپک جاتا ہے۔

۵۔ عمرو بن العاص القرشی

ان کی کنیت ابو عبداللہ یا ابو محمد السہمی ہے۔ فتح مکہ سے پہلے ۸ھ میں صفر کے مہینے میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صلح حدیبیہ اور فتح خیبر کے درمیانی عرصہ میں

---

[۱] جامع ترمذی کتاب الاحکام باب "ما جاء فی الامام العادل"۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ شیخ مبارکپوری "تحفۃ الاحوذی" (۴ : ۵۶۰) میں لکھتے ہیں کہ حاکم نے "مستدرک" میں اور بیہقی نے "السنن الکبریٰ" میں یہ روایت نقل کی ہے۔ المناوی "شرح الجامع الصغیر" میں کہتے ہیں کہ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

وہ مسلمان ہوئے۔ زبیر بن بکار اور واقدی نے اپنی الگ الگ سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے سرزمین حبشہ میں نجاشی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عمرو سے کہا کہ تم عقل و فہم کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہو پھر بھی تم نے اسلام قبول کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی؟ حضرت عمرو نے جواب دیا کہ ہم ایسے لوگوں کے ساتھ تھے جن کو ہم پر فوقیت حاصل تھی، یہ وہ لوگ تھے جن کے دل اور ہام کی آماجگاہ تھے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ان لوگوں نے آپ کی تکذیب کی۔ ہم نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور معاملات کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں آئی تو ہم نے غور و فکر سے کام لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ حق نے ہمارے دماغوں پر اثر کیا اور اسلام کی دعوت ہمارے دلوں میں داخل ہو گئی۔ اس بات کا احساس بعد میں قریش کو بھی اس طرح ہو گیا کہ اب میں پہلے کی طرح ان کے ساتھ تعاون میں دلچسپی نہیں لیتا تھا، چنانچہ انھوں نے ایک نوجوان کو میرے پاس بھیجا جس نے مجھ سے مباحثہ کیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تجھے اللہ کا، جو تیرا اور تجھ سے پہلے اور بعد کے سب لوگوں کا رب ہے قسم دے کر کہتا ہوں کہ بتاؤ کہ ہم زیادہ صحیح دین پر ہیں یا اہل روم و فارس۔ اس نے کہا کہ ہم زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ہم خوشحال ہیں یا وہ؟ اس نے کہا "وہ"۔ میں نے کہا کہ ہماری ان پر فضیلت کس کام کی اگر یہ ہمیں اس دنیا میں حاصل نہ ہو جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ دنیوی اعتبار سے ہم سے ہر چیز میں آگے ہیں۔ سن لو میرا دل اس بات کو قبول کرتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ بات حق ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے تاکہ نیکوکار کو اس کی بھلائیوں اور بدکار کو اس کی برائیوں کا بدلہ دیا جا سکے۔ اب باطل کے آگے بڑھتے چلے جانے میں کوئی خیر نہیں۔ حافظ ابن حجر نے یہ روایت الاصابہ میں نقل کی ہے۔

حضرت عمروؓ بن العاص کبار صحابہ میں سے تھے۔ آپ کے بے شمار مناقب و فضائل ہیں۔ وہ مصر اور قنسرین کے فاتح اور فلسطین کے گورنر تھے۔ وہ عرب کے اہلِ دانش و بینش لوگوں میں سے ایک تھے۔ حضرت معاویہؓ نے جنگِ صفین کے بعد اپنی طرف سے انھیں ثالث نامزد کیا جس طرح کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو نامزد کیا تھا۔

حضورؐ نے ان کو قاضی مقرر کرتے وقت مندرجہ ذیل حکم لکھوایا تھا:

امام احمد مسند میں روایت کرتے ہیں کہ ابوالنضر نے فرج سے انھوں نے محمد بن عبدالاعلیٰ سے انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے روایت کیا کہ دو شخص حضورؐ کی خدمت میں جھگڑتے ہوئے آئے آپؐ نے فرمایا "عمروؓ! ان کے درمیان فیصلہ کرو"۔ حضرت عمروؓ نے عرض کی "حضورؐ! آپ یہ کام مجھ سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ حضرت عمروؓ نے عرض کی "اگر میں نے ان کے درمیان یہ فیصلہ کر دیا تو اس کا مجھے کیا صلہ ملے گا؟" آپؐ نے فرمایا: إِنْ أَنْتَ قَضَيْتَ بَيْنَهُمَا فَأَصَبْتَ الْقَضَاءَ فَلَكَ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَإِنْ أَنْتَ اجْتَهَدْتَ فَأَخْطَأْتَ فَلَكَ حَسَنَةٌ "اگر تم نے ان کے درمیان صحیح فیصلہ کیا تو تمھیں دس نیکیاں ملیں گی اور اگر تمھارا اجتہاد غلط نکلا تو پھر تمھیں ایک نیکی ملے گی"۔

اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فیصلہ صادر کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس بارے میں ایک ایسے قاضی کی تعریف فرمائی جو عدل و انصاف تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے حضورؐ کے اس ارشادِ گرامی کی تائید ہوتی ہے:

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ (سورۃ الانعام - ۱۶۰)

جو نیکی کرے گا اس کو دس گنا اجر ملے گا۔

باقی رہا حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی کہ اجتہاد کی صورت میں تمھیں ایک نیکی ملے گی" تو یہ نیکی ان کو غلطی کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ملے گی کہ انھوں نے حق و انصاف کی جستجو میں کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ اور یہ نیکی قاضی کو تب ملے گی جب کہ وہ کتاب و سنت کا عالم ہو اور اختلافی مسائل میں اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جہاں تک اس ناداں اور جاہل شخص کا تعلق ہے جو مطلوبہ استعداد کے بغیر قاضی کی کرسی پر براجمان ہو جائے تو اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث صادق آتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ مِنْهُمْ قَاضٍ يَقْضِيْ وَهُوَ لَا يَعْلَمُ فَهُوَ مِنَ النَّارِ وَاِنْ اَصَابَ الخ۔

قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک قاضی وہ ہے جو علم کے بغیر فیصلہ کرے۔ ایسا قاضی اہلِ دوزخ میں سے ہے اگرچہ اس کا فیصلہ درست ہی کیوں نہ ہو......

صحیح روایت کے مطابق حضرت عمروؓ بن العاص کی وفات ۴۳ھ میں ہوئی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

۶۔ عقبہ بن عامرؓ

عقبہؓ بن عامر الجہنی مشہور صحابی ہیں۔ حضورؐ سے بکثرت احادیث انھوں نے روایت کی ہیں۔ پھر ان سے متعدد صحابہ و تابعین مثلاً حضرت ابن عباسؓ، ابو امامہؓ، جبیرؓ بن نفیر، بعجہؓ بن عبداللہ الجہنی، ابو ادریسؒ خولانی اور کئی دوسرے لوگوں نے احادیث روایت کی ہیں۔

ابو سعید بن یونس لکھتے ہیں:

"وہ قرآن، فقہ اور خاص طور پر علم وراثت کے جلیل القدر عالم تھے۔ فصیح و بلیغ شاعر اور کاتب تھے۔ یہ ان صحابہ میں سے تھے جنھوں نے قرآن جمع کیا"

ایک دفعہ دو شخص جھگڑتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے حضرت عقبہؓ کو حکم دیا کہ ان کے درمیان فیصلہ کریں۔

دارقطنی اپنی سند کے ساتھ عقبہؓ بن عامر سے نقل کرتے ہیں کہ دو شخص جھگڑتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا "عقبہؓ! اٹھو اور ان کے درمیان فیصلہ کرو"۔ میں نے عرض کی "حضورؐ! آپ یہ کام مجھ سے بہتر طریقے سے سرانجام دے سکتے ہیں"۔ آپ نے فرمایا "ان کے درمیان فیصلہ کرو۔ اگر تمھارا فیصلہ صحیح ہوا تو دس گنا اجر ملے گا اور اگر تم نے اجتہاد کیا اور اس میں غلطی ہوئی تو تمھیں ایک گنا اجر ملے گا۔"

اس حدیث کی سند میں ابو الفرج بن فضالہ راوی ہے جو ضعیف ہے، البتہ حدیث کا معنی و مفہوم صحیح ہے اور کئی دوسری اسناد کے ساتھ یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔

۷۔ حُذَیفہ بن یمان عَبَسی یہ کبار صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ان سے حضرت جابر، جُندب، عبداللہ بن یزید، ابوالطُفَیل اور بکثرت تابعین نے بکثرت احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت حُذَیفہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محرم اسرار کے طور پر معروف تھے۔ حضرت عمرؓ ان سے دُنیا میں رونما ہونے والے فتنوں کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ جب حُذَیفہؓ کسی جنازہ میں شریک ہوتے تو حضرت عمرؓ بھی شرکت کرتے اور اگر وہ کسی جنازے میں شرکت سے اجتناب کرتے تو حضرت عمرؓ بھی شرکت نہ کرتے۔ آپ کے فضائل و مناقب بےشمار ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حُذَیفہؓ کو دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے یمامہ بھیجا۔ ابن شعبان لکھتے ہیں کہ وہ دو آدمی سرکنڈے کی ایک جھونپڑی کے بارے میں جھگڑتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام نسائیؒ کتاب الاسماء والکنیٰ" میں ذکر کرتے ہیں کہ یمامہ کے رہنے والے دو شخص ایک باغ کے بارے میں جھگڑتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حُذَیفہ بن یمان کو ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بھیجا۔ حذیفہ نے اس شخص کے حق میں فیصلہ صادر کیا جو اس رسّی کے قریب تر تھا جس کے ساتھ وہ جھونپڑی باندھی گئی تھی۔ پھر وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ آپ نے فرمایاؐ تم نے ٹھیک فیصلہ کیا۔"

دارقطنی نے یہ حدیث دہشم بن قران کی سند کے ساتھ روایت کی ہے لیکن یہ راوی ضعیف ہے۔ ابن ماجہ نے یہ نمران بن جاریہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ مگر نمران مجہول راوی ہے۔

۸۔ عَتّابؓ بن اُسَید یہ عتّابؓ بن اُسید بن ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس اموی ہیں۔ ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن یا ابومحمد ہے۔ والدہ کا نام زینب بنت عمرو بن اُمیّہ ہے۔

فتح مکہ کے دن مشرف باسلام ہوئے۔ بہت نیک طینت اور صاحب فضیلت تھے۔ ان کی عمر اس وقت بیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ الماوردی لکھتے ہیں:"رسول کریمؐ نے فتح مکہ کے بعد عتّابؓ بن اُسید کو مکہ کا حاکم اور قاضی مقرر کیا۔ عتّابؓ کو مخاطب کر کے حضورؐ نے فرمایا:

يَا عَتَّابُ إِنْهَهُمْ عَنْ بَيْعِ مَا لَمْ يَقْبِضُوا	عتاب! لوگوں کو اس مال کی بیع سے منع کرو جو ان کے
وَعَنْ رِبْحِ مَا لَمْ يَضْمَنُوا۔	قبضہ میں نہ ہو۔ اور اس چیز کا نفع لینے سے روکو جس کے ضمان
(ادب القاضی للماوردی ج ۱ ص ۱۳۱)	کی وہ ذمہ داری قبول نہ کریں۔

الخوارزمی امام ابوحنیفہؒ سے بسند یحییٰ بن عبداللہ بن موہب التیمی القرشی الکوفی عن عامر الشعبی عن عتّابؓ بن اُسید نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کو اس مال کی بیع سے منع کریں جو ان کے قبضہ میں نہ ہو۔ نیز ایک ہی سودے میں دو طرح کی شرطیں مقرر کرنے سے روکیں (اور وہ یوں کہ اگر نقد ادائیگی کریں تو رقم اتنی ہوگی اور اگر ادھار کریں تو اتنی) مزید برآں بائع کو ایسی چیز پر نفع لینے سے منع کریں جس کے ضمان کی ذمہ داری وہ قبول نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی بیع کو بھی ممنوع قرار دے دیں، جس میں قیمت کی مستقبل میں ادائیگی کی شرط پر چیز کو فروخت کر کے قبضہ دے دیا جاتا ہے۔ (مسند ابی حنیفہ ج ۲ ص ۶۰۷)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عتّاب بن اُسید کو مکہ کا حاکم مقرر کیا۔

منافقین کے بارے میں بڑے سخت اور سچے اہل ایمان کے لیے نہایت نرم تھے۔ حضرت عتابؓ فرمایا کرتے تھے:

"کسی شخص کے بارے میں مجھے پتہ چل جائے کہ وہ نماز باجماعت میں شرکت نہیں کرتا تو میں اسے قتل کردوں گا۔ کیونکہ نماز باجماعت سے مستقل طور پر غیر حاضر وہی شخص رہتا ہے جو منافق ہو۔"

اہل مکہ نے آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ آپؐ نے ایک درشت خو بدو کو مکہ کا حاکم مقرر کر دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنِّی رَاَیْتُ فِیْمَا یَرَی النَّائِمُ اَنَّہٗ اَتٰی بَابَ الْجَنَّۃِ فَاَخَذَ بِحَلْقَۃِ الْبَابِ فَقَعْقَعَھَا حَتّٰی فُتِحَ لَہٗ وَدَخَلَ۔	میں نے خواب میں دیکھا کہ عتابؓ بن اُسید جنت کے دروازے پر آیا اور اس نے دروازے کی زنجیر پکڑ کر اسے زور سے ہلایا یہاں تک کہ دروازہ کھل گیا اور عتابؓ اندر داخل ہو گیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت عتابؓ نے اسی روز وفات پائی جس روز حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہوا۔

۹۔ دِحیہ کلبی

دحیہؓ بن خلیفہ بن فروہ قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آغاز میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ جبریل امین جب انسانی شکل میں نازل ہوتے تو ان کی حضرت دحیہ سے بہت مشابہت ہوتی۔

ابن سعد نے مہاجرین و انصار کے دوسرے طبقے کے ذکر کے دوران میں بیان کیا ہے کہ انہیں یعلی بن لبید، عبیداللہ بن موسیٰ اور فضل بن دکین نے بتایا کہ ان سے زکریا بن ابو زائدہ نے حضرت عامر الشعبی کے حوالے سے روایت بیان کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین آدمیوں کو تین اشخاص کے مشابہ قرار دیا۔ آپ نے فرمایا:

"دِحْیَۃُ الْکَلْبِیُّ یُشْبِہُ جِبْرِیْلَ وَعُرْوَۃُ بْنُ مَسْعُوْدٍ یُشْبِہُ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ وَعَبْدُ الْعُزّٰی یُشْبِہُ الدَّجَّالَ"

۱۔ دحیہؓ کلبی جبریلؑ کے مشابہ ہیں۔

۲۔ عروہؓ بن مسعود ثقفی عیسٰیؑ بن مریم سے ملتے جلتے ہیں۔

۳۔ عبدالعزّٰی یعنی ابولہب دجال کے مشابہ ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے آپؐ نے فرمایا:

اَشْبَہُ مَنْ رَاَیْتُ بِجِبْرِیْلَ دِحْیَۃُ الْکَلْبِیُّ۔	جس آدمی کو شکل میں میں نے جبریلؑ کے بہت مشابہ پایا وہ دحیہ کلبی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ جبریلؑ آپؐ کے پاس دحیہؓ کلبی کی شکل میں آیا کرتے تھے۔

یہ حضرت دحیہؓ ہی ہیں جو حضورؐ کا مکتوب گرامی پہنچانے قیصر کے ہاں گئے تھے۔

الماوردی لکھتے ہیں:

"دحیہ کلبی کو حضورؐ نے یمن کے ایک علاقے کا قاضی مقرر کیا تھا اور وہ شکل و صورت میں جبریلؑ سے مشابہت رکھتے تھے۔"[1]

---

[1] ادب القاضی (ج ۱: ص ۱۳۲)

۱۰۔ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری

نام عبداللہؓ بن قیس اور کنیت ابو موسیٰ ہے قبیلہ اشعر سے تعلق رکھتے تھے۔ نام اور کنیت دونوں کے ساتھ معروف تھے۔ بلکہ کنیت نسبتاً زیادہ مشہور ہے۔ ان کی والدہ کا نام طیبہ بنت وہب بن علی ہے۔ مشرف باسلام ہوئیں اور مدینہ میں وفات پائی۔ ابو موسیٰؓ رملہ میں سکونت پذیر تھے۔ یہ سعیدؓ بن العاص کے حلیف تھے۔ پھر اسلام لائے اور حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ اکثر مؤرخین کی رائے ہے کہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو حبشہ کی جانب ہجرت نہیں کی بلکہ وہ اپنے وطن (یمن) چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیٰ بن عقبہؒ ابن اسحاق، واقدی اور دوسرے سیرت نگاروں نے ان کو مہاجرین حبشہ میں شامل نہیں کیا۔ جب خیبر فتح ہوگیا تو مدینہ تشریف لائے۔ اتفاقاً جعفرؓ بن ابی طالب کی کشتی کے ساتھ ہی ان کی کشتی بھی کنارے لگی۔

وکیعؒ "اخبار القضاۃ" میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ابو موسیٰؓ کو یمن کا حاکم اور بعض کہتے ہیں قاضی بنا کر بھیجا۔ حافظ ابن حجر الاصابۃ میں لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو یمن کے کچھ علاقوں مثلاً زبید، عدن اور اس کے گرد و نواح کا حاکم بنا کر بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ بن شعبہ کے بعد ان کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا، چنانچہ انھوں نے پہلے اہواز اور پھر اصفہان کا علاقہ فتح کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔ حضرت علیؓ نے جنگِ صفین میں ان کو ثالث مقرر کیا تھا۔"

حضرت ابو موسیٰؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین، حضرت معاذؓ، ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ اور عمارؓ سے روایتِ حدیث کی ہے اور ان سے ان کے بیٹوں موسیٰ، ابراہیم، ابو بردہ، ابو بکر اور ان کی اہلیہ امّ عبداللہ اور دوسرے لوگوں نے۔

آپؓ کا انتقال ۴۲ھ میں ہوا جب کہ آپ کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر تھی۔

۱۱۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب

آپ عمرؓ بن الخطاب بن نفیل القرشی العدوی، ابو حفص امیر المومنین ہیں۔ حرب فجار کے چار سال بعد اور بعثتِ نبوی سے تیس سال پہلے پیدا ہوئے۔ خلیفہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ عام الفیل کے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے۔ دورِ جاہلیت میں سفارت کی ذمہ داری آپ کے سپرد تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا اعلان فرمایا تو مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا سخت تھا۔ پھر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو ان کا اسلام لانا مسلمانوں کے لیے ایک عظیم کامیابی تھی۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہؓ بن عمر سے کہا "جاؤ اور لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرو۔" وہ کہنے لگے "امیر المومنین! اس خدمت سے معاف رکھیے۔" حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ "تم اس منصب کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ تمھارے والد لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔"

ابن العربی کہتے ہیں:

"حضرت عثمانؓ نے عبداللہؓ بن عمر سے جو یہ کہا کہ تمھارے والد لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے تو ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ (حضرت عمرؓ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ قاضی تھے۔"

۱۲۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ | آپ سید القراء اور بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک ہونے والوں میں سے تھے۔ آپ نے غزوہ بدر سمیت تمام غزوات میں حصہ لیا۔

۱۳۔ حضرت زید بن ثابت انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ | آپ کاتبین وحی صحابہ میں سے تھے۔ وراثت کے احکام ان کو سب سے زیادہ معلوم تھے۔

ابن سعد ان کو مفتی صحابہ کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مدینہ میں قضاء و فتویٰ میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔

۱۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ | قرآن حکیم کے ان قاریوں میں سے تھے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

مَنْ سَرَّهُ اَنْ یَقْرَأَ الْقُرْآنَ غَضًّا کَمَا نَزَلَ فَلْیَقْرَأْهُ عَلٰی قِرَاءَةِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ۔

جو شخص قرآن کو اسی طرح تر و تازہ پڑھنا چاہے جس طرح وہ نازل ہوا ہے تو وہ اس کو عبداللہ بن مسعود کی طرح تلاوت کرے۔

ان تینوں صحابہ کرام کو مسروق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاضیوں میں شمار کیا ہے۔ الکتانی نے طبری کے حوالے سے مسروق کی یہ رائے نقل کی ہے۔ (دیکھیے التراتیب الاداریہ ج ۱: ص ۲۵۸)

منصب قضاء کے لیے شرائط

ابو یعلی الفراء کہتے ہیں:

"منصب قضاء پر صرف اس شخص کو فائز کیا جاسکتا ہے جس میں مندرجہ ذیل سات شرائط پائی جاتی ہوں:

(۱) مرد ہونا (۲) بالغ ہونا (۳) صحیح العقل ہونا (۴) آزاد ہونا (۵) مسلمان اور عادل ہونا (۶) قوت سماعت و بصارت کا ٹھیک ہونا (۷) اور علم و فضل۔" (الاحکام السلطانیہ ص ۶۰)

مرد ہونے کی شرط اس لیے عائد کی گئی ہے کہ عورت کو حکمران بننے اور گواہی دینے کے اعتبار سے مرد کے برابر درجہ نہیں دیا جاتا۔

الماوردی کہتے ہیں:

"ابن جریر طبری کا یہ انفرادی مسلک ہے کہ عورت تمام احکام شرعیہ میں فیصلہ صادر کرنے اور قاضی بننے کی مجاز ہے۔ ان کا یہ قول خلاف اجماع ہونے کی وجہ سے وزنی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ درج ذیل آیت کریمہ سے بھی متصادم ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ (النساء۔ ۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں اس لیے کہ خدا نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

لہٰذا یہ جائز نہیں کہ عورتیں مردوں پر حاکم بنائی جائیں۔" (الاحکام السلطانیہ ص ۶۰)

صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا: "لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمُ امْرَاَةً" "وہ قوم ہرگز

فلاح نہیں پا سکتی جس کی حکمران عورت ہو۔

جو علماء عورت کو قاضی بنانے کے حق میں ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ عورت کو منصب خلافت نہ سونپا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ جن معاملات میں عورت کی شہادت جائز ہے ان معاملات میں اس کو قاضی بھی بنایا جا سکتا ہے، یعنی ان کے نزدیک حدود و قصاص کے علاوہ باقی تمام امور میں عورت کا قاضی بنانا درست ہے۔

قاضی کے لیے بالغ اور عاقل ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ جب بچے اور مجنوں کو اپنی ذات پر ہی اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے۔ تو ان کو دوسروں پر اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ علاوہ ازیں واقعات کی تہ تک پہنچنا اور گواہوں کی شہادت کا پورا ادراک کرنا ان کے بس میں نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ منصب قضا پر فائز نہیں ہو سکتے۔

قاضی کے لیے آزاد ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ غلام نہ والی بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کی شہادت مکمل شمار ہوتی ہے۔

الماوردی کہتے ہیں:

"چونکہ غلام کو اپنی ذات پر بھی اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ کسی اور کا مختار بھی نہیں بن سکتا۔ اسی طرح جب غلام کی شہادت ہی قابل قبول نہیں تو اس کا فیصلہ کیسے نافذ ہو سکتا ہے؟ علیٰ ہذا القیاس جو شخص پوری طرح آزاد نہیں وہ بھی قضا کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً مُدبّر (وہ غلام جس کو آقا یہ کہے کہ تم میری موت کے بعد آزاد ہو) مُکاتَب (وہ غلام جس کے ساتھ آقا یہ معاہدہ کرے کہ تم اتنی رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہو۔ مگر اس نے وہ رقم ابھی ادا نہ کی ہو) اسی طرح وہ غلام جس کا کچھ حصہ آزاد ہو اور کچھ غلامی کی حالت میں ہو (مثلاً ایک غلام کے چند آقا ہوں۔ ان میں سے کچھ تو اس کو آزاد کر دیں اور کچھ یہ کہیں کہ تم اتنی رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہو) اس قسم کے نیم آزاد افراد کو بھی قاضی نہیں بنایا جا سکتا۔"

مگر غلامی فتویٰ دینے اور حدیث روایت کرنے میں مانع نہیں۔ اس لیے کہ فتویٰ دینے اور روایت کرنے کے لیے صاحب اختیار ہونا ضروری نہیں۔ علاوہ ازیں غلام جب آزاد ہو جائے تو اسے قاضی بنایا جا سکتا ہے۔ چاہے ابھی اس کے ذمہ ولاء کا مال ادا کرنا باقی ہو۔ اس لیے کہ حکمران بنانے میں نسب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

حضرت عمرؓ نے ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ کے بارے میں فرمایا تھا کہ "اگر آج (اس وقت حضرت عمرؓ زخمی ہونے کے باعث بستر علالت پر دراز تھے) سالمؓ زندہ ہوتے تو خلافت ان کے سپرد کرنے میں مجھے کوئی تردد نہ ہوتا۔" الماوردی نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ سالمؓ آزاد ہو چکے تھے اور ان پر غلامی کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ اور آزاد شدہ آدمی کو منصب خلافت و قضاء پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ (ادب القاضی ج ۱ ص ۶۳۰)

قاضی کے لیے مسلمان ہونے کی شرط اس لیے عائد کی گئی ہے کہ جب فاسق مسلمان کو منصب اختیارات پر فائز کرنا جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ کافر کو ایسے منصب پر فائز کرنا بطریق اولیٰ جائز نہیں۔

الماوردی کہتے ہیں:

"یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ شہادت کی قبولیت کے لیے بھی مسلمان ہونا شرط ہے (تو اسلام کے بغیر جب شہادت قبول نہیں ہو سکتی تو غیر مسلم کو قاضی کیسے بنایا جا سکتا ہے ؟) مزید برآں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے ۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (النساء - ۱۴۱)
اور خدا کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ نہیں دے گا۔

اس لیے کافر کو نہ اہلِ اسلام کا قاضی مقرر کیا جا سکتا ہے نہ کفار کا۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کافر کو اس کے ہم مذہب لوگوں کا قاضی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ عموماً والیانِ علاقہ کے ہاں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ وہ غیر مسلموں کو منصب اور عہدے دے دیتے ہیں مگر دراصل یہ فیصلہ کا منصب نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک طرح کی سیادت و قیادت ہے جو ایک غیر مسلم کو اپنے اہلِ مذہب پر حاصل ہو جاتی ہے۔ مزید براں اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان وہ جو فیصلے بھی کرے گا وہ اس لیے نافذ ہوں گے کہ انھوں نے اس فیصلے کو قبول کر لیا نہ کہ اس وجہ سے کہ اس نے انھیں وہ فیصلہ قبول کرنے کے لیے پابند کیا۔ چنانچہ جب غیر مسلم اپنے مقدمات اس کے پاس لے جانا پسند نہ کریں تو ان کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کے مقدمات کا اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔" (الاحکام السلطانیہ ص ۶۵ - دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے ادب القاضی ج ۱ ص ۱۴۴)

قاضی کے لیے عادل ہونے کی شرط اس لیے ضروری ہے کہ فاسق کے دین اور اس کی دیانت کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ منصبِ قضا ایک امانت ہے اس لیے یہ فاسق کے سپرد نہیں کی جا سکتی۔

الماوردی کہتے ہیں :-

"کسی شخص کو کسی منصب پر فائز کرتے وقت اس میں عدالت کی صفت کو بہر صورت ملحوظ رکھا جائے گا۔ عدالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص راست گفتار، امانت دار، محرمات سے اجتناب کرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہو۔ اس کا کردار شکوک و شبہات سے بالاتر ہو، وہ غصے اور خوشی دونوں حالتوں میں متوازن اور دینی اور دنیوی معاملات میں صاحبِ مروت ہو۔ جب یہ اوصاف اس میں بتمام و کمال پائے جائیں تو ایسا شخص عادل کہلائے گا۔ اس کی شہادت جائز ہوگی اور اس کو حکمران یا قاضی بنانا صحیح ہوگا اور اگر ان میں سے کوئی صفت مفقود ہو تو اس کی شہادت بھی قبول نہیں کی جائے گی اور اس کو حاکم بھی نہیں بنایا جائے گا، نہ اس کی کسی بات کا وزن ہوگا اور نہ اس کا کوئی حکم نافذ ہوگا۔ (مذکورہ بالا حوالہ جات ملاحظہ کیجیے)

قاضی کی قوتِ سماعت و بصارت کا صحیح ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ مقدمہ کے فریقین اور گواہوں کو پہچان سکے۔ ظاہر ہے کہ ایک نابینا اور بہرہ شخص عموماً اس صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ دوسرے اعضاء کا صحیح سلامت ہونا اس لیے ضروری نہیں کہ ان کا فیصلے پر اثر نہیں پڑتا۔

الماوردی کہتے ہیں :-

"قاضی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی قوتِ سماعت و بصارت ٹھیک ہو تاکہ وہ صاحبِ حق کے حق کا صحیح طور تعین کر سکے۔ طالب و مطلوب اور اقرار کرنے اور انکار کرنے والے کے درمیان امتیاز کر سکے اور حق و باطل میں فرق کر سکے۔ چونکہ نابینا آدمی اس صلاحیت سے محروم ہوتا ہے اس لیے ایسے شخص کو منصب پر متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مگر امام مالک کی رائے میں اس کا حاکم بننا

بھی درست ہے اور اس کی شہادت بھی معتبر ہے۔ قاضی کے بہرہ ہونے کی صورت میں دہی اختلاف پایا جاتا ہے جس کا ذکر امامت کے ضمن میں پہلے کیا جا چکا ہے۔ قاضی کے بارے میں دیگر اعضاء کے صحیح سالم ہونے کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا مگر حکمران کے سلسلہ میں ان کو ملحوظ رکھا جائے گا، لہٰذا ایک اپاہج اور معذور شخص کو بھی منصب قضا پر فائز کیا جا سکتا ہے، تاہم بہتر یہی ہے کہ ایسے عظیم منصب پر فائز ہونے والے شخص کے اعضاء صحیح سلامت ہوں تاکہ اس کے وقار اور رعب میں اضافہ ہو"

(الاحکام السلطانیہ ص ۶۵، ادب القاضی ج ۱ ص ۶۱۸، ۶۲۵)

قاضی کے لیے شرعی احکام کا عالم ہونا از بس ضروری ہے اور احکام شرعیہ کا عالم ہونے کے لیے چار بنیادی چیزوں کی معرفت لازمی ہے۔ وہ چار چیزیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ کتاب اللہ کے احکام، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص، مجمل و مفصل کا اسے صحیح علم اور معرفت حاصل ہو۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے آگاہ ہو جو آپ کے افعال و اقوال سے ثابت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ کی اسناد و اقسام مثلاً متواتر، خبر واحد، صحیح اور ضعیف، مطلق اور مقید وغیرہ کا علم بھی رکھتا ہو۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ علماء سلف کی آراء سے باخبر ہو مثلاً یہ کہ کس مسئلہ پر ان کے یہاں اجماع منعقد ہوا ہے اور کون سا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اجماعی مسائل کی پیروی کرے گا اور اختلافی مسائل میں اجتہاد سے کام لے گا۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ وہ قیاس کے اصول و ضوابط سے واقفیت رکھتا ہو تاکہ جن فروعی مسائل کے بارے میں شارع نے سکوت اختیار کیا ہے ان کے متعلق وہ نص میں مذکور متفق علیہ اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کر سکے۔

الماوردی لکھتے ہیں:۔

"جب قاضی احکام شرعیہ کی ان چار بنیادی باتوں سے باخبر ہو تو اس کا شمار ان علماء میں ہوگا جو دین میں اجتہاد کرنے کے اہل تصور کیے جاتے ہیں۔ ایسا شخص فتویٰ بھی دے سکتا ہے اور لوگوں کے مقدمات کے فیصلے بھی کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے اہل علم سے فتوے پوچھنے اور ان سے مقدمات کا حل دریافت کرنے کا بھی مجاز ہے۔

اور اگر قاضی میں یہ صفات یا ان میں سے بعض نہ پائی جاتی ہوں تو وہ مجتہد نہیں ہوگا۔ ایسا شخص نہ مفتی ہو سکتا ہے اور نہ اسے قاضی بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے شخص کو اگر قاضی بنا دیا گیا، تو پھر وہ چاہے غلط فیصلے صادر کرے یا صحیح، بہرحال اس کی تقرری باطل ہے۔ اس کے درست فیصلوں کو بھی رد کر دیا جائے گا اور اس کے غلط فیصلوں سے جو نقصان ہوگا اس کی ذمہ داری اس شخص پر عائد ہوگی جس نے اس کو اس منصب پر مقرر کیا۔"

امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں غیر مجتہد کو بھی قاضی بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو مسائل اس کے سامنے پیش ہوں گے ان کے بارے میں وہ اہل علم سے پوچھ کر فیصلے کرے گا۔

یہ امام ابوحنیفہؒ کی انفرادی رائے ہے۔ جمہور فقہاء کا قول یہ ہے کہ غیر مجتہد قاضی کی تقرری غلط اور اس کے صادر کردہ احکام باطل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منصب قضاء کسی شخص کو ایک ضرورت کے تحت تفویض کیا جاتا ہے، لہٰذا اس پر ایسے ہی شخص کا تقرر

جائز ہے جو حق کا التزام کرنے والا ہو نہ یہ کہ وہ حق کو اپنے تابع بنانے والا ہو۔

اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھی ایسے شخص کو بھی قاضی بنانے کے قائل ہیں جو علماء سے مسائل دریافت کر کے مقدمات کے فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ (المبسوط ج ۱۶، ص ۷۲ اور حاشیہ ابن عابدین ج ۴ ص ۴۲۴)

ابن قتیبہ اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"کوئی شخص اس وقت تک قاضی نہیں بن سکتا جب تک وہ حسب ذیل پانچ اوصاف کا حامل نہ ہو:

۱۔ قاضی بنائے جانے سے پہلے وہ صاحب علم ہو۔

۲۔ اہل علم سے (علمی معاملات میں) مشورے لینے والا۔

۳۔ منصب کا حریص نہ ہو۔

۴۔ دشمن سے بھی انصاف کرنے والا ہو۔

۵۔ اجماع امت کی پیروی کرنے والا ہو۔"

منصب قضاء قبول کرنے سے علماء کا اجتناب

علماء سلف رحمہم اللہ تعالیٰ منصب قضاء قبول کرنے سے اجتناب کرتے رہے۔ اس لیے کہ یہ منصب ایک بہت بھاری ذمہ داری ہے اور متعدد احادیث میں اس منصب کے قبول کرنے والے کو اللہ کی بارگاہ میں شدید گرفت سے ڈرایا گیا ہے۔

اس سلسلے میں چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ، وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَاثْنَانِ فِي النَّارِ، فَأَمَّا الَّذِي فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضَى بِهِ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ قَضَى لِلنَّاسِ عَلَى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ)

قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک جنت میں جائے گا اور دو جہنم میں۔ جنتی قاضی وہ ہے جو حق کو پہچانے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ رہا وہ قاضی جو حق کو تو پہچانے لیکن فیصلہ صادر کرنے میں زیادتی کرے وہ دوزخی ہے۔ اسی طرح وہ قاضی جو جہالت کے باوجود فیصلے کرے وہ بھی جہنمی ہے۔

۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اکرمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ میں نے آنحضورؐ کو یہ فرماتے سنا:

لَيَأْتِيَنَّ عَلَى الْقَاضِي الْعَدْلِ سَاعَةٌ يَتَمَنَّى أَنَّهُ لَمْ يَقْضِ بَيْنَ اثْنَيْنِ فِي تَمْرَةٍ قَطُّ (رواہ احمد فی مسندہ وابن حبان فی صحیحہ)

قیامت کے دن منصف قاضی پر بھی ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ حسرت سے یہ کہے گا کہ اے کاش! میں نے دو آدمیوں کے درمیان ایک کھجور کے بارے میں بھی فیصلہ نہ کیا ہوتا۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت حمزہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

عرض کی "یا رسولؐ اللہ! مجھے کوئی ایسا منصب دیجیے جس سے میں گزر بسر کر سکوں۔" حضورؐ نے فرمایا:

یَا حَمْزَةُ نَفْسٌ تُحْيِيهَا أَحَبُّ إِلَيْكَ أَمْ نَفْسٌ تُمِيتُهَا	اے حمزہؓ! کیا تمھیں کسی شخص کو زندہ رکھنا زیادہ پسند ہے یا ہلاک کرنا؟

حضرت حمزہؓ نے جواب دیا "زندہ رکھنا۔" آپؐ نے فرمایا "تو پھر تمھیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے (یعنی کسی عہدہ کا لالچ نہیں کرنا چاہیے)۔

۴۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

مَنْ وَلِيَ الْقَضَاءَ أَوْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّينٍ۔	جو منصب قضاء پر فائز کیا گیا یا جسے لوگوں کا قاضی بنا دیا گیا اسے گویا الٹی چھری سے ذبح کیا گیا۔

(ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے یہ روایت کی ہے)

شعبی المقصد المحمود میں فرماتے ہیں کہ:

"منصب قضا ایک کٹھن آزمائش ہے۔ جو اس میں داخل ہوا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا۔ اس لیے کہ اس سے پیچھا چھڑانا بڑا مشکل ہے، لہٰذا اس سے راہِ فرار اختیار کرنا واجب ہے، خصوصاً عصر حاضر میں۔ منصب قضاء کا طلب کرنا حماقت ہے اگرچہ اس میں اجر و ثواب کی امید ہی کیوں نہ ہو۔" (تاریخ قضاۃ الاندلس ص۱)

القباہی نے اپنی کتاب "تاریخ قضاۃ الاندلس" میں متعدد ایسے علماء اور فقہاء کا ذکر کیا ہے جنھیں منصب قضاء پیش کیا گیا مگر انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ مثلاً:

ابراہیم بن محمد، مصعب بن عمران، ابان بن عیسیٰ بن دینار، قاسم بن ثابت بن عبدالعزیز الفہری، ابو عیسیٰ احمد بن عبدالملک اشبیلی، محمد بن عبدالسلام الخشنی۔ (تاریخ قضاۃ الاندلس۔ ص۱۲)

ابو قلابہ کو منصب قضاء کی پیشکش کی گئی تو وہ عراق سے بھاگ کر شام پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں جب شام کے قاضی کو معزول کیا گیا تو ابو قلابہ شام سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یمامہ جا کر دم لیا کہ کہیں انھیں شام کا قاضی نہ مقرر کر دیا جائے۔ سفیانؒ ثوری کے متعلق روایت ہے کہ ان کو منصب قضاء کی پیشکش کی گئی تو وہ بصرہ کی جانب بھاگ گئے اور وہاں چھپے رہے یہاں تک کہ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ امام ابو حنیفہؒ کے متعلق روایت ہے کہ ان کو پیٹا گیا اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا گیا، مگر انھوں نے زندگی بھر منصب قضاء قبول نہ کیا۔

ان علماء کے علاوہ بے شمار دوسرے اہل علم نے بھی اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ سیرت و سوانح کی کتابیں ان کے حالات سے بھری ہوئی ہیں۔ ان میں علماء و فقہاء بھی تھے اور محدثین اور زاہد و عابد لوگ بھی۔ ان کو مارا پیٹا گیا، گالیاں دی گئیں، قید و بند میں ڈالا گیا مگر انھوں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور اس منصب کو قبول نہ کیا بلکہ ان اذیتوں پر اللہ کے ہاں سے اجر کی توقع رکھی۔

دوسری جانب، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے یہ بھی ایک امر واقعہ ہے۔ قضاء کا منصب خلافت کے بعد ایک عظیم منصب ہے۔ انبیاء علیہم السلام

[illegible]

بکثرت احادیث میں اس عادل قاضی کی ستائش کی گئی ہے جو اللہ کے بارے میں کسی کی ملامت کی پروا نہ کرتا ہو۔ اس سلسلے میں چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيَعْمَلُ بِهَا۔

رشک صرف دو آدمیوں پر کرنا چاہیے۔ ایک تو اس شخص پر جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہوا ور اسے حق کی راہ میں لٹانے کی توفیق بھی عطا کی ہو۔ دوسرے اس شخص پر جس کو اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت سے نوازا ہو اور وہ اس خداداد حکمت کے ذریعے فیصلے کرتا ہو اور اس پر عمل پیرا ہو۔

۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا:

هَلْ تَدْرُوْنَ مَنِ السَّابِقُوْنَ إِلٰى ظِلِّ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ قَالُوْا: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: الَّذِيْنَ إِذَا عَلِمُوا الْحَقَّ قَبِلُوْهُ. وَإِذَا سُئِلُوْا عَنْهُ بَذَلُوْهُ وَإِذَا حَكَمُوْا لِلْمُسْلِمِيْنَ حَكَمُوْا كَحُكْمِهِمْ لِأَنْفُسِهِمْ۔ (رواہ احمد فی مسندہ وابو نعیم فی الحلیۃ، وابو العباس فی کتاب آداب القاضی)

کیا تمھیں معلوم ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے سائے میں آنے کے لیے کون سبقت کریں گے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "وہ لوگ کہ جب حق بات انھیں معلوم ہو جائے تو اسے قبول کر لیتے ہیں اور جب ان سے حق بات دریافت کی جائے تو اس کا ٹھیک ٹھیک اظہار کر دیتے ہیں۔ اور جب مسلمانوں کے مابین انھیں فیصلہ کرنے کے لیے کہا جائے تو ایسا فیصلہ صادر کرتے ہیں جیسے اپنی ذات کے بارے میں کر رہے ہوں۔"

۳۔ حارث بن اسامہ اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَعْدِلُ الْعَامِلِ فِيْ رَعِيَّتِهِ يَوْمًا وَاحِدًا أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الْعَابِدِ فِيْ أَهْلِهِ مِائَةَ عَامٍ أَوْ خَمْسِيْنَ عَامًا۔

(المطالب العالیۃ ج ۲ ص ۲۳۲)

حاکم کا اپنی رعیت کے بارے میں ایک روز انصاف کرنا عابد کی اپنے گھر میں صد سالہ عبادت سے افضل ہے۔ راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے سو سال فرمایا یا پچاس سال۔

۴۔ حدیث صحیح میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ۔

سات آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس روز اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا جب اس کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔

ان سات آدمیوں میں سب سے پہلے آپ نے عادل حاکم کو شمار کیا۔

بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن میں منصب قضا کو قبول کرنے اور اس میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اس لیے علماء نے دونوں قسم کی احادیث کے مابین تطبیق کی راہ نکالی ہے اور وہ یہ کہ منصب قضا کے قبول کرنے سے اس شخص کو ڈرایا گیا ہے جو خود اس کا طالب ہو (اور جب اسے وہ مطلوبہ مسند مل جائے) تو اس کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے۔ اور ترغیب اس شخص کو دلائی گئی ہے جس کو طلب کے بغیر یہ منصب مل جائے۔ اور اس منصب پر فائز ہونے کے بعد وہ بیم و رجا کی کیفیت کے ساتھ صحیح راہ پر چلتا رہے۔ میرے علم کی حد تک اس موضوع پر سب سے بہتر کتاب ابن فرحون نے لکھی ہے۔ اس کا نام "تبصرۃ الحکام" ہے۔ مصنف نے اس میں اس پہلو پر تفصیلی بحث کی ہے۔ جو حضرات مزید تحقیق چاہتے ہوں وہ اس کتاب کی طرف رجوع کریں۔

فصل دوم

اندلس میں علمی ترقی کی تحریک پہلی صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک

اندلس ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں موسیٰ بن نُصَیر کے ہاتھوں سنہ ۹۲ھ میں فتح ہوا۔ یہ ان ملکوں میں سے ہے جن کی طرف مسلمان سب سے پہلے متوجہ ہوئے اور وہاں خیر و برکت والے قرونِ اُولیٰ میں علم و ہدایت کی مشعل فروزاں کی۔ اس دور میں علماء و فقہاء اُندلس کی طرف سفر کرنے لگے۔ امیرالمومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسلام کی نشر و اشاعت میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ مفتوح ملکوں کے باشندوں کے دلوں اور دماغوں میں اسلامی عقائد کو راسخ کرنے کے متمنی تھے، چنانچہ آپ نے محدثین، فقہاء اور قرآن کے قاریوں کی ایک جماعت کو ان علاقوں کی جانب بھیجا۔ اور اس کے بعد اہلِ علم ان ملکوں کی طرف متواتر جاتے رہے۔

جب چوتھی صدی ہجری کا آغاز ہوا ——— اور یہ شیخ امام ابن الطلاع سے پہلے کا دور ہے ——— تو اُندلس علماء اور علمی اداروں کی کثرت، لائبریریوں کی بہتات اور دانشگانِ علم و معرفت سے آباد مراکز و مساجد کی بنا پر مشرقی شہروں کا ہم پلہ ہو گیا۔

امیرالمومنین الحکم المستنصر باللہ، جو سنہ ۳۵۰ھ سے سنہ ۳۶۶ھ تک سولہ سال کے لیے اُندلس کا حکمران رہا، بڑا علم دوست تھا۔ سرزمینِ اندلس میں علم و فضل کی جو روشنی پھیلی اس کا سہرا بڑی حد تک اسی علم دوست خلیفہ کے سر ہے۔ اس نے علماء کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے اکرام و احترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ اہلِ علم کو مشرقی ممالک سے کھینچ کھینچ کر لایا۔ اس نے لائبریریاں قائم کیں اور دین، ادب، فلسفہ اور دوسرے مختلف علوم و فنون پر بغداد سے کتابیں منگوائیں۔ الحکم علم دوستی میں خلیفہ المامون سے مشابہت رکھتا تھا، چنانچہ مشہور مورخ المقری[1] خلیفہ الحکم کی تعریف میں لکھتا ہے:

"الحکم علم دوست اور اہلِ علم کا قدردان تھا۔ مختلف علوم و فنون کی کتابیں جمع کرنے کا اسے اس قدر شوق تھا کہ اس سے پہلے بادشاہوں میں سے کسی نے اس قدر کتابیں جمع نہیں کی تھیں۔" (نفح الطیب للمقریؒ ج ۱ ص ۳۶۱)

امام ابو محمد ابن حزم متوفّیٰ سنہ ۴۵۶ھ پانچویں صدی ہجری کے معروف ترین علماء میں سے ہیں۔ وہ اُندلس کی علمی تحریک کے بارے میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"الحکم کی لائبریری میں چوالیس ۴۴ فہرستیں تھیں اور ہر فہرست بیس اوراق پر مشتمل تھی۔ ان میں صرف کتابوں کے نام

---

[1] المُقَّرِی بفتح المیم وتشدید القاف اس کا صحیح ترین تلفظ ہے۔ ان کا نام احمد بن محمد، کنیت ابوالعباس اور نسبت المُقَّرِی ہے تلمسان میں پیدا ہوئے۔ پہلے فاس اور پھر قاہرہ میں رہائش رکھتے تھے۔ سنہ ۱۰۴۱ھ میں وفات پائی۔

درج تھے۔ (نفح الطیب ج ۱ ص ۶۲ ۳۶۲)

آگے چل کر ابن حزم صرف ان کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو علوم الحدیث سے متعلق تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں علم کا دائرہ کس قدر وسیع تھا۔ جب علوم الحدیث پر اس قدر کتابیں موجود تھیں تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے موضوعات مثلاً لغت، ادب، تاریخ وغیرہ سے متعلق کتابیں کتنی تعداد میں ہوں گی!

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

"ابن حزم کو کسی کا یہ قول بتایا گیا کہ امام مالک کی کتاب "المؤطا" حدیث میں سب سے بہتر تصنیف ہے۔ وہ کہنے لگے "نہیں"، سب سے زیادہ قابل تعظیم تو صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں اور پھر اس کے بعد مندرجہ ذیل کتب:۔

(۱) صحیح سعید بن السکن (۲) المنتقیٰ لابن الجارود (۳) المنتقیٰ لقاسم بن اصبغ (۴) ابو داؤد (۵) النسائی (۶) مصنف قاسم بن اصبغ (۷) مصنف الطحاوی (۸) مصنف البزار (۹) مسند ابن ابی شیبہ (۱۰) مسند احمد بن حنبل (۱۱) مسند ابن راہویہ (۱۲) مسند طیالسی (۱۳) مسند حسن بن سفیان (۱۴) مسند سنجر (۱۵) مسند عبد اللہ بن محمد السندی (۱۶) مسند یعقوب بن شیبہ (۱۷) مسند علی بن المدینی (۱۸) مسند ابن ابی عرفۃ اور اسی طرح کی دوسری وہ کتب جو صرف احادیث نبویہ پر مشتمل ہیں۔

ان کتابوں کے بعد ان کتابوں کا درجہ ہے جن میں احادیث نبویہ کے ساتھ ساتھ علماء و ائمہ کے اقوال و آثار بھی ہیں۔ مثلاً:

(۱) مصنف عبد الرزاق (۲) مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ (۳) مصنف تقی بن مخلد (۴) کتاب محمد بن نصر المروزی (۵) کتاب ابی بکر بن المنذر الاکبر او ر الاصغر (۶) مصنف حماد بن سلمہ (۷) مصنف سعید بن منصور (۸) مصنف وکیع (۹) مصنف فریابی (۱۰) مؤطا امام مالک (۱۱) مؤطا ابن ابی ذئب (۱۲) مؤطا ابن ابی وہب (۱۳) مسائل احمد بن حنبل (۱۴) فقہ ابی عُبَید (۱۵) فقہ ابی ثور۔"

(نفح الطیب ج ۴ ص ۱۶۱، ۱۷۰، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۱۵۴)

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس دور میں دوسرے علوم سے متعلق کتنی کثیر تعداد میں کتابیں موجود ہوں گی مثلاً مندرجہ ذیل علوم:۔ علوم التفسیر، شروح الحدیث، ادب، لغت، معانی، بیان، تاریخ، فقہ اور دیگر علوم سے متعلق کتابوں کی فہرستوں سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ سر زمین اندلس اس دور میں علم و فضل کی معراج پر تھی اور اس ضمن میں اس کا مقام کسی طرح بھی مشرق کے اسلامی ممالک سے کم نہ تھا۔

امام ابن حزم نے یہاں صرف وہ کتابیں شمار کی ہیں جو فتنہ بربر کے زمانہ میں ضائع ہونے سے بچ رہیں۔ یہ فتنہ ۳۹۹ھ سے ۴۰۳ھ تک بپا رہا۔ ابن خلدون اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"عبد الرحمٰن الناصر کے دورِ خلافت میں جو لائبریری تھی وہ قرطبہ کے محل میں محفوظ رہی یہاں تک کہ بربروں نے جب قرطبہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت ان میں سے اکثر کتابیں فروخت کر دی گئیں۔ اور منصور بن ابی عامر کے آزاد کردہ غلام

واضح نے جو صاحب کے منصب پر فائز تھا ان کتابوں کو دہاں سے نکالنے کا حکم دیا جب بربر قرطبہ میں داخل ہو گئے تو لوگ باقی ماندہ کتابیں لوٹ کر لے گئے۔" (تاریخ ابن خلدون ج ۴ ص ۱۴۷)

اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام ابن حزم نے جس علمی خزانے کا ذکر کیا ہے اس کی کچھ کتابیں الشیخ ابن القطلاع کے ہاتھ بھی لگی ہوں گی اور ان سے انھوں نے استفادہ بھی کیا ہو گا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں ان میں سے بعض کے حوالے بھی دیے ہیں اور ان سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کے مؤلفین کا مختصر تعارف بھی آپ کو ملے گا۔

جب اہل ہسپانیہ کے ہاتھوں سرزمین اندلس کے آخری شہر غرناطہ کا ۸۹۷ھ (مطابق ۱۴۹۲ء) میں سقوط ہوا اس وقت بھی اندلس کے مختلف شہر علوم و فنون بالخصوص علوم اسلامیہ پر مشتمل کتب سے مالا مال تھے جس کی وجہ سے ملکہ کے لاٹ پادری کارڈینل خمنیس نے ان علمی آثار کو بالکل مٹا دینے کا تہیہ کر لیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ کتابیں آئندہ نسلوں کو روحانی اور عقلی غذا فراہم کریں گی، چنانچہ اس پادری نے غرناطہ اور اس کے گرد و نواح سے ان کتابوں کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ تعمیل حکم میں کتابیں اکٹھی کی گئیں اور غرناطہ کے میدان میں ان کے بڑے بڑے ڈھیر لگا دیے گئے اور ان کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

اس کے بعد بھی سپین کی (عیسائی) حکومت عربی کتابوں کو تلاش کر کر کے ان کو ضائع کرنے کے مسلسل درپے رہی، حتیٰ کہ جن عربوں نے مجبور ہو کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا ان کے لیے عربی زبان ممنوع قرار دے دی گئی اور سرکاری و غیر سرکاری امور میں قشتالی زبان لازمی قرار دے دی گئی۔ اس کے بعد بچی کھچی کتابوں کو اکٹھا کر کے ان کو اسکوریال کے محل میں پہنچا یا گیا تاکہ ان کو وہاں کی شاہی لائبریری میں رکھ دیا جائے۔ ۱۶۷۱ء میں "اچانک" وہاں آگ بھڑک اٹھی جس نے اس عظیم خزانے کو بھسم کر دیا۔ صرف دو ہزار سے کچھ زیادہ مخطوطے کسی طرح اس آگ کی نذر ہونے سے بچ رہے۔ (الآثار الاندلسیۃ الباقیۃ ص ۴۴۰-۴۴۳)

اندلس کی سرزمین اپنے طبعی مناظر، اونچے اونچے پہاڑوں، رواں نہروں اور پھلدار اور سایہ دار درختوں کی بنا پر جنت نظیر تھی اور قلم اس کی منظر کشی سے قاصر ہے۔

اندلس میں جگہ جگہ علمی مراکز پائے جاتے تھے جو ہر رنگ اور ہر نسل کے طلبہ سے آباد تھے۔ یہ طلبہ مختلف قسم کے مفید علوم و فنون سے اپنی جھولیاں بھرنے کے لیے کشاں کشاں وہاں چلے آتے تھے۔

اندلس میں بے شمار مساجد تھیں جو ذکر و فکر میں مشغول رہنے والے ہزاروں نمازیوں سے ہمیشہ آباد رہتی تھیں۔ اندلس کی اصل رونق اور شان و شوکت ان محدثین، فقہاء، ادباء، شعراء، اطباء، تراجم اور دوسرے علوم کے ماہرین کے دم قدم سے تھی۔ دین اسلام نے اپنی تاریخ کے آغاز ہی سے سرزمین اندلس میں اپنے خیمے گاڑ دیے تھے۔ چنانچہ یہ زمین اسے پسند آگئی اس نے اسے اپنا وطن بنا لیا کیونکہ اندلس کے رہنے والوں نے دین اسلام کو عزت و احترام اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ آٹھ صدیوں کی طویل مدت میں یہ بات کبھی اسلام کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ اس کو اس فردوس ارضی سے یوں جلا وطن کیا جائے گا۔

مگر اللہ تباہ کرے اس جاہلی عصبیت کو جو قیسی، یمنی، اموی، عباسی، عربی اور بربری قبائل میں پائی جاتی تھی۔ یہ قبائل اندرونی اختلافات اور خاندانی جھگڑوں میں اُلجھے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور اہلِ اسلام کو وہ سرزمین چھوڑنی پڑی۔ اور تعداد کی کثرت اور وسائل و ذرائع کی فراوانی کے باوجود ان میں سے کتنی لوگوں نے عیسائیت کو اختیار کر لیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ نہ تو وہاں کوئی رونے والی آنکھ باقی رہی اور نہ ہی کوئی ہمیشہ رہنے والی یادگار۔ اسلام اور اس کی عظیم تہذیب کے تمام آثار کو ایک ایک کر کے محو کر دیا گیا، کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا، اور مساجد کو مسمار کر کے میدانوں اور منڈیوں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

پانچویں صدی ہجری میں اُندلس کی سیاسی حالت

چوتھی صدی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں اُندلس میں اس اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس نے دمشق سے اپنا اثر و نفوذ پھیلا کر پورے عالم پر دو صدیوں تک بڑی قوت و شوکت کے ساتھ حکومت کی تھی۔ یہ حکومت ماضی میں مسلسل ترقی کرتی رہی اور اس کے عہد میں سرزمینِ اندلس درس گاہوں اور مسجدوں کی کثرت و فراوانی کے باعث اسلامی تہذیب کا مرکز اور دین کی زینت قرار پائی۔ اس دور میں محدثین، مفسرین، فقہاء، قاضی اور مختلف علوم و فنون مثلاً طب، حکمت، علم معانی و بیان کے ماہرین علم کی نشر و اشاعت میں حصہ لینے کے لیے اندلس کی جانب کشاں کشاں چلے آتے تھے۔ اس زمانے میں اندلس کو وہ عروج حاصل ہوا کہ مشرقی ممالک تقریباً پس منظر میں چلے گئے۔

مگر پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں مسلمانوں میں خانہ جنگی رُونما ہونے کی وجہ سے اندلس کی مرکزی حکومت چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئی۔ آگے چل کر ادریسی، جن کو بنو حمود بھی کہا جاتا ہے، اس پر قابض ہو گئے۔ ادریسی مالقہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ تک پہنچتا ہے۔ ادریسیوں نے تیسری صدی ہجری میں مغرب میں ایک حکومت قائم کی تھی جس کا دارالحکومت فاس تھا۔ اندلس کی اموی حکومت کے ہاتھوں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خاندان مصر، مغرب اور اندلس میں منتشر ہو گیا۔

لیکن جب اندلس میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکی تو ادریسی خاندان کا ایک شخص علی بن حمود بعض متحارب گروہوں پر تسلط حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ شخص اس سے پہلے افریقی لشکر کا سپہ سالار تھا۔ اس کا بھائی قاسم بن حمود، ہشام المؤید کے دورِ خلافت میں جزیرہ اور مالقہ کا حاکم رہ چکا تھا۔ سنہ ۴۰۷ھ میں علی سپین کا حکمران بن گیا۔ اس وقت سے ادریسیوں کو اندلس میں علوی یا بنی حمود کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اگرچہ علی بن حمود حاکم بننے کے بعد صرف دو سال زندہ رہا تاہم اس نے اپنے خاندان کے لیے حکومت کی بنیاد رکھ دی اور وہ سنہ ۴۶۲ھ تک تخت پر متمکن رہے۔ بعد میں جزیرہ اور مالقہ کے سقوط کے ساتھ ان کی حکومت ہسپانیہ میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اندلس میں عظیم فاتح یوسف بن تاشفین کے ہاتھوں مرابطین کی حکومت قائم ہوئی۔ اپنے دشمنوں کے ساتھ ——— جن میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مسلمان اور عیسائی حکمران شامل تھے ——— زبردست جنگوں کے بعد سلطان یوسف نے سنہ ۴۸۴ھ میں پورے اندلس پر قبضہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس کی وہ مسلمان حکومت جو مسلمانوں کی غفلت اور مخصوص

مفادات رکھنے والوں کی خود غرضی کی بنا پر ختم ہونے کو تھی، از سرنو ایک اسلامی مملکت بن گئی۔ اب پورا جزیرہ نمائے اندلس سلطان یوسف کے زیر نگین آگیا۔ سلطان نے ملت اسلامیہ کو اخلاقی و سیاسی زوال سے بچایا اور مسلمانوں کو عیسائیوں اور چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان یوسف اندلس میں تاریخ اسلام کے جدید فاتح تھے۔

سلطان نے اپنی وسیع و عریض سلطنت میں ہر طرف اسلامی سطوت و عظمت کے جھنڈے نصب کر دیے تھے۔ یہ سلطنت ایک طرف بحر اطلانتک سے مصر تک، دوسری طرف بحر ابیض سے نائیجیریا تک (بشمول صحرائے اعظم) اور تیسری طرف اندلس میں دریائے ایبرو سے لے کر وادی کبیر کے دہانہ اور آبنائے جبل الطارق تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان یوسف بن تاشفین نے سنہ ۵۰۰ھ میں تقریباً سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی پوری عمر کارہائے نمایاں انجام دیتے ہوئے گزری۔

(دیکھیے تاریخ ابن خلکان ج ۴ ص ۳۶۶ ، ۳۲۱ ، ۴۴۵۔ الکامل لابن الاثیر ج ۱۰ ص ۴۱۔ نفح الطیب للمقری ج ۲ ص ۲۷۔ صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۱۸۹ ، ۱۹۴۔ تاریخ الاندلس از جرمن مورخ یوسف اتباخ ص ۲۶)

سلطان یوسف علم اور علماء سے محبت اور دین اسلام کے ساتھ اخلاص رکھتا تھا۔

ابن اثیر نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

"سلطان اعلیٰ کردار کا مالک، نیکی پسند اور منصف مزاج تھا۔ اہل دین اور اہل علم حضرات سے دلی رغبت رکھتا، ان کا بڑا احترام کرتا اور ان کے مشوروں پر عمل کرتا تھا۔ جب وہ اندلس پر قابض ہوا تو اس نے فقہا کو اپنے ہاں بلا کر ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ علماء و فقہاء نے مشورہ دیا کہ خلیفہ بغداد کی جانب سے آپ کو حکمرانی کا اجازت نامہ ملنا چاہیے تاکہ سب لوگوں پر آپ کی اطاعت واجب ہو، چنانچہ سلطان نے امیرالمومنین خلیفہ مستظہر باللہ کے پاس ایک قاصد بہت سے تحائف دے کر بھیجا۔ اس کے پاس خلیفہ کے نام ایک خط تھا جس میں سلطان کی فتوحات اور اسلامی خدمات کا ذکر تھا اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کہ اسے اندلس کی حکمرانی کا اجازت نامہ عنایت کیا جائے، چنانچہ دربار خلافت کی طرف سے تحریری اجازت نامہ آگیا۔ مزید برآں خلعت سلطانی اور امیرالمومنین کے لقب سے اسے نوازا گیا۔ سلطان اس سے بہت خوش ہوا۔"

ابن الاثیر مزید لکھتے ہیں:۔

"سلطان یوسف نے مرابطین کے لیے مراکش کا شہر آباد کیا۔ وہ سنہ ۵۰۰ھ تک حکمران رہا اور اسی سال وفات پائی۔ سلطان کے بعد اس کا بیٹا علی بن یوسف تخت نشین ہوا تو اسے بھی امیرالمومنین کا لقب دیا گیا۔ وہ علماء کا پہلے سے بھی زیادہ احترام کرنے لگا اور ان کے مشوروں پر چلنے لگا۔ جب کوئی شخص اسے نصیحت کرتا تو سلطان علی بن یوسف اس کی بات نہایت انکساری اور توجہ سے سنتا، اس کا دل نرم ہو جاتا اور اس کے آثار اس کے چہرہ پر نمایاں ہو جاتے۔"

امام ابن الطلّاع کے بعض معاصرین

یہاں ہم اسلامی علوم و فنون کے چند ایسے ماہرین کا تذکرہ کرتے ہیں جو امام ابن الطلاع کے ہم عصر تھے اور ان کے علوم و معارف سے امام نے بھرپور استفادہ کیا اگرچہ ان میں سے بعض حضرات ان کے باقاعدہ استاد نہ تھے۔

ان علماء و فضلاء کا ذکر ان کے سال وفات کی ترتیب سے حسب ذیل ہے:۔

۱۔ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عثمان بن سعید متوفی ۴۲۴ھ۔ یہ طلیطلہ کے رہنے والے تھے، بہت بڑے فاضل، عابد و زاہد، متواضع، متقی اور عالم باعمل تھے۔

۲۔ ابومحمد عبدالعزیز بن احمد متوفی ۴۲۶ھ۔ آپ لغت و ادب میں اپنے زمانہ کے منفرد عالم تھے۔

۳۔ عبداللہ بن یحییٰ بن احمد المعروف ابن دحون متوفی ۴۳۱ھ۔ قرطبہ کے رہنے والے اور وہاں کے عظیم محدث و فقیہ تھے۔

۴۔ محمد بن احمد عبداللہ بن محمد الباجی اللخمی متوفی ۴۳۳ھ۔ اشبیلیہ کے رہنے والے عظیم فقیہ تھے۔ شروط اور علم الوثائق (دستاویزات) میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر آپ نے ایک نہایت عمدہ کتاب تحریر کی جس پر حکام اعتماد کرتے ہیں۔

۵۔ عبداللہ بن احمد بن محمد انصاری مالکی متوفی ۴۴۳ھ بہت بڑے عالم فاضل، عابد و زاہد اور متواضع تھے۔

۶۔ قاضی ابوالولید الباجی متوفی ۴۴۴ھ۔ عظیم متکلم، مفسر، فقیہ اور محدث تھے۔ موطا کی شرح المنتقی ان کی بڑی وقیع تصنیف ہے۔

۷۔ مروان بن علی الاسدی القطان متوفی ۴۴۴ھ۔ ان کی رہائش قرطبہ میں تھی اور البونی کے نام سے معروف تھے۔ بہت بڑے محدث و فقیہ تھے۔ انھوں نے ایک ضخیم کتاب مؤطا امام مالک کی شرح میں لکھی ہے۔

۸۔ عثمان بن سعید بن عمر الاموی ابوعمرو الدانی متوفی ۴۴۴ھ۔ اپنے عہد کے یکتائے روزگار حافظ حدیث تھے۔

۹۔ عبداللہ بن یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ۔ اندلس کے عظیم حافظ حدیث تھے۔ آپ "التمہید" اور "الاستیعاب" کے مصنف ہیں۔

۱۰۔ العلاء بن عبدالوہاب بن احمد بن عبدالرحمٰن بن سعید بن حزم متوفی ۴۵۴ھ۔ یہ عظیم عالم اور ادیب تھے۔

۱۱۔ محمد بن ابراہیم انصاری المعروف ابن شق اللیل متوفی ۴۵۵ھ۔ بہت بڑے حافظ حدیث اور فقیہ تھے۔

۱۲۔ احمد بن مغیث بن احمد بن مغیث الصدفی متوفی ۴۵۹ھ۔ علم الفرائض، لغت، نحو اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ انھوں نے "المقنع" نامی کتاب تصنیف کی ہے۔

۱۳۔ عمر بن حسن ابوحفص الہوزنی متوفی ۴۶۰ھ۔ عظیم عالم اور فاضل محدث تھے۔

۱۴۔ عبدالوہاب بن محمد بن عبدالوہاب بن عبدالقدوس القرطبی متوفی ۴۶۱ھ۔ قرطبہ کے رہنے والے قاری تھے۔ انھوں نے فن قرارت میں "المفتاح" تحریر کی۔

۱۵ - موسیٰ بن نُدَیل بن محمد بن تاجیت البکری القرطبی المعروف ابن ابی عبدالصمد متوفّٰی ۴۶۲ھ - عظیم عالم اور با فضل تھے۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ متواضع اور منکسر المزاج تھے۔

۱۶ - عبدالعزیز عبداللہ بن بقلہ السعدی الشاطبی متوفّٰی ۴۶۵ھ۔ آپ نے ابوعلیہ کی کتاب "غریب الحدیث" کو حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کیا۔

۱۷ - ابومروان ابن حیّان القُرطبی متوفّٰی ۴۶۹ھ۔ مشہور مؤرخ تھے۔ انھوں نے "المقتبس من ابناء اھل الاندلس" تصنیف کی۔

۱۸ - احمد بن محمد رزق الاموی ابوجعفر متوفّٰی ۴۷۷ھ۔ عظیم فقیہ، حافظِ حدیث اور صاحب بصیرت تھے۔ ان کے مشوروں کو اس دور میں خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔

۱۹ - عیسیٰ بن سہل بن عبداللہ الاسدی ابوالاصبغ۔ اہلِ حیّان میں سے ہیں۔ قرطبہ میں رہائش پذیر تھے۔ ۴۸۶ھ میں وفات پائی۔ ابن بشکوال کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن سہل عظیم فقیہ، حافظِ حدیث اور عالم تھے۔ عصری مسائل میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ انھیں نئے نئے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے اور دینی احکام کی معرفت میں دستگاہ حاصل تھی۔

۲۰ - عبدالملک بن سراج بن عبداللہ بن محمد بن سراج القُرطبی متوفّٰی ۴۸۹ھ - یہ اندلس کے یکتائے روزگار امام لغت تھے۔

۲۱ - عبدالعزیز بن محمد بن عتّاب بن محسن ابوالقاسم القرطبی متوفّٰی ۴۹۱ھ۔ بہت بڑے حافظ، فقیہ اور مفتی تھے۔

۲۲ - حسین بن محمد بن احمد الغسانی متوفّٰی ۴۹۸ھ۔ آپ قرطبہ کے رئیس المحدثین تھے۔ وہاں کے علماء کبار میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے راویوں کے حالات پر کتاب "تقیید المھمل و تمییز المشکل" تصنیف کی۔

امام ابن الطلّاع کا وطن

قُرطُبہ[1] یہ امام ابن الطلّاع اور ان سے پہلے اور بعد میں آنے والے سینکڑوں اہلِ علم و فضل بزرگوں کا وطن ہے۔ جب سے قیصرِ روم نے اس کا سنگِ بنیاد رکھا اس وقت سے یہ نہایت اہم شہر رہا ہے۔ دورِ جاہلیت میں یہ اندلس کا پایۂ تخت رہا۔ پھر اندلس میں اسلام کے ورود مسعود کے بعد یہ اس عظیم اسلامی سلطنت کا دارالحکومت قرار پایا۔ (نفح الطیب ج ۲ ص ۲۰)

---

[1] قرطبہ کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ قلقشندی نے بضمّ القاف وسکون الراء وضمّ الطاء یعنی قُرْطُبہ نقل کیا ہے۔

(صبح الاعشٰی ج ۵ ص ۲۲۶)

ابوعُبَید البکری ظاء معجمہ کے ساتھ اس کو قُرظُبہ ضبط کرتے ہیں۔ ابومحمد عبداللہ بن ابراہیم الحجاری مصنف "المسہب فی غرائب المغرب" کہتے ہیں کہ یہ طاء مہملہ کے ضمّہ کے ساتھ ہے۔ جب کہ اہلِ مشرق کے نزدیک طاء پر کسرہ ہے اور بعض کے نزدیک یہ طاء نہیں ظاء ہے۔ (نفح الطیب ج ۲ ص ۸)

یاقوت حموی نے اس کو قلقشندی کی طرح ضبط کیا ہے۔ (دیکھیے معجم البلدان ج ۴ ص ۳۲۴)

ابنِ حیّان، رازی اور الحجاری ذکر کرتے ہیں کہ قیصر روم ثانی تنبان نے دنیا کے اکثر ممالک فتح کیے اور اسی کے عہد سے رومیوں نے اپنی تاریخ کا آغاز کیا، اس کا دور مسیح علیہ السلام سے اڑتیس برس قبل تھا۔ اس نے اندلس میں بڑے بڑے شہر آباد کرنے کا حکم صادر کیا، چنانچہ اس کے دور میں قرطبہ، اشبیلیہ، ماردہ اور سرقسطہ جیسے عظیم شہر آباد ہوئے۔ علامہ الحجاری کہتے ہیں کہ ــــــــــ تنبان نے اپنے چار امراء کو اندلس میں والی بنا کر بھیجا۔ اور ان میں سے ہر شخص نے اپنے اپنے علاقہ میں ایک ایک شہر آباد کیا اور اس کو اپنے نام سے موسوم کیا۔ گویا ان چاروں شہروں کے نام دراصل ان کی تعمیر کرانے والے امراء کے ناموں پر تھے۔ الحجاری کے علاوہ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ یہ نام ان شہروں کے موقع و محل کی بنا پر تجویز کیے گئے تھے۔ علماء نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ قرطبہ میں مختلف رومی گورنر یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار رہے۔ آخر میں بنو عبیس بن اسحاق ابن ابراہیم اس کے حکمران بنے اور ان کا دور اس وقت تک رہا جبکہ یافث کی اولاد میں سے القوط نے یہ شہر ان سے چھین لیا۔ اور وہاں بنی القوط کی حکومت اس وقت تک رہی جب مسلمانوں نے انہیں شکست دے کر قرطبہ پر قبضہ کر لیا اور اسے اندلس کا پایۂ تخت بنا دیا۔ مسلمانوں نے اس شہر کی تعمیر و ترقی میں اس حد تک دلچسپی لی کہ یہ اندلس کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔

ابن حوقل کہتے ہیں:۔

"قرطبہ اندلس کا سب سے بڑا شہر ہے اور آبادی کی کثرت اور رقبہ کی وسعت کے اعتبار سے مغرب کا کوئی شہر اس کے برابر نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر بغداد کے دو حصوں میں سے ایک حصہ کے برابر یا اس کے لگ بھگ ہے۔"

(معجم البلدان ج ۴ ص ۳۲۴)

یاقوت حموی قرطبہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"قرطبہ اندلس کے وسط میں واقع ہے، وہ اس ملک کا ایک عظیم شہر ہے۔ یہ اندلس کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ چنانچہ اموی حکمران اسی شہر میں رہتے تھے۔ یہ شہر بے شمار علماء و شرفاء کا مولد و مسکن ہے۔" (حوالہ سابق)

علماء میں سے بعض نے لکھا ہے:۔

"قرطبہ اندلس کا مرکز و محور اور اس کا قصرِ اعظم ہے۔ یہ ام البلاد ہے۔ خلفاء نے اسے اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا یہ شہر عیسائیت اور اسلام دونوں کے عہد میں اندلس کا دار السلطنت رہا ہے۔ قرطبہ علم و فضل کا مرکز اور اہل السنۃ والجماعۃ کا مسکن رہ چکا ہے۔ اس میں تابعین کی ایک جماعت سکونت پذیر رہی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض صحابہ بھی اس میں رہائش پذیر رہے مگر اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔" (نفح الطیب ج ۲ ص ۸)

رازی لکھتے ہیں:۔

"قرطبہ قدیم و جدید عہد اور دورِ اسلام و جاہلیت کے اندلس کا مرکزی شہر اور پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ اس کا دریا اندلس کے تمام دریاؤں سے بڑا ہے۔ اس پر وہ پل ہے جو کاریگری اور مضبوطی کے اعتبار سے دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اس شہر میں وہ جامع مسجد پائی جاتی ہے جس سے بڑی مسجد اندلس بلکہ پورے عالمِ اسلام میں کہیں موجود نہیں۔" (حوالہ سابق)

الحجاری قرطبہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :

”قرطبہ بنو مروان کے دورِ حکومت میں اسلام اور علم و فضل کا مرکز تھا۔ جلیل القدر علماء یہاں رہتے تھے۔ یہ مروانی حکومت کا پایۂ تخت تھا۔ معدی اور یمانی قبائل کی سربرآوردہ شخصیتیں اس شہر میں بود و باش رکھتی تھیں۔ شعر و شاعری کی روایت کے سلسلہ میں لوگ قرطبہ کا رُخ کیا کرتے تھے۔ یہ شہر اشراف کا مرکز اور علماء کا مسکن تھا۔ لوگ یہاں سے اپنے سینے بھی علم سے بھر کر لے جاتے اور تھیلے بھی۔ یہاں کے اہلِ علم مرتبہ میں فوجی افسروں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اس کے میدان آلاتِ جنگ کا ذخیرہ، تیز رفتار گھوڑوں کا مرجع اور نیزوں کی آماجگاہ تھے۔ قرطبہ کو اندلس میں وہی حیثیت حاصل تھی جو سر کو انسان کے بدن میں اور سینے کو شیر کے جسم میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اندرونی حصہ کشادہ اور بیرونی منظر پرکشش اور دیدہ زیب تھا۔ اسے بار بار دیکھنے سے آنکھوں کو سکون ملتا تھا۔“ (حوالہ سابق)

فصل سوم

تعارفِ مؤلف

ابن الطلاع کا دور

پچھلے صفحات میں ہم نے ان سیاسی اضطرابات، اندرونی خلفشار اور خانہ جنگیوں کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے اندلس چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں تباہی و بربادی سے دوچار رہا۔ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں جب یوسف بن تاشفین نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو اندلس میں دوبارہ امن قائم ہوا۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے اور اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جہاں تک علمی و فکری تحریک کا تعلق ہے وہ سیاسی حالات سے متاثر ہوئے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن رہی۔ ابن الطلاع اور ان سے کچھ پہلے کے دور میں علوم و فنون اوجِ کمال کو پہنچ گئے تھے مختلف علوم و فنون مثلاً فلسفہ، منطق اور الٰہیات پر مشتمل کتابیں دوسری زبانوں سے عربی میں منتقل کی جا رہی تھیں۔ اس دور کے قدآور اہلِ علم اور اہلِ قلم کی علمی تخلیقات اور ان کا فکری سرمایہ واقعی بے نظیر ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ابن الطلاع کا عہد دوسرے اسلامی ادوار کے مقابلہ میں علمی طور پر زیادہ پرکشش اور ترقی یافتہ تھا۔ چنانچہ مشرق میں بغداد اور مغرب میں قرطبہ یورپ و دنیا کے شہروں کی نسبت تہذیب و ترقی میں بہت آگے تھے۔ اس سے پہلے ادوار میں تاریخ میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ان جلیل القدر علماء نے جو فکری ورثہ چھوڑا امام ابن الطلاع نے اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ جن علمی مراجع تک ابن الطلاع کو رسائی حاصل ہوئی ان کی حیثیت ایک ایسی یادگار کی ہے جن کے نام تو ہم علماء کی تصانیف اور علوم اسلامیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ، ادب، لغت اور دوسرے علوم و فنون کی کتابوں کی فہرستوں میں پڑھتے ہیں، مگر عصرِ حاضر کی لائبریریوں میں ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اہلِ ہسپانیہ نے اسلامی کتب کو جلانے، ان کو ضائع کرنے اور سرزمینِ اندلس سے ان کا نشان تک مٹانے کے سلسلہ میں کس قدر تعصب سے کام لیا حتٰی کہ کورڈیال نے ایک لاکھ کتابیں نذرِ آتش کر دی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تاتاریوں نے عراق و شام میں لٹریچر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔

حسب و نسب

ابوعبداللہ محمد بن فرج المعروف بابن الطلاع کے والد فرج محمد بن یحییٰ البکری (الطلاع) کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اسی لیے ان کو ابن الطلاع کہا جاتا ہے۔ مجھے اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ البکری کو طلاع کیوں کہتے تھے۔

"الدیباج" میں غلطی سے ابن الطلاع کے بجائے ابن الکلاع لکھا گیا ہے۔ (دیکھیے الدیباج ص ۲۷۵)

اندلسی کتب کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابن الطلاع کا تعلق کسی علمی و ادبی خاندان سے نہ تھا۔ نہ ہی

ان کے والد اور ان کے آزاد کرنے والے محمد بن یحییٰ البکری کا نام علمی حلقوں میں معروف تھا، لہٰذا ابن الطلاع کی علمی شہرت ان کے حسب نسب کی مرہونِ منت نہیں، بلکہ یہ شہرت ان کی انتھک کاوشوں اور فنا فی العلم ہونے کی بنا پر حاصل ہوئی۔ اس سے اسلام کی عظمت بھی واضح ہوتی ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام میں فضیلت کا معیار حسب نسب نہیں بلکہ علم و تقویٰ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلۃ - ۱۱)	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جن کو علم عطا کیا گیا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے گا۔

دوسری جگہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔ (الحجرات - ۱۳)	لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور باہمی تعارف کے لیے تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے اور خدا کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار رہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَبْطَأَ بِهٖ عِلْمُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ (رواہ احمد)	جس کا علم اسے پیچھے ہٹا دے اس کا حسب نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔

ولادت

ابن الطلاع کے تمام سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی ولادت ۴۰۴ھ میں ہوئی۔ سیرت نگاروں کے یہاں اس بات میں بھی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ ان کی ولادت قرطبہ میں ہوئی۔ اگرچہ بعض مورخین نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ ابن الطلاع کے سن ولادت پر مورخین کا اتفاق ایک خلاف معمول بات ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کوئی نہیں جانتا کہ اسے کتنی شہرت حاصل ہوگی، لیکن جب اس کی موت واقع ہوتی ہے تو وہ شہرت کا حامل ہو چکا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اس وقت اٹھنا شروع ہوتی ہیں جب وہ درجۂ کمال کو پہنچ چکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے جلیل القدر علماء کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔

نشوونما

ابن الطلاع کے بچپن کے بارے میں ہمیں صرف اتنا معلوم ہے جو ابن بشکوال نے لکھا ہے کہ وہ حافظِ قرآن تھے اور قرآن کریم کی تلاوت اکثر کیا کرتے تھے۔ ان کے حفظِ قرآن کی کوئی خاص وجہ تو معلوم نہیں ہو سکی البتہ اس کا ایک سبب معلوم ہے اور وہ یہ کہ اندلس کے تعلیمی نظام میں حفظِ قرآن کا عام رواج تھا۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ کی اکتیسویں فصل میں اس بات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:-

"بچے کو قرآن کی تعلیم دینا ایک دینی شعار ہے اور اہل اسلام تمام ممالک میں اس پر عمل پیرا رہے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن و حدیث

کی تعلیم سے ابتدائیات و عقائد بچے کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ مختلف ملکوں میں قرآن کریم تعلیم کی اساس قرار پایا ہے۔ جہاں تک اہل اندلس کا تعلق ہے تو وہ تو بچے کی تعلیم کا آغاز ہی قرآن کی تعلیم سے کرتے ہیں۔" (مقدمہ ابن خلدون ص ۵۳۸)

حفظِ قرآن کے بعد ابن الطلاع نے اندلس کے علماء سے مالکی فقہ پڑھنی شروع کی۔ اس لیے کہ وہاں مالکی فقہ ہی عام طور پر رائج تھی اور اندلس کی حکومت کا سرکاری مسلک بھی یہی تھا۔ امام ابن حزم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"دو فقہی مسلک حکومت اور اقتدار سے پھیلے۔ ان میں سے ایک امام مالک کا مسلک ہے جو اندلس میں پھیلا اور دوسرا حنفی مسلک جس کی اشاعت مشرق میں ہوئی۔" (نفح الطیب ج ۲ ص ۱۰)

چنانچہ اس فقہی رجحان کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ ابن الطلاع سب سے پہلے مالکی فقہ کے اصول و فروع میں ماہرانہ بصیرت حاصل کرتے۔

شیوخ و اساتذہ

ابن الطلاع نے اپنے دور کے بے شمار علماء سے استفادہ کیا۔ ان کا احصا تو ان اوراق میں نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان میں سے بعض کا ذکر ان کے سالِ وفات کی ترتیب سے کیا جاتا ہے:

۱۔ حسن بن ایوب بن محمد بن ایوب انصاری المعروف بالحداد (م ۴۲۸ھ) یہ حدیث و لغت کے مشہور راوی تھے۔ مشاورت میں ان کی رائے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ ("الصلۃ" ص ۷۴)

۲۔ یونس بن عبداللہ بن محمد بن مُغیث (م ۴۲۹ھ) یہ قرطبہ کے عظیم محدث، فقیہ اور قاضی تھے۔ انھوں نے زہد و عبادت کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں۔ امام ابن الطلاع نے ان سے استفادہ کیا۔ (بغیۃ الملتمس ص ۵۱۲۔ "الصلۃ" ص ۶۸۴۔ "الدیباج" ص ۲۷۵۔ العبر ج ۳ ص ۳۲۹۔ شذرات الذہب ج ۳ ص ۷۴)

۳۔ احمد بن ہشام بن بہور (م ۴۳۰ھ) یہ اہلِ مرشانہ میں سے تھے اور قرطبہ میں سکونت پذیر رہے۔ (الدیباج ص ۲۷۵)

۴۔ محمد بن عبداللہ بن سعید بن عابد المعافری (م ۴۳۹ھ) یہ جلیل القدر محدث و فقیہ تھے۔ ابو محمد الاُصَیلی سے استفادہ کرنے والے لوگوں میں سے یہ آخری شخص تھے جو قرطبہ میں بقیدِ حیات تھے۔ (الصلۃ ص ۶۱)

۵۔ مکی بن ابی طالب، ان کا اصلی نام حموش بن محمد بن مختار القیسی تھا۔ ۴۳۷ھ میں وفات پائی۔ یہ قرآن اور عربی زبان و ادب کے بہت بڑے عالم تھے اور انھوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔

۶۔ احمد بن محمد بن عیسیٰ بن ہلال المعروف بابن القطان (م ۴۶۰ھ) ابن بشکوال کہتے ہیں کہ اپنے دور میں اندلس میں ان کو علم اور حفظ میں منفرد مقام حاصل تھا۔ (الصلۃ ص ۴۶ ۵)

۷۔ محمد بن جہور بن محمد جہور الولید (م ۴۶۲ھ) قرآن کریم کے حافظ اور قاری تھے۔ شیوخ و اساتذہ سے استفادہ کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ (الصلۃ ص ۴۱۶۔ البغیہ ص ۴۶۱)

۸۔ حاتم بن محمد بن عبدالرحمان المعروف بابن الطرابلسی (م ۴۶۹ھ) فقہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ (الدیباج ص ۲۷۵۔ الصلۃ ص ۵۶۴۔ البغیۃ ص ۲۷۰)

۹۔ معاویہ بن محمد العقیلی ابو عبدالرحمن (م ۴۶۹ھ) ابن بشکوال نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کے

حافظ تھے اور اکثر اس کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ (الصلۃ ص ۵۷۴)

ابن الطلاع کا علمی مقام

ابن الطلاع مالکی فقہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ان کو ریاست الافتاء کا منصب تفویض کیا گیا۔ مشاورت میں ان کی رائے کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔

لوگ موطا امام مالک اور مدونہ کے سماع کے لیے دور دور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ پورے اندلس میں مالکی فقہ کے اصول و فروع کا ان سے بڑا عالم کوئی نہ تھا۔ انھوں نے لمبی عمر پائی اور چھوٹوں بڑوں اور باپ بیٹوں یعنی کئی کئی پشتوں نے ان سے استفادہ کیا۔ جامع قرطبہ کی خطابت کا منصب ان کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ وہ وعظ کہتے اور پیش آمدہ مسائل میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ بڑے خوش بیان اور فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ اسرار شریعت کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ احکام کی حکمت اور ان کی شروط و علل کے فہم و ادراک میں یکتائے روزگار تھے۔ نئے نئے پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے کی پوری پوری مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان سب باتوں کی زندہ دلیل ان کی عدیم النظیر کتاب "اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ہے۔

ابن الطلاع کے بعض اساتذہ سے یہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ:

"اگر امام مالک، ابن الطلاع کو دیکھتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔"

ابن الطلاع علماء کی نظر میں

ابن الطلاع کو جو علمی مقام حاصل تھا اس کے اظہار کے لیے علماء کے چند اقوال درج ذیل ہیں:

ابن بشکوال کہتے ہیں:

"وہ فقیہ اور عالم تھے۔ مالکی فقہ کے حافظ تھے۔ فتویٰ دینے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ارباب حل و عقد کے ہاں شوریٰ میں ان کی رائے کو بہت اہمیت حاصل تھی اور احکام کے اسباب اور ان کی شروط و علل کو خوب جانتے تھے۔ اپنے ملک کے علماء کے حالات اور ان کے فتووں سے پوری طرح باخبر تھے۔" (الصلۃ ص ۵۷۴)

ابن فرحون لکھتے ہیں:-

"ابن الطلاع اپنے دور کے شیخ الفقہاء تھے۔ ان کے جو ہم عصر علماء و فقہاء زندہ تھے وہ ان سب سے عمر میں بھی بڑے تھے۔" (الدیباج ص ۲۷۵)

الضبی کہتے ہیں:-

"ابن الطلاع مشہور قرطبی فقیہ تھے۔ قرطبہ کے جلیل القدر محدث تھے۔ مشاورت میں ان کی رائے کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔"

(بغیۃ الملتمس ص ۱۲۳)

ابن العماد لکھتے ہیں:-

"وہ علم و عمل میں سربرآوردہ اور ہمیشہ حق بات کہنے والے تھے۔" (شذرات الذہب ج ۳ ص ۴۰۲)

حافظ ذہبی کہتے ہیں:-

"ابن الطلاع اندلس کے بہت بڑے مفتی اور اہل علم کا مرجع تھے۔" (العبر - ۳ : ۳۴۹)

ابن بشکوال کا قول ہے:-

"ابن الطلاع اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے تھے۔ قرآن کے حافظ تھے اور قرآن کریم کی تلاوت اکثر تجوید سے کیا کرتے تھے۔"

قرآن کی تلاوت سے ان کے تقوٰی میں مزید اضافہ ہوا ۔ اللہ کے بارے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ خلفاء و حکام کے سامنے بھی ہمیشہ سچی بات ڈنکے کی چوٹ کہہ دیا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ معتمد بن عباد ان کو راستہ میں ملا ۔ آپ کے علم و فضل کی بنا پر احتراماً وہ گھوڑے سے اتر پڑا ۔ اس کے باوجود حق گو اور خدا ترس امام ابن الطلاع نے اس کو سرزنش کی اور رعیت سے حسن سلوک اور لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کی تلقین کی اور فرمایا کہ اسے اس روز اللہ کے دربار میں پیش ہو کر جوابدہی کرنی ہوگی جس دن آنکھیں پتھرا جائیں گی ۔ بعض مورخین نے اختصار کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔"

(المغرب فی حلی المغرب ج ۱ ص ۱۶۵)

ابن فرحون لکھتے ہیں :-

"ابن الطلاع بدعات کے معاملے میں بڑے سخت اور امراء کے معاملے میں بالکل نڈر تھے"۔ (الدیباج ص ۲۷۵)

مراجع و مآخذ

ابن الطلاع کو احادیث کے بہترین مآخذ، مثلاً صحیح بخاری و مسلم، موطا امام مالک، سنن نسائی و ابوداؤد تک رسائی حاصل تھی اور ان کتابوں میں سے اپنی کتاب کے لیے جس قدر مواد وہ فراہم کر سکتے تھے۔ انھوں نے کیا مگر ان میں سے بہت سا مواد چھوڑ بھی دیا اور باقی مواد فقہ کی کتابوں سے حاصل کیا ۔ جہاں تک جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی، بیہقی اور مستدرک حاکم کا تعلق ہے تو وہ ان کے یہاں معروف نہ تھیں ۔ اس لیے ان کتب سے استفادہ نہ کرنے کے سلسلے میں وہ معذور تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے فقہ کی کتابوں، مثلاً ابن ابی زید کی النوادر، ابن حبیب کی الواضحہ، ابن المنذر کی الاشراف، اصیلی کی الفوائد اور اسی طرح کی دوسری کتابوں سے احادیث کیوں نقل کیں جبکہ یہی احادیث ابوداؤد اور نسائی میں موجود ہیں؟ میں اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کر سکتا کہ ان کو حدیث کی نسبت فقہ کی کتابوں پر زیادہ عبور حاصل تھا۔

کتاب کے آخر میں مراجع کا ذکر

اس امر کی جانب اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں ابن الطلاع پہلے مصنف ہیں جنھوں نے کتاب کے آخر میں مراجع کا ذکر کیا ہے ۔ ان سے پہلے اور خود ان کے دور میں بھی اس چیز کا رواج نہ تھا ۔ اس لیے جب ہم یہ بات کہتے ہیں کہ امام ابن الطلاع اس علمی اسلوب کے موجد و موسس تھے جس تک ہمارے دور کے محققین پہنچے ہیں تو اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں۔

بعض لوگ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ اس میں سبقت کا سہرا مستشرقین کے سر ہے جن کی مطبوعات کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہوتی ہے کہ ان میں کئی قسم کی فہرستیں شامل ہوتی ہیں جن میں سے ایک فہرست مراجع کی بھی ہوتی ہے ۔ مصادر کا ذکر اس لیے کیا جاتا ہے کہ قاری میں موضوع زیر بحث کے سلسلے میں مزید اعتماد پیدا کیا جا سکے ۔

مگر ابن الطلاع کا اسلوب اس باطل خیال کی تردید کے لیے کافی ہے ۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسلاف کی تصانیف کا اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ہمارے علماء نے اپنی تصانیف میں مستشرقین سے صدیوں

پہلے وہ ترتیب وتبویب اختیار کی اور بحث وتحقیق اور کتابوں کے مختلف نسخہ جات کے تقابل کے وہ اصول وقواعد وضع کیے جنھیں عصر حاضر میں بھی بحث وتحقیق کے سلسلہ میں اب تک معیار تصور کیا جاتا ہے۔ والحمد للہ۔

ابن الطلاع کی تصانیف ابن الطلاع بعض دوسرے علماء کی طرح کثیر التصانیف نہ تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وعظ وارشاد، درس وتدریس اور افتاء وتبلیغ میں مشغول رہتے تھے اور تصنیف وتالیف کے لیے انھیں وقت نہیں ملتا تھا۔ ہمارے پاس ان کی ایک ہی تصنیف "اقضیۃ النبی" ہے جس سے ان کی علمی وسعت اور تصنیف وتالیف پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔

کتاب اقضیۃ النبی یہ کتاب کئی ناموں سے موسوم ہے:

حاجی خلیفہ صاحب کشف الظنون نے اس کو "اقضیۃ الرسول" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ متقدمین ومتاخرین اس کتاب کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں (دیکھیے شرح المواہب ج ۳ ص ۳۷۰)

یہ کتاب آج بھی اسی نام سے معروف ہے، چنانچہ چوتھی فصل میں اس پر تھوڑی سی بات ہوگی۔ ابن فرحون نے اس کتاب کا نام "احکام النبی" لکھا ہے۔ (الدیباج ص ۲۷۵)

ابن بشکوال اور ابن خیر نے بھی اس کتاب کا یہی نام ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے الصلۃ ص ۵۶۵ اور فہرست ص ۲۴۲)

خطیب بغدادی نے ان دونوں ناموں کو جمع کرکے اس کا نام "احکام النبی، کتاب الاقضیۃ" بتایا ہے۔

(ھدیۃ العارفین ج ۲ ص ۷۸)

بعض علماء نے اس کا ذکر "نوازل الاحکام النبویۃ" کے نام سے کیا ہے۔ (المغرب فی حلی المغرب، ج ۱، ص ۱۶۵)

ان تینوں ناموں سے کتاب کے موضوع کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور اوامر ونواہی بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ نوازل کا لفظ اہل مغرب کی اصطلاح ہے۔ اس کے لیے ہمارے یہاں فتاویٰ کا لفظ مستعمل ہے مگر نوازل کا استعمال نئے پیدا ہونے والے مسائل کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے برعکس فتویٰ کا لفظ شرعی احکام سے متعلق ہر سوال کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مسائل نئے پیدا ہوتے ہوں یا بالکل ہی پیدا نہ ہوتے ہوں۔

ابن الطلاع کی جو تصانیف ہم تک نہ پہنچ سکیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الشروط (دیکھیے "الدیباج" اور "البغیۃ")

۲۔ زوائد ابی محمد فی المختصر (〃 〃 〃 〃)

۳۔ مختصر ابی محمد فی الولاء (〃 〃 〃 〃)

۴۔ کتاب الوثائق (المغرب فی حلی المغرب ج ۱ ص ۱۶۵۔ فہرست ابن خیر)

وفات مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام ابن الطلاع کی وفات تیرہ رجب بروز جمعرات کے دن چاشت کے وقت ۴۹۷ھ میں ہوئی اور انھیں اسی دن نماز عصر کے بعد العباس کے قبرستان میں دفن

کیا گیا۔ (دیکھیے الصلۃ، الدیباج، البغیۃ، شذرات الذہب اور العبر)

حاجی خلیفہ نے اس سبب سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی وفات ۵۵۰ھ کے قریب ہوئی (کشف الظنون ص ۳۰)

بلاشبہ یہ قول قابلِ قبول نہیں اور حاجی خلیفہ سے پہلے علماء میں سے کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی۔ اس لیے یا تو یہ کتابت یا طباعت کی غلطی ہے یا خود حاجی خلیفہ ہی کو غلطی لگ گئی ہے۔

امام ابن الطلاع نے بیو زاہد شب زندہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے عظیم محدث علم کلام کے امام بھی تھے اپنی پوری زندگی کار ہائے نمایاں انجام دینے میں گزاری۔ حکام کے ہاں وہ مشیر کے منصب پر فائز تھے۔ دعوت دین کے سلسلے میں ان کو اذیتیں دی گئیں مگر ان سب کو انھوں نے صبر سے برداشت کیا اور ان پر اللہ کے ہاں سے اجر و ثواب کی امید رکھی۔

ابن فرحون لکھتے ہیں :-

"جب ان کے استاد ابن القطان نے وفات پائی تو ابن الطلاع نے دینی امور میں شدت کا انداز اختیار کیا اور اپنی رائے کو قوت کے ساتھ نافذ کیا۔ جب مرابطین قرطبہ میں برسر اقتدار آئے تو انھوں نے ابن الطلاع کو مسند اقتدار سے الگ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن الطلاع مرابطین کے خلاف تعصب رکھتے تھے۔ ساتھ ہی عبادت میں ان کا انہماک بہت بڑھ گیا، چنانچہ اس کے بعد وفات تک مسند اقتدار پر نہیں بیٹھے۔"

تلامذہ امام ابن الطلاع نے اپنے پیچھے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد چھوڑی۔ مختلف علوم میں ان کی بصیرت کی بنا پر ان میں سے ہر ایک کا یہ مقام ہے کہ اس کے تعارف کے لیے ایک باب وقف کیا جائے، لیکن طوالت کے خوف سے ان میں سے چند ایک کا مختصر ذکر ان کے سالِ وفات کی ترتیب سے کیا جاتا ہے :

۱ - محمد بن حیدرہ بن احمد بن مفوز ابو بکر (۵۰۵ھ) یہ حافظ حدیث اور اسماء الرجال کے ماہر تھے۔ انھوں نے فقیہ ابو عبداللہ محمد بن فرج اور دیگر علماء سے استفادہ کیا۔ (الصلۃ ص ۵۲۸)

۲ - عبدالعزیز بن عبداللہ بن محمد بن احمد بن حزمون (۵۰۶ھ) بہت بڑے فقیہ، شرعی احکام کے سلسلے میں حکام کے مشیر اور دار الافتاء کے صدر تھے۔ (الصلۃ ص ۳۷۲، ۳۷۳)

۳ - ہشام بن احمد ابو الولید (۵۰۹ھ) قرطبہ کے شیخ اور فقیہ تھے، کبار علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا (الصلۃ ص ۶۵۴)

۴ - احمد بن ابراہیم بن احمد بن ابراہیم ابو جعفر (۵۱۱ھ) یہ قرطبہ کی جامع مسجد کے خطیب تھے اور ادب اصول و عقائد شرعی احکام میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ (الصلۃ ص ۷۴)

۵ - یحییٰ بن عمرو بن یقظان الجذامی ابو بکر المرجونی کے نام سے معروف تھے (۵۱۱ھ) فقہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ کاروباری دستاویزات اور ان کے شروط و علل سے پوری طرح آگاہ تھے۔ (الصلۃ ص ۶۷۷)

۶ - ابو علی حسین بن محمد بن حیون بن سکرہ الصدفی (۵۱۴ھ) احادیث، ان پر جرح و انتقاد اور ان کے راویوں کے بارے میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ان کے لیے یہ اعزاز کافی ہے کہ ابن الابار نے ان کے تلامذہ کی فہرست مرتب کی تو ان کی تعداد تین سو نفر تک پہنچ گئی۔ (الصلۃ ص ۱۴۴، الدیباج ص ۱۰۵)

۷۔ عبدالرحمن بن محمد بن احمد بن خلد بن عبدالرحمن بن احمد بن بقی بن مخلد ابوالحسن (م ۵۱۵ھ) قرطبہ میں مدتوں حج کے منصب پر فائز رہے۔ (الصلۃ ص ۳۴۷)

۸۔ عبدالجبار بن عبداللہ بن احمد بن اصبغ القرشی المروانی ابوطالب (م ۵۱۶ھ) بڑے ذہین، بڑے مستعد اور بیدار مغز شخص تھے۔ انھوں نے تاریخ کے موضوع پر ایک جامع کتاب مرتب کی جس کا نام عیون الامامۃ ہے (الصلۃ ص ۳۸۰)

۹۔ ابراہیم بن محمد بن خیرہ ابواسحاق (م ۵۱۳ھ) حافظ حدیث تھے۔ (الصلۃ ص ۹۹)

۱۰۔ جراح بن موسیٰ بن عبدالرحمن الغافقی ابوعبیدہ (م ۵۱۶ھ) ادیب و حافظ حدیث تھے۔ عربی زبان و ادب اور شعر میں مہارت رکھتے تھے۔ (الصلۃ ص ۱۳۴)

۱۱۔ محمد بن عبدالرحمن بن شبل الرعینی ابوعبداللہ (م ۵۱۹ھ) کاروباری معاملات کی شروط و علل کے جید عالم اور ماہر تھے۔ (الصلۃ ص ۵۷۴)

۱۲۔ محمد بن احمد بن احمد بن رشد ابوالولید (م ۵۲۰ھ) مشہور فقیہ، حافظ اور مصنف تھے۔ المدونہ کے ابواب کے آغاز میں انھوں نے مقدمات لکھے ہیں۔ (الصلۃ ص ۵۷۶۔ البغیۃ نیز الدیباج ص ۲۷۹)

۱۳۔ احمد بن محمد بن علی بن محمد التغلبی ابوالقاسم (م ۵۲۱ھ) انھیں قرطبہ میں دو دفعہ قاضی بنایا گیا۔ (الصلۃ ص ۷۸)

۱۴۔ یونس بن محمد بن مغیث ابوالحسن (م ۵۲۱ھ) قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ لغت اور اعراب کے ماہر اور غیر مانوس الفاظ اور علم الانساب کے جید عالم تھے۔ (الصلۃ ص ۶۸۸۔ البغیۃ ص ۶۱۳)

۱۵۔ فضل اللہ بن محمد بن وہب اللہ بن محمد انصاری المقری ابوالقاسم (م ۵۲۴ھ) انھوں نے ابوعبداللہ محمد بن فرج سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ (الصلۃ ص ۴۷۵)

۱۶۔ عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ ابو محمد (م ۵۲۶ھ) متعدد علوم کے ماہر اور حافظ تھے۔ (الصلۃ ص ۲۹۴)

۱۷۔ عبدالجلیل بن عبدالعزیز بن محمد الاموی المقری ابوالحسن (م ۵۲۶ھ) تجوید و قراءت میں مہارت رکھتے تھے۔ احادیث کی نقل و روایت سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ (الصلۃ ص ۳۸۷)

۱۸۔ یحییٰ بن محمد بن ابی المطرف ابوالحکم (م ۵۲۶ھ) لغت اور ادب کے عالم تھے۔ (الصلۃ ص ۶۷۳)

۱۹۔ یحییٰ بن ابراہیم بن عبد ربہ ابن بہور القیسی ابوالقاسم (م ۵۲۷ھ) حدیث، فقہ اور اصول دین میں دلچسپی رکھتے تھے۔ (الصلۃ ص ۶۴۰)

۲۰۔ محمد بن احمد بن خلف بن ابراہیم المعروف بابن الحاج ابوعبداللہ (م ۵۲۹ھ) احادیث و آثار اور اسماء الرجال میں خصوصی بصیرت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی غریب الفاظ، علم الانساب، لغت اور اعراب انھیں ازبر تھے۔ اشعار کے معانی اور تاریخی واقعات کے عالم تھے۔ (الصلۃ ص ۵۸۰)

۲۱۔ محمد بن اسماعیل بن عبدالملک الصدفی (م ۵۲۹ھ) علم الاحکام کے ماہر اور اپنے شہر کے مفتی تھے۔ اسی وجہ سے انھیں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ (الصلۃ ص ۵۸۰)

۲۲ - محمد بن سلیمان بن مروان بن یحییٰ قَلیسی ابو عبد اللہ (۵۳۰ھ) (الصلۃ ص ۵۸۴)

۲۳ - احمد بن محمد بن احمد بن مخلد بن عبد الرحمٰن بن احمد بن بقیّ بن مخلد ابو القاسم (۵۳۲ھ) مدت تک ابن الطلاع کی صحبت میں رہ کر ان سے مستفید ہوتے رہے ۔ نئے نئے مسائل کو حل کرنے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے ۔ صدر مفتی تھے ۔ کاروباری دستاویزات اور ان کے شروط و علل میں بصیرت رکھتے تھے (الصلۃ ص ۷۹)

۲۴ - یونس بن محمد بن مُغیث بن محمد بن یونس بن عبد اللہ بن محمد بن مغیث بن عبد اللہ ابو الحسن (۵۳۲ھ) لغت اور اعراب کے عالم اور غریب الفاظ اور علم الانساب کے حافظ تھے ۔ (الصلۃ ص ۶۸۸)

۲۵ - عبد اللہ بن علی بن عبد العزیز بن فرج الغافقی ابو محمد (۵۴۱ھ) فقیہ، حافظ اور بیدار مغز عالم تھے ۔ (الصلۃ ص ۲۹۶)

۲۶ - یحییٰ بن موسیٰ بن عبد اللہ ابو بکر (۵۴۱ھ) متقی، پاکباز، نیک خصال اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے ۔ (الصلۃ ص ۶۷۳)

۲۷ احمد بن عبد الرحمن بن محمد بن عبد الباری ابو جعفر (۵۴۲ھ) بُطروجی کے نام سے معروف تھے ۔ حدیث، فقہ، اسماء الرجال اور تاریخ کے حافظ تھے ۔ (الصلۃ ص ۸۲)

۲۸ - محمد بن عبد الرحمٰن بن ابراہیم بن یحییٰ بن مسعود المعروف بابن الورّاق ابو الحسن (۵۴۲ھ) دین دار اور با اصل شخص تھے اور علمی مسائل اور آراء کو ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کرتے تھے ۔ (الصلۃ ص ۵۹۱)

۲۹ - محمد بن محمد بن عبد الرحمن بن احمد ابو عبد اللہ (۵۴۲ھ) احمر کے نام سے معروف تھے مالکی فقہ کے حافظ تھے اور اس میں ان کا مقام بہت بلند تھا ۔ (الصلۃ ص ۵۸۹)

۳۰ - محمد بن محمد بن عبد الرحمٰن بن محمد بن الحکم القرشی ابو عبد اللہ (۵۴۲ھ) مالکی فقہ کے حافظ تھے ۔ (الصلۃ ص ۵۸۹)

۳۱ - عبد الرحمٰن بن احمد بن خَلف بن رضا المقری ابو القاسم (۵۴۵ھ) انھوں نے ابو عبد اللہ محمد بن فرج سے مؤطا امام مالک پڑھا ۔ (الصلۃ ص ۳۵۲ - ۳۵۳)

۳۲ - محمد بن محمد بن عبد اللہ بن مسلمہ ابو بکر (۵۴۵ھ) بہت بڑے فاضل اور عابد و زاہد تھے ۔ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے تھے ۔ (الصلۃ ص ۵۹۲)

۳۳ - محمد بن یونس بن محمد بن مُغیث ابو الولید (۵۴۷ھ) ایک صالح و پاکباز اور منکسر المزاج عالم تھے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرتے تھے ۔ (الصلۃ ص ۵۹۲)

۳۴ - عبد الملک بن مسعود بن بَشکوال بن یوسف بن داحہ انصاری ابو مروان (۵۵۲ھ) انھوں نے عرصۂ دراز تک محمد بن فرج کی صحبت میں مسلسل رہ کر ان سے استفادہ کیا ۔ اور ان سے مؤطا امام مالک کا درس لیا ۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے حدیث اور فقہ کے علم اور اعلیٰ ادب کی نعمت سے نوازا تھا ۔ (الصلۃ ص ۳۶۶)

۳۵ - احمد بن محمد بن احمد بن رُشد (۵۶۳ھ) قُرطُبہ کے قاضی تھے ۔ بڑے فاضل اور دانا تھے ۔ ابو عبد اللہ بن فرج نے ان کو روایت حدیث کی اجازت دی تھی (الصلۃ ص ۸۳)

۳۶ - عبد الرحمٰن بن محمد بن عبد الملک بن قزمان ابو مروان (۵۶۴ھ) جلیل القدر فقیہ اور بلند پایہ ادیب تھے ۔ (الصلۃ ص ۳۵۳)

فصل چہارم

کتاب کے مختلف نسخے

اللہ کے فضل سے مجھے اس کتاب کے دو مطبوعہ نسخوں کے علاوہ تین مخطوطے بھی مل گئے۔

اب ان نسخوں کا تعارف پڑھیے:۔

۱۔ پہلا نسخہ حرم مکی کی لائبریری میں ملا۔ اس کا نمبر ۱۳ ہے۔ یہ سب سے قدیم، سب سے زیادہ صحیح اور متن کے اعتبار سے سب سے مکمل نسخہ ہے۔ قاری اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ان اضافوں سے آگاہ ہوگا جو دوسرے نسخوں کے مقابلے میں اس نسخے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ نسخہ (۱۷×۱۲ سم) سائز کے ۲۳۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں خوش خط پندرہ سطریں ہیں۔ ابتدائی دو تہائی حصوں میں نقطے اور اعراب لگے ہوئے ہیں۔ آخری تہائی حصے میں اعراب نہیں لگائے گئے بلکہ بعض جگہ نقطے بھی مفقود ہیں۔ پہلے دو تہائی حصوں میں ہر جملے کے بعد ایک دائرہ بنا ہوا ہے جس میں ایک نقطہ لگا ہوا ہے۔ یعنی یوں ⊙ ——— آخری تہائی میں جملے کے خاتمے پر حرف الھاء اس طرح (ھ) لکھا گیا ہے اور بعض جگہ دائرہ بنا کر اس میں نقطہ ڈالا گیا ہے۔ یہ نسخہ آٹھویں صدی ہجری میں لکھا گیا۔ اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ کتاب کے آخر میں کاتب نے کتابت سے فارغ ہونے کی تاریخ یوں درج کی ہے:۔

"۷۰۲ھ میں کتابت سے اس وقت فارغ ہوا جب جمادی الاولیٰ کے پانچ دن باقی تھے۔ اس کا کاتب اللہ کی رحمت کا محتاج احمد بن علی بن محمد النسفی ہے۔"

پہلے صفحہ پر کتاب کا نام "احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا ہوا ہے جو مشہور فقیہ اور مشیر ابوعبداللہ محمد بن فرج ابن الطلاع رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ اس نسخے پر لائبریریوں کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ (دیکھیے اس کی فوٹو سٹیٹ کاپی)

چونکہ ہم تک پہنچنے والوں میں یہ کتاب کا قدیم ترین نسخہ ہے، اس کے ساتھ ہی یہ متن اور افادیت کے اعتبار سے نہایت مکمل ہے اس لیے کتاب کی تحقیق کے سلسلے میں ہم نے اسی کو اصل قرار دیا ہے۔

۲۔ دوسرے نسخے کا عکس عرب لیگ کی لائبریری سے لیا گیا ہے۔ یہ نسخہ شعبہ حدیث میں تھا۔ اس کا کارڈ نمبر ۵، ہے۔ یہ نسخہ شہید علی پاشا لائبریری استنبول سے لیا گیا۔ وہاں اس کا نمبر ۱۲۶۸-۲۱-۲ ہے۔ یہ نسخہ (۲۷،۲ × ۸،۷ سم) سائز کے ساٹھ ۶۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں تینتیس ۳۳ سطریں ہیں۔ یہ نسخہ بڑا صاف، خوش خط، آٹھویں صدی ہجری کا تحریر کردہ ہے۔ کاتب اس کی تحریر سے ۷۳۵ھ میں ربیع الاول کے پہلے عشرہ میں فارغ ہوا۔ آخری صفحہ پر

شہید علی پاشا کی لائبریری کی مہر لگی ہوئی ہے۔

۳۔ تیسرے نسخے کا عکس بھی عرب لیگ کی لائبریری ہی سے لیا گیا ہے۔ وہاں شعبۂ حدیث میں اس کا نمبر ۴۷ ہے۔ اصل نسخہ لالہ لی لائبریری استنبول میں نمبر ۔۔ ۵ کے تحت موجود ہے۔ یہ بڑے سائز کے ۷۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام پہلے صفحہ پر اس طرح لکھا ہے:

"کتاب اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما قضی فیہ او امر با قضائہ"

ان فیصلوں کی روایت جلیل القدر محدثین اور فقہاء نے کی اور جلیل القدر فقیہ ابو عبداللہ محمد بن فرج ابن الطلاع قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو مشہور کتب حدیث سے نقل کیا۔ آخر میں لائبریری کی مہر ہے۔ ہر صفحہ باییس ۲۲ خوش خط سطروں پر مشتمل ہے۔ کاتب اس کی کتابت سے ۸۱۵ھ میں ۱۳ جمادی الاولیٰ کو پیر کے دن فارغ ہوا"

کتاب کے آخر میں ہے کہ امیر المومنین ابراہیم بن المعتضد باللہ ابوالفتح نے اس کتاب کو ۵ شوال ۸۳۸ھ سے سننا شروع کیا۔ اس صفحے کا عکس کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔

بہت دیر بعد مجھے اس کتاب کے دو اور نسخوں کا پتہ چلا جو حال ہی میں طبع ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نسخہ قطر میں چھپا ہے اور وہ الحلبی کے طبع کردہ نسخے کا عکس لے کر چھاپا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ بھی الحلبی کے طبع کردہ نسخے کا عکس ہے۔ وہ حلب کے "دارالوعی" کی طرف سے طبع ہوا۔ دونوں نسخوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ دوسرے نسخہ میں امام ابن الطلاع کا مختصر تعارف ڈاکٹر عبدالمعطی قلعجی کا تحریر کردہ ہے۔ آغاز کتاب میں بعض الفاظ کی تشریح اور بعض اشخاص کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جہاں تک متن کا تعلق ہے تو اس میں غلطیاں بدستور موجود ہیں کیونکہ اصل نسخہ سے تقابل نہیں کیا گیا۔

اس کتاب پر میرا تحقیقی کام

۱۔ میں نے تینوں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا تقابل کر کے ان کے ہر چھوٹے بڑے فرق کی نشان دہی کی ہے۔

۲۔ مصنف نے جو بھی اقتباس نقل کیا اگر اس کا ماخذ دستیاب ہو سکا تو میں نے اس کی تحقیق کی۔

۳۔ نایاب کتابوں میں سے مصنف نے جو اقتباسات نقل کیے میں نے ان کو تلاش کیا اور حدیث و فقہ اور تاریخ و سیر کے قابل اعتماد مراجع سے ان کی تصحیح کی۔

۴۔ کتاب میں جن جلیل القدر محدثین، مؤرخین اور فقہاء کا ذکر آیا ہے میں نے ان کا مختصر تعارف لکھ دیا ہے اور تعارف کے بعض ماخذ کے حوالے بھی دیے ہیں۔

۵۔ کتاب میں درج تمام احادیث کی تخریج کی ہے اور ان پر نقد کیا ہے۔ اس ضمن میں میرا انداز حسب ذیل رہا:

ا۔ جب کوئی حدیث صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کتاب میں موجود ہو تو میں نے کتاب اور باب کا نام تحریر کر دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ فتح الباری میں حدیث کا نمبر اور صحیح مسلم کا صفحہ نمبر کیا ہے۔

ب۔ جب کوئی حدیث صحیحین یا ان میں سے کسی ایک میں بھی موجود نہ ہو تو میں نے اس کی سند کے بارے میں محدثین کی رائے

بھی بیان کی ہے اور ان کا تعارف بھی کروایا ہے۔ مزید براں اس حدیث کے طرق و شواہد کی تحقیق کر کے اس کی صحت یا ضعف کے بارے میں رائے دی۔ اور اس کی تائید میں ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال ذکر کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ ان کے اقوال سے تجاوز نہ کروں۔

ج۔ جب حدیث کے راوی ثقہ ہوں تو میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں یا اس کے راوی صحیحین کے راوی ہیں۔ اس صورت میں میں نے ان کا تعارف نہیں کروایا۔

د۔ جب کسی حدیث کے ماخذ اور اس کی سند کا پتہ نہ چل سکا تو میں نے اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ "مجھے اس حدیث کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکا۔" شاید کسی دوسرے شخص کو اس حدیث کا سراغ مل سکے۔

(ھ) مزید توضیح کے لیے میں نے جرح و تعدیل کے الفاظ پر مشتمل ایک نقشہ بھی تیار کر دیا ہے۔

۶۔ بہت سے فقہی مسائل کی وضاحت کے لیے میں نے حواشی میں فقہاء کے دلائل کا موازنہ کیا ہے۔ جب کوئی مسلک مجھے راجح نظر آیا تو اس کا ذکر کر دیا ہے۔ ورنہ صرف دلائل ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

۷۔ میں نے مشکل الفاظ کی شرح بھی اور فقہی اصطلاحات کا لغوی و شرعی مفہوم بھی بیان کیا ہے۔

۸۔ قرآنی آیات کے لیے قرآن کریم کی سورتوں کے حوالے دیے ہیں۔

۹۔ مصنف نے جن احادیث کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے میں نے ان کا پورا متن درج کر دیا ہے۔

۱۰۔ بہت سے مقامات پر امام احمد بن حنبل کی رائے بھی بیان کی ہے۔

۱۱۔ رموزِ اوقاف لگائے۔

۱۲۔ مصنف نے جن نایاب کتابوں کا ذکر کیا ہے اور ان سے اقتباسات نقل کیے ہیں میں نے ان کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔

۱۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جن فیصلوں کا ذکر مصنف نے نہیں کیا میں نے استدراکات میں ان کا ذکر کر دیا ہے۔

۱۴۔ کتاب سے استفادہ کو آسان بنانے کے لیے میں نے کتاب کے آخر میں تین فہرستیں دی ہیں:

۱۔ ان شخصیتوں اور راویوں کی فہرست جن کا تعارف اس کتاب میں کرایا گیا ہے۔

۲۔ مراجع و مآخذ کی فہرست۔

۳۔ مضامینِ کتاب کی فہرست۔

اللہ کرے کہ اس کی توفیق سے مجھے اس عظیم الشان کتاب کو ایسے جدید اسلوب میں پیش کرنے میں کامیابی حاصل ہو جس سے یہ طالبانِ علم کے لیے مزید مفید ثابت ہو سکے۔

میں اپنے لیے اور اس کتاب کے قارئین کے لیے بارگاہِ خداوندی سے رُشد و ہدایت کی دعا مانگتا ہوں اور

دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازے۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی
کلیۃ الحدیث
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام ابو عبداللہ ابن الطلاع

كتاب الحدود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ. عَوۡنَكَ اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنۡتَ

یہ کتاب تکمیل پذیر ہونے کے بعد توثیق کے لیے مصنف کتاب علامہ ابو عبداللہ محمد بن فرج کو، جو ایک بلند پایہ فقیہہ اور مشیر امور شرعیہ ہیں، پڑھ کر سنائی گئی ہے[1]۔ مصنف اس کتاب کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں[2]: "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں اور یہ تعریفیں اسی طرح بیان کی جاتی چاہئیں جس طرح کہ خود اس نے اپنی صفات بیان فرمائی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی مخلوق نے اس کی جتنی حمد و ثنا بیان کی ہے وہ اس سے کئی گنا زیادہ تعریفوں کا مستحق ہے۔ مخلوق کی بیان کی ہوئی حمد و ثنا بالآخر فنا ہو جائے گی مگر اس کی حمد کی صفت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔[3]

---

[1] نسخہ لالہ لی میں "وما توفیقی الا باللّٰہ علیہ توکلت" کا اضافہ ہے۔

[2] نسخہ شہید علی پاشا میں "ازواجہ وذریتہ واصحابہ" کا اضافہ ہے۔

[3] یہ جملہ صرف نسخہ حرم مکی میں ہے۔

[4] لفظ "لُغَنَا" جو دراصل "اَخۡبَرَنَا" کی مختصر صورت ہے۔ یہ لفظ گزشتہ ادوار میں اس صورت میں استعمال کیا جاتا تھا جب استاد اپنے حافظہ کی مدد سے شاگرد کو املا کراتا یا اپنی کسی تصنیف سے پڑھ کر سناتا تھا۔ استاد سے استفادہ کی یہ بہترین شکل تصور کی جاتی تھی۔ قاضی عیاض فرماتے تھے:

"اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب شاگرد استاد سے براہ راست سنے تو اس کے لیے اپنی روایت میں حَدَّثَنَا، اَخۡبَرَنَا، اَنۡبَانَا، سَمِعۡتُ، قَالَ لَنَا، ذَكَرَ لَنَا کے الفاظ کہنا جائز ہے۔ ابن الصلاح "علوم الحدیث" (ص ۱۴) میں لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب "اَخۡبَرَنَا" کا لفظ شاگرد کے استاد کو پڑھ کر سنانے کے لیے مختص نہیں ہوا تھا۔ (یعنی اب "اخبرنا" صرف اسی صورت میں کہا جاتا ہے جب شاگرد پڑھ کر استاد کو سنائے)"

ابن الصلاح کے قول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ متاخرین کے نزدیک "اَخۡبَرَنَا" کا لفظ صرف اس صورت میں بولا جاتا ہے جب شاگرد استاد کو پڑھ کر سنائے۔ اس کو محدثین "العرض" بھی کہتے ہیں۔ اسی کے پیش نظر امام ابن الطلاع سے روایت کرنے والے ان کے شاگردوں نے آخر میں "قراءة علیہ" کے الفاظ تحریر کیے ہیں۔

محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ شاگرد استاد کو جو روایت پڑھ کر سنائے وہ صحیح تصور کی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض علماء کی رائے اس کے خلاف بھی ہے مگر ان کی بات حجت نہیں۔ امام نووی نے بھی اپنی کتاب "تدریب الراوی" (ص ۲۴۰) میں یہی بات لکھی ہے۔

امام البغوی فرماتے ہیں:— "شاگرد استاد کو جو روایت پڑھ کر سنائے اور پھر اس سے روایت کرے وہ ائمہ حدیث اور اور اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک جائز تصور کی جاتی ہے۔" (شرح السنۃ ج ۱، ص ۲۳۸)

إن شاء اللہ میں اس کتاب میں ان فیصلوں کا ذکر کروں گا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائے یا جن کے صادر کرنے کا حضورؐ نے حکم دیا اور وہ مجھ تک پہنچے۔ اس لیے کہ جس شخص کو فیصلہ کرنے کے لیے مامور کیا جاتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ فیصلہ اللہ کی کتاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنت یا علماء کے اجماع کے مطابق کرے یا ان تینوں میں سے کسی دلیل کی بنا پر استنباط کر کے حکم جاری کرے۔

امام مالکؒ[1]، شافعیؒ[2] اور ابو حنیفہؒ[3] رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ کسی حاکم کے لیے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ بیک وقت حدیث و فقہ کا عالم[4]، صاحب عقل و فراست اور زاہد و متقی نہ ہو[5]

---

[1] ابو عبداللہ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن الحارث الاصبحی المدنی۔ آپ امام، حافظ، فقیہ امت، شیخ الاسلام، امام دار الہجرۃ ہیں ـــــــ آپ تاریخ اسلام کے معروف ترین چار اماموں میں سے ایک ہیں۔ ۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ میں مدینہ منورہ میں چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔

[2] ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف القرشی المطلبی المکی ہیں۔ آپ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نسب اور آپؐ کی سنت کے خادم و محافظ تھے۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اسی سال امام ابو حنیفہؒ نے وفات پائی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے امام ابو حنیفہؒ کے عوض ملت اسلامیہ کو امام شافعی عطا کیے۔ آپ ائمہ حفاظ میں سے ایک تھے۔ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ لغت و ادب میں آپ کو سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کا شمار اسلام کے ان ائمہ میں ہوتا ہے جن کی اقتداء کی جاتی ہے۔ آپ نے ۲۰۴ھ میں مصر میں وفات پائی۔

[3] امام ابو حنیفہؒ، امام اعظم اور فقیہ عراق کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نعمان بن ثابت بن زوطا التیمی الکوفی ہیں۔ آپ تاریخ اسلام کے مشہور ترین چار اماموں میں سے ایک ہیں۔ آپ کے متبعین سب سے زیادہ ہیں۔ سرزمین کوفہ میں ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے دورِ خلافت میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں خلیفہ منصور کے قید خانہ میں وفات پائی۔

[4] یہ بھی ضروری ہے کہ قاضی ناسخ و منسوخ سے بھی بخوبی آگاہ ہو تاکہ منسوخ کے مطابق فیصلے نہ کرتا رہے۔ وہ کتاب اللہ کے اکثر احکام سے باخبر ہو۔ صحابہ کے متفق علیہ اور اختلافی اقوال، فقہاءِ تابعین کی آراء اور خیر القرون کے دیگر اہلِ علم کے آثار کو بھی جانتا ہو۔ صحیح اور ضعیف قول کے درمیان امتیاز کر سکتا ہو۔ نئے پیش آنے والے مسائل کا حل کتاب اللہ میں اور اگر اس میں نہ ملے تو حدیث نبوی میں، اور اگر اس میں بھی نہ ملے تو صحابہ کے تعامل اور متفق علیہ اقوال کی روشنی میں تلاش کرے۔ اگر کسی مسئلے میں صحابہ میں اختلاف پایا جاتا ہو تو ان کا جو قول کتاب و سنت سے قریب تر ہو یا اکابر صحابہ کے فتووں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو، اسے اختیار کرے۔

[5] حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک صحیح قاضی نہیں بن سکتا جب تک اس میں پانچ صفات نہ پائی جاتی ہوں:
(۱) پاکباز ہو (۲) متحمل مزاج اور بردبار ہو (۳) کتاب و سنت اور اسلاف کی آراء کا عالم ہو (۴) اہلِ عقل سے مشورہ لیتا ہو اور (۵) اللہ کے بارے میں کسی کی ملامت کا خوف اس کے دل میں نہ ہو۔
حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ قاضی میں سات صفات ضروری ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی کم ہو (باقی اگلے صفحہ پر)

امام مالکؒ فرماتے ہیں :-

" قاضی میں جن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے وہ میری رائے میں اس دور میں شاذ و نادر ہی کسی ایک شخص میں جمع ہوتے ہیں، لہٰذا جب ان میں سے دو وصف کسی شخص میں جمع ہو جائیں تو اسے قضاء کے منصب پر فائز کر دینا چاہیے اور وہ دو وصف ہیں :-

(۱) علم

(۲) زہد و تقوٰی

عبدالملکؒ بن حبیب فرماتے ہیں :-

" قاضی میں اگر سات صفات نہ بھی جمع ہوں تو بھی اس میں عقل اور تقوٰی کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ عقل اس لیے کہ اس کے ذریعہ وہ پیش آمدہ قضیہ کی صحیح نوعیت معلوم کر سکے گا — اور اس لیے بھی کہ اس سے تمام اوصاف حمیدہ کا گہرا تعلق ہے اور تقوٰی اس لیے کہ اس کے ذریعے آدمی پاک دامن رہ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک عقلمند آدمی علم کی جستجو کرے گا تو اسے پالے گا لیکن اگر کسی شخص کا دامن عقل سے خالی ہو تو وہ اسے تلاش کرنے سے نہیں پا سکتا۔"

اس کتاب کا آغاز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فیصلوں سے کر رہا ہوں جن کا تعلق قصاص اور دیت کے مقدمات سے ہے اس لیے کہ امام مسلمؒ کی روایت کے مطابق حضورؐ نے ایک صحیح حدیث میں ارشاد فرمایا ہے :-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو یہ اس کا نقص شمار ہوگا۔

(۱) عقل (۲) دین کا فہم (۳) زہد و اتقاء (۴) طہارت (ظاہری و باطنی) (۵) صراحت سے بات کرنے کی استعداد (۶) سنت کا علم (۷) فقہی احکام کا علم۔

[۱] عبدالملک بن حبیب بن سلیمان بن ہارون بن جاہمہ بن عباس بن مرداس السلمی ابو مروان سرزمین اندلس کے عظیم فقیہ، محدث، نحوی، لغوی، شاعر، علم الانساب کے ماہر اور مؤرخ تھے۔ سنہ ۱۸۰ھ کے بعد پیدا ہوئے اور ذوالحجہ ۲۳۸ یا ۲۳۹ھ میں وفات پائی۔ قاضی عیاض نے ترتیب المدارک (ج ۳، ص ۳۰، ۴۸) میں، ابن فرحون نے الدیباج المذہب (ص ۱۵۴ - ۱۵۶) میں، ابو بکر اشبیلی نے الفہرس (ص ۲۰۲، ۲۶۵) میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (ج ۱، ص ۵۳۷) میں ان کا تعارف کرایا ہے۔

[۲] حجۃ الاسلام ابو الحسین امام مسلم بن حجاج بن مسلم قشیری نیشاپوری، صحیح مسلم کے مؤلف ہیں۔ سنہ ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ زندگی بھر امام بخاریؒ کے ساتھ رہے اور ان سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ ۲۴ رجب اتوار کی شام کو سنہ ۲۶۱ھ میں وفات پائی۔ یہ حدیث صحیح مسلم — کتاب "القسامۃ" باب "المجازاۃ بالدماء فی الآخرۃ" میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی گئی ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری کتاب "الرقاق" باب "القصاص یوم القیمۃ" میں موجود ہے۔ فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۶۵۳۳ ہے۔ صحیح بخاری باب قولہ تعالیٰ "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا" میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ فتح الباری میں اس کا نمبر ۶۸۶۴ ہے۔

یہ حدیث بظاہر حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ اس حدیث سے ٹکراتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا اِنَّ اَوَّلَ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اِنَّ اَوَّلَ مَا یَقْضِی اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی بَیْنَ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فِی الدِّمَاءِ وَاَوَّلُ مَا یُنْظَرُ فِیْہِ مِنْ عَمَلِ الْعَبْدِ الصَّلَاۃُ، فَمَنْ وُجِدَتْ لَہٗ صَلَاۃٌ نُظِرَ فِیْ سَائِرِ اَعْمَالِہٖ وَمَنْ لَمْ تُوْجَدْ لَہٗ صَلَاۃٌ لَمْ یُنْظَرْ فِیْ شَیْءٍ مِنْ عَمَلِہٖ وَلَیْسَ بَعْدَ الشِّرْکِ بِاللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ اَعْظَمُ مِنْ قَتْلِ النَّفْسِ۔"	اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلا فیصلہ خون ریزی کے متعلق کرے گا اور بندے کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز دیکھے گا جس کے اعمال نامہ میں نماز کا عمل ہوگا اس کے باقی اعمال بھی دیکھے گا لیکن جس کے اعمال نامے میں نماز نہیں ہوگی اس کے باقی اعمال کو دیکھے گا ہی نہیں۔ اور شرک کے بعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک قتل سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

لَزَوَالُ الدُّنْیَا بِجَمِیْعِ مَا فِیْہَا اَھْوَنُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ قَتْلِ امْرِءٍ مُسْلِمٍ۔	دنیا و مافیہا کا زوال اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان آدمی کے قتل سے کم تر ہے۔

یہ حدیث ابن الاحمر نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مَا یُحَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ صَلَاتُہٗ" قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا" اس حدیث کو اصحاب سنن و مسانید نے روایت کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۱۱ ص ۳۹۶ میں اس ظاہری تعارض کا جواب اس طرح دیا ہے:

"پہلی حدیث کا تعلق مخلوق کے معاملات سے ہے اور دوسری کا خالق کی عبادت سے ہے" امام نسائی نے حضرت ابن مسعودؓ سے مروی حدیث میں دونوں حصوں کو جمع کر دیا ہے۔ وہاں روایت یوں ہے:

اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ الْعَبْدُ عَلَیْہِ صَلَاتُہٗ وَاَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ فِی الدِّمَاءِ۔	کہ بندے سے سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا اور لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون ریزی کا فیصلہ کیا جائے گا)۔

نسائی کی جس روایت کی جانب حافظ ابن حجر نے اشارہ کیا ہے وہ سنن نسائی باب "تحریم الدم" (۷-۸۳) میں پائی جاتی ہے۔

[۱] محمد بن معاویہ بن عبدالرحمٰن بن معاویہ بن اسحاق بن عبداللہ بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک بن مروان ابوبکر المعروف بابن الاحمر، یہ صاحب علم کی حد تک علماء میں سے الحمیدی نے "جذوۃ المقتبس" (ص ۸۴) میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ابن الاحمر نے مسند تالیف کی۔ الحمیدی لکھتے ہیں کہ ابن الاحمر پہلے شخص ہیں جن کی سنن نبویہ پر مشتمل کتاب اندلس پہنچی اور لوگوں نے اس سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ الضبی نے بُغیۃ الملتمس (ص ۱۲۷) میں بھی ابن الاحمر کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن الاحمر نے ۳۵۸ھ میں وفات پائی۔

یہ حدیث امام نسائی نے (۷-۸۲) باب "تعظیم الدم" میں عن ابن اسحاق عن ابراھیم بن مہاجر عن اسماعیل مولیٰ عبداللہ بن عمرو عن عبداللہ بن عمرو بن العاص کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ حضور نے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَتْلُ	اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے (باقی اگلے صفحہ

قصاص و دیت کے عمومی احکام

رسول اکرم علیہ السلام کا ارشاد ہے :-

مُؤْمِنٍ أَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ مِنْ زَوَالِ الدُّنْيَا۔ — ایک مومن کا قتل اللہ کے نزدیک تمام دنیا کی تباہی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

امام نسائی کہتے ہیں کہ اس حدیث میں ابراہیم بن مہاجر راوی بھی ہے جو قوی نہیں۔

پھر امام نسائی نے یہ حدیث ایک دوسری سند عن ابن عدی عن شعبة عن یعلی بن عطاء عن ابیہ عن عبد اللہ بن عمرو کے ساتھ روایت کی ہے ۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

لَزَوَالُ الدُّنْيَا أَهْوَنُ عِنْدَ اللهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ۔ — ساری دنیا کا زوال اللہ کے نزدیک ایک مومن کے قتل سے ہلکا ہے۔

شعبہ سے محمد بن جعفر نے بھی یہی روایت بیان کی ہے جو اس سے ابن ابی عدی نے روایت کی ہے۔

امام ترمذی نے یہ حدیث جامع ترمذی میں (۴ - ۱۶) کتاب الدیات باب ما جاء فی تشدید قتل المومن میں ابن ابی عدی سے روایت کی ہے ۔ اس کے بعد محمد بن جعفر کی روایت نقل کی ہے اگرچہ وہ مرفوع نہیں - ترمذی کہتے ہیں "محمد بن جعفر کی روایت ابن ابی عدی کی روایت کے مقابلہ میں صحیح تر ہے ۔" پھر اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرو کی روایت کردہ حدیث کو ابن ابی عدی نے شعبہ سے، انھوں نے یعلی بن عطاء سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے عبد اللہ بن عمرو سے اور انھوں نے رسول کریم سے روایت کیا ہے، جبکہ محمد بن جعفر اور دوسرے راویوں نے یہ حدیث شعبہ سے انھوں نے یعلی بن عطاء سے روایت کی ہے، مگر مرفوعاً نہیں ۔ اسی طرح سفیان ثوری نے یہ حدیث یعلی بن عطاء سے موقوفاً روایت کی ہے اور اس حدیث کو مرفوع کی نسبت موقوف روایت کرنا زیادہ صحیح ہے ۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو کی اس روایت کی تائید میں مجھے ایک روایت صحیح سند کے ساتھ مل گئی ہے ۔ ولید بن مسلم، مروان بن جناح سے، وہ ابو الجہم جوزجانی سے، وہ براء بن عازب سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی حدیث روایت کرتے ہیں۔ اس کے آخر میں بغیر حق (ناحق) کے الفاظ زیادہ ہیں ۔ یہ حدیث ابن ماجہ نے (۲ - ۴۷۸) روایت کی ہے ۔ البوصیری "الزوائد" میں لکھتے ہیں "اس حدیث کی سند صحیح اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ اس کی سند میں ولید نے سماع کی تصریح کی ہے لہٰذا ولید سے تدلیس کی تہمت زائل ہو گئی، دیگر محدثین نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی روایت کی ہے ۔"

لہ مصنف نے حضورؐ کے اسم گرامی کے ساتھ صرف علیہ السلام لکھا ہے ۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام نہیں لکھا ۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ صرف صلاۃ یا سلام لکھنا جائز ہے یا نہیں ۔ امام نووی دونوں میں سے صرف ایک لفظ استعمال کرنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (الاحزاب: ۵۶) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجو۔

اس میں بعض شوافع بھی ان کے ہم خیال ہیں ۔ علماء کی ایک دوسری جماعت کا موقف یہ ہے کہ صلوٰۃ وسلام کو الگ الگ

مَنْ أَعَانَ فِي قَتْلِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِنِصْفِ كَلِمَةٍ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ آيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللهِ۔

جس نے کسی مسلم کے قتل میں نصف کلمہ (تھوڑا سا) کے ساتھ بھی تعاون کیا تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا: اللہ کی رحمت سے سب سے زیادہ مایوس آدمی۔[1]

ادا کرنے میں بالکل کوئی کراہت نہیں۔ اس لیے کہ امر کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں کام بیک وقت کیے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کام الگ الگ انجام دیے جائیں۔ مثلاً جو شخص صلوٰۃ صبح کو کہتا ہے اور سلام شام کو تو اس نے دونوں احکام کی تعمیل کر دی۔

قرآن کریم میں اس کی دوسری مثالیں بھی ملتی ہیں، مثلاً:

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (البقرۃ: ۴۳) یعنی نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو، اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔

یا مثلاً: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (الاحزاب: ۴۱-۴۲) یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

اور اسی طرح کی دوسری بے شمار آیات ہیں۔ ان آیات میں کئی احکام دیے گئے ہیں اور ان سب پر الگ الگ عمل کیا جاتا ہے۔ البتہ علماء سلف صلوٰۃ و سلام کو اکٹھا کرنے کے عادی ہو گئے تھے، لہٰذا اس طریقہ سے انحراف پسندیدہ امر نہیں ہے۔

ابن حجر الہیتمی کہتے ہیں کہ یہاں غیر پسندیدہ سے مراد خلاف اولیٰ ہے اور اس مسئلہ میں صحیح رائے یہی ہے۔ امام شافعی نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں کئی مقامات پر صرف صلوٰۃ لکھا ہے۔ (دیکھیے ص ۱۷۱)

اسی طرح امام بخاری نے "التاریخ الکبیر" میں اور خطیب بغدادی نے "تقیید العلم" میں بھی صلوٰۃ و سلام کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔

اس ضمن میں مزید تحقیق کے لیے دیکھیے علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی (۲۲-۸۴) اور مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتاب "الرفع والتکمیل" پر شیخ ابو غدہ کی تعلیق۔

[1] یہ حدیث ابن ماجہ (۲-۸۷۴) اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ اس کی سند میں یزید بن ابی زیاد راوی ضعیف ہے۔ یہ حدیث سیوطی نے "الجامع الصغیر" میں روایت کر کے ابن ماجہ کی جانب منسوب کی ہے اور اس کے ضعیف ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ المناوی نے فیض القدیر (۶: ۷۲) شرح الجامع الصغیر میں اس کے ضعف کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں یزید بن ابی زیاد شامی نامی راوی ضعیف ہے۔ منذری کی طرح حافظ ابن حجر نے بھی اس حدیث کو نہایت ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن الجوزی نے اس میں مزید اضافہ کیا ہے اور ابو حاتم کی پیروی میں اس حدیث کو موضوع کہا ہے۔ ابو حاتم "العلل" میں کہتے ہیں کہ "یہ حدیث باطل اور موضوع ہے"۔ (میزان الاعتدال (۴-۴۲۵) میں ہے کہ یزید بن ابی زیاد شامی کو منذری نے ضعیف اور نسائی نے متروک قرار دیا ہے۔ امام بخاری اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ پھر انھوں نے مذکورہ صدر حدیث بیان کر کے اس کو امام احمد کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔"

مجھے اس حدیث کے چند شواہد بعض دوسرے صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، ابن عباس اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم کی روایات سے ملے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت بیہقی نے شعب الایمان میں اور المنذری نے الترغیب والترہیب (۴-۲۰۳) میں بیان کی ہے۔ (باقی آگے)

صحیح بخاری[1] میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

لَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ فِي فُسْحَةٍ مِنْ دِينِهِ مَالَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا ۔	مومن اپنے دین میں کشادگی میں رہتا ہے جب تک کہ وہ قتل ناحق کا مرتکب نہ ہو۔

الاصیلی[2] کی روایت میں "مِنْ دِينِهِ" کے الفاظ ہیں جب کہ القابسی[3] کی روایت میں "مِنْ ذَنْبِهِ" ہے۔

المنذری نے اسے الاصبہانی کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔ (دیکھیے رموز الاحادیث ص ۴۰۶) حضرت ابن عباسؓ کی حدیث طبرانی نے حکیم بن نافع سے، انھوں نے نافع سے انھوں نے خلف بن حوشب سے، انھوں نے عبدالحکم بن عتیبہ سے اور انھوں نے سعید بن مسیب سے روایت کی ہے، ابونعیم "الحلیہ" میں لکھتے ہیں کہ خلف سے یہ روایت کرنے میں حکیم منفرد ہے۔

ابوسعیدؓ خدری کی حدیث ابن الجوزی نے روایت کی ہے اور عطیہ اور محمد بن عثمان کی وجہ سے اسے معلول قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ "القول المسدد فی الذب عن مسند الامام احمد" میں فرماتے ہیں کہ "محمد بن عثمان کی مرویات کو موضوع کہنا درست نہیں۔ عطیہ بلاشبہ ضعیف راوی ہے لیکن جب دوسری حدیث اس کی موید ہو تو ترمذی اس کو حسن قرار دیتے ہیں۔"

لہٰذا اس حدیث کو حسن لغیرہٖ قرار دیا جا سکتا ہے۔

[1] شیخ الاسلام، امام الحفاظ، امیر المومنین فی الحدیث ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ الجعفی البخاری "صحیح بخاری" کے مؤلف جو کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب ہے۔ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ میں عیدالفطر کی رات کو وفات پائی۔

یہ حدیث صحیح بخاری کتاب الدیات باب قول تعالیٰ "مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا" میں موجود ہے۔ یہ حدیث امام احمد نے مسند (۲-۹۴) میں بھی روایت کی ہے۔ امام حاکم کو وہم ہوا ہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود نہیں (المستدرک ۴-۳۵۰) میں ان کا قول ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر صحیح بخاری و مسلم میں موجود نہیں۔

[2] الاُصَیلی اُصَیلہ کی جانب منسوب ہے جو کہ اندلس میں طُلَیْطُلَہ کے علاقے میں ایک شہر کا نام ہے۔ ابو محمد عبداللہ بن ابراہیم عظیم محدث اور فقیہ تھے۔ انھوں نے صحیح بخاری نہایت قوی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ سند یہ ہے۔ اُصَیلی، ابوزید محمد بن احمد مروزی سے وہ ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر الفربری سے اور وہ امام بخاری سے روایت کرتے ہیں۔

اُصَیلی نے امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ کے اختلافی مسائل پر ایک کتاب تحریر کی تھی جس کا نام "الدلائل علیٰ امہات المسائل" تھا۔ مگر یہ کتاب اب علمی خزانے سے مفقود ہو گئی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ امام ابن الطلاع اس کتاب کے اقتباسات کثرت سے نقل کرتے ہیں۔

اُصیلی نے اندلس میں ۳۹۲ھ میں وفات پائی۔ ابن الفرضی نے "تاریخ العلماء والرواۃ بالاندلس" (۱-۲۴۹) میں ان کا تعارف دیا ہے۔ اسی طرح الحُمَیدی نے جذوۃ المقتبس (ص ۲۵۰-۲۵۸) میں، یاقوت حموی نے معجم البلدان (۱-۱۳) میں، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (۳-۱۰۲۴) میں اور خطیب بغدادی نے ایضاح المکنون (۱-۴۷۷) میں ان کا تعارف تحریر کیا ہے۔

[3] القابسی۔ بفتح القاف وکسر الباء۔ قابس کی جانب منسوب ہے جو کہ مہدیہ کے قریب افریقہ میں ایک شہر کا نام ہے (باقی اگلے صفحہ

الخطابی[1] کی کتاب میں ہے:۔

سُفیان[2] بن عُیَینَہ کہتے ہیں کہ قتل میں نصف کلمہ سے تعاون کرنے سے یہ مراد ہے کہ مثلاً قتل کی ترغیب دینے والا شخص دوسرے شخص کو صرف یوں کہے "اق" یعنی اقتل (فلاں آدمی کو قتل کر دو) جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ "کفی بالسیف شا" جب کہ حضورؐ کا مقصد یہ تھا کفی بالسیف شاھداً[3] (تلوار گواہی دینے کے لیے کافی ہے)۔

ابوالحسن علی بن محمد بن خلف المعافری، ابن القابسی کی کنیت سے معروف ہیں۔ یہ عظیم حافظ حدیث، محدث، فقیہ، امام اور علامہ تھے۔ یہ بھی صحیح بخاری کی روایت کرنے والوں میں ہیں۔ القابسی اور اُصَیلی دونوں ابوزید مروزی سے روایت کرتے ہیں۔ ۴۰۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

ان کے تعارف کے لیے دیکھیے:۔

(وفیات الاعیان لابن خلکان (۳ - ۳۲۰-۳۲۲)، نکت الھمیان للصفدی (ص ۲۱۷ - ۲۱۸) تذکرۃ الحفاظ للذھبی (۳ - ۱۰۷۹) اور کشف الظنون لحاجی خلیفۃ (ص ۸۱۸)

[1] الخطابی۔ ابوسلیمان حمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب البُستی۔ "بُسْت" باء کی پیش اور سین کی جزم کے ساتھ، سجستان اور ہرات کے درمیان ایک شہر کا نام ہے۔ حدیث نبوی اور اس کے علوم وعلل کے امام تھے۔

ان کی جلیل القدر تصنیفات میں سے صرف مندرجہ ذیل کتب ہم تک پہنچی ہیں:

۱ - شرح ابوداؤد۔ یہ چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۲ - غریب الحدیث۔ یہ ابھی تک چھپی نہیں۔ اس کا قلمی نسخہ استنبول کے مکتبہ الفاتح میں موجود ہے۔ اس کا نمبر ۱۱۱۴ ہے۔ یہ نسخہ ناقص ہے، البتہ اسی لائبریری میں نمبر ۱۱۱۵ کے تحت اس کتاب کا کامل نسخہ بھی موجود ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے:۔ "فہرس المخطوطات المصورۃ لجامعۃ الدول العربیۃ" (۱ - ۸۹) ابن خلکان نے "وفیات الاعیان" (۲ - ۲۱۴-۲۱۶) میں، البغدادی نے "خزانۃ الادب" (۱ - ۲۸۲) میں، القفطی نے "انباہ الرواۃ" (۱ - ۱۲۵) میں، ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (۳ - ۱۰۱۸) میں اور یاقوت الحموی نے "معجم البلدان" (۱ - ۴۱۵) میں ان کا تعارف کرایا ہے۔

[2] سُفیان بن عُیَینَہ، ابن ابی عمران میمون الہلالی ابو محمد کوفی، حدیث کے عظیم امام تھے۔ یہ ان دو اشخاص میں سے ایک ہیں جن کے بارے میں امام شافعیؒ نے فرمایا تھا:

"اگر مالک اور سفیان بن عُیَینَہ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔"

سفیان نے ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ اسماء الرجال کی تمام کتابوں میں ان کا تفصیلی تعارف موجود ہے۔

[3] ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت مجھے کہیں نہیں ملی۔ سنن ابن ماجہ (۲ - ۸۶۹) "کتاب الحدود" باب "الرجل یجد مع امرأتہ رجلاً" میں قبیصہ بن حُریث سے اور وہ سلمۃ بن المحبق سے روایت کرتے ہیں کہ جب حدِ زنا والی آیت نازل ہوئی تو ابوثابت سعد بن عبادہ سے، جو نہایت غیور آدمی تھے، کہا گیا کہ اگر تم اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو پاؤ تو کیا کرو گے؟ وہ فرمانے لگے: "میں دونوں کو تلوار سے قتل

الخطابی کی کتاب کے علاوہ دیگر کتب میں یوں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ وَلَمْ يُشْرِكْ بِهِ شَيْئًا وَلَمْ يَتَنَدَّ بِدَمٍ مُسْلِمٍ كَانَ لَهُ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ أَنْ يَغْفِرَ لَهُ۔[1]

جو شخص اللہ کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ اس نے نہ تو شرک کا ارتکاب کیا اور نہ ہی وہ کسی مسلم کے خون سے آلودہ ہوا تو اللہ تعالیٰ پر اس کا یہ حق ہے کہ اس کو بخش دے۔

کر دوں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان کو دیکھ کر چار گواہ لینے کے لیے چلا جاؤں، اور وہ اس اثنا میں اپنا کام کر کے چلتا بنے۔ یا پھر اگر میں لوگوں سے کہوں کہ میں نے فلاں شخص کو یہ کام کرتے دیکھا ہے (تو گواہ مہیا نہ کرنے کی وجہ سے) تم مجھ پر حد قذف لگاؤ اور کبھی میری شہادت قبول نہ کرو۔" جب یہ واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: "تلوار کی شہادت ہی کافی ہے۔" پھر فرمایا کہ "إِلَّا إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَتَتَابَعَ فِي ذَالِكَ السَّكْرَانُ وَالْغَيْرَانُ" (مگر مجھے خدشہ یہ ہے کہ نشہ میں مخمور اور غیور اشخاص اس طرح لوگوں کو قتل نہ کرنے لگیں)۔ البوصیریؒ "الزوائد" میں کہتے ہیں کہ "اس حدیث کی سند میں قبیصہ بن حریث بن قبیصہ راوی ہے جس کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس کی روایت کردہ احادیث میں تامل کی ضرورت ہے۔ ابن حبان نے اس کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ اس سند کے باقی راوی ثقہ ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اپنی پوری تفصیلات اور اس میں مندرجہ احکام کے ساتھ "کتاب الطلاق" کے آخر میں "باب اللعان" میں آرہی ہے۔

باقی رہا امام بخاری کا یہ قول کہ اس راوی کے بارے میں تامل ہے۔ یا علماء نے اس سے سکوت اختیار کیا ہے، تو یہ امام بخاری کی خاص اصطلاح ہے جس سے آگاہی ضروری ہے۔ ابن کثیرؒ "الباعث الحثیث" (ص ۱۰۱) میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری جب کسی راوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ "علماء اس کے بارے میں خاموش ہیں یا یہ کہ اس کی حدیث کے قبول کرنے میں تامل ہے" تو وہ راوی ان کی نظر میں بہت ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے مگر وہ نہایت ہی لطیف انداز میں اس طرح جرح و تعدیل کرتے ہیں، لہٰذا اس سے آگاہ رہنا چاہیے۔"

ابن القطان کہتے ہیں کہ امام بخاری جس راوی کو "منکر الحدیث" کہتے ہیں اس سے روایت کرنا بالکل درست نہیں۔ دیکھیے المیزان للذہبی (۱-۵)۔

[1] یہ حدیث ابن ماجہ نے اپنی سنن (۲-۸۷۳) میں "کتاب الدیات" "باب التغلیظ فی قتل مسلم" میں عبدالرحمٰن بن عائذ سے اور انھوں نے عقبہ بن عامر الجہنی سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ اس میں بدم حرام (ناحق خون) کے الفاظ ہیں۔ البوصیریؒ "الزوائد" میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ بشرطیکہ عبدالرحمٰن بن عائذ کا سماع عقبہ بن عامر سے ثابت ہو۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن، عقبہ سے مرسلاً روایت کرتے ہیں اور انھوں نے براہ راست عقبہ سے احادیث نہیں سنیں۔

میں کہتا ہوں کہ عبدالرحمٰن بن عائذ کے بارے میں محدثین کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن مندہ کہتے ہیں کہ امام بخاری نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ابن عساکر کہتے ہیں کہ بخاری نے ایسا نہیں کیا۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے حضورؐ کا زمانہ نہیں پایا نیز یہ کہ وہ ضعیف راوی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

الخطّابی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا یَزَالُ الْمُؤْمِنُ صَالِحًا مُعْنِقًا مَا لَمْ یُصِبْ دَمًا فَإِذَا أَصَابَ دَمًا بَلَّحَ" (مومن اس وقت تک نیک، ہلکا پھلکا اور نیکی کے کاموں میں سرگرم رہتا ہے جب تک کہ وہ ناحق خون ریزی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ جب خون ریزی کا ارتکاب کرتا ہے تو تھک کر عاجز ہو جاتا ہے)۔ الخطّابی کہتے ہیں مُبَلِّحٌ کے معنی تھک جانے کے ہیں۔

عربی محاورہ میں بولتے ہیں بَلَّحَ الْفَرَسُ وَانْقَطَعَ جَرْیُہٗ (گھوڑا تھک گیا اور اس کی تیز رفتاری ختم ہوگئی) بَلَّحَ الْغَرِیْمُ کے معنی ہیں مقروض مفلس ہوگیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عبدالرحمٰن کی روایات حضرت علیؓ، معاویہؓ اور عمرؓ سے مرسل ہیں۔ اور کسی نے بھی عقبہ بن عامرؓ سے ان کے سماع کا ذکر نہیں کیا۔ دیکھیے (تہذیب التہذیب ۶-۲۰۳) یہ حدیث ایک واقعہ پر مشتمل ہے جس کا ذکر امام احمد نے مسند (۴-۱۴۸) میں کیا ہے۔ اس واقعہ کو یزید بن ہارون روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسماعیل بن ابی خالد، عبدالرحمان بن عائذ شامی سے روایت کرتے ہیں کہ عقبہؓ بن عامر الجہنی مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے لیے آئے تو لوگ ان کے پیچھے چلنے لگے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ تم لوگ میرے پیچھے کیوں آ رہے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ آپ حضور کی صحبت میں رہے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ کچھ وقت آپ کے ساتھ گذاریں اور آپ کو سلام کہیں۔ عقبہؓ کہنے لگے کہ یہاں اتر کر نماز پڑھو۔ وہ اترآئے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔ جب سلام پھیرا تو انھوں نے مذکورہ بالا حدیث لوگوں کو سنائی۔

لہ یہ حدیث ابوداؤد نے (۴-۱۰۴) کتاب "الفتن باب" فی تعظیم قتل المومن" میں خالد بن دہقان سے روایت کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم قسطنطنیہ کے غزوہ پر گئے تو ذلیقہ کے مقام پر اہل فلسطین میں سے ایک معزز شخص آیا جس کو سب لوگ پہچانتے تھے۔ اس کا نام ہانی بن کلثوم بن شریک کنانی تھا۔ اس نے عبداللہ بن ابی زکریا کو سلام کیا۔ وہ انھیں بخوبی جانتے تھے۔ اس حدیث کے راوی خالد کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی زکریا نے کہا کہ میں نے امّ درداء سے سنا وہ کہتی ہیں کہ میں نے ابوالدرداء سے سُنا، وہ کہتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كُلُّ ذَنْبٍ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَغْفِرَهُ إِلَّا مَنْ مَاتَ مُشْرِكًا أَوْ مُؤْمِنٌ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا" (ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ بخش دے سوائے اس شخص کے جس کو موت شرک کی حالت میں آئے یا جو کسی مومن کو دانستہ قتل کر دے) یہ سن کر ہانی بن کلثوم نے کہا کہ میں نے محمود بن ربیع سے سُنا، وہ عُبادہؓ بن صامت سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا فَاغْتَبَطَ بِقَتْلِهِ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ مِنْهُ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا" (جو شخص کسی مومن کو قتل کرے اور پھر اس پر مسرت کا اظہار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے کسی نفل یا معاوضے کو قبول نہیں کرے گا)۔

خالد نے ہم سے کہا کہ پھر ابن ابی زکریا نے امّ الدرداء سے اور انھوں نے ابوالدرداء سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انھوں نے پھر وہی حدیث بیان فرمائی۔ البتہ اس کے الفاظ میں "صَالِحًا مُعْنِقًا" کے بجائے "مُعْنِقًا صَالِحًا" ہے۔ ابوداؤد اور المنذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔

یہ حدیث امام حاکم نے "مستدرک" میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ البتہ بخاری و مسلم

مسند بقی[1] اور البزار[2] میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

نے اسے روایت نہیں کیا۔ خالد بن دہقان ابوالمغیرہ دمشقی کے نام سے معروف ہے۔ یہ مقبول کے درجے میں ہے۔ سند کے باقی راوی ثقہ ہیں۔

[1] بقی بن مخلد "المسند الکبیر" کے مؤلف قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی کنیت ابوعبدالرحمان ہے۔ الکتانی "الرسالۃ المستطرفۃ" (ص ۴۷۔ ۴۸) میں لکھتے ہیں کہ ابن حزم نے تحریر کیا ہے کہ "بقی نے المسند الکبیر میں ایک ہزار تین سو سے کچھ اوپر صحابہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ کتاب فقہی ابواب کے مطابق ترتیب دی گئی ہے۔ یہ مسند بھی ہے اور مصنف بھی۔ کسی شخص نے ایسی کتاب مرتب نہیں کی۔"

ان کی وفات ۲۷۶ھ میں ہوئی۔

ان کے تعارف کے لیے دیکھیے:۔

الضبی کی "بغیۃ الملتمس" (ص ۲۴۵) الحمیدی کی "جذوۃ المقتبس" (ص ۱۷۷) اور حافظ ذہبی کی "تذکرۃ الحفاظ (۲ - ۶۲۹)

امام ابو محمد ابن حزم نے "جوامع السیرۃ" کی ایک پوری فصل (ص ۲۷۵ تا ۳۱۵) میں احادیث کے راوی صحابہ کے نام اور ان کی مرویات کی تعداد ذکر کی ہے۔ فصل کے آخر میں وہ آخری صحابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمارے علم کی حد تک یہ آخری صحابی ہیں جنھوں نے آنحضورؐ سے حدیثیں روایت کیں۔ اس سے پہلے امام حافظ بقی بن مخلد اندلسی اور ان سے پہلے کے علماء نے بھی یہی بات لکھی ہے۔"

امام بقی بن مخلد کی یہ کتاب آج اسلام کے گم شدہ خزانے کا حصہ بن گئی ہے۔ بروکلمان نے "تاریخ الادب العربی (۳ - ۳۱۰) میں بھی یہی لکھا ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے "تحفۃ الاحوذی" (۱ - ۳۴۱) میں لکھا ہے کہ مذکورہ کتاب کا ایک نسخہ جرمنی کی لائبریری میں موجود ہے۔ لیکن بعض علماء نے اس کتاب کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور وہ انھیں وہاں نہ ملی۔

عصر حاضر میں ہمارے بعض اساتذہ نے یہ مستحسن کوشش کی ہے کہ انھوں نے بقی بن مخلد کی مرویات کو محلی ابن حزم اور علماء اندلس کی دوسری کتابوں میں سے چھانٹ کر الگ کیا اور باقاعدہ ایک کتاب مرتب کی جس کا نام انھوں نے "مسند بقی بن مخلد" رکھا۔ یہ مستحسن کوشش ہے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو بارآور فرمائے۔

[2] مسند البزار حافظ ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار متوفی ۲۹۲ھ کی تالیف ہے۔ انھوں نے مسند مرتب کی، احادیث پر نقد و جرح کی اور ضعیف روایات کے ضعف پر روشنی ڈالی۔ ان کے تعارف کے لیے دیکھیے:

(خطیب بغدادی کی "تاریخ بغداد" (۴ - ۳۳۴) امام ذہبی کی "تذکرۃ الحفاظ" (۲ - ۶۵۳) اور "میزان الاعتدال" (۱ - ۱۲۴) ابن العماد حنبلی کی "شذرات الذہب" (۲ - ۲۰۹) اور الکتانی کی "الرسالۃ المستطرفۃ" (ص ۶۸)

مسند بزار کا پانچویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ایک نسخہ بصورت قلمی نسخہ استنبول میں واقع مراد ملا لائبریری میں موجود ہے۔ اس کا نمبر ۵۷۸ ق ۱۰ ہے۔ اس مسند کا آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایات کردہ احادیث سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی

لَوْ اَنَّ اَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی قَتْلِ مُسْلِمٍ لَاَدْخَلَهُمُ اللّٰهُ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا۔	اگر آسمان اور زمین والے سب مل کر ایک مسلم کو قتل کریں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جہنم میں جھونک دے گا۔[۱]

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روایت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حضور اس حال میں حاضر ہوا کہ وہ کسی مسلم کے خونِ ناحق میں شریک نہ ہوا ہو تو وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کی پیٹھ پر گناہوں کا کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔

روایت کردہ احادیث پر ہوتا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ قدرے ناقص ہے۔ دیکھیے فہرس المخطوطات المصورۃ لجامعۃ الدول العربیۃ (۱- ۹۹، ۱۰۰)

حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) نے البزار کی ان احادیث کو اپنی مشہور تصنیف "مجمع الزوائد ومنبع الفوائد" میں جمع کیا ہے جو صحاح ستہ میں نہیں پائی جاتیں۔ موصوف نے مسند بزار کے علاوہ مسند احمد، مسند ابی یعلیٰ موصلی اور طبرانی کی معاجم ثلاثہ کی ان احادیث کو بھی اس کتاب میں جمع کر دیا ہے جو صحاح ستہ میں موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان مساعی جمیلہ کا اجر و ثواب عطا فرمائے۔

[۱] یہ حدیث ترمذی نے (۴-۱۷) کتاب "الدیات" باب "الحکم فی الدماء" میں حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "لَوْ اَنَّ اَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اشْتَرَكُوْا فِیْ دَمِ مُؤْمِنٍ لَاَكَبَّهُمْ فِی النَّارِ۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔ یہ حدیث سیوطی نے "الجامع الصغیر" میں روایت کی ہے۔ المناوی "الجامع الصغیر" کی شرح "فیض القدیر" (۵-۳۰۸) میں لکھتے ہیں کہ البغوی نے ترمذی کے اتباع میں اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ اس کی سند میں یزید الرقاشی راوی ہے جو ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجر تقریب التہذیب (۲-۳۶۱) میں لکھتے ہیں "یزید بن ابان الرقاشی ابو عمرو البصری القاص زاہد پانچویں درجے کا ضعیف راوی ہے۔ البزار کی یہ حدیث الہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۷-۲۹۶) میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ عہد رسالت میں ایک شخص کو کسی نے قتل کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے منبر پر تشریف لائے اور فرمایا: "اَلَا تَعْلَمُوْنَ مَنْ قَتَلَ هٰذَا الْقَتِیْلَ وَاَنَا بَیْنَ اَظْهُرِكُمْ" (کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا ؟ حالانکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں) آپ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے۔ لوگوں نے کہا بخدا ہمیں معلوم نہیں! حضورؐ نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے وہی الفاظ ارشاد فرمائے جو اس حدیث میں ہیں۔ آخر میں مزید فرمایا کہ جو شخص میرے اہلِ بیت کو عداوت کی نظر سے دیکھے گا اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ جہنم میں گرائے گا۔" الہیثمی کہتے ہیں کہ یہ حدیث البزار نے روایت کی ہے اور اس میں داؤد بن عبد الحمید اور بعض دوسرے راوی ہیں جو ضعیف ہیں۔

اس حدیث کی تائید بعض دوسری روایات سے ہوتی ہے جو طبرانی میں ابن عباس، ابو بکرہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ الہیثمی نے "مجمع الزوائد" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: (باقی اگلے صفحہ پر)

الحربی کی شرح میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات نماز میں ایک

"عطار بن ابی مسلم کے سوا اس کے سب راویوں کی روایات صحیحین میں ہیں۔ ابن حبان نے عطار کو ثقہ قرار دیا ہے۔ جب کہ محدثین کی دوسری جماعت نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ ابوبکرہ کی روایت کے بارے میں الہیثمی کہتے ہیں کہ اس کی سند میں جسر بن فرقد نامی راوی ہے جو ضعیف ہے اور حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث میں ابوحمزہ اعور راوی ہے جو متروک الحدیث ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ ابوحمزہ کی روایت قابلِ قبول ہے۔ اس حدیث کے دوسرے راوی ثقہ ہیں۔"

ؔ ابراہیم بن اسحاق بن بشیر بن عبداللہ البغدادی حربی، ابو اسحاق عظیم محدث اور تمام علوم دینیہ میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ انھوں نے غریب الحدیث، مناسک حج، معجود القرآن اور دلائلِ نبوت کے موضوعات پر بڑی عمدہ کتابیں تحریر کیں جو اب نایاب ہو چکی ہیں۔ ابن الاثیر نے اپنی کتاب "النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر" کے مقدمہ میں ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ابن قتیبہ کے زمانہ میں امام ابراہیم بن اسحاق حربی نے غریب الحدیث کے موضوع پر ایک جامع کتاب مرتب کی تھی۔ یہ کتاب نہایت ضخیم اور کئی جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس میں انھوں نے نہایت بسط و تفصیل سے کام لیا تھا۔ کسی حدیث میں اگر ایک لفظ بھی غریب ہوتا تو الحربی اس کی پوری سند اور متن نقل کر کے اس پر طویل بحث کرتے ہیں۔ اسی طوالت کی بنا پر یہ کتاب مقبول نہ ہو سکی۔ اگرچہ یہ کتاب کثیر الفوائد اور نہایت عمدہ تھی۔ اس کے مصنف عظیم امام، حافظ، فقیہ، محدث، لغوی اور ادیب تھے۔"

الحربی ۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۸۵ھ میں وفات پائی۔ ان کے تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیے:۔

(صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی (۲-۴۰۸، ۲۳۲) معجم الادباء للبغدادی (۱-۳۷، ۴۶) تاریخ بغداد للخطیب (۶-۲۷، ۴۰) تذکرۃ الحفاظ للذہبی (۲-۵۸۴)

یہ حدیث امام احمد نے مسند (۵-۱۷۰) میں پوری تفصیل کے ساتھ یحییٰ ابن سعد سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں:

یحییٰ بن سعد، قدامہ بن عبداللہ سے اور وہ جسرہ بنت دجاجہ سے روایت کرتے ہیں کہ جسرہ عمرے کے لیے گئیں۔ ان کا گذر ربذہ نامی مقام سے ہوا (جہاں ابوذر غفاریؓ مقیم تھے) انھوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو فرماتے ہوئے سنا:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات عشاء کی نماز کے لیے اٹھے۔ آپ نے نماز پڑھائی۔ کچھ لوگ آپ کے بعد نماز پڑھنے لگے۔ آپ نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ جب آپ نے دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے ہیں۔ تو آپ واپس اپنی جگہ پر آ کر نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ میں آکر آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے دائیں جانب کھڑے ہونے کا اشارہ کیا تو میں دائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر عبداللہ بن مسعودؓ آئے اور وہ میرے اور حضور کے پیچھے کھڑے ہو گئے آپ نے انھیں اپنے بائیں ہاتھ کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر ہم تینوں اپنی اپنی نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ جس قدر قرآن

بی آیت بار بار پڑھتے رہے پھر آپؐ نے فرمایا "دَعَوْتُ لِاُمَّتِیْ" (میں نے اپنی امت کے لیے دعا کی)

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں میں نے عرض کیا "کیا میں لوگوں کو یہ بشارت نہ سنا دوں؟" آپؐ نے فرمایا "کیوں نہیں؟" چنانچہ میں خوشی خوشی جلدی سے چلا گیا۔

ہم پڑھ سکتے تھے ہم نے پڑھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ایک ہی آیت نماز فجر تک دہراتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اشارہ کیا کہ آپؐ سے ایک آیت کو دہرانے کا سبب دریافت کریں۔ ابن مسعودؓ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ میں اس ضمن میں بات نہیں کروں گا الا یہ کہ حضورؐ خود گفتگو کا آغاز فرمائیں۔

میں نے عرض کی "میرے والدین آپؐ پر فدا ہوں آپؐ رات بھر ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے رہے، حالانکہ پورا قرآن آپؐ کو ازبر ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس طرح کرتا تو ہم اس پر ناراض ہوتے"۔ حضورؐ نے فرمایا "مجھے ایسی بشارت ملی ہے کہ اگر عام لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں تو نماز ترک کر دیں"۔ میں نے عرض کی "کیا میں لوگوں کو بشارت نہ دوں؟" آپؐ نے فرمایا "کیوں نہیں"۔ میں تیزی سے ابھی اتنی ہی دور گیا تھا جتنی دور پتھر پھینکا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو اس موقع پر وہاں آگئے تھے کہا "حضورؐ! اگر آپؐ لوگوں کو یہ بشارت سنائیں گے تو وہ عبادت کرنا ترک کر دیں گے"۔ چنانچہ آپؐ نے آواز دی کہ واپس آجاؤ اور میں واپس آگیا۔ جو آیت آپؐ بار بار تلاوت فرماتے رہے تھے وہ مندرجہ ذیل تھی:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (المائدہ: ۱۱۸)	اگر تو ان کو عذاب میں مبتلا کرے تو وہ تیرے بندے ہیں (تو ایسا کر سکتا ہے) اور اگر انھیں بخش دے تو تو غالب اور حکیم ہے۔

ابن کثیرؒ نے یہ حدیث اپنی تفسیر میں نقل کی ہے مگر اس پر نقد و جرح نہیں کی۔ دیکھیے (تفسیر ابن کثیر ۲ - ۱۲۱)۔

اس حدیث میں ایک راوی قدامہ بن عبداللہ ہیں۔ یہ البکر العامری الذہلی ابو روح الکوفی ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو مقبول راوی قرار دیتے ہیں۔

جسرہ بنت دجاجہ عامریہ کوفیہ، العجلی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن حبان بھی ان کو ثقہ راویوں میں شمار کرتے ہیں۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ یہ صحابیہ تھیں۔ امام بخاری کہتے ہیں جسرہ کی طرف عجیب باتیں منسوب ہیں۔ امام ابن حزم جسرہ کی روایات کو ناقابلِ اعتماد قرار دیتے ہیں۔ ابن القطان اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابن حزم کا یہ قول اس بات کے لیے کافی نہیں کہ جسرہ کی روایت کردہ احادیث کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ حافظ ابن حجر کے نزدیک جسرہ کی مرویات قابلِ قبول ہیں۔

ابن ماجہ نے "سنن" میں اس حدیث کو مختصراً روایت کیا ہے۔ البوصیریؒ "الزوائد" میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ البوصیری مزید کہتے ہیں کہ یہ حدیث نسائی نے سنن کبریٰ میں، امام احمد نے مسند میں، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں

قتل کے ملزم کو قید میں رکھنے کے احکام

اہلِ علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی کو قید میں رکھا یا نہیں؟ بعض علماء کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں نہ کوئی قید خانہ موجود تھا اور نہ ہی انھوں نے کسی کو قید میں رکھا۔[۱]

اور امام حاکم نے المستدرک میں روایت کی ہے۔ امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے (الفتح الربانی ۱۸ - ۱۳۶)

ربذہ: ایک مقام کا نام ہے جو عراق سے حج کے لیے جانے والوں کے راستے میں آتا ہے۔ مدینہ منورہ سے تین منزل کے فاصلے پر ہے۔ ذات العرق سے قریب ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی قبر اسی جگہ ہے۔ آپ نے زندگی کے آخری دور میں اسی جگہ سکونت اختیار کر لی تھی اور یہیں آپ نے وفات پائی۔ (دیکھیے معجم البلدان)

[۱] شرعی اصطلاح میں کسی کو قید میں رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو کسی تنگ جگہ میں بند کیا جائے۔ اس کے برعکس اس سے مقصود یہ ہے کہ اس شخص کو آزادانہ تصرفات سے روک کر نظر بند کر دیا جائے۔ خواہ یہ نظر بندی کسی گھر میں ہو یا مسجد میں یا کسی اور جگہ۔ الماوردی نے "الاحکام السلطانیہ" میں قید میں رکھنے کی یہی تعریف کی ہے۔

عہدِ رسالت اور خلافتِ صدیقی میں اسی قسم کی نظر بندی ہوا کرتی تھی۔ ناپسندیدہ لوگوں کو قید میں رکھنے کے لیے اس زمانہ میں باقاعدہ قید خانے نہ تھے۔ جب خلافتِ فاروقی میں فارس و روم کے علاقے فتح ہوئے اور رعیت پھیل گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صفوان بن امیہ سے ایک مکان چار ہزار درہم میں خرید کر اسے جیل بنا دیا۔

ملزم کو قید میں رکھنے کے بارے میں فقہا کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء کی رائے میں عہدِ رسالت اور خلافتِ صدیقی میں کوئی قید خانہ نہ تھا۔ نہ ہی حضورؐ اور حضرت صدیقؓ نے کسی کو قید و بند میں ڈالا۔ علماء کی دوسری جماعت قید میں رکھنے کو جائز قرار دیتی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قید ایک قسم کی تعزیر ہے۔ یہ حدِ شرعی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ تو قیدی کے کسی عضو کو کاٹا جا سکتا ہے، نہ زخمی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مال چھینا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلامی شریعت میں ان باتوں کی کوئی اجازت نہیں۔ نیز اس لیے کہ قید میں رکھنے کا مقصد قیدی کی اصلاح ہے نہ کہ اذیت رسانی اور عضو قطع کرنے سے اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ (الشرح الکبیر للمقدسی ۱۰ - ۳۴۸)۔

جو لوگ مجرم کو قیدی بنانے کو جائز کہتے ہیں وہ اس کے حق میں بہت سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ دلائل ہیں جن کا مصنف نے ذکر کیا ہے۔ ان پر تفصیلی گفتگو آگے آ رہی ہے۔ علاوہ ازیں وہ مندرجہ ذیل آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ — ان عورتوں کو گھروں میں روکے رکھو یہاں تک کہ انھیں (باقی اگلے صفحہ پر)

بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو قتل کے الزام میں مدینہ میں نظر بند کیا تھا یہ حدیث عبدالرزاق[1] اور نسائی[2] نے اپنی تصانیف میں بہز بن حکیم سے، اس نے اپنے باپ سے اور اس نے اپنے باپ سے

اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا۔ (النساء: ۱۵)

موت آجائے یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور راستہ کھول دے۔

حافظ زیلعی نے کنز کی شرح (۳-۱۷۹) میں قید کے جواز پر اللہ تعالیٰ کے اس قول سے دلیل اخذ کی ہے:

"اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ" (المائدۃ: ۳۳) (یا ان کو زمین سے جلاوطن کیا جائے)

وہ کہتے ہیں اس آیت کریمہ میں "نفی" سے مراد "حبس" (قید) ہے

مزید براں وہ اس بات سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو قتل کے الزام میں نظر بند کیا تھا۔ (اس کا تفصیلی تذکرہ آگے آرہا ہے)

زیلعی اجماع کو بھی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والوں نے اس (قید) پر اجماع کیا ہے"

ابن العربی "احکام القرآن" (۲-۵۹۸) میں لکھتے ہیں کہ "اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ" کی تفسیر میں علماء کے چار اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں نفی سے مراد قید و بند ہے۔ امام ابوحنیفہ اور اہل کوفہ کی رائے یہی ہے۔ امام مالک کا مشہور مسلک بھی یہی ہے کہ مجرم نے جس بستی میں جرم کیا ہے اس کے سوا کسی اور جگہ لے جا کر اس کو قید میں رکھا جائے۔

سچی بات یہ ہے کہ ایسے شخص کے لیے قید و بند جلاوطنی کے مترادف ہے۔ جہاں تک مجرم کو مشرکین کے علاقہ کی جانب جلاوطن کرنے کا تعلق ہے تو وہ درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ ایک طرح سے اسے کھلی چھٹی دینے کے مترادف ہے۔

[1] عبدالرزاق نے اس حدیث کا اپنی کتاب "مصنف" (۸-۳۰۶) میں ذکر کیا ہے۔ علامہ عبدالرزاق بن ہمام بن نافع حمیری صنعانی نہایت ثقہ امام تھے۔ وہ احادیث و آثار پر مشتمل متعدد کتابوں کے مؤلف تھے۔ ان کی مشہور کتاب "المصنف" اکیس ہزار تینتیس سے زیادہ احادیث اور اقوالِ صحابہ و تابعین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی گیارہ جلدیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ البتہ پہلی جلد، جو کتاب الطہارۃ پر مشتمل ہے ابھی منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ اس کی تلاش کا سہرا علامہ فاضل حبیب الرحمٰن اعظمی کے سر ہے۔

امام عبدالرزاق نے ۲۱۱ھ میں وفات پائی (دیکھیے المعارف لابن قتیبہ ص ۵۱۹)۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ عبدالرزاق اصحاب الحدیث میں سے تھے۔

[2] یہ حدیث سنن نسائی (۸-۶۶) بابٌ فی امتحان السارق بالضرب والحبس" میں ہے۔ امام نسائی کا نام و نسب ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن بحر بن سنان ہے۔ ۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۰۳ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی یہ عظیم امام اور حافظِ حدیث تھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

روایت کی ہے۔ ابو داؤد نے سنن میں ذکر کیا ہے کہ بہز بن حکیم نے کہا کہ رسولِ کریم نے میری قوم کے چند لوگوں کو قتل کے الزام میں قید کیا تھا۔

پہلے السنن الکبریٰ کے نام سے انھوں نے ایک ضخیم اور عظیم الشان کتاب تصنیف کی جو احادیث کے مختلف طرق واسانید اور ان کے مخارج بیان کرنے کے سلسلے میں بے مثال تھی۔ پھر اس کا اختصار کر کے اس کو المجتبیٰ یا المجتنیٰ کے نام سے موسوم کیا۔

جب صرف نسائی کا نام بولا جاتا ہے تو اس سے آخر الذکر کتاب مراد ہوتی ہے جو عام طور سے متداول ہے۔ سنن کبریٰ لائبریریوں میں کہیں دفن تھی۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ یہ شرف ہندوستانی عالم شیخ عبدالصمد شرف الدین کو حاصل ہوا کہ انھوں نے اس کا سراغ لگایا اور اس کو اڈیٹ کر کے شائع کرنا شروع کیا۔ ابھی تک اس کے تین اجزا طبع ہو چکے ہیں۔

لہ اس حدیث کا ابو داؤد نے السنن (۳-۳۱۴) کتاب القضاء باب الدین ھل یحبس بہ میں ذکر کیا ہے۔

امام ابو داؤد کا نام ونسب ابو سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران سجستانی ہے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ میں ۱۶ شوال کو بصرہ میں وفات پائی۔

یہ حدیث امام ترمذی نے (۴-۲۸) کتاب الدیات باب ما جاء فی الحبس میں روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بہز بن حکیم کی روایت کردہ یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔ امام حاکم نے المستدرک (۴-۱۰۲) میں بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور امام بخاری اور مسلم نے صحیحین میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ بہز بن حکیم کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کرنے کے بارے میں اختلاف مشہور ہے لیکن میرے نزدیک قابل ترجیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث حسن الاسناد ہے۔ یحییٰ بن معین نے بہز کو ثقہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے بشرطیکہ بہز کے علاوہ دیگر راوی ثقہ ہوں۔ ابن الجارود اور نسائی نے بھی بہز کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ بہز سے امام زہری جیسے ثقہ راویوں نے احادیث روایت کی ہیں۔ امام حاکم بھی اس کو ثقہ راویوں میں شمار کرتے ہیں۔ حاکم کہتے ہیں البتہ بہز کی روایت اپنے باپ اور دادا سے شاذ ہے اور اس کی تائید میں کوئی اور حدیث بھی نہیں اس لیے یہ سند صحیح کے درجے میں نہیں آتی۔ (تہذیب التہذیب ۱-۴۹۸)

بہز کے دادا کا نام معاویہ بن حیدہ بن معاویہ بن قشیر بن کعب بن ربیعہ بن عامر القشیری ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ ان کو حضورؐ کی صحبت کا شرف حاصل ہے۔ بخاری کہتے ہیں کہ انھوں نے آنحضورؐ سے حدیثیں سنی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" (۳-۴۳۲) میں ان کا ذکر کیا ہے۔

بہز بن حکیم کی روایت کردہ حدیث کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث سے ہوتی ہے جس کا حاکم نے مستدرک (۴-۱۰۲) میں ذکر کیا ہے۔ حافظ زیلعی نصب الرایۃ (۳-۳۱۰) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث البزار اور ابو یعلیٰ نے ابراہیم بن خثیم سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد نے میرے دادا عراک بن مالک سے اور انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک الزام میں احتیاط کی بنا پر ایک دن اور ایک رات نظر بند رکھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

بہز بن حکیم بعض اہلِ علم کے نزدیک مجہول راوی ہے لیکن امام بخاری کتاب الوضوء میں بہز کو لائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ مجہول نہیں بلکہ معروف راوی ہے۔ مصنف عبدالرزاق کے علاوہ دیگر محدثین کے یہاں اسی سند کے ساتھ یہ الفاظ منقول ہیں:

"ان النبی علیہ السلام حَبَسَ فی تُھْمَةٍ بِدَمٍ سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ ثُمَّ خَلّٰى عَنْهُ"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو قتل کے الزام میں دن کے وقت کچھ دیر بند رکھا پھر چھوڑ دیا۔

زیلعی کہتے ہیں کہ حاکم نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے اور الذہبی نے "المختصر" میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابراہیم بن خُثیم متروک الحدیث ہے۔ اسی طرح ترمذی نے "العلل الکبیر" میں لکھا ہے کہ ابراہیم بن خُثیم مجنون شخص تھا اور بچے اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ الہیثمی نے "مجمع الزوائد" میں یہ حدیث نقل کی ہے اور اسے بزّار کی جانب منسوب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن خُثیم متروک الحدیث ہے۔ خطیب بغدادی نے یہ حدیث تاریخ بغداد (٧-٥٠) میں مرفوعاً روایت کی ہے۔ مگر اس کی سند میں ابراہیم بن خثیم نہیں ہے، بلکہ انھوں نے یہ حدیث یحییٰ بن سعید سے انھوں نے عراک بن مالک سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ ایک اور سند کے ساتھ یہ حدیث عراک بن مالک سے مرسلاً بھی روایت کی گئی ہے۔

اس حدیث کی ایک اور مؤید حدیث معجم طبرانی کی "الاوسط" میں نبیشہ کی روایت سے ملی ہے۔ الہیثمی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ایسے راوی بھی ہیں جنھیں میں نہیں جانتا۔ ابن عدی اور العُقَیلی نے اپنی اپنی کتاب میں یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس سند میں ابراہیم بن زکریا واسطی راوی مجہول ہے۔ اس کی روایت کردہ احادیث بھی قابلِ اعتماد نہیں۔ (دیکھیے نصب الرایہ)

١ نسخہ لاہور میں کتاب الوضو کے بجائے "کتاب الصوم" ہے۔ تلاش اور تحقیق کے باوجود صحیح بخاری کی کتاب الوضو اور کتاب الصوم دونوں میں مجھے بہز کی روایت نہیں ملی۔ اسی طرح ابن طاہر مقدسی کے مطابق ابونصر کلاباذی اور ابوبکر اصبہانی نے صحیحین کے رجال میں بہز کا ذکر نہیں کیا۔ حافظ زیلعی نے بہز کا دفاع کیا اور اس کو ثقہ بھی قرار دیا ہے، تاہم وہ یہ نہیں کہہ سکے کہ صحیحین میں ان کی روایت موجود ہے۔ اگر بہز کی کوئی روایت صحیح بخاری و مسلم میں موجود ہوتی تو اس کو ثقہ قرار دینے کے لیے یہی بات کافی تھی، اس کے لیے باقی ائمہ حدیث کے اقوال پیش کرنے کی حاجت ہرگز نہ تھی اور نہ ہی اس جرح کی تردید کی ضرورت تھی جو ابوحاتم وغیرہ نے ان پر کی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مصنف کو یہاں اشتباہ ہوا ہے جبکہ بخاری میں یہ حدیث موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ان کو معاف فرمائے۔

٢ یہ حدیث ابن الجارود نے "المنتقیٰ" (ص ۴۳۴) میں، البیہقی نے السنن الکبریٰ (٦-٥٣) میں بہز بن حکیم سے، انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کی جس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَبَسَ رَجُلًا فِي تُهْمَةٍ سَاعَةً ثُمَّ خَلّٰى عَنْهُ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو ایک الزام میں تھوڑی دیر کے لیے نظر بند کیا پھر رہا کر دیا۔

"احکام ابن زیاد"[1] میں فقیہہ ابوصالح ایوب بن سلیمان[2] سے مروی ہے کہ ایک شخص کے غلام کا ایک حصہ آزاد ہوگیا۔ حضورؐ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنا حصہ بھی آزاد کر کے غلام کو مکمل طور پر آزاد کر دے۔ اس شخص نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو آپؐ نے اسے نظر بند کر دیا۔ حدیث میں مذکور ہے کہ اسے نظر بند رکھا گیا[3] یہاں تک کہ اس نے اپنا مالِ غنیمت بیچ دیا۔ (یعنی غلام میں اپنا حصہ فروخت کر دیا)۔

ابن شعبان[4] نے اپنی کتاب میں اوزاعی سے اور انھوں نے عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند

---

[1] احمد بن محمد بن زیاد اللخمی، ابن حبیب کے نام سے معروف تھے۔ یہ قرطبہ کے قاضیوں میں سے تھے۔ آپ نے ایک کتاب "کتاب الاقضیۃ والاحکام" کئی جلدوں میں لکھی ہے۔ ان کے معاصرین اپنے فتووں میں اس کتاب کے حوالے دیا کرتے تھے۔ ۳۱۲ھ میں وفات پائی۔ ان کی یہ کتاب مجھے کہیں نہیں ملی کہ میں اس سے مراجعت کرتا۔ القیروانی نے "قضاۃ قرطبۃ وعلماء افریقیۃ" (ص ۸۴۔۱۵۴) میں اور ابن فرحون نے "الدیباج" (ص ۳۴) میں ان کا تعارف لکھا ہے۔

[2] یہ ابوصالح ایوب بن سلیمان بن صالح بن ہشیم المعافری القرطبی ہیں۔ یہ فقیہ، حافظ حدیث اور مفتی تھے۔ انھوں نے العتبی اور دیگر علماء سے حدیث کا درس لیا۔ ۳۰۲ھ میں وفات پائی۔ ابن فرحون نے "الدیباج" (ص ۹۸) میں ان کا تعارف لکھا ہے۔

[3] یہ حدیث بیہقی نے السنن الکبریٰ (۱۰۔۲۷۶) میں ابومجلز سے روایت کی ہے۔

بیہقی کہتے ہیں کہ یہ "حدیث منقطع ہے۔ ثوری نے اسی مفہوم کی حدیث ابن ابی لیلیٰ سے، اس نے قاسم بن عبدالرحمٰن سے اور اس نے ابومجلز سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث ایک دوسری سند کے ساتھ بھی مروی ہے اور وہ سند یہ ہے کہ قاسم نے اپنے باپ سے اور اس نے اپنے باپ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کی مگر یہ سند ضعیف ہے۔"

امام ابن حزم نے "المحلی" (۸۔۱۷۰) میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ "یہ حدیث مرسل ہے، اور مرسل حدیث حجت نہیں ہوتی۔ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اس سے استدلال کیا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کو اس بات کا خدشہ ہوا ہو کہ وہ شخص کہیں مالِ غنیمت لے کر فرار نہ ہو جائے لہٰذا اس کو نظر بند کیا گیا تاکہ وہ مالِ غنیمت فروخت کر دے اور یہ بات درست ہے جس سے ہم انکار نہیں کرتے۔ اس سے وہ قید مراد نہیں جو ہم سے اختلاف کرنے والوں کا نقطۂ نگاہ ہے۔ اور یہ مطلب بھی نہیں کہ اس شخص نے مالِ غنیمت کو فروخت کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "باعہا" میں باع کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب راجع ہو، یعنی حضورؐ نے اس کے مالِ غنیمت کو فروخت کر دیا۔ اس حدیث میں "حَبَس" کے یہ معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں کہ اس شخص کو مدینہ میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اس حدیث میں کہیں مذکور نہیں کہ اس کو قید خانہ میں محبوس کیا گیا تھا۔ اس لیے اس حدیث سے ان کا استدلال درست نہیں۔"

ابومجلز کا نام لاحق بن حمید بن سعید، اور بعض کے نزدیک شعبہ بن خالد بن کثیر بن حبیش بن عبداللہ بن سدوس السدوسی ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (دیکھیے تہذیب التہذیب (۱۱۔۱۷۱)

[4] ابن شعبان کا نام سعید بن شعبان بن قرار اور کنیت ابوالولید ہے۔ وہ ثقہ راوی تھے۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔

کے ساتھ روایت کی ہے کہ ایک شخص نے دانستہ اپنے غلام کو قتل کر دیا۔ آنحضورؐ نے اس کو سو کوڑے لگوائے اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دیا۔ آپؐ نے اس سے قصاص نہ لیا اور اسے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ ابن شعبان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ روایت بیان کی گئی کہ آپ نے اسے پیٹنے اور قید کرنے کا حکم دیا۔" ابن شعبان کی کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی یہ روایت ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ ان کے دور میں قید خانہ موجود تھا اور ہجو کرنے کے جرم میں الحُطَیئۃ[2] نامی شاعر کو آپ نے قید کیا تھا۔

انھوں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا تھا انھیں یاد بھی تھا۔ ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مصنف نے ان کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ مجھے نہیں ملی۔

ابن الفرضی نے اپنی کتاب "تاریخ العلماء والرواۃ للعلم فی الاندلس" (ص ۳۰۹) میں ان کا تعارف لکھا ہے۔ ابن شعبان نامی شخص ایک اور بھی تھا جس کا تذکرہ قاضی عیاض نے کیا ہے۔ دیکھیے ترتیب المدارک (۱-۴۴۳) اسی طرح ابن فرحون نے "الدیباج" (ص ۲۴۸) میں اس دوسرے ابن شعبان کا تعارف اس طرح لکھا ہے:

"محمد ابو اسحاق بن قاسم بن شعبان بن محمد بن ربیعہ بن داؤد بن سلیمان بن ایوب العیتقل بن ابی عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسرؓ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔"

یہ ابن شعبان مصر میں مالکی فقہاء کے قائد اور اس فقہ کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ مالکی فقہ پر ان کی مشہور کتاب ہے جس کا نام "الزاهی الشعبانی" ہے۔ ۳۵۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

ابن شعبان کے نام سے یہ دو علماء معروف تھے۔ میں اس کا تعین نہیں کر سکا کہ مصنف کے نزدیک یہاں کون صاحب مراد ہیں۔

[1] یہ حدیث بیہقی نے سنن کبریٰ (۸-۳۶) میں اس اضافہ کے ساتھ روایت کی ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو ملنے والے مال غنیمت میں سے اس کا حصہ ختم کر دیا۔ اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ہے جو اپنے ہم وطن شامیوں کے علاوہ دوسروں کے ہاں ضعیف شمار ہوتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہاں اس کے ہم وطن ہیں۔ آگے چل کر بیہقی نے اسی قسم کی ایک اور روایت نقل کی ہے۔ اس کی سند اس طرح ہے کہ اسماعیل بن عیاش اسحاق بن ابی فروہ سے، وہ عمرو بن شعیب سے وہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے باپ سے اور وہ نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ حدیث اسی سند کے ساتھ دارقطنی (۳-۱۴۴) اور ابن ماجہ نے (۲-۸۸۸) میں بھی روایت کی ہے۔

البوصیری "الزوائد" میں لکھتے ہیں کہ ان کی سند میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی فَروہ راوی ضعیف ہے۔

[2] الحُطَیئَۃ جرول بن اوس بن مالک عبسی ہے۔ وہ مخضرمی شاعر ہے۔ مخضرمی شاعر وہ ہوتا ہے جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہو۔ یہ سخت ہجو گو شاعر تھا اور اس کی زبان سے کوئی شخص بچتا نہ تھا وہ زبرقان بن بدر کی ہجو کیا کرتا تھا۔ زبرقان نے حضرت عمرؓ کے پاس اس کی شکایت کی اور کہا کہ حُطَیئَہ نے میری ہجو میں یہ شعر کہا ہے۔

دعِ المکارمَ لا ترحل لبُغیتِها   واقعد فانّک انت الطاعم الکاسی

(تم نے کاموں کو چھوڑ، ان کی تلاش کے لیے سفر اختیار نہ کر اور بیٹھ رہنے پر اکتفا کر اس لیے کہ تو کھانے اور پہننے کے سوا کوئی کام نہیں جانتا)

(باقی اگلے صفحہ پر)

اسی طرح آپؓ نے صَبِیغ التیمی کو بھی نظر بند کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ اس نے بعض قرآنی الفاظ مثلاً الذاریات، المرسلات النازعات وغیرہ کے بارے میں الٹے سیدھے اعتراضات کیے۔ لوگوں نے اسے اچھی طرح غور کرنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے کئی مرتبہ اس کو پیٹا اور عراق یا بصرہ کی طرف جلا وطن کر دیا۔ آپ نے لوگوں کو اس کی مجلس سے روک دیا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ صبیغ اگر ہمارے پاس آتا اور ہم ایک سو کی تعداد میں ہوتے تو بھی ہم الگ الگ ہو جاتے۔ بعد ازاں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ صبیغ نے بہت اچھی طرح توبہ کر لی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو اس سے ملنے کی اجازت دے دی۔

البزار نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو سو کوڑے لگوائے۔ جب اس کے زخم بھر گئے تو مزید سو کوڑے لگوائے اور لکڑی کے محمل پر سوار کیا۔ البزار نے یہ پورا واقعہ بیان کر کے آخر میں ذکر کیا ہے کہ صبیغ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو قسمیں کھا کھا کر کہا کہ اب میرے دل و دماغ میں وہ شکوک و شبہات باقی نہیں جو پہلے ہوا کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو یہ بات لکھی جس کے جواب میں فاروق اعظم نے تحریر کیا کہ میں اس کو اس وقت تک آزادانہ طور پر لوگوں سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں دے سکتا جب تک کہ سچی توبہ نہ کرے۔ لہٰذا اگر اس نے سچی توبہ کر لی ہے تو اب لوگوں سے ملنے جلنے کی اسے اجازت دے دی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ شعر سن کر کہا کہ یہ تو چھیڑ چھاڑ ہے ہجو تو نہیں۔ زبرقان نے کہا تو کیا میری عظمت محض کھانے اور پہننے میں مضمر ہے؟ فاروق اعظمؓ نے حضرت حسانؓ (صحابی شاعر) کو بلوا بھیجا۔ انھوں نے آ کر کہا کہ حطیئہ نے ہجو نہیں کی بلکہ زجر و توبیخ کی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس ضمن میں لبید مشہور شاعر سے پوچھا تو اس نے کہا مجھے یہ بات پسند نہیں کہ زبرقان کی جو تذلیل اس شعر کی وجہ سے ہوئی ہے میں اس سے دوچار ہوتا۔ خواہ اس کے عوض مجھے سرخ اونٹ کیوں نہ ملتے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو بند کنوئیں میں ڈالنے کا حکم دیا اور پھر اس پر کوئی چیز ڈال دی گئی۔ وہ طویل عرصہ تک قید و بند میں رہا۔ حتیٰ کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اس کے معاملہ میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کی تو آپ نے اسے قید سے نکال دیا۔ (کتاب الاغانی ۲-۱۵۵)

حُطَیئہ کے تعارف کے لیے دیکھیے:۔

(الکتبی کی فوات الوفیات ذیل وفیات الاعیان (۱-۱۹۲) ابن قتیبہ کی الشعر والشعراء (۱-۳۲۲) زبیر بن بکار کی الموفقیات اور المبرد کی الکامل (۱-۳۵۳)

؎ یہ صبیغ بن شریک بن منذر بن قطن بن قشم بن عسل بن عمرو بن یربوع ہے۔ ابن دُرَید نے الاشتقاق (۲۲۸) میں لکھا ہے "صبیغ کم عقل آدمی تھا۔ یہ حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ "الذاریات ذروًا" سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا میں ذرا تمھارے سر کو اچھی طرح دیکھتا ہوں۔ آپ نے دیکھا تو اس کی دو دو مینڈھیاں تھیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اگر تمھارا سر منڈا ہوا ہوتا تو تمھارے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہ رہتا۔ پھر آپ نے اہل بصرہ کو خط لکھا کہ صبیغ کے ساتھ بات چیت بند کر دو۔ اسی حالت میں وہ کسی ہنگامے میں قتل ہو گیا۔"

حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ (۴۱۱۸ نمبر) میں ابن درید کے اس قول پر کہ صبیغ حضرت معاویہ کے پاس گیا، تبصرہ کرتے ہوئے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ضابی[1] بن حارث کو قید میں رکھا حتیٰ کہ وہ قید ہی میں مرگیا۔ وہ بنی تمیم کے چوروں اور رہزنوں میں سے تھا۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب نے کوفہ میں اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے مکہ[2] میں بعض لوگوں کو نظر بند رکھا تھا۔

لکھا ہے کہ یہ درست نہیں۔ اس کے برعکس صحیح یہ ہے کہ صبیغ حضرت معاویہ کے یہاں نہیں بلکہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا تھا۔"

[1] ضابی بن حارث ابن ارطاۃ بن شہاب بن عُبَید بن خاذل ابن القیس القبیلۃ بن حنظلہ بن مالک التمیمی البراجمی ہے۔ یہ نہایت شریر اور بدزبان شاعر تھا۔ جاہلیت میں معروف تھا۔ اس نے اسلام کا زمانہ پایا اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت تک مدینہ میں رہا۔

حضرت عثمانؓ نے ضابی کو اس لیے قید میں رکھا کہ اس نے ایک بچے کو اپنی سواری کے نیچے کچل کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس نے نظر کی کمزوری کا عذر پیش کیا تو آپ نے قصاص میں قتل نہ کیا لیکن ابن قتیبہؒ "الشعر والشعراء" (ج ۱۔ ص ۳۵۰) میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ضابی کو اس لیے قید کیا تھا کہ اس نے بنی حنظلہ سے ایک کتا شکار کے لیے مستعار لیا تھا۔ جب بنی حنظلہ نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تو ضابی نے دینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اس سے جبراً چھین لیا۔ ضابی اس پر ناراض ہو گیا اور بنی حنظلہ کی والدہ کو "قرحان" نامی کتے کے ساتھ متہم کیا۔ اور اس ضمن میں فحش اشعار کہے۔

جب بنی حنظلہ نے حضرت عثمانؓ سے ضابی کی شکایت کی تو آپ نے اسے قید کر دیا اور فرمایا کہ "اللہ کی قسم! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقیدِ حیات ہوتے تو تمہارے بارے میں قرآن کی آیت نازل ہوتی۔ میں نے آج تک نہیں سنا کہ تجھ سے پہلے کسی نے کسی کو کتے کے ساتھ متہم کیا ہو۔"

کہا جاتا ہے کہ ضابی کو تاحیات قید میں رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ جب قیدیوں کو حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو ضابی بھی ان میں شامل تھا اور اس نے اپنے جوتے میں چھری چھپا رکھی تھی تاکہ موقع پر حضرت عثمانؓ کو قتل کر دے۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو یہ شعر کہا ؎

ہممت ولم افعل وکدت ولیتنی ترکت علی عثمان تبکی حلائلہ

(میں نے ایک کام کا ارادہ کیا مگر اس کو انجام نہ دے سکا۔ اے کاش! میں عثمانؓ کو اس حال میں چھوڑتا کہ ان کی بیویاں ان پر رو رہی ہوتیں)

چنانچہ ضابی سنہ ۳۰ھ میں جیل ہی میں مرا۔ اس کے تعارف کے لیے دیکھیے:۔

(الاشتقاق لابن دُرَید (ص ۲۱۸)، خزانۃ الادب للبغدادی (ج ۴ ص ۸۰)، معاهد التنصیص للعباسی (ص ۱۸۱)، طبقات الشعراء لابن سلام (ص ۱۴۲))

[2] اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ حرمِ مکہ میں بھی کسی کو قید رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں طاؤس کی اس رائے کا رد بھی ہے کہ وہ مکہ میں قید رکھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے: "عذاب کا گھر رحمت کے گھر میں نہیں ہونا چاہیے۔" (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت ابن زبیرؓ نے سجن عارم میں محمد بن حنیفہ کو اس لیے قید میں رکھا کہ انھوں نے ابن زبیرؓ کی بیعت کرنے سے انکار کیا تھا۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب "الخصومات" میں ایک باب کا عنوان رکھا ہے۔ باب الربط والحبس فی الحرم اس میں مکہ میں ابن زبیرؓ کے قید خانے کا ذکر کیا ہے، مگر امام بخاری کی یہ روایت معلق ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (ج ۵ ص ۷۶) میں لکھتے ہیں کہ یہ روایت خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں متصل سند کے ساتھ بیان کی ہے۔ اسی طرح ابوالفرج اصبہانی نے "کتاب الاغانی" میں اس روایت کو متعدد طُرق سے بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک سند یہ ہے کہ الفاکہی نے عمرو بن دینار سے انھوں نے حسن بن محمد سے انھوں نے محمد ابن الحنفیہ سے روایت کی ہے کہ ابن زبیرؓ نے مجھے پکڑ کر دارالندوہ کے سجن عارم میں بند کردیا۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا اور پہاڑوں کو عبور کرکے منیٰ میں پہنچ گیا۔

ک۵ عارم یاقوت حموی "معجم البلدان" (ج ۴ ص ۶۶) میں لکھتے ہیں:۔

"مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں کہ سجن عارم کہاں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ طائف میں تھا۔ عارم ابوعثمان محمد بن فضل بصری کا لقب ہے جو علمائے بصرہ میں سے تھے۔"

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ سجنِ عارم مکہ میں تھا اور وہیں محمد بن حنفیہ کو قید میں رکھا گیا۔

الفاکہی نے لکھا ہے:۔

"اس قید خانہ کو سجن عارم کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ عارم مصعب بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا غلام تھا۔ ایک دفعہ مصعبؓ عارم سے ناراض ہوگیا اور نہایت ہی تنگ جگہ میں اس کو اس طرح بند کردیا کہ اسی میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ اسی بنا پر اس مکان کو "سجن عارم" کہا جانے لگا۔ یہ مکان دارالندوہ کی پچھلی جانب تھا۔ نافع بن عبدالحارث نے، جس کو حضرت عمرؓ نے مکہ کا حاکم مقرر کیا تھا، یہ جگہ صفوان بن امیہ سے خریدی تھی۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں خریدنے کے اس واقعہ کو غیر متصل سند کے ساتھ اور عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے متصل سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔"

محمد بن الحنفیہؒ:۔ حضرت علیؓ کے بیٹے اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام خولہ تھا جو بنی حنیفہ کے قیدیوں میں سے تھیں۔ بنی حنیفہ کی جانب نسبت کی وجہ سے ان کو محمد بن حنفیہ کہا جاتا ہے۔ تاکہ حضرت حسنؓ و حسینؓ اور ان میں امتیاز ہوجائے۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے محمد بن حنفیہ کو اس لیے قید کیا کہ ابن زبیر اور عبدالملک دونوں نے محمد بن حنفیہ سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں، جب وہ کسی ایک پر متفق ہوجائیں گے تو میں بھی اس کی بیعت کرلوں گا، چنانچہ ابن زبیرؓ نے ان کو قید کرلیا۔

ابن الحنفیہؒ کے سالِ وفات میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ ۸۱ھ ہے۔ یہ ابن یحییٰ بن بُکیر کی روایت ہے۔ امام بخاری نے ابونعیم سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ۸۰ھ میں وفات پائی۔ المدائنی نے ۸۳ھ لکھا ہے اور بعض نے ۷۳ھ لکھا ہے۔

ابوداؤد[1] اپنی "سنن" میں نضر بن شمیل[2] سے، وہ ہرماس بن حبیب[3] سے، وہ اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے ایک مقروض کو لایا۔ آپ نے فرمایا "اس کو قابو میں رکھنا۔ پھر فرمایا "بنی تمیم کے بھائی تم اپنے قیدی سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

قید و بند کے حق میں رائے دینے والے بعض اہل علم نے مندرجہ ذیل آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا۔ (النساء - ۱۵)	ان (عورتوں) کو گھروں میں روکے رکھو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے۔

ان کے تعارف کے لیے دیکھیے:

"تہذیب الاسماء واللغات" للنووی (القسم الاول من الجزء الاول ص ۸۰) "صفۃ الصفوۃ" لابن الجوزی ص ۳۴ - "نزہۃ الجلیس" للموسوی ج ۲ ص ۹۸-۳۹۸ "الکامل" للمبرد ج ۲ - ۱۵۱)

[1] نسخہ الالہ، حلبی اور حلب میں یہ اضافہ ہے کہ الخطابی کی کتاب میں حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے بعض لوگوں کو نظر بند کیا تھا۔ آپؓ نے سرکشوں کا ایک قید خانہ بنایا اور اس کا نام نافع رکھا۔ چوروں نے اس میں نقب لگائی۔ پھر آپ نے اینٹوں کا ایک قید خانہ بنایا اور اس کا نام مخیّس رکھا۔ ابوداؤد (۳ - ۳۱۴) کتاب "الاقضیۃ" باب "فی الدین ھل یحبس" میں یہ روایت موجود ہے، مگر اس کی سند میں "عن جدہ" کے الفاظ موجود نہیں۔ ہرماس بن حبیب کے باپ اور دادا مجہول راوی ہیں۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے (۲ - ۸۱۱) بھی نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں "عن جدہ" کے الفاظ موجود ہیں۔ المنذری کہتے ہیں: کہ "عن جدہ" کے الفاظ صحیح تر ہیں لیکن حافظ ابوبکر الخطیب کی کتاب میں یہ موجود نہیں۔ اس بارے میں میرا اعتماد ابن ماجہ کی روایت اور امام بخاری کی التاریخ الکبیر (۸ - ۲۴۸) کی روایت پر ہے۔ ان سب نے "عن أبيه عن جده" کہا ہے۔ المزی نے بھی "الاطراف" میں یہی لکھا ہے"۔

[2] النضر بن شمیل میں شمیل بضم الشین المعجمۃ وتشدید الیاء ہے۔ نضر کی کنیت ابوالحسن ہے۔ یہ مشہور نحوی تھے۔ ان کی رہائش مرو میں تھی۔ حافظ ابن حجر نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

[3] ہرماس بن حبیب: ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ ہرماس اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے دادا صحابی تھے۔ وہ مزید ذکر کرتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے ہرماس بن حبیب العنبری کے بارے میں دریافت کیا گیا تو دونوں نے کہا "ہم اسے نہیں جانتے"۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے ہرماس بن حبیب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا "وہ ایک بدوی شیخ ہے۔ نضر بن شمیل کے سوا کسی نے اس سے روایت نہیں کی۔ ہم اس کے والد اور دادا کو بھی نہیں جانتے"۔

ابن الاثیر نے اسد الغابہ میں ابو حبیب العنبری کا ذکر کرتے ہوئے اس کے دادا کا ذکر نہیں کیا۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ

علاوہ ازیں انھوں نے حضور کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے جو آپؐ نے اس شخص کے بارے میں ارشاد فرمایا جس نے ایک شخص کو پکڑ رکھا اور دوسرے نے اس کو قتل کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا "اُقْتُلُوا القَاتِلَ وَاصْبِرُوا الصَّابِرَ" قاتل کو قتل کر دو اور پکڑنے والے کو قید کر دو۔

حسن بمرقندی نے اس کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" (۴ - ۴۴) میں ابو حبیب کے تعارف میں لکھا ہے کہ الدولابی نے "الکنی" میں اس کا ذکر کیا ہے اور اسحاق بن راہویہ اس کا نام ثعلبہ بتاتے ہیں۔ حافظ ابن حجر ثعلبہ کے تعارف میں "الاصابۃ" (۱ - ۲۱۰) میں لکھتے ہیں: ثعلبہ بن زینب العنبری سے ان کے بیٹے عبداللہ نے روایت کی ہے۔ اس کی مرویات مرسل اور ضعیف ہیں (دیکھیے التجرید) حافظ ابن حجر مزید فرماتے ہیں کہ اس کا نام اُلٹ گیا ہے۔ دراصل اس کا نام عبداللہ بن زینب بن ثعلبہ ہے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتا ہے۔

حافظ ابن حجر نے "تہذیب التہذیب" (۱۱ - ۷۲) میں اس حدیث کے بارے میں امام احمد، یحییٰ ابن معین اور ابو حاتم کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور ان پر کچھ اضافہ نہیں کیا۔

نمبر ۵ یہ حدیث دارقطنی (۳ - ۱۳۹، ۱۴۰) نے اسماعیل بن امیہ عن نافع عن عبداللہ بن عمرؓ کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اِذَا اَمْسَكَ الرَّجُلُ وَقَتَلَهُ الْاٰخَرُ يُقْتَلُ الَّذِي قَتَلَ وَيُحْبَسُ الَّذِي اَمْسَكَ۔	جب ایک آدمی کسی کو پکڑ رکھے اور دوسرا اس کو قتل کرے تو قاتل کو قتل کیا جائے اور جس نے پکڑ رکھا تھا اس کو قید کیا جائے۔

یہ حدیث معمر اور ابن جریج نے اسماعیل بن امیہ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

يُقْتَلُ الْقَاتِلُ وَيُصْبَرُ الصَّابِرُ۔	قاتل کو قتل کیا جائے اور پکڑ کر رکھنے والے کو قید کیا جائے۔

اس کے علاوہ معمر اور ابن جریج نے سفیان سے، انھوں نے جابر سے، انھوں نے عامر سے اور انھوں نے حضرت علیؓ کے متعلق روایت کی ہے کہ آپؓ نے بھی ایسا ہی فیصلہ کیا تھا۔

دارقطنی کہتے ہیں کہ یہ حدیث زیادہ تر مرسلاً روایت کی گئی ہے۔

یہ حدیث بیہقی (۸ - ۵۱) نے روایت کی اور اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے یہ بھی کہا ہے کہ اس حدیث کی متصل سند محفوظ نہیں۔

حافظ ابن حجر بلوغ المرام (ص ۲۱۸) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث دارقطنی نے متصل اور مرسل دونوں طرح روایت کی ہے۔ ابن القطان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں، مگر بیہقی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ابوعبید[1] کہتے ہیں "اصبروا الصابر" کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے مقتول کو پکڑ رکھا تھا اس کو مرنے تک قید میں رکھو۔ عبدالرزاق نے مصنف[2] میں حضرت علیؓ بن ابی طالب سے بھی اسی طرح کا قول ذکر کیا ہے۔ آپؓ نے فرمایا:
"پکڑنے والے کو موت تک قید میں رکھا جائے۔"

حافظ ابن کثیرؒ "الارشاد" میں لکھتے ہیں۔ کہ دارقطنی کی یہ سند صحیح مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔ دارقطنیؒ نے اسے ابوداؤد الحفری سے روایت کیا ہے۔ وہ ثوری سے وہ اسماعیل بن امیہ سے وہ نافع سے اور وہ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ بیہقی کہتے ہیں کہ ابوداؤد الحفری کے سوا دوسرے راویوں نے یہ حدیث ثوری اور اسماعیل بن امیہ سے مرسلاً روایت کی ہے۔ صنعانی "سبل السلام" (۳-۲۴۲) میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مرسل ہونا ہی قرین صحت وصواب ہے۔

[1] ابوعبید قاسم بن سلام الہروی الازدی الخزاعی خراسانی کا شمار اکابر محدثین، مفسرین، فقہا اور اہل لغت ونحو میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بہترین کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً "غریب الحدیث"، "کتاب الاموال" اور "فضائل القرآن" وغیرہ۔ ۱۵۷ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

تعارف کے لیے دیکھیے:

"تاریخ بغداد" للخطیب۔ (ج ۱۲ ص ۴۰۵)۔ "طبقات الشافعیہ" للسبکی (ج ۱ ص ۲۷۰)۔ "طبقات النحویین" للزبیدی (ص ۲۱۷)۔ "تذکرۃ الحفاظ" للذہبی (ج ۲ ص ۴۱۷)

[2] مصنف عبدالرزاق (ج ۹ ص ۴۸۰) ابن حزمؒ "المحلی" میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند منقطع ہے۔

برسرِ پیکار کفار کے بارے میں نبی ﷺ کا فیصلہ

صحیح بخاری[1] اور مسلم[2] میں حضرت انس[3] سے مروی ہے کہ ایک دفعہ قبیلۂ عکل[4] کا عرینہ[5] کے اور مصنف عبدالرزاق کے مطابق بنو فزارہ[6] کے اور ایک روایت کے مطابق بنو سلیم کے کچھ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اسلام قبول کیا لیکن مدینہ منورہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اور سخت بیمار پڑ گئے، یہاں تک کہ وہ قریب الموت ہو گئے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک ایسی جگہ منتقل ہونے کا حکم دیا جہاں صدقے کے اونٹ تھے ساتھ ہی فرمایا کہ وہ ان کا دودھ اور پیشاب پئیں[7]۔

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الحدود، باب "المحاربین من اھل الکفر والردۃ" (فتح الباری حدیث نمبر ۶۸۰۲) یہ روایت صحیح بخاری میں دوسرے مقامات پر بھی ہے۔

[2] صحیح المسلم: کتاب "القسامۃ" باب "حکم المحاربین"۔

[3] انس بن مالک: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص جن کا شمار کثیر الروایت صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ ابن اثیر نے "اُسد الغابۃ" (ج ۱، ص ۱۲۶) میں آپ کا شجرہ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔

انس بن مالک بن نضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار انصاری خزرجی۔ انھوں نے ۹۳ھ میں وفات پائی۔

[4] عُکل: سمعانی نے "الانساب" (ج ۲، ص ۲۹۲) میں بیان کیا ہے کہ یہ بنو تمیم کی ایک شاخ ہے، لیکن ابن اثیر نے "اللباب" (ج ۲، ص ۱۴۷) میں اسے غلط قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق عُکل حمیر قبیلے کی ایک عورت کی لونڈی کا نام ہے جسے بنت ذی اللحیہ کہا جاتا تھا۔ اس نے عوف بن قیس بن وائل بن عبد مناۃ بن اد بن طابخہ سے شادی کی جس سے اس کے ہاں تین بچے، جُشَم، سعد اور علی نامی پیدا ہوئے۔ بنو حمیر کی اس عورت کی وفات سے عُکل اور اس کے لڑکوں کو شدید صدمہ پہنچا۔ یہ لڑکے زیادہ تر اپنی ماں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ عُکل ان قبائل میں سے ایک ہے جو بنو تمیم کے خلاف باہم حلیف بن گئے تھے۔

[5] عُرینہ: عُرنی کی نسبت اسی کی طرف ہے۔ سمعانی نے "الانساب" (ج ۲، ص ۳۸۸) میں اس قبیلے کا سلسلہ یوں بیان کیا ہے:

عُرینہ بن نذیر بن قسر بن عبقر بن انمار بن اراش۔ یہ قبیلہ بجیلہ کی ایک شاخ ہے جس کا تذکرہ ابن اثیر نے "اللباب" (ج ۲، ص ۱۳۳) میں اور ابن درید نے "الاشتقاق" (ص ۲۲۶) میں کیا ہے۔

[6] نسخہ ظاہریہ میں بنی فزارہ ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس کی نسبت فزارہ بن ذبیان بن بغیض بن ریث بن غطفان کی طرف ہے۔ یہ قیس بن غیلان کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے جس کی طرف منسوب لوگ اپنے آپ کو فزاری کہتے ہیں۔ دیکھیے "اللباب" (ج ۲، ص ۲۱۳)

[7] یہ حدیث صحیح بخاری میں حضرت انس ہی سے لفظوں کے معمولی فرق کے ساتھ بعض دوسرے مواقع پر بھی بیان ہوئی ہے۔ مثلاً صحیح بخاری کی کتاب الحدود کے باب (لم یسق المرتدون المحاربون حتی ماتوا) میں ہے کہ جب یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

ما أجد لكم إلا أن تلحقوا بإبل رسول الله صلى الله عليه وسلم فأتوها فشربوا من ألبانها وأبوالها حتى صحوا وسمنوا (صحیح البخاری۔ کتاب الحدود۔ باب لم یسق المرتدون المحاربون حتی ماتوا)

میرے نزدیک تم لوگوں کے لیے ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ تم لوگ بیت المال کے اونٹوں کی چراگاہ میں چلے جاؤ۔ وہ لوگ وہاں چلے گئے اور ان کا دودھ اور پیشاب پینے لگے یہاں تک کہ وہ صحت یاب اور موٹے تازے ہو گئے۔

صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ

چند ہی روز میں وہ موٹے تازے ہو گئے۔ پھر وہ مرتد ہو گئے۔ انھوں نے چرواہوں کو قتل کیا اور صدقے کے اونٹ ساتھ لے کر بھاگ نکلے۔ اطلاع پاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے آدمی بھیجے جو غروب آفتاب سے قبل ہی ان کو پکڑ کر لے آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور ان کی آنکھیں نکال دی گئیں، بلکہ خون روکنے کے لیے انھیں داغا تک نہیں گیا۔ اور وہ ایسی ہی حالت میں سسک سسک کر مر گئے۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضور نے لوہے کی سلائیں گرم کرنے کا حکم دیا جنھیں ان کی آنکھوں میں پھیرا گیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے اور خون روکنے کے لیے نہ انھیں داغا گیا اور نہ ہی انھیں پانی دیا گیا، بلکہ گرم ریت پر پڑا رہنے دیا گیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔[1]

نے انھیں بیت المال کے اونٹوں کی چراگاہوں میں ٹھہرتے ہوئے صرف اس قدر ارشاد فرمایا:

اشربوا من البانہا - ان کا دودھ پیو (صحیح البخاری - کتاب الطب - باب الدواء بالبان الابل)

ان تینوں روایات کے الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو ان میں تطبیق کی مندرجہ ذیل دو صورتیں ممکن دکھائی دیتی ہیں۔

۱- ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے انھیں صرف وہاں پر رہنے کے لیے ارشاد فرمایا ہو اور انھوں نے اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پینے کا اقدام قدیم عرب کی روایات کے مطابق اپنے طور پر کیا ہو لیکن راوی کو یہ غلط فہمی ہوئی ہو کہ انھوں نے ایسا حضور کے ارشاد کے مطابق کیا ہوگا۔

۲- دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے تو صرف دودھ پینے کے لیے ارشاد فرمایا ہو، لیکن ان لوگوں نے خود اپنے طور پر دورِ جاہلیت کی روایات کے مطابق دودھ کے ساتھ اونٹوں کا پیشاب بھی پینا شروع کر دیا ہو اور راوی کو یہ شبہ گزرا ہو کہ آپ نے انھیں دودھ کے ساتھ پیشاب پینے کا حکم بھی دیا ہوگا۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ پیٹ کی جو بیماری ان لوگوں کو لاحق تھی، قدیم جاہلیت کے دور میں عربوں کے ہاں اس کا علاج اونٹوں کے پیشاب سے ہی کیا جاتا تھا اس لیے یہ ایک فطری بات ہے کہ ان لوگوں کو جب اونٹوں کی چراگاہ میں بھیجا گیا ہوگا تو انھوں نے قدیم جاہلی رواج کے مطابق از خود اسی طریق علاج کو اپناتے ہوئے اونٹوں کا پیشاب پینا شروع کر دیا ہو گا۔

[1] یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ اسلام کے دوسرے قوانین کی طرح حاربین سے متعلق قانون میں بھی ایک تدریج پائی جاتی ہے۔ عرب میں قدیم جاہلی زمانے یہ تھا کہ جس طریقے سے قاتل مقتول کو قتل کرتا تھا، خود اسے بھی اسی طریقے سے قتل کیا جاتا تھا جس وقت محاربین کے ہاتھوں اونٹوں کے اس چرواہے کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت تک چونکہ اس سلسلے میں قرآن کریم میں کوئی حکم نہیں پایا جاتا تھا۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کے مروجہ قانون کے مطابق ان لوگوں کو اسی طریقے سے قتل کرنے کا حکم دیا جس طرح انھوں نے اس چرواہے کو قتل کیا تھا اور جس طرح انھوں نے اس کی آنکھیں نکالی تھیں، آپ نے بھی ان کی آنکھیں نکالنے کا حکم دیا۔

لیکن، جیسا کہ ابن جریر طبری، ابن کثیر اور دوسرے مفسرین نے مستند روایات کے حوالے سے بیان کیا ہے یہ واقعہ پیش آتے ہی اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل فرما کر ان کے لیے سزا کی ایک واضح صورت متعین فرما دی۔ چنانچہ اس کے بعد اس سلسلے میں جو سزائیں دی گئیں اسی حکم خداوندی کے ماتحت دی گئیں۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدہ ۵-۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انھیں جلا وطن کر دیا جائے

یعنی انھیں ان کے جرائم کے شدید یا خفیف ہونے کے لحاظ سے ان سزاؤں میں سے کوئی ایک سزا دی جائے گی۔ ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ کرنے سے بھی سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا - (صحیح مسلم - کتاب الجہاد - باب تامیر الجہاد ووصیتہ بآداب الغزو وغیرہا)

(دشمن کے ساتھ جہاد کے دوران میں) نہ تو خیانت کرو، نہ بد عہدی کرو، نہ مثلہ کرو اور نہ کسی بچے کو مارو)

ابو قلابہ[1] کا قول ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے چوری کی، قتل کا ارتکاب کیا، ایمان کے بعد مرتد ہو گئے اور انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔

مصنف عبدالرزاق میں حضرت سعید بن جبیر کا اور ابو عبید کی کتاب[2] میں محمد بن سیرین کا یہ قول درج ہے کہ یہ واقعہ سورۂ مائدہ کی آیت "إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا" (المائدہ ۳۳) کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔

بخاری[3] اور مسلم کے مطابق ان افراد کی کل تعداد آٹھ تھی۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری تھیں۔ مصنف عبدالرزاق[4] میں ہے: میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ "سمل" کیا ہوتا ہے؟ فرمایا کہ لوہے کا ٹکڑا گرم کر کے آنکھوں کے اتنا قریب لایا جائے کہ وہ پگھل جائیں[5]۔

---

[1] ابو قلابہ: عبداللہ بن زید بن عمرو یا عامر بصری کا شمار ثقہ محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کی روایات بخاری میں پائی جاتی ہیں۔

[2] اس میں مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ "مصنف عبدالرزاق" (ج ۱۰، ص ۱۰۷) میں صراحت ہے کہ سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ سورہ مائدہ کی آیت إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (المائدہ ۳۳) ان ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت قتادہ، حسن، عطا، ضحاک اور زہری کی رائے بھی یہی ہے، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک اس آیت کا تعلق ان مسلمانوں سے ہے جو ڈاکے مارتے اور فتنہ و فساد برپا کرتے ہوں۔ امام شافعی، مالک اور اہل کوفہ کا بھی یہی مسلک ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کی رائے میں اس آیت کا تعلق اہلِ کفر اور مرتدین سے ہے۔ اسی لیے انھوں نے باب کا عنوان "باب المحاربين من أهل الكفر والردة" قائم کیا اور اس میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث بیان کی۔ ابن بطال نے اسماعیل قاضی سے نقل کیا ہے کہ ظاہرِ قرآن اور مسلمانوں کا طرزِ عمل اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت میں جن حدود کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق مسلمانوں ہی سے ہے۔ کفار کے متعلق احکام کا ذکر "فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ" (محمد ۴) میں ہے۔ دیکھیے (فتح الباری: ج ۱۲، ص ۱۱۰)

[3] یہ وضاحت شاید ابو عبید کی تفسیر میں موجود ہے جو اس وقت دستیاب نہیں ہے۔ [4] بخاری میں تعداد کا ذکر مجھے نہیں ملا۔

[5] مجھے یہ روایت "مصنف" کے متوقع مقامات، یعنی باب "المحاربة في الحدود" میں نہیں ملی۔

[6] **فقہ الحدیث**: اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ ایک شخص کے بدلے پوری جماعت کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ جمہور فقہاء میں سے امام مالک، ابو حنیفہ، شافعی، ثوری اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی مسلک ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے صنعاء کے ایک مقتول کے بارے میں فرمایا کہ "اگر اس قتل میں تمام اہلِ صنعاء شریک ہوتے تو میں ان سب کو اس کے قصاص میں قتل کروا دیتا۔"

یہ روایت "مصنف عبدالرزاق" (ج ۹، ص ۴۷۵) میں ہے اور اس کی تفصیل یوں ہے کہ صنعاء شہر کی ایک عورت کا خاوند غائب ہو گیا۔ اس کا ایک چھوٹا بچہ اس عورت کے پاس رہ گیا۔ وہ بچہ کسی دوسری عورت کے بطن سے تھا۔ بچے کا نام اصیل تھا۔ اس عورت نے خاوند کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی اور سے اپنے مراسم قائم کر لیے۔ اس عورت نے اپنے آشنا کو اکسایا کہ یہ بچہ ہمیں رسوا کرے گا اس لیے اسے ٹھکانے لگانا ہی بہتر ہے۔ شروع میں وہ شخص اس بھیانک فعل کے لیے آمادہ نہ ہوا مگر اس پر عورت نے اس سے بے رخی برتی تو اس نے عورت، اس کے خادم اور ایک تیسرے آدمی کے ساتھ مل کر اس بچے کو قتل کیا اور اس کے ٹکڑے کر کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ جب تمام شہر میں اس حادثے کا چرچا ہوا تو یمن کے حاکم نے اس عورت کے آشنا کو گرفتار کر لیا۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ پھر دوسرے ملزموں نے بھی اعترافِ جرم کر لیا۔ حاکمِ شہر نے یہ سارا واقعہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں لکھ بھیجا جس کے جواب میں آپؓ نے لکھا کہ ان سب کو قتل کروا دو۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "اگر اس قتل میں سب اہلِ صنعاء شریک ہوتے تو میں بلا استثنا تمام کو قتل کرا دیتا۔"

اہلِ ظاہر کا مسلک اس سے مختلف ہے اور وہ یہ کہ فرد واحد کے بدلے پوری جماعت کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ابن زبیر اور زہری کا قول بھی یہی ہے۔

قاتل کو حاکم کے پاس لانا اور اُس سے اقرارِ جرم کرانا

صحیح مسلم[1] میں روایت ہے کہ سماک[2] بن حرب علقمہ[3] بن وائل سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد وائل نے انھیں بتایا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص ایک آدمی کو چمڑے کی رسی میں باندھے ہوئے آپ کے پاس لایا اور عرض کیا کہ یہ میرے بھائی کا قاتل ہے۔ آپ نے پوچھا کیا تو نے اسے قتل کیا[4]؟ اور ساتھ ہی مدعی سے فرمایا[5] کہ اگر اس نے اعتراف جرم نہ کیا تو تجھے ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ لیکن اس نے اقرارِ قتل کر لیا۔ آپ نے دوبارہ پوچھا کہ تو نے قتل کیسے کیا؟ مجرم نے کہا کہ میں اور اس کا بھائی درخت کے پتے جھاڑ رہے تھے کہ اس نے مجھے گالی دی اور غصہ دلایا۔ میں نے یہی پتے جھاڑنے کا آلہ اس کے ماتھے پر دے مارا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔

نبی[6] صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "هَلْ لَكَ مِنْ شَيْءٍ تُؤَدِّيهِ عَنْ نَفْسِكَ" "کیا تیرے پاس دیت کے پیسے کچھ ہے؟" اس نے کہا میرے پاس تو یہی ایک کملی اور پتے جھاڑنے کا آلہ ہے۔ آپ نے دوبارہ پوچھا "فَتَرَى[7] قَوْمَكَ يَشْتَرُونَكَ" "کیا خیال ہے کیا تیری قوم تجھے خرید لے گی؟" مجرم نے کہا "میری قوم میں میری اتنی قدر و قیمت نہیں کہ وہ میری دیت دیں۔" یہ سن کر آپ نے وہ رسی جس میں وہ بندھا ہوا تھا مدعی کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا "دُوْنَكَ صَاحِبَكَ" یعنی

---

[1] صحیح مسلم، (ج ۲، ص ۵۹) کتاب القسامة باب "صحة الاقرار بالقتل وتمكين ولى الدم من القصاص واستحباب طلب العفو منه"

[2] سماک بن حرب: پورا نام سماک بن حرب بن اوس بن خالد ذہلی کوفی ابو المغیرہ ہے۔

[3] علقمہ بن وائل بن حجر حضرمی کوفی۔ حافظ ابن حجر نے "تقریب التھذیب" (ج ۲، ص ۳۱) میں لکھا ہے کہ ان کا اپنے باپ سے سماع ثابت نہیں۔ محدثین کے ہاں ان کا شمار درجہ "صدوق" میں ہوتا ہے۔

[4] نسخہ حلبی اور نسخہ حلب میں "اَقَتَلْتَهُ" کے بجائے "اَقَتَلْتَ" (بحذف ضمیر) استعمال ہوا ہے، لیکن صحیح وہی ہے جو نسخہ حرم مکی شریف میں ہے اور مسلم شریف کے مطابق ہے۔

[5] نسخہ حلبی اور حلب میں "لَوْ لَمْ يَعْتَرِفْ" کے بجائے "اِنْ لَمْ يَعْتَرِفْ" مذکور ہے لیکن درست وہی ہے جو نسخہ حرم مکی شریف میں ہے اور وہ مسلم شریف کے مطابق ہے۔

[6] نسخہ لالہ میں اس کی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات مذکور ہیں۔ لیکن نسخہ حرم مکی شریف والی عبارت راجح ہے۔ دوسرے تمام نسخوں اور صحیح مسلم میں بھی "النبی" ہی ہے۔

[7] نسخہ حلب، نسخہ حلبی اور نسخہ لالہ میں "فَتَرَى" کی بجائے "اَفَتَرَى" کا استعمال ہے لیکن راجح وہ ہے جو نسخہ حرم مکی شریف میں ہے اور صحیح مسلم کے مطابق ہے۔

اپنے اس آدمی کو لے جاؤ۔" وہ شخص قاتل کو لے کر چل دیا۔ جب وہ مڑا تو آپ نے فرمایا "ان قتلہ فھو مثلہ" "اگر اس نے اسے قتل کر دیا تو وہ بھی اس کی مانند ہوگا۔ آپ کا ارشاد سن کر مقتول کا بھائی پلٹا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ!

لہ نسخہ حلبی اور حلب میں "دنی" کی بجائے "ولیا" ہے، لیکن نسخہ سوم کی شریف کی عبارت صحیح ہے اور روایت مسلم کے مطابق ہے۔

لہ اِنْ قَتَلَهُ فَهُوَ مِثْلُهُ کی تشریح:

آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل ہوگی نہ اس کا اس پر کوئی احسان ہوگا کیونکہ اس نے اس سے اپنا حق وصول کر لیا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر مقتول کا بھائی قاتل کو معاف کر دے تو اس کا اس پر بڑا احسان ہوگا، دنیا میں اسے نیک نامی حاصل ہوگی اور آخرت میں اسے اجر عظیم ملے گا۔

بعض کے نزدیک آپ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ارتکاب قتل میں مساوی ہیں۔ اگرچہ اس میں حرمت و اباحت کا فرق پایا جاتا ہے۔ وہ دونوں اس اعتبار سے مساوی ہیں کہ دونوں غصے سے مغلوب ہو کر اور نفس امارہ کی پیروی کرتے ہوئے قتل پر آمادہ ہوئے خاص طور پر جبکہ مقتول کے بھائی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتل کو معاف کر دینے کے لیے فرما دیا تھا۔

امام نووی نے شرح مسلم (ج ۱۱۔ ص ۱۷۳) میں یہی تشریح کی ہے۔ علامہ شوکانی نے "نیل الاوطار" (ج ۷، ص ۱۸۰) میں بیان کیا ہے کہ اگرچہ قاتل نے اعتراف قتل کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کی اجازت بھی دے دی، تاہم آپ کی خواہش یہ تھی کہ قاتل کو معاف کر دیا جائے کیونکہ اس نے قتل عمداً نہیں کیا تھا۔

ابن قتیبہ کے نزدیک اس ارشاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں گناہ کے اعتبار سے برابر ہیں اور یہ مطلب ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اس کے لیے تو قصاص کی اباحت موجود ہے، البتہ چونکہ آپ کی دلی خواہش یہ تھی کہ اسے معاف کر دیا جائے تو آپ نے تعریضاً یوں فرمایا کہ تو بھی ایسے ہی ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتا ہے جیسے کہ پہلے اس نے قتل کیا، حالانکہ ان دونوں میں واضح فرق تھا۔ پہلا ظالم تھا اور دوسرا قصاص لینے والا۔

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ آپ نے قاتل کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نے قتل ارادۃً نہیں کیا ہے، بلکہ غصے سے مغلوب ہو کر اس سے غیر ارادی طور پر قتل ہو گیا، تاہم یہ قتل شبہ عمد کے زمرے میں آتا ہے۔ اس نے ایسا آلہ استعمال کیا جو قتل میں مستعمل ہوتا ہے۔ آپ نے وارث سے معاف کرنے کو کہا کیونکہ قتل ارادۃً نہیں ہوا تھا لیکن جب وہ راضی نہ ہوا تو آپ نے قاتل اس کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اپنا حق وصول کر سکے لیکن ساتھ ہی تنبیہ فرمائی تاکہ وہ اقدام قتل سے باز رہے۔ اور معاف کرنے سے اسے نیک نامی اور فضیلت حاصل ہو۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ دونوں ہی قاتل ہوں گے اگرچہ اسباب قتل مختلف ہیں۔ اگلی حدیث سے اس مطلب کی تائید ہوتی ہے اور اسی بنا پر قاتل قصاص لیا جاتا ہے۔

کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے کہ اگر میں نے اسے قتل کر دیا تو میں بھی اسی کے مانند ہوں گا۔ حالانکہ میں نے اسے آپ کی اجازت سے اپنے قبضہ میں لیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تجھے یہ بات پسند نہیں کہ یہ شخص تیرے اور تیرے بھائی کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے؟[2] ابوداؤد[3] میں ہے کہ "وہ اپنا اور اپنے ساتھی کا بوجھ اٹھائے" ابن منذر[4] کی تفسیر القرآن میں ہے۔ "انی ارید ان تبوء باثمی واثمك" کا مطلب یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گناہوں اور اپنے گناہوں کا بوجھ لے کر پلٹو۔

---

[1] نسخہ لالرلی، حلبی اور حلب میں "باثمہ" کا کلمہ موجود ہے لیکن نسخہ حرم کی شریف کے الفاظ راجح اور صحیح ہیں جو صحیح مسلم کے مطابق ہیں۔

[2] عربی متن میں "ان یبوء باثمك واثم صاحبك" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ قاتل مقتول اور اس کے ولی الدم کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا ——— یہاں یہ معاملہ وضاحت طلب ہے کہ ولی دم کے گناہ بھی اس پر ڈالے جائیں گے۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار (ج ۷، ص ۱۸۱) میں اس کی توجیہ یوں بیان کی ہے کہ قاتل ارتکاب قتل کر کے بیک وقت دو گناہ کرتا ہے یعنی ایک مقتول کو زندگی سے محروم کرنا اور دوسرا ورثاء کو پریشانی میں مبتلا کرنا۔ معاشرتی زندگی میں بھائی بھائی کے لیے ڈھارس ہوتا ہے۔ اگر خون کا وارث معاف بھی کر دے تو بھی اسے اس پریشانی سے کیسے نجات مل سکتی ہے جو قاتل کے ہاتھوں اسے لاحق ہوتی ہے، چنانچہ حدیث رسول کے مطابق اس اذیت و پریشانی کا بدلہ قاتل سے اس طرح لیا جائے گا کہ خون کے وارث کی پریشانی کے برابر گناہ قاتل کے ذمے ڈال دیے جائیں گے۔

[3] ابوداؤد (ج ۴، ص ۱۷۰) کتاب الدیات باب "الامام یامر بالعفو فی الدم"۔

[4] ابن منذر: پورا نام ابوبکر محمد بن ابراہیم بن منذر نیشاپوری ہے۔ بلند پایہ فقیہ اور مجتہد تھے۔ مکہ معظمہ کے شیوخ میں سے تھے۔ ان کی وفات ۳۱۹ھ میں ہوئی۔

انھوں نے حصول علم کے لیے مصر کا سفر کیا اور شافعی مسلک کے جید علما محمد بن عبداللہ بن حکم اور ربیع بن سلیمان سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابواسحاق شیرازی انھیں شوافع میں شمار کرتے ہیں۔

علمی خدمات: آپ کی بلند پایہ تصانیف میں "المبسوط فی الفقہ"، "الاوسط فی السنن"، "الاجماع والاختلاف"، "الاشراف علی مذاہب اهل العلم"، "اختلاف العلماء" اور "تفسیر القرآن" شامل ہیں۔ ان تصانیف کا ذکر ہم مختلف کتابوں اور مجلوں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

تفسیر القرآن: جہاں تک ابن منذر کی تفسیر القرآن کا تعلق ہے، اس کا ایک نسخہ مکتبہ جوتا میں ۱۲۵ نمبر کے تحت موجود ہے۔ (یہ تفسیر سورۂ بقرہ آیت ۱۲ سے سورۂ نساء آیت ۹۴ تک ہے) بروکلمان نے اپنی تاریخ ادب عربی (ج ۳، ص ۳۰۱) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان" (ج ۵، ص ۲۷) میں، ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (ج ۳، ص ۸۲) میں، یافعی نے "مرآۃ الجنان" (ج ۲، ص ۲۶۱) میں اور صفدی نے "الوافی بالوفیات" (ج ۱، ص ۳۳۶) میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

اس نے کہا: "اے خدا کے رسول! ممکن ہے کہ وہ ایسا نہ کر سکے"[1] حضورؐ نے فرمایا "کیوں نہیں" یہ سنتے ہی اس شخص نے رسی پھینک دی اور اسے چھوڑ دیا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب مقتول کا وارث قاتل کو پکڑ کر لے جانے لگا تو آپؐ نے فرمایا:

"قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں ہوں گے"[2] تو ایک شخص مقتول کے وارث سے ملا اور اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بتایا تو اس نے قاتل کو رہا کر دیا۔

---

[1] عربی متن میں "لعلہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارث نے کہا "ہو سکتا ہے کہ وہ میرے اور میرے بھائی کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے" اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا "کیوں نہیں" یعنی وہ تمہارے گناہوں کے ساتھ لوٹے گا"

[2] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "القاتل والمقتول فی النار" کے سمجھنے میں لوگوں کو کچھ دقت پیش آئی ہے چنانچہ اس کی تاویل امام نووی نے یوں کی ہے کہ آپؐ نے یہ اس لیے فرمایا کہ مقتول کے ورثاء ڈر جائیں اور وہ قصاص لینے کے بجائے دیت قبول کر لیں کیونکہ ایسا کرنے میں مقتول، اس کے وارث اور قاتل تینوں کا فائدہ ہے۔ مقتول اور اس کے ولی کا فائدہ تو یہ کہ ان کے گناہوں کا بوجھ قاتل لے کر پلٹے گا اور قاتل کا یہ کہ وہ قتل سے بچ جائے گا۔

چونکہ معافی میں مصلحت کا پہلو غالب تھا اور اس کے لیے تعریض مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ اسلوب اختیار فرمایا اور آپؐ کا ارشاد عام اصول کی حیثیت سے سو فی صد درست ہے۔

آپؐ کے اس ارشاد کی روشنی میں بعض شافعی علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مفتی مصلحت کے پیش نظر تعریض سے کام لے سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص پوچھتا ہے کہ کیا قاتل کے لیے توبہ کی گنجائش ہے؟ مفتی کو قرائن سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ ہاں کی صورت میں سوال کرنے والے کی جرأت بڑھے گی اور وہ قتل کو ایک معمولی جرم اس اعتبار سے سمجھے گا کہ اس سے اس کے لئے چھٹکارے کی گنجائش موجود ہے۔ ایسی صورت میں مفتی چاہے اس رائے سے متفق نہ بھی ہو تب بھی وہ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول پیش کر سکتا ہے "لَا تَوْبَةَ لِقَاتِلٍ یعنی قاتل کے لیے توبہ نہیں ہے"۔ اسی طرح اس سوال کے جواب میں کہ "آیا غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟" "اَلْغِیْبَۃُ تُفْطِرُ الصَّائِمَ یعنی غیبت روزے کو توڑ دیتی ہے" والی حدیث پیش کی جا سکتی ہے۔

امام نووی مزید لکھتے ہیں کہ یہاں حضورؐ کے اس ارشاد سے مراد وہ دونوں اشخاص نہیں ہیں جن کا تذکرہ اس واقعہ میں کیا گیا ہے، کیونکہ حضورؐ نے تو خود قاتل کو مقتول کے وارث کے حوالے کیا تھا۔ پھر یہ ارشاد اس پر کیسے صادق آ سکتا ہے۔ حقیقت میں ارشاد عام ہے اور اس سے مراد ایسے مسلمان ہیں جو عصبی جذبات سے مغلوب ہو کر ہتھیار نکال لیں اور ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں ان کا انجام دوزخ ہے۔ یہاں آپؐ کا ارشاد تعریض کی شکل میں ہے تاکہ مقتول کا وارث یہ سمجھے کہ وہ بھی اس میں شامل ہے اور وہ عاقبت سے خائف ہو کر قتل کا ارادہ ترک کر دے۔

اسماعیل بن سالم[1] کہتے ہیں کہ جب میں نے اس امر کا تذکرہ حبیب بن ابی ثابت[2] سے کیا تو انھوں نے فرمایا: کہ ابن اشوع[3] نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے وارث سے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ وہ قاتل کا جرم معاف کر دے جس سے اس نے انکار کر دیا تھا۔[4]

مسند ابن ابی شیبہ[5] میں وائل بن حجر حضرمی کی حدیث میں بھی اسی طرح کی بات ہے جس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث سے فرمایا "اَتَعْفُوْعَنْهُ" کیا تم اسے معاف کر دو گے؟ اس نے انکار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم دیت لے لو گے[6]؟

---

[1] اسماعیل بن سالم: یہ ابو یحییٰ کوفی ہیں جن کا شمار ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ ان کی رہائش بغداد میں تھی۔

[2] حبیب بن ابی ثابت: یہ زیادہ تر تدلیس کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض کے نزدیک ان کا نام ہند بن دینار اسدی ہے۔ ابو یحییٰ کوفی ان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ثقہ راویوں اور جلیل القدر فقہاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ تاہم ان کی اکثر روایات مدلس اور مرسل ہیں۔

[3] نسخۂ لاہ، حلبی اور حلب میں ابن "اشرع" ہے جو سہو کاتب ہے۔ صحیحین کی روایات میں ابن اشوع ہی ہے، ان کا نام سعید بن عمرو بن اشوع ہمدانی ہے۔ یہ صحیح مسلم اور بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ عجلی اور ابن حبان نے انھیں ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

[4] صحیح مسلم کی روایت کے مطابق، شروع میں اس نے انکار کیا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنتے ہی وہ معاف کرنے کے لیے رضامند ہو گیا۔

[5] ابن ابی شَیْبَۃ: یہ عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ عبسی ہیں۔ ابوبکر کوفی ان کے مولیٰ تھے۔ ابن ابی شیبہ ان ائمۂ حدیث میں سے ہیں جو حفظ و اتقان میں مشہور ہیں۔ ان کی کئی مفید، بلند پایہ تصانیف ہیں۔ ان میں سے ایک "المصنف المشهور فی الحدیث" ہے۔

فؤاد سزگین نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تاریخ التراث العربی" (ج ۱، ص ۲۹۵ - ۲۹۴) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے متعدد نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ اس کے کئی ایک اجزاء المطبعة العزيزية حیدرآباد میں ۱۳۸۶ھ میں چھپے اس کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ ان کی وفات محرم ۲۳۵ھ میں ہوئی۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد (ج ۱۰، ص ۶۶) میں، علامہ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (ج ۲، ص ۴۳۲) میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے "تهذيب التهذيب (ج ۶، ص ۲) میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

[6] **فقہ الحدیث:**

جمہور علماء کے نزدیک مقتول کے ورثاء کو تین باتوں میں سے کسی ایک کا اختیار حاصل ہے یعنی (۱) معاف کرنا۔ (۲) دیت لینا اور (۳) قصاص لینا۔ وہ اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ دیت قبول کرنے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوا۔ پھر آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا "اَفَتَقْتُلُهٗ" تو پھر کیا تم اسے قتل ہی کرو گے؟ اس نے کہا، "ہاں یا رسول اللہ!" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس[1] سے فرمایا: "اگر تو اسے معاف کر دے تو مقتول کے گناہ بھی اس کے سر ہوں گے۔" یہ سنتے ہی اس نے قاتل کو معاف کر دیا[2]۔

مسند احمد[3] میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قتل کا ارتکاب کیا۔ فیصلے کے لیے یہ مقدمہ حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپؐ نے تمام کارروائی سننے کے بعد قاتل کو مقتول کے وارث کے سپرد کر دیا۔ اس وقت قاتل نے کہا کہ "یا رسول اللہ! میں نے اسے ارادۃً قتل نہیں کیا۔" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقتول کے وارث کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اَمَا اِنَّهٗ اِنْ كَانَ صَادِقًا ثُمَّ قَتَلْتَهٗ، دَخَلْتَ النَّارَ" اگر یہ سچ کہہ رہا ہے اور اس کے باوجود تو نے اسے بدلے میں قتل کر دیا تو تیرا ٹھکانہ دوزخ ہو گا" یہ سنتے ہی مقتول کے وارث نے قاتل کو، جس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے، چھوڑ دیا۔ جب وہ جا رہا تھا تو اس کی رسّی بھی ساتھ ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔ اس وقت سے اس کا

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور ان کے ساتھیوں کی رائے اس کے برعکس ہے۔ ان کے نزدیک قتل میں قصاص لازمی ہے۔ اور مقتول کے وارث کو قاتل کی رضامندی کے بغیر دیت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ اس ارشادِ باری سے استدلال کرتے ہیں کہ "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (البقرہ: ۱۷۸) وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں دیت کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس رائے کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت قتل سے متعلق تمام احکام پر حاوی نہیں ہے۔ قتل کے بعض احکام احادیثِ متواترہ میں مذکور ہیں جن پر حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کا عمل رہا ہے۔

[1] نسخۂ حلب، حلبی اور لالہ میں "لهٗ" (اس سے) نہیں ہے۔

[2] نسخہ حلب اور حلبی میں "فَعَفٰى عَنْهُ" (اسے معاف کر دیا) کی عبارت مذکور نہیں ہے۔

[3] یہ روایت سنن ابی داؤد (ج ۴، ص ۲۹۰) کتاب الدیات باب "الامام یامر بالعفو فی الدم" میں عثمان بن ابی شیبۃ عن ابی معاویۃ ثنا الاعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ کی سند کے ساتھ اور جامع ترمذی (ج ۴، ص ۲۲) کتاب الدیات باب "ماجاء فی حکم ولی القتیل فی القصاص والعفو" میں عن ابی کریب عن ابی معاویۃ کی سند کے ساتھ بھی موجود ہے۔ امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

عثمان بن ابی شیبۃ: یہ ابوالحسن کوفی ہیں۔ ان کا شمار بلند پایہ محدثین میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ صاحب مسند ابن ابی شیبہ نہیں ہیں۔ صاحب مسند ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ہیں۔ منذری نے اس روایت کو نسائی اور ابن ماجہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث عثمان بن ابی شیبہ کے بجائے ابوبکر ابن شیبہ صاحبِ مسند سے روایت کی ہے۔

اس روایت سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ اگر قتل عمد بالکل واضح ہو تو قاتل کی بات کا کوئی وزن نہیں ہو گا، تاہم مقتول کے وارث کے لیے احتیاط لازم ہے کہ وہ قصاص میں عجلت سے کام نہ لے مبادا کہ وہ گناہ کی لپیٹ میں آ جائے۔ حضورؐ کے ارشاد "اِنْ كَانَ صَادِقًا ثُمَّ قَتَلْتَهٗ دَخَلْتَ النَّارَ" کا مقصد یہی ہے کہ وہ قتل پر اصرار نہ کرے۔

نام "رسی والا" پڑگیا۔ مسند احمد کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "عَمَدَ يَدَهُ وَخَطَأَ قَلْبُهُ"[1] یعنی یہ کام ہاتھ سے دانستہ ہوا اور دل سے سہواً" یہ عبارت "الواضحہ"[2] میں ہے۔

سنن نسائی میں ہے "خدا کی قسم یا رسول اللہ! میں نے اسے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا ہے" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِنْ كَانَ صَادِقًا ثُمَّ قَتَلْتَهُ دَخَلْتَ النَّارَ" کہ اگر وہ سچ کہہ رہا ہے اور اس کے باوجود تو نے اسے قتل کر دیا تو تیرا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔"

نسائی[3] میں ایک روایت اس طرح بھی ہے کہ "قاتل نے کہا کہ یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! میں نے اسے ارادۃً قتل نہیں کیا ہے" اس حدیث کا باقی حصہ روایت ابوہریرہؓ کی مانند ہے (یعنی ایک روایت میں "واللہ یا رسول اللہ" ہے اور دوسری میں "یارسول اللہ، واللہ" ہے۔

"الواضحہ"[4] میں ہے کہ اس نے تھپڑ مارا جس سے وہ مر گیا۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مجھے اس کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکا۔

[2] الواضحہ:

یہ کتاب عبدالملک بن حبیب نے لکھی ہے جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ فقہ مالکی کی امہات الکتب میں شمار ہوتی ہے۔ البتہ اس وقت یہ نایاب ہے۔

بروکلمان نے "تاریخ الادب العربی" (ج ۳، ص ۸۶) میں لکھا ہے کہ ان کی دینی اور فقہی کتب میں سے "الفرائض" (برلن ۴۶۸۷) اور "کتاب الورع" (میڈرڈ ۵/۷۷) کے سوا اور کوئی کتاب دستیاب نہیں۔ حاجی خلیفہ نے مغالطہ کی بنا پر "کشف الظنون" (ج ۲، ص ۱۹۹۶) میں "الواضحہ" کو اعراب القرآن کی کتاب لکھا ہے: حالانکہ عبدالملک بن حبیب کی اعراب القرآن پر ایک اور کتاب ہے۔ "الواضحہ" تو سنن اور فقہ کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔

[3] النسائی (ج ۸، ص ۱۳) کتاب "القسامۃ" باب "القود" میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت مذکور ہے۔

[4] یہ اضافہ صرف نسخہ حرم مکی شریف میں موجود ہے۔ صاحب الواضحہ کی یہ وضاحت کہ اس کی موت تھپڑ سے ہوئی کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ تمام اصولوں کے بھی خلاف ہے اور قرآن و سنت کی تصریحات کے بھی منافی ہے۔ تھپڑ لگنے سے جو موت واقع ہوگی وہ قتل خطا ہوگا جس کے بارے میں اجماع ہے کہ اس میں قصاص نہیں ہوتا۔ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ثابت ہو جائے تو بھی اسے شاذ تصور کیا جائے گا۔

ابن اسحاق: محمد بن اسحاق کا شمار عرب کے قدیم ترین مؤرخین میں ہوتا ہے۔ ایک جماعت کے ہاں وہ ثقہ شمار ہوتے ہیں، جبکہ بعض کے نزدیک ان کی روایات مدلس ہیں۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اور ابن سید الناس نے "عیون الاثر" میں پوری دو فصلوں میں ان تمام اعتراضات کو مسترد کیا ہے جو ان پر کیے گئے ہیں۔ امام مسلمؒ "متابعات" میں ان کی روایات لائے ہیں۔ امام بخاری نے متعدد مقامات پر ان کی روایات سے استدلال کیا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور

وادیٔ نخلہ یمانیہ[1] سے ہوتے ہوئے طائف[2] گئے۔ وادیٔ نخلہ سے قرن المنازل[3]، وہاں سے وادیٔ مُلَیح[4] اور وہاں سے بحرۃ الرغاء[5] میں، جو لیّۃ[6] کے قریب ہے، پڑاؤ کیا۔ وہاں آپ نے مسجد بنائی اور نماز ادا کی۔[7] پھر طائف پہنچے۔

ابن ماجہ میں ان کی روایات موجود ہیں۔

۸۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی، ایک روایت کے مطابق ان کی وفات ۱۵۳ھ میں ہوئی۔

ابن اسحاق نے جو کچھ لکھا ہے، ابن ہشام (المتوفی ۲۱۸ھ) نے اس کی تلخیص کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اشعار کے غیر مانوس الفاظ کی تشریح کی۔ اس کے مبہم مقامات کی وضاحت کی اور اس کی مختلف قراءتوں کا ذکر کیا جس سے یہ سیرت ابنِ ہشام کی طرف منسوب ہوگئی۔ اس کے بعد عظیم محدث عبدالرحمٰن سُہیلی (المتوفی ۵۸۱ھ) نے سیرت ابنِ ہشام کی مکمل تشریح کی اور "الروض الانف" اس کا نام رکھا جس پر تحقیق و تعلیق کا کام شیخ عبدالرحمٰن وکیل نے کیا۔

[1] نَخلہ یَمانیہ۔ یہ حجاز کی ایک وادی ہے۔ اس کے اور مکہ کے درمیان دو راتوں کی مسافت پائی جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں اہلِ نجد اور یمن کے حاجی یہاں جمع ہونے کے بعد حج کے لیے آتے تھے۔

[2] یہ واقعہ غزوۂ حنین کے بعد کا ہے۔ غزوۂ حنین میں شکست کھانے اور درید بن الصمہ کے قتل ہو جانے کے بعد ہوازن کے بچے کھچے لوگ اوطاس میں جمع ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف حضرت خالد بن ولید کو روانہ کیا۔ جب انھیں اوطاس میں بھی منہ کی کھانی پڑی تو بنی ثقیف ایک سال کا سامان خورد و نوش لے کر اپنے مضبوط قلعوں میں محفوظ ہو کر بیٹھ گئے۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اس جانب متوجہ ہوئے اور طائف کے نزدیک پڑاؤ کیا۔ یہ واقعہ ۸ھ میں ہوا۔ دیکھیے "فتوح البلدان" (ص ۶۶) اور "عیون الاثر" (ج ۲، ص ۲۰۰)

[3] قَرَن: اہلِ نجد کا میقات ہے۔ یہ طائف کے قریب واقع ہے۔

[4] مُلَیح، طائف کی ایک وادی کا نام ہے۔ ملح کی تصغیر ہے۔

[5] بَحرَۃ: یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ بحرہ کی بستی لیّۃ کے قریب واقع ہے۔

[6] لیّۃ: طائف کے ایک نواحی مقام کا نام ہے۔

[7] آپ نے نماز کے لیے جس جگہ کا انتخاب فرمایا وہ ام المومنین حضرت اُمّ سلمہ اور حضرت زینب کے خیموں کے درمیان تھی۔ بعد میں وہاں آپ نے مسجد بنوا دی۔

جب بنو ثقیف مشرف باسلام ہوئے تو عمرو بن اُمیّہ بن وہب بن مُعتّب بن مالک نے یہاں مسجد کی باقاعدہ تعمیر کرائی۔

طائف کا محاصرہ اٹھارہ اور بعض روایات کے مطابق پندرہ دن جاری رہا۔ ابن اسحاق کا قول ہے کہ بیس سے کچھ زائد دن یہ محاصرہ رہا۔

ابنِ ہشام نے سترہ دن کا ذکر کیا ہے۔ ابن ہشام کے مطابق اسلام میں پہلی مرتبہ یہیں منجنیق استعمال کی گئی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب[1] نے مجھے بتایا کہ حضورؐ نے بحرۃ الرغا میں قتل کے ایک مقدمہ میں قصاص کا فیصلہ صادر فرمایا اور یہ پہلا خون تھا جس کا اسلام میں قصاص لیا گیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ بنو لیث کے ایک آدمی نے بنو ہذیل کا ایک شخص قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کے بدلے میں قتل کروا یا۔ الواضحہ[2] میں ہے کہ اسے بدلے میں قتل کرنے کا فیصلہ قسم کے ذریعے کیا گیا تھا۔

الواضحہ اور سیرت ابن ہشام[3] میں ہے کہ محلم بن جثامہ نے عامر بن اضبط الشجعی کو قتل کر دیا تو اس کے ورثا نے قسمیں کھائیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مقتول کی دیت قبول کرنے کو کہا انھوں نے آپ کا یہ ارشاد مان لیا اور آپ نے سو اونٹ

---

[1] نسخہ حرم مکی شریف میں شعیب کی جگہ مغیث چھپا ہے جو غلط ہے۔

[2] عربی متن میں قال فی الواضحۃ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ عبارت نسخہ شہید علی پاشا، حلبی اور حلب میں مذکور نہیں ہے، البتہ اس کی طرف نسخہ حلبی اور حلب کے تشریحی حصہ میں اشارہ موجود ہے۔

[3] یہاں سے لے کر آخر باب تک کی عبارت نسخہ شہید علی پاشا میں مذکور نہیں ہے۔

[4] سیرت ابن ہشام (ج ۲، ص ۶۲۶) میں ہے کہ ابن اسحاق یزید بن عبد اللہ سے، وہ قعقاع بن عبد اللہ بن ابی حدرد سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ ابن حدرد سے بیان کرتے ہیں کہ حضور اقدس نے ہمیں "اضم" کی طرف بھیجا۔ مسلمانوں کی اس جماعت میں ابو قتادہ رضؓ حارث بن ربعی اور محلم بن جثامہ بھی تھے۔ جب وادی میں داخل ہوئے تو ان کے پاس سے عامر بن اشجعی گزرا۔ وہ اونٹ پر سوار تھا اور اس کے پاس دودھ اور سامان بھی تھا۔ اس نے سلام کہا، لیکن محلم بن جثامہ نے کسی پرانی رنجش کی بنا پر اسے قتل کر دیا اور اس کا سامان اپنے قبضے میں کر لیا۔ جب ہم واپس آئے تو سارا واقعہ حضورؐ کو سنایا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ۔ (النساء: ۹۴) "اے اہل ایمان جب تم راہ خدا میں نکلو تو اصل حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ اور جو تمھیں سلام کہے تم اسے یہ مت کہو کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگر تم دنیا کا سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمھارے لیے بہت سے اموالِ غنیمت ہیں"۔

یہ روایت احمد اور طبرانی نے بھی کی ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۷ - ۸)

ابن اسحاق حضرت زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں اور حضرت زبیرؓ جنگ حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر سستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اسی دوران اقرع بن حابس اور عُیَیْنَہ بن حصن نے عامر اشجعی کے معاملے میں جھگڑنا شروع کیا۔ عُیَینہ اس وقت غطفان کا سردار تھا اور وہ عامر اشجعی کے قصاص کا تقاضا کر رہا تھا۔ اقرع بن حابس محلم کی مدافعت کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اس مسئلہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا، عیینہ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم! میں اس کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ غم واندوہ سے اس کی عورتیں بھی اسی طرح نہ جلنے لگیں، جس طرح ہماری عورتیں جل رہی ہیں یعنی میں اس کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ حضورؐ نے فرمایا: "ایسا مت کرو بلکہ دیت پر صلح کر لو" پچاس اونٹ اس سفر کے دوران لے لو اور پچاس واپس مدینہ پہنچنے پر لے لینا، لیکن وہ اپنے موقف پر اصرار کر رہا تھا۔ اچانک بنو لیث کا ایک آدمی جسے مُکَیتِل یا مکیتل کہتے تھے، اٹھا اور اس نے کہا یا رسولؐ اللہ! میرے خیال میں اس مقتول کی

دیت مقرر کی۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ یہ فیصلہ حُنین[1] میں ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پچاس اونٹ اس سفر کے دوران دے دیں گے جب کہ باقی پچاس ہماری واپسی پر دیے جائیں گے۔

اس کے بعد محلم سات دن کے اندر اندر فوت ہوگیا۔ جب اسے قبر میں اتارا گیا تو قبر نے اسے باہر پھینک دیا۔ "کتبِ سیرت" میں ہے کہ آپ نے تین مرتبہ دعا کی تھی کہ "اے اللہ! محلم کو نہ بخشنا"۔ چنانچہ قبر نے تینوں دفعہ اسے باہر پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا "اِنَّ الْاَرْضَ لَتَقْبَلُ مَنْ هُوَ شَرٌّ مِنْهُ، اَرَادَ اَنْ یَجْعَلَهُ لَكُمْ عِبْرَةً" زمین اس سے بھی بُروں کو قبول کر لیتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے تمھارے لیے سامانِ عبرت بنانا چاہا ہے"۔ اس کے بعد اسے پہاڑ کے دامن میں پھینک دیا گیا جہاں درندوں نے اسے کھا لیا۔

مثال ان بھیڑ بکریوں کی ہے جو گھاٹ پر پانی پینے آئیں اور اگلیوں کو تیر لگے اور پچھلی بھی بھاگ جائیں۔ آج اس کا ایسا فیصلہ فرمائیے کہ یہ بعد والوں کے لیے نمونہ بن جائے۔ حضورؐ نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور فرمایا کہ "تمھیں دیت ہی لینی ہوگی جس کا نصف حصہ سفر میں ادا ہوگا اور باقی آدھا واپسی پر ادا کیا جائے گا"۔ تب اس نے دیت قبول کر لی۔

[1] نسخہ حلبی، حلب اور شہید علی پاشا میں حنین کی جگہ بجمسین ہے جو درست نہیں ہے۔

پتھر سے ہلاک کرنے والے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک یہودی نے ایک لونڈی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل ڈالا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ یہ لونڈی زیور پہنے ہوئے مدینہ آئی۔ ایک یہودی نے اسے پتھر مارا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی گئی۔ اس وقت اس میں کچھ جان باقی تھی۔ آپ نے پوچھا "اَقَتَلَكِ فُلَانٌ" کیا تجھے فلاں نے قتل کیا ہے؟" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پوچھا تو اس نے پھر اسی طرح سر ہلایا، لیکن جب تیسری مرتبہ آپ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہودی کو پکڑ کر آپ کی خدمت میں لایا گیا اس نے غلطی جرح کے بعد آخر کار اعتراف جرم کر لیا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کا سر بھی پتھر سے کچل دیا گیا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا گیا۔ صحیح مسلم اور مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا، چنانچہ اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

لہ صحیح البخاری: کتاب الخصومات باب "ما یذکر فی الاشخاص والخصومة بین المسلم والیهودی" ۔ فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۲۴۱۳ ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری، کتاب "الوصایا" باب "إذا أومأ المریض برأسه اشارة بینة جازت" میں بھی یہ حدیث موجود ہے اور فتح الباری میں یہاں اس کا نمبر ۲۷۴۶ ہے۔ صحیح بخاری کتاب "الدیات" باب "سؤال القاتل حتی یقر والاقرار فی الحدود" میں بھی یہ حدیث ہے اور فتح الباری میں یہاں اس کا نمبر ۶۸۷۶ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے (فتح الباری ج ۱۲، ص ۱۹۸) میں بیان کیا ہے کہ یہودی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

ٹہ صحیح مسلم، (ج ۲- ص ۱۲۹۹) کتاب "القسامة" باب "ثبوت القصاص فی القتل بالحجر وغیرہ من المحددات والمثقلات وقتل الرجل بالمرأة"۔

ٹہ مصنف عبدالرزاق (۱۰ - ۱۰۳۰) میں یہ حدیث باب "قتل النصرانی بالمسلم" میں مذکور ہے حالانکہ باب کا عنوان "قتل الیهودی بالمسلم" ہونا چاہیے تھا۔ سنن ابو داؤد (۴ : ۱۸۰) کتاب الدیات باب "إیقاد من القاتل بحجر او بمثل ما قتل" ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ "اسے کنوئیں میں پھینک دیا گیا"۔ ابن ماجہ (ج ۲، ۸۸۹) ، الدارمی (ج ۲، ص ۱۹۰) اور نسائی (ج ۷، ص ۱۰۰) میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔

ٹہ روایات میں تطبیق: بظاہر یہ روایات باہم متصادم نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ پتھروں سے اس کا سر

اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ قاتل کو اسی انداز میں قتل کیا جائے گا جو اس نے قتل کے وقت اختیار کیا تھا۔ مثلاً پتھر یا اینٹ مارنا، گلا دبانا وغیرہ۔

امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے[۲] اس کے برعکس اہلِ عراق کے نزدیک قصاص صرف تیز دھار لوہے کے آلے کے ذریعے لیا جائے گا۔[۳]

کچل دیا گیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ روایت ابوداؤد میں ہے کہ اسے گڑھے میں ڈالا گیا۔ درحقیقت، ان روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے کہ اسے پتھر سے مارا گیا "ثُمَّ القاھا فی القلیب" میں اس جگہ کا ذکر ہے جہاں اسے ہلاک کرنے کے بعد ڈالا گیا۔

[۱] نسخہ شہید علی پاشا، لالہ، حلبی اور حلب میں "حصی" کے بجائے لفظ "عصا" ذکر کیا گیا ہے جس کا مفہوم ہوگا لاٹھی یا ڈنڈے سے مارنا۔

[۲] امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے اور ایک قول کے مطابق امام احمد کی رائے بھی یہی ہے۔ یہ حضرات آیاتِ قرآنیہ سے استدلال کرتے ہیں، مثلاً:

ا۔ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ۔ (النحل - ۱۲۶)	اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو تم اسی طرح بدلہ لو جس طرح تمھارے ساتھ کیا گیا
ب۔ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ (البقرۃ: ۱۹۴)	جو تمھارے ساتھ زیادتی کرے تم بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرو۔
ج۔ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ-۴۰)	برائی کا بدلہ اسی کی مانند ہے۔
د۔ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا۔ (الاسراء: ۳۳)	جو شخص ظلم کے ساتھ قتل کیا گیا ہم نے اس کے ولی کو قصاص کا حق دیا ہے۔

ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو بیہقی نے "المعرفۃ" میں اور بزار نے اپنی مسند میں مرفوعاً نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

مَنْ حَرَّقَ حَرَّقْنَاهُ وَمَنْ غَرَّقَ غَرَّقْنَاهُ۔	جس نے کسی کو جلایا اسے ہم جلائیں گے اور جس نے کسی کو پانی میں ڈبو کر مارا اسے ہم پانی میں ڈبو کر ماریں گے۔

بیہقی نے کہا ہے کہ اس سند میں بعض مجہول راوی ہیں، ان کا حافظ ابن حجر نے "التلخیص الحبیر" (ج ۴، ص ۱۹) میں تذکرہ کیا ہے۔ "المھذب مع شرحہ المجموع" (ج ۱۷، ص ۲۹۹) میں ہے کہ لفظ قصاص مماثلت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص قصاص میں تلوار سے قتل کرتا ہے اور اپنا کچھ حق رضاکارانہ طور پر چھوڑتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ دراصل قصاص میں دو چیزیں ہیں۔ ایک قتل اور دوسری اذیت رسانی، لیکن اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنا کچھ حق (اذیت رسانی) چھوڑنا چاہے تو اسے ایسا کرنے کا اختیار ہے۔

[۳] اہلِ عراق سے مراد امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا۔

امام مالک کا یہ مسلک اس صورت میں ہے جب مقتول جائے حادثہ پر ہی مرجائے، لیکن اگر مقتول چوٹیں آنے کے بعد بھی زندہ رہا، پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ مرگیا اور اس کے ورثاء نے قسمیں کھائیں کہ اس کی موت انہی چوٹوں کے نتیجے میں ہوئی ہے تو قاتل کو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔

امام احمد بن حنبل کا دوسرا قول بھی یہی ہے۔ ان کی اس رائے کی بنیاد حضرت نعمان بن بشیر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ" یعنی قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا۔ کاسانی نے البدائع (ج ۷۔ ص ۲۴۵) میں لکھا ہے قَود بمعنی قصاص ہے اور قصاص کا مطلب ہے اپنا پورا پورا حق لینا۔

ابن ماجہ نے (ج ۲۔ ص ۸۸۹) میں اس روایت کا ذکر کیا ہے۔ ابوصیری نے "الزوائد" میں بیان کیا ہے کہ اس روایت میں جابر جعفی نامی راوی کذاب ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کے مطابق اس روایت کو بزار، طحاوی، دارقطنی اور بیہقی نے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے تاہم اس کی سند ضعیف ہے۔ نیز ابن ماجہ، بزار، بیہقی نے ابوبکرہ سے اس سے ملتی جلتی حدیث روایت کی ہے۔
بوصیری نے "الزوائد" میں بیان کیا ہے کہ اس میں مبارک بن فضالہ نامی راوی مدلس ہے۔ ابوحاتم کے نزدیک یہ روایت منکر ہے۔ بزار کہتے ہیں کہ اس سند میں ایک راوی حر بن مالک ہیں جو اس سلسلے میں تنہا راوی ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ ان کی روایات مرسل ہوتی ہیں۔ حافظ ابن حجر کے نزدیک بیہقی اور دارقطنی کی اس روایت میں سلیمان بن ارقم ایک راوی ہے جو متروک ہے۔ دارقطنی کی دوسری روایت میں معلی بن ہلال ہے جو کذاب ہے۔ طبرانی اور بیہقی میں یہ حدیث ایک تیسری سند کے ساتھ حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت کی گئی ہے لیکن اس کی سند بھی بہت ضعیف ہے۔

عبدالحق کہتے ہیں کہ اس حدیث کی تمام سندیں ضعیف ہیں۔ ابن جوزی کی بھی یہی رائے ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اس کی سند ثابت شدہ نہیں ہے۔ دیکھیے "التلخیص الحبیر" (ج ۴، ص ۱۹)۔ اسی طرح امام شوکانی نے نیل الاوطار (ج ۷، ص ۱۶۵) میں حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"امام طحاویؒ "شرح معانی الآثار" میں کہتے ہیں کہ قتل بالمثل والی روایات ان احادیث سے منسوخ ہو چکی ہیں جن میں مثلہ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، لیکن امام بیہقی اس سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس ان کے منسوخ ہونے کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے، البتہ ان روایات میں تطبیق ممکن ہے یعنی صرف سزا کے قتل میں مثلہ جائز نہیں ہے جبکہ قصاص میں اس کی اجازت صاف ظاہر ہے۔

حافظ ابن القیمؒ اعلام الموقعین (ج ۱، ص ۳۲۷) میں کہتے ہیں کہ کتاب اللہ اور انصاف قتل بالمثل کی تائید کرتے ہیں اور سنت رسول اللہ اور صحابہؓ کے عمل سے صاف ظاہر ہے کہ قاتل کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کا نمونہ خود اس نے پیش کیا ہے۔ اس پر کتاب و سنت، آثار صحابہ اور قیاس متفق ہیں۔ علاوہ ازیں خود لفظ قصاص میں بھی یہ مفہوم موجود ہے۔"

اس حدیث سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:
۱۔ واضح اشارہ کلام کی مانند ہے[۱]
۲۔ مرد عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا[۲]

---

[۱] اس کا مطلب یہ ہے کہ زخمی یا مضروب کے کہنے پر اس آدمی کو قتل کیا جا سکتا ہے جس پر وہ جان لیوا زخم یا ضرب لگانے کا الزام عائد کرے اور اس کا اشارہ کلام کے قائم مقام ہوگا۔ امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے جو امام نووی نے بیان کیا ہے، لیکن جمہور کی رائے اس کے برعکس ہے۔ صحیح بخاری کی روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہودی نے قتل کا اقرار کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے باب کا عنوان یہ دیا ہے "سؤال القاتل حتی یُقِرّ والاقرار فی الحدود"۔ پھر اس حدیث کو اس باب میں شامل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو محض لونڈی کے قول کی بنا پر قتل نہیں کرایا تھا۔ پس اس سے امام مالکؒ کے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے کہ زخمی کے قول کو قبول کر کے ملزم کو قتل کر دیا جائے گا۔

[۲] جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔ ابن منذر کے نزدیک اس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے تاہم حضرت علیؓ کا قول ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ علامہ شوکانی کی روایت کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ان کے علاوہ حسن بصری، عکرمہ، عطاء، امام مالک اور امام شافعی کی بھی ایک رائے حضرت علیؓ کے قول کے مطابق نقل کی ہے اور کہا ہے کہ اس صورت میں دیت ہوگی۔

لیکن بیہقی نے ابوالزناد سے نقل کیا ہے کہ میں نے ان فقہاء امت سے ملاقات کی جن کو حجت مانا جاتا ہے۔ مثلاً سعید بن مسیّب، عُروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبدالرحمان، خارجہ بن زید، ابن ثابت، عبیداللہ بن عبداللہ، سلیمان بن یسار اور دیگر حضرات۔ ان سب کا قول ہے کہ مرد سے عورت کا قصاص لیا جائے گا، یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، اور ہر زخم کے بدلے زخم اور اگر مرد عورت کو قتل کرے تو اس کو (قصاص میں) قتل کیا جائے گا۔

ابن قدامہ نے "المغنی" میں ارشاد باری تعالیٰ "اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ" اور "اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ" اور دیگر نصوص سے استدلال کیا ہے۔ وہ عمرو بن حزم کی روایت کردہ اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن کو ایک خط لکھا تھا جس میں وراثت اور قابلِ زکوٰۃ مویشیوں کی عمر کے ساتھ یہ مسئلہ بھی تحریر تھا کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ ابن قدامہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ مکتوب اہلِ علم کے یہاں مشہور و مقبول ہے۔ مرد کو عورت کے بدلے قتل کرنے کی دلیل یہ ہے کہ مرد اور عورت میں سے ہر ایک اپنا جدا گانہ تشخص رکھتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زنا کی تہمت لگائے تو اس پر حدِ قذف لگائی جائے گی۔ بعینہٖ اسی طرح اگر ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دے تو قاتل کو مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا۔

اہلِ یمن کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب والی روایت امام شافعی نے امام مالک سے اور امام مالک نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے اور انھوں نے اپنے والد سے بیان کی ہے۔ نعیم بن حماد نے ابن مبارک از معمر از عبداللہ بن ابوبکر کی سند کے ساتھ اس کی تائید کی ہے۔ عبدالرزاق اور دارقطنی نے معمر کی سند کے ساتھ اسے بیان کیا ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے

یہ حدیث امام مالکؒ نے روایت کی ہے۔ امام شافعی اس حدیث کو امام مالک سے، وہ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد ابن عمر بن حزم سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ نُعیم بن حماد نے اس حدیث کو موصولاً ابن مبارک سے ذکر کیا ہے۔ ابن مبارک معمر سے اور وہ عبداللہ بن ابی بکر سے نقل کرتے ہیں۔ عبدالرزاق نے یہ حدیث معمر سے روایت کی ہے۔ محدث دارقطنی بھی اس حدیث کو بروایت معمر نقل کرتے ہیں۔ امام داؤد اور نسائی نے یہ حدیث مرسلاً امام زہری سے روایت کی ہے۔ (التلخیص الحبیر ج ۴۔ ص ۱۷)

امام زہری سے یہ روایت مرسل بیان کی ہے۔ دیکھیے التلخیص الحبیر (۴-۱۷) اور امام شوکانی نے وہاں سے نیل الاوطار (۷-۱۶۲) میں جو کچھ نقل کیا ہے۔

نوٹ:- اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کسی کا قتل کسی ثقیل چیز سے ہوا ہو تو اس صورت میں اسی طرح قصاص لیا جائے گا جمہور علماء، امام شافعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔ وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ سے روایت کی گئی ہے کہ کسی ثقیل چیز سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ وہ حدیث نعمان بن بشیرؓ سے استدلال کرتے ہیں۔ جسے امام بیہقی نے بیان کیا ہے کہ "کل شی خطاء الا السیف ولکل خطاءٍ أرش" یعنی ایسا قتل جس میں تلوار کا استعمال نہیں ہوا ہے وہ قتل خطا ہے اور اس میں دیت لازم ہوتی ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حدیث کے الفاظ یہ ہیں: کل شئ سوی الحدیدۃ خطاٌ ولکل خطاً ارش یعنی لوہے کے آلے کے علاوہ کیا گیا قتل، قتل خطا ہے۔ اور ہر قتل خطا کی دیت کی ادائیگی لازم ہے۔

اس روایت کا دارومدار جابر جعفی نامی راوی پر ہے جو کذاب ہے۔ زیلعی نے "تبیین الحقائق" (ج ۶، ص ۱۰۰) میں نقل کیا ہے کہ کوڑے، ڈنڈے اور پتھر وغیرہ سے عموماً قتل واقع نہیں ہوتا اور نہ یہ چیزیں قتل کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ باقی رہا ارادہ تو وہ ایک داخلی معاملہ ہے جس کا پتہ دلیل کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اور یہ دلیل ایسے آلے کا استعمال ہے جو عموماً قتل میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر ایسے آلے کے علاوہ کوئی اور چیز استعمال ہوگی تو اس سے ارادے کے بارے میں شک پیدا ہوگا، لیکن مذکورہ بالا حدیث سے ان سب تاویلات کی تردید ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں خود امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی تیز دھار لوہے، لکڑی تیز پتھر، منجنیق، آگ میں پھینکنے اور اسی طرح کی ان تمام دوسری صورتوں میں قصاص لازم ہے جن میں قتل واقع ہو جاتا ہے (ان صورتوں میں امام ابوحنیفہؒ اسے قتل خطا قرار دے کر قصاص کے بجائے دیت کے قائل نہیں)

کسی کی ضرب سے حمل گرنے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

موطا[1]، بخاری[2] اور مسلم[3] میں روایت ہے۔ امام مالک، ابن شہاب سے وہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ ہذیل[4] کی دو عورتوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے دوسری کو مارا جس سے اس کا جنین[5] گر گیا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنے کا حکم دیا۔

صحیح مسلم[6] کی ایک اور روایت میں ہے کہ ایک عورت نے دوسری کو پتھر مارا جس سے اس کی اور اس کے پیٹ میں بچے کی موت واقع ہو گئی۔

---

[1] الموطا (ج ۲، ص ۸۴۰) کتاب العقول باب "عقل الجنین" نیز یہ روایت ابو سلمہ سے متصل اور حضرت سعید سے مرسل مروی ہے۔

[2] فتح الباری (۴۰ : ۶۷) حضرت سعید ابن المسیب کی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو لحیان کی عورت کے جنین کے بارہ میں، جو مردہ گرا تھا، ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنے کا حکم دیا۔ چند ایام کے بعد وہ عورت بھی جس پر دیت عائد کی تھی مر گئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بیٹوں اور خاوند میں تقسیم کی جائے گی اور اس کے ذمے جو دیت واجب ہے وہ اس کے عصبات ادا کریں گے۔ کتاب الدیات باب جنین المرأۃ (فتح الباری : ۴۰-۶۹) میں یہ حدیث حضرت ابو سلمہ سے روایت کی گئی ہے۔

[3] صحیح مسلم، کتاب القسامۃ باب "دیۃ الجنین ووجوب الدیۃ فی قتل الخطأ وشبہ العمد علی عاقلۃ الجانی" اسی روایت میں حمل بن نابغہ ہذلی کا یہ قول منقول ہے "یا رسول اللہ! کیا ہم اس کی دیت بھی ادا کریں گے جس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ نہ چیخا اور نہ ہی آواز نکالی"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تک بندی سن کر فرمایا "یہ کاہنوں کے گروہ میں سے ہے۔"

[4] ھُذَیل: ایک مشہور قبیلے کا نام ہے جو ہُذَیل بن مدرکہ بن الیاس بن مُضر بن معد بن عدنان کی طرف منسوب ہے۔ اس قبیلے کے اکثر لوگ مکہ کے قریب، وادی نخلہ میں آباد ہیں۔ دیکھیے "السمعانی" (ج ۲، ص ۵۰۸) "اللباب" (ج ۳، ص ۸۶)

[5] "جنین" یہ کلمہ بروزن عظیم ہے۔ بچہ جب تک عورت کے پیٹ میں ہے اسے جنین کہا جاتا ہے۔ ولادت کے بعد اگر زندہ ہو تو اسے بچہ کہا جاتا ہے، لیکن اگر وہ مردہ پیدا ہوا تو اس پر بھی لفظ جنین کا اطلاق ہوتا ہے۔

[6] یونسؒ نے یہ روایت ابن شہاب سے متصل سند کے ساتھ بیان کی ہے۔

ایک اور حدیث[1] میں ہے کہ اسے خیمہ کی لکڑی سے مارا۔ وہ عورت حاملہ تھی اور اس کی سوکن تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عصبات پر ڈالی اور جنین کے لیے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔

سنن نسائی[2] میں ہے کہ ایک نے دوسری کو لکڑی ماری جس سے وہ اور اس کا جنین جاں بحق ہو گئے۔ آپؐ نے فیصلہ کیا کہ جنین کے عوض غلام آزاد کیا جائے اور اس عورت کو مقتولہ کے بدلے قتل کر دیا جائے۔ نسائی کے علاوہ دیگر کتب میں بھی اسی طرح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتلہ کو مقتولہ کے بدلے قتل کرا دیا اور جس غلام کے آزاد کرنے کا حکم آپؐ نے دیا اس کی قیمت پچاس دینار[3] یا چھ سو درہم تھی۔ قتادہؒ، امام مالکؒ بن انسؒ[4] و دیگر فقہاء کا یہی مسلک ہے۔

---

[1] یہ حدیث حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے مروی ہے اس کی سند یہ ہے۔ اسحاق بن ابراھیم الحنظلی قال اخبرنا جویر عن منصور عن ابراھیم عن عبید بن نفیلۃ الخزاعی عن مغیرۃ بن شعبۃ۔ اس کی دوسری سند اس طرح ہے۔ محمد بن رافع قال حدثنا یحیی بن آدم قال حدثنا مفضل عن منصور الی آخرہ۔

[2] سنن نسائی (ج ۸، ص ۲۱) کتاب القسامۃ باب "قتل المرأۃ" میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلے کی درخواست کی گئی تو حمل بن مالک اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ میں دونوں عورتوں کے گھروں کے درمیان میں تھا جب ایک نے دوسری کو مارا۔ یہ حدیث اصحاب سنن نے اور امام حاکم نے بھی روایت کی ہے۔

ابوداؤد نے ان عورتوں کا نام ملکیہ اور ام غطیف بتایا ہے لیکن طبرانی نے مارنے والی کا نام ام عفیف اور مضروبہ کا نام ملکیہ لکھا ہے۔ اس میں علاء بن مُسرِفوح کا قول بھی مذکور ہے جسے ابن حبانؒ نے حمل بن مالک کے حوالے سے نقل کیا ہے وہ قول یہ ہے۔ کیا ہم اس بچے کی دیت دیں جس نے کھایا پیا نہ بات کی۔ حافظ عراقی نے الدرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ (ج ۲، ص ۲۸۲) میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

جنین کی دیت پچاس دینار کے مساوی ہوتی ہے۔

[3] حضرت عمرؓ نے دیت کی قیمت یہی مقرر کی تھی۔

ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ غلام کی قیمت پانچ سو دینار ہے۔ ربیعہ کے نزدیک یہ پچاس دینار ہوتی ہے۔ ابراہیم حربی نے صحیح سند کے ساتھ امام شعبی سے نقل کیا ہے کہ غلام کی قیمت پانچ سو دینار ہوتی ہے جبکہ عبدالرزاق نے معمر سے، انھوں نے قتادہ سے پچاس دینار بیان کی ہے۔ دیکھیے "المصنف" اور الدرایۃ (ج ۲، ص ۲۸۱)

[4] امام مالکؒ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے بیان کرتے ہیں کہ غلام ۵۰ دینار یا ۶۰۰ درہم کا ہوتا ہے۔ ایک مسلمان عورت کی دیت پانچ سو دینار یا چھ ہزار درہم ہوتی ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جنین کی دیت عورت کی دیت کا دسواں حصہ ہوگی اور یہ حصہ پچاس دینار یا چھ سو درہم کے مساوی بنتا ہے۔ امام مالک نے یہ بات مؤطا میں کہی ہے۔ حضورِ اقدس نے جنین کے ½ حصہ کا فیصلہ کیا کیونکہ احتمال تھا کہ جنین مردہ ہو۔ اسی بنا پر علماء کا فتویٰ ہے کہ

مصنف عبدالرزاق[1] میں حضرت عکرمہ کی روایت ہے کہ قبیلہ ہُذیل کے جس شخص کی ایک بیوی نے دوسری کو قتل کیا اس کا نام حمل بن مالک بن نابغہ تھا۔ قاتلہ کا نام اُم عُفیف بنت مسروح تھا۔ وہ بنو سعد بن ہُذیل قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ مقتولہ کا نام مُلیکہ بنت عُوَیمر تھا۔ وہ بنو لحیان بن ہُذیل قبیلے سے تھی۔

صحیح بخاری[2] کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پتھر مارنے والی عورت کو قتل نہیں کرایا[3]۔ ان کی حدیث اس طرح ہے کہ عبداللہ بن یوسف نے لیث سے، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے سعید بن مسیب سے۔ انھوں نے ابوہریرہؓ سے روایت کی کہ بنو لحیان کی عورت کے جنین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ عورت جس پر دیت عائد کی گئی تھی، وفات پا گئی۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بیٹوں اور خاوند کے لیے ہے لیکن دیت کی ادائیگی اس کے عصبات (آبائی خاندان) کے ذمے ہے۔

اگر جنین زندہ گرا لیکن چوٹ کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا تو اس کی پوری دیت ہے کیونکہ جنین پیدائشی اعتبار سے مکمل تھا۔ امام مالکؒ نے بھی مؤطا میں یہ روایت نقل کی ہے۔

[1] "المصنف" (ج ۱۰، ص ۶۲)

[2] یہ روایت بخاری کتاب الفرائض میں ہے۔

[3] شبہ عمد کی وجہ سے۔

امام مالکؒ کے نزدیک قتل کی دو ہی صورتیں ہیں۔ قتل عمد اور قتل خطاء۔ اگر کوئی تیسری شکل نکالی جائے گی تو یہ نص قرآنی پر اضافہ ہوگا۔ ارشاد باری ہے "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا" (النساء: ۹۳) اور "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً" (النساء - ۹۲) اس واقعہ میں پتھر مارنے والی عورت کو شبہ عمد کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا۔ علامہ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے اس روایت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اس میں شبہ عمد کی شکل موجود تھی جس کے وہ (امام مالکؒ) قائل نہیں ہیں۔ فتویٰ اور اہل مدینہ کا عمل بھی اس کے خلاف ہے۔ آپ نے صرف جنین کے واقعہ کے ذکر تک اکتفا کیا جو ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ زرقانی نے شرح مؤطا (ج ۵، ص ۱۴۵) میں ان تشریحات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

قاتل معلوم نہ ہوسکنے کی صورت میں قسمؔ کے ذریعے فیصلہ

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب موطا ؔ میں بیان کرتے ہیں کہ ان سے

لہ القسامہ کی اہمیت و افادیت:

القسامۃ: بلفظی معنی حُسن ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ فلان قسیم "یعنی فلاں بڑا خوبصورت ہے۔ یہ لفظ قسم اور حلف کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ مثلاً تقاسم القوم یعنی قوم نے باہم قسمیں کھائیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے تقاسموا باللہ (النمل ۴۹) (اللہ کی قسم کھاؤ)۔ اسی طرح دوسرے مقام میں ہے۔ کما انزلنا علی المقتسمین (الحجر۔ ۹۰) (جیسا کہ ہم نے قسمیں کھانے والوں پر نازل کیا یعنی وہ لوگ جنھوں نے حضور اکرم کے خلاف سازشیں کرنے کی قسمیں اٹھا رکھی تھیں۔ لسان العرب (ج ۱۲ ۔ ص ۴۸۱)

اسلامی قانون میں یہ لفظ قسم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مقتول کے ورثاء اپنا استحقاق اور ملزم اپنی برأت ثابت کرنے کے لیے قسمیں اٹھاتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی محلہ میں مقتول پایا جائے تو پچاس اہل محلہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے نہ قتل کیا اور نہ ہی ہمیں قاتل کا علم ہے۔ اگر وہ قسمیں اٹھائیں تو ان پر (قصاص کے بجائے) دیت لازم ہوگی۔

قسامت کا رواج عہد جاہلیت میں موجود تھا جسے اسلام نے برقرار رکھا۔ اس کی تائید کتاب و سنت اور اجماع امت سے ہوتی ہے۔ کتاب اللہ سے اس کے ثبوت کے لیے یہ ارشاد باری ہے:

یعنی جو شخص مظلوما نہ قتل کیا گیا ہو اس کے وارث کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔ اللہ نے اس حق (سلطان) کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کا مطلب "قسم" ہے۔ سنت کے لیے اس باب کی احادیث کا مطالعہ فرمائیے اور اجماع یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں اس اصول پر عمل ہوتا رہا، چنانچہ جب حارث بن اصبغ الوداعی نے حضرت عمرؓ سے کہا "امیرالمومنین نہ ہماری قسمیں ہمارے مالوں کی حفاظت کرتی ہیں اور نہ ہمارے مال ہماری قسموں کے لیے مفید ہیں تو آپؓ نے فرمایا "قسموں سے تمہاری جانیں محفوظ ہوگئیں اور دیت اس لیے ہے کہ مقتول تمہارے ہاں پایا گیا" سرخسی نے المبسوط (ج ۲۶، ص ۱۰۷) میں یہ روایت بیان کی ہے اور اس کی وجہ انھوں نے یہ لکھی ہے کہ قاتل اپنے محلے سے نکل کر کسی دوسرے محلہ میں آسانی سے قتل کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس کا کسی محلہ میں قتل جیسی واردات کرنا اہل محلہ کی حمایت ہی سے ہوسکتا ہے۔ اور یہ لوگ اس کے لیے ایک طرح سے عاقلہ ہوں گے اور شریعت نے ان پر دیت تو اس لیے فرض کی ہے کہ خون ضائع نہ جائے اور قسم اس لیے ضروری ٹھہرائی ہے کہ شاید اس تدبیر سے قاتل کا سراغ مل جائے۔ صحابہ کرام نے حضرت عمرؓ کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور اس پر برابر عمل ہوتا رہا ہے۔ غرناطی نے "قوانین الاحکام الشرعیہ" میں قسامت کی تین شرطیں بیان کی ہیں: مقتول مسلمان ہو۔ آزاد ہو یعنی ذمی اور غلام کے قتل میں بالاتفاق قسامہ نہیں ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ قتل کی کوئی واضح نشانی موجود ہو۔

لہ موطا (ص ۱۹۵) کتاب القسامۃ باب تبرئۃ اہل الدم فی القسامۃ بخاری: کتاب الدیات باب القسامۃ میں

ابولیلیٰ بن عبداللہ نے اور ان سے سہل بن ابی حثمہ نے بیان کیا کہ انھیں ان کی قوم کے سربرآوردہ اشخاص نے بتایا کہ عبداللہ بن سہل اور محیصہ مالی مشکلات کی وجہ سے خیبر گئے۔ محیصہ واپس آیا اور اس نے اپنے لوگوں کو بتایا کہ عبداللہ بن سہل کو قتل کر کے ایک کنوئیں میں پھینک دیا گیا تو میں یہودیوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ اللہ کی قسم تم نے اسے (عبداللہ کو) قتل کیا ہے تو انھوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کے بعد میں نے آکر تم لوگوں کو سارا واقعہ سنادیا ہے۔

پھر وہ، اس کا بڑا بھائی حویصہ اور عبدالرحمٰن مل کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سب سے پہلے محیصہ نے، جو خیبر میں ساتھ تھے، بات کرنی چاہی۔ اس پر آپ نے فرمایا کَبِّرْ، کَبِّرْ "بڑے کو بات کرنے دو" چنانچہ حویصہ نے تفصیل سے پورا واقعہ سنایا۔ اس کے بعد محیصہ نے کچھ اور تفاصیل بیان کیں۔

سارا واقعہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اِمَّا اَنْ يَدُوا صَاحِبَكُمْ وَاِمَّا اَنْ يُؤْذَنُوا بِحَرْبٍ" یعنی یا تو یہودی تمھارے ساتھی کی دیت ادا کریں یا ان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جائے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھوا کر بھیج دی، لیکن یہودیوں نے قتل کے الزام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے محیصہ اور حویصہ اور عبدالرحمٰن سے کہا "اَتَحْلِفُونَ وَتَسْتَحِقُّونَ دَمَ صَاحِبِكُمْ" یعنی کیا تم قسمیں کھانے کے لیے تیار ہو تاکہ تم اپنے ساتھی کے خون کے حق دار بن سکو؟

روایت اختصار کے ساتھ مذکور ہے (فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۶۸۹۸ ہے۔ اسی طرح بخاری کی کتاب الاحکام باب کتاب الحاکم الیٰ عمالہ والقاضی الیٰ امنائہ میں یہ روایت موجود ہے اور فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۷۱۹۲ ہے۔

ل۔ ابولیلیٰ: یہ اصل میں ابن ابی لیلیٰ انصاری مدنی ہیں۔ جن کا نام عبدالرحمٰن تابعی صغیر ہے۔ یہ ثقہ ہیں۔

ل۔ سہل بن ابی حثمہ: ابن ساعدۃ بن عامر انصاری خزرجی ہجرت کے تیسرے سال پیدا ہوئے۔

ل۔ زرقانی نے شرح مؤطا (ج ۵، ص ۱۸۱) میں بیان کیا ہے کہ محیصہ اور حویصہ مسعود کے اور عبداللہ اور عبدالرحمٰن سہل کے بیٹے ہیں۔ عبداللہ بن سہل ابن زید انصاری حارثی عبدالرحمٰن کے بھائی اور حویصہ و محیصہ کے چچا زاد بھائی ہیں۔

ل۔ "کَبِّرْ": صیغہ امر ہے یعنی عمر میں بڑا گفتگو کا آغاز کرے۔ اس سے مراد حویصہ ہے جو محیصہ اور عبدالرحمٰن سے بڑا ہے۔ دراصل مقتول کا حقیقی بھائی عبدالرحمٰن ہے جسے دعویٰ پیش کرنے کا حق ہونا چاہیے تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بعض لوگوں کو الجھن پیش آئی ہے کہ اصل مدعی کے بجائے آپ نے دوسرے شخص کو بات کرنے کے لیے کیوں فرمایا۔

امام نووی نے شرح مسلم (ج ۱۱، ص ۱۴۶) میں اس کی توجیہ یوں بیان کی ہے کہ حضور نے اسے دعویٰ پیش کرنے کے لیے نہیں بلکہ صحیح صورتِ حال بیان کرنے کا حکم دیا تھا اور دعویٰ پیش کرنے کا حق بھائی ہی کو تھا، تاہم اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ عبدالرحمٰن نے حویصہ کو دعویٰ پیش کرنے کے لیے وکیل مقرر کیا ہو۔

ل۔ حدیث کا باقی حصہ اس طرح ہے کہ انھوں نے قسمیں کھانے سے انکار کیا۔ تب آپ نے فرمایا "اَفَتَحْلِفُ لَكُمُ الْيَهُودُ" کیا

ابولیلیٰ اور یحییٰ بن سعید سے یحییٰ بن یحییٰ کی روایت ہیں "دم صاحبکم" کے الفاظ ہی منقول ہیں۔ تمام راویوں نے خاص طور پر یحییٰ بن سعید کی روایت میں ان الفاظ کا تذکرہ کیا ہے۔ "وتستحقون[1] صاحبکم او قاتلکم" اور بخاری میں "او تستحقون قاتلکم او صاحبکم" کے الفاظ ہیں۔ تاکہ تم اپنے ساتھی کی دیت یا اپنے ساتھی کے قاتل (سے بدلہ لینے کے) حق دار بن سکو۔[2]

سنن ابی داؤد میں ہے "دم صاحبکم" کہ تم اپنے ساتھی کے خون کے حق دار بن سکو، یہ بات حضورؐ نے دو مرتبہ فرمائی لیکن وہ قسمیں اٹھانے کے لیے راضی نہ ہوئے۔

ایک اور روایت[3] میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ قسمیں کیسے اٹھائی جا سکتی ہیں جبکہ ہم موقع پر موجود نہیں تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فتحلف لکم الیھود" (پھر یہودی تمہارے لیے قسمیں کھائیں) ایک اور روایت میں عبارت اس طرح ہے "فتبریکم[4] یھود بخمسین یمیناً" (پھر یہودیوں کے پچاس آدمی قسمیں کھا کر اپنی برأت ثابت کریں)۔ انھوں نے عرض کیا "یا رسول! وہ تو مسلمان نہیں ہیں"۔ دوسری روایت میں ہے "ہم کفار کی قسمیں کیسے قبول کر سکتے ہیں"؟ اس کے بعد آپؐ نے اپنے پاس سے سو اونٹ مقتول کے ورثاء کے گھر بھیجنے کا حکم دیا۔ حضرت سہل بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ان میں سے ایک سرخ اونٹنی نے مجھے دھکا دیا۔

یہ روایت صحیح مسلم میں کئی دفعہ آئی ہے۔ اس میں حضورؐ کا ارشاد اس طرح ہے "تستحقون صاحبکم او قاتلکم" تاکہ تم اپنے شخص یا قاتل کے حق دار بن سکو۔

یہود تمہارے لیے قسمیں کھائیں؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو مسلمان نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنی طرف سے دیت ادا کی۔ چنانچہ سو اونٹ ان کے گھر بھیجے گئے۔ سہل بن عبداللہ کا قول ہے کہ ان میں سے ایک سرخ اونٹنی نے مجھے دھکا دیا۔

[1] نسخہ حلبی، حلب اور لالہ میں "وَوَدَی سائر الرواۃ فی حدیث یحیی بن سعید" کی عبارت موجود نہیں ہے۔

[2] نسخہ علبی، حلب اور لالہ میں لفظ "دم" کا اضافہ موجود ہے۔

[3] سنن ابی داؤد میں بشر بن مفضل و مالک عن یحییٰ بن سعید والی روایت میں بھی (اتستحقون دم صاحبکم او قاتلکم) کے الفاظ موجود ہیں، اور بشر نے (دماً) کے بجائے (عدۃ) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے ملتی جلتی عبارت موطا امام مالکؒ میں بھی مذکور ہے۔

[4] نسخہ حلبی اور حلب میں "دم قتیلکم" کی عبارت مذکور ہے۔

[5] ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد کتاب الدیات باب القتل بالقسامہ یحییٰ بن سعید سے امام مالک نے جو روایت بیان کی ہے اس میں "لیسوا مسلمین" کے بجائے "کیف نقبل ایمان قوم کفار" کی عبارت ہے۔

[6] جیسا کہ مالک عن یحییٰ بن سعید والی روایت میں گزر چکا ہے۔ "من عندہ" (اپنے پاس سے) کے الفاظ امام مالک کی روایت میں ہیں۔ سنن ابی داؤد کتاب الدیات باب ترک القود بالقسامۃ میں بشیر بن یسار سے جو روایت ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ اس کا خون ضائع جائے۔ لہٰذا آپ نے اس کی دیت صدقہ کے ایک سو اونٹوں سے ادا فرمائی۔

[7] "تبرؤکم" یعنی ہم آپ کے دعوے کے مقابلے میں اپنی برأت ثابت کریں۔

صحیح مسلم[1] ہی میں امام مالک کی سند کے ساتھ ایک روایت ہے جس کے الفاظ اسی طرح ہیں جس طرح یحییٰ والی روایت میں، یعنی اس طرح "تم اپنے شخص کے خون کے حق دار بن سکو"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ تم میں سے پچاس آدمی ان کے ایک شخص کے بارے میں قسمیں اٹھائیں (کہ قتل اس نے کیا ہے) تو اسے مکمل طور پر تمھارے سپرد کر دیا جائے گا۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے صدقہ کے اونٹوں سے دیت ادا کی۔

مصنف ابی داؤد[2] میں ہے کہ حضورؐ نے یہود پر دیت عائد کی کیونکہ مقتول ان کے ہاں پایا گیا تھا۔ بخاری میں اس طرح بھی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "تاتون بالبينة على من قتله"؟ کیا تمھارے پاس قاتل کے سلسلے میں کوئی شہادت ہے؟ جس سے انھوں نے معذوری ظاہر کی۔ پھر آپؐ نے فرمایا "تو یہود قسمیں کھائیں"۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہود کی قسموں پر راضی نہیں۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ اس کا خون ضائع جائے، چنانچہ آپؐ نے دیت صدقہ کے اونٹوں سے ادا کی۔

مصنف عبدالرزاق[3] میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے یہود کو قسمیں کھانے کے لیے کہا جس کے لیے وہ

---

[1] صحیح مسلم کتاب القسامہ۔

[2] سنن ابی داؤد (ج ۴ - ص ۱۷۹) کتاب الدیات باب "ترك القود بالقسامة" میں حسن بن علیؒ کی روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبدالرزاق نے ہمیں خبر دی کہ انھیں معمر نے زہری سے، انھوں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمان اور سلیمان بن یسار سے اور انھوں نے انصار کے کچھ آدمیوں کے حوالے سے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے پچاس آدمی قسمیں کھائیں لیکن وہ اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ پھر آپؐ نے انصار سے فرمایا "تم اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے قسمیں کھاؤ"۔ انھوں نے معذوری پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم جائے حادثہ پر موجود نہیں تھے۔ اس کے بعد دیت یہود پر ڈالی گئی کیونکہ مقتول ان کے ہاں پایا گیا تھا۔

المُنذری نے مختصر ابو داؤد (ج ۶، ص ۳۲۳) میں ذکر کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف اور ناقابل التفات ہے۔ امام شافعی سے کہا گیا کہ آپ ابن شہاب کی اس روایت کو کیوں قبول نہیں کرتے تو انھوں نے فرمایا کہ یہ روایت مرسل ہے۔ مقتول انصاری تھا اور انصار دوسروں کی نسبت اس واقعہ کا زیادہ علم رکھتے تھے بشرطیکہ یہ روایت کرنے والا ثقہ ہو اور اللہ کے فضل سے وہ سب ہمارے نزدیک ثقہ ہیں۔ بیہقی کہتے ہیں ایسے لگتا ہے کہ ان کا مطلب ابن شہاب زہری کی روایت سے ہے۔

اسی طرح عبدالرزاق کی روایت پر، جو آگے آرہی ہے، تعلیق بھی دیکھیے۔

[3] عبدالرزاق نے المصنف (ج ۱۰، ص ۲۷، ۲۸) میں بیان کیا ہے کہ ابوسلمہ اور سلیمان بن یسار نے حضورؐ کے ایک صحابی سے روایت بیان کی۔ اس روایت میں لفظ "رجل من اصحاب النبی" (یعنی مفرد) استعمال ہوا ہے جبکہ امام بیہقیؒ نے سنن کبریٰ (۸ - ۱۲۱) میں عبدالرزاق سے لفظ جمع یعنی "عن رجال من الانصار" (انصار کے آدمیوں سے) نقل کیا ہے۔ امام بیہقی کے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے۔ اس میں ان لوگوں کا نام مذکور نہیں ہے جن سے ابوسلمہؒ اور سلیمان بن یسار نے روایت بیان کی ہے۔ علاوہ ازیں یہ روایت اس متصل حدیث سے متصادم ہے جس میں دیت کی ادائیگی کا ذکر ہے اور حضورؐ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے دیت اپنے پاس سے ادا کی۔

راضی نہ ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے انصار سے کہا لیکن وہ بھی قسمیں کھانے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم[1] نے اس پوری کارروائی کے بعد دیت یہود پر عاید کی۔

سنن نسائی[2] میں ہے کہ آپ نے اس کی دیت تقسیم کی اور آدھی دیت یہود کی مدد کے طور پر خود ادا کی۔

حُوَیّصہ اور مُحَیّصہ مقتول کے چچا زاد بھائی تھے۔ جبکہ عبدالرحمٰن اس کا حقیقی بھائی تھا۔ مصنف[3] عبدالرزاق میں ہے کہ یہ پہلا واقعہ ہے جس میں قسم کی صورت اختیار کی گئی۔ اس حدیث سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قسم بھی قصاص کی بنیاد بن سکتی ہے۔ کیونکہ آپ نے فرمایا "أتحلفون وتستحقون دم صاحبکم" کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ قسمیں کھاؤ اور اپنے ساتھی کے خون کے حق دار بن جاؤ۔

صحیح مسلم[4] کی ایک اور روایت میں ہے "فيدفع برمته" کہ قاتل مکمل طور پر تمہارے سپرد کیا جا سکے۔

---

[1] نسخہ لالہ، حلبی اور حلب میں النبی کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات ہیں۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ مختلف نسخوں میں "رسول اللہ" یا "نبی اللہ" کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان سے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیک وقت نبی اور رسول بنا کر بھیجا تھا، لیکن اس کے باوجود میں علمی امانت اور تحقیق کے پیش نظر اس اختلاف کی طرف اشارے کر دیا ہوں۔ اسلاف کی عادت تھی کہ جن الفاظ میں وہ روایات اپنے شیوخ اور اساتذہ سے سنتے انھیں ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ میں نقل کرنا پسند کرتے تھے۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب کوئی محدث والد صاحب کے سامنے کسی کتاب میں سے "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھنے کے بعد کہتے۔ کہ یہاں "عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ہے تو والد صاحب اسے کاٹ دیتے اور اس کی جگہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھ دیتے۔ اسی طرح خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ ابوبکر البرقانی نے ہمیں بتایا کہ ابوالقاسم عمر بن نوح کے سامنے حدیث پڑھی گئی اور میں (البرقانی) بھی سننے میں شریک تھا۔ پڑھنے والے نے کہا کہ ہمیں عبداللہ بن سلیمان نے حدیث سنائی۔ اس نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے اپنے شیخ سے حدیث سنائی انھوں نے کہا کہ حماد بن سلمہ بیان کر رہے تھے اور ان کے پاس ہی عفان اور بہز لفظ نبی کو رسول کے ساتھ ادل بدل کر پڑھ رہے تھے جس پر حماد نے کہا کہ تم دونوں کو تو حدیث کی سمجھ ہی نہیں۔

معلوم ہوا کہ اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ نقل حدیث میں حد درجہ محتاط تھے جس کی نظیر دیگر ادیان میں ملنی محال ہے۔ اسی لیے مختلف نسخوں میں جہاں جہاں لفظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یا صلی اللہ علیہ وسلم اور علیہ السلام کا فرق ہے، میں نے وہاں وہاں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[2] سنن نسائی (ج ۸، ص ۱۲) کتاب القسامۃ باب "ذکر اختلاف الفاظ الناقلین لخبر علقمہ بن وائل فیه" اور طبرانی میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت یہود پر ڈال دی کیونکہ مقتول ان کے ہاں پایا گیا تھا۔ دیکھیے مجمع الزوائد (ج ۶، ص ۲۹۱) اور مختلف احادیث میں تعارض کے وقت اگر تطبیق ممکن نہ ہو تو صحیحین کی روایت کو دوسری روایات پر ترجیح دی جائے گی۔ یہ بات اہل علم کے ہاں معروف ہے۔

[3] مصنف عبدالرزاق (ج ۱۰، ص ۳۱) میں یہ تفاصیل مذکور ہیں۔

[4] مسلم (ج ۳، ص ۱۲۹۲) کتاب القسامہ۔ باب القسامہ میں سند اس طرح ہے یحییٰ بن سعید عن بشیر بن یسار عن سہل بن ابی حثمہ و رافع بن خدیج۔ "فيدفع برمته" کہ تمہیں وہ رسی سونپ دی جائے جس میں مجرم بندھا ہوا تھا۔ "الرمة" رسی کا ٹکڑا۔ کہا جاتا ہے "اخذت برمته" میں نے سارے کا سارا لے لیا۔ اس کا اصل استعمال یوں ہے کہ ایک شخص نے اونٹ بھیجا اور اس کے

اس حدیث سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:۔

ا۔ دوسرے حقوق کے مقدمات کے برعکس اس صورت میں (جبکہ قتل کا فیصلہ قسم کی بنیاد پر کرنا ہو) قسم کا آغاز مدعیان سے ہوگا۔[۱]

ب۔ فریقِ ثانی سے قسم لیے بغیر ہی اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

ج۔ اگر ذمی کسی حق کو رد کریں تو ان سے جنگ ضروری ہے۔

د۔ اگر جائے حادثہ دور ہو تو وہاں سے معلومات حاصل کرنے کے لیے قاضی خود جانے کے بجائے لکھ کر یا کسی اور قابلِ اعتماد ذریعے سے معلومات منگوا سکتا ہے۔

ہ۔ قاضی محض واقعہ سننے پر گواہوں کے بغیر بھی مطلب نامہ لکھ سکتا ہے۔

و۔ غیر موجود فرد یا افراد کے خلاف بھی فیصلہ دیا جا سکتا ہے جبکہ اہلِ عراق کے نزدیک موجودگی ضروری ہے۔

ز۔ مقدمۂ قتل میں ایک ہی شخص کا قسمیں اٹھانا کافی نہیں ہے۔

ح۔ ذمیوں کے فیصلے اسلامی قوانین کے مطابق بھی کیے جا سکتے ہیں۔

ط۔ اگر قاتل کا پتہ نہ لگ سکے تو دیت غارمین کی اس مد سے ادا کی جا سکتی ہے جو اللہ نے زکوٰۃ میں مقرر فرمائی ہے۔[۲] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اس لیے کیا کہ یہ بات متعین نہیں ہوئی تھی کہ یہودی نے اس شخص کو قتل کیا تھا۔

گلے میں رسی تھی۔ اسے کہا گیا ادفعہ برمتہ یعنی یہ اونٹ رسی سمیت دے دو۔ بعض ازاں یہ جملہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

احکامِ قسامہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "فیدفع برمتہ" سے یہ دلیل ملتی ہے کہ قسم سے قصاص لازم ہو جاتا ہے۔ امام مالک، امام احمد اور ایک قول کے مطابق امام شافعی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا یہی مسلک ہے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ ان کے ساتھیوں، تمام فقہاءِ کوفہ اور ایک دوسرے قول کے مطابق امام شافعی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا مسلک یہ ہے کہ قسم سے قصاص لازم نہیں ہوتا۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قسم کوئی بھی شخص اٹھا سکتا ہے یعنی معین اشخاص کا قسمیں اٹھانا ضروری نہیں ہے۔ امام احمد اور امام مالک کی مشہور رائے یہی ہے جبکہ جمہور کے نزدیک قسم کھانے کے لیے افراد یا فرد کا تعین ضروری ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار (ج، ص ۱۸۷)

[۱] عام شرعی ضابطہ یہ ہے "البینة علی المدعی والیمین علی من انکر" لیکن واقعۂ قتل پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔ عمرو بن شعیب کی اس روایت سے بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ البینة علی المدعی والیمین علی من انکر الا فی القسامة" کہ ثبوت کی فراہمی مدعی کے ذمے ہے اور جو دعوے کی صحت کا انکار کرے اس کے ذمے قسم ہے۔ مگر مقدمۂ قتل کی قسم اس سے مستثنیٰ ہے۔ امام دارقطنی اور بیہقی نے یہ روایت بیان کی ہے تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی نے التلخیص الحبیر (ج۴۔ ص ۳۹) میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

[۲] نسخہ لالہ، حلبی اور حلبیہ میں "فمن دخیل" کا اضافہ موجود ہے۔ قاضی عیاض نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ مالِ زکوٰۃ رفاہِ عامہ

ک ۔ ایک شخص کو مال زکوٰۃ میں سے نصاب سے زیادہ بھی دیا جا سکتا ہے ۔

ص ۔ امام شافعی اور[1] امام مالکؒ کی متفقہ رائے ہے کہ پہلے قسم خون کے مدعی کھائیں گے ۔ امام شافعی کے نزدیک اگر مقتول قاتل کا تعین کر جائے کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے تو پھر قسم نہیں لی جائے گی ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر مدعی اور مدعیٰ علیہ کے مابین دشمنی ہو، جیسا کہ یہود اور مسلمانوں میں تھی، تو ایسی صورت میں قسم ضروری ہوگی ورنہ نہیں ۔

ابن ملیکہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعَى قَوْمٌ

پر خرچ کیا جا سکتا ہے ۔ انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے ۔

[1] مالکیہ کے ہاں قسم کا آغاز مدعی سے کرانے کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ قتل کی کوئی علامت پائی جائے ۔ مثلاً مقتول کہہ جائے کہ فلاں میرا قاتل ہے یا اس کے پاس کوئی مہلک آلہ پایا جائے ۔ مثلاً تلوار یا بڑی ڈھال یا بڑا پتھر یا اس قسم کی کوئی اور چیز ۔

ابن سحنون سے مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر ایک جماعت پر قتل کا دعویٰ ہو جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوں تو اس کا فیصلہ کیسے ہوگا ؟ سحنون نے کہا کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایسے تو اس مقدمہ میں کسی ایک متعین شخص کے بارے میں قسم لی جائے گی ۔ پھر اگر ان سب کی طرف سے قتل سرزد ہونے کی کوئی علامت موجود ہو یا مقتول نے قتل کے سلسلے میں کوئی بات کی ہو یا اس بات کی شہادت مل جائے کہ ان سب نے مل کر اسے پیٹا پھر وہ کچھ دیر زندہ رہا اور بعد میں انہی ضربوں سے مرگیا تو ان سب کو قصاص میں قتل کیا جائے گا ۔

حنابلہ کے نزدیک بھی قسم کے لیے عداوت اور علامت قتل کا ہونا ضروری ہے ورنہ دعوائے قتل کی نوعیت دیگر دعووں کی مانند ہوگی ۔ اس سلسلے میں دیکھیے المغنی لابن قدامہ (ج ۸، ص ۴۸۰) اگر عداوت اور علامت قتل موجود نہ ہوں تو امام احمد کی دو رائیں ہیں ۔ ایک یہ کہ اس صورت میں مدعیٰ علیہ سے قسم نہیں لی جائے گی اور نہ ہی اس کے خلاف فیصلہ دیا جائے گا بلکہ اسے بری کر دیا جائے گا ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے قسم لی جائے گی ۔ صحیح قول یہی ہے ۔ امام شافعیؒ کا قول بھی یہی ہے ۔ اس کی دلیل حضورؐ کی حدیث " الیمین علی المدعیٰ علیہ " ہے ۔ اس لیے کہ اس حدیث کے الفاظ میں عموم پایا جاتا ہے ۔ دیکھیے (المغنی، کتاب القسامہ، الفصل الثانی)

احناف کے نزدیک مقتول اور اہل محلہ میں عداوت کا ہونا ضروری نہیں ہے ۔ اہل محلہ پر قسم اور دیت دونوں ہی لازم ہیں ۔ اس کی دو وجوہات ہیں ۔ ایک یہ کہ مقتول کا خون ضائع نہ ہو اور دوسری یہ کہ اس میں اہل محلہ کی کوتاہی کو دخل ہے ۔ دیکھیے المبسوط (ج ۲۶ ۔ ص ۱۰۸)

[2] بخاری: تفسیر سورۂ آل عمران باب " إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ " (آل عمران ۔ ۷۷)

دِمَاءَ قَومٍ وَاموالھُم" (اگر لوگوں کو محض ان کے دعووں کی بنیاد پر دے دیا جائے تو لوگ ایک دوسرے کے مالوں اور جانوں پر دعوی کرنے لگیں گے)۔

واقعۂ قتل اور حضرت علیؓ کا فیصلہ:

مسند بزار[۱] میں ہے کہ کچھ لوگوں نے یمن میں ایک کنواں کھودا۔ اتفاقاً اس میں ایک شیر گر پڑا۔ لوگ اسے دیکھنے لگے۔ اچانک ایک شخص کا پاؤں پھسلا اور وہ دوسرے کے ساتھ چمٹ گیا۔ دوسرا اگلے کے ساتھ چمٹ گیا۔ اس طرح یہ افراد چار ہو گئے اور وہ چاروں ہی کنویں میں گر پڑے۔ شیر نے ان چاروں کو زخمی کر دیا۔ پھر ایک شخص نے نیزہ مار کر شیر کا کام تمام کر دیا۔ لوگوں نے پہلے آدمی (کے ورثاء) سے کہا کہ اس نے ہمارے آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔ اور تمہیں ان سب کی دیت ادا کرنا ہو گی جس کے لیے وہ راضی نہ ہوئے۔ یہ لوگ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیصلہ چاہا۔ آپ نے فرمایا، کنواں کھودنے والوں کو چوتھائی دیت، تہائی دیت، نصف دیت اور پوری دیت ادا کرنی پڑے گی۔ چوتھائی دیت پہلے شخص کی ہو گی۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ تین دوسرے آدمیوں کی ہلاکت کا سبب بھی بنا ہے۔

فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۴۵۵۲ ہے۔ اس روایت میں ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ دو عورتیں ایک گھر یا کمرے میں کپڑوں کی آرائش کا کام کر رہی تھیں کہ ایک کی ہتھیلی میں سوئی داخل ہو گئی، وہ باہر نکلی اور اس نے دوسری کو اس کا ملزم ٹھہرایا۔ یہ مقدمہ حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو انھوں نے حضورؐ کا ارشاد دہرایا کہ اگر لوگوں کو محض ان کے دعووں کی بنیاد پر دے دیا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ ایک قوم دوسروں کے مالوں اور خونوں کا دعوی کرنے لگے۔

مسلم (ج ۳، ص ۱۳۳۶) کتاب الاقضیہ باب "الیمین علی المدعی علیہ" میں یہ حدیث مذکور ہے۔ امام نووی نے شرح مسلم (ج ۱۲، ص ۳) میں بیان کیا ہے کہ یہ حدیث احکام شریعت میں ایک بنیادی قاعدہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے کہ کسی شخص کا حق محض دعوے سے ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی تائید میں شہادت موجود نہ ہو یا مدعا علیہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ آپ کا فرمان بے شمار حکمتوں کا حامل ہے کہ "اگر فیصلے محض دعووں کی بنیاد پر ہونے لگیں تو لوگوں کی جانیں اور مال کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے واضح ہو چکا ہے مقدمہ قتل ہر قسم کے احکام باقی تمام مقدمات سے مختلف ہیں۔

[۱] ہیثمی نے یہ واقعہ مجمع الزوائد (ج ۶، ص ۲۸۷) میں بیان کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہیثمی نے یہ واقعہ امام احمد کی روایات میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں حنش بن معتمر راوی موجود ہے جسے ابوداؤد نے ثقہ قرار دیا ہے لیکن بعض کے نزدیک وہ ضعیف ہے۔ بزار کا قول ہے کہ یہ واقعہ تنہا حضرت علیؓ سے صرف اسی سند کے ساتھ منقول ہے۔

حنش بن معتمر

حنش بن معتمر سے مراد ابو المعتمر کوفی ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ لوگ اس کی روایات کے بارے میں کلام کرتے ہیں۔ نسائی نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں ہے۔ ابن حبان کے نزدیک اس کی روایت حجت نہیں ہے۔ علامہ عقیلی، ساجی، ابن جارود اور

تہائی دیت دوسرے شخص کی ہوگی اس لیے کہ وہ بھی اپنے ساتھ دو دوسرے آدمیوں کی ہلاکت کا سبب بنا ہے۔ نصف دیت تیسرے شخص کی ہوگی، جو اپنے ساتھ ایک دوسرے شخص کی ہلاکت کا سبب بھی بنا ہے۔ جبکہ چوتھے شخص کی پوری دیت واجب الادا ہوگی"۔ اگلے سال حج کے موقعہ پر وہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے! انھوں نے یہ واقعہ اور سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ بیان کیا۔ اسے سن کر آپؐ نے فرمایا کہ "علیؓ نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے"۔

ابوالعرب المعقلی نے اسے ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ ابن حزم نے "محلی" میں اسے ساقط الاعتبار کہا ہے۔ ابوداؤد اور العجلی اسے ثقہ قرار دیتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی بیان کرتے ہیں کہ یہ شخص کثرت وہم کا مریض تھا اور منکر احادیث روایت کیا کرتا تھا۔ بزار کے نزدیک یہ روایت حضرت علیؓ سے حنش کی سند سے منقول ہے جسے محدثین کے نزدیک ضعیف سمجھا جاتا ہے۔ التلخیص الجبیر (ج ۴، ص ۳)

[1] امام طحاویؒ نے مشکل الآثار (ج ۳، ص ۵۹) میں بھی اسی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے۔

سوتیلی ماں سے نکاح کرنے والے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

سنن نسائی[1] اور مسند ابن ابی شیبہ میں حضرت براءؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے ماموں ابوبردہ سے ملا

---

[1] سنن نسائی ــــــ کتاب النکاح باب "نکاح ما نکح الآباء" میں احمد بن عثمان بن حکیم کی روایت ہے وہ ابونعیم سے، وہ حسن بن صالح سے، وہ سدی سے، وہ عدی بن ثابت سے اور وہ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس روایت میں الفاظ یوں ہیں "اَنْ اَضْرِبَ عُنُقَهُ اَوْ اَقْتُلَهُ" کہ میں اس کی گردن اڑا دوں یا اس کو قتل کر دوں"۔ جبکہ عمرو بن منصور عن عبداللہ بن جعفی، عن عبیداللہ عن زید عن عدی بن ثابت میں الفاظ یہ ہیں "فَاَمَرَنِی اَنْ اَضْرِبَ عُنُقَهُ وَاٰخُذَ مَالَهُ" "آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کی گردن اڑا دوں اور اس کا تمام مال قبضے میں کر لوں"۔

احمد بن عثمان بن حکیم کی روایت میں ایک راوی السدی ہے جس کا تعارف حسب ذیل ہے:

اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمہ سدی ابومحمد قرشی سدی کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ ابوحاتم کے نزدیک اس کی حدیث لکھی تو جائے گی۔ لیکن اسے حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب (۱-۷۱) میں لکھتے ہیں کہ یہ سچ بولتا تھا لیکن وہمی تھا۔ اس پر تشیع کا الزام بھی ہے۔

عمرو بن منصور کی روایت میں ایک راوی زید ہے۔ اس کا تعارف یہ ہے:

زید جزری ابواسامہ رہاوی کوفی النسل ہیں۔ ابن سعد اور امام ابوداؤد کے نزدیک ان کا شمار ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے تقریب التہذیب (ج ۱، ص ۲۷۲) میں بھی انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ان کے تلامذہ کا شمار محدثین کے طبقہ ششم میں ہوتا ہے۔

ابوداؤد نے (ج ۴، ص ۱۵۸) کتاب الحدود باب "فِی الرَّجُلِ یَزْنِی بِحَرِیمِهِ" میں عمرو بن قسیط الرقی کی سند سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں "اَنْ اَضْرِبَ عُنُقَهُ وَاٰخُذَ مَالَهُ" کہ میں اس کی گردن اڑا دوں اور اس کا مال اپنے قبضہ میں کر لوں"۔ جامع ترمذی (ج ۳، ص ۳۵۷) کتاب الاحکام باب "ما جاء فیمن تزوج امرأة ابیه" میں ہے "اِنْ اٰتِی بِرَأْسِهِ" "کہ میں اس کا سر لاؤں"۔ امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ابن ماجہ (ج ۲، ص ۸۶۹) اور مستدرک حاکم (ج ۴، ص ۳۵۷) میں یہ روایت موجود ہے، البتہ امام ذہبی نے اور ابن ابی حاتم نے "العلل" (ج ۱، ص ۴۱۵) میں اس روایت پر سکوت اختیار کیا ہے۔

تعزیر اور حد میں فرق: اس روایت سے امام مالک یہ دلیل اخذ کرتے ہیں کہ تعزیر میں قتل بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن احناف

جن کے پاس جھنڈا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کی طرف بھیجا جس نے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کیا تھا۔ نسائی کے مطابق الفاظ یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک ایسے شخص کی طرف بھیجا جو اپنے باپ کی بیوی سے ہمبستری کرتا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ میں جاؤں اور اسے قتل کر دوں۔ ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے: "ان اجی براسہ واستفی مالہ کہ میں اس کا سر لاؤں اور اس کا تمام مال اپنی تحویل میں کر لوں۔" ابن سکن[۱] نے "کتاب الصحابہ" میں لکھا ہے۔ ابن ابی خیثمہ[۲] نے بھی اس کا ذکر کیا ہے،

مصلحت کے طور پر قتل کو تعزیر کہتے ہیں۔ دیکھیے حاشیہ ابن عابدین (ج ۳، ص ۲۴۳) اور مواہب الجلیل (ج ۳، ص ۲۵۷)
مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر میں اسلامی نقطۂ نظر سے تعزیر کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ تعزیر اور حد میں فرق یہ ہے کہ حدود میں سزائیں متعین ہوتی ہیں۔ ان میں قاضی کو کمی بیشی کا مجاز نہیں ہے۔ مثلاً حدود قصاص و دیت اور وہ حدود جن کا تذکرہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔ تعزیرات میں سزا کا تمام تر تعلق قاضی کی صوابدید پر ہوتا ہے جس میں حالات کی مناسبت سے کمی بیشی کا امکان ہے چنانچہ قتل اور جلاوطنی، کوڑے، قید اور جرمانہ وغیرہ کی جو سزا چاہے وہ دے سکتا ہے۔ اور فقہا کے درمیان تعزیر کے طور پر سزائیں دینے کے معاملے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے جس کا ذکر ہم انشاء اللہ متعلقہ مباحث کے دوران میں ساتھ ساتھ کرتے جائیں گے۔

[۱] **ابن السکن** سعید بن عثمان بن سعید السکن بغداد میں رہائش پذیر تھے اور مصری نژاد تھے۔ ابو علی ان کی کنیت تھی۔ یہ محدث اور حافظ تھے۔ احادیث سننے کے لیے مصر، شام، الجزیرہ، عراق اور خراسان گئے اور جید اساتذہ حدیث سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس کے بعد حدیث رسول کے اہم گوشوں یعنی جمع و تدوین، تخریج و تعدیل اور تصحیح و تعلیل کے سلسلے میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ جلیل القدر مصنف تھے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیلی۔
حافظ ابن حجر نے "مقدمۃ الاصابۃ" میں لکھا ہے "معرفت صحابہ" کے بارے میں ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ کتانی نے "الرسالۃ المستطرفۃ" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ امام ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (ج ۳، ص ۹۴۲) اور ابن تغری نے "النجوم الزاہرۃ" (ج ۳، ص ۳۲۸) میں ان کا تذکرہ کیا ہے، تاہم معرفت صحابہ کے بارے میں ان کی کتاب مجھے دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ ۳۵۳ھ میں فوت ہوئے۔

[۲] **ابن ابی خیثمہ**، یہ ابوبکر احمد بن زہیر بن حرب بن شداد نسائی البغدادی ہیں۔ یہ عظیم حافظ حدیث اور مورخ تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے "التاریخ الکبیر" مشہور کتاب ہے جس کی تالیف انھوں نے محدثین کرام کے طریقے پر کی۔ ۲۷۹ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

ابن جوزی نے "المنتظم" (ج ۵، ص ۱۳۹) میں، حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان" (ج ۱، ص ۱۷۴) میں یاقوت حموی نے "معجم البلدان" (ج ۳، ص ۳۵) میں خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" (ج ۴، ص ۱۶۲) میں اور ابن تغری نے "النجوم الزاہرۃ" (ج ۳، ص ۸۳) میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ بروکلمان نے "تاریخ ادب عربی" (ج ۳، ص ۲۰۲) میں ابن ابی خیثمہ کی کتاب "تاریخ کبیر" کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ صاحب کتاب نے جرح و تعدیل پر کافی معلوماتی بحث کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ فاس میں مکتبہ قرویین

کہ خالد[1] بن ابی کریمہ معاویہ[2] بن قرہ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے باپ یعنی معاویہ کے دادا کو حضورؐ نے ایسے شخص کے پاس بھیجا جس نے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر رکھا تھا تو معاویہ کے دادا نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور اس کا خمس[3] مال قبضے میں کر لیا۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

ہیں اور ایک کاپی مکتبہ سندیہ میں پائی جاتی ہے۔

[1] خالد بن ابی کریمہ: ابو عبدالرحمٰن اصفہانی کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔ اگرچہ وہ درجۂ صدوق کے راوی ہیں تاہم ان کی روایات میں خطا اور ارسال کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

[2] معاویہ بن قرۃ: ان کا نام ابو ایاس بصری ہے۔ ان کا شمار ثقہ علماء میں ہوتا ہے اور محدثین کے تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد مُرّۃ بنؓ ایاس بن ہلال مزنی صحابیٔ رسول تھے جن کی رہائش بصرہ میں تھی۔

[3] ابن ماجہ (ج ۲، ص ۔ ۸۷) میں یہ حدیث یوسف بن منازل عن عبداللہ بن ادریس خالد بن ابی کریمہ کی سند کے ساتھ ہے۔ حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" (ج ۱، ص ۱۰۲) میں ایاس بن بلال کے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام نسائی اور بارودی نے بھی اس روایت کو یوسف بن منازل کی سند سے نقل کیا ہے اور یوسف بن منازل کے بجائے انھوں نے یوسف بن مبارک لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند حسن ہے اور عبداللہ بن الوضاح اور احمد بن عبداللہ العتکی نے بھی یہ روایت بیان کی ہے اور ابن سکن کا قول ہے کہ وہ زیادہ تر یوسف کے نام سے مشہور ہے۔ ثقہ محدثین میں سے ان کے علاوہ کسی اور نے اس سے روایت نہیں کی۔

حافظ عسقلانی کہتے ہیں کہ یہ روایت اسحاق بن راہویہ نے عبداللہ بن ادریس کی سند سے نقل کی ہے۔ اس سند میں قُرّہ کا ذکر نہیں ہے۔ بوصیری نے زوائد میں اسے صحیح حدیث قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسے اَقرَب الی الصواب کہا ہے کیونکہ اس میں خالد بن کریمہ نامی راوی پایا جاتا ہے۔ یہ حدیث مسلم نے (۴ ۔ ۲۱۳۹) کتاب التوبۃ میں روایت کی ہے۔

حضرت علیؓ کا حضرت ماریہؓ کے چچازاد بھائی کے قتل کے لیے بھیجا جانا

کتاب ابن السکن اور کتاب ابن ابی خیثمہ میں ہے کہ حضرت ماریہؓ (حضورؐ کے بیٹے حضرت ابراہیمؓ کی والدہ) کو ان کے چچازاد بھائی کے ساتھ متہم کیا جاتا تھا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ اگر اسے ماریہ رضی اللہ عنہا کے پاس پائیں تو قتل کر ڈالیں۔ آپ وہاں پہنچے تو وہ کنوئیں میں نہا رہا تھا۔ آپ نے اسے باہر نکلنے کو کہا۔ جب اسے ہاتھ پکڑ کر نکالا گیا تو اسے مجبوب پایا، یعنی اس کا آلہ تناسل نہیں تھا۔ حضرت علیؓ اسے کچھ کہے بغیر واپس حضورؐ کی خدمت میں آ گئے اور آپؐ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ثابت البنانی نے حضرت انسؓ سے یہ روایت بیان کی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ وہ نخلستان میں کھجوریں اکٹھی کر رہا تھا اور کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس نے لپیٹ رکھا تھا۔ تلوار دیکھتے ہی وہ کانپنے لگا اور اس کا وہ کپڑے کا ٹکڑا اُتر گیا جس سے معلوم ہوا کہ اس کا آلہ تناسل ہی نہیں ہے۔

لہ نسخۂ لالہ، حلبی اور حلب میں "ھات یدک" کے الفاظ مذکور ہیں۔

ئہ صحیح مسلم (ج ۴، ص ۲۱۳۹) کتاب التوبہ باب "براءۃ حرم النبی من الریبۃ" میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ام الولد (ماریہ قبطیہ) کے ساتھ متہم کیا جاتا تھا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اسے قتل کرنے کے لیے بھیجا۔ جب آپؓ وہاں پہنچے تو وہ جسم کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کنوئیں میں نہا رہا تھا۔ آپ نے اسے فوراً باہر آنے کے لیے کہا۔ جب وہ باہر آیا تو اسے مجبوب پایا، یعنی اس کا آلہ تناسل ہی نہیں تھا، چنانچہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا واقعہ بیان کیا۔

امام احمد بن حنبل نے بھی مسند (ج ۳، ص ۲۸۱) میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

دو بستیوں کے درمیان پائے جانے والے مقتول کے بارے میں حضورؐ کا فیصلہ

مسند[1] ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مقتول دو بستیوں کے درمیان پایا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درمیانی مسافت ناپنے کا حکم دیا، جس سے مقتول ایک بستی کے زیادہ قریب پایا گیا، حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ جیسے اب بھی میں حضورؐ کو فاصلہ ماپتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ پھر آپؐ نے اس خون کی ذمہ داری اس بستی والوں پر ڈال دی جس کے وہ زیادہ قریب تھا۔

"مصنف[2] عبدالرزاق" میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول مذکور ہے کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے کا

---

[1] اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

مسند احمد (ج ۳، ص ۸۹) میں یہ روایت حضرت ابو سعیدؓ سے ان الفاظ میں مرفوعاً مروی ہے کہ "مقتول کی اطلاع ملتے ہی آپؐ نے دونوں بستیوں کی باہمی پیمائش کا حکم دیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ مقتول کس بستی سے زیادہ قریب پڑا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بالشتوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا، چنانچہ قتل کی ذمہ داری اس بستی پر عائد کی گئی جس سے نعش قریب تھی۔

امام بیہقی نے "سنن کبریٰ" (ج ۸، ص ۱۲۶) میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس میں ابو اسرائیل اسماعیل منفرد راوی ہے جس نے عطیہ عوفی سے یہ روایت بیان کی ہے اور یہ دونوں راوی مستند نہیں ہیں۔ امام احمد اور بزار نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اور "مجمع الزوائد" (ج ۶، ص ۲۹۰) میں الہیثمی نے بھی عطیہ عوفی کی وجہ سے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ابن عراق نے "تَنْزِیہ الشریعَۃ" (ج ۲، ص ۲۱۹) میں کہا ہے کہ ابو اسرائیل ترمذی اور ابن ماجہ کے راویوں میں سے ہے۔ یہ شخص متعصب شیعہ تھا۔ محدثین کرام کے تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کذّاب نہیں تھا، مگر اس کا حافظہ اچھا نہیں تھا اور وہ بکثرت غلطیاں کیا کرتا تھا۔ امام احمد کے نزدیک اس کی روایات لکھی جا سکتی ہیں اور ابن معین نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک اگرچہ وہ درجۂ صدوق میں ہے لیکن اس کا حافظہ ناقابلِ اعتبار تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ غالی شیعہ تھا۔ یہ محدثین کے طبقۂ ہفتم سے تھا۔ اس کا نام اسماعیل بن خلیفہ عبسی کوفی تھا اور اس کی کنیت زیادہ مشہور تھی۔

عَطِیّہ: ان کی کنیت ابو سعید تھی۔ اصل نام عطیہ عوفی جدلی قیسی بن سعد بن جنادہ تھا۔ وہ مشہور مفسّر کلبیؒ کی خدمت

علم ہوا ہے جو ایسے مقتول کے بارے میں ہے جو ایک قوم کی حدود میں پایا گیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ مدعا علیہم قسم کھائیں گے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں تو مقتول کے ورثاء اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے حلف اٹھائیں گے۔ اگر دونوں فریق ہی حلف اٹھانے سے انکار کر دیں تو آدھی دیت مدعا علیہم[1] پر ہوگی اور آدھی مدعی کے قسم نہ اٹھانے کی وجہ سے ساقط ہو جائے گی۔

میں حاضر رہتے اور تفسیر سے متعلق سوال کیا کرتے۔ امام نسائی، ابو حاتم اور ہیثم کے نزدیک ان کی روایات ضعیف ہیں۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ ان کی حدیث لکھی جا سکتی ہے۔ (تہذیب التہذیب: ج ۷، ص ۱۲۴)

[1] المصنف میں الفاظ یہ ہیں۔ کانت الدیۃ "نصفین" یعنی دیت کے دو حصے ہو جائیں گے۔ آدھی دیت مدعیٰ علیہ پر ہوگی اور آدھی باطل ہو جائے گی کیونکہ مدعی فریق حلف کے ذریعے اپنا استحقاق ثابت نہیں کر سکا۔

زخموںؒ کے قصاص کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

"مصنف عبدالرزاقؒ" میں عمرو بن شعیب سے روایت ہے کہ ایک شخص کے پاس سینگ تھا اس نے وہ مار کر دوسرے شخص کا پاؤں زخمی کر دیا۔ زخمی آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے قصاص کا تقاضا کیا۔ آپؐ نے فرمایا "حتّٰی تبرأ جراحك" (زخم ٹھیک ہونے تک انتظار کرو) جس کے لیے وہ راضی نہ ہوا، چنانچہ آپؐ نے اس کا قصاص دلا دیا۔

ؒ متن میں جراح کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جراحۃ کی جمع ہے، جس کے معنی زخم کے ہیں۔ زخم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سر اور چہرے پر لگے، دوسرا وہ جو جسم کے باقی ماندہ حصوں میں لگے۔ اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس سے کوئی عضو کٹ جائے۔ اور دوسرا وہ جس سے گوشت کٹ جائے۔ لفظ جرح میں کافی وسعت ہے۔ اس میں کسی تیز آلے کے ذریعے جسم کے کسی حصّے کا کٹ جانا، گوشت وغیرہ کا پھٹ؛ چوٹ لگنا، کسی حصے کا ٹوٹ جانا، جل جانا وغیرہ سب شامل ہیں۔

بحث کا ماحصل:

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جسم کے ایسے اعضاء جو صرف ایک ہوں مثلاً زبان، ناک، آلۂ تناسل اور پشت وغیرہ ان کے ٹوٹ یا کٹ جانے سے پوری دیت لازم آتی ہے کیونکہ ان کا اتلاف پوری جان کے اتلاف کی مانند ہے، لیکن ایسے اعضاء جن میں جوڑا ہوتا ہے مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھیں اور کان وغیرہ۔ ان کے دونوں کے ضائع ہونے کی صورت میں پوری دیت ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے ضائع ہونے سے ان کی افادیت مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے، لیکن اگر ایک ضائع ہو جائے تو آدھی دیت لازم ہوگی۔ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے، اور اس سے کسی کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں۔ المغنی (ج ۸، ص ۴۲۴) اور المبسوط (ج ۲۶ - ص ۶۹)

ؒ مصنف عبدالرزاق (ج ۹ - ص ۴۵۴)، دارقطنی (ج ۲، ص ۸۸)، مسند احمد (ج ۲، ص ۲۱۷) میں یہ روایت محمد بن اسحاق عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مرفوعاً نقل کی گئی ہے۔ اس میں روایت اس طرح ہے کہ "جلدی مت کرو۔ زخم کے ٹھیک ہونے تک انتظار کرو" پس قصاص لینے والا لنگڑا رہا اور جس سے قصاص لیا گیا تھا وہ ٹھیک ہو گیا۔

محمد بن اسحاق صاحب السیرۃ

محمد بن اسحاق سیرت نبوی کے مؤلف ہیں جن کے بارے میں تفاصیل گزر چکی ہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ روایت

وہ شخص جس سے قصاص لیا گیا تندرست ہو گیا لیکن مجروح بدستور لنگڑا رہا۔ وہ شخص دوبارہ آپؐ کے پاس حاضر ہوا اور شکایت کی کہ وہ تو صحت یاب ہو گیا اور میں لنگڑاتا ہوں جس پر حضورؐ نے فرمایا، کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ زخم کے مندمل ہونے تک قصاص نہ لے، مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے (اپنی عافیت) سے دور کر دیا اور تیرا زخم ٹھیک نہ ہوا۔ حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں: "الم آمرك الا تستقيد حتى تبرأ جراحك، فعصيتني فابعدك الله وبطل جراحك"

اس واقعہ کے بعد آپؐ نے حکم فرمایا کہ زخموں کا قصاص ان کے ٹھیک ہونے تک موقوف رہے گا کیونکہ زخم کی صحیح نوعیت کا اندازہ اس کے اندمال کے بعد ہی ممکن ہے۔ بے کار یا لنگڑے عضو کا قصاص نہیں ہو گا بلکہ دیت ہو گی۔ اگر ایک شخص نے زخم یا چوٹ کا قصاص لیا لیکن جس سے قصاص لیا گیا اسے زیادہ زخم آ گیا تو اس زیادتی

منقطع ہے۔ کیونکہ ابن اسحاق کا عمرو بن شعیب سے سماع ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح عمرو بن شعیب کا اپنے دادا سے سماع میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم مشہور یہی ہے کہ ان کا سماع ثابت ہے۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد (ج ۶، ص ۲۹۶) میں اس روایت کو امام احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے تمام رجال ثقہ ہیں۔ اس میں ابن اسحاق کی تدلیس کی طرف اشارہ موجود نہیں ہے۔

اس حدیث کے دو شاہد جابر اور محمد بن طلحہ بن یزید بن رکانہ کی روایات ہیں۔ امام دارقطنی نے "الحدود" میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے۔ امام بیہقی نے سنن کبریٰ (ج ۸، ص ۶۶) میں حدیث جابر ایک اور سند سے بھی مرسلاً روایت کی ہے۔ علامہ شوکانی نے نیل الأوطار (ج ۷، ص ۳۰) میں اس روایت پر طویل بحث کی ہے۔ حدیث جابر کا ذکر طبرانی نے بھی کیا ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد (ج ۶، ص ۲۹۶)

لہ یہ اس حدیث کا ایک حصہ ہے جسے دارقطنی نے کتاب الحدود والدیات (ج ۳ ص ۹۱) میں عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس روایت میں بقیہ نامی ایک مدلس راوی ہے جس کا ابن جریج سے سماع ثابت نہیں ہے۔ تاہم امام نسائی فرماتے ہیں کہ اگر وہ اخبرنا یا حدثنا کے الفاظ استعمال کرے تو اس کی روایت لی جائے گی۔ اگر وہ کہے کہ میں نے فلاں سے سنا ہے تو یہ روایت قابل اعتبار نہیں ہو گی۔ کیونکہ اس صورت میں معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے روایت کس سے لی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے تقریب التہذیب (ج ۱، ص ۱۰۵) میں بیان کیا ہے کہ اگرچہ وہ درجہ صدوق میں ہے لیکن وہ ضعیف راویوں سے بہت سی مدلس روایات بیان کرتا ہے۔ اس کا شمار محدثین کے آٹھویں طبقہ میں ہوتا ہے۔

"المجموع شرح المهذب" (ج ۱۷، ص ۲۶۱) میں امام شافعی کا مسلک اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی نے ناکارہ ہاتھ کاٹ دیا تو اس کے بدلے صحیح سالم ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر ناکارہ ہاتھ والے نے ایک صحیح ہاتھ کاٹ ڈالا تو ایسی شکل میں اگر چاہے تو وہ اس کا ناکارہ ہاتھ قصاص میں کاٹ سکتا ہے۔

کی دیت اس شخص سے لی جائے گی جس نے قصاص لیا تھا۔

عطاء بن ابی رباح کا قول ہے کہ زخموں میں بھی قصاص ہے۔ قاضی اسے نظر انداز کر کے مار پیٹ یا قید کی سزا نہیں دے سکتا۔ تیرا رب بھولنے والا نہیں۔ اگر وہ یہ سزائیں دلوانا چاہتا تو وہ مارنے یا قید کرنے کا حکم دیتا اور یہ نہ فرماتا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ قصاص بھی لیا جائے گا اور اس جرأت کی وجہ سے اسے سزا بھی دی جائے گی۔

ؔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک شبہ عمد کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک فعلِ عمد اور دوسری فعلِ خطا۔ دیکھیئے "المدوّنہ" (ج ۶، ص ۳۱۶) اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ جس نے زخم لگایا اس سے قصاص لیا جائے گا اور اسے سزا بھی دی جائے گی۔

احناف کے نزدیک ضرب اور زخم میں شبہ عمد نہیں ہے کیونکہ قتل کے برعکس اس میں آلہ کی تخصیص نہیں ہے، چنانچہ اس شکل میں شبہ عمد نہیں ہوگا۔ دیکھیے حاشیہ ابن عابدین (ج ۵، ص ۳۷۱)

دانت کے قصاص کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

صحیح بخاری[1] اور مسلم[2] میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ بنت نضر (ربیع کی بہن) نے ایک کنیز کو طمانچہ مارا جس سے اس کے اگلے دو دانت ٹوٹ گئے۔

صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے ایک شخص کو زخمی کر دیا۔ یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ جس میں آپ نے قصاص کا حکم دیا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلح باب "الصلح فی الدیۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۰۳) میں ہے کہ محمد بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ حمید نے حدیث بیان کی کہ حضرت انسؓ نے ان سے بیان کیا کہ ربیع نے، جو نضر کی بیٹی تھی ایک کنیز کے دو اگلے دانت توڑ دیے۔ اس کے ورثاء نے دیت طلب کی جس سے انھوں نے انکار کر دیا، چنانچہ یہ مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو جس میں آپؐ نے قصاص کا فیصلہ صادر فرمایا۔

انس بن نضر نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا ربیع کے بھی دانت توڑ دیے جائیں گے؟ اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اس کے دانت ہرگز نہیں توڑے جائیں گے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ارشاد فرمایا۔ "یا انس، کتاب اللہ القصاص" (انس، قصاص کا حکم تو کتاب اللہ میں آیا ہے)" لیکن وہ صلح کے لیے مسلسل کوشش کرتا رہا۔ بالآخر کنیز کے ورثاء معاف کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ یہ سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان من عباد اللہ مَن لَوْ اَقسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ (اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ اس کی قسم کھالیں تو وہ اسے پورا کر دیتا ہے"

فزاری نے اس روایت میں حضرت انس سے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ "قوم راضی ہو گئی اور اس نے دیت قبول کر لی"۔

بخاری کتاب الجہاد باب "مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ" (الاحزاب۲۳) میں محمد بن سعید خزاعی اور عمرو بن زرارہ کی سندوں سے مذکور ہے کہ انس بن نضر نے کہا، "اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اس کے دانت نہیں توڑے جائیں گے" آخر کار وہ دیت لینے اور قصاص کا ارادہ ترک کرنے پر راضی ہو گئے۔

بخاری کتاب التفسیر سورۃ مائدہ باب "الجروح قصاص" میں سند اس طرح ہے عن محمد بن سلام قال اخبرنا الفزاری عن حمید عن انس اور کتاب الدیات باب "السن بالسن" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۸۹۴) میں سند اس طرح ہے۔ عن الانصاری (محمد بن عبداللہ) قال حدثنا حمید عن انس۔

[2] صحیح مسلم ——— کتاب القسامۃ باب "اثبات القصاص فی الاسنان" میں ہے کہ اخت ربیع یعنی ام حارثہ

اُمِّ ربیع نے کہا: یا رسول اللہ! کیا آپؐ فلاں عورت سے قصاص لے رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! اس سے کبھی بھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا "سبحان اللہ یا ام الربیع، القصاص فی کتاب اللہ" (سبحان اللہ، ام الربیع قصاص کا حکم تو کتاب اللہ میں مذکور ہے) اس نے دوبارہ زور دے کر کہا اللہ کی قسم! اس سے کبھی بھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی کوشش جاری رکھی یہاں تک کہ فریق ثانی دیت پر راضی ہو گیا۔ حضورؐ نے اس موقع پر فرمایا: "ان من عباد اللہ لو اقسم علی اللہ لأبرّہٗ" (اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ کسی سلسلے میں قسم کھالیں تو اللہ اسے پورا کر دیتا ہے)۔

بخاریؒ اور مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کا ہاتھ کاٹ کھایا۔ جب اس نے زور سے اپنا ہاتھ کھینچا تو کاٹنے والے کے اگلے دو دانت گر گئے۔ یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ تفصیلات سننے کے بعد آپؐ نے فرمایا "یعض احدکم اخاہ کما یعض الفحل لا دیۃ لک" (تم میں سے ایک شخص اپنے بھائی کو یوں کاٹتا ہے جیسے اونٹ کاٹ کھاتا ہے۔ تمہارے لیے کوئی دیت نہیں)۔

مصنف ابی داؤد[۲] میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ اگر کسی شخص کی چوٹ سے دوسرے کی آنکھ کی بینائی جاتی رہے لیکن دیکھنے میں آنکھ صحیح سالم[۳] ہو تو اس کی ایک تہائی[۴] دیت ہوگی۔ مصنف نسائی میں اس روایت میں

نے ایک شخص کو زخمی کر دیا۔ اس میں کلمہ "القصاص، القصاص" دو دفعہ آیا ہے۔

روایات بخاری اور مسلم میں اختلاف:

صحیح مسلم میں ہے کہ یہ زیادتی اخت ربیع نے کی تھی لیکن بخاری کی روایت میں اس کا نام ربیع بتایا گیا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث میں قسم کھانے والی اُمِّ ربیع ہے حالانکہ بخاری کی روایت کے مطابق قسم انس بن نضر نے کھائی۔ علماء کہتے ہیں کہ ان میں سے بخاری کی روایت زیادہ مشہور ہے لیکن امام نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔

[۱] یہ روایت صحیح بخاری کتاب الدیات، باب "اذا عض رجلاً فوقعت ثنایاہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۸۹۲)

صحیح مسلم کتاب "القسامۃ" باب "الصائل علی نفس الانسان او عضوہ اذا دفعہ المصول علیہ فاتلف نفسہ او عضوہ لا ضمان علیہ"۔ ابو داؤد ———— کتاب "الدیات" باب فی الرجل یقاتل الرجل فیدفعہ عن نفسہ"۔ سنن نسائی ———— کتاب "القسامۃ" باب القصاص من الثنیۃ" میں ہے۔

[۲] سنن ابی داؤد ———— کتاب "الدیات" باب "دیات الاعضاء"

[۳] اصل الفاظ یوں ہیں "العین القائمۃ السادۃ بمکانہا" جس کا مطلب یہ ہے کہ چوٹ کی وجہ سے گو بصارت زائل ہو چکی ہو لیکن آنکھ بدستور اپنے حلقہ میں موجود ہو۔ (عون المعبود ج ۱۲، ص ۳۰۹) میں ہے کہ تورپشتی کے نزدیک اس سے مراد ایسی آنکھ ہے جو اپنے حلقہ میں قائم ہے۔ اس میں ظاہراً کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوا جسب سابق وہ چہرے کے لیے زینت بنی ہوئی ہے، لیکن اس کی بینائی ختم ہو گئی ہے۔

[۴] علامہ شوکانی نیل الاوطار (ج ۷، ص ۷۰) میں رقمطراز ہیں کہ ایسی آنکھ کی دیت صحیح آنکھ کی دیت کی ایک تہائی اس

یہ اضافہ ہے کہ ناکارہ ہاتھ کو کاٹنے اور سیاہ دانت[۱] کو توڑنے کی صورت میں بھی ایک تہائی دیت ہوگی۔

مؤطا[۲] امام مالک اور المدونہ[۳] میں حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے کہ دیت کی کل مالیت سو دینار ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ دیت کی مالیت کا تعین اجتہاد[۴] سے ہوگا۔

لیے ہوگی کہ بصارت زائل ہونے کے باوجود وہ زینت کا کام دے رہی ہے۔

[۱] متن میں الید الشلاء کے الفاظ ہیں۔ ایسا ہاتھ جس کی منفعت باقی نہ رہے، اس کی دیت صحیح سالم ہاتھ کی دیت کی ایک تہائی اس لیے ہوگی کہ اس کے کاٹنے سے جسم کا صرف حسن وجمال متاثر ہوتا ہے (نیل الاوطار: ج ۷، ص ۶۷)

سیاہ دانت کی بھی ایک تہائی دیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ اس کی خوبصورتی تو نہیں ہوتی لیکن اس کی افادیت باقی ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں بھی ایک تہائی دیت لازم ہوگی۔

[۲] مؤطا امام مالک (ج ۲، ص ۱۸۵) کتاب "العقول" باب "ما جاء فی عقل العین اذا ذهب بصرها"۔

[۳] المدونہ (ج ۶، ص ۳۲۱) میں مذکور ہے کہ ایسی پھوٹی ہوئی آنکھ کی دیت ہے جو دیکھنے میں صحیح وسالم ہو لیکن سیاہ دانت کی دیت نہیں ہوگی۔

[۴] امام مالک کا یہ قول ایسی پھوٹی ہوئی آنکھ کے بارے میں ہے جو دیکھنے میں صحیح وسالم نظر آئے، لیکن جہاں تک "سیاہ دانت" کا تعلق ہے۔ وہ اس کی پوری دیت کے قائل ہیں۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ سوکھے ہوئے ہاتھ، سیاہ دانت اور اس پھوٹی ہوئی آنکھ کے بارے میں جو اپنے حلقے میں قائم ہو امام احمد بن حنبل سے دو رائیں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ سوکھے ہوئے ہاتھ، کالے دانت اور اس پھوٹی ہوئی آنکھ کی، جو اپنی جگہ قائم ہو، ایک تہائی دیت ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ان کے بارے میں علیحدہ علیحدہ فیصلہ ہوگا (المغنی کتاب الدیات باب دیات الجراح)۔ امام احمد کے پیروان کی پہلی رائے کو ترجیح دیتے ہیں جس کا سبب مذکورہ بالا احادیث اور سیدنا حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ ہے کہ سوکھے ہوئے ہاتھ، کالے دانت اور اس طرح کی پھوٹی ہوئی آنکھ کی دیت ایک تہائی ہوگی دیکھیے مصنف عبد الرزاق۔ (۹ ص ۵۰)

اقرارِ جرم کرنے والے شادی شدہ زانی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا امام مالک[1] میں حضرت سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ اسلم قبیلہ کا ایک شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں نے زنا کیا ہے۔ آپؓ نے پوچھا کیا تو نے اس کا ذکر میرے علاوہ کسی اور سے بھی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں" آپؓ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ اور اس واقعہ کا کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے

---

[1] زنا حرام ہے یہ گھناؤنے کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ ارشاد باری ہے "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا" (بنی اسرائیل ۳۲) (اے لوگو! زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ اور غلط راستہ ہے)۔ ایک اور آیت میں ہے "وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا" (الفرقان-۶۸) (رحمان کے بندے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے، کسی بے گناہ کو قتل نہیں کرتے اور نہ ہی زنا کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جو ایسی راہ پر چلے گا (اس کا انجام نہایت برا ہوگا)۔

زنا کی تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص ایسی عورت سے وطی کرے جو نہ اس کی منکوحہ ہو نہ اس سے نکاح کا شبہ ہو اور نہ وہ اس کی لونڈی ہو۔ ابن قدامہ "المغنی" (ج ۹، ص ۲۰) میں لکھتے ہیں کہ اہل علم میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کی شرمگاہ میں ناجائز وطی کرے جبکہ اس کی حلت کا شبہ بھی موجود نہ ہو تو وہ زانی ہوگا) اور شرائط مکمل ہونے کی صورت میں وہ حدِ زنا کا سزاوار ہوگا۔ دبر میں وطی بھی زنا ہے اس لیے کہ یہ بھی ایسی عورت کے فرج کو استعمال کرنا ہے جس میں ملکیت اور شبہ ملکیت کی کوئی شکل موجود نہیں ہے، تاہم بعض علماء نے زنا کے لیے قُبل (سامنے کی شرمگاہ) میں وطی کرنے کی شرط عائد کی ہے۔ شرح فتح القدیر (ج ۴، ص ۱۳۸) میں لکھا ہے کہ زنا اس وطی کو کہتے ہیں جو مرد کسی استحقاق کے بغیر عورت کی سامنے کی شرمگاہ میں کرے اور وطی جس پر حد واجب ہو جاتی ہے وہ ہے جس میں آلۂ تناسل کا اگلا حصہ (حشفہ) عورت کی شرمگاہ میں چھپ جائے، البتہ اس کا انزال شرط نہیں ہے۔

[2] مؤطا امام مالک (ج ۲، ص ۱۶۵) کتاب "الحدود" باب "ما جاء فی الرجم" میں یہ روایت ہے۔ تمام راویوں کے نزدیک حضرت امام مالکؒ سے یہ روایت مرسلاً مروی ہے۔ امام مالک کے علاوہ اور بھی کئی راویوں نے مختلف اسناد کے ساتھ اسے مرسلاً روایت کیا ہے، البتہ ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ صحیحین اور دیگر کتب احادیث میں یہ حدیث کئی سلسلوں سے بروایت ابن شہاب متصلاً مروی ہے۔ ان سلسلوں میں ابن شہاب، سعید بن المسیب اور ابوسلمہ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اس روایت میں "رجل" سے مراد ماعز بن مالکؓ ہیں جیسا کہ بہت سی احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

بندوں کی توبہ قبول کرتے ہیں ۔ مگر اس شخص کو اس کے دل نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ اور ان سے بھی وہی کچھ کہا جس کا ذکر وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کر چکا تھا۔ حضرت فاروقؓ نے بھی حضرت صدیقؓ کی طرح مشورہ دیا لیکن وہ شخص پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔ بالآخر وہ رسول[1] اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بتایا کہ میں نے زنا کیا ہے۔ حضرت سعیدؒ فرماتے ہیں کہ رسول[2] اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے تین مرتبہ منہ پھیرا لیکن وہ وہی بات دہراتا رہا تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اس کے گھر بھیجا تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کہیں کسی مرض یا جنون[3] میں مبتلا تو نہیں۔ گھر والوں نے کہا کہ وہ تو بالکل صحت مند ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ تو شادی شدہ ہے یا کنوارا ؟ اس نے کہا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پھر آپؐ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔

صحیح بخاری[4] میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ اسلم قبیلہ کا ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے اعتراف زنا کیا۔ آپؐ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ جب اس نے چار مرتبہ اعتراف زنا کر لیا تو آپؐ نے پوچھا، اَبِكَ جُنُوْنٌ ؟ (تجھے جنون کا مرض تو نہیں) اس نے عرض کیا کہ "نہیں" آپؐ نے پھر سوال کیا کہ "تو شادی شدہ ہے ؟" اس نے کہا کہ "ہاں"۔ جب یہ تمام مراحل طے ہو چکے تو آپؐ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ جب اس پر پتھروں کی بارش ہوئی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا، مگر اس پر مسلسل پتھر برسائے گئے یہاں تک کہ وہ مر گیا۔

اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں کلمۂ خیر کہا اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ابن جریج اور یونس نے جو روایت امام زہری سے کی ہے اس میں نمازِ جنازہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

صحیح مسلم[5] میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چار مرتبہ لوٹایا لیکن بعض دوسری روایات میں اسے دو یا تین دفعہ لوٹانے کا ذکر ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد جب کچھ اندھیرا ہوا تو حضورؐ منبر پر چڑھے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا:

اَوَ كُلَّمَا انْطَلَقْنَا غُزَاةً فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ تَخَلَّفَ رَجُلٌ فِيْ عِيَالِنَا ، لَهٗ نَبِيْبٌ كَنَبِيْبِ	کیا ہر دفعہ ایسا ہی ہوگا کہ جب ہم اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے نکلیں گے تو ایک شخص پیچھے ہمارے اہل و عیال

---

۱ نسخہ شہید علی پاشا میں "رسول اللہ" کے بجائے "النبی" ہے۔

۲ تمام نسخوں میں صلی اللہ علیہ وسلم کا اضافہ موجود ہے۔

۳ نسخہ لالہ لی اور حلب میں یہ عبارت مذکور ہے: "اجنه یشتکی أ به جنون" لیکن صحیح عبارت وہی ہے جو نسخہ حرم مکی شریف میں ہے۔

۴ صحیح بخاری: کتاب "الحدود" باب "الرجم بالمصلی" (فتح الباری حدیث نمبر ۶۸۲۰)

۵ صحیح مسلم: (ج ۳، ص ۱۳۲۰) کتاب "الحدود" باب "من اعترف علی نفسہ بالزنا"

التَّيْسِ عَلَيَّ أَنْ لَا أُوتَى بِرَجُلٍ فَعَلَ إِلَّا نَكَّلْتُ بِهِ" قَالَ : فَمَا اسْتَغْفَرَ لَهُ وَلَا سَبَّهُ"

میں رہ جائے گا جو سانڈ بکرے کی طرح آوازیں نکالتا[1] ہوگا۔ یہ میرے ذمے فرض ہے کہ جب بھی ایسا شخص میرے پاس لایا جائے تو میں اسے عبرتناک سزا دوں۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ نے اس کے لیے نہ دعائے مغفرت کی اور نہ ہی اسے سخت سست کہا۔[2][3]

ایک اور روایت[4] میں ہے کہ اس واقعہ سے دو تین روز بعد لوگ ایک جگہ جمع تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا کہ ماعزؓ بن مالک کے لیے بخشش کی دعا کرو۔ صحابہ کرامؓ نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ماعزؓ بن مالک کی مغفرت فرمائے۔ آپ نے فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے ایک جماعت پر تقسیم کر دیا جائے تو یہ اس کے لیے کافی ہوگی۔

سنن ابی داؤد[5] میں ہے کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس وقت وہ جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے۔"

موطا امام[6] مالک میں یعقوب بن زید بن طلحہ کی روایت ہے کہ ان کے والد زید بن طلحہ نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے روایت کی کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور کہا کہ وہ زنا سے حاملہ ہے۔ آپ نے فرمایا، کہ بچے کی ولادت کے بعد آنا، چنانچہ وضع حمل کے بعد وہ پھر آئی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جاؤ" اسے دودھ پلاؤ اور مدتِ

---

[1] تَبِیبٌ : بکرے کی آواز جو بوقت جفتی نکالتا ہے۔ تیس نر کو کہتے ہیں۔ وہ بکرا ہو یا ہرن۔

[2] آپ نے اسے سخت سست نہیں کہا اور نہ ہی اس کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ سخت سست نہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حد ہی گناہوں سے پاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ دعائے بخشش اس لیے نہیں فرمائی کہ کہیں لوگ حضور کی دعائے مغفرت پر اعتماد کرتے ہوئے گناہوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ [3] صحیح مسلم۔ کتاب الحدود۔ باب "من اعترف علی نفسہ بالزنا"

[4] صحیح مسلم (حدیث : ۱۳۲۲) کتاب "الحدود" باب "من اعترف علی نفسہ بالزنا"

[5] ابوداؤد (ج ۴، ص ۱۴۸) کتاب "الحدود" باب "رجم ماعز بن مالک"

[6] موطا امام مالک (ج ۲، ص ۱۶۶) کتاب "الحدود" باب "ما جاء فی الرجم"

علامہ سیوطی نے "تنویر الحوالک فی شرح موطا امام مالک" (ج ۲۔ ص ۱۶۲) میں لکھا ہے کہ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ یحییٰ کی طرح اکثر حدیث بھی اسی طرح کی ہے۔ انھوں نے عبداللہ بن ابی ملیکہ کی اس روایت کو مرسل قرار دیا ہے جو قعنبی، ابن قاسم اور ابن بکیر نے امام مالکؒ سے، انھوں نے یعقوب بن زید بن طلحہ سے، انھوں نے اپنے باپ زید بن طلحہ سے انھوں نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے بیان کی ہے۔ ان کے نزدیک زید بن طلحہ کی یہ روایت مرسل ہے۔ اسی طرح ابن وہب نے امام مالکؒ سے، انھوں نے یعقوب بن زید بن طلحہ تیمی سے انھوں نے اپنے باپ اور انھوں نے ایک خاتون سے اسی طرح کی روایت بیان کی ہے۔ ایسی ہی روایت ابن لہیعہ نے محمد بن عبدالرحمٰن سے، اس نے عمر بن قتادہ بن نعمان سے اس نے محمد بن لبید انصاری سے اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ ان روایات کے مفہوم کی تائید صحاح ستہ کے معیار کے مطابق روایت کردہ عمران بن حصین اور بریدہ والی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

رضاعت پوری ہونے کے بعد آنا۔" تیسری بار وہ آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ بچہ کسی کی کفالت میں دینا ضروری ہے۔ جب وہ بچے کو کسی کے سپرد کر کے آئی تو آپ نے رجم کا حکم دیا اور اسے رجم کیا گیا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کے لیے سینے تک گہرا گڑھا کھودا گیا۔ اس کے بعد اسے رجم کیا گیا۔ آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا "کیا آپ ایک زانیہ کی نماز جنازہ پڑھا رہے ہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا "لقد تابت توبة لو قسمت بين سبعين من اهل المدينة لوسعتهم وهل افضل من ان جادت بنفسها لله عزوجل" (اس نے ایسی سچی توبہ کی ہے کہ اگر اسے مدینہ کے ستر آدمیوں پر تقسیم کر دیا جائے تو ان کی بخشش کے لیے کافی ہے۔ اس سے بہتر توبہ کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خدائے بزرگ و برتر کے حوالے کر دیا)۔

نسائیؒ میں ہے کہ رجم کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی موقع پر موجود تھے۔ آپ نے چنے کے دانے کے برابر ایک

یہ روایت متعدد طرق سے مرسلاً مروی ہے۔ محدثین کرام کے ہاں بھی مشہور ہے۔ ابوداؤد میں روایت عمران بن حصین میں ہے کہ یہ عورت جہینہ قبیلہ سے تھی۔ صحیح مسلم کے مطابق یہ غامد قبیلہ سے تھی جو جہینہ قبیلہ کی ایک شاخ کا نام ہے۔

۱؎ صحیح مسلم (ج ۳، ص ۱۳۲۳) کتاب "الحدود" باب من اعترف علی نفسه بالزنا میں مذکور ہے کہ جب حضرت خالدؓ بن ولید نے اس کے سر پر پتھر مارا تو خون کے کچھ چھینٹے ان کے چہرے پر پڑے جس پر انھوں نے اسے سخت سست کہا۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا "اے خالد! خاموش رہو، خدا کی قسم اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی کرے تو بخشا جائے"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے اپنے کپڑے اپنے جسم پر لپیٹ لیے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا، اور پھر رجم کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا "کیا آپ ایک ...." ایسا ہی مضمون سنن نسائی (ج ۴، ص ۶۳) کتاب الجنائز باب "الصلوٰة علی المرجوم" میں ہے" اپنے گرد کپڑے لپیٹنے کے بارے میں ایک روایت میں ہے فشکت ثيابها اور دوسری میں ہے فشدت ...

"النهاية" (ج ۲، ۴۹۵) میں اس کا معنی بیان کیا گیا ہے۔ جمعت، دنفت۔ یعنی اس نے اپنے کپڑوں کو اپنے جسم کے اردگرد لپیٹ لیا، تاکہ بدن منکشف نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ رجم کے دوران میں عورت کے لیے اپنے کپڑوں کا لپیٹے رکھنا مستحب ہے تاکہ اس کا جسم برہنہ نہ ہو۔

۲؎ "سنن نسائی الصغریٰ" میں مجھے یہ روایت نہیں ملی، شاید یہ "سنن نسائی الکبریٰ" میں ہو۔

سنن ابی داؤد (ج ۴، ص ۱۵۲) کتاب "الحدود" باب "فی المرأة التی امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم برجمها من جهينة" میں زکریا بن سلیم کی سند کے ساتھ مروی ہے جس میں یہ زائد عبارت موجود ہے۔ "آپ نے اسے چنے کے برابر کنکری ماری اور فرمایا" اسے پتھر مارو، لیکن چہرے سے احتراز کرنا۔ پھر جب اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا تو اسے نکال کر آپ نے نماز جنازہ پڑھائی"۔

منذری نے مختصر ابی داؤد (ج ۶، ص ۲۵۷) میں کہا ہے کہ امام نسائی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ ان دونوں کی اسناد میں ابن ابی بکرہ نامی راوی ہے۔ اور دونوں ہی روایات میں ابن ابی بکرہ سے روایت کرنے والا مجہول ہے۔

کنکر اس پر پھینکا پھر فرمایا "ارموا وا یاکم وجهها" اسے سنگسار کرو لیکن چہرے پر نہ مارنا۔ اس وقت حضورؐ خچر پر سوار تھے۔
موطا امام مالک کی اس روایت سے مستنبط ہوتا ہے کہ:

ا۔ جو شخص ایک دفعہ زنا کا اعتراف کرے اس پر حد قائم کر دی جائے گی اور چار دفعہ اقرار کرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

ب۔ رجم کی صورت میں کوڑوں کی سزا ساقط ہو جائے گی۔

ج۔ اگر کوئی شخص دیوانہ ہو تو اقرار زنا کے باوجود وہ شرعی حد کا سزاوار نہیں ہو گا کیونکہ اس روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اس کے بارے میں پوچھا کہ وہ دیوانہ تو نہیں ہے؟

یہ کہ اقامتِ حد کے لیے ایک دفعہ اقرار بھی کافی ہے۔ امام مالک، شافعی، داؤد، ابوثور، طبری اور دیگر بہت سے اہل علم کا یہی مسلک ہے لیکن امام ابوحنیفہ، اور امام احمد کے نزدیک چار مرتبہ مختلف اوقات میں اقرار ضروری ہے بلکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اقرار مختلف مجالس میں ہونا ضروری ہے۔ (بدایۃ المجتہد : ج ۲، ص ۳۲۸)

صحتِ اقرار کے لیے ضروری ہے کہ وہ عاقل ہو، چنانچہ دیوانے کا اعتراف قابلِ قبول نہیں ہے۔ اگر ایک شخص ایسا ہے کہ ایک وقت اس پہ دیوانگی طاری ہوتی ہے، دوسرے وقت میں وہ صحیح حالت میں ہوتا ہے اور وہ حالتِ صحت میں اقرار کرتا ہے یا اس کے خلاف حالتِ صحت میں ارتکاب زنا کی شہادت قائم ہوتی ہے تو ایسا شخص حدِ زنا کا سزاوار ہو گا۔
المغنی (ج ۹، ص ۴۷)

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو یعنی نابالغ کا اقرارِ جرم قابلِ اعتبار نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کا اقرار عدم اقرار کے مانند ہو گا۔
بدائع الصنائع (ج ۷، ص ۴۹)

احناف کے نزدیک تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا اقرار بالکل واضح ہو، چنانچہ گونگے پر حد عائد نہیں ہو گی خواہ وہ اعتراف جرم لکھ کر یا اشارے سے ہی کیوں نہ کرے۔ تاہم شوافع اور مالکیہ کے نزدیک اگر اس کا اشارۂ زنا بالکل واضح ہے تو گونگا حدِ زنا کا سزاوار ہو گا۔

زنا کے جرم میں یہودی کو رجم کرنے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا[1] میں روایت ہے امام مالکؒ نافعؒ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیان کرتے ہیں کہ چند یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ان کے ہاں ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے۔ آپ نے پوچھا "تورات میں زنا کا کیا حکم ہے؟" انھوں نے کہا کہ ہم ان کو ذلیل و رسوا کرتے اور کوڑے لگاتے ہیں۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن سلامؓ وہاں موجود تھے —— انھوں نے کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، تورات میں تو زنا کی سزا رجم ہے۔

یہودی تورات لائے اور متعلقہ حصہ پڑھنا شروع کیا لیکن ایک شخص نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیا۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے کہا "اپنا ہاتھ اٹھاؤ"۔[2] اس نے ہاتھ اٹھایا تو وہاں آیت رجم موجود تھی۔ اس کے بعد انھوں نے تسلیم[3] کرلیا کہ زانی کی سزا رجم ہے چنانچہ اس یہودی جوڑے کو آپ کے حکم سے رجم کیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرد عورت پر جھک کر اسے پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔ امام مالک کا قول ہے "یَجْنَیْ عَلَیْھَا" یعنی مرد عورت پر جھکتا تھا تاکہ وہ پتھروں سے محفوظ رہے۔ صحیح بخاری[4] اور

---

[1] یہ روایت مؤطا امام مالک (ج ۲، ص ۱۶۵) کتاب "الحدود" باب "ما جاء فی الرجم" میں ہے۔

[2] امام نووی شرح مسلم (ج ۱۱، ص ۲۰۸) میں لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے یہ سوال فیصلہ معلوم کرنے یا ان کی تقلید کرنے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ ان پر یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ رجم کا حکم تو تورات میں بھی پایا جاتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب معلومات آپ کو بذریعہ وحی حاصل ہوئیں یا ان کا علم یہودی علما، حضرت کعبؓ بن احبار، حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہم سے ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہودنے حکم رجم چھپانے کی ناکام کوشش کی تو یہ آپ سے مخفی نہ تھا۔

[3] یہ جملہ کہ "انھوں نے تسلیم کرلیا کہ تورات میں زانی کی سزا رجم ہے"، نسخہ لاہ میں موجود نہیں البتہ نسخہ حلبی اور نسخہ حلب کے حاشیوں پر یہ موجود ہے۔

[4] صحیح بخاری، کتاب "الحدود" باب "الرجم فی البلاط" میں ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۸۱۹) "قالوا ان احبارنا احدثوا تحمیم الوجه والتجبیة" اب ہمارے علما نے رجم کے بجائے منہ کالا کرنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے کا طریقہ اپنا لیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری: ج ۱۲، ص ۱۲۹) میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جَبْهَتُ الرَّجُلَ" کا مطلب ہے کہ میں نے اس کے ساتھ گفتگو اور طرز عمل میں نہایت سختی کا معاملہ کیا۔ ثابت نے "الدلائل" میں یہی مفہوم لکھا ہے۔ اس سے پہلے حربی

مسلم[1] میں اسی طرح کی روایت ہے۔ سنن نسائی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں مذکور ہے، جس میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے۔ ارشادِ باری ہے "یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ" (اے اہلِ کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو ایسے بہت سے احکام بھی بیان کرتا ہے جنھیں تم چھپانے کی کوشش کرتے ہو)[2]

حضرت امام مالک مؤطا کے علاوہ دوسری جگہ بیان کرتے ہیں کہ یہودی مرد اور عورت اہلِ ذمہ میں سے نہیں تھے لیکن امام بخاری کہتے ہیں کہ یہ یہودی اہلِ ذمہ میں سے تھے۔

زجاج نے معانی القرآن میں ذکر کیا ہے کہ خیبر کے یہودی سرداروں میں زنا کی وبا عام ہو چکی تھی۔

نے اس کا یہی معنی لکھا ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ اس کا معنی الٹا سوار کرنا ہے۔ قاضی عیاض نے اس لفظ کی تشریح اس طرح بیان کی ہے کہ انھیں کوڑے لگائے جائیں، ان کے چہرے سیاہ کیے جائیں اور انھیں اس طرح سوار کیا جائے کہ ایک دوسرے کا رُخ الٹی سمت میں ہو۔ حربی کہتے ہیں کہ امام زہری سے بھی ایسی ہی تشریح منقول ہے۔

ابو عبید نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ پہلے کھڑا ہو پھر اپنا ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر رکوع کی حالت میں چلا جائے۔ اس کے بعد اوندھے منہ سجدہ کی حالت اختیار کرے۔ فارابی کے مطابق تجبیا کا معنی ننگے ہو کر رکوع کرنے والے کی طرح کھڑے ہونا ہے۔ اگر یہ لفظ تجنا ہو جیسا کہ "فرأیت الیھودی اجنا علیھا" ہے تو معنی ہوگا وہ اس پر جھکا۔

حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک یہ لفظ (التجبیہ) ب کے ساتھ ہے ن کے ساتھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا یہ معنی غلط ہے کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کو اونٹ یا گدھے پر ایک دوسرے کی مخالف سمت میں سوار کیا جائے۔

[1] صحیح مسلم (ج ۲، ص ۱۳۲۶) کتاب الحدود "باب رجم الیھودی اھل الذمۃ فی الزنیٰ" میں ہے کہ ہم ان کا منہ کالا کرتے ہیں، ان کے منہ ایک دوسرے کی الٹی سمت کر کے ان کو سوار کرتے اور گلیوں بازاروں میں ان کو گھماتے ہیں۔

[2] (سورۂ مائدہ ۔ ۱۵)۔ پوری آیت اس طرح ہے "وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ" (وہ تمھاری بہت سی غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔ بے شک تمھارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور اور واضح کتاب آ چکی ہے)

[3] معانی القرآن۔ یہ زجاج کی مشہور تفسیر ہے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل عبدہ شلبی کی تحقیق کے ساتھ اس کے دو جز منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جو (اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ۔ سورہ توبہ: ۱۰۸) تک ہیں۔ زجاج کا اصل نام ابو اسحاق ابراہیم بن سری بن سہل ہے، لیکن زیادہ تر زجاج کے نام سے مشہور رہے۔ شروع میں شیشے کی اشیاء بنانے کا کام کرتے تھے۔ اس لیے زجاج مشہور ہو گئے۔ تعلیم کا شوق پیدا ہوا تو مبرد کی شاگردی اختیار کی۔ اکثر وقت ان کی خدمت میں گزارتے۔ ان کا شمار مبرد کے نہایت قابلِ اعتماد شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ابن ندیم "الفہرس" (ص ۹۰) میں لکھتے ہیں کہ زجاج کا شمار مبرد کے ممتاز ترین شاگردوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ اگر کوئی یہ چاہتا کہ وہ (اپنی احادیث تصحیح کے لیے) مبرد کے سامنے پڑھے تو اسے (ان احادیث کو) پہلے زجاج کے سامنے پیش کرنا ہوتا۔ معانی القرآن کی تکمیل میں ان کے پورے سولہ سال صرف ہوئے اور اس کی تکمیل وفات سے دس سال پہلے ہوئی۔ انھوں نے اس گراں قدر تصنیف کا آغاز ۲۸۵ھ میں کیا اور ۳۰۱ھ میں پوری کی۔ وہ فکر کی پختگی اور لغت دانی میں منفرد

اور تورات میں شادی شدہ زانی کی سزا رجم تھی۔ ایک دفعہ ایک یہودی مرد اور عورت نے زنا کیا۔ یہودی اس خیال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے کہ شریعت اسلامیہ میں زنا کی سزا کوڑے ہیں۔ قرآن مجید یہود کی اس عادت کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا[1] (یہ تورات کے الفاظ بدل دیتے اور کہتے ہیں کہ اگر محمدؐ کے ہاں حسب منشا حکم مل جائے تو لے لینا ورنہ اس سے احتراز کرنا)

"سنن ابی داؤدؒ" میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ چند یہودی ایک زانی مرد اور عورت کو لے کر آپؐ کے پاس آئے۔ حضورؐ نے فرمایا، تم اپنے دو سب سے بڑے عالم میرے پاس لاؤ، چنانچہ وہ صوریا کے دو بیٹے[3] حضورؐ کے پاس لائے۔ آپؐ نے انھیں قسم دے کر پوچھا کہ تورات میں زنا کی سزا کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ تورات میں یہ حکم ہے کہ اگر چار آدمی زنا کے وقوع کی شہادت اس طرح دیں کہ ہم نے مرد کا آلۂ تناسل عورت کی شرمگاہ میں اس طرح دیکھا ہے جس طرح سرمہ دانی میں سلائی ہوتی ہے تو دونوں کو رجم کیا جائے گا۔

آپؐ نے پوچھا، پھر تم انھیں رجم کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارا اقتدار ختم ہو گیا اور ہم قتل کو ناپسند کرنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہ طلب کیے[4]۔ چار گواہ آئے اور انھوں نے گواہی دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

حیثیت رکھتے تھے۔ قدیم زمانہ میں مفسرین کے لیے یہ تفسیر ایک عظیم ذخیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ تفسیر کشاف میں لغوی تشریحات کے سلسلے میں علامہ زمخشریؒ اور اسی طرح بغوی اور محمد بن خازنؒ نے اپنی اپنی تفسیروں میں اسی پر اعتماد کیا ہے اسی طرح اہل لغت و ادب نے بھی لغوی ضوابط وضع کرنے میں اس سے بہت زیادہ رہنمائی حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ یہ تفسیر باقی رہے، چنانچہ یہ بڑی بڑی عالمی لائبریریوں میں مختلف اجزا کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک نسخہ "دار الکتب المصریہ" میں تفسیر طلعت، نمبر ۲۶۷ (آغاز قرآن سے سورۂ ہود کی بعض آیات تک) ایک نسخہ آغاز سے سورہ مائدہ تک مکتبہ عمومیہ استنبول، نمبر ۴۴۲ میں موجود ہے۔ ایک اور نسخہ "معهد المخطوطات العربیة" قاہرہ میں پایا جاتا ہے جو مکتبہ کوپریلی استنبول میں موجود نسخہ کی، جس کا نمبر ۴۴۲ ہے، فوٹو کاپی ہے۔ یہ نسخہ (ابتدائے قرآن کریم سے) سورہ انعام کی ابتدائی چند آیات تک ہے۔ اسی طرح ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے جو سورۂ نساء سے شروع ہو کر آخر قرآن کریم تک ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم شلبی نے اس کتاب کی تحقیق میں "دار الکتب المصریہ" کے نسخہ پر اعتماد کیا ہے۔

[1] سورۂ مائدہ - ۴۱

[2] سنن ابی داؤد (ج ۴، ص ۱۵۷) کتاب "الحدود" باب "رجم الیهودیین"۔

[3] - حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (ج ۱۲، ص ۱۲۸) میں بیان کیا ہے کہ طبری نے حدیث ابن عباس میں کہا ہے: "میرے پاس علمائے یہود سے دو آدمی لاؤ، چنانچہ وہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا اور دوسرا اتنا بوڑھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے ابرو آنکھوں پر ڈھلکے ہوئے تھے۔

[4] ابن عربی کا خیال ہے کہ حدیث جابر میں "فدعا بالشهود" سے مراد مسلمان گواہ ہیں لیکن اس کی تردید اس حدیث سے ہو جاتی ہے جس کے الفاظ ہیں "بأربعة منكم" (اپنے میں سے چار گواہ لاؤ) امام نووی نے شرح مسلم (ج ۱۱، ص ۲۰۹) میں لکھا ہے

رجم[1] کا حکم دیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ان ہی میں سے چار گواہ آئے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے کہا کہ "اپنے میں سے چار شخص لاؤ"۔ اس روایت کی سند میں مجالد نامی ایک راوی ہے جس کی روایت قابل قبول[2] نہیں۔ اصل صورت یہ ہے کہ حضورؐ نے انھیں یہود کی گواہی پر رجم نہیں کیا بلکہ یا تو آپؐ نے یہ فیصلہ وحی کی بنا پر کیا یا مسلمانوں کی گواہی پر کیا یا خود مجرمین نے زنا کا اقرار کیا تھا۔

مسند بزار[3] میں ہے کہ یہود آپ کی خدمت میں صوریا کے دو بیٹے لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم دوسروں سے زیادہ علم رکھتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کا یہی خیال ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قسم دے کر پوچھا کہ زنا کا تورات میں کیا حکم ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ تورات میں ہے کہ اگر مرد اور عورت ایک گھر میں مشکوک حالت میں اکٹھے پائے جائیں تو انھیں سزا دی جائے گی۔

اگر مرد و عورت کے کپڑوں اور پیٹ پر پایا گیا تو ایسی صورت میں بھی شک کی بنا پر وہ سزا کے مستحق ہیں، البتہ اگر چار گواہ شہادت دیں۔ اس کے بعد حدیث کا باقی حصہ اسی روایت کے مطابق ہے۔

کہ انھیں رجم ان کے اقرار کی بنا پر کیا گیا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ان پر چار آدمیوں نے گواہی دی، اگر یہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گواہ مسلمان تھے۔ کیونکہ اگر وہ کافر ہوتے تو ان کی گواہی کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ اس صورت میں سزا مجرموں کے اعتراف کے سبب ہی ہو سکتی ہے۔ امام نوویؒ کی تشریح یہاں تک ختم ہو گئی، لیکن ہمارے خیال میں یہ بھی ممکن ہے کہ گواہ یہودی ہی ہوں کیونکہ (شریعت میں) یہ ثابت نہیں کہ کفار کی ایک دوسرے پر گواہی کی کوئی ممانعت ہے۔

[1] سنن ابی داؤد میں اس عبارت کا اضافہ ہے "فَشَهِدُوْا اَنَّهُمْ رَاَوْا ذَكَرَهٗ فِيْ فَرْجِهَا مِثْلَ الْمِيْلِ فِي الْمُكْحُلَةِ" (انھوں نے گواہی دی کہ ہم نے مرد کا آلۂ تناسل عورت کی شرمگاہ میں اس طرح دیکھا جس طرح سرمہ دانی میں سلائی ہوتی ہے)۔

[2] منذری نے مختصر ابی داؤد (ج ۶، ص ۲۶۵) میں لکھا ہے کہ ابن ماجہ نے بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ روایت کی ہے، لیکن اس کی سند میں ایک راوی مُجالد ہے جو ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے تقریب التہذیب (ج ۲، ص ۲۲۹) میں لکھا ہے کہ مُجالد ابن سعید بن عمیر ہمدانی ابو عمر کوفی قوی نہیں ہے۔ یہ شخص اپنی عمر کے آخری حصہ میں بہت حد تک بدل گیا تھا۔

[3] بزار کی حدیث کا ہیثمی نے "مجمع الزوائد" (ج ۶، ص ۲۷۲ - ۲۷۱) میں ذکر کیا، اور کہا ہے کہ ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے یہ حدیث اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ بزار کی سند یہ ہے۔ مجالد عن الشعبی عن جابر رضی اللہ عنہ۔ ابن عدی نے اس سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ مُجالد کے بارے میں محدثین کی آراء کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس حدیث سے درج ذیل فقہی نکات مترتب ہوتے ہیں:

ا۔ اگر غیر مسلم اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرانا چاہیں تو ان کے مذہبی پیشواؤں کی رائے کے بغیر بھی ان کے درمیان فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ جسے رجم کرنا ہو اس کے لیے گڑھا کھودا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر گڑھا ہوتا تو وہ مرد اس عورت کو بچانے کے لیے اس پر نہ جھک سکتا۔

ج۔ امام مالکؒ کے نزدیک مرد کے لیے گڑھا نہیں کھودا جائے گا۔ وہ اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں، تاہم ان کے بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ یہ معاملہ قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے۔ اگر مناسب سمجھے تو گڑھا کھودنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور چاہے تو گڑھا نہ کھدوائے۔

د۔ جسے رجم کرنا ہو اسے کوڑے نہیں لگائے جائیں گے۔[۲]

۱؎ امام مالکؒ کا مشہور مسلک یہی ہے۔ حاشیہ دسوقی (ج ۴، ص ۳۲۸) میں مذکور ہے کہ صرف عورت کے لیے گڑھا کھودا جائے گا لیکن "المدونۃ" (ج ا، ص ۲۴۱) میں ہے کہ امام مالکؒ اس سلسلے میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ ان دونوں سے اس سلسلہ میں مساوی سلوک ہوگا۔ اسی طرح امام مالکؒ سے یہ بات بھی ثابت نہیں ہے کہ رجم کیے جانے والے مرد کو باندھا جائے۔ امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ البتہ امام احمدؒ سے ایک روایت اس طرح منقول ہے کہ اگر حدِّ زنا اقرار کی وجہ سے لگائی جارہی ہو تو گڑھا نہیں کھودا جائے گا۔ اگر ثبوت زنا گواہوں کے ذریعے ہوا ہے تو صرف عورتوں کے لیے سینے تک گڑھا کھودا جائے گا۔ دیکھیے المغنی (ج ۹، ص

ابوقتادہ، ابوثورؒ، امام ابویوسف اور ایک روایت کے مطابق امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ دونوں کے لیے گڑھا کھودا جائے گا خواہ زنا کا ثبوت شہادت سے ہوا ہو یا اقرار سے۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے امام نووی نے شرح مسلم (ج ۱۱- ص ۱۹۷) میں بیان کیا ہے کہ شوافع کے نزدیک اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ عورت کے لیے سینے تک گڑھا کھودا جائے گا تاکہ پردہ پوشی قائم رہے۔

۲۔ گڑھا کھودنا مستحب ہے نہ مکروہ بلکہ یہ معاملہ قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے۔

۳۔ اگر زنا کا ثبوت شہادت سے ہوا ہے تو گڑھا کھودا جائے گا۔ اگر محض اقرار سے ہوا ہے تو گڑھا نہیں کھودا جائے گا، تاکہ رجوع کی شکل میں بھاگنے کی گنجائش باقی رہے

۲؎ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے متعلق مروی ہے کہ آپؓ نے شراحہ کو جمعرات کے دن کوڑے لگائے اور جمعہ کو رجم کیا اور فرمایا کہ کوڑے کتاب اللہ کے حکم سے لگائے جارہے ہیں اور رجم سنت رسول اللہ کی پیروی میں کیا جارہا ہے۔ یہ روایت دارقطنی (ج ۲، ص ۱۲۴) میں مذکور ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام احمد کا مسلک بھی یہی ہے۔

ابومسعود کا قول ہے کہ جب دو حدیں جمع ہوجائیں جن میں سے ایک کی سزا قتل ہو تو یہی ایک سزا دونوں کے لیے کافی ہوگی۔ دوسری آیت کے مطابق حضرت امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت امام مالکؒ، شافعیؒ اور ابوحنیفہؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ انھوں نے حدیث جابر

سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے ماعز کو رجم کیا ہے لیکن کوڑے نہیں لگائے۔ اسی طرح غامدیہ کو رجم کیا لیکن سنگسار کرنے سے پہلے کوڑے نہیں لگائے۔ دیکھیے المجموع (ج ۱۸، ص ۳۴۴)، المغنی (ج ۹، ص ۷)۔

لیکن ابن قدامہ کے نزدیک دونوں حدوں کو جمع کرنا افضل ہے جس کی تائید حضرت علیؓ کے عمل سے ہوتی ہے کہ کوڑے کتاب اللہ کے حکم سے اور رجم سنتِ نبویؐ کے اتباع میں لگا رہا ہوں۔ نیز حدیث عبادہؓ میں صاف موجود ہے "الثیّب بالثیّب الجلد والرّجم" یہ حکم دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہے جیسے اسی طرح کی قطعی حجت ہی کی بنا پر ترک کیا جا سکتا ہے۔ باقی احادیث اس سلسلے میں واضح نہیں ہیں۔ ان میں رجم کا تو ذکر ہے لیکن کوڑے نہ لگانے کی وضاحت موجود نہیں ہے۔ پس ان کی بنا پر اس واضح اور صریح روایت کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس حدیث کی رُو سے کنوارے زانی کو جلا وطن بھی کیا جائے گا حالانکہ قرآن مجید میں اس کا حکم نہیں ہے۔ جس شخص نے ارتکاب زنا کیا ہے وہ غیر شادی شدہ کی طرح کوڑوں کا سزاوار ہے۔ نیز غیر شادی شدہ کی دو سزائیں ہیں یعنی کوڑے اور جلا وطنی۔ اسی طرح شادی شدہ زانی کی بھی دو ہی سزائیں ہوں گی۔ کوڑے اور رجم۔ رجم جلا وطنی کی جگہ ہوگا۔

اس روایت کے مطابق سزا کا آغاز کوڑوں سے ہوگا۔ اس کے بعد رجم پر عمل کیا جائے گا۔ اگر بیک وقت دونوں سزائیں دی جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ مقصود تو اس کو ہلاک کرنا ہے۔ لیکن اگر ایک دن کوڑے لگائے جائیں اور دوسرے دن رجم کیا جائے، تو بھی جائز ہے۔ کیونکہ حضرت علیؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے شراحہ نامی عورت کو جمعرات کے دن کوڑے لگائے اور جمعہ کے دن اسے رجم کیا اور ساتھ ہی فرمایا، کوڑے کتاب اللہ کے حکم کے مطابق ہیں جبکہ رجم کی سزا سنتِ رسولؐ کی پیروی میں دی جا رہی ہے۔

۱؎ سنن ابی داؤد (ج ۴، ص ۱۵۸) کتاب الحدود، باب "الرجل یزنی بجاریۃ امرأتہ" میں یہ حدیث حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے۔ جامع ترمذی (ج ۴، ص ۴۵) کتاب الحدود، باب "ما جاء فی الرجل یقع علی جاریۃ امرأتہ" ابو داؤد طیالسی نے اپنی مُسند میں یہ روایت نقل کی ہے۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے۔ مُنذری نے مختصر ابی داؤد (ج ۶، ص ۲۷۰) میں امام ترمذی کا قول نقل کیا ہے کہ ابو بشر نے یہ حدیث بھی حبیب بن سالم سے نہیں سنی۔ اس نے یہ خالد بن عرفطہ سے روایت کی ہے۔" اس کے بعد منذری کہتے ہیں کہ خالد بن عرفطہ ابو حاتم کے نزدیک مجہول ہے۔ دیکھیے العلل (ج ۱، ص ۴۲۹)

امام ترمذیؒ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس روایت کے بارے میں محمد بن اسماعیل (بخاریؒ) کو کہتے ہوئے سنا "کہ میں اس حدیث کو لینے سے احتراز کرتا ہوں۔" امام نسائی کہتے ہیں کہ ان تمام روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور خطابی نے اس روایت کو غیر متصل قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر عمل نہیں۔

۲؎ نسخہ شہید علی پاشا اور نسخہ لالہ میں کتاب "النسائی" کا ذکر نہیں ہے۔ سنن نسائی (ج ۶، ص ۱۲۶) کتاب "النکاح" باب "احلال الفرج"۔

شرف المصطفیٰ[1] میں بھی ہے، کہا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کی لونڈی سے ہم بستری کی۔ جب یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے اس فعل کا ارتکاب بیوی کی اجازت سے کیا ہے تو ایک سو کوڑوں کا مستحق ہے ورنہ اسے رجم کیا جائے گا۔

---

[1] کتاب شرف المصطفیٰ

یہ ابوسعید کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ مصنّف کا اصل نام عبدالملک بن محمد بن ابراہیم نیشاپوری خرکوشی ابوسعید ہے وہ شافعی فقہاء میں سے تھے۔ نیشاپور میں وعظ بھی کہتے تھے۔ طلبِ علم کے لیے مشہور اسلامی مراکز عراق، مصر اور حجاز وغیرہ کا سفر کیا۔ ایک عرصہ علماء و شیوخ کی صحبت میں گزارا۔ کئی سال مکہ مکرمہ میں رہے۔ پھر نیشاپور آئے اور وہاں ۴۰۶ھ میں وفات پائی۔

ان کی مشہور تصانیف "البشارۃ والنذارۃ فی تفسیر الأحلام"، "سیر العباد والزھاد"، "دلائل النبوۃ" اور "شرف المصطفیٰ" جس کے آٹھ اجزا ہیں۔ ابن عساکر نے "تبیین کذب المفتری" (ص ۲۳۳) میں اور ابن اثیر نے اللباب (ج ۱، ص ۳۵۳) میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں لکھا ہے کہ "شرف المصطفیٰ" آٹھ جلدوں میں ہے۔ شاید یہی کتاب "شرف النبوۃ" کے نام سے بھی ہے مگر مجھے ابھی تک یہ کتاب نہیں ملی۔

کنوارے زانی اور مریض پر حد قائم کرنے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا[1] میں امام مالکؒ ابن شہاب سے، وہ عبیدہ[2] بن عتبہ بن مسعود سے، وہ حضرت ابوہریرہؓ اور زید بن خالد جہنیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی[3] اپنا جھگڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ ایک نے کہا، اے خدا کے رسول! ہمارے مابین کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کیجیے۔ دوسرے نے، جو زیادہ سمجھدار تھا، کہا۔ ہاں یا رسول اللہ! کتاب اللہ کے مطابق ہمارے درمیان فیصلہ فرمایئے اور مجھے اصل واقعہ پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ بات کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میرا بیٹا اس شخص کے ہاں ملازم تھا۔ اُس نے اس کی بیوی کے ساتھ زنا کیا۔

سنن نسائی[4] میں ہے کہ میرا بیٹا اس کی بیوی کا ملازم تھا اور اس نے اُس سے زنا کیا۔ اس شخص نے مجھے کہا کہ میرے بیٹے کو رجم کیا جائے گا۔ میں نے فدیہ کے طور پر سو بکریاں اور ایک لونڈی پیش کی لیکن میں نے اہل علم سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ تیرے بیٹے کو ایک سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا[5] ملے گی اور عورت کو رجم کیا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مؤطا امام مالک (ج ۲ - ص ۱۶۷) کتاب "الحدود" باب "ما جاء فی الرجم"۔

[2] نسخہ شہید علی پاشا اور نسخہ لالہ میں "عبید اللہ بن عبد اللہ بن عبد اللہ" ہے اور یہی صحیح ہے۔

[3] ان دونوں کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

[4] سنن نسائی (ج ۸، ص ۲۴۱) کتاب "آداب القضاۃ" باب "صون النساء عن مجلس الحکم" میں "عسیف" کا لفظ موجود ہے۔ لیکن نسخہ شہید علی پاشا اور نسخہ لالہ میں "کتاب النسائی" کے الفاظ موجود ہیں۔

[5] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کو سو کوڑوں اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا دی"۔ اس کے متعلق امام نووی شرح مسلم (ج ۱۱، ص ۲۰۷) میں بیان کرتے ہیں کہ "اس کا بیٹا کنوارا تھا اور اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا ورنہ محض باپ کے اقرار پر اسے سزا نہیں دی جا سکتی تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس فیصلے کی شکل اس طرح کی ہو کہ اگر تیرے بیٹے نے زنا کیا ہے اور وہ کنوارا ہے تو اسے ایک سال کی جلا وطنی اور سو کوڑوں کی سزا ملے گی۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (ج ۱۲، ص ۱۴۰) میں لکھتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ حضورؐ کا فیصلہ تھا۔ اگر اس کی حیثیت محض ایک فتویٰ کی ہوتی تو پھر کوئی اشکال پیدا نہ ہوتا۔ اس واقعہ میں اعترافِ جرم کا قرینہ یہ ہے کہ وہ باپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور باپ نے جو فعل اس کی طرف منسوب کیا اس پر اُس نے خاموشی اختیار کی اور اس کا

نے فرمایا: اما والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ اما غنمک وجاریتک فرد علیک وجلد ابنہ مائۃ وغربہ عاما وامر انیسا الاسلمی ان یاتی امرأۃ الآخر فان اعترفت رجمھا فاعترفت فرجمھا (خدا کی قسم میں تمہارے درمیان اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ سنو، تیری لونڈی اور بکریاں تجھے واپس کی جائیں گی اور تیرے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا ہوگی) آپ نے انیس اسلمی کو دوسرے شخص کی بیوی کے پاس بھیجا کہ اگر وہ اعتراف جرم کرلے تو اسے رجم کر دیا جائے چنانچہ اس کے اعتراف کی بنیاد پر اسے رجم کیا گیا۔[۲]

بعض علماء کے نزدیک حضورؐ کے ارشاد "لاقضین بینکما بکتاب اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ یہ حکم وحی تو ہے لیکن قرآن کا حصہ نہیں ہے جیسا "اَمْ عِنْدَھُمُ الْغَیْبُ فَھُمْ یَکْتُبُوْنَ"[۳] میں یکتبون، یحکمون کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی طرح یہاں کتاب اللہ کا لفظ حکم اللہ کے معنی میں ہے۔[۴]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں "عسیف" کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے خادم۔

کنوارا ہونا اس کے باپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ عمرو بن شعیب کی روایت میں صاف الفاظ ہیں کان ابنی اجیرا لامرأۃ ھذا وابنی لم یحصن" کہ میرا بیٹا اس شخص (کی بیوی) کا ملازم تھا اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

[۱] اُنیس۔ یہ مشہور صحابی اُنیس بن ضحاک اسلمی ہیں۔ ان کا شمار اہل شام میں ہوتا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ انیس بن مرثد ہیں، لیکن صحیح نام پہلا ہی ہے جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابن السکن نے کتاب الصحابہ میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے علاوہ نہ ان کا کہیں ذکر پایا ہے نہ ان کی کوئی روایت مجھے ملی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انس بن مالک ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔

[۲] مصنف (امام ابن الطلاع) نے ذکر نہیں کیا ورنہ یہ روایت مؤطا کے علاوہ صحیحین اور سنن میں بھی پائی جاتی ہے۔ صحیح بخاری کتاب الحدود باب "الاعتراف بالزنا" "فتح الباری (حدیث نمبر ۶۸۲۸) اسی طرح بخاری کتاب الحدود باب ھل یجوز للحاکم ان یبعث رجلا وحدہ للنظر فی الامور" فتح الباری میں حدیث کا نمبر (۷۱۹۴) صحیح مسلم کتاب "الحدود" باب من اعترف علی نفسہ بالزنا۔ "سنن ابو داؤد (ج ۴، ص ۱۵۳) کتاب الحدود باب فی المرأۃ التی امر النبی برجمھا من جھینۃ "جامع ترمذی (ج ۴، ص ۳۹) کتاب الحدود باب ماجاء فی الرجم علی الثیب" ابن ماجہ (ج ۲، ص ۸۵۲) کتاب الحدود باب "حد الزانی"

[۳] سورۃ قلم - ۴۷۔

[۴] ابن قتیبہؒ کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کے ارشاد "لاقضین بینکما بکتاب اللہ" کہ "میں یقیناً تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا" سے مراد قرآن حکیم نہیں ہے بلکہ آپؐ کی مراد یہ ہے کہ "میں تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کروں گا" لفظ کتاب کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک معنی حکم اور فرض بھی ہے۔ ارشاد باری ہے: کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء - ۲۴) یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر فرض ہے اور حلال کیا جاتا ہے تمہارے لیے جو کچھ اس کے علاوہ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ آیت "وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ"[1] میں لفظ عذاب مجمل ہے جس کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہوئی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ شادی شدہ زانی کے لیے سزا رجم ہے۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل فقہی فوائد مرتب ہوتے ہیں:

ا۔ ناجائز صلح کو توڑنا ضروری ہے۔

ب۔ حد نافذ کرنے کے لیے کسی کو اپنا قائم مقام بنانا جائز ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ اس کے قائل نہیں ہیں[2]۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف ثبوت قائم کرنے کے لیے قاضی کسی کو اپنا نائب بنا کر بھیج سکتا ہے۔

ج۔ حد قائم کرنے کے لیے زانی کا ایک دفعہ اقرار بھی کافی ہے۔

د۔ رجم کی سزا کے ساتھ کوڑے نہیں لگائے جائیں گے۔

ر۔ کسی معاملہ میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے کسی عالم کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے اور پھر اس کی توثیق کے

آیا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (البقرہ - ۱۷۸) قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے۔

امام نووی نے شرح مسلم (ج ۱۱، ص ۲۰۶) میں لکھا ہے کہ ممکن ہے "حکم اللہ" سے اشارہ اس آیت کریمہ کی جانب ہو "اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا (النساء - ۱۵) (یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے) آپ نے شادی شدہ زانی کے لیے لفظ سبیل کی تشریح رجم فرمائی ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ آپ کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے "اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا" ہے جس کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے لیکن حکم باقی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (ج ۱۲، ص ۱۳۸) میں لکھا ہے کہ کتاب اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ اوامر اور فرائض ہیں جن کی اطاعت بندوں پر لازم ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ جس کی طرف فوراً ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ جلاوطنی اور رجم کا حکم قرآن مجید میں نہیں ہے یہ حکم تو ہمیں اللہ کے اس حکم سے ملا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ بعض کے نزدیک ابن دقیق العید کا قول بھی محلِّ نظر ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس سے اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف ہو "اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا" اور آپ نے لفظ سبیل کی تشریح میں فرمایا ہو کہ کنوارے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہوگی اور شادی شدہ کے لیے رجم

میرے نزدیک ان تمام تاویلات کا تعلق حضورؐ کے اس ارشاد کے ساتھ ہے "لا قضین بینکما بکتاب اللہ" یہاں کتاب اللہ سے مراد قرآن متلو نہیں بلکہ اس سے مراد اللہ کا وہ حکم ہے جو اس نے اپنے نبی کے ذریعے صادر فرمایا۔

[1] سورہ نور - ۸ "وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ"

[2] پوری انسانی جان یا اس کے کسی عضو کا قصاص طلب کرنے کے لیے کسی کو نائب بنانا امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن اس روایت میں تو اقامت حد کے لیے وکالت کا ذکر پایا جاتا ہے۔

لیے اس سے بھی زیادہ بڑے عالم کی طرف۔

ھ۔ اگر ایک آدمی کسی دوسرے شخص کی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو قاضی حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے اس عورت کے پاس اپنا نمائندہ بھیج سکتا ہے۔ اگر وہ اعترافِ جرم کر لے تو اس پر حد نافذ کی جائے گی، لیکن اگر وہ انکار کر دے اور چار گواہ بھی نہ ہوں) تو الزام لگانے والے پر حدِ قذف نافذ ہوگی۔

ص۔ کسی شخص پر حکم لگانے یا اس کے عذر کو قبول کرنے کے سلسلہ میں "خبرِ واحد" پر اعتماد کرنے کی بھی اجازت ہے۔

ض۔ غیر شادی شدہ زانی مرد کو جلا وطنی کی سزا دی جائے گی، لیکن عورت اور غلام اس سے مستثنیٰ ہوں گے، کیونکہ عورت کا پردہ میں رکھنا ضروری ہے اور غلام کی حیثیت اس کے مالک کی پونجی کی ہوتی ہے۔

امام بخاری نے جلا وطنی کے لیے "تغریب" کے بجائے "نفی" کا لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں باب کا عنوان "البکران یُجلدان وینفیان" (غیر شادی شدہ زانی مرد اور عورت کو کوڑے لگائے جائیں اور ان کو جلا وطن کیا جائے گا)۔[1]

امام نسائی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا عدالت میں موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔[2]

مؤطا میں امام مالک،[3] زید بن اسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں ایک شخص

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الحدود، باب "البکرانِ یُجلدانِ و ینفیان" میں زید بن خالد جہنی سے مرفوع روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے سنا ہے کہ جس غیر شادی شدہ نے زنا کیا اسے سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا ملے گی۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۸۳۱) ابن شہاب حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایسے شخص کو جلا وطن کیا اور اس کے بعد یہی طریقہ رہا۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگرد امام محمد جلا وطنی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی دلیل حضرت علیؓ کا یہ قول ہے: "ان دونوں کو فتنہ میں ڈالنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کو ملک بدر کر دیا جائے۔" حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ربیعہ بن اُمیّہ بن خلف کو شراب نوشی کی سزا میں خیبر کی طرف جلا وطن کیا، اور وہ قیصرِ روم ہرقل سے مل گیا اور نصرانی ہو گیا۔ اس پر آپؓ نے فرمایا "آئندہ میں کسی مسلمان کو ملک بدر نہیں کروں گا۔" علاوہ ازیں کتاب اللہ میں صرف کوڑوں کا حکم ہے اور جلا وطنی کا حکم نصِ قرآنی پر اضافہ ہوگا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اضافہ نص کے حکم کو منسوخ نہیں کرتا، بلکہ وہ علیٰ حالہٖ قائم ہے اور حکم نصِ سنّت سے ثابت ہے یعنی سو کوڑے اور جلا وطنی۔

جمہور علماء کے نزدیک کوڑوں کے ساتھ ملک بدر کرنا واجب ہے۔

خلفائے راشدین کے بارے میں بھی روایت ہے کہ وہ اپنے عہد میں ان دونوں سزاؤں پر عمل کرتے رہتے۔ امام مالک، شافعی اور احمد کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ امام مالک عورت کی جلا وطنی کے خلاف ہیں کیونکہ اسے حفاظت و کفالت کی ضرورت ہوتی ہے۔

[2] کتاب "آداب القضاء" باب "صَوت المتساء"

[3] مؤطا امام مالک (ج ۲، ص ۱۶۹) کتاب "الحدود" باب "ما جاء فیمن اعترف علیٰ نفسہ بالزنا"

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ بہت سے راویوں نے اس حدیث کو مرسلاً بیان کیا ہے اور میرے علم کی حد تک کسی معتبر سند میں یہ الفاظ

نے زنا کا اعتراف کیا۔ آپؐ نے اس کے لیے کوڑا منگوایا، چنانچہ ایک ٹوٹا ہوا کوڑا پیش کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا اس سے مضبوط لاؤ۔ اس وقت بالکل ایک نیا کوڑا لایا گیا جس کی اطراف ابھی تک گھسی نہیں تھیں حضورؐ نے فرمایا۔ اس سے کم تر درجہ کا کوڑا لے کر آؤ۔ پھر ایک ایسا کوڑا لایا گیا جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ نرم تھا۔ تب اس شخص کو آپؐ کے حکم سے کوڑے لگائے گئے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[۱]: "اے لوگو! وقت آگیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی حدود سے باز رہو۔ اگر کوئی شخص اس گندگی میں ملوث ہو جائے تو وہ اپنی اس برائی کی پردہ پوشی کرے جیسا کہ اللہ نے اس کی پردہ پوشی فرمائی اور جو شخص اپنے آپ کو ہمارے سامنے ظاہر کردے گا اسے اللہ کی کتاب کے مطابق سزا دی جائے گی۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "مَنْ اَصَابَ مِن ھٰذِہ القاذوراتِ شیئاً" (جو شخص اس گندگی میں ملوث ہو جائے) میں گندگی سے مراد زنا، شراب نوشی اور اسی طرح کی دوسری برائیاں ہیں۔

کتاب ابی عبید[۲] میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ ایک ایسے شخص کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے جو مریض اور اپاہج تھا۔ وہ ایک لونڈی کے ساتھ خباثت کرتا ہوا پایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اسے کھجوروں کے ایسے گچھے سے ایک ضرب لگاؤ جس میں کئی شاخیں ہوں۔"

نہیں ہیں۔ معمر نے یحییٰ بن ابی کثیر سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مانند روایت کی ہے۔ عبدالرزاق نے "مصنف" میں اور ابن وہب نے اپنے "مؤطا" میں، حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ کریب سے اس کی مانند مرسل روایت بیان کی ہے۔

امام شافعیؒ "الأم" (۶- ۱۴۵) میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ حدیث منقطع ہے۔ یہ بذاتِ خود تو حجت نہیں ہے، لیکن ہم نے قابلِ اعتماد اہلِ علم کو یہ بات کہتے سنا اس لیے ہم بھی یہ بات کہتے ہیں۔

[۱] نسخہ للہ اور مؤطا امام مالک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں ہیں۔

[۲] اس سے مراد ابو عبید کی وہ کتاب ہے جو "غریب الحدیث" کے بارے میں ہے۔ یہ ان بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے جو احادیث کے غریب الفاظ کی شرح کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان میں چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں مجھے حدیث سعد بن عبادہ نہیں ملی۔

دار قطنی (ج ۳، ص ۹۹) نے سہل بن سعد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک لونڈی زنا سے حاملہ ہو گئی۔ اس سے پوچھا گیا کہ کس نے تمھیں حاملہ کیا؟ اس نے کہا ایک معذور شخص نے مجھے حاملہ کیا۔ اس معذور سے پوچھا گیا تو اس نے اعترافِ جرم کر لیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ تو اتنا کمزور ہے کہ کوڑوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پھر آپؐ نے اسے کھجور کے لیے گچھے سے مارنے کا حکم دیا جس میں تقریباً سو شاخیں ہوں۔ دار قطنی نے فلیح کے وہم کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اس نے غلطی سے اس روایت کی نسبت سہل بن سعد کی طرف کی ہے۔ حالانکہ اصل سند اس طرح ہے کہ ابو حازم نے ابو امامہ بن سہل بن حنیف اور انھوں نے اپنے باپ سے یہ روایت بیان کی ہے۔

امام شافعی اور بیہقی نے یہ روایت ابو امامہ سے بیان کی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ مرسل روایت ہے اور ابو امامہ سے اسی

ابن قتیبہؒ نے "شرح الحدیث" میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اجلدوھا" کہ اسے کوڑے لگاؤ۔ لوگوں

طرح روایت ہوئی۔ ایک اور سند کے مطابق ابوالزناد اور یحییٰ بن سعید نے ابوامامہ سے اور انھوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کی ہے۔ طبرانی میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ طبرانی کہتے ہیں کہ اگر اس روایت کی تمام اسناد مضبوط ہیں تو ابوامامہ نے یہ حدیث صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے بھی نقل کی ہے اور اسے مرسلاً بھی بیان کیا ہے۔" (افادات الشیخ العظیم آبادی)

لہ ابن قتیبہ دینوری

یہ ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری ہیں۔ بعض انھیں مروزی کہتے ہیں۔ ۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۶ھ میں وفات پائی۔ یہ اپنے دور کے ایک بہت بڑے مورخ، فقیہ، محدث، ادیب اور ماہر لغت تھے۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ وسیع ہے۔

امام ابن تیمیہؒ ان کے علمی مقام کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: "ان کا اہل سنت کے حلقوں میں وہی مقام ہے جو معتزلہ کے ہاں جاحظ کا ہے۔ جاحظ معتزلہ کے خطیب تھے اور ابن قتیبہ اہل سنت کے خطیب تھے۔" الفتاوی (۱۷-۳۹۱)

تراجم کی تمام کتب میں ان کا تذکرہ پایا جاتا ہے، چنانچہ داؤدی نے "طبقات المفسرین" میں، خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں، ابن جوزی نے "المنتظم" میں، قفطی نے "انباء الرواۃ" میں، امام نووی نے "تھذیب الاسماء واللغات" میں، علامہ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" اور "میزان الاعتدال" میں، حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان" اور "تھذیب التھذیب" میں، ابن قطلوبغا نے "طبقات الحنفیۃ" میں، ابوالطیب نے "مراتب النحویین" میں، زبیدی نے "طبقات النحویین" میں، سیوطی نے "بغیۃ الوعاۃ" میں، سمعانی نے "الانساب" میں، ابن اثیر نے "اللباب" میں، ابن خلکان نے "وفیات الاعیان" میں، اور ابن کثیر نے "البدایۃ والنہایۃ" میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

لیکن "شرح الحدیث" کے نام سے جس کتاب کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے وہ مجھے ان کی ان تصانیف میں، جن کا ابن ندیم نے "الفہرس" میں ذکر کیا ہے، نہیں مل سکی۔ حدیث کی تین اہم کتابوں کی آپ کی طرف نسبت کی جاتی ہے: غریب الحدیث، مشکل الحدیث اور تاویل مختلف الحدیث۔

ا۔ غریب الحدیث:

ابن ندیم نے "الفہرس" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ صاحب "کشف الظنون" کا قول ہے کہ ابن قتیبہ نے اس کتاب میں ابوعبید القاسم بن سلام کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اور اسی کا کچھ حصہ دمشق کے مکتبہ ظاہریہ میں ۴۴، ۴۵ لغۃ کے تحت موجود ہے۔

ب۔ مشکل الحدیث:

خطیب بغدادی اور سمعانی نے اس کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ابن ندیم کی "الفہرس" میں اس کا ذکر موجود نہیں ہے اور چونکہ کتاب دستیاب نہیں ہے اس لیے اس کے بارہ میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو ان کا متحمل نہیں ہوگا۔ وہ تو مر جائے گا۔

تب آپؐ نے ارشاد فرمایا "اجلدوه بالثكول والعثكال الكباسة" کہ اسے کھجوروں کا ایک مٹھا مارو۔" اہل مدینہ اس مٹھے کو عذق کہتے ہیں۔ اس کے لیے دوسرا لفظ "عرجون" ہے۔ یعنی کھجور کا وہ حصہ جس میں کھجوریں لگی ہوتی ہیں۔

ج۔ تاویل مختلف الحدیث

یہ کتاب مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ مثلاً "مختلف الحدیث"، "اختلاف تاویل الحدیث"، "کتاب المناقضة"، "کتاب الرد علی من قال بتناقض الحدیث" اور "المشتبهة من الحدیث والقرآن"۔

ابن قتیبہ کی تصانیف کا تفصیلی ذکر ان کی کتاب "المعارف" کے مقدمہ میں مجھے ملا ہے۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر ثروت عکاشہ نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ (ان کی تحقیق کے مطابق) یہ تمام نام ایک ہی کتاب کے مشہور ہو چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب المعارف (ص ۵۴) کتاب تاویل مختلف الحدیث دو دفعہ طبع ہو چکی ہے۔ ایک مرتبہ قاہرہ میں ۱۳۲۶ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۳۹۲ھ میں بیروت میں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "شرح الحدیث" سے مصنّف کی مراد ابن قتیبہ کی کتاب "غریب الحدیث" ہے۔

؎ نسخہ حرم مکی شریف میں اسی طرح ہے جو کتابت کی غلطی ہے۔ اصل میں لفظ "عثکال" ہے جیسا کہ نسخہ لالہ میں ہے یا "عثکول" ہے۔ جیسا کہ نسخہ شہید علی پاشا میں مذکور ہے:

قذفؔ، شراب نوشی اور عملِ قومِ لُوط کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے

ؔ قذف کا لفظی معنی ہے تیر مارنا اور اس کا اصطلاحی مفہوم ہے "کسی پر زنا کی تہمت لگانا"۔ سورۂ نور میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ	ایسے لوگ جو پاکدامن خواتین پر زنا کا الزام لگاتے ہیں
شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ	پھر اس پر چار گواہ نہیں لاتے، انھیں اسّی کوڑے لگاؤ
شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (سورۃ نور: ۴)	اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔

تفسیر بیضاوی (ص ۱، ۴) میں ہے "یرمون" یعنی "یقذفون بالزنا" "زنا کا الزام لگاتے ہیں" احادیث میں مذکور ہے کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا یا رسولؐ اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک، جادو، بے گناہ کا قتل، سود کھانا، یتیم کا مال کھا جانا، میدانِ جنگ سے بھاگنا، اور پاکدامن بے خبر عورتوں پر زنا کا الزام لگانا۔

بہتان لگانے والے پر حد لگانے کے بارے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اقامتِ حد کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہو) حد کا مطالبہ کرے۔ دوسری یہ کہ قاذف (تہمت لگانے والا) اپنے الزام کے لیے شہادت پیش نہ کر سکے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے (ثم لم یأتوا باربعۃ شھداء) المغنی لابن قدامہ (ج ۹، ص ۷۵) گویا اقامتِ حد کے لیے ایک شرط گواہی کا نہ ہونا یا مقذوف کا عدمِ اقرار ہے۔

اگر تہمت لگانے والا خاوند ہے تو اس وقت تیسری شرط بھی ضروری ہے کہ خاوند لعان کے لیے تیار نہ ہو۔ ابن قدامہؒ المغنی میں کہتے ہیں کہ اس بارے میں اہلِ علم کا کوئی اختلاف ہمیں معلوم نہیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اقامتِ حد کا تقاضا نفاذِ حد تک جاری رہے۔ اگر ایک شخص نے حد کا مطالبہ کیا اور بعد میں معاف کر دیا تو ایسی صورت میں حد ساقط ہو جائے گی۔ امام شافعی اور ابو ثورؒ کا یہی مسلک ہے لیکن امام حسنؒ اور ان کے ہم رائے ساتھی فرماتے ہیں کہ حدِ قذف کا حکم بھی عام حدود کی طرح ہے اور وہ بھی معاف کرنے سے ساقط نہیں ہو گی! اور جہاں تک مصنف کی اس بات کا تعلق ہے کہ قذف کے کیس کے عدالت میں پہنچنے کے بعد اس کے حکم کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں مجھے قذف کے صریح ہونے اور اس کی تمام شروط موجود ہونے کی صورت میں تو اختلاف ائمہ کی کوئی دلیل نہیں ملی ہے۔

اگر کسی شخص نے قذف میں صراحت کی بجائے تعریض سے کام لیا تو اس کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، زفر، ثوری، ابن شبرمہ اور امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ تعریض سے حدِ قذف عائد نہیں ہو گی۔ ان کی دلیل وہ حدیث اعرابی ہے جس میں ہے کہ ایک بدوی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ میری بیوی نے سیاہ فام بچہ جنا ہے۔ آپؐ نے پوچھا کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے پوچھا "ان کا رنگ کیا ہے؟" اس نے کہا "وہ سرخ ہیں" آپؐ نے فرمایا کیا ان میں کچھ (سیاہی مائل) بھی ہیں؟ اس نے کہا کچھ ایسے بھی ہیں۔ آپؐ

سنن نسائی میں ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ جب میری برأت نازل ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے اور آپ نے متعلقہ آیات کی تلاوت کی پھر آپ منبر سے اترے اور دو مردوں اور ایک عورت کو قذف کی سزا کا حکم دیا، چنانچہ ان پر حد نافذ کی گئی۔

نے پوچھا۔ "وہ کہاں سے آگئے؟" اس نے جواب دیا "شاید ان کی نسل میں کوئی ایسا ہو۔" اس پر حضور نے فرمایا۔ اس بچے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔

امام بخاری نے یہ روایت، کتاب اللعان باب "اذا عرّض بنفی الولد" (باپ اگر تعریضاً بچے کی نفی کرے) میں نقل کی ہے (فتح الباری حدیث کا نمبر ۵۳۰۵) ہے۔ صحیح مسلم (ج ۲، ص ۱۱۳۷) میں بھی روایت موجود ہے۔

امام مالک، ان کے متبعین اور امام احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ تعریض میں حد لازم ہوتی ہے۔ ان کی دلیل مؤطا امام مالک کتاب الحدود باب "ماجاء فی القذف والنفی" کی حدیث ہے جس میں عمرۃ بنت عبدالرحمٰن کہتی ہیں کہ دو آدمی حضرت عمرؓ کی خدمت میں آئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دی تھیں۔ ایک نے کہا، خدا کی قسم! میرا باپ زانی ہے نہ میری والدہ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ اس شخص نے اپنے والدین کی تعریف کی ہے یا توہین۔ تو ایک نے کہا کہ اس نے تعریف کی ہے لیکن دوسروں نے کہا کہ تعریف کا اسلوب دوسرا ہوتا ہے۔ میری رائے میں یہ شخص حد قذف کا مستحق ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے اسی کوڑے لگوائے۔

۱؎ یہ روایت مجھے سنن صغریٰ میں کہیں نہیں ملی۔ شاید "سنن کبریٰ" میں ہو۔ یہ روایت دوسری کتب احادیث مثلاً ابوداؤد (ج ۴، ص ۱۶۲) "کتاب الحدود" باب "فی حد القذف" میں مذکور ہے۔ اس روایت کی سند میں محمد بن اسحاق راوی ہے جو محدثین کے ہاں مدلس شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ جامع ترمذی (ج ۵۔ ص ۳۳۲) "تفسیر سورۂ نور"۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ابن ماجہ (ج ۲، ص ۸۵۷) کتاب "الحدود" باب "حد القذف"

۲؎ اس سے مراد واقعۂ افک ہے جو غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر پیش آیا۔ وہ قصہ اختصار کے ساتھ یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مہم سے واپس تشریف لا رہے تھے اور مدینہ منورہ کے قریب پہنچ چکے تھے کہ ستانے کی غرض سے آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ پھر طلوع فجر سے پہلے ہی قافلہ کی روانگی کا اعلان فرما دیا۔

اس وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ رفع حاجت کی غرض سے قافلے سے دور کچھ فاصلہ پر گئی تھیں۔ آپ واپس آئیں تو گلے کا ہار گم پایا۔ آپؓ اس کی تلاش میں نکلیں جس میں کافی وقت لگ گیا۔

اسی دوران کجاوا اٹھانے والے آئے اور اسے اونٹ پر رکھ کر چل دیے۔ انھیں اندازہ نہ ہوا کہ ام المومنین کجاوے میں موجود ہیں یا نہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس وقت عورتیں نہایت ہلکی پھلکی ہوتی تھیں اور کم غذا استعمال کیا کرتی تھیں۔ اس لیے کجاوا اٹھانے والوں کو اندازہ نہ ہو سکا کہ کجاوہ خالی ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتی ہیں کہ میں نے یہ سوچ کر اسی جگہ ٹھہرنا پسند کیا کہ جب انھیں میری عدم موجودگی کا علم ہوگا تو وہ ضرور پلٹیں گے۔ اس کے بعد مجھے نیند آگئی۔ اور میں سو گئی۔

صحیح بخاری[1] میں حضرت عروہؓ سے روایت ہے کہ اہلِ افک میں حضرت حسان بن ثابت[2]، مسطح بن اثاثہ[3]، حمنہ بنت جحش[4] اور

حضرت صفوان بن معطل سلمی لشکر کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ قریب پہنچتے ہی انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ کیونکہ وہ پردہ کے حکم سے پہلے مجھے دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے بلند آواز سے "انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" پڑھا جس سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنے چہرے پر پردہ ڈال لیا۔ صفوان نے اپنا اونٹ بٹھایا جس پر میں سوار ہوگئی اور وہ خود پیدل مہار پکڑ کر چلنے لگے۔ اس پورے عرصہ میں انھوں نے مجھ سے کوئی گفتگو نہیں کی اور نہ ہی میں نے ان سے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" کے علاوہ کوئی کلمہ سنا، یہاں تک کہ ہم لشکر سے آملے۔

یہ اس افسوسناک واقعہ کا خلاصہ ہے اور افک کا اصل سرغنہ عبداللہ بن ابی سلول تھا۔ بعد میں مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش بھی اس میں شامل ہوگئے۔

اس عرصہ میں حضرت عائشہؓ کی حالت ایسی تھی جیسے وہ انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے ان کی برأت میں یہ آیت نازل فرمائی (اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔ النور-۱۱) یعنی جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں تمھارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے لیے خیر ہی ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا۔ اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا۔ اس کے لیے تو بہت بڑا عذاب ہے۔

[1] صحیح بخاری میں یہ روایت کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ (وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ۔ النور-۱۶) میں ہے۔ (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۴۷۵۰ ہے۔) اسی طرح یہ واقعہ کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ (اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ) میں مذکور ہے۔

[2] حسانؓ بن ثابت: مشہور صحابی رسول ہیں جو آپ کی مدح اور مدافعت میں شعر کہا کرتے تھے۔ آپؐ ہی کے بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ جب تک حسان، کفار کے مقابلہ میں دفاع کرتا رہے گا، روح القدس اس کی تائید کرتے رہیں گے۔

[3] مسطح بن اثاثہؓ: یہ مسطح بن اثاثہ بن عباد بن المطلب ہیں۔ مسطح کا معنی ہے خیمہ کی لکڑی۔ ان کا اصل نام عوف ہے اور وہ اور ان کی والدہ محترمہ اولین مہاجرین میں سے ہیں۔ چھوٹے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس پورے عرصہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی کفالت کی۔ کیونکہ ان کی والدہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قریبی رشتہ دار تھیں۔ وہ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ شریک ہوئے۔ ۳۴ھ یا ۳۷ھ میں فوت ہوئے۔

[4] حمنہؓ بنت جحش: یہ ام المومنین حضرت زینبؓ کی بہن ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی بیوی تھیں۔ وہ جنگ احد میں شہید ہوگئے تو ان کی شادی طلحہ بن عبیداللہ سے ہوئی۔

یہ ان عورتوں میں سے ہیں جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ جنگ احد میں شریک ہوئیں۔ انھوں نے پیاسوں کو پانی پلایا اور زخمیوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کی۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت زینبؓ کا مقام حضرت عائشہؓ سے بلند ہو۔ اس لیے وہ بھی واقعۂ افک میں سرگرمی سے شامل ہوگئیں۔ ان پر حد قذف نافذ کی گئی۔

کچھ اور اشخاص شامل تھے جن کا مجھے علم نہیں ہے، تاہم قرآن حکیم کے مطابق وہ ایک گروہ (عصبۃ) تھا۔ اور "وَالَّذِی تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" سے مراد عبداللہ بن ابی بن سلول ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت نہیں کہ آپ نے عمل قوم لوط کے جرم میں کسی کو رجم کیا ہو، البتہ آپ کا یہ ارشاد ثابت ہے "اقتلوا الفاعل والمفعول بہ" (کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو) یہ روایت حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔

عبداللہ بن ابی بن سلول۔ اس کا تعلق قبیلہ بنی عوف بن خزرج سے تھا۔ اور یہ شخص منافقین مدینہ کا سردار تھا۔ اور یہی شخص ہے جس نے غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر یہ کہا تھا (لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ - المنافقون-۸) یعنی جب ہم واپس مدینہ منورہ پہنچیں گے تو ہم میں سے عزت والے لوگ ذلیل لوگوں کو نکال دیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم کی سورہ "المنافقون" کا شانِ نزول اس کی یہی بات ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے پہلے اسے تاج پہنانے اور بادشاہ بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، لیکن پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ میں آنے کی صورت پیدا فرمائی، تو اس کی قوم کے لوگ اسے چھوڑ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ مجبوراً منافقانہ طور پر مسلمان ہو گیا۔ لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

غزوۂ تبوک سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد ۹ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ کتب احادیث میں اس پر حد لگانے کا کوئی ذکر نہیں ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں تفصیل کی روایت مذکور ہے کہ جن لوگوں پر حد نافذ کی گئی ان میں مسطح، حمنہ بنت جحش اور حسان بن ثابت شامل ہیں، البتہ طبرانی میں ابوالیسر کی ایک روایت موجود ہے کہ آپ نے عبداللہ بن ابی بن سلول کو بلایا اور اس پر دو حدیں نافذ کیں، یہ روایت اسماعیل بن یحییٰ سے مروی ہے جسے محدثین کذّاب کہتے ہیں۔ (مجمع الزوائد: ج ۶، ص ۲۶۱)

لہ سنن ابی داؤد (ج ۴، ص ۱۵۸) کتاب الحدود باب "فیمن عَمِلَ عَمَلَ قومِ لوط" میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: من وجدتموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ" (کسی کو عملِ قوم لوط کرتا ہوا پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو) اسی طرح جامع ترمذی (ج ۴، ص ۵۷) کتاب الحدود باب "ما جاء فی حد اللوطی" میں بھی حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت موجود ہے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت جابرؓ اور ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے لیکن ہمارے ہاں یہ ابن عباس کی روایت سے معروف ہے۔ یہی روایت محمد بن اسحاق نے عمرو بن ابی عمرو سے نقل کی ہے کہ جس نے عملِ قوم لوط کیا وہ ملعون ہے۔ اس کے قتل کا ذکر نہیں ہے، البتہ اس میں یہ بھی ہے کہ وہ شخص بھی ملعون ہے جس نے کسی جانور سے بدفعلی کی۔ محمد بن اسحاق نے یہ روایت عاصم بن عمر سے، اس نے سہیل بن ابی صالح سے، اس نے اپنے باپ سے، اس نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اقتلوا الفاعل والمفعول بہ" کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو۔" لیکن اس روایت کی سند میں کلام ہے۔ عاصم بن عمر کے سوا کسی اور راوی نے یہ روایت نہیں کی جب کہ اس شخص کا حافظہ کمزور تھا اور اس بنا پر اس کی روایات کو ضعیف سمجھا جاتا ہے۔

ہماری تحقیق کے مطابق حاکم نے یہ حدیث اپنی "مستدرک" (ج ۴، ص ۳۵۵) میں عبدالرحمٰن بن عبداللہ کی سند سے روایت کی ہے۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ساقط الاعتبار ہے۔

تاہم حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ اضافہ بھی پایا جاتا ہے "أحصنا أم لم يحصنا" کہ چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور پھر آپؓ نے تمام صحابہ کرام سے مشورہ کے بعد، جن میں حضرت علیؓ ابن ابی طالب پیش پیش تھے، حضرت خالدؓ بن ولید کو بھی یہی حکم لکھ کر بھیجا کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کرا دو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ان کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ انھیں رجم کروانے کے بعد جلایا۔ ابن قصّار کہتے ہیں کہ تمام صحابہ کرامؓ نے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت

لہ حضرت ابی ہریرہؓ کی حدیث میں ایک راوی عاصم ہے جو متروک ہے۔ دیکھیے التلخیص الحبیر (ج ۴، ص ۵۵)، ابن ماجہ (ج ۲، ص ۸۵۶) کتاب الحدود باب "من عمل عمل قوم لوط" میں اسی سند کے ساتھ یہ حدیث مذکور ہے۔ اس میں یہ اضافہ پایا جاتا ہے "ارجموا الاعلیٰ والاسفل ارجموھما جمیعاً" اوپر اور نیچے والے یعنی فاعل اور مفعول دونوں کو رجم کرو)۔

لہ امام بیہقیؒ نے سنن کبریٰ (ج ۸، ص ۲۳۲) میں یہ روایت تفصیل سے بیان کی ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو لکھا کہ مجھے عرب کے ایک علاقے میں ایک ایسا شخص ملا ہے جو عورتوں کی طرح وطی کراتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیا۔ ان میں حضرت علیؓ کی رائے دوسروں کی نسبت سخت تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ ایسے شخص کو آگ میں جلایا جائے۔ یہ ایسا گھناؤنا فعل ہے کہ اس کا ارتکاب صرف ایک امت نے کیا تھا جس کے ساتھ اللہ نے وہ معاملہ کیا ہے جو تمھیں معلوم ہے۔ دوسرے صحابہ نے آپ کی تائید کی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے لکھ بھیجا کہ اسے جلا دیا جائے۔

حافظ ابن حجرؒ نے الدرایۃ (ج ۲، ص ۱۰۳) میں اس روایت کو انتہائی ضعیف کہا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر ایسا فیصلہ ہو چکا ہوتا تو اسے ایک قطعی دلیل ہونا چاہیے تھا جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ امام بیہقی کے نزدیک یہ روایت مرسل ہے۔ علاوہ ازیں حضرت جعفر بن محمد اپنے والد کے حوالے سے ایک اور قصہ کے ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ اسے رجم بھی کیا جائے اور آگ میں بھی جلایا جائے۔ اور ابولیلیٰ ہمدان کے ایک آدمی کے حوالے سے یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شادی شدہ شخص کو عمل قوم لوط کرنے پر رجم کیا۔ امام ثوریؒ نے بھی اسے روایت کیا ہے جس میں شادی شدہ کی قید موجود ہے۔ ہشیم نے اسے ابولیلیٰ سے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں ایک راوی مجہول ہے۔

میرے نزدیک سزائے لواطت میں علماء کے اختلاف کی وجہ صحابہ کرام کا اس سلسلے میں ایک رائے پر متفق نہ ہونا ہے البتہ علماء کے اقوال اور دلائل کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

لہ حضرت ابن عباسؓ کی یہ رائے اس بنیاد پر ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کو حق نہیں کہ وہ آگ میں جلانے کا عذاب دے۔ علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت علیؓ آگ میں جلانے کو ایک سزا سمجھتے تھے اور اس پر مسلسل عمل ہوتا رہا ہے۔ مثلاً حضرت ابن زبیرؓ نے اپنے عہد حکومت میں، اسی طرح ہشام بن عبدالملک نے اور خالد قسری نے عراق میں اس سزا پر عمل کیا۔ احکام القرآن لابن عربی (ج ۳، ص ۷۴۳)

لہ ابن قصّار: یہ ابوالحسن علی بن احمد البغدادی ہیں جو علم اصول اور فقہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ایک مدت تک بغداد میں قاضی کے عہدے پر متمکن رہے۔ اختلافی مسائل کے سلسلے میں ان کی ایک کتاب ہے۔ علامہ ابن فرحون کا قول ہے کہ

ابوبکر صدیقؓ سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ انھیں کسی اونچی جگہ سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے اور حضرت علیؓ نے اس پر دیوار گرا کر ہلاک کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

میری دانست کے مطابق مالکی علماء کے ہاں اختلافی مسائل میں اس سے عظیم کوئی کتاب نہیں پائی جاتی۔ آپ ۲۹۵ھ میں فوت ہوئے۔ ابن فرحون نے "دیباج" (ص ۱۹۹) میں اور خطیب بغدادی نے ایضاح المکنون (ج ۲، ص ۲۴۳) میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

لہ متن کتاب میں موجود روایت کا ناقل معلوم نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ اور امام بیہقیؒ نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ "گاؤں میں کوئی بلند عمارت تلاش کرکے اس پر سے گرایا جائے اور اس کے بعد اس پر پتھروں کی بارش کی جائے۔"

تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لواطت نہایت مکروہ فعل ہے۔ کتاب اللہ میں اس کی شناعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے: وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ (الاعراف-۸۰) (اور یاد کرو جب لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم وہ فحش کام کرتے ہو جو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا) ابن عربی نے احکام القرآن میں بیان کیا ہے کہ عمل قوم لوط زنا کے حکم میں ہے۔ اس پر حد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو فاحشۃ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اہل لغت کے نزدیک فاحشۃ کا معنی زنا ہے، چنانچہ جوہری نے الصحاح میں بھی اس کا یہی مفہوم لکھا ہے۔ اسی طرح تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ آیت وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ (النساء-۱۵) میں فاحشۃ سے مراد زنا ہے۔

عمل قوم لوط کرنے والے کی سزا ..... اور .. فقہاء کی آراء

فقہاء میں لواطت کی سزا کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ (مشہور قول کے مطابق) امام ابو یوسف اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ فاعل پر حد زنا لگائی جائے گی۔ اگر وہ شادی شدہ ہے تو اسے رجم کیا جائے گا ورنہ سو کوڑے لگائے جائیں گے، البتہ مفعول کے بارے میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اسے سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا ملے گی چاہے وہ مرد ہو یا عورت اور کنوارا ہو یا شادی شدہ۔ ان کی دلیل ابو موسیٰ اشعریؓ کی وہ روایت ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ جب ایک شخص دوسرے کے ساتھ غیر فطری فعل کا ارتکاب کرے تو وہ دونوں زانی ہوں گے۔ علاوہ ازیں لواطت پر زنا کی تعریف صادق آتی ہے کہ ایک آدمی کا اپنی شرمگاہ کو کسی ایسے فرج میں داخل کرتا ہے جس میں ملکیت اور شبہ ملکیت نہ ہو۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی شرمگاہ کو کسی عورت کی شرمگاہ میں داخل کرے۔ لہٰذا ایسی صورت میں یہ فعل خود بخود اس آیت کے حکم میں آجاتا ہے جس میں زنا کی حد بیان ہوئی ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ لوطی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اسے رجم کیا جائے گا۔

امام شافعیؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے جیسا کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ قتل کی کونسی شکل ہوگی، اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان پر دیوار گرا کر اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ کسی اونچی جگہ سے انھیں گرا کر ہلاک کیا جائے گا جیسا کہ قوم لوط کے معاملہ میں ہوا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک لواطت میں حد نہیں تعزیر ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسے عمر قید کی سزا دی جائے گی یہاں تک کہ وہ مر جائے یا توبہ کر لے، البتہ اگر وہ اس جرم کا عادی ہو چکا ہے تو اسے حد کے طور پر نہیں بلکہ مصلحت کے تحت قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔

حضرت علیؓ نے ان دونوں پر دیوار گروا کر انھیں ہلاک کروا دیا۔[۲]

مشہور کتابوں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مرتد یا زندیق[۳] کو قتل کروایا ہو۔

جہاں تک حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت کا تعلق ہے وہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ثابت نہیں کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمٰن راوی پایا جاتا ہے جسے ابو حاتم نے کذاب کہا ہے اور امام بیہقی کے نزدیک وہ مجہول ہے۔ انھوں (بیہقی) نے اپنی اس رائے کا اظہار "السنن الکبریٰ" میں کیا ہے۔

لواطت کی سزا کے متعلق امام احمد بن حنبل کی تین آراء ہیں۔ پہلی یہ کہ لواطت بھی زنا کی طرح ہے جیسا کہ امام شافعی کا زیادہ مشہور قول بھی یہی ہے۔ امام احمد کی دوسری رائے یہ ہے کہ فاعل کو رجم کیا جائے گا لیکن مفعول کو کوڑے مارنے اور جلا وطن کرنے کی سزا دی جائے گی۔ خواہ وہ (مفعول) مرد ہو یا عورت، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ شادی شدہ کو اس لیے سزا دی جائے گی کہ شادی تبل سے طلی کے لیے ہوتی ہے۔ دُبر سے وطی شادی کے منشا کو پورا نہیں کرتی۔ امام احمد کا تیسرا قول یہ ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ پھر طریقۂ قتل کے بارے میں بھی ان کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ انھیں رجم کیا جائے گا اور دوسرا یہ کہ انھیں تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ آخری قول زیادہ مشہور ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔

دیکھیے شرح فتح القدیر (ج ۴، ص ۱۵۰)، بدائع الصنائع (ج ۷، ص ۳۴)، المغنی (ج ۹، ص ۳۱)، مواہب الجلیل (ج ۶، ص ۲۹۶)، المجموع (ج ۱۸، ص ۲۶۲)

[۲] مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ روایت کس نے بیان کی ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر بھی اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار فرماتے ہیں۔ دیکھیے "الدرایۃ" (ج ۲، ص ۱۰۳)

[۳] بعض ضعیف احادیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی عورت کو قتل کرنے کا حکم دیا جو اسلام سے مرتد ہو گئی تھی۔ دارقطنی (ج ۳، ص ۱۱۸) میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جنگِ اُحد میں ایک عورت مرتد ہو گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی محمد بن عبدالملک ہے جس کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ احادیث وضع کرتا ہے۔

حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ ایک عورت جسے امّ قروان کہا جاتا تھا، مرتد ہو گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جائے۔ اگر وہ اپنے ارتداد سے رجوع کر کے اسلام قبول کر لے تو ٹھیک، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔

حافظ زیلعیؒ نے "نصب الرایۃ" (ج ۳، ص ۴۵۹) میں بیان کیا ہے کہ اس روایت میں مُعمّر بن بکار نامی راوی پایا جاتا ہے جس کے بارے میں عقیلی کی رائے یہ ہے کہ وہ وہم کا شکار ہے۔ حضرت جابرؓ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں: "ایک عورت اسلام سے پھر گئی۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ اس کے سامنے اسلام پیش کریں اور ساتھ فرمایا، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔" چنانچہ اس کے سامنے اسلام پیش کیا گیا۔ جسے قبول کرنے سے اس نے انکار کر دیا اور اس انکار کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد ثابت ہے "من غیر دینه فاقتلوہ"[1] (جو اپنے دین (یعنی اسلام) کو بدل دے اسے قتل کر دو) چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک عورت اُم قرفہ کو اس کے ارتداد کی بنا پر قتل کروا دیا۔

حافظ زیلعیؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبداللہ اُذینہ ہے جسے ابن حبان نے مجروح قرار دیا ہے۔ امام دارقطنی نے "المؤتلف والمختلف" میں لکھا ہے کہ یہ روایت ابن عدی نے الکامل میں نقل کی ہے لیکن یہ متروک ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عطارد اُذینہ "منکر الحدیث" ہے تاہم متقدمین سے اس کے بارے میں کچھ منقول نہیں ہے۔ امام بیہقی نے بھی "سنن کبریٰ" (ج ۸، ص ۲۰۳) میں یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں بعض مجہول راوی پائے جاتے ہیں۔ یہی روایت منکدر سے ایک اور سند سے بھی منقول ہے۔ یہ تمام احادیث ایک دوسری کی تائید کرتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

[1] امام مالکؒ نے مؤطا (ج ۲، ص ۱۱۶) کتاب الاقضیہ باب "القضاء فیمن ارتد عن الاسلام" میں حضرت زید بن اسلم سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من غیر دینه فاضربوا عنقه (جس نے اپنا دین بدلا اس کا سر قلم کر دو) صحیح بخاری کتاب "الجہاد" باب "لا یعذب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۰۱۷) میں متصل سند کے ساتھ روایت ہے کہ ایوب عکرمہ سے اور وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے کچھ لوگوں کو آگ میں جلایا۔ جب حضرت ابن عباسؓ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو انھیں ہرگز جلانے نہ دیتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا تعذبوا بعذاب اللہ" (کہ وہ عذاب نہ دو جو صرف اللہ ہی دے سکتا ہے) بلکہ میں انھیں قتل کرتا جیسا کہ نبیؐ نے فرمایا ہے "مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ" (جس نے اپنا دین بدلا اس کو قتل کر دو) ابوداؤد (ج ۴، ص ۱۲۶) کتاب "الحدود" باب "الحکم فیمن ارتد" میں (ویح اُم ابن عباس) کے کلمات کا اضافہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کے اعتراض کو پسند نہیں کیا، لیکن یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اظہار تحسین کے لیے یہ کلمہ کہا ہو کہ ابن عباسؓ نے مجھے وہ بات یاد دلائی جسے میں بھول چکا تھا۔ اس تاویل کی بنیاد یہ ہے کہ لفظ "ویح" بیک وقت مدح اور تعجب دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "النہایۃ" (ج ۵، ص ۳۵) میں ہے۔ اس تاویل کی تائید ترمذی کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ کتاب الحدود باب "حکم المرتد" میں ہے "صدق ابن عباسؓ" یعنی حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ابن عباسؓ نے درست کہا۔ سنن نسائی (ج ۷، ص ۱۰۳) کتاب "تحریم الدم" باب "الحکم فی المرتد" میں یہ روایت ہے لیکن اس میں حضرت علیؓ کا یہ قول نہیں ہے۔ ابن ماجہ (ج ۲، ص ۸۴۸) کتاب الحدود باب "المرتد عن دینه" میں بھی یہ روایت ہے۔

مرتد وہ شخص ہے جو پہلے مسلمان ہو پھر اسلام کو ترک کر دے۔ پس ارتداد کا اطلاق صرف اس مسلمان پر ہوتا ہے جو اسلام کو چھوڑ دے۔ شریعت اسلامیہ میں مرتد کی دو سزائیں ہیں۔ ایک ہے اصل سزا اور وہ ہے قتل اور دوسری اس سے کم ہے اور وہ ہے اس کی جائداد کی ضبطی۔ سورہ بقرہ (آیت: ۲۱۷) میں ہے:

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ — جو شخص دین سے پھرا اور کفر کی حالت میں مر گیا۔ دنیا اور

صحیح بخاری میں عقبہ بن حارث سے روایت ہے کہ نُعیمان یا ابن نُعیمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، اس وقت وہ نشہ کی حالت میں تھا۔ حضورؐ کو اس سے تکلیف ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ گھر میں موجود لوگ اسے کھجور کی ٹہنیوں اور جوتوں سے ماریں۔ عقبہؓ کہتے ہیں کہ میں مارنے والوں میں شامل تھا۔

فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ | آخرت میں اس کے اعمال ضائع ہو گئے۔ یہی دوزخی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

قتل کی سزا کے سلسلے میں اصل بنیادی یہی آیت ہے اور اس کی تائید مذکورہ بالا احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

بے شک ارتداد اسلام میں ناقابلِ معافی جرم ہے جس پر سخت ترین سزا دی جاتی ہے۔ اس سے مقصود اسلامی معاشرے کو مجرموں سے پاک کرنا اور دین کی عظمت کو قائم رکھنا ہے تاکہ لوگ دین کو کھلونا نہ بنائیں۔

مرتد کی جائداد کی ضبطی کے متعلق فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی مشہور رائے یہ ہے کہ مرتد کی پوری جائداد ضبط کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس کا وہ تمام مال ضبط کر لیا جائے گا جو اس نے ارتداد کے بعد کمایا۔ رہا اس کا پہلا مال تو وہ اس کے مسلمان ورثا میں حسب حصہ تقسیم کیا جائے گا۔ بعض حنبلی علماء کی بھی یہی رائے ہے۔ ایک غیر مشہور روایت میں امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ جو مال ارتداد کے بعد اس نے کمایا اسے ضبط نہیں کیا جائے گا۔ دیکھیے المغنی (ج ۸، ص ۵۴۵)

لہ صحیح بخاری کتاب "الحدود" باب "من امر بضرب الحد فی البیت" میں یہ روایت مذکور ہے (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۶۷۷۴ ہے)

لہ راوی کو شک ہے کہ نام نعیمان ہے یا ابن نُعیمان، لیکن اسماعیلی کی روایت میں ہے کہ "میں نعیمان کو لایا"۔ اس روایت میں نام میں کوئی شک نہیں۔ نعیمان کا شجرۂ نسب یہ ہے: ابن عمرو بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم بن مالک بن نجار۔ یہ بدری صحابی ہیں۔ ان کی طبیعت میں مزاح تھا۔ بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مزاحیہ باتیں سن کر مسکرا پڑتے۔

ابن اثیر نے "اُسد الغابۃ" (ج ۵، ص ۳۶) میں ان سے منسوب بعض ہنسانے والی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ نسخہ حلبی اور حلبیہ میں "نعمان أو ابن نعمان" ہے جو تصحیف ہے۔ اختلاف کی نوعیت دراصل یہ ہے کہ یہ لفظ نعمان ہے یا نعیمان جیسا کہ اس کا ذکر کشمیہنی نے "الحدود" میں کیا ہے۔ باقی رہ گئیں وہ روایات جن میں اختلاف یہ ہے کہ وہ بیٹا تھا یا باپ تو ان سب میں "نعیمان" (تصغیر کا صیغہ) ہی ہے یعنی "جیئ بالنعیمان أو بابن النعیمان" "جیئ بالنعمان أو ابن النعمان" کہیں نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرابی کو کھجور کی ٹہنیوں اور جوتوں سے مارنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابی کو چالیس کوڑے لگوائے۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں جب کسی ایسے شخص کو ہمارے پاس لایا جاتا جس نے شراب پی لی ہوتی تو ہم اٹھ کر گھونسوں اور جوتوں سے اس کی پٹائی کرتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا آخری زمانہ آیا تو انھوں نے شرابی کو چالیس کوڑے لگوائے لیکن جب شراب نوشی اور قانون شکنی میں اضافہ ہونے لگا تو آپ نے اسی کوڑوں کا سلسلہ شروع کیا۔

سلہ صحیح بخاری: کتاب الحدود باب ما جاء فی ضرب شارب الخمر (فتح الباری حدیث نمبر ۳، ۶۷)

سلہ سائب بن یزید بن سعید بن ثمامہ بن اسود کندی۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اسدی یا لیثی یا الہزلی تھے۔ امام زُہری کے مطابق ان کا تعلق قبیلہ ازد سے تھا۔ وہ لوگوں میں ابن اخت النمر کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ اور ان کے والد صحابی تھے۔ ۲ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد کے ہمراہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں حج بیت اللہ کیا۔ اس وقت ان کی عمر سات سال کی تھی۔ انھوں نے حضور سے احادیث سنیں اور آپ سے اور دوسرے صحابہ سے احادیث روایت کیں۔ واقدی کے مطابق ۹۱ھ میں اور بعض دوسرے مؤرخین کے نزدیک ۸۰ھ میں فوت ہوئے۔ دیکھیے اسد الغابہ (ج ۲، ص ۲۷۵) تہذیب التہذیب (ج ۳، ص ۴۵۰)

اس کتاب کے مقدمہ میں میں نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے انھیں مدینہ منورہ کا قاضی مقرر کیا۔

سلہ شرابی کی حد: حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری ج ۱۲، ص ۶۹) میں لکھتے ہیں کہ عبدالرزاق نے عظیم تابعی عبید بن عمیر سے صحیح سند کے ساتھ حضرت سائب کی طرح کی مرسل روایت نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ شروع میں حضرت عمر فاروقؓ شرابی کو چالیس کوڑوں کی سزا دیتے تھے۔ جب لوگ شراب نوشی سے باز نہ آئے تو آپ ساٹھ کوڑے لگوانے لگے۔ جب آپؓ نے دیکھا کہ لوگ اس سے بھی باز نہیں آرہے تو آپ نے اسی کوڑے لگانے شروع کیے۔ اور فرمایا کہ یہ پوری حد ہے۔ ——— اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اس رائے سے متفق تھے کہ اسی کوڑے پوری حد ہے اور حدود سے مراد زنا، قذف اور چوری کی حدود ہیں۔ جن کا ذکر کتاب اللہ میں موجود ہے اور ان حدود میں سے قذف کی سزا سب سے ہلکی ہے اور اس میں کوڑوں کی تعداد سب سے کم یعنی اسی ہے۔

مؤطا (ج ۲، ص ۱۰۸) میں امام مالک۔ ثور بن یزید الدیلی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے شرابی کی سزا کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اسے اسی کوڑے لگانا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ شراب کا جب نشہ چڑھتا ہے تو شرابی فحش گوئی کرتا اور دوسروں پر بہتان باندھتا ہے۔ (جس کی سزا اسی کوڑے ہے) چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اسی کوڑے لگائے۔

صحیح البخاری کتاب الحدود[1] میں اسی طرح مذکور ہے۔ صحیح بخاری "مناقب عثمانؓ بن عفان" میں ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ کو بلایا اور ان کے مشورے سے ولید بن عقبہ کو اسی کوڑے لگوائے۔

---

[1] صحیح بخاری باب الضرب بالجرید والنعال (فتح الباری حدیث نمبر ۶۷۷۹)

[2] صحیح بخاری باب "مناقب عثمان بن عفان" (فتح الباری حدیث نمبر ۳۶۹۶) یہ روایت احمد بن شبیب نے اپنے باپ سے اور اس نے یونس سے بیان کی ہے۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (ج ۷، ص ۵۷) میں لکھتے ہیں کہ معمر سے ایک روایت ہے کہ حضرت عثمان نے ولید کو چالیس کوڑے لگوائے۔ اس کے ساتھ ہی حافظ کہتے ہیں کہ یہ روایت یونس کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ یونس کی روایت میں ابن ابی شبیب کو وہم ہوا ہے۔ اس کے بعد معمر کی مانند روایت مسلم میں یہی مضمون مذکور ہے۔ (ج ۳، ص ۱۳۳۱) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ معمر کی روایت کی ترجیح کا سبب وہ روایت ہے جو صحیح مسلم میں کتاب الحدود باب "حد الخمر" میں ابوساسان کی سند کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

مسلم کی روایت میں کچھ اضافہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ولید نے صبح کی دو رکعت نماز پڑھائی پھر کہا کہ مزید پڑھاؤں۔ پھر دو آدمیوں نے اس کے خلاف گواہی دی جن میں سے ایک حضرت عثمان کا غلام حمران تھا۔ حافظ عسقلانی کہتے ہیں کہ دوسرے کا نام مذکور نہیں ہے۔ بعض نے اس کا نام صعب بن جثامہ بتایا ہے جو مشہور صحابی رسول ہیں۔ یعقوب نے اپنی تاریخ میں یہ روایت بیان کی ہے۔ طبری کے نزدیک دوسرے گواہ کا نام جثامہ بن صعب بن جثامہ تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق وہ اشخاص جنھوں نے گواہی دی ان کے نام ابوزینب بن عوف اسدی اور ابومورع اسدی تھے۔ ایسی ہی روایت عمر بن شبہ نے "اخبار المدینۃ" میں نقل کی ہے کہ جب حضرت عثمانؓ بن عفان کو ولید کے واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے حضرت علیؓ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ اسے بلایا جائے اور گواہ اس کی موجودگی میں گواہی دیں تو میں اس پر حد لگاؤں گا، چنانچہ ولید کو لایا گیا اور ابوزینب، ابومورع، جندب بن زہیر ازدی اور سعد بن مالک اشعری نے گواہی دی۔ باقی حدیث ابوساسان کی روایت کی مانند ہے۔

ولید بن عقبہ بن ابی معیط ابو وہب اموی قرشی ہے۔ یہ قریش کے نوجوان شعراء اور شہسواروں میں سے تھے۔ ماں کی جانب سے حضرت عثمانؓ کے بھائی تھے۔ فتح مکہ کے وقت مشرف بہ اسلام ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق سے صدقات کی وصولی کے لیے انھیں عامل مقرر کیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے انھیں بنو تغلب کے صدقات کی وصولی پر مقرر کیا اور حضرت عثمان نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بعد انھیں کوفہ کا گورنر بنایا (الاصابۃ ۳: ۶۳۷) تاریخ المسعودی (۱/ ۲۷۵:

حدیث عثمان بن عفان میں ہی ایک دوسری روایت کے مطابق آیا ہے کہ جب ان کے پاس حمران اور ایک دوسرے شخص نے ولید بن عقبہ کے بارے میں گواہی دی۔ حمران نے کہا کہ میں نے ولید بن عقبہ کو شراب پیتے دیکھا ہے۔ دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے شراب کی قے کی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ اس نے شراب پی ہے تبھی تو اس نے شراب کی قے کی ہے۔ آپؓ نے حضرت علیؓ سے کہا اے علیؓ اٹھو اسے کوڑے لگاؤ۔ حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے کوڑے لگانے کو کہا جس سے انھوں نے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ جو اس کے نفع کا مالک ہے وہی اس کے نقصان کا مالک ہو سکتا ہے۔" حضرت علیؓ اس جواب سے خفا ہوئے۔ پھر آپؓ نے عبداللہ بن جعفرؓ سے کوڑے لگانے کے لیے کہا، چنانچہ وہ کوڑے لگاتے رہے اور آپ گنتے گئے۔ یہاں تک کہ چالیس کی گنتی مکمل ہو گئی تو آپ نے حضرت عبداللہؓ کو کہا کہ رک جاؤ۔ اس وقت آپؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے چالیس کوڑے لگوائے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اسی پر عمل کیا اور عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں اسی کوڑوں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سب سنت کے مطابق ہے لیکن میں چالیس کوڑوں کی سزا ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ مصنف عبدالرزاقؒ میں ہے کہ حضورؐ نے شرابی کو اسی کوڑے لگائے۔

الطبری (۵، ۴۷، ۲۸۴)

لے حمران: پورا نام حمران ابن ابان ہے جو حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ نمر بن قاسط قبیلہ سے تعلق تھا۔ عین التمر کی لڑائی میں قید ہو کر آئے۔ حضرت عثمانؓ نے مسیب بن نجیبہ سے خرید کر انھیں آزاد کیا۔ ابن عبدالبر کے مطابق یہ جلیل القدر علماء میں سے تھے۔ ان کی رائے کو بہت اہمیت حاصل تھی اور معاشرے میں ان کو بلند مقام حاصل تھا۔ ابن قانع کے بیان کے مطابق ۷۵ھ اور ابن جریر طبری کے مطابق ۷۶ھ میں فوت ہوئے۔ دیکھیے تہذیب التہذیب (ج ۳، ص ۲۴، ۲۵)

ے شراب نوشی کی کم از کم حد چالیس کوڑے ہے جس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ اس میں کمی نہیں ہو سکتی البتہ اس میں اضافے کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ امام شافعیؒ اور ابو ثورؒ کا مسلک چالیس کوڑے ہی ہے۔ ابن المنذر اور طبری نے علماء کے ایک گروہ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ شراب نوشی پر حد نہیں بلکہ تعزیر ہے۔

ابن قدامہ نے المغنی (ج ۹، ص ۱۴۱) میں بیان کیا ہے کہ حد شراب میں دو قسم کی روایات منقول ہیں۔ ایک میں اسی کوڑوں کا ذکر ہے۔ امام مالکؒ، ثوری، ابو حنیفہ اور ان کے متبعین کی یہی رائے ہے۔ ان کے نزدیک اس پر اجماع صحابہ ہے۔ ان کی دلیل وہ واقعہ ہے جس میں حضرت عمرؓ نے شراب کی حد کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ شراب پی کر آدمی بہک جاتا ہے، پھر وہ ہذیان بکتا اور دوسروں پر بہتان باندھتا ہے۔ اس لیے اس کی سزا وہی ہونی چاہیے جو بہتان باندھنے والے کی ہے یعنی اسی کوڑے۔

دوسری روایت میں چالیس کوڑوں کا ذکر ہے۔ امام شافعی کی رائے یہی ہے۔ ابن ہمام نے شرح فتح القدیر (ج ۴، ص ۱۸۵) میں لکھا ہے کہ البتہ حاکم وقت مصلحت کی بنا پر اسی کوڑے بھی لگا سکتا ہے۔

سے مجھے یہ روایت کہیں نہیں مل سکی اور یہ اس روایت کے بھی خلاف ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ نے چالیس سے زیادہ کوڑے نہیں لگوائے جیسا کہ امام شافعی اور بعض دیگر اہل علم کا مسلک ہے۔ جن فقہاء نے چالیس سے زائد کوڑوں کی سزا اپنائی

کسی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو معاف کر دے، چنانچہ مرتد، زندیق، جادوگر، اللہ اور اس کے رسولؐ یا حضرت عائشہؓ صدیقہ کو گالی دینے والے اور مسلمانوں سے لڑنے والے اشخاص واجب القتل ہیں۔ اسی طرح زنا، شراب نوشی، چوری اور لواطت میں حدود کا نافذ کرنا ضروری ہے۔

البتہ قذف کی حد کے بارے میں اختلاف ہے کہ جب مقدمہ حاکم کی عدالت میں پہنچ چکا ہو تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی تاویل یہ ہے کہ ان میں سے چالیس کوڑے حد کے طور پر ہیں جب کہ باقی تعزیر کے طور پر لگائے جاتے ہیں۔

لہ حدِ قذف: قاذف پر حد نافذ کرنے اور اسے معاف کرنے کے سلسلے میں اختلاف ہے اور اس باب کے آغاز میں اس پر کچھ گفتگو ہو چکی ہے۔ جرائم سے معرضِ وجود میں آنے والے حقوق کو فقہاء نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد۔ حقوق اللہ سے مراد وہ جرائم ہیں جن سے سوسائٹی متاثر ہوتی ہے اور مفادِ عامہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہر ایسے جرم کو حقوق اللہ میں شمار کیا جائے گا جس سے عوام کو نقصان پہنچتا ہو۔ اور جب ان کی رپورٹ حاکم وقت کے پاس پہنچ جائے تو کسی کو انھیں معاف کرنے کا حق حاصل نہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام الناس کے نقصان کا ازالہ کیا جا سکے۔ مصنفؒ نے ان جرائم کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ارتداد، الحاد اور جادو وغیرہ۔

حقوق العباد سے مراد ایسے جرائم ہیں جن کے اثرات ایک شخص کی ذات تک محدود ہوں۔ اسے معاف کرنے اور اپنے حق سے دستبردار ہونے کا اختیار رہے۔ ان میں سے ایک قذف ہے تاہم قذف کے حق اللہ اور حق العباد ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ حق اللہ ہے جس میں قاذف کو اس وقت معاف نہیں کیا جا سکتا جب کہ مقدمہ حاکم کے ہاں پہنچ چکا ہو۔

بعض احناف کے نزدیک قذف میں دو حق ہیں تاہم بندے کا حق غالب ہے (شرح فتح القدیر: ج ۴، ص ۱۹۸)

امام شافعیؒ کے نزدیک قذف حقوق العباد میں سے ہے چنانچہ اقامتِ حد سے پہلے وہ شخص معاف کر سکتا ہے جس پر تہمت لگائی گئی ہو، البتہ اگر متعددین زیادہ ہوں اور جرم کی نوعیت ایک جیسی حد کی متقاضی ہو تو ایسی شکل میں حد ساقط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سارے کے سارے متعددین معاف کریں۔ اگر بعض نے معاف کر دیا اور دوسرے اقامتِ حد کے لیے اصرار کر رہے ہوں تو اس شکل میں ان کی طرف سے حد لگائی جائے گی جنھوں نے معاف نہیں کیا۔ (المغنی: ج ۹، ص ۵۸) (المجموع: ج ۱۸، ص ۲۹۸)

امام مالکؒ کے نزدیک جب تک مقدمہ حاکم کے ہاں نہیں پہنچا اس وقت تک بندے کا حق فائق ہے۔ لیکن جب مقدمہ حاکم کے پاس پہنچ جائے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا حق غالب ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی متعدد رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ شہادت سننے سے پہلے معافی جائز ہے۔ گواہی ہو جانے کے بعد اس کا ذاتی حق سلب ہو جاتا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ حاکم تک پہنچانے سے پہلے پہلے معافی جائز ہے۔ اور اس کے بعد صرف اس صورت میں جائز ہو سکتی ہے کہ مقذوف اپنے حالات کو منظر عام پر نہ لانا چاہتا ہو اور قاذفین میں اس کا والد یا والدہ یا دادا یا نانا وغیرہ ہوں۔ دیکھیے مواہب الجلیل (ج ۶، ص ۳۰۵) حاشیہ دسوقی (ج ۴، ص ۲۹۵)

عادی چور کے بارے میں حضورؐ کا فیصلہ

موطا[1] میں امام مالکؒ نافعؒ سے اور وہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈھال کی چوری کی سزا میں جس کی قیمت تین درہم تھی، ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ امام مالکؒ نے ابن شہاب زہری سے اور وہ صفوان بن

---

[1] الموطا (ج ۲، ص ۷۱) کتاب الحدود باب "ما یجب فیہ القطع" یہ روایت صحیحین میں بھی مذکور ہے جسے مصنف بیان نہیں کرسکے۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود میں اسماعیل سے اور صحیح مسلم، کتاب الحدود میں یحییٰ سے یہ روایت بیان کی گئی ہے وہ دونوں امام مالک سے روایت کرتے ہیں، نیز امام بخاری کے ہاں جویریہ بن اسماءؒ، موسیٰ بن عقبہؒ، اور عبیداللہ بن عمر سے اور امام مسلم کے ہاں لیث بن سعد سے یہی روایت حضرت نافعؒ سے منقول ہے جس میں "ثمنہ" کی بجائے "قیمتہ" کا لفظ ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (ج ۱۲، ص ۱۰۵) میں بیان کیا ہے کہ اس روایت میں ثمن بمعنی قیمت ہے اور جنھوں نے "ثمنہ" کے لفظ کے ساتھ روایت کی ہے یا تو ان سے تساہل ہوا ہے یا اس دور میں "ثمن" اور "قیمۃ" ایک ہی چیز تھی۔

[2] **قطع ید کے لیے شرائط**

الموطا (ج ۲، ص ۷۴) کتاب الحدود باب ترک الشفاعۃ للسارق اذا بلغ السلطان، ابوداؤد (ج ۴، ص ۱۴۸) کتاب الحدود باب "من سرق من حرز" کی روایت میں قدرے تفصیل موجود ہے کہ حضرت صفوان کے بھانجے اپنے ماموں صفوان سے روایت کرتے ہیں کہ میں مسجد میں اپنی چادر پر سویا ہوا تھا جس کی قیمت تیس درہم تھی۔ ایک شخص خاموشی سے مسجد میں داخل ہوا اور اس نے چپکے سے چادر کھسکا لی لیکن وہ پکڑا گیا۔ میں اسے حضورؐ کی خدمت میں لایا۔ آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس وقت میں نے کہا، کیا تیس درہم کے بدلے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ چلیے میں نے یہ اس کے ہاتھ ادھار پر بیچ دی اور اس کی قیمت بعد میں وصول کرلوں گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا "فهلا كان هذا قبل ان تاتيني به" (میرے پاس لانے سے پہلے ایسا کیوں نہ کرلیا)۔

ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے کہ زائدہ، سماک سے اور وہ حُمید بن حجیر سے بیان کرتے ہیں کہ صفوان سوگئے اور مجاہد اور طاؤس بیان کرتے ہیں کہ صفوان مسجد میں سوئے ہوئے تھے کہ چور آیا اور اس نے ان کے سر کے نیچے سے چادر چرالی۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کی روایت اس طرح ہے کہ چور نے چادر صفوان کے سر کے نیچے سے کھسکا لی تو صفوان نے شور مچا دیا اور اسے پکڑ لیا۔ زہری نے صفوان بن عبداللہ سے روایت بیان کی ہے کہ صفوان چادر کا تکیہ بنا کر مسجد میں سو گئے

عبداللہ بن صفوان سے روایت کرتے ہیں کہ صفوان بن امیہ کو حضورؐ کے اس ارشاد کا علم ہوا کہ جس نے ہجرت نہ کی، وہ ہلاک ہوا تو وہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے اور اپنی چادر سر کے نیچے رکھ کر مسجد میں سو گئے۔ اسی اثنا میں ایک چور مسجد میں داخل ہوا اور اس نے چادر اپنے قبضہ میں لے لی۔ حضرت صفوان نے اسے پکڑ لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ حضورؐ نے پورا واقعہ سننے کے بعد اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس وقت صفوان نے کہا یا رسول اللہ! میرا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا، میں اسے معاف کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا فھلا قبل ان تاتینی بہ "میرے پاس لانے سے پہلے تم نے اسے کیوں نہ معاف کر دیا۔"[1]

[2] سنن نسائی (کتاب قطع ید السارق، باب تعلیق ید السارق فی عنقہ) میں مشہور تابعی اور محدث حضرت

ایک چور آیا اور اس نے چادر اپنے قبضے میں لے لی۔ صفوان اس چور کو پکڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔

ابوداؤد کی روایت میں ایک راوی کا نام حمید بن حجیر ہے جو صفوان کا بھانجا ہے۔ حافظ زیلعیؒ نے "نصب الرایۃ" (ج ۳، ص ۳۶۸-۳۶۹) میں نقل کیا کہ ان سے سماک کے علاوہ کسی اور نے کوئی روایت نقل نہیں کی ہے۔ البتہ منذری نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ عبدالحق نے "احکام" میں یہ روایت متعدد طرق سے بیان کی ہے جن کا تذکرہ سنن نسائی میں بھی موجود ہے مثلاً رواہ سماک ابن حرب عن حمید بن اخت صفوان، عن صفوان ورواہ عبدالملک بن ابی بشیر عن عکرمۃ عن صفوان، ورواہ اشعث بن سوار عن عکرمۃ عن ابن عباسؓ ورواہ عمرو بن دینار عن طاؤس عن صفوان۔

امام مالکؒ نے یہی روایت ایک دوسری سند کے ساتھ نقل کی ہے وہ زہری سے اور وہ صفوان بن عبداللہ بن صفوان سے روایت کرتے ہیں۔ یہ روایت پہلی روایت سے مختلف ہے اور میرے علم کی حد تک یہ سند متصل نہیں ہے۔

ابن قطان نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ یہ روایت حمید نامی راوی کی وجہ سے ضعیف ہے جس کا ذکر بجز اس روایت کے کہیں نہیں ملتا ہے۔ ابن حاتم کی رائے بھی یہی ہے۔ امام بخاریؒ اپنی کتاب میں اس روایت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کہ راوی حمید بن حجیر بن اخت صفوان بن امیہ ہے اس کے بعد وہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ حاکم مستدرک (ج ۳، ص ۳۸) میں یہی روایت طاؤس عن ابن عباسؓ کی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ روایت صحیح الاسناد ہے لیکن شیخین نے یہ روایت نقل نہیں کی۔ امام ذہبی نے حاکم کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔

[1] نسخہ حرم مکی شریف اور دیگر نسخ میں "صلی اللہ علیہ وسلم" کے الفاظ ہیں نیز اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مقدمہ قاضی کے ہاں پہنچ جائے تو حد ساقط نہیں ہو سکے گی جیسا کہ اس وقت سفارش کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

[2] سنن نسائی (ج ۸، ص ۹۲) کتاب "قطع السارق" باب "تعلیق ید السارق فی عنقہ" امام نسائی کے نزدیک اس روایت میں حجاج بن ارطاۃ نامی راوی ضعیف ہے اور اس کی روایت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعارف اس طرح ہے: حجاج بن ثور بن ھبیرۃ بن شراحیل النخعی ابو ارطاۃ الکوفی القاضی العجلی، یہ فقہائے کوفہ کے مفتیوں میں سے تھا۔ اس میں کچھ غرور پایا جاتا تھا، چنانچہ خود اس کا اپنا قول ہے کہ "حُبِ جاہ نے مجھے ہلاک کر دیا ہے۔" یہ بصرہ کا قاضی مقرر ہوا۔ اس

ابن مُحَیریز[1] سے روایت ہے کہ میں نے فضالہ بن عبید[2] سے پوچھا، کیا چور کا ہاتھ گردن میں لٹکایا جائے گا؟ اس نے کہا یہ سنت ہے۔ حضور اکرمؐ نے چور کا ہاتھ کاٹا اور اسے اس کی گردن میں لٹکایا تھا۔ سنن ابی داؤد[3] میں بھی اسی طرح کی روایت پائی جاتی ہے۔ صحیح بخاری[4] اور صحیح مسلم[5] میں وارد ایک دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے لیے

کی روایات صحیح تو ہیں لیکن زیادہ تر مرسل ہیں۔ یہ زیادہ تر مکحول اور یحییٰ ابن کثیر سے روایت کرتا ہے حالانکہ ان سے اس کا سماع ثابت نہیں ہے۔ بعض محدثین کے ہاں اس میں تدلیس کا عیب پایا جاتا تھا۔

ممتاز محدثین کی اس کے بارے میں آراء اس طرح ہیں مثلاً ابن معین کہتے ہیں "هُوَ صَدُوقٌ لَيْسَ بِالقوىّ" (وہ سچا تو ہے لیکن قوی نہیں) ابوزرعہ کہتے ہیں "صدوقٌ يدلسُ" (سچا ہے لیکن تدلیس کا عیب پایا جاتا ہے) ابوحاتم فرماتے ہیں "يدلس عَنِ الضعفاء" تاہم اس کی روایات لکھی جاسکتی ہیں۔ تہذیب التہذیب (ج ۲، ص ۱۹۶)

جامع ترمذی (ج ۴، ص ۱ ۵) کتاب الحدود باب "ما جاء فی تعلیق يد السارق" میں ہے کہ یہ روایت حسن غریب ہے۔ کیونکہ یہ روایت صرف عمر بن علی المقدمی نے، حجاج بن ارطاۃ اور عبدالرحمٰن بن محیریز سے روایت کی ہے۔ اس کی اور کوئی سند نہیں۔ عبدالرحمٰن بن مُحَیریز، عبداللہ بن مُحَیریز شامی کا بھائی ہے۔

حافظ ابن حجر نے "التلخیص الحبیر" (ج ۴، ص ۶۹) میں امام ترمذی کا قول نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ دونوں مدلس ہیں۔ امام نسائی نے کہا ہے کہ حجاج ضعیف ہے۔ اس کی روایت قابل استدلال نہیں ہے۔ امام نسائی نے یہ جرح اپنی سند کے ساتھ اس کو روایت کرنے کے بعد کی ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح کے درجے کے قریب بھی نہیں پہنچتی۔ اس حدیث کی تائید حضرت علیؓ کے عمل سے ہوتی ہے کہ آپ نے ایک چور کا ہاتھ کاٹا اور اسے اس کی گردن میں لٹکا کر پھرایا۔ دیکھیے سنن کبریٰ (ج ۸، ص ۲۷۵)

[1] ابنِ مُحَیرِیز: عبداللہ بن مُحَیریز بن جُنادہ ابن وہب جُمَحی مکی۔ یتیمی کی حالت میں ابو محذورہ کے پاس مکہ میں رہے۔ پھر بیت المقدس چلے گئے۔ ان کا شمار مشہور زاہد اور ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ آپ محدثین کے طبقہ سوم سے ہیں ۹۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ التقریب (ج ۱، ص ۴۴۹)

[2] فضالہ بن عبید بن نافذ بن قیس انصاری، اوسی ہیں۔ غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد دمشق چلے گئے اور قاضی کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۵۳ھ میں فوت ہوئے۔

[3] یہ روایت سنن ابی داؤد (ج ۴، ص ۱۴۳) کتاب الحدود باب "فی السارق تعلق يده فی عنقه" میں ہے۔ زیلعیؒ نے "نصب الراية" (ج ۳، ص ۳۷۰) میں اس روایت کو حجاج راوی کی وجہ سے غیر مستند قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ابن قطان کے نزدیک ابن مُحَیریز بھی ایک مجہول الحال راوی ہے۔

میرے نزدیک ان کی یہ تحقیق صحیح نہیں ہے۔ وہ ثقہ راوی ہیں جن کے بارے میں تفصیلات پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

[4] صحیح بخاری: کتاب الحدود باب "كراهية الشفاعة فی الحدود إذا رُفع إلى السلطان" (فتح الباری ۶۷۸۸)

[5] صحیح مسلم (ج ۳، ص ۱۳۱۵) کتاب الحدود "قطع السارق الشريف وغيره والنهي عن الشفاعة فی الحدود"

بنو مخزوم کی ایک خاتون کے معاملہ نے سنگینی اختیار کرلی جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق یہ واقعہ فتح مکہ کے وقت پیش آیا۔ اس پر قریش پریشان ہوئے اور باہم مشورے سے حضرت اسامہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ حضور کو ان سے بڑی محبت تھی اور وہی اس طرح کی بات کرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔

حضرت اسامہ نے آپ سے بات کی۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اتشفع فی حد من حدود اللہ" کیا تو حدود الٰہی کے بارے میں سفارش کرتا ہے؟" یہ سن کر حضرت اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کیجیے۔ عشاء کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی اس کی شان کے مطابق تعریف کی اور فرمایا:

امابعد، فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ اَنَّهُمْ كَانُوا اِذَا سَرَقَ

تم سے پہلے بہت سے لوگ محض اس وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں کہ جب ان میں سے کوئی با اثر آدمی چوری کرتا

لہ مخزومیہ کی نسبت مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب کی طرف ہے۔

مخزوم، کلاب بن مرہ کا بھائی تھا جس کی طرف بنو عبد مناف کی نسبت ہے۔ اس عورت کا نام فاطمہ بنت اسود بن عبدالاسد بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم ہے۔ یہ مشہور اور جلیل القدر صحابی اور ام المومنین حضرت ام سلمہ کے پہلے خاوند حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد کی بھتیجی تھی۔

بعض کے نزدیک اس عورت کا نام ام عمرو بنت سفیان بن عبدالاسد ہے۔ دیکھیے مصنف عبدالرزاق (ج ۱۰، ص ۲۰۳)
ابن جریج کہتے ہیں کہ بشر بن تیم نے مجھے بتایا کہ اس عورت کا نام ام عمرو بنت سفیان بن اسد ہے۔ (کتاب المستفاد، ص ۴)
لیکن پہلا نام ہی صحیح ہے جیسا کہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب (ج ۴، ص ۳۸۴) میں ذکر کیا۔

سلہ صحیح مسلم، کتاب الحدود۔

سہ حضرت اسامہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پیارے تھے۔ آپ ان سے بہت محبت کرتے تھے جیسا کہ آپ کو ان کی والدہ ام ایمن اور ان کے والد حضرت زید بن حارثہ سے بہت انس تھا۔ حضرت ام ایمن کے متعلق تو آپ نے فرمایا "ھی امی بعد امی" (کہ میری حقیقی والدہ کے بعد یہ میرے لیے ماں کی مانند ہیں)۔ حضرت اسامہ کے بارے میں آپ نے فرمایا: "اے اللہ مجھے اس سے محبت ہے پس تو بھی اس سے محبت فرما۔"

ان کا انتقال مدینہ منورہ میں ۵۴ھ میں ہوا۔

کہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت اسامہ بن زید اس عورت کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ سنتے ہی حضور کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

شہ نسخہ لالہ، حلبی اور حلب میں "خطب" کی بجائے "اختطب" کا کلمہ مذکور ہے۔

فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ۔ فَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا۔

تو اسے چھوڑ دیا جاتا، لیکن جب یہی جرم کمزوروں سے سرزد ہوتا تو ان پر حد قائم کر دی جاتی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا اور اس مخزومی عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

صحیح مسلم کی ایک روایت[1] میں ہے کہ حضرت اُم سلمہؓ نے اس کے بارے میں آپؐ سے بات کی تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔" پھر اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ ایک روایت[2] میں ہے کہ یہ عورت لوگوں سے زیورات اور سامان ادھار لیتی تھی پھر انکار کر دیتی تھی کہ میں نے ادھار لیا ہی نہیں۔ حضورؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔

---

[1] صحیح مسلم (ج ۲، ص ۱۳۱۵) میں ہے کہ بنو مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا۔ اس نے حضرت ام سلمہؓ کی پناہ میں آنے کی کوشش کی تو حضورؐ نے یہ بات فرمائی۔

[2] صحیح مسلم (ج ۲، ص ۱۳۱۶) میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ وہ مخزومی عورت لوگوں سے سامان ادھار لیتی تھی اور واپس دینے سے انکار کر دیتی تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس کے گھر والے حضرت اسامہؓ کے پاس آئے اور حضورؐ سے اس بارے میں بات کرنے کی درخواست کی۔

امام نووی نے شرح مسلم (ج ۱۱، ص ۱۸۷) میں بیان کیا ہے کہ اس کا ہاتھ چوری کی وجہ سے کاٹا گیا۔ یہ الفاظ کہ وہ سامان لے کر واپس نہیں کرتی تھی۔ اس میں اس کی عادت کا ذکر ہے جو قطع ید کا سبب نہیں ہے۔ امام مسلم نے متعدد طرق سے جو روایت بیان کی ہے اس میں صراحتاً مذکور ہے کہ اس عورت کا ہاتھ چوری کی وجہ سے کاٹا گیا۔

اس وضاحت سے تمام متعلقہ روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے کیونکہ یہ ایک ہی واقعہ ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک یہ شاذ روایت ہے اور جمہور راویوں کی روایت کے خلاف ہے۔ شاذ روایت پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ اس روایت میں چوری کا ذکر نہ ہونے کی توجیہ علماء نے یہ کی ہے کہ یہ روایت حدود کے بارے میں سفارش کی ممانعت کے سلسلے میں نقل کی گئی ہے۔ اس کا مقصد چوری کا ذکر کرنا نہیں ہے۔ جمہور علماء اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ادھار لی ہوئی چیزوں کے انکار پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اس روایت کی تاویل وہی ہے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے، البتہ امام احمدؒ اور اسحاق کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی ہاتھ کاٹنا لازمی ہے۔ ابن حزم نے "المحلّٰی" (ج ۱۱، ص ۳۶۱) میں بیان کیا ہے کہ یہ دو مختلف عورتوں کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (ج ۱۲، ص ۹۱) میں اس توجیہ سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں واقعات میں حضرت اسامہؓ کی سفارش کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تنبیہ ہونے پر وہ دوبارہ اس کی جرأت کرتے۔ خاص طور پر

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک غلام لایا گیا جس نے چوری کی تھی۔ وہ چار مرتبہ لایا گیا لیکن آپ نے اسے ہر بار چھوڑ دیا۔ جب پانچویں دفعہ اس جرم میں اسے پیش کیا گیا تو اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ چھٹی دفعہ پھر اس نے چوری کی تو اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا۔ ساتویں دفعہ اس جرم کی پاداش میں اس کا دوسرا ہاتھ اور آٹھویں مرتبہ اس کا دوسرا پاؤں کاٹ دیا گیا۔

"واضحہ" میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور لایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا "اقتلوہ" (اسے قتل کر دو) صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! اس نے صرف چوری کی ہے۔ تو آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ایک اور چوری کے جرم میں وہ آپ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپ نے فرمایا "اقتلوہ" (اسے قتل کر دو) صحابہ کرامؓ نے وضاحت کی کہ اس نے صرف چوری کا ارتکاب کیا ہے۔ آپؐ نے قطع کا حکم دیا۔ چنانچہ (عادی چور ہونے کی بنا پر) اس کے چاروں ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے گئے۔ اس کے بعد اسی شخص نے اپنے منہ کے ذریعے چوری کی اور پکڑا گیا۔ اسے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؓ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ یہ سزا اسی شخص کے ساتھ مخصوص تھی، البتہ امام مالک کے شاگرد ابوالمصعبؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی پانچویں مرتبہ چوری کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

جب کہ ان دونوں واقعات کے درمیان لمبا عرصہ بھی نہ گزرا۔ بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ پہلا واقعہ ان کے ذہن سے نکل گیا ہو یا انھوں نے یہ سمجھا ہو کہ سفارش کی ممانعت کا تعلق چوری سے ہے اور مستعار چیزوں کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس خیال کی بنا پر انھوں نے سفارش کر دی ہو جس کا جواب ان کو یہ دیا گیا کہ اس صورت میں بھی حد نافذ ہوتی ہے جس میں سفارش جائز نہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں ہی احتمال کمزور ہیں۔ اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے ان لوگوں کی متعدد دلائل سے تردید کی ہے جو مستعار چیزوں میں حد کے قائل ہیں۔ یہاں ان تفصیلی دلائل کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

لہ عبدالرزاق نے المصنف (ج ۱۰، ص ۱۸۸) میں، امام ابوداؤد نے کتاب المراسیل (ص ۲۷) میں اور امام بیہقیؒ نے سنن کبریٰ (ج ۸، ص ۲۷۳) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ مرسل حسن صحیح الاسناد ہے۔ سنن نسائی (ج ۸، ص ۸۹) باب "قطع الرجل من السارق بعد الید" میں حارث بن حاطب لخمی کی روایت مذکور ہے جس میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحیح علم کی بنا پر اس کے قتل کا حکم دیا تھا۔ پھر آپؐ نے اس شخص کو قریش کے نوجوانوں کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اسے قتل کر دیں۔ ان نوجوانوں میں عبداللہ بن زبیر بھی تھے۔ وہ قیادت کو پسند کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اپنا امیر بنا لو، چنانچہ وہ نوجوان ان کی قیادت میں مجرم کو مارتے رہے یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ امام بیہقی نے سنن کبریٰ (ج ۸، ص ۲۷۲) اور حاکم نے مستدرک (ج ۴، ص ۳۸۲) میں اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ شیخین نے اس روایت کی تخریج نہیں کی ہے۔

لہ ابوالمصعب کا پورا نام احمد بن ابی بکر بن حارث بن زرارہ بن مصعب ہے۔ وہ زیادہ تر کنیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے امام مالک سے "مؤطا" کی روایت کی ہے۔ ان کی ایک کتاب کا نام "مختصر فی قول مالک" ہے۔ زبیدی کہتے ہیں کہ ابوالمصعب اہل مدینہ کے متفق علیہ فقیہ تھے۔ ابواسحاق شیرازی کا قول ہے کہ وہ مدینہ طیبہ کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ امام بخاری، مسلم،

سنن ابو داؤد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچویں چوری پر اس کے قتل کا حکم دیا چنانچہ اسے قتل کر کے نعش کو کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ہم نے اس پر پتھر پھینکے۔

ذہلی اور اسماعیل قاضی جیسے عظیم محدثین نے ان سے احادیث بیان کی ہیں۔ وہ ۲۴۲ھ میں مدینہ میں فوت ہوئے۔ دیکھیے ترتیب المدارک (ج ۲، ص ۱۱۵) اور اخبار القضاۃ (ج ۱، ص ۲۵۸) لیکن امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ (ج ۲، ص ۴۸۶) میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات ۲۹۲ھ میں ہوئی۔

لہ سنن ابی داؤد (ج ۴، ص ۱۴۲) کتاب الحدود باب "السارق یسرق مراراً" میں مصعب بن ثابت عن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبداللہ کی سند کے ساتھ مروی ہے۔ سنن نسائی (ج ۸، ص ۹۱) کتاب "قطع السارق" باب "قطع الیدین والرجلین من السارق" میں ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ اس میں مصعب بن ثابت نامی راوی قوی نہیں ہے۔

منذری نے مختصر ابی داؤد (ج ۶، ص ۲۳۸) میں نقل کیا ہے کہ مصعب بن ثابت کا پورا نام ابو عبداللہ مصعب بن ثابت بن عبداللہ بن زبیر بن عوام قرشی ہے۔ اکثر ائمہ حدیث کے نزدیک یہ ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (ج ۲، ص ۹۹) میں بیان کیا ہے کہ ابن منکدر اور امام شافعیؒ نے اس حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے۔ بعض نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہ سزا اسی شخص کے ساتھ خاص تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے واجب القتل ہونے کی اطلاع کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی میں حضورؐ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس شخص کا تعلق مفسدین فی الارض کے گروہ سے ہو۔

خطابی کے مطابق اس روایت کی سند محل نظر ہے اور یہ صحیح الاسناد حدیث سے متصادم ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں گرایا جا سکتا ہے۔ اسلام کے بعد ارتداد، نکاح کے بعد زنا اور قتل عمد۔ چور ان تین میں شامل نہیں ہے اور اس کے قتل کا جواز نہیں۔ امام خطابی کہتے ہیں کہ میرے علم کی حد تک کسی بھی فقیہ نے چور کے قتل کو جائز قرار نہیں دیا چاہے وہ بار بار چوری کرنے کا عادی ہو، البتہ اگر وہ فساد فی الارض کرتا ہو تو اس کا قتل جائز ہے۔ امام ایسے شخص کو حد سے زیادہ بھی سزا دے سکتا ہے جس میں قتل کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے اور اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے تہذیب السنن میں لکھا ہے کہ حدیث "لایحل دم امرء مسلم الا باحدی ثلاث" کی بنا پر اس حدیث کو منسوخ قرار دینے کا دعویٰ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث عام ہے اور حدیث قتل خاص ہے اور یہ حکم مصلحت کے پیش نظر تعزیر کے طور پر ہوا ہے اور یہ جائز ہے۔ اسی طرح مثلاً اگر لوگوں میں شراب نوشی عام ہو جائے اور وہ حدود الٰہی کی پروا نہ کریں تو امام اس وبا کو روکنے کے لیے قتل کا حکم بھی دے سکتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایسے شرابیوں کو کبھی جلا وطن کیا۔ بعض اوقات ان کے سر مونڈ کر انھیں ذلیل کیا اور اسی کوڑے لگائے جبکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضورؐ نے چالیس کوڑے لگوائے تھے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چوتھی مرتبہ چوری کرنے پر اس شخص کو قتل کی سزا دینا حد نہیں بلکہ دینی مصلحت اور مفاد عام

اُصَیلی نے اپنے بغداد کے شیوخ سے جو روایات بیان کی ہیں ان میں ایک یہ روایت ہے، جو مجھے ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کی شکل میں ملی ہے، کہ ایک شخص بچوں کو اغوا کیا کرتا تھا۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔

مصنفؒ عبدالرزاق میں امام ثوریؒ سے مروی ہے، امام ثوری ایک اور آدمی سے اور وہ حضرت حسن سے روایت کرتے ہیں کہ ایک چور حضورؐ کے پاس لایا گیا جس نے کھانے کی چوری کی تھی۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ سفیان ثوریؒ کا کہنا ہے کہ ایسی اشیاء جو عموماً ایک دن سے زیادہ ٹھیک نہیں رہ سکتیں، مثلاً گوشت، ثرید اور اسی طرح کی دیگر اشیاء، ان

کی ضرورت کے تحت یہ تعزیر ہے اور چور کو قتل کی سزا کا حکم جس حدیث میں ہے اگر وہ صحیح ہے تو اس کی یہی توجیہ ہے۔ میرے نزدیک حماد بن سلمہ کی روایت صحیح الاسناد ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ اس کے کئی ایک شواہد ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا ہے اور کچھ کا ذکر ابونعیم نے "الحلیۃ" (ج ۲، ص ۶) میں عبداللہ بن زبیر الجہنی کے تذکرہ میں کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے سامان کی چوری کی، اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر اس کے بعد پھر چوری کی تو پاؤں کاٹ دیا جائے گا۔ اگر پھر چوری کی تو اس کا دوسرا ہاتھ بھی قطع کر دیا جائے گا۔ چوتھی مرتبہ چوری میں اس کا دوسرا پاؤں کاٹ دیا جائے گا۔ اگر پھر بھی چوری سے باز نہ آیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ یہ روایت صرف حزام بن عثمان سے مروی ہے جو محدثین کے نزدیک بہت زیادہ ضعیف ہے۔ چوری کے بارے میں یہ چند احادیث ہیں۔ ان میں سے بعض کی سندیں کچھ ضعیف ہیں لیکن ایک دوسری کی تائید سے ضعف کا ایک حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

لہ الاُصَیلی: دارقطنی (ج ۳، ص ۲۰۲) نے روایت بیان کی ہے کہ مروان بن حکم جب مدینہ طیبہ کا گورنر تھا تو اس کے پاس ایک شخص لایا گیا جو بچوں کو اغوا کر کے انھیں کسی دور دراز علاقہ میں بیچا کرتا تھا۔ مروان نے ممتاز فقہا اور علمائے مدینہ سے مشورہ کیا تو حضرت عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ کے حوالے سے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص لایا گیا جو بچے اغوا کر کے کسی دور دراز مقام پر لے جا کر انھیں فروخت کیا کرتا تھا۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹا، چنانچہ مروان نے بھی آپؐ کے فیصلہ کی روشنی میں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا۔

امام دارقطنی نے کہا کہ اس روایت میں عبداللہ بن محمد بن یحییٰ واحد راوی ہے جس نے ہشام سے یہ روایت نقل کی ہے اور ہشام سے روایت کرنے میں اس سے اکثر غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ شخص روایتِ حدیث میں ضعیف تصور کیا جاتا ہے۔

امام بیہقیؒ نے سنن کبریٰ (ج ۸، ص ۲۶۸) میں دارقطنی کی سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور اس حدیث کے ضعف کے سلسلے میں دارقطنی نے جو کچھ لکھا، اس کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔

لہ مصنف عبدالرزاق (ج ۱۰، ص ۲۲۳-۲۲۴) کی سند میں ایک راوی کا نام مذکور نہیں۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حفص عن اشعث بن عبدالملک و عمرو عن حسن کی سند کے ساتھ اور وکیع عن جریر بن حازم والسری بن یحییٰ عن حسن

کی چوری میں حد کی بجائے تعزیر ہوگی[1]۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ پہلے[2] دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اس کے بعد دوسرے جرم میں بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، البتہ تیسری[3] مرتبہ چوری کی سزا کے بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک

کی سند کے ساتھ اسی طرح کی ایک روایت نقل کی ہے جس کا تذکرہ عبدالحق نے "الاحکام" میں کیا ہے دیکھیے (نصب الرایۃ: ج ۳، ص ۳۶۲)

[1] سفیان ثوری کی مکمل بات یوں ہے کہ پھل جب تک درخت پر ہو اس وقت تک اس کی چوری پر قطع ید کی حد نافذ نہیں کی جائے گی، بلکہ اس پر تعزیر ہوگی۔

[2] "اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں .... تا آخر باب۔

یہ عبارت نسخہ لالہ اور نسخہ شہید علی پاشا میں مذکور نہیں ہے۔ نسخہ حلب اور حلبی میں بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔

تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص نے پہلی مرتبہ چوری کی ہو تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے گا اس فیصلے میں تمام صحابہ کرامؓ کی رائے یکساں ہے۔ دائیں ہاتھ میں گرفت کی استعداد نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ سزا کا آغاز اسی سے ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ یہ خود چوری کا آلہ ہے۔ سزا میں اس کو کاٹنا قرین قیاس نظر آتا ہے۔ اگر یہی شخص دوبارہ چوری کرے گا تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے گا۔ حضرت عطاء کے سوا تمام علماء اس سزا پر متفق ہیں۔ حضرت عطاء کہتے ہیں کہ جب چور پہلی دفعہ چوری کرے گا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اس کے بعد قطع کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اگر اس نے بار بار اس جرم کا اعادہ کیا تو اس پر تعزیر کا نفاذ ہوگا۔ ان کی دلیل ارشاد باری "فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا" ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ کے نزدیک پاؤں کاٹنے کی سزا ہوتی تو اس کا تذکرہ کتاب اللہ میں ہونا چاہیے تھا۔ اہل ظاہر کا یہی مسلک ہے کہ سرقہ میں صرف دونوں ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ پہلی چوری میں ایک ہاتھ اور دوسری چوری میں دوسرا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس کے بعد تکرار جرم میں تعزیر لاگو ہوگی۔

تاہم یہ رائے جمہور کے مسلک کے خلاف ہے۔ جمہور علماء کی دلیل ارشاد نبوی ہے۔ "اذا سَرَقَ فاقطعوا يده ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا رِجلَہٗ" (کہ چوری کی صورت میں اس کا ہاتھ کاٹو اور اگر وہ دوبارہ چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو)۔ امت مسلمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے خلفائے راشدین کے دور تک اسی فیصلے پر عمل کیا ہے۔ اور اجماع امت کے خلاف جو بات ہوگی اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ درحقیقت یہ حدیث اور دوسری روایات مجمل القرآن کی تفسیر متصور ہوں گی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کو تو لیا جائے لیکن نبی صلی اللہ نے اس کی جو تفسیر کی ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔

[3] تیسری بار چوری کی سزا کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ اختلاف کا سبب اس باب میں دی گئی احادیث ہیں جن کی کچھ تفصیل گزر چکی ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے اس باب کی احادیث پر عمل کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل کے نزدیک تیسری اور چوتھی مرتبہ قطع کی سزا دی جائے۔ لیکن اس کے بعد چوری میں اس پر تعزیر ہوگی اور اسے قید میں رکھا جائے گا۔ جیسا کہ المغنی لابن قدامہ (ج ۹، ص ۱۰۲) میں اس کی تفصیل ہے۔

تیسری اور چوتھی بار چوری کرنے پر بھی ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا دی جائے گی جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قطع کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ اسے قید میں رکھا جائے گا اور حسب حال سزا دی جائے گی۔ حضرت علیؓ کی بھی ایسی ہی رائے منقول ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تیسری مرتبہ چوری کی سزا میں قطع کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ تاحیات اسے قید میں رکھا جائے گا۔ ان کی دلیل حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ اس کے کھانے اور استنجا کے لیے ہاتھ اور چلنے کے لیے پاؤں نہ چھوڑوں"۔ (شرح فتح القدیر (ج ۴، ص ۲۴۸-۲۴۹)

مصنف عبدالرزاق (ج ۱۰، ص ۱۸۶) میں معمر عن جابر عن شعبی کی سند کے ساتھ حضرت علیؓ کا قول مذکور ہے جسے امام دار قطنی (ج ۳، ص ۱۰۳) نے بھی امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے۔ امام محمد بن حسن نے "الآثار" (ص ۱۰۹) امام بیہقی نے سنن کبری (ج ۸، ص ۲۷۵) میں یہ روایت بیان کی ہے۔ حضرت علیؓ کے قول کی مانند حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ سے بھی روایت ہے نیز امام ثوری، نخعی، زہری، شعبی، اوزاعی، حماد اور تابعین کی ایک جماعت کی بھی یہی رائے ہے۔ ابن ترکمانی نے "الجوہر" (۸-۲۷۵) میں اس قول کو امام احمد سے بھی منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ محض ان کا گمان ہے۔ صحیح بات وہی ہے۔ جو میں نے بیان کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے مسلمان یا ذمّی یا حربی کے بارے میں آپؐ کا فیصلہ اور جادوگر کو قتل کرنے کا طریقہ

صحیح حدیث[1] میں ہے کہ ایک یہودی عورت نے بکری کے گوشت میں زہر ملا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلایا۔ اس عورت کا نام زینب بنت حارث بن سلام تھا۔ اس نے بکری کے بازو والے گوشت میں زیادہ زہر ملایا کیونکہ حضور کو یہ گوشت زیادہ پسند تھا۔ گوشت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کر رکھا گیا تو آپؐ نے بازو والا حصہ پکڑا اور اسے کھانے لگے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب "الجزیة" باب "اذا غدر المشرکون بالمسلمین هل یعفیٰ عنهم" میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۳۱۶۹ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جب خیبر فتح ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بکری کا گوشت ہدیہ کے طور پر بھیجا گیا۔ جس میں زہر ملا ہوا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اجمعوا لی من کان ھاھنا من الیھود" (یہاں جو یہودی ہوں ان کو جمع کر کے میرے پاس لاؤ) اس ارشاد کی تعمیل کی گئی اور یہود حاضر کر دیے گئے۔ آپؐ نے فرمایا "میں تم سے ایک بات پوچھنے لگا ہوں، کیا تم مجھے سچ بتاؤ گے؟" انھوں نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "تمھارا جدِّ اعلیٰ کون ہے؟" انھوں نے کہا "فلاں" آپؐ نے فرمایا "تم جھوٹ کہتے ہو، تمھارا جدِّ اعلیٰ تو فلاں ہے"۔ انھوں نے کہا کہ "آپؐ نے سچ کہا"۔ آپؐ نے پھر فرمایا: "میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، کیا تم مجھے سچ بتاؤ گے؟" انھوں نے کہا: "اے ابوالقاسمؐ کیوں نہیں؟ جبکہ ہم جھوٹ بولیں تو بھی آپؐ کو پتہ چل جائے گا جیسا کہ ہمارے جدِّ اعلیٰ کے معاملے میں ہوا"۔ آپؐ نے ان سے کہا۔ "اہلِ دوزخ کون ہیں؟" انھوں نے کہا "کہ کچھ عرصہ ہم اس میں رہیں گے پھر ہماری جگہ تمھارے لوگ آ لیں گے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آگ سے ڈرو۔ خدا کی قسم! ہم دوزخ میں تمھاری جگہ ہرگز نہیں لیں گے"۔ پھر آپؐ نے پوچھا۔ "میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم مجھے سچ بتاؤ گے؟" انھوں نے کہا۔ "ہاں، اے ابوالقاسمؐ!" آپؐ نے فرمایا: "کیا تم نے اس گوشت میں زہر ملایا ہے؟" انھوں نے کہا۔ "ہاں"۔ آپ نے پوچھا "کیوں؟" انھوں نے کہا "اس لیے کہ اگر آپ بادشاہ ہوئے تو ہمیں آپ سے نجات مل جائے گی۔ اور اگر آپ نبی ہوئے تو آپ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا"۔

یہ حدیث بخاری کتاب المغازی باب "الشاة التی سمت للنبی بخیبر" میں اختصار کے ساتھ ہے۔ فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۴۲۴۹ ہے۔ اسی طرح بخاری کتاب الطب باب "ما یذکر فی سم النبی" میں بھی ہے۔ فتح الباری میں اس کا نمبر ۵۷۷۷ ہے۔ صحیح مسلم کتاب السلام باب "السم" میں حضرت انسؓ کی روایت ہے۔ اس روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا کہ میں تمھیں قتل کرنا چاہتی تھی۔ آپ نے فرمایا "اللہ تمھیں اس کی طاقت عطا نہیں فرمائے گا"۔

حضورؐ کے ساتھ بشرؓ ابن البراء بن المعرور بھی تھے۔ وہ بھی گوشت کھانے لگے اور انھوں نے خوب کھایا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو گوشت منہ میں ڈالا تھا، آپؐ نے اسے منہ سے نکال کر پھینک دیا اور فرمایا:

(یہ ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے) پھر آپؐ نے اس یہودی عورت کو بلا کر پوچھا تو اس نے زہر ملانے کا اعتراف کر لیا۔ آپؐ نے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے سوچا اگر تو یہ بادشاہ ہے تو ہمیں اس سے نجات مل جائے گی اور اگر یہ نبی ہوا تو اسے نقصان نہیں پہنچے گا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے درگزر فرما دیا۔ حضرت بشرؓ نے جو زہر آلود گوشت کھایا تھا اس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔

بخاریؒ، مسلمؒ، اسماعیل قاضی اور ابن ہشامؒ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا تھا۔ ابوداؤدؒ نے اور کتاب "شرف المصطفیٰ" کے مصنفؒ نے ذکر کیا ہے کہ آپؐ نے اپنی طرف سے معاف فرما دیا لیکن

سنن ابوداؤد (ج ۴، ص ۱۷۳) کتاب الدیات باب "فیمن سقی رجلاً سمّاً أو اطعمہ فمات أیقاد منہ" میں یہ روایت ہے۔

لہ بشر بن البراء بن المعرور خزرجی انصاری سلمی ہیں۔ بیعت عقبہ میں اپنے والد کے ساتھ شریک ہوئے۔ غزوۂ بدر اور بعد کے غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ غزوۂ خیبر کے بعد اس زہر کے اثر سے ان کا انتقال ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں "سید بنی نضلہ" کا خطاب دیا۔

لہ صحیح بخاری کتاب "الھبۃ" باب "قبول الھدیۃ من المشرکین" (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۲۶۱۷ ہے) یہ روایت حضرت انس بن مالک سے ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک یہودی عورت نے بکری کا زہر آلود گوشت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تو آپؐ نے اس میں سے کھایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوگوں نے عرض کیا کہ ہم اس عورت کو قتل نہ کر دیں؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں"۔

لہ صحیح مسلم، کتاب السلام باب "السم" میں حضرت انسؓ سے اسی طرح کی روایت ہے۔

لہ سیرت ابن ہشام (ج ۲، ص ۳۳۷) میں یہودی عورت کا نام زینب بنت حارث بن خالد بن صخر ہے۔ یہ سلام بن مشکم کی بیوی تھی۔

لہ سنن ابی داؤد (۴-۱۷۴) کتاب الدیات میں ابوسلمہ سے مرسل روایت ہے کہ خیبر کی ایک یہودی عورت نے بکری کا بھنا ہوا گوشت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آگے روایت میں ہے کہ بشرؓ بن البراء بن المعرور صحابی اس زہر کے اثر سے فوت ہو گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا کہ تو نے ایسے کیوں کیا؟ پھر آگے پوری روایت ہے اور آخر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص میں اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔

المنذری، مختصر ابی داؤد میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ روایت حماد بن سلمہ سے انھوں نے محمد بن عمرو سے، انھوں نے ابوسلمہ سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کی ہے اور ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں اس عورت کو قتل کرنے کا حکم نہ دیا ہو لیکن حضرت بشرؓ کے انتقال کے بعد اسے قتل کر دیا گیا ہو۔

لہ کتاب "شرف المصطفیٰ" کے مصنف ابوسعید ہیں اور ان کا تعارف پہلے گزر چکا ہے۔

اس گوشت کی وجہ سے آپؐ کے جس مسلمان ساتھی کی موت واقع ہوئی تھی اس کے قصاص میں آپؐ نے اس عورت کو قتل کرایا۔ اسی کتاب "شرف المصطفیٰ" میں ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے اسے پھانسی دلوائی۔ مصنف عبدالرزاق[1] میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک جادوگر[2] لایا گیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اسے قید میں رکھو جس شخص پر اس نے جادو کیا ہے اگر وہ مرگیا تو اسے قتل کردینا۔"

ابن سلام[3] نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا[4] حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيْفِ "کہ جادوگر کی سزا تلوار کے ذریعے اس کا قتل ہے۔"

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۱۰-۱۸۴) اس کی سند منقطع اور اس وجہ سے ضعیف ہے۔

[2] جادو کوئی کلام یا لکھی ہوئی چیز یا کوئی عمل ہوتا ہے جو سحرزدہ آدمی کے جسم یا دل یا عقل پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ اسے اس کا براہِ راست علم بھی نہیں ہوتا۔ جادو ایک امر واقعہ ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض ایسے جادو ہیں جو آدمی کو قتل کردیتے ہیں۔ بعض سے آدمی بیمار ہوجاتے ہیں، بعض آدمی کو بیوی کے ساتھ ہم بستری سے عاجز کردیتے ہیں، بعض میاں بیوی میں تفریق کا باعث بن جاتے ہیں، بعض میاں بیوی کے درمیان نفرت کا اور بعض محبت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ یہ امام شافعی کی رائے ہے لیکن انہی کے بعض ساتھیوں کی رائے یہ ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ یہ ایک خیالی اور وہمی چیز ہوتی ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ (طٰہٰ - ۶۶) (حضرت موسیٰؑ کو جادوگروں کے جادو سے وہم ہوا کہ رسیاں اژدہے بن کر دوڑ رہی ہیں) یہ ابوجعفر اور اشتراباذی کی رائے ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے ساتھیوں کی رائے یہ ہے کہ اگر تو کوئی چیز سحرزدہ آدمی کے جسم کے ساتھ لگے مثلاً دھواں وغیرہ کی طرح کی کوئی چیز تو پھر تو اس کا اثر ہوسکتا ہے لیکن کسی چیز کے جسم کے ساتھ لگے بغیر جادو کے ذریعے بیماری اور موت وغیرہ کا آنا صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے معجزوں کی کوئی حقیقت باقی نہ رہتی کیونکہ اسی طرح کی چیز کا ظہور اگر غیر انبیاء سے بھی ہو تو انبیاء کے دلائل اور ان کے معجزے تو ختم ہوکر رہ جاتے ہیں۔

تمام اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جادو کا سیکھنا اور سکھانا حرام ہے۔ دیکھیے المغنی (۸ - ۵۶۲، ۵۶۷) اور المجموع (۱۸ - ۲۲)

[3] یحییٰ بن سلام بن ابی ثعلبہ تیمی بصری ثم افریقی بنو تمیم کی شاخ ربیعہ کے موالی میں سے تھے۔ یہ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے اپنے باپ کے ساتھ بصرہ منتقل ہوگئے اور وہیں پلے بڑھے۔ پھر مصر اور وہاں سے افریقہ چلے گئے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا۔ یہ مفسر، محدث، فقیہ اور زبان وادب کے عالم تھے۔ تقریباً چالیس تابعین کی صحبت ان کو نصیب ہوئی اور ان سے انھوں نے احادیث روایت کیں۔

ان کے تمام تذکروں میں لکھا ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی عظیم الشان تفسیر لکھی۔ اس کے متعلق ابن جزری کی رائے یہ ہے کہ متقدمین میں سے کسی نے ایسی تفسیر نہیں لکھی۔

زرکلی نے جامعہ قیروان کی لائبریری میں اس تفسیر کے پچیسویں اور چھبیسویں اجزا دیکھے۔ اسی طرح اس نے قیروان ہی

ایک روایت میں، جسے امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں روایت کیا ہے، ذکر ہے:-

---

میں سولہویں پارے کا مخطوطہ دیکھا لیکن وہ حتمی طور پر یہ رائے قائم نہیں کر سکا کہ یہ اسی تفسیر کا حصہ ہے۔ دیکھیے الاعلام (۱۸۴/۹) اسی طرح شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ نے معجم المحدثین والمفسرین والقراء بالمغرب الاقصیٰ (ص ۸۷) میں لکھا ہے کہ اس تفسیر کا ایک نسخہ التجانی کی لائبریری میں تھا، اس کے کچھ اجزا تیونس اور قیروان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے مزید تذکرہ و تعارف کے لیے دیکھیے "غایۃ النھایہ" (۲-۳۷۳) "ریاض النفوس" (۱-۱۲۲) "طبقات علماء افریقیۃ و تونس" (۱۱۱) ابوالعرب کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سلام ۱۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات ۲۰۰ھ میں ہوئی۔

نوٹ: ابو عبید قاسم بن سلام نے بھی قرآن کریم کی ایک عظیم تفسیر لکھی ہے اور مصنف نے "تفسیر ابن سلام" کا جو ذکر کیا ہے تو ذہن فوری طور پر ابو عبید کی تفسیر کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے لیکن میری رائے میں متعدد وجوہ کی بنا پر یہاں "ابن سلام" سے مراد ابو عبید نہیں۔

ا۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قاسم ابن سلام کا ذکر ہمیشہ ابن سلام نہیں بلکہ ابو عبید کی کنیت سے کیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب "الاموال" کی نسبت بھی ابن سلام نہیں بلکہ ابو عبید کی طرف ہوتی ہے۔

ب۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصنف نے مراجع میں کتاب "الاموال" کا ذکر کیا تو کتاب الاموال لابی عبید لکھا لیکن تفسیر ابن سلام کا ذکر کیا تو وہاں ابو عبید نہیں لکھا۔

ج۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ امام سیوطیؒ بھی دونوں تفسیروں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں۔ ایک کو "تفسیر ابو عبید" اور دوسری کو "تفسیر ابن سلام" لکھتے ہیں۔

د۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ابو عبید اپنی اس کنیت کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں۔ صرف ابن سلام ان کے لیے شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر میں وثوق سے کہتا ہوں کہ تفسیر ابن سلام سے مراد یحییٰ بن سلام بن ابی ثعلبہ کی تفسیر ہے باقی صحیح علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

ابن سلام کی روایت کردہ اس حدیث کا ذکر عبدالرزاق نے "مصنف" (۱۰-۱۸۴) میں اس سند کے ساتھ کیا ہے عن ابن عیینۃ عن اسماعیل بن مسلم، عن الحسن عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ امام بیہقی نے "السنن الکبریٰ" (۸-۱۳۶) میں یہ روایت اس سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ عن اسماعیل بن مسلم، عن الحسن، عن جندب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ بیہقی کہتے ہیں کہ راوی اسماعیل بن مسلم ضعیف ہے۔ الحاکم نے "المستدرک" (۴-۳۶۰) میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ صحیح الاسناد حدیث ہے اور شیخین اسماعیل بن مسلم کی روایت اس لیے ترک کر دیتے ہیں کیونکہ وہ "غریب صحیح" ہوتی ہے لیکن اس حدیث کی تائید ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جو شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ حافظ ذہبی نے اسماعیل بن مسلم کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے۔ لیکن المیزان (۱-۲۴۸) میں ہے کہ ابو زرعہ کے نزدیک اسماعیل بن مسلم ضعیف ہے۔ اور نسائی اور دوسروں نے اس کو متروک قرار دیا ہے اور امام احمد نے حسن عن سمرہ کی سند کو منکر قرار دیا ہے اور قطان اور ابن مہدی نے بھی اسے متروک قرار دیا ہے۔

حضرت عائشہؓ نے اپنی ایک لونڈی کو اپنی وفات کے بعد آزاد کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس لونڈی نے حضرت عائشہؓ کو جادو کر دیا تو ام المومنین حضرت صدیقہؓ نے اسے قتل کرا دیا۔ لیکن یہ روایت ثابت شدہ نہیں۔ جو روایت ثابت شدہ ہے وہ یہ کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اسے فروخت کر دیا۔

حضرت حفصہؓ[۱] نے بھی ایسے ہی کیا اور اسماعیل[۲] نے "احکام القرآن" میں حضرت حفصہ کے لونڈی کو قتل کرانے کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اسماعیل نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے اس اقدام کو اس بنا پر ناپسند فرمایا کہ انھوں نے اس معاملے کو حکومت کے سپرد کرنے کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ابن المنذر نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے وہ لونڈی فروخت کر دی، ساتھ ہی انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

المیزان (۱-۲۴۴) میں لکھا ہے کہ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ اسماعیل عن مسلم ضعیف ہے اور امام نسائی اور بعض دوسرے محدثین کے نزدیک وہ متروک ہے، اور امام احمد اس سند کو منکر اور القطان اور ابن مہدی اسے متروک قرار دیتے ہیں۔

[۱] یہ واقعہ امام بیہقی نے "السنن الکبری" (۸-۱۳۷) میں عمرۃ سے اور انھوں نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا ہے کہ وہ (حضرت عائشہؓ) بیمار ہو گئیں اور آپ کے کسی بھتیجے نے اس بیماری کا ذکر کسی طبیب سے کیا تو اس نے کہا کہ تم ایک ایسی خاتون کا ذکر کر رہے ہو جس پر اس کی کنیز نے جادو کر دیا ہے۔ اس کنیز کی گود میں بچہ ہے جس نے گود میں پیشاب کر دیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے بھتیجے نے یہ بات ان (عائشہؓ) کو بتائی۔ آپ نے فرمایا کہ میری فلاں کنیز کو بلاؤ جس کی گود میں اس کے فلاں بچے نے پیشاب کر دیا ہے۔ اس کنیز کو لایا گیا۔ حضرت عائشہؓ نے اس سے پوچھا کہ تو نے مجھ پر جادو کر دیا ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت عائشہؓ نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ آزاد ہونے کے لیے (کیونکہ حضرت عائشہؓ نے اپنی زندگی کے بعد اسے آزاد کرنے کا حکم دیا تھا) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ تو کبھی آزاد نہیں ہوگی۔ پھر آپؓ نے کہا کہ عربوں میں سب سے برا آدمی دیکھو اور اسے اس کے ہاتھ فروخت کر دو۔ پھر اس کی جو قیمت ملی اس سے ایک اور لونڈی خرید کر حضرت عائشہؓ نے آزاد کر دی۔

[۲] یہ واقعہ طبرانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ حضرت حفصہؓ کی ایک لونڈی نے ان پر جادو کیا اور اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ حضرت حفصہؓ نے عبدالرحمن بن یزید کو حکم دیا کہ اس لونڈی کو قتل کر دیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے اس اقدام کو ناپسند فرمایا۔ حضرت عبداللہؓ (ابن عمر) حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ لونڈی نے حضرت حفصہؓ پر جادو کیا اور اس کا اعتراف بھی کر لیا (اس لیے حضرت حفصہؓ نے اسے قتل کروا دیا) حضرت عثمانؓ نے معاملے کو حکومت کے سپرد کرنے کے بجائے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کو ناپسند فرمایا تھا۔

حافظ ہیثمی مجمع الزوائد (۶-۲۸۰) میں لکھتے ہیں کہ اس سند میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش مدنی ہے جو ضعیف ہے اور باقی راوی ثقہ ہیں۔ اسی طرح بیہقی نے السنن الکبریٰ (۸-۱۳۶) میں یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ امام شافعی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جادوگروں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اللہ ہی کو بہتر علم ہے کہ جادو شرک ہے۔

[۳] نسخہ شہید علی پاشا اور نسخہ لالہ میں "اسماعیل القاضی" لکھا ہے۔

کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے "حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيْفِ" (جادوگر کی سزا تلوار کے ذریعے اس کا قتل ہے) ابن المنذر کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند پر جرح کی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم ہے جو ضعیف ہے۔

سنن نسائیؒ اور ابوداؤدؒ میں حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت ہے کہ ایک نابینا آدمی نے اپنی ایک لونڈی کو، جس سے اس کی اولاد بھی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے ہوئے سنا تو اس نے اسے قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لونڈی کے خون کو ساقط قرار دیا۔

ل نسائی (۷-۱۰۷) کتاب تحریم الدم باب الحکم فی مَن سَبَّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں ایک نابینا آدمی کے پاس لونڈی تھی، جس سے اس کے دو بیٹے تھے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں بدزبانی کرتی اور گالیاں دیتی۔ وہ (مالک) اسے روکتا لیکن وہ اس حرکت سے باز نہ آتی۔ ایک رات اس نے حضورؐ کے بارے میں بدزبانی کی۔ وہ نابینا صحابی کہتے ہیں کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو میں نے ایک کدال لے کر اس کے پیٹ میں گھسا دیا جس سے وہ مر گئی۔ اس واقعہ کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا تو آپؐ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ ایک آدمی پر میرا حق ہے اور اس نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ میں اسے اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ وہ اٹھ کر سامنے آجائے۔ اس پر وہ نابینا صحابی آئے اور انھوں نے کہا یا رسولؐ اللہ! یہ معاملہ میرے ساتھ ہوا ہے۔ میں اس لونڈی کا مالک تھا۔ وہ میری اولاد کی ماں تھی۔ میرے ساتھ اس کا رویہ نہایت شائستہ اور نرم تھا۔ اس کے بطن سے میرے دو موتیوں جیسے بچے ہیں مگر وہ حضورؐ کے بارے میں بدزبانی کرتی اور گالیاں دیتی تھی۔ میں اسے منع کرتا لیکن وہ باز نہیں آتی تھی۔ گزشتہ رات اس نے آپؐ کی شان میں گستاخی کی تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے کدال لیا اور اس کے پیٹ پر رکھ کر اسے اوپر سے دبایا جس سے وہ قتل ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَلَا اشْهَدُوا اَنَّ دَمَهَا هَدَرٌ" (گواہ رہو کہ اس کا خون ساقط ہے)

ے ابوداؤد (۴-۱۲۹) کتاب الحدود باب "الحکم فیمن سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ابوعبید نے کتاب "الاموال" (ص ۲۵۹-۲۶۰) میں عکرمہ سے یہ روایت مرسل بیان کی ہے۔ اس روایت کی تائید ایک اور سند سے ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ امام شعبی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیا کرتی تھی تو ایک آدمی نے اس کا گلا گھونٹا جس سے مر گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو ساقط قرار دیا۔ یہ حدیث سنن ابوداؤد کتاب الحدود (۴) میں نقل کی گئی ہے۔ المنذری، مختصر ابوداؤد (۶-۲۰۰) میں لکھتے ہیں کہ بعض محدثین کے نزدیک امام شعبیؒ کا حضرت علیؓ سے سماع ثابت ہے جبکہ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ انھوں نے ان کو صرف دیکھا تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک ایسی عورت کو قتل کر دیا جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی تھیں (بحوالہ کتاب "الاموال" ص ۲۶۰)

امام ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کو اپنی کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

اس حدیث میں فقہی نکتہ یہ ہے کہ جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے اسے توبہ کرنے کے لیے نہیں کہا جائے گا بلکہ اسے فوراً قتل کر دیا جائے گا۔ جبکہ مرتد کا معاملہ اس سے قدرے مختلف ہے۔

ابن المنذر نے "الاشراف" میں لکھا ہے کہ عام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے۔

مگر امام ابو حنیفہ کی یہ رائے نقل کی گئی ہے کہ جو ذمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے اسے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اس سے بڑے جرم یعنی شرک کا تو پہلے ہی مرتکب ہوتا ہے، اس لیے اس سے چھوٹے جرم میں اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

"اس حدیث کی سند بہت اچھی ہے کیونکہ امام شعبی کی حضرت علیؓ سے ملاقات ثابت ہے۔ وہ کوفہ کے رہنے والے تھے اور اس وقت ان کی عمر بیس برس سے زیادہ تھی جب وہ حضرت علیؓ سے ملے۔ اس لحاظ سے یہ سند متصل ہے، لیکن اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ امام شعبی کا حضرت علیؓ سے سماع ثابت نہیں اور یہ روایت مرسل ہے تو بھی اس پر اجماع ہے کہ یہ حدیث حجت ہے کیونکہ امام شعبی کے مرتبہ و مقام کی وجہ سے ان کی مرسل روایات بھی صحیح شمار ہوتی ہیں اور یہ امر مسلّم ہے کہ امام شعبی، حضرت علیؓ اور ان کے ثقہ ساتھیوں کی روایات کے سب سے بڑے عالم تھے۔

لہ امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب "الصارم المسلول" کی فصل " اِسْتِتَابَةُ الْمُسْلِمِ وَقَبُوْلُ تَوْبَةِ مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" میں لکھا ہے کہ امام مالک اور احمد کی مشہور رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے کو نہ توبہ کرنے کے لیے کہا جائے گا اور نہ ہی توبہ کی وجہ سے وہ قتل سے بچ سکے گا۔ لیث بن سعد کی بھی یہی رائے ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ سلف اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ شوافع کی بھی ایک رائے یہی ہے۔ امام مالک اور احمد کی ایک رائے یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کا قول بھی یہی ہے اور امام شافعی کا مشہور مسلک بھی یہی ہے۔ اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح مرتد کی توبہ قبول کی جاتی ہے اسی طرح شاتم رسول کی توبہ بھی قبول کی جائے گی۔

ٹہ امام ابن تیمیہؒ اپنی مذکورہ کتاب کے ص ۳۲۱ میں لکھتے ہیں کہ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ مرتد کو توبہ کرنے کے لیے کہا جائے گا، امام مالک اور احمد کی یہی رائے ہے اور توبہ کے لیے اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ توبہ کے لیے کہنا واجب ہے یا مستحب۔ امام شافعی اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک ایسا کرنا مستحب ہے۔

سلہ "کشف الظنون" (۱-۱۰۳) کے مطابق کتاب کا مکمل نام "الاشراف علی مذاهب الاشراف" ہے۔ مصنف ابوبکر محمد بن ابراہیم نیشاپوری شافعی ہیں۔ وہ ابن المنذر کی کنیت سے معروف ہیں۔ ان کی وفات ۳۱۸ھ میں ہوئی۔ اس کی تیسری جلد "دار الکتب المصریۃ" میں موجود ہے۔ اس جلد کا آغاز "کتاب الشفعۃ" سے ہوتا ہے اور ختم "کتاب الغصب" پر ہوتی ہے۔ دار الکتب المصریۃ کی فہرست میں اس کا نام "الاشراف علی مذاهب اهل العلم" درج ہے۔

سمہ امام ابن تیمیہؒ محولہ بالا کتاب کے (ص ۱۰) پر لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

امام ابوحنیفہؒ کی اس رائے کے خلاف قوی دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کون ہے جو کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگائے کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائی ہے۔

کو گالی دینے سے نہ تو ذمی کا عہد ٹوٹتا ہے اور نہ ہی اسے قتل کیا جائے گا بلکہ اس جرم پر اس پر اس طرح تعزیر لگائی جائے گی جس طرح دوسرے جرائم کے ارتکاب پر اس کے خلاف تعزیری کارروائی کی جاتی ہے۔ امام طحاویؒ نے سفیان ثوریؒ کا بھی یہی مسلک بیان کیا ہے۔ اس طرح کے جرائم کی سزا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بارے میں ذمیوں کو قتل کرانے کے جو واقعات منقول ہیں ان کو یہ حضرات مصلحت اور سیاسی ضرورت پر محمول کرتے ہیں۔

ؔلہ صحیح بخاری کی کتاب "المغازی" باب "قتل کعب بن اشرف" (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۴۰۳۷) میں اس کی تفصیلات اس طرح ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَن لِکعبِ بنِ الاشرف؟ فانہ قد آذی اللہ ورسولہٗ (کون ہے جو کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگائے؟ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچائی ہے) اس پر محمد بن مسلمہ آگے بڑھے اور انھوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ چاہتے ہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں۔ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس سے کوئی بات کہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں کہہ لینا۔ تو محمد بن مسلمہ کعب بن اشرف کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ یہ شخص (مراد ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے صدقہ مانگتا ہے۔ اس نے ہمیں مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ میں تم سے قرض لینے کے لیے آیا ہوں۔ کعب نے کہا کہ اللہ کی قسم تم اس سے اکتا بھی جاؤ گے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ اب ہم اس کے پیچھے چل ہی پڑے ہیں تو ہم نہیں چاہتے کہ اس کا انجام دیکھے بغیر اس کو چھوڑ دیں۔ ہم اس وقت چاہتے ہیں کہ تم ایک یا دو وسق کھجوریں ہمیں ادھار دے دو (وسق = ۶۰ صاع۔ ایک صاع = تین کلو) عمرو نے کئی دفعہ یہ حدیث ہمیں سنائی لیکن انھوں نے کبھی وسق، دو وسق کا ذکر نہ کیا۔ میں نے پوچھا کہ یہاں اس طرح ہے "وسقا او وسقین" عمرو نے جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ وسق میں "وَسْقًا اَوْ وَسْقَیْنِ" (ایک یا دو وسق) ہے۔ کعب نے کہا تو پھر کوئی چیز میرے پاس رہن رکھو۔ انھوں نے کہا کہ کیا رہن رکھیں؟ کعب نے کہا "اپنی عورتیں"۔ انھوں نے کہا کہ تمھارے پاس عورتیں کیسے رہن رکھیں جب کہ تم عرب کے حسین ترین آدمی ہو۔ اس نے کہا تو پھر اپنے بیٹے رکھو۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ہمارے لیے باعثِ ننگ ہوگا۔ لوگ ہمارے بیٹوں کو طعنے دیا کریں گے کہ یہ ایک یا دو وسق کھجوروں کے بدلے رہن رکھے گئے تھے، البتہ ہم تمھارے پاس اسلحہ رکھ سکتے ہیں۔ اس پر فریقین متفق ہو گئے۔ محمد بن مسلمہ رات کو کعب کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ کعب کے رضاعی بھائی ابو نائلہ بھی تھے۔ محمد بن مسلمہ نے کعب کو آواز دی۔ کعب کی بیوی نے پوچھا اس وقت کہاں جاتے ہو؟ کعب نے کہا کہ یہ محمد بن مسلمہ اور میرا بھائی ابو نائلہ ہیں، انھوں نے بلایا ہے۔ اس کی بیوی نے کہا "مجھے تو یہ آواز ایسے لگی ہے جیسے اس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں"۔ کعب نے کہا کہ یہ تو میرا بھائی محمد بن مسلمہ اور میرا رضاعی بھائی ابو نائلہ ہیں اور معزز آدمی کو تو رات کو بھی اگر نیزہ زنی کے لیے پکارا جائے تو وہ اس پکار پر لبیک کہتا ہے۔ محمد بن مسلمہ کے ساتھ دو اور آدمی بھی اندر گئے جن میں سے بعض کے ناموں کا عمرو (راوی) نے ذکر کیا ہے اور عمرو کے علاوہ دوسرے راویوں

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے کچھ لوگ اس کے پاس گئے اور اسے بلا کر انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

المفضلؒ نے اپنی کتاب میں اور "شرف المصطفیٰ" کے مصنف نے اپنی تالیف میں اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ انھوں نے ایک ٹوکری میں اس کا سر رکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔

ایک آدمی نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنی زبان سے اذیت پہنچائی تو ابو برزہ اسلمی نے اسے قتل کرنا چاہا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اسے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کا یہ مقام نہیں ہے کہ اس کو گالیاں دینے والے کو قتل کر دیا جائے۔

نے کہا ہے کہ محمدؓ بن مسلمہ کے ساتھ ابو عبس بن جبیر، حارث بن اوس اور عباد بن بشر تھے۔ محمدؓ بن مسلمہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کعب جب آیا تو میں اس کے سر کے بال پکڑ کر سونگھوں گا۔ جب تم دیکھو کہ میں نے اسے اچھی طرح قابو کر لیا ہے تو اسے مار ڈالنا۔ کعب ہتھیار بند ہو کر ان کے پاس آیا اور اس وقت وہ خوشبو میں لبا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اتنی عمدہ خوشبو اس سے پہلے مجھے کبھی نہیں ملی۔ محمدؓ بن مسلمہ نے کہا کہ تم مجھے اپنے سر کی خوشبو سونگھنے کی اجازت دیتے ہو؟ اس نے کہا "ہاں"۔ محمدؓ بن مسلمہ نے اس کے سر کو سونگھا، پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم بھی سونگھو۔ اس کے بعد دوبارہ وہ خود سونگھنے لگے۔ جب انھوں نے اس (کعب) کو اچھی طرح سر سے قابو کر لیا تو ساتھیوں سے کہا کہ اپنا کام کر گزرو، چنانچہ ان لوگوں نے اسے قتل کیا اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر آپؐ کو خبر دی۔

امام مسلم نے بھی یہ روایت صحیح مسلم کتاب "الجہاد" باب "قتل کعب بن اشرف طاغوت الیھود" میں نقل کی ہے۔

عمیر بن امیہ نے اپنی ایک بہن کو قتل کر دیا جو مشرکہ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ ہوا یوں کہ ایک دن عمیر تلوار لے کر اپنے ساتھ لے کر گئے اور اس (بہن) کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمیر کے بھانجے چیخ اٹھے کہ ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ کس نے ہماری ماں کو قتل کیا ہے۔ انھوں نے حضرت عمیرؓ سے کہا کہ تم ہماری ماں کو قتل کرتے ہو جبکہ دوسرے لوگوں کے ماں باپ بھی مشرک ہیں اور ان کو تم قتل نہیں کرتے؟ حضرت عمیر کو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کی بہن کے بدلے کسی ایسے شخص کو قتل نہ کر دیا جائے جو قاتل نہ ہو، چنانچہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو سارا قصہ سنایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے اپنی بہن کو قتل کر دیا ہے؟ عمیر رضی اللہ عنہ نے اثبات میں جواب دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیوں؟ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ آپؐ کے بارے میں مجھے اذیت پہنچایا کرتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے بیٹوں کی طرف آدمی بھیجا جس نے جا کر ان سے واقعہ دریافت کیا۔ انھوں نے عمیرؓ کے علاوہ کسی اور پر قتل کا الزام لگایا۔ اس آدمی نے ان کو بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھاری ماں کا خون ساقط کر دیا ہے۔ طبرانی نے یہ روایت دو تابعین سے کی ہے جن میں سے ایک ثقہ ہیں اور اس کے باقی راوی بھی ثقہ ہیں۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۶-۲۶۰)

ؔ سب نسخوں میں الفضل لکھا ہے جو غلط ہے۔ المفضل "معانی القرآن" کے مصنف ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس ارشادؓ میں دلیل ہے کہ جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائے، یا آپؐ میں عیب اور نقص نکالے اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ؑ عیسیٰ بن القاسم نے یہ روایت "المستخرجۃ" میں نقل کی ہے۔

ابن وہب نے امام مالک سے روایت بیان کی ہے کہ اگر کوئی شخص تحقیر کے جذبے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بٹن کے بارے میں بھی کہے کہ وہ میلا تھا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

عیسیٰ بن القاسم نے "المستخرجۃ" میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص بھی نبوت کا علی الاعلان یا بخفیہ دعویٰ کرے اسے مرتد کی طرح توبہ کا موقع دیا جائے گا، اگر وہ رجوع کر لے تو ٹھیک، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس کی وراثت مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ؑ

ؑ سنن ابوداؤد، کتاب الحدود، باب الحکم فیمن سبّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۴ - ۱۳۰) میں روایت اس طرح ہے کہ ابو برزہ نے کہا کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا کہ آپؓ کو ایک آدمی پر سخت غصہ آیا اور آپ نے اسے بری طرح ڈانٹا۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ کے خلیفہ! مجھے اجازت دیجیے کہ اس کا سر قلم کر دوں۔ میری اس بات سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا غصہ فرو ہو گیا، آپ اٹھے اور اندر چلے گئے۔ پھر آپ نے مجھے اندر بلوایا اور فرمایا کہ تم نے کیا بات کہی تھی؛ میں نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ اس کا سر قلم کر دوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں حکم دے دیتا تو کیا واقعی تم ایسا کر گزرتے؛ میں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم ایسا نہ کرنا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کی بھی یہ حیثیت نہیں۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ روایت یزید کے الفاظ میں کی گئی ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

سنن نسائی (۷ - ۱۰۹) میں ہے کہ مجھے حضرت ابوبکرؓ نے ڈانٹا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کی یہ حیثیت نہیں۔

ؑ ابوداؤد، اسماعیل القاضی، ابوبکر عبدالعزیز، قاضی ابویعلیٰ اور بعض دوسرے علماء نے اس کو دلیل بنایا ہے۔

ؑ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت محمد بن عبداللہ، اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور خاتم الانبیاء ہیں۔ آپؐ کے بعد نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ نبی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب ۴۰) (محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد ثابت ہے اِنِّیْ خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ وَلَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (میں خاتم الانبیاء ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے اس کے کفر پر امت کا اجماع ہے۔ شرح العقیدۃ الطحاویۃ (ص ۱۶۷) میں ہے کہ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ اور یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ اگر وہ مضبوط دلائل اور معجزات پیش کرے تو اس کی تکذیب کیسے کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایسا ممکن ہی نہیں اور یہ محال کو فرض کرنے والی بات ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے واضح

"الواضحۃ" میں امام مالک، ابن قاسم اور دوسرے ائمہ کی یہی رائے نقل کی گئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ اسے توبہ کا موقع دیے بغیر قتل کر دیا جائے گا۔ یہ رائے ابن عبدالحکم نے امام مالکؒ سے نقل کی ہے۔

طور پر فرما دیا کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں تو اس کے بعد یہ محال ہے کہ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور اس کا جھوٹ سامنے نہ آسکے۔

ابن قدامہ المغنی (۸ - ۵۶۵) میں لکھتے ہیں کہ جو شخص (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) نبوت کا دعویٰ کرے وہ بھی اور جو اس کی تصدیق کریں وہ بھی مرتد ہیں، جیسا کہ مسیلمہ اور طلیحہ اسدی نے نبوت کا دعویٰ کیا، تو وہ اور ان کے سب ماننے والے مرتد قرار پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَخْرُجَ ثَلَاثُونَ كَذَّابُونَ كُلٌّ يَدَّعِي أَنَّهُ رَسُولُ اللهِ "(قیامت اس وقت تک برپا نہیں ہوگی جب تک تیس ایسے کذاب نہ پیدا ہو جائیں جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے)

كِتَابُ الْجِهَادِ[1]

مشرکین کے پہلے مقتول اور پہلے مال غنیمت کے بارے میں رسول اللہ کا فیصلہ

---

[1] لغت میں جہاد کا مفہوم ہے انتہائی کوشش کرنا اور اپنی پوری طاقت اور صلاحیت کسی کام کے لیے صرف کرنا۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے منکرین حق کے خلاف جدوجہد، انھیں حق کی دعوت دینا اور اگر قبول نہ کریں اور اس کے مقابلے پر اتر آئیں تو ان کے خلاف جنگ کرنا۔ دیکھیے شرح فتح القدیر (۴-۲۷۷)

جہاد کی تین قسمیں : ۱۔ اعلانیہ دشمن کے خلاف جہاد ۲۔ شیطان کے خلاف جہاد اور ۳۔ نفس کے خلاف جہاد۔ ان آیات میں یہ تینوں ہی قسم کے جہاد شامل ہیں۔ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ (الحج ۷۸) (اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے) اور إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (الانفال : ۷۲) (وہ لوگ جو ایمان لائے جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ذریعے جہاد کیا)

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاد صرف اس غرض کے لیے فرض کیا گیا ہے کہ دین کی حفاظت کی جائے، اس کی نشرواشاعت اور تبلیغ کی جائے اور ظالموں، جابروں اور خدا کے باغیوں کے تسلط و اقتدار کا خاتمہ کیا جائے لیکن متعصب مستشرقین نے جہاد کے اس اصلاحی مفہوم کو بدل دیا اور انھوں نے کہا کہ جہاد تو غیر مسلموں کے خلاف جور و جبر کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے جہاد کا ترجمہ مقدس جنگ (HOLY WAR) کیا۔ دیکھیے گولڈ زیہر کی کتاب "العقیدۃ والشریعۃ" (ص ۱۰۶-۱۲۵)

یہ جہاد کی ایسی تشریح ہے جس کا یہ لفظ متحمل ہی نہیں ہو سکتا۔ جو بھی متعصب یہ کہتا ہے کہ جہاد غیر مسلموں کو جبراً اسلام میں داخل کرنے کے لیے جنگ کا نام ہے، وہ اسلام پر افترا اور بہتان باندھتا ہے۔

جہاد فرض کفایہ ہے جب کچھ لوگ اس فریضہ کو ادا کریں تو باقیوں سے وہ ساقط ہو جاتا ہے۔ جہاد میں کفایت کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ جہاد کے لیے تیار رہیں اور وہ میدان میں جنگ لڑیں، چاہے ان کی حیثیت باقاعدہ منظم فوج کی ہو، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے دور میں تھا یا وہ رضاکارانہ طور پر اس کام کے لیے اس طرح عملاً تیار رہیں کہ دشمن کا مقابلہ بخوش اسلوبی سے کر سکیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوتا تھا کہ آپؐ اپنے صحابہؓ کی اس طرح تربیت فرماتے تھے کہ وہ بوقت ضرورت یہ کام احسن طریقے سے انجام دیتے تھے۔

تین صورتوں میں جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے :

احمد بن محمد بن النحاس المعروف بابن النحاس ابو جعفر مصری کی کتاب "معانی القرآن"

۱۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہو جائے اور ان میں مڈبھیڑ ہونے لگے تو وہاں پر موجود ہر شخص پر لازم ہوگا کہ وہ ڈٹ کر میدان میں مقابلہ کرے اور وہاں سے نہ بھاگے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات حجت ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا۔ (انفال: ۴۵)
اے اہلِ ایمان! جب کسی گروہ سے تمھاری مڈبھیڑ ہو تو ثابت قدمی دکھاؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ۔ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ (الانفال: ۱۵-۱۶)
اے اہلِ ایمان! جب تمھاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو پیٹھ نہ پھیرو۔ اور جو شخص کسی جنگی چال یا اپنے کسی گروہ میں شامل ہونے کے علاوہ کسی اور وجہ سے پیٹھ پھیرے وہ اللہ کے غضب کے ساتھ پلٹتا ہے۔

۲۔ جب کفار کسی ملک پر حملہ آور ہو جائیں تو وہاں کے باشندوں پر قتال اور مسلمان ملک کا دفاع فرض ہو جاتا ہے۔

۳۔ جب سربراہ عام لام بندی کا حکم دے دے تو جہاد میں شمولیت فرض ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ (توبہ: ۳۸)
(اے اہلِ ایمان تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تمھیں اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہا جاتا ہے تو تم زمین کے ساتھ چمٹے جاتے ہو) دیکھیے "المغنی" (۹-۱۷۹)

جہاد کا معاملہ سربراہ کے سپرد ہوتا ہے اور رعیت پر لازم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں اس کی اطاعت کرے۔ سربراہِ مملکت حالات کے پیشِ نظر اجتہاد کر کے مناسب اقدامات کرنے مثلاً قلعے بنوانے، خندقیں کھودنے، جنگ و جدال اور دشمن کی چالوں کے توڑ میں ماہر افراد کو امیر بنانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یہ جہاد سے متعلق چند ضروری مباحث تھے، ان کی تفصیلات کے لیے اس موضوع پر کثیر تعداد میں موجود کتب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

لہ النحاس: یہ احمد بن محمد بن اسماعیل بن یونس نحوی ہیں۔ ابن نحاس ابو جعفر مصری کی کنیت سے معروف ہیں۔ اہلِ علم و فضیلت حضرات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ تفسیر، لغت اور نحو کے موضوعات پر اور معلقات، مفضلیات اور سیبویہ کی الکتاب کی شروح کے سلسلے میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ان کی وفات ۳۳۸ھ میں ہوئی۔ "وفیات الاعیان"، البغیۃ، المنتظم اور "فہرست ابن خیر" میں ان کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ ان کی کتاب "معانی القرآن" کی پہلی جلد سورۂ مریم کے آخر تک ہے۔ وہ مخطوطے کی شکل میں "دار الکتب المصریۃ" میں تفسیر ۲۸۵ نمبر کے تحت موجود ہے۔ دیکھیے فہرست دار الکتب (۱-۶۲)

اسماعیل القاضی کی کتاب "احکام القرآن" اور سیرت ابن ہشام میں الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کو مہاجرین کے ایک دستے کے ساتھ روانہ فرمایا۔ اس دستے میں انصار میں سے ایک شخص بھی نہیں تھا۔

سیرت ابن ہشام کے مطابق آٹھ رجب کو اور "احکام القرآن" کے مطابق جمادی الآخر میں یہ دستہ روانہ فرمایا گیا۔ "احکام القرآن" میں ہے کہ ابن الحضرمی جمادی الآخر کی آخری یا رجب کی پہلی تاریخ کو قتل ہوا جبکہ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ یہ واقعہ رجب کے آخر اور شعبان کے آغاز میں پیش آیا۔ النحاس اور اسماعیل لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ ابن الحارث یا عبیدہ ابن الحارث کو اس دستے کا امیر مقرر کیا لیکن جب وہ روانہ ہونے لگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ان پر گریہ طاری ہو گیا۔ تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کو اس مہم کا امیر بنایا۔ آپؐ نے ایک خط لکھوا کر انھیں دیا اور فرمایا کہ فلاں مقام پر پہنچنے سے پہلے اسے نہ پڑھنا اور نہ ہی اپنے ساتھیوں میں سے کسی سے زبردستی اپنی بات منوانا۔

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ دو دن کی مسافت طے کرنے سے پہلے اس خط کو نہ پڑھنا، چنانچہ دو دن کے سفر کے بعد گرامی نامہ پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا:

> "میرا یہ خط پڑھنے کے بعد اپنا سفر جاری رکھو، جب مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے مقام پر پہنچ جاؤ تو وہاں قریش کے حالات کی ٹوہ لگانا اور ہمیں ان کی خبر بھیجنا۔"

حضرت عبداللہ بن جحش نے گرامی نامہ پڑھنے کے بعد "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" پڑھا اور کہا "سمع وطاعۃ" (حضورؐ کا ارشاد سر آنکھوں پر) پھر انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جو میرے ساتھ جانا چاہے وہ چلے اور جو واپس جانا چاہے اسے بھی اجازت ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ میں کسی کو زبردستی اپنے ساتھ لے چلوں۔[۵]

---

[۱] اسماعیل: یہ ابن اسحاق بن اسماعیل بن حماد بن زید الجہضمی الازدی ہیں۔ مالکی فقہ میں امام تھے۔ مسند اور علوم القرآن پر متعدد کتب کے مصنف ہیں۔ ۲۸۲ھ میں وفات ہوئی۔ تاریخ بغداد (ص ۶ ۲۸۴) میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

[۲] سیرۃ ابن ہشام (۱-۶۰۱) یہ واقعہ ابن اسحاق سے روایت کیا ہے۔ ابن اسحاق اس کے آخر میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث زہری اور یزید بن رومان نے عروہ بن زبیر سے بیان کی ہے۔ بیہقی نے "السنن الکبریٰ" (۹-۱۱) میں عن زہری عن عروہ کی سند کے ساتھ مرسل روایت کی ہے۔ یہاں یہ روایت غیر مکمل ہے لیکن دوسری جگہ (۹-۵۸، ۵۹) یہ مکمل نقل کی ہے۔

[۳] یہ قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور قرآن حکیم کی اس آیت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

[۴] سیرت ابن ہشام (۱-۶۰۲)

[۵] تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ پھر عبداللہ بن جحش نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اسماعیل قاضی اور نحاس کہتے ہیں کہ وہاں سے وہ آدمی پلٹ آئے لیکن ابن ہشام سیرت میں لکھتے ہیں کہ واپس کوئی بھی نہیں آیا تھا البتہ ہوا یوں کہ نجران کے مقام پر پہنچ کر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ دونوں اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور حضرت عبداللہ بن جحش اپنے دوسرے ساتھیوں کو ساتھ لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وادی نخلہ میں پہنچے اور وہاں ڈیرے ڈال دیے۔ وہاں سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ منقہ اور دوسرا سامان تجارت لے کر گزرا۔ اس قافلے میں عمرو ابن الحضرمی بھی تھا۔ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ الحضرمی کا اصل نام عبداللہ بن عباد[۱] اور بعض کے نزدیک مالک بن عباد تھا۔ وہ الصدف کا بھائی تھا اور الصدف کا نام عمرو بن مالک تھا۔ یہ السکون بن اشرس کندی کا بھائی تھا۔ مسلمانوں نے ان کے بارے میں آپس میں مشورہ کیا کہ یہ رجب کی آخری تاریخ ہے، اگر ہم ان کو چھوڑ دیتے ہیں تو یہ ہماری زد سے بچ جائیں گے اور حرم کی حدود میں داخل ہو کر محفوظ ہو جائیں گے اور اگر آج ان کو قتل کرتے ہیں تو یہ حرمت والے مہینے میں قتل ہوگا۔

مسلمانوں کو اس بارے میں تردد ہوا ۔۔۔ وہ کسی اقدام سے ڈرنے لگے لیکن آخر کار انھوں نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ جنھیں قتل کیا جا سکے انھیں قتل کر دیا جائے۔ اور ان کے مال پر قبضہ کر لیا جائے۔ واقد[۲] بن عبداللہ تمیمی نے عمرو ابن الحضرمی کے تیر مارا جس سے وہ قتل ہو گیا۔ اس نے عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کر لیا۔ نوفل بن عبداللہ

نے حکم دیا ہے کہ میں نخلہ کے مقام پر پہنچ کر قریش کے حالات اور سرگرمیوں کی ٹوہ لگاؤں اور آپ نے مجھے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ میں تم میں سے کسی کو ساتھ دینے پر مجبور کروں۔

آگے سیرت میں یہ بات یہاں مکمل ہوتی ہے کہ عبداللہ بن جحشؓ نے کہا کہ تم میں سے جسے شہادت کی تمنا ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جو اسے پسند نہ کرتا ہو وہ واپس جا سکتا ہے۔ باقی رہا میرا معاملہ تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق آگے جا رہا ہوں۔ پھر وہ اور ان کے ساتھی بھی آگے چلے گئے اور اس میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہا۔ طبری میں بھی یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

[۱] "الاصابۃ" میں علاء بن الحضرمی کے تذکرے میں اس کا نام عبداللہ بن عباد لکھا گیا ہے۔

[۲] سیرت ابن ہشام میں ہے کہ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عثمان بن عبداللہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ مخزومی ہیں۔ حکم بن کیسان، ہشام بن مغیرہ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ جب انھوں نے مسلمانوں کو دیکھا تو ان سے خوف زدہ ہو گئے مگر عکاشہ بن محصن کو جب انھوں نے دیکھا کہ اس نے اپنے بال منڈوائے ہوئے ہیں تو وہ مطمئن ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں نے ان کے بارے میں مشورہ کیا۔ "طبری" میں بھی یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا ہے۔

[۳] یہ واقد بن عبداللہ تمیمی بن عبد مناف بن عرین بن ثعلبہ بن یربوع الحنظلی ہیں۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے آغاز میں ان کا انتقال ہوا۔

بھاگ گیا اور اسے گرفتار نہ کیا جا سکا۔ عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھی قافلے کا مال اور دو قیدی لے کر واپس مدینہ منورہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے[1]۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا اَمَرْتُكُمْ بِقِتَالٍ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ"[2] (میں نے تو تمھیں حرمت والے مہینے میں لڑائی کا حکم نہیں دیا تھا) آپ نے قافلے کے مال میں سے کوئی چیز لینے سے انکار کر دیا اور دونوں قیدیوں کو وقف کر دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو وہ لوگ پریشان ہو گئے اور انھیں خیال ہوا کہ وہ ہلاک ہو گئے۔ دوسرے مسلمانوں نے بھی ان کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ قریش نے پراپیگنڈا کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں نے حرمت والے مہینے کی بے حرمتی کی، اس میں قتل و غارت گری کی اور لوگوں کو قیدی بنایا۔ مسلمانوں میں سے جنھوں نے اس پراپیگنڈہ کا جواب دیا انھوں نے کہا کہ یہ واقعہ شعبان میں پیش آیا۔ یہودیوں نے بھی اس بارے میں تک بندیاں کیں۔ جب لوگوں نے اس سلسلے میں زیادہ باتیں چھانٹیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۔ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ[3] وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ (البقرة - ۲۱۷)

یہ لوگ حرمت والے مہینوں میں جنگ کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں۔ تم کہہ دو کہ ان مہینوں میں جنگ بُری بات ہے لیکن اللہ کی راہ اور مسجد حرام سے لوگوں کو روکنا، اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو ان کے گھروں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

یعنی یہ ابن الحضرمی کے قتل سے بھی بڑی بات ہے[4]۔ اور فتنہ کا مطلب ہے اللہ کے ساتھ کفر اور بتوں کی عبادت

---

[1] "طبری" میں یہاں اضافہ ہے کہ عبداللہ بن جحش کی اولاد میں سے کسی نے ذکر کیا کہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس میں سے پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب مال غنیمت میں سے "خمس" نکالنے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حضرت عبداللہؓ نے پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے الگ کر دیا اور باقی مال اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ (طبری: ۲-۱۲۷۵)

[2] "طبری" میں اضافہ ہے کہ انھوں نے کہا کہ تم نے وہ کچھ کیا جس کا تمھیں حکم نہیں دیا گیا تھا اور حرمت والے مہینے میں تم نے قتال کیا جبکہ تمھیں اس کے لیے کہا نہیں گیا تھا۔

[3] نسخہ لالا میں "كُفْرٌۢ بِهٖ" کا کلمہ حذف ہو گیا ہے۔

[4] سیرت ابن ہشام میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے حرمت والے مہینے میں قتل کیا ہے تو انھوں نے بھی تو تمھیں اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکا ہے۔ انھوں نے اللہ کے ساتھ کفر بھی کیا ہے اور تمھیں مکہ سے نکالا بھی ہے جبکہ تم مکہ کے رہنے والے تھے اور تمھارے گھر بار اور اہل و عیال وہاں تھے۔ ان کا تمھیں مکہ سے نکالنا اللہ کے نزدیک تمھارے ہاتھوں ان کے ایک آدمی کے قتل ہو جانے سے بڑی بات ہے۔ "وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ" کا مطلب یہ ہے

اور بہ ہزیمتیں اس سب کچھ سے بڑھ کر ہیں۔ اس سے مسلمانوں کا اضطراب ختم ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلے کے مال اور دونوں قیدیوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ قریش نے عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کی رہائی کے لیے فدیہ بھیجا جس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم فدیہ لے کر ان دونوں کو اس وقت تک رہا نہیں کریں گے جب تک کہ ہمارے دونوں ساتھی (سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہؓ بن غزوان) واپس نہ آجائیں کیونکہ ہمیں ان دونوں کے بارے میں خدشہ ہے کہ کہیں تم انھیں قتل نہ کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمھارے ان دونوں آدمیوں کو قتل کر دیں گے۔ حضرت سعدؓ اور عتبہؓ آگئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں (عثمان اور حکم) کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ ان میں سے حکم بن کیسان نے تو اسلام قبول کر لیا اور مدینہ منورہ ہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سکونت اختیار کر لی۔ بعد میں یہ "بئر معونہ" والے واقعہ میں قتل ہو گئے[۱]۔ عثمان مکہ مکرمہ چلا گیا اور وہیں حالتِ کفر میں اس کی موت واقع ہوئی۔

کہ وہ مسلمانوں کو اس طرح ستاتے تھے کہ وہ اسلام چھوڑ کر کفر قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں اور اللہ کے نزدیک ان کی یہ حرکت قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ پھر وہ ابھی اس ناپاک روش پر اب بھی قائم ہیں۔ نہ انھیں اپنی اس حرکت پر کوئی ندامت ہے اور نہ انھوں نے توبہ کی ہے۔

جب قرآن پاک میں یہ آیات نازل ہوئیں تو مسلمانوں کی پریشانی ختم ہوئی اور جس ذہنی اور نفسیاتی کرب میں وہ مبتلا تھے اس سے انھیں نجات ملی۔ "طبری" نے اس اضافے کا ذکر نہیں کیا۔

[۱] سیرت ابن ہشام میں ہے کہ "وہ شہید ہو گئے"۔ طبری (۲-۱۲۷) میں بھی ایسا ہی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اس روایت میں سُدی نے محمد بن اسحاق، واقدی اور دوسرے راویوں سے اختلاف کیا ہے۔ مجھے موسیٰ بن ہارون نے، اس نے عمرو بن حماد سے، اس نے اسباط سے اور اس نے سُدی سے روایت بیان کی ہے کہ "یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ" والی آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ حضرت عبداللہؓ بن جحش کی سرکردگی میں بھیجا۔ اس میں عمارؓ بن یاسر، ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ، سعد بن ابی وقاص، بنی نوفل کے حلیف عتبہ بن غزوان سہیل بن بیضاء، عامر بن فہیرہ اور حضرت عمرؓ کے حلیف واقد بن عبداللہ الیربوعی شریک تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہؓ بن جحش کو ایک خط لکھوا کر دیا اور فرمایا کہ مقام "بطن ملل" سے پہلے اسے نہ کھولنا۔ وہاں پہنچ کر اس نامۂ مبارک کو کھولا اور پڑھا گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ اپنا سفر جاری رکھو یہاں تک کہ وادیٔ نخلہ میں پہنچ جاؤ۔ عبداللہ بن جحش نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جو شخص موت کی تمنا رکھتا ہو وہ اپنی وصیت کرے اور میرے ساتھ چلے۔ میں تو وصیت کر کے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق آگے چل رہا ہوں۔ وہاں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہؓ بن غزوان کی سواری گم ہو گئی اور وہ اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور باقی قافلہ آگے چلا گیا اور وادیٔ نخلہ میں پہنچ گیا۔ وہاں انھیں حکم بن کیسان ملا۔

یہ پہلا مالِ غنیمت تھا جو مسلمانوں کو ملا۔ عمرو بن الحضرمی پہلا مقتول تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان مسلمانوں کے ہاتھ آنے والے پہلے قیدی تھے۔

مکی کی کتاب "الھدایۃ"[1] اور بعض دوسری کتابوں میں ہے کہ یہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی جنگ تھی۔ یہ پہلا مالِ غنیمت تھا اور مشرکین میں سے یہ پہلا مقتول تھا۔[2] مکی کہتے ہیں کہ ابنِ وہب نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت لوٹا دیا اور مقتول کی دیت ادا کی۔ یہ واقعہ ہجرت کے چودہ ماہ بعد پیش آیا۔

اسماعیل قاضی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عبداللہ بن جحش کو سربمہر خط دے کر بھیجا اور حکم دیا کہ دو دن کے سفر کے بعد ہی اسے کھولا جائے۔ اس میں فقہی نکتہ یہ ہے کہ لکھی یا چھپی ہوئی وصیت کی بنیاد پر شہادت جائز ہوگی۔[3] امام مالک اور بہت سے اسلاف کا یہی مسلک ہے۔ امام حسنؒ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ لکھے یا چھپے ہوئے خط کی بنیاد پر شہادت کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس میں ظلم پایا جاتا ہے۔

---

[1] اس کتاب کا نام "الھدایۃ الی بلوغ النھایۃ فی التفسیر وعلوم القرآن ہے" یہ ایک عظیم کتاب ہے۔ یہ ستر اجزاء پر مشتمل ہے اور اس وقت یہ کہیں دستیاب نہیں۔ اس کے مصنف مکی کا تعارف یہ ہے۔ مکی بن ابوطالب حموش بن محمد بن مختار القیسی القیروانی۔ ان کی وفات ۴۳۷ھ میں ہوئی۔ "جذوۃ المقتبس" (ص ۳۲۹) "الصلۃ" (ص ۵۹۷) اور "انباء الرواۃ" (۳-۳۱۳) میں ان کا مفصل تذکرہ ہے۔ یہ امام ابن الطلاع کے اساتذہ میں سے ہیں۔

[2] نسخہ شہید علی پاشا اور نسخہ لالہ لی میں یہ اضافہ ہے کہ اسماعیل قاضی کی کتاب "الاحکام" میں بھی ہے کہ یہ پہلا شخص تھا جو مشرکین میں سے قتل ہوا۔

حافظ ابن حجر کی کتاب "الاصابۃ" میں ہے کہ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ بنو یربوع اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ مشرکین میں سے پہلا مقتول ان کے قبیلے کے ہاتھوں قتل ہوا، چنانچہ اس بارے میں حضرت عمرؓ نے شعر بھی کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ نخلہ کے مقام پر ابن حضرمی کے خون سے ہم نے اپنے نیزوں کو سیراب کیا۔

[3] اس سلسلے میں یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ خط (HAND. WRITING) جانا پہچانا ہو یا چٹھی سربمہر ہو اور کوئی ماہر اور ثقہ آدمی اس خط کی شہادت دے۔ حضرت طاؤس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خط پہچان کر اس کی شہادت کو جائز قرار دیتے تھے۔ عبدالرزاق نے "المصنف" (۸-۳۵۴) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جاسوس[1] کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم

صحیح بخاریؒ اور دوسری کتب احادیث میں ایاس بن سلمہ بن اکوع سے روایت ہے، وہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مشرک[2] مہمان بن کر آیا۔ اس نے کھانا کھایا اور چپکے سے کھسک گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کو پکڑ کر قتل کر دو۔ لوگوں نے جلدی جلدی اس کا تعاقب کیا اور حضرت ابیؓ تو گھوڑے سے بھی تیز دوڑتے تھے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اس تک پہنچ گئے۔ انھوں نے اس کی سواری کی نکیل پکڑ لی اور اسے قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا مالِ غنیمت حضرت ابیؓ کو دے دیا۔ عبید اللہ بن ابی رافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ

---

[1] لسان العرب (۲-۸۰م) میں ہے کہ "جاسوس" اس شخص کو کہتے ہیں جو نقصان دہ رازوں کی ٹوہ لگائے اور اس کے مقابلے میں "ناموس" وہ شخص ہے جو خیر کے پہلوؤں کا کھوج لگائے۔

[2] صحیح بخاری کتاب "الجہاد" باب "اَلْحَرْبِیُّ اِذَا دَخَلَ دَارَالْاِسْلَامِ بِغَیْرِ اَمَانٍ" (فتح الباری میں حدیث ۳۰۵۱) یہ روایت صحیح بخاری میں ان الفاظ میں ہے۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے کہ مشرکین کا ایک جاسوس آپؐ کے پاس آیا۔ وہ صحابہ کرامؓ کے پاس بیٹھا کچھ باتیں کرتا رہا پھر کھسک گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اطلبوه فاقتلوه" (اسے تلاش کر کے قتل کر دو) (حضرت ابیؓ) نے اسے قتل کر دیا تو حضورؐ نے اس کا مالِ غنیمت حضرت ابیؓ کو دے دیا۔"

یہ حدیث "سنن ابن ماجہ" (۲-۹۲۶) کتاب "الجہاد" باب "المبارزة والسلب" میں ہے۔ بوصیریؒ "الزوائد" میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح اور راوی ثقہ ہیں۔ سنن ابوداؤد (۳-۴۸) کتاب "الجہاد" باب "الجاسوس المستامن" میں بھی یہ حدیث ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضرت ابیؓ کہتے ہیں کہ میں نے دوسروں سے پہلے پہنچ کر اس (جاسوس) کو قتل کر دیا اور اس کا سامان اپنے قبضے میں کر لیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مال مجھے عطا فرما دیا۔

المنذریؒ مختصر ابی داؤد" (۴-۶) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری اور نسائی نے بھی روایت کی ہے۔ بخاری کی روایت کا ذکر تو ہو چکا ہے اور شیخ عبدالصمد شرف الدین نے "تحفۃ الاشراف" (۴-۳۷) میں لکھا ہے کہ نسائی نے "السنن الکبریٰ" میں کتاب "السیر" میں یہ روایت نقل کی ہے۔

[3] تمام نسخوں میں یہاں لفظ "عسین" ہے جس کا مطلب ہے کہ جاسوس آیا۔ لیکن نسخہ حرم مکی میں یہ لفظ ساقط ہو گیا ہے۔

[4] امام احمدؒ نے اپنی "مسند" (۱-۷۹) میں یہ روایت تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس کی سند یہ ہے۔ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ عَنْ عَمِّهٖ

کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے، زبیرؓ کو اور مقدادؓ کو حکم دیا کہ تم چلتے جاؤ یہاں تک کہ روضة الخاخ[1] کے مقام پر پہنچ جاؤ، وہاں تمہیں ایک عورت ملے گی۔ اس کے پاس ایک خط ہے وہ اس سے لے آؤ۔" "المفصل" میں ہے۔ "خُذا مِنْهَا الكِتٰبَ وخَلِّيَا سَبِيلَهَا فَإنْ لَمْ تَدْفَعْهُ إلَيكُمَا فَاضْرِبَا عُنُقَهَا" (کہ تم اس سے خط لے لینا اور اسے چھوڑ دینا، لیکن اگر وہ خط دینے سے انکار کرے تو اس کی گردن قلم کر دینا) اس روایت کے مطابق اس مشن پر حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا گیا۔ اور حضرت مقدادؓ ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت جبریلؑ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خط کی اطلاع دی[2]۔ اسی طرح الزجاج نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو خط کے بارے میں باخبر کیا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم گھوڑوں کو تیز دوڑاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ جب ہم الروضہ کے مقام پر پہنچے تو وہاں ہمیں وہ عورت مل گئی۔ ہم نے کہا کہ خط نکالو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے[3]۔ ہم نے کہا کہ تمہیں خط نکالنا پڑے گا یا پھر کپڑے اتارنے ہوں گے۔ اس پر اس نے اپنی مینڈھیوں میں سے خط نکال دیا[4]۔ وہ خط لے کر ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسے کھولا گیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ حاطب[5] بن ابی بلتعہ کی طرف سے مشرکین مکہ کے نام ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض معاملات اور پروگراموں کے بارے

أخْبَرَنِي حسن بن محمد بن علي، أخْبَرَنِي عَبْدُ اللهِ بن ابي رافع وَقَالَ مَرَّةً أنَّ عَبَيْدَ الله بْنُ أبِي رافع أخبرَهُ أنَّهُ سَمِعَ عَلِيًّا رضي الله عنه يقول .... آگے روایت اسی طرح ہے جس طرح متن میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں ہے کہ اس عورت کا نام سارۃ یا ام سارۃ تھا۔ یہ قریش کی آزاد کردہ کنیز تھی۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث کتاب "الجهاد" باب "الجاسوس" (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۳۰۰۷ ہے) میں اور کتاب "التفسیر" باب "لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ" (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۴۸۹۰ ہے) میں ہے۔ سنن ابوداؤد (۲-۴۷) میں یہ حدیث کتاب "الجهاد" باب فِي حُكْمِ الْجَاسُوسِ إِذَا كَانَ مُسْلِمًا میں ہے۔ ابن اسحاق نے "سیرت" (۲-۳۹۸) میں یہ روایت الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ عروہ بن زبیر سے بیان کی ہے۔

[1] "خاخ" مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، اسے روضۃ الخاخ کہتے ہیں۔ یاقوت نے "معجم البلدان" (۲-۳۳۵) میں لکھا ہے کہ یہ مدینہ منورہ سے کچھ فاصلہ پر حمراء الاسد کے قریب واقع ہے۔

[2] واقدی نے بھی "المغازی" (ص ۳۲۶) میں اس کی صراحت کی ہے۔

[3] نسخہ لالہ، حلبی اور حلب میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ "ہم نے کہا کہ خط نکالو، تو اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں۔"

[4] واقدی نے "المغازی" میں لکھا ہے کہ اس عورت نے ان سے امان طلب کی اور یہ عہد لیا کہ وہ خط اس صورت میں دے گی کہ وہ نہ تو اسے قتل کریں گے اور نہ اسے واپس مدینہ منورہ لے جائیں گے بلکہ اسے آزاد چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے یہ عہد اسے دیا۔

[5] حَاطِبُ بنُ أبِي بَلْتَعَة بن عمرو بن عمير بن سلمۃ بن صعب بن سهل اللخمی بنی اسد بن عبدالعزیٰ کے

میں بتا یا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حاطب! یہ کیا ہے؟" حضرت حاطبؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ! میرے بارے میں جلدی فیصلہ نہ فرمائیے۔ میں آپ سے حقیقتِ حال عرض کرتا ہوں۔ میں قریش کے درمیان رہتا تھا۔ لیکن ان کے قبیلے سے نہ تھا۔[۱] دوسرے مہاجرین کے وہاں اعزہ واقارب ہیں جو ان کے اہل وعیال اور مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے سوچا جب میرا وہاں[۲] کوئی رشتہ دار نہیں ہے تو میں ان پر کوئی ایسا احسان کروں جس کے جواب میں وہ میرے رشتہ داروں کی حفاظت کریں۔ اللہ کے رسول! میں نے یہ کام کفر، ارتداد یا اسلام کے بعد کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس نے تمھیں سچی بات بتائی ہے"۔ حضرت عمرؓ نے کہا[۳]۔ یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن قلم کردوں" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ غزوہ بدر میں شریک ہوا ہے۔ اور تمھیں کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر سے جھانک کر اہل بدر کو کہہ دیا ہو کہ تم جو چاہو کرو، میں نے تمھیں بخش دیا ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کا یہ حصہ نازل فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ ...... (الممتحنة)	اے اہل ایمان! تم اپنے اور میرے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

حلیف تھے۔ کہتے ہیں کہ آپؓ حضرت زبیرؓ کے حلیف تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپؓ عبید اللہ بن حمید بن زہیر کے غلام تھے اور اس نے کچھ رقم لے کر انھیں آزاد کر دیا تھا۔ اس پر اتفاق ہے کہ یہ جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ صحیحین میں بھی اس کا ذکر ہے۔

ابن شاہین، الباوردی، طبرانی اور سمویہ نے امام زہری کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ امام زہری حضرت عروہ سے اور وہ عبدالرحمان بن حاطب بن ابی بلتعہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت حاطب یمن کے رہنے والے تھے۔ وہ حضرت زبیرؓ کے حلیف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ آپؓ کے بیٹے اور بھائی مکہ مکرمہ میں تھے۔ حضرت حاطب نے ایک خط مدینہ منورہ سے رؤسا قریش کے نام لکھا جس میں ان کے لیے کچھ نصیحتیں تھیں۔ المرزبانی نے "معجم الشعراء" میں لکھا ہے کہ دورِ جاہلیت میں حضرت حاطب کا شمار قریش کے شہسواروں اور شاعروں میں ہوتا تھا۔ ابن ابی خیثمہ لکھتے ہیں کہ المدائنی کہتے تھے کہ حضرت حاطب کا انتقال حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں ۳۰ھ میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر پینسٹھ برس تھی۔ دیکھیے الاصابة (۱ - ۲۹۹)

[۱] سہیلی نے "الروض الانف" (۷ - ۸۰) میں لکھا ہے کہ حارث بن ابی اسامہ نے اپنی "مسند" میں ذکر کیا ہے کہ حضرت حاطبؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں قریش میں اجنبی تھا اور میری والدہ ان کے درمیان رہتی ہے۔ مسند ابی یعلی میں ہے کہ میں اہل مکہ میں اجنبی تھا۔

[۲] نسخہ لالہ شہید علی پاشا، حلبی اور حلب میں الفاظ یوں ہیں۔ "مکہ میں"

[۳] حافظ ابن حجر فتح الباری (۸ - ۴۷۳) میں لکھتے ہیں کہ حضرت حاطب نے جو عذر پیش کیا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچا قرار دیا لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے یہ بات اس وجہ سے کہی کہ ان میں دینی حمیت وغیرت اور اہل نفاق سے نفرت و عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرے وہ

ابو عبیدؒ نے کتاب "الاموال" میں ذکر کیا ہے کہ جس عورت کے پاس سے خط ملا، اس کا نام "سارہ" تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ ابن ہشام نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ قبیلہ مزنیہ کی تھی۔

سحنون کہتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان حربی کفار کے ساتھ خط و کتابت کرے تو اسے توبہ کا موقع دیے بغیر قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کا مال اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

سحنون کے علاوہ دوسرے اہل علم کہتے ہیں کہ اسے دردناک مار دی جائے گی، اسے لمبے عرصے تک قید میں رکھا جائے گا اور کفار کے قریب والے مقام سے کسی دور دراز مقام پر اسے منتقل کر دیا جائے گا۔

ابن قاسم "المستخرجة" میں لکھتے ہیں کہ جاسوس کا معاملہ زندیق کی طرح کا ہے۔ اس کی توبہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اسے قتل کیا جائے گا۔[۱]

سحنون کہتے ہیں[۲] کہ جاسوس واجب القتل ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حاطب کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔[۳]

واجب القتل ہوتا ہے لیکن انھیں اس بات کا پورا یقین نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے حضرت حاطب کو قتل کرنے کی اجازت چاہی اور ان کے لیے منافق کا لفظ استعمال کیا۔

حضرت حاطب نے جو عذر پیش کیا اس کی بنیاد اس تاویل پر تھی کہ انھوں نے اپنے اعزہ و اقارب کے لیے قریش کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر جو تدبیر اختیار کی اس میں مسلمانوں کے لیے نقصان کا کوئی پہلو نہ تھا۔

[۱] مجھے کتاب "الاموال" میں یہ روایت نہیں ملی۔ واقدی نے "المغازی" (ص ۳۲۶) میں اس طرح کی روایت نقل کی ہے "شرح المواهب" (۲-۳۵۰) میں ہے کہ ابن اسحاق نے اس کا نام "سارہ" اور واقدی نے ایک روایت میں "کنود" اور ایک میں "ام سارہ" لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عباسؓ کی آزاد کردہ کنیز تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عمرو بن ہاشم بن مطلب کی آزاد کردہ لونڈی تھی۔

[۲] حافظ ابن تیمیہ نے "زاد المعاد" (۲-۱۵۰۰) میں اس طرح لکھا ہے اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ امام شافعی، ابو حنیفہ اور احمد کہتے ہیں کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور دونوں فریقوں نے دلیل حضرت حاطب کے واقعہ ہی کو بنایا ہے۔

نسخہ لالہ اور شہید علی پاشا میں اس عبارت کا اضافہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں "وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ" سے مراد جاسوس ہیں۔

[۳] نسخہ شہید علی پاشا میں یہ عبارت موجود نہیں۔

[۴] اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قتل کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ حضرت حاطب بدری صحابی تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ایسی حرکت کرے اور وہ بدری نہ ہو تو اسے قتل کیا جائے گا۔

جنگی قیدیوں کے بارے میں رسول اللہؐ کا فیصلہ اور اس شخص کا ذکر جسے حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا

ابن وہب نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ میں یہودیوں کی اچھی طرح خون ریزی کے بعد قیدیوں[1]

---

[1] یہاں متن میں "الاسری" کا لفظ ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ کے دوران کسی بھی طریقے سے اسلامی حکومت کے قبضے میں آجائیں۔ فقہاء نے ان کے متعلق احکام تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں "الاسری" سے مراد وہ برسرپیکار کفار ہیں جو زندہ حالت میں مسلمانوں کے قابو میں آجائیں۔ جنگی قیدی بنانا اسلام میں جائز ہے جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں:

وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ (التوبہ۔۵) فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (محمد۔۴) ان دونوں آیتوں سے جنگی قیدی بنانے کا جواز نکلتا ہے۔

قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر (ص ۲۴۷) میں اور زمخشری نے "الکشاف" (۲-۱۳۵) میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں قید کرو۔

اسلام میں جنگی قیدیوں کے احکام:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ آپ حالات اور مصلحت عامہ کے پیش نظر بعض قیدیوں پر احسان کر کے چھوڑ دیتے، بعض کو قتل کرادیتے اور بعض کو فدیہ لے کر یا مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں چھوڑ دیتے۔

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمانوں کے حکمران کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی مصالح کے تحت درج ذیل میں سے کوئی بھی مناسب فیصلہ کر سکتا ہے:

احناف کہتے ہیں کہ حکمران کو عام جنگی قیدیوں کے بارے میں اختیار ہے کہ وہ چاہے تو انھیں قتل کرا دے، چاہے تو غلام بنا لے اور چاہے تو ذمی بنا کر آزاد کر دے، البتہ مشرکین عرب اور مرتدین کو غلام یا ذمی نہیں بنایا جا سکتا۔ امام ابو حنیفہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد فدیہ یا قیدیوں کے تبادلے میں ان کو چھوڑ دینا جائز نہیں۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے مال لے کر چھوڑنا تو جائز ہے لیکن مسلمان قیدیوں کے بدلے میں چھوڑنا جائز نہیں۔ صاحبین کے نزدیک قیدیوں کا تبادلہ جائز ہے۔ امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ یہ تبادلہ قیدیوں کو مسلمانوں میں تقسیم کرنے سے پہلے تو جائز ہے بعد میں نہیں۔ جمہور احناف کے نزدیک جنگی قیدیوں کو احسان کر کے چھوڑ دینا جائز نہیں۔ امام محمد کہتے ہیں کہ بعض قیدیوں پر احسان کر کے انھیں چھوڑا جا سکتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اثال پر احسان کر کے اسے رہا کر دیا تھا جبکہ مسلمانوں نے اسے قید کر کے مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اسی طرح

کو قتل کرایا۔ اور جنگ بدر کے قیدیوں میں سے آپ نے عقبہ[1] بن ابی معیط کو باندھ کر قتل کرایا۔ جنگ بدر کے قیدیوں میں سے عقبہ کے علاوہ اور کوئی قتل نہیں ہوا۔ عقبہ کا سر عاصم بن ثابت بن الوالافلح نے اور بعض روایات کے مطابق حضرت علیؓ نے قلم کیا۔ "المدونۃ" میں ہے کہ اسے ذبح کیا گیا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ نضر بن حارث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت علیؓ نے "صفراء" کے مقام پر باندھ کر قتل کیا۔ ابن ہشام کی اپنی رائے کے مطابق اسے "الاثیل" (مدینہ کے قریب ایک وادی) کے مقام پر قتل کیا گیا۔ ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے کہ ان میں سے کونسی روایت صحیح ہے۔

احناف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین کی کاشت کے لیے قیدیوں کو چھوڑا جا سکتا ہے "تاکہ فاتحین زراعت میں مشغول ہو کر جہاد کو نہ چھوڑ بیٹھیں۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے "المبسوط" (۱۰-۲۴)، "الفتاوی الھندیۃ" (۲-۲۰۶)، "بدائع الصنائع" (۷-۱۱۹) شرح "فتح القدیر" (۴-۳۰۵) اور شرح "السیر الکبیر" (۴-۱۵۸۷)

شوافع، حنابلہ اور ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ حکمران یا اس کا نائب اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کے لیے مندرجہ ذیل میں سے جو فیصلہ مناسب سمجھے، کر سکتا ہے۔ یہ چار فیصلے ہیں: (۱) قتل (۲) غلام بنانا (۳) احسان کر کے چھوڑ دینا اور (۴) مال یا مسلمان قیدیوں کے تبادلے میں رہا کر دینا۔

اگر حکمران کو اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت واضح طور پر سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو اسے چاہیے کہ انھیں قید میں رکھے یہاں تک کہ اس سلسلے میں اس کا ذہن واضح ہو جائے۔ مصلحت کا فیصلہ ان باتوں کی روشنی میں ہو گا کہ قیدی کتنی قوت، جنگی مہارت یا اپنی قوم میں اثر و رسوخ کا مالک ہے، یا اس سے کسی خیانت کا خطرہ تو نہیں یا اس بات کی توقع ہے کہ وہ اسلام قبول کرے گا یا مسلمانوں کو مال و دولت کی ضرورت ہے۔

مالکیہ کے نزدیک حاکم وقت کو اس بات کا اختیار ہے کہ مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر ان پانچ میں سے کوئی فیصلہ کرے۔ (۱) قتل (۲) غلام بنانا، (۳) احسان کر کے چھوڑ دینا، (۴) فدیہ لے کر چھوڑ دینا (۵) جزیہ عائد کرنا۔

[1] عبدالرزاق نے "المصنف" (۵-۲۰۵) میں اسرائیل بن یونس سے روایت کی ہے کہ ابو الہیثم نے ابراہیم تیمی سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن ابی معیط کو ایک درخت پر سولی پر لٹکایا۔ ابو داؤد نے یہ روایت "المراسیل" (ص ۳۲) میں اور ابن اسحٰق نے "السیرۃ" (۱-۷۰۹) میں نقل کی ہے۔ عبدالرزاق نے "المصنف" (۵-۲۰۶) میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ فدیے کے فیصلے سے پہلے ہی اسے قتل کر دیا گیا اور حضرت علیؓ نے اسے باندھ کر قتل کیا۔ ابن حبیب نے "المحبر" (۴۷۸) میں لکھا ہے کہ ابو عبداللہ القصاب کہتے ہیں کہ عقبہ بن ابی معیط پہلا شخص ہے جسے اسلام میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔ حافظ ابن کثیر نے "البدایۃ والنھایۃ" (۳-۳۰۵) میں اس کے قتل کا سبب بیان کرتے ہوئے مغازی موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب عاصم بن ثابت اس کی طرف بڑھے تو اس نے کہا اے قریش کی جماعت! مجھے یہاں کیوں قتل کیا جا رہا ہے؟ اس کا جواب حضرت عاصم نے یہ دیا کہ اللہ اور رسول سے تیری دشمنی کی بنا پر۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے تین قیدیوں — عقبہ بن ابی معیط، طعیمہ بن عدی اور نضر بن حارث — کو باندھ کر قتل کرایا۔

نضر بن حارث بن کلدۃ بن علقمہ بن عبد مناف بن عبدالدار کی بہن قتیلہ[1] نے اس کے بارے میں اشعار کہے جن میں سے چند اشعار میں اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ اے محمدؐ! تم تو معزز حسب نسب سے تعلق رکھتے ہو اور اگر تم نضر پر احسان کر دیتے تو تمھارا کیا نقصان تھا۔ اور اگر تمھیں فدیہ لینا ہوتا تو نضر کے بدلے میں بیش بہا فدیہ دینے کے لیے ہم تیار تھے .....

کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ اشعار پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ اس کے قتل سے پہلے یہ اشعار مجھ تک پہنچ جاتے تو میں اس پر احسان کر کے اسے چھوڑ دیتا۔

معمر کہتے ہیں کہ اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (لقمان - ۶)	اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے بھٹکائے۔

یہ ایسی کتابیں خریدتا تھا جن میں ایران اور روم کے قصے کہانیاں تھیں اور یہ کہتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھیں عاد اور ثمود کی باتیں سناتا ہے اور میں تمھیں ایران اور روم کی خبریں سناتا ہوں۔ اسی طرح یہ قرآن کریم کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتا۔

عکرمہ[2] کہتے ہیں کہ اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ (الانعام - ۹۳)	اور جس نے کہا کہ عنقریب میں بھی اسی طرح کی کتاب نازل کر رہا ہوں جس طرح کی کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے۔

حماد بن سلمہ نے عطاء بن سائب سے اور انھوں نے امام شعبی سے روایت کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کے قتل کا حکم دیا تو اس نے کہا کہ محمدؐ! قریش میں سے تم مجھے قتل کر رہے ہو؟ حضورؐ نے فرمایا، ہاں! پھر آپ نے وہاں پر موجود لوگوں سے مخاطب کر کے فرمایا، تم جانتے ہو کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟ ایک دن میں مقام ابراہیم کے پیچھے سجدے کی حالت میں تھا کہ یہ آیا اور اس نے اپنا پاؤں میری گردن پر رکھ کر اس طرح دبایا کہ مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔ دوسری دفعہ اس نے بکری کی اوجھ لے کر میرے سر پر اس وقت ڈال دی جب میں سجدے میں تھا۔ پھر فاطمہ آئی اور اس نے میرا سر دھویا۔"

[1] اصل نام قتیلہ ہے۔ یہاں کتابت کی غلطی ہوئی ہے نسخہ حلب میں "قتیلہ" ہی ہے۔ اسی طرح سیرت ابن ہشام (۲-۴۲) میں بھی قتیلہ ہے۔ یہ حارث بن امیہ کی بیوی تھی۔ سہیلی نے "الروض الانف" میں لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ نضر کی بہن نہیں بیٹی تھی۔

[2] مجھے اس کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکا جبکہ طبری اور قرطبی اپنی اپنی تفسیروں میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ روایت کلبی نے ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اسی کے بارے میں یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے[1]

لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (الانفال: ۳۱)

اگر ہم چاہیں۔ تو ہم بھی اس (قرآن) کی طرح کی باتیں بنا سکتے ہیں۔ یہ (قرآن) پرانے زمانے کے قصے کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جنگِ بدر کے اکثر قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ جو سب سے زیادہ فدیہ ایک شخص سے لیا گیا اس کی رقم چار ہزار درہم تھی۔[2] بعض کو اس فدیہ کے عوض رہا کر دیا گیا کہ وہ کچھ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں گے۔ ایک روایت[3] یہ ہے کہ جو قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیتا اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رہا کر دیتے۔ ابن وہب کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہلِ مدینہ اچھی طرح لکھ نہیں سکتے تھے۔

تفسیر ابن سلام میں ہے کہ امام حسنؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کو رہا کر دیا اور ان میں سے جس جس نے چاہا وہ واپس مکہ معظمہ چلا گیا۔ ابن سیرینؒ[4] کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر مکہ والوں کو گرفتار کیے بغیر آزاد کر دیا گیا۔

۱؎ ابن کثیر اپنی تفسیر (۲-۳۲۵) میں لکھتے ہیں کہ سعید بن جبیر، سدی اور ابن جریر کہتے ہیں کہ یہ آیت ملعون نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ ایران گیا تھا اور وہاں سے رستم و اسفندیار اور شاہانِ ایران کے قصے کہانیاں سن کر آیا تھا۔ اس نے مکہ مکرمہ واپس آکر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن حکیم کو سناتے ہوئے سنا تو اس نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مجلس سے اٹھ جاتے تو وہ لوگوں کو ایرانی قصے سنا کر کہتا "بتاؤ میں اچھے قصے سناتا ہوں یا محمدؐ" جب وہ جنگِ بدر میں گرفتار ہو کر آیا تو اس کی انہی حرکتوں کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باندھ کر اپنے سامنے قتل کرنے کا حکم دیا۔ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے اسے گرفتار کیا تھا۔ ابن جریر اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط، طعیمہ بن عدی اور نضر بن حارث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھ کر قتل کرا دیا تھا اور حضرت مقدادؓ نے نضر بن حارث کو گرفتار کیا تھا۔ انھوں نے کہا "یا رسول اللہ! میرا قیدی؟" آپ نے دعا فرمائی "اللہ! مقداد کو اپنے فضل سے غنی کر دے۔" حضرت مقدادؓ نے کہا کہ مجھے اسی چیز کی ضرورت تھی۔

۲؎ ابن ہشام "السیرۃ" (۱-۷۰۰) میں لکھتے ہیں کہ جنگِ بدر کے قیدیوں کے فدیہ کی رقم چار ہزار درہم تھی۔ البتہ جن کے پاس کچھ نہ تھا ان پر احسان کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ دیا۔ عبدالرزاق نے "المصنف" (۵-۲۰۰) میں یہی بات حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کی ہے۔

۳؎ الشیخ عبدالحی الکتانی "التراتیب الاداریۃ" (۱-۴۸) میں ابوالوفاء نصر الہورینی مصری کی کتاب "المطالع النصریۃ فی الاصول الخطیۃ" سے نقل کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں لکھنے کا رواج ہجرت نبوی کے دوسرے سال اس وقت ہوا جب جنگِ بدر میں مشرکین مکہ کے ستر (۷۰) سردار گرفتار ہو کر آئے اور ان کی رہائی کا فدیہ یہ مقرر ہوا کہ وہ انصار کے لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس کے بعد لکھنے پڑھنے کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تعداد بیالیس تک پہنچ گئی۔ سہیلی "الروض الانف" میں لکھتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی موقع پر لکھنا پڑھنا سیکھا۔

۴؎ ابن سیرین۔ یہ محمد بن سیرین الانصاری ابوبکر بن ابی عمرۃ ہیں۔ نہایت تقویٰ اور عبادت گزار تھے ۱۱۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

انھیں "طلقاء" کہا جاتا ہے اور طائف والوں کو گرفتار کرنے کے بعد رہا کیا گیا۔ انھیں "عتقاء" کہا جاتا ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اہل مکہ سے کہا۔ اِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ[1] کہ جاؤ تم آزاد ہو۔

سفیان اور شعبہ کی کتاب "الاعراب"[2] میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "طلقاء" قریش میں سے ہیں اور "عتقاء" ثقیف میں سے۔ نحاس کی کتاب "معانی القرآن"[3] میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ جنگ بدر کے موقع پر جب قیدیوں کو

---

[1] نسخہ حرم مکی، نسخہ شہید علی پاشا "المسیوۃ" (۲-۱۲۴) اور "الاکتفاء" (۲-۳۰۶) میں "الطلقاء" ال کے ساتھ ہے جبکہ نسخہ حلب، نسخہ حلبی اور نسخہ لالہ میں "طلقا" ال کے بغیر ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اہل مکہ کو "طلقاء" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر بلا کسی جنگ کے بذریعہ فتح عطا فرمائی تھی۔

[2] یہ حدیث مسند احمد بن حنبل (۴-۳۶۳) میں عبدالرزاق عن سفیان عن الاعمش عن موسیٰ بن عبداللہ بن ہلال العبسی عن جریر بن عبداللہ کی سند کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ "الطُّلَقَاءُ مِنْ قُرَيْشٍ وَالْعُتَقَاءُ مِنْ ثَقِيفٍ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ وَالْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔

حافظ الہیثمی "مجمع الزوائد" (۱۰-۱۵) میں لکھتے ہیں کہ احمد اور طبرانی نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس کے راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ اس حدیث کی تائید طبرانی، ابو یعلیٰ اور بزار کی ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت کی ہے۔ الہیثمی کہتے ہیں کہ بزار کی سند میں ایک راوی عاصم بن بہدلہ ہے جس کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس سند کے باقی راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔

[3] مصنف نے نحاس کی ایک مختصر روایت نقل کی ہے لیکن طبری نے اپنی تفسیر میں اپنی سند کے ساتھ اسے اس طرح تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ انھیں بہت زیادہ ایندھن والی کسی وادی میں داخل کرکے آگ لگا دیجیے۔ اس پر حضرت عباسؓ نے کہا کہ تم قطع رحمی کر رہے ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ حضرت ابوبکرؓ کے مشورے پر عمل فرمائیں گے جب کہ دوسروں نے کہا کہ آپؐ حضرت عمرؓ کی رائے کو قبول فرمائیں گے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپؐ عبداللہؓ بن رواحہ کی رائے پر عمل کریں گے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں میں نرمی پیدا فرما دیتا ہے اور وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہوتے ہیں اور بعض کے دلوں میں سختی پیدا فرما دیتا ہے اور وہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ اے ابوبکر تمھاری مثال ابراہیم علیہ السلام کی سی ہے جنھوں نے کہا تھا۔ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (ابراہیم: ۳۶) یعنی جس نے میری پیروی کی، وہ میرا ہے اور جس نے میرے طریقے کے بجائے کوئی اور طریقہ اختیار کیا۔ تو یقیناً تو درگزر کرنے والا اور مہربان ہے۔

نیز اے ابوبکر تیری مثال عیسیٰ علیہ السلام کی سی ہے جنھوں نے کہا تھا إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (المائدہ-۱۱۸) یعنی اب اگر آپ انھیں سزا دیں گے تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔ اور اے عمرؓ تمھاری مثال نوح علیہ السلام کی سی ہے جنھوں نے کہا تھا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا (نوح-۲۶) یعنی اے میرے رب زمین پر کافروں کی کسی بستی کو باقی نہ رہنے دے۔ نیز اے عمرؓ تمھاری مثال موسیٰ علیہ السلام کی سی ہے جنھوں نے کہا تھا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ (یونس-۸۸) یعنی اے رب ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے یہاں تک کہ یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ پھر اس بارے میں مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى

لایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان قیدیوں کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا یا رسول اللہ! یہ آپ کی قوم کے لوگ ہیں۔ انھیں رہنے دیجیے شاید اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ! ان لوگوں نے آپ کی تکذیب کی، آپ کو گھر بار سے نکالا اور آپ کے خلاف جنگ لڑی، اس لیے آپ ان کے سر قلم کرا دیجیے۔ اس بارے میں یہ وحی نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ۔ (الانفال۔ ۶۷)

کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔

ابن سلام نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ امام حسن کہتے ہیں کہ اس وقت تک جنگی قیدیوں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے آپ نے مسلمانوں سے مشورہ طلب کیا اور اکثریت کی رائے یہ طے پائی کہ ان سے فدیہ لے لیا جائے۔ چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں کو چار چار ہزار فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوں ریزی نہیں کی۔

"يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ" (الانفال: ۶۷) سے لے کر تین آیات نازل ہوئیں۔

یہ روایت منقطع ہے کیونکہ ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں۔ ترمذی نے یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب "التفسیر" میں اختصار کے ساتھ نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور ابوعبیدہ کا اپنے والد گرامی سے سماع ثابت نہیں۔

امام احمد نے "مسند" (۱۔ ۳۸۳) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ الہیثمی کہتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور ابوعبیدہ کا اپنے والد محترم سے سماع ثابت نہیں۔ حاکم نے "المستدرک" (۲۔ ۲۱) میں یہ روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور صحیحین میں یہ روایت موجود نہیں ہے۔

ابن جریر طبری نے عکرمہ بن عمار سے اس کی نسبت زیادہ صحیح روایت نقل کی ہے کہ ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کہاں ہیں۔ پھر آپ نے سوال کیا کہ قیدیوں کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ ہمارے اپنے بھائی بند ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے۔ فدیہ سے ہمیں فائدہ بھی پہنچے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اسلام کی ہدایت عطا فرما دے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابن خطاب! تمھاری کیا رائے ہے؟" حضرت عمرؓ نے کہا۔ "اللہ وحدہٗ لاشریک کی قسم میری رائے ابوبکر کی رائے سے مختلف ہے میری رائے یہ ہے کہ عقیل کو علی کے، عباس کو حمزہ کے اور میرے فلاں رشتہ دار کو میرے حوالے کر دیجیے۔ یہ قائدین کفر ہیں۔ ہم ان کی گردنیں اڑا دیں گے۔" حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بجائے ابوبکر کی رائے پر عمل فرمایا۔ اگلے دن میں آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر بیٹھے رو رہے تھے۔ میں نے کہا "یا رسول اللہ! آپ اور ابوبکر کیوں رو رہے ہیں مجھے بھی بتائیے تاکہ مجھے بھی رونا آ جائے تو رووں، نہیں تو رونے کی کوشش کروں۔" حضورؐ نے فرمایا کہ میں اس فدیے پر رو رہا ہوں جو میرے صحابہ نے لیا۔ اور قریب کے اس درخت سے بھی زیادہ قریب کر کے مجھے وہ عذاب دکھایا گیا جو ان پر آنے والا تھا لیکن اللہ نے انھیں معاف فرما دیا اور مال غنیمت ان کے لیے حلال کر دیا۔ اسی موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور مسلم نے کتاب "الجہاد" باب "الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر" میں روایت کی ہے۔

"السیر" میں ہے کہ جنگ بدر میں جو ستر (۷۰) افراد قید ہوئے اُن میں ابوعزّۃ عمرو بن عبداللہ الشامی بھی تھا۔ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے کثیر العیال ہونے کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں تو اُن کے لیے کچھ حاصل کرنے کی غرض سے نکلا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے یہ عہد لے کر چھوڑ دیا کہ آئندہ وہ کبھی مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے نہیں نکلے گا، لیکن پھر وہ جنگ اُحد میں شریک ہوا اور مشرکین کو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کے لیے بھڑکایا۔ وہ گرفتار ہوگیا اور غزوہ احد میں اس کے علاوہ اور کوئی شخص گرفتار نہیں ہوا تھا۔ ایک اور کتاب میں روایت ہے کہ اس نے کہا کہ یارسول اللہ! مجھ پر احسان کیجیے۔ اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَيْنِ	مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔
لا تمسح عارضيك بمكة تقول خدعت	اب ایسا نہیں ہوگا کہ تو مکہ میں اپنے چہرے پر ہاتھ
محمدا مرتين۔	پھیر کر کہے کہ میں نے محمدؐ کو دو دفعہ دھوکا دیا۔

پس اسے باندھ کر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

غزوۂ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن خلفؓ کو برچھی مار کر ہلاک کیا۔ برچھی اس کی گردن پر ماری گئی جس سے

لہ "السیرۃ" (۱-۴۶۰) میں ہے کہ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ابوعزۃ بن عبداللہ بن عثمان بن اہیب بن حذافہ بن جمح مفلس آدمی تھا۔ اس کی بیٹیاں تھیں۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی کہ یارسول اللہ! آپؐ کو معلوم ہے کہ میں تلاش اور صاحب عیال ہوں اس لیے مجھ پر احسان کیجیے۔ آپؐ نے اس سے یہ عہد لے کر چھوڑ دیا کہ وہ آپؐ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا۔ اس پر ابوعزہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدہ کہا اور قریش میں آپ کی فضیلت بیان کی۔

ابن ہشام (۲-۱۰۴) کہتے ہیں کہ ابوعزۃ جمحی بدر میں گرفتار ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر احسان کیا اور چھوڑ دیا۔ وہ جنگ احد میں پھر گرفتار ہوا اور اس نے معافی کی درخواست کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا کہ تم مکہ میں منہ پر ہاتھ پھیر کر کہو کہ میں نے محمدؐ کو دو دفعہ دھوکا دیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ زبیر اس کا سر قلم کر دو۔ چنانچہ انھوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد ابن ہشام لکھتے ہیں کہ مجھے حضرت سعید بن المسیب سے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يُلْدَغُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَيْنِ۔	مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔
اضرب عنقه يا عاصم بن ثابت۔	عاصم بن ثابت اس کی گردن مار دو۔

چنانچہ انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

امام شافعی نے "الام" (۴-۲۳۸-۲۳۹) میں اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب "لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَيْنِ" میں حضرت ابوہریرۃ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۶۱۳۳ ہے۔

لہ نسخہ شہید علی پاشا میں "ابی بن خلف" کے بجائے "امیّہ بن خلف" ہے جو غلط ہے۔ سیرت ابن ہشام (۲-۸۴) میں ہے کہ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ صالح بن ابراہیم بن عبدالرحمان بن عوف نے مجھ سے روایت بیان کی کہ ابی بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

اس کا خون بہنے لگا۔ اس نے کہا کہ اللہ کی قسم! مجھے محمدؐ نے قتل کر دیا ہے۔ کفارِ قریش نے اسے کہا کہ اللہ کی قسم تیرا دل تو بالوں سے بیٹھا جا رہا ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ اس نے مجھے مکہ میں کہا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا، اب اگر وہ مجھ پر صرف تھوک بھی دے تو بخدا میں اس سے بھی قتل ہو جاؤں گا۔ وہ اللہ کا دشمن مکہ کی طرف لوٹتے ہوئے "سرف" کے مقام پر مر گیا۔

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی تعداد سات سو اور کفار کی تعداد تین ہزار تھی۔ ان کے پاس دو سو تیر کمانیں تھیں۔[2]

صحیح بخاری[3] میں ہے کہ سعدؓ بن معاذ نے امیہ بن خلف سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا

مکہ معظمہ میں کہا کرتا تھا کہ محمد! میرے پاس ایک گھوڑا ہے جسے میں کھلا پلا کر خوب موٹا تازہ کر رہا ہوں اور میں اس پر سوار ہو کر تجھے قتل کروں گا۔ اس کے جواب میں حضورؐ فرماتے کہ ان شاء اللہ میں تجھے قتل کروں گا۔ جب وہ قریش کے پاس اس حالت میں آیا کہ گردن پر برچھی لگنے سے اس کا خون بہ رہا تھا تو اس نے کہا کہ اللہ کی قسم! محمد نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۵-۳۵۶،۵۷) اور "البدایۃ والنہایۃ" (۴-۳۲)

[1] "السیرۃ" (۲-۶۴-۶۳) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار ساتھیوں کے ساتھ مدینہ سے نکلے لیکن جب مدینہ اور اُحد کے درمیان پہنچے تو عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد ابن اسحاق (۲-۶۶) لکھتے ہیں کہ قریش کی تعداد تین ہزار تھی۔ ان کے ساتھ دو سو گھوڑے بھی تھے۔

[2] نسخہ حرم مکی میں اسی طرح ہے لیکن نسخہ لالا اور نسخہ شہید علی پاشا میں ہے کہ دو سو گھوڑے تھے اور نسخہ حلب اور نسخہ حلبی میں ہے کہ دو سو سوار تھے۔

[3] صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ یُقْتَلُ بِبَدْرٍ"۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۳۹۵۰ ہے۔

وہاں واقعہ کا آغاز اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود حضرت سعدؓ بن معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ امیہ بن خلف ان کا دوست تھا اور جب کبھی وہ مدینہ آتا تو حضرت سعد کے ہاں ٹھہرتا اور حضرت سعدؓ جب مکہ جاتے تو اس کے ہاں ٹھہرتے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے تو اس کے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ عمرہ کے لیے مکہ معظمہ گئے اور امیہ کے ہاں ٹھہرے۔ انھوں نے امیہ سے کہا کہ ذرا خلوت کا کوئی وقت دیکھنا تاکہ میں بیت اللہ کا طواف کر سکوں۔ وہ دونوں تقریباً دوپہر کو نکلے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل سے ہو گئی۔ اس نے امیہ سے پوچھا کہ یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا کہ یہ سعد ہے۔ ابوجہل نے کہا کہ سعد تم نے بے دین لوگوں کو پناہ بھی دی ہے اور تم ان کی مدد کا اعلان بھی کرتے ہو اور پھر مکہ آ کر اطمینان سے کعبہ کے گرد طواف بھی کرتے ہو۔ خدا کی قسم! اگر ابوصفوان تمھارے ساتھ نہ ہوتا تو کبھی بچ کر نہ جانے پاتے۔ حضرت سعدؓ نے آواز کو بلند کرتے ہوئے کہا کہ تو نے مجھے مکہ سے روکا تو میں یقیناً تجھے اس سے روکوں گا جو تیرے لیے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ یعنی مدینہ کے راستے تمھیں گزرنے نہ دوں گا۔ امیہ نے کہا: سعد، ابوالحکم سے اتنی اونچی آواز سے بات نہ کرو۔ وہ اس وادی کا سردار ہے۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا: امیہ رہنے دو۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ تمھیں قتل کر دیں گے۔ امیہ نے پوچھا:

ہے کہ وہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) تجھے قتل کریں گے۔ اس نے پوچھا" مکہ میں"؟ حضرت سعد نے فرمایا کہ اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ بات سن کر وہ سخت گھبرا یا[۱]۔ جب ابوجہل نے جنگ بدر کے لیے لوگوں کو نکلنے کے لیے پکارا تو امیہ بن خلف نکلنے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ ابوجہل اس کے پاس آیا اور کہا کہ ابوصفوان تم لوگوں کے سردار ہو، جب وہ دیکھیں گے کہ تم نکلنے کے لیے تیار نہیں تو وہ بھی نہیں نکلیں گے۔ ابوجہل مسلسل اسے اکساتا رہا یہاں تک کہ وہ تیار ہو گیا اور اس نے کہا کہ جب تم نے اپنی بات منوا ہی لی ہے تو مکہ میں جو بہترین اونٹ ہوگا میں وہ خریدوں گا اور اس پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ پھر امیہ نے اپنی بیوی سے کہا کہ ام صفوان[۲] میرا سامان تیار کردو۔ اس نے کہا۔ ابوصفوان، تمھارے یثربی[۳] بھائی نے جو بات کہی وہ تم بھول گئے ہو۔ امیہ نے کہا: "نہیں۔ میں ان کے ساتھ بس تھوڑا سا ہی آگے جاؤں گا۔" جب امیہ نکلا تو جہاں بھی پڑاؤ ہوتا وہاں وہ اپنے اونٹ کو باندھ دیتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بدر میں قتل کرا دیا۔

النحاس کی کتاب "معانی القرآن" میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن خلف کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ لیکن یہ بات غلط ہے[۴]۔

"مکہ میں"؟ حضرت سعدؓ نے فرمایا: اس کا مجھے پتہ نہیں۔ امیہ سخت گھبرا گیا۔ اس نے گھر جا کر کہا۔" ام صفوان" تجھے معلوم ہے کہ سعد نے مجھے کیا کہا"؟ ام صفوان نے پوچھا" اس نے کیا کہا"؟ امیہ نے کہا" وہ کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔ میں نے پوچھا" مکہ میں"؟ اس نے کہا" کہ اس کا مجھے پتہ نہیں"۔ اس کے بعد امیہ نے کہا کہ خدا کی قسم میں مکہ سے نہیں نکلوں گا۔ جب ابوجہل نے لوگوں کو بدر کی طرف نکلنے کے لیے کہا تو امیہ اس کے لیے تیار نہ ہوا۔ ابوجہل نے کہا کہ امیہ! تم لوگوں کے سردار ہو۔ تم نہ نکلے تو لوگ بھی نہیں نکلیں گے۔

[۱] اس گھبراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ اسرائیل کی روایت کے مطابق اس نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب بات کرتے ہیں تو وہ جھوٹی نہیں ہوتی۔ بیہقی کی روایت میں ہے کہ اللہ کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ نہیں بولتا اس لیے یہ ہو کر رہے گا۔

[۲] ام صفوان امیہ کی بیوی تھی۔ اس کا نام صفیہ تھا۔ بعض کہتے ہیں اس کا نام کریمہ بنت معمر بن حبیب بن وہب تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام فاختہ بنت اسود تھا۔

[۳] بھائی اس نے اس لیے کہا کہ زمانۂ جاہلیت میں امیہ کے حضورؐ کے درمیان مواخات تھی اور یثربی اس لیے کہ حضورؐ کی ہجرت سے پہلے مدینہ کا نام یثرب تھا۔

[۴] نحاس اور بعض دوسرے اہل سیر کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اصل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا وہ ابی بن خلف تھا۔ اس واقعہ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے علی بن امیہ کو حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف نے گرفتار کیا۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور امیہ مکہ میں ایک دوسرے کے دوست رہ چکے تھے۔ حضرت بلال نے جب امیہ کو گرفتار دیکھا تو انھوں نے فرمایا کہ امیہ کفر کا سرغنہ ہے۔ اگر یہ بچ گیا تو میں ہلاک ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا۔ بلالؓ! وہ تو میرا قیدی ہے حضرت بلالؓ نے بلند آواز سے کہا۔ انصار اللہ! امیہ کفر کا سرغنہ ہے۔ اگر یہ بچ گیا تو میں ہلاک ہو گیا۔" انصار نے انھیں گھیر لیا۔ (اور یہی شخص تھا جو مکہ مکرمہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان کے اسلام کی وجہ سے تختۂ مشق ستم بنایا کرتا تھا)

ایک دوسری کتاب نیز المدونہ میں ہے کہ یمامہ کے سردار ابوامامہ یا اثاثہ اور ایک قول کے مطابق ثمامہ بن اثال کو قید کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضورؐ نے اسے مسجد میں باندھ دینے کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ تین مرتبہ اس کے سامنے اسلام پیش فرماتے۔ پھر آپ نے اسے ان تین باتوں میں کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا کہ یا تو اسے آزاد کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا اسے قتل کر دیا جائے۔ اس نے جواب میں کہا کہ اگر آپ قتل کریں گے تو ایک عظیم شخص کو قتل کریں گے اور فدیہ لیں گے تو بھی عظیم آدمی سے فدیہ لیں گے اور آزاد کر دیں گے تو بھی ایک عظیم شخصیت کو آزاد کریں گے۔ رہ گئی یہ بات کہ میں مسلمان ہو جاؤں تو سن لیجیے کہ اللہ کی قسم میں کبھی بھی جبر کے تحت اسلام قبول نہیں کروں گا۔ تب رسول اللہ

حضرت عبدالرحمٰن ان (امیہ اور اس کے بیٹے) کو بچانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ایک آدمی نے امیہ کے بیٹے علی پر تلوار کا وار کیا جس سے وہ گر پڑا اور امیہ نے اس طرح چیخ ماری کہ میں نے ایسی چیخ کبھی نہیں سنی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے امیہ کو کہا کہ میں تمہارے کچھ کام نہیں آ سکتا۔ تم خود اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر سکتے ہو تو کرو لیکن انصار نے امیہ اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بلالؓ پر رحم فرمائے۔ اس نے مجھے میرے قیدیوں کے سلسلے میں تکلیف میں مبتلا کیا۔ یہ روایت سیرت ابن ہشام (۱-۶۳۱) میں ہے۔

صحیح بخاری کتاب "الوکالۃ" باب "اذا وکل المسلم حربیا فی دار الحرب او فی دار الاسلام جاز" میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ فرماتے ہیں کہ جب مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ لوگ ہمیں آ لیں گے تو میں نے امیہ کے لڑکے کو پیچھے چھوڑ دیا تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں، لیکن ہوا یہ کہ اسے قتل کر کے وہ ہمارے پیچھے آ گئے۔ امیہ موٹا تھا اس لیے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ زمین پر گر جاؤ۔ وہ گر گیا تو میں اس پر لیٹ گیا تاکہ اس کی حفاظت کر سکوں لیکن لوگوں نے میرے نیچے سے بھی اسے تلوار سے قتل کر دیا اور ایک آدمی کی تلوار سے تو میرے پاؤں پر بھی زخم آ گیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ وہ زخم دکھایا کرتے تھے۔ اس حدیث کا نمبر فتح الباری میں ۲۳۰۱ ہے۔

واقدی "المغازی" (ص ۸۱-۱۱۷) میں لکھتا ہے کہ امیہ کو خبیبؓ بن اساف انصاری اور حضرت بلال نے مل کر قتل کیا جبکہ اس کے بیٹے علی کو عمار بن یاسر نے قتل کیا۔ حاکم نے "المستدرک" میں اور ابن کثیر نے "البدایۃ والنہایۃ (۳-۲۸۷) میں ذکر کیا ہے کہ رفاعہ بن رافع نے امیہ پر تلوار کا وار کیا۔

لہ یہ روایت صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "وفد بنی حنیفۃ" میں ہے۔ فتح الباری میں اس کا نمبر ۴۳۷۲ ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم (۳-۱۳۸۶) کتاب "الجہاد" باب "ربط الاسیر وحبسہ" میں، سنن نسائی (۲-۴۶) باب "ربط الاسیر بساریۃ المسجد" اور سنن ابوداؤد (۳-۵۶) کتاب "الجہاد" باب "الاسیر یوثق" میں بھی ہے۔

ٹہ یہ ثمامہؓ بن اثال بن نعمان بن مسلمہ الحنفی ہیں۔ یہ جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ جب اہل یمامہ مرتد ہو گئے تو یہ اور ان کے ساتھی اسلام پر قائم رہے۔ یہ مسلمہ کی اتباع سے لوگوں کو روکتے تھے اور کہتے تھے کہ اس بات سے بچو جس میں کوئی نور نہیں۔ یہ بدبختی کی بات ہے اسے بنی حنیفہ تم میں سے جو اسے قبول کرے گا یہ اس کے لیے وبال بن جائے گی۔

اسلامی غزوات میں انھوں نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ دیکھیے "اسد الغابۃ" (۱-۲۴۹)، "الاصابۃ" (۱-۲۰۴)، "الاستیعاب" (۱-۲۰۵) ان سب کتابوں میں مسجد میں انھیں باندھنے کا ذکر ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ رہائی پاتے ہی اس نے کہا" اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد انک رسول اللہ۔

اس روایت کا کچھ حصہ "المدونہ" میں بھی ہے۔

ابن المواز کی کتاب میں ہے کہ اصبغ کی رائے یہ ہے کہ جب حاکم جنگی قیدی کو قتل کرنے کا فیصلہ کرے تو اسے چاہیے کہ پہلے اس کے سامنے اسلام پیش کرے اور یہ بھی پوچھے کہ جنھوں نے اسے گرفتار کیا تھا کیا ان میں سے کسی سے اس نے عہد تو نہیں لیا۔

ابن جریج اور السدی کہتے ہیں کہ "فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً" (محمد-۴) والی آیت کفارِ عرب کے بارے میں تھی اور بعد میں یہ "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ" (التوبۃ-۵) والی آیت سے منسوخ ہو گئی۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی قیدیوں کے بارے میں فدیہ لے کر چھوڑنے یا ویسے ہی آزاد کر دینے یا قتل کر دینے یا غلام بنا کر رکھنے کا اختیار دیا۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے[۳]۔

الخطابی کی کتاب میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قیدی لایا گیا جو کانپ رہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا" ادفوہ" اس کا مطلب تھا" ادفئوہ" یعنی اسے گرمی پہنچاؤ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجے میں یہ لفظ ہمزہ کے بغیر تھا۔ صحابہ کرام نے لے جا کر اسے اس خیال سے قتل کر دیا کہ آپ نے یہی حکم دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت دی۔ اگر آپ اُسے قتل کروانا چاہتے تو آپ فرماتے" دافوہ" یا" ذافوا علیہ"

کتاب الشرف میں ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جس شخص کا سر لٹکایا گیا وہ ابو عزہ ہے۔ اس کا سر نیزے پر لٹکا کر

---

[۱] ابن المواز۔ یہ محمد بن ابراہیم اسکندرانی ہیں۔ ابن المواز کی کنیت سے معروف ہیں۔ ابن الماجشون اور ابن عبدالحکم سے انھوں نے فقہ پڑھی اور اصبغ پر زیادہ اعتماد کیا۔ فقہ و فتویٰ میں راسخ تھے۔ فقہ پر ان کی ایک مشہور کتاب ہے جس کا سراغ نہیں مل سکا۔ ان کی وفات ۲۶۹ھ میں ہوئی۔ الدیباج (ص ۲۳۲) "شذرات الذھب" (۲-۱۷۷) اور مرآۃ الجنان (۲-۱۹۳) میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

[۲] اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں۔ قتادہ، ضحاک، السدی، ابن جریج اور بہت سے اہل کوفہ کی رائے ہے کہ اہل ادیان کے بارے میں یہ منسوخ ہو چکی ہے اور ان سے فدیہ لینا یا انھیں ویسے ہی چھوڑ دینا جائز نہیں۔ ان کی رائے میں "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ" (التوبۃ-۵) اور "فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ" (الانفال-۵۷) "وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً" (التوبہ-۳۶) نے اس کو منسوخ کیا ہے۔ اس کے برعکس امام مالک، شافعی، ثوری، اوزاعی اور ابو عبیدہ کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ حاکم کو اختیار ہے کہ وہ جنگی قیدی کو قتل کر دے یا قید میں رکھے اور قید کرنے کے بعد اسے اختیار ہے کہ وہ فدیہ لے کر چھوڑ دے یا ویسے ہی رہا کر دے۔ یہی رائے قابل ترجیح ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے اسی پر عمل کیا ہے۔ دیکھیے امام شوکانی کی تفسیر فتح القدیر (۵-۳۱)

[۳] اس باب کے آغاز میں علماء کی رائے کا ذکر گزر چکا ہے۔

مدینہ لایا گیا۔[1]

کتاب المفصل میں ہے کہ جنگ اُحد ہجرت کے تیسویں مہینے سات شوال کو شروع ہوئی اور دوسروں کی رائے یہ ہے کہ یہ نصف شوال میں ہوئی۔[2]

---

[1] امام زہری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف جنگ بدر میں تنہا ابوجہل کا سر لایا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے پاس کسی کا سر لایا گیا تو انھوں نے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔ سب سے پہلے جس شخص کے پاس کٹے ہوئے سر لائے گئے وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ دیکھیے شرح السیر الکبیر (۱-۱۱۱)

[2] "السیرۃ" میں ہے کہ جنگ احد شوال ۳ھ میں ہوئی۔ اسی طرح دیکھیے "الروض الانف" (۵ - ۴۱۹)، ابن حبیب "المحبر" (۱۱۲-۱۱۳) میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شوال کی چودہ تاریخ کو اُحد کی طرف نکلے اور اس دن جمعہ تھا۔

بنو قریظہ اور بنو نضیر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

آپ کا بنو قریظہ کے معاملہ کو حضرت سعد بن معاذ کے سپرد کرنا۔

صحیح بخاری، مسلم اور نسائی میں "نزول یہود بنی قریظۃ علی حکم سعد بن معاذ" کے عنوان کے تحت ہے

۱؎ ہجرت کے بعد کفار کی پوزیشن:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ ہجرت کے بعد کفار کی تین قسمیں ہو گئیں۔ ایک وہ جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا معاہدہ کر لیا کہ وہ نہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ ہی آپ کے خلاف کسی دشمن کی مدد کریں گے۔ اس قسم میں یہود کے تینوں قبائل ــــ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ ــــ شامل تھے۔ دوسری قسم ان کفار کی تھی جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ لڑی۔ یہ قریش مکہ اور ان کے ساتھی تھے۔ تیسری قسم ان کفار کی تھی جو اس انتظار میں تھے کہ اسلام اور کفر کی اس کشمکش کا نتیجہ دیکھیں۔ اس قسم میں عرب کے اکثر قبائل شامل تھے۔

یہودیوں میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع نے عہد شکنی کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے بعد شوال ۲ھ میں ان سے جنگ کی۔ اس کے بعد بنو نضیر نے اور ان کے بعد بنو قریظہ نے معاہدہ توڑا۔ بنو قریظہ نے جنگ خندق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں قریش کے ساتھ تعاون کیا۔ ابو عبید نے "کتاب الاموال" (ص ۲۴۲) میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے قتل کو اس لیے جائز قرار دیا کہ انھوں نے حضورؐ کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کو توڑ کر قریش مکہ کی مدد کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عہد شکنی قرار دیا اور ان کے قتل کا حکم دیا اگرچہ انھوں نے کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا تھا۔ اسی سلسلے میں سورۂ احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی۔ "وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ (الاحزاب - ۲۶)

۲؎ صحیح بخاری، کتاب "المغازی" باب "مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب ومخرجہ الی بنی قریظۃ"

۳؎ صحیح مسلم، کتاب "الجہاد والسیر" باب جواز قتال من نقض العہد وجواز انزال اہل الحصن علی حکم حاکم عدل اہل للحکم"

۴؎ نسائی "السنن الکبریٰ" الشیخ شرف الدین نے تحفۃ الاشراف (۲-۴۴۳) میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے "التحفۃ" میں حدیث کا نمبر ۲۹۲۵ ہے۔ جامع ترمذی (۴-۱۴۴) میں کتاب "السیر" باب "ما جاء فی النزول علی الحکم" میں اسی سند کے ساتھ یہ روایت موجود ہے۔

کہ قتیبہ بن سعید نے لیث سے، لیث نے ابوالزبیر سے اور انھوں نے حضرت جابرؓ سے روایت بیان کی کہ جنگِ احزاب میں حضرت سعدؓ بن معاذ کے تیر لگا جس سے ان کے ہاتھ کی ایک رگ کٹ گئی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ قریش میں سے ایک آدمی حبان بن العرقہ نے حضرت سعد کے تیر مارا جس سے ان کے ہاتھ کی رگ کٹ گئی۔ نسائی نے "السنن الکبریٰ" میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رگ کاٹ کر اسے داغا۔ اس سے ان کا ہاتھ سوج گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑ دیا اور ان کا خون بہنے لگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ان کے ہاتھ کو داغا اور ہاتھ پھر سوج گیا۔ اس پر حضرت سعدؓ نے دعا کی "اللہ! میری جان اس وقت تک نہ نکلے جب تک بنی قریظہ کے بارے میں میری آنکھ ٹھنڈی نہ ہو جائے۔" اس دعا کے بعد خون بہنا بند ہو گیا۔ اس کے بعد ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔ یہاں تک کہ انھوں نے فیصلے کے لیے اپنے آپ کو حضرت سعدؓ کے حوالے کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپؓ گدھے پر سوار ہو کر آئے۔ جب آپ مسجد کے قریب پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ" اپنے سردار کی تکریم کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ مہاجرین نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انصار کے لیے تھا،

---

۱ نسخہ حلب اور حلبی میں زبیر کے بجائے زہیر ہے البتہ وہاں حاشیہ میں زبیر کی طرف اشارہ ہے۔

۲ صحیح بخاری کتاب "المغازی" اس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۴۱۲۲ ہے۔ یہ روایت حضرت عائشہؓ سے ہے۔

۳ حبان بن العرقۃ: نسخہ حرم مکی میں حیان ہے لیکن وہ غلط ہے۔ اصل نام حبان بن عرقہ ہے۔ عرقہ اس کی والدہ کا نام ہے۔ یہ عرقہ بنت سعید بن سعد بن سہم ہے۔ حبان کے باپ کا نام قیس یا ابوقیس بن علقمہ بن عبد مناف ہے۔

۴ بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں یہ روایت نقل کی ہے۔ الزیلعی نے "نصب الرایۃ" (۳-۲۰۱) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۵ صحیح بخاری، کتاب "مناقب الانصار" باب "مناقب سعد بن معاذ" فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۳۸۰۴ ہے۔ اسی طرح یہ روایت کتاب "الجہاد" باب "اذا نزل العدو علی حکم رجل" میں حضرت ابوسعید سے مروی ہے۔ فتح الباری میں اس حدیث کا نمبر ۳۰۴۳ ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سننے کے بعد حضرت سعدؓ نے کہا کہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ ان کے قابلِ جنگ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے اہل و عیال کو غلام لونڈی بنا لیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لقد حکمت فیھم بحکم الملک" کہ تم نے ان کے بارے میں بادشاہ حقیقی والا فیصلہ کیا ہے۔ یہ روایت کتاب "الاستیذان" باب "قول النبی قوموا الی سیدکم" میں اور کتاب "المغازی" میں باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب میں بھی ہے۔ فتح الباری میں ان احادیث کے نمبر بالترتیب ۶۲۶۲ اور ۴۱۲۱ ہیں۔

۶ سیرت ابن ہشام (۲-۲۴۰) میں ہے کہ مہاجرین نے کہا کہ ابو عمرو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے حلیفوں کا معاملہ تمھارے سپرد کیا ہے۔ صحیح بخاری میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا کہ اپنے سردار کی تکریم کے لیے اٹھو۔

چنانچہ انصار اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت سعدؓ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِنَّ هٰؤُلَاءِ نَزَلُوا عَلٰی حُکْمِكَ" (انھوں نے فیصلے کے لیے اپنے آپ کو تمھارے حوالے کر دیا ہے)[1]

صحیح بخاری[2] میں ایک دوسرے مقام پر حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنو قریظہ کے پاس آئے تو انھوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کے فیصلے کے سپرد کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ حضرت سعدؓ کے سپرد کر دیا۔ حضرت سعد نے کہا کہ ان کے بارے میں میرا فیصلہ یہ ہے کہ ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے اہل و عیال کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَقَدْ حَکَمْتَ فِیْھِمْ بِحُکْمِ الْمَلِکِ" کہ تم نے ان کے بارے میں بادشاہِ حقیقی کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔

صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتابوں[2] میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "تم نے وہ فیصلہ کیا ہے جو سات[3] آسمانوں کے اوپر اللہ کا فیصلہ ہے۔" پھر یہودیوں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مدینہ منورہ میں بنت[4] الحارث کے گھر میں بند کر دیا۔ پھر آپ بازار کی طرف نکلے۔ وہاں آپؐ نے خندقیں کھدوائیں۔ پھر ان کو وہاں بلوا کر خندقوں میں کھڑے کر کے ان کی گردنیں قلم کروا دیں۔ ان میں ان کے سردار حیی بن اخطب اور کعب بن اسد بھی تھے۔ ان کی تعداد چھ یا سات سو تھی۔ جو ان کی تعداد زیادہ بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آٹھ سو اور نو[6] سو کے درمیان تھی۔

کعب بن سعد القرظی (یہودیوں کو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جا رہا تھا تو انھوں نے پوچھا کہ تمھاری رائے میں وہ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرے گا؟

کعب نے کہا۔ کیا ہر موقع پر تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ تم میں سے کوئی لوٹ کر نہیں آئے گا اللہ کی قسم وہ تمھیں قتل کرے گا۔"

---

[1] صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب" فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۴۱۲۲ ہے۔ صحیح مسلم (۳-۱۳۸۹) کتاب الجہاد والسیر۔

[2] یہ روایت سیرت ابن ہشام (۲-۱۴۰) میں ہے۔ اس میں ہے لَقَدْ حَکَمْتَ فِیْھِمْ بِحُکْمِ اللہِ مِنْ فَوْقِ سَبْعَةِ اَرْقِعَةٍ (تم نے ان کے بارے میں وہ فیصلہ کیا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر اللہ کا فیصلہ ہے) حافظ ابن حجر فتح الباری (۷-۴۱۲) میں لکھتے ہیں کہ اَرْقِعَةٌ رقیع کی جمع ہے جس کے معنی آسمان کے ہیں۔ اور آسمان کو رقیع اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ستارے جڑے ہوتے ہیں۔

[3] نسخہ حرم مکی میں سات کے بجائے چار ہے جو کہ غلط ہے۔

[4] یہ کیسہ بنت الحارث بن کریز بن حبیب بن عبد شمس ہے۔ سہیلی الروض الانف (۶-۳۴۳) میں کہتے ہیں کہ یہ مسیلمہ کذاب کی بیوی تھی۔

[5] نسخہ لالہ میں "سعد" کے بجائے "اسید" ہے لیکن صحیح وہی ہے جو نسخہ حرم مکی میں ہے۔

[6] سیرت ابن ہشام میں ہے آٹھ سو سے لے کر نو سو تک۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان کی عورتوں میں سے صرف ایک عورت قتل کی گئی اس کا نام بنانہ[1] تھا۔ اس نے خلاد بن سوید[2] پر چکی کا پاٹ پھینکا تھا جس سے وہ شہید ہوگئے تھے۔

جامع المستخرجۃ میں ابن قاسم کی روایت ہے کہ امام مالک نے فرمایا کہ عبداللہ بن ابی بن سلول نے حضرت سعد بن معاذ سے کہا کہ بنو قریظہ میرا ایک بازو ہیں۔ وہ تین سو زرہ پوش اور چھ سو سوار ہیں۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ سعد نے قسم کھا رکھی ہے کہ اللہ کے معاملے میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرے گا۔ "السنن الکبریٰ" میں ہے کہ یہودیوں کی تعداد چار سو تھی۔ جب حضرت سعدؓ ان کے قتل سے فارغ ہوئے تو ان کی رگ پھٹ گئی جس سے ان کا انتقال ہوگیا۔ ابن سحنون کی کتاب[3] میں ہے۔ روایت ہے کہ جس دشمن نے اپنے آپ کو اللہ کے فیصلے کے سپرد کیا ہو اُسے قتل کرنے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کیونکہ تمھیں نہیں معلوم کہ اللہ کا فیصلہ ان کے بارے میں کیا ہو۔ آپؐ نے حکم دیا کہ دشمن کو کہو کہ وہ اپنے آپ کو تمھارے فیصلے کے سپرد کرے۔

سحنون کہتے ہیں کہ اگر حاکم نے غلطی سے دشمن کے مطالبے پر اسے اللہ کے فیصلے کے سپرد کر دیا تو پھر بات شبہ میں پڑ گئی اور اس صورت میں اسے چاہیے کہ وہ انھیں ان کی پناہ گاہ میں پہنچائے اِلّا یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔

امام محمد[4] کہتے ہیں کہ پناہ گاہ میں پہنچانے سے پہلے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنی چاہیے اور اسے وہ قبول نہ

---

[1] نسخہ حلبیہ، حلبی اور رباط میں اس کا نام "بنانۃ" ہے، نسخہ شہید علی پاشا میں اس کے نام کا ذکر نہیں۔ سہیلی نے بھی اس کا نام نہیں لکھا۔

[2] یہ خلاد بن سوید بن ثعلبۃ انصاری خزرجی ہیں۔ بیعت عقبہ اور جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ بنو قریظہ کے ہاتھوں شہید ہوئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے لیے دو شہیدوں کا اجر ہے، دیکھیے "السیرۃ" (۲-۲۵۴) "الاصابۃ" (۱-۴۵۴) اور "اسد الغابۃ" (۲-۱۲۱)

[3] صحیح مسلم (۳-۱۱۵۶) میں یہ حدیث سلیمان بن بریدہ کی روایت سے ہے۔ یہ اس نصیحت کا حصہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوج کے سپہ سالار کو کیا کرتے تھے۔ صحیح مسلم، کتاب "الجہاد والسیر" باب "تأمیر الامام الامراء علی البعوث"۔

[4] قتال سے پہلے اسلام کی دعوت پہنچانے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دعوتِ اسلام پیش کرنا لازمی ہے چاہے وہ دشمن تک پہنچ سکے یا نہ پہنچ سکے۔ امام مالک کی یہی رائے ہے۔ دیکھیے المقدمات (ص ۲۶۶) اس قول کی دلیل حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ لڑائی ہونے سے پہلے دشمن کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرمائی (بیہقی، ۹-۱۰۷)۔ اسی طرح سلیمان بن بریدہ کی روایت ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس میں ہے کہ جب غیر مسلم دشمن سے تمھاری جنگ ہو تو ان کے سامنے تین باتیں پیش کرو اور ان میں سے جو بھی منتخب کر لیں اسے قبول کر لو۔ ان کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر وہ قبول کر لیں تو ٹھیک ورنہ انھیں جزیہ دینے کے لیے کہو۔ اسے بھی قبول کر لیں تو ٹھیک ورنہ ان کے مقابلے میں اللہ سے مدد مانگو اور ان سے لڑو۔ اسی طرح وہ نصیحت ہے

کریں تو انھیں جزیہ قبول کرنے کے لیے کہنا چاہیے۔ سحنون کہتے ہیں کہ اگر وہ کہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو اللہ اور فلاں شخص کے حکم کے سپرد کیا تو بھی ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے گا کہ گویا انھوں نے اپنے آپ کو صرف اللہ کے فیصلے کے سپرد کیا ہے اور اگر وہ شخص ان کو قتل اور ان کے اہل وعیال کو لونڈی غلام بنانے کا فیصلہ صادر کرے تو وہ فیصلہ نافذ نہیں کیا جائے گا۔

ابوعبید نے کتاب "الاموال" میں ذکر کیا ہے کہ یہودیوں سے کہا گیا کہ تم اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے سپرد کردو تو انھوں نے کہا کہ ہم اپنے آپ کو سعد کے فیصلے کے حوالے کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے تم سعد ہی کے حوالے کرو۔

مصنف ابوداؤد[۲] میں ہے کہ بنونضیر بنوقریظہ سے زیادہ معزز تھے اور دونوں ہی قبیلے حضرت ہارون کی نسل سے تھے۔ مصنف ابوداؤد کے علاوہ دوسری کتابوں[۳] میں ہے کہ بنونضیر میں سے کوئی شخص بنوقریظہ کے کسی آدمی کو قتل کردیتا تو اس

جو فتح یمن کے لیے حضرت معاذؓ بن جبل کو بھیجتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ آپ نے فرمایا "لَا تُقَاتِلْهُمْ حَتّٰى تَدْعُوْهُمْ" (جب تک دعوت ان کے سامنے پیش نہ کرلو، ان سے جنگ مت شروع کرو) اسی طرح یہ آیت ہے "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (اسراء-۱۵)

دوسری رائے یہ ہے کہ دعوت پیش کرنا بالکل ضروری نہیں۔ اس رائے کے حق میں ابن عون کی یہ روایت دلیل کے طور پر لاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ غافل تھے اور اپنے چوپایوں کو پانی پلا رہے تھے۔ آپؐ نے ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کروا دیا اور ان کے اہل وعیال کو غلام بنا لیا۔ امام بخاری نے یہ روایت کتاب "العتق" باب "من ملك من العرب رقيقا" میں بیان کی ہے۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۲۵۴۱ ہے۔ صحیح مسلم میں یہ روایت کتاب "الجهاد" باب "جواز الاغارة على الكفار الذين بلغتهم دعوة الاسلام من غير تقدم الاعلام بالاغارة" میں ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ اگر دعوت پہنچ سکتی ہو تو لازماً پہنچانی چاہیئے لیکن اگر اسلام پھیل چکا ہو اور اس کی دعوت پوری طرح واضح ہو چکی ہو اور لوگوں کو معلوم ہو کہ کس بات کے لیے ان سے جنگ کی جارہی ہے تو دعوت پیش کرنا مستحب ہے۔ یہ جمہور علماء مثلاً نافع مولی ابن عمر، حسن بصری، ثوری، لیث، شافعی، ابن المنذر اور ابوثور وغیرہم کی رائے ہے۔ ابوعبید نے کتاب "الاموال" (ص ۱۷۰) میں ابن عون کے حوالے سے روایت کی ہے کہ میں نے نافع کو لکھا کہ جنگ سے پہلے دعوت لازماً پیش کی جاتی تھی تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ آغاز اسلام میں ایسے ہوتا تھا لیکن بعد میں ضروری نہ رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مصطلق پر اس وقت حملہ کیا جب وہ غافل تھے۔ اس سے دوسری رائے کی غلطی واضح ہوجاتی ہے۔ امام نووی نے شرح مسلم (۱۲-۳۶) میں اس قول کو ترجیح دی ہے۔

[۱] کتاب الاموال (ص ۱۹۱)

[۲] مصنف ابوداؤد، کتاب "الدیات" باب "النفس بالنفس"

[۳] یہاں سے "أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ" تک کی عبارت صرف نسخۂ حرم مکی میں موجود ہے۔

مصنفؒ کہتے ہیں کہ یہ بات مصنف ابوداؤدؒ کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ مصنف ابوداؤدؒ میں

کی دیت ایک سو وسق (تقریباً چھ سو من) غلہ یا کھجوریں ہوتیں اور اگر بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تو اسے قصاص میں قتل کر دیا جاتا۔ اسی طرح اگر معاملہ دیت کا طے ہوتا تو بنو قریظہ والے پوری دیت ادا کرتے اور بنو نضیر والے آدھی۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ بنو قریظہ کے ایک آدمی کو بنو نضیر کے ایک شخص نے قتل کر دیا تو بنو قریظہ نے مطالبہ کیا کہ قاتل کو ہمارے حوالے کرو تاکہ ہم اسے قتل کریں)۔ بنو قریظہ نے کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ کریں گے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں "وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ" (المائدہ: ۴۲) (اور فیصلہ کرو توان کے درمیان ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو)[۳] اور أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ (المائدہ: ۵۰) (تو پھر کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں)

بنو قریظہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے سے یہ فقہی نکتہ نکلتا ہے کہ اہل ذمہ اگر جنگ پر اتر آئیں جبکہ حکمران عادل ہو تو ان کی اس کارروائی سے ان کی عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذور مردوں کو بھی لونڈی غلام بنانا جائز ہو جاتا ہے۔ امام اوزاعی، ابن الماجشون، اصبغ، ابن حبیب، اور ابن المواز کی یہی رائے ہے۔ ابن القاسم بوڑھے اور معذور مردوں کے بارے میں ان حضرات سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کو غلام بنانا جائز نہیں۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کا قتل اس لیے جائز قرار دیا کہ انھوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ توڑ کر ان کے مقابلے میں احزاب کی مدد کی۔

ابو عبیدؒ لکھتے ہیں۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قوم نے معاہدہ کر کے توڑا ہو تو آپؐ نے اس کا قتل جائز نہ قرار دیا ہو سوائے اہل مکہ کے کہ آپؐ نے ان پر احسان کر کے انھیں چھوڑ دیا۔

تقدیم و تاخیر کے ساتھ اس طرح موجود ہے کہ جب بنو قریظہ میں سے کوئی شخص بنو نضیر کے کسی آدمی کو قتل کرتا تو اسے اس کے قصاص میں قتل کر دیا جاتا اور بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کرتا تو ایک سو وسق کھجوریں دیت کے طور پر دے دی جاتیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے تو بنی نضیر کے ایک آدمی نے بنو قریظہ کے ایک آدمی کو قتل کر دیا...... اس کے بعد کا واقعہ ابوداؤد میں بھی ایسے ہی ہے جیسے اوپر درج ہوا ہے۔ یہ روایت کتاب "الدیات" (۴-۱۶۸) میں ہے اور کتاب "القضا" باب "الحكم بين أهل الذمة" میں محمد بن اسحاق عن داؤد بن الحصین، عن عکرمہ، عن ابن عباس کی سند کے ساتھ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ" اور "وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (المائدہ-۴۲) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر اور بنو قریظہ کے درمیان قتل کے قصاص میں مساوات کر دی جب کہ اس سے پہلے ایسا نہیں تھا۔ نسائی نے اسی سند کے ساتھ اسے کتاب "القسامة" باب "تاویل قول الله تعالیٰ" وان حکمت......" (۸-۱۹) میں بیان کیا ہے۔ المنذری نے "المختصر" میں اسے اس سند کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں محمد بن اسحاق راوی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محمد بن اسحاق ثقہ راوی ہیں اور ان کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔

[۱] کتاب الاموال (ص ۲۴۳) [۲] کتاب الاموال (ص ۲۴۹) [۳] (المائدہ - ۴۲)

اہلِ مکہ نے یہ عہد شکنی کی کہ ان کے حلیف قبیلہ بنی بکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف قبیلہ بنی خزاعہ پر حملہ کیا تو اہلِ مکہ نے بنی بکر کی مدد کی۔ اس عہد شکنی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ کے ساتھ جنگ کو جائز قرار دیا۔

المفصل کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کا اکیس[1] دن تک محاصرہ کیے رکھا۔ تب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ صلح صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے سپرد کر دیں۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان میں ہر تین گھر ایک اونٹ پر جتنا سامان لاد کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں اور جو باقی بچ جائے گا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہوگا۔ اس فیصلے کو قبول کر کے وہ مدینہ چھوڑ کر شام[2] چلے گئے اور یہی ان کا وہ حشر[3] ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

صحیح بخاری[4] میں ہے کہ بنو نضیر کے محاصرے کا واقعہ جنگ بدر کے چھ ماہ[5] بعد ہوا۔ مختصر المدونۃ میں عروہ بن شہاب کی روایت ہے کہ واقعۂ بنو نضیر محرم ۳ھ میں ہوا۔

دوسرے کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ۴ھ میں ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ربیع الاول کو جمعہ کی رات کو ان کا محاصرہ

---

[1] بنو نضیر کے محاصرہ کی مدت کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے اور ان میں تطبیق مشکل ہے۔ سیرت ابن اسحاق (۲-۱۹۱) میں ہے کہ حضورؐ نے ان کا محاصرہ ربیع الاوّل کے مہینے میں چھ دن کے لیے کیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (۷-۳۳۱) میں اسی روایت کو نقل کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر (۴-۳۴۵) میں، ابن سید الناس "عیون الاثر" (۲-۴۸) میں اور طبری اپنی تاریخ (۳-۱۴۵) میں محمد بن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کا پندرہ دن تک محاصرہ کیا۔ طبری کی سند یہ ہے کہ محمد بن سعد سے، وہ اپنے باپ سے، وہ اپنے چچا سے، وہ اپنے باپ سے، وہ اپنے باپ اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اسی سند سے "عیون الاثر" (۲-۵۰) میں ابن سید الناس نے روایت کی ہے۔ واقدیؒ "المغازی" (ص ۲۸۹) میں لکھتا ہے کہ تقریباً بیس دن تک جنگ ہوتی رہی۔ الکلاعی نے محاصرے کی مدت کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح سہیلی نے بھی مدتِ محاصرہ میں وجہِ اختلاف کا ذکر نہیں کیا۔

[2] لیکن یہودیوں کے سردار شام کے بجائے خیبر چلے گئے۔ ان میں سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق اور حیی بن اخطب شامل تھے۔

[3] یہ اشارہ ہے سورۂ حشر کی ان آیات کی طرف۔ هُوَ الَّذِيٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ .... وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ۔ (الحشر-۲،۳)

[4] صحیح بخاری، "کتاب المغازی" باب حدیث بنی النضیر۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۷-۳۳۰) میں کہتے ہیں کہ عبد الرزاق نے اپنی "مصنف" میں اسے معمر عن الزہری کی متصل سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

[5] سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ یہ واقعہ جنگ اُحد کے پانچ ماہ بعد ہوا اور واقدی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے سینتیس ماہ بعد ہوا۔

کیا۔ یہ محاصرہ تئیس[1] دن جاری رہا اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ پچیس دن جاری رہا۔

المفصل کی کتاب میں ہے کہ بنونضیر کے محاصرے کا سبب یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند صحابہ[2] کے ساتھ بنونضیر کی طرف گئے اور ان سے بات کی کہ بنو کلاب کے جن دو آدمیوں کو عمرو بن ربیعہ ضمری[3] نے قتل کیا ہے۔ ان کی دیت ادا کرنے میں وہ (بنونضیر) آپ کی مدد کریں۔ انھوں نے کہا۔ ابوالقاسم! ہم تمھاری مدد کریں گے[4]۔ اس کے بعد انھوں نے خلوت میں سازش کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔

عمرو بن حجاش نضیری[5] نے کہا کہ میں چھت پر چڑھ کر اس پر پتھر پھینکتا ہوں اور المفصل کے علاوہ دوسروں[6] نے لکھا ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس پر چکی کا پاٹ پھینکتا ہوں۔ تو سلام بن مشکم نے اسے کہا کہ ایسا نہ کرو، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ یقیناً تمھیں بتا دے گا[7] کہ تم نے کیا منصوبہ بنایا ہے اور یہ اس عہد کی بھی خلاف ورزی ہے جو ہمارے اور اس کے درمیان ہے۔

---

[1] ابن حبیب کی کتاب "المحبر" (ص ۱۱۳) میں ہے کہ غزوہ بنی نضیر ۴ھ میں ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو منگل کے دن ان کا محاصرہ کیا جو تئیس دن تک جاری رہا۔

[2] سیرت ابن ہشام میں ہے کہ ان میں حضرات ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ واقدی نے اس میں اضافہ کیا ہے کہ ان میں حضرات زبیر، طلحہ، سعد بن معاذ، اسید بن حضیر اور سعد بن عبادہ شامل تھے۔

[3] یہ واقعہ یوں ہوا کہ عمرو بن ربیعہ ضمری بئر معونہ سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اس کی ملاقات قبیلہ بنو عامر کے دو آدمیوں سے ہو گئی۔ اس نے انھیں کہا کہ اپنا نسب بتاؤ۔ انھوں نے اپنا نسب بتایا تو وہ ان سے لڑنے لگا اور ان پر جھپٹ کر انھیں قتل کر دیا۔ پھر وہ اسی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو سارا واقعہ سنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بِئْسَ مَا صَنَعْتَ، قَدْ كَانَ لَهُمَا مِنَّا أَمَانٌ وَعَهْدٌ" — تم نے بہت برا کیا۔ ان دونوں کے ساتھ تو ہمارا معاہدہ تھا اور انھیں ہماری طرف سے امان حاصل تھی۔

حضرت عمرو بن ربیعہ نے کہا کہ مجھے تو اس بات کا شعور نہ تھا۔ میں تو ان دونوں کو شرک پر سمجھتا تھا اور ان کے قبیلے نے ہمارے ساتھ جو بدعہدی کی تھی وہ میرے پیش نظر تھی۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنونضیر کی طرف تشریف لے گئے کہ وہ دیت کی ادائیگی میں مدد کریں۔

[4] واقدی نے لکھا ہے کہ وہ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔

[5] ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے آل یامین میں سے کسی نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یامین سے کہا کہ تیرے چچا زاد بھائی نے میرے ساتھ جو سلوک کیا اس کا تجھے علم ہے؟ تو یامین بن عمیر نے ایک شخص کے لیے انعام مقرر کر دیا کہ وہ عمرو بن حجاش کو قتل کر دے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس آدمی نے اسے قتل کر دیا۔ ابن عبدالبر الاستیعاب (۳-۱۴۸۶) میں لکھتے ہیں کہ یامین نے اسلام قبول کر لیا۔ ان پر اسلام کا رنگ خوب چڑھا اور ان کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی "الاصابۃ" (۳-۶۱۱) میں ان کا ذکر کیا ہے۔ [6] واقدی نے اسی طرح لکھا ہے۔

[7] واقدی لکھتا ہے کہ سلام بن مشکم نے کہا کہ اس مرتبہ میری بات مان لو پھر زندگی بھر میری مخالفت کرتے رہنا۔ میں اللہ کی قسم کھا کر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ارادے کی خبر پہنچ گئی۔

دوسرے کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام آئے اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تو آپ جلدی جلدی وہاں سے اُٹھے اور آپ نے مدینہ کا رُخ کیا۔ صحابہ کرام بھی آپ کے ساتھ آ کر مل گئے اور انھوں نے کہا کہ آپؐ وہاں سے اُٹھ آئے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هَمَّتْ يَهُودُ بِالْغَدْرِ فَأَخْبَرَنِي اللهُ عَزَّوَجَلَّ بِذٰلِكَ[1]

یہودیوں نے غداری کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی خبر کر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف پیغام بھیجا[2]:

اُخْرُجُوا مِنْ بَلَدِي لَا تُسَاكِنُونِي وَقَدْ هَمَمْتُمْ بِالْغَدْرِ۔ وَقَدْ اَجَّلْتُكُمْ عَشْرًا فَمَنْ رُؤِيَ بَعْدَ ذٰلِكَ ضُرِبَتْ عُنُقُهُ۔

میرے شہر سے نکل جاؤ۔ تم نے غداری کا ارادہ کر لیا تھا اس لیے اب تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ میں نے تمھیں جلا وطن کر دیا ہے۔ دس دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جاؤ۔ اس مدّت کے بعد تم میں سے جو یہاں نظر آیا میں اس کی گردن مار دوں گا۔

وہ کچھ دن تیاری کرتے رہے۔ عبداللہ بن ابی نے انھیں پیغام بھیجا کہ اپنے گھروں سے نہ نکلنا۔ میرے پاس دو ہزار آدمی ہیں۔ وہ تمھارے ساتھ تمھارے قلعوں میں رہیں گے اور تمھارے ساتھ مریں گے۔ ان کے علاوہ بنو قریظہ اور تمھارے حلیف بنو غطفان بھی تمھاری مدد کریں گے۔ حیی بن اخطب نے اس کی باتوں سے امیدیں وابستہ کر لیں اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا کہ ہم اپنے گھروں سے نہیں نکلیں گے اس لیے جو کرنا ہو کر لو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ان کی طرف چل پڑے۔ آپ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی تھے۔ انھوں نے جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ جب بنو نضیر نے انھیں دیکھا تو اپنے قلعوں پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے پاس تیر اور پتھر تھے۔ بنو قریظہ ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور ابن اُبی اور بنو غطفان نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کہتا ہوں کہ اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو وہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تمھیں تباہ کر دے گا کہ تم نے اس کے ساتھ غداری کی ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو خدا کی قسم قیامت تک ان میں سے کوئی نہ کوئی اس دین کے لیے کھڑا ہوتا رہے گا جو اپنے مخالفین کی بیخ کنی اور اپنے دین کو غالب کرتا رہے گا۔

[1] سیرت ابن ہشام میں ہے کہ یہودیوں کے ارادوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خبر آسمان سے آئی۔

[2] ابن سید الناس نے "عیون الاثر" (۲-۴۹) میں ابن سعد سے یہ روایت نقل کی ہے۔ شیخ الغزالی کی کتاب "فقہ السیرۃ" (ص ۳۰۲) پر اپنی تعلیقات میں شیخ ناصر الدین البانی لکھتے ہیں کہ ابن سعد نے "الطبقات الکبریٰ" میں سند کے بغیر یہ روایت نقل کی ہے جبکہ تفسیر ابن کثیر (۴-۳۳۳) کے مطابق بیہقی نے محمد بن مسلمہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس سند کے تمام راوی محمد بن مسلمہ کے علاوہ

ان کا محاصرہ کیا۔ آپ نے ان کے کھجوروں[2] کے درخت کاٹ دیے۔ تنگ آ کر انھوں نے کہا کہ ہم تمھارے شہر سے نکل جاتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا اقبل ذلك ولكن اخرجوا	میں یہ بات قبول نہیں کرتا۔ تمھارے لیے فیصلہ یہ ہے کہ
ولكم دماؤكم وما حملت الابل	تم یہاں سے نکل جاؤ۔ تمھاری جانیں محفوظ ہیں اور ہتھیاروں
الا الحلقة	کے علاوہ جو سامان تم اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہو
	وہ لے جاؤ۔

بنو نضیر نے یہ فیصلہ تسلیم کر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہتھیار اور مال اپنے قبضے میں لے لیے۔ بنو نضیر کا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگزیر ضرورت کے کام آیا۔ آپ نے اس میں سے خمس نہیں لیا، بلکہ پورے مال پر آپ کا حق ٹھہرا۔[3] اللہ تعالیٰ نے وہ آپ کے لیے خاص کر دیا کیونکہ مسلمانوں نے اس کے لیے اونٹ گھوڑے نہیں دوڑائے تھے۔

ثقہ ہیں۔ محمد بن مسلمہ کا تذکرہ ابن ابی حاتم نے "الجرح والتعدیل" (۴-۲۹۰) میں کیا ہے اور اس پر کوئی جرح و تعدیل نہیں کی اس لیے اس کا شمار مجہولین میں ہے۔

[2] الکلاعی "الاکتفاء" (۲-۱۴۸) میں لکھتے ہیں کہ جب مسلمان یہودیوں کے گھروں کو ڈھا اور ان کی کھجوروں کو کاٹ رہے تھے تو انھوں نے طعنہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم تو فساد سے روکا کرتے تھے اور جو فساد پھیلاتا اس پر نکیر کیا کرتے تھے لیکن یہ کھجوروں کا کاٹنا اور جلانا کیا ہوا؟ ان درختوں کا کیا قصور ہے؟ اور تمھارا دعویٰ تو یہ ہے کہ تم زمین میں اصلاح کے لیے آئے ہو، تو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کی تائید میں یہ آیت نازل کی۔ "مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ ... (الحشر- ۵)" (تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔ اور (اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے) (الحشر: ۵)

[3] یہ اشارہ ہے سورۂ حشر کی ان آیات کی طرف وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ .... وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (الحشر-۶) (اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیے، وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا فرما دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مالوں میں سے انصار کو کوئی حصہ نہیں دیا بلکہ یہ مہاجرین میں تقسیم کر دیے تاکہ انصار ان کی کفالت کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائیں۔ انصار میں سے آپ نے ابو دجانہ اور سہل بن حنیف کو ان کی ضرورت کے لیے حصہ دیا۔ دیکھیے "السیرۃ"، "الروض الانف" (۲-۲۳۳)، "الاکتفاء" (۲-۱۴۹)، "عیون الاثر" (۲-۵۰)۔ ابن الطلاع نے اسمٰعیل القاضی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انصار میں سے ایک تیسرے شخص حارث بن صمہ کو بھی آپ نے حصہ دیا۔ ایسا آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے کیا۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ .... هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحشر-۸)

تو یہ بنو نضیر کی وہ رسوائی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَفْعَلُ ...." (البقرہ-۸۵) (تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا اس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں رسوائی کی صورت میں ظاہر ہوگی)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ (الحشر- ۵) تاکہ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو رسوا کرے۔

بنو قریظہ کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین ہزار مسلمانوں کے ساتھ گئے اور پندرہ دن[1] تک ان کا محاصرہ کیے رکھا انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ابولبابہ کو ان کی طرف بھیجیں۔ آپ نے حضرت ابولبابہؓ کو ان کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے حضرت ابولبابہ سے مشورہ کیا تو آپؓ نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کرائیں گے۔ اس کے بعد حضرت ابولبابہ کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی۔ انھوں نے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے۔ پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پلٹ کر نہ آئے بلکہ وہ سیدھے مسجد کی طرف گئے اور ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اس وقت آئے جب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کی قبولیت کی خبر دی[2]

(یہ مال ان مفلس مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راستباز لوگ ہیں)

ابن سید الناس نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اسلحہ میں سے پچاس زرہیں، پچاس خود اور چالیس تلواریں ملیں۔ آپ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کو ابوالحقیق کی تلوار عطا فرمائی۔

[1] اس کتاب کے تمام نسخوں میں پندرہ دن ہی کا ذکر ہے لیکن یہ سیرت کی کتابوں کی روایات کے مخالف ہے۔ واقدی (۴۹۸) میں اکیسؓ راتوں، سیرت ابن ہشام، ابن حبیب کی "المحبر" الکلاعی کی "الاکتفاء" میں پچیس راتوں اور تاریخ طبری میں ایک ماہ اور پچیس راتوں کا ذکر ہے۔ سہیلی نے اس اختلاف کا سبب بیان نہیں کیا اور ابن سید الناس نے محاصرے کی مدت کا ذکر نہیں کیا۔

[2] یہ اشارہ ہے اس آیت کی طرف: وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ .... إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (توبہ - ۱۰۲)

حضرت ابولبابہؓ ابن عبدالمنذر ہیں۔ یہ بنو عمرو بن عوف کے خاندان سے ہیں۔ ابن سید الناس "عیون الاثر" (۲- ۷۱، ۷۰) میں لکھتے ہیں کہ ابوعمرو کہتے ہیں کہ حضرت ابولبابہ کے اپنے آپ کو ستون کے ساتھ باندھنے کی وجہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں زیادہ صحیح بات وہ ہے جو معمر نے زہری سے روایت کی ہے کہ حضرت ابولبابہؓ ان لوگوں میں شامل تھے جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے اور اس وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے بنو قریظہ کا واقعہ بھی بیان کیا ہے لیکن نہایت کمزور انداز میں، مگر موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق ایسے سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا سبب بنو قریظہ والا واقعہ ہے۔ دیکھیے حافظ ابن کثیر کی "البدایۃ والنہایۃ" (۴- ۱۱۹)

پھر انھوں نے اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے سپرد کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہؓ کو حکم دیا اور انھوں نے ان کو ایک طرف جمع کر دیا[۱]۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو مقرر فرمایا اور انھوں نے ان کا سامان اور ہتھیار جمع کیے۔ انھیں وہاں سے دو ہزار پانچ سو تلواریں، تین سو زرہیں، ایک ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں ملیں۔ ان کے شراب کے مٹکے بھی تھے جن میں سے شراب گرا دی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال میں سے خمس نہیں لیا، بلکہ سارا مال اپنے قبضے میں لے کر اجتماعی مصالح کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے تقسیم کیا۔

قبیلہ اوس بنو قریظہ کا حلیف تھا اس لیے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ بنو قریظہ کو ان کے حوالے کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا فیصلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کے سپرد کر دیا۔ حضرت سعدؓ نے فیصلہ دیا کہ ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے اور ان کی جائدادیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد تم نے وہی فیصلہ سنایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تشریف لے آئے۔ آپ نے ان کے بارے میں حکم دیا اور انھیں مدینے میں لے آیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیٹھ گئے۔ آپ کے ساتھ صحابہ بھی تھے۔ پھر انھیں آرام آرام سے نکالا گیا اور ان کے سر قلم کر دیے گئے۔ ان کی تعداد چھ اور سات سو کے درمیان تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے ریحانہ[۲] بنت عمرو کو منتخب کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت جمع کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے سامان اور لونڈی غلاموں میں سے خمس نکالا اور باقی میں سے کچھ مسلمانوں میں تقسیم کر دیا اور کچھ فروخت کر دیا گیا[۳]۔ اس کے تین ہزار بہتر (۳۰۷۲) حصے کیے گئے۔ ایک گھوڑے کے دو اور اس کے مالک کا ایک حصہ مقرر کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بعض کو آزاد کر دیا، کچھ لوگوں کو دے دیے اور کچھ کو خدمت کے لیے مقرر فرما دیا۔

اسی طرح "المستخرجۃ" میں امام مالک کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے مال غنیمت میں سے خمس نکالا لیکن بنو نضیر کے مال میں سے نہیں۔

---

۱ ابن سعد نے لکھا ہے کہ انھوں نے عورتوں اور بچوں کو نکال کر ایک طرف کر دیا۔ ابن سیدالناس نے یہ روایت نقل کی ہے۔

۲ ریحانہ بنت عمرو بن خناقہ، بنو عمرو بن قریظہ میں سے تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے لیے منتخب فرمایا۔ آپ نے اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرمائی لیکن اس نے یہودیت کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار محسوس ہوئی اور آپ نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ابن حبیب نے "المحبر" (۹۴) میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ کسی کے جوتوں کی آواز آئی۔ آپ نے فرمایا: "یہ ثعلبہ بن سعید قرظی ہے اور مجھے ریحانہ کے اسلام قبول کرنے کی خوشخبری دینے آیا ہے۔" تو ایسا ہی ہوا۔

۳ الکلاعی نے "الاکتفاء" (۲-۱۸۲) میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن زید انصاریؓ کو بنو قریظہ کے کچھ قیدی دے کر نجد بھیجا۔ انھوں نے ان کو فروخت کیا اور ان کے بدلے گھوڑے اور ہتھیار لائے۔

فتح مکہ کے موقع پر امان دینے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

موطا[1]، بخاری[2]، مسلم[3] اور نسائی[4] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو آپؐ کے سر مبارک پر خود تھا۔ جب آپؐ نے خود اتارا تو ایک آدمی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور اس نے کہا یا رسول اللہ! ابن خطل[5] غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "اُقْتُلُوْهُ" (اسے قتل کر دو)

---

[1] موطا (۱-۲۹۳) کتاب "الحج" باب "جامع الحج"۔

[2] صحیح بخاری، کتاب "الجهاد" باب "قتل الاسیر وقتل الصبی"۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۳۰۴۴ ہے۔ یہ روایت حضرت انسؓ سے ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری، کتاب اللباس باب "المغفر"۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۵۸۰۸ ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب "أين ركز النبي صلى الله عليه وسلم الراية"۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۴۲۸۶ ہے۔

[3] صحیح مسلم (۲-۹۸۹) کتاب الحج باب "جواز دخول مكة بغير احرام"۔ امام نووی، شرح مسلم (۹-۱۳۱) میں لکھتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کے لیے دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جو شخص حج یا عمرے کا ارادہ نہ رکھتا ہو اس کے لیے احرام باندھے بغیر مکہ معظمہ میں داخلہ جائز ہے۔ چاہے وہ کسی ضرورت مثلاً ایندھن، شکار، پانی وغیرہ کے لیے بار بار آئے جائے یا بار بار آنے جانے والی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً تجارت یا زیارت وغیرہ۔ اسی طرح چاہے آنے والے شخص کو کوئی خطرہ ہو یا نہ ہو۔ امام شافعی کا زیادہ صحیح قول یہی ہے اور شوافع کا فتویٰ بھی یہی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اگر بار بار پیش آنے والی ضرورت نہ ہو تو احرام کے بغیر داخلہ جائز نہیں، ہاں اگر کوئی خطرہ ہو، جنگ کی حالت ہو، جنگ یا ظلم کا خوف ہو تو احرام کے بغیر داخل ہو سکتا ہے۔ اکثر علماء کی یہی رائے نقل کی گئی ہے۔

[4] سنن نسائی (۵-۲۰۰) کتاب الحج باب "دُخُولِ مَكَّةَ بغير احرام"۔ یہ روایت حضرت انسؓ سے ہے۔ ابوداؤد نے بھی یہ روایت، کتاب الجهاد باب فی قتل الاسیر ولا یعرض علیه الاسلام اور ترمذی (۴-۲۰۲) نے کتاب الجهاد باب "ما جاء فی المغفر" میں نقل کی ہے۔

[5] ابن خطل کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کا نام عبداللہ تھا۔ کلبی کہتے ہیں کہ اس کا نام غالب بن عبداللہ بن عبد مناف بن سعد بن جابر بن قصیر بن تیم بن غالب تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ آگے آ رہی ہے۔

امام مالک نے شہاب سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ دوسروں کی روایت یہ ہے کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سرمبارک پر سیاہ رنگ کی پگڑی تھی۔ امام بخاری اور مسلم نے ذکر کیا ہے کہ آپ اونٹنی پر سوار تھے اور آپ کے پیچھے حضرت اسامہؓ بن زید تھے۔

سنن نسائی[1] اور بعض دوسری کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ دَخَلَ الْكَعْبَةَ فَهُوَ اٰمِنٌ وَمَنْ	جو کعبہ میں داخل ہوگیا اس کے لیے امان ہے۔
اَغْلَقَ بَابَ بَيْتِهٖ فَهُوَ اٰمِنٌ	جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اس کے لیے امان
وَمَنْ اَلْقَى السِّلَاحَ فَهُوَ اٰمِنٌ وَمَنْ	ہے۔ جس نے ہتھیار ڈال دیے اس کے لیے امان ہے اور جو
دَخَلَ دَارَ اَبِىْ سُفْيَانَ[2] فَهُوَ اٰمِنٌ۔	ابوسفیان[3] کے گھر میں داخل ہوگیا اس کے لیے امان ہے

ابوعبید نے کتاب الاموال[4] میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی زخمی پر سختی نہ کی جائے، جو آدمی بھاگ جائے اس کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنا دروازہ بند کر لے اس کے لیے امان ہے۔

---

[1] امام مسلم نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور جعفرؓ بن عمرو سے اور نسائی نے حضرت جابرؓ سے یہ روایت بیان کی ہے۔

[2] مجھے یہ روایت "السنن الصغریٰ" میں نہیں ملی، شاید "السنن الکبریٰ" میں ہو۔ ابن ہشام نے "السیرۃ" (۲-۳-۴) میں ابن اسحاق سے یہ روایت تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ ابن جریر (۲-۱۴۳۰) نے اس کی متصل سند حضرت ابنؓ عباس تک بیان کی ہے۔ اس سند میں ایک راوی حسین بن عبداللہ بن عبیداللہ ہے جو ضعیف ہے، لیکن الہیثمی نے (مجمع الزوائد) (۶-۱۶۵، ۱۶۷) میں لکھا ہے کہ طبرانی نے یہ روایت بیان کی ہے اور اس کے راوی صحیح بخاری کے معیار پر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طبرانی کی سند ابن جریر کی سند سے مختلف ہے۔ ابوداؤد (۳-۱۶۲) نے کتاب "الامارۃ" باب "ماجاء فی فتح مکۃ" میں ابن اسحاق کے حوالے سے ایک اور سند کے ساتھ یہ روایت حضرت ابن عباسؓ سے بیان کی ہے۔ اس سند میں ایک راوی کا نام نہیں لیا گیا لیکن اس کی ایک تیسری سند بھی ہے جس کے راوی ثقہ ہیں، مگر اس میں ابن اسحاق نے اپنے سماع کی تصریح نہیں کی۔ ابوداؤد اور مسلم (۲-۱۴۰۸) نے کتاب "الجہاد" باب "فتح مکۃ" میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں انہوں نے "جو مسجد میں داخل ہوا۔ پس وہ امن میں ہے" کی جگہ "جس نے اپنے ہتھیار پھینک دیے پس وہ امن میں ہے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

[3] ابوسفیان بن حرب بن عبدالمطلب سرداران قریش میں سے تھے۔ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تکریم اور تالیف قلب کے لیے ان کے گھر کو امان کی جگہ بنا دیا۔

[4] کتاب الاموال (ص۱۵۸) میں ہے کہ پھر ابوعبید نے کہا کہ ہشیم نے حصین بن عبدالرحمن سے اور اس نے عبیداللہ بن عتبہ سے اسی طرح روایت بیان کی، اس کے بعد ابوعبید نے کہا کہ روایت میں ایک بات میں نے ایسی بیان کی ہے جو میں نے ہشیم سے حفظ نہیں کی اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار کے علاوہ سب لوگوں کو امان دے دی۔

یہاں یہ بات بھی سامنے رہے کہ نسخہ حرم مکی میں تو عبارت اسی طرح ہے جس طرح کتاب الاموال میں ہے، لیکن دوسرے نسخوں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چار آدمیوں کے علاوہ سب کو امان دے دی اور ان چار کے متعلق فرمایا: "اُقْتُلُوْهُمْ وَاِنْ تَعَلَّقُوْا بِاَسْتَارِ الْکَعْبَةِ" (انھیں قتل کر دو اگرچہ وہ غلافِ کعبہ کے ساتھ لپٹے ہوئے ہوں)۔

ابن حبیب نے چھ مردوں اور چار عورتوں کا ذکر کیا ہے جنھیں امان نہیں ملی تھی۔ نسائی وغیرہ کی روایت کے مطابق ان کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن خطل، عکرمہ بن ابوجہل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ سعد بن ابی سرحؓ۔

جہاں تک عبداللہ بن خطل کا تعلق ہے تو وہ اس حالت میں پکڑا گیا کہ غلاف کعبہ کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ حضرت سعید بن حریث اور عمارؓ بن یاسر دونوں، اس کی طرف دوڑے لیکن سعید نوجوان تھے اور انھوں نے آگے بڑھ کر ابن خطل کو قتل کر دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن خطل کے مال کے ساتھ کوئی تعرض نہ کیا۔

ابن ہشامؒ نے ذکر کیا ہے کہ مقیس بن صبابہ کی اپنی قوم کے ایک شخص نمیلہ نے اسے قتل کر دیا اور عبداللہ بن خطل کو سعیدؓ بن حریث اور ابوبرزہؓ اسلمی نے مل کر قتل کیا۔

مقیس کی بہن نے اس کے بارے میں شعر کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ نمیلہ نے اپنے ہی قبیلے کو ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور مقیس کو قتل کر کے اس نے موسمِ سرما کے مہمانوں کو رنج پہنچایا۔

"الشرف" کے مصنفؒ نے لکھا ہے کہ ابوبرزہ نے اسے قتل کیا۔ باقی رہ گیا عکرمہؓ کا معاملہ تو وہ سمندر کے سفر پر روانہ

(نسخہ لالہ، حلیب، حلبی وغیرہ) کی عبارت کتاب الاموال کی عبارت سے مختلف ہے۔

[1] پانچواں ہبار بن اسود اور چھٹا حویرث بن نقید بن وہب بن عبد بن قصی تھا۔ ابوداؤد نے امام احمد کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے اور ابن سید الناس نے "عیون الاثر" (۲-۱۷۵) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

[2] سیرت ابن ہشام (۲-۴۱۰)

[3] جنگ بدر میں ابوجہل کے قتل کے بعد اس کا بیٹا عکرمہ لوگوں کو بھڑکایا کرتا تھا۔ ابن اسحاق نے "السیرۃ" (۲-۶۰) میں لکھا ہے کہ جب جنگ بدر میں کفار قریش کو شکست ہوئی اور ان کے بہت سے سردار قتل ہو گئے اور ابوسفیان اپنا قافلہ لے کر مکہ معظمہ پہنچ گیا تو عبداللہ بن ربیعہ، عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ اور دوسرے وہ لوگ جن کے باپ، بیٹے یا بھائی قتل ہو گئے تھے انھوں نے ابوسفیان سے اور ان لوگوں سے جن کا مالِ تجارت اس قافلے کے پاس تھا بات کی کہ قریشیو! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمھارے بہترین لوگوں کو قتل کر کے تمھاری جڑ مار دی ہے۔ تم اس مال کے ذریعے ہماری مدد کرو تاکہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑ کر اپنا بدلہ لے سکیں۔ اس اپیل پر وہ لوگ اپنا مال دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

اس کے بعد ابن اسحاق (۲-۶۲) نے لکھا ہے کہ قریش تیاری کر کے نکلے۔ ان کی تعداد تین ہزار تھی۔ اُن کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے۔ انھوں نے سواروں کے میمنہ پر خالد بن ولید کو اور میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل کو مقرر کیا۔

اس کے علاوہ عکرمہ ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے عضل اور قارہ کی غداری کے نتیجے میں حضرت خبیب کو قتل کیا۔ دیکھیے

ہو گیا کشتی تیز آندھی کی زد میں آگئی تو ملاحوں نے کہا کہ خالصتاً ایک ہی اللہ کو پکارو۔ کیونکہ یہاں دوسرے معبود تمھارے کچھ کام نہیں آسکتے۔ عکرمہ نے کہا کہ اگر سمندر میں خالص توحید کے علاوہ کوئی چیز نجات نہیں دے سکتی تو خدا کی قسم خشکی پر بھی اس کے علاوہ کوئی کام نہیں آسکتا۔ اے اللہ! میں تیرے ساتھ عہد کرتا ہوں کہ اگر تو نے مجھے اس مشکل سے نجات دی تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر ان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں انھیں فراخ دل معاف کرنے والا پاؤں گا، چنانچہ حضرت عکرمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔[1]

عبداللہ[2] بن سعد بن ابی سرح کا معاملہ یوں ہوا کہ وہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے ہاں چھپ گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کی دعوت دی تو حضرت عثمانؓ نے عبداللہ کو لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھڑا کر دیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ سے بیعت لیجیے۔ آپ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور تین مرتبہ اس کی طرف دیکھا۔ اس نگاہ میں انکار پایا جاتا تھا لیکن اس کے بعد آپ نے بیعت لے لی۔ پھر آپ صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

أَمَا كَانَ فِيكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ يَقُومُ إِلَى هٰذَا حِينَ رَآنِي كَفَفْتُ يَدِي عَنْ بَيْعَتِهِ فَيَقْتُلُهُ۔	جب تم نے دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اس کی بیعت سے روک لیا ہے تو تم میں کوئی ایسا سمجھدار آدمی نہ تھا کہ وہ اٹھتا اور اسے قتل کر دیتا۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں کیا خبر کہ آپ کے دل میں کیا بات تھی۔ آپ نے اپنی آنکھ سے ہمیں اشارہ کر دیا ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی نبی کے شایانِ شان نہیں کہ اس میں آنکھوں کی خیانت پائی جاتی ہو۔

---

* "السیرۃ" (۲-۱۷۹) یہ خندق عبور کرنے والوں میں بھی شامل تھا۔ السیرۃ (۲-۴۲۴) فتح مکہ کے موقع پر یہ صفوان بن امیہ کے ساتھ ان لوگوں میں شامل تھا۔ جنھوں نے حضور سے جنگ کی کوشش کی۔ ان سب وجوہات کی بنا پر آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔

[1] حضرت عکرمہ کی بیوی ام حکیم بنت حارث بن ہشام تھیں۔ وہ مسلمان ہو گئیں اور انھوں نے اپنے خاوند کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امان طلب کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امان دے دی۔ وہ اپنے خاوند کی تلاش میں یمن کی طرف نکلیں۔ انھیں لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ دیکھیے "السیرۃ" (۲-۴۱۰)

[2] ابن اسحاق نے "السیرۃ" (۲-۴۰۹) میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم اس لیے دیا کہ وہ پہلے مسلمان ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے وحی بھی لکھواتے تھے لیکن بعد میں وہ مرتد ہو گیا اور بھاگ کر قریش کے پاس آ گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر اس نے حضرت عثمانؓ بن عفان کے ہاں پناہ لی۔ حضرت عثمانؓ کا وہ رضاعی بھائی تھا۔ اس کے بعد ابن ہشام نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں کسی علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے بھی انھیں ایک علاقے کا حاکم بنایا۔

ابنِ ہشام نے "السیرۃ"[1] میں اور ابن حبیب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا مردوں اور دو عورتوں کے علاوہ حویرث[2] بن نفیر بن وہب بن عبد بن قصی کو بھی قتل کر دینے کا حکم دیا۔ اسے حضرت علیؓ نے باندھ کر قتل کیا۔

ابن حبیب نے ان کے علاوہ دو اور عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کر دینے کا حکم دیا۔ وہ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ اور عمرو بن ہاشم[3] کی آزاد کردہ لونڈی سارہ تھیں۔ جن عورتوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے وہ دونوں عبداللہ بن خطل کی باندیاں تھیں جو گا گا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام قرتنا تھا اور دوسری کا قریبہ۔ قرتنا مسلمان ہو گئی۔ اس کا انتقال حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں ہوا۔ قریبہ اور سارہ کو قتل کر دیا گیا۔ اور ہند بنت عتبہ نے مسلمان ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لی۔

ابنِ اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ سارہ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امان طلب کی گئی تو آپؐ نے اسے امان دے دی اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی زندہ رہی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے دور میں ابطح میں ایک آدمی نے گھوڑے کے نیچے روند کر اسے قتل کر دیا۔

ابو عبید نے کتاب الاموال[4] میں ذکر کیا ہے کہ سارہ اہل مکہ کے نام حضرت حاطب کا خط لے کر گئی تھی۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سرح کے قتل کا حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ پہلے مسلمان ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے وحی بھی لکھواتے رہے لیکن بعد میں وہ مرتد ہو گیا۔ وہ بعد میں پھر مسلمان ہو گئے اور حضرت عمرؓ نے انھیں ایک علاقے کا حاکم مقرر کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے بھی انھیں ایک علاقے کا حاکم بنایا۔

عبداللہ بن خطل کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک مہم پر بھیجا۔ اس کے ساتھ آپؐ نے ایک انصاری صحابی کو بھی بھیجا۔ اس کے علاوہ خدمت کے لیے ایک مسلمان غلام بھی تھا۔ ایک جگہ ان سب نے پڑاؤ ڈالا۔ عبداللہ بن خطل نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ بکرا ذبح کر کے اس کے لیے کھانا تیار کرے لیکن غلام سو گیا اور اس نے کھانا تیار نہ کیا۔ عبداللہ بن خطل نے حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور خود مرتد ہو گیا۔

حویرث بن نفیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ میں اذیتیں پہنچایا کرتا تھا۔ حضرت عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں حضرت فاطمہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما کو اونٹنی پر سوار کر کے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ لے جا رہے تھے۔ کہ راستے میں اسی حویرث نے اونٹنی کو بدکا یا جس سے دونوں صاحبزادیاں زمین پر گر گئیں۔

مقیس نے اس انصاری کو قتل کیا تھا جس کے ہاتھوں مقیس کا بھائی بلا ارادہ قتل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مقیس مرتد

---

[1] اس کے قتل کا سبب آگے بیان ہو گا۔ [3] نسخہ لالہ، حلب اور حلبی میں ہاشم کے بجائے ہشام ہے اور صحیح بھی یہی ہے۔

[2] السیرۃ (۲-۴۱۱) [4] کتاب الاموال (ص ۱۵۰)

ہوکر مکہ مکرمہ چلا گیا۔ مقیس سنہ ۶ ھ میں صلح حدیبیہ والے سال مسلمان ہوکر مکہ معظمہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے اپنے بھائی کی دیت کا مطالبہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی ادائیگی کا حکم دے دیا۔ دیت وصول کرنے کے بعد اس نے اپنے بھائی کے قاتل کو قتل کر دیا اور مرتد ہوکر مکہ واپس چلا گیا۔ وہاں اس نے شعر کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے پاس جاکر خون کا بدلہ لے لیا اور پھر اپنے بتوں کی طرف میں سب سے پہلے رجوع کرنے والا ہوں۔

اس کے بھائی کو عبادہ بن صامت کے قبیلے کے ایک انصاری ہشام بن صبابہ نے غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر شعبان سنہ ۶ ھ میں اس غلط فہمی کی بنا پر قتل کر دیا تھا کہ وہ دشمن کا آدمی ہے۔

ابن ہشام نے "السیرۃ" (۲-۴۱۴) میں لکھا ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلا مقتول جس کی دیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر ادا کی، جنیدب بن اکوع تھا جسے بنو کعب نے قتل کر دیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت کے طور پر سو اونٹنیاں دیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبیلہ خزاعہ کے لوگو! اب قتل سے ہاتھ اٹھالو کیونکہ اگر قتل (کسی درجہ میں) نفع بخش ہے تو وہ بہت ہوچکا۔ ابن حبیب نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو خزاعہ کو اجازت دی تھی کہ وہ نماز عصر تک بنو بکر کو تہ تیغ کر سکتے ہیں۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس اجازت کی وجہ یہ تھی کہ حدیبیہ کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان صلح کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو چاہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اور جو چاہے وہ اہل مکہ کا حلیف بن سکتا ہے تو بنو خزاعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے، لیکن بنو بکر اور قریش نے اس عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور انھیں نقصان پہنچایا۔ تب عمرو بن سالم خزاعی نے مدینہ منورہ آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

لہ "السیرۃ" (۲-۴۱۷)۔ اس میں مکمل حدیث اس طرح ہے کہ اب تم نے جو قتل کیا ہے میں اس کی دیت دوں گا، لیکن اس کے بعد اگر تم نے کوئی قتل کیا تو مقتول کے ورثاء کو اختیار ہوگا کہ چاہیں تو وہ قتل کا بدلہ لیں اور چاہیں تو دیت لے لیں پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کی دیت ادا کی جسے بنو خزاعہ نے قتل کیا تھا۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں روایت ہوئی ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث کتاب "الدیات" باب "من قتل لہ قتیل فھو بخیر النظرین" میں حضرت ابوہریرہ سے تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۶۸۸۰ ہے۔ صحیح مسلم میں کتاب "الحج" باب "تحریم مکۃ وصیدھا" میں، سنن ابوداؤد (۴-۱۷۲) میں کتاب "الدیات" باب "ولی العمد یرضی بالدیۃ" میں اور جامع ترمذی (۴-۲۱) میں کتاب "الدیات" باب "ما جاء فی حکم ولی القتیل فی القصاص والعفو" میں تفصیل کے ساتھ یہ روایت آئی ہے۔ اسی طرح سنن نسائی (۸-۳۸) کتاب "القسامۃ" باب "ھل یؤخذ من قاتل العمد الدیۃ إذا عفا ولی المقتول عن القود عنہ" اور ابن ماجہ (۲-۸۷۶) کتاب "الدیات" باب "من قتل لہ قتیل فھو بالخیار بین احدی ثلاث" میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

مدد کی درخواست کی اور فتح مکہ کے لیے اس نے اپنے اشعار کے ذریعے جذبات کو بھڑکایا۔

تفسیر ابن سلام میں ہے کہ مکہ معظمہ میں بنو خزاعہ کے پچاس آدمی قتل ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ (اور اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے سینوں کی جلن مٹا دے گا)

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُغْزَىٰ قُرَيْشٌ أَبَدًا وَلَا يُقْتَلُ قُرَشِيٌّ صَبْرًا أَبَدًا۔ آئندہ نہ تو قریش کبھی چڑھائی کریں گے اور نہ کسی قریشی کو باندھ کر قتل کیا جائے گا۔

آپ کی مراد تھی کہ آئندہ کسی قریشی کو کفر کی بنا پر قتل نہیں کیا جائے گا (کیونکہ فتح مکہ کے بعد اس دور میں سب قریشی اسلام قبول کر لیں گے)

ابو سفیان نے کہا۔ یا رسول اللہ! قریش کی جمعیت آج ختم ہو گئی۔ آج کے بعد قریش میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ" (جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو گیا اس کے لیے امان ہے)۔

ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ "لَا يُقْتَلُ قُرَشِيٌّ صَبْرًا" میں "لَا يُقْتَلُ" مضارع کا صیغہ ہے نہی کا نہیں، کیونکہ اگر اسے

لہ التوبۃ: ۱۴۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ مجاہد، عکرمہ اور سدی نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ "قوم مومنین" سے مراد بنو خزاعہ ہیں۔

لہ اس روایت کا ماخذ مجھے معلوم نہیں ہو سکا، البتہ ابن اسحاق نے "السیرۃ" (۲-۲۵۴) میں ان الفاظ میں روایت بیان کی ہے کہ جو بات مجھ تک پہنچی ہے اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ وَلَكِنْ تَغْزُونَهُمْ (قریش آئندہ تم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان پر چڑھائی کرو گے)۔ طبرانی نے "المعجم الاوسط" اور "المعجم الکبیر" میں سائب بن یزید سے روایت نقل کی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر عبد اللہ بن خطل کو غلاف کعبہ سے نکال کر زمزم اور مقام ابراہیم کے درمیان قتل کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آئندہ کسی قریشی کو باندھ کر قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس میں ایک راوی ابو معشر ہے جو ضعیف ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۶-۱۷۵)

لہ صحیح مسلم (۳-۱۴۰۹) کتاب "الجہاد والسیر" باب "فتح مکۃ" میں ایک لمبی حدیث ہے جس کا یہ ایک جزو ہے۔ یہ روایت حضرت ابو ہریرہ سے ہے۔ امام احمد نے بھی اپنی مسند (۲-۵۳۸) میں حضرت ابو ہریرہ ہی سے یہ روایت بیان کی ہے۔

لہ زرقانی نے شرح المواہب (۲-۳۰۹) میں لکھا ہے کہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس روز قریش کے بہت سے لوگ قتل ہوئے اور اس سے طبرانی کی اس روایت کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت خالد نے اس روز قریش کے ستر آدمی قتل کیے۔

لہ "المعارف"۔

نہی کا صیغہ "لَا یُقْتَلُ" پڑھا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ قریشی مرتد ہو جائے تو بھی اسے قتل نہ کیا جائے اور اگر وہ کسی کو قتل کرے تو بھی اس سے قصاص نہ لیا جائے، لیکن اگر اسے مضارع کا صیغہ پڑھا جائے تو اس میں یہ خبر ہوگی کہ اس کے بعد قریش میں سے کوئی مرتد ہوگا ہی نہیں کہ اسے قتل کیا جائے۔

ابن حبیب نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں پندرہ دن قیام فرمایا اور اس عرصہ میں آپ نے قصر نمازیں پڑھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دس دن قیام فرمایا اور قصر نمازیں پڑھیں، اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس دن قیام کیا اور قصر نمازیں پڑھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں[2] کہ ہم انیس[19] دن تک تو قصر پڑھتے اور اس سے زیادہ قیام ہوتا تو پوری نماز پڑھتے۔

المزنی[3] نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں اٹھارہ دن قیام کیا اور

---

[1] صحیح بخاری، باب "مَا جَاءَ فِی تَقْصِیرِ الصَّلَاةِ" فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۱۰۸۰ ہے۔ اس میں انیس دن کا ذکر ہے۔

[2] صحیح بخاری، کتاب "المغازی" باب "قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ" فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۱۲۲۱ ہے صحیح مسلم (۱-۱۸۴) کتاب "صلاۃ المسافرین"۔ سنن نسائی (۳-۱۰۰۱) کتاب "التقصیر" جامع ترمذی (۲-۴۳۲) ابواب السفر، باب "ما جاء فی کم تقصر الصلاۃ" ابن ماجہ (۱-۳۴۲) کتاب "الصلاۃ" باب "کم یقصر الصلاۃ المسافر اذا اقام ببلدۃ" اس میں حدیث کا نمبر ۱۰۹۴ ہے۔ سنن ابوداؤد (۲-۱۰۷۹) کتاب "الصلاۃ" باب "متی یتم المسافر"۔

[3] یہ روایت مزنی کی "المختصر" میں ہے جو امام شافعی کی کتاب "الام" کے ساتھ چھپی ہوئی ہے۔ یہ آٹھویں جزو میں ہے۔ اس میں شک کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ یا اٹھارہ دن قیام فرمایا جس کے دوران آپ نے قصر نمازیں پڑھیں۔ پھر آپ حنین کی طرف نکلے۔ میں کہتا ہوں کہ فتح مکہ کے موقع پر مکہ معظمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدت قیام کے بارے میں روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک آپ نے انیس[19]، بعض کے نزدیک اٹھارہ، بعض کے نزدیک سترہ اور بعض کے نزدیک پندرہ دن قیام فرمایا۔

حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" (۲-۵۶۲) میں لکھا ہے کہ بیہقی نے ان روایات میں اس طرح تطبیق پیدا کی ہے کہ جس نے انیس دن لکھے ہیں اس نے مکہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے دونوں دن شامل کر لیے ہیں اور جس نے سترہ دن لکھے ہیں اس نے ان دونوں دنوں کو حذف کر دیا ہے اور جس نے اٹھارہ دن لکھے ہیں اس نے ان میں سے ایک دن شامل کر لیا ہے اور ایک دن حذف کر دیا ہے اور پندرہ دن والی روایت کو امام نووی نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام نووی کی یہ رائے وزنی نہیں کیونکہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور اس کی روایت میں ابن اسحاق منفرد نہیں بلکہ نسائی نے بھی عراک بن مالک بن عبیداللہ کی سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں تو اس کی تاویل اس طرح کی

اس عرصہ میں قصر نمازیں پڑھیں۔ سنن ابوداؤد[1] میں حضرت جابر رضی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں بیس دن قیام فرمایا اور اس عرصہ میں قصر نمازیں پڑھیں۔ یہ روایت حضرت ابن عباس رضی کی روایت کے خلاف ہے۔

جائے گی کہ راوی کو گمان یہ ہوا کہ آپ کا اصل میں قیام سترہ دن رہا اور اس نے مکہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے دونوں دن حذف کر دیے اور پندرہ دن شمار کر لیے۔

حضرت ابن عباس رضی اور حضرت انس رضی کی روایات میں جو تعارض ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ حضرت انس رضی کی روایت حجۃ الوداع کے بارے میں ہے کیونکہ یہی وہ سفر ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں دس دن قیام فرمایا۔ آپ چار تاریخ کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور چودہ تاریخ کو وہاں سے نکلے۔ رہ گئی حضرت ابن عباس رضی کی روایت تو وہ فتح مکہ کے بارے میں ہے۔ یہ تطبیق بہت اچھی ہے۔

مزنی: یہ ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے امام شافعی اور نعیم بن حماد سے احادیث کی روایت کی ہے۔ امام شافعی نے ان کے بارے میں فرمایا کہ شیطان مزنی سے مناظرہ کرے تو مزنی اس پر غالب آجائے گا۔ ان کی وفات ۲۶۴ھ میں ہوئی۔ بہت عالم، زاہد اور مجتہد تھے۔ مضبوط قوت استدلال کے مالک تھے۔ سبکی نے "الطبقات الشافعیۃ" (۱-۲۹۳) میں، شیرازی نے "طبقات الفقہاء" (ص ۷۹) میں، بغدادی نے "طبقات الفقہاء الشافعیۃ" (ص ۹) میں، ابن عبدالبر نے "الانتقاء" (ص ۱۱۰) میں اور ابن الاثیر نے "اللباب" (۳-۱۳۳) میں ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

[1] سنن ابوداؤد (۲-۱۱) کتاب "الصلاۃ" باب "اذا اقام بارض العدو یقصر"۔ شیخ عظیم آبادی نے "عون المعبود" (۴-۱۰۳) میں لکھا ہے کہ ابن حبان اور بیہقی نے معمر کی سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ ابن حزم اور نووی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے "العلل" میں اس میں ارسال اور انقطاع کی علت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ علی بن مبارک اور دوسرے حفاظ نے یحییٰ بن ابی کثیر عن ابن ثوبان سے یہ روایت مرسل بیان کی ہے اور اوزاعی نے یحییٰ عن انس کی سند کے ساتھ بیان کی ہے جس میں "بضع عشرۃ" (دس سے کچھ دن اوپر) کے الفاظ ہیں۔ انہی الفاظ کے ساتھ حضرت جابر رضی کی روایت بھی ہے جو بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ نقل کی ہے۔

حافظ زیلعی نے "نصب الرایۃ" (۲-۱۸۶) میں لکھا ہے کہ امام نووی نے "الخلاصۃ" میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام بخاری اور مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح الاسناد ہے۔ اس میں معمر کے منفرد ہونے سے کوئی خرابی واقع نہیں ہوئی کیونکہ وہ ثقہ اور حافظ ہے اور اس نے جو اضافہ کیا ہے وہ قابل قبول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت جابر رضی کی حدیث کی تائید حضرت انس رضی کی روایت سے ہوتی ہے جو طبرانی نے "المعجم الاوسط" میں نقل کی ہے۔ اس کا ذکر حافظ الہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۲-۱۵۸) میں کیا ہے۔ اس روایت میں عمر بن عثمان الکلابی ہے جو متروک ہے۔ اس حدیث کی موید ایک دوسری روایت حضرت ابن عباس رضی کی ہے جو "مصنف عبدالرزاق" میں ہے، مگر اس روایت میں چالیس دن کا ذکر ہے جس کے بارے میں بیہقی (۳-۱۵۲) نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اس میں حسن بن عمارہ منفرد راوی ہے جو حجت نہیں۔

ابو عبید "کتاب الاموال" (ص ۱۴۲) لکھتے ہیں کہ میمون بن مہران کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کا بیس سے تیس دن تک محاصرہ کیا جس کے بعد انھوں نے اس شرط پر امان حاصل کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز چھپائیں گے نہیں۔

ابو عبید کے علاوہ دوسروں نے لکھا ہے کہ کوئی مال نہیں چھپائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یا بنی الحقیق (ابو عبید لکھتے ہیں کہ حضور نے ایسے ہی فرمایا حالانکہ وہ "بنو ابی الحقیق" تھے)۔ اللہ اور اس کے رسول سے تمھیں جو عداوت ہے وہ تمھارے علم میں ہے اس کے باوجود میں نے تمھارے ساتھیوں کو امان دی جس کا بدلہ تم نے مجھے یہ دیا کہ تم نے مجھ سے اپنا مال چھپایا۔ اس عہد شکنی سے تمھارے خون ہمارے لیے حلال ہو گئے ہیں۔ اب بتاؤ تمھارے وہ برتن (جن میں مال تھا) کیا ہوئے؟ یہودیوں نے کہا کہ وہ تو ہم نے اپنی جنگ میں خرچ کر دیے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا اور وہ اس جگہ جمع ہو گئے جہاں برتن تھے اور وہاں انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ابو عبید نے مزید لکھا ہے کہ پھر یہودیوں کی گردنیں ماردی گئیں۔

ابن عقبہ[3] نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انھوں نے امان اس شرط پر حاصل کی تھی کہ بدن کے کپڑوں کے علاوہ ان

---

[1] کتاب الاموال میں مکمل بیان اس طرح ہے کہ قلعہ والوں نے اپنے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے اس شرط پر امان طلب کی کہ قلعہ میں جو کچھ ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا۔ ابو عبید نے لکھا ہے قلعہ میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے حضور کے بارے میں فحش کلامی اور سختی کی تھی۔

[2] حافظ ابن قیم نے "زاد المعاد" (۲-۱۳۶) میں لکھا ہے کہ حضور نے شرط عائد کی کہ وہ کوئی چیز چھپائیں گے نہ غائب کریں گے اور اگر انھوں نے ایسا کیا تو پھر کوئی عہد باقی نہیں رہے گا، لیکن انھوں نے وہ پوری غائب کر دی جس میں حیی بن اخطب کا مال اور زیورات تھے۔ وہ یہ مال اور زیورات اس وقت خیبر میں لایا تھا جب بنو نضیر کو جلا وطن کیا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیی بن اخطب کے چچا سے کہا کہ اس مال کا کیا ہوا جو وہ بنو نضیر کی جلا وطنی کے وقت لایا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ اخراجات اور لڑائیوں نے اسے ختم کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مال تو بہت زیادہ تھا اور ابھی عرصہ تو اتنا نہیں گزرا کہ وہ سارا خرچ ہو جاتا۔ پھر آپ نے اسے حضرت زبیرؓ کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے اس بات پر سختی کی تو اس نے کہا کہ میں نے حیی بن اخطب کو ویرانے میں پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لوگ گئے اور انھوں نے ویرانے میں گھوم پھر کر دیکھا تو وہاں سے پوری مل گئی۔ اس عہد شکنی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو الحقیق کے دو بیٹوں کو قتل کروا دیا۔ ان دو میں سے ایک حضرت صفیہؓ بنت حیی کا پہلا خاوند تھا۔

[3] ابن عقبہ: یہ موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش قرشی ہیں۔ سیرت نبوی کے عالم تھے۔ مغازی پر ان کی ایک کتاب تھی جس کا ذکر حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" (ص ۱۴۶۱، ۱۷۴۷) میں کیا ہے۔ حافظ نے "تہذیب التہذیب" (۱۰-۳۶۰) میں اور ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (۱-۱۴۸) میں ان کے حالات لکھے ہیں۔ ۱۴۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی کتاب

کے پاس کوئی چیز نہ رہے گی اور اگر انھوں نے کوئی چیز چھپائی تو اللہ و رسولؐ کی ضمانت سے وہ نکل جائیں گے۔

ابو عبید نے لکھا ہے کہ ہم سے یزید نے عن ہشام عن الحسن کی سند سے یہ روایت بیان کی کہ حیی بن اخطب نے رسول اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا کہ آپؐ کے مقابلے میں کسی کی مدد نہیں کرے گا اور اس پر اس نے اللہ کو ضامن ٹھہرایا لیکن جب بنو قریظہ کا واقعہ ہوا تو اس کی غداری کے بعد اسے اور اس کے بیٹے کو گرفتار کر کے آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ضمانت پوری کرو۔ پھر آپؐ کے حکم سے اس کی اور اس کے بیٹے کی گردنیں مار دی گئیں۔ ابو عبید نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو ابن ابی الحقیق کو قتل کرنے کے لیے بھیجا اور انھوں نے جا کر اسے قتل کر دیا۔

خطابی نے موسیٰ بن عقبہ سے اور اس نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ ابو الحقیق کے پاس ایک خزانہ[۱] تھا جسے "مسک الجمل" کہتے تھے۔ وہ خزانہ یہودیوں نے چھپایا اور اسے غائب کر دیا۔ اس عہد شکنی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قتل کرایا۔ واقدی[۲] نے لکھا ہے کہ اس خزانے کی مالیت کا اندازہ دس ہزار دینار کا تھا۔

ابن عقبہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خزانے کے بارے میں ابو الحقیق کے بیٹوں کے ثعلبہ نامی ایک غلام سے پوچھا اور ثعلبہ ان کے ہاں یوں رہتا تھا جیسے ان کا مہمان ہو۔ ثعلبہ نے کہا کہ مجھے اس کے بارے میں صحیح علم نہیں لیکن میں کنانہ بن ربیع کو روزانہ صبح اس ویرانے میں چکر لگاتے اور گھومتے پھرتے دیکھتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں اگر کوئی چیز ہوگی تو اسی میں ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ویرانے میں تلاش کے لیے آدمی بھیجے۔ انھیں وہ خزانہ وہاں مل گیا اور وہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے قتل کا حکم دے دیا۔

کتاب الاموال میں[۳] ابو عبید نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن صالح نے لیث بن سعید سے، اس نے عقیل سے اور اس نے ابن شہاب

کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ بس ۱۹ سن میں یورپ میں اس میں سے کچھ منتخب احادیث طبع ہوئیں۔ دیکھیے معجم المطبوعات (ص ۱۸۱۲)

[۱] یہ روایت بیہقی نے "سنن" (۹-۱۳۷) میں اور ابن سعد نے "طبقات" (۲-۱۱۰) میں حضرت ابن عمرؓ سے ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ شرط عائد کی کہ وہ نہ کوئی چیز چھپائیں گے نہ غائب کریں گے اور اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کے لیے نہ کوئی ضمانت ہے اور نہ کوئی عہد۔

[۲] طبقات ابن سعد (۲-۱۰۶) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو الحقیق کا وہ خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا جو "مسک الجمل" میں تھا۔ یہودیوں نے اسے ایک ویرانے میں غائب کر دیا تھا لیکن اللہ نے اپنے رسولؐ کو اس کا سراغ بتا دیا اور آپؐ نے وہ نکلوا لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں ترا نوے یہودی قتل کروائے۔

[۳] مجھے واقدی کی "المغازی" میں اس کا ذکر نہیں ملا۔

[۴] کتاب الاموال (ص ۲۳۵)

سے روایت کی ہے کہ جنگِ احزاب جنگِ اُحد کے دو سال بعد ہوئی۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھدوائی۔ اس وقت کفار کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا۔ انھوں نے دس سے کچھ دن اوپر مسلمانوں کا محاصرہ جاری رکھا جس سے مسلمان پریشان ہوگئے۔ سعید بن المسیب نے مجھے بتایا کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ! میں تجھے تیرا وعدہ یاد دلاتا ہوں۔ یا اللہ! اگر تیری مشیت یہی ہو تو آئندہ تیری عبادت نہیں ہوگی۔" پریشانی اتنی بڑھ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان کے سردار اور ابوسفیان کے ساتھی عیینہ بن حصن کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ احزاب کا ساتھ چھوڑ دے اور بنو غطفان کو لے کر واپس چلا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے مدینہ کی ایک تہائی کھجوریں بطور تاوان دیں گے۔ عیینہ نے کہا کہ نہیں مجھے آدھی کھجوریں دو تو میں واپس جا سکتا ہوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ اور خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کو بلا بھیجا۔ وہ آئے تو آپ نے انھیں بتایا کہ میں نے عیینہ کو مدینہ کی ایک تہائی کھجوروں کی پیشکش اس شرط پر کی کہ وہ احزاب کا ساتھ چھوڑ دے اور بنو غطفان کو لے کر واپس چلا جائے لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوا اور اس کا مطالبہ مدینے کی آدھی کھجوروں کا ہے۔ اب بتاؤ تم دونوں کی کیا رائے ہے؟ ان دونوں نے کہا کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ کو اللہ کی طرف سے کوئی حکم ہوا ہے تو اس پر عمل فرمائیے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم ہوا ہوتا تو میں تم سے اس بارے میں مشورہ طلب نہ کرتا۔ یہ تو میری ذاتی رائے ہے جو میں نے تمھارے سامنے پیش کی ہے۔ اب تم بتاؤ۔ ان دونوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس تو ان کے لیے تلوار کے علاوہ کچھ نہیں۔" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بہت خوب۔"

۱؎ سیرت ابن ہشام (۲-۲۲۳) میں ہے کہ بیس سے کچھ دن اوپر تقریباً ایک مہینہ یہ محاصرہ رہا اور اس دوران میں تیراندازی اور محاصرے کے علاوہ کوئی لڑائی نہ ہوئی۔

۲؎ اس کا نام حذیفہ تھا۔ اسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "وہ احمق سردار ہے۔ دس ہزار آدمی ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ پہلے مسلمان ہوا پھر مرتد ہو کر طلیحہ کے جھوٹے دعوائے نبوت پر ایمان لے آیا۔ وہ گرفتار ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا تو آپؓ نے اس پر احسان کیا اور آزاد کر دیا۔ پھر وہ اپنی موت تک اسلام پر قائم رہا۔ دیکھیے "الروض الانف" (۶-۳۰۷)

۳؎ سیرت ابن ہشام (۲-۲۲۳) میں ہے کہ حارث بن عوف بن ابی حارثہ المری کے پاس بھی پیغام بھیجا اور یہ دونوں (حارث اور عیینہ) بنو غطفان کے قائد تھے۔

۴؎ اس موقع پر حضرت سعد بن معاذ نے اپنی عظیم الشان گفتگو تاریخ کے صفحات میں ریکارڈ کرائی۔ ابن ہشام اور دوسرے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ہم اور یہ شرک کی مصیبت میں مبتلا تھے۔ ہم سبھی بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ہم اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے نہ ہی ہمیں اس کی معرفت حاصل تھی۔ اس وقت بھی یہ لوگ خواہش اور کوشش کے باوجود مدینہ کی کھجوریں دو صورتوں کے علاوہ کسی تیسری صورت میں نہیں کھا سکتے تھے۔ یا تو یہ خرید کر کھاتے یا کسی کے ہاں مہمان کی حیثیت میں ان سے

مشرکین کے ساتھ عارضی صلح کرنے کے بارے میں علماء کی تین مختلف آراء ہیں۔ ایک گروہ کی رائے ہے کہ اس طرح کی صلح جائز ہے۔ ان کی دلیل یہ ارشادِ ربانی ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال-۶۱) اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی ان کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔

جہاں تک سورۂ محمد کی اس آیت کا تعلق ہے۔ "فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (محمد-۳۵) تم نہ کمزوری دکھاؤ اور نہ صلح کی دعوت دو اور غالب تم ہی رہو گے) تو ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جب تو ی ہوں تو وہ اہلِ باطل کو صلح کی دعوت نہ دیں جبکہ سورۂ انفال کی اوپر والی آیت کا مطلب یہ ہے کہ کفار اگر صلح کی دعوت دیں تو اسے اپنی شرائط کے مطابق قبول کر لو۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے۔

محفوظ ہوتے، تو اب جب اللہ نے ہمیں راہِ راست کی ہدایت عطا فرمائی، اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور آپ کی ذاتِ اقدس کے ذریعے ہمیں عزت بخشی ہے تو کیا اب انھیں اپنے مال یا ان کے طور پر دیں گے۔ اللہ کی قسم ہمیں اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس ان کے لیے تلوار کے سوا کچھ نہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فَاَنْتَ وَذٰلِكَ" (تمہاری مرضی) حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ابتلا کی یہ حالت دیکھی تو آپ کے دل میں رقت پیدا ہو گئی اور آپ نے چاہا کہ اس طرح ان کا بوجھ ہلکا ہو جائے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میں نے دیکھا کہ عرب متحد ہو کر تم پر ٹوٹ پڑے ہیں تو میں نے سوچا کہ کسی حد تک ان کی قوت کو اس طرح توڑ دیا جائے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ نے وہ تحریر لے کر مٹا دی اور کہا: وہ اپنا زور لگا لیں۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ تحریر لکھی تو گئی تھی لیکن اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے نہ ہی معاہدہ طے پایا تھا۔

لہ یہاں متن میں عربی کا لفظ "مھادنۃ" استعمال ہوا ہے جس کا لغوی معنی ہے صلح۔ شرعاً اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی معاوضہ لے یا دے کر یا کسی معاوضے کے بغیر ایک خاص مدت کے لیے جنگ بندی یا عارضی صلح کر لینا۔ اسے "موادعۃ"، "ھدنۃ" "مسالمۃ" یا "معاھدۃ" بھی کہتے ہیں۔ دیکھیے "حاشیۃ البجیری" (۴-۲۱۸)

یہ "ھدنۃ" یا "مھادنۃ" ایک کمزور قسم کا معاہدہ ہوتا ہے جو کسی ایک فریق کے توڑنے سے ٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ صلح حدیبیہ کے ساتھ ہوا کہ قریش کے حلیف قبیلہ بنو بکر نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ خزاعہ پر حملہ کیا اور بعض قریش نے بھی ان کی مدد کی جبکہ باقیوں نے خاموشی اختیار کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عہد شکنی تصور فرماتے ہوئے مکہ معظمہ پر چڑھائی کر دی۔

صلح کی دو قسمیں ہیں ایک عارضی جسے عربی میں "موادعۃ"، "معاھدۃ"، "مسالمۃ" اور "مھادنۃ" کہتے ہیں اور دوسری مستقل صلح جس میں برسرِ پیکار کفار جزیہ دینے اور اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ دیکھیے "آثار الحروب فی الفقہ الاسلامی" (ص-۲۰۰)

دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ کسی حال میں بھی صلح جائز نہیں بلکہ مشرکین سے اس وقت تک جنگ جاری رہے گی جب تک وہ ہتھیار ڈال لیں اور جزیہ دینے کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ سورۂ انفال کی آیت کے حکم کو سورۂ محمدؐ کی آیت نے منسوخ[1] کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہی رائے نقل کی گئی ہے۔

تیسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کمزور ہونے کی وجہ سے جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں، تو وہ کچھ مال دے کر صلح[2] کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہ اور عبدالملک بن مروان نے اس پر عمل کیا۔ امام اوزاعی نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔

---

[1] حضرات ابن عباسؓ، مجاہد، زید بن اسلم، عطاء خراسانی، عکرمہ، حسن بصری اور قتادہ کی یہی رائے ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مشرکین عرب سے اسلام کے علاوہ کوئی اور چیز قبول نہیں کی جا سکتی۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ رائے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ سورۂ توبہ میں مشرکین سے لڑنے کا حکم اس صورت میں ہے جب ایسا کرنا ممکن ہو لیکن جب دشمن قوی ہو اور اس سے لڑنا مشکل ہو تب ان سے عارضی طور پر صلح کی جا سکتی ہے۔ اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر اس پر عمل بھی فرمایا۔ پس یہ آیت نہ منسوخ ہوتی ہے نہ اس کی تخصیص کی کوئی وجہ ہے اور نہ ہی ان دونوں آیات میں کچھ تضاد ہے۔

علامہ رشید رضا نے اپنی تفسیر "المنار" (۱۰ - ۷) میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اس کے جواب میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مشرکین نے کبھی صلح پر آمادگی کا اظہار کیا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول نہ فرمایا ہو بلکہ اس کے برعکس حدیبیہ کے مقام پر مشرکین نے صلح کی خواہش ظاہر کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کیا۔ اس کے بعد مشرکین مسلسل لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا دینی اور دنیوی مرکز مکہ معظمہ اور اس کے بعد ان کا اہم شہر طائف فتح ہو گئے۔ ان کی ہوا بالکل اکھڑ گئی۔ ان کی ہیبت اور قوت ختم ہو گئی اور پورا جزیرۃ العرب فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگا۔

شوکانی نے اس کی اور تعبیر کی ہے اور وہ یہ کہ بعض کی رائے میں یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے جزیہ قبول کرنا، چنانچہ صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والوں نے جزیہ قبول کیا۔ دیکھیے شوکانی کی تفسیر "فتح القدیر" (۲-۳۲۲)

[2] دعوت کے ابتدائی دور میں جب مسلمان کمزور تھے اس وقت ان کی یہ پوزیشن تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر سہیل بن عمرو سے صلح کی جس کی ایک شرط یہ تھی کہ دس سال تک ان کی آپس میں جنگ نہیں ہو گی۔ حضورؐ نے یہ اس لیے کیا کہ مسلمان طاقتور ہو جائیں اور جنگ کے لیے ضروری تیاری کر سکیں۔

اس کے بعد دورِ انحطاط و زوال میں پھر مسلمانوں کا یہی حال ہو گیا، چنانچہ انھوں نے رومیوں اور دوسروں سے جنگ بندی کا معاہدہ کیا اور مسلمان حکومت کے دفاع کے بدلے کچھ رقم دینے کا عہد کیا۔ امام اوزاعی سے سوال کیا گیا کہ اگر دشمن مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائے اور مسلمان اپنے دفاع کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو کیا ان کے لیے جائز ہے کہ وہ ہتھیار اور مال دے کر دشمن کو وہاں سے جانے پر آمادہ کر لیں، امام اوزاعی نے فرمایا اگر مسلمانوں کے پاس طاقت نہ ہو تو وہ مجبوراً ایسا

صلح کو جائز قرار دینے کے حق میں امام مالکؒ کے پاس یہ دلیل بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن اُمیّہ کے پاس وہبؓ بن عمیر کو اپنی چادر دے کر بھیجا اور فرمایا کہ صفوان کے لیے دو ماہ کی امان ہے۔ پھر حضورؐ نے صفوان سے کہا کہ ابو وہب اتر آؤ۔ اس نے کہا میں اس وقت تک نہیں اتروں گا جب تک آپ اپنی بات کی وضاحت نہ فرمادیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دو نہیں بلکہ چار ماہ تک تجھے آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت ہے۔[۱]

امام اوزاعی نے ذکر کیا ہے کہ عبدالملک بن مروان شہنشاہِ روم کو روزانہ ایک ہزار دینار اور روم و شام کے نبطیوں کو لبنان کے پہاڑ کا ہر جمعہ کو ایک ہزار دینار دیا کرتے تھے۔ یہ روایت امام اوزاعی سے ولید بن مسلم نے نقل

کر سکتے ہیں۔

امام اوزاعی سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ اگر مسلمانوں میں فتنہ برپا ہو جائے اور مسلمان حکومت کو خطرہ ہو کہ دشمن حملہ آور ہو جائے گا اور اس کے دفاع کی اس کے پاس طاقت نہیں تو کیا ایسے حالات میں جائز ہے کہ دشمن کے ساتھ اس بات پر صلح ہو جائے کہ مسلمان حکومت اسے ہر سال ایک خاص رقم دیا کرے گی؟ امام اوزاعی نے کہا کہ ایسے حالات میں میرے نزدیک یہ جائز ہے۔ دیکھیے "اختلاف الفقہا" (ص ۱۷، ۱۸)

[۱] یہ روایت موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق نے اپنی اپنی کتب سیرت میں، امام مالکؒ نے "موطا" میں اور حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابۃ" (۲-۱۸۱) میں بیان فرمائی ہے۔

مسلمانوں اور کفار کے درمیان صلح اور معاہدے کرنے کی بہت سی مثالیں سیرتِ نبوی میں ملتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جہینہ، بنی ضمرہ، غفار اور دوسرے ان قبائل کے ساتھ عدم جنگ کے معاہدے کیے جو مدینہ منورہ اور ساحل سمندر کے درمیانی علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ آپؐ نے حدیبیہ کے مقام پر کفار سے صلح کی۔ اس سے پہلے آپؐ نے یہود سے معاہدہ کیا جو میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کی رو سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ان کے دین پر قائم رہنے کی اجازت دی۔ اور جب تک انھوں نے عہد شکنی نہیں کی ان کے معاملات میں آپؐ نے کوئی مداخلت نہیں کی البتہ ان کی عہد شکنی کے بعد حضورؐ نے ان سے جنگ کی۔ ان کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کیے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام تو امن و سلامتی اور استحکام کا دین ہے اور جب بھی ان کے لیے کوئی گنجائش پیدا ہوئی اہلِ اسلام نے ان کا خیر مقدم کیا اور مکر و فریب اور چالبازیوں کے جال ہمیشہ دشمن نے پھیلائے۔

[۲] بلاذری نے "فتوح البلدان" (ص ۱۶۴) میں اہلِ انطاکیہ کے کچھ شیوخ سے نقل کیا ہے کہ جب مروان بن حکم کا انتقال ہو گیا اور عبدالملک بن مروان اس کی جگہ خلیفہ بنا تو اس نے مصعبؓ بن زبیر سے لڑنے کے لیے اپنی فوج عراق کی طرف روانہ کی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رومی فوج ایک کمانڈر کی قیادت میں نکلی اور لبنان تک پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ نبطیوں اور جراجمہ کی جماعتیں بھی مل گئیں۔ مسلمانوں کے بھاگے ہوئے کچھ غلاموں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ان حالات میں عبدالملک ان کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور یہ صلح اس شرط پر ہوئی کہ عبدالملک شہنشاہِ روم کو خراج ادا کیا کرے گا۔

کی ہے ۔ اس میں ہے کہ امیر معاویہ نے جنگِ صفین کے موقع پر اور عبدالملک بن مروان نے حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ جنگ کے زمانے میں ایسا کیا۔

فتحِ مکہ کے موقع پر حضرت خالدؓ کے ساتھیوں میں سے دو آدمی کرزؓ بن جابر الفہری اور خالدؓ بن حبیس الخزاعی شہید ہوئے۔ ابن حبیب نے لکھا ہے کہ اس موقع پر مشرکین کے تیئیس آدمی قتل ہوئے جبکہ ابن ہشام کی روایت کے مطابق ان کی تعداد بارہ یا تیرہ تھی۔

مسعودی کی "مروج الذہب" (۵-۴-۲۲۴) بھی دیکھیے۔

۱؎ دیکھیے "فتوح البلدان" (ص ۱۶۴) امیر معاویہ نے بازنطینی فرمانروا قسطنطین ثانی سے عارضی صلح کی تھی۔ یہ صلح حضرت علیؓ کے ساتھ ۳۹ھ میں جنگ سے پہلے ہوئی۔ اسی طرح انھوں نے اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں ۴۲ھ میں رومیوں کے ساتھ صلح کی جو پہلی صلح ہی کی توسیع سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے جراجمہ کے ساتھ بھی صلح کی۔ ابن الفراء کی "رسل الملوک" (ص ۱۵۲) بھی دیکھیے۔

۲؎ آپ خالدؓ بن ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم القرشی ہیں۔ آپ کے قبولِ اسلام کے زمانے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور غزوہ خیبر سے پہلے مسلمان ہوئے۔ بعض دوسروں کی رائے یہ ہے کہ غزوہ بنو قریظہ کے بعد ۵ھ میں آپ مسلمان ہوئے۔ غزوہ موتہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "سیف اللہ" کا خطاب دیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ غزوۂ موتہ ۸ھ سے پہلے اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آچکے تھے۔

۳؎ کرزؓ بن جابر بنو فہر میں سے تھے۔ انھی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عُکلیوں کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے کی آنکھوں میں کانٹے چبھوئے پھر اسے قتل کر دیا اور اونٹنیاں چھین کر لے گئے۔ کرزؓ ان کو قید کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیں پھروا دیں۔ ان کے واقعہ کا ذکر محاربین کے سلسلے میں گزر چکا ہے۔

۴؎ سیرۃ ابن ہشام میں ان کا نام خنیس بن خالد ہے۔ بنو منقذ کے حلیف تھے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ بنو خزاعہ میں سے تھے۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق یہ دونوں خالدؓ بن ولید کے دستے میں شامل تھے، لیکن وہ اس سے الگ ہو کر ایک دوسرے راستے پر چلے گئے اور شہید ہو گئے۔ حضرت خالد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق مکہ معظمہ کے نشیبی حصے کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔

"السیرۃ" میں ہے کہ ان کا نام خنیس بن خالد بن ربیعہ بن اصرم تھا۔ بنو منقذ کے حلیف تھے اور کنیت ابو صخر تھی۔

۵؎ ابن سید الناس نے "عیون الاثر" (۲-۳-۱۷۳) میں لکھا ہے کہ ابن سعد کی روایت کے مطابق قریش میں سے چوبیس اور ہذیل میں سے چار آدمی قتل ہوئے۔

مالِ غنیمت میں سے عورت اور غائب کے حصّوں نیز ایک شخص کے دو حصّوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

صحیح بخاری[1] اور دوسری کتب حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کے دو اور آدمی کا ایک حصّہ مقرر فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی ثابت ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ تمام علماء[2] کا اس پر اجماع ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ سوار کو دو حصے ملیں گے۔ ایک اس کا اپنا اور دوسرا اس کے گھوڑے کا۔ وہ حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے موقع پر دو سو گھوڑوں

---

[1] صحیح بخاری کتاب "الجهاد" باب "سهام الفرس" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۸۶۳) میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کے لیے دو اور اس کے سوار کے لیے ایک حصّہ مقرر فرمایا۔ صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "غزوة خیبر" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۲۲۸) میں حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کے بعد امام بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت نافع مولیٰ ابن عمرؓ نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ ایک آدمی کے پاس گھوڑا ہو تو اس کو تین حصے ملیں گے اور اگر وہ بغیر گھوڑے کے ہو تو اسے ایک حصہ ملے گا۔ یہ روایت ابن عمرؓ سے صحیح مسلم (۳-۱۳۸۳) کتاب "الجهاد والسیر" باب "قسمة الغنیمة بین الحاضرین" میں، سنن ابوداؤد (۳-۷۵) کتاب "الجهاد" باب "فی سهمان الخیل" میں اور جامع ترمذی (۴-۱۲۴) کتاب "السیر" باب "فی سهم الخیل" میں بیان ہوئی ہے۔ امام مالکؒ "مؤطا" (۱-۲۰۲) کتاب "الجهاد" باب "القسم للخیل فی الغزو" میں فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز فرماتے تھے کہ گھوڑے کے دو حصے ہیں اور آدمی کا ایک۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ میں یہ بات مسلسل سنتا رہا۔

[2] امام طبری نے "اختلاف الفقهاء" (ص ۸۰) میں امام اوزاعی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کے لیے دو اور اس کے مالک کے لیے ایک حصہ مقرر فرمایا اور حضورؐ کے بعد مسلمان آج تک اس پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں اور اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام اوزاعی کے زمانے میں اس بارے میں اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔

[3] یہ سنن ابوداؤد (۳-۷۶) کتاب "الجهاد" باب "فیمن اسهم له سهماً" کی ایک ایسی حدیث میں اس طرح روایت کی گئی ہے کہ خیبر کا مالِ غنیمت ان لوگوں میں تقسیم کیا گیا جو صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اٹھارہ سو حصوں میں تقسیم فرمایا۔ فوج کی کل تعداد پندرہ سو تھی۔ ان میں تین سو گھوڑے تھے۔ آپؐ نے سوار کو دو اور پیدل کو ایک حصہ عطا فرمایا۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ ابومعاویہ یعنی ابن عمر کی حدیث زیادہ صحیح ہے اور عمل بھی اسی پر ہے اور میرا خیال ہے کہ مجمع کی روایت میں وہم ہے۔

کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا۔ تو آپ نے ہر سوار کو دو اور ہر پیادے کو ایک حصہ عطا کیا۔

امام ابوحنیفہ نے ابن مبارکؒ کی روایت سے بھی استدلال کیا ہے۔ ابن مبارک کی روایت میں عبیداللہ بن عمرؓ، نافع سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار کے لیے دو اور پیادے کے لیے ایک حصہ مقرر فرمایا۔

انھوں نے تین سو گھوڑے کہا ہے جبکہ گھوڑے دو سو تھے۔

حافظ ابن حجر "فتح الباری" (۶ - ۶۸) میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ضعف ہے، البتہ انھوں نے وہ ضعف بیان نہیں کیا جبکہ امام شافعی نے وہ بیان فرمایا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی مجمع بن یعقوب نے اپنے والد سے، اس نے عمر بن عبدالرحمٰن بن زید سے اور اس نے اپنے چچا مجمع بن حارثہ سے یہ روایت بیان کی ہے اور مجمع بن یعقوب غیر معروف راوی ہے، اس لیے ہم اس سلسلے میں ابن عمرؓ کی روایت پر عمل کرتے ہیں۔ ابن عمرؓ کی روایت سے کوئی دوسری ایسی روایت معارض نہیں جو صحت میں اس کے برابر ہو جبکہ کسی صحیح حدیث کو اس جیسی صحیح حدیث ہی کی بنیاد پر رد کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے "عون المعبود" (۳ - ۴۰۹)

ابن القطان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں علت یہ ہے کہ یعقوب بن مجمع مجہول راوی ہے۔ دیکھیے "نصب الرایۃ" (۳ - ۴۱۷)

ابوحنیفہ گھوڑے کو آدمی پر ترجیح نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان سے روایت ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں ایک چوپائے کو مسلمان پر فضیلت دوں، لیکن یہ قیاس اس وجہ سے قابلِ قبول نہیں کہ حقیقت میں تو سارے حصے آدمی ہی کے ہیں، البتہ سوار کو پیدل پر ترجیح اس لیے دی گئی ہے کہ اسے اپنے گھوڑے کے اخراجات برداشت کرنے ہوتے ہیں اور اس کی خدمت کرنا ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کی رائے تفصیل سے پڑھنے کے لیے دیکھیے "کتاب الخراج" (ص ۱۸) اس سلسلے میں امام ابو یوسف اور امام محمد ان سے اختلاف کرتے ہیں۔

؎۱ ابن مبارک کی یہ روایت دارقطنی نے سنن (۴ - ۱۰۶) میں اپنے شیخ ابوبکر نیشاپوری سے بیان کی ہے۔ اس کی سند یہ ہے: ابوبکر عن احمد بن منصور عن نعیم بن حماد عن عبداللہ بن المبارک .... اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد دارقطنی لکھتے ہیں: احمد بن منصور کہتے ہیں کہ نعیم نے عبداللہ بن مبارک سے انہی لفظوں میں یہ روایت بیان کی ہے لیکن لوگ اس روایت کی صحت کے بارے میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔

نیشاپوری لکھتے ہیں کہ غالباً نعیم کو وہم ہوا ہو گا کیونکہ عبداللہ بن مبارک تو ثقہ ترین لوگوں میں سے ہیں۔ ابوبکر بن ابی شیبہ نے نعیم بن حماد کی تائید کی ہے لیکن نیشاپوری نے اس پر وہم کا طعن کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل اور عبدالرحمان بن بشر نے ابن عمر سے اس کے برعکس روایت بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۶ - ۶۸) میں لکھتے ہیں کہ نہ نعیم کو وہم ہوا نہ ان دونوں روایات میں کوئی تعارض ہے کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار کے لیے اس کی سواری کے دو حصے مقرر فرمائے اور اس کا اپنا ذاتی حصہ اس کے علاوہ ہے۔

؎۲ نسخہ حلب اور حلبی میں ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے نافع سے روایت بیان کی، لیکن یہ غلط ہے کیونکہ عبداللہ بن مبارک نافع

حقیقت میں ان روایات سے کوئی مضبوط دلیل فراہم نہیں ہوتی کیونکہ خیبر کی تقسیم کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت اس کے خلاف ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ کے اکثر شاگردوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی روایت سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام غزوات میں گھوڑے کے دو اور سوار کا ایک حصہ مقرر فرمایا۔

خیبر کا مال غنیمت خاص طور پر ان چودہ سو صحابہ کے لیے تھا جو صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے اور حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے علاوہ وہ سب حضرات غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ کا بھی باقاعدہ حصہ رکھا۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ غزوہ بنی قریظہ میں گھوڑوں کی تعداد چھتیس تھی۔ "المدونۃ" میں بھی اسی طرح ہے۔

سے براہ راست روایت نہیں کرتے۔ وہ ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں انتقال ہوا۔ اپنے زمانے میں فقہ اور غزوات کے علم اور زہد و ورع میں سب سے ممتاز تھے۔ حافظ حدیث اور راویوں کے نقاد تھے۔

۱ اس کی تفصیل حافظ زیلعی نے "نصب الرایۃ" (۳-۴۱۴) میں اس طرح بیان کی ہے کہ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار کے تین اور پیدل کے لیے ایک حصہ مقرر فرمایا۔ ابن عباسؓ ہی سے ایک دوسری روایت ہے کہ حضورؐ نے سوار کے تین حصے مقرر فرمائے۔ دو گھوڑے کے اور ایک اس کا اپنا۔

اس حدیث کی تائید میں متعدد روایات ہیں جن کا ذکر زیلعی نے "نصب الرایۃ" میں کیا ہے۔

۲ نسخہ حلب اور حلبی میں عبداللہ بن عمرؓ لکھا ہے جو غلط ہے۔

۳ حضرت عبداللہ بن مبارک کی اس روایت کی جو تاویل حافظ ابن حجر نے کی ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک تو ثقہ ترین راویوں میں سے ہیں اور وہم کا شکار نعیم بن حماد ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں "نصب الرایۃ" (۳-۴۱۸) بھی دیکھیے۔

۴ خیبر مدینہ منورہ سے شمال کی طرف تین دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اس میں بہت سے قلعے اور باغات تھے۔ یہاں وہ یہودی رہتے تھے جو دعوت اسلامی کے نہایت ہی خطرناک دشمن تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان فوج نے اس پر چڑھائی کی اور ۷ھ میں اسے فتح کر لیا۔

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ فتح صلح کے نتیجے میں ہوئی یا وہ قوت کے ذریعے حاصل کی گئی۔ صحیح بات وہی ہے جو حافظ ابن قیم نے لکھی ہے کہ پورا خیبر بزور شمشیر فتح ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا مال غنیمت حملہ آور فوج اور حدیبیہ کے شرکاء میں اس لیے تقسیم کیا کہ یہی شرکاء حدیبیہ تھے جو خیبر کو فتح کرنے کے لیے گئے اور ان میں سے حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے علاوہ سب اس جنگ میں شریک ہوئے۔ جو علاقہ بزور شمشیر فتح ہو اس کے بارے میں فیصلہ یہی ہے کہ وہ فاتح فوج میں تقسیم کر دیا جائے۔ دیکھیے "نیل الاوطار" (۸-۱۲)

۵ "السیرۃ" (۲-۲۴۴) ۶ مجھے یہ روایت ان ماخذ میں نہیں ملی۔

یہ پہلا مالِ فَیْ تھا جس میں دو حصے رکھے گئے اور اس میں سے خمس نکالا گیا۔ اس کے بعد یہ سنت بن گئی اسمٰعیل القاضی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔

لہ فَیْ جمہور کے نزدیک کفار کے اس مال کو کہتے ہیں جو باقاعدہ حملہ کیے بغیر محض مسلمانوں کے خوف اور رعب کی بنا پر ان کے ہاتھ لگ جائے۔ ان کی دلیل سورۂ حشر کی یہ آیت ہے۔ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ (الحشر۔ ۶) اور جو اموال اللہ تعالیٰ نے ان (یہود بنی نضیر) سے لے کر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دیئے ہیں۔ پس یہ اموال تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر (جنگ کے ذریعہ) حاصل نہیں کیے ہیں۔

یہ مال اہلِ حل وعقد مسلمانوں کے اجتماعی مصالح پر خرچ کرنے کے مجاز ہوں گے۔ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا، لیکن شوافع کی رائے اس کے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۂ انفال کی آیت "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (الانفال۔ ۴۱) سورۂ حشر کی آیات کو خاص کرتی ہے جبکہ جمہور اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ سورۂ حشر کی آیات سورۂ انفال کی اس آیت کو خاص کرتی ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ انفال غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی جس میں عام مالِ غنیمت کی تقسیم کا اصول بیان کیا گیا۔ سورۂ حشر اس کے بعد بنو نضیر کی جلا وطنی کے بعد نازل ہوئی جس میں مالِ فَیْ کی تقسیم کا طریقہ بتایا گیا کہ یہ عام مسلمانوں میں تقسیم ہوگا جس میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اس لحاظ سے یہ آیات سورۂ انفال کی آیت کو خاص کرتی ہیں

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس معاملے میں حکومت کو اختیار ہے وہ چاہے تو مالِ فَیْ میں سے خمس نکالے اور چاہے تو نہ نکالے۔ الجصاص نے اس کی ایک اور توجیہ کی ہے اور وہ یہ کہ سورۂ انفال کی آیت زمینوں کے علاوہ باقی مالِ غنیمت کے بارے میں ہے۔ اور زمینوں کے بارے میں اربابِ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہیں تو ان میں سے خمس نکالیں اور چاہیں تو نہ نکالیں۔ اس کے مقابلے میں سورۂ حشر کی آیات میں زمینوں کا معاملہ اللہ ورسول کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو مالکوں کے پاس بھی چھوڑی جا سکتی ہیں۔ اور رسولؐ کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ اس کے سپرد ہے کہ وہ جسے چاہے دے۔ حضرت عمرؓ نے سورۂ حشر کی آیات سے استدلال کیا کہ اگر میں یہ زمینیں فوج میں تقسیم کر دوں تو ایک تو مال کی گردش مالدار لوگوں ہی میں ہوتی رہے گی اور مفلس اس سے محروم رہیں گے۔ اور دوسرے جو بعد میں آنے والے ہیں انھیں اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ دیکھیے "احکام القرآن (۳۔ ۴۳۰) اور بدایۃ المجتہد" (۱۔ ۳۹۴)۔

بعض لوگوں کی رائے میں فَیْ اور غنیمت کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ان کے نزدیک دونوں میں سے خمس نکالنے یا نہ نکالنے کا اختیار حکومت کو ہوگا۔ مصنّف کا رجحان بھی اسی رائے کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی کا مسلک بھی یہی ہے۔ ابن المنذر کہتے ہیں کہ میرے علم میں نہیں کہ امام شافعی سے پہلے کسی نے یہ رائے قائم کی ہو۔ دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم۔

امام شافعی کی یہ رائے حضرت عمرؓ کی اس روایت کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بنو نضیر کے مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فَیْ تھے۔ وہ حضورؐ کے لیے مخصوص تھے۔ آپؐ ان میں سے اپنے اہل وعیال کے لیے سال کا نان ونفقہ بھی لیتے اور ان کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سامانِ حرب وغیرہ کی تیاری میں بھی مدد دیتے۔ امام مسلم نے صحیح مسلم (۳۔ ۱۳۷۶) کتاب الجہاد" باب

اسماعیل القاضی کہتے ہیں کہ میرے خیال میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ خمس کا حکم اس کے بعد نازل ہوا ہے۔ حدیث میں اس کے متعلق کوئی واضح ہدایت موجود نہیں۔ خمس کا یقینی ذکر غزوۂ حنین[1] کے مالِ غنیمت کے سلسلے میں ہوا ہے اور یہ آخری غنیمت تھی جس کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی۔

واقدی نے کتاب المفصل میں کہا ہے کہ سب سے پہلا خمس غزوۂ بنو قینقاع کے موقع پر نکالا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے ایک ماہ تین دن بعد ان کا محاصرہ پندرہ[2] دن تک کیے رکھا جس کے نتیجے میں انھوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ حضور ان کے بارے میں جو فیصلہ فرمائیں گے وہ انھیں قبول ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ ان کا مال مسلمانوں کو ملے گا اور ان کی عورتیں اور ان کے بچے ان کے پاس رہیں گے۔ حضور نے ان کے ہتھیاروں

"حکم الفیئ" میں یہ روایت نقل کی ہے۔

[1] غزوۂ حنین فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں ہوا۔ جب بنو ہوازن نے فتح مکہ کی خبر سنی تو مالک بن عوف النضری نے بنو ہوازن اور بنو ثقیف کو جمع کیا۔ جب اس کی اطلاع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے عبداللہ بن حدرد اسلمی کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں میں گھل مل کر رہیں اور صحیح خبر لائیں۔ وہ جا کر ان میں رہے اور صحیح معلومات لے کر آئے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے کے لیے اتفاق کر لیا ہے۔ اس خبر کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکلے۔ آپؐ کے ساتھ دس ہزار صحابہ وہ تھے جو مدینہ منورہ سے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار نئے افراد مکہ معظمہ سے شامل ہو گئے۔ اس طرح کل تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بنو ہوازن کو آخر کار شکست سے دوچار کر دیا۔ اس کا ذکر سورۂ توبہ میں اس طرح آرہا ہے: "وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ ...." (سورۂ توبہ: ۲۵) اور حنین کے دن جب تمھیں تمھاری کثرت نے گھمنڈ میں مبتلا کر دیا۔

[2] بنو قینقاع ایک یہودی قبیلہ تھا۔ سب سے پہلے اسی قبیلے نے عہد شکنی کی۔ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان لڑائی کا سبب ابن ہشام نے ابوعون سے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک عرب عورت اپنا زیور لائی جسے اس نے بنو قینقاع کے بازار میں فروخت کیا۔ وہ ایک سنار کی دکان میں بیٹھی تھی کہ یہودیوں نے اس کا چہرہ ننگا کرنا چاہا۔ اس خاتون نے اس بات سے انکار کر دیا تو سنار نے خاموشی سے اس کے کپڑے کا ایک حصہ پکڑ کر اس کی پیٹھ کی طرف والے کپڑے سے باندھ دیا۔ جب وہ اٹھی تو اس کا قابلِ ستر حصہ ننگا ہو گیا۔ اس پر یہودیوں نے قہقہہ لگایا۔ اس عورت نے چیخ ماری اور شور مچایا جسے سن کر ایک مسلمان وہاں پہنچا اور جھپٹ کر اس نے سنار کو قتل کر دیا۔ سنار یہودی تھا اس لیے یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ تب دونوں طرف جذبات بھڑک اٹھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ دن تک ان کے محلے کا محاصرہ کیے رکھا۔ دیکھیے سیرت ابن ہشام (۲-۴۷)۔ واقدی نے المغازی (ص ۱۳۹) میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع کا محاصرہ کیا۔ سب سے پہلے ان ہی سے جنگ ہوئی اور ان ہی کو سب سے پہلے جلاوطن کیا۔

[3] واقدی کی "المغازی" (ص ۱۳۹)، سیرۃ ابن ہشام (۲ - ۴۹)۔ ابن کثیر کی "البدایۃ والنہایۃ" (۴-۴) میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

میں سے تین کمانیں دو زرہیں اور پانچ تلواریں لیں اور ان کے مال میں سے خمس نکالا۔

بزار[2] نے مسند میں لکھا ہے کہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ ستتر مہاجرین اور دو سو چھتیس انصار۔ مہاجرین کے علمبردار حضرت علیؓ اور انصار کے سعدؓ بن عبادہ تھے۔ مجاہدین بدر میں بیس آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے ساتھ تین گھوڑے تھے۔ ایک حضرت زبیرؓ کے پاس، دوسرا حضرت مقدادؓ کی تحویل میں اور تیسرا مرثدؓ بن ابی مرثد کے پاس۔ علاوہ ازیں ستر اونٹ تھے جن پر باری باری سوار ہوتے تھے[3]۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ اور مرثد تینوں باری باری ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ حمزہؓ، زید بن حارثہؓ، ابوکبشہ اور انسہ چاروں باری باری ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ ابوکبشہ اور انسہ حضور کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر، عمر اور عبدالرحمن رضی اللہ عنہم باری باری ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے[4]۔

---

[1] واقدی نے تین نیزوں کا اضافہ کیا ہے۔

[2] بزار نے ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے۔ البتہ مسند بزار میں مہاجرین کی تعداد چھہتر لکھی ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۶-۹۳)، ہیثمی نے لکھا ہے کہ یہ روایت بزار اور احمد نے بیان کی ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "عدة اصحاب بدر" میں حضرت براء کی روایت بیان کی ہے کہ مہاجرین ساٹھ سے کچھ اوپر اور انصار دو سو چالیس سے کچھ اوپر تھے۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۳۹۵۶ ہے۔ حافظ ابن حجر نے ان روایات میں تطبیق اس طرح پیدا کی ہے کہ ایک روایت میں براء ابن عمر اور انس کی طرح کے کم سن صحابہ کو شمار کر کے کل تعداد تین سو انیس بیان کی گئی ہے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے فتح الباری (۷-۲۹۱)

[3] دیکھیے سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱۳۔

[4] یہاں یہ ابہام پیدا ہوتا ہے کہ جب مرثد ابن مرثد کے پاس اپنا گھوڑا تھا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹ پر کس طرح سوار ہوتے تھے۔ یہ ابہام دراصل اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ غزوۂ بدر کے حالات کے سلسلے میں سیرت ابن ہشام میں مرثد کا ذکر دو جگہ پر آتا ہے۔ جلد اول ص ۶۱۳ میں بعنوان عدد اہل المسلمین" مذکور ہے کہ آپ نبی کریم کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے۔ اور اسی جلد میں ص ۲۲۶ پر "اسماء خیل المسلمین یوم بدر" کے عنوان سے مذکور ہے کہ ان کے پاس اپنا گھوڑا تھا۔ ان دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہی دکھائی دیتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا گھوڑا کسی دوسرے صحابی کو دے دیا ہو اور وہ خود حضور کے ساتھ اونٹ پر سوار ہوئے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (مترجم)

[5] **بعض صحابہ کے حالات** | ۱۔ سعدؓ بن عبادہ بن دلیم بن حارثہ بن ابی خزیمہ۔ ان کی کنیت ابوثابت ہے۔ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ نقیب بنی ساعدہ میں خزرج کے نقیب تھے۔ دیار شام کی طرف چلے گئے۔ ۱۵ھ یا بعض کے نزدیک اس سے پہلے شام ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

۲۔ زبیرؓ بن العوام بن خویلد بن سعد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب القرشی الاسدی۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ والدہ کا نام صفیہ بنت عبدالمطلب ہے۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ یہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ ان کو ابن جرموز نے وادی السباع میں اس وقت قتل کیا جب آپ جنگ جمل سے لوٹ رہے تھے۔ یہ جمعرات ۱۰ رجمادی الاولیٰ ۳۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت آپ کی عمر سرسٹھ سال تھی۔

۳۔ مقدادؓ بن عمرو بن ثعلبہ بن مالک بن ربیع بن ثمامہ البہرادی۔ یہ ابن الاسود کے نام سے معروف تھے اور اسود سے اسود بن عبد یغوث زہری مراد ہے۔ ابن الاسود کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ بہراء میں حضرت مقداد سے ایک قتل ہو گیا۔ آپ وہاں سے بھاگ کر قبیلہ کندہ

ابن ہشام[1] نے شرکاءِ بدر کی تعداد تین سو چودہ لکھی ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ مہاجرین میں سے تراسی ۸۳
۲۔ قبیلۂ اوس میں سے اکسٹھ ۶۱
۳۔ قبیلۂ خزرج میں سے ایک سو ستر ۱۷۰

کل تعداد۔ تین سو چودہ ۳۱۴

یمن آ گئے اور ان کے حلیف بن گئے۔ پھر اسود نے آپ کو متبنّٰی بنا لیا۔ ان کو مقداد کِندی بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ کِندہ کے قبیلہ میں آپ نے ایک شخص کو قتل کر دیا جہاں سے بھاگ کر آپ مکہ آ گئے اور اسود کے حلیف بن گئے۔ مقداد ان سات صحابہ میں شمار ہوتے ہیں جو مکہ میں سب سے پہلے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ حضرت مقدادؓ تمام غزوات میں رسولِ کریمؐ کے ساتھ شریک ہوئے۔ آپ بے شمار محامد و مناقب سے متصف تھے۔ الجرف میں آپ کی زمینیں تھیں اسی جگہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں آپ نے وفات پائی۔ جنازہ مدینہ منورہ لایا گیا۔ آپ کی عمر اس وقت ستّر برس تھی۔

۴۔ مرثد بن ابی مرثد :۔ ابو مرثد کا نام کناز الغنوی تھا۔ غنی بن اعصر بن سعد بن قیس بن عیلان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو حضورؐ نے ان کو اور اوس بن صامت کو بھائی بھائی بنا دیا۔ غزوۂ الرجیع میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

۵۔ سیّد الشہداء حمزہؓ :۔ حمزہ بن عبد المطلب۔ حضورؐ کے چچا تھے۔ غزوۂ احد میں شہادت پائی۔ آپ جنت میں سیّد الشہداء ہوں گے۔

۶۔ زیدؓ بن حارثہ بن شرحبیل بن کعب بن عبد العزیٰ بن امرئ القیس بن عامر بن نعمان بن عامر بن عبدوُدّ بن عوف بن کنانہ۔ ان کی کنیت ابو اسامہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔ ان شاء اللہ کتاب النکاح میں ان کے بعض واقعات کا ذکر آئے گا۔

۷۔ ابو کبشہؓ :۔ حضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابن ہشام کہتے ہیں یہ فارس کے رہنے والے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دَوس کی سرزمین میں پیدا ہوئے اور بعض کے نزدیک ان کی ولادت مکّہ میں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ ان کا نام سُلیم ہے۔ آپ نے ۱۳ھ میں اس دن وفات پائی جس روز حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ابن عبد البرّ نے اسی طرح لکھا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ۲۳ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ اسی سال عُروہ بن زبیر پیدا ہوئے۔

۸۔ آنسہؓ :۔ رسول کریمؐ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی کنیت ابو مَسروح یا ابو مَسرح ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور خلافتِ صدیقی میں وفات پائی۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ بدر میں شہید ہوئے۔ واقدی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ بات ثابت نہیں۔ اہلِ علم کا کہنا ہے کہ آپ نے غزوۂ احد میں شرکت کی تھی۔ بعد ازاں عرصۂ دراز تک زندہ رہے اور خلافتِ صدیقی میں وفات پائی۔

یہ حالات مندرجہ ذیل کتب سے ماخوذ ہیں :

سیرت ابن ہشام، المغازی للواقدی، الاستیعاب لابن عبد البر، اسد الغابۃ لابن الاثیر، الاصابۃ للحافظ ابن حجر عسقلانی۔

[1] دیکھیے سیرت ابن ہشام (۱-۷۰۶) البدایۃ والنہایۃ (۳-۳۲۲)

امام بخاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ قریش میں سے جن صحابہ نے غزوۂ بدر میں شرکت کی اور مالِ غنیمت میں سے ان کو حصہ دیا گیا ان کی تعداد اکیاسی تھی۔

اسماعیل قاضی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عُبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں میدانِ بدر کی طرف نکلے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے ان کا تعاقب کر کے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ جبکہ دوسرا گروہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر متعین رہا۔ تیسرا گروہ مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف رہا۔ جب تعاقب کرنے والے واپس آئے تو انھوں نے کہا کہ ہمیں مالِ غنیمت میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ کیونکہ ہم نے دشمن کا تعاقب کیا ہے۔ جو گروہ حضورؐ کی حفاظت پر متعین تھا اس نے کہا کہ ہم مالِ غنیمت کے زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ ہم تو اس خیال سے حضورؐ کی حفاظت میں لگے رہے کہ کہیں دشمن ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر آپؐ کو گزند نہ پہنچا جائے۔ جو لوگ مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے انھوں نے کہا کہ یہ ہمارا حق ہے کیونکہ مالِ غنیمت ہم نے جمع کیا ہے۔ تب[۲] یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

صحیح بخاری میں براء بن عازب سے منقول ہے کہ ان کی تعداد تین سو دس سے کچھ اوپر تھی (کتاب المغازی باب "عدۃ اصحاب بدر")۔

[۱] صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "شهود الملائكة بدراً" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۰۲۶) میں بھی موسیٰ بن عقبہ از ابن شہاب کی سند کے ساتھ اسی طرح روایت بیان کی گئی ہے۔ اسی سند کے ساتھ مروی حدیث میں مرقوم ہے کہ عروہ بن زبیر کہا کرتے تھے کہ حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ بدر میں حصے تقسیم کیے گئے تو ان کی تعداد ایک سو تھی۔ لہٰذا ہر ان دونوں باتوں میں تضاد ہے جس کا جواب داؤدی نے یہ دیا ہے کہ حضرت زبیرؓ کو اصحاب بدر کی تعداد کے بارے میں شبہ ہوا ہے۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ حضرت زبیرؓ سے روایت کرنے والے سے غلطی ہوئی ہو، جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے قریش کی تعداد چوراسی تھی۔ ان کے ساتھ تین گھوڑے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھوڑے کو دو حصے دیے۔ جن اصحاب کو آپؐ نے کسی کام کے لیے باہر بھیجا تھا، حضورؐ نے ان کے حصے بھی نکالے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح غزوۂ بدر میں قریشی مجاہدین کے ایک سو حصے قرار پائے ہوں۔

حافظ ابنِ حجر فتح الباری (۷-۳۲۶) میں فرماتے ہیں:

"داؤدی نے جو بات کہی ہے اس میں کوئی حرج نہیں مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ سو کا اطلاق خمس کے ساتھ ملا کر کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ نے پہلے مالِ غنیمت میں سے خمس نکالا۔ جو باقی بچا تھا اس کو مہاجر مجاہدین میں اسّی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ کیونکہ شرکاء کی تعداد اتنی ہی تھی۔ جب اسّی میں خمس (۱/۵) کو شامل کر دیا جائے تو ایک سو حصے بن جاتے ہیں"۔ (واللہ اعلم)

[۲] یہ روایت امام احمد نے مسند (ج ۵ ص ۳۲۳-۳۲۴) میں نقل کی ہے۔ اس ضمن میں متعدد روایات ہیں جن کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (ج ۲ ص ۳۰۳-۳۰۴) میں اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ ہوں:

يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ الخ (الانفال - ۱) (لوگ آپ سے مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں سوال کرتے ہیں)۔

۱۔ حضرت عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں اصحاب بدر کے یہاں اختلاف پیدا ہوا اور ہمارے طرزِ عمل میں خرابی پیدا ہوگئی تب اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کا معاملہ ہمارے ہاتھ سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ اور آپ نے اس مال کو برابر برابر تقسیم فرمایا۔ (مسند احمد)

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ غزوہ بدر کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو لوگ فلاں فلاں کام کریں گے انھیں اتنا انعام دیا جائے گا" یہ سن کر نوجوانوں نے جلدی جلدی وہ کام کیے اور بڑی عمر کے لوگ جھنڈے تلے بیٹھے رہے۔ جب مالِ غنیمت جمع ہوا تو جو پیشکش آپ نے فرمائی تھی نوجوان اس کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس پر بڑوں نے کہا کہ نوجوانوں کو ہم پر ترجیح نہیں ملنی چاہیے اس لیے کہ ہم ان کی پشت پناہ تھے۔ خدانخواستہ انھیں شکست ہوتی تو یہ ہماری ہی طرف لوٹ کر آتے، چنانچہ وہ باہم جھگڑنے لگے۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر (۲۔ ۲۰۴) میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی، ابن جریر، اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ موخر الذکر کے ہیں۔ اسی طرح ابن حبان اور حاکم نے بھی اس حدیث کو متعدد طرق سے بروایت داؤد بن ابی ہند عن عکرمہ عن ابن عباس روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے اپنے استاذ محترم ڈاکٹر محمد امین مصری رحمہ اللہ سے سورۃ الانفال کے درس کے دوران سنا کہ یہ روایت پہلی روایت کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے۔ اس لیے کہ اس کے راویوں میں نقد و جرح کی کوئی گنجائش نہیں اور بقول حاکم و ذہبی یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی سند صحیح بخاری کی شرائط کے مطابق ہے۔ اسی طرح ابوداؤد کی سند تمام شکوک سے پاک ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے بھی صحت کے اعلیٰ معیار پر ہے اور اس کے مطابق صحابہ کے اختلاف کی جو صورت سامنے آتی ہے اس پر کوئی طعن نہیں کیا جاسکتا۔ اس روایت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو شجاعت پر آمادہ کرنے کے لیے فرمایا تھا کہ جو شخص یہ یہ کام کرے گا اسے یہ یہ انعام دیا جائے گا" اور مستدرک حاکم میں یہ الفاظ ہیں کہ "جو شخص فلاں کام کرے گا یا فلاں جگہ جائے گا اس کو یہ انعام دیا جائے گا" یہ نوجوانوں کے لیے مفید اور معقول قسم کی حوصلہ افزائی ہے جس سے ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور جوانی کی جرأت اور شجاعت ان کو کارہائے نمایاں انجام دینے پر ابھارتی ہے۔ نوجوانوں کو ایسے مواقع پر نظر انداز کرنے سے دو عظیم مواقع ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ (۱) ایک تو یہ کہ قوم نوجوانوں کی صلاحیتوں سے مستفید نہیں ہو سکتی اس امر کا تو امکان ہوتا ہے کہ ایک نوجوان دشمن کے لشکر کے قریب جا کر ان کے کسی درے کو کھول دے۔ یا ان کے کسی قلعہ کو تباہ کر دے۔ دورِ جدید میں جنگ جیتنے کے سلسلے میں نوجوانوں کے جذبات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ (۲) دوسری بات یہ ہے کہ نوجوان اس طرح سے جنگ کا عملی تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنے لشکر کی نصرت و تائید کے سلسلے میں ان کے جذبات میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ یہ جذبہ عصرِ حاضر میں مسلمانوں میں مفقود اور ان کے دشمنوں میں مکمل طور پر موجود ہے۔ رسول اکرم

اس آیت کے نزول کے بعد مال غنیمت کو حضورؐ نے صحابہ میں جلدی سے تقسیم کر دیا۔ اس وقت تک آیت "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ" (الانفال۔۴۱) نازل نہیں ہوئی تھی۔

اسماعیل کہتے ہیں کہ جب مہاجرین مدینہ آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کا مال مہاجرین اور تین انصاری صحابہ کے درمیان تقسیم کر دیا۔

ان انصاری صحابہ کے نام یہ ہیں:

(۱) سہل بن حنیفؓ (۲) ابودجانہؓ اور حارثؓ بن الصمہ

یہ تقسیم حضورؐ نے اس لیے فرمائی کہ مہاجرین جب مدینہ منورہ آئے تھے تو انصار نے ان کو اپنا نصف پھل دیتے رہنے کا عہد کیا تھا۔ اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر تم چاہو تو میں بنو نضیر کا مال تمہارے (انصار کے) اور ان (مہاجرین) کے درمیان تقسیم کر دوں۔ اور تم حسب سابق انھیں نصف پھل دیتے رہو اور اگر چاہو تو صرف مہاجرین کو دوں اور آپ لوگ ان کو پھلوں کا حصہ دینا بند کر دیں۔"

یہ سن کر انصار نے کہا۔ آپ یہ مال صرف مہاجرین میں تقسیم فرمادیں اور ہم اپنے پھل اپنے پاس رکھا کریں گے، چنانچہ

نے نوجوان صحابہ میں یہی جذبہ پیدا کرنے کی سعی کی تھی۔ آپؐ نے ان کو ایسے کاموں پر آمادہ کیا جو مسلمانوں کے لیے فوز و فلاح کے موجب ہو سکتے ہیں۔ ایسے کاموں پر انعام دینے سے اس شخص کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ قائد مجھ سے خوش ہے۔ قائد ایسے شخص کو انعام کے طور پر جو چیز بھی دیتا ہے وہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ اس سے خوش ہے۔ مزید براں ایسے شخص کو جو چیز عطا کی جاتی ہے اس کی صرف مادی حیثیت ہی پیش نظر نہیں ہوتی۔ مثلاً حضرت سعدؓ نے حضورؐ کی اجازت سے جو تلوار لی تھی وہ صرف ایک تلوار ہی نہ تھی، بلکہ اس تلوار کی ایک تاریخی حیثیت ہے اور جو صفات وہ اپنے دامن میں رکھتی ہے دوسری کسی تلوار میں وہ موجود نہیں۔

لہ سہل بن حُنَیف انصار کے قبیلہ اوس میں سے تھے۔ ان کی کنیت ابو سعد یا ابو سعید تھی اور بعض کے نزدیک ابو عبداللہ یا ابوالولید یا ابو ثابت۔ فاضل صحابہ میں سے تھے۔ غزوۂ اُحد میں تیر چلا چلا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرتے رہے۔ ۳۸ھ میں کوفہ میں فوت ہوئے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

ٮه ابودجانہؓ کا نام سماک بن خرشہ اور بعض کے نزدیک سماک بن اوس بن خرشہ بن لوذان بن عبدود بن زید انصاری خزرجی ساعدی ہے۔ یہ سعدؓ بن عبادہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا شمار فاضل اور جری صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر انھوں نے حضورؐ کا دفاع کیا تھا۔ جنگ یمامہ میں آپ مسیلمہ کے قتل میں شریک ہوئے اور اسی جنگ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

ٮه حارث بن الصمہ بن عمرو بن عتیک بن عامر ہے۔ لقب مبذول بن مالک بن النجار انصاری خزرجی ہے۔ کنیت ابو سعد تھی۔ بیر معونہ کے واقعہ میں شہید ہوئے۔

آپؐ نے وہ مال مہاجرین کو عطا کر دیا۔ وہ یہ مال لے کر بے نیاز ہو گئے اور انصار اپنے پھلوں کی وجہ سے دولت مند ہو گئے۔
مذکورہ بالا تینوں انصاری صحابہ نے اپنی مفلسی کا اظہار کیا تھا اس لیے ان کو بھی حصہ دیا گیا۔
ابن ہشامؒ، ابن سحنون، ابن حبیب اور البرقی نے ذکر کیا ہے کہ طلحہ بن عبیداللہؓ اور سعد بن زیدؓ نے بدر میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ دونوں ان دنوں شام میں تھے۔ حضورؐ نے مال غنیمت میں سے ان دونوں کا حصہ بھی نکالا۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ حضورؐ ہمارا اجر و ثواب؟

آپؐ نے فرمایا "تمھیں اجر و ثواب بھی ملے گا۔"

امام بخاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ عقبہ بن عمرو انصاری غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے۔

۱؎ دیکھیے سیرت ابن ہشام (۱۔ ۲۸۲) اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:
ابن اسحاق کہتے ہیں طلحہؓ بن عبیداللہ بن عثمان بن کعب بن سعد بن تیم شام میں تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے لوٹنے کے بعد مدینہ آئے۔ آپؐ نے مال غنیمت میں سے ان کا حصہ نکالا۔ طلحہ نے عرض کیا "حضورؐ میرا ثواب؟ آپؐ نے فرمایا" تجھے پانچ آدمیوں کا ثواب ملے گا۔

۲؎ ایک نسخہ میں سعد بن زید کے بجائے سعید بن زید ہے۔ سیرت ابن ہشام (۱۔ ۲۸۲) میں بھی اسی طرح ہے۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:
سعید بن زید بن عمرو بن نفیل بن عبد العزیٰ بن عبداللہ بن قرط بن ریاح بن رزاح بن عدی بن کعب۔ جب رسول اللہ صلی اللہ غزوہ بدر سے لوٹے تو سعیدؓ شام سے مدینہ پہنچے۔ جب انھوں نے حضورؐ سے گفتگو کی تو آپؐ نے بدر کے مال غنیمت سے ان کو حصہ دلوایا۔ سعید نے عرض کیا حضورؐ میرا اجر و ثواب؟ آپ نے فرمایا "تمھیں چودہ آدمیوں کا اجر ملے گا۔"

۳؎ صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "تسمیۃ من سمی من اھل بدر" عقبہ بن عمرو کی کنیت ابو مسعود ہے اور وہ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ "الاصابۃ" (۲۔ ۴۸۴) میں لکھتے ہیں۔ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ ابو مسعودؓ بیعت عقبہ میں حاضر ہوئے تھے، البتہ غزوۂ بدر میں ان کی شرکت کے بارے میں محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ انھوں نے شرکت کی تھی۔ اور اسی لیے ان کو بدری کہا جاتا ہے۔ امام بخاری پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ امام بخاری نے اس ضمن میں چند احادیث سے استدلال کیا ہے جو صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ بعض احادیث میں تصریح ہے کہ انھوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی۔ مثلاً عروہ بن زبیر کی روایت کردہ حدیث جو انھوں نے بشیر بن ابی مسعود سے روایت کی ہے۔ بشیر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت مغیرہؓ نے عصر کی نماز تاخیر سے ادا کی۔ اسی اثنا میں ابو مسعود عقبہ بن عمرو، جو کہ زید بن حسن کے دادا تھے ان کے پاس داخل ہوئے۔ ابو مسعود نے غزوہ بدر میں شرکت کی تھی۔
ابو عتبہ بن سلام اور امام مسلم الکنیٰ میں لکھتے ہیں کہ ابو مسعود نے بدر میں شرکت کی تھی۔
ابن البرقی کہتے ہیں:
"ابن اسحاق نے ابو مسعود کو بدری صحابہ میں شمار نہیں کیا، مگر متعدد احادیث میں وارد ہوا ہے کہ انھوں نے بدر میں شرکت کی تھی۔"

یحییٰ بن معین[1] کہتے ہیں کہ عقبہ بن عمرو بدر میں شریک نہیں ہوئے، البتہ وہ بیعت عقبہ میں شامل ہوئے تھے۔
ابن حبیب اور ابن ہشام[2] نے ذکر کیا ہے کہ ابولبابہ، حارث بن حاطب اور عاصم بن عدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے لیکن حضور نے انھیں لوٹا دیا اور ابولبابہ کو آپ نے مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا۔

طبرانی فرماتے ہیں:
"اہل کوفہ کہتے ہیں کہ ابومسعود نے بدر میں شرکت کی تھی۔ مگر اہل مدینہ ان کو بدری صحابہ میں شمار نہیں کرتے"
ابن سعد کہتے ہیں کہ واقدی سے روایت ہے کہ:
"ہمارے اصحاب میں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ ابومسعود نے بدر میں شرکت نہیں کی" (الاصابۃ ج ۲- ص ۴۸۴) (ابن حجر کا کلام ختم ہوا)
ابن الاثیر اُسد الغابۃ (۳-۴۱۹) میں پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ:
ابومسعود نے بدر میں شرکت نہیں کی۔ ابن کثیر البدایہ والنہایۃ (۳-۳۲۲) میں لکھتے ہیں کہ اکثر اصحاب مغازی کے نزدیک امام بخاری کا یہ قول محل نظر ہے کہ ابومسعود بدری ہیں۔ اسی لیے انھوں نے امام بخاری کے قول کا ذکر ہی نہیں کیا۔
ابن اثیر نے ابومسعود کا نسب یوں بیان کیا ہے:
"عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ بن اسیرہ، بعض کے نزدیک ثعلبہ بن عسیرہ، اور بقول بعض علماء ثعلبہ بن اسیرہ بن عسیرہ بن عطیہ بن خدارہ بن عوف بن حارث۔ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے" بعض علماء کہتے ہیں "عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ بن اسیرہ بن عسیرہ بن عطیہ۔
حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ خلیفہ نے لکھا ہے کہ عقبہ بن عمرو نے ۴۰ھ سے پہلے وفات پائی۔ ابن المدینی نے ۴۰ھ لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں "صحیح یہ ہے کہ انھوں نے ۴۰ھ کے بعد وفات پائی۔ اس لیے کہ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ عقبہ بن عمرو نے کوفہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کی امارت کا زمانہ پایا تھا۔ اور یہ زمانہ یقیناً ۴۰ھ کے بعد کا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ انھوں نے مدینہ میں وفات پائی اور بعض کے نزدیک کوفہ میں۔

[1] یحییٰ بن معین: یہ عظیم امام اور حافظ حدیث تھے۔ ان کی کنیت ابوزکریا اور نسبت بغدادی ہے۔ یہ نقد و جرح کے امام تھے۔ ۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں ۲۳۳ھ میں وفات پائی۔

[2] دیکھیے سیرت ابن ہشام (۱-۶۱۲)۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:
"رسول کریم نے عمرو بن ام کلثوم اور بعض کے نزدیک عبداللہ بن ام مکتوم کو نماز پڑھانے کے لیے امام مقرر کیا۔ پھر ابولبابہ کو الروحاء نامی جگہ سے واپس بلا کر مدینہ کا حاکم مقرر کیا۔ اس سے آگے ۶۸۸ صفحہ پر لکھتے ہیں کہ ابولبابہ بن عبدالمنذر اور حارث بن حاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے۔ آپ نے ان کو واپس کر دیا اور ابولبابہ کو مدینہ طیبہ کا امیر مقرر کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے مال غنیمت میں سے ان دونوں کا حصہ نکالا"
عاصم بن عدی کا تذکرہ ابن ہشام نے ۶۸۹ صفحہ پر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ابن حبیب کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن امّ مکتوم کو مدینہ میں نماز کے لیے امام مقرر فرمایا اور آپ نے ان کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا۔

حارث بن الصمہ کو روحاء میں رکنا پڑا۔ حضورؐ نے مالِ غنیمت سے ان کو بھی حصہ دیا۔

ابن ہشامؒ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے بدر کے مالِ غنیمت میں سے خوّاتؓ بن جُبیر بن نعمان کو بھی حصہ عطا فرمایا تھا۔

تمام سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہؓ بنت رسولؐ کی بیماری کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شرکت نہ کر سکے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت میں سے ان کا حصّہ نکالا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا۔ "حضور میرا اجر و ثواب؟" فرمایا: تمھیں اجر و ثواب بھی ملے گا۔

ابن حبیب کہتے ہیں کہ کسی شخص کی لڑائی میں عملی شرکت کے بغیر بھی مالِ غنیمت میں سے حصہ دینا حضورؐ کی خصوصیات میں سے ہے اور بعد میں مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ جنگ میں شرکت نہ کرنے والے کو حصّہ نہ دیا جائے۔

"عاصم بن عدیؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر میں شرکت کرنے کے لیے مدینہ سے نکلے مگر آپ نے ان کو واپس کر دیا اور مالِ غنیمت میں سے ان کا حصہ نکالا۔ اصحاب السیر کہتے ہیں کہ حضورؐ نے عاصم کو اس لیے واپس کیا کہ آپ کو مسجدِ ضرار والوں کی جانب سے خطرے کا احساس ہوا۔ حضورؐ نے عاصمؓ کو قباء اور عالیہ کے علاقہ پر اپنا جانشین مقرر کیا تھا، لہٰذا آپ نے ان کو واپس بھیج دیا تاکہ اس علاقہ کی نگرانی کریں۔"

لہ سیرت ابن ہشام (۱-۶۹)

ٹہ ابن ہشام سیرت (۱-۶۷۸) میں لکھتے ہیں:

"عثمانؓ بن عفان بن ابی العاص بن اُمیہ بن عبد شمس اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہؓ بنت رسولؐ کی بیماری کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شرکت نہ کر سکے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مالِ غنیمت میں سے ان کا حصہ نکالا۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا اجر و ثواب؟ فرمایا تمھیں اجر بھی ملے گا۔"

صحیح بخاری کتاب "الفضائل" باب "مناقب عثمانؓ بن عفان" (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۳۶۹۸ ہے) میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک لمبی حدیث روایت کی گئی ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی غزوۂ بدر میں عدم شرکت کا سبب یہ ہے کہ ان کی زوجہ محترمہ حضرت رقیہؓ بیمار تھیں اور آپ ان کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ تمھیں غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے آدمی کے برابر اجر و ثواب بھی ملے گا اور مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی۔

سہ مصنّف کا یہ قول کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہو چکا ہے کہ جہاد میں شرکت نہ کرنے والے کو مالِ غنیمت میں سے حصّہ نہ دیا جائے اس کی دلیل حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا یہ قول ہے کہ غنیمت میں حصّہ صرف اس شخص کا ہے جو جنگ میں شریک ہو۔ (البیہقی ۹-۵۰)

ابن وہب اور ابن نافع امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ حکومت جب کسی کو فوجی مصلحت کے لیے کسی مہم پر بھیجے تو مالِ غنیمت میں سے اس کو حصہ دیا جائے گا۔ امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ اسے حصہ نہیں ملے گا۔ سحنون کہتے ہیں کہ میں پہلی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو غزوۂ اُحد

امام احمد، اوزاعی، شافعی، اسحاق اور ابو داؤد کی رائے بھی یہی ہے۔

اس قول کی دوسری دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایت ہے جو امام بخاری نے کتاب "المغازی" باب "غزوۂ خیبر" میں نقل کی ہے (فتح الباری حدیث نمبر ۴۲۳۸) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے ابانؓ کو ایک فوجی دستے کا قائد بنا کر مدینہ سے نجد کی طرف بھیجا۔ ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابان اور ان کے ساتھی اس وقت حضورؐ کی خدمت میں خیبر پہنچے جب وہ فتح ہو چکا تھا اور گھوڑوں کے زین اتارے جا چکے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کو مالِ غنیمت میں سے حصہ نہ دیجیے۔ یہ سن کر ابان نے کہا "تمہاری یہ حیثیت ہرگز نہیں ہے کہ تم اس طرح کی بات کہو" حضورِ اکرمؐ نے فرمایا۔ ابان! بیٹھ جاؤ۔ پھر آپؐ نے ان کو حصہ نہ دیا۔

اس کے برعکس احناف کا موقف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مصلحتِ عامہ کی بنا پر جہاد میں شرکت نہ کرے تو اسے حصہ دیا جا سکتا ہے۔ وہ اس ضمن میں حضورؐ کے عمل سے استدلال کرتے ہیں کہ حضورؐ نے غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت میں سے حضرت عثمانؓ کو حصہ دلایا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا استدلال ابوبُردہ کی حدیث سے ہے جو انھوں نے ابوموسیٰؓ سے روایت کی ہے کہ ہم حضورؐ کی خدمت میں خیبر فتح ہونے کے بعد حاضر ہوئے تو آپؐ نے ہمیں مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جبکہ آپؐ نے ہمارے سوا کسی ایسے شخص کو حصہ نہ دیا جس نے غزوۂ خیبر میں شرکت نہیں کی تھی۔ (صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "غزوۂ خیبر" ومسلم ۴-۱۹۴۶۔ کتاب "فضائل الصحابۃ" باب "فضائل جعفر بن ابی طالب")

شوافع اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ لوگ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے سے پہلے خیبر پہنچ گئے تھے۔ ابن حبان اپنی صحیح میں کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ان کو خمس میں سے حصہ دیا تھا۔ حضورؐ کا مقصد ان کی تالیفِ قلب اور دلجوئی تھی۔ آپؐ نے ان کو مالِ غنیمت میں سے حصہ نہیں دیا تھا کیونکہ وہ جہاد میں شریک نہیں ہوئے تھے (نصب الرایۃ للزیلعی ۳-۴۰۸، ۴۰۹) احناف حضرت عمرؓ کے قول کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ شوافع کے نزدیک حجت نہیں۔ اس لیے کہ شوافع تقلیدِ صحابی کے قائل نہیں۔ احناف نے حضرت عمرؓ کے قول کی تاویل یہ کی ہے کہ جہاد میں شرکت کرنے کا مقصد قتال کا قصد کرنے سے پورا ہو جاتا ہے اور قتال کا مقصد دو باتوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔ (۱) جہاد کے لیے نکلنے سے (۲) اور دوسرے جہاد کے لیے تیاری کرنے سے۔ اور جس شخص کو امیر المومنین کسی مصلحت کے لیے بھیجتا ہے اس میں یہ دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں۔ (فتح القدیر ۴-۳۱۳)

لہ صحیح بخاری کتاب "الشہادات" باب "بلوغ الصبیان وشہادتہم" (فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۲۶۶۴) اس روایت میں ہے کہ نافع نے کہا کہ میں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ حدیث بیان کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ بالغ اور نابالغ کے مابین

کے موقع پر واپس بھیج دیا جب کہ ان کی عمر اس وقت چودہ برس تھی۔ اس کے بعد غزوۂ خندق میں ان کو شرکت کی اجازت دے دی جب کہ اس وقت ان کی عمر تقریباً پندرہ برس تھی۔

ایک تدبیر ہے۔ پھر انھوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے سرکاری کارندوں کو حکم بھیجا کہ جو بچہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچ جائے اس کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے۔ صحیح مسلم (۳ - ۱۴۹۰) کتاب "الامارۃ" میں یہ اضافہ ہے کہ "اگر بچے کی عمر اس سے کم ہو تو اس کو عیال ہی میں شمار کیا جائے"۔ ابن سعد نے طبقات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ:

غزوہ بدر کے وقت مجھے آنحضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت میری عمر تیرہ[۱۳] سال تھی۔ آپؐ نے مجھے واپس کر دیا۔ پھر میں غزوہ احد کے موقع پر آپ کی خدمت میں پیش ہوا .... تا آخر۔

ابن سعد لکھتے ہیں:

"یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی عمر سولہ سال ہونی چاہیے۔ یہ ابن اسحاق کے اس قول پر مبنی ہے کہ غزوۂ خندق ۵ھ میں ہوا اور احد کی جنگ شوال ۳ھ میں ہوئی۔ اس طرح بقول یزید بن ہارون حضرت عبداللہ بن عمر کی عمر غزوہ خندق کے وقت سولہ سال کی ہوگی۔ مگر امام بخاریؒ کا رجحان اس طرف ہے کہ غزوۂ خندق شوال ۴ھ میں ہوا۔

ارباب مغازی اس بات پر متفق ہیں کہ مشرک جب غزوۂ احد سے لوٹنے لگے تو انھوں نے مسلمانوں کو پکار کر کہا:

" اگلے سال بدر کے میدان میں پھر ملاقات ہوگی۔" چنانچہ اگلے سال ۴ھ ماہ شوال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے میدان میں پہنچے مگر وہاں کسی کو نہ پایا۔ اس کو "بدر موعد" کہتے ہیں۔ اس موقع پر لڑائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لیے ابن اسحٰق کی بات درست ہے کہ غزوۂ خندق ۵ھ میں ہوا، لہٰذا مذکورہ اشکال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

امام بیہقی اور دیگر محدثین نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ ابن عمرؓ کے اس قول کا کہ "میں غزوۂ احد کے موقع پر چودہ برس کا تھا" مطلب یہ ہے کہ میری عمر کا چودھواں سال ابھی شروع ہوا تھا۔ اسی طرح غزوۂ خندق کے موقع پر پندرہ سال کا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت عمر پورے پندرہ سال ہو چکی تھی۔ دیکھیے فتح الباری (۵ - ۲۷۸)

خواتین، بچوں اور غلاموں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دینے کے بارے میں شرعی احکام

اس مسلک کی بنیاد حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواتین کو جہاد میں لے جاتے۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں اور ان کو مالِ غنیمت میں سے کچھ تحائف وغیرہ دیے جاتے تھے مگر باقاعدہ حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ ہی سے دوسری روایت ہے کہ نجدہ بن عامر نے آپ کو لکھا تھا کہ عورت اور غلام اگر جہاد میں شرکت کریں تو کیا انھیں مالِ غنیمت میں سے حصہ دینا چاہیے؟ اس کے جواب میں حضرت ابن عباسؓ نے تحریر کیا کہ ان کو باقاعدہ حصہ تو نہیں دیا جا سکتا، البتہ (دلجوئی کے لیے) کچھ دے دیا جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ صحیح مسلم (۳ - ۱۴۴۵ - ۱۴۴۶) کتاب "الجہاد" باب "النساء الغازیات"۔ نیز ترمذی (۴ - ۱۲۵)۔ کتاب "السیر" باب "من یعطی الفئ"۔ مسند احمد (۱ - ۲۴۸)

ابن حبیب کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواتین، بچوں اور غلاموں کو مالِ غنیمت میں سے باقاعدہ حصہ نہیں دیا کرتے تھے، البتہ حوصلہ افزائی کے لیے مالِ غنیمت میں سے کچھ دے دیا کرتے تھے۔ امام مالکؒ کے نزدیک عورتوں اور بچوں کو حوصلہ افزائی کے لیے بھی کچھ دینا درست نہیں۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک اور حدیث بھی منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خواتین اور غلاموں کو مالِ غنیمت میں سے مجاہدین کے حصے سے کم مال دے دیا کرتے تھے۔ (مسند احمد)

حضرت عمیرؓ ابو اللحم کے غلام تھے وہ روایت کرتے ہیں کہ میں اپنے آقاؤں کے ہمراہ خیبر میں حاضر ہوا۔ انھوں نے میرے معاملہ میں حضورؐ سے گفتگو کی اور عرض کیا کہ میں غلام ہوں۔ حضورؐ کے ارشاد فرمانے پر میرے گلے میں ایک تلوار حمائل کی گئی جسے میں گھسیٹنے لگا۔ پھر آپ نے مجھے کچھ ردی سا سامان دلوا دیا۔ ترمذی (۴-۱۲۷) کتاب "السیر" باب "هل یسهم للعبد" ابو داؤد (۳-۷۵) کتاب "الجهاد"۔ ترمذی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض اہلِ علم کا عمل اسی پر ہے۔ امام ثوری، شافعی، احمد اور اسحاق کی رائے بھی یہی ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں:

نبی کریمؐ نے غزوۂ خیبر کے مالِ غنیمت میں سے بچوں کو حصہ دیا تھا۔ ائمہ اسلام اس بچے کو مالِ غنیمت سے حصہ دلواتے ہیں جو علاقۂ جنگ میں پیدا ہو۔ اسی طرح حضورؐ نے جنگِ خیبر میں خواتین کو بھی مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا تھا۔ بعد ازاں اہلِ اسلام اس پر عمل پیرا رہے۔ اس سلسلے میں نہایت مفید بحث کے لیے دیکھیے "التمهید" (۱-۳۴۲-۲۳۲)

عورتوں اور بچوں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دینے کے بارے میں امام اوزاعی کی دلیل وہ حدیث ہے جو حشرج بن زیاد نے اپنے بھائی سے اور انھوں نے اپنی دادی سے روایت کی ہے کہ وہ (دادی) حضورؐ کے ہمراہ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئیں۔ ان کے علاوہ پانچ خواتین اور بھی تھیں۔ حضورؐ کو پتہ چلا تو آپ نے ہمیں بلایا۔ ہم حاضر ہوئیں تو دیکھا کہ آپؐ ناراض ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تم کس کے ہمراہ آئیں؟ اور کس کی اجازت سے یہاں پہنچیں؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سفر میں نکلیں۔ راستہ میں اُون کاتتی تھیں اور خدا کی راہ میں دوسروں کی امداد کرتی تھیں۔ ہمارے پاس زخمیوں کے لیے مرہم پٹی بھی ہے۔ ہم تیر پکڑ کر لاتی اور ستو پلاتی ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "اٹھو اور واپس چلی جاؤ۔" جب خیبر فتح ہوا تو آپؐ نے مردوں کی طرح مالِ غنیمت میں سے ہمیں بھی حصہ دیا۔ (راوی کا بیان ہے) کہ میں نے پوچھا۔ دادی جان! "مالِ غنیمت میں سے کیا چیز آپ کو ملی؟" اُنھوں نے کہا "کھجوریں"۔ ابو داؤد (۳-۷۵) کتاب "الجهاد" باب فی المرأة والعبد یحذیان من الغنیمة۔ مسند احمد (۶-۳۷۱) مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ اس لیے یہ حدیث حجت نہیں۔ حشرج بن زیاد ضعیف راوی ہے۔ وہ مقبول کے درجہ کا ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ خواتین، بچوں، غلاموں اور ذمیوں کو مالِ غنیمت سے حصہ نہیں دیا جا سکتا اور اس ضمن میں جو احادیث وارد ہوتی ہیں ان میں یہ مذکور نہیں کہ آپ نے ان کو مالِ غنیمت میں سے باقاعدہ حصہ دیا تھا، لہٰذا مختلف احادیث میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے ان کو تحفہ اور ہدیہ پر محمول کرنا چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ حدیث میں تو اس بات کی

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں سے اونٹ اور بکریاں تقسیم کیں۔ آپؐ نے دس بکریوں

تصریح بھی موجود ہے۔ اس میں باقاعدہ حصہ کی نفی اور تحفہ کا اثبات کیا گیا ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار (۷-۲۹۷)

امام مالکؒ کا یہ قول کہ ان کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے پیش نظر قابل تسلیم نہیں۔ تحفہ اور ہدیہ اخماس اربعہ میں سے دیا جاتا ہے مال غنیمت میں سے نہیں۔ جیسا کہ الولی العراقی نے کہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ (حاشیۃ البحیری (۴-۲۶۸) اور المغنی لابن قدامہ (۹-۲۳۹)

ہدیہ اور تحفہ کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی بلکہ اسے حکومت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے۔

لہ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب "الجہاد" باب "من قسم الغنیمۃ فی غزوۃ وسفرۃ" میں رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے بلا سند روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں ذوالحلیفہ میں تھے۔ ہمیں بہت سے اونٹ اور بکریاں مال غنیمت میں ملیں۔ اور آپؐ نے دس بکریوں کو ایک اونٹ کے برابر ٹھہرایا۔"

امام بخاری نے کتاب "البیوع" باب "القسمۃ علی الذبیحۃ" میں ایک طویل حدیث کی حیثیت میں اس کو متصل سند کے ساتھ بھی بیان کیا ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۹۸ ہے) ترمذی (۴-۱۵۳) کتاب "السیر" باب ما جاء فی کراھیۃ النھب" یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مال غنیمت دارالحرب میں تقسیم کرنا جائز ہے۔ جمہور فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا یہی موقف ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"مال غنیمت کی تقسیم میں جلدی کرنا بہتر ہے۔ اس لیے کہ صاحب حق کا حق ادا کرنے میں تاخیر ظلم کے مترادف ہے۔ اور حق دار کا حق جلد ادا کرنا فرض ہے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ (المغنی (۹-۲۵۰)۔ المدونہ (۲-۱۲) المحلی لابن حزم (۷-۵۵۷)

دارالحرب میں مال غنیمت کی تقسیم امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ دارالحرب میں مال غنیمت کی تقسیم جائز نہیں۔ ان کے نزدیک مال غنیمت دارالاسلام میں پہنچ کر تقسیم کیا جائے گا۔ ان کی رائے میں یہ اس صورت میں ہے جب دارالحرب اور دارالاسلام میں کافی فاصلہ ہو، لیکن اگر دونوں مقامات متصل ہوں اور دارالحرب کو فتح کر کے اس پر دارالاسلام کا اطلاق کیا جا چکا ہو، جیسا کہ غزوۂ حنین میں ہوا، تو تقسیم کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ ان کی اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ مال غنیمت کی ملکیت کی تکمیل قبضے سے ہوتی ہے۔ اور قبضہ اس وقت تصور کیا جائے گا جب مال غنیمت کو دارالاسلام میں لاکر محفوظ کر لیا جائے، لیکن حکومت اگر کسی مصلحت یا اپنے اجتہاد کی بنا پر دارالحرب میں مال غنیمت کو تقسیم کرنا چاہے تو یہ تقسیم صحیح ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ حاکم وقت مال غنیمت کو دارالحرب سے اٹھا کر لانے سے قاصر ہو تب بھی دارالحرب میں مال غنیمت کو تقسیم کر سکتا ہے۔ (الشرح الکبیر (۲-۱۰۱۲) المبسوط (۱۰-۱۹) سیر الاوزاعی مع الامّ (۷-۳۰۳)

اس ضمن میں جمہور علماء کے مسلک کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ تمام غزوات میں آپؐ کا تعامل

کو ایک اونٹ کے مساوی قرار دیا۔

یہ رہا کہ جونہی مالِ غنیمت جمع ہوتا اس میں سے خُمس نکال لیتے اور واپسی سے قبل تقسیم فرما دیتے۔ مثلاً غزوہ بنی مصطلق، ہوازن اور حنین وغیرہ میں فتح عراق کے موقع پر حضرت عمرؓ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ ابن وہب نے ابن لہیعہ سے اور اس نے یزید بن ابی حبیب سے روایت کی ہے کہ جب عراق فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو تحریر کیا:

"حمد و صلوٰۃ کے بعد آپ کا خط ملا۔ آپ نے اس میں لکھا ہے کہ لوگ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ مالِ غنیمت ان میں تقسیم کر دیا جائے۔ جب میرا یہ خط آپ کو ملے تو جو مالِ غنیمت موجود ہو اس کو مجاہدین میں تقسیم کر دیں اور اراضی اور نہروں کو باقی رہنے دیں۔ اس لیے کہ اگر ان کو بھی تقسیم کر دیا گیا تو بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے کچھ بھی نہ بچے گا۔" (المدونہ ج ۲ ص ۱۲، ۱۳)

امام الطبریؒ "اختلاف الفقہاء" میں لکھتے ہیں:

"دارالحرب میں مالِ غنیمت کو تقسیم نہ کرنا اور دارالاسلام پہنچنے تک اسے ملتوی رکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر آج تک تمام سلف صالحین کے طرزِ عمل کے خلاف ہے۔"

("اختلاف الفقہاء" ص ۱۲۹)

لڑائی کے دوران میں کسی مجاہد کے ہاتھوں مرنے والے شخص کے سامان کے بارے میں فیصلہ

نیز یہ مسئلہ کہ اس میں سے خمس نکالا جائے گا یا نہیں؟

موطا[1]، بخاری[2] اور مسلم[3] میں ابو قتادہ[4] سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ حنین کے لیے نکلے۔ جب کفار کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اسی حالت میں میں نے دیکھا کہ ایک کافر نے ایک مسلمان کو گرا لیا ہے اور وہ اس کے اوپر بیٹھ گیا ہے۔ میں نے پچھلی طرف سے آ کر کافر کے کندھے پر تلوار ماری۔ وہ میری جانب متوجہ ہوا اور مجھے اس انداز سے بھینچا کہ مجھے اس سے اس کی موت کا اندازہ ہو گیا۔ پھر موت نے اسے آ لیا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میری ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی اور میں نے پوچھا کہ لوگوں کا کیا حال ہے؟ وہ فرمانے لگے۔ "جیسے اللہ کا حکم" پھر مسلمان واپس آنے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

"جس نے کسی کو قتل کیا اور اس کا کوئی گواہ بھی ہو تو مقتول کا سامان اسے ملے گا۔"

میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ کون میری شہادت دے گا؟ پھر میں بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔

میں نے پھر کھڑے ہو کر کہا۔ "میرا گواہ کون ہے؟" یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا۔ پھر آپؐ نے تیسری مرتبہ وہی الفاظ ارشاد فرمائے۔ حضورؐ نے فرمایا: "قتادہ کیا بات ہے؟" تب میں نے واقعہ بیان کیا۔

اس پر ایک آدمی[5] نے کہا۔ یا رسول اللہ! "یہ سچ کہتے ہیں۔ اس وقت اس مقتول کا سامان میرے پاس ہے اور آپ اس کو راضی کر دیجیے"۔ (اور وہ مال میرے ہی پاس رہے)۔

---

[1] دیکھیے مؤطا (۱-۳۰۱) کتاب "الجہاد" باب ما جاء فی السلب فی القتل۔

[2] صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "غزوہ حنین" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۳۲۱) نیز کتاب فرض الخمس باب من لم یخمس الاسلاب (حدیث نمبر فتح الباری ۳۱۴۲)

[3] صحیح مسلم (۳-۱۳۷) کتاب "الجہاد والسیر" باب استحقاق القاتل سلب القتیل۔

[4] ابو قتادہ کا نام حارث بن ربعی الانصاری الخزرجی السلمی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام نعمان تھا۔ یہ رسول کریمؐ کے شہسوار تھے۔ فاضل صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ سنہ ۵۴ھ میں وفات پائی۔ حضرت علیؓ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔

[5] واقدی کہتے ہیں کہ ان کا نام اسود بن خزاعی تھا۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ درست نہیں کیونکہ صحیح روایت میں ہے کہ جس شخص نے مقتول کا سامان لیا وہ قریشی تھا۔ زرقانی نے یہ بات نقل کی ہے اور اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا "بخدا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر اللہ و رسول کے دفاع کے لیے لڑ رہا ہو اور مقتول کا سامان (اس کو دینے کے بجائے) تمھیں دے دیا جائے"۔

صحیح بخاری کتاب الاحکام میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا "بخدا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مقتول کا سامان قریش کی ایک چڑیا (کمزور آدمی) کو دے دیا جائے اور اللہ کے شیر کو اس سے محروم کر دیا جائے"۔

یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس (ابوبکر رضی اللہ عنہ) نے سچ کہا، لہٰذا وہ سامان ان (ابوقتادہ رضی اللہ عنہ) کو دے دو"۔ ابوقتادہ کہتے ہیں کہ "میں نے اس میں سے ایک زرہ فروخت کی اور اس کے عوض بنو سلمہ کے علاقے میں ایک باغ خرید لیا۔ یہ پہلا مال تھا جو میں نے اسلام لانے کے بعد حاصل کیا"۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں قبیلہ ازد والے سَلِمہ (لام کی زیر کے ساتھ) بولتے ہیں اور بنو قشیر سَلَمہ (لام کی زبر کے ساتھ) بولتے ہیں۔ ———— امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

۱؎ تفصلات کے لیے دیکھیے فتح الباری (۸-۳۸) زرقانی شرح مؤطا (۳-۳۰۵)

۲؎ صحیح بخاری باب "الشهادة تكون عند الحاكم في ولاية القضاء" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۷۱۷۰)

۳؎ دیکھیے ابوداؤد (۳-۷۰) کتاب "المغازی" باب "في السلب يعطى القاتل" نیز ترمذی (۴-۱۳۱) کتاب "السیر" باب "من قتل قتيلاً فله سلبه" ابن ماجہ (۲-۹۴۶) کتاب "الجهاد" باب "المبارزة والسلب"

۴؎ دیکھیے صحیح بخاری کتاب "فرض الخمس" باب من لم يخمس الاسلاب ومن قتل قتيلاً فله سلبه من غير ان يخمس"۔ باب کا یہ عنوان مقرر کرنے سے امام بخاری کا مقصد اس مشہور اختلاف کی جانب اشارہ کرنا ہے جو اس مسئلہ میں پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جمہور علماء امام بخاری کے ہمنوا ہیں۔ امام بخاری کا مسلک یہ ہے کہ سَلَب (مقتول کے مال) میں سے خمس نہ نکالا جائے۔ یہ سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے۔ امام شافعی، ابن المنذر اور ابن سیرین کا موقف بھی یہی ہے۔ عوف بن مالک اور خالد بن ولید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ مقتول کا مال قاتل کو دیا جائے اور اس میں سے آپ نے خمس نہیں نکالا تھا۔ (ابوداؤد ۳-۷۲) کتاب "الجهاد" باب في السلب لا يخمس" مگر اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش راوی ہے جو کہ ضعیف ہے۔ اس کا تعارف قبل ازیں تحریر کیا جا چکا ہے۔

مصنف عبدالرزاق (۵-۲۳۳) میں مَعمر، ایوب سے اور وہ ابن سیرین سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے میدان میں نکل کر مرزبان کو چیلنج کیا اور اسے قتل کر کے اس کا سامان لے لیا۔ اس کی قیمت تیس ہزار درہم تک پہنچ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے ابوطلحہ کو کہا، ہم مقتول کے مال میں سے خمس نہیں نکالا کرتے تھے، مگر براء نے جو سامان حاصل کیا ہے وہ بہت قیمتی ہے۔ اسی لیے میں اس میں سے خمس نکالنا چاہتا ہوں"۔

یہ حدیث بیہقی نے سنن (۶-۳۱۰) میں عبداللہ بن مبارک از ہشام و حماد بن زید از ایوب از ابن سیرین از انس بن مالک کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ بیہقی نے یہ حدیث قتادہ عن انس رضی اللہ عنہ کی سند کے ساتھ بھی روایت کی ہے۔ طحاوی نے شرح معانی الآثار (۳-۲۲۹) میں یہ حدیث ابن عُیینہ عن ایوب عن ابن سیرین اور مکحول عن انس رضی اللہ عنہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس

نے ذکر کیا ہے کہ (مقتول کا مکمل سامان[1]) قاتل کو دیا جائے گا اور اس میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔

امام مالک اور ان کے ہم مسلک ساتھی کہتے ہیں کہ اسے صرف خمس میں سے حصہ دیا جائے گا۔ امام مالک کے بعض اصحاب نے مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کیا ہے:۔

"وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ" (الانفال۔۴۱) وہ کہتے ہیں کہ مال غنیمت میں سے چار خمس مجاہدین

حدیث میں دلیل حضرت عمرؓ کا یہ قول ہے کہ ہم مقتول کے مال میں سے خمس نہیں نکالا کرتے تھے۔"

حضرت عمرؓ نے حضرت براء کے حاصل کردہ مال میں سے جو خمس نکالا تھا وہ ان کے اجتہاد اور سیاست پر مبنی ہے (شرعی حکم کی بنا پر نہیں) اس لیے کہ وہ مال بہت قیمتی تھا جس کی قیمت تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ جیسا کہ سعید نے اپنے سنن میں بیان کیا ہے۔ اسی لیے یہ بات کہی گئی ہے کہ پہلا مالِ مقتول جس میں سے خمس نکالا گیا وہ براءؓ کا خمس تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عہدِ رسالت، خلافتِ صدیقی اور خلافتِ فاروقی کے اوائل میں مقتول کے مال میں سے خمس نہیں نکالا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا اتباع حضرت عمرؓ کی سیاست و اجتہاد کے اتباع سے بہرحال اولیٰ و افضل ہے۔

جوزجانی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع سب باتوں سے مقدم ہے اور آپؐ کے ارشاد گرامی کی موجودگی میں کسی شخص کا قول حجت نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مقتول کے مال میں سے خمس نکالا جائے۔ امام اوزاعی اور مکحول کا موقف بھی یہی ہے۔ اس لیے کہ آیتِ کریمہ "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ" (الانفال۔۴۱) (اور جو چیز بھی تم مالِ غنیمت میں حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے) میں عموم پایا جاتا ہے۔ امام مالکؒ نے اسی عموم پر عمل کیا ہے، مگر اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ اس درجہ کا ہے کہ اس سے اس عموم کی تخصیص کی جا سکتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے (المغنی ۹-۲۲۲) نیز رسالۃ ابی زید اور اس کی شرح المثمر الدانی ص ۴۱۹)

علماء کے یہاں اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ آیا محض قتل کرنے ہی سے قاتل مقتول کے مال کا مستحق ہو جاتا ہے یا حاکمِ اعلیٰ کی اجازت بھی مطلوب ہے؛ اس کے لیے اگلا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

[1] سَلَب بفتح سین و اللام۔ لڑنے والے کے سامان مثلاً لباس، وغیرہ کو کہتے ہیں۔

امام احمد کے نزدیک سَلَب میں مقتول کی سواری شامل نہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ سَلَب میں صرف مقتول کا اسلحہ شامل ہے اور بس۔ جمہور علماء کے نزدیک قاتل مقتول کے مال کا ہر حالت میں مستحق ہوتا ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ فوج کے کمانڈر نے اس بات کا اعلان کیا ہو کہ مقتول کا مال قاتل کو ملے گا یا نہ کیا ہو۔ اس کے برعکس احناف اور مالکیہ کا موقف یہ ہے کہ قاتل صرف اس صورت میں مقتول کے مال کا مستحق ہو گا جب کہ حکومت نے اس کا اعلان کیا ہو۔ اس سلسلے میں احناف حبیب بن ابی سلمہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ:

"تمھیں تمھارے مقتول کا وہی مال ملے گا جس کی امام اجازت دے۔" یہ حدیث طبرانی نے معجم کبیر اور معجم اوسط میں روایت کی ہے

کے لیے ہوں گے اور یہ جائز نہیں کہ ان کے حصے میں سے کوئی چیز محض احتمال کی بنا پر رکھ لی جائے۔ باقی رہا ہمارا یہ قول کہ شروع شروع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مجاہدین کو خمس میں سے انعامات دیے تھے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دی تھی کہ اپنے اجتہاد کے مطابق خمس میں تصرف فرمائیں۔

مگر یہ حدیث عمرو بن واقد کی وجہ سے معلول ہے۔ یہ حدیث اسحاق بن راہویہ نے بھی روایت کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

اس ضمن میں صحیح مسلک یہ ہے کہ مقتول کا مال ہر حال میں قاتل کو ملتا ہے۔ بجز اس صورت کے کہ دشمن بھاگ جائے۔ امام شافعی اور امام احمد کا موقف یہی ہے۔ اہل علم نے اس کو چار شرطوں کے ساتھ مشروط ٹھہرایا ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ مقتول ان برسرپیکار لوگوں میں سے ہو جن کو قتل کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت، بچے، بوڑھے یا ایسے کمزور آدمی کو قتل کرے جو لڑنے کے قابل نہ ہو تو وہ مقتول کے مال کا مستحق نہیں ہوگا۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مقتول ایسا آدمی ہو جو اپنی قوم کے لیے مفید ہو اور اس سے پہلے کاری زخموں کی وجہ سے اس کا خون نہ بہہ گیا ہو۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ قاتل اسے قتل کرے اور ایسا کاری زخم لگائے جس کی وجہ سے وہ مقتول کے حکم میں شمار ہونے لگے۔

۴۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ اس نے قتل کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا ہو لیکن اگر کسی شخص نے مسلمانوں کی صف میں کھڑے ہو کر تیر مارا جس سے کسی دشمن کی موت واقع ہو گئی تو اس صورت میں اسے مقتول کا مال نہیں ملے گا۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ سلب قاتل کو صرف اس صورت میں ملے گا جب کہ وہ میدان سے نکل کر مقتول کو للکارے اور پھر مقابلہ کر کے اسے قتل کر دے۔ ابن قدامہ نے المغنی (۹-۲۱۹) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

دور جدید کے بعض مصنفین نے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے کہ مقتول کے مال پر قبضہ کرنا لوٹ مار کی ایک قسم ہے جو شریعت میں ممنوع ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے:-

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (آل عمران - ۱۶۱)

اور جو شخص مال غنیمت میں خیانت کرے وہ قیامت کے دن اس چیز کو لائے گا جس میں اس نے خیانت کی۔

ان کی دوسری دلیل جنیوا کے وہ دو معاہدے ہیں جو ۱۹۲۹ء میں طے پائے تھے۔ جن میں فیصلہ کیا گیا کہ تمام لڑنے والوں کی ذاتی چیزوں کا احترام کیا جائے اور لازم ٹھہرایا گیا کہ اگر مقتول کی کوئی چیز میدان جنگ میں کسی کے ہاتھ آئے تو محکمہ اطلاعات کے دفاتر کی معرفت ان کے اہل خانہ کو واپس کر دی جائے۔

اس رائے کے حاملین نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ یہ بین الاقوامی قوانین تو انسانوں کے وضع کردہ ہیں جن میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ ان کی کوئی الہامی یا شرعی بنیاد نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ان کا اتباع لازمی ہو۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اس سے پہلے بین الاقوامی عمل یہ تھا کہ زخمیوں، مقتولوں اور قیدیوں کا جو مال جس فوجی کے ہاتھ لگے گا وہ اس کا مالک ہوگا۔

جب حقیقت یہ ہے تو نہ شرعی احکام کی تاویل کی ضرورت ہے اور نہ ان کو ترک کرنے کی۔ اور وہ بھی صرف ضعیف انسان کے خوف سے جس کو کسی بات پر قرار نہیں۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ انسان کا خالق اس کی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ مذکورہ آیت غزوۂ خیبر اور غزوۂ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح و تفسیر کو غزوۂ حنین تک ملتوی رکھتے۔ جبکہ آپ نے یہ بات بھی اس وقت فرمائی جب جنگ کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور اگر اس سے پہلے آپ نے اس کا حکم دیا ہوتا تو ابو قتادہؓ جو حضورؐ کے شہسوار اور کبار صحابہ میں سے تھے، ضرور اس سے آگاہ ہوتے۔ حالانکہ انھوں نے مقتول کے مال کا مطالبہ اس وقت کیا جب حضورؐ نے یہ اعلان کرنے کا حکم صادر فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کرے اس کا مال اسی کو دیا جائے۔ اگر آپؐ نے پہلے یہ بات فرمائی ہوتی تو اس کے مخفی رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

اس کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کا مال ابو قتادہؓ کو صرف ایک گواہ کی گواہی کی بنیاد پر دے دیا اور اس سے کوئی حلف بھی نہ لیا۔ اگر سَلَب اصل مال غنیمت ہی سے ہوتا تو اس میں سے کوئی حصہ شہادت یا حلف کے اسی اصول کی بنیاد پر نکالا جاتا جس اصول پر کسی ملکیت میں سے حصہ نکالا جاتا ہے۔

ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر مقتول کا مال قاتل کو دینا ضروری ہوتا تو گواہ موجود نہ ہونے کی صورت میں اس کو تقسیم کرنے کے بجائے اسی طرح وقف کر دیا جاتا جس طرح شہادت کی عدم موجودگی کی صورت میں گری پڑی چیز وقف کر دی جاتی ہے اور وہ کسی خاص شخص کو نہیں دی جاتی۔ جبکہ اس کے برعکس مقتول کا مال گواہ کے بغیر بھی قاتل کو دے دیا جاتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ امام اس کو اپنے اجتہاد کے مطابق خمس میں سے نکالتا ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں ہمیں نہیں معلوم کہ حضورؐ نے غزوۂ حُنین کے علاوہ کسی اور غزوہ میں بھی مقتول کا مال قاتل کو دینے کا حکم دیا ہو یا بذاتِ خود آپؐ نے اس پر عمل کیا ہو۔ نہ ہی حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے اس پر عمل کیا ہے۔ ابن المواز کہتے ہیں کہ براءؓ[1] بن مالک کے سوا آپؐ نے کسی قاتل کو نہ تو مقتول کا کل مال دیا اور نہ ہی اس کا خمس۔

عبدالرزاق نے مصنف میں ذکر کیا ہے کہ اکیلے حضرت براءؓ[2] بن مالک نے میدان میں نکل کر ایک سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔

انسان کو دینی احکام دیے ہیں جو اس کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہیں۔

[1] براءؓ بن مالک حضرت انس بن مالک کے حقیقی بھائی تھے۔ بقول واقدی ۲۰ھ میں تُستر کے معرکہ میں بلادِ فارس میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ بعض کے نزدیک ۱۹ھ یا ۲۳ھ میں شہید ہوئے۔ ہُرمزان نے ان کو شہید کیا تھا۔

[2] مصنف عبدالرزاق (۵-۲۳۳) میں معمر سے روایت ہے، وہ ایوب سے اور وہ ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ براءؓ بن مالک پشت کے بل لیٹ کر ترنم سے شعر پڑھ رہے تھے۔ ان کے بھائی انسؓ نے کہا "بھائی! اللہ کا ذکر کرو"۔ براءؓ اٹھ کر سیدھے بیٹھ گئے اور کہنے لگے انسؓ! کیا آپ کا خیال ہے کہ میں اپنے بستر پر جان دوں گا حالانکہ میں نے میدان میں نکل کر ایک سو مشرکین کو جہنم رسید کیا ہے جبکہ وہ لوگ ان کے علاوہ ہیں جن کو میں نے دوسروں کے ساتھ مل کر قتل کیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ بغوی نے یہ روایت صحیح سند کے ساتھ محمد بن سیرین سے بیان کی ہے۔ (الاصابۃ (۱-۱۴۳) ترجمہ براء بن مالک)

دوسروں کے ساتھ مل کر جن کو انھوں نے قتل کیا وہ ان کے علاوہ ہیں۔
امام بخاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ مُعاذ بن عمرو بن الجموح انصاری[۲] اور مُعاذ بن عفراء انصاری[۳] نے غزوۂ بدر میں ابوجہل بن ہشام کو اپنی تلواروں سے قتل کیا اور دونوں نے آکر حضورؐ کو اس کی اطلاع دی۔ آپؐ نے فرمایا، "تم دونوں میں سے کس نے ابوجہل کو قتل کیا؟" دونوں میں سے ہر ایک نے کہا کہ "میں نے اسے قتل کیا ہے۔" آپؐ نے پوچھا، "کیا تم نے اپنی تلواریں صاف کرلی ہیں؟" انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ حضورؐ نے دونوں تلواریں دیکھ کر فرمایا، "تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے۔" پھر آپؐ نے اس کا مال معاذ بن عمرو بن الجموح کو دینے کا حکم دیا۔ بخاریؒ کے علاوہ دیگر کتب حدیث

---

[۱] صحیح بخاری "فرض الخمس" باب "من لم یخمس الاسلاب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۱۴۱) صحیح مسلم (۳-۲-۱۳۷) کتاب "الجهاد والسیر" باب "استحقاق القاتل سلب القتیل"۔
ابوجہل کے قتل کے بارے میں دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے: صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "قتل ابی جهل" (فتح الباری میں احادیث کا نمبر ۳۹۶۱، ۳۹۶۲، ۳۹۶۳، ۳۹۸۸ ہیں) سیرت ابن ہشام مع شرح السہیلی (۵-۱۳۰) "الاکتفاء" للکلاعی (۲-۳۶) البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر (۳-۲۸۷)

[۲] معاذ بن عمرو بن الجموح انصاری خزرجی السلمی نے اپنے والد کے ساتھ بیعت عقبہ میں شرکت کی۔ ان کے والد نے غزوۂ احد میں شہادت پائی۔ غزوۂ بدر میں عکرمہ بن ابی جہل نے معاذ کے بازو پر تلوار کا وار کیا جس سے وہ کٹ گیا مگر تسمہ لگا رہا جس سے ہاتھ لٹک رہا تھا۔ معاذ نے پاؤں کے نیچے دبا کر اسے الگ کر دیا۔ انھوں نے خلافتِ عثمانی میں وفات پائی۔ دیکھیے الاصابۃ (۳-۴۰۹) نیز سیرت ابن ہشام (۱-۳۶۵)

[۳] معاذ بن حارث بن رفاعہ بن حارث بن سواد بن مالک بن غنم بن مالک انصاری خزرجی معروف با بن عفراء۔ عفراء ان کی والدہ کا نام ہے۔ یہ اسی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ یہ بیعت عقبہ میں حاضر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ غزوۂ بدر میں یہ زخمی ہو گئے تھے اور وہیں وفات پائی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بدر کے بعد بھی زندہ رہے۔ حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" میں بھی ان کی وفات کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں لکھی۔ (دیکھیے الاصابۃ (۳-۴۰۸)

[۴] سیرت ابن ہشام میں معاذ بن عفرا انصاری کی جگہ معوذ بن عفرا انصاری بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۶۳۴)

[۵] موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ الکلاعی نے "الاکتفاء" (۲-۳۸) میں اس سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقتولوں کے پاس کھڑے ہو کر ابوجہل کی لاش کو تلاش کرنے لگے۔ جب اس کی لاش نظر نہ آئی تو آپؐ کے "تاثرات کا اظہار چہرۂ مبارک پر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا:
"اے اللہ! اس امت کا فرعون (ابوجہل) قتل ہونے سے رہ نہ جائے۔"
چنانچہ صحابہؓ اس کی لاش کو ڈھونڈھنے لگے۔ اسی دوران حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے دیکھا کہ وہ (ابوجہل) تھوڑے سے فاصلے پر گرا پڑا ہے۔ ——— سیرت ابن ہشام میں مرقوم ہے کہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔

میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ابوجہل گرا ہوا ہے اور اپنی تلوار کے ذریعے لوگوں کو اپنے سے پرے ہٹا رہا ہے۔ حضرت عبداللہؓ نے اس کی گردن پہ پاؤں رکھ کر کہا۔ دشمنِ خدا! کیا اللہ نے تمھیں رسوا نہ کر دیا؟ ابوجہل نے کہا "حقیر ہوا ہے! تم نے بڑی دشوار گھاٹی پر قدم رکھا ہے"۔

پھر عبداللہؓ بن مسعود نے تلوار لے کر ابوجہل پر وار کیا جو بے اثر ثابت ہوا۔ تب ابوجہل کی تلوار لے کر اس کا سر کاٹا اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے وہی تلوار عبداللہؓ بن مسعود کو انعام کے طور پر دے دی۔
سب سے پہلے ابوجہل پہ معاذ بن عمرو بن الجموح نے وار کیا اور اس کا پاؤں کاٹ دیا۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے

"بنی مخزوم کے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہا کرتے تھے کہ ابوجہل نے ان سے کہا" حقیر ہوا ہے! تم نے بڑی دشوار گھاٹی پر قدم رکھا ہے"۔

عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں "پھر میں ابوجہل کا سر کاٹ کر حضورؐ کی خدمت میں لایا"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ابن مسعودؓ نے کہا۔ دشمنِ خدا! کیا اللہ نے تجھے رسوا نہ کر دیا، ابوجہل نے کہا،

"مجھے کس طرح رسوا کیا؟ تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تو کیا ہوا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ آج فتح یاب کون ہوا؟"

میں نے کہا۔ "اللہ اور اس کا رسول"۔

مصنّف نے اس حدیث سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ مقتول کا مال امام کی رائے کے تابع ہے اور وہ جسے چاہے دے دے، چنانچہ اگر مقتول کا مال قاتل کا حق ہوتا تو آپؐ اسے معوّذ اور معاذ دونوں میں تقسیم کر دیتے۔ کیونکہ ان دونوں نے ابوجہل کو قتل کیا تھا۔

امام طحاوی نے "شرح معانی الآثار" (۳ - ۲۲۷) میں بھی اس حدیث کو حجت کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔
آپ دیکھتے نہیں کہ اس حدیث کے مطابق حضورؐ نے ان سے فرمایا "تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے۔" اس کے باوجود آپ نے مقتول کا مال ایک ہی کو دیا اور دوسرے کو اس میں سے کچھ نہیں دیا اور اگر مقتول کا مال قاتل کو دینا اس لیے ضروری ہوتا کہ اس نے قتل کیا ہے تو آپؐ ابوجہل کے دونوں قاتلوں کو اس کا مال عطا کرتے۔

جمہور نے اس حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ اس کے سیاق و سباق سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتول کے مال کا مستحق وہ ہوتا ہے جو پہلے اس کا خون بہاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی دوسرا شخص قتل میں اس کے ساتھ شریک بھی ہو جائے تو وہ سلب کا مستحق نہیں ہوتا۔

مہلّب کہتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تلواروں کو بنظرِ غائر دیکھا تاکہ معلوم ہو کہ ان میں سے ہر ایک کی تلوار کس حد تک خون سے لتھڑی ہوتی ہے اور وہ مقتول کے جسم میں کس حد تک داخل ہوئی ہے۔ اس جائزے سے آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ مقتول کا مال اس کو دیا جائے جس کی تلوار قتل میں زیادہ مؤثر ثابت ہوئی ہو۔ اسی لیے آپؐ نے پہلے ان سے سوال کیا تھا کہ تم نے اپنی تلواروں کو صاف کر لیا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اگر انھوں نے تلواروں کو پونچھ لیا ہوتا تو آپ کا مقصد

مُعاذ پر وار کیا اور ان کا بازو جُدا کر دیا۔ اس کے بعد مُعوّذ بن عفراءؓ نے ابوجہل پر حملہ کر کے اسے اس حال میں چھوڑا کہ اس میں کچھ جان باقی تھی۔ اس کے بعد ابن مسعودؓ ابوجہل کے پاس پہنچے اور اس کا سرتن سے جدا کر دیا۔

پورا نہ ہوتا۔ باقی رہا حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی کہ "تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے۔" تو وہ اس لیے تھا کہ دونوں کا دل خوش ہو جائے۔ ورنہ قتل کا آغاز کرنے والا تو ایک ہی تھا۔ فتح الباری (۶-۲۴۸)

اکثر و بیشتر احادیث جو اس ضمن میں روایت کی گئی ہیں ان سے جمہور کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ ان میں سے چند احادیث قبل ازیں نقل کی جا چکی ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث وہ بھی ہے جس کو حافظ زیلعی نے نصب الرایہ (۳-۴۲۸) میں اور ابن تیمیہؒ نے المنتقٰی میں (دیکھیے المنتقٰی سے نیل الاوطار (۸-۱۰۸) میں اور ابن حزم نے المحلّٰی (۷-۳۴۵) میں نقل کیا ہے۔

لہ مُعوّذ بن عفراء، معاذ بن عفراء کا بھائی ہے۔ معوّذ نے بدر میں شرکت کی اور شہادت سے سرفراز ہوئے۔ ابن الاثیر اسد الغابۃ (۴-۴۰۲) میں لکھتے ہیں کہ مُعوّذ وہی ہے جس نے غزوۂ بدر میں ابوجہل کو جہنّم رسید کیا اور بعد میں لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

مسلمانوں کے ان اموال کا حکم، جو مشرکین کے قبضہ میں ہوں۔ جب کہ مسلمان غلبہ حاصل کر لیں اور وہ مشرک مسلمان ہو جائیں۔

صحیح بخاری[1] میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ایک گھوڑا کہیں نکل گیا جسے دشمن نے پکڑ لیا۔ پھر مسلمان اس دشمن پر غالب آ گئے۔ تو یہ گھوڑا عہدِ رسالت میں ہی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو واپس کر دیا گیا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجھاد باب "اذا غنم المسلمون مال المسلم" بروایت ابن نُمیر از عبیداللہ از نافع از ابن عمر (فتح الباری حدیث نمبر ۳۰۶۷) صحیح بخاری میں ایک دوسری حدیث بروایت یحییٰ القطان عن عبیداللہ منقول ہے۔ اس میں ہے کہ گھوڑے اور غلام کے گم ہونے کے دونوں واقعات عہدِ رسالت کے بعد پیش آئے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۰۶۸)

صحیح بخاری میں تیسری روایت موسیٰ بن عقبہ سے منقول ہے، وہ نافع سے روایت کرتے ہیں کہ گھوڑے کے بھاگ جانے کا واقعہ خلافتِ صدیقی میں پیش آیا (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۰۶۹)

حافظ ابن حجر فتح الباری (۶-۳۱۸) میں لکھتے ہیں کہ اسماعیل بن زکریا کی ایک روایت ہے جس کو اسماعیل نے ابن المبارک عن عبیداللہ کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس روایت میں اس واقعہ کا زمانہ متعین نہیں کیا گیا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبیداللہ کی روایت ابن نُمیر کی روایت کے بالکل مطابق ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس لیے کہ ابن نُمیر کی روایت میں دونوں واقعات کا زمانہ متعین کیا گیا ہے۔ ایک واقعہ عہدِ رسالت میں پیش آیا اور دوسرا خلافتِ صدیقی میں۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اسی اختلاف کے پیش نظر امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں جزم و وثوق سے کام نہیں لیا اس لیے کہ اس حدیث کے راوی خود اس شک میں مبتلا ہیں کہ آیا یہ حدیث مرفوع ہے یا موقوف۔ اسی طرح نیل الاوطار (ج ۷، ص ۱۲۹) میں امام شوکانی لکھتے ہیں:

"اس مسئلہ میں اہل علم میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ امام شافعی اور اہلِ علم کی ایک جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حربی کافر اگر مسلمانوں پر غالب آ کر ان کی کسی چیز پر قبضہ کر لیں تو وہ چیز ان کی ملکیت نہیں ہو سکتی، بلکہ جب بھی ممکن ہو اس چیز کا مالک اس کو اپنی ملکیت میں لے سکتا ہے۔ خواہ کفار اس کو تقسیم کر چکے ہوں یا نہیں۔ حضرت علیؓ، زہری، عمرو بن دینار اور حسن کہتے ہیں کہ وہ چیز اصل مالک کو واپس نہیں کی جا سکتی، بلکہ وہ اہلِ غنیمت کے لیے مخصوص ہوگی۔ عمر، سلمان بن ربیع عطاء، لیث، امام مالک، امام احمد اور ابن ابی الزناد کی ایک روایت کے مطابق حسن اور "فقہاء سبعۃ" کی رائے یہ ہے کہ اگر چیز کے اصل مالک (مسلمان) کو وہ چیز تقسیم سے پہلے مل جائے تو اس پر اس کا حق مقدم ہے لیکن اگر وہ تقسیم

اسی طرح حضرت عبداللہ رضؓ کا ایک غلام روم کی طرف بھاگ گیا تھا۔ جب مسلمانوں کو وہاں غلبہ حاصل ہوا تو حضرت خالد بن ولید رضؓ نے حضرت ابوبکر رضؓ کے دورِ خلافت میں یہ غلام آپؓ کو واپس کر دیا۔

"المدونة" ، "الواضحہ" اور دوسری کتابوں میں ہے کہ ایک مسلمان نے اپنا اونٹ مالِ غنیمت میں دیکھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا "اگر یہ اونٹ ابھی مالِ غنیمت میں تقسیم نہ ہوا ہو تو اسے لے لو۔ اور اگر تقسیم ہو چکا ہو تو تم چاہو تو اس کو خریدنے کے دوسروں سے زیادہ مستحق ہو۔

کے بعد ملے تو وہ اس کو صرف قیمت ادا کر کے خرید سکتا ہے۔ انھوں نے حضرت ابن عباس رضؓ کی مرفوع حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں یہ تفصیل موجود ہے اور جس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ مگر اس کی سند نہایت ضعیف ہے۔ بادویہ نے بھی یہ تفصیل بیان کی ہے، امام ابو حنیفہ کی رائے بھی اس ضمن میں امام مالک کے ساتھ ہے، البتہ بھاگنے والے غلام کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ ہر حالت میں اس کا آقا ہی اس کا حق دار ہے۔ امام ثوری کا مسلک بھی یہی ہے۔" (نیل الاوطار ۷ - ۱۲۹)

لہ المدونہ (۲ - ۱۴) بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

اس سے ملتی جلتی ایک حدیث مجھے معجم الطبرانی میں ملی ہے۔ طبرانی اس حدیث کو یاسین الزیات سے روایت کرتے ہیں۔ وہ سماک بن حرب سے وہ تمیم بن طرفہ سے اور وہ جابر بن سمرہ سے، انھوں نے کہا کہ دشمن نے ہو سُلیمان کے ایک شخص کی اونٹنی پکڑ لی جسے مسلمانوں میں سے ایک شخص نے خرید لیا۔ اونٹنی کے مالک نے اپنی اونٹنی پہچان لی اور حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو قیمت اس شخص نے دی ہے وہ اس کو ادا کر کے اپنی اونٹنی لے لو اور اس شخص کو یہ ہدایت فرمائی کہ اونٹنی اور اس کے مالک کے درمیان حائل نہ ہو۔

ابو داؤد نے یہ حدیث مرسل روایات میں تمیم بن طرفہ سے روایت کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ کسی شخص کے پاس میں نے اپنی اونٹنی دیکھی۔ ہم نے یہ مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش کیا۔ میں نے گواہ پیش کیا کہ یہ میری اونٹنی ہے۔ دوسرے نے شہادت پیش کی کہ اس نے یہ اونٹنی دشمن سے خریدی ہے۔ حضور نے فرمایا "اگر تم چاہو تو اس شخص کو قیمت ادا کر کے اپنی اونٹنی لے لو ورنہ یہ اونٹنی اس کے پاس رہنے دو۔"

اس حدیث کو عبدالحق نے "الاحکام" میں ابو داؤد کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ پھر کہتے ہیں "یہ حدیث یاسین الزیات نے سماک بن حرب از تمیم بن طرفہ اور جابر بن سمرہ رضؓ کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کی ہے، مگر الزیات ضعیف راوی ہے" اور یہی بات ابن القطان نے بھی اپنی کتاب میں کہی ہے۔ (نصب الرایۃ ۳ - ۴۳۴)

بیہقی نے یہ حدیث سنن (۹ - ۱۱۱) میں الحسن بن عمارہ سے روایت کی ہے، لیکن حسن متروک راوی ہے اور اس کی روایت حجت نہیں ہوتی۔ بیہقی کہتے ہیں یہ حدیث مسلمہ بن علی الخشنی نے عبدالملک سے روایت کی ہے اور وہ بھی ضعیف راوی ہے۔ یہ حدیث ایک اور سند کے ساتھ بھی مروی ہے جس میں ایک مجہول راوی عبدالملک سے روایت کرتا ہے، مگر یہ روایت بھی صحیح نہیں۔

صحیح بخاری[1]، صحیح مسلم[2] اور ابوداؤد[3] میں ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کہاں قیام فرمائیں گے ؟ آپؐ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا بھی ہے ؟
صحیح بخاری[4] میں اس طرح کی روایت بھی ہے کہ اسامہ بن زیدؓ نے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی "یا رسول اللہ! آپؐ کل کہاں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ؟ آپؐ نے فرمایا" کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا بھی ہے" ؟ پھر آپؐ نے فرمایا" ہم کل بنی کنانہ کی وادی المحصب میں قیام کریں گے جہاں قریش نے کفر پر قائم رہنے کی قسم کھائی تھی"۔
کفر پر قسم کھانے کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جس میں بنو کنانہ بنی ہاشم کے خلاف قریش کے حلیف بن گئے تھے اور انھوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ بنی ہاشم کے ساتھ نہ تو خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کریں گے اور نہ ہی ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کریں گے۔
یونسؒ نے اپنی روایت میں حجۃ الوداع یا فتح مکہ کا ذکر نہیں کیا۔[5]

مجمع الزوائد (۴-۳۰) میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا جس شخص نے اپنے مال کو مالِ غنیمت میں تقسیم سے پہلے پایا تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اور جس نے تقسیم کے بعد پایا تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔ الہیثمی کہتے ہیں اس کو طبرانی نے المعجم الاوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں یاسین زیات نامی راوی ضعیف ہے۔

[1] صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب" این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الرایۃ یوم الفتح" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۲۸۲)

[2] صحیح مسلم (۲-۹۸۴) کتاب "الحج" باب" نزول الحاج مکۃ وتوریث دورھا"

[3] ابوداؤد (۳-۱۲۵) فی الفرائض باب" ھل یرث المسلم الکافر"

[4] صحیح بخاری کتاب "الجھاد" باب" اسلم قوم فی دار الحرب ولھم مال وارض فھی لھم (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۰۵۸)

[5] صحیح بخاری کتاب" الحج" باب" توریث دور وبیعھا وشرائھا" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۱۵۸۸) میں یونس، ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں جس میں ہے کہ عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر یا حویلی چھوڑی بھی ہے ؟ اصل واقعہ یوں ہے کہ عقیل اور طالب جناب ابوطالب کے وارث بنے تھے لیکن حضرت علیؓ اور جعفرؓ کو وراثت میں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں مشرف باسلام ہو چکے تھے، جب کہ اس وقت تک عقیل اور طالب نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب فرمایا کرتے تھے "مومن، کافر کا وارث نہیں ہو سکتا"۔
ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ وہ مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور خدا
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑے وہ اور جنھوں نے

ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو عقیل بن ابی طالب نے حضور کی پوری جائداد پر قبضہ کر لیا اور جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو یہ سب جائداد ان کے قبضے میں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا تھا کہ اسلام لانے وقت جو چیز کسی کے قبضے میں ہو وہ چیز اسی کی ملکیت ہوگی۔ (اس طرح وہ جائداد حضرت عقیل ہی کے قبضے میں رہی)۔

وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ (الانفال - ۷۲) — ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

یونس ابن یزید نے زہری سے روایت کرتے ہوئے حجۃ الوداع یا فتح مکہ کا ذکر نہیں کیا، البتہ زہری سے روایت کرتے ہوئے "المغازی" میں جس نے "فتح مکہ" کا ذکر کیا ہے وہ محمد بن ابو حفصہ ہیں اور امام زہری ہی سے روایت کرتے ہوئے کتاب الجہاد میں "حجۃ الوداع" کا جس نے ذکر کیا ہے وہ معمر ہیں۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۸ - ۱۵) میں کہتے ہیں کہ معمر محمد بن ابی حفصہ کی نسبت زیادہ ثقہ اور قابل اعتماد ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ایک دوسری روایت سے بھی معمر کی تائید ہوتی ہے، جس کو اوزاعی، زہری سے نقل کرتے ہیں۔ دیکھیے صحیح بخاری کتاب "الحج" باب نزول النبی صلی اللہ علیہ وسلم (فتح الباری میں حدیث نمبر ۱۵۹۰) بہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"حضور عید الاضحیٰ کے روز جب منیٰ میں تھے تو آپؐ نے فرمایا: ہم کل بنی کنانہ کی وادی میں قیام کریں گے جہاں قریش اور بنی کنانہ نے بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کی مخالفت میں حلف اٹھایا تھا کہ بنی ہاشم کے ساتھ اس وقت تک نہ شادی بیاہ کیا جائے اور نہ ہی خرید و فروخت کا معاملہ جب تک وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے سپرد نہ کردیں۔"

لہ حدیث کے اس حصے کو ابو یعلیٰ اور ابن عدی نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے:۔ المطالب العالیۃ لابن حجر (۲ - ۱۸۲) التلخیص الحبیر (۳ - ۱۷۰) سنن بیہقی (۹ - ۱۱۳) الہیثمی مجمع الزوائد (۵ - ۳۳۶) میں کہتے ہیں کہ اس کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس میں یاسین بن معاذ الزیات نامی راوی متروک ہے۔

ابو یعلیٰ کی سند کے ضعیف ہونے کے باوجود اس حدیث کے مفہوم کی تائید دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً امام احمد مسند (۴ - ۳۱۰) میں ابان بن عبد اللہ البجلی سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے چچاؤں نے اپنے دادا صخر بن عَیلَہ سے سن کر بتایا کہ جب اسلام کا آغاز ہوا تو بنو سُلیم کی ایک جماعت اپنی اراضی وغیرہ چھوڑ کر بھاگ گئی۔ میں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں بنو سُلیم مسلمان ہو گئے اور زمین کا مقدمہ رسول کریمؐ کی عدالت میں پیش کیا۔ آپؐ نے یہ اراضی ان کو واپس دلا دی اور ارشاد فرمایا کہ "جب کوئی شخص اسلام لے آئے تو وہ اپنی اراضی اور مال کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔"

الخطابی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ عقیل نے عبدالمطلب کے مکانات فروخت کر دیے تھے۔ اس لیے کہ انھوں نے یہ مکانات اپنے والد سے ورثہ میں پائے تھے اور حضرت علیؓ اپنے والد کی وفات سے پہلے اسلام لانے کی وجہ سے ورثہ سے محروم رہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی مُورث نہ تھا کیونکہ آپؐ کے والد عبداللہ اپنے والد (عبدالمطلب) کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے۔ اسی طرح عبدالمطلب کی اولاد میں سے اکثر و بیشتر وفات پا چکے تھے۔ اور ان کا جانشین کوئی نہ تھا۔ اس لیے تمام جائداد ابو طالب کے قبضہ میں آئی اور ان کی وفات کے بعد عقیل ان کے وارث قرار پائے۔

قریشِ مکہ کا معمول تھا کہ جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ ہجرت کر جاتا وہ اس کی اراضی اور مکانات کو فروخت کر دیا کرتے تھے۔

صحیح بخاری[1] میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ ریشمی کپڑے[2] تحفہ کے طور پر بھیجے گئے جن پر سونے کی کڑھائی کی ہوئی تھی۔ آپؐ نے ان کو صحابہ میں تقسیم کر دیا اور ایک کوٹ مخرمہ[3] بن نوفل کے لیے رکھ لیا۔ مخرمہ آپؐ کی خدمت میں

ابوداؤد نے یہ حدیث سنن ابوداؤد (۳-۱۷۶) کتاب "الخراج" باب "اقطاع الارضین" میں روایت کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے عمرؓ بن الخطاب ابوحفص نے بتایا کہ انھوں نے الفریابی سے انھوں نے ابان بن عبداللہ بن ابی حازم سے انھوں نے عثمان بن ابی حازم سے انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے اپنے دادا صخر سے یہ روایت پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے

لیکن المنذری نے ابان بن عبداللہ بن ابی حازم پر نقد و جرح کی ہے، چنانچہ وہ مختصر ابی داؤد (۴-۲۶۳) میں لکھتے ہیں:

"اس حدیث کی سند میں ابان بن عبداللہ بن ابی حازم ہے۔ اس کو یحییٰ بن معین نے ثقہ قرار دیا ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ "صدوق" اور "صالح الحدیث" ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی روایات قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابو حاتم بن حبان البُستی کہتے ہیں کہ ابان سے بڑی فاش غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ وہ منکر احادیث روایت کرنے میں منفرد ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ ابن خزیمہ اور حاکم نے اپنی اپنی صحیح میں اَبان کی مرویات نقل کی ہیں اور امام احمد کے بارے میں روایت ہے کہ العجلی اور ابن نُمیر کی طرح انھوں نے بھی اَبان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

[1] صحیح بخاری کتاب "الخمس" باب "قسمۃ الامام ما یقدم علیہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۱۲۷) حماد بن زید عن ایوب عن عبداللہ بن ابی مُلیکہ کی سند کے ساتھ۔ نیز کتاب "الادب" باب "المداراۃ مع الناس" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۱۳۲) عن ابن مُلیکہ عن ایوب۔ الفاظ وہی ہیں۔

[2] متن میں لفظ "اقبیۃ" استعمال ہوا ہے جس کا واحد قباء ہے۔ اس کا مطلب ہے کوٹ یا جبہ وغیرہ۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۱۰-۲۶۹) میں لکھتے ہیں کہ ابو عبید اور دیگر اہلِ لغت نے اسی کا اظہار کیا ہے۔ ابن فارس کہتے ہیں کہ چھوٹے بچے کی قمیص کو قباء کہتے ہیں۔ القرطبی کہتے ہیں قبا تنگ آستین والے کپڑے کو کہتے ہیں۔ اس میں پچھلی جانب درمیان میں کوٹ کی طرح کا شق ہوتا ہے۔ اس کپڑے کو سفر اور جنگ میں پہنا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں حرکت کرنا آسان ہوتا ہے۔

[3] مخرمہ بن نوفل رؤسائے قریش میں سے تھے۔ یہ ماہر انساب تھے۔ فتح مکہ کے روز اسلام لائے۔ یہ مؤلفۃ القلوب میں سے

حاضر ہوئے تو ان کے ہمراہ ان کے صاحبزادے مسورؓ بھی تھے۔ مخرمہ آکر دروازے پر ٹھہر گئے اور اپنے بیٹے سے کہا کہ "حضورؐ کو آواز دو"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آواز سنی تو ازار پہنے باہر نکلے اور فرمایا: "ابو مسورؓ! میں نے یہ کوٹ تمہارے لیے چھپا رکھا تھا۔ میں نے یہ کوٹ تمہارے لیے چھپا رکھا تھا۔" یہ جملہ حضورؐ نے مکرر فرمایا۔

نسائی نے کتاب الاسماء والکنیٰ[2] میں ذکر کیا ہے کہ مخرمہؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارش کی۔

تھے۔ انھوں نے غزوہ حنین میں شرکت کی تھی۔

ابن الاثیرؒ نے "اسد الغابۃ" میں ان کا نسب اس طرح لکھا ہے:

"مخرمہ بن نوفل بن اہیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مرّہ القرشی الزہری"

مخرمہ نے ۵۴ھ میں وفات پائی۔

[1] صحیح بخاری کتاب "اللباس" باب "المزرّر بالذہب" اس روایت میں یہ صراحت موجود ہے کہ مسورؓ نے اپنے والد پہ اعتراض کرنے کے بعد حضورؐ کو بلایا تھا۔ مسورؓ نے اپنے والد سے کہا تھا۔ میں آپ کے لیے حضورؐ کو بلاؤں؟ والد نے اس کے جواب میں کہا: "میرے بیٹے! رسول کریمؐ سرکش اور مغرور شخص نہیں ہیں۔"

[2] مجھے نسائی کی "الاسماء والکنیٰ" کا سراغ نہیں مل سکا۔

خلاصۂ بحث یہ کہ دشمن مسلمانوں کے مال پر قبضہ کرلے۔ بعدازاں اہل اسلام اپنے دشمنوں پر غالب آجائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص ٹھیک اپنی کوئی چیز دشمن کے پاس پہچان لے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں آئے گا یا نہیں، اور وہ شخص اپنی پہچانی ہوئی چیز لینے کا مجاز ہے یا نہیں؟

امام شافعیؒ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ حربی کفار کو مسلمانوں کے مال پر قابض ہونے سے اس کا مالک قرار نہیں دیا جاسکتا اور جس شخص کا وہ مال ہو وہ تقسیم غنیمت سے پہلے بھی اس کے لینے کا مجاز ہے اور اس کے بعد بھی۔

اس کے برعکس حضرت علیؓ، زہریؒ، عمرو بن دینار، حسن اور مالکیہ میں سے ابن القاسم کہتے ہیں کہ یہ مال کسی صورت میں بھی اس کے مالکوں کو نہیں دیا جائے گا، بلکہ یہ مجاہدین کی ملکیت ہوگا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اگر مالِ غنیمت کی تقسیم سے قبل مالک اپنی چیز پہچان لے تو وہی اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے اور اگر مالِ غنیمت تقسیم ہوچکا ہو تو وہ اپنی چیز نہیں لے سکتا، البتہ وہ اس کی قیمت لینے کا مجاز ہے۔ امام مالکؒ اور احمدؒ کی رائے یہی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور فقہائے سبعہ سے بھی یہی بات منقول ہے۔

یہ قول تیسرے قول سے ملتا جلتا ہے اس میں صرف اتنا فرق ہے کہ بھاگے ہوئے غلام کا مالک مطلقاً اس کا زیادہ حقدار ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے بھی یہی بات منقول ہے۔

ائمہ کرام کے درمیان یہ اختلاف دراصل ملکیت کا ثبوت بہم پہنچنے یا نہ پہنچنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جس امام کے نزدیک مسلمانوں کے مال میں کفار کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے اس کی رائے میں یہ بھی درست ہے کہ جب اہلِ اسلام اس مال پر قابض ہوجائیں تو وہ اسے تقسیم بھی کر

جو کپڑے آپ نے تقسیم کیے تھے ان میں سے میرا حصّہ کہاں ہے ؟ حضورؐ نے فرمایا" ابو صفوان ! یہ کوٹ میں نے تمھارے لیے چھپا رکھا ہے" مخرمہ نے کوٹ لے لیا اور کہا "آپ صلہ رحمی سے کام لیتے ہیں"۔

سکتے ہیں اور اس میں تصرف کرنے کے بھی مجاز ہیں، بشرطیکہ ان کو کسی چیز کے مالک کا پتہ نہ ہو۔ نیز یہ کہ کافر جب مشرف باسلام ہو جائے اور وہ مال اس کے قبضے میں ہو تو وہی اس کا زیادہ مستحق ہے۔ بخلاف ازیں جس شخص کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کافر اس چیز کا مالک نہیں ہوتا اس کے نزدیک معاملہ اس کے برعکس ہے۔

دلائل کے موازنہ سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ دورانِ جنگ غیر مسلم مسلمانوں کے مال پر قابض ہو جائیں تو وہ اس کے مالک ٹھہریں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مسلمان کفار کے مال پر قابض ہونے کی صورت میں اس کے مالک قرار پاتے ہیں، البتہ اگر کسی مسلمان کا مال تقسیم سے قبل مِل جائے تو اس کا مالک وہ مسلم ہی ہو گا۔ مالِ غنیمت تقسیم ہو جانے کی صورت میں امیرالمومنین غنیمت کے خُمس میں سے اس مسلم کو اس چیز کی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کو اپنی چیز پر ملکیت کا اولین حق حاصل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تفصیلی دلائل کے لیے دیکھیے :- آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی (ص ۶۱۳ تا ۶۲۲)

ذمی یا حربی کافر کا تحفہ قبول کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

ابنِ سحنون نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان[1]، دِحیہ[2]، مقوقس[3] اور

---

[1] اس باب کے آخر میں ابوسفیان کے تحفے کا ذکر آرہا ہے۔

[2] دِحیہ بن خلیفہ بن فروہ مشہور صحابی تھے۔ قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق تھا۔ حسن صورت میں ضرب المثل کی حد تک مشہور تھے۔ جبریل امین ان کی صورت میں حضورؐ کے پاس آتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیر بنا کر ان کو قیصر روم کے پاس بھیجا تھا۔ امیر معاویہ کے دورِ خلافت تک زندہ رہے۔ دیکھیے الاصابۃ (۱-۴۷۳) اور المعارف لابن قتیبہ (۳۱۹)

طبرانی نے المعجم الکبیر میں روایت کی ہے کہ دحیہ نے ہدیہ کے طور پر حضورؐ کو سفید رنگ کا ایک خچر دیا تھا۔ الہیثمی "مجمع الزوائد" (۴-۱۵۳) میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ نامی راوی متروک الحدیث ہے۔

[3] مقوقس کا نام جریج بن مینا ہے۔ سہیلی نے "الروض الانف" (۲-۱۷۵) میں اور ابن کثیر نے "البدایۃ والنہایۃ" (۴-۲۷۵) میں یہ نام پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے۔ "الاصابۃ" (۴-۲-۵) میں حافظ ابن حجر مقوقس کا مفصل تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مقوقس لقب ہے۔ اس کا نام جریج بن مینا بن قرقوب ہے۔ بعض مینا کا ذکر نہیں کرتے جیسا کہ ابو عمرو الکندی نے امراءِ مصر میں پورے یقین کے ساتھ لکھا ہے مقوقس بن قرقوب رومی بادشاہ کی طرف سے مصر میں قبطیوں کا رئیس تھا۔ محدث ابن مندہ نے اس کو صحابہ میں شمار کیا ہے اور اس کی بیان کردہ ایک حدیث کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ حسین بن الاسواری عن مندل بن علی عن محمد بن اسحاق عن زہری عن عبداللہ کی سند کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے مقوقس نے بتایا کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شیشے کا ایک پیالہ تحفے کے طور پر پیش کیا جس میں آپؐ پانی پیا کرتے تھے۔ اس حدیث کو اسماعیل بن عمرو نے مندل سے اس کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے: وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مقوقس نے آپ کی خدمت میں شیشے کا پیالہ تحفے کے طور پر دیا۔"

الہیثمی کہتے ہیں: مندل بن علی نامی راوی ضعیف ہے۔ اس حدیث کو البزار نے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی تائید میں دوسری روایات بھی موجود ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت کہ اسکندریہ کے حاکم مقوقس نے حضورؐ کی خدمت میں شامی لکڑی کی ایک سرمے دانی، ایک شیشہ اور ایک کنگھی تحفے کے طور پر بھیجی۔ طبرانی نے یہ روایت المعجم الاوسط میں نقل کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ یہ حدیث حنظلہ بن الربیع کاتب سے بھی مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقوقس نے حضورؐ

اُکَیدِر سے ہدیہ قبول کیا۔ اور ان میں سے بعض کو ہدیہ دیا بھی۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے شخص

کی خدمت میں سفید کھجور تحفے کے طور پر پیش کیا۔ یہ روایت طبرانی نے المعجم الکبیر میں نقل کی ہے، مگر اس کی سند میں زکریا بن یحییٰ الکسائی نہایت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۴- ۱۵۲ - ۱۵۳)

ان تائیدی روایات کی کثرت کی بنا پر یہ حدیث حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ حدیث ابونعیم اور اس سے پہلے ابن قانع نے بھی روایت کی ہے۔ ابن الاثیر نے مقوقس کو صحابہ میں شمار کرنے پر نکیر کی ہے تو وہ لکھتے ہیں:

"صحابہ کے ساتھ مقوقس کو کچھ نسبت نہیں کیونکہ اس نے تو اسلام ہی قبول نہیں کیا تھا بلکہ وہ بدستور نصرانی رہا اور اسی کے زمانہ میں حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمانوں نے مصر فتح کیا۔ اس لیے اس کو صحابہ میں ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

لہ "اُکَیدِر" اَکدر کی تصغیر ہے۔ یہ دُوْمہ (بضم الدال وسکون الواو) کا بادشاہ تھا۔ دومہ حجاز اور شام کے درمیان ایک شہر کا نام ہے۔ اس کو دومۃ الجندل کہتے ہیں۔ یہ تبوک کے قریب واقع ہے اور اُکیدر اس کا بادشاہ تھا۔

"اُکیدر کا تعارف حسب ذیل ہے:

"اُکیدر بن عبدالملک بن عبدالجن بن اعیا بن حارث بن معاویہ۔ کندہ کی طرف منسوب ہے اور یہ نصرانی تھا۔ اس باب کے آخر میں اس کا مزید تذکرہ آئے گا۔

"اُکیدر کا ہدیہ قبول کرنے سے متعلق حدیث امام بخاری نے صحیح بخاری کتاب "الھبۃ" باب "قبول الھدیۃ من المشرکین" میں نقل کی ہے۔ (فتح الباری حدیث نمبر ۲۶۱۵) یہ حدیث حضرت قتادہ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ریشمی جُبّہ ہدیہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ چونکہ حضور ریشمی لباس سے منع فرماتے تھے اس لیے لوگوں کو اس تحفے پر تعجب ہوا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، سعد بن معاذؓ کے رومال جنت میں اس سے زیادہ خوب صورت ہوں گے۔"

امام بخاریؒ فرماتے ہیں: "سعید قتادہؓ سے اور وہ انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ دُومۃ الجندل کے بادشاہ اُکیدر نے یہ جُبّہ ہدیہ کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔"

اسی طرح امام مسلم نے اپنی صحیح (۳- ۱۶۴۵) کتاب "اللباس" باب "تحریم استعمال الذھب" میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ اکیدر نے آپ کی خدمت میں ایک ریشمی کپڑا پیش کیا۔ آپ نے وہ کپڑا حضرت علیؓ کو دے کر کہا: "یہ کپڑا خواتین میں تقسیم کر دیجیے کہ وہ ان سے دوپٹے بنالیں۔"

حضرت علیؓ ہی سے ایک دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ریشمی لبادہ ہدیہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ آپ نے وہ میری طرف بھیج دیا۔ میں نے اسے پہن لیا۔ پھر میں نے حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی کے آثار دیکھے۔ آپؐ نے فرمایا: "میں نے یہ کپڑا اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تم اسے پہنو۔ میں نے تو اس لیے بھیجا تھا کہ تم یہ عورتوں کو دے دو تاکہ وہ اس سے اپنے دوپٹے بنالیں۔"

عیاضؓ المجاشعی کا ہدیہ قبول نہیں کیا تھا۔

مُقوقس نے آپؐ کی خدمت میں ماریہؓ ام ابراہیمؓ اور سیرینؓ (دو لونڈیاں) سفید رنگ کا ایک خچر اور ایک گدھا ہدیہ کے طور پر بھیجا تھا۔

۱؎ عیاض المجاشعی: ابن قتیبہ کتاب المعارف (ص ۳۳۷) میں عیاض المجاشعی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عیاض المجاشعی سے مراد عیاض بن حمار بن ابی حمار بن ناجیہ بن عقال الدارمی ہے۔ اسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک تحفہ بھیجا تھا، مگر حضورؐ نے اسے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ میں مشرکین کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔"

اس باب کے آخر میں اس حدیث کی تخریج ملاحظہ فرمایئے۔

۲؎ طبقات ابن سعد میں عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی صَعْصَعہ کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ انھوں نے کہا۔ اسکندریہ کے حاکم مُقوقس نے ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ماریہؓ اور ان کی بہن سیرینؓ، ایک ہزار مثقال سونا، بیس نرم نرم کپڑے دلدل نامی خچر، عُفَیر یا یعفور نامی گدھا اور مابور نامی ایک نہایت بوڑھا خصی غلام ہدیہ کے طور پر بھیجا۔ مابور ماریہؓ کا بھائی تھا میں کہتا ہوں کہ یہی غلام تھا جس کے بارے میں ماریہؓ پر تہمت لگائی گئی تھی اور حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اسے قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ اس کا تو آلۂ تناسل ہی کٹا ہوا ہے۔ اس حدیث کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

۳؎ ماریہ بنت شمعون ماریہؓ قبطیہ کے نام سے معروف تھیں۔ آپ نہایت حسین وجمیل تھیں۔ ان کے بال گھنگھریالے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں "عالیہ" میں رکھا۔ وہ آپ سے حاملہ ہوئیں اور ذوالحجہ ۸ھ میں ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زندہ رہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے دورِ خلافت میں اور آپؓ کے بعد حضرت عمرؓ ان کے نان ونفقہ کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا انتقال حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ہوا۔ واقدی کہتے ہیں کہ انھوں نے محرم ۱۶ھ میں وفات پائی۔ دیکھیے "الاصابۃ" (۴۔ ۳۹۱) "اسد الغابۃ" (۴۔ ۵۴۳)

۴؎ ابراہیم بن المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ماریہؓ قبطیہ کے بطن سے ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے۔ واقدی کہتے ہیں کہ اٹھارہ ماہ کی عمر میں انھوں نے وفات پائی۔ جب کہ محمد بن مُؤمل المخزومی سولہ ماہ آٹھ دن بتاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی وفات سے غم زدہ ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا "آنکھیں اشک بار ہیں، دل غمگین ہے اور ہم وہی بات کہتے ہیں جسے ہمارا رب پسند کرتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ابراہیم! ہم تیری وفات سے غمگین ہیں۔" ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "ابراہیم کے لیے جنت میں ایک عالی شان محل ہے۔" حضرت ابراہیمؓ کے فضائل میں بکثرت احادیث مروی ہیں۔ دیکھیے "اسد الغابۃ" (۱۔ ۳۸)

۵؎ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیرینؓ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو عطا کر دی تھی اور مجھے اس کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات نہیں مل سکیں۔

حضورؐ نے ماریہؓ کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ خچر اور گدھے کو بھی اپنی وفات تک اپنے پاس رکھا۔ سیرینؓ حسانؓ[1] بن ثابت کو عطا کی۔ یہ ماریہ کی بہن تھی۔ ان کے بطن سے عبدالرحمٰن بن حسان پیدا ہوئے۔ یہ تحفے اسکندریہ کے حاکم مقوقس کی طرف سے حضرت حاطبؓ[2] بن ابی بلتعہ لائے تھے جنھیں ۶ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمائندہ بنا کر مُقوقس کے پاس بھیجا تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہدیہ تین[3] لونڈیوں، ایک خچر، چند کپڑوں اور برتنوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک لونڈی آپؐ نے ابوجہمؓ[4] بن حُذیفہ کو عطا کی تھی۔

صحیح مسلم[5] میں ہے کہ فروہؓ[6] بن نُفاثہ الجذامی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفید رنگ کا

---

[1] حسانؓ بن ثابت کا نسب ابن الاثیر نے یوں بیان کیا ہے:

"ابن المنذر بن حرام بن عمرو بن زید مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن النجار۔ ان کا نام تیم اللہ بن ثعلبہ بن عمرو بن الخزرج الانصاری الخزرجی تھا۔ یہ خزرج کی شاخ بنی مالک بن النجار میں سے تھے۔ ان کی کنیت ابوالولید اور بعض کے نزدیک ابوعبدالرحمٰن یا ابوالحسام تھی۔ یہ شاعرِ رسول اللہ کہلاتے تھے۔ (جب کفارِ مکہ کے شعراء حضورؐ کی ہجو میں شعر کہتے تو یہ) حضورؐ کا نہایت کامیاب دفاع کرتے تھے، جس کی گواہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ آپ بے شمار فضائل کے مالک تھے۔

[2] حضرت حاطبؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مُقوقس کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ چھ آدمی اور بھی تھے۔ دیکھیے تاریخ طبری (۳-۱۵۵۹) "البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر" (۴-۱۸۰) ابن جریر طبری اور ابن کثیر واقدی سے روایت کرتے ہیں کہ یہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ اسی سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف علاقوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے اپنے نمائندے بھیجے تھے۔ ابن الاثیر نے "اُسد الغابۃ" (۱-۳۶۱) میں حضرت حاطبؓ کی گفتگو کے کچھ حصے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مُقوقس ان سے بہت متاثر ہوا اور اس نے کہا:

"تم دانا آدمی ہو اور دانا کی طرف سے آئے ہو۔"

[3] دیکھیے "اسد الغابۃ لابن الاثیر" (۱-۳۶۲)

[4] ابوجہم بن حذیفہ فتح مکہ کے روز اسلام لائے۔ یہ قریش کے قائدین اور سربرآوردہ لوگوں میں تھے۔ سب اصحابِ تراجم اس بات پر متفق ہیں کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایت صحیح نہیں جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے تین لونڈیوں میں سے ایک لونڈی ان کو دی تھی۔

[5] صحیح مسلم (۳-۱۳۹۸) کتاب الجہاد والسیر باب "غزوۃ حنین" یہ روایت حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

[6] فروہ بن نُفاثہ اور بعض روایات میں فروہ بن نعامہ ہے لیکن پہلی روایت ہی صحیح ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں ان کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے کیونکہ طبری کہتے ہیں کہ وہ اسلام لائے اور انھوں نے طویل عمر پائی جبکہ دوسرے کہتے ہیں کہ وہ مشرف باسلام نہیں ہوئے۔ نووی نے شرح مسلم (۱۲-۱۱۴) میں اسی طرح لکھا ہے۔

خچر تحفے کے طور پر دیا تھا جس پر آپؐ غزوہ حنین میں سوار تھے۔

سحنون کہتے ہیں:

"جب روم کا بادشاہ امیر المومنین کو تحفہ ارسال کرے تو اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں اور وہ تحفہ خاص طور پر اسی کے لیے ہوگا۔"

اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ وہ ہدیہ مسلمانوں کی ملکیت ہوگا اور مسلمانوں کا امیر ہدیہ دینے والے کو اس کے برابر تحفہ بیت المال سے دے گا۔

سحنون کہتے ہیں کہ اس کے عوض میں ہدیہ دینا ضروری نہیں۔

سحنون یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو کفار کی طرف قاصد بنا کر بھیجا جائے اور کفار اس کو تحفہ دیں تو وہ مسلمانوں کی نہیں بلکہ اس قاصد کی ملکیت ہوگا اور اس میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کفار کی طرف سے کوئی قاصد آئے

حافظ ابن حجر نے الاصابہ (۳-۲۰۷) میں ان کا نام فروہ بن عامر الجذامی تحریر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے حضورؐ کی زندگی ہی میں اسلام تو قبول کر لیا مگر آپؐ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ انھوں نے ایک قاصد کے ذریعے اپنے مشرف باسلام ہونے کی خبر حضورؐ کو بھیجی اور تحفہ کے طور پر ایک سفید خچر بھی آپؐ کی خدمت میں ارسال کیا۔ یہ رومیوں کی طرف سے عرب علاقوں کے حاکم تھے۔ ابن ہشام نے سیرت میں ان کے اسلام لانے کا واقعہ لکھا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ رومیوں نے انھیں پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔

ؔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں کے ناموں اور ان کی تعداد کے بارے میں علما کا اختلاف ہے۔ امام نوویؒ تھذیب الاسماء (۱-۳۶) میں لکھتے ہیں کہ:

سہیل بن سعد کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین گھوڑے تھے۔

۱- اللِّزاز (بکسر اللام والزائین)

۲- الظَرِب (بفتح الظاء وکسر الراء)

۳- اللُّحَیف (بضم اللام وفتح الحاء)

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ الظرب نامی گھوڑا آپ کو فروہ بن عمر الجذامی نے اور لزاز نامی گھوڑا المقوقس نے تحفۃً بھیجا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سفید خچر آپ کو ایلہ کے حاکم نے ہدیۃً دیا تھا۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ سہیلی نے اس کا نام دُلدُل لکھا ہے۔

ؔ قاضی عیاض نے سحنون سے یہ بات نقل کی ہے اور اس کو ابو یوسف اور اشہب کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔ دیکھیے امام نوویؒ کی شرح مسلم (۱۲-۱۱۴)

ؔ قاضی عیاض نے اوزاعی، محمد بن حسن، ابن القاسم اور ابن الحبیب سے نقل کیا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم

تو امیر المومنین کو اسے کوئی تحفہ نہیں دینا چاہیے، البتہ مسلمان حاکم اگر مسلمانوں اور اسلام کی مصلحت کے پیش نظر تحفہ دینا مفید سمجھے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایلہ کے حکمران نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک سفید خچر بھیجا۔ حضورؐ نے اس کو ایک چادر بھیجی اور اس کو بحیرہ کی حکومت کا پروانہ عطا فرمایا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے ان کا ملحقہ سمندری علاقہ اسے عطا فرمایا۔ یہ غزوۂ تبوک کا واقعہ ہے۔

عمرو بن الحارث کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت صرف ایک سفید خچر، کچھ اسلحہ اور زمین چھوڑی تھی جو صدقہ کر دی گئی۔

کے علاوہ دوسرے حکمران اپنی ذات کے لیے ہدیہ قبول کرنے کے مجاز نہیں۔ اگر کوئی حکمران ہدیہ قبول کرے گا تو تمام اہل اسلام اس کے حقدار ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ ہدیہ اسے امام المسلمین ہونے کی حیثیت سے ہی پیش کیا گیا ہے۔ اور اگر ہدیہ اس قوم کی جانب سے ہو جس کا محاصرہ کیا گیا ہے تو اسے مال غنیمت تصور کیا جائے گا۔ (حوالہ مذکور)

لہ فروہ کا قاصد مسعود بن سعد جب فروہ کا خط اور اس کے تحائف لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اسے پانچ سو درہم عطا کیے تھے۔ حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" (۳-۳۹۲) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

ٹہ صحیح بخاری کتاب "الزکوٰۃ" باب "خرص التمر" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۱۴۸۱) بروایت ابوحمید الساعدی۔

ٹہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ ایلہ کے بادشاہ کا نام یحنۃ بن رُوبہ تھا۔ امام نووی نے شرح مسلم میں اسی طرح لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں یوحنا بن رُوبہ بضم الراء وسکون الواؤ نقل کیا ہے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یحنۃ نون کے ساتھ ہے۔

ٹہ علاقہ کو "بحرۃ" اس لیے فرمایا کہ وہ ساحل سمندر پر مقیم تھے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں۔ بعض روایات میں "ببحرہم" کے الفاظ ہیں۔ بحرہ سے ان کا شہر مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بحرہ سے زمین مراد ہے۔ ابن اسحاق نے سیرت (۲-۵۲۵) میں اس خط کا ذکر کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حاکم ایلہ کے نام لکھا۔

خط کے متن کا ترجمہ درج ذیل ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ یوحنا بن رُوبۃ اور اہل ایلہ کے لیے امن کا پروانہ ہے۔ ان کی کشتیوں اور خشکی اور تری میں سفر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے امن و امان کی ذمہ داری ہوگی۔ اسی طرح ان کے ساتھ جو اہل یمن، اہل شام اور اہل بحر مقیم ہیں وہ بھی محفوظ و مامون ہوں گے۔ ان میں سے جو ناروا حرکت کرے گا اس کا مال ان لوگوں کے لیے مباح ہو جائے گا جو اس پر قبضہ کر لیں گے۔ پانی کے جس چشمے پر جائیں وہ اتر سکتے ہیں اور بحر و بر میں جہاں جائیں جا سکتے ہیں۔

ٹہ عمرو بن الحارث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر نسبتی تھے۔ یہ ام المومنین حضرت جُویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھائی تھے۔ صحیح بخاری کتاب الوصایا (فتح الباری حدیث نمبر ۲۷۳۹) میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مصنف نے بخاری

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

حضور نے وفات کے وقت ایک زرہ چھوڑی تھی جو ایک یہودی کے پاس تیس[۳۰] صاع جَو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی۔"

صحیح بخاری میں ہے:-

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت درہم، دینار، لونڈی، غلام یا کوئی اور چیز نہیں چھوڑی تھی۔ آپ نے جو ترکہ چھوڑا وہ محض ایک سفید خچر، کچھ اسلحہ اور اراضی پر مشتمل تھا جسے صدقہ کر دیا گیا۔"

الاصیلی کی روایت میں "شیئاً" (کوئی چیز) کی جگہ "شاۃ" (ایک بکری) کے الفاظ ہیں۔

ابن حبیب اور دیگر مورخین نے تحریر کیا ہے کہ مقوقس مصر کا حاکم تھا۔

ابو عبید کتاب "الاموال" میں لکھتے ہیں کہ:

عامر بن مالک کا لقب "ملاعب الاسنۃ" (نیزوں سے کھیلنے والا) تھا۔ اس نے رسول کریم کو کچھ ہدیہ بھیجا۔ حضور نے فرمایا: "ہم مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کیا کرتے۔"

آپ نے عیاض مجاشعی کو بھی یہی فرمایا تھا کہ "ہم مشرک کا عطیہ قبول نہیں کرتے۔"

کی جس حدیث کی جانب اشارہ کیا ہے وہ صحیح بخاری کتاب "الجھاد" باب "بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" میں موجود ہے (دیکھیے فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۸۷۳)

ؔ صحیح بخاری کتاب "الجھاد" باب "ماقیل فی درع النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۹۱۶)

ؔ صحیح بخاری کتاب "الجھاد" باب "ماقیل فی درع النبی صلی اللہ علیہ وسلم"

ؔ کتاب "الاموال" ص ۲۶۵۔

ؔ نام عامر بن مالک ابن جعفر اور کنیت ابو البراء ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل نجد کی طرف قاریوں کی ایک جماعت بھیجنے کی درخواست کی تھی تاکہ وہ انھیں اسلام کی دعوت دیں۔ اس نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کی تھی۔ حضور نے اس مقصد کے لیے ستر آدمیوں کو بھیجا۔ جب وہ بیر معونہ کے قریب پہنچے تو قبیلہ سُلیم کے لوگوں نے ان کو شہید کر دیا۔ اس وقت ابھی حضور کو مکہ سے ہجرت کیے ہوئے تین سال کا عرصہ ہوا تھا۔ (مغازی الواقدی ص ۲۶۹)

ؔ تمام کتب سیرت میں یہاں "کچھ" کے بجائے "فرساً" (گھوڑا) کا لفظ ہے، لیکن کتاب "الاموال" میں اس ہدیہ کی تفصیل مذکور نہیں۔ الواقدی میں ہے کہ اس نے آپ کی خدمت میں دو گھوڑے اور دو اونٹنیاں تحفہ کے طور پر بھیجی تھیں۔

ؔ اس حدیث کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں جن کے ناموں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کتاب "الاموال" میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کعب کو چند اہل علم نے بتایا۔

یہ حدیث عبدالرزاق نے المصنف (۱۰-۴۴۶) میں نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ نے "المغازی" میں اسے

ابو عبید کہتے ہیں:" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان کا تحفہ اس لیے قبول کیا تھا کہ ان دنوں آپ کا کفار مکہ سے معاہدہ ہو چکا تھا۔ اسی طرح اسکندریہ کے حاکم مقوقس کا ہدیہ قبول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے حضور کے قاصد حاطب بن ابی بلتعہ کی عزت افزائی کی اور حضور کی نبوت کا اقرار کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے حربی کافر کا ہدیہ قبول نہیں کیا تھا" پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اکیدر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ اکیدر

نقل کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر یہ حدیث مرسل ہے۔ بعض نے اس حدیث کو متصل بھی بیان کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ دیکھیے فتح الباری (۵-۲۳۰)

میرا خیال ہے کہ ان کا اشارہ اس حدیث کی جانب ہے جس کو البزار نے نقل کیا ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد للہیثمی (۴-۱۵۲) الہیثمی کہتے ہیں کہ البزار کے اسناد ابراہیم بن عبداللہ بن جنید کے علاوہ اس حدیث کے باقی راوی صحیح کے درجے کے ہیں اور ابراہیم بن عبداللہ بھی ثقہ ہیں۔

لہ عیاض مجاشعی کے بارے میں حدیث ابوداؤد نے (۳-۱۷۳) کتاب "الامارۃ" باب "فی الامام یقبل ھدایا المشرکین" میں عیاض بن حماد سے روایت کی ہے۔ اسی طرح ترمذی نے (۴-۱۴۲) کتاب "السیر" باب "قبول ھدایا المشرکین" میں یہ حدیث عیاض بن حماد سے روایت کی اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح کے درجہ کی ہے۔ نیز امام احمد نے مسند (۴-۱۶۲) میں اور ابن خزیمہ نے صحیح میں اسے نقل کیا ہے۔

عیاض کا نام عیاض بن حمار بن ابی حمار ہے۔ یہ فاضل صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ بصرہ میں سکونت پذیر تھے۔ مشرف باسلام ہونے سے پہلے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی "الاصابۃ" (۳-۴۸) میں لکھتے ہیں کہ عیاض کے والد کا نام حمار ہے جو کہ ایک مشہور جانور ہے۔ بعض تکلف پسند فقہا نے اس کو "حماد" (بالدال) سے بدل دیا محض اس وہم کے پیش نظر کہ کوئی اپنا نام حمار (گدھا) نہیں رکھ سکتا۔ جیسا کہ ابو داؤد کی روایت میں حماد ہی ہے۔

لہ ابو عبید کتاب "الاموال" (ص ۳۶۶) میں بروایت عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان کو عام کھجور اور عجوہ (ایک اعلیٰ قسم کی کھجور) کا تحفہ پیش کیا۔ ابو سفیان ان دنوں مکہ میں مقیم تھے اور عمرو بن امیہ یہ تحفے کر گئے تھے۔ حضور نے ایک خط لکھ کر ابو سفیان سے چمڑے کا ہدیہ طلب کیا تھا جو کہ ابو سفیان نے بھیج دیا۔ دیکھیے "الروض الانف" (۷-۱۶۵)

سلہ یہ بات ہرگز ثابت نہیں کہ مقوقس نے حضور کی رسالت کا اقرار کیا تھا۔ اس کے برعکس حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں وہ مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار رہا اور حضرت عمروؓ بن العاص نے تین ماہ تک محاصرہ کر کے اس کے علاقہ کو لڑ کر فتح کیا۔ مزید براں مقوقس نے حضرت عمروؓ بن العاص کو تیرہ ہزار دینار دے کر اس بات پر صلح کی تھی کہ جو عیسائی چاہے اسکندریہ سے نکل جائے اور جو چاہے وہیں مقیم رہے۔ ہر قبطی پر دو دینار مقرر کیے۔ دیکھیے بلاذری کی فتوح البلدان ص ۲۲۲۔

مقوقس کے تعارف کے سلسلے میں ابن الاثیر کا اقتباس قبل ازیں گزر چکا ہے۔

سمہ اکیدر بن عبدالملک کا تعلق کندہ سے تھا۔ وہ ان کا بادشاہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو اس طرف بھیجا اور فرمایا

عیسائی تھا۔ حضورؐ نے اس کی جان بخشی فرمائی اور جزیہ قبول کرکے اس کے ساتھ مصالحت کرلی۔ پھر اسے رہا کردیا اور وہ اپنے وطن لوٹ گیا۔[ل]

تھا کہ "تم اس کو گائے کا شکار کرتے ہوئے پاؤگے" چنانچہ حضرت خالدؓ نے اس کی جانب کوچ کیا۔ جب اس کے قلعے کے سامنے پہنچے تو چھپا تدنی رات تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ وہ قلعہ کی چھت پر تھا۔ اس کے پاس اس کی بیوی تھی۔ اسی اثنا میں ایک (نیل) گائے آکر اپنے سینگوں کے ساتھ قلعہ کے دروازے کو بار بار کھٹکھٹانے لگی۔ اس کی بیوی نے کہا۔ کیا آپ نے کبھی ایسے دیکھا ہے؟ اس نے کہا "بخدا کبھی نہیں" وہ بولی "اس گائے کو کون جانے دے گا؟" اس نے کہا۔ کوئی بھی نہیں۔ چنانچہ وہ قلعے سے اترا اور اس نے گھوڑے پر زین کسنے کا حکم دیا۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کے گھر کے چند افراد بھی اس کے ساتھ ہولیے۔ ان میں ایک اس کا بھائی بھی تھا جس کا نام حسان تھا۔ انھوں نے ضروری سامان بھی ساتھ لے لیا۔ اسی اثنا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سواروں نے اسے گرفتار کرلیا اور اس کے بھائی کو قتل کردیا۔ اکیدر نے ایک ریشمی جبہ پہن رکھا تھا جو سونے کی تاروں سے مرصع تھا۔ حضرت خالدؓ نے وہ جبہ اس کے جسم سے اتار لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کے حاضر ہونے سے پہلے بھیج دیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے عاصم بن عمر بن قتادہ نے بتایا انھوں نے انسؓ بن مالک سے سنا وہ فرماتے ہیں میں نے اکیدر کا وہ جبہ دیکھا جب اسے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ مسلمان اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے اور اس پر اظہار تعجب کرنے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے سعد بن معاذ کے رومال جنت میں اس سے بدرجہا بہتر ہیں" (سیرت ابن ہشام (۲-۵۲۶) العلل لابن ابی حاتم (۱-۳۲۴)

ابوحاتم کہتے ہیں:

"اس حدیث کے شروع کا کلام عثمان بن ابی سلیمان کا ہے اور حدیث کے آخر میں جو الفاظ ہیں وہ ابن اسحاق کے ہیں۔ حدیث کے اصلی الفاظ صرف اتنے ہیں کہ جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے چمکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ سونے سے مرصع تھے۔"

ل مشرکین کے تحائف قبول کرنے کے بارے میں متضاد احادیث وارد ہونے کی بنا پر اس مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں یوں باب باندھا ہے۔ کتاب "الھبۃ" "باب قبول الھدیۃ من المشرکین" اس باب میں وہ متعدد ایسی احادیث لائے ہیں جن سے مشرکین کے تحائف قبول کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آپ نے بکری کا زہریلا گوشت قبول کیا۔ نیز یہ حدیث کہ اکیدر نے ریشمی جبہ آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

ابن جریر طبری متضاد احادیث میں تطبیق پیدا کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو ہدیہ حضورؐ کی ذات کے لیے پیش کیا گیا وہ آپ نے قبول نہیں فرمایا اور جو مسلمانوں کے لیے دیا گیا اسے آپ نے قبول فرمالیا۔

(بقیہ حاشیہ) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ طبری کا یہ قول محلِ نظر ہے اس لیے کہ جواز کے اثبات میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں وہ احادیث بھی ہیں جن میں ہدیہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

طبری کے علاوہ دیگر علماء نے متضاد احادیث کے مابین جمع و تطبیق کی مندرجہ ذیل صورتیں پیش کی ہیں:

۱۔ جو شخص مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے ہدیہ پیش کرے اسے قبول نہ کیا جائے۔ اور جو شخص ہدیہ کے ذریعے اسلام کے قریب آنے کا متمنی ہو اس کا ہدیہ قبول کیا جائے۔ یہ نقطۂ نظر طبری کے قول سے افضل و احسن ہے۔

۲۔ اہل کتاب کے تحائف قبول کیے جائیں اور بت پرستوں کے نہیں۔

۳۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول کرنے کے مجاز تھے جبکہ دوسرے امراء ایسا نہیں کر سکتے۔

۴۔ ہدیہ قبول کرنے کی ممانعت منسوخ ہو چکی ہے اور اس کی ناسخ وہ احادیث ہیں جن سے ہدیہ قبول کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۵۔ علماء کی دوسری جماعت کے نزدیک ہدیہ قبول کرنے کی احادیث منسوخ ہیں۔"

حافظ ابن حجر مزید لکھتے ہیں کہ:

"یہ تینوں جواب کمزور ہیں کیونکہ نسخ اور تخصیص محض احتمال سے ثابت نہیں ہوتے۔ فتح الباری (۵-۲۳۱) لیکن ابن حزم نے صراحت کی ہے کہ عیاض مجاشعی غزوۂ تبوک سے پہلے مشرف با سلام ہو چکے تھے (المحلی ۱۰-۱۴۵)

یہ عیاض مجاشعی وہی ہے جس سے حضور نے پوچھا تھا کہ تم اسلام لا چکے ہو؟ اس نے کہا "نہیں"۔ تو آپ نے اس کے تحفے کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے مشرکین کا تحفہ قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس کے برعکس حضور نے ایلہ کے بادشاہ کا تحفہ غزوۂ تبوک کے موقع پر ہی قبول فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بعد کا عمل تھا اس لیے یہ پہلے عمل کا ناسخ ہے۔

قاضی عیاض کہتے ہیں:

کہ آپ نے وہ ہدیہ قبول فرمایا جو مالِ فیئ میں سے تھا اور جنگ و قتال کے بغیر حاصل ہوا تھا۔ دوسرے مال سے آپ نے ہدیہ قبول نہیں فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے اس شخص کے ہدیہ کو قبول فرمایا جس کی تالیفِ قلب مقصود تھی اور اس کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بارے میں حضور پر امید تھے یا جس میں مسلمانوں کی مصلحت مضمر تھی۔ بعض لوگوں کو آپ نے تحفے کا بدلہ بھی دیا۔ جس شخص کے مشرف باسلام ہونے کے بارے میں آپ پر امید نہ تھے اور اس کا ہدیہ قبول کرنے میں کوئی مصلحت پوشیدہ نہ تھی اس کا ہدیہ آپ نے رد فرما دیا۔ دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم (۱۲-۱۱۴)

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ) "جب مسلمان حاکم کو کفار کے مشرف باسلام ہونے کی امید ہو تو ان کی تالیفِ قلب کے لیے وہ ان کے تحائف قبول بھی کر سکتا ہے۔ اور ان کو ہدیہ پیش بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ آنحضور کا ارشاد ہے "باہم تحفے دیا کرو اس لیے کہ اس سے محبت بڑھتی ہے" جب کفار کے اسلام لانے کی امید نہ ہو تو ان کے تحائف رد کر کے ان کے ساتھ سختی کا اظہار کرنا چاہیے۔ اگر حاکم ہدیہ قبول کرے تو اسے مالِ فئی میں رکھا جائے گا جو کہ سب اہلِ اسلام کے لیے ہے۔ (شرح السیر الکبیر ج ۴ - ۱۲۳۷)

خلاصہ | خلاصۂ بحث یہ ہے کہ کفار کے تحائف کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا انحصار امام المسلمین کی رائے پر ہے جس امر میں مسلمانوں کی مصلحت مضمر ہو وہی کام کرے۔ اگر مصلحت کا تقاضا تحائف قبول کرنے یا ان کو تحائف پیش کرنے میں ہو تو یونہی کرے۔ اگر معاملہ برعکس ہو تو ان کے تحائف کو رد کر دے اور ان کو ہدیہ پیش کرنے سے احتراز کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مالِ فئ کی تقسیم کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

امام بخاریؒ نے ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے۔ باب "ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعطی المؤلفۃ قلوبھم وغیرھم من خمس"

لہ امام بخاری نے یہ باب اپنی صحیح میں کتاب "الخمس" میں باندھا ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۱۴۱) ہے۔

لہ "مؤلفۃ القلوب" سے وہ قریشی مراد ہیں جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے، مگر اسلام ابھی تک ان کے ذہن و قلب میں راسخ نہیں ہوا تھا، بلکہ ان میں سے بعض لوگ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے جیسے صفوان بن اُمیہ۔

علماء کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ جن مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ کا مستحق قرار دیا گیا ہے ان سے کون لوگ مراد ہیں:

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے وہ غیر مسلم مراد ہیں جن کو اسلام کی ترغیب دینے کے لیے کچھ مال دیا جائے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جن کے بعض پیرو کار ہوں اور وہ ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ نومسلم ہیں جن کی تالیف قلب کے لیے کچھ مال دیا جائے تاکہ اسلام ان میں راسخ ہو جائے (فتح الباری ج ۸ ص ۴۸)

امام شعبی، مالک، شافعی اور اصحاب الرائے سے منقول ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا کر کے تالیف قلب سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ایسے کسی مشرک کو تالیفِ قلب کی خاطر مال دینے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔

ان لوگوں کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف ٹھہرایا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف مقرر کیے ہیں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤلفۃ القلوب کو دیا کرتے تھے اور حضورؐ کا یہ طرزِ عمل وفات تک جاری رہا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حال میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دیا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ جیسا انتہائی متقی آدمی اس طرح کا فیصلہ کیسے کر سکتا تھا۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ بات کہی تھی تو بھی یہ بات ان کے عہدِ خلافت کے ساتھ مخصوص ہو گی۔ اس لیے کہ ان کے عہد میں اسلام کو بہت ترقی اور عروج حاصل ہوا تھا۔ جب کہ اسلام کی حالت آج کل اس سے بالکل مختلف ہے۔

یہ حدیث عبداللہ بن زیدؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ امام زہریؒ کہتے ہیں کہ مجھے انسؓ نے بتایا کہ جب بنی ہوازن کا مال لڑے بغیر مسلمانوں کو مل گیا اور آپؐ نے قریش کے بعض لوگوں کو ایک سو اونٹ تک عطا کیے تو انصار کے بعض لوگوں نے کہا "اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو معاف کرے۔ آپؐ قریش کو دے رہے ہیں اور ہمیں نظر انداز کر رہے ہیں، حالانکہ ابھی تک ہماری تلواروں سے قریش کا خون ٹپک رہا ہے۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس گفتگو کا پتہ چلا تو آپؐ نے انصار کو بلایا، ان کو چمڑے کے ایک خیمے میں جمع کیا۔ انصار کے سوا آپؐ نے کسی اور کو نہیں بلایا تھا۔ انصار جب اکٹھے ہو گئے تو آپؐ ان کے پاس آئے اور فرمایا:

"مَا حَدِيثٌ بَلَغَنِي عَنْكُمْ" وہ کیا بات ہے جو مجھے آپ کی طرف سے پہنچی ہے؟

انصار میں سے دانا لوگوں نے کہا۔ حضورؐ! ہم میں جو لوگ دانشمند تھے انھوں نے تو کچھ نہیں کہا، البتہ ہمارے بعض نوجوانوں نے کہا: "اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاف کرے کہ آپ قریش کو دے رہے ہیں اور انصار کو محروم رکھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہماری تلواروں سے ابھی تک قریش کا خون ٹپک رہا ہے۔"

یہ سن کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں ان لوگوں کو دے رہا ہوں جنھیں اسلام قبول کیے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ دوسرے تو مال لے کر جائیں اور تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لے کر گھروں کو لوٹو۔ اللہ کی قسم! جسے اپنے ساتھ لے کر تم اپنے گھروں کو جا رہے ہو اس سے کہیں بہتر ہے جسے اپنے ساتھ لے کر وہ گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔"

انصار بولے "یا رسول اللہ! ہم راضی ہیں۔" حضورؐ نے فرمایا "انصار! دیکھنا میرے بعد تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔[۲] اس وقت تم صبر سے کام لینا، یہاں تک کہ (وفات کے بعد) تم حوض پر مجھ سے ملو۔"

لہٰذا اسلام کی طرف ترغیب دلانے کے نقطۂ نظر سے مؤلفۃ القلوب کا حق ساقط نہیں ہوگا۔

[۱] عبداللہ بن زید بن عاصم بن کعب انصاری خزرجی فاضل صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ۶۳ھ میں حرّہ کے واقعہ میں یزید بن معاویہؓ کے دورِ حکومت میں شہید ہوئے۔ جس حدیث کی جانب مصنف نے اشارہ کیا ہے اسے اس باب میں امام بخاری نے "معلق" نقل کیا ہے، مگر صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "غزوۃ الطائف" میں یہ حدیث متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۳۳۰) بروایت موسیٰ بن اسماعیل از وہیب از عمرو بن یحییٰ از عباد بن تمیم از عبداللہ بن زید بن عاصم۔ مصنف نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے یہ اس سے مختلف ہے۔

[۲] امام بخاری نے باب مذکور میں یہ حدیث ابوالیمان از شعیب از زہری کی متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[۳] عربی متن میں (اُثْرَةً شديدة) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی جس چیز میں تم دوسروں کے ساتھ برابر کے شریک ہو وہ دوسروں کو تو دی جائے گی لیکن تمہیں نہیں دی جائے گی۔ ابوعبید اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ مالِ غنیمت میں سے دوسروں کو تم سے زیادہ مال دیا جائے گا۔ فتح الباری (۸-۵۲)

بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ "صبر سے کام لو حتیٰ کہ حوض پر اللہ اور اس کے رسولؐ سے تمھاری ملاقات ہو"۔
ابوزیدؒ نے یہ حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو ترجیح دیتے ہوئے سو سو اونٹ دیے تھے ان میں اقرعؓ بن حابس، عیینہؓ بن حصن اور بعض دوسرے لوگ شامل تھے۔

ابن ہشامؒ اور دوسرے سیرت نگاروں نے ان ناموں کا ذکر بھی کیا ہے:

۱۔ ابوسفیانؓ
۲۔ معاویہؓ بن ابی سفیانؓ
۳۔ حکیمؓ بن حزامؓ

ابوزید یہ محمد بن احمد المروزی ہیں جو الفربری کی سند سے صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ حافظ ابونُعیم اصبہانی اور حافظ ابومحمد عبداللہ بن ابراہیم الاُصیلی اور امام ابوالحسن علی بن محمد القابسی بھی ابوزید سے روایت کرتے ہیں۔

اقرع بن حابس بن عقال بن محمد بن سفیان تمیمی مجاشعی دارمی ہیں۔ ان کو اقرع (گنجا) اس لیے کہتے تھے کہ ان کے سر میں گنج تھا۔ ابن دُرید کہتے ہیں کہ ان کا اصل نام فراس تھا۔ یہ دورِ جاہلیت میں بھی معزز اور شریف تھے اور اسلام لانے کے بعد بھی یہ معززین میں شمار ہوتے تھے۔ خلافتِ عثمانی میں عبداللہ بن عامر کے لشکر میں شامل تھے۔ جوزجان میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دس بیٹوں سمیت جنگ یرموک میں شرکت کی اور وہیں شہادت کی سعادت حاصل کی۔ دیکھیے "الاصابۃ" (۱-۳، ۷۲)

عُیینہ بن حصن بن حُذَیفہ بن بدر الفزاری۔ یہ درشت طبع بدوی تھے۔ فتح مکہ سے پہلے اور بعض کے نزدیک اس کے بعد مسلمان ہوئے۔ ان ہی کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا "احمق رئیس"۔ دیکھیے "الاستیعاب" (۳-۱۶۷)

صحیح بخاری کتاب "فرض الخمس" اور کتاب "المغازی" میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے یہ روایت ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۱۵۰، ۴۳۳۶) حدیث نمبر ۳۱۵۰ میں دوسری حدیث سے یہ الفاظ زائد ہیں کہ آپؐ نے چند عرب شُرفا کو یہ عطیہ دیا"۔ صحیح بخاری میں اُن شرفاء کے نام مذکور نہیں، البتہ موسیٰ بن عُقبہ، ابن اسحاق اور دوسرے اصحابِ سیر نے ان کے نام لکھے ہیں۔ دیکھیے سیرت ابن ہشام (۲-۴۹۲-۴۹۳)

ابوسفیان صخر بن حرب بن اُمیہ بن عبدشمس بن عبدمناف القرشی الاموی ہیں۔ آپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے اور غزوۂ حنین اور طائف میں شرکت کی۔ حضرت عثمان کے دورِ خلافت کے آخر میں اٹھاسی برس کی عمر میں وفات پائی۔

امیرالمومنین معاویہ بن ابی سفیان القرشی۔ حضرت علیؓ کے بعد خلیفہ بنے۔ بعثتِ نبوی سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئے۔ صحیح روایت کے مطابق ۶۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔

حکیم بن حزام بن خُوَیلد القرشی۔ واقدی "المغازی" (ص ۹۴۶) میں لکھتے ہیں:

(۴) حارثؓ بن کلدہ (۵) نضیرؓ بن الحارث (۶) حارثؓ بن ہشام (۷) سُہیلؓ بن عمر (۸) حُویطبؓ بن عبدالعزّیٰ (۹) عَلاءؓ بن جاریہ

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ستّر اونٹ دیے تو انھیں یہ تعداد پسند نہ آئی۔ انھوں نے کہا، یا رسول اللہ! آپؐ کے عطیہ کا مجھ سے بڑھ کر اور کوئی مستحق نہیں ہے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دس اونٹ اور دیے۔ حکیم نے انھیں قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپؐ نے مزید دس کا اضافہ کیا۔ حکیم نے پھر انکار کیا۔ تب آپؐ نے پورے سو اونٹ عطا کیے۔ حکیم نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! کیا آپؐ کا یہ عطیہ، جس پر میں مطمئن ہو گیا ہوں، بہتر ہے یا وہ جسے میں نے قبول نہیں کیا تھا؟ آپؐ نے فرمایا۔ "وہ عطیہ بہتر تھا جسے تم نے قبول نہ کیا۔" حکیم نے کہا۔ "اللہ کی قسم! میں مزید نہیں لوں گا اور نہ ہی آپؐ کے بعد کسی سے سوال کروں گا۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ انھیں تمھارے لیے بابرکت بنائے۔"

واقدی کہتے ہیں۔ "حضرت حکیم نے وفات پائی تو روئے زمین پر قریش میں کوئی بھی ان سے زیادہ امیر نہ تھا۔" عیون الاثر (۲-۱۹۳) میں ابن سید الناس لکھتے ہیں کہ پھر حکیم بن حزام نے مزید سو اونٹ مانگے جو حضورؐ نے انھیں عطا کر دیے۔"

[۱] حارث بن کلدہ بن عمرو بن ابی علاج بن ابی سلمہ بن عبدالعزّیٰ بن غیرہ بن عوف بن قُصَیّ الثقفی طبیب العرب۔ مجھے ان کا سالِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔

[۲] نضیر بن الحارث بن علقمہ بن کلدہ العبدری۔ ان کو موسیٰ بن عقبہ نے حبشہ کے مہاجرین میں شمار کیا ہے۔ یہ جنگ یرموک میں شہید ہوئے۔ ابنِ اسحاق، ابن سعد اور ابن شاہین کہتے ہیں کہ یہ غزوۂ حنین میں مؤلفۃ القلوب میں سے تھے۔ دیکھیے "الاصابۃ" (۳-۸۲۵)

[۳] حارثؓ بن ہشام بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم۔ یہ ابوجہل کے بھائی اور خالدؓ بن ولید کے چچا زاد تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے اور بڑے مخلص ثابت ہوئے۔ جب تک زندہ رہے شام میں جہاد میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ وہیں شہید ہو گئے، لیکن بعض مؤرخین کے نزدیک طاعون عمواس میں انھوں نے وفات پائی۔" الاصابۃ" (۱-۲۹۳)

[۴] سُہیلؓ بن عمرو بن شمس بن عبدِ وُدّ بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر لؤی العامری القرشی۔ لقب خطیب قریش اور کنیت ابویزید ہے۔ صلح حدیبیہ میں قریش کے نمائندے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے اور مخلص مسلمان ثابت ہوئے۔ طاعونِ عمواس میں شام میں انھوں نے وفات پائی۔

[۵] حُویطبؓ بن عبدالعزّیٰ بن ابی قیس بن عبدِ وُدّ بن نصر القرشی العامری۔ ان کی کنیت ابو محمد یا ابوالاصبع ہے۔ فتح مکہ والے سال اسلام لائے۔ غزوۂ حنین میں شرکت کی اور خلافتِ معاویہ میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

[۶] ابن عبدالبر نے "الاستیعاب" (۳-۱۴۸) میں ان کا نام العلاء بن الجاریۃ لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:
العلاء بن جاریۃ (بالجیم) ثقفی مؤلفۃ القلوب میں سے تھے۔ یہ قبیلہ ثقیف کے سرداروں میں سے تھے۔
طبقات ابن سعد (۲-۱۵۳) میں ان کا نام العلاء بن الحارثۃ لکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے:

(۱۰) عُیَینہؓ بن حصن (۱۱) اقرعؓ بن حابس (۱۲) مالکؓ بن عوف (۱۳) صفوانؓ بن اُمیّہ۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو سوسو اونٹ دیے گئے۔

بعض لوگوں کو آپؐ نے سو سے کم اونٹ دیے اور بعض دوسرے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا کیے۔

العلاءؓ بن حارثہ (بالحاء) الثقفی ان لوگوں میں سے تھے جن کو حضورؐ نے مالِ غنیمت میں سے پچاس اونٹ عطا کیے۔

مالکؓ بن عوف بن سعد بن یربوع بن واثلہ بن دھمان بن نصر بن معاویہ بن بکر بن ہوازن ابوعلی النصری۔ غزوۂ حنین میں مشرکین کے قائد تھے۔ پھر مشرف باسلام ہوئے اور جنگِ قادسیہ اور فتحِ دمشق میں شرکت کی۔

صفوانؓ بن اُمیّہ بن خلف بن وہب بن حذامہ۔ فتح مکّہ کے بعد اسلام لائے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر رسولِ کریمؐ نے ان سے زرہیں مستعار لی تھیں۔ ان کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے قبل انھوں نے وفات پائی۔

یزیدؓ بن ابی سفیان کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو آپ نے سَو سَو اونٹ عطا کیے تھے۔ ان کے والد ابوسفیان نے ان کی سفارش کی تھی۔ ابن سیدالناس نے "عیون الاثر" (۲-۱۹۳) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

قیس بن عدی کو بھی آپؐ نے سَو اونٹ دیے تھے لیکن ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ انھیں پچاس اونٹ عطا کیے تھے۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ "سید بن جاریہ الثقفی اور قیس بن عدی کو بھی آپ نے سوسو اونٹ دیے تھے۔"

ابنِ سعد نے "طبقات" (۲-۳-۵۲-۱۵۲) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مخرمہؓ بن نوفل الزّہری، عمیر بن وہب الجُمحی اور ہشام بن عمرو اخو بنی عامر بن لؤی القرشی بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کو پچاس پچاس اونٹ عطا کیے تھے۔

ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ حضورؐ نے ان کو کتنے کتنے اونٹ دیے تھے، البتہ اتنی بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سو سے کم تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیدؓ بن یربوع بن عنکثہ بن عامر بن مخزوم کو پچاس اونٹ دیے۔ اسی طرح عدیؓ بن قیس السہمی کو بھی پچاس اونٹ عطا کیے۔ عباس بن مرداس کو آپؐ نے چند اونٹ دیے جس پر وہ غصے ہو گیا اور اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کچھ شعر پڑھے۔

ابنِ اسحاق لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِذْهَبُوْا بِهٖ فَاقْطَعُوْا عَنِّيْ لِسَانَهٗ "اس کو لے جاؤ اور میرے بارے میں اس کی زبان بند کر دو۔"

تعمیلِ ارشاد میں اس کو اتنا کچھ دیا گیا کہ وہ راضی ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کی زبان بند کرنے کا جو حکم دیا تھا اس کا یہی مطلب تھا۔

ابن عقبہ "المغازی" میں لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس بن مرداس کی زبان بند کرنے کا حکم دیا تو وہ گھبرا گیا اور کہنے لگا "جو شخص عباس کے معاملے سے آگاہ نہیں وہ ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے میری زبان کاٹ دے گا" لیکن عباس بن مرداس کو مالِ غنیمت کے پاس لے جا کر کہا گیا کہ اس میں سے جو چاہو لے لو۔ عباس نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ تھا کہ عطیہ دے کر میری زبان بند کی جائے۔ اس لیے کہ میں نے تو آپ کے عطیہ پر ہی اعتراض کیا تھا۔" اب

ایک شخص[۱] نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ نے عُیَیْنہ اور اَقْرَع کو تو سو سو اونٹ دیے لیکن جُعَیل بن سراقہ الضمری کو کچھ نہیں دیا۔"

یہ سُن کر آپ نے فرمایا "اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، جُعَیل بن سُراقہ تو عُیَیْنہ اور اُقرع جیسے دنیا کے تمام لوگوں سے بہتر ہے، مگر میں نے ان دونوں کی تالیفِ قلب کی تاکہ وہ اسلام لے آئیں۔ اور جُعَیل بن سراقہ کو میں نے اس کے اسلام کے حوالے کر دیا ہے۔"

صحیح بخاری[۲] میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں بعض ایسے لوگوں کو دیتا ہوں جن سے مجھے کجروی اور اضطراب کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں کو میں اس بھلائی اور تونگری کے سپرد کر دیتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ڈال دی ہوتی ہے۔ عَمروؓ بن تغلب انہی میں سے ایک ہے۔"

عَمروؓ بن تَغلِب کہتے ہیں کہ "میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میرے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ واپس لے کر ان کے عوض مجھے سُرخ اونٹ دیے جائیں۔ غزوہ حُنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ایک شخص نے کہا تھا کہ "خدا کی قسم! یہ ایسی تقسیم[۳] ہے جو مبنی بر عدل نہیں یا اس میں اللہ کی رضا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔"

عباس کی عزتِ نفس نے اسے اجازت نہ دی کہ وہ اس مال میں سے لے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس کو ایک جبہ عطا کیا جو اس نے لے لیا اور اسے زیبِ تن کیا۔ دیکھیے "الاکتفا" (۲-۳۶۰)

ابنِ سیدالناس نے لکھا ہے کہ عثمانؓ بن وہب کو بھی آپؐ نے پچاس اونٹ عطا کیے تھے۔

ابوالفضل بن طاہر نے اپنی کتاب "المبہمات" میں مؤلفۃ القلوب کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مکمل تعداد ستائیس[۴۳] ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۸-۴۸) میں یہ بات نقل کی ہے۔

[۱] سیرت ابنِ ہشام (۲-۴۹۶) میں محمد بن ابراہیم بن حارث التیمی کی روایت ہے کہ وہ شخص ابوعبداللہ المدنی تھا۔ حافظ ابن حجر "التقریب" (۲-۱۴۰) میں ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ "الاکتفاء" للکلاعی (۲-۳۶۰، ۳۶۱)

[۲] صحیح بخاری کتاب "الخمس" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۱۴۵) بروایت عمرو بن تَغلِب النمری رضی اللہ عنہ۔ ان کا شمار فضلِ صحابہ میں ہوتا ہے۔ بصرہ میں رہائش پذیر تھے۔ مجھے ان کی تاریخِ وفات کا ذکر کہیں نہیں ملا۔

[۳] ابن اسحاق نے "سیرت" میں اپنی سند کے ساتھ اس کا ذکر بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ کیا ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کتاب "الخمس" میں اس کو نقل کیا ہے۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۳۱۵۰ ہے۔ بخاری کی روایت میں حدیث کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ ہے "رَحِمَ اللّٰہُ مُوسٰی قَدْ اُوْذِیَ بِاَکْثَرَ مِنْ ھٰذَا فَصَبَرَ۔"

(اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے ان کو اس سے زیادہ ستایا گیا مگر انھوں نے صبر سے کام لیا)

یہ آدمی قبیلہ تمیم سے تھا۔ اسے ذوالخویصرہ کہتے تھے۔ ابنِ اسحاق نے اس کا یہی نام لکھا ہے۔ صحیح بخاری کتاب المغازی میں ہے کہ وہ شخص انصار میں سے تھا۔

یہ شخص بنو تمیم کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے ذوالخویصرہ کہا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مخاطب کرکے فرمایا "وَيْحَكَ، فَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ أَعْدِلْ" (تیرا ستیاناس ہو۔ اگر میں نے عدل سے کام نہ لیا تو اور کون انصاف کر سکے گا؟) (الی آخرہ)

واقدی کے شاگرد ابن سعد[1] نے لکھا ہے کہ اس آدمی کا نام حرقوص[2] بن زہیر تھا۔

مبرد نے "الکامل" (ص ۵) میں ابراہیم بن محمد التیمی سے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے تھوڑا سا سونا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپؐ نے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا اور ایک چوتھائی اقرع بن حابس کو، ایک چوتھائی زید الخیل[3] کو ایک چوتھائی علقمہ[4] بن علاثہ کو اور ایک چوتھائی عیینہ بن حصن الفزاری کو عطا کیا۔ ایک شخص کھڑا ہوا جس کا جسم بھدا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور پیشانی ابھری ہوئی تھی۔ مبرد کے علاوہ بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ اس شخص نے کہا:

"یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ کی رضا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا"

یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا۔ اس کے بعد پوری حدیث[5] نقل کی گئی ہے۔

واقدی کہتے ہیں کہ اس کا نام معتب بن قشیر بن عمرو بن عوف تھا۔ وہ منافقین میں سے تھا۔ بخاری نے باب "استتابة المرتدين" میں تصریح کی ہے کہ اس کا نام عبداللہ اور لقب ذوالخویصرہ تمیمی تھا۔ سہیلی نے "الروض الانف" (۲۸۸-۷) میں اسی کو ترجیح دی ہے۔

[1] طبقات ابن سعد میں یہ حوالہ مجھے نہیں ملا۔

[2] فتح الباری (۸-۵۶) میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

حرقوص کا واقعہ اس سے مختلف ہے جس کا ذکر حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت کردہ حدیث میں آتا ہے۔ اس حدیث کا ذکر مصنف نے بعد میں کیا ہے۔

[3] الکامل للمبرد (۲-۱۴۱)

[4] زید الخیل یعنی ابن مہلہل الطائیؓ۔ زید الخیل کے نام سے اس لیے معروف تھے کہ انھوں نے نہایت عمدہ گھوڑے پال رکھے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام "زید الخیر" رکھا اور آپؐ نے ان کی تعریف کی۔ وہ مسلمان ہوئے اور عہد رسالت میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اسی طرح لکھا ہے۔

[5] علقمہ بن علاثہ العامریؓ بنی عامر کے سرداروں میں سے تھے۔ عامر بن الطفیل کے اور ان کے درمیان قیادت کے بارے میں اکثر نزاع رہتا تھا۔ انھوں نے اسلام قبول کیا اور حضرت عمرؓ نے ان کو حوران کا حاکم مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ کی زندگی ہی میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے بعض حالات اس سے پہلے کتاب کے مقدمہ کے باب "التحکیم" میں گزر چکے ہیں۔

[6] پوری حدیث اس طرح ہے کہ آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ آپ کے دونوں رخسار مبارک سرخ ہو گئے اور آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ

مبرد نے "الکامل"[1] میں ایک دوسری روایت نقل کی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کا مالِ غنیمت تقسیم کر رہے تھے کہ ایک سیاہ فام شخص کھڑا ہوا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "آپ نے آج تک کبھی انصاف سے کام نہیں لیا"۔

یہ حدیث صحیح بخاری[2] میں ہے اور راوی کو چونکہ آدمی کے بارے میں شک ہے کہ وہ علقمہ ہے یا عامر بن طفیل۔

نے مجھے پوری روئے زمین کا امین بنایا ہے مگر تم مجھے امین تصور نہیں کرتے"۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے "یا رسول اللہ! میں اس کو قتل نہ کر دوں؟" آپ نے فرمایا "اس شخص کی نسل سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے اس طرح نکل جائے گی جیسے تیر نشانے سے نکل جاتا ہے"۔

ابراہیم بن محمد ابن عبداللہ بن عُبَید اللہ بن معمر التیمی العمری ہیں۔ ان کی کنیت ابو اسحق ہے۔ یہ ثقہ راوی ہیں۔ ابو داؤد و نسائی نے ان سے روایت کی ہے۔

[1] الکامل للمبرد (۲-۱۴۱) میں پوری حدیث اس طرح ہے:

"آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ غصے کے آثار چہرۂ مبارک پر نمودار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر نے کہا: "یا رسول اللہ! میں اس کو قتل نہ کر دوں؟" آپ نے فرمایا "ایسا نہ کرو۔ اس کا اور اس کے رفقاء کا ایک خاص واقعہ پیش آئے گا"۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو مخاطب کر کے فرمایا "تجھ پر افسوس ہے اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟" پھر آپ نے حضرت ابوبکر کو اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکر اس مقصد کے لیے گئے اور جلد ہی واپس آگئے۔ انھوں نے کہا "یا رسول اللہ! میں نے اسے رکوع کرتے دیکھا ہے"۔ پھر حضرت عمر کو اسے قتل کرنے کے لیے فرمایا وہ گئے اور واپس آگئے۔ انھوں نے کہا۔ میں نے اسے سجدے کی حالت میں پایا ہے۔ پھر حضرت علی کو حکم دیا کہ اسے قتل کر دیں۔ وہ گئے اور واپس آگئے۔ انھوں نے کہا "یا رسول اللہ! وہ مجھے نہیں ملا"۔ حضور نے یہ سن کر فرمایا۔ اگر اس شخص کو قتل کر دیا جاتا تو دین کے بارے میں کبھی دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا نہ ہوتا۔

[2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب "بعث علی ابن ابی طالب وخالد بن الولید الی الیمن" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۳۵۱) اس کو مسلم نے بھی روایت کیا ہے (۲-۷۴۲) کتاب الزکوٰۃ باب ذکر الخوارج وصفاتہم۔

مکمل حدیث صحیح بخاری میں اس طرح ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک شخص نے کہا۔ اس مال کے تو ان لوگوں کی نسبت ہم زیادہ حق دار تھے"۔ یہ بات حضور تک پہنچی تو آپ نے فرمایا "کیا تم مجھے امین تصور نہیں کرتے؟ حالانکہ میں آسمان والے کا امین ہوں۔ صبح و شام میرے پاس آسمان کی خبریں آتی ہیں"۔ (یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضور نے چار آدمیوں کے درمیان مالِ غنیمت تقسیم فرمایا)

راوی کہتا ہے کہ اس وقت ایک آدمی کھڑا ہوا جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، رخسار ابھرے ہوئے اور پیشانی اونچی تھی۔ ڈاڑھی گھنی اور سر منڈا ہوا تھا۔ تہبند ٹخنوں سے اوپر اٹھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا "یا رسول اللہ! خدا سے ڈریے!" آپ نے فرمایا تو ہلاک

سنن[1] ابوداؤد میں جُبیر بن مُطعم سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اقارب کا حصّہ

ہو جائے۔ کیا میں روئے زمین کے تمام لوگوں سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا نہیں ہوں؟ پھر وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! میں اس کی گردن نہ اڑا دوں؟ آپ نے فرمایا "نہیں ممکن ہے وہ نمازی ہو" خالدؓ نے کہا "کتنے ہی نمازی ہیں جو زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دل چیر کر دیکھوں یا ان کے پیٹ چاک کروں"۔

راوی کہتا ہے کہ پھر آپ نے اس کی طرف دیکھا جب کہ وہ پیٹھ پھیرے کھڑا تھا۔ اس وقت آپ نے فرمایا "اس کی نسل سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو خوش الحانی سے کتاب اللہ کی تلاوت کرے گی مگر الفاظ ان کے گلے سے نیچے نہیں اتریں گے۔ وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے نکل جاتا ہے"۔

راوی کہتا ہے کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر میں نے ان کا زمانہ پایا تو میں انھیں قوم ثمود کی طرح تباہ کر دوں گا"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے عرض کیا" یا رسول اللہ! میں اس کی گردن نہ اڑا دوں" تو آپ نے فرمایا "نہیں"۔

مصنّف نے یہاں دو الگ الگ واقعات کو جمع کر دیا ہے۔ (۱) غزوۂ حنین میں تقسیم غنیمت کا واقعہ ذوالقعدہ ۸ھ میں پیش آیا جبکہ (۲) حضرت علیؓ نے یمن سے سونا ۹ھ میں بھیجا۔ ان دونوں واقعات میں جو چیز مشترک ہے وہ معترض کا اعتراض ہے۔

علاوہ ازیں تقسیم غنیمت کے سلسلے میں سونے کے واقعہ کا تذکرہ بھی محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ حضرت علیؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فیئ یا غنیمت کا مال نہیں بھیجا تھا اور نہ ہی حضرت علیؓ کو آپ نے لڑنے کے لیے بھیجا تھا بلکہ انھیں قاضی اور والی بنا کر بھیجا تھا، لہٰذا حضرت علیؓ نے جو سونا آپ کی خدمت میں ارسال کیا وہ یا تو زکوٰۃ کے مال سے ہوگا یا ہدیہ اور تحفہ، وہ فیئ یا غنیمت میں سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔

[1] ابوداؤد (۳-۴۶) کتاب الخراج والامارۃ باب فی بیان مواضع قسم الخمس وسھم ذی القربیٰ

صحیح بخاری کی روایت اس طرح ہے کہ حضرت جبیر بن مطعمؓ نے فرمایا کہ میں اور عثمانؓ بن عفان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے بنی مطلب کو بہت کچھ دیا اور ہمیں محروم رکھا۔ حالانکہ ہم اور وہ ایک ہی مرتبہ کے ہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا "بنی مطلب اور بنی ہاشم ایک ہی چیز ہیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ:

"عبد شمس، ہاشم اور مطلب ایک ہی ماں کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ عاتکہ بنت مُرّہ تھیں اور نوفل اُن کا باپ کی طرف سے بھائی تھا"۔

بنی ہاشم اور بنی مُطّلب کو عطا کیا، مگر بنی نَوفل اور بنی عبدشمس کو کچھ نہ دیا۔ اس پر میں (جُبیرؓ[1] بن مُطعم) اور حضرت عثمانؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم بنی ہاشم کی فضیلت کا انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان میں پیدا فرمایا، مگر ہمارے برادران بنی مُطّلب کی خصوصیت کیا ہے کہ آپ نے ان کو تو دیا لیکن ہمیں محروم رکھا۔ جبکہ ہمارا خاندان ایک ہی ہے؟" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انا وبنوا المطلب لا نفترق في جَاهِلِيَّةٍ ولا اسلام، وانما نحن وَهُمْ شيءٌ واحدٌ۔	جاہلیت ہو یا اسلام ہمارے اور بنی مُطّلب کے درمیان کوئی فرق نہیں رہا۔ دراصل ہم اور وہ ایک ہی چیز ہیں۔

یہ کہہ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں (یعنی ہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط و متصل ہیں جس طرح دونوں ہاتھوں کی انگلیاں)

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ اقدام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے تھا۔ اس لیے کہ عبدشمس، ہاشم اور مُطّلب حقیقی بھائی تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عبدشمس اور ہاشم دونوں جڑواں بھائی تھے۔

ابن وہبؒ[2] نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر کا محاصرہ کیا تو بعض لوگوں کو بھوک لگی۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کے لیے کچھ مانگا، مگر آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ ان لوگوں نے خیبر کا ایک قلعہ فتح کرلیا۔ وہاں ایک شخص کو چربی کی بھری ہوئی ایک بوری ملی جو اس نے اپنے قبضے میں لے لی۔ مالِ غنیمت کے محافظ کعبؓ بن عمرو بن زید انصاری نے اسے دیکھ لیا اور اسے پکڑ لیا۔ اس شخص نے کہا "بخدا میں یہ بوری تمھیں اس وقت تک نہیں دوں گا

نسائی کی روایت میں اس امر کی صراحت ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ خیبر میں پیش آیا۔ رسول اکرمؐ نے اپنے اقارب کا حصہ بنی ہاشم اور بنی مُطّلب کو عطا کیا اور بنی نوفل اور بنی عبدشمس کو کچھ نہ دیا، مگر ابوعُبَید نے کتاب الاموال ص ۱۲۹ میں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ یہ خیبر کا واقعہ ہے۔ ابوعبید نے لکھا ہے کہ ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ خمس اسی طرح تقسیم کیا کرتے تھے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ اسی طرح حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما بھی آپ کے اقارب کو خمس میں سے دیا کرتے تھے۔

[1] جُبیرؓ بن مُطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف القرشی النوفلی اکابر قریش اور علماء انساب میں سے تھے۔ یہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کا فدیہ دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ صلح حُدَیبیہ اور فتح مکّہ کے درمیانی عرصہ میں مشرف باسلام ہوئے۔ بعض مؤرخین کے نزدیک یہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ حضرت معاویہؓ کی خلافت میں انھوں نے وفات پائی۔

[2] حافظ ابن حجر عسقلانیؒ "فتح الباری" (۶-۲۵۶) میں لکھتے ہیں کہ ابن وہب کی روایت مُعضَل ہے۔ محدثین کے نزدیک مُعضَل اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند سے دو یا اس سے زیادہ راوی ایک ہی جگہ ساقط ہو گئے ہوں۔ اگر راوی ایک ہی جگہ سے نہیں بلکہ زیادہ مقامات سے ساقط ہوں تو وہ روایت منقطع کہلاتی ہے۔

جب تک اسے اپنے ساتھیوں کے پاس نہ لے جاؤں" حضرت کعبؓ نے کہا یہ بوری مجھے دو تاکہ میں اسے لوگوں میں تقسیم کردوں۔ اس نے انکار کیا۔ وہ دونوں اس پر جھگڑنے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس آدمی کو یہ بوری دے دو" چنانچہ وہ شخص وہ بوری اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔[1]

ابن عبدالحکیم[2] الکبیر نے "مختصر المدونۃ" میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ یہودیوں کی مقبوضہ چربی کھائیں اگرچہ ہم اسے حرام بھی قرار نہیں دیتے۔

---

[1] دیکھیے سیرت ابن ہشام (۲-۳۳۹) نیز صحیح بخاری کتاب "فرض الخمس" باب "ما یصیب من الطعام فی ارض الحرب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۱۵۳) مختصراً۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

" حضرت عبداللہ بن مُغفّل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے خیبر کے ایک محل کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس وقت ایک آدمی نے چربی سے بھری ہوئی ایک بوری باہر پھینکی۔ میں نے اُچھل کر اسے پکڑنا چاہا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ اس وقت مجھے شرم محسوس ہوئی۔ صحیح مسلم (۳-۱۳۹۳) کتاب "الجہاد" باب جواز الاکل من طعام الغنیمة فی دار الحرب اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے"

اس حدیث سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ فاتحین حسب ضرورت کھانے پینے کی چیزیں مالِ غنیمت میں سے لے سکتے ہیں۔

قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ:

" علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسلمان جب تک دارالحرب میں مقیم ہوں اس وقت تک وہ امام کی اجازت سے یا اس کے بغیر حربی کافروں کا کھانا کھا سکتے ہیں اور امام زُہری کے علاوہ کسی عالم نے بھی اس کو امام کی اجازت کے ساتھ مشروط نہیں کیا جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ دارالحرب میں سے کوئی چیز دارالاسلام میں نہ لائی جائے اور اگر کوئی شخص دارالاسلام میں کوئی چیز لے جائے تو لازماً اس چیز کو مالِ غنیمت میں شامل کر دیا جائے گا، لیکن امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اس چیز کو مالِ غنیمت میں شامل کرنا ضروری نہیں۔ اس مسئلے میں بھی علماء میں اتفاق رائے ہے کہ مالِ غنیمت کی کسی چیز کو دارالحرب میں یا کسی اور جگہ فروخت نہ کیا جائے۔ اگر مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز مجاہدین کے علاوہ کسی اور کے پاس فروخت کر دی گئی ہو تو اس کی قیمت مالِ غنیمت میں شامل کی جائے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ حربی کافروں کے جانوروں پر سواری کرنا اور ان کا لباس اور اسلحہ جنگ کے دوران استعمال کرنا جائز ہے اور اس ضمن میں امام کی اجازت غیر ضروری ہے، البتہ امام اوزاعی دیگر ائمہ کے برعکس اجازت کی شرط عائد کرتے ہیں۔

دیکھیے شرح مسلم للنووی (۱۲-۱۰۲)

[2] ابن عبدالحکیم کا نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عبدالحکم بن اعین بن لیث مصری اور کنیت ابوالقاسم ہے۔ ابن یونس کہتے ہیں کہ یہ عظیم فقیہ تھے لیکن حدیث اور تاریخ میں ان کو زیادہ کمال حاصل تھا۔ القضاعی لکھتے ہیں کہ یہ اہل الحدیث میں سے تھے۔ یہ تاریخ کے عظیم عالم تھے۔ انھوں نے مصر کی تاریخ لکھی جس کا نام "فتوح مصر والمغرب" ہے۔ تاریخ پر ان کی اور بھی کتابیں ہیں۔ کتاب "فتوح مصر والمغرب" میں سے جو حصہ خاص طور پر مصر کی تاریخ سے متعلق ہے اُسے "مجلس المعارف الفرنسی" (شعبہ عادات شرقیہ) نے میسو ہنری ماسیہ کے زیر اہتمام ۱۹۱۴ء میں شائع کر دیا تھا۔

ابن ابی زید کہتے ہیں:

"ہمارے بعض ساتھیوں نے اس سلسلہ میں اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ غزوہ خیبر میں ایک شخص کو پوری کی جس میں چربی تھی" اس کے بعد ابن زید نے یہ مکمل حدیث روایت کی ہے۔

بعد ازاں توری نے ۱۹۲۰ء میں اسے دوسری دفعہ طبع کیا۔ یہ کتاب بعد میں آنے والے مؤرخین کے لیے عظیم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً الکندی متوفی ۳۵۰ھ، ابن زولاق متوفی ۳۸۷ھ، القضاعی متوفی ۴۵۴ھ، ابن دقماق متوفی ۸۰۹ھ، المقریزی متوفی ۸۴۵ھ ابوالمحاسن متوفی ۸۷۴ھ، سیوطی متوفی ۹۱۱ھ۔ یہ تمام مؤرخین بلا نقد و تبصرہ مذکورہ بالا کتاب سے اخذ و استفادہ کرتے تھے۔ (دیکھیے حسن ابراہیم حسن۔ حواشی دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۱-۲۲۲)

ابن عبدالحکیم نے ۲۵۷ھ میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب (۲-۲۰۶) میں ان کا تعارف لکھا ہے۔ جہاں تک ابن عبدالحکیم کی کتاب "مختصر المدونۃ" کا تعلق ہے وہ مجھے کہیں نہیں مل سکی۔

لہ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ اس میں کوئی کراہت نہیں جبکہ مالکی علماء مثلاً اشہب اور ابن القاسم اور امام احمد کے بعض ساتھی اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ جمہور علماء مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

"وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ (المائدہ-۵) اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کہتے ہیں کہ طعام سے مراد ذبیحہ ہے اور اس میں سے گوشت یا چربی وغیرہ کسی چیز کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ دیکھیے شرح مسلم للنووی (۱۲-۱۰۲) نیز المجموع (۹-۷۲) ان علماء کے نزدیک اس حدیث سے اس آیت کی تشریح اور تائید ہوتی ہے۔

طحاوی نے امام مالک اور ان کے ساتھیوں پر اعتراض کیا ہے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ یہودیوں کے ذبح کرنے کی صورت میں اونٹ اور ناخن والے جانوروں کا گوشت بھی نہ کھائیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ۔ (الانعام-۱۴۶)

اور یہودیوں پر ہم نے ناخنوں والے جانوروں کو حرام ٹھہرایا۔

اونٹ کا گوشت یہودیوں پر حرام تھا۔ امام طحاوی کہتے ہیں کہ اسی طرح ملکیہ کو چاہیے کہ وہ ہفتہ کے روز جس مچھلی کا شکار کریں اسے بھی نہ کھائیں۔ (اختلاف الفقہاء للطحاوی ص ۴۳، ۴۴)

ٹہ رسالہ ابن ابی زید (ص ۵-۱۴) میں لکھا ہے:

"کہ اہل کتاب کا کھانا اور ذبیحہ کھانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ یہود کے یہاں کی چربی کھانا مکروہ ہے مگر حرام نہیں"۔

بنو نضیر کے اموال اور خیبر کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

امام بخاریؒ[1] اور ابو عبیدؒ[2] نے ذکر کیا ہے کہ بنو نضیر کا مال اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں لڑے بغیر دے دیا لہٰذا وہ آپ کے لیے مختص تھا۔ اس میں سے آپ اپنے اہلِ خانہ کو ایک سال کا خرچ دیا کرتے تھے اور جو باقی بچ جاتا اس سے جہاد کی تیاری کے لیے گھوڑے اور اسلحہ وغیرہ خریدتے۔

المستخرجہ اور النوادر[3] میں ہے کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام صدقات بنی نضیر کے مال میں سے دیا کرتے تھے۔ اس مال میں سے خمس نہیں نکالا گیا تھا کیونکہ یہ بلا قتال حاصل ہوا تھا۔ اس کے برعکس بنو قریظہ کے مال میں سے خمس نکالا گیا تھا کیوں کہ وہ لڑ کر حاصل کیا گیا تھا۔

ابو عبیدؒ[4] کے بیان کے مطابق بنی نضیر کا واقعہ غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد ہوا۔ امام بخاریؒ[5] نے صحیح بخاری میں اور ابن ابی زید نے مختصر المدونہ میں امام زہری کی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ محرم ۳ھ میں پیش آیا۔ ابن شہاب زہری کے علاوہ دوسروں سے ۴ھ منقول ہے کہ سورۂ الحشر انہی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس سے پہلے اس واقعہ کا ذکر گزر چکا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں (النوادر اور المستخرجۃ) میں منقول ہے: امام مالکؒ فرماتے تھے :

---

[1] صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "حدیث بنی النضیر" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۰۳۳)

[2] "کتاب الاموال" لابی عُبَید ص ۱۴

[3] النوادر: کتاب کا پورا نام "النوادر والزیادات علی ما فی المدونۃ وغیرھا من الامھات" لابی محمد عبداللہ بن ابی زید عبد الرحمٰن القیروانی متوفی ۳۸۶ھ۔

اس کتاب کا قلمی نسخہ مکتبہ ایا صوفیا ترکی میں محفوظ ہے۔ عرب لیگ نے اس کی فوٹو کاپی کرائی ہے۔ یہ انیس جلدوں میں ہے۔ اس کے مکمل تعارف کے لیے دیکھیے فہرست عرب لیگ (۱-۲۸۲)

مجھے اس کتاب سے استفادہ کا موقع نہیں مل سکا۔

[4] کتاب الاموال لابی عُبَید ص ۱۵۔

[5] امام بخاری نے یہ حدیث مذکورہ بالا باب میں امام زہری سے "معلق" روایت کی ہے۔ عبد الرزاق نے المصنف (۵-۳۵۷) میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اس کو متصل سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ نیز دیکھیے ابن کثیر کی البدایۃ والنہایۃ (۴-۷۴)

"خیبر معمولی لڑائی کے بعد فتح ہو گیا تھا اور مالِ غنیمت میں سے خمس بھی نکالا گیا تھا، البتہ اس کا جو علاقہ لڑائی کے بجائے صلح کے ذریعہ حاصل کیا گیا تھا، اس میں سے خمس نہیں نکالا گیا تھا۔"

امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے ابن شہاب زہری کو یہ کہتے سنا "خیبر کا کچھ حصہ صلح کے نتیجے میں ملا تھا اور کچھ حصہ جنگ کے ذریعے فتح کیا گیا تھا، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اس سے زہری کا مقصد کیا ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ خیبر کے مالِ غنیمت کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ان اٹھارہ حصوں کو اٹھارہ سو مجاہدین میں اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ہر سو مجاہدین کو ایک ایک حصہ دیا گیا۔

ابو عُبید کہتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے مالِ غنیمت کو چھتیس حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر حصہ ایک سو حصوں پر مشتمل تھا۔ مالِ غنیمت کا نصف حصہ ہنگامی حوادث کے لیے مخصوص تھا اور باقی نصف کو مجاہدین میں تقسیم کیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں شِق[۳] (خیبر کا ایک قلعہ) اور النَّطاۃ[۴] (خیبر میں ایک قلعہ یا چشمہ) اور ان کا ملحقہ علاقہ آیا۔

---

[۱] ابن سعد کہتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مجاہدین شمار کرنے کا کام تفویض کیا تھا۔ ان کی مردم شماری کے مطابق مجاہدین کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔ دو سو گھوڑے تھے۔ ہر گھوڑے کو مالِ غنیمت میں سے دو حصے ملتے ہیں۔ اس طرح دو سو گھوڑوں کو چار سو حصے ملے۔

[۲] دیکھیے کتاب الاموال ص ۷۹۔ اور سنن ابوداؤد (۳۔ ۱۵۹) کتاب "الامارۃ" باب "خیبر" میں بشیر بن یسار کی روایت کردہ حدیث۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ خیبر کے مالِ غنیمت کو چھتیس حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے نصف یعنی اٹھارہ حصے ہنگامی ضروریات کے لیے الگ کر لیے گئے۔ اور باقی ماندہ اٹھارہ حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیے گئے۔

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں:

"کہ خیبر کے مالِ غنیمت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھتیس حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے ہر حصہ ایک سو حصوں پر مشتمل تھا۔ اس طرح کل تین ہزار چھ سو حصے ہوئے۔ اس میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو نصف یعنی ایک ہزار آٹھ سو حصے دیے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا حصہ ملا جتنا ایک عام آدمی کو ملتا ہے۔ دوسرے نصف کو، جو اٹھارہ سو حصوں پر مشتمل تھا، الگ کر لیا گیا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہلِ حدیبیہ کو یہ عطیہ دیا گیا تھا۔ خواہ ان میں سے کوئی شخص خیبر میں حاضر ہوا یا نہ ہوا ہو۔ حدیبیہ کے شرکا کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔ ان کے ساتھ دو صد سوار تھے۔ ہر گھوڑے کو دو حصے دیے گئے۔ اس طرح چودہ سو مجاہدین اور دو سو گھوڑوں کو کل ایک ہزار آٹھ سو حصے دیے گئے۔" (زاد المعاد (۲۔ ۱۳۷))

[۳] "الشِّق" بفتح الشین اور ایک روایت کے مطابق بکسر الشین۔ خیبر میں ایک قلعہ کا نام ہے۔ بعض نسخوں میں "المسبق" ہے جو فاش غلطی ہے۔

[۴] النطاۃ بفتح النون جس کے آخر میں ھا ہے۔ خیبر میں ایک علاقے کا نام ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ خیبر میں ایک قلعہ یا چشمہ کا نام ہے۔

ابن عُقبہؒ کہتے ہیں کہ الشق[۱] اور النطاۃ پانچ حصّوں پر مشتمل تھا۔

خیبر کے مالِ غنیمت میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حصّہ بطور وقف رکھا وہ کُتَیْبَہ[۲] (نامی بستی) وَطیحہ[۳] (نامی قلعہ) اور سُلَالِم[۴] (نامی قلعہ) پر مشتمل تھا۔ جب یہودِ خیبر کی جائدادیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آئیں تو زمینوں کا کام سنبھالنے کے لیے آپ کے پاس کارکن نہ تھے۔ اس لیے آپ نے وہ زمینیں نصف بٹائی پر یہودیوں کو دے دیں۔

"الواضحۃ" میں ہے کہ جو سات باغات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف کیے تھے وہ بنی نضیر کی جائدادوں میں سے تھے۔ آگے "باب الاخماس" میں ان کا ذکر آ رہا ہے۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب فرمایا کرتے تھے کہ اگر بعد میں آنے والے لوگ نہ ہوتے تو جو علاقہ بھی فتح ہوتا میں اسے اسی طرح تقسیم کر دیتا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینیں تقسیم فرما دی تھیں۔

۱۔ ابن عقبہ صاحب المغازی ہیں۔ ان کا تعارف اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ابن اسحاق نے بھی اس کے بارے میں یہی بیان کیا ہے۔

۲۔ الکُتَیْبَہ۔ باتا بعد الکاف۔ تصغیر کا وزن۔ یہ خیبر میں ایک بستی کا نام ہے۔

۳۔ الوَطِیحہ۔ بفتح الواؤ وکسر الطاء۔ خیبر کے ایک قلعہ کا نام ہے۔

۴۔ سُلَالِم بضم السین وبعد الالف لام مکسورۃ۔ خیبر کے ایک قلعہ کا نام جو سب سے آخر میں فتح ہوا (یاقوت)

۵۔ دیکھیے کتاب الاموال لابی عُبَید ص ۰۸۔ نیز صحیح بخاری کتابُ الحرث والمزارعۃ" بابٌ اوقاف اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وارض الخراج (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۳۳۴)

سہیلیؒ الروض الانف" (۲-۵۸۱) میں لکھتے ہیں کہ:

جب سرزمین عراق فتح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی زمینوں کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے ہمنوا تھے کہ اس کو وقف کر دیں اور تقسیم نہ کریں۔ شام کی زمینوں کے بارے میں بھی اسی قسم کا اختلاف بپا ہوا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر آپ نے یہ تقسیم کر دی تو بعد میں آنے والے مسلمانوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ یا انھوں نے اس سے ملتی جلتی بات کہی۔ حضرت عمرؓ نے معاذؓ بن جبل کی رائے پر عمل کیا

قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:۔

صحابہ کرام کم و بیش دو تین دن تک مشورہ کرتے رہے مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ تب حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرے ذہن میں ایک دلیل آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ

اور جو (مال) خدا نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے (بغیر لڑائی کے) دلوایا ہے اس میں تمھارا کچھ حق نہیں کیونکہ اس کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ لیکن خدا

امام مالک اور ابو عبید نے ذکر کیا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت عمرؓ سے ملک شام کی اراضی تقسیم کرنے کی درخواست کی۔ اس سلسلے میں حضرت بلالؓ کا موقف زیادہ سخت تھا۔ حضرت عمرؓ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! آپ مجھے ان سے بچا۔

مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (۶)

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۷)

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۸)

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (۹)

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ

اپنے پیغمبروں کو جن پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (۶)

جو مال خدا نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ خدا کے اور پیغمبر کے اور (پیغمبر کے) قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور حاجت مندوں کے اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ بے شک خدا سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۷)

اور ان مفلسان تارک الوطن کے لیے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کر دیے گئے ہیں۔ اور خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار اور خدا اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں یہی لوگ سچے ایمان دار ہیں۔ (۸)

اور (ان لوگوں کے لیے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے (اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور خلش) نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔ اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔ (۹)

اور (ان کے لیے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے اور دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں

ابوعُبَید کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دعا کی کہ "اے اللہ! مجھے بلالؓ اور ان کے رفقاء سے بچا"۔[1]

ابن ہشام کہتے ہیں کہ خیبر کا واقعہ صفر ۷ھ میں پیش آیا۔[2]

امام مالک فرماتے ہیں کہ غزوہ خیبر[3] شدید سردی کے موسم میں ہوا تھا۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ ہم اس سردی میں نہیں لڑ سکتے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا "کیوں؟" صحابہؓ نے عرض کی "سردی شدید ہے اور نہ کچھ پہننے کے لیے ہے اور نہ کچھ کھانے پینے کے لیے"۔

حضورؐ نے دعا فرمائی "اے اللہ! آج وہ علاقہ فتح کر دے جس میں کھانا اور گوشت زیادہ ہو"۔ اس دعا کے نتیجے میں خیبر فتح ہوا۔

---

(۱) سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ (۱۰)

کہ جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (و حسد) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔ (۱۰)

سورۃ الحشر کی ان آیات میں پہلے بنی نضیر کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اہلِ ایمان کی مختلف قسموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں مہاجرین کا اور پھر انصار کا ذکر کیا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ بعد میں آنے والے مومنین کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ آیت عام ہے اور بعد میں آنے والے تمام اہلِ ایمان شامل ہیں۔ جب فیئ کا یہ مال تمام اہلِ ایمان کے لیے ہے، جن میں موجودہ اہلِ ایمان اور بعد میں آنے والے مومنین بھی شامل ہیں، تو ہم اس کو صرف موجود لوگوں میں تقسیم کر کے بعد میں آنے والوں کو کیسے محروم کریں؟ حضرت عمرؓ نے مصمم ارادہ کیا کہ اس اراضی کو مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جائے اور اس سے جو فائدہ ہو اس کو بیت المال میں محفوظ رکھا جائے۔

یہ اقتباس طویل ہو گیا ہے لیکن اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فہمِ قرآن اور اس سے استنباط کا کس قدر صحیح ملکہ رکھتے تھے۔ فقہائے کرام میں امام مالکؒ بھی حضرت عمرؓ کی رائے پر عمل پیرا تھے۔ اس کے برعکس امام شافعیؒ کا موقف یہ ہے کہ مفتوحہ اراضی کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں کیا تھا۔

[1] حضرت عمرؓ اور حضرت بلالؓ کے درمیان پایا جانے والا یہ اختلاف دراصل اصولی اختلاف تھا۔ حضرت بلالؓ کی رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کو اسی طرح تقسیم کیا جائے جس طرح خیبر کی زمینوں کو تقسیم کیا گیا تھا۔ جبکہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد یہ تھا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے کچھ حصہ بعد کے لوگوں کے لیے بھی رکھا جائے۔

[2] ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ (۴-۱۸۱) میں اس بات کو صحیح تر قرار دیا ہے کہ خیبر کا واقعہ ۷ھ کے آغاز میں پیش آیا۔ واقدی کا بھی یہی خیال ہے۔

[3] خیبر مدینہ منورہ سے آٹھ منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ یہودیوں کا مسکن اور ان کا فوجی مرکز تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انھوں نے یہود کو خیبر سے جلا وطن کر دیا تاکہ جزیرۂ عرب میں دو دین نہ رہیں۔

ابن ہشام کہتے ہیں[1] خیبر کا مالِ غنیمت اہلِ حدیبیہ میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے جو لوگ موجود تھے ان کو بھی دیا گیا اور ان کو بھی جو موجود نہ تھے۔ اور اہلِ حُدیبیہ میں سے صرف حضرت جابرؓ بن عبداللہ تھے جو خیبر میں شرکت نہ کرسکے تھے۔ ان کی عدمِ شرکت کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حصہ نکالا۔

المفضل نے لکھا ہے:

"جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ فدک[2] کے درمیان مصالحت کروانے کی کوشش کی تھی۔ آپؐ نے ان کو غلّہ دیا۔ ان میں سے محیّصہ[3] بن مسعود بھی تھے۔ آپؐ نے ان کو تیس[4] وسق جَو عطا کیے۔"

---

[1] سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خیبر کے لیے ہمارے ساتھ صرف وہی شخص جائے جو حُدیبیہ میں حاضر ہوا ہو۔ ہاں رضاکارانہ طور سے جانے کی دوسروں کو بھی اجازت ہے مگر مالِ غنیمت میں سے انھیں کچھ نہیں ملے گا۔" (دیکھیے الواقدی ص ۲۱۳)

البتہ جعفرؓ کے وہ رفقاء جو ان کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئے تھے خیبر میں شمولیت کر سکتے ہیں۔ ابن اسحاق نے مہاجرینِ حبشہ کے نام بھی لکھے ہیں۔ وہ سولہ آدمی تھے۔ رسولِ کریمؐ نے خیبر کے مالِ غنیمت میں سے ان کو حصّہ دلایا (کتاب الخراج از یحییٰ بن آدم ص ۱۳)

[2] فدک، حجاز میں ایک بستی کا نام ہے۔ اس کے اور مدینہ طیبہ کے درمیان دو یا تین دن کی مسافت ہے۔ (یاقوت)

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے فارغ ہوئے تو اہلِ فدک خیبر کے واقعات سُن کر مرعوب ہوگئے۔ انھوں نے حضورؐ کو فدک کا نصف غلّہ دے کر مصالحت کرلی۔

بلاذری فتوح البلدان (ص ۴۲) میں لکھتے ہیں کہ اہلِ فدک کا رئیس یوشع بن نون یہودی تھا۔

یحییٰ بن آدم "کتاب الخراج" (ص ۴۱) میں لکھتے ہیں کہ:

[3] نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودِ فدک کے درمیان محیّصہ بن مسعود نے مصالحت کروائی تھی۔ محیّصہ بن مسعود حُویّصہ کے بھائی تھے۔ ان کی کنیت ابوسعد تھی۔ ان دونوں بھائیوں کا واقعہ صحیحین میں مشہور ہے۔ یہ واقعہ سہل بن سعد بن ابی خثیمہ نے عبداللہ بن سہل کے قتل کے سلسلے میں باب القسامہ میں روایت کیا ہے۔ (دیکھیے صحیح بخاری و مسلم باب حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القسامۃ فی من لم یعرف قاتلہ)

کفار سے ایفاء عہد اور قاصد کو قتل نہ کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے اور قرآنی احکام

سنن ابوداؤد (کتاب الجہاد، باب فی الرسل) میں مذکور ہے :-

لہ سنن ابوداؤد (۳-۸۳) کتاب "الجہاد" باب "فی الرسل" بروایت محمد بن اسحاق، وہ قبیلۂ اشجع کے ایک شیخ سے روایت کرتے ہیں جو سعد بن طارق کہلاتے تھے (سعد بن طارق ثقہ راوی ہیں۔ ان کی کنیت ابو مالک اشجعی کوفی ہے) وہ سلمہ بن نُعیم بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد نُعیم سے۔ سلمہ اور ان کے والد دونوں صحابی ہیں۔ ابوداؤد، المنذری اور حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، البتہ اس حدیث کی سند میں محمد بن اسحاق مشہور مُدلّس ہے۔ اس نے عن عن کے ساتھ روایت کی ہے، مگر کسی ناقدِ حدیث نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی۔

مُسَیلمہ نے جو دو قاصد بھیجے تھے ان میں سے ایک ابن نَوّاحہ (بفتح النون وتشدید الواؤ) تھا اور دوسرا ابن اُثال (ہمزہ کی پیش کے ساتھ) امام احمد اور ابویعلیٰ نے اپنی اپنی مسند میں اس روایت کا ذکر ایک طویل حدیث میں کیا ہے جو ابو وائل سے مروی ہے۔ اور ابو وائل، عبداللہؓ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ (دیکھیے ہیثمی کی مجمع الزوائد (۵-۳۱۴) وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند حسن کے درجہ کی ہے۔

سُنن ابوداؤد میں سفیان سے مروی ہے۔ وہ ابن اسحاق سے اور وہ حارثہ بن مضرب سے روایت کرتے ہیں کہ وہ عبداللہؓ بن مسعود کے یہاں آئے اور کہنے لگے:" میرے اور کسی عربی کے درمیان کوئی عداوت نہیں پائی جاتی۔ میرا گزر قبیلۂ بنو حنیفہ کی ایک مسجد میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مُسیلمہ (کذاب) پر ایمان رکھتے ہیں۔ عبداللہؓ بن مسعود کے بلانے پر بنو حنیفہ آپ کے پاس حاضر ہوئے۔ آپ نے ابن نوّاحہ کے علاوہ سب سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور ابن النوّاحہ سے کہا کہ تمہارے بارے میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا تھا کہ" اگر تم قاصد نہ ہوتے تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا" لیکن آج تمہاری حیثیت قاصد کی نہیں ہے، چنانچہ حضرت عبداللہؓ نے قرظہ بن کعب کو اس کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ قرظہ نے بازار میں اس کی گردن اڑا دی اور کہا :

" جو شخص بازار میں ابن نوّاحہ کی لاش کو دیکھنا چاہے دیکھ لے۔"

اس حدیث کی سند میں ابن اسحاق مُدلّس راوی ہے اور اس نے حارثہ بن مُضرب سے عن عن کے ساتھ روایت کی ہے۔ المنذری کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام نسائی نے بھی روایت کی ہے۔

یہ حدیث ابوحاتم نے ابوبکر بن عیاش سے، اس نے عاصم سے، اس نے ابو وائل سے، اس نے ابن معین سعدی سے اور اس نے

"نعیم[1] بن مسعود اشجعی سے مروی ہے کہ مسیلمہ[2] کذاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھا۔ ایک قاصد نے وہ خط پڑھ کر حضور کو سنایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خط سن کر دونوں قاصدوں سے پوچھا" مَا تَقُوْلَانِ اَنْتُمَا "
(تم دونوں کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟) ان دونوں نے جواب دیا" ہم بھی وہی کہتے ہیں جو مسیلمہ نے لکھا ہے"
یہ سن کر حضور نے فرمایا:

اَمَا وَاللّٰهِ لَوْلَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ اَعْنَاقَكُمَا۔	اللہ کی قسم! اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا۔

ابورافع[3] روایت کرتے ہیں کہ مجھے قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قاصد بنا کر بھیجا۔ جب میں نے آپؐ

عبداللہ سے بھی روایت کی ہے۔ ثوری کا حافظہ ابوبکر کے حافظے سے بہتر ہے اور میرا خیال ہے کہ عاصم نے ابووائل سے روایت کیا تھا کہ ایک شخص جس کا نام ابومعین تھا وہ بنی حنیفہ کی مسجد سے گزرا، لیکن ابوبکر نے غلطی سے ابووائل عَنْ ابن معین بنا دیا۔ میرے نزدیک ثوری (جس نے روایت کی ہے کہ ابومعین کا گزر مسجد کے پاس سے ہوا) راوی ابوبکر سے زیادہ ذہین اور بہتر حافظ حدیث ہے۔ (العلل لابی حاتم ج ۱ ص ۳۰۴)

حافظ ابن حجر "التلخیص الحبیر" (۴-۱۰۴) اور ابن الاثیر "اسد الغابۃ" (۵-۸۴) میں لکھتے ہیں کہ ابونُعیم نے "معرفۃ الصحابۃ" میں وبیر بن شہر الحنفی کے تعارف میں لکھا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے وبیر بن شہر بن شغاف الحنفی اور ابن نواحہ کو قاصد بنا کر بھیجا تھا۔ ان میں سے وبیر نے تو صحیح اسلام قبول کر لیا، لیکن دوسرے دونوں کہتے تھے کہ حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور مسیلمہ آپ کے بعد منصب رسالت پر فائز ہے، چنانچہ حضورؐ نے ان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ تعمیل حکم میں ان کو پکڑ کر ایک مکان میں بند کر دیا گیا۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ "حضورؐ یہ دونوں آدمی مجھے عطا کیے جائیں"۔ آپؐ نے انھیں اس شخص کے حوالے کر دیا۔

وبیر حضورؐ کی وفات تک آپؐ کی صحبت میں رہ کر قرآن کریم پڑھتا رہا۔

امام شوکانی "نیل الاوطار" (۸-۱۸۲) میں لکھتے ہیں:

"کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ کفار کے قاصدوں کو قتل کرنا حرام ہے۔ اگر وہ امیرالمومنین اور اہل اسلام کے سامنے کلمۂ کفر کہیں تب بھی انھیں قتل نہیں کیا جاسکتا"۔

[1] نُعیم بن مسعود مشہور صحابی ہیں۔ غزوۂ خندق کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے۔ وہ نُعیم ہی تھے جو قُریظہ اور غطفان کے قبائل کے پاس گئے اور ان میں پھوٹ ڈالی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قبائل مدینہ سے چلے گئے۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے آغاز میں قتل ہوئے۔ بعض مورخین کے نزدیک انھوں نے حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

[2] "مُسَیْلَمَہ" مشہور مدعی نبوت جس کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے جنگ لڑی۔

[3] ابورافع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ مشہور ترین روایت کے مطابق ان کا نام اسلم تھا۔ انھوں نے مدینہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت سے تھوڑا سا عرصہ پہلے یا بعد میں وفات پائی۔

کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی - میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! اللہ کی قسم میں ہرگز قریش کے پاس نہیں جاؤں گا۔" یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا :

اِنِّی لَا اَخِیْسُ بِالْعَھْدِ وَلَا اَحْبِسُ الْبُرُدَ وَلٰکِنْ اِرْجِعْ اِلَیْھِمْ فَاِنْ کَانَ فِیْ نَفْسِکَ الَّذِیْ فِیْ نَفْسِکَ الْاٰنَ فَارْجِعْ۔	میں عہد شکنی نہیں کرتا اور نہ ہی قاصدوں کو روکتا ہوں - تم واپس قریش کے پاس جاؤ اگر وہاں بھی تمہارے دل میں اسلام کی ویسی محبت ہو جیسی اب ہے تو پلٹ کر آجانا -

ابو رافع کہتے ہیں "میں قریش کے یہاں چلا گیا - پھر واپس حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔"[1]

صحیح بخاری[2] میں ہے کہ ابو جندل لوہے کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ابو جندل[3] لوہے کی بیڑیوں کے بوجھ سے لڑکھڑا رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی وجہ سے اسے مکہ واپس بھیج دیا - قریش کے ساتھ معاہدہ یہ تھا کہ جو کافر حضورؐ کے پاس آئے گا اُسے واپس کر دیا جائے گا -

صحیح بخاری[4] میں یہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو جندلؓ کو ان کے والد سہیل[5] بن عمرو کے حوالے کر دیا - یہ وہی سہیل ہے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کی نمائندگی کر رہا تھا - اس معاہدہ میں تین شرائط طے پائی تھیں -

---

[1] ابوداؤد (۳-۸۲) کتاب "الجہاد" باب "فی الامام یستجن بہ فی العھود" امام شوکانی نیل الاوطار (۸-۱۸۲) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث نسائی نے روایت کی اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

الخطابی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قاصد اس لیے بنا کر بھیجا جاتا ہے کہ وہ مکتوب الیہ سے جواب لائے - اگر قاصد کو قتل کر دیا جائے، تو بھیجنے والے کو جواب کیسے ملے گا؟ اس طرح گویا یہ ایک معاہدہ ہے جو کاتب اور مکتوب الیہ کے مابین طے پاتا ہے کہ قاصد کی واپسی تک اس سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔"

[2] صحیح بخاری کتاب "الشروط" باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اھل الحرب وکتابۃ الشروط" (دیکھیے مفصل حدیث - فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۳۱ - ۲۷۳۲)

[3] ابو جندلؓ: ایک قول کے مطابق ان کا نام العاصی تھا - بنی لوئی کے قبیلہ سے تھے - فتح مکہ سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی لڑائی میں شریک نہ ہو سکے - حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں اپنے والد سہیلؓ کی رفاقت میں لڑتے ہوئے دونوں باپ بیٹے نے شام میں شہادت پائی -

[4] صحیح بخاری کتاب "الصلح" باب "الصلح مع المشرکین" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۰۰)

[5] سہیلؓ ابو جندل ابن عمرو بن عبد شمس القرشی العامری ہے - یہ قریش کے خطیب تھے - مؤلفۃ القلوب میں سے تھے - انھوں نے

۱۔ مشرکین میں سے جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے گا آپ اسے واپس کر دیں گے۔
۲۔ مسلمانوں میں سے جو شخص مشرکین کے پاس جائے گا وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔
۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیندہ سال مکہ آکر صرف تین دن قیام کریں گے۔ مسلمان اپنے ہمراہ صرف تلوار، کمان اور اسی طرح کے اسلحہ نیاموں میں بند کر کے لائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَلْعَهْدُ بَيْنَنَا كَشَرْجِ الْعَيْبَةِ" ہمارا اور قریش کا یہ معاہدہ اس طرح باہم مربوط ہے کہ اس کی ایک شرط کی خلاف ورزی سے سارا معاہدہ ختم ہو جائے گا۔

حضرت ابوجندل مسلمانوں کے پاس حدیبیہ میں صلح نامہ کی تحریر سے پہلے پہنچ گئے تھے۔

صحیح بخاری کتاب "الشروط" میں یہ بھی ہے کہ سُہیل غزوۂ بدر کے قیدیوں میں شامل تھا[1]

ابوسلیمان الخطابی اپنی کتاب "شرح غریب الحدیث" میں لکھتے ہیں[2]:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل سے کوئی بات پوشیدہ رکھے بغیر انھیں ان کے والد اور اہل خانہ کے حوالے کر دیا تھا۔ البتہ جو خواتین مسلمان ہو کر آتیں انھیں واپس قریش کے سپرد نہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنہ - ۱۰) ان (خواتین) کو واپس کفار کے سپرد مت کرو

اس سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن سنّت کا ناسخ ہے[3]۔

شام میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہیں مقیم رہے حتٰی کہ طاعونِ عمواس میں وفات پائی۔

[1] صحیح بخاری کتاب "الشروط" میں یہ روایت مجھے نہیں، البتہ ابن اسحاق اور دوسرے اصحابِ سِیَر نے ذکر کیا ہے کہ غزوۂ بدر میں یہ قید ہوئے تھے۔ مالک بن الدخشم برادر بنی سالم بن عوف نے ان کو قید کیا تھا۔ مالک یہ شعر گنگناتے تھے ؎

اسرتُ سُهَيلاً فلا ابتغی　　　اسيراً به من جميع الامم

(میں نے سُہیل کو قیدی بنا لیا ہے۔ میں اس کے بدلے میں دنیا کے کسی قیدی کو نہیں لینا چاہتا)

قریش مکہ نے سُہیل کے فدیہ میں مکرز بن حفص بن الاخیف کو مدینہ بھیجا تھا۔ دیکھیے الروض الانف (۵ - ۱۰۹)

[2] خطابی کی "شرح غریب الحدیث" آج کل کہیں موجود نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری (۵ - ۳۴۵) میں الخطابی سے نقل کرتے ہیں:

"کہ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور نے ابوجندل کو ان کے والد کی طرف اس لیے لوٹا دیا کہ والد سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اسے ہلاک کر دے گا، البتہ اسے قید و بند اور اذیت کی صعوبتوں سے دوچار کر سکتا ہے۔ جن سے وہ ناگزیر ضرورت کے وقت تقیہ کے ذریعے بھی نجات پا سکتے تھے۔

[3] علمائے اصول اس بارے میں متفق ہیں کہ قرآن سنّت کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن قطعی الدلالۃ ہے اور وہ ظنی الدلالۃ (حدیث) کو منسوخ کر سکتا ہے، البتہ حدیث کے ناسخِ قرآن ہونے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں

المفضل نے ذکر کیا ہے کہ حدیبیہ کے دن سُبَیعۃؓ اسلمیہ مسلمان ہو کر مکّہ سے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اُن کا خاوند ان کی تلاش میں آیا۔ اس نے آپؐ سے کہا کہ محمدؐ! میری بیوی مجھے واپس کر دو۔ ابھی تو تمھارے عہد نامے کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ	اے ایمان والو! جب مومن عورتیں تمھارے پاس
الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ	ہجرت کر کے آئیں .... تو انھیں واپس کر
(الآیۃ) (سورۃ الممتحنۃ - ۱۰)	کے کفار کے حوالے مت کرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون سے اس مضمون کا حلف لیا:

راجح موقف یہ ہے کہ سنت بھی ناسخ قرآن ہو سکتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں اس کی بکثرت مثالیں پیش کی ہیں۔

قرآن کے ناسخ حدیث ہونے کی علماء اصول نے متعدد مثالیں دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ قرآنی آیات کے نازل ہونے سے یہ منسوخ ہو گیا۔ رمضان کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت حرام تھی، قرآن کریم نے ان کو منسوخ کر کے مجامعت کی اجازت دی۔ جہاد و قتال کے دوران حالتِ خوف میں نماز کو مؤخر کرنے کی اجازت تھی۔ قرآن کریم نے اسے منسوخ ٹھہرا کر بروقت نمازِ خوف ادا کرنے کا حکم صادر کیا۔

لہ سُبَیعۃ (بضم السین المہملہ وفتح الباء) بنت الحارث۔ ان کا ذکر آگے کتاب النکاح والطلاق میں آرہا ہے۔ ابن الاثیر نے ان کا نام سعیدہ کسی نسبت کے بغیر لکھا ہے (دیکھیے "اسد الغابۃ" ۵-۲۷۵) یہ ابو صیفی الراہب کی بیوی تھیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی "الاصابۃ" (۵-۳۲۱) میں لکھتے ہیں کہ یہ انصار میں سے تھیں۔ اہلِ مدینہ جب مشرف باسلام ہوئے تو ابو صیفی ان سے ناراض ہو کر مدینہ سے چلا گیا۔ جن دنوں مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں میں صلح ہوئی تو ابو صیفی کی بیوی ہجرت کی نیت سے مدینہ منورہ پہنچ گئی۔ مکہ والوں نے کہا کہ اس کو واپس مکہ بھیج دیا جائے۔ اسی اثنا میں سورۃ "الممتحنۃ" کی آیت نازل ہوئی۔ حافظ ابن حجر اور ابن اثیر دونوں نے یہ بات تفسیر ابن حبان سے نقل کی ہے۔ قرطبی نے بھی اس کو اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اس عورت کا نام انھوں نے سُبَیعۃ بنت الحارث اسلمیہ اور اس کے خاوند کا نام صیفی بن راہب بتایا ہے۔ تصحیح کرنے والے نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "سُبَیعۃ" درست نہیں۔ اس عورت کا اصل نام سعیدہ تھا۔ اس کے لیے اس نے ابن اثیر کا حوالہ دیا ہے۔ ابن عبدالبر نے "سعیدہ" کا تعارف نہیں لکھا۔

طبری نے اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ ام کلثوم بنت عُقبہ بن ابی مُعَیط کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ اُمّ سلیم کے خاوند عمرو بن العاص مدینہ آئے۔ ان کے ساتھ اُمّ کلثوم کے دو بھائی عمارہ اور ولید بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دونوں بھائیوں کو واپس کر دیا مگر اُمّ کلثوم کو روک لیا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس عورت کا نام اُمیمہ بنت بشر اور اس کے خاوند کا نام ثابت بن شمراخ تھا۔ مقاتل کا قول ہے کہ وہ خاتون سعیدہ زوجہ صَیفی بن راہب تھی۔

قُرطبی مزید لکھتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک وہ خاتون ام کلثوم ہی تھیں۔

"مجھے اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں محض اسلام کے شوق اور اس کی خواہش اور محبت کی وجہ سے مکہ چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔ اپنے خاوند کے ساتھ مجھے کوئی بغض و عناد نہیں۔ نہ ہی میری قوم میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے میں یہاں آئی ہوں"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خاوند کو اس کا مہر بھی واپس کر دیا اور جو کچھ اس نے خرچ کیا تھا وہ بھی، مگر اس خاتون کو واپس نہ بھیجا۔

النحاسؒ اور دیگر اہلِ علم کا قول ہے کہ یہ (معاہدہ کی شرط) منسوخ ہو چکی ہے۔

النحاس اور الزجاج نے بھی اسی طرح لکھا ہے، مگر دونوں نے سُبَیعہ کے نام کا ذکر نہیں کیا۔

لہ نحاس نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" (ص ۲۳۹) میں یہ بات لکھی ہے۔ نحاس اس آیت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اہلِ علم کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ کے ساتھ یہ جو معاہدہ کیا تھا کہ جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آئے گا آپؐ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ وہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد خواتین کے بارے میں منسوخ ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا کہ جب کوئی عورت مسلمان ہو جائے اور ہجرت کر کے دارالاسلام میں آجائے تو اس کا اچھی طرح امتحان لیں اور اگر وہ عورت درحقیقت مسلمان ہو چکی ہو تو اسے واپس نہ کریں"۔

ابو جعفر نحاس کہتے ہیں:

"یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن سنت کو منسوخ کر سکتا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ معاہدہ مردوں اور عورتوں دونوں کے بارے میں منسوخ ہو چکا ہے، لہٰذا امام اس بات کا مجاز نہیں کہ کفار کے ساتھ اس شرط پر مصالحت کرے کہ ان میں سے جو شخص مسلمان ہو کر دارالاسلام میں آئے گا اسے واپس کیا جائے گا۔ اس لیے کہ کسی عالم کے نزدیک بھی ایسے دارالشرک میں مسلمان کا قیام درست نہیں، جہاں کفر و شرک کی فرمانروائی ہو"۔

مگر یہ آخری قول درست نہیں کیونکہ رسول اللہ نے حسبِ معاہدہ ابو جندلؓ، ابو بصیرؓ اور ابو رافعؓ کو مکہ واپس کیا۔ علاوہ ازیں اس قول کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب سے اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا اس وقت سے لے کر آج تک اہلِ اسلام کفار کے ملکوں میں سکونت گزیں رہتے چلے آئے ہیں اور کوئی عالم اس پر معترض نہیں ہوا۔

مسلمان مرد یا عورت کی طرف سے امان دینے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

ابن سلام نے اپنی تفسیر میں کلبی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

"مشرکین میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تو کوئی امن کا معاہدہ کیا تھا اور نہ ہی وہ مصالحت کے موقع پر حاضر ہو سکے تھے۔ ان کو پتہ چلا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ محرّم گزر جانے کے بعد غیر معاہد کفار سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ محرّم گزرنے کے بعد حضورؐ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے مدینہ حاضر ہوئے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مصالحت کی صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ سچے دل سے اسلام قبول کرو۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ مشرکین نے یہ شرط تسلیم نہ کی۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا یہاں تک کہ وہ اپنے گھروں میں واپس پہنچ گئے۔ یہ لوگ بنی قیس بن ثعلبہ کے عیسائی تھے۔ وہ یمامہ چلے گئے۔[1] اس اثنا میں بہت سے لوگ مشرف باسلام ہوئے اور ان میں سے بھی بعض اسلام لائے اور بعض نصرانیت پر قائم رہے۔"

مسند ابی شیبہ اور سیرت[2] کی کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے خاوند

---

[1] قرآن کریم میں ہے:

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (التوبۃ۔۵)

جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور پکڑ لو اور گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھے رہو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ حرام مہینے گزرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے اور مشرکین کے درمیان معاہدۂ امن کرنے کا اختیار نہ تھا۔

[2] دیکھیے سیرت ابن ہشام (۱: ۶۵۷-۶۵۸) بیہقی (۹-۹۵) مستدرک حاکم (۴-۴۵) اور الطبرانی کی "المعجم الاوسط" میں باختصار کے ساتھ بروایت حضرت ام سلمہؓ۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ راوی اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی روایت کو حسن کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۵-۳۳۰)

ابوالعاص کے پاس کچھ مال تھا وہ مسلمانوں کے ایک دستہ نے چھین لیا۔ ابوالعاصؓ بھاگ گئے۔
پھر رات کو مال کی تلاش میں وہ (اپنی زوجہ) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر آئے اور پناہ طلب کی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے لیے تکبیر کہی تو حضرت زینبؓ نے خواتین والی جانب سے بآواز بلند کہا:
"لوگو! میں نے ابوالعاص کو پناہ دی ہے"۔
جب حضورؐ نے نماز ادا کر کے سلام پھیرا تو لوگوں کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: "جو کچھ میں نے سنا ہے کیا تم لوگوں نے بھی سنا ہے؟" لوگوں نے عرض کی: "جی ہاں!" آپ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے مجھے اس وقت تک کسی چیز کا علم نہیں تھا جب تک میں نے وہ بات نہ سنی جو تم نے بھی سن لی۔ یہ جان لو کہ اگر ایک معمولی درجے کا مسلمان بھی کسی کو پناہ دے دے تو سب مسلمان اس کے پابند ہوں گے"۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد حضرت زینبؓ کے گھر آئے اور فرمایا: "اَکْرِمِیْ مَثْوَاہُ وَلَا یَخْلُصَنَّ اِلَیْكِ فَاِنَّكِ لَا تَحِلِّیْنَ لَهٗ (ابوالعاص کا اعزاز کرو مگر اسے ہرگز اپنے قریب نہ آنے دینا کیونکہ تم (اب) اس کے لیے حلال نہیں ہو)"۔
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

تُحْسِنُوْا وَتَرُدُّوْا عَلَیْهِ الْمَالَ فَهُوَ الَّذِیْ نُحِبُّ وَاِنْ اَبَیْتُمْ فَهُوَ فَیْئُ اللّٰهِ اَنْتُمْ اَحَقُّ بِهٖ۔	ابوالعاص کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور اس کا مال واپس کر دو۔ ہمیں یہی بات پسند ہے اور اگر تم واپس نہ کرو تو وہ مال فیئ ہے جو لڑے بغیر اللہ نے تمھیں دیا ہے اور تم اس کے زیادہ حقدار ہو۔

راوی کا بیان ہے کہ لوگوں نے ابوالعاصؓ کا سب مال واپس کر دیا۔ ابوالعاصؓ یہ سب مال مکّہ لے گئے اور قریش کے ہر شخص کی امانت اس کو ادا کر دی۔ وہ کہنے لگے: "اللہ تمھیں جزائے خیر دے۔ ہم نے تمھیں نہایت فیاض اور وعدہ وفا کرنے والا پایا ہے"۔ اس وقت ابوالعاصؓ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور مشرف با سلام ہو گئے۔ پھر کہنے لگے: "اللہ کی قسم مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسلام قبول کرنے سے صرف یہ بات مانع تھی کہ تم کہتے کہ ہمارا مال کھانے کے لیے اس نے اسلام قبول کیا ہے۔ جب میں نے تمھارا مال ادا کر دیا تو اب میں نے اسلام قبول کر لیا"۔

لہ یہ فتح مکّہ سے تھوڑا سا عرصہ پہلے کا واقعہ ہے۔

ٰٓلہ ابوالعاصؓ کا نام لَقِیط یا ہاشم یا ہشیم تھا۔ بعض علماء نے مُہَشِّم بن عبدالعزّٰی بتایا ہے۔ الروض الانف (۵۱-۱۹۴)۔

واقعہ یوں ہوا کہ ابوالعاصؓ ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں عازمِ شام ہوئے۔ ان کے پاس قریش کا مال بھی تھا کیونکہ ان کو بڑا امین سمجھا جاتا تھا۔ جب شام سے لوٹے تو مسلمانوں کا ایک دستہ انھیں ملا۔ ابن اسحاق نے اسی طرح لکھا ہے۔

یہ کہہ کر ابوالعاصؓ مدینہ منورہ حضورؐ کے پاس آ گئے۔[1]

سیرت ابن ہشام کے علاوہ بعض دوسری کتابوں میں ہے کہ اگر کہنے والا یہ کہے کہ ایسا کیوں ہے کہ جب انصار نے غزوہ بدر میں (حضور کے چچا) حضرت عباسؓ کو قیدی بنا لیا تو انھوں نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ! ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اپنے بھانجے[3] عباسؓ کا فدیہ ادا کر دیں۔ اس وقت آپؐ نے فرمایا: "ایک درہم بھی باقی نہ چھوڑیں۔" الاصیلی کی کتاب میں یہی الفاظ ہیں۔ صحیح بخاری میں اس سے ملتے جلتے الفاظ ہیں،[2] لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے خاوند ابوالعاصؓ کو مسلمانوں کی قید سے چھڑوانے کے لیے کچھ مال بھیجا

---

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو سابقہ نکاح کی بنیاد پر ابوالعاص کی زوجیت میں دے دیا۔ اس بارے میں علماء کی آراء آگے کتاب النکاح میں آ رہی ہیں) بعد ازاں ابوالعاص مدینہ میں قیام پذیر رہے حتیٰ کہ حضرت علیؓ انھیں یمن لے گئے اور وہاں سے واپسی کے وقت ان کو اس علاقہ کا والی مقرر کیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت ہوئی تو ابوالعاص حضرت علیؓ کے ہمراہ تھے۔

ابراہیم بن المنذر کہتے ہیں کہ ابوالعاصؓ نے ۱۲ھ میں حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ سب سے عجیب بات محدث ابن مندہ نے کہی ہے کہ ابوالعاصؓ یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ دیکھیے "الاصابة" (۴ : ۱۲۱-۱۲۲)

[2] صحیح بخاری کتاب "الجہاد" باب "فداء المشرکین" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۰۴۸) بروایت انسؓ بن مالک۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"بعض انصاری صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اپنے بھانجے عباسؓ سے فدیہ نہ لیں۔" آپ نے فرمایا: "ان کو ایک درہم بھی معاف نہ کرنا۔"

امام بخاری کتاب "المغازی" میں اس حدیث کو دوبارہ لائے ہیں (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۰۱۸) مگر یہاں باب کا عنوان مقرر نہیں کیا۔ اس میں الفاظ دوسرے ہیں مگر مفہوم وہی ہے کہ "ان کا ایک درہم بھی نہ چھوڑیں۔" غلطی سے حاکم اس کو مستدرک (۳ - ۲۷) میں اس دعویٰ کے ساتھ لائے ہیں کہ یہ حدیث بخاری میں موجود نہیں۔ حالانکہ یہ حدیث بخاری میں موجود ہے۔

[3] انصار کا حضرت عباسؓ کو بھانجا کہنا ایک قسم کے مجاز پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ حضرت عباسؓ کی والدہ انصاریہ تو کیا یثرب (دور جاہلیت میں مدینہ کا نام) کی رہنے والی بھی نہ تھیں۔ ہاں البتہ عبدالمطلب کی ماں (حضرت عباسؓ کی دادی) مدینہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کا نام سلمیٰ بنت عمرو بن زید بن لبید بن عدی بن النجار ہے۔ وہ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتی تھیں۔ لہٰذا اس بنا پر انصار نے حضرت عباسؓ کی دادی کو ہمشیرہ اور عباس کو بھانجا قرار دیا۔

حضرت عباسؓ کی والدہ کا نام نُتیلہ بنت جناب تھا۔ وہ قبیلہ تیم اللات بن النمر بن قاسط سے تعلق رکھتی تھیں۔ (فتح الباری ۷ - ۳۲۲)

تو اس میں وہ ہار بھی تھا جو ان کی والدہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کی رخصتی کے وقت ان کو پہنایا تھا۔ اس وقت وہ ہار دیکھ کر حضورؐ نے انصارِ مدینہ سے کہا:

"اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو قیدی چھوڑ دو اور اس کا مال اسے واپس کر دو۔"

انصار نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ضرور" چنانچہ انصار نے ابوالعاصؓ کو رہا کر دیا اور حضرت زینبؓ کا مال ہار سمیت انھیں واپس کر دیا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ تو یہ سلوک آپؐ نے اس لیے کیا کہ آپؐ پر یہ دیکھ کر رقت طاری ہو گئی کہ ان کے پاس فدیہ کی رقم پوری نہ تھی۔ ان کی کل کائنات ایک ہار تھا جو ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رخصتی کے وقت ان کو پہنایا تھا۔ علاوہ ازیں ابوالعاصؓ کے پاس اپنا کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے پاس جو مال اور سامان تھا وہ تجارت کے لیے قریش کا دیا ہوا تھا۔ وہ انھوں نے مکہ جا کر قریش کو واپس کر دیا جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

اس کے برعکس حضورؐ نے انصار سے حضرت عباسؓ کے بارے میں فرمایا "عباسؓ کے فدیہ میں سے ایک درہم بھی معاف نہ کریں"۔ اس لیے کہ وہ دولت مند آدمی تھے۔

ابن قتیبہؒ اور دیگر مورخین نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے کہا:

"آپ اپنا اور اپنے دو بھتیجوں عقیل اور نوفل اور اپنے حلیف (عتبہ بن عمرو جو بنی حارث بن فہر میں سے تھا) کا فدیہ ادا کریں کیونکہ آپ مالدار آدمی ہیں۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میں دل سے اسلام لا چکا تھا مگر قریش نے مجھے (بدر میں شرکت کرنے پر) مجبور کیا" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آپ کے اسلام لانے کا حال تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اگر آپ سچ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے گا، مگر آپ کی ظاہری حالت کے مطابق ہم فدیہ وصول کریں گے"۔

حضرت عباسؓ نے کہا "میرے پاس مال نہیں ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا:

لہ یہ حدیث سنن ابوداؤد (۲-۶۲) "کتاب الجہاد" باب "فی فداء الاسیر بالمال" میں ہے۔

یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ ابوداؤد اس کو اپنی سند کے ساتھ محمد بن اسحاق سے روایت کرتے ہیں۔ ابن اسحاق معروف مُدلِّس ہے۔ اس نے یہ حدیث یحییٰ بن عبادہ سے عَنْ عَنْ کے ساتھ روایت کی ہے، البتہ حاکم نے المستدرک (۳-۲۳ اور ۴-۴۵) میں اس کے سماع کی تصریح کی ہے۔ حاکم یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے، البتہ بخاری و مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ امام ذہبی نے بھی حاکم کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اس لیے اس روایت کے بارے میں ابن اسحاق سے تدلیس کی تہمت زائل ہو گئی۔

لہ دیکھیے ابن قتیبہ کی کتاب المعارف (ص ۱۵۵) (بحوالہ ابن اسحاق)

"وہ مال کہاں ہے جو آپ نے مکّہ سے نکلتے وقت اُمّ الفضل کو دیا تھا؟ اس وقت آپ دونوں کے پاس کوئی اور آدمی نہ تھا۔ آپ نے اُمِ فضل سے کہا تھا کہ اگر میں اس سفر میں کام آگیا تو فضل کو اتنی رقم دینا اور عبداللہ کو اتنی۔"

حضرت عباسؓ نے کہا:

"اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اس بات کا علم میری بیوی کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔" پھر انھوں نے ایک سو اوقیہ فدیہ کے طور پر ادا کیا۔

ابنِ اسحاق نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

حضرت عباسؓ نے کہا "آپ نے مجھے اس حال میں چھوڑا ہے کہ میں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھروں"

بعد ازاں حضرت عباسؓ مشرف باسلام ہوئے۔ انھوں نے عقیل کو حکم دیا کہ وہ بھی اسلام قبول کرے اور وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ قیدیوں میں سے ان دونوں کے علاوہ کوئی اور شخص مسلمان نہ ہوا۔

نحاس نے المعانی میں حضرت عباس کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"جب مجھے قید کیا گیا تو میرے پاس بیس اوقیہ سونا تھا جو مجھ سے لے لیا گیا۔ اس کے عوض اللہ نے مجھے بیس غلام عطا کیے اور مغفرت کا وعدہ بھی کیا۔"

لہ ابن قتیبہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ عقیل فتح مکّہ کے روز اسلام لائے۔

دیکھیے "الاصابۃ" (۲-۴۸۷)

سُہیلی "الروض الانف" (۵-۲۵۳) میں لکھتے ہیں:

"عقیل صلح حدیبیہ والے سال مشرف باسلام ہوئے۔ انھوں نے بصرہ میں سکونت اختیار کرلی۔ حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں انھوں نے وفات پائی۔"

لہ حضرت عباسؓ کی اس بات میں مندرجہ ذیل آیت کی جانب اشارہ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم	اے نبیؐ! جو قیدی تمھارے قبضے میں ہیں ان سے کہہ
مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي	دیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمھارے دلوں میں بھلائی
قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا	دیکھی تو تمھیں اس سے بہتر عطا کرے گا جو تم سے لیا
أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ	گیا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے
رَّحِيمٌ (الانفال: ۷۰)	والا مہربان ہے۔

محمد بن اسحاق، یزید بن رومان سے، وہ عُروہ سے، وہ زُہری سے اور وہ راویوں کی ایک جماعت سے جن کے اسماءِ گرامی کا انھوں نے ذکر کیا ہے، روایت کرتے ہیں کہ حضرت عباسؓ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بیس اوقیہ کے عوض اسلام میں بیس غلام عطا کیے جو سب کے سب تجارت پیشہ ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ میں اللہ کی مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے یہ روایت

(بقیہ حاشیہ)
اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔

ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ آیت کریمہ ماکان لنبی ان یکون لہ اسری (الانفال۔ ۶۷) میرے بارے میں نازل ہوئی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ اس لیے فدیہ کے طور پر جو بیس اوقیہ مجھ سے لیے گئے تھے وہ واپس کیے جائیں۔ مگر آپ نے انکار فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض مجھے بیس غلام عطا کیے جو میرے مال سے تجارت کرتے ہیں۔

ابن حُمید سے بھی اسی طرح کی روایت کی گئی ہے۔ وہ سلمہ سے روایت کرتے ہیں وہ محمد بن اسحاق سے وہ کلبی سے وہ ابو صالح سے اور وہ ابن عباسؓ سے۔ اس طرح محمد بن اسحاق سے تدلیس کی تہمت زائل ہو گئی۔ اس لیے کہ اس سند میں محمد بن اسحاق نے سماع کی تصریح کی ہے، مگر اس کی سند میں کلبی ضعیف راوی ہے۔ الہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۷-۸) میں ان دونوں حدیثوں کا زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ نیز یہ بھی کہا ہے کہ طبرانی نے اس حدیث کو المعجم الاوسط اور المعجم الکبیر میں مختصراً روایت کیا ہے۔ الاوسط میں جو حدیث روایت کی گئی ہے ابن اسحاق کے علاوہ اس کے سب راوی صحیح بخاری کے معیار کے ہیں جبکہ یہاں ابن اسحاق نے بھی سماع کی تصریح کی ہے۔

محمود شاکر تفسیر طبری کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ ظاہر بات ہے کہ ان کی مراد ان دو سندوں کے علاوہ ایک اور سند ہے۔ اس لیے کہ پہلی سند میں سماع کی تصریح موجود نہیں (یعنی ابن عباسؓ سے مروی پہلی حدیث جو ابن وکیع عن ابن ادریس عن ابن اسحاق عن ابن ابی نجیح عن مجاہد عن ابن عباس مروی ہے) اور دوسری سند میں کلبی ہے جو کہ ضعیف راوی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں اس حدیث کو الواحدی نے اسباب النزول میں بروایت کلبی زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حضرت عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس اُوقیہ کی واپسی کا جو مطالبہ کیا تھا یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضورؐ کے پاس بحرین کا مال آیا اور بخاری کی روایت کے مطابق حضورؐ نے فرمایا "اس کو مسجد میں پھیلا دو" اتنا مال قبل ازیں حضورؐ کے پاس کبھی نہیں آیا تھا۔ اسی اثنا میں حضرت عباسؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اس مال میں سے مجھے بھی کچھ دیجیے۔ اس لیے کہ میں نے اپنا اور عقیل کا فدیہ ادا کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "لے لو" حضرت عباسؓ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کپڑے میں مال ڈالا۔ پھر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اٹھا نہ سکے۔ انھوں نے حضورؐ سے درخواست کی کہ کسی کو حکم دیجیے کہ یہ بوجھ مجھے اٹھوا دے۔ آپؐ نے فرمایا "نہیں"۔ حضرت عباسؓ نے کہا "تو پھر آپؐ اٹھوا دیجیے"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "نہیں" حضرت عباسؓ نے کچھ مال نکال دیا۔ پھر اٹھانے لگے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ کہنے لگے "کسی کو اٹھوانے کا حکم دیجیے"۔ آپؐ نے فرمایا "نہیں"۔ حضرت عباسؓ نے درخواست کی "کہ پھر آپؐ اٹھوا دیجیے"۔ فرمایا "نہیں"۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے کچھ مال نکال دیا پھر اپنے کندھے پر اٹھا کر چل دیے

مکی کی کتاب "الهداية" میں ہے کہ "جب مجھے قید کیا گیا تو میرے پاس چالیس اوقیہ سونا تھا۔ ہر اوقیہ چالیس مثقال کا ہوتا ہے۔ اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے مجھے چالیس غلام عطا کیے اور اس کے ساتھ ساتھ مغفرت کا وعدہ بھی فرمایا۔"

امام مالک "موطا"[۲] میں ابو النضر[۳] سے روایت کرتے ہیں کہ ابو مرہ[۴] نے اسے بتایا ــــ (ابو مرہ امّ ہانی[۵] بنت

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔ طبری نے تفسیر ابن جریر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ مال اسی ہزار کی تعداد میں تھا اور حضرت عباسؓ کہا کرتے تھے کہ "جو فدیہ ہم سے لیا گیا یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے ساتھ مجھے مغفرت کی امید بھی ہے۔"

[۱] مکی اور ان کی کتاب پر قبل ازیں گفتگو کی جا چکی ہے۔ جس روایت میں چالیس اوقیہ کا ذکر ہے اس کو طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے آیت يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ (الانفال-۷۰) کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ میرے والد عباسؓ کو غزوۂ بدر میں قید کیا گیا۔ انھوں نے چالیس اوقیہ سونا فدیہ دے کر رہائی پائی جب یہ آیت اتری تو میرے والد حضرت عباسؓ نے کہا۔ اللہ نے مجھے دو ایسی چیزیں عطا کی ہیں جو میں ساری دنیا لے کر بھی دینا نہیں چاہتا۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے دن مجھے قید کر لیا گیا۔ میں نے چالیس اوقیہ دے کر رہائی پائی۔ اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے مجھے چالیس غلام عطا کیے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری مغفرت کا وعدہ فرمایا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ میں نے جو کچھ دیا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے سو گنا زیادہ عطا کیا۔

[۲] موطا امام مالک (۱۔۱۲۷) کتاب "الصلاۃ" باب "صلوٰۃ الضحیٰ"۔

[۳] ابو النضر کا نام سالم بن ابی امیہ ہے۔ یہ ثقہ راوی تھے۔

[۴] ابو مُرّہ (بضم المیم وتشدید الراء) کا نام یزید ہے۔ اپنی کنیت سے مشہور تھے۔

[۵] اُمّ ہانی بنت ابی طالب۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کی بیٹی تھیں۔ ان کا نام فاختہ یا فاطمہ یا ہند تھا۔ پہلا نام زیادہ مشہور ہے۔ ان کے خاوند کا نام ہُبیرہ بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم المخزومی ہے۔

ابن الکلبی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو صالح سے اور وہ ابن عباسؓ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے امّ ہانی کا رشتہ طلب کیا۔ اسی طرح ہبیرہ نے بھی رشتہ مانگا۔ ابو طالب نے ام ہانی کا نکاح ہُبیرہ سے کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا سے اظہار ناراضگی کیا تو ابو طالب نے کہا۔ اے بھتیجے ہم نے ان کے ساتھ سسرالی روابط قائم کیے ہیں اور ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کو اچھا بدلہ دیتا ہے۔ پھر امّ ہانی اسلام لے آئیں جبکہ ہبیرہ نے اسلام قبول نہ کیا۔ اس طرح دونوں میں مفارقت ہو گئی۔ پھر حضورؐ نے امّ ہانی سے نکاح کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگیں۔ "بخدا میں تو آپ کو دورِ جاہلیت میں بھی چاہتی تھی پھر اسلام لانے کے بعد کیوں پسند نہ کروں، مگر بات یہ ہے کہ میں

ابی طالب کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اُمّ ہانی کا نام بقول ابن وضاح[1] فاختہ تھا۔ ابن ہشام کے نزدیک ہند اور البرقی کی رائے میں رملہ تھا) انھیں بتایا کہ اس نے ام ہانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں فتح مکّہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں گئی تو آپؐ غسل فرما رہے تھے۔ اور آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ایک کپڑا لیے پردہ کر رہی تھیں۔ ام ہانی نے سلام کہا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "کون ہیں؟" انھوں نے کہا۔ میں ہوں اُمّ ہانی بنت ابی طالب! آپ نے فرمایا "خوش آمدید اُمّ ہانی"! جب غسل سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے آٹھ رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ آپ ایک ہی کپڑا پہنے ہوئے تھے۔ پھر آپ میری جانب متوجہ ہوئے تو میں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! میری اپنی ماں کا بیٹا اور میرا بھائی علیؓ[3] کہتا ہے کہ وہ اس شخص کو قتل کر دے گا جس کو میں نے پناہ دی ہے۔ اور وہ شخص

عیب دار عورت ہوں (یعنی کفر و اسلام کی بنا پر میرے اور میرے خاوند کے درمیان فُرقت ہوئی ہے) اور میں اس بات کو ناپسند کرتی ہوں کہ (میرے سسرال والے) آپ کو ایذا دیں۔"

پھر حضورؐ نے فرمایا:

"عرب خواتین جو اونٹوں پر سوار ہوتی ہیں ان میں سب سے بہتر قریشی خواتین ہیں۔ وہ اپنے بچوں پر حد درجہ شفیق ہوتی ہیں"

دیکھیے "الاصابۃ" (۴ - ۴۷۹)

سُہیلی کہتے ہیں کہ ان کی کنیت اُمّ ہانی، ان کے بیٹے ہانی بن ہُبیرہ کے نام پر رکھی گئی ہے۔ ہُبیرہ سے ان کے دو بیٹے اور بھی تھے۔ ان کا نام یوسف اور جعدہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اُمّ ہانی نے جو کہا تھا کہ میری ماں کا بیٹا اور میرا بھائی علی کہتا ہے کہ وہ اس شخص کو قتل کر دے گا جسے میں نے پناہ دی ہے۔ وہ فلاں بن ہُبیرہ ہے۔ اس فلاں سے اُمّ ہانی کی مراد ان کا بیٹا جعدہ تھا، مگر حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ سُہیلی کی یہ بات اس لیے درست نہیں کہ جعدہ نے حضورؐ کو دیکھا تھا مگر صحبت کے شرف سے محروم رہا۔ امام بخاری، ابن حبان اور دیگر محدثین نے ان کو تابعین میں شمار کیا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جو شخص اس قدر چھوٹی عمر کا ہو اس سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ فتح مکّہ کے سال لڑنے کے قابل ہو اور اسے امان کی ضرورت ہو۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ ام ہانی حضرت علیؓ کے بعد زندہ رہیں مگر صحیح طور پر ان کا سال وفات معلوم نہیں۔

[1] ابن وضاح (بفتح الواؤ وتشدید الضاد) محمد بن وضاح بن بزیع ابوعبداللہ مولیٰ عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام قرطبہ کے عظیم محدث تھے۔ انھوں نے زہد کے موضوع پر "العباد والعوابد" "حدیث بن الرقائق والقطعات" اور "فقر ما کان مکنوز السر ومستخرج العلو" تحریر کیں۔ ان کتب کے قلمی نسخے تیونس کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں۔

علامہ الزرکلی نے "الاعلام" میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ۲۸۶ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ ابن وضاح کے تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیے: "لسان المیزان" (۵ - ۴۱۶) اور "بغیۃ الملتمس للضبّی" (ص ۱۲۳)

[2] سیرت ابن ہشام (۲ - ۴۲)

[3] اپنی ماں کا بیٹا کہہ کر ام ہانی نے بتایا کہ حضرت علیؓ کے ساتھ ان کی کس قدر گہری قرابت داری ہے، مگر اس کے باوجود حضرت علیؓ

فلاں بن ہبیرہ ہے۔[1]

یہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ام ہانی! جس کو تم نے پناہ دی اس کو ہم نے بھی پناہ دی۔[2]"

ام ہانی کہتی ہیں یہ چاشت کے وقت کا واقعہ ہے۔

ابن سحنون کی کتاب میں اور "الواضحة" میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ایک ادنیٰ درجے کا مسلمان بھی سب اہلِ اسلام کی طرف سے کسی کو امان دے سکتا ہے۔ اور دور دراز علاقے سے ایک مسلمان مالِ غنیمت لاکر ان سب کو دیتا ہے۔[3]"

نے ان کا خیال نہیں کیا۔ اور وہ یوں کہ جس آدمی کو ام ہانی نے پناہ دی تھی اس کے ساتھ حضرت علیؓ نے جنگ کی۔ دیکھیے المنتقیٰ شرح المؤطا للباجی (۱-۲۷۱)

ام ہانی نے ماں کا بیٹا کہا حالانکہ حضرت علیؓ والد اور والدہ دونوں کی جانب سے ان کے حقیقی بھائی تھے۔ دونوں کی والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم ہے۔ ماں کا نام لے کر انھوں نے قرابت داری کی مزید پختگی کو ظاہر کیا۔ کیونکہ والدہ کا رشتہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو شرح الموطا للزرقانی)

[1] ہُبَیرہ بن ابی وہب بن عمرو المخزومی ام ہانی کے خاوند تھے۔ ہبیرہ سے ام ہانی کے کئی بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک ہانی بھی تھا جس کی جانب نسبت کر کے ان کی کنیت ام ہانی مشہور ہوئی۔

سیرت ابن ہشام (۲-۴۱۱) میں ہے کہ ام ہانی نے اپنے خاوند کے رشتہ داروں میں سے دو آدمیوں کو پناہ دی تھی ایک کا نام حارث بن ہشام اور دوسرا زُہیر بن ابی امیہ تھا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام احمد اور طبرانی نے اس کو ایک اور سند سے بطریق ابو مرہ عن ام ہانی روایت کیا ہے۔ ام ہانی کہتی ہیں کہ میں نے اپنے دو عزیزوں کو پناہ دی تھی۔ ابو العباس بن سُریج اور دیگر محدثین کا قول ہے کہ وہ جعدہ بن ہبیرہ اور بنی مخزوم کا ایک اور آدمی تھا۔ یہ دونوں ان لوگوں میں شامل تھے جو خالد بن ولید سے لڑے اور انھوں نے امان قبول نہ کی۔ ان دونوں کو ام ہانی نے امان دی۔ حافظ ابن حجر نے ان دو شخصوں کو متعین کرنے کے سلسلے میں طویل گفتگو کی ہے۔ اس لیے اس مقصد کے لیے فتح الباری کی طرف رجوع فرمائیں۔ دیکھیے فتح الباری (۱-۴۷۰)

زرقانی نے "شرح الموطا" (۲-۲۵) میں فتح الباری سے نقل کیا ہے۔ اور "اخبار مکہ" (۲-۱۶۲) میں الازرقی بڑے وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ دو آدمی عبداللہ بن ابی ربیعہ بن المغیرۃ اور حارث بن ہشام بن المغیرہ تھے۔ یہ دونوں قبیلہ بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔

[2] یہ حدیث صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے۔ مثلاً کتاب "الصلوٰۃ" باب "الصلوٰۃ فی الثوب الواحد" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۵۷) اس سے پہلے اختصار کے ساتھ کتاب "الغسل" اور اس کے بعد کتاب "الجزیۃ والموادعۃ"، باب "امان النساء" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۱۷۱) اور کتاب "الجہاد" وغیرہ میں یہ حدیث پائی جاتی ہے۔ [3] سنن ابو داؤد (۳-۱۸۱)

ان دو کتابوں کی علاوہ دوسری کتابوں میں حضورؐ کے یہ الفاظ روایت کیے گئے ہیں :

"اہلِ اسلام غیروں کے مقابلے میں ایک جان ہیں۔"

ابن حبیب کہتے ہیں کہ :

"اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ادنیٰ درجے کا مسلمان بھی خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، عورت ہو یا بچہ، اگر کسی کو امان دے دے تو وہ امان ہو جاتی ہے[1]۔"

کتاب "الدیات" باب "ایقاد المسلم من الکافر" میں ہے کہ عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "ایک دور افتادہ علاقے کا مسلمان سب مسلمانوں کی طرف سے کسی کو پناہ دے سکتا ہے۔ اور طاقتور کمزور کے لیے اور قوی معذور کے لیے مالِ غنیمت میں سے حصّہ دیتا ہے۔ سنن ابن ماجہ (۲-۸۹۵) کتاب "الدیات" باب "المسلمون تتکافأ دماؤھم" میں مذکور ایک دوسری حدیث کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے "مسلمان دوسروں کے مقابلے میں ایک ہیں۔ ان کا خون اور مال مساوی درجہ رکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ مسلمان کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور ایک دور افتادہ علاقے کا مسلمان مالِ غنیمت میں سے حصّہ (خمس) دیتا ہے۔"

[1] عورت کے امان دینے کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض مالکیہ جن میں "الماجشون" اور "سحنون" شامل ہیں۔ کہتے ہیں کہ عورت کی امان کا انحصار امام کی اجازت پر ہے۔ اگر امام اس کو قبول کر لے تو مقبول ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ اُمِّ ہانی کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "اُمّ ہانی! جس کو تم نے پناہ دی اس کو ہم نے پناہ دی"۔ اس کے مقابلے میں جمہور علماء عورت کی امان کو مطلقاً درست تسلیم کرتے ہیں۔ وہ حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں وہ فرماتی ہیں کہ :

"عورت عہدِ رسالت میں تمام مسلمانوں کی طرف سے امان دیتی تھی اور اس کو درست تسلیم کیا جاتا تھا۔"

ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ عورت جب کسی کو امان دے تو اس کی دی ہوئی امان جائز ہے۔ ابوداؤد (۳-۸۴) کتاب "الجہاد" باب "امان المرأۃ" نیز بیہقی (۹-۵۹)

مزید براں وہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس مرفوع حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں :

"عورت مسلمانوں کی طرف سے کسی کو امان دے سکتی ہے۔" (ترمذی (۴-۱۴۱) کتاب "السیر" باب "امان المرأۃ والعبد" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ حضرت زینبؓ نے ابوالعاصؓ کو پناہ دی تھی۔

امام ابوحنیفہ اور ایک روایت کے مطابق امام مالک بھی غلام کی امان کو درست تصور نہیں کرتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ غلام کو چونکہ مالِ غنیمت میں سے حصہ نہیں دیا جاتا اس لیے اسے امان کا بھی اختیار نہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ امان دینے کی شرط کمال ہے اور ایک غلام غلامی کے باعث کامل نہیں ناقص ہے۔ دیکھیے شعرانی کی "المیزان" (۲-۱۷۶)

اور حدیث کے الفاظ "یرد علیھم اقصاھم" کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اپنے دور افتادہ علاقوں میں بھی جو مالِ غنیمت حاصل کرتے ہیں اس کا پانچواں حصّہ وہ بیت المال کو دیتے ہیں۔

ابن الماجشون کا قول ہے کہ امان دینے کا اختیار یا تو قائدِ افواج کو ہے یا فوجی دستہ کے سردار کو۔ ان کے سوا کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں۔

ابن شعبان القرطبی کہتے ہیں کہ:

ابن ماجشون کا قول باقی سب لوگوں کے اقوال کے خلاف ہے۔

جس شخص کو ام ہانیؓ نے امان دی تھی اُس کا نام ہُبَیرہؓ بن ابی وُہب ہے۔ وہ اُمِّ ہانیؓ کا خاوند تھا۔

ان دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ غلام خود اپنے نفس کا بھی مالک نہیں ہوتا۔ اسے کسی چیز کے خریدنے کا اختیار نہیں۔ وہ خود اپنی مرضی سے نکاح بھی نہیں کر سکتا۔ پھر وہ تمام مسلمانوں کی جانب سے کسی کو امان کیسے دے سکتا ہے؟ جب کہ اس کا فعل اپنی ذات پر بھی نافذ نہیں ہے۔ دیکھیے امام شافعی کی کتاب "الاُمّ"۔

اس کے برعکس جمہور علماء کے نزدیک غلام امان دینے کا مجاز ہے۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں کسی کی تخصیص نہیں فرمائی۔ آپ نے فرمایا "یُجِیْرُ عَلیٰ اُمَّتِیْ اَدْنَاھُمْ" (ادنیٰ مسلمان بھی میری امت کی طرف سے پناہ دے سکتا ہے) لہٰذا آپ کے الفاظ کے عموم میں غلام بھی شامل ہے۔ کیا غلام ادنیٰ درجے کا مومن بھی نہیں؟ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: "غلام کی امان سب اہلِ اسلام کی امان ہے۔" دیکھیے زیلعی کی "نصب الرایۃ" (۳-۳۹۶) زیلعی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ حضرت عمرؓ سے منقول ہے انھوں نے فرمایا:

"مسلمان غلام اہلِ اسلام میں سے ہے۔ اس کی ذمہ داری سب کی ذمہ داری اور اس کی دی ہوئی امان سب کی طرف سے امان ہے۔" "البیہقی" (۹-۹۴)

ایک غلام نے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک قلعہ میں محصور کفار کو امان دے دی تھی۔ جب فوج کے قائد نے حضرت عمرؓ سے اس ضمن میں دریافت کیا تو انھوں نے غلام کی دی ہوئی امان کو درست تصور کیا۔

اکثر علماء اس بارے میں متفق ہیں کہ چھوٹے بچے کی دی ہوئی امان درست نہیں جو شعور نہ رکھتا ہو (فتح القدیر ۴-۳۰۴) اور بچہ اور مجنون کا ایک ہی حکم ہے، البتہ بچہ اگر لڑائی کی اہلیت سے بہرہ ور ہو تو اس کی امان جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا شمار مجاہدین کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ ابن جریر نے یہ بات آیت کریمہ "اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ" (سورۃ التوبۃ - ۶) کی تفسیر میں تحریر کی ہے۔

لہ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ہُبَیرہ بن ابی وُہب نجران بھاگ گیا تھا اور بحالتِ کفر وہیں فوت ہوا۔ ابن اسحاقؒ نے نہایت وثوق کے ساتھ یہ بات کہی ہے۔ ابن عبدالبرؒ نے بھی "الاستیعاب" میں اُمِّ ہانیؓ کے تذکرے میں یہ بات تحریر کی ہے۔

وہ بنو مخزوم کے قبیلہ سے تھا۔ جب اس کو پتہ چلا کہ اس کی بیوی مسلمان ہو گئی ہے تو اس نے چند اشعار کہے تھے۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ امّ ہانیؓ کا اصلی نام ہند تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مختلف روایات میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے ایک اور توجیہہ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس عبارت میں بعض الفاظ محذوف ہیں۔ دراصل عبارت یوں تھی "فلان ابن عم هُبَيْرَة" "فلاں شخص جو ہُبَیرہ کا چچازاد بھائی یا قریبی رشتہ دار تھا اور غلطی سے "ابن عم هبيرة" کی جگہ "ابن هبيرة" کا لفظ لکھ دیا گیا۔ جن اشخاص کو امان دینے کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً حارث بن ہشام، زُہیر بن ابی اُمیّہ، عبداللہ بن ابی ربیعہ یہ سب ہُبَیرہ کے عم زاد اور قریبی رشتہ دار تھے۔ ان سب کا تعلق بنی مخزوم کے قبیلے سے تھا۔ یہ نہایت عمدہ توجیہہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ متعدد روایات میں مذکور ہے کہ امّ ہانیؓ نے جن لوگوں کو امان دی تھی وہ ان کے خاوند کے قریبی عزیز تھے۔

جزیہ کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے

ابن حبیب لکھتے ہیں :

"آغازِ بعثت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتال اور جزیہ کے بغیر اسلام کی دعوت و تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا۔ بعثت کے بعد مکہ معظمہ میں دس سال تک آپ کو لڑائی سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

لہ **جزیہ کے احکام** | جزیہ ایک قسم کا ٹیکس ہے جو ان غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کے باشندے ہوتے ہیں۔ چونکہ اسلامی ریاست ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے اور ملک کے دفاع کے سلسلے میں ان سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی۔ اس لیے اس تحفظ کے عوض ان سے جزیہ کی رقم وصول کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو مسلمان اسلامی ریاست میں رہتے ہیں ان سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مالی صدقات اور کفارے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دفاعِ وطن اور اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے ان پر جہاد بھی فرض ہوتا ہے۔ جبکہ ذمیوں سے دفاع کی خدمت نہیں لی جاتی بلکہ وہ جزیہ کی رقم ادا کرنے کے بعد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ جزیہ ایک سزا ہے جو غیر مسلموں کو اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے دی جاتی ہے لیکن ان کی یہ بات تعصب پر مبنی اور اسلام پر زبردست اتہام ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ صرف چند دلائل پیش کرتے ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جزیہ کی رقم اہلِ ذمہ کے جان و مال کے تحفظ کے بدلے میں لی جاتی تھی۔ مسلم اکابر کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب وہ اہلِ ذمہ کی حفاظت کی ذمہ داری ادا نہ کر سکتے تو جزیہ کی رقم واپس کر دیتے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب اہلِ روم نے عرب کے شمالی علاقوں پر ایک لشکرِ جرار کو حملہ کرنے کے لیے بھیجا تو مسلمان فوجوں کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے مسلمان حاکموں کو حکم دیا کہ غیر مسلموں سے وصول کردہ جزیہ اور خراج ان کو واپس کر دیا جائے اور اہلِ ذمہ کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ رومیوں نے سرحد پر بہت سا لشکر جمع کر دیا ہے۔ تم نے اپنی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر عائد کی تھی مگر ہم اس سے قاصر ہیں اس لیے جو کچھ ہم نے تم سے وصول کیا تھا وہ واپس کر رہے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عنایت فرمائی تو ہم تمہاری شرط کو پورا کریں گے اور جو معاہدہ ہمارے مابین ہوا تھا ہم اس کے پابند رہیں گے۔ جب ذمیوں نے یہ بات سنی تو وہ مال مسلمانوں کو دوبارہ واپس کر دیا اور کہا "خدا تمھیں پھر ہمارا حاکم بنا کر واپس لائے اور ان (رومیوں) پر غلبہ عطا کرے اگر تمھاری جگہ وہ ہوتے تو ہمیں کچھ بھی واپس نہ کرتے اور جو کچھ ہمارے پاس ہوتا وہ سب بھی ہم سے لے لیتے۔" (فتوح البلدان ص ۱۴۳)

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی جس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قتال کے بارے میں یہ پہلی آیت تھی:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (سورۃ الحج - ۳۹)	جن لوگوں سے لڑا جاتا تھا اب ان کو (انتقام لینے کی) اجازت دی جاتی ہے اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا کہ جو آپؐ سے لڑے آپ اس کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ اور جو جنگ سے احتراز کرے اس سے کچھ تعرض نہ کریں۔

یہ واقعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جزیہ ایسا ٹیکس نہیں جو جبری طور پر اہل ذمہ سے اس لیے وصول کیا جاتا ہے کہ وہ اسلام کیوں نہیں لائے۔ اگر حقیقت وہی ہوتی جو مستشرقین کہتے ہیں تو حضرت ابو عبیدہؓ اور ان کے رفقاء حفاظت پر قادر نہ ہونے کی صورت میں اہل ذمہ کا مال ہرگز واپس نہ کرتے۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ اسلام قبول کرنے کے ساتھ جزیہ ساقط ہو جاتا ہے، مگر جزیہ کے ساقط ہونے کے ساتھ ہی ایک مسلمان پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اسے زکوٰۃ اور نفلی صدقات دینے پڑتے ہیں۔ اور اسلام اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے اس کو جہاد میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حالات میں غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی محض دلجوئی اور ہمدردی کی بنا پر جزیہ ساقط ہو جاتا ہے:

وہ حالات جن میں غیر مسلم سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے

۱۔ موت کی صورت میں جزیہ ساقط ہو جاتا ہے اور حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک ترکہ میں سے وصول نہیں کیا جاتا، البتہ شافعیہ کے نزدیک ساقط نہیں ہوتا۔ شافعیہ اس کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ جزیہ ایک قرض تھا جو ذمی کی زندگی میں اس پر واجب تھا۔ اس لیے موت کے بعد بھی اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ جس طرح مسلمان کا قرض اس کے ذمہ ہو تو وہ بعد از موت ادا کیا جاتا ہے۔ دیکھیے "احکام اهل الذمة" (۱-۹۰)

۲۔ جسمانی عیب پیدا ہو جانے کے باعث۔ مثلاً وہ شخص اندھا ہو جائے، اپاہج یا مریض ہو جائے، دائمی طور پر ادا کرنے سے قاصر ہو جائے، بوڑھا ہو، مفلس و قلاش ہو۔ احناف اور مالکیہ کا مسلک یہی ہے، مگر شوافع اور حنابلہ کے نزدیک راجح مسلک یہ ہے کہ ساقط نہیں ہوتا۔ المبسوط (۱۰-۷۹)

۳۔ عورتوں، بچوں، غلاموں اور گرجا نشین لوگوں پر جزیہ واجب نہیں ہے۔ تبیین الحقائق (۳-۲۷۸) نیز شرح فتح القدیر (۴-۳۷۲)

علاوہ ازیں مسلمانوں پر جو مالی واجبات عائد ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں جزیہ کی مقدار نہایت قلیل ہوتی ہے۔ اسی باب میں اس کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے۔

یہ چند ضروری مباحث تھے جن کا ذکر اصل موضوع کے آغاز سے قبل میں نے تمہید کے طور پر کر دیا ہے۔

چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی:[1]

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (النساء - ۹۰)

اگر وہ تم سے الگ رہیں، جنگ نہ کریں اور صلح کا ڈول ڈالیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان پر گرفت کرنے کا کوئی راستہ نہیں بنایا۔

اس کے بعد ۹ھ میں سورۂ توبہ نازل ہوئی جس میں آپ کو جزیرۃ العرب کے تمام غیر مسلموں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ آپ کے خلاف نبرد آزما ہوں یا نہ ہوں، اس سے وہ غیر مسلم مستثنیٰ تھے جن کے ساتھ مسلمانوں کا صلح کا معاہدہ ہو چکا تھا۔

---

[1] اس سلسلہ میں ارشادِ خداوندی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اگلی آیت بھی پیشِ نظر رہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا فَإِنْ لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُبِينًا۔ (سورۃ النساء - ۹۱)

تم کچھ اور لوگ ایسے بھی پاؤ گے جو یہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں لیکن جب فتنہ انگیزی کو بلائے جاتے ہیں تو اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ تو ایسے لوگ اگر تم سے (لڑنے سے) کنارہ کشی نہ کریں اور نہ تمہاری طرف پیغامِ صلح بھیجیں۔ اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو ان کو پکڑ لو اور جہاں پاؤ قتل کرو۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ہم نے تمہارے لیے واضح حجت قائم کر دی ہے۔

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ جب کفار مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہوں تو وہ صلح کا تقاضا کریں اور اپنے ہاتھوں کو مسلم آزاری سے ملوث نہ کریں تو ان کے خلاف قتال ہمارے لیے جائز نہیں۔ اس کی تائید مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے:

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ (الممتحنۃ - ۸)

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (البقرۃ - ۱۹۰)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

اس آیت میں صرف ان لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جو ہم سے لڑیں۔ اور جو ہم سے نہ لڑیں ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ سورۃ التوبۃ کی حسبِ ذیل آیت ہے۔

ارشاد فرمایا:

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ .... ان کو جہاں بھی پاؤ قتل کر ڈالو۔

الی قولہ تعالیٰ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ..... [۱]

اس کے بعد غیر اہل کتاب عربوں کے لیے اسلام قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت باقی نہ رہ گئی۔ اور اہل کتاب کے لیے دو صورتیں تھیں۔ (۱) وہ اسلام قبول کرلیں یا (۲) جزیہ ادا کریں، چنانچہ ارشاد ہوا:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ [۲] .... الاٰیۃ — اللہ اور یوم آخرت پر جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان سے قتال کرو۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبۃ۔۵) — جب حرام مہینے گزر جائیں تو جہاں بھی مشرکوں کو پاؤ انھیں قتل کر دو۔

حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

[۱] کتاب کے تمام نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے حالانکہ آیت کا پہلا حصہ سورۃ النساء کی آیت ۸۹ کا حصہ ہے۔ اور دوسرا جزو یعنی "فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ" سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۵ کا، (جو اس طرح سے ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ .... فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوۃَ) معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے غلطی سے (فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ) کی جگہ (وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ) لکھ دیا۔

[۲] سورۃ توبۃ (آیت نمبر ۲۹) مکمل آیت ہے وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ .... وَهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مشرکین عرب کی بنیادیں جب پوری طرح ہل گئیں اور جزیرۃ العرب میں اسلام کی قوت مستحکم ہو گئی اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے تو اس کے بعد اہل کتاب سے قتال کا یہ پہلا حکم نازل ہوا۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں اور عیسائیوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم ۹ھ میں دیا گیا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کی تیاری کی اور لوگوں کو اس کی دعوت دی۔

اس کے بعد ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جو لوگ صرف اہل کتاب یا ان کی طرح کے دوسرے لوگوں مثلاً مجوسیوں سے جزیہ قبول کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اور مجوسیوں سے جزیہ قبول کرنے کے لیے وہ اس صحیح حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔ امام شافعی کا اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد کا یہی مسلک ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ تمام عجمیوں سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ اہل کتاب ہوں یا عام مشرک، لیکن عربوں میں سے صرف اہل کتاب سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے جبکہ غیر اہل کتاب عربوں سے نہیں لیا جا سکتا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ غیر مسلم جو بھی ہو اس سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے، چاہے وہ کتابی ہو یا مجوسی یا بت پرست یا کوئی اور۔ (ابن کثیر کی عبارت یہاں ختم ہو گئی)

عربوں میں سے جو اہل کتاب تھے وہ بھی اس حکم کے تحت آگئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجرانؔ اور ایلہ ؔ والوں سے جزیہ لیا۔ اہل نجران اور اہل ایلہ عرب عیسائی تھے۔ اسی طرح آپ نے دومۃ الجندلؔ کے رہنے والوں سے بھی جزیہ لیا۔ یہ عیسائی تھے اور ان میں سے اکثر عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جزیہ صرف اہل کتاب سے قبول کرنے کی اجازت دی تھی۔ باقی سب سے قتال کا حکم دیا گیا لیکن بعد میں حضورؐ کے ارشادؔ کے مطابق مجوسی اس میں سے مستثنیٰ قرار دیے گئے کہ اگر وہ چاہیں

مغرب اقصیٰ سے لے کر چین تک تمام مسلمان حکومتوں میں عمل امام مالک ہی کی رائے پر ہوتا رہا۔ اور اہل کتاب، مجوسیوں اور بت پرستوں کی تفریق کے بغیر سب غیر مسلموں سے جزیہ قبول کیا جاتا رہا۔ ابو عبید نے کتاب الاموال (ص ۵۴) میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایران کے مجوسیوں سے اور حضرت عثمانؓ نے افریقہ کے بربروں سے جزیہ قبول فرمایا۔

؎ امام زہری فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جزیہ اہل نجران سے لیا گیا۔ ابو داؤد نے اس کا ذکر کیا ہے اور حافظ ابن قیم نے "احکام اھل الذمۃ" (۱-۳) میں اسے نقل کیا ہے۔ ابو عبید نے لکھا ہے کہ یہ لوگ بنو حارث بن کعب ہی سے تھے۔ دیکھیے "کتاب الاموال" (ص ۳۸)

؎ ایلہ شام کے قریب بحر قلزم کے کنارے ایک شہر ہے۔ بعض کی رائے میں یہ حجاز کی آخری سرحد پر شام کی سرحد کے ساتھ ہے۔ "معجم البلدان" (۱-۲۹۲) میں ہے کہ یہ یہودیوں کی وہ بستی تھی جہاں کے لوگوں کے لیے اللہ نے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار حرام ٹھہرایا۔ ایلہ سے یوحنا بن رویۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آیا جب آپ تبوک میں تھے۔ وہاں اس نے حضورؐ سے جزیہ کی شرط پر صلح کی۔ ہر بالغ فرد پر ایک دینار سالانہ جزیہ عائد کیا گیا۔ اس سے کل رقم تین سو دینار سالانہ بن گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ جن مسلمانوں کا وہاں سے گزر ہوگا، اہل ایلہ ان کی مہمان نوازی کیا کریں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے عوض ان کو حفاظت کی ضمانت لکھ کر دی۔

؎ دومۃ الجندل۔ دمشق اور مدینہ منورہ کے درمیان دمشق سے سات منزل کے فاصلے پر ہے۔ اس کا سردار اُکیدر تھا جسے حضرت خالدؓ نے گرفتار کر لیا اور جزیہ پر اس سے صلح ہوگئی۔ دیکھیے "کتاب الاموال" ص۲۸۔ اس کے بعض واقعات کا ذکر ص ۱۹۰ پر بھی ہے۔

ابن سعد "طبقات" (۲-۶۲) میں لکھتے ہیں کہ دومۃ الجندل اور دمشق کے درمیان پانچ دن رات اور اس کے اور مدینہ منورہ کے درمیان پندرہ یا سولہ دن رات کی مسافت ہے۔

؎ ابو داؤد اور دوسروں نے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں مجوسیوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کروں جبکہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان کے ساتھ اہل کتاب والا معاملہ کرو۔ ابو داؤد کی روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے گواہی دی کہ حضورؐ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔ اس روایت کی پوری سند بعد میں بیان ہوگی۔

توان سے بھی جزیہ قبول کرنے کی اجازت ہے۔ اس طرح گویا سنت نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا[1]، لیکن مشرکین عرب کے لیے جزیے کی کوئی صورت باقی نہ رکھی گئی۔ ان کے لیے دو ہی راستے تھے کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا لڑیں۔ یہ درحقیقت عربوں کے لیے خصوصی اعزاز تھا کہ وہ لازماً اسلام قبول کریں۔

یہاں ابن حبیب نے جو یہ کہا ہے کہ سنت نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

---

[1] لغت میں "نسخ" کے معنی ہیں کسی چیز کو زائل کر دینا۔ کہتے ہیں "نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ" (سورج نے سائے کو زائل کر دیا) "وَنَسَخَتِ الرِّيحُ آثَرَ الْمَشْيِ" ہوا نے قدموں کے نشان مٹا دیے۔ اسی سے ہے "تناسخ القرون والأزمنة" بعض اوقات کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرنے کے لیے بھی نسخ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بجستانی کہتے ہیں کہ شہد کی مکھیوں کو اور شہد کو ایک چھتے سے دوسرے چھتے میں منتقل کرنے کو نسخ کہتے ہیں۔ اسی طرح جب میراث ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام منتقل ہو جائے تو اس عمل کو بھی نسخ کہتے ہیں۔ دیکھیے آمدی کی "الاحکام" (۳-۲-۱۰)

علمائے اصول (فقہ) کی اصطلاح میں بھی یہ دونوں ہی معنی مراد ہیں۔ متقدمین کے نزدیک نسخ سے مراد ہے مطلق کو مقید، عام کو خاص اور مجمل کو مفصل کرنا اور متاخرین کے نزدیک اس کا مطلب ہے کہ اصل حکم اس طرح ختم کر دینا گویا کہ یہ حکم دیا ہی نہیں گیا تھا۔ دیکھیے اعلام الموقعین (۲-۳۱۶) اہل علم کے ہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن، قرآن کو اور سنت، سنت کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اختلاف اس بارے میں ہے کہ سنت قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ سنت کتاب اللہ کی ناسخ نہیں ہے، بلکہ اس کے تابع ہے۔ دیکھیے "الرسالۃ" (ص۱۰۶)

اس رائے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امام شافعی نے صحیح ثابت شدہ احادیث کو، جن میں بعض متواتر اور بعض آحاد ہیں، اس گمان کی بنا پر باطل قرار دے دیا کہ وہ کتاب اللہ کے خلاف ہیں یا کتاب اللہ پر اضافہ کرتی یا اس کے بعض احکام کو منسوخ کرتی ہیں۔ جبکہ اللہ کا دین اس کی اجازت نہیں دیتا، حالانکہ اسلام میں تو کتاب و سنت، دونوں ہی شریعت کی بنیاد ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں تو وحی ہی کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى" (النجم۔ ۳،۴) وہ (نبی) اپنی خواہش نفس کے تابع کوئی بات نہیں کرتے۔ ان کی تو ہر بات وحی ہوتی ہے۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کا کلام بھی وحی ہے اور قرآن بھی وحی ہے تو وحی، وحی کی ناسخ ہوتی ہے۔

امام شافعی اور ان کی رائے سے اتفاق رکھنے والے، دوسرے اہل علم کی دلیل یہ آیت ہے "مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا" (البقرۃ- ۱۰۶) (ہم جو بھی آیت منسوخ یا نظر انداز کرتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسی لاتے ہیں) وہ کہتے ہیں کہ یہاں نَأْتِ (ہم لاتے ہیں) میں تبادل لانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ناسخ قرآن ہو۔ اسی آیت میں دوسری دلیل یہ ہے کہ یہاں فرمایا ہے کہ "ہم اس سے بہتر (خیر) لاتے ہیں" اور ظاہر ہے کہ سنت تو قرآن سے بہتر نہیں ہو سکتی اس لیے ناسخ قرآن ہی ہوگا نہ کہ سنت۔

امام مالک اور ان کے ساتھی اس کے قائل ہیں کہ سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ" (وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں) نے قرآن کے اس ارشاد کو منسوخ کر دیا "اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ" (البقرۃ - ۱۸۰) (وصیت والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے ہے)۔

جو لوگ اس بات کے قائل نہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن معجزہ ہے جبکہ سنت معجزہ نہیں۔ اس لیے سنت قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ اس کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ ان کی دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ" (جب ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ بدلتے ہیں) اور ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا "قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ" (کہہ دو کہ مجھے اس بات کا اختیار نہیں کہ میں قرآن میں اپنی طرف سے تبدیلی پیدا کر لوں۔

جمہور نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے تو کوئی بات نہیں کہی۔ آپ کی تو ہر بات اللہ کے حکم کے تابع ہوتی ہے۔ آپ اللہ کی شریعت محمد بن عبداللہ نہیں بلکہ محمد رسول اللہ کی حیثیت سے پہنچاتے ہیں۔ جہاں تک بہتر ہونے کا تعلق ہے تو وہ موازنہ تو احکام کے درمیان ہوگا نہ کہ کلام کے درمیان۔ اس اعتبار سے ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے مصالح کا بہتر علم رکھتا ہے اس لیے وہ اپنی مصلحت اور حکمت کے تحت ایک وقت میں ایک حکم کو مناسب سمجھتا اور ایک چیز پر عمل کرنے یا اس سے رک جانے کا حکم دیتا ہے اور دوسرے وقت میں دوسرے حکم کو مناسب سمجھتا اور پہلے کو منسوخ کر دیتا ہے۔

لے جو لوگ سنت کو قرآن کا ناسخ نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کو میراث والی آیت نے منسوخ کیا ہے، لیکن ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ کہنا فاش غلطی ہے کیونکہ نسخ کا مطلب ہوتا ہے ایک حکم کو ختم کر کے اس کے بالکل برعکس حکم دینا۔ جبکہ آیت میراث سے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی کہ والدین اور اقرباء کو وصیت کرنا جائز نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وراثت میں سے بھی حصہ پائیں اور ان کے حق میں (تہائی میں سے) وصیت بھی کی جائے۔

اس کے بعد ابن حزم کہتے ہیں کہ جو لوگ سنت کو قرآن کا ناسخ نہیں مانتے وہ اپنی ہی بات کو بھول گئے اور انھوں نے عمران بن حصین کی حدیث کو والدین اور اقرباء کے لیے وصیت کا ناسخ مان لیا گویا جس بات کا وہ انکار کر رہے تھے اسے انھوں نے خود ہی تسلیم کر لیا اور صحیح کر دکھایا۔

ے متقدمین توضیح و تشریح کو بھی نسخ کہتے ہیں۔

سے سورۃ نحل آیت نمبر ۱۰۱۔

کے سورۃ یونس: ۱۵

شہ ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ بھی ان کے حق میں دلیل نہیں بنتی کیونکہ ہم تو یہ نہیں کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے بدل دیتے ہیں۔ یہ بات کہنے والا تو کافر ہے، ہم تو کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے وحی کی بنیاد پر تبدیلی پیدا کرتے ہیں جیسے کہ خود اللہ تعالیٰ نے حضور کو حکم دیا کہ آپ لوگوں سے کہہ دیں "اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ" (میں تو اسی بات کی

عبدالرزاق نے "المصنف"[1] میں اور ابو عبید نے کتاب "الاموال"[2] میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو حکم دیا کہ وہ یمن کے ہر بالغ مرد اور عورت سے جزیہ لیں۔ ابو عبید نے اس میں اضافہ کیا ہے کہ چاہے غلام یا لونڈی ہی کیوں نہ ہو، ہر ایک سے ایک دینار یا اس کے برابر جزیہ لیا جائے۔ امام شافعی[3] کی یہی رائے ہے۔ امام مالک کا

پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے) تو اس آیت کی رُو سے بھی وحی، وحی کے ذریعے منسوخ ہو سکتی ہے۔ اور سنت بھی وحی ہے اس لیے قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ (ابن حزم کی بات ختم ہوئی)

اس میں بھی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی فرمایا ہے، وہ اللہ کے حکم سے ہے۔ اس لحاظ سے وہ قرآن ہی کی طرح واجب الاطاعت تشریع ہے۔ پس ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اتباع اور اطاعت کے پہلو سے اللہ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں فرق کریں کیونکہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

[1] مصنف عبدالرزاق (۱۰-۳۳۰) میں مسروق بن اجدع کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ یحییٰ نے کتاب الخراج (ص۶۵) میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ بیہقی یحییٰ اور ابو وائل سے بھی روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت معاذ سے۔ بیہقی لکھتے ہیں کہ ابو داؤد کے بعض نسخوں میں ہے کہ یہ حدیث منکر ہے اور مجھے امام احمد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت شدت کے ساتھ کہتے تھے کہ یہ حدیث بالکل منکر ہے۔ اس کے بعد بیہقی لکھتے ہیں کہ اصل میں منکر تو وہ حدیث ہے جو ابو معاویہ عن الاعمش عن ابراہیم عن مسروق عن معاذ کی سند کے ساتھ ہے لیکن اعمش عن ابی وائل عن مسروق والی روایت بالکل محفوظ ہے کیونکہ اعمش سے ایک جماعت نے یہ روایت بیان کی ہے جن میں سفیان ثوری، شعبہ، معمر، جریر، ابو عوانہ، یحییٰ بن سعید اور حفص بن غیاث شامل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بیہقی، ابو معاویہ کی روایت کو اس لیے ضعیف کہنا چاہتے ہیں کہ ابو معاویہ ضعیف راوی ہے لیکن ابن الترکمانی نے "الجوھر النقی" میں جو لکھا ہے کہ ابن حزم پورے وثوق سے لکھتے ہیں کہ مسروق نے حضرت معاذ سے حدیث نہیں سنی۔ تو یہ بات صحیح نہیں کیونکہ مسروق کی حضرت معاذ سے ملاقات اور ان سے سماع ثابت شدہ ہے۔ اس کے لیے دیکھئے "تھذیب الکمال" (۶ — ۲۱-۱۳۲۰)

علاوہ ازیں بیہقی کے ہاں اس حدیث کی تائید میں حضرت ابن عباس اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایات بھی موجود ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔

[2] کتاب الاموال (ص ۲۸) اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کے مساوی جزیہ لیا جائے۔

[3] یعنی یہ کہ جزیہ ایک دینار یا اس کے برابر ہو۔ "المھذب" میں ہے کہ "جزیہ کی کم سے کم مقدار ہے اور اگر اس سے بڑھانا ہو تو اس کے لیے باقاعدہ معاہدہ کرنا چاہیے۔ بہرحال شریعت نے یہ مقرر کیا ہے کہ دینار سے کم نہ ہو اور اس سے زیادہ کے لیے طرفین کی رضامندی ضروری ہے۔" دیکھئے "المجموع" (۱۸-۱۷۳)

ابن رشد نے "بدایۃ المجتھد" (۱-۲۹۵) میں نہایت خوبصورت بات لکھی ہے کہ کم از کم کی حد مقرر اور زیادہ کی غیر معین ہے۔ یہ اتنی ہو گی جتنی طرفین میں طے ہو جائے۔

مسلک وہ ہے جو حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ جن کے پاس سونا تھا ان پر انھوں نے چار دینار اور چاندی والوں پر چالیس درہم عائد کیے اور عورتوں اور غلاموں سے کوئی جزیہ نہیں لیا۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اہلِ یمن کی کمزور مالی حالت معلوم تھی اس لیے آپؐ نے ان پر کم جزیہ لگایا اور حضرت عمرؓ کو پتہ تھا کہ اہلِ شام کی مالی پوزیشن مضبوط ہے اس لیے آپؓ نے ان پر زیادہ جزیہ عائد کیا۔

احناف کے نزدیک ذمیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان کی رائے میں مالدار پر اڑتالیس درہم، متوسط پر چوبیس اور مزدور و کسان وغیرہ مفلوک الحال لوگوں پر صرف بارہ درہم ہیں۔ دیکھیے امام ابویوسف کی کتاب "الخراج" (ص۱۲۲) اور الجصاص کی "احکام القرآن" (۳-۹۸)

ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی رائے بھی وہی ہے جو امام شافعی کی ہے یعنی یہ کہ جزیہ کی مقدار ایک دینار مقرر ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہوگی، مگر امام شافعی اضافے سے نہیں روکتے۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام احمد کا دوسرا قول وہ ہے جو اثرم نے ان سے نقل کیا ہے کہ جزیہ کی مقدار مقرر نہیں بلکہ اس کا تعین وقت کا حکمران حالات کے پیشِ نظر کرے گا۔ امام احمد کا اسی قول پر عمل ہے۔ سفیان ثوری کی رائے بھی یہی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو تو حکم دیا کہ ہر بالغ سے ایک دینار لیں لیکن اہلِ نجران کے ساتھ آپ نے کپڑوں کے دو ہزار جوڑوں پر صلح کی۔ ایک ہزار رجب میں اور ایک ہزار صفر میں۔ یہ دونوں حدیثیں ابوداؤد نے روایت کی ہیں۔

امام احمد سے ایک تیسرا قول بھی روایت کیا گیا ہے جو امام شافعی کے قول کے مانند ہی ہے یعنی یہ کہ کم از کم مقدار ایک دینار ہے اور زیادہ کی حد مقرر نہیں۔ دیکھیے "المغنی" (۹-۳۲۵)

اس میں شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی الگ الگ مفہوم کی احادیث و آثار کو سامنے رکھتے ہوئے امام احمد کی دوسری رائے سب سے بہتر اور ہر زمان و مکان کے لحاظ سے موزوں ہے۔ الماوردی نے الاحکام السلطانیہ" (ص۱۴۴) میں امام مالک کی بھی یہی رائے نقل کی ہے۔

بیہقی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام اسلمؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اہلِ جزیہ کے اُمراء کو لکھا کہ وہ معذور لوگوں کے علاوہ کسی کا جزیہ ساقط نہ کریں۔ جزیہ کی مقدار چاندی والوں کے لیے چالیس درہم اور سونے والوں کے لیے چار دینار ہے۔ ان کے ذمے مسلمانوں کے لیے کچھ گندم اور زیتون کی مقدار بھی ہے اور عورتوں اور نابالغ بچوں پر جزیہ نہیں لگایا جائے گا۔ یہ جزیہ اہلِ شام پر تھا۔ اہلِ مصر کے لیے اس سے مختلف مقدار تھی۔

امام شافعی کتاب "الام" (۴-۱۰۰) میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے چاندی والوں پر چالیس درہم، متوسط لوگوں پر چوبیس اور ان سے کم حیثیت والوں پر بارہ درہم مقرر فرمائے۔ ان کے نزدیک دیت کے معاملے میں بارہ درہم ایک دینار کے برابر ہوتے تھے۔ امام شافعی کی روایت ختم ہوئی۔

اشہب کہتے ہیں کہ جو بھی قوم جزیہ دینا چاہے اس سے قبول کر لیا جائے۔ اہل کتاب سے تو اس لیے کہ ان کے بارے میں قرآن پاک میں حکم موجود ہے اور دوسروں سے سنت نبوی[1] کے تحت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس سے فدیہ قبول کر لینے کے لیے فرمایا۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش[2] کے سامنے دو متبادل طریقے رکھے کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا پھر تلوار ان کے درمیان فیصلہ کرے گی۔ اس بنا پر دوسرے عرب قبیلوں مثلاً تغلب[3] اور

---

[1] "المدونۃ" (۲-۴۶) میں امام مالک کی بھی یہی رائے نقل کی گئی ہے۔ ابن رشد "المقدمات" (ص۲۸۵) میں لکھتے ہیں کہ قیاس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جب اہل کتاب سے، جو حق کے نسبتاً زیادہ قریب ہیں، جزیہ لیا جاتا ہے تو بت و شریعت کے منکر مجوسیوں سے کیوں نہ لیا جائے۔

[2] ابن الجہم نے لکھا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ قریش سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ ابن رشد نے "المقدمات" میں نقل کیا ہے کہ اجماع نے آیت جزیہ کو خاص کر دیا ہے جس کی رُو سے یہ طے ہے کہ اگر قریش اہل کتاب میں سے ہوں تو بھی ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا بلکہ وہ یا اسلام قبول کریں گے یا ان کا فیصلہ تلوار کرے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جزیہ کی ذلت ان پر مسلط نہیں کی جائے گی۔

یحییٰ بن آدم نے "کتاب الخراج" (ص۶۹) میں ابراہیم بن ابی یحییٰ سے جو حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ایک عیسائی پر ایک دینار سالانہ جزیہ مقرر فرمایا، وہ موضوع کے درجہ کی ہے۔ یہ ابراہیم بن ابی یحییٰ وہی امام شافعی کے استاد ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ اسلمی ہیں جس کو محدثین کی ایک جماعت نے غیر ثقہ قرار دیا ہے اور انھوں نے امام شافعی سے مباحثہ کیا کہ وہ اس کی روایت کو کیوں قبول کرتے ہیں۔ اس کی وفات ۱۸۴ھ میں ہوئی۔

[3] بنو تغلب بن وائل، ربیعہ بن نزار کی شاخ تھے۔ دور جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں جزیہ دینے کے لیے کہا تو انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ ہم بھی عرب ہیں۔ ہم سے اسی طرح صدقہ لیا کریں جیسے مسلمانوں سے لیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم مشرکوں سے صدقہ قبول نہیں کرتے اس پر ان میں سے بعض لوگ رومیوں کے پاس چلے گئے تو نعمان بن زرعہ نے کہا۔ امیر المومنین یہ جنگجو لوگ ہیں۔ جزیہ دینے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے تو آپ ان کا وزن اپنے دشمن کے پلڑے میں نہ ڈالیے بلکہ صدقہ کے نام پر ان سے جزیہ لیجیے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلاش میں آدمی بھیجے۔ وہ واپس آگئے اور حضرت عمرؓ نے ہر پانچ اونٹوں پر دو بکریاں، ہر تیس گایوں پر دو بچھڑے، ہر بیس دینار پر ایک دینار، ہر دو سو درہم پر دس درہم اور بارانی پیداوار پر خمس اور نہری اور چاہی پیداوار پر عشر مقرر فرما دیا۔ صحابہؓ میں سے کسی نے حضرت عمرؓ سے اس سلسلے میں اختلاف نہ کیا تو یہ اجماع صحابہ قرار پایا۔ صحابہ کے بعد ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کی رائے بھی یہی ہے۔ اس سے اختلاف صرف حضرت علیؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کیا ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل کتب دیکھیے:

"المغنی" (۹-۳۳۵)، امام ابو یوسف کی "کتاب الخراج" (ص۱۲۹)، یحییٰ بن آدم کی "کتاب الخراج" (ص۶۱)،

تنوخ[1] وغیرہ کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا جائے گا ان میں سے جو اہلِ کتاب کا کوئی مذہب اختیار کرلیں ان سے جزیہ قبول کرلیا جائے گا اور جو اہلِ کتاب کا کوئی مذہب اختیار نہ کریں انھیں یا اسلام قبول کرنا ہوگا یا ان سے جنگ لڑی جائے گی۔

سحنون کہتے ہیں کہ مجھے اس رائے سے اس لیے اتفاق نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے ساتھ اہلِ کتاب والا معاملہ کرو[2]۔

البلاذری کی "فتوح البلدان" (ص۱۹۱)، جصاص کی "احکام القرآن" (۳-۹۰۴-۹۳)، "المهذب مع المجموع" (۱۸-۱۷۴)، اور ابن قیم کی "احکام اهل الذمة" (۱-۷۷)

[1] تنوخ اہلِ یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ ماہرینِ انساب کا ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابنِ خلدون کہتے ہیں کہ یہ بنو اسد بن وبرہ بن تغلب میں سے تھے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ تنوخ کا نام مالک بن زہیر بن عمرو بن فہیم تھا۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ اس کی تین شاخیں نزار، **احلاف** اور فہم تھیں۔ دیکھیے کحالہ کی کتاب "معجم قبائل العرب" (۱-۱۳۳)

امام شافعی کہتے ہیں کہ تنوخ، بہرا اور بنو تغلب جیسے عرب عیسائیوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے ضمن میں مختلف قسم کی روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے ان سے اس بات پر صلح کی کہ ان پر جزیہ نہیں لگائیں گے۔ دیکھیے "احکام اهل الذمة" (۱-۸۰)

حنابلہ میں سے قاضی ابویعلیٰ اور ابوالخطاب نے بنو تغلب، بہرا اور تنوخ کے عیسائیوں الکنانہ اور حمیر کے یہودیوں اور بنو تمیم کے مجوسیوں کے بارے میں ایک ہی فیصلہ دیا ہے کہ ان سے جزیہ نہیں لیا گیا۔

حافظ ابن القیم کہتے ہیں کہ یہ مسلک امام احمد کی رائے کے خلاف ہے۔ ابنِ قدامہ کہتے ہیں کہ آیت حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ... (التوبہ-۲۹) کے عموم کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب اہلِ کتاب سے جزیہ لیا جائے، رہا بنو تغلب کے ساتھ خصوصی سلوک امیر المومنین کی رائے پر کیا گیا۔

[2] یہ روایت امام مالک نے "موطا" (۱-۲۰۶) کتاب الزکوٰۃ میں نقل کی ہے۔ مصنف عبدالرزاق (۶-۶۹) ابوعبید کی کتاب "الاموال" (ص۳۵) یہ سب جعفر بن محمد سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ صحابہ کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے جن میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے پوچھا کہ ان لوگوں کے بارے میں کیا کروں جو نہ اہلِ کتاب ہیں نہ عرب۔ ان کی مراد تھی "مجوسی"۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ "ان کے ساتھ اہلِ کتاب والا معاملہ کرو"۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ محمد بن علی کی ملاقات نہ حضرت عمرؓ سے ثابت ہے نہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے۔ ابوعلی حنفی نے یہ امام مالک سے روایت کی ہے۔ اور اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ منقطع ہے۔ کیونکہ علی بن حسین کی ملاقات حضرت عمرؓ یا حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے نہیں ہوئی۔ دیکھیے "التمهيد" (۲-۱۱۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل حجر[۱] اور منذر بن ساویٰ کی طرف اپنے خطوط میں ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرمائی تھی۔ اس خط میں آپؐ نے لکھوایا:

"مَنْ اَبٰی فَعَلَیْہِ الْجِزْیَۃُ" (جو اسلام لانے سے انکار کرے اس پر جزیہ عائد کیا جائے گا) اس سلسلے میں حضورؐ نے عربوں اور غیر عربوں میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا حالانکہ ان میں مجوسی اور دوسرے ادیان کے پیرو بھی شامل تھے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جزیہ سال کے آخر میں لیا جائے گا[۲]۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ اور دوسرے اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ سال کے آغاز میں لیا جائے گا[۳]۔ اس سلسلے میں امام مالک کی کوئی رائے محفوظ طریقے سے ہم تک نہیں پہنچی[۴]۔

البتہ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کی طرف سے شہادت سامنے آنے کے بعد حضرت عمرؓ نے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔ یہ حدیث تواتر کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔ بخاری، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور دوسرے محدثین نے یہ روایت کی ہے۔ مسلمان خلفاء اور حکمرانوں نے حضرت عمرؓ کے بعد اس پر عمل کیا ہے۔ طبرانی نے مسلم بن العلاء الحضرمی سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ زرقانی نے "شرح موطا" (۲-۴۰۲، ۳) میں حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل موجود ہے۔

[۱، ۲، ۳] ان کے لیے دیکھیے کتاب "الاموال" (ص ۳۰، ۴۴، ۴۵)

[۲] دیکھیے کتاب "الام" (۴-۱۷۶) اور "المہذب مع المجموع" (۱۸-۱۷۷)

[۳] دیکھیے جصاص کی "احکام القرآن" (۳-۱۰۰) اور ابن رشد کی "المقدمات" (ص ۲۸۲) اس سلسلے میں امام احمد کی رائے وہی ہے جو امام شافعی کی ہے۔ یعنی یہ کہ جزیہ سال کے آخر میں لیا جانا چاہیے۔ دیکھیے "المغنی" (۹-۳۲۹) اور "المقنع" (ص ۹۴)

[۴] باقی جہاں تک "مواہب الجلیل" میں "التوضیح" کے حوالے سے نقل کی گئی اس رائے کا تعلق ہے کہ جو شخص اہل ذمہ میں سے بالغ ہو تو اس سے بالغ ہوتے ہی سال کے اختتام کا انتظار کیے بغیر جزیہ لینا شروع کر دیا جائے گا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ سال کے شروع میں واجب ہو جاتا ہے، لیکن ابن رشدؒ "المقدمات" (ص ۲۸۲) میں اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "المدونۃ" میں امام مالک کا جو قول نقل کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جزیہ سال کے آخر میں واجب ہوتا ہے ابن رشد کہتے ہیں کہ قیاس بھی یہی کہتا ہے، کیونکہ یہ تو ان سے سال بسال ان خدمات کے صلے میں لیا جاتا ہے جو ان کی جان و مال کی حفاظت کرنے، ان کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی آزادی دینے اور ان کے مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں سرانجام دی جاتی ہیں۔

اس کے بعد ابن رشد لکھتے ہیں کہ اس لحاظ سے تو یہ زکوٰۃ کی طرح سال گزرنے کے بعد ہی واجب الادا ہونا چاہیے۔ اس قیاس کی بنیاد یہ بھی ہے کہ جزیہ بھی زکوٰۃ مال ہی میں مستحقین کا حق ہے اس لیے اسی طرح سال گزرنے کے بعد ہی وہ وصول ہونا چاہیے (ابن رشد کی بات ختم ہوئی)

كِتَابُ النِّكَاحْ

اس بیوہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

جس کا نکاح اس کا باپ اس کی مرضی کے بغیر کردے

موطا[1]، بخاری[2]، مسلم[3]، نسائی[4] اور مصنف عبدالرزاق[5] میں حضرت خنساء[6] بنت خذام انصاریہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بیوہ[7]

---

[1] "موطا" (۲-۸) کتاب "النکاح" باب "ما لا یجوز من النکاح" اس کی سند یہ ہے۔ مالک عبدالرحمٰن بن قاسم سے، وہ اپنے والد سے، وہ یزید بن جاریہ انصاری کے دو بیٹوں عبدالرحمٰن اور مجمع سے، وہ دونوں خنساءؓ بنت خذام سے روایت کرتے ہیں۔

[2] صحیح بخاری، کتاب "النکاح" باب "اذا زوج الرجل ابنته وھی کارھۃ نکاحھا مردود" امام بخاری، اسماعیل سے، وہ امام مالک سے خود ان کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

[3] پوری جستجو کے باوجود یہ حدیث مجھے صحیح مسلم میں نہیں ملی۔ اس میں مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ صحیح مسلم میں خنساءؓ سے اس طرح کی کوئی روایت نہیں چنانچہ عبدالحق نے یہ بات پورے وثوق سے لکھی ہے۔ جیسے ان سے زبیدی نے "عقود الجواھر" (۱-۱۵۲) میں بھی نقل کیا ہے۔ زرقانی نے بھی "شرح موطا" (۴-۳۴۳) میں یہ بات پوری تاکید کے ساتھ لکھی ہے کہ مسلم نے یہ روایت نقل نہیں کی۔

[4] سنن نسائی (۶-۸۶) کتاب "النکاح" باب "الثیب یزوجھا ابوھا وھی کارھۃ" امام مالک کی سند کے ساتھ۔

[5] مصنف عبدالرزاق (۶-۱۴۸، ۱۴۴) عن ثوری، عن ابوالحویرث، عن نافع بن جبیر، عن معمر، عن سعید بن عبدالرحمٰن الجحشی، عن ابوبکر بن محمد۔

معمر کی روایت ہے کہ ان کے خاوند کا نام انیسؓ بن قتادہ تھا۔ وہ غزوۂ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔ خنساءؓ نے کہا کہ میرے بیٹے کا چچا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے خاوند سے اس کا بیٹا تھا۔

[6] خنساءؓ بنت خذام، مشہور صحابیہ ہیں۔ ان کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔

[7] سب راویوں کا کہنا ہے کہ وہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ مصنف عبدالرزاق میں صراحت ہے کہ پہلے خاوند میں سے ان کا بیٹا بھی تھا مگر ثوری نے عبدالرحمٰن بن قاسم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن یزید بن ودیعۃ کہتے ہیں کہ اس وقت خنساءؓ کنواری تھیں۔ ابن عبدالبر نے اس طرح روایت نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی "الاصابۃ" (۴-۲۷۹) میں خنساءؓ کے تذکرے میں یہ بات نقل کی ہے لیکن "فتح الباری" (۹-۱۹۰) میں وہ پہلی روایت کو مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت خنساءؓ نے کہا کہ میرے بیٹے کا چچا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے۔ دوسرے یہ کہ مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت ہے کہ خذام ابو ودیعہ نے اپنی بیٹی کا نکاح ایک آدمی سے کر دیا تو حضورؐ نے فرمایا۔

ہوگئیں توان کے باپ نے ان کا دوسرا نکاح[1] ان کی مرضی کے بغیر کر دیا۔ انھیں یہ بات ناگوار گزری تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضور نے اس نکاح کو کالعدم قرار دے دیا۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ اس کے بعد خنساء نے ابولبابہ انصاری سے نکاح کر لیا۔ خذام[2] کی کنیت ابو ودیعہ ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں مہاجر بن عکرمہ[3] سے یہ روایت بھی ہے کہ ایک کنواری لڑکی نکاح اس کے باپ نے

"لَا تُكْرِهُوهُنَّ" (انھیں مجبور نہ کیا کرو) اس کے بعد انھوں نے ابولبابہ سے نکاح کر لیا اور اس وقت وہ بیوہ تھیں۔ تیسرے یہ کہ طبرانی ایک اور سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے اسی طرح کی روایت کرتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ مصنف عبدالرزاق میں ایک روایت حضرت سفیان ثوری عن ابی الحویرث کی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس میں ہے کہ خنساؓ بیوہ ہوگئیں تو ان کے والد نے ان کا نکاح ایک آدمی سے کر دیا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ اسناد ایک دوسری کو تقویت پہنچاتی ہیں اور ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیوہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ ابو عمر کہتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت پر سب کا اتفاق ہے اور عمل بھی اسی پر ہے۔ کیونکہ جو حضرات یہ کہتے ہیں: (کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا) وہ بھی دراصل یہ کہتے ہیں کہ بیوہ کا ولی (سرپرست) چاہے وہ اس کا باپ ہو یا کوئی اور اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہیں کر سکتا، چنانچہ زرقانی نے بھی شرح مؤطا میں اسی رائے کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ حضرت حسن بصری کے علاوہ باقی سب کا اس پر اجماع ہے کہ اگر بیوہ کا سرپرست اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کر دے تو وہ کالعدم ہوگا۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ باپ اسے مجبور کر سکتا ہے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ اگر وہ اس کے خاندان میں شمار کی جاتی ہو تو ٹھیک ورنہ کالعدم قرار پائے گا۔ اس بارے میں یہ اختلاف ہے کہ اگر رضامندی کے بغیر بیوہ کا نکاح اس کا سرپرست کر دے تو کیا ہوگا۔ احناف کہتے ہیں کہ وہ اس کو مان لے تو ٹھیک ہے ورنہ نکاح کالعدم ٹھہرے گا۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر وہ جلدی مان لے تو ٹھیک، ورنہ باطل۔ اور باقی اسے مطلقاً مسترد کرتے ہیں۔

[1] جس آدمی سے ان کا نکاح ہوا اس کا نام معلوم نہیں۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ قبیلہ مزینہ میں سے تھا۔

[2] ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ خذام ابن ودیعۃ انصاری ہیں۔ ابن مندہ لکھتے ہیں خذام بن خالد۔ نسخہ محرم کی میں ہے کہ خذام کی کنیت وزیعۃ (زاء کے ساتھ) تھی۔ باقی نسخوں میں ابو وریعۃ (راء کے ساتھ) ہے۔ لیکن یہ دونوں غلط ہیں۔ صحیح ابو ودیعۃ ہی ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں یہی ہے اور ابونعیم نے بھی اس کی یہی کنیت لکھی ہے۔

[3] مہاجر بن عکرمہ بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام مخزومی۔ عبدالرزاق اپنی سند کے ساتھ مہاجر بن عکرمہ سے یہ مرفوع حدیث روایت کرتے ہیں۔

بیہقی "السنن الکبریٰ" (۷-۱۱۷) میں کہتے ہیں کہ اس روایت میں جریر بن حازم نے ایوب سختیانی سے روایت میں غلطی کی ہے جبکہ ایوب عن عکرمہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محفوظ سند کے ساتھ یہی حدیث مرسلاً روایت کی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ایک اور متصل سند

اس کی مرضی کے بغیر کر دیا تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے اسے اس بارے میں اختیار دے دیا۔

ابن جریج، ایوب سے، وہ عکرمہ سے اور وہ یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک کنواری اور ایک بیوہ کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف ان کے والد نے کر دیا۔ وہ دونوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے ان کے نکاح کالعدم قرار دے دیے۔

عبداللہ بن بریدہ روایت کرتے ہیں کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور

کے ساتھ یہ حدیث حضرت عکرمہ سے بھی روایت کی گئی ہے لیکن وہ بھی غلط ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اگر کنواری کے بارے میں یہ حدیث ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا نکاح "غیر کفو" کے ساتھ کیا گیا تھا۔ عبدالرزاق نے جو حدیث یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کی ہے اسے طبرانی اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متصل سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ رَدَّ نِكَاحَ بِكْرٍ وَثَيِّبٍ اَنْكَحَهُمَا اَبُوْهُمَا كَارِهَتَيْنِ" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنواری اور بیوہ کے نکاح باطل قرار دے دیے جن کی مرضی کے خلاف ان کے والدوں نے ان کے نکاح کر دیے تھے)

اس روایت کے بارے میں دارقطنی کہتے ہیں کہ اس سند میں ایک راوی عبدالملک الذماری تنہا ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔ اور صحیح روایت وہ ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں یحییٰ بن ابی کثیر سے، اس نے مہاجر سے اور اس نے عکرمہ سے مرسلاً بیان کی ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیوہ پر تو اس کے باپ کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اگر وہ اس کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی کر دے تو وہ کالعدم قرار پائے گی۔ شرعی دلائل اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔ جہاں تک کنواری لڑکی کا تعلق ہے تو اس کے نکاح کا مجاز اس کا والد ہے کیونکہ وہ اس کی مصلحتوں کو بہتر سمجھتا ہے۔ ہاں اگر وہ "کفو" کے انتخاب میں غلطی کرے تو لڑکی حکومت کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔

ؔ یہ حدیث عبدالرزاق نے المصنف (۶ - ۱۴۶) میں جعفر بن سلطان سے کہمس بن حسن کے حوالے سے روایت کی ہے۔ اور امام نسائی (۲ - ۸۶) اسے علی بن غراب عن کہمس عن عبداللہ عن بریدہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں، جبکہ بیہقی (۷ - ۱۱۸) عبدالوہاب بن عطا عن کہمس عن عبداللہ بن بریدہ کی سند کے ساتھ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک دوشیزہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ابن ماجہ (۱ - ۶۰۲) اس حدیث کو عبداللہ بن بریدہ سے اور وہ اپنے باپ بریدہ سے روایت کرتے ہیں۔ بوصیری نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ ابن بریدہ کی مرسل روایت ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کا سماع ثابت نہیں لیکن "سنن بیہقی" کی شرح "الجوہر النقی" کے مصنف ابن الترکمانی اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن بریدہ ۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور انھوں نے متعدد صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں اور امام مسلم نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس بات پر محدثین کا اتفاق ہے کہ اگر ملاقات اور سماع کا امکان ہو تو یہ سند کے متصل ہونے کے لیے کافی دلیل ہے اور اس میں شک نہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابن بریدہ کے سماع کے کافی امکانات ہیں۔ پس ان (عائشہ رضی اللہ عنہا) سے ابن بریدہ کی روایت کو متصل قرار دیا جا سکتا ہے خاص طور پر جبکہ "الکمال" کے مؤلف نے اس سماع کی

اس نے کہا "یا رسول اللہ! میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کر دیا ہے اور مجھ سے مشورہ نہیں کیا۔ کیا مجھے اپنے معاملے میں کچھ اختیار ہے؟ اس لڑکی نے یہ بھی کہا کہ میری وجہ سے اس (خاوند) کی دنائت میں فرق آتا ہے اور اس کی پوزیشن بہتر ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہاں تجھے اختیار ہے۔" اس لڑکی نے کہا کہ میں اپنے باپ کی بات کو مسترد نہیں کرنا چاہتی لیکن میں عورتوں کو یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ انھیں اپنے بارے میں اختیار ہے یا نہیں۔

مصنف[1] عبدالرزاق میں اور الواضحہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی بیٹیوں میں سے کسی کا نکاح کرنے کا ارادہ فرماتے تو آپ پردے کے پیچھے سے آ کر فرماتے کہ فلاں شخص فلاں (اپنی اس بیٹی کا نام لیتے) کا رشتہ طلب کرتا ہے۔ اگر وہ پردے کو ہلا دیتیں تو آپ نکاح نہ کرتے۔ الواضحہ میں ہے کہ اگر وہ اپنی انگلی سے کھٹکھٹا دیتیں تو آپ نکاح نہ کرتے اور اگر خاموش رہتیں تو آپ نکاح کر دیتے۔

"المدونۃ"[2] میں حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیوں کے نکاح ان کی مرضی پوچھے بغیر حضرت عثمانؓ بن عفان سے کیے۔ ابن وضاح کی روایت میں اسی طرح ہے جبکہ دوسروں کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کی مرضی پوچھے بغیر حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔

حضرت حسن بصری[3] کہتے ہیں کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک شخص اپنی بیوہ یا مطلقہ بیٹی کا دوسرا نکاح اس کی مرضی

تصریح کی ہے۔ (ابن الترکمانی کی بات ختم ہوئی)۔

میں کہتا ہوں کہ "الکمال" (۳ - ۶۶۹) کے مؤلف نے حضرت عائشہؓ سے ابن بریدہ کے سماع کی تصریح نہیں کی کیونکہ اس نے تو لکھا ہے کہ مرو کے قاضی عبداللہ بن بریدہ الخصیب الاسلمی ابو سہیل مروزی نے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی جس میں حضرت انسؓ اور عائشہؓ شامل ہیں۔

اور ابن ماجہ کی روایت میں تصریح ہے کہ اس نے اپنے باپ بریدہ بن خصیب سے روایت کی جو امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں تین سال تک زندہ رہے۔ یہ روایت اس کی حضرت عائشہؓ کی روایت سے زیادہ قابل قبول ہے اور اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس لڑکی کے باپ نے اس کا "غیر کفو" سے نکاح کر دیا تھا۔ ابن الجوزی نے اسی طرح لکھا ہے۔

[1] مصنف عبدالرزاق (۶ - ۱۴۱) میں معمر عن یحیی بن ابی کثیر عن مہاجر بن عکرمہ کی سند کے ساتھ مرسل روایت ہے۔ ایک دوسری روایت ثوری عن ہشام عن یحیی ابن ابی کثیر عن مہاجر کی سند کے ساتھ ہے۔ یہی روایت بیہقی (۷ - ۱۲۳) نے شعبی عن ثوری عن ہشام اور یونس بن بکر عن ہشام کی سندوں کے ساتھ نقل کی ہے۔ ابو الاسباط عن یحیی بن ابی کثیر عن ابو سلمہ عن ابو ہریرہ کی متصل سند کے ساتھ بھی بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس پر بیہقی نے تبصرہ کیا ہے کہ یہ سند غیر محفوظ اور یحیی ابن ابی کثیر والی مرسل سند محفوظ ہے۔

[2] "المدونۃ" (۲ - ۱۵۷) ابن وہب کہتے ہیں کہ مجھے السری بن یحیی نے حسن بصری کے حوالے سے بتایا۔

[3] امام حسن بصری کا یہ قول شاذ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ سب ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیوہ یا مطلقہ کا نکاح اس کی مرضی کے

پوچھے بغیر کر سکتا ہے۔ اسماعیل القاضی کہتے ہیں کہ یہ بہت عمدہ فقہی نکتہ ہے مگر اجماع اس کے خلاف ہے۔

ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ اگر وہ اس کے خاندان میں شمار کی جاتی ہو تو وہ اس کا نکاح کر سکتا ہے۔

اسماعیل القاضی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض بیٹیوں کے نکاح ہجرت سے پہلے اور بعض کے بعد میں کیے۔ اور احکام نے تو ہجرت کے بعد آخری شکل اختیار کی اور ہمیں نہیں معلوم کہ ہجرت کے بعد حضور نے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ کسی اور کنواری بیٹی کا نکاح کیا ہو۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح عتبہ بن ابو لہب سے ہوا۔

بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بنیاد حضرت خنساءؓ والی حدیث اور اس کے ساتھ دوسری یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلثَّیِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِیِّهَا" (بیوہ یا مطلقہ کو اپنے ولی سے زیادہ اپنے اوپر حق حاصل ہے) یہ صحیح حدیث ہے اور حضرت خنساءؓ والی حدیث کے بارے میں بھی ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ اس کی صحت پر اجماع ہے اور اس کے خلاف حضرت حسن کے علاوہ کسی اور کا قول ہمیں معلوم نہیں۔ اسماعیل بن اسحاق کہتے ہیں کہ مطلقہ یا بیوہ کے بارے میں حضرت حسن کے علاوہ اور کسی کا قول اس طرح کا نہیں۔ امام حسن بصری کا یہ قول اہلِ علم اور اہلِ سنت کی رائے کے خلاف ہے۔ دیکھیے "المغنی" (۶- ۵۲۰) شوکانی "نیل الاوطار" (۶- ۲۵۵) میں لکھتے ہیں کہ اس بارے میں اجماع ہے اور اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ نکاح کرکے دینے والا باپ ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور۔

لہ ابراہیم بن یزید بن قیس بن الاسود صداقت، تقویٰ اور حافظہ کے اعتبار سے کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ مجتہد امام تھے۔ امام ابوحنیفہ نے اپنی فقہ کی بنا انہی کے فقہی مسلک پر رکھی۔ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

یہ بیوہ یا مطلقہ کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک بڑی اور دوسری چھوٹی۔ بڑی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ باپ یا کسی اور سرپرست کو اس کی مرضی کے بغیر نکاح کرکے دینے کا حق حاصل نہیں۔ چھوٹی وہ ہے جو اپنے باپ کے خاندان میں شامل ہو۔ اس کے بارے میں امام نخعی کہتے ہیں کہ اس کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ کنواری لڑکیوں ہی کی مانند ہوتی ہے اور اسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک، ابوحنیفہ اور احمد سے بھی اسی طرح کی رائے نقل کی گئی ہے۔ دیکھیے "المغنی" (۶-۵۲۱) عام مصلحت کے پیشِ نظر تو یہ تقسیم بہت اچھی ہے، لیکن احادیث و آثار سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

ابراہیم نخعی کے تعارف کے لیے دیکھیے ابونعیم کی "حلیۃ الاولیاء" (۴ - ۲۱۹)، ذہبی کی تاریخ اسلام (۳- ۳۳۵) اور ابن الجزری کی "طبقات القراء" (۱- ۲۹)

ٰٰلہ فاطمۃؓ الزہراء حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صاحبزادی تھیں۔ بعثتِ نبوی سے تقریباً ایک سال پہلے پیدا ہوئیں۔ حضرت عائشہؓ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھیں۔ اوائل محرم ۲ھ میں ان کا حضرت علیؓ سے نکاح ہوا۔ حضورؐ کی وفات کے تقریباً چھ ماہ بعد ان کا انتقال ہوا۔

لہ رقیہؓ، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں۔ جرجانی نے نقل کیا ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں، لیکن اکثر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ ام کلثوم چھوٹی تھیں۔ ان کا عتبہ بن ابولہب سے اور ام کلثومؓ کا عتیبہ

اس نے انھیں طلاق دے دی تو آپؐ نے مکہ ہی میں ان کا نکاح حضرت عثمان سے کر دیا۔ حضرت ام کلثوم کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ ان کا نکاح عتیبہ بن ابولہب سے تھا۔ اس نے انھیں طلاق دے دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت عثمان سے مدینہ منورہ میں کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں بہنوں کی ابولہب کے بیٹوں کے ہاں رخصتی ہوئی تھی یا نہیں؟[۱] امام حسن بصری نے جو روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی[۲] کی مرضی معلوم کیے بغیر ان کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا تو گمان ہوتا ہے کہ یہ حضرت اُمّ کلثوم ہوں گی، کیونکہ حضورؐ نے ہجرت کے بعد تو ان کے اور حضرت فاطمہؓ کے علاوہ اور کسی کا نکاح نہیں کیا۔

پس اسماعیل قاضی کی روایت ابن وضاح کی اس روایت سے مختلف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے اپنی دو بیٹیوں کے نکاح کیے۔

ابن قتیبہ نے "المعارف"[۳] میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے مدینہ

بن ابی لہب سے نکاح ہوا تھا۔ جب سورۂ لہب نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہیں دو گے تو میرا تمھارے ساتھ رہنا حرام ہے۔ اسی طرح ان کی ماں نے بھی انھیں مجبور کیا تو انھوں نے رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت رقیہؓ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ پھر انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں ۲ھ میں ان کی اس وقت وفات ہوئی جب حضورؐ غزوۂ بدر میں تھے۔

[۱] ابن عبدالبر، ابن اثیر، حافظ ابن حجر اور دوسرے سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ابولہب کے دونوں بیٹوں نے حضورؐ کی بیٹیوں کو رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی تھی۔

[۲] بعض نسخوں میں "اپنی دونوں بیٹیوں" کے الفاظ ہیں، لیکن وہ غلط ہیں۔ مجھے سیرت کی کتابوں میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹی کی مرضی معلوم کیے بغیر ان کا نکاح کر دیا تھا۔ بس ایک ہی بات سے اس کا کچھ اشارہ ملتا ہے اور وہ یہ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حفصہ کے بیوہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ سے باری باری کہا کہ وہ ان (حفصہؓ) سے نکاح کر لیں تو حضرت ابوبکرؓ تو خاموش رہے اور حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت عمرؓ نے اس بات کی شکایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو آپ نے فرمایا: "حفصہؓ سے وہ شخص شادی کرے گا جو عثمانؓ سے بہتر ہے اور عثمانؓ اس خاتون سے شادی کرے گا جو حفصہؓ سے بہتر ہے۔" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے شادی کی اور اپنی بیٹی اُمّ کلثوم کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ اس روایت میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے پتہ چلتا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہنے سے پہلے اپنی بیٹی سے ان کی مرضی معلوم کی ہو۔

[۳] یہاں مصنف سے "المعارف" (ص ۱۴۲) سے نقل کرنے میں غلطی ہوئی۔ ابن قتیبہ نے یہ نہیں لکھا کہ حضرت عثمانؓ نے

میں اور ان کے بعد حضرت ام کلثوم سے بھی مدینہ میں نکاح کیا اور ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ نے رخصتی سے پہلے ہی حضرت رقیہ اور ام کلثوم کو طلاق دے دی تھی۔

حضرت رقیہؓ سے مدینہ منورہ میں شادی کی۔ بلکہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:

حضرت رقیہ کا نکاح عتبہ بن ابولہب سے ہوا تو ابولہب نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ وہ طلاق دے دے، چنانچہ اس نے رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے مکہ معظمہ میں نکاح کیا۔ وہ مدینہ ہجرت کرکے آنے کے ایک سال، دس ماہ اور بیس دن بعد وفات پا گئیں۔ ان کے بطن سے حضرت عثمان کا لڑکا عبداللہ پیدا ہوا۔ ان کا بچپن ہی میں چھ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کو مرغ نے آنکھوں میں ٹھونگے مارے تھے جس سے وہ بیمار ہوئے تھے اور وفات پا گئے۔

نکاحِ تفویض اور جس کا خاوند رخصتی سے پہلے ہی فوت ہو جائے

اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

نسائی[2] اور مصنف عبدالرزاق[3] میں ابراہیم نخعی سے روایت ہے، وہ علقمہ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا لیکن نہ اس نے حق مہر مقرر کیا اور نہ ہی رخصتی ہوئی

---

[1] لغت میں تفویض کا معنی ہے کوئی معاملہ کسی کے سپرد کر دینا۔ شریعت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی اپنے نکاح کا معاملہ کسی کے سپرد کر دے۔ اگر کسی خاتون کو نکاح کا معاملہ تفویض کیا گیا ہو تو اسے مُفَوِّضَۃٌ (واؤ کی زیر کے ساتھ) کہتے ہیں۔ اور اگر اس کے نکاح کا معاملہ کسی اور کو تفویض کیا گیا ہو تو اسے مُفَوَّضَۃٌ (واؤ کی زبر سے) کہتے ہیں۔

شریعت میں تفویض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے حق مہر کا معاملہ کسی کے سپرد کرنا۔ جیسے کہیں کہ میں نے تمہارا نکاح (فلاں سے) کر دیا ہے جس مہر پر تم چاہو یا میں چاہوں یا ہم چاہیں۔ اس صورت میں نکاح صحیح ہوگا اور مہر مثل واجب ہو جائے گا۔ دوسری قسم ہے تفویض بضع۔ اس کی مثال یوں ہے کہ مہر کا ذکر کیے بغیر کہے کہ میں نے تمہارا نکاح (فلاں سے) کر دیا ہے یا یوں کہے کہ میں نے تمہارا (فلاں سے) مہر کے بغیر نکاح کر دیا۔ یہ نکاح بھی درست ہوگا اور اس عورت کے لیے کوئی مہر نہیں ہوگا۔ دیکھیے "المجموع" (۱۵-۵۲۷) اور "المغنی" (۷-۱۲۷)۔

[2] نسائی (۶-۱۲۱) کتاب النکاح' باب اباحۃ التزوج بغیر صداق۔

[3] مصنف عبدالرزاق (۶-۲۹۴) میں ابراہیم نخعیؒ کی اس روایت کے الفاظ میں کچھ اختلاف ہے۔ میں یہاں اس روایت کو اس طرح نقل کرتا ہوں جیسے وہ "مصنف" میں ہے۔

"علقمہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے ابن مسعودؓ سے ایک عورت کے بارے میں پوچھا جس کا خاوند نکاح کے بعد فوت ہو گیا جبکہ ابھی نہ حق مہر مقرر ہوا تھا اور نہ رخصتی ہوئی تھی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ان کو واپس بھیج دیا۔ وہ پھر آئے تو آپ نے فرمایا کہ میں اس معاملہ میں اپنی رائے دے رہا ہوں، وہ صحیح ہو تو اللہ کی طرف سے ہوگی اور غلط ہو تو میری طرف سے۔ میری رائے میں اس کے لیے پورا مہر مثل، وراثت میں سے پورا حصہ اور پوری عدت ہے۔ اس پر معقل بن سنان اشجعی نے اٹھ کر گواہی دی کہ بروع بنت واشق کے بارے میں حضورؐ نے بھی یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ بروع بنو عامر بن رؤاس بن صعصعہ کی شاخ بنو رواس سے تعلق رکھتی تھی۔ سفیان ثوری کی بھی یہی رائے ہے۔"

عبدالرزاق "مصنف" میں مزید لکھتے ہیں کہ شعبی کی روایت کے مطابق یہی سوال حضرت ابن مسعودؓ سے کیا گیا تو انھوں نے

اور وہ مرد فوت ہو گیا - اب اس کے لیے کیا حکم ہے ؟ حضرت عبداللہ بن مسعود انھیں ایک ماہ تک فتویٰ دیے بغیر واپس بھیجتے رہے - پھر انھوں نے فرمایا "میں اپنی رائے سے ایک بات کہہ رہا ہوں اگر یہ درست ہو تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر اس میں غلطی ہو تو یہ میری طرف سے ہے - نسائی میں ہے کہ پھر یہ شیطان کی طرف سے ہے - میری رائے یہ ہے کہ اسے اپنے خاندان کی عورتوں کے برابر پورا پورا حق مہر ملنا چاہیے - وہ میراث میں سے پورا حصہ پائے گی اور چار ماہ عدت گزارے گی - تب قبیلۂ اشجع کے کچھ لوگوں نے اٹھ کر کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بروعؓ بنتِ واشق کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک اسی طرح فیصلہ دیا جیسے آپ نے دیا ہے -

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ بنتِ واشق، بنو رواس میں سے تھی اور بنو رواس، بنی عامر بن صعصعہ کی شاخ ہے اور جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی گواہی دی وہ معقلؓ بن سنان اشجعی اور اس کی قوم کے کچھ لوگ تھے[۲]

سائل سے کہا کہ لوگ بہت ہیں، کسی اور سے پوچھ لو - اس نے کہا کہ سال بھر بھی اگر آپ نے نہ بتایا تو بھی میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں بلکہ آپ سے پوچھتا رہوں گا - حضرت ابن مسعودؓ نے ایک مہینہ کے لیے اسے واپس بھیج دیا - پھر خود اٹھے - وضو کیا اور دو رکعتیں پڑھیں - پھر دعا کی کہ اے اللہ اگر میں صحیح بات کہوں تو یہ تیری طرف سے ہوگی اور غلط کہوں تو میری طرف سے ہوگی - پھر انھوں نے رائے دی کہ اس عورت کے لیے پورا مہر مثل، پوری وراثت اور عدت ہے - تب قبیلۂ اشجع کے ایک آدمی نے اُٹھ کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے وہی فیصلہ دیا ہے جو بروع بنتِ واشق اسلمیہ کے بارے میں حضورؐ نے دیا تھا - بروع کا نکاح ہلال بن امیہ سے ہوا تھا - حضرت عبداللہ نے پوچھا کہ تمھارے علاوہ کسی نے یہ بات حضورؐ سے سنی ؟ اس نے کہا جی ہاں" پھر وہ اپنے قبیلے کے بہت سے لوگ لے آیا جنھوں نے گواہی دی - کہتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت ابن مسعود کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا جتنے آج وہ اس بات پر خوش ہوئے کہ انھوں نے فیصلہ حضورؐ کے فیصلے کے مطابق کیا (مصنف عبدالرزاق کی عبارت ختم ہوئی)

ان دونوں روایات کا موازنہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ دونوں میں الفاظ کا کتنا فرق ہے - ہو سکتا ہے کہ "مصنف عبدالرزاق" کا جو نسخہ مصنف کے پاس ہو اس میں الفاظ اسی طرح ہوں جیسے متن میں ہیں یا ابراہیم نخعی اور شعبی کی روایت کو انھوں نے خلط ملط کر دیا ہو -

[۱] بُرُوَع (بروزن جَدْوَل) رواسیة کلابیة یا اشجعیة مشہور صحابیہ ہیں - مسند حارث بن اسامہ میں تصریح ہے کہ ان کا نکاح ہلال بن مرہ سے ہوا تھا اور اس بات کو طبرانی، طحاوی اور ابن مندہ بھی سعید عن قتادہ عن خراش بن عمرو وابو حسان عن عبداللہ بن عتبہ عن عبداللہ بن مسعود کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں - حافظ ابن حجر نے "الاصابة" (۳-۳، ۵) میں اور اختصار کے ساتھ "التلخیص الحبیر" میں ہلال بن مرۃ کے تعارف میں بھی اس بات کا ذکر کیا ہے -

[۲] مَعقِل بن سنان مشہور صحابی ہیں - قبیلہ اشجع سے ان کا تعلق تھا - فتح مکہ کے موقع پر قبیلے کا علم انہی کے پاس تھا - واقعہ حرہ میں مسلم بن عقبہ کے حکم پر نوفل بن مساحق کے ہاتھوں شہید ہوئے -

[۳] یہ حدیث ابو داؤد (۲-۲۳۷) نے کتاب "النکاح" باب فی من تزوج ولم یسم صداقا حتی مات میں اور ترمذی (۲-۵۰۹) نے

حضرت علیؓ اور زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ اسے مہر نہیں ملے گا۔
امام مالکؒ کی بھی یہی رائے ہے۔[1]
سفیان ثوریؒ[2]، حسن بصریؒ[3] اور قتادہ[4] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مسلک کے قائل ہیں۔ حکم[5] بن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے

بسند ابراہیم نخعی عن علقمہ "کتاب النکاح" "باب مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يَتَزَوَّجُ الْاِمْرَأَةَ فَيَمُوتُ عَنْهَا قَبْلَ اَنْ يَفْرِضَ لَهَا" میں روایت کی ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ ابن مسعودؓ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ ثوری، امام احمد اور اسحاق کی رائے بھی یہی ہے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت علیؓ، زید بن ثابت، ابن عمرؓ اور اسی طرح بعض دوسرے اہل علم کی رائے یہ ہے کہ ایسی حالت میں عورت کو میراث میں سے حصہ ملے گا، وہ عدت بھی گزارے گی لیکن مہر اسے نہیں ملے گا۔ امام شافعی کی رائے بھی یہی ہے۔ امام شافعی نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر بَرْوَع کی حدیث ثابت ہو جائے تو حضورؐ کا ارشاد حجت ہے۔ کہتے ہیں کہ مصر کے زمانہ قیام میں امام شافعی نے اپنی پہلی رائے سے رجوع کر لیا تھا اور اسی حدیث کے مطابق انھوں نے رائے دی۔

علامہ مبارکپوری "تحفۃ الاحوذی" (۴-۲۰۱) میں لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے روایت کے بارے میں "البدر المنیر" میں مذکور ہے کہ وہ آپ سے ثابت نہیں۔ امام شافعی سے روایت کے متعلق حاکم "المستدرک" (۲-۱۸) میں لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ حافظ ابو عبداللہ محمد بن یعقوب کہا کرتے تھے کہ اگر مجھے موقع ملے تو میں امام شافعی کے ساتھیوں کے سروں پر کھڑا ہو کر کہوں کہ یہ حدیث صحیح ہے لہٰذا اس کے مطابق اپنی رائے دو۔ بَرْوَعؓ بنت واشق والی حدیث حاکم نے بھی روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح مسلم کی شرائط پر پوری اترتی ہے البتہ امام بخاری اور مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ ذہبی نے بھی حاکم سے اتفاق کیا ہے۔

[1] ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ رخصتی کے بعد تو اسے مہر مثل ملے گا لیکن اگر رخصتی سے پہلے انتقال ہو جائے تو اسے مہر مثل نہیں ملے گا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ اگر مہر مقرر کرنے اور رخصتی ہونے سے پہلے خاوند فوت ہو جائے یا وہ طلاق دے دے تو عورت کو کوئی مہر نہیں ملے گا۔ دیکھیے "المدونۃ الکبریٰ" (۴-۸۷) علاوہ ازیں ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، اہل مدینہ، زہری اور اوزاعی کا بھی یہی مسلک ہے لیکن امام ابو حنیفہ اور امام احمد کہتے ہیں کہ اس کے لیے مہر مثل لازم ہے۔ امام شافعی کا بھی ایک قول اسی طرح کا ہے۔ دیکھیے "المجموع" (۱۵-۵۲۹)

[2] یہ سفیان بن عیینہ بن میمون، حافظ، علامہ اور شیخ الاسلام ہیں۔ انھوں نے ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ ان کا تعارف گزر چکا ہے۔

[3] حسن بن ابی الحسن یسار ابو سعید بصری مشہور حافظ ہیں۔ ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے۔ ان کا تعارف بھی گزر چکا ہے۔

[4] قتادہ بن دعامۃ بن قتادۃ بن عزیز دوسی بصری تھے۔ ابو الخطاب کنیت تھی۔ حضرت انسؓ کے ساتھیوں میں سے تھے، نابینا تھے۔ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔ امام احمد، ثوری، زہری، سعید بن المسیب اور دوسرے جلیل القدر اہل علم ائمہ کی ایک بڑی جماعت نے ان کے علم کی گواہی دی ہے۔

[5] حکم بن عیینہ ابو عمر الکندی۔ حافظ، فقیہ، اہل کوفہ کے شیخ اور نہایت ثقہ لوگوں میں سے تھے۔ العجلی کہتے ہیں کہ یہ نہایت ثقہ، فقیہ

حضرت علیؓ کو حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رائے بتائی تو انھوں نے کہا کہ حضورؐ کے بارے میں بدویوں کی بات کا اعتبار نہ کیا کرو۔

دونوں کتابوں میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کو کبھی کسی بات سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی خوشی انھیں اس بات سے ہوئی کہ ان کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے عین مطابق ہے۔

اور سنت کے متبع تھے۔

حضرت علیؓ سے ان کا سماع ثابت نہیں۔ ان کی وفات ۱۱۵ھ میں اور بعض روایات کے مطابق اس کے بعد ہوئی۔ دیکھیے "تذکرۃ الحفاظ" (۱-۱۱۷)

لہ عبدالرزاق "المصنف" (۶-۲۹۳) میں معمر عن جعفر بن برقان عن حکم بن عیینہ وسعید بن منصور عن مزیدہ بن جابر کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب کے مقابلے میں ایک اشجعی بدوی کی بات قبول نہیں کی جا سکتی۔

مزیدہ بن جابر کا ذکر ابن حبان نے ثقہ راویوں میں کیا ہے اور ابوزرعہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

شوکانی "نیل الاوطار" (۶-۱۸۳) میں کہتے ہیں کہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جس بدوی کے پیشاب کے چھینٹے اس کے ٹخنوں پر پڑتے ہوں اس کی ایسی بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے خلاف ہو۔

لیکن یہ بات اس بنیاد پر مسترد کر دی گئی کہ کسی صحیح سند کے ساتھ یہ روایت حضرت علیؓ سے ثابت نہیں۔ اور اگر اسے درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں معقل بن سنان منفرد نہیں ہیں، بلکہ جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی میں ہے کہ قبیلۂ اشجع کے کئی لوگوں نے اس بات کی گواہی دی۔ شوکانی کہتے ہیں کہ کتاب وسنت سے بھی جو بات ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس عورت کو اس کے خاوند نے مہر مقرر کرنے اور رخصتی ہونے سے پہلے طلاق دے دی ہو اس کے لیے کوئی مہر نہیں، لیکن جس عورت کا خاوند اس صورت میں فوت ہو گیا ہو اس کے لیے تو کتاب وسنت نے یہ اصول نہیں ٹھہرایا۔ اور موت کے احکام طلاق کے احکام سے مختلف ہیں۔

حضورؐ کا فیصلہ اُس شخص کے بارے میں جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اُسے حاملہ پایا

نیز مطلّقہ کی عدت، سکونت اور نفقہ کے بارے میں آپ کا حکم

مصنف[1] عبدالرزاق میں حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے، وہ ایک انصاری سے، جس کا نام نضرۃ تھا، روایت کرتے ہیں کہ اس نے ایک کنواری عورت سے نکاح کیا لیکن جب وہ اُس کے پاس گیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ تو حاملہ ہے

لہ مجھے یہ روایت مصنف عبدالرزاق میں نہیں ملی، البتہ ابوداؤد (۲-۲۴۲) کتاب "النکاح" باب "الرجل یتزوج المرأۃ فیجدھا حبلی" میں اور دارقطنی (۳-۲۵۰) کتاب "النکاح" باب "المھر" میں عبدالرزاق کی سند اور اسحاق بن ادریس سے محمد بن سنان کی سند کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے۔ محمد بن سنان اور اسحاق بن ادریس یہ دونوں ہی مجروح راوی ہیں۔ محمد بن سنان کو ابوداؤد بن خراش نے اور اسحاق بن ادریس کو ابن معین نے جھوٹا قرار دیا ہے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ اسحاق حدیثیں وضع کرتا تھا اور دارقطنی نے اسے منکر الحدیث لکھا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ یہ حدیث متصل نہیں بلکہ مرسل ہے۔ دیکھیے "العلل" (۱-۴۱۸) حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں سند کے لحاظ سے بھی اضطراب پایا جاتا ہے اور مفہوم کے لحاظ سے بھی۔

صحابی کے نام کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض بصرہ، بعض نضرۃ، بعض نضلۃ، بعض بسرۃ، بعض نضرۃ بن اکثم خزاعی، بعض انصاری اور بعض نضرۃ بن ابوبصرۃ الغفاری کہتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ "الاصابۃ" میں لکھتے ہیں کہ راجح یہ ہے کہ اس کا نام بصرۃ بن اکثم انصاری تھا اور یہ حدیث مجہول ہے اور جس کا سبب یہ ہے کہ اس کی روایت ابن جریج نے صفوان بن سلم سے، اس نے سعید بن مسیب سے اور انھوں نے ایک انصاری سے کی ہے جبکہ ابن جریج کا صفوان سے سماع ثابت نہیں۔ اصل میں ابن جریج نے ابراہیم بن محمد بن ابویحیٰی اسلمی سے اور اس نے صفوان سے روایت کی ہے اور ابراہیم کو امام احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین، ابن مبارک، ابوحاتم، ابوزرعۃ اور دوسرے محدثین نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ امام مالکؒ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ ثقہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں، وہ نہ روایت حدیث میں ثقہ ہے اور نہ اپنے دین میں۔

اس حدیث میں ایک علّت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ معروف روایت کے مطابق یہ مرسل ہے۔ قتادہ، یزید بن نعیم اور عطا خراسانی نے یہ حدیث حضرت سعید بن مسیب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مرسل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ عبدالحق نے ان دونوں علّتوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ صحیح بات اس کا مرسل ہونا ہی ہے۔ دیکھیے "تہذیب السنن" (۳-۶۱، ۶۰)

اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

لَهَا الصَّدَاقُ بِمَا اسْتُحِلَّ مِنْ فَرْجِهَا وَالْوَلَدُ عَبْدٌ لَكَ وَإِذَا وَلَدَتْ فَاجْلِدُوهَا۔

اپنی شرمگاہ کے حلال کیے جانے کے عوض وہ مہر کی حقدار ہے۔ جو بچہ پیدا ہوگا وہ تمھارا غلام ہوگا اور وضعِ حمل کے بعد اس عورت کو کوڑے مارنا۔

امام مالکؒ نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ حد نافذ ہونے کے بعد وہی شخص اس عورت سے دوبارہ نکاح کرنے کا مجاز ہے یا نہیں۔ "المستخرجة" "کتاب النکاح" میں عیسیٰ کی روایت ہے کہ امام مالک کہتے ہیں کہ جس طرح عدت کے دوران اگر کوئی نکاح کرے تو وہ دوبارہ نکاح کا مجاز نہیں ہوتا اسی طرح یہ دونوں بھی دوبارہ کبھی بھی نکاح کے مجاز نہیں۔ "المختصر الکبیر" میں بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ لیکن اصبغ نے ابن القاسم سے اس سے بالکل مختلف روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث تو صرف عدت کے دوران والے نکاح کے بارے میں ہے اور یہ صورت اس سے مختلف ہے۔ پھر انھوں نے اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا اور کہا کہ (زنا سے) حمل کی صورت میں تو دوبارہ نکاح کسی صورت میں بھی جائز نہیں لیکن اگر حمل نہ ہوا ہو تو پھر دوبارہ نکاح میں مجھے کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا۔ اصبغ کہتے ہیں کہ ابن القاسم نے حمل کی صورت کو اس لیے زیادہ سنگین تصوّر کیا ہے کہ اس بارے میں ابن وہب کی امام مالک سے ایک روایت ہے جو صرف حمل کی حالت میں دوبارہ نکاح کی ممانعت کے بارے میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قیاس کی رُو سے تو (زنا سے) حمل نہ ہونے کی صورت میں بھی اس شخص کو اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر وہ ایسا کرے تو میں نکاح کے فاسد ہونے کا عدالتی فیصلہ صادر نہیں کروں گا۔

مؤطا امام مالک (کتاب الطلاق، باب ما جاء فی نفقة المطلقة) صحیح البخاری (کتاب الطلاق، باب قصة فاطمة بنت قیس)

۱؎ زانیہ کے نکاح کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ جب تک وہ توبہ نہ کرے اور اس کی عدت پوری نہ ہو جائے اس وقت تک اس سے نکاح جائز نہیں اور اگر کوئی شخص اس کی عدت گزرنے اور اس کے توبہ کرنے سے پہلے اس سے نکاح کرے تو وہ نکاح فاسد ہوگا اور دونوں کے درمیان تفریق کرا دی جائے گی۔ امام مالک کی بھی یہی رائے ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ خاوند کا مادۂ تولید قابلِ احترام ہے اور نسب کو خلط ملط ہونے سے بچانا چاہیے اس لیے عدت گزرنے سے پہلے نکاح جائز نہیں۔ ان کے برعکس امام ابو حنیفہ اور شافعی کی رائے یہ ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے ہی نکاح جائز ہے، البتہ اس کے بعد ہم بستری کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ امام شافعی کے نزدیک یہ جائز اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ زنا سے قرار پانے والے حمل کا کوئی احترام نہیں۔ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ وضعِ حمل تک ہم بستری اس لیے جائز نہیں کہ خاوند کے قابلِ احترام مادہ تولید کو زانی کے ذلیل مادۂ تولید کے ساتھ خلط ملط نہیں ہونا چاہیے۔

۲؎ مؤطا (۲-۱۳) کتاب الطلاق باب "ما جاء فی نفقة المطلقة"

۳؎ بخاری کتاب الطلاق باب "قصة فاطمة بنت قیس" امام بخاری نے یہ پورا واقعہ بیان نہیں کیا بلکہ صرف باب کا

مسلم اور نسائی میں فاطمہ[۳] بنت قیس کی روایت ہے کہ ابو عمرو[۴] بن حفص نے انھیں بائن طلاق دے دی۔

صحیح مسلم اور نسائی میں ہے کہ ابو عمرو نے آخری طلاق شام سے بھیجی اور ساتھ ہی اپنے نمائندے کے ذریعے نفقہ کے لیے جَو بھی بھیجے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے غصّے کا اظہار کیا جس کے جواب میں اس نمائندے نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم پر تمھارا کوئی حق باقی نہیں۔

نسائی میں ہے کہ ابو عمرو نے حارث بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ کو نفقہ دے کر بھیجا اور ان دونوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہمارے ذمے تیرا نفقہ صرف اسی صورت میں ہے کہ تو حاملہ ہو اور ہمارے ہاں ہماری اجازت کے بغیر تجھے رہائش رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ حضرت فاطمہؓ نے اس بات کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو آپ نے فرمایا "لَيْسَ لَكِ نفقة (تیرا نفقہ کا کوئی حق نہیں)

صحیح مسلم میں حضرت فاطمہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نفقہ اور سکونت کا دعویٰ پیش کیا تو آپؐ نے میرا یہ حق تسلیم نہ فرمایا۔

سنن نسائی میں ہے کہ حضورؐ نے انھیں اُمِ شریک[۵] کے گھر میں عدت گزارنے کے لیے کہا۔ پھر فرمایا کہ اس کے ہاں میرے

عنوان قائم کرکے اس کے کچھ حصوں کا ذکر کیا ہے۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۵۳۲۳-۵۳۲۴ ہے۔

[۱] صحیح مسلم (۲-۱۱۱۴) کتاب "الطلاق" باب المطلقة البائنة لانفقة لها"

[۲] نسائی (۲-۲۰۷) کتاب "الطلاق" باب" الرخصة فی خروج المبتوتة من بَيْتِهَا فِی عِدَّتِهَا لِسُكْنَاهَا" ابوداؤد نے بھی یہ حدیث کتاب "الطلاق" باب" فی نفقة المبتوتة" میں روایت کی ہے۔

[۳] فاطمہ بنت قیس، بنو محارب بن فہر بن مالک کے قبیلے سے ہیں۔ یہ ضحاک کی بہن تھیں۔ ضحاک کو یزید بن معاویہ نے عراق کا گورنر مقرر کیا تھا اور وہ مرج راھط کے مقام پر قتل ہوئے۔ یہ کم سن صحابہ میں سے تھے۔ فاطمہ ان سے بڑی تھیں۔ یہ سب سے پہلے ہجرت کرنے والوں میں سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل و دانش اور حُسن و جمال کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد مجلس شوریٰ کا اجلاس انہی کے گھر میں ہوا۔

[۴] ابو عمرو بن حفص اور بعض روایات کے مطابق ابو حفص بن عمرو بن مغیرہ مخزومی، حضرت خالدؓ بن ولید کے چچازاد بھائی تھے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو یمن بھیجا تو یہ بھی ان کے ساتھ گئے اور صحیح مسلم کی روایت کے مطابق وہیں سے انھوں نے تین طلاقیں بھیج دیں اور اپنے دو چچازاد بھائیوں حارث بن ہشام اور عیاش بن ابو ربیعہ سے کہا کہ وہ فاطمہ کو نفقہ کے لیے کھجوریں اور جَو دیں۔ فاطمہ نے یہ چیزیں لینے سے انکار کردیا اور اس بات کی شکایت حضورؐ سے کی۔

[۵] نسائی کی روایت میں اُمِ کلثوم ہے۔ اُمِ شریک قریش کی شاخ بنو عامر میں سے تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ انصاریہ تھیں۔ ان کا نام غزیہ یا غزیلہ بنت دودان بن عوف بن عمرو تھا۔ کلبی نے ان کا یہی نسب لکھا ہے لیکن ابن سعد نے بنت جابر بن حکیم لکھا ہے۔

صحابہ کا آنا جانا رہتا ہے اس لیے اس کی بجائے ابنِ اُمِ مکتومؓ، جو کہ نابینا تھے، کے ہاں عدّت گزارلو۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب ماہواری سے پاک ہو جاؤ تو مجھے بتانا۔ جب میرے ایّام ماہواری گزر گئے تو میں نے بتایا کہ معاویہ بن ابوسفیان اور ابوجہم نے مجھے پیغامِ نکاح بھیجا ہے۔

مؤطا یحیٰی میں ابوجہمؓ بن ہشام لکھا ہے جو کہ غلط ہے، صحابہؓ میں اس نام کا کوئی آدمی نہیں۔ صحیح نام ابوجہم بن صخر بن عدی قرشی یا ابوجہم بن حذیفہ بن غانم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَمَّا اَبُوْجَهْمٍ فَلَا يَضَعُ عَصَاهُ عَنْ	ابوجہم تو اپنے کندھے سے لاٹھی نیچے رکھتا ہی نہیں
عَاتِقِهٖ وَاَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُعْلُوْكٌ لَا مَالَ	یعنی بہت زیادہ پیٹتا ہے اور معاویہ قلاش آدمی ہے
لَهٗ۔ اِنْكِحِيْ اُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ۔	اس لیے تم اسامہؓ بن زید سے نکاح کرلو۔

فاطمہ کہتی ہیں کہ یہ تجویز مجھے پسند نہ آئی۔ حضورؐ نے دوبارہ فرمایا کہ اسامہؓ بن زید سے نکاح کرلو۔ اس پر میں نے آپؐ کے ارشاد کی تعمیل کی اور اللہ تعالیٰ نے اس نکاح میں اتنی خیر و برکت عطا کی کہ عورتیں مجھ پر رشک

کہتے ہیں کہ انہی نے اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہبہ کیا تھا لیکن حضورؐ نے ان سے نکاح نہ کیا تو انھوں نے پھر زندگی بھر کسی اور سے بھی نکاح نہیں کیا۔ "الاصابۃ" میں ان کا تفصیلی تعارف موجود ہے۔

ام کلثوم کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے صرف اتنا لکھا ہے کہ نسائی میں اُمِ شریک کے بجائے ام کلثوم لکھا ہے۔

[1] یہ ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ اہلِ مدینہ ان کا نام عبداللہ بن قیس بن زیاد بن اصم بن رواحہ قرشی عامری اور اہلِ عراق نے عمرو بتایا ہے۔ ان کی والدہ کو اُمِّ مکتوم کہتے تھے۔ ان کا نام عاتکہ بنت عبداللہ تھا۔ یہ السابقون الاولون مہاجرین میں سے تھے۔ نابینا تھے۔ حضرت بلال اور یہ حضورؐ کے مؤذن تھے۔ دیکھیے "اعلام النبلاء" (۱-۸) ابن اثیر نے "اسد الغابۃ" (۳-۲۲۵) میں ان کا نام عبداللہ بن قیس بن زائدہ لکھا ہے۔

[2] یہ ابومحمد یحیٰی بن ابوعیسیٰ بن یحیٰی بن کثیر بن وسلاس اندلسی بہت بڑے فقیہہ، اندلس میں مالکیوں کے شیخ اور مؤطا امام مالک کے راوی لیثی ہیں۔ ان کی سند، عن زیاد بن عبدالرحمٰن بن زیاد اللخمی عن الامام مالک ہے۔ مؤطا کے بعض حصوں کا سماع انھوں نے براہِ راست امام مالک سے بھی کیا۔ مؤطا کی ان کی روایت کو مشرق و مغرب میں شہرت حاصل ہے۔ الباجی، السیوطی، زرقانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے انہی کی روایت کردہ مؤطا کی شرحیں لکھی ہیں۔ "اوجز المسالک" کے مقدمہ (ص ۴۹ تا ۵۹) میں شیخ زکریا نے مؤطا کے راویوں کی تعداد کے بارے میں مفصل بحث کی ہے۔ یحیٰی کا انتقال ۲۴۹ھ میں ہوا۔

[3] سیوطی نے "تنویر الحوالک" میں لکھا ہے کہ یہ صحابی ابوجہم ہی ہیں اور ان کا نام حذیفہ القرشی العدوی ہے۔ قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ ابوجہم کا ذکر تو تمام راویوں نے کیا ہے لیکن ان کے نسب کا ذکر صرف یحیٰی بن یحیٰی اندلسی نے کیا ہے۔ انھوں نے

کرنے لگیں۔

خطابی کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ نے جو یہ کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعویٰ پیش کیا تو آپؐ نے میرا نفقے اور سکونت کا حق تسلیم نہ فرمایا۔ تو ان میں سے نفقے والی بات تو علم پر اور سکونت والی بات وہم پر مبنی ہے اس وہم کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ نے حضرت فاطمہ کو ان کے خاوند کے گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہونے کے لیے جو فرمایا تو وہ (حضرت فاطمہ) اس کا سبب صحیح طور پر نہ سمجھ سکیں اور انھوں نے خیال کیا کہ سکونت کا حق تسلیم نہیں کیا گیا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے کہ ابن اُمّ مکتوم کے ہاں عدت گزارلو، سکونت کا حق ثابت ہوتا ہے۔ اس حدیث میں حسب ذیل فقہی نکات ہیں:

۱۔ ایک عورت کو دو مرد نکاح کا پیغام بھیج سکتے ہیں۔

۲۔ فاطمہؓ بنت قیس، ضحاک بن قیس قرشی کی ہمشیرہ تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قریشی عورت کا نکاح غلام کے بیٹے سے ہو سکتا ہے۔

۳۔ نکاح کے سلسلے میں کسی کے بارے میں رائے پوچھی جائے تو اس کے نقائص کا ذکر غیبت کے زمرے میں نہیں آتا۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف ابوجہم کی مار پٹائی اور حضرت معاویہ کے افلاس کا ذکر کیا۔ لیکن اہلِ علم نے نکاح کے سلسلے میں باقی نقائص کے ذکر کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح گواہ اور جسے امام یا قائد مقرر کیا جا رہا ہو اس کے نقائص کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اندازِ بیان میں مبالغہ بھی بعض اوقات جائز ہو سکتا ہے، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ابوجہم

ابوجہم بن ہشام لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ صحابہ میں اس نام کا کوئی آدمی نہیں اور مؤطا کے کسی دوسرے راوی یا کسی اور محدث نے یحییٰ کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ ابن عبدالبر نے بھی یہی بات کہی ہے، البتہ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا نام عویمر بن حذیفہ بن غانم عدوی یا عبید بن حذیفہ تھا۔

ابن اخی الاصمعی نے "النوادر" میں لکھا ہے کہ ابوجہم امیر معاویہ اور ان کے بعد ان کے بیٹے یزید کے دربار میں گئے اور ابن زبیر کے ساتھ ان کے بعض واقعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دیکھیے الاصابۃ "تذکرہ ابوجہم"۔

ٹ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ معاویہ قلاش ہے اور ابوجہم عورتوں کو بہت زیادہ پیٹتا ہے لیکن اسامہؓ بن زیدؓ مناسب ہے۔

حضرت فاطمہ نے اپنے ہاتھ کو (حقارت سے) ہلاتے ہوئے کہا "اسامہ بن زید"! تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ و رسول کی اطاعت تمھارے لیے بہتر ہے۔"

حضرت فاطمہ کہتی ہیں کہ میں نے اسامہ سے نکاح کر لیا اور مجھ پر رشک کیا جانے لگا۔

ٹ اس سے ان لوگوں کی رائے کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نکاح کے لیے "کفو" ہونا شرط ہے۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ حضورؐ

کھانا، بیٹھنا، لیٹنا اور سونا بھی تھا لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ وہ تو اپنے کندھے سے لاٹھی ہی نیچے نہیں رکھتا۔

۵۔ مطلقہ اگر اپنے خاوند کے خاندان والوں پر زبان درازی کرے اور انھیں ایذا پہنچائے تو اس کا اس گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں چلے جانا جائز ہے[1]۔ حضرت فاطمہؓ بنت قیس کا یہی معاملہ تھا۔ اور یہ زبان درازی بھی اس صریح برائی میں شامل ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح آیا ہے۔

لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ	نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں
إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ۔ (الطلاق ۱)	الّا یہ کہ وہ کسی واضح برائی کا ارتکاب کریں۔

ابن مزینؒ وغیرہ نے اس رائے کا ذکر کیا ہے[2] اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نقل مکانی کا سبب یہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ نے گھر کے خراب ہونے کی شکایت حضورؐ سے کی لہٰذا آپؐ نے انھیں وہاں سے نکلنے کی اجازت دے دی۔

نے قریش خاندان کی بیٹی ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کیا۔ اسی طرح حضرت سلمانؓ فارسی نے ولید بن عتبہ کی بیٹی ہند سے نکاح کیا۔ اس کے برعکس کفو کے شرط ہونے کے سلسلے میں جو احادیث آئی ہیں وہ ثابت شدہ نہیں۔ دیکھیے "نصب الرایۃ" (۳-۱۹۶)۔

[1] زبان دراز عورت کے دوسرے گھر میں عدت گزارنے کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں، البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ جو عورت زبان دراز نہ ہو وہ کسی دوسرے گھر میں کسی ضرورت کے تحت عدت گزار سکتی ہے یا نہیں۔ حضرت علیؓ اور امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ صرف کسی دینی یا دنیوی ضرورت کے لیے ہی وہ نکل سکتی ہے۔ ان کی دلیل حضرت جابرؓ کی یہ حدیث ہے کہ میری خالہ کو تین طلاقیں ہوگئیں۔ وہ اپنے کھجوروں کے باغ کی طرف نکلیں تو ایک آدمی نے انھیں گھر سے نکلنے سے منع کیا۔ انھوں نے حضورؐ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ چلی جایا کرو اور کھجوریں لے آیا کرو۔ ہوسکتا ہے کہ تم ان میں سے صدقہ کردو یا بھلائی کا کوئی اور کام کرو۔" یہ حدیث صحیح ہے۔ مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے یہ روایت کی ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس حدیث اور آیت (لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ ....) میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ حدیث نے آیت کے عموم کو خاص کردیا ہے۔

امام مالک، شافعی، احمد اور دوسروں کی رائے یہ ہے کہ دن کے وقت اس کے لیے نکلنا مطلقاً ممنوع ہے۔ وہ آیت کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے کسی ضرورت کے لیے نکلنے کا جواز پیدا ہوتا ہو۔

[2] الطلاق (آیت نمبر ۱)

[3] ابوزکریا یحییٰ بن ابراہیم بن مزین، رملہ بنت عثمانؓ بن عفان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ مشہور فقیہ ہیں۔ طلیطلہ کے رہنے والے تھے۔ امیر عبدالرحمان بن حکم کے زمانے میں یہ مدینہ منورہ آگئے۔ وہاں مطرف بن عبداللہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اُن سے موطا سُنا۔ اسی طرح عراق اور مصر میں بھی انھوں نے بہت سے لوگوں سے موطا کو سنا۔ انھوں نے بہت سی

۶۔ طلاق بائن کے بعد نفقہ کی ذمہ داری خاوند پر نہیں رہتی۔ بعض اہل علم یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی رُو سے ایسی مطلقہ کو سکونت کا حق بھی حاصل نہیں۔

۷۔ مرد نیک عورت سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بہترین کتاب "مؤطا" کی شرح ہے۔ اس شرح سے ابن عبدالبر نے استفادہ کیا لیکن اب اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ۲۵۹ھ یا ۲۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے تعارف کے لیے "تاریخ علمائے اندلس (۲-۱۸۱) اور جذوۃ المقتبس (ص ۳، ۳۷۳) وغیرہ دیکھیے۔

لہ فقہاء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ جس عورت کو بائن طلاق ہو جائے اسے نفقہ اور سکونت کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حمل کی صورت میں اس کے یہ دونوں حقوق طے شدہ ہیں۔ حمل نہ ہونے کی صورت میں امام ابوحنیفہ اور ان کے ہم فکر اصحاب کہتے ہیں کہ اسے نفقہ بھی ملے گا اور سکونت بھی۔ سکونت تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد "أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ" (الطلاق ۶) کی بنا پر اس میں سکونت دینے کا حکم دیا گیا ہے اور نفقہ اس لیے کہ وہ پابند ہے کہ باہر جا نہیں سکتی۔ نیز اللہ تعالیٰ کا حکم کہ "وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ" (الطلاق ۶) اور نفقہ نہ دینا بہت بڑے نقصانات میں سے ہے اسی طرح وہ اس لحاظ سے نفقہ و سکونت کی حق دار ہے کہ وہ عدت گزار رہی ہوتی ہے۔

امام مالک اور شافعی فرماتے ہیں کہ اسے سکونت کا حق تو حاصل ہے لیکن نفقہ کا نہیں۔ وہ پہلی آیت "أَسْكِنُوهُنَّ ......" کے ظاہری الفاظ سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں سکونت فراہم کرنے کا حق دیا گیا ہے نفقہ کا نہیں۔ نفقہ کا حکم صرف حاملہ کے لیے دیا گیا ہے۔ حضرات ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، عائشہؓ، سعید بن مسیب اور سفیان ثوری کی رائے بھی یہی ہے۔

امام احمد کے مسلک کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک میں ان کی رائے امام شافعی والی ہے، لیکن یہ مرجوح ہے۔ دوسری رائے فاطمہؓ بنت قیس کی روایت پر مبنی ہے اور اس کے مطابق اسے نفقہ کا حق حاصل ہے نہ سکونت کا۔ حضرات ابن عباسؓ، جابر، عطاء، طاؤس، حسن بصری، تابعین کی ایک اور جماعت اور ابن ابی لیلیٰ کی بھی یہی رائے ہے۔ حضرت عمرؓ کے قول کے بارے میں جو روایت ہے اس پر امام احمد کا تبصرہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسی بات نہیں کہی ہوگی۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ کتاب اللہ میں تو رجعی طلاق والی عورت کے لیے سکونت کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک نبیؐ کی سنت کا تعلق ہے تو دار قطنی کے قول کے مطابق حافظ اور ثقہ راویوں نے اس بارے میں کوئی روایت نقل نہیں کی۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو بائنہ کے لیے نفقہ کے اثبات کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کہاں ہے، سکونت مہیا کرنے کا حکم جس آیت میں دیا گیا ہے اس کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ تو رجعی طلاق والی عورت کے لیے ہے اور سکونت تو نفقہ کے تابع ہے اور بائن طلاق والی کو جب نفقہ کا حق ہی حاصل نہیں تو اسے سکونت کا حق کہاں سے مل گیا۔

فاطمہؓ بنت قیس کی بات پر جب حضرت عائشہؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ نے گرفت کی تو انھوں (فاطمہؓ) نے کہا کہ میرے اور تمھارے درمیاں حکم اللہ کی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا" تمھیں نہیں

۸۔ غیر حاضر شخص کے بارے میں فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ابو عمرو نے فاطمہ کو جب طلاق دی تو وہ ان کے پاس نہ تھے بلکہ شام میں تھے۔ اور فاطمہ بنت قیس کے ایام ماہواری جب پورے ہو گئے اس وقت بھی ابو عمرو مدینہ میں موجود نہ تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عدم موجودگی ہی میں نکاح کا حکم دے دیا۔ یہ بات اسمعیلی نے لکھی ہے[۱]

سنن ابوداؤد میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ایک عورت کی بات کی بنیاد پر نہیں چھوڑ سکتے جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ خاتون بات کو ٹھیک طرح یاد بھی رکھ سکی ہے یا نہیں۔

معلوم کہ شاید اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی اور صورت پیدا فرما دے) تو بتائیے کہ تین طلاقوں کے بعد کیا صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ اسے نفقہ اور سکونت کا حق دیا جائے۔ نسائی وغیرہ نے فاطمہ بنت قیس کی جو روایت بیان کی ہے اس میں اس بات کی صراحت پائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کے لیے نفقہ اور سکونت کا حق اس وقت تک ہوتا ہے جب تک خاوند کو رجوع کا حق ہوتا ہے، دیکھیے "المغنی" (۷-۱۱۶) "المهذب مع المجموع" (۱۷: ۵۰۵) "شرح فتح القدیر" (۳-۳۳۹) "شرح مسلم للنووی" (۱۰-۹۰) اور ابوبکر الجصاص کی "احکام القرآن" (۳-۴۵۹)

[۱] امام نووی نے شرح مسلم (۱۰-۱۰۷) میں کچھ نکات کا اضافہ کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ حقوق اور لین دین میں کسی دوسرے کو وکیل یا مختار مقرر کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کوئی ضروری بات پوچھنی ہو تو اجنبی مرد یا عورت کی آواز سننا جائز ہے۔

۳۔ جس عورت کو بائن طلاق ہو چکی ہو اور وہ عدت گزار رہی ہو اُسے نکاح کا پیغام بھیجا جا سکتا ہے۔

۴۔ ایک پیغام نکاح پر دوسرا پیغام نکاح اس صورت میں بھیجا جا سکتا ہے کہ پہلے پیغام کو قبول نہ کیا گیا ہو۔

۵۔ مجازکا انداز اختیار کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کہ ابوجہم تو ہر وقت لٹھ لیے پھرتا ہے)

۶۔ لوگوں کو ان کے فائدے کی بات بتانا مستحب ہے اگرچہ وہ بات انھیں ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ ضرورت ہو تو نصیحت بار بار بھی کرنی چاہیے۔

۷۔ عقلمند لوگوں کی نصیحت قبول کرنی چاہیے اور ان کے ارشاد کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔

۸۔ اگر عورت یا اس کا سرپرست راضی ہو تو غیر کفو کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

۹۔ اہل فضل و تقویٰ چاہے حسب نسب کے اعتبار سے اونچے نہ ہوں، ان کی صحبت اختیار کرنی چاہیے۔

[۲] سنن ابوداؤد (۲-۲۸۸) کتاب "الطلاق" باب "مَنْ انکرَ ذٰلکَ علی فاطمة" صحیح مسلم (۲-۱۱۱۹) کتاب "الطلاق" باب "المطلقة ثلاثا لا نفقة لها"

حضرت عمرؓ کی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی فاطمہ بنت قیس کی اس بات پر گرفت کی۔ انھوں نے فرمایا۔ فاطمہ تم اللہ سے نہیں ڈرتیں۔ امام بخاری نے حضرت عائشہؓ کے اس قول کا ذکر صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب "قصة فاطمة بنت قیس" میں کیا ہے۔ فتح الباری میں حدیث کا نمبر ۵۳۲۲ ہے

رسول اللہ کا فیصلہ کہ بیوی خاوند کی عدم موجودگی میں بھی اس کے مال میں سے نفقہ لے سکتی ہے

صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم[2] میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہندؓ[3] بنت عتبہ نے آ کر کہا کہ ابوسفیان کنجوس آدمی ہے وہ مجھے اور میرے بچوں کو کافی خرچ نہیں دیتا سوائے اس کے کہ اس کے علم کے بغیر میں خود اس کے مال میں سے لے لوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ — معروف طریقے سے جتنا تمھارے لیے اور تمھارے بچوں کے لیے کافی ہو اتنا لے لیا کرو۔

اس حدیث میں فقہی نکتہ یہ ہے کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں بھی اس کے بارے میں فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔[4] امام بخاریؒ نے اس باب کا عنوان بھی یہی باندھا ہے۔ "القضاء علی الغائب" دوسری جگہ انھوں نے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب اِذَا لَمْ يُنْفِقِ الرَّجُلُ لِلْمَرْاَةِ اَنْ تَاْخُذَ بِغَيْرِ عِلْمِهِ مَا يَكْفِيهَا وَوَلَدَهَا بِالْمَعْرُوفِ۔

[2] یہ حدیث صحیح مسلم (۳-۱۳۳۸) کتاب "الاَقْضِيَة" باب "قَضِيَّةُ هِنْد" میں اور نسائی نے سنن (۸-۲۴۶) کتاب "القضاۃ" باب قَضَاءِ الحاکِمِ علی الغَائِبِ اذا عَرَفَهُ" میں اور ابن ماجہ نے سنن (۲-۷۶۹) میں روایت کی ہے۔ نسائی میں ہے "کیا میں اس کے مال میں سے اس کے علم کے بغیر لے سکتی ہوں"۔ ابوداؤد نے سنن (۲-۲۸۹) کتاب البیوع "باب فی الرجل یاخذ حقہ من تحت یدہ" میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

[3] امیر معاویہ کی والدہ ہند کا باپ عتبہ، اس کا چچا شیبہ اور اس کا بھائی ولید تھا۔ یہ سب جنگ بدر میں قتل ہو گئے۔ ہند پر یہ بات بہت شاق گزری۔ جب جنگ احد میں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تو ہند بہت خوش ہوئی اور اس نے ان کا پیٹ چاک کر کے جگر نکالا اور اسے چبا کر پھینک دیا۔ جب فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیانؓ مسلمان ہو گئے تو ہند کو ان پر شدید غصہ آیا۔ اس نے ان کی ڈاڑھی پکڑ لی لیکن بعد میں خود بھی مسلمان ہو گئی۔ ۱۴ھ میں اسی دن اس کا انتقال ہوا جس دن حضرت ابوبکرؓ کے والد حضرت ابو قحافہ نے وفات پائی۔

[4] دیکھیے صحیح بخاری، کتاب "الاحکام" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۷۱۸۰) اس بارے میں اتفاق رائے ہے کہ صرف حقوق العباد میں ایسا کرنا جائز ہے حقوق اللہ میں نہیں۔ امام مالک، لیث، شافعی اور ابوعبید کی یہی رائے ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے یہ استثنائی رائے بھی

باب کا عنوان باندھا ہے۔ مَنْ رَأَى لِلْقَاضِي أَنْ يَحْكُمَ بِعِلْمِهِ فِي أَمْرِ النَّاسِ إِذَا لَمْ يَخَفِ الظُّنُونَ وَالتُّهْمَةَ وَكَانَ أَمْرًا مَشْهُوْدًا (ان لوگوں کی رائے جو یہ کہتے ہیں کہ قاضی کو اس بات کا حق ہے کہ اگر اسے شکوک و شبہات اور اتہام کا خدشہ نہ ہو اور معاملہ واضح ہو تو وہ اپنے علم کی بنا پر فیصلہ دے سکتا ہے)

اس میں دوسرا فقہی نکتہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا حق نہ دے اور اسے اس کے مال پر دسترس حاصل ہو جائے تو اسے بتائے بغیر وہ اس میں سے اپنا حق لے سکتا ہے۔ اس بارے میں امام مالکؒ کے ساتھیوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

"الواضحۃ" میں ہے کہ حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما نے کاموں کے بارے میں اپنی اپنی شکایت رسول اللہؐ کے

روایت کی ہے کہ اگر غیر حاضر شخص کا معاملہ زمین یا جائداد وغیرہ کا ہوا اور اس کے پاس اپنے حق میں دلائل ہونے کا امکان ہو تو ایسی صورت میں اس کی عدم موجودگی میں فیصلہ نہیں ہو سکتا الّا یہ کہ وہ بہت لمبی مدت سے غائب اور لاپتہ ہو۔

امام ابو حنیفہ کسی شخص کی غیر حاضری میں اس کے خلاف فیصلہ دینے کے مطلقاً قائل نہیں۔ ہاں اگر اس کا وکیل موجود ہو تو اس پر دعویٰ کرکے اور اسے صفائی کا موقع دے کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے، جو حضرات اس کے قائل نہیں وہ حضرت علیؓ کی اس مرفوع حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "لَا تَقْضِيَنَّ لِأَحَدِ الْخَصْمَيْنِ حَتَّى تَسْمَعَ مِنَ الْآخَرِ" (دوسرے فریق کی بات سُنے بغیر ایک فریق کے حق میں فیصلہ نہ دیا کرو)۔ ابو داؤد (۳ - ۳۰۱) اور ترمذی (۳ - ۶۱۲) نے یہ حدیث روایت کی ہے۔

اس سلسلے میں ہند کے اس واقعے سے اس لیے بھی استدلال درست نہیں کیونکہ ابو سفیان مکہ معظمہ میں موجود تھے اور غیر حاضر کے خلاف فیصلہ دینے میں یہ شرط شامل ہے کہ وہ شہر یا ملک سے غائب ہو، یا چھپا ہوا ہو اور اسے تلاش نہ کیا جا سکے یا وہ حاضر ہونے سے اجتناب کر رہا ہو۔ ان میں سے کوئی شرط بھی ابو سفیان کے معاملے میں نہیں پائی جاتی تھی، اس لحاظ سے اس کی حیثیت غیر حاضر کے بارے میں فیصلے کی نہیں بلکہ فتویٰ کی ہے۔ امام نووی نے شرح مسلم (۱۲ - ۸) میں یہی بات لکھی ہے۔ ان سے پہلے سہیلی نے بھی یہ بات یقین کے ساتھ کہی ہے، حتیٰ کہ سہیلی نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ابو سفیان مجلس میں ہند کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے مگر یہ شعبی سے مرسل روایت ہے۔ دیکھیے "فتح الباری" (۹ - ۵۱۰)

لہ صحیح بخاری، کتاب "الاحکام" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۷۱۶۱)

لہ حافظ ابن حجر "فتح الباری" (۹ - ۵۰۷) میں لکھتے ہیں کہ اصبغ اور ابن ماجشون سے ابن حبیب نے روایت کی ہے، وہ دونوں امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ خاوند تنگ دست ہو تو بیوی پر فرض ہے کہ وہ گھر کے کام کاج کرے اگرچہ وہ حسب نسب کے اعتبار سے بلند مقام ہی کیوں نہ رکھتی ہو۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کے ذمے گھر کے کام اور حضرت علیؓ کے ذمے باہر کے کام لگائے (حالانکہ حضرت فاطمہؓ کا مقام بہت بلند تھا)

ابن بطال نے بعض اساتذہ سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ پر گھر کے کام فرض نہیں کیے تھے بلکہ یہ تو حسن معاشرت کی تعلیم و تربیت تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ عورت کو گھر کے کاموں پر مجبور کیا جا سکتا ہے، تو اس بات کی کوئی بنیاد نہیں، بلکہ اس پر

پاس کی۔ آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ گھر کے اندر کے کام کاج حضرت فاطمہؓ کے اور باہر کے کام حضرت علیؓ کے ذمے ہیں۔

ابن حبیب کہتے ہیں کہ گھر کے کام کاج سے مراد ہے آٹا گوندھنا، کھانا پکانا، بستر بچھانا، گھر کی صفائی کرنا، پانی کا انتظام گھر میں ہو تو اسے بھرنا وغیرہ اور باقی سب کام جو گھر کے اندر کرنے کے ہوتے ہیں۔

بخاریؒ، مسلمؒ اور نسائیؒ نے روایت کی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو معلوم ہوا کہ حضورؐ کے پاس کچھ غلام آئے ہیں تو وہ آپؐ

اجماع ہے کہ بیوی کی تمام ضروریات پورا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔

شیرازی نے "المھذب" میں لکھا ہے کہ اگر عورت اپنی خاندانی وجاہت یا کسی بیماری کی وجہ سے کام نہ کر سکتی ہو تو خاوند پر لازم ہے کہ وہ اس کے لیے خادم رکھے کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے "وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (ان سے معروف طریقے سے معاشرت رکھو) اور معاشرت بالمعروف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بیوی کے لیے خادم رکھا جائے۔ ہاں وہ ایک سے زیادہ خادم کا تقاضا نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی خدمت کے لیے ایک خادم کافی ہے۔ خادمہ عورت ہونی چاہیے اور اگر خادم مرد ہو تو وہ محرم رشتہ داروں میں سے ہونا چاہیے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہودی یا عیسائی کو خادم رکھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ایک رائے نفی میں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ طبیعت اس سے ابا کرتی ہے اور دوسری رائے اثبات میں ہے۔

امام ابوحنیفہ اور احمد ایک خادم کے قائل ہیں جبکہ امام مالک کی رائے یہ ہے کہ اگر اس کے والد کے گھر میں ایک سے زیادہ خادم ہوں اور اسے خاوند کے گھر میں بھی زیادہ خادموں کی ضرورت ہو تو پھر ایک سے زیادہ خادم ہونے چاہئیں۔ دیکھئے "المجموع" (۱۷۔ ۹۷) اہلِ کتاب کو خادم رکھنے کے بارے میں امام احمد کی دو رائیں ہیں اور صحیح یہی ہے کہ یہ جائز ہے۔ دیکھئے "المغنی" (۸۔ ۱۷۲)

میں کہتا ہوں کہ ازدواجی تعلقات کی اصل بنیاد آپس میں محبت، تعاون اور خیر خواہی کے جذبات ہیں۔ اگر عورت مالدار خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور خاوند تنگ دست ہو تو وفا شعار، نیک اور مومنہ بیوی کو چاہیے کہ وہ اس تنگدستی سے نکلنے میں خاوند کی مدد کرے نہ یہ کہ اسے اور تنگ کرے۔ اگر وہ نئے نئے مطالبات پیش کر کے اسے تنگ کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے تو مال و دولت، ساز و سامان، ٹھاٹھ باٹھ اور عیش و عشرت سے دلچسپی ہے خاوند سے نہیں۔ ایسی عورت کبھی مثالی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی، نہ ہی اس میں کوئی خیر ہوتی ہے۔ اسلام محبت و اخوت کا دین ہے اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان عورت کو اسلام کا یہ سبق از سر نو پڑھایا جائے۔

لہ صحیح بخاری "فضائل الصحابة" باب "مناقب علی بن ابی طالب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۷۰۵) اسی طرح کتاب "النفقات" باب "عَمَلِ الْمَرْأَةِ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۳۶۱) باب "خادم المرأة" فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۳۶۲) کتاب "الدعوات" باب "التکبیر والتسبیح عند المنام" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۳۱۸)

ٹہ صحیح مسلم (۴۔ ۲۰۸۰) کتاب "الذکر" باب "التسبیح اَوَّلَ النَّهَارِ وَعِنْدَ النَّوْمِ"۔

تہ سنن صغریٰ میں مجھے یہ روایت نہیں ملی۔ شاید "السنن الکبریٰ" میں ہو۔ ابوداؤد (۷۔ ۳۱۵) اور ترمذی (۵۔ ۴۷۷) میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

کی خدمت میں یہ بتانے کے لیے حاضر ہوئیں کہ چکی پیس پیس کر ان کے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ اس لیے حضورؐ ایک غلام ان کو دے دیں۔ حضرت فاطمہؓ کی ملاقات حضورؐ سے نہ ہو سکی۔ جب حضورؐ گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے آپؐ کو ساری بات بتائی۔ حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ ہمارے ہاں تشریف لے آئے اور اس وقت ہم اپنے بستروں میں لیٹ چکے تھے۔ ہم اُٹھنے لگے تو آپؐ نے فرمایا "مَکَانَکُمَا" (لیٹے رہو)۔ آپؐ آگے بڑھے اور ہمارے درمیان بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں کی ٹھنڈک میں نے اپنے پیٹ پر محسوس کی پھر آپؐ نے فرمایا:

"اَلَا اَدُلُّکُمَا عَلٰی مَا هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا سَاَلْتُمَا،	میں تمھیں ایسی بات نہ بتاؤں جو تمہاری طلب کردہ
اِذَا اَخَذْتُمَا مَضَاجِعَکُمَا اَوْ آوَیْتُمَا اِلٰی	چیز سے بہتر ہے۔ جب تم اپنے بستروں میں لیٹ جاؤ،
فِرَاشِکُمَا فَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ	تو تینتیس مرتبہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" تینتیس مرتبہ "اَلْحَمْدُ
وَاحْمِدَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ وَکَبِّرَا اَرْبَعًا وَّ	لِلّٰهِ" اور چونتیس مرتبہ "اَللّٰهُ اَکْبَرُ" کہا کرو۔ یہ
ثَلَاثِیْنَ، فَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمَا مِنْ خَادِمٍ۔	تمھارے لیے غلام سے بہتر ہے۔

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے یہ وظیفہ کبھی نہیں چھوڑا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ معرکہ صفین میں بھی؟ آپؓ نے فرمایا "معرکہ صفین میں بھی۔"

مہر اور اس کی کم سے کم مقدار کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

نسائی[1]، مصنف عبدالرزاق[2] اور ابوداؤد[3] میں ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی حطمی[4] زرہ حضرت فاطمہؓ کو مہر میں دی۔ عکرمہ "الواضحۃ" میں کہتے ہیں کہ وہ زرہ پانچ سو درہم میں فروخت ہوئی۔ "الواضحۃ" کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ رقم کی خوشبو ان کے لیے خریدی۔ مصنف عبدالرزاق[5] میں یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو بارہ اوقیہ سونا مہر میں دیا۔ نسائی[6] میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو جہیز میں ایک گدا، ایک مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ جس میں اذخر بھرا ہوا تھا دیا۔

ابن ابی زید نے لکھا ہے کہ یہ نکاح سنہ۲ھ میں ہوا اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ سنہ۳ھ میں ہجرت کے بائیسویں مہینے میں ہوا تھا۔ البتہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت عائشہؓ[7] کی رخصتی شوال سنہ۱ھ میں ہجرت کے آٹھویں مہینے میں ہوئی[8]۔

---

[1] نسائی (۶-۱۲۹) کتاب "النکاح"   [2] مصنف عبدالرزاق (۶-۱۸۳)

[3] ابوداؤد (۲-۲۴۰) کتاب "النکاح" باب فی الرَّجُلِ یَدْخُلُ بِامْرَأَتِهِ قَبْلَ اَنْ یَنْقُدَهَا شَیْئًا۔

حمیدی نے اپنی مسند (۱-۲۲) میں اسی طرح روایت کی ہے۔

[4] اصل میں ہے "دِرْعُهُ الحُطَمِيَّة" اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس زرہ کو "حُطَمِيَّة" اس لیے کہتے تھے کہ وہ تلواروں کو توڑ دیتی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کی ایک شاخ کو "حُطَمَة" بن محارب کہتے تھے۔ یہ لوگ زرہیں بناتے تھے اور ان کی طرف نسبت کر کے ان زرہوں کو "حُطَمِيَّة" کہتے تھے۔ دیکھیے الفائق (۱-۱۲۶) اور "النهاية" (۱-۴۰۲) ابن اثیر نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔

[5] مصنف عبدالرزاق (۶-۱۷۶)

[6] نسائی (۶-۱۳۵) کتاب "النکاح" باب "جهاز الرجل ابنته" حاکم نے بھی یہ حدیث "المستدرک" (۲-۱۸۵) میں روایت کی اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے حاکم سے اتفاق کیا ہے۔

[7] ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے نکاح سنہ۲ھ میں رمضان کے مہینے میں کیا اور رخصتی اسی سال ذی الحجہ میں ہوئی۔ قسطلانی نے ایک اور قول نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی کے ساڑھے چار ماہ بعد حضرت فاطمہؓ کی رخصتی ہوئی۔ زرقانی کہتے ہیں کہ اس حساب سے تو حضرت فاطمہؓ کی رخصتی سنہ۲ھ میں وسط صفر میں ہوئی۔ دیکھیے شرح المواهب (۲-۲)

[8] مشہور قول یہی ہے۔ ابن سعد نے حضرت عائشہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کی رخصتی ہجرت کے آٹھویں مہینے کے آغاز میں

موطا[1]، صحیح بخاری[2]، صحیح مسلم[3] اور نسائی[4] میں ہے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے کہا "یا رسول اللہ! میں اپنے آپ کو آپ کے سپرد کرتی ہوں"۔ وہ کافی دیر تک کھڑی رہی۔ پھر ایک آدمی نے اٹھ کر کہا کہ "یا رسول اللہ! اگر آپ کو اس کی ضرورت نہ ہو تو مجھ سے اس کا نکاح کر دیجیے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "هَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ تُصْدِقُهَا إِيَّاهُ" (اسے مہر میں دینے کے لیے تمھارے پاس کوئی چیز ہے) اس نے کہا کہ میرے پاس تو بس یہ ایک تہبند ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنْ أَعْطَيْتَهَا إِيَّاهُ جَلَسْتَ لَا إِزَارَ لَكَ فَالْتَمِسْ شَيْئًا" (اگر تم یہ اسے دے دو تو تم بغیر تہبند کے بیٹھے رہو گے۔ اس لیے جاؤ اور کوئی اور چیز تلاش کرو) اس نے کہا مجھے تو کچھ نہیں مل رہا ہے۔ حضور نے فرمایا "اِلْتَمِسْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيدٍ" (جا ہے لوہے کی ایک انگوٹھی ہی لے آؤ) اس نے تلاش کی مگر اسے کچھ نہ ملا۔ تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "هَلْ مَعَكَ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ" (تمھیں کچھ قرآن یاد ہے) اس نے جواب دیا کہ ہاں فلاں فلاں سورتیں مجھے یاد ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان سورتوں کے (پڑھانے) کے عوض میں نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا۔

کہتے ہیں کہ وہ خاتون خولہ رضی اللہ عنہا بنت حکیم تھیں اور بعض کے نزدیک وہ ام شریک رضی اللہ عنہا تھیں[5]۔

ہوئی۔ "الاصابۃ" اور "العیون" میں بھی اسی طرح ہے۔ قسطلانی نے "المواہب" میں کسی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی شوال ۲ھ میں ہجرت کے اٹھارھویں مہینے میں ہوئی۔ اس پر زرقانی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے کہ مصنف نے یہ ضعیف قول نقل کیا ہے حالانکہ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس قول کے مطابق تو رخصتی کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ساڑھے دس سال بنتی ہے جبکہ یہ بات صحیحین کی اس روایت کے خلاف ہے کہ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ دیکھیے "شرح المواہب" (۳-۲۳۰)

[1] "موطا" (۲-۳) کتاب "النکاح" باب "مَا جَاءَ فِي الصَّدَاقِ وَالْحِبَاءِ"

[2] صحیح بخاری، کتاب "النکاح" باب "نِكَاحِ الْمُعْسِرِ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۰۸۷)

[3] صحیح مسلم (۲-۱۰۴۱) کتاب "النکاح" باب الصداق وجواز کونہ تعلیم قرآن وخاتم حدید۔

[4] نسائی (۶-۱۱۳) کتاب "النکاح" باب "التَّزْوِيجِ عَلَى سُوَرٍ مِنَ الْقُرْآنِ" یہ حدیث ابوداؤد (۲-۲۳۶) کتاب "النکاح" باب "فِي التَّزْوِيجِ عَلَى الْعَمَلِ يُعْمَلُ" میں، ابن ماجہ (۱-۶۰۸) کتاب "النکاح" باب "الصداق" میں اختصار کے ساتھ اور دار قطنی (۳-۲۴۷) میں بھی روایت ہوئی ہے۔

[5] حافظ ابن حجر "فتح الباری" (۸-۵۲۵) میں لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم کے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت کے مطابق وہ خاتون خولہ رضی اللہ عنہا بنت حکیم تھیں اور شعبی کی روایت کے مطابق وہ ام شریک تھیں۔

ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ کہتے ہیں کہ جن عورتوں نے اپنے آپ کو حضور کے حوالے کر دیا تھا وہ تھیں فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت شریح، لیلیٰ بنت الحطیم، زینب رضی اللہ عنہا بنت خزیمہ اور خولہ رضی اللہ عنہا بنت حکیم۔ ابوعبیدہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو حضور کے

اس حدیث سے مندرجہ ذیل فقہی نکات مستنبط ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی کو نکاح کا اختیار دے دینے سے نکاح جائز ہو جاتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ سے حضرت علیؓ کا نکاح بھی اسی طرح ہوا تھا۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم[۱] پر اُجرت لینا جائز ہے۔

ابن حبیب کے نزدیک یہ حدیث منسوخ ہے۔

بعض دوسروں کی رائے ہے کہ یہ حضورؐ کی خصوصیاتؐ میں سے ہے اور صحابہ، تابعین اور فقہاء میں سے امام شافعی[۳] کے علاوہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔ اس میں ایک اشکال یہ بھی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ عورت کو پہلے ہی ٹھیک دہی

سپرد کرنے والی میمونہؓ بنت الحارث تھیں۔ یہ روایت منقطع ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں کوئی ایسی خاتون شامل نہ تھیں جنھوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کے سپرد کیا ہو۔ طبرانی نے یہ روایت نقل کی ہے اور سند کے اعتبار سے یہ حسن کے درجہ کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس خاتون کے نام کے بارے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی۔ انھوں نے فتح الباری (۹ - ۲۰۶) میں ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ مجھے اس عورت کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ پھر انھوں نے ابن الطلاع کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ خولہ بنت حکیم یا اُمّ شریک تھیں لیکن انھوں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

۱؎ قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ احناف کے علاوہ سب اہلِ علم قرآن کی تعلیم پر اُجرت لینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ شوکانی نے بھی "نیل الاوطار" (۶ - ۲۱۷) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اس قاعدے کی بنیاد پر احناف کے نزدیک قرآن کی تعلیم مہر بھی نہیں بن سکتی۔

۲؎ احناف میں سے امام طحاوی کی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہو سکتا ہے کہ یہ ان امور میں سے ہو جن میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ کو اللہ نے اختیار دیا ہو کہ آپؐ اس عورت کا کسی دوسرے شخص کے ساتھ مہر کے بغیر بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ لیث نے بھی یہی کہا ہے۔" دیکھیے "شرح معانی الآثار" (۳ - ۱۸)

۳؎ امام شافعی شرط لگاتے ہیں کہ اس تعلیم کے لیے عقد کے موقع پر ہی متصل اور معلوم مدت کا تعین ہونا چاہیے اور عورت مرد سے مطالبہ کرے کہ اس مدت میں وہ اس کو سکھائے۔ اگر مہر یہ مقرر ہوا ہو کہ وہ بیس سورتوں کی تعلیم دے گا اور سورتوں کا تعین نہ ہوا ہو تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس حدیث کے مطابق صحیح ہو گا کہ وہ کوئی سی بیس سورتیں سکھا دے اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں ہو گا کیونکہ سورتیں تو ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہیں۔ دیکھیے المہذب مع المجموع (۱۵ - ۴۸۷)

امام احمد کے بارے میں بھی دو روایتیں ہیں۔ ایک میں ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں اسے (قرآن کی تعلیم کو مہر مقرر کرنے کو) ناپسند کرتا ہوں۔ اور دوسری میں ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور مالک اسے جائز نہیں سمجھتے۔ وہ قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں "اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ" (النساء ۲۴) اور "وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ" (النساء - ۲۵) اور "طول" مال کو کہتے ہیں۔

سورتیں یاد ہوں جو مرد کو یاد ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوشش کے باوجود وہ عورت ان سورتوں کو پڑھ یا یاد نہ کر سکے اور مرد اسے سکھانے سے پہلے ہی خلاوت میں مل چکا ہو۔ باقی رہ گیا اس عورت کا معاملہ جس کا اس حدیث میں ذکر ہے تو اس نے تو اپنا معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کیا تھا اور وہ اس پر رضامند ہو چکی تھی۔

صحابہ میں سے کسی نے بھی پانچ درہم سے کم مہر پر نکاح نہیں کیا۔ اس کم از کم مقدار پر نکاح کرنے والے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے ایک گٹھلی کے برابر سونا مہر دیا۔ جس کی قیمت پانچ درہم تھی۔[۱]

ابن المنذر نے "الاشراف" میں ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے دس درہم کے برابر سامان کے مہر پر نکاح کیا۔

سنن سعید میں روایت ہے کہ ایک آدمی نے قرآن کی ایک سورت کی تعلیم دینے کے مہر پر نکاح کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تمھارے بعد کسی اور کے لیے یہ رعایت نہیں۔" یہ روایت ابوالنعمان ازدی سے مرسل ہے اور اس کے علاوہ اس کے بارے میں حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ غیر معروف ہے۔ یہ اضافہ مکحول کے حوالے سے اور لیث بن سعد عن ابوعوانہ کے حوالے سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ دیکھیے "نیل الاوطار" (۶-۱۶۷) شوکانی کہتے ہیں کہ تابعی کا قول حجت نہیں ہوتا۔ ابن قدامہ "المغنی" (۶-۱۴۰) میں لکھتے ہیں کہ ابن النجاد نے اپنی سند کے ساتھ بھی یہ روایت بیان کی ہے۔

[۱] صحیح بخاری، کتاب "النکاح" باب قولہ عز وجل (وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ) (النساء-۴) فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۱۴۸) اور باب "الولیمۃ ولو بشاۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۱۶۷)۔ صحیح مسلم (۲-۱۰۴۲) کتاب "النکاح" باب "الصداق" ابوداؤد (۲-۲۳۶) کتاب "النکاح" باب "قلۃ المھر" نسائی (۶-۱۱۹) کتاب "النکاح" باب التزویج علی نواۃ من الذھب"۔ ترمذی (۳-۴۰۲) کتاب "النکاح" باب "مَا جَاءَ فِي الْوَلِيمَةِ" - ابن ماجہ (۱-۶۱۵) کتاب "النکاح" باب "مَا جَاءَ فِي الْوَلِيمَةِ" مؤطا (۲-۱۴) کتاب "النکاح" باب "مَا جَاءَ فِي الْوَلِيمَةِ"۔

مگر احناف کہتے ہیں کہ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے۔ ان کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "لا مَهْرَ أَقَلَّ مِنْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ" (دس درہم سے کم کوئی مہر نہیں) چنانچہ دارقطنی (۳-۲۴۵) اور بیہقی (۷-۱۳۳) نے بشر بن عبید سے، اس نے حجاج بن ارطاۃ سے، اس نے عطاء اور عمرو بن دینار سے، انھوں نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عورتوں کے نکاح ان کے کفو ہی سے کیا کرو، ان کے نکاح ان کے ولی ہی کریں اور کوئی مہر دس درہم سے کم نہیں"۔

دارقطنی کہتے ہیں کہ بشر بن عبید متروک الحدیث ہے۔ زیلعی "نصب الرایۃ" (۳-۱۹۲) میں لکھتے ہیں کہ بیہقی نے "المعرفۃ" میں امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب کر کے یہ بات لکھی ہے کہ بشر بن عبید کی روایات موضوع اور جھوٹی ہوتی ہیں۔ ابن القطان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ بشر ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ حجاج بن ارطاۃ خود بھی ضعیف ہے اور ضعفاء سے تدلیس بھی کرتا ہے۔

حافظ زیلعی "نصب الرایۃ" (۳-۱۹۹) میں لکھتے ہیں کہ دارقطنی نے سنن (۳-۲۴۵) میں داؤد اودی سے، اس نے شعبی سے اور انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ "دس درہم سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے اور دس درہم سے کم مہر نہیں"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ابن الجوزی نے "التحقیق" میں لکھا ہے کہ ابن حبان کہتے ہیں کہ داؤد اودی ضعیف راوی ہے اور

"الواضحۃ" میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے مہر پانچ سو درہم تھے۔ "وثائق ابن العطار"[1] میں چار سو درہم لکھے ہیں۔ "المتواد" اور بعض دوسری کتابوں میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُم حبیبہؓ بنت ابوسفیان[2] سے نکاح کیا اور حضورؐ کی طرف سے نجاشی نے چار ہزار درہم اور ایک روایت کے مطابق چار سو طلائی دینار مہر کے طور پر دیئے۔ ابوداؤد (۲ - ۲۳۵)، دارقطنی (۳ - ۲۴۶) اور بیہقی (۷ - ۲۳۲) نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔

شعبی کا حضرت علیؓ سے سماع ثابت نہیں۔ اس کے بعد پھر لکھتے ہیں کہ دارقطنی نے یہ روایت ابن جریر سے جو خود بھی ضعیف ہے، ایک ایسی سند کے ساتھ بیان کی ہے جس میں محمد بن مروان ابوجعفر بھی ہے جسے ذہبی نے غیر معروف قرار دیا ہے۔

[1] "وثائق ابن العطار"، ابن العطار، ان کا نام محمد بن احمد بن عبید اللہ بن سعید الاموی ہے۔ قرطبہ کے رہنے والے تھے فقیہ، حافظ، فتوٰی اور شہادت میں عظیم المرتبت اور علم الفرائض کے ماہر تھے۔ ۳۹۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ دیکھیے "الصلۃ" (ص ۴۸۴)

[2] ان کا نام رملہ تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ کنیت ام حبیبہ تھی۔ بعثت نبوی سے انیس سال پہلے پیدا ہوئیں۔ عبید اللہ بن جحش سے ان کی شادی ہوئی۔ دونوں مسلمان ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ عبید اللہ اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا تو یہ ان سے الگ ہو گئیں۔ ابن سعد نے روایت بیان کی ہے کہ ام حبیبہؓ کہتی ہیں کہ میں نے خواب میں اپنے خاوند عبید اللہ کو نہایت ہی سیاہ شکل میں دیکھا۔ میں گھبرا کر اٹھی اور اگلے روز وہ مرتد ہو گیا۔ میں نے اسے خواب سنایا لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی اور شراب پی پی کر مر گیا۔ پھر خواب میں کسی شخص نے آکر مجھے "ام المومنین" کہا۔ میں گھبرا گئی۔ مگر ہوا یوں کہ میری عدت گزری ہی تھی کہ نجاشی کی ایک لونڈی ابرھۃ نامی میرے پاس آئی اور اس نے کہا کہ بادشاہ کہتا ہے کہ کسی کو نکاح کے لیے اپنا وکیل بناؤ۔ میں نے خالد بن سعید بن العاص کو بلا بھیجا اور اسے اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ میں نے ابرھۃ کو چاندی کے دو کنگن دیئے۔ عشاء کا وقت ہوا تو نجاشی کے حکم سے حضرت جعفرؓ بن ابوطالب نے نکاح کا خطبہ پڑھنے کے بعد کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لکھا ہے کہ میں ام حبیبہؓ کا نکاح ان سے کر دوں، چنانچہ میں حضورؐ کے اس حکم کی تعمیل میں حضورؐ کی طرف سے چار سو دینار مہر کے طور پر ادا کرتا ہوں۔ خالد نے اس پیغام کو قبول کر کے میرا نکاح حضورؐ سے کرنے کا اعلان کر دیا۔ نجاشی نے دعوت ولیمہ کی۔ حضرت ام حبیبہؓ کہتی ہیں کہ جب مہر کی یہ رقم مجھے ملی تو میں نے اس میں سے پچاس دینار ابرھۃ کو دے دیے لیکن اس نے یہ رقم یہ کہتے ہوئے واپس کر دی کہ بادشاہ کی طرف سے یہ رقم آپ کے لیے مختص ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے وہ چیزیں بھی واپس کر دیں، جو میں نے اسے پہلے دی تھیں۔ دوسرے دن وہ اپنے ساتھ بہت سا سامان جس میں عود اور عنبر وغیرہ خوشبوئیں اور ورس (یمن میں پائے جانے والے ایک پودے سے بننے والا غازہ) وغیرہ سامان آرائش کی چیزیں شامل تھیں، ساتھ لے کر آئی اور پھر میرے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئی۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ یہ واقعہ سات ہجری میں پیش آیا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ چھ ہجری کا واقعہ ہے۔

اور جب ابوسفیان کو یہ خبر ملی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیٹی ام حبیبہؓ سے شادی کر لی ہے، تو اس نے کہا کہ آپ ایک ایسے انسان ہیں جو ناقابلِ تسخیر ہیں۔

احمد الحفنی نے "سواطع الانوار" (ص - ۸۱) میں نجاشی کا خط بھی نقل کیا ہے۔ اور ان چیزوں کا ذکر بھی کیا ہے جو اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ اس خط کا متن یہ ہے:

حضرت علیؓ کو ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے سے منع کرنا

صحیح بخاری[1]، ابوداؤد[2] اور "الواضحۃ" میں ہے کہ حضرت علیؓ نے ابوجہل بن ہشام کی بیٹی[3] سے نکاح کے لیے پیغام بھیجا۔ بنو ہشام[4] بن المغیرہ نے اس سلسلے میں حضورؐ سے اجازت چاہی تو آپؐ نے انھیں اجازت نہیں دی۔ حضورؐ غصے کی حالت میں گھر سے نکلے۔ آپؐ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر چڑھ گئے۔ آپؐ نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

بنو ہشام بن المغیرہ نے مجھ سے اجازت طلب کی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح علی بن ابوطالب سے کر دیں۔ سن لو۔ میں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ ہاں، علی چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے۔ میری بیٹی میری لختِ جگر ہے۔ جو چیز اسے تشویش میں مبتلا کرے وہ مجھے تشویش میں مبتلا کرتی ہے اور جس بات سے اسے اذیت پہنچے اس سے مجھے اذیت پہنچتی ہے۔ اللہ کے نبی کی بیٹی کے ساتھ اللہ کے دشمن کی بیٹی کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں فاطمہؓ اپنے دین کے سلسلے میں فتنے میں مبتلا نہ ہو جائے۔ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں ٹھہراتا لیکن اللہ کی قسم! اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک گھر میں ہرگز جمع نہیں ہوں گی۔[5]

یہ خط نجاشی کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے!

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے بعد: میں نے آپ کے ساتھ ایک ایسی خاتون کا نکاح کیا ہے جو آپ کی قوم سے بھی ہے اور آپ کے دین پر بھی ہے۔ اور یہ خاتون ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان ہے۔ علاوہ ازیں میں آپ کی خدمت میں ایک قمیص، ایک شلوار، ایک چادر اور بنے ہوئے موزوں کا ایک جوڑا بھیج رہا ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

[1] صحیح بخاری، کتاب "النکاح" باب ذَبِّ الرَّجُلِ عَنِ ابْنَتِہِ فِي الْغَيْرَةِ وَالْإِنْصَافِ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۳۰)

[2] ابوداؤد (۲-۲۲۱) کتاب "النکاح" باب "مَا يُكْرَهُ أَنْ يَجْمَعَ بَيْنَهُنَّ مِنَ النِّسَاءِ"۔

[3] اس کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ حاکم نے "الاکلیل" میں "جویریۃ" لکھا ہے اور یہی زیادہ مشہور بھی ہے۔ بعض اس کا نام عوراء لکھتے ہیں۔ ابن طاہر نے "المبھمات" میں یہی لکھا ہے۔ ابن جریر نے "حیفاء"، سہیلی نے "جرھمۃ" اور ابن المقلن نے جمیلہ لکھا ہے۔ بعد میں اس کا نکاح عتاب بن اسید سے ہوا۔ دیکھیے فتح الباری (۷-۸۶)

[4] صحیح مسلم (۴-۱۹۰۲) کتاب "فضائل الصحابۃ" میں ہشام بن المغیرہ ہے۔ یہ اس لڑکی کے دادا تھے۔

[5] صحیح بخاری، کتاب "فضائل الصحابۃ" باب "اصھار النبی" ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں اس بات کی صراحت

ابن حبیب کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس حدیث سے استدلال کرے کہ نکاح کے سلسلے میں اس طرح کی شرائط عائد کرنے کی اجازت ہے تو یہ درست نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواص میں سے ہے۔

ہے کہ اس کے بعد حضرت علیؓ نے اس نکاح کا ارادہ بالکل ترک کر دیا اور انھوں نے کہا کہ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے فاطمہؓ کو تکلیف پہنچے۔ پھر حضرت علیؓ نے یہ عہد پورا کر دکھایا اور حضرت فاطمہؓ جب تک زندہ رہیں انھوں (حضرت علیؓ) نے دوسری شادی نہیں کی۔

لہ حضرت علیؓ کو نکاح سے منع فرمانے کے بارے میں علماء کی آراء نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے تھی کہ آپؐ کی صاحبزادیوں پر دوسرے نکاح نہ کیے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صرف حضرت فاطمہؓ کے لیے خاص ہو۔ دیکھیے "فتح الباری" (۹ - ۳۲۹)

امام نوویؒ نے اس کی ایک تاویل تو یہ کی ہے کہ اس نکاح سے حضرت فاطمہؓ کو اذیت پہنچتی اور ان کی اذیت سے حضورؐ کو اذیت پہنچتی اور جو شخص حضورؐ کو اذیت پہنچانے کا سبب بنتا تو گویا وہ ہلاک ہوگیا۔ اس لیے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ پر کمال شفقت کا تقاضا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اس سے روک دیا۔ انھوں نے دوسری تاویل یہ کی ہے کہ کہیں غیرت کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ فتنہ میں نہ پڑ جائیں اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو ان کی زندگی میں دوسرے نکاح سے منع فرما دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے جو یہ فرمایا کہ اللہ کے رسول اور اللہ کے دشمن کی بیٹیاں ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں تو یہ دراصل نہی نہیں تھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تفضل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا اور آپؐ نے اس امر واقعہ کی خبر دے دی لیکن حدیث کے سباق و سیاق سے اس تاویل کی تائید نہیں ہوتی۔

مجوسی مرد اور عورت مسلمان ہوجائیں تو اُن کے نکاح کے بارے میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

"المدونۃ" اور دوسری کتابوں میں ہے کہ جب غیلان بن سلمہ ثقفی مسلمان ہوا تو اس کی دس بیویاں تھیں۔ حضور نے اس سے فرمایا:

اِخْتَرْ اَرْبَعًا وَفَارِقْ سَائِرَهُنَّ (کوئی سی چار رکھ لو اور باقیوں سے الگ ہو جاؤ)

فیروز دیلمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارش کی کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرے نکاح میں

لہ "المدونۃ" (۲-۱۱۳) ترمذی (۳-۷۸۶) کتاب "النکاح" باب ماجاء فی الرجل یسلم و عندہ عشر نسوۃ، ابن ماجۃ (۱-۶۲۸) کتاب "النکاح" باب "ماجاء فی الرجل یسلم و عندہ اکثر من اربع نسوۃ" اور دار قطنی (۳-۲۶۹) ان سب میں یہ حدیث اس سند کے ساتھ ہے کہ زہری، سالم سے اور وہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں۔ امام شافعی کی سند یہ ہے کہ وہ ایک ثقہ راوی سے بیان کرتے ہیں، وہ معمر سے اور وہ زہری سے۔ ابن حبان اور حاکم نے بھی یہ روایت بیان کی ہے اور ان دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ امام بخاری کی رائے میں یہ حدیث غیر محفوظ ہے۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ زہری نے سالم سے اور انھوں نے اپنے والد سے جو روایت بیان کی ہے اس میں یہ ہے کہ قبیلہ ثقیف کے ایک آدمی نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تو حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ اپنی عورتوں سے رجوع کر لو ورنہ میں تمہیں رجم کرا دوں گا۔

اثرم امام احمد سے بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ انھوں نے اس میں یہ علت بتائی کہ معمر دوسرے خطے کے ایک راوی سے حدیث بیان کرنے میں منفرد ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ جن طرق سے بھی یہ حدیث روایت کی گئی ان سب میں کوئی نہ کوئی علت موجود ہے۔ امام مالک اور عبدالرزاق نے زہری سے یہ مرسلاً روایت کی ہے۔ اسی لیے ابو حاتم اور ابو زرعہ کہتے ہیں کہ ان سب میں سے یہ مرسل روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ معمر بصرہ میں وہم کا شکار رہتا ہے اور اگر بصرہ سے باہر کوئی اس سے روایت کرے تو ہم اس پر صحت کا حکم لگائیں گے۔ اس حدیث کی تائید میں بعض دوسری روایات بھی ہیں جو صحابہ سے مروی ہیں۔ مثلاً دار قطنی میں ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے ہے، مگر اس سند میں واقدی ہے جس کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔ دیکھیے "التلخیص الحبیر" (۳-۱۶۸)

دو بہنیں ہیں۔ حضور نے فرمایا "طَلِّقْ اَيَّتَهُمَا شِئْتَ" (ان میں سے جسے چاہو طلاق دے دو)[1]
سنن ابوداؤد[2] میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک عورت مسلمان ہوگئی اور اس نے کسی مسلمان

---

[1] دیکھیے "المدونۃ" (۲-۲۱۱) سنن ابوداؤد (۲-۲۷۲) کتاب "الطلاق" باب "مَنْ اَسْلَمَ وَعِنْدَہٗ نِسَاءٌ اَکْثَرُ مِنْ اَرْبَعٍ اَوْ اُخْتَانِ"، ابن ماجۃ (۱-۶۲۷) کتاب "النکاح" باب "الرَّجُلُ یُسْلِمُ وَعِنْدَہٗ اُخْتَانِ"، ابن ماجہ نے یہ حدیث دو طرق سے روایت کی ہے۔ ان میں سے ایک میں ابن لھیعہ ہے۔ جس پر جرح کی گئی ہے۔ ترمذی کتاب "النکاح" باب "مَاجَاءَ فِی الرَّجُلِ یُسْلِمُ وَعِنْدَہٗ اُخْتَانِ" ترمذی کی سند میں بھی ابن لھیعہ ہے۔ ان سب روایات میں ابو وہب الجیشانی ہے جس کا نام عبید بن شرحبیل ہے۔ جس کے بارے میں امام بخاری کہتے ہیں کہ اس کے ثقہ ہونے میں کلام ہے۔ ابن القطان اسے مجہول الحال اور ابن حبان ثقہ کہتے ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا نام دیلم بن الہوشع ہے۔ انھیں حافظ ابن حجر نے غلط قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ تو صحابی ہیں اور ان کا نام فیروز الدیلمی ہے جبکہ ابو وہب الجیشانی تابعی ہے۔ دیکھیے "تھذیب التھذیب" (۱۲-۲۷۵)۔ شوکانی کہتے ہیں کہ یہ مقبول راوی ہے، لیکن بخاری اور عقیلی نے اسے "معلول" قرار دیا ہے۔ دیکھیے "نیل الاوطار" (۶-۱۸۰)

فیروز دیلمی فارسی الاصل ہیں۔ یہ یمن کے دارالحکومت صنعا میں رہتے تھے۔ جہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے۔ انھوں نے جھوٹے مدعی نبوت اسود عنسی کو قتل کیا۔ اسود عنسی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں قتل ہوا اور حضور کو اس کے قتل کی خبر مرض الموت میں ملی تھی۔

[2] سنن ابوداؤد (۲-۲۷۱) کتاب "الطلاق" باب "اِذَا اَسْلَمَ اَحَدُ الزَّوْجَیْنِ"، المنذری نے اس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ابن ماجہ (۱-۶۴۷) کتاب "النکاح" باب "الزَّوْجَیْنِ یُسْلِمُ اَحَدُھُمَا قَبْلَ الْاٰخَرِ"

ابوداؤد الطیالسی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ دیکھیے "منحۃ المعبود" (۱-۳۱۰) یہ حدیث مستدرک الحاکم (۲-۲۰۰) میں بھی ہے۔ اور حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ذہبی نے بھی حاکم سے اتفاق کیا ہے۔ "القاری" المظھر سے نقل کرتے ہیں کہ "عدت گزرنے سے پہلے پہلے اگر دونوں مسلمان ہو جائیں تو ان کا نکاح باقی رہے گا چاہے اس سے پہلے وہ دونوں ایک ہی دین کے پیرو ہوں جیسے دونوں بت پرست یا دونوں اہل کتاب ہوں یا وہ الگ الگ ادیان کے ماننے والے ہوں اور چاہے وہ دونوں دارالاسلام میں ہوں یا دارالحرب میں یا ایک دارالاسلام میں ہو اور دوسرا دارالحرب میں۔ امام شافعی اور احمد کا مسلک یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل تین صورتوں میں سے کوئی ایک بھی صورت پیدا ہو جائے تو ان میں علیحدگی ہو جائے گی۔ ایک یہ کہ عدت گزر جائے۔ دوسری یہ کہ دونوں میں سے جو مسلمان نہیں ہوا اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جائے اور وہ اسے قبول نہ کرے اور تیسری یہ کہ دونوں میں سے کوئی ایک دارالاسلام سے دارالحرب کی طرف یا دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہو جائے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان میں سے کوئی رخصتی سے پہلے اسلام قبول کر لیتا ہے یا بعد میں۔ دیکھیے

سے نکاح کر لیا۔ اس کا پہلا خاوند آیا اور اس نے کہا کہ اللہ کے رسول! میں مسلمان ہو چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دوسرے خاوند سے لے کر پہلے خاوند کو واپس کر دی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس آدمی کی بات سچی تھی۔

"عون المعبود" (۲-۲۲۲)

ابن شہاب کہتے ہیں کہ ہم تک کوئی ایسی روایت نہیں پہنچی کہ عورت ہجرت کر کے دارالاسلام میں آگئی ہو اور اس کا خاوند حالت کفر میں دارالکفر میں مقیم ہو اور ان کے درمیان علیحدگی نہ ہو گئی ہو۔ سوائے اس کے کہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے خاوند اسلام قبول کرے اور ہجرت کر کے دارالاسلام پہنچ جائے۔ اسی طرح ہم تک کوئی ایسی روایت بھی نہیں پہنچی کہ عدت کے اندر اندر خاوند مسلمان ہو کر ہجرت کر کے دارالاسلام میں آگیا ہو اور پھر ان میں علیحدگی ہو گئی ہو۔ دیکھیے المجموع (۱۵-۵۴۳)

مُتعہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا[۱] امام مالک، صحیح بخاری[۲]، صحیح مسلم[۳] اور نسائی[۴] میں ہے کہ رفاعہ[۵] بن سموال نے اپنی بیوی تمیمہ[۶] بنت وہب کو

---

[۱] مؤطا امام مالک (۲-۶) کتاب النکاح باب نکاح المحلل وما اشبہہ حافظ ابن حجر الاصابۃ (۱-۴-۵۰) میں لکھتے ہیں کہ "مؤطا کے تمام راویوں کے نزدیک یہ مرسل روایت ہے۔ ابن وہب، ابراہیم بن طہمان اور ابو علی الحنفی تینوں اس کو امام مالک سے متصل سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ ان کی بیان کردہ سند میں امام مالک الزبیر بن عبدالرحمٰن بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد سے"۔ (ابن حجر کا بیان ختم ہوا)

الہیثمی نے مجمع الزوائد (۴-۳۴۰) میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث البزار اور طبرانی نے روایت کی ہے اور ان دونوں کے راوی ثقہ ہیں۔ امام مالک نے مؤطا میں اس کو مرسلاً روایت کیا ہے۔

[۲] صحیح بخاری کتاب الطلاق باب من قال لامرأتہ انت علی حرام (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۶۵) عن عائشہؓ۔

[۳] صحیح مسلم (۲-۱۰۵۵) کتاب النکاح باب لا تحل المطلقۃ ثلاثا لمطلقھا حتی تنکح زوجا غیرہ"۔

[۴] نسائی (۶-۱۴۶) کتاب الطلاق باب الطلاق للتی تنکح زوجا ثم لا یدخل بہا"

یہ حدیث ابوداؤد (۲-۲۹۴) نے کتاب الطلاق باب المبتوتۃ لا یرجع الیہا زوجہا حتی تنکح زوجا غیرہ" میں روایت کی ہے۔ نیز دیکھیے ترمذی (۳-۴۲۶) کتاب النکاح" باب ما جاء فیمن یطلق امرأتہ ثلاثاً فیتزوجہا اخر فیطلقھا قبل ان یدخل بہا"۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

[۵] رفاعہ بن سموال :۔ حافظ ابن حجر نے الاصابۃ" (۱-۴-۵۰) میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "رفاعہ بن سموال القرظی بنو قریظہ کے ایک فرد کا ذکر صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث میں پایا جاتا ہے"۔

حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں :۔

"رفاعہ بن سموال اور بعض علماء کے نزدیک رفاعہ بن رفاعہ القرظی بنو قریظہ میں سے تھے۔ ان کے بیٹے نے اُن سے روایت کی ہے"۔

ابن الاثیر اُسد الغابۃ" (۲-۱۸۱) میں لکھتے ہیں :

"رفاعہ ام المومنین صفیہؓ بنت حیی بن اخطب کے ماموں تھے۔ حضرت صفیہؓ کی والدہ کا نام برّہ بنت سموال تھا"۔

[۶] تمیمہ بنت وہب اور بعض کے نزدیک اس کا نام اُمیمہ یا سُہیمہ تھا۔

عہدِ رسالت میں طلاق دے دی۔ اس نے عبدالرحمٰن بن زبیر رضی اللہ عنہ [1] سے نکاح کر لیا۔ عبدالرحمٰن کو خلوت کا موقع ملا مگر وہ مجامعت پر قادر نہ ہو سکا۔ اس لیے اس نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اس عورت کے پہلے خاوند رفاعہ نے اس سے دوبارہ نکاح کرنا چاہا، چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خواہش کا ذکر کیا تو آپ نے اس کو نکاح کرنے سے روکا اور فرمایا:

(وہ عورت تمھارے لیے حلال نہیں جب تک (وہ دوسرے خاوند کا) مزہ [2] نہ چکھ لے۔"

مؤطا امام مالک کے علاوہ دوسری کتابوں میں یہ الفاظ ہیں کہ حضورؐ نے اس عورت سے فرمایا کہ "نہیں، جب تک دوسرا خاوند تمھارا مزہ نہ چکھ لے اور تم اس کا مزہ نہ چکھ لو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ

اسی قسم کا فیصلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے الغمیصاء یا الرمیصاء نامی عورت کے بارے میں کیا تھا۔ اس خاتون نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے خاوند کی شکایت کی تھی کہ وہ اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہیں کر سکتا۔ خاوند نے کہا "یا رسول اللہ! یہ جھوٹ بولتی ہے۔ میں اس کے حقوق ادا کرتا ہوں مگر یہ اپنے پہلے خاوند کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔" حضورؐ نے فرمایا۔ یہ پہلے خاوند کے لیے اس وقت تک حلال نہیں جب تک تم اس کا مزہ نہ چکھ لو۔" یہ حدیث ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ دیکھیے "المطالب العالیہ" (۲-۴۶) الہیثمی "مجمع الزوائد" (۴-۳۴۰) میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی صحیحین کے راویوں میں سے ہیں۔"

[1] عبدالرحمٰن بن زَبیر رضی اللہ عنہ: عبدالرحمٰن صحابہ میں سے تھے۔ ان کے والد زَبیر کو، جو کہ یہودی تھا، غزوہ بنو قُرَیظہ میں قتل کیا گیا تھا۔ زَبیر کے والد کا نام باطا، یا باطیا القُرظی تھا۔ ابن عبدالبر اور دیگر محققین نے اسی طرح لکھا ہے۔ محدث ابن مَندہ اور ابو نُعیم اصبہانی نے حالاتِ صحابہ سے متعلق اپنی کتابوں میں تحریر کیا ہے کہ عبدالرحمٰن کا نام عبدالرحمٰن بن الزُبیر بن زید بن اُمیہ بن زید بن مالک بن عوف ہے۔ امام نووی شرح مسلم (۱۰-۱) میں لکھتے ہیں کہ پہلی بات درست ہے۔

[2] حدیث میں یہاں العُسَیلۃ (بضم العین وفتح السین) عسلہ کی تصغیر ہے جس کے معنی شہد کے ہیں۔ اس سے یہاں مراد مجامعت ہے۔ مجامعت کی لذت کو شہد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کی مؤید وہ روایت ہے جس کو امام احمد نے مسند (۶-۶۲) میں نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "شہد چکھنے سے مراد جماع ہے۔" علاوہ ازیں ابو یعلیٰ نے اس کو مسند میں عبداللہ بن ابی مُلیکہ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے المطالب العالیۃ (۲-۴۴)

جمہور علماء کا قول ہے کہ عورت کی شرمگاہ میں مرد کے آلۂ تناسل کے اگلے حصے حشفہ کا داخل ہو جانا کافی ہے۔ اس کے لیے انزال ضروری نہیں۔ اس کے برعکس امام حسن بصری نے یہ شاذ مسلک اختیار کیا ہے کہ انزال بھی شرط ہے اس لیے کہ حقیقی لذت اسی سے حاصل ہوتی ہے، مگر جمہور اہلِ علم کا قول ہے کہ آلۂ تناسل کے دخول سے لذت حاصل ہو جاتی ہے انزال ضروری نہیں۔

باقی رہا حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی کہ "جب تک تو اس کا مزہ نہ چکھ لے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے یہ بات حاصل ہونے تک صبر سے کام لو۔ اگرچہ تم پہلے خاوند سے الگ ہو گئی ہو مگر تمھارے لیے ضروری ہے کہ تم دوسرے خاوند سے نکاح کرو اور

اگر خاوند عورت سے اس حالت میں مجامعت کرے کہ وہ سو رہی ہو اور اسے کچھ پتہ نہ ہو یا اس پر غشی کی کیفیت طاری ہو اور اسے لذت کا احساس نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں وہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔

متعدد طرق سے ثابت ایک حدیث میں الربیع بن سبرہ الجہنی نے اپنے والد سے روایت کی کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں فتح مکہ والے سال مکہ آئے تو آپ نے ہمیں عورتوں سے متعہ کی اجازت دے دی۔

چنانچہ میں اور بنی عامر کے قبیلے سے تعلق رکھنے والا میرا ایک ساتھی ایک عورت کے یہاں گئے۔ وہ نوخیز دوشیزہ نظر آتی تھی۔ ہم نے اپنی اپنی چادر کے عوض اس سے متعہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ سبرہ کا بیان ہے کہ میرے ساتھی کی چادر مجھ سے بہتر تھی

اس سے لذت بھی حاصل کرو۔" (تب پہلے خاوند کے ساتھ تمہارا نکاح ہو سکے گا)

لہ اگر دوسرا خاوند عورت کی دُبر میں وطی کرے تو بھی وہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔ کیونکہ حضورؐ نے خاوند اور بیوی دونوں کے لیے مزہ چکھنے کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب مجامعت پوری تیاری کے ساتھ فرج میں کی گئی ہو۔ اگر آلۂ تناسل کے انتشار کے بغیر اس کا اگلا حصہ فرج میں داخل کر دے تو پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں مزہ چکھنے کی شرط پوری نہیں ہوگی۔

ٹہ یہ حدیث مسلم اور ابن ماجہ (۱۔ ۶۳۱) نے عبدالعزیز بن عمر سے روایت کی ہے۔ وہ الربیع سے روایت کرتے ہیں۔ دیکھیے کتاب النکاح باب النھی عن نکاح المتعۃ یہ واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آیا تھا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! بیویوں سے علیحدگی ہم پر بڑی شاق گزر رہی ہے۔" الدارمی (۲۔ ۱۴۰) میں بروایت عبدالعزیز عن زہری مذکور ہے کہ یہ فتح مکہ والے سال کا واقعہ ہے۔

ٹہ میرے خیال میں یہ واقعہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیش نہیں آیا۔ کیونکہ عورتیں مرے سے اس وقت مباح ہی نہ تھیں۔ یہ غلطی عبدالعزیز بن عمر سے سرزد ہوئی۔ عبدالعزیز اگرچہ سچا راوی ہے مگر خطا کا سرزد ہونا بعید از امکان نہیں۔ اسی لیے امام زہری نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور اس نے حجۃ الوداع کی بجائے فتح مکہ کہا ہے۔

امام نووی شرح مسلم (۹۔ ۱۸۰) میں لکھتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں کہ متعہ کی اجازت حجۃ الوداع کے موقع پر دی گئی تھی۔ اس لیے کہ اس موقع پر متعہ کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ اکثر صحابہ بیویوں سمیت حج کے لیے آئے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس موقع پر آپؐ نے متعہ سے منع کیا تھا جیسا کہ متعدد روایات میں مروی ہے۔ آپؐ نے حرمت متعہ کو اس موقع پر اس لیے دہرایا کہ بکثرت صحابہ جمع تھے۔ تمام راویان حدیث کا اس پر اجماع ہے۔ تمام صحابہ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ حضورؐ نے متعہ سے فتح مکہ کے دن منع فرمایا۔ پس یہ بات واضح ہو گئی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے تاکیداً اس ممانعت کو دہرایا تھا تاکہ موجود لوگ ان تک بات پہنچا دیں جو حاضر نہ ہو سکے۔ اس لیے بھی کہ آج دین مکمل ہو گیا تھا۔ تعدد اولیا کی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ سبرۃ الجہنی نے جو حلت کی بات بتائی وہ فتح مکہ کے موقع کی تھی اور حجۃ الوداع پر تو حرمت کی بات دوبارہ کہی گئی۔ میں کہتا ہوں کہ روایات میں اس قسم کے اوہام کی کمی نہیں اور ایک وقت کا دوسرے وقت سے، ایک جگہ کا دوسری جگہ سے، اور ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ کے ساتھ التباس حفاظ حدیث کے یہاں ہو ہی جاتا ہے۔ ایسی صورت میں تطبیق کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مگر میں اس سے خوبصورت جوان تھا۔ وہ عورت مجھے اور میرے ساتھی کو غور سے دیکھتی رہی۔ میرے ساتھی نے کہا، میری چادر اس کی چادر سے بہتر ہے۔ وہ بولی: "اس کی چادر جیسی کچھ بھی ہے ہم نے اسے منتخب کر لیا ہے۔" میں تین دن رات اس کے یہاں ٹھہرا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کے بعد متعہ سے منع کر دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔

مسند ابن ابی شیبہ میں یہ الفاظ ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے متعہ کو قیامت تک حرام قرار دیا ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی عورت کے ساتھ ایسا معاہدہ کر رکھا ہو تو اسے چھوڑ دے اور جو کچھ تم نے ان عورتوں کو دے دیا ہے اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔" شعبہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میں نے ایک عورت کے ساتھ دس دن کے لیے متعہ کر رکھا تھا۔ میں نے ایک رات اس کے یہاں گزاری۔ صبح کو آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپؐ حجرِ اسود اور بابِ کعبہ کے درمیان کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں:

إِنِّي كُنْتُ أَذِنْتُ لَكُمْ فِي الِاسْتِمْتَاعِ مِنْ هٰذِهِ النِّسَاءِ وَإِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ ذٰلِكَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ شَيْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيلَهُنَّ وَلَا تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا	میں نے تمہیں ان عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے متعہ کو قیامت تک حرام قرار دے دیا ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی عورت کے ساتھ ایسا معاہدہ کر رکھا ہو تو اس کا راستہ صاف کر دے۔ اور جو کچھ تم نے ان کو دیا ہو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو[1]

---

[1] ابن حبان میں یہ حدیث زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ دیکھیے "نصب الرایۃ" (۳-۱۷۸)

اس ضمن میں راجح بات یہ ہے کہ متعہ کی اجازت فتح مکہ کے موقع پر ضرورت کی بنا پر دی گئی تھی۔ پھر حضورؐ نے مکہ سے نکلنے سے پہلے ہی اس کو حرام ٹھہرا دیا تھا۔

یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ متعہ کو غزوۂ خیبر کے موقع پر مباح قرار دیا گیا تھا اور ساتھ ہی اسی موقع پر اس کو حرام قرار دے دیا گیا تھا جیسا کہ صحیحین میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے خیبر کے روز متعہ سے اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپؐ نے پالتو گدھوں کے گوشت سے منع کیا نکاح متعہ سے نہیں۔

اصل میں یہ سفیان بن عُیَینہ کی روایت ہے جس کا ابو عمر نے "التمہید" میں ذکر کیا ہے۔ اس سے بعض راویوں کو وہم ہوا کہ متعہ خیبر کے موقع پر حرام ہوا۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا مقصد اپنے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباس کے اس موقف کی تردید کرنا تھا کہ متعہ اور پالتو گدھے دونوں حلال ہیں۔ حضرت علیؓ نے ہر دو مسائل کے بارے میں ان کے خلاف استدلال کیا۔ حضرت علیؓ نے پالتو گدھوں کی حرمت کو تو خیبر کے ایام کے ساتھ مقید کیا، مگر متعہ کی حرمت کو علی الاطلاق بیان کیا۔

حضرت علیؓ نے ابن عباسؓ سے کہا کہ آپؓ تو یوں کہتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھوں کے گوشت اور عورتوں کے متعہ سے منع فرمایا ہے۔ ابن عباسؓ پر حجت تمام کرنے کے لیے دونوں کی حرمت کو یکجا بیان کیا مگر کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں کیا۔

متعہ کی حرمت کے بارے میں راویوں کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ کب حرام ہوا۔ ایک قول یہ ہے کہ خیبر والے سال اسے حرام قرار دیا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صلح حدیبیہ والے سال ۶ھ میں حرام قرار پایا۔ یہ ابو عبید کا قول ہے کہ فتح مکہ والے سال (۸ھ) اسے حرام ٹھہرایا گیا۔ ابو عبید نے اپنی روایت کردہ حدیث میں یوں کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرا خیال ہے کہ تم میں سے جو شخص بھی کسی عورت کے ساتھ تین دن خلوت اختیار کرے گا وہ ضرور اس سے پیٹھ پھیرے گا۔"

اگر یہ کہا جائے کہ متعہ کو غزوۂ خیبر کے موقع پر حرام ٹھہرایا گیا تھا تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نسخ دو دفعہ ہوا (ایک دفعہ خیبر میں اور دوسری دفعہ مکہ میں) حالانکہ شریعت میں ایسا نہیں ہوتا۔ دوسری بات اس سے یہ لازم آتی ہے کہ خیبر میں متعہ کی اجازت صرف مسیحی عورتوں کے بارے میں دی گئی تھی۔ اس لیے کہ وہاں مسلمان عورتیں موجود نہ تھیں۔ اور یہ درست نہیں اس لیے کہ اس وقت تک وہ آیت نازل نہیں ہوئی تھی جس میں اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ (۱۴۳-۲)

باقی رہی یہ بات کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر متعہ کی حرمت کا ذکر فرمایا تھا تو واضح رہے کہ ممانعت کی یہ تکرار مزید تاکید کے لیے تھی جیسا کہ اس سلسلے میں امام نووی کا قول اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

حضرت میمونہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح

صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم[2] میں جابر بن زید سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں عبداللہ بن عباسؓ نے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں نکاح کیا۔

مسلمؒ نے یزید بن الاصم سے ایک اور روایت کی ہے جس میں ہے کہ مجھے میری خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے ساتھ نکاح کیا تو آپ احرام کی حالت میں نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میمونہؓ میری اور ابن عباسؓ کی خالہ تھیں۔ اسی طرح "الواضحة"[3] میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مُحرِم[4] نہ تھے اور سَرِف کے مقام پر حضرت میمونہؓ

---

[1] صحیح بخاری کتاب "المنکاح" باب "نکاح المحرم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۱۱۴)

[2] صحیح مسلم (۲-۱۰۳۱) کتاب "المنکاح" باب تحریم نکاح المحرم۔

[3] حوالہ مذکور۔

[4] حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ابن عباسؓ کے قول پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ حضورؐ نے حلال (غیر محرم) ہونے کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا۔ اسحاق بن راہویہ نے مُسند میں اس کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے "المطالب العالیة" (۲-۸) میں اسحاق سے نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۹-۱۶۵) میں لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ کی روایت ایک علمی مشاہدہ پر مبنی ہے اور اس کی مختلف توجیہات ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ایک احتمال یہ ہے کہ ابن عباسؓ یہ سمجھتے ہوں گے کہ جو شخص قربانی کے جانوروں کے گلے میں قلادہ ڈال دے وہ مُحرِم ہو جاتا ہے۔ اور حضورؐ نے چونکہ اپنے عمرہ کے لیے قربانی کے جانوروں کے گلے میں قلادے ڈالے ہوئے تھے اور پھر اسی عمرہ کے سفر میں آپؐ نے حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا۔ اس لحاظ سے ابن عباسؓ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے جانوروں کے گلے میں قلادہ ڈالنے کے بعد حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا، اگرچہ آپؐ نے ابھی تک احرام کا لباس نہیں پہنا تھا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ حضورؐ نے ابو رافعؓ کو حضرت میمونہؓ کی طرف پیغامِ نکاح دے کر بھیجا۔ انہوں نے حضرت میمونہ کے نکاح کا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا اور حضرت عباسؓ نے میمونہؓ کا نکاح حضورؐ سے کر دیا۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ ترمذی، ابن حبان اور ابن خزیمہ نے اپنی اپنی کتابوں میں بطریق مطر الوراق عن ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن عن سلیمان بن یسار عن ابی رافع روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے اس وقت نکاح کیا جب آپ احرام کی حالت میں نہیں تھے۔ اور جب ان کی رخصتی ہوئی اس وقت بھی آپؐ احرام کی حالت میں نہ تھے۔ ابو رافع دونوں کے درمیان پیغام رسانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

کی رخصتی ہوئی۔

۲- دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول سے ۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم ہونے کی صورت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا۔

مراد یہ ہے کہ حضورؐ اس وقت حرم مکہ میں داخل تھے۔ یا یہ معنی کہ اس وقت حرمت والا مہینہ تھا۔ جیسے کہ الاعشیٰ نامی شاعر کہتا ہے ع

سہ قتلوا کسریٰ بلیل محرمًا (انھوں نے شہر حرام میں کسریٰ کو رات کے وقت قتل کیا)

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے: ع

قتلوا ابن عفان الخلیفۃ محرمًا (انھوں نے خلیفہ حضرت عثمانؓ کو بلد الحرام میں قتل کیا)

ابن حبان نے بھی اپنی کتاب میں بڑے وثوق کے ساتھ اسی لٹائے کا اظہار کیا ہے۔ آگے چل کر ابن حبان یزید بن الاصم کی روایت نقل کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے نکاح غیر محرم ہونے کی حالت میں کیا تھا صحیح مسلم میں ایک دوسری سند کے ساتھ یزید بن الاصم سے جو روایت بیان کی گئی ہے۔ اس کا ذکر اصل کتاب (اقضیۃ الرسول) میں موجود ہے۔ غرضیکہ صحابہ میں سے کوئی بھی حضرت ابن عباس کے قول کی تائید نہیں کرتا۔ قاضی عیاض کہتے ہیں۔

" ابن عباسؓ کے سوا کسی صحابی نے یہ روایت بیان نہیں کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا۔ اس کے برعکس حضرت میمونہؓ، حضرت ابو رافع اور دوسرے صحابہ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے غیر محرم ہونے کی حالت میں حضرت میمونؓ سے نکاح کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ شریک واقعہ ہونے کے اعتبار سے ان کی بات صحیح تر ہے۔" (یہ بات امام نووی نے شرح مسلم میں قاضی عیاض سے نقل کی ہے)

یہاں ایک اور تاویل کی بھی گنجائش ہے جو میں نے اپنے مرحوم استاد علامہ امین ابن شنقیطی سے اصول الفقہ کے درس کے دوران سنی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ تعارض کے وقت پہلے صحیحین کو دوسری کتب کے مقابلے میں ترجیح دی جائے گی۔ اس کے بعد صحیح بخاری کو اور پھر صحیح مسلم کو۔

انھوں نے فرمایا کہ صحیح مسلم کی روایت کو سند کے لحاظ سے دوسری روایات کے مقابلہ میں ترجیح دی جائے گی مگر اس کے معنی کی تاویل کی جائے گی اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کی تکمیل کے بعد حرم میں تشریف فرما تھے اور ابھی آپؐ نے احرام کا لباس نہیں اتارا تھا چنانچہ آپؐ نے اسی حالت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا۔ ابن عباسؓ اس وقت چھوٹی عمر کے تھے اس لیے انھوں نے سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں نکاح کیا ہے۔ اس وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ میرے نزدیک یہ تاویل نہایت عمدہ ہے۔

سرف :- (بفتح الاول وکسر الثانی) ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور بعض کے نزدیک سات یا نو یا بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ (معجم البلدان ج ۳ ص ۲۱۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یہاں اس باب کا اختتام ہوتا ہے۔ نسخہ حرم مکی کے علاوہ دوسرے نسخوں میں مندرجہ ذیل اضافہ پایا جاتا ہے:

"ابن المواز اپنی کتاب میں امام مالک کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء والے سال مکہ میں حضرت میمونہؓ کے ساتھ نکاح کیا تو قریش نے آپ کو حضرت میمونہؓ کو مکہ میں اپنے گھر میں لانے سے روک دیا، چنانچہ آپ مکہ سے باہر تشریف لے گئے اور مقام سَرِف میں حضرت میمونہؓ کی رخصتی ہوئی۔"

میں کہتا ہوں کہ جیسا کہ زیلعیؒ نے نصب الرایۃ (۲-۱۷۳) میں لکھا ہے کہ ابن حبان کی روایت یہ ہے کہ حضورؐ نے تین دن مکہ میں قیام کیا۔ پھر اہل مکہ نے آپ سے مکہ چھوڑنے کی درخواست کی اور آپ مکہ سے باہر سَرِف نامی مقام پر تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے میمونہؓ کو اپنے گھر میں بسایا۔ اندریں حالت کہ حضورؐ اور میمونہؓ دونوں حلال (غیر محرم) تھے۔ ابن عباسؓ نے تو نفسِ عقد کا تذکرہ کیا۔ جب کہ حضرت میمونہؓ نے پورا پورا واقعہ بیان کیا۔ اسی طرح ابورافع نے جو حضورؐ اور حضرت میمونہؓ کے مابین قاصد کے فرائض انجام دیتے تھے پورا واقعہ بیان کیا۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالتِ احرام میں نکاح سے منع کرنے اور حضرت میمونہؓ سے نکاح کرنے میں بظاہر دکھائی دینے والے تعارض کی حقیقت کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں ہمارا نقطۂ نظر کتنا صحیح ہے۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب وہ ہے جو امام محمد نے "الحجۃ" (۲-۲۰۹) میں لکھا ہے۔ آپ کہتے ہیں:

"امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ محرم اپنا نکاح بھی کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کا بھی، مگر جو شخص حالتِ احرام میں نکاح کرے اسے اس بات کی اجازت نہیں کہ اپنی بیوی کا بوسہ لے یا اس کے ساتھ مباشرت کرے۔ غرض یہ کہ ایک غیر مُحرِم شخص اپنی بیوی کے ساتھ جو بوس و کنار وغیرہ کر سکتا ہے مُحرِم نکاح کرنے کی صورت میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

مگر جمہور فقہاء اس ضمن میں امام ابوحنیفہ کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ حضورؐ نے مُحرِم کو اپنا اور کسی دوسرے کا نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔

بیویوں کی باری کی تقسیم کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمِّ سلمہؓ سے نکاح کیا تو تین روز ان کے یہاں قیام

۱؎ باری سے مقصود یہ ہے کہ مختلف ازواج سے تمتع میں مساوات کو ملحوظ رکھا جائے۔ تمتع (فائدہ حاصل کرنا) سے محبت اور جماع دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ کمالِ عدل کے تقاضے اسی طرح پورے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسی مساوات پر قادر نہ ہو تو اس پر کوئی گرفت نہیں۔ کیونکہ تمتع کے محرک شہوت اور محبت کے جذبات ہیں جو کہ اختیاری چیز نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ (سورة النساء - ۱۲۹) (اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان انصاف قائم نہیں رکھ سکتے اگرچہ تم اس کے حریص ہو)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے جو میرے بس میں ہے اور جو چیز میرے اختیار میں نہیں بلکہ تیرے اختیار میں ہے تو اس پر مجھے ملامت نہ کر"

اس حدیث کی صحت کے بارے میں بخاری و مسلم دونوں متفق ہیں۔

اسی لیے اہل علم کا قول ہے کہ باری کی تقسیم میں جماع شرط نہیں۔ اس لیے کہ جماع کی محرک شہوت ہے اور شہوت کا میلان بعض ازواج کی طرف زیادہ ہوتا ہے بعض کی طرف کم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہوت کے محرکات حسن و جمال اور خوش اخلاقی ہیں جو کہ سب عورتوں میں یکساں طور پر نہیں پائے جاتے، تاہم یہ بات مستحب ہے کہ جماع کے سلسلے میں بھی عورتوں سے یکساں سلوک کیا جائے۔ کیونکہ باری سے مقصود دراصل یہی ہے۔ بہر حال اگر کوئی شخص ایک عورت کے ساتھ اس کی باری میں جماع کرے اور دوسری کی باری میں نہ کرے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا۔

جہاں تک ازواج کے گھروں میں آنے جانے کا اور ان کو لوازم حیات مہیا کرنے کا تعلق ہے تو اس میں مساوات لازم ہے چاہے کوئی عورت بیمار یا حیض و نفاس کی حالت میں ہی کیوں نہ مبتلا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں وعید بھی منقول ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

"جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں عدل کے تقاضے پورے نہ کرتا ہو تو قیامت کے روز وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ گر چکا ہوگا"۔

دیکھیے ترمذی (۳ - ۴۴۷) کتاب النکاح "باب التسویة بین الضرائر - الحاکم فی "المستدرک" (۲ - ۱۸۶) اور ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"پھر وہ ایک عورت کی جانب جھک گیا، تو قیامت کے دن وہ اس حالت میں آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ گرا ہوا ہوگا"۔

۲؎ صحیح مسلم (۲ - ۱۰۸۳) کتاب "النکاح" باب "قدر ما تستحقه البکر والثیب من اقامة الزوج عندها عقب الزفاف" مسلم نے یہ حدیث متعدد سندوں کے ساتھ روایت کی ہے۔ موطا امام مالک (۲ - ۵) کتاب النکاح باب "المقام عند البکر والأیم"

کیا۔ جب ان کے گھر سے جانے کا ارادہ کیا تو حضرت ام سلمہؓ نے آپ کا دامن تھام لیا۔ اس وقت آپ نے فرمایا۔ "تمہاری وقعت[1] تمہارے گھر والوں کے دل میں کچھ کم نہیں، لیکن اگر میں تمہارے یہاں سات دن قیام کروں تو دوسری بیویوں کے یہاں بھی اتنے اتنے روز ہی ٹھہروں گا اور اگر تم چاہو تو تین روز تمہارے ہاں قیام کروں اور پھر اگلی باری پر تمہارے پاس آجاؤں"۔

حضرت ام سلمہؓ نے کہا "نہیں، بلکہ تین دن ہی مناسب ہیں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کنواری کے لیے سات شب و روز اور بیوہ کے لیے تین دن رات[2] ہیں۔

ابوداؤد (۲ – ۲۴۰) کتاب "النکاح" باب "المقام عند البکر"۔ ابن ماجہ (۱ – ۶۱۷) کتاب "النکاح" باب "الاقامۃ علی البکر والثیب" الدارمی (۲ – ۱۴۴) – کتاب "النکاح" باب الاقامۃ عند الثیب والبکر۔

[1] یعنی تمہیں رسوا نہیں کیا جائے گا نہ تمہارا حق ضائع ہوگا، بلکہ تم اسے لے کر رہوگی۔ قاضی عیاض کہتے ہیں "اہل خانہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔ کی اپنی ذات مراد ہے۔ اور آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے ایسا سلوک نہیں کروں گا جس سے تمہاری رسوائی ہو۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے یہاں تین دن قیام کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہاری اہمیت میرے نزدیک کم ہے یا میں تمہاری جانب رغبت نہیں رکھتا۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر پہلے بیوی موجود ہو اور بعد ازاں دوسری بیوی سے نکاح کیا جائے تو رخصتی کے موقع پر اس کا حق دیگر ازواج کے مقابلہ میں فائق ہوگا۔ اگر وہ دوشیزہ ہو تو خاوند اس کے یہاں سات شب و روز قیام کرے گا۔ اور یہ سات ایام دوسری ازواج کو نہیں دیے جائیں گے۔ اور اگر بیوہ سے نکاح کرے تو عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو خاوند اس کے یہاں سات دن قیام کرے گا۔ پھر اسی طرح باقی بیویوں کے یہاں بھی سات سات دن بسر کرنا ہوں گے۔ اور اگر وہ چاہے تو تین دن رات اس کے پاس گزارے اور یہ تین شب و روز دوسری بیویوں کو نہیں دیے جائیں گے، بلکہ یہ اس کا خصوصی حق شمار ہوگا۔

یہ امام شافعی، مالک اور احمد بن حنبل کا مسلک ہے احادیث صحیحہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ نئی بیوی دوشیزہ ہو یا بیوہ ہو یا مطلقہ، ہر حالت میں مساوات ضروری ہے۔ جس بیوی سے نیا نکاح ہوا ہو اس کے لیے کوئی خصوصی رعایت نہیں ہے۔ ان کی دلیل وہ نصوص ہیں جو کتاب و سنت میں عدل سے متعلق وارد ہوئی ہیں۔ جبکہ اولی الذکر مسلک والوں کی دلیل یہ ہے کہ عدل کے بارے میں وارد شدہ احکام کو یہ احادیث خاص کر رہی ہیں۔ (شرح مسلم للنووی (۱۰ – ۴۴) اور شرح فتح القدیر (۲ – ۵۱۲)

طحاوی ام سلمہؓ سے مروی حدیث کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اہل علم کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ سے کہا کہ اگر میں تمہارے یہاں سات شب و روز قیام کروں گا تو دوسری ازواج کے یہاں بھی اسی قدر ٹھہرنا ہوگا تو اس سے حضور کا مطلب یہ تھا کہ میں تمہارے اور دوسری بیویوں کے درمیان انصاف کروں گا۔ اور ہر ایک کے یہاں اتنا ہی ٹھہروں گا جتنا تمہارے یہاں۔ علیٰ ہذا القیاس جب آپ نئی منکوحہ بیوی کے یہاں تین شب و روز قیام کریں گے تو باقی بیویوں کے یہاں بھی اسی قدر ٹھہریں گے۔ اور جب ایک کے یہاں سات دن کا قیام ہے تو دیگر ازواج کے یہاں بھی اتنا ہی ہوگا۔ اور اگر تین روز ہے تو باقی سب کے یہاں بھی تین تین دن ہوگا۔ (شرح معانی الآثار (۳ – ۲۹)

[2] موطا امام مالک (۲ – ۵) کے مطابق امام مالک

عبدالملک بن حبیب کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے درمیان عدل ومساوات کا احسان کے طور پر لحوظ رکھا کرتے تھے[1] ورنہ آپ پر عدل کرنا واجب نہ تھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ۖ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا۔ (الاحزاب - ۵۱)

اور تم کو یہ بھی اختیار ہے کہ جس بیوی کو چاہو علیحدہ رکھو اور جسے چاہو اپنے پاس رکھو۔ اور جس کو تم نے علیحدہ کر دیا ہو اگر اس کو پھر اپنے پاس طلب کر لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ اجازت اس لیے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمناک نہ ہوں اور جو کچھ تم ان کو دو اسے لے کر سب خوش رہیں اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خدا اسے جانتا ہے اور خدا جاننے والا اور بُردبار ہے۔

حمید الطویل سے روایت کرتے ہیں اور وہ انسؓ بن مالک سے۔ موطا کتاب "النکاح" باب "المقام عند البکر والأیّم"

امام مالک فرماتے ہیں:

"اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ نکاح کرے اور اس سے پہلے بھی اس کی کوئی بیوی موجود ہو، تو خاوند چند ایام نئی بیوی کے ساتھ بسر کرے گا اور اس کے بعد مختلف بیویوں کی باری کا آغاز کرے گا۔ یہ دن جو اس نے نئی بیوی کے ساتھ گزارے ہوں گے وہ باری میں شمار نہیں کیے جائیں گے بلکہ نئی بیوی باقی بیویوں کے ساتھ اپنی باری برابر لے گی۔"

دارمی (۲ - ۱۴۴) نے یہ حدیث ابوقلابہ سے روایت کی ہے اور وہ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ دیکھیے دارمی کتاب "النکاح" باب "اذا یتزوج الثیب علی البکر" حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ جب کوئی شخص کسی کنواری سے نکاح کرے جبکہ اس کی پہلی بیوی اس سے نکاح کے وقت کنواری نہ ہو تو وہ نئی بیوی کے یہاں سات شب و روز قیام کرے۔ پھر اس کے بعد سب بیویوں کی باری کا آغاز کرے۔ اور جب کسی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح کرے اور پہلے اس کے یہاں وہ بیوی ہو جو نکاح کے وقت کنواری تھی تو اس نئی بیوی کے ہاں تین شب و روز بسر کرے۔ اور پھر سب کی باریوں کا آغاز کرے۔"

ابوقلابہ کہتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ حضرت انسؓ نے یہ حدیث مرفوعاً روایت کی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت پہلے گزر چکی ہے۔ اس میں خالد الحذاء نے وہی بات کہی جو ابوقلابہ نے اس حدیث میں کہی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ "تلخیص الحبیر" (۲ - ۲۰۲) میں فرماتے ہیں کہ کسی حدیث کا راوی جب یہ کہے کہ فلاں بات سنت ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حدیث مرفوع ہے۔ (دیکھیے تدریب الراوی للسیوطی ص ۱۲۱)

[1] حتیٰ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوتے تو آپ کی چارپائی اٹھا کر اس بیوی کے گھر تک پہنچائی جاتی جس کی باری ہوتی تھی۔ اس طرح آپ باری کی تقسیم میں عدل ومساوات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے تھے۔ یہ مسند احمد کی روایت ہے۔ حافظ ابن حجر

حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور ضحاک سے مروی ہے کہ مندرجہ بالا آیت مندرجہ ذیل آیت کی ناسخ ہے۔ اگرچہ یہ آیت ترتیب کے اعتبار سے پیچھے ہے:

ارشاد باری ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا[۱] (سورۃ الاحزاب: ۵۲)	(اے پیغمبر) ان کے سوا اور عورتیں تمھارے لیے جائز نہیں اور نہ یہ کہ ان بیویوں کو چھوڑ کر اور بیویاں اختیار کرو خواہ اُن کا حسن تم کو کیسا ہی اچھا لگے مگر وہ جو تمھارے دائیں ہاتھ کا مال ہیں (یعنی لونڈیوں کے بارے میں تم کو اختیار ہے) اور خدا ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو آیت ترتیب میں پہلے ہے وہ دوسری آیت کو منسوخ کرے۔ اکثر و بیشتر دوسری آیت پہلی کو منسوخ کرتی ہے۔ اسی سے ملتی جلتی سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۳۴ ہے جس میں فوت شدہ خاوند والی عورت کی عدت چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے۔ یہ آیت ترتیب میں مقدم ہونے کے باوجود اسی سورہ کی بعد والی آیت نمبر ۲۴۰ کی ناسخ ہے[۴]

نے یہ بات "المطالب العالیۃ" (۲-۸) میں لکھی ہے۔ البوصیری کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

[۱] ملاحظہ ہو نحاس کی "الناسخ والمنسوخ" (ص ۲۰۹)

[۲] النحاس لکھتے ہیں:

بعض کوفی فقہا نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو آیت ترتیب میں مقدم ہے وہ بعد والی آیت کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ پھر اس مسلک کی ان الفاظ میں تردید کرتے ہیں:

یہ اختلاف درست نہیں۔ اس لیے کہ پورا قرآن مجید ماہ رمضان میں پہلے آسمان پر نازل ہو گیا تھا، لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ جو آیت ترتیب میں پہلے ہے وہ بعد میں آنے والی آیت کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔

[۳] ابوالقاسم سلامہ اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" (ص ۷۴-۷۵) میں لکھتے ہیں:

"یہ عجیب بات ہے کہ جو آیت ناسخ ہے وہ ترتیب میں منسوخ سے پہلے ہے۔"

امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو آپ کے لیے حلال کر دیا تھا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ام سلمہؓ والی روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ محرم خواتین کو چھوڑ کر باقی سب عورتیں آپ کے لیے حلال تھیں۔ اس کی دلیل سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۵۰ ہے۔ گویا حضرت ام سلمہؓ نے اس آیت کو بعد والی آیت (یعنی آیت نمبر ۵۲) کی ناسخ قرار دیا۔ دیکھیے ابن کثیر (۳-۵۲۳)

[۴] ناسخ سورۃ البقرہ کی مندرجہ ذیل آیت ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا	اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں

جن میں فوت شدہ خاوند والی عورت کو سال بھر انتظار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔
مؤطا امام مالک (کتاب النکاح) اور المدونہ میں امام ابن شہاب زہری سے مروی ہے کہ

يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا	تو عورتیں چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں۔
فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا	اور جب (یہ) عدت پوری کر چکیں اور اپنے حق میں
فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ط وَاللَّهُ بِمَا	پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کر لیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں
تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (البقرة : ۲۳۴)	اور خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔

اور منسوخ مندرجہ ذیل آیت ہے:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا	اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں
وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ	وہ اپنی عورتوں کے حق میں وصیت کر جائیں کہ ان کو
إِخْرَاجٍ (سورۃ البقرۃ - ۲۴۰)	ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔

ابو عُبید سلامہ "الناسخ والمنسوخ" (ص ۴۶) میں لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص مرجاتا اور بیوی چھوڑ جاتا تو سال بھر تک اس کے مال میں سے بیوی پر خرچ کیا جاتا تھا اور وہ عورت اس کی عدت میں ہوتی تھی بشرطیکہ وہ گھر سے نہ نکلے۔ اور اگر وہ گھر سے نکل جاتی تو عدت ختم ہو جاتی اور اسے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ جب میت کو فوت ہوئے ایک سال گزر جاتا تو عورت ایک مینگنی لیتی اور اسے کُتے کے منہ پر دے مارتی۔ یہ فعل ان کے یہاں عدت ختم ہونے کا نشان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا جو ترتیب میں اس سے مقدم ہے۔ اس میں بیوہ ہونے والی عورت کی عدت چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے۔ اس طرح سال بھر کی عدت کا حکم منسوخ ٹھہرا۔ قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں ناسخ مقدم ہو اور منسوخ مؤخر۔ اس سے مستثنیٰ صرف دو مقامات ہیں؛ ایک سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۳۴ کہ جو ناسخ ہے اور آیت نمبر ۲۴۰ منسوخ ہے اور دوسری سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۵۱ ناسخ اور آیت نمبر ۵۲ منسوخ ہے۔"

ملاحظہ ہو مؤطا امام مالک (۲-۱۵) کتاب النکاح باب "جامع النکاح" یہ حدیث ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اپنی اسناد کے مطابق عن زہری عن سعید بن المسیب وسلیمان بن یسار اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ روایت کی ہے۔ طبری لکھتے ہیں:
رافع بن خدیج کی ایک معمر بیوی تھی۔ رافع نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی اور اس سے ترجیحی سلوک روا رکھنا شروع کیا۔ پہلی بیوی کو یہ صورت ناگوار محسوس ہوئی۔ اس پر رافع نے اس کو ایک طلاق دے دی۔ جب تھوڑی سی عدت باقی رہی تو بیوی سے کہا اگر تم چاہو تو میں تم سے رجوع کر لوں مگر تمہیں وہ ترجیحی سلوک برداشت کرنا ہوگا۔ باہم رضا مندی سے رافع نے رجوع کر لیا اور اس کے بعد ترجیحی سلوک جاری رکھا لیکن پہلی بیوی پھر صبر نہ کر سکی۔ رافع نے اسے ایک اور طلاق دے دی اور ترجیحی سلوک پھر بھی جاری رکھا۔ ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ یہی وہ مصالحت ہے جس کے بارے میں مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی تھی:

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ — اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی

رافع بن خدیج نے ایک نوجوان لڑکی[2] سے شادی کی۔ قبل ازیں محمد بن سلمہ کی بیٹی ان کے نکاح میں تھی جو بوڑھی ہو چکی تھی۔ رافع نوجوان بیوی سے ترجیحی سلوک[3] کرنے لگے تو پہلی بیوی نے عدالتِ نبوی میں حاضر ہو کر فریاد کی۔ حضورؐ نے فرمایا: "اے رافع! یا تو دونوں سے انصاف کرو ورنہ بوڑھی کو چھوڑ دو۔"

رافع نے آخری مرتبہ پہلی بیوی سے یہ بات کہی کہ "اگر اس ترجیحی سلوک کے باوجود جو تم دیکھ رہی ہو ٹھہرنا پسند کرو تو ٹھہرو۔ اور اگر چاہو تو میں تمھیں چھوڑ دوں۔"

رافع کہتے ہیں کہ اسی ضمن میں سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۲۸[4] نازل ہوئی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے؛ چنانچہ ان

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ (النساء - ۱۲۸)

یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں اور صلح خوب چیز ہے۔

حاکم نے یہ حدیث "المستدرک" (۲ - ۳۰۸) میں روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق ہے، مگر امام بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ بیہقی (۷ - ۲۹۶) نے یہ حدیث دوسری سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[1] ان کا نام و نسب رافع بن خدیج بن رافع بن عدی الحارثی الاوسی الانصاری ہے۔ انھوں نے پہلے پہل غزوۂ اُحد میں شرکت کی اور پھر غزوۂ خندق میں۔ ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں وفات پائی۔

[2] مجھے اس لڑکی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

[3] ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:۔

یہاں ترجیحی سلوک سے مراد طبعی میلان و رجحان ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رافعؓ کھانے پینے، لباس اور دوسرے معاشرتی امور میں بھی نوجوان بیوی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے کہ رافع جیسے شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ دیکھیے زرقانی کی شرح مؤطا (۴ - ۶۵)

[4] حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ بوڑھی ہو گئیں تو انھیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق نہ دے دیں۔ انھوں نے آپؐ سے عرض کیا کہ مجھے طلاق نہ دیجیے بے شک میری باری مجھے نہ دیں۔" چنانچہ آپؐ نے ایسے ہی کیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ جیسا کہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ ابو داؤد طیالسی نے بھی اس کو اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ دیکھیے "منحۃ المعبود" (۲ - ۱۷) ترمذی (۵ - ۲۴۹) کتاب التفسیر اور بیہقی فی السنن (۳ - ۲۹۷) ان سب کے الفاظ یہ ہیں:

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے کہا "مجھے طلاق نہ دیجیے، مجھے یہاں ہی رہنے دیجیے۔ میں اپنی باری کا دن عائشہؓ کو دیتی ہوں۔" چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب کے درجہ کی ہے۔

حضرت سودہ کا اصل واقعہ صحیحین میں مذکور ہے، چنانچہ صحیح بخاری کتاب "النکاح" باب "المرأۃ تھب یومھا من زوجھا لضرتھا" میں مالک بن اسماعیل سے مروی ہے۔ وہ زہیر سے وہ ہشام سے وہ اپنے والد سے اور وہ حضرت عائشہؓ

کی وہ بیوی مصالحت پر راضی ہوگئی اور رافعؓ کے یہاں رہنے لگی۔

یہ المدوّنہ کے الفاظ ہیں۔ مؤطا امام مالک میں یہ مذکور نہیں کہ اس ضمن میں یہ آیت نازل ہوئی۔ النحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔

سے روایت کرتے ہیں کہ سودہؓ بنت زمعہ نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہؓ کو دے دیا۔ اس کے نتیجے میں حضورؐ حضرت عائشہؓ کے یہاں دو دن قیام فرماتے۔ ایک دن حضرت عائشہؓ کا اور ایک دن سودہؓ بنت زمعہ کا۔

صحیح مسلم کتاب النکاح میں اس امر کی تصریح ہے کہ جب سودہؓ بوڑھی ہوگئیں تو انھوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی۔ ابوداؤد کی روایت اس سے بھی واضح تر ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ جب سودہؓ بوڑھی ہوگئیں اور انھیں اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں ان کو طلاق نہ دے دیں تو انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں اپنی باری عائشہؓ کو دیتی ہوں۔ آپؐ نے ان کی یہ بات تسلیم کر لی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

رضاعی رشتوں کی حرمت کا حکم

صحیح بخاری[1] میں حضرت ام حبیبہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپؐ ابوسفیان کی بیٹی میں کچھ رغبت رکھتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کیا مطلب؟ میں نے عرض کی۔ آپؐ اس سے نکاح کر لیں۔" فرمایا کیا تمھیں یہ بات پسند ہے؟ میں نے کہا۔ آپ کی زوجیت کے شرف میں میں تنہا تو نہیں ہوں۔ لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ اس شرف میں میری بہن بھی میرے ساتھ شریک ہو۔

آپؐ نے فرمایا۔ تمھاری بہن میرے لیے حلال نہیں۔" میں نے کہا۔" مجھے پتہ چلا ہے کہ آپؐ درّہ[2] کا رشتہ طلب کرتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا۔" کیا تمھاری مراد درّہ بنت امّ سلمہ سے ہے؟" میں نے کہا جی ہاں!" آپؐ نے فرمایا۔ اگر درّہ میری بیوی کی بیٹی نہ ہوتی تب بھی وہ میرے لیے حلال نہ تھی[3]۔ اس لیے کہ وہ میرے رضاعی بھائی ابوسلمہؓ کی بیٹی ہے۔ مجھے اور درّہ کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب "النکاح" باب "یحرم من الرضاع من یحرم من نسب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۱۰۱) اس حدیث کے بعض حصے فتح الباری میں مندرجہ ذیل نمبروں کے حامل ہیں (۵۱۰۶، ۵۱۲۳، ۵۳۷۲)

صحیح مسلم (۲-۱۰۷۲) کتاب "الرضاع" باب "تحریم الربیبة واخت المرأة" مسلم نے یہ حدیث متعدد سندوں کے ساتھ روایت کی ہے۔ بعض روایات میں اس کا نام عزّہ مذکور ہے۔ نیز دیکھیے نسائی (۶-۹۵) کتاب "النکاح" باب "تحریم الجمع بین الام والبنت"۔ مصنف عبدالرزاق (۷-۴۷۵)

[2] بعض نسخوں میں ذرّہ بالذال ہے جو تمام سیرت نگاروں کے نزدیک غلط ہے۔ صحیح نام "درّہ بنت ابی سلمہؓ" ہے۔ ان کے بارے میں مزید کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

[3] قرطبی لکھتے ہیں:

"اس حدیث میں ایک حکم کی دو علتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلے حُرمت کی وجہ یہ بیان کی کہ وہ آپؐ کی ربیبہ یعنی بیوی کی بیٹی ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ آپؐ کے رضاعی بھائی کی بیٹی ہیں۔ حافظ ابن حجر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فتح الباری (۹-۱۴۴) میں لکھتے ہیں:

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ حُرمتِ نکاح کی اگر ایک وجہ ہوتی تو بھی کافی تھی، مگر یہاں تو ایک نہیں بلکہ دو مانع جمع ہو گئے تھے۔ کسی شے میں دو علتوں کے وجود کا یہ مطلب نہیں کہ حکم کو دونوں میں سے کسی علت کی جانب انفرادی طور پر بھی منسوب کیا جاتا ہے، مگر جب دونوں اوصاف یکے بعد دیگرے پائے جائیں تو دونوں میں سے جو وصف پہلے ہے حکم کو اس کی طرف منسوب کیا جائے گا جس طرح دو سبب جمع ہو جائیں تو حکم کو پہلے سبب کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔"

باپ ابوسلمہ کو ثُوَیبہ نے دودھ پلایا تھا۔ پس اپنی بہنیں اور بیٹیاں مجھے پیش نہ کرو۔
عُروہ کہتے ہیں کہ ثُویبہ ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی تھی۔ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا تھا۔ جب ابولہب مرگیا تو اس کے اہل خانہ میں سے بعض نے خواب میں اسے بہت بری حالت میں دیکھا۔ اس نے ابولہب سے پوچھا۔ "تمھارا کیا حال ہے؟" ابولہب نے کہا "تمھارے بعد مجھے آرام نہیں پہنچا۔ بجز اس کے کہ ثُویبہ کو آزاد کرنے کی وجہ سے مجھے تھوڑا سا پانی پلایا گیا تھا۔ عبداللہ بن ابی ملیکہ التیمی المکی سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:۔

ثُوَیبہ:۔ حافظ ابن مَندہ نے اس کو صحابیات میں شمار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے نام میں اختلاف ہے۔ ابونُعیم کہتے ہیں:۔
ہمیں نہیں معلوم کہ ابن مندہ کے سوا کسی نے ان کا نام ذکر کیا ہو۔ کتب سیرت میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ جب حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تو ثُوَیبہ آپؐ کے یہاں آیا کرتی تھیں۔ آپؐ مدینہ سے ان کو تحائف بھیجا کرتے تھے۔ خیبر فتح ہونے کے بعد ثُوَیبہؓ نے وفات پائی اور ان کا بیٹا مَسروح بھی فوت ہوگیا۔" فتح الباری (۹ - ۱۴۵)

مصنف عبدالرزاق (۷ - ۴۷۸) میں "یعتقی" کا لفظ ہے یعنی ثُوَیبہ کو آزاد کرنے کی وجہ سے حافظ ابن حجر فتح الباری (۹ - ۱۴۵) میں لکھتے ہیں:
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں کافر کو بھی اس کے نیک اعمال کا فائدہ پہنچتا ہے، مگر یہ بات مندرجہ ذیل آیت کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (الفرقان - ۲۳)	اور جو عمل انھوں نے کیے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک بنا دیں گے۔

۱- اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ عروہ نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ حدیث انھوں نے کسی سے روایت کی ہے؟ اور اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ حدیث متصل ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ خواب کا واقعہ ہے اس لیے حجت نہیں ہے۔ مزید یہ کہ جس شخص نے ابولہب کو خواب میں دیکھا تھا وہ ہنوز اسلام نہیں لایا تھا، لہٰذا اس کے قول سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

۲- دوسرا جواب یہ ہے کہ ابولہب کے عذاب میں یہ تخفیف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی بنا پر ابوطالب کے عذاب میں تخفیف کی گئی اور ان کو گہری آگ سے نکال کر پایاب آگ کی طرف منتقل کردیا گیا۔ کچھ اور احتمالات بھی ہیں جن کا تذکرہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیا ہے، لہٰذا مزید مطالعہ کے لیے فتح الباری سے رجوع کریں۔

ابن ابی ملیکہ کا نام عبداللہ بن عُبَیداللہ بن ابی مُلیکہ ہے۔ ان کو ابو محمد التیمی المکی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ کی طرف سے قاضی مقرر ہوئے تھے۔ یہ عبادلۂ اربعہ (عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عمرؓ رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں۔ ثقہ تابعین میں سے ہیں۔ ۱۱۷ھ میں یا اس کے بعد وفات پائی۔

مجھے عُبَید بن ابی مریم[1] نے عقبہ بن حارث[2] سے سُن کر بتایا ——— ابن ابی مُلیکہ کہتے ہیں میں نے عقبہ سے براہِ راست بھی یہ حدیث سنی ہے مگر عُبَید سے سُنی ہوئی روایت مجھے اچھی طرح یاد ہے[3] ——— عقبہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت[4] سے نکاح کیا۔ پھر ایک سیاہ فام عورت[5] آئی اور اس نے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ میں نے آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ یا رسُول اللہ! میں نے فلاں کی بیٹی فلاں سے نکاح کیا تھا، لیکن ہمارے یہاں ایک سیاہ فام عورت آئی اور اس نے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ میرے خیال میں وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ سُن کر آپؐ نے منہ

---

[1] عُبَید بن ابی مریم المکی سے امام بخاری نے صرف یہی ایک حدیث روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب حدیث میں ان کی صرف یہی ایک روایت موجود ہے۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

[2] عقبہ بن حارث قرشی النوفلی ابوسروعہ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ بعض محدثین کے نزدیک ابوسروعہ ان کے بھائی کی کنیت ہے، مگر ابوحاتم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ ابوسروعہ عقبہ ہی کی کنیت ہے۔ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کو انہی نے قتل کیا تھا۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ سے روایت کی ہے۔

[3] بعض نسخوں میں "عُبَید کی حدیث" کے بجائے "عقبہ کی حدیث ہے مگر صحیح "عُبَید کی حدیث" ہی ہے، چنانچہ دوسرے نسخوں میں یہی ہے۔ صحیح بخاری میں ابن ابی مُلیکہ براہِ راست عقبہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں عُبَید بن ابی مریم کا واسطہ نہیں ہے۔ امام بخاری کتاب "الشهادات" باب "شهادة المرضعة" میں لکھتے ہیں کہ میں نے ابوعاصم سے سُنا انھوں نے عمر بن سعید سے وہ ابن ابی ملیکہ سے اور وہ عقبہ بن حارث سے روایت کرتے ہیں۔ قبل ازیں امام بخاری نے باب "الإماء والعبيد" میں تصریح کی ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے یہ حدیث عقبہؓ سے روایت کی۔ امام بخاری لبطریق علی بن عبداللہ عن یحیٰی بن سعید عن ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابن ابی ملیکہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے عقبہ بن حارث نے حدیث سنائی یا میں نے اُن سے سنا۔ پھر پوری حدیث بیان کی۔ اس روایت میں انھوں نے اس عورت کی کنیت ام یحییٰ بنت ابی اہاب ذکر کی ہے۔ کتاب "العلم" باب "الرحلة فی المسئلة النازلة" میں امام بخاری نے یہ اضافہ کیا ہے۔ "ام یحییٰ بنت ابی اہاب بن عزیزہ"۔

بخاری میں عُبَید بن ابی مریم کی روایت کردہ حدیث کے اندر ضعف کا جو احتمال پایا جاتا ہے اس سے اُس کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے۔ ضعف کی وجہ یہ ہے کہ بخاری میں عُبَید بن ابی مریم سے منقول اور کوئی روایت موجود نہیں۔ اسی بنا پر متاخرین نے بخاری کی اس روایت پر نقد و جرح کی ہے، مگر مذکورہ صدر تصریح کے بعد ضعف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مزید براں اس حدیث کو عبدالرزاق نے المصنف (۷-۴۸۱) میں، ابن الجارود نے "المنتقیٰ" (ص ۲۴۶) میں اور ابوداؤد نے "السنن" میں روایت کیا ہے۔

[4] اس عورت کا نام غنیہ اور کنیت اُمِّ یحییٰ ہے۔ نسائی نے اس کا نام زینب بتایا ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ غنیہ اس کا لقب ہو۔ نام کچھ اور ہوگا جو بعد ازاں تبدیل ہو کر زینب ہو گیا جس طرح عورتوں کے نام تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ فتح الباری (۵-۲۶۸)

[5] حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ مجھے اس عورت کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

موڑ لیا۔ میں سامنے کی طرف سے آپؐ کے سامنے آیا اور عرض کیا کہ وہ جھوٹی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم اپنی بیوی کو اپنے گھر میں کیسے آباد کر سکتے ہو جب کہ وہ عورت اس بات کی مدعی ہے کہ اس نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ اپنی بیوی کو اپنے سے الگ کر دو۔"

"المدونہ"[1] میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے رضاعت کے بارے میں ایک عورت کی شہادت کو قبول نہیں کیا تھا۔

---

[1] المدونہ (۲-۴۱۲) میں پورا واقعہ یوں ہے کہ ایک شخص حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس ایک عورت کو لایا اور اس نے کہا۔ "امیرالمومنین! یہ عورت کہتی ہے کہ اس نے مجھے اور میری بیوی کو دودھ پلایا ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اس نے میری بیوی کو دودھ پلایا ہے۔ مگر یہ بات معلوم نہیں کہ اس نے مجھے بھی دودھ پلایا تھا" حضرت عمرؓ نے اس عورت سے دریافت کیا کہ تو نے اس آدمی کو کیسے دودھ پلایا تھا؟ اس عورت نے کہا" میرا اس کے پاس سے گزر ہوا اور یہ بیٹھا رو رہا تھا (اپنے بچپن کے زمانہ میں) اس کی ماں روٹی پکا رہی تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور دودھ پلا کر خاموش کر دیا" حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس عورت کو کوڑے لگائے جائیں اور اس شخص کو حکم دیا کہ اپنی بیوی کے پاس چلے جاؤ۔

سحنون قاسم کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ امام مالک نے فرمایا:

امام مالک کا فتویٰ اس صورت میں خاوند سے کہا جائے گا کہ اگر تمھیں اس عورت پر اعتماد ہے کہ اس نے فی الواقع تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اس عورت سے الگ ہو جاؤ اور اسے اپنے نکاح میں نہ رکھو لیکن صرف ایک عورت کی شہادت کی بنا پر قاضی زوجین میں تفریق نہ کرے اگرچہ گواہی دینے والی عورت ثقہ اور راست باز ہی کیوں نہ ہو۔

امام شافعی کہتے ہیں کہ میرے علم کی حد تک اہل علم میں سے کوئی بھی اس بات کا مخالف نہیں ہے کہ ایسے امور میں جنھیں محرم کے سوا کسی مرد کو بھی دانستہ طور پر دیکھنے کی اجازت نہیں، عورت کی شہادت جائز ہے۔ مثلاً عورت کی ولادت یا اس کا وہ عیب جو اس کے کپڑوں کے نیچے ہے اور میرے نزدیک رضاعت کا بھی یہی حکم ہے۔ عورت کے محرم اور خاوند کے سوا کوئی بھی شعوری طور پر عورت کی چھاتیوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور عورت کے دودھ پلانے کی شہادت اس کی چھاتی کو دیکھے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے عورتوں کی شہادت رضاعت کے بارے میں اسی طرح درست ہے جس طرح ولادت کے بارے میں ان کی شہادت جائز ہے۔ (کتاب الام للشافعی (۵-۴۴))

احناف کا مسلک حنفیہ کے نزدیک رضاعت کی شہادت کا نصاب دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے کم تر درجہ کی شہادت قابل قبول نہیں۔ صرف عورتوں کی شہادت بھی غیر مقبول ہے۔ دلیل کے طور پر وہ بیان کرتے ہیں کہ امام محمد بن حسن نے عکرمہ بن خالد مخزومی سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ رضاعت کے بارے میں دو گواہوں کی شہادت سے کم درجہ کی شہادت قبول نہ کی جائے۔" یہ بات آپؓ نے صحابہ کی موجودگی میں کہی اور کسی صحابی نے اس کی مخالفت نہ کی۔ اس طرح اس بات پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو گیا۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ رضاعت ایک ایسا معاملہ ہے جس سے مرد بھی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اجنبی مرد لونڈی کی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ایک عورت نے میاں بیوی دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: "جب یہ بات کہی گئی تو وہ میاں بیوی اکٹھے کیسے رہ سکتے ہیں؟" صحیح بخاری[1] میں یہ الفاظ ہیں کہ "وہ اکٹھے کیسے رہ سکتے ہیں جبکہ یہ بات کہی گئی ہے؟" چنانچہ اس شخص نے اپنی بیوی کو علیحدہ کر دیا اور اس نے دوسرے آدمی سے نکاح کر لیا۔

چھاتی کو دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح آزاد عورت کی چھاتی کو اس کا محرم دیکھنے کا مجاز ہے۔ مگر خاوند کے لیے افضل بات یہ ہے کہ اپنی بیوی کو ایسی صورت میں چھوڑ دے جب کوئی عورت ان دونوں کو دودھ پلانے کی شہادت دے۔ اور اس کے لیے وہ مندرجہ بالا حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر میاں بیوی میں تفریق واجب ہوتی تو حضور اعراض نہ فرماتے۔ احناف حضرت علیؓ کے قول سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک آدمی سے کہا تھا "یہ تیری بیوی ہے اس کو کوئی تیرے لیے حرام نہیں ٹھہرا سکتا، ہاں اگر تو اپنے طور پر اس عورت سے پرہیز کرے تو بہتر ہے۔ بدائع الصنائع (۴: ۱۴-۱۵)

امام احمد بن حنبل کا زاویۂ نظر حافظ ابن حجر "فتح الباری" (۵-۲۶۸) میں نقل کرتے ہیں کہ علی بن سعد کہتے ہیں کہ ایک دفعہ امام احمد بن حنبلؒ سے دریافت کیا گیا کہ کیا رضاعت کے بارے میں ایک عورت کی شہادت مقبول ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ عُقبہ بن حارث سے مروی حدیث کے مطابق درست ہے۔ امام اوزاعی کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ پھر کہتے ہیں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ رضاعت کے بارے میں مرضعہ کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ یہ شہادت اس کی اپنی ذات کے بارے میں ہے اور کسی شخص کی شہادت اپنے آپ کے بارے میں قابلِ قبول نہیں۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جمہور کے قول کے خلاف ہے، (لہٰذا حدیث پر عمل کرنا چاہیے نہ کہ قولِ جمہور پر)

[1] صحیح بخاری کتاب الشہادات باب "اذا شہد شاهد او شاهد بشیٔ" دیگر علماء کا قول ہے کہ ہمارے علم کی حد تک شاہد کے قول پر عمل کیا جائے گا۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۶۴۰)

كِتَابُ الطَّلَاقِ

حائضہ عورت کی طلاق[1] کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا[2]، صحیح بخاری[3]، صحیح مسلم[4] اور نسائی[5] میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے عہد رسالت میں اپنی بیوی[6] کو حالت حیض میں طلاق دے دی۔ جب حضرت عمرؓ نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا ثُمَّ لْيُمْسِكْهَا حَتّٰى تَطْهُرَ ثُمَّ تَحِيضَ ثُمَّ تَطْهُرَ ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدُ وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ

ابن عمر کو حکم دو کہ اپنی بیوی سے رجوع کرے اور اپنے گھر میں رکھے، حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائے۔ پھر اسے حیض آئے اور پھر پاک ہو جائے اس کے بعد چاہے تو گھر میں رہنے دے یا مجامعت سے قبل طلاق دے دے۔ یہی وہ عدت

---

[1] طلاق کا لفظ "اطلقت الناقة فطلقت" سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی ناقہ کا بند کھولنے اور آزاد کرنے کے ہیں۔ گویا عورت قبل ازیں نکاح کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ لہٰذا جب خاوند نے اس کو الگ کر دیا تو گویا اس کو بندھنوں سے آزاد کر دیا۔ اسی طرح جب عورت کسی کے عقد نکاح میں ہوتی ہے۔ تو عربی زبان کے محاورہ میں "هِيَ فِي حِبَالِكَ" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی وہ تمھارے عقد نکاح میں اسی طرح بندھی ہوتی ہے جیسے ناقہ رسی سے بندھی ہو۔ پھر ناقہ اور عورت کے فعل میں فرق ملحوظ رکھنے کے لیے الگ الگ فعل استعمال کیے جانے لگے مگر اصل ایک ہی ہے۔ عربی محاورہ میں بولتے ہیں "طَلَقَتِ النَّاقَةُ" بفتح اللام یعنی ناقہ آزاد ہوئی۔ دوسری طرف عورت کے لیے "طَلُقَتِ الْمَرْأَةُ" بضم اللام (عورت قید نکاح سے رہا ہوئی) بولتے ہیں۔ عربی میں یوں بھی بولتے ہیں "أُطْلِقَتِ النَّاقَةُ وَطُلِّقَتِ الْمَرْأَةُ" (دیکھیے مقدمات ابن رشد ص ۲ ۳۸)

[2] مؤطا امام مالک (۲-۲۹) کتاب "الطلاق" باب "ما جاء فی الاقراء وعدة الطلاق وطلاق الحائض"۔

[3] صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب "اذا طلقت الحائض تعتد بذلک الطلاق" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۵۲) نیز باب "من طلق وهل يواجه الرجل امرأته بالطلاق" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۵۸)

[4] صحیح مسلم کتاب "الطلاق" باب تحریم طلاق الحائض بغیر رضاها۔

[5] نسائی کتاب الطلاق باب ما یفعل اذا طلق تطلیقة وهی حائض۔

[6] ان خاتون کا نام آمنہ بنت غفار تھا جیسا کہ ابن نقطہ نے "تکملة الاکمال" میں ابن سعد کے حوالے سے لکھا ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ اس کا نام النوار تھا۔

اللہ ان تطلق لہا النساء۔ یہ جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کے سلسلے میں دیا ہے۔

مؤطا کی حدیث ختم ہو گئی لیکن اس کے علاوہ دوسری مذکورہ بالا کتب میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا۔ میں نے اس کو ایک طلاق شمار کیا۔ نافع کے تلامذہ نے یہ حدیث نافع سے اور انھوں نے ابن عمرؓ سے اسی طرح روایت کی ہے۔

یہ حدیث زہری اور محمد بن عبدالرحمٰن نے سالم سے اس نے اپنے والد اور یونس بن جبیر سے اور انھوں نے عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ نیز زید بن اسلم، ابن سیرین، ابوالزبیر، سعید بن جُبیر اور ابو وائل، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:

"عبداللہ کو حکم دو کہ وہ اپنی بیوی کو گھر لے آئے اور پاک ہونے تک گھر میں رکھے۔ بعد ازاں اگر چاہے تو رہنے دے اور اگر چاہے تو طلاق دے دے۔"

اس میں یہ اضافہ نہیں کہ پھر اسے حیض آئے اور اس سے پاک ہو۔ بہر حال ثقہ راوی کا اضافہ مقبول ہوتا ہے اسی طرح صحیح مسلم میں بھی یہ الفاظ مذکور نہیں۔ جس راوی نے اس حدیث کو اس اضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کی روایت فقہی اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ رجوع کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ خاوند عورت سے مجامعت کرے۔ جب طہر کی حالت میں خاوند جماع کرلے تو اس طہر میں اسے طلاق دینے کی اجازت نہیں۔ اگر خاوند کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ عورت کو اس وقت طلاق دے جب وہ اس حیض سے پاک ہو جائے جس میں خاوند نے اسے طلاق دی تھی۔ تو گویا اسے رجوع کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ اسے طلاق دے دے۔ اس کی صورت اس نکاح سے ملتی جلتی ہے جو ایک خاص مدت کے لیے کیا گیا ہو۔

قاسم بن اصبغ نے ابراہیم بن عبدالرحیم سے روایت کی ہے۔ وہ معلّیٰ بن عبدالرحیم واسطی سے وہ عبدالحمید سے وہ محمد بن

ل صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا گیا کہ یہ طلاق جو آپ نے دی ہے کیا یہ شمار کی جائے گی۔ وہ کہنے لگے میں اسے کیونکر شمار نہ کروں گا؟ میں عاجز آ جاؤں یا حماقت کروں تو بھی وہ طلاق تو شمار نہ ہوگی۔ ابوالزبیر نے ابن عمرؓ سے جو روایت کی ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ وہ روایت آگے آ رہی ہے۔

ؔ ایک نسخہ میں یعلی ابن عبدالرحیم ہے مگر صحیح معلی ہی ہے۔ یہ کذاب راوی ہے اور اس سے روایتِ حدیث جائز نہیں۔ اس نے فضائل علیؓ میں ستر احادیث وضع کی تھیں۔ یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، ابوزرعہ اور دارقطنی نے اس کو کذاب کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ عبدالحمید بن جعفر سے الٹی سیدھی حدیثیں روایت کرتا ہے۔ اگر روایت کرنے میں یہ منفرد ہو تو اس کی روایت کردہ حدیث کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ابن ماجہ نے اس سے روایت کی ہے۔

اس حدیث کی سند میں عبدالحمید نامی راوی ہے۔ اس کا نام عبدالحمید بن جعفر بن عبداللہ بن الحکم بن رافع انصاری ہے۔ یہ سچا راوی ہے مگر اس کو منکرین تقدیر میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن قیس الہمدانی المرہبی ہے جو مقبول راوی ہے۔ پس یہ حدیث سند کے اعتبار سے حجت نہیں۔

قیس سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ رجوع کریں۔ پھر جب وہ حیض سے پاک ہو تو اس سے مجامعت کریں۔ اس کے بعد جب اسے حیض آئے اور اس سے پاک ہو تو پھر چاہیں تو اسے طلاق دے دیں اور چاہیں تو اپنے گھر میں آباد کرلیں۔

اصحابِ تصنیف محدثین میں سے صرف قاسمؒ نے "اَنْ یَمَسَّهَا" (اس عورت سے مجامعت کریں) کا اضافہ کیا ہے۔

مصنف عبدالرزاقؒ میں ابن جریج سے مروی ہے وہ ابوالزبیر سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن عمرؓ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بیوی مجھے واپس دلادی اور اس طلاق کو شمار نہ کیا۔

؂ مجھے نہیں معلوم ہوسکا کہ قاسم کے سوا کسی نے اس کو روایت کیا ہو۔ ابن قدامہ نے اس کو ابن عبدالبر کی جانب منسوب کیا ہے۔ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ اس صورت میں طلاق ثانی دینے سے قبل مجامعت واجب ہے۔ ایک روایت امام احمد سے بھی اسی قسم کی منقول ہے، مگر جمہور علماء اس کے خلاف ہیں۔

؂ عبدالرزاق المصنف (۶-۳۰۹) میں ابن جُریج سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے ابوالزبیر نے بتایا کہ عبداللہ بن عمرؓ سے عُروہ کے آزاد کردہ غلام عبدالرحمان بن ایمن نے دریافت کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے؟ اس کے جواب میں عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ عبداللہ بن عمر نے عہدِ رسالت میں حالتِ حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اس وقت عمرؓ نے اس ضمن میں حضورؐ سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا۔ عبداللہ کو چاہیے کہ اپنی بیوی سے رجوع کرلے، چنانچہ اس نے رجوع کرلیا اور اس طلاق کو شمار نہ کیا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ جب عورت حیض سے پاک ہو تو چاہو تو اسے طلاق دے دو اور چاہو تو اپنے پاس رہنے دو۔

عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ آیت پڑھی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (سورۃ الطلاق-۱)	اے پیغمبر (مسلمانوں سے کہہ دو) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔

ابوداؤد (۲-۲۵۶) اس حدیث کو اسی سند کے ساتھ روایت کرکے کہتے ہیں:

یہ حدیث یونس بن جُبیر، انس بن سیرین، سعید بن جبیر، زید بن اسلم، ابوالزُبیر اور منصور نے ابووائل سے اور انھوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ ان سب کی روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ اپنی بیوی کو پھر سے اپنے گھر میں لے آئیں حتیٰ کہ وہ حیض سے پاک ہو جائے۔ پھر اس کے بعد چاہیں تو گھر میں آباد کرلیں اور چاہیں تو طلاق دے دیں۔ اسی طرح یہ حدیث محمد بن عبدالرحمٰن نے سالم سے اور انھوں نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔

زُہری نے سالم اور نافع سے اور ان دونوں نے ابن عمرؓ سے جو روایت کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اپنی بیوی کو پھر سے اپنے گھر میں آباد کرلیں، حتیٰ کہ وہ ایک دفعہ حیض سے پاک ہو جائے اور پھر اسے دوبارہ حیض آئے۔ اس کے بعد اگر چاہیں تو طلاق دے دیں اور اگر چاہیں تو اپنے گھر میں بسالیں۔ عطاء خراسانی نے حسن بصری سے اور انھوں نے ابن عمرؓ سے

بعض اصحاب ظاہرؒ نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حیض کی حالت میں دی ہوئی طلاق اسی صورت میں شمار ہوتی ہے جب تین طلاقیں دی جائیں۔ یا آخری طلاق دی ہو، جبکہ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حیض کی حالت میں دی ہوئی طلاق باقاعدہ طلاق شمار ہوتی ہے۔

بہرحال صحیح بات وہی ہے جو بخاری اور مسلم نے اس حدیث میں نقل کی ہے جس میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ عمرؓ کو اس طلاق کا پابند کیا تھا جو انھوں نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں دی تھی۔ اس لیے کہ رجوع اسی صورت میں کیا جاتا ہے جب خاوند نے بیوی کو طلاق دی ہو۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عبداللہ کو حکم دو کہ بیوی سے رجوع کرلے۔"

نافع اور زہری کی طرح کی روایت کی ہے۔ یہ تمام روایات ابوالزبیر کی روایت کردہ حدیث سے مختلف ہیں۔

تاہم ابوالزبیر نے جو روایت کی ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی اس میں وہ منفرد نہیں۔ عبدالوہاب ثقفی عبیداللہ سے وہ نافع سے اور وہ ابنِ عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دے تو اس طلاق کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ محمد بن عبدالسلام الخشنی نے اسے بندار سے اور انھوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔ التلخیص الحبیر (۳-۲۰۶)

امام ابن حزم اندلسی ابوالزبیر کی روایت سے استدلال کر کے اپنے مسلک کو تقویت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں جتنے اقوال حضرت ابنِ عمرؓ کی جانب طلاق کو شمار کرنے کے سلسلے میں وارد ہوئے ہیں انھوں نے ان سب کا ابطال کیا ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں ذکر کردہ حدیث کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند عمدہ درجہ صحیح ہے اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ دیکھیے المحلی "(۱۰-۱۵۱)

لہ اصحاب ظاہر کا بانی اور مؤسس داؤد بن علی اصفہانی متوفی ۲۷۰ھ تھا۔ یہ لوگ کتاب وسنت کو حجت مانتے ہیں۔ اور رائے اور قیاس کو کوئی وزن نہیں دیتے۔

شہرستانی لکھتے ہیں:

اصحاب ظاہر میں داؤد اصفہانی اور دیگر لوگ احکام شرعی میں قیاس و اجتہاد کو درست خیال نہیں کرتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ شریعت کے اصل مآخذ صرف کتاب وسنت اور اجماع ہی ہیں۔ "الملل والنحل" (۱-۲۰۶)

امام ابو محمد علی بن حزم متوفی ۴۵۶ھ کو اس مسلک کے مجددین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان کی تصنیف "المحلی" ظاہری فقہ کے بنیادی مآخذ میں شمار ہوتی ہے، مگر یہ مسلک زیادہ پھل پھول نہ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہری فقہ میں شدت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ نصوص کے ظاہری اور لفظی مفہوم کو لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فقہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

لہ الباجی "المنتقی" (۴-۹۸) میں لکھتے ہیں:

کہ رجوع یا رجعت کا اطلاق اکثر و بیشتر اس طلاق کے بعد رجوع کرنے پر کیا جاتا ہے جسے شمار کیا گیا ہو۔ لہٰذا اس حدیث میں رجوع کا حکم ان علماء کے خلاف حجت ہے جو اس طلاق کو شمار نہیں کرتے۔ اور وہ علماء ہشام بن عبدالحکیم، ابن علیہؒ اور داؤد ظاہری ہیں۔

ان کا موقف یہ ہے کہ حائضہ عورت کو جو طلاق دی جاتی ہے وہ اس پر اثر انداز نہیں ہوتی:

ابو عمر کہتے ہیں :

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ حالت حیض میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس حالت میں طلاق دینا ان سب کے نزدیک غیر مستحسن ہے۔ صرف مبتدعین اور جہلاء یہ کہتے ہیں کہ جو طلاق سنت کے مطابق نہ دی جائے وہ واقع نہیں ہوتی۔ بعض تابعین سے بھی اس طرح کی رائے مروی ہے، مگر یہ شاذ مسلک ہے جس کی جانب کوئی عالم بھی التفات نہیں کرتا۔ شرح الموطا للزرقانی (۴-۱۷۰)

ظاہریہ اس بات کے قائل ہیں کہ حائضہ پر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ابن حزم نے ان کے مسلک کی توضیح یوں کی ہے:

"حضورؐ نے ابن عمرؓ کو جو رجوع کرنے کا حکم دیا ہے اس سے ان لوگوں کا موقف ثابت نہیں ہوتا جو کہتے ہیں کہ حالت حیض میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ابن عمرؓ نے جب حالت حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دی تو اس سے بلاشبہ الگ رہنے لگے۔ حضورؐ نے ان کو حکم دیا کہ اس علیحدگی کو ترک کر دیں اور جس طرح قبل ازیں اس سے گھل مل کر رہتے تھے اب بھی ایسے ہی رہیں۔"

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"اہل علم کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ ابن عمرؓ کو حضورؐ نے جو رجوع کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی بیوی پر طلاق واقع ہو گئی تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو اس سے یہ سمجھ کر الگ تھلگ رہنے لگے کہ اس پر طلاق بائن واقع ہو گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اصلی حالت کی طرف لوٹ آئیں اور جس طرح قبل ازیں اس کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اب بھی ایسا ہی کریں۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ جب ایک شخص نے ایک صاع غلہ دو صاع کے عوض فروخت کر دیا تو آپ نے فرمایا "یہ تو بالکل ربا ہے اس کو واپس کر دو۔"

اسی طرح حدیث صحیح میں عمران بن حصین سے مروی ہے کہ ایک شخص نے چھ غلام آزاد کر دیے۔ آپ نے ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے دو کو آزاد کر دیا اور چار کو غلام رہنے دیا۔ السنن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی زینبؓ کو پہلے ہی نکاح کے باعث ان کے خاوند ابو العاص کی طرف واپس کر دیا تھا۔ یہ گویا زینبؓ کو خاوند کی طرف واپس کرنا ہوا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا کہ جو غلام انھوں نے اپنے بھائی سے علیحدہ کر کے فروخت کیا ہے اس کو واپس لیں۔ علاوہ ازیں حضورؐ نے بشیرؓ نامی صحابی کو حکم دیا تھا کہ جو غلام تم نے اپنے بیٹے کو ہبہ کیا تھا اس کو واپس لے لو۔ اس کے نظائر و امثال بے شمار ہیں۔" (اس ساری بحث میں امام ابن تیمیہؒ نے واپس کرنے (ردّ) کے لفظ پر بحث کی ہے کہ جب کسی کو واپس کیا یا لیا جاتا ہے تو اس پر اس فعل کا کوئی اثر نہیں ہوتا جس کے بعد واپسی کا عمل ہوتا ہے۔

معلوم نہیں امام ابن تیمیہؒ نے حافظ ابن حزم سے متاثر ہو کر یہ بات کہی ہے یا یہ ان کی ذاتی تحقیق ہے۔

امام ابن تیمیہؒ مزید فرماتے ہیں:

"مراجعت کے معنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں۔ لوٹ آنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اسی عورت سے دوبارہ نکاح کر لیا جائے

"جس نے طلاقِ بدعت دی ہم اس طلاق کو اس پر لازم کر دیں گے[1]" اس حدیث سے ان لوگوں کا قول باطل ٹھہرا جو کہتے ہیں کہ حیض کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا۔ (البقرۃ - ۲۳۰)	اگر عورت کو طلاق دے دے تو اس بات میں کچھ مضائقہ نہیں کہ دونوں رجوع کر لیں۔

مراجعت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے جسم کی طرف رجوع کریں اگرچہ طلاق وقوع پذیر نہ ہوئی ہو۔ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی یا لونڈی کو گھر سے نکال دے تو اسے کہا جائے کہ اس کی طرف رجوع کرو۔ جس طرح حضرت علیؓ سے روایت کردہ حدیث میں ہے کہ آپؓ نے امر بالمعروف کی طرف رجوع کیا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا:

"تمھیں حق کی جانب لوٹ آنا چاہیے اس لیے کہ حق قدیم ہے۔" (امام ابن تیمیہؒ)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس سے آگے لکھتے ہیں:

"مراجعہ بروزن مُفاعلہ ہے۔ یہ لفظ اشتراک کو چاہتا ہے۔ طلاق سے رجوع کرنے کے بارے میں خاوند تنہا بااختیار ہے اور اس کے زبانی کہنے ہی سے رجعت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس صورت میں مراجعت کا لفظ استعمال نہیں کیا جائے گا، مگر اس صورت میں جب کہ خاوند بیوی کے جسم کو اپنی طرف واپس لائے اور عورت اپنی مرضی سے اس کی طرف لوٹ آئے تو اندریں صورت مراجعت کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔ اسی طرح جب عورت دوسرے خاوند سے نکاح کرنے کے بعد اپنی مرضی سے دوبارہ پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کرے تو اس کا نام بھی مراجعت ہوگا۔ (مجموع الفتاویٰ (۳۳ - ۹۹، ۱۰۰)

یہ دلائل و براہین جو پہلے امام ابن حزم نے اور ان کے بعد امام ابن تیمیہؒ نے بیان کیے ہیں اگرچہ قوی ہیں تاہم صحیح روایت وہی ہے جو صحیحین میں ابن عمرؓ کے شاگرد نافع سے منقول ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نافع، ابوالزبیر کی نسبت ثقہ تر راوی ہے۔ الخطابی لکھتے ہیں:

"محدثین کا قول ہے کہ ابوالزبیر نے اس سے ضعیف تر حدیث روایت نہیں کی۔"

المنذری کہتے ہیں کہ امام شافعی نے فرمایا کہ نافع ابن عمرؓ کے نزدیک ابوالزبیر سے زیادہ ثقہ راوی ہیں، لہٰذا نافعؒ کی روایت ہر حال میں اولیٰ و افضل ہے۔

اگرچہ ابوالزبیر سے مروی حدیث کو دیگر روایات کی تائید و تقویت حاصل ہے، تاہم حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس روایت کی یہ تاویل کی جائے گی کہ یہ بات خلافِ سنت ہے نہ یہ کہ اس طلاق کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح روایاتِ صحیحہ میں جمع و تطبیق کی ایک صورت پیدا ہو جائے گی۔ التلخیص الحبیر (۳ - ۲۰۶)

[1] یہ حدیث بیہقی (۷ - ۳۲۷) نے معاذؓ بن جبل سے روایت کی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں مجھے ابوعبدالرحمٰن السلمی نے بتایا ان کو حافظ ابوالحسن دارقطنی نے بتایا کہ اسماعیل بن ابی اُمیہ مصری متروک الحدیث ہے۔

دارقطنی نے یہ حدیث سنن (۴ - ۲۰) میں روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم کا یہ ارشاد کہ "یہ وہی عدت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کے سلسلے میں صادر کیا ہے، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ عدت "قُروء" سے شمار کی جائے گی۔ اقراء قُروء طُہر کو کہتے ہیں۔ امام مالک بھی یہی فرماتے ہیں کہ "اقراء" (قَرء کی جمع) طُہر کو کہتے ہیں۔[۱]

ان کتابوں کے علاوہ دوسری کتبِ حدیث میں یہ روایت ابن عمرؓ سے آغاز باب میں منقول ہے۔ ان کی سند یہ ہے کہ شعیب بن زُرَین بیان کرتے ہیں کہ عطا خراسانی نے حسن بصری سے سن کر انھیں بتایا۔ حسن بصری کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ پھر ارادہ کیا کہ باقی ماندہ دو طلاقیں مزید حیضوں کی مدت میں دے دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو آپ نے فرمایا:

"ابن عمر! اللہ تعالیٰ نے اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا۔ تم سنت کو بھول گئے۔ طلاق دینے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ طُہر کا خیال رکھو اور ہر طہر میں ایک طلاق دے دو۔"

"اے معاذ! جو شخص اپنی بیوی کو ایک طلاقِ بدعت ۔ یا دو یا تین طلاق دے تو ہم ان کو واقع کر دیں گے۔"

دارقطنی فرماتے ہیں:

"اسماعیل بن اُمیہ قرشی ضعیف اور متروک الحدیث راوی ہے۔" حافظ ابن حجرؒ "لسان المیزان" (۱-۳۹۴) میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اسماعیل بن ابی عباد امیۃ البصری کو ذکریا الساجی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ابن حجر مذکورہ بالا حدیث کو انسؓ سے مرفوعاً روایت کرتے اور کہتے ہیں کہ ابن حزم کے نزدیک یہ حدیث موضوع ہے۔ اسماعیل سے اگر القرشی المعنیر البصری مراد ہے تو وہ ساقط الاعتبار ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا راوی مراد ہے تو وہ مجہول ہے جس کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کون ہے۔ المحلّی (۱۱-۴۵۵)

ابن حزم مزید لکھتے ہیں:

اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو ان کے لیے حجت قرار نہیں پا سکتی۔ اس لیے کہ "اَلزَمناہ بدعتہٗ" (ہم اس کی بدعت کو اس پر لازم قرار دیں گے) کے الفاظ بعینہٖ اسی طرح ہیں جس طرح قرآن کریم میں فرمایا:

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (سورۃ بنی اسرائیل: ۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بہ صورتِ کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔

[۱] کتاب الاُمّ (۵-۱۸۰) از امام مالک از نافع از ابن عمرؓ، نیز "المدوّنۃ" (۲-۴۲۲) از امام مالک و ابن ابی ذئب۔

[۲] مگر احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقراء سے حیض مراد ہے۔ خلفاء راشدین، عبادلہ اربعہ اور صحابہ کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ امام مالک کی روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ، ابن عمرؓ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مفہوم روایت کیا گیا ہے۔ اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ لفظ قَرء لغات اضداد میں سے ہے (اس کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی) ہر شخص سیاق حدیث کی روشنی میں اس کے مفہوم کی تعیین کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی بیوی سے رجوع کرنے کا حکم دیا اور فرمایا "جب یہ پاک ہوجائے تو پھر چاہو تو طلاق دے دو اور اگر چاہو تو اپنے یہاں رہنے دو"۔ میں نے عرض کیا "حضور! اگر میں اسے تین طلاق دے چکا ہوتا تو کیا پھر بھی مجھے رجوع کا حق حاصل تھا؟ فرمایا "نہیں، تمہاری بیوی تم سے الگ ہوجاتی اور رجوع کرنا گناہ ٹھہرتا"۔[1]

اہل علم نے شعیب بن رزین پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور بعض علماء نے اسے ضعیف راوی قرار دیا ہے۔[2]

نسائی[3] میں محمد بن عبدالرحمان آل طلحہ کے آزاد کردہ غلام نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ اس کو رجوع کرنے کا حکم دو۔ پھر طُہر یا حالتِ حمل میں طلاق دے دے۔

نسائی کہتے ہیں کہ ہمارے علم کی حد تک کسی راوی نے بھی محمد بن عبدالرحمٰن کے قول "او ـ امرا، (یا حالتِ حمل میں) کی تائید نہیں کی۔ اور محمد بن عبدالرحمٰن ٹھیک راوی ہے۔ اس سے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

سنن[4] ابی داؤد (کتاب الطلاق، باب البتۃ) میں مروی روایت میں ہے کہ

---

[1] اس کو دارقطنی (۴ - ۳۱) نے معلّی بن منصور سے روایت کیا ہے۔ حافظ زیلعی "نصب الرایۃ" (۳ - ۲۲۰) میں لکھتے ہیں کہ عبدالحق نے "کتاب الاحکام" میں دارقطنی کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور معلّی بن منصور کی وجہ سے اسے معلول ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام احمد معلّی کو کاذب قرار دیتے ہیں۔ زیلعی مزید کہتے ہیں کہ بیہقی نے اس حدیث کو محض عطاء خراسانی کی وجہ سے معلّل ٹھہرایا ہے۔ بیہقی کہتے ہیں عطا خراسانی نے اس میں ایسے اضافے کیے ہیں جن کی تائید کسی دوسری روایت سے نہیں ہوتی۔ عطا ضعیف ہے۔ مدعین حدیث کے روایت کرنے میں وہ منفرد ہو وہ روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ طبرانی نے اس کو معجم میں علی بن سعید رازی سے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں حافظ الہیثمی نے اس کو "مجمع الزوائد" (۴ - ۳۳۶) میں نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث طبرانی نے روایت کی اور اس کی سند میں علی بن سعید رازی ہے۔ دارقطنی اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں، مگر دوسرے محدثین اس کا احترام کرتے ہیں۔

جہاں تک حسن بصری کے ابن عمرؓ سے سماع کا تعلق ہے اس کے متعلق زیلعی کہتے ہیں کہ حسن بصری نے ابن عمرؓ سے سماع کی تصریح کی ہے۔ امام احمد کے بیٹے صالح اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حسن بصری کا ابن عمرؓ سے سماع ثابت ہے۔ ابوحاتم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ محدث ابوزرعہ سے دریافت کیا گیا کہ حسن بصری ابن عمرؓ سے ملے تھے؟ انھوں نے جواب دیا "جی ہاں!" (زیلعی کا بیان ختم ہوا)

[2] نصب الرایۃ میں شعیب بن رزیق ہے۔ المیزان (۲ - ۲۷۶) میں بھی اسی طرح ہے۔ اس کا ابوداؤد اور ترمذی کے راویوں میں شمار ہوتا ہے۔ شعیب کی کنیت ابوشیبہ اور نسبت مقدسی شامی ہے۔ طرطوس میں مقیم تھا۔ دارقطنی نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ حافظ ابن حجر "تھذیب التھذیب" (۴ - ۳۵۴) میں لکھتے ہیں کہ اس کی مرویات قابلِ قبول ہیں۔ سوائے ان احادیث کے جو وہ عطاء سے روایت کرتا ہے۔ ابن حزم نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

[3] نسائی (۲ - ۱۴۱) کتاب "الطلاق" باب "ما یفعل اذا طلق تطلیقۃ وھی حائض"۔

[4] ابوداؤد (۲ - ۲۶۳) کتاب "الطلاق" باب "فی البتۃ" مکمل حدیث یوں ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو دوسری طلاق حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اور تیسری خلافتِ عثمانی میں دی۔

رکانہ[1] نے اپنی بیوی سُہیمہ[2] کو طلاقِ بائن دے دی۔ پھر اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور کہا "اللہ کی قسم میں نے تو ایک طلاق کا ارادہ کیا تھا" حضور نے یہ سُن کر فرمایا "بخدا تم نے ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا تھا؟" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر آپؐ نے اس کی بیوی کو اس کی طرف لوٹا دیا۔

عُبَیداللہ بن ولید ابراہیم سے، وہ داؤد سے اور وہ حضرت عبادہؓ بن الصامت سے روایت کرتے ہیں:

کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو ایک ہزار طلاق دے دی۔ میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ آپؐ کو سنایا۔ آپ نے فرمایا "کیا تمہارا دادا خدا سے نہیں ڈرتا۔ اسے صرف تین طلاق دینے کا حق حاصل ہے۔ باقی نو سو ستانوے ظلم اور تعدی ہے۔ اگر خدا چاہے تو اسے عذاب میں مبتلا کرے اور چاہے تو بخش دے[3]۔"

ترمذی (۳ - ۰۸۴) کتاب "الطلاق" باب "ما جاء فی الرجل طلّق امراتہ البتّة"۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ہمیں صرف اسی سند سے معلوم ہے۔

المنذری مختصر ابی داؤد (۳ - ۱۳۴) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مضطرب المتن والسند ہے۔

ابن عبدالبرؒ "التمہید" میں کہتے ہیں کہ اس حدیث کو اہل علم نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کا تذکرہ "التلخیص الحبیر" (۳ - ۲۱۳) میں کیا ہے۔ یہ حدیث دارقطنی (۴ - ۳۳) نے رکانہ بن عبد یزید اور عبداللہ بن علی بن رکانہ سے، اس نے اپنے والد سے اور اس نے ان کے دادا سے روایت کی ہے۔

مولانا عظیم آبادی حاشیہ دارقطنی میں کہتے ہیں کہ امام عُقیلی نے کہا اس حدیث کی سند مضطرب ہے۔ اور دیگر روایات سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ امام شوکانی نیل الاوطار (۶ - ۲۵۵) میں لکھتے ہیں:

کہ اس کی سند میں زبیر بن سعید ہاشمی ہے جس کو ایک سے زیادہ محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور بعض علماء نے اس کو متروک الحدیث کہا ہے۔

[1] رکانہ ابن عبد یزید بن ہاشم بن المطلب بن عبد مناف المطّلبی۔ یہ وہی شخص ہے جس کے مشرف باسلام ہونے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے ساتھ کُشتی لڑی تھی۔ یہ بہت طاقتور تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اُس نے وفات پائی اور بعض علماء کے نزدیک حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں فوت ہوا۔ بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ وہ ۴۱ھ تک بقیدِ حیات رہا۔ "الاصابة" (۱ - ۵۲۰)

[2] سُہیمہ بنت عُمیر مُزنیہ، رکانہ بن عبد یزید مطلبی کی بیوی ہے۔ حافظ ابن مَندہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے خاوند نے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں اس کو دوسری طلاق دی اور تیسری طلاق حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں دی تھی۔ "الاصابة" (۴ - ۳۲۹)

[3] دارقطنی (۴ - ۲۰) اس کو عُبَیدُاللہ بن ولید اور صدقہ بن ابی عمران سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابراہیم بن عُبیداللہ بن عُبادہ بن الصامت سے وہ اپنے والد سے وہ اُن کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارے اجداد میں سے ایک نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی۔ اس کے بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارے باپ نے ہماری والدہ کو ایک ہزار طلاق دی ہے تو کیا اس کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لیے نجات کا کوئی راستہ ہے؟" آپ نے فرمایا: "تمھارا باپ خدا سے نہیں ڈرا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے رہائی کی کوئی صورت پیدا کرتا۔ تین خلافِ سنت طلاقوں سے اس کی بیوی جدا ہوگئی اور نوسوستانوے اس کے گلے میں گناہ کا طوق ہیں۔"

دارقطنی کہتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی مجہول اور ضعیف ہیں ماسوا ہمارے استاد محترم اور ابن عبد الباقی کے۔ حافظ الہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۴-۳۳۸) میں اس حدیث کا تذکرہ کیا اور اس کو طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس حدیث کی سند میں عبید اللہ بن ولید ضعیف راوی ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ حدیث "المطالب العالیۃ" (۲-۶۳) میں داؤد بن ابراہیم بن عبادہ بن الصامت سے روایت کی ہے۔ الذہبی "المیزان" (۳-۱۷) میں کہتے ہیں کہ عبید اللہ بن ولید ترمذی اور ابن ماجہ کے راویوں میں سے ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان میں سے ابوزرعہ اور دارقطنی بھی ہیں۔ نسائی اس کو متروک الحدیث قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے یہ حدیث داؤد بن ابراہیم سے اور انھوں نے عُبادہ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ داؤد بن ابراہیم مجہول راوی ہے۔ (المیزان ج ۲ ص ۴)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی سند میں تحریف ہو چکی ہے۔ میں نے کسی شخص کو یوں کہتے نہیں پایا "ابراہیم ابن عُبید اللہ بن عُبادہ" اور نہ ہی "داؤد بن ابراہیم بن عُبادہ"۔

بخلاف ازیں صحیح وہی بات ہے جو محدث الذہبی نے کہی۔ بنا بریں اس حدیث کی سند کو حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

خُلع[1] کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا[2]، صحیح بخاری[3]، صحیح مسلم[4] اور نسائی[5] میں ہے کہ حبیبہ بنت سہل[6]، ثابت بن قیس بن شماس کے نکاح میں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح سویرے گھر سے نکلے تو آپ نے اندھیرے میں حبیبہ بنت سہل کو اپنے گھر کے دروازے پر پایا۔ حضورؐ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا میں حبیبہ بنت سہل ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کیا بات ہے؟ اس نے کہا میرا اور میرے خاوند ثابت بن قیس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] خُلع کے معنی اتار دینے کے ہیں۔ عربی محاورہ میں کہتے ہیں "خالعتِ المرأۃ زوجھا" (عورت نے معاوضہ دے کر خاوند سے طلاق حاصل کی) خُلع (بالضم) استعارہ ہے خلع اللباس (لباس اتار دینا) سے۔ "خلع القمیص عن البدن" کے معنی قمیص اتارنے اور جسم سے دور کرنے کے ہیں۔ چونکہ خُلع بھی نکاح کو اس کے لزوم کے بعد دُور کر دیتا ہے، لہٰذا اس کو یہ نام دیا گیا ہے اس لیے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ قرآن عزیز میں ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (سورۃ البقرۃ-۱۸۷) عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

[2] مؤطا امام مالک (۲-۲۲۰) کتاب "الطلاق" باب "ما جاءَ فی الخلع"

[3] صحیح بخاری کتاب "النکاح" باب "الخلع" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۷۳) امام بخاری فرماتے ہیں کہ دوسری روایات سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۹-۴۰۱) میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری کے شیخ ازہر بن جمیل نے اس حدیث کی سند میں ابن عباسؓ کا جو ذکر کیا ہے، دوسرا کوئی راوی اس کی تائید نہیں کرتا۔ بخلاف ازیں دوسرے راوی اس حدیث کو مرسلاً روایت کرتے ہیں۔

[4] یہ مصنف کا تسامح ہے کیونکہ یہ حدیث مسلم میں موجود نہیں بلکہ یہ ان احادیث میں سے ہے جن میں امام بخاری منفرد ہیں۔ امام مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ اس کتاب کے دوسرے نسخوں میں "مسلم" کا لفظ نہیں ہے۔

[5] نسائی (۶-۱۶۹) کتاب "المنکاح" باب "ما جاء فی الخلع" نیز دیکھیے ابوداؤد (۲-۲۶۹) کتاب الطلاق باب "الخلع"

[6] اس کے نام میں اختلاف ہے۔ بصریوں کے نزدیک جمیلہ بنت اُبی ابن سلول ہے۔ اہل مدینہ حبیبہ بنت سہل کہتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے دونوں کے مابین تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایسے معلوم دیتا ہے کہ یہ ایک نہیں دو واقعات ہیں جو دو مختلف عورتوں کو پیش آئے۔ اس لیے کہ یکساں طور پر دونوں حدیثیں مشہور ہیں، دونوں کی سندیں صحیح ہیں اور دونوں کے سیاق و سباق ایک دوسرے سے جُدا جُدا ہیں، لہٰذا جمیلہ کے نام میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس میں جمع و تطبیق کی یہی صورت ممکن ہے۔ (فتح الباری ۹-۳۹۹)

جب اس کا خاوند ثابت بن قیس آیا تو آپ نے فرمایا "یہ حبیبہ بنت سہل ہے اس نے جو کہنا تھا کہا۔ حبیبہ نے کہا "یا رسول اللہ! اس نے جو کچھ مجھے دیا تھا وہ سب میرے پاس موجود ہے"۔ حضورؐ نے ثابتؓ سے کہا "یہ اس سے لے لو" ثابت نے اس میں سے کچھ لے لیا اور وہ اپنے میکے میں بیٹھ گئی۔ یہ مؤطا اور نسائی کے الفاظ ہیں۔

صحیحینؔ میں ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے خاوند کے دین و اخلاق کو تو ناپسند نہیں کرتی مگر مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ دینِ اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے مجھ سے کوئی کافرانہ حرکت سرزد ہو جائےؔ" حضورؐ نے فرمایا "کیا تو ثابت کا باغ اسے واپس دے دے گی؟" اس نے کہا "جی ہاں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت سے فرمایا "اپنی بیوی کی جانب سے باغ قبول کر لو اور اسے طلاق دے دو"۔

پہلی روایت کے یہ الفاظ کہ "اپنے گھر والوں کے یہاں بیٹھ گئی" راوی کے اپنے الفاظ ہیں۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ خلع سے پہلے وہ اپنے خاوند کے ہمراہ اپنے والدین کے یہاں مقیم ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلع کے بعد وہ اپنے میکے چلی گئی ہو۔ اور جس گھر میں وہ اپنے خاوند کے ہمراہ سکونت گزیں تھی وہاں عدت اس لیے نہ گزاری ہو کہ وہاں خطرہ کا احتمال تھا یا کسی اور عذر کی بنا پر وہ خاوند کے گھر میں عدت نہ گزار سکی ہو۔

ابن المنذرؔ کی کتاب میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک حیض عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ بن عفان اور عبداللہؓ بن عمر کا یہی موقف ہے۔ ابن المنذر کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے۔ اس کے برعکس اکثر علماء کے نزدیک خلع والی عورت کی عدت مطلقہ کی طرح تین قروء (حیض یا طُہر) ہےؔ۔

ۤ۱ یہاں بھی مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث افرادِ بخاری میں سے ہے اور صحیح مسلم میں موجود نہیں۔

۲ ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ وہ حسین و جمیل تھی اور ثابت ایسے نہ تھے؛ چنانچہ مصنف عبدالرزاق کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔

۳ دیکھیے ابوداؤد (۲-۲۶۹) کتاب "الطلاق" باب "الخلع" بروایت ابن عباسؓ۔ اس روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ایک حیض مقرر کی تھی۔ ترمذی (۳-۴۹۱) کتاب "الطلاق" باب ما جاء فی الخلع" اور دارقطنی (۴-۴۶) میں بھی یہ آیا ہے علاوہ ازیں عبدالرزاق المصنف میں عکرمہ سے اس کو مرسلاً روایت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بیہقی (۷-۴۵۰) نے یہ ابن عباسؓ سے متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ عبدالرزاق نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہے۔ اسی طرح حاکم نے "المستدرک" (۲-۲۰۶) میں یہ حدیث روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۴ حضرت علیؓ، قتادہ اور حسن بصری کی رائے بھی یہی ہے۔ (دیکھیے مصنف عبدالرزاق ۶-۵۰۷) اس کے علاوہ فقہاء میں سے سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاقؒ اور اہلِ کوفہ کا یہی مسلک ہے۔

صحابہ میں سے بعض اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے۔ اسحاقؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ مسلک اختیار کرلے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ نہایت قوی مسلک ہے (تحفۃ الاحوذی (۴-۳۶۴) مؤطا امام مالک (۲-۲۳) میں نافع سے مروی ہے کہ رُبَیّع بنت معوذ بن عفراء اور اس کا چچا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رُبَیّع نے

ابن السکن[1] کی کتاب میں ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس نے اپنی بیوی کو پیٹا اور اس کا ہاتھ توڑ دیا۔ اس کا نام جمیلہ بنت عبداللہ بن اُبی تھا۔ اس کے بھائی نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ آپؐ نے ثابت کو پیغام بھیجا کہ "جو کچھ تم نے اسے دیا تھا وہ لے لو اور اسے طلاق دے دو۔ ثابت نے اثبات میں جواب دیا۔ آپؐ نے جمیلہ کو کہا کہ ایک حیض عدت گزارے اس کے بعد اپنے گھر والوں کے پاس چلی جائے[2]"

کہا کہ میں نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اپنے خاوند سے خُلع حاصل کیا تھا۔ یہ بات حضرت عثمانؓ تک پہنچی اور آپ نے اسے بُرا نہیں منایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ اس عورت کی عدت مطلقہ کی عدت کے برابر ہے۔

مطلقہ کی عدت تین حیض مقرر کرنے میں یہ حکمت مضمر ہے کہ رجعت کی مدت طویل ہو جائے اور خاوند عدت کی مدت میں رجوع کر سکے۔ خُلع کی صورت میں چونکہ رجعت کا کوئی سوال نہیں لہٰذا خلع میں عدت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اتنا پتہ چل سکے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں۔ اس لیے استبراءِ رحم کے لیے اس میں صرف ایک حیض کی مدت کافی ہے۔ یہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کا استدلال ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خُلع فسخ نکاح ہے طلاق نہیں۔ (زاد المعاد ۴/۳۶)

[1] بیہقی (۵-۳۱۷) نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ بعض روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ اس عورت نے کہا یا رسول اللہؐ! میں حسین و جمیل ہوں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے برعکس ثابت اس قدر بدصورت شخص ہے کہ اس سے کراہت میری برداشت سے باہر ہے"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جمیلہ ثابت کو ناپسند کرتی تھی۔ یہ فطری بات ہے کہ عورت مرد ہی کی طرح حُسن و جمال کی دلدادہ ہوتی ہے۔

[2] عورت کو اپنے اہلِ خانہ کے یہاں جانے کا حکم اس لیے دیا کہ یہاں رہنے سے کہیں عورت کو کوئی ناگوار واقعہ نہ پیش آئے۔ نیز اس لیے بھی کہ خُلع فسخ نکاح ہے اور اس میں رجوع کا کوئی سوال ہی نہیں۔

منکوحہ لونڈی کے آزاد ہو جانے کے بعد اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا[1]، صحیح بخاری[2]، صحیح مسلم[3] اور نسائی[4] میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بریرہ[5] کے معاملے کی وجہ سے ہم تک تین سنتیں پہنچیں۔ ان میں سے ایک سنت یہ تھی کہ جب وہ آزاد ہو گئی تو اسے اختیار دے دیا گیا کہ چاہے تو غلام خاوند کے نکاح میں رہے اور چاہے تو نہ رہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ "ولایت کا حق اس کو حاصل ہوگا جو غلام کو آزاد کرے۔" دوسری سنت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ہنڈیا میں گوشت پک رہا ہے۔ آپؐ کی خدمت میں روٹی اور گھر کا سالن پیش کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کیا ہنڈیا میں گوشت نہیں پک رہا؟ اہلِ خانہ نے کہا گوشت تو ضرور پک رہا ہے مگر وہ بریرہ کو صدقہ کے طور پر دیا گیا ہے۔ اور آپؐ صدقہ کا مال کھاتے نہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہُوَ عَلَیْھَا صَدَقَۃٌ وَھُوَ لَنَا ھَدِیَّۃٌ "یہ بریرہ کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے تحفہ ہے۔"

الواضحہ اور بعض دوسری کتابوں میں ہے کہ بریرہ کی وجہ سے چار سنتیں ہم تک پہنچیں۔ تین سنتیں تو وہ ہیں جن کا ذکر یہاں ہوا اور چوتھی یہ کہ حضورؐ نے بریرہ کو تین حیض عدت گزارنے کا حکم دیا۔[6]

---

[1] مؤطا امام مالک (۲-۲۱) کتاب "النکاح" باب "ما جاء فی الخیار"

[2] صحیح بخاری کتاب "النکاح" باب "الحرۃ تحت العبد" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۰۹۷)

[3] صحیح مسلم (۲-۱۱۴۴) کتاب "العتق" باب "انما الولاء لمن اعتق"

[4] نسائی (۶-۱۶۴) کتاب "النکاح" باب "خیار الامۃ تعتق و زوجھا مملوک"

[5] بُریرہؓ:- حضرت عائشہؓ کی آزاد کردہ لونڈی تھیں۔ ایک قول کے مطابق یہ کسی انصاری صحابی کی ملکیت تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آلِ عتبہ بن ابی اسرائیل کی لونڈی تھیں۔ ان کے حسب نسب اور وطن کا کچھ پتہ نہیں۔ ان کی روایت کردہ حدیث صحیحین اور دوسری کتبِ حدیث میں معروف ہے۔ علماء نے ان کی روایت کردہ حدیث سے تین سو سے زائد مسائل کا استنباط کیا ہے جن کا خلاصہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں پیش کیا ہے۔ مجھے بریرہ کا سالِ وفات کسی کتاب سے معلوم نہ ہو سکا۔

[6] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو حکم دیا تھا کہ وہ آزاد عورت کی سی عدت گزاریں۔ امام احمد نے مسند میں اور طبرانی نے "المعجم الاوسط" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ امام احمد کے راوی صحیحین کے راوی ہیں۔ "مجمع الزوائد" (۴-۳۴۲)

احمد بن خالد کہتے ہیں کہ چوتھی سُنّت یہ ہے کہ اس کو فروخت کرنے سے اس پر طلاق واقع نہیں ہوتی۔
[1] کتب ثلاثہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور نسائی میں ہے کہ بَریرہ کا خاوند سیاہ فام غلام تھا جس کو مغیث[1] کہتے تھے۔

انہی کتابوں میں ایک دوسری روایت میں منقول ہے کہ اس کا خاوند آزاد تھا۔ عُروہ کہتے ہیں کہ اگر بریرہ کا خاوند آزاد ہوتا تو اس کو اس کے نکاح میں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار نہ دیا جاتا۔ جو بات اکثر روایات میں ہے اور صحیح تر ہے وہ یہ ہے کہ وہ غلام تھا۔

مُسند ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس سے دریافت کیا گیا کہ ایک غلام نے ایک لونڈی سے نکاح

مگر اکثر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ لونڈی کی عدّت دو حیض ہے۔ ابوداؤد (۲ - ۲۷۵) کتاب "الطلاق" باب سنّة طلاق العبد" ترمذی (۳ - ۴۸۸) کتاب الطلاق باب "ما جاء فی ان طلاق الامة تطليقتان"۔ الحاکم فی "المستدرك" (۲ - ۲۰۵) بیہقی (۷ - ۳۷۰) یہ تمام محدثین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے:

"لونڈی کے لیے طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدّت دو حیض۔"

ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ حدیث مجہول ہے۔ ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ اس کی مرفوع سند صرف وہ ہے جس میں مظاہر بن اسلم راوی ہے اور اس حدیث کے سوا اس سے کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔

اس کے بعد حاکم "المستدرك" میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کے بعد ابو عاصم سے ان کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ ابو عاصم کہتے ہیں کہ میں نے مظاہر بن اسلم سے اس حدیث کا ذکر کیا اور کہا مجھے بھی یہ حدیث سنایئے جیسے آپ نے ابن جریج کو سنائی ہے؛ چنانچہ مظاہر نے قاسم سے اور اس نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مثل سابق حدیث بیان کی۔ حاکم کہتے ہیں مظاہر بن اسلم بصرہ کے شیوخ میں سے تھے۔ ہمارے قدیم شیوخ میں سے کسی نے بھی اس پر نقد و جرح نہیں کی۔ پھر حاکم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک قول اسی ضمن میں ذکر کیا ہے۔ اس قول کو بیہقی (۷ - ۴۲۵) نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی (۳ - ۳۱۱) اس کو حدیث مرفوع قرار دیتے ہیں۔

[1] مغیث:- آلِ ابی احمد بن جَحش کا غلام تھا۔ خطیب اور ابن طاہر دونوں نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ ابن بشکوال کہتے ہیں کہ مُغیث بن جحش آلِ ابی احمد کا آزاد کردہ غلام تھا۔ عراقی نے "المستفاد" (ص ۵۹) میں اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مسند میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

[2] مسند ابن ابی شیبہ (۴ - ۱۵۵) اس روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ اضافہ ہے کہ اگر تو اس عورت کو دوبارہ اپنی طرف لوٹا لے تو تمہیں ایک طلاق کا حق باقی رہے گا جبکہ دو (طلاقیں) اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔

مگر اس روایت میں ایک راوی مجہول ہے۔ اس لیے کہ اس کی سند میں سعید بن ابی عروبہ اپنے اُستاد سے عن یحییٰ ابن ابی کثیر کے حوالے سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں اور یحییٰ میں تدلیس اور ارسال دونوں عیب پائے جاتے ہیں۔ مزید براں بنو نوفل کے آزاد کردہ غلام ابوالحسن نے بھی

کیا۔ غلام نے اسے دو طلاقیں دیں اور وہ اس سے جدا ہو گئی۔ اس کے بعد وہ لونڈی اور غلام دونوں آزاد کر دیے گئے۔ تو اس صورت میں کیا وہ مرد اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے؟ (یعنی بغیر اس کے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ مجامعت کے بعد اسے طلاق دے)

حضرت ابن عباسؓ نے کہا جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فیصلہ کیا تھا۔

حدیث عن عن کے ساتھ روایت کی ہے۔

ابوداؤد (۲-۲۵۷) نے بھی یہ حدیث کتاب "الطلاق" باب "سنۃ طلاق العبد" میں یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کی ہے۔ نسائی (۲:۷-۱۵۴) نے بھی یہ حدیث کتاب "الطلاق" باب "طلاق العبد" میں روایت کی ہے۔ ابن ماجہ (۱-۶۷۲) نے کتاب "الطلاق" باب "من طلق امۃ تطلیقتین" میں روایت کی ہے۔ حاکم (۲-۲۰۵) اور ذہبی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے مگر اس پر کچھ تبصرہ نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اُس عورت کے بارے میں جو طلاق پر ایک گواہ پیش کرے مگر اس کا خاوند اس کی تکذیب کرتا ہو۔

احمد بن خالد نے ابن وضاح سے روایت کی ہے، وہ ابن مریم سے، وہ عمرو بن ابی سلمہ سے، وہ زُہیر بن محمد سے، وہ ابن جریج سے، وہ عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے باپ سے، وہ اس کے دادا سے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جب عورت اس بات کا دعویٰ کرے کہ خاوند نے اسے طلاق دی ہے اور وہ اس پر ایک ثقہ گواہ بھی پیش کرے تو اس کے خاوند سے حلف لیا جائے۔ اگر وہ حلف اُٹھالے تو گواہ کی گواہی باطل ہوگی۔ اور اگر حلف سے انکار کرے تو اس کا انکار ایک اور گواہ کے قائم مقام ہوگا اور طلاق نافذ ہو جائے گی۔[1]

ابن ابی مریم کہتے ہیں کہ میں اس مسئلہ میں ابن القاسم کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتا تھا لیکن جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک اثر مل گیا تو میں نے اسے تسلیم کر لیا اور وہ اُشہب کا قول ہے جس کو انھوں نے امام مالک سے نقل کیا ہے۔[2]

---

[1] ابن ماجہ (۱-۶۵۷) کتاب النکاح باب الرجل یجحد الطلاق میں محمد بن یحییٰ عن عمرو بن ابی سلمہ کی سند کے ساتھ اسی طرح روایت کیا ہے ——— البوصیری "الزوائد" میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ دارقطنی (۴-۶۴) اپنے شیخ ابوبکر نیشاپوری سے ابن ماجہ کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ تاریخ بغداد (۲-۵۴) میں خطیب بغدادی اپنی سند کے ساتھ احمد بن عیسیٰ مصری سے اور وہ عمرو بن ابی سلمہ سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔

[2] امام مالک سے ابن القاسم کی روایت "المدونۃ" (۵-۱۰۸) میں ہے جس میں لکھا ہے کہ ابن القاسم نے امام مالک سے دریافت کیا کہ اگر عورت ایک گواہ اس بات پر پیش کرے کہ اس کے خاوند نے اسے طلاق دی ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ امام مالک فرماتے ہیں اس کے خاوند سے حلف لیا جائے۔ اگر عورت طلاق پر ایک گواہ پیش کرے اور خاوند حلف اٹھانے سے انکار کرے تو میرا خیال ہے کہ خاوند کو قید میں رکھا جائے یہاں تک یا تو وہ حلف اٹھالے یا طلاق دے دے۔

شوافع کا مسلک یہ ہے کہ اس ضمن میں خاوند کے قول کو معتبر سمجھا جائے گا بشرطیکہ وہ حلف اٹھالے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بنیادی بات تو یہ ہے کہ نکاح موجود ہے اور اگر خاوند کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی تو طلاق نہیں ہوگی، لہٰذا خاوند کے قول کو معتبر تصور کیا جائے گا۔ "المجموع" (۱۷-۲۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تخییر[1] کے بارے میں

المدونہ اور بعض دوسری کتابوں میں اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تخییر اور تملیک جمہور فقہاء کے نزدیک ہم معنی ہیں۔ اس کے معنی ہیں عورت کو یہ اختیار دینا کہ خاوند کے نکاح میں رہے یا اس سے الگ ہو جائے۔ جو شخص لغوی مفہوم سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ تملیک کے معنی کسی انسان کو کسی امر کا مالک بنانے کے ہیں کہ وہ اسے انجام دے یا نہ دے۔ ظاہر ہے کہ اسی کا نام تخییر ہے، البتہ امام مالک کے یہاں تخییر و تملیک میں فرق پایا جاتا ہے۔ تملیک کا مفہوم ان کے یہاں عورت کو طلاق کا مالک بنانے کا ہے۔ اب چاہے تو عورت اپنے آپ کو ایک طلاق دے لے اور چاہے تو اس سے زیادہ، لیکن تخییر کا یہ مطلب نہیں۔ تخییر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر عورت طلاق کو اختیار کرتی ہے تو اس کا رشتۂ نکاح بالکل منقطع ہو جائے گا۔ ہاں اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ عورت کو مشروط اختیار دیا گیا ہو۔ مثلاً یوں کہا جائے "اپنے آپ کو اختیار کر و" یا ایک یا دو طلاقیں اختیار کر لو"۔ اس کے برعکس جب عورت کو غیر مشروط اختیار دیا گیا ہو تو امام مالک کے نزدیک عورت یا تو خاوند کے عقدِ زوجیت میں رہے گی یا تین طلاق لے کر الگ ہو جائے گی۔ دیکھیے "بدایۃ المجتہد" (۲۔۵۳)

میں کہتا ہوں کہ امام مالک کا بیان کردہ فرق بہت عمدہ ہے بشرطیکہ لغت سے اس کی تائید ہوتی ہو۔

[2] دیکھیے "المدونۃ" (۲۔۳۸۱) یہ حدیث صحیح بخاری میں سورۃ الاحزاب کی تفسیر میں روایت کی گئی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۷۸۵) نیز صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب "من خیر ازواجہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۶۲) میں بھی اس کو روایت کیا گیا ہے۔ اس روایت میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ اس اختیار کو حضور نے کچھ بھی شمار نہ کیا۔

علاوہ ازیں یہ حدیث صحیح مسلم (۲-۱۱۰۳) کتاب "الطلاق" باب "فی الایلاء و اعتزال النساء"۔ ابو داؤد (۲۔۲۶۲) کتاب "الطلاق" باب "فی الخیار" ترمذی (۳۔۴۸۳) کتاب "الطلاق" باب "ما جاء فی الخیار" میں بھی موجود ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں:

بیوی کو اختیار دینے کے مسئلہ میں اہلِ علم کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا کہ اس صورت میں اگر بیوی اپنے آپ کو اختیار کر لے تو ایک بائنہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ ان دونوں حضرات سے دوسری روایت یہ منقول ہے کہ اس صورت میں ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے اور اگر اپنے خاوند کو اختیار کر لے تو کسی قسم کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اگر بیوی اپنے آپ کو اختیار کرے تو ایک بائنہ طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور اگر اپنے خاوند کو اختیار کرے

کو حکم دیا گیا کہ اپنی ازواجِ مطہرات کو کہہ دیں کہ انھیں آپ کے عقدِ زوجیت میں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار ہے تو آپ نے اس کا آغاز مجھ سے کیا۔ آپ نے فرمایا "میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں۔ اس پر عجلت سے کام نہ لینا اور اپنے والدین سے پوچھے بغیر کوئی بات نہ کہنا"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ بخوبی جانتے تھے کہ میرے والدین مجھے آپ سے الگ ہونے کا مشورہ دینے والے نہ تھے۔

پھر حضورؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (الاحزاب: ۲۸ - ۲۹)

اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت و آرائش کی خواستگار ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کروں۔ اور اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر (یعنی بہشت) کی طلبگار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں ان کے لیے خدا نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میں کس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں۔ میں تو اللہ، رسولؐ اور آخرت کو چاہتی ہوں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں پھر دیگر ازواج نے بھی میری پیروی کی اور ایسا کرنے سے کوئی طلاق واقع نہ ہوئی۔

ربیعہؒ اور ابن شہابؒ[1] کہتے ہیں کہ ازواجِ مطہرات میں سے صرف ایک نے اپنی ذات کو ترجیح دی۔ وہ چلی گئیں اور

تو ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے۔ زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں اگر اپنے خاوند کو اختیار کرے تو ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور اگر اپنے آپ کو اختیار کرے تو تین طلاقیں۔

اہلِ علم اور فقیہہ صحابہ و تابعین نے اس ضمن میں حضرت عمرؓ اور عبداللہؓ بن مسعود کے قول کو اختیار کیا ہے۔ سفیان ثوری اور اہلِ کوفہ کا مسلک یہی ہے، البتہ امام احمد بن حنبل نے حضرت علیؓ کے قول کو اختیار کیا ہے۔" (ترمذی کی بات ختم ہو گئی)

نسائی (۶ - ۱۶۰) نے یہ حدیث کتاب "الطلاق" باب "ما جاء فی التوقیت" میں روایت کی ہے، نیز ملاحظہ ہو ابن ماجہ (۱ - ۶۶۱) کتاب "الطلاق" باب "الرجل یخیر امرأته"۔

[1] ملاحظہ ہو زاد المعاد (۴ - ۶۸) المحلّی لابن حزم (۱۱ - ۲۸۲) ابنِ وہب عبد الجبار بن عمرو اور یحییٰ بن عبدالملک سے وہ دونوں ربیعہ سے بھی روایت کرتے ہیں اور ابنِ حزم کہتے ہیں کہ عبد الجبار بن عمرو اور یحییٰ بن عبدالملک دونوں ضعیف راوی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ مرسل روایت ہے۔

اور ربیعہ سے ربیعہ ابن ابی عبد الرحمٰن مدنی فقیہ مراد ہے۔ یہ عظیم امام، حافظ، مجتہد اور قیاس و اجتہاد میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ اسی لیے آپ "ربیعۃ الرأی" کے نام سے معروف تھے۔ تاریخ دمشق اور تاریخ بغداد میں ان کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔ انھوں نے سنہ ۱۳۶ھ میں وفات پائی۔

ابنِ شہاب کے قول کو ابن حزم نے ابنِ وہب عن عبد الجبار بن عمرو عن ابن شہاب زہری کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور عبد الجبار ضعیف راوی ہے۔ یہ روایت بھی مرسل ہے۔

ان پر بائن طلاق واقع ہوگئی۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ وہ ایک بدوی خاتون تھیں۔ عمرو بن شُعیب کہتے ہیں کہ وہ ضحاک عامری کی بیٹی تھیں اور اپنے اہلِ خانہ کے یہاں چلی گئیں[1]۔

کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاتون کو اپنے گھر میں بسانے کا شرف عطا نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس ابن حبیب کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ان کو اپنے گھر میں آباد کیا تھا۔ ان کا نام فاطمہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد ان کا یہ معمول ہوگیا کہ وہ اونٹ کی مینگنیاں چنتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ میں "بدبخت" ہوں۔ اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ جب عورت کو اختیار دیا جائے اور وہ اپنے خاوند

---

[1] ابن حزم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے جس کے بارے میں ابن حزم کہتے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ مزید براں یہ روایت بھی مرسل ہے۔

اس عورت کا نام فاطمہ تھا۔ وہ ضحاک بن سفیان کلابی کی بیٹی تھی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی زینب کی وفات کے بعد اس کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ جب آیت تخییر نازل ہوئی تو آپ نے دیگر ازواج کی طرح اس کو بھی اختیار دیا۔ اس نے دُنیا کو اختیار کیا۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو طلاق دے دی اور اس واقعہ کے بعد اس کا یہ معمول ہوگیا کہ اونٹ کی مینگنیاں چنتی اور کہا کرتی تھی "میں وہ بدنصیب ہوں جس نے دنیا کو پسند کیا"۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں یہ بات ہماری تحقیق میں درست نہیں۔ اس لیے کہ ابن شہاب زُہری، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور عروہ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی ازواج مطہرات کو اختیار دیا تو اس کا آغاز مجھ سے کیا۔ میں نے اللہ اور اس کے رسول کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد تمام ازواج مطہرات نے میری پیروی کی۔

قتادہؒ اور عکرمہؒ کہتے ہیں جب حضورؐ نے اپنی بیویوں کو اختیار دیا تو اس وقت آپؐ کے یہاں نو بیویاں تھیں اور انہی کی موجودگی میں آپ نے وفات پائی۔ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ جو عورت کہا کرتی تھی کہ میں بدنصیب ہوں یہ وہی عورت ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی چاہی تھی۔ حضورؐ سے علیحدگی چاہنے والی عورت کے بارے میں علماء کے یہاں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ دراصل اس ضمن میں کوئی روایت بھی صحیح نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضحاک بن سفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بیٹی فاطمہ کی پیشکش کی اور کہا کہ یہ بالکل باکرہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔ ایک قول کے مطابق حضورؐ نے ۸ھ میں اس کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ (ابن عبدالبر کا بیان ختم ہوا)

حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابۃ" (۴ - ۲۷۱) میں لکھا ہے کہ:

ابن شہاب زُہری کی حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ عورت جو کہا کرتی تھی کہ میں بدنصیب ہوں تو آپؐ سے پناہ مانگنے والی بھی وہی ہے "اس کو واقدی نے ابن مناح سے نقل کیا ہے۔ اس سے ابن اسحاق کے اس قول کی تردید نہیں ہوتی کہ کلابیہ عورت نے اپنے آپ کو اختیار کیا تھا اور وہ کہا کرتی تھی کہ میں بدنصیب ہوں"۔ اس لیے کہ دونوں اقوال میں جمع و تطبیق ممکن ہے۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ پناہ مانگنے والی عورت کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ابن حجر نے ابن سعد کی روایت سے اختلافی اقوال کا تذکرہ کیا ہے۔ (الاصابۃ) (ابن حجر کا بیان ختم ہوا)

کو اختیار کرے تو اس صورت میں اس پر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ طلاق کو ترجیح نہ دے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب، زید بن ثابت، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی موقف ہے۔

حضرت علیؓ[1] سے اس ضمن میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ ایک قول تو اسی مسلک سے ہم آہنگ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر عورت اپنے خاوند کو اختیار کرے تو اس پر ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور اگر اپنی ذات کو اختیار کرے تو بائن طلاق واقع ہوتی ہے۔

عبدالرزاق[2] نے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اگر عورت اپنے آپ کو اختیار کرے تو ایک بائن طلاق واقع ہوتی ہے اور اگر اپنے خاوند کو اختیار کرے تو ایک رجعی طلاق پڑتی ہے۔

ابن سلام نے اپنی تفسیر میں قتادہ سے روایت کی ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق[3] میں حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ[4] نے عورتوں کو دنیا و آخرت میں سے ایک چیز پسند کرنے کا اختیار دیا ہے لیکن انھیں طلاق دینے یا نہ دینے کا اختیار نہیں دیا۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۷ - ۹)

[2] مصنف عبدالرزاق (۷ : ۹ - ۱۱)

[3] مصنف عبدالرزاق (۷ - ۱۰)

[4] مصنف عبدالرزاق (۷ - ۱۱) عبدالرزاق معمر سے روایت کرتے ہیں۔ معمر نے کہا مجھے اس شخص نے بتایا جس نے حسن بصری سے سنا تھا مگر اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے تاہم قرآن کریم کا سیاق و سباق اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول سے حسن بصری کے قول کی تردید ہوتی ہے۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو اس بات کا اختیار دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ دار آخرت اور دنیا کی زیب و زینت میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرلیں اور دنیوی ساز و سامان کو اختیار کرنے کی صورت میں انھیں رسول کریمؐ سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی اور بلا شبہ اسی کا نام طلاق ہے۔ دیکھیے زاد المعاد (۴ - ۶۸)

لونڈی کی حُرمت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

الزّجاج اور النحاس اپنی اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی زینب بنت جحش کے یہاں جاکر شہد پیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اور حفصہؓ نے مشورہ کیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے جس کے یہاں بھی تشریف لے جائیں ہم عرض کریں کہ آپ کے مُنہ سے مغافیر کی بُو آتی ہے[1]۔ الزجاج کہتے ہیں مغافیر ایک بُودار گوند کا نام ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ ایک طرح کی سبزی ہوتی ہے۔

دوسری کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدبو کو سخت ناپسند فرمایا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں (حفصہؓ اور عائشہؓ) میں سے ایک کے یہاں تشریف لے گئے تو انھوں نے کہا "یا رسول اللہ! مجھے آپ کے مُنہ سے مغافیر کی بُو آ رہی ہے" پھر دوسری بیوی کے گھر آئے تو انھوں نے بھی یہی کہا۔ حضورؐ نے فرمایا "میں نے شہد پیا تھا (اس لیے یہ بُو آ رہی ہے) میں اس کا اعادہ نہیں کروں گا"۔

النحاس اور الزجاج دونوں کہتے ہیں کہ آپؐ نے شہد کو اپنی ذات پر حرام ٹھہرا لیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپؐ نے حلف اٹھا کر اپنے اوپر شہد کو حرام کرلیا۔ چنانچہ تفسیر میں ایسے ہی منقول ہے اور یہی بات زیادہ معروف بھی ہے۔ النحاسؒ نے یہ بھی لکھا ہے

---

[1] ابنِ سعد، عبد بن حُمَید، ابن المنذر اور ابنِ مَردَویہ نے بھی اس حدیث کو اسی طرح روایت کیا ہے۔ دیکھیے سیوطی کی "الدرّ المنثور (۶-۲۳۹) امام بخاری نے اس کو کتاب "التفسیر" میں (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۹۱۲) حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زینب بنت جحش کے گھر جاکر بیٹھا کرتے اور شہد پیا کرتے تھے۔ میں نے اور حفصہؓ نے مشورہ کیا کہ حضورؐ ہم دونوں میں سے جس کے گھر میں بھی تشریف لائیں تو انھیں کہا جائے کہ آپؐ کے مُنہ سے مغافیر کی بُو آتی ہے۔ یہ سُن کر حضورؐ نے فرمایا "میں زینب بنت جحش کے یہاں جاکر شہد پیا کرتا ہوں آیندہ ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے حلف اٹھا لیا ہے۔ تم نے کسی کو بتانا نہیں"۔

"الجصاص" نے احکام القرآن میں اس کا ذکر کیا ہے۔ احکام القرآن (۳-۴۶۴)

[2] الہیثم بن کُلَیب نے اپنی مُسند میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہؓ سے کہا۔ "ماریہ اُمّ ابراہیم مجھ پر حرام ہے مگر کسی کو بتائیں نہیں"۔ حفصہؓ نے کہا "جو چیز اللہ نے آپ پر حلال کی تھی آپ اس کو حرام ٹھہرا رہے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ کی قسم! میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا"۔ اور آپؐ نے ان سے علیحدگی اختیار کیے رکھی۔ یہاں تک کہ حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کو یہ واقعہ

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کی باری کے دن اپنی لونڈی ماریہ امِّ ابراہیم کے ساتھ خلوت میں رہے۔ النحاس کا قول ہے کہ یہ واقعہ حضرت حفصہؓ کے گھر میں پیش آیا۔ المنفصل کہتے ہیں کہ حضرت حفصہؓ اپنے والد حضرت عمرؓ کے یہاں گئی تھیں۔ حضرت حفصہؓ جب واپس آئیں تو دروازے کو بند پایا۔ آپ دروازے پر بیٹھ گئیں حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازہ کھولا۔ النحاس کا بیان ہے کہ حضرت حفصہؓ نے کہا "یا رسول اللہ! آپ نے مجھے حقیر جانا"۔ دیگر محدثین کے الفاظ یہ ہیں کہ حفصہؓ نے کہا "یا رسول اللہ! کیا آپ کی ازواج میں دوسری کوئی بیوی مجھ سے حقیر تر نہ تھی؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عائشہؓ کو نہ بتانا"۔ حفصہؓ نے کہا "نہیں بتاؤں گی"۔ آپؐ نے ماریہ کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپؐ نے اس پر حلف بھی اٹھایا تھا۔ پھر حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کو بتا دیا مگر حضورؐ سے یہ بات پوشیدہ رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اس سے آگاہ کر دیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

بندو بست اس پر آیت نازل ہوئی:

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ	اللہ نے تم لوگوں کے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔
(التحریم۔ ۲)	

اس حدیث کی سند صحیح ہے اگرچہ صحاح ستہ میں سے کسی میں بھی موجود نہیں۔ الضیاء المقدسی نے اپنی کتاب "المستخرج" میں یہ روایت نقل کی ہے۔ دیکھیے تفسیر ابن کثیر (۴۔ ۴۱۱-۴۱۰)

ابوبکر الجصاص "احکام القرآن" (۳۔ ۴۶۴) میں تحریر کرتے ہیں:

"یہ دونوں واقعات (شہد کی تحریم اور ماریہ قبطیہ کی تحریم) بیک وقت اس آیت کا سبب نزول قرار پا سکتے ہیں، یعنی حضورؐ نے شہد اور ماریہ دونوں کو اپنے لیے حرام ٹھہرا لیا، مگر واضح تر بات یہ ہے کہ آپؐ نے ماریہ کو حرام ٹھہرایا تھا اور یہ آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی۔ اس لیے کہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ" (آپؐ اپنی بیویوں کی رضامندی چاہتے ہیں) ظاہر ہے کہ شہد کے ترک کرنے سے ازواج مطہرات کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی۔ البتہ ماریہ کی تحریم خوشنودی کا باعث بن سکتی ہے۔ شہد کے بارے میں منقول ہے کہ آپؐ نے اس کو حرام ٹھہرا لیا تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے شہد نہ پینے کا عہد کیا تھا۔ اسی لیے حسن بصری کہا کرتے تھے کہ حضورؐ نے ماریہ کو حرام ٹھہرایا تھا۔ شعبی مسروق سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی اور حرام ٹھہرا لیا تھا۔ آپؐ سے کہا گیا کہ جس چیز کو آپؐ نے حرام قرار دیا ہے وہ تو حلال ہے۔"

قرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت ماریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت حفصہؓ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ بعض مفسرین کا میلان دونوں واقعات کو جمع کرنے کی جانب ہے۔ اس لیے کہ دونوں واقعات صحیح سندوں کے ساتھ منقول ہیں۔ جمع و تطبیق کا طریقہ یہ ہے کہ حضورؐ کو دونوں واقعات پیش آئے تھے اور دونوں ہی کے بارے میں یہ آیت اتری۔ نیز دونوں واقعات میں مذکور ہے کہ آپؐ نے اپنی کسی بیوی کے ساتھ رازدارانہ طور پر بات کی تھی۔ فتح القدیر (۵۔ ۲۵۲)

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ۔ (التحریم - ۳)

اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی تو اس نے دوسری کو بتا دی جب اس نے اس کو افشا کیا اور اللہ نے اس (حال) سے پیغمبر کو آگاہ کر دیا تو پیغمبر نے (اس بیوی کو وہ بات کچھ تو بتائی اور کچھ نہ بتائی۔

ایک دوسری قرأت کے مطابق آیت کے الفاظ یہ ہیں:

عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ۔ — ایک حصّے کو مہیا نا اور دوسرے سے انکار کر دیا۔

اس قراءت میں "عَرَفَ" تخفیف (را) سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بتایا کہ کسی حلال چیز کو اگر حرام قرار دے دیا جائے تو وہ حرام نہیں ٹھہرتی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ط وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (التحریم - ۱)

اے پیغمبر! جو چیز خدا نے تمھارے لیے جائز کی ہے تم اس سے کنارہ کشی کیوں کرتے ہو؟ (کیا اس سے) اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہو اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دے۔ آیت کی دونوں توجیہات کے پیش نظر کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ (التحریم - ۲)

خدا نے تم لوگوں کے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔

اس آیت میں کفارۂ قسم کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے کہ حرام ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ آپ نے حلف بھی اٹھایا تھا۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس آیت میں کفارۂ تحریم کا ذکر ہے نہ کہ کفارۂ قسم کا۔ المفضل کہتے ہیں کہ یہ قتادہ کی رائے ہے۔

ؔ جمہور کی قراءت عَرَّفَ ہے جس کا مصدر تعریف ہے۔ اس کے برعکس حضرات علی، طلحہ بن مطرف، ابو عبدالرحمٰن السلمی، حسن بصری، قتادہ اور کسائی اس کو تخفیف کے ساتھ عَرَفَ پڑھتے ہیں، جبکہ ابو عُبَید اور ابو حاتم نے پہلی قراءت کو اختیار کیا ہے۔ دیکھیے فتح القدیر (۵ - ۲۵۰)

ؔ ابوبکر الجصاص "احکام القرآن" (۳ - ۴۶۴) میں تحریر کرتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے قسم کا کفارہ مقرر کیا ہے۔ مجاہد اور عطاء کہتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنی لونڈی کو حرام ٹھہرا لیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہ سے بھی یہی منقول ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے لونڈی کو حرام بھی ٹھہرایا تھا اور حلف بھی اٹھایا تھا تو آیت کے ظاہری الفاظ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آیت میں صرف تحریم کا ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ آیت میں جو بات مذکور نہیں اس کو اس آیت سے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ کسی چیز کو حرام قرار دینا بھی گویا ایک قسم ہے۔ حسن بصری اور ابراہیم نے بھی یہی بات کہی ہے۔

مسروق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ کے قریب نہ جانے کا حلف اٹھا لیا تھا اور کہا کہ یہ مجھ پر حرام ہے۔ اسی موقع پر قسم کے کفارہ کا حکم نازل ہوا۔ اور آپؐ کو حکم دیا گیا کہ اللہ نے جس چیز کو آپؐ کے لیے حلال ٹھہرایا ہے اس کو

حلال کر دیا جائے۔ اس طرح یہ بات لازم ٹھہری کہ تحریم کو بھی قسم قرار دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کا نام لے کر اس میں قسم کے کفارہ کو ٹھہرایا ہے۔

لہ دیکھیے صحیح بخاری کتاب التفسیر (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۹۱۱) اس میں ہے کہ پھر ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب - ۲۱) بے شک تمھارے لیے رسول کریمؐ کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے۔

سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کو فرماتے سنا کہ اپنی بیوی کو حرام قرار دینے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کہنے کے بعد انھوں نے مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کی۔ (حدیث نمبر ۵۲۶۶) "لَيْسَ بِشَيْءٍ" (کچھ بھی نہیں) کا مطلب یہ ہے کہ اس سے عورت پر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو نسائی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بیان کی ہے۔ کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہا "میں نے اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا ہے۔" ابن عباسؓ نے کہا "تم نے جھوٹ بولا وہ تم پر حرام نہیں ہے۔" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ (التحریم-۱) پھر کہنے لگے تم ایک غلام آزاد کرو۔" ابن عباسؓ کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ دولت مند آدمی ہے۔ اس لیے آپ نے اس پر زیادہ سے زیادہ کفارہ لازم ٹھہرایا، مگر نسائی ان الفاظ کے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔

صحیح مسلم (۲ - ۱۱۰۰) میں ہے کہ ہشام دستوائی کہتے ہیں کہ یحییٰ بن ابی کثیر نے یہ حدیث مجھے تحریر کر کے بھیجی جو ان کو یعلیٰ بن حکیم نے سنائی تھی۔ یعلیٰ نے سعید بن جبیر سے اور انھوں نے ابن عباسؓ سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو حرام ٹھہرانا ایک قسم ہے، لہٰذا اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ پھر یہ آیت تلاوت کی "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (الاحزاب-۲۱)

مفسر ابن کثیر کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے تحریم کو قسم ٹھہرایا۔ تفسیر ابن کثیر (۴ - ۳۸۱)

حضرت عائشہؓ سے بھی ابن عباسؓ ہی کی طرح منقول ہے۔ دیکھیے دارقطنی (۴ - ۴۲)

لہ مسروق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے قریب نہ جانے کی قسم کھالی اور ان کو حرام قرار دے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے حرام کردہ کو حلال ٹھہرایا اور قسم کا کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔

مسلم بن علقمہ نے اس حدیث کو اسی طرح داؤد سے روایت کیا ہے۔ وہ شعبی سے، وہ مسروق سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ علی بن مسہر اور دوسرے راوی اس کو شعبی سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کا مرسل ہونا ہی زیادہ صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ۳ - ۵۰۹) کتاب "الطلاق" باب "مَا جَاءَ فِي الْإِيلَاءِ" ابن جریر طبری اپنی تفسیر

حرام نہ ٹھہرائیں (اور اس قسم کا کفارہ ادا کریں) شعبیؒ نے یہی بات کہی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں امام مالک نے زیدؒ بن اسلم سے یہی بات نقل کی ہے۔

ابن سلام اپنی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں:

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ (التحريم - ۲) خدا نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے

اس آیت میں قسم کا کفارہ مراد ہے جس کا ذکر سورۂ المائدہ میں کیا گیا ہے۔

سورۃ المائدہ میں فرمایا:

فَكَفَّارَتُهٗ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ اس (قسم) کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

حسن بصری کہتے ہیں لونڈی کو حرام قرار دینا قسم کے مترادف ہے اور آزاد عورت کو حرام ٹھہرانے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

الفراءؒ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام آزاد کیا اور پھر ماریہؓ سے رجوع کیا تھا۔ یہ فیصلہ تو لونڈی کے بارے میں ہے۔ جہاں تک آزاد عورت کا تعلق ہے اگر خاوند کہے کہ تو مجھ پر حرام ہے تو امام مالک اور ان کے اصحاب و تلامذہ کے نزدیک اگر بیوی مدخولہ ہو تو تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اگرچہ خاوند نے طلاق کی نیت نہ رکھی ہو۔ اہل کوفہ کہتے ہیں کہ اگر خاوند طلاق کی نیت کرے تو حرام کہنے سے ایک بائن طلاق واقع ہوتی ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور اگر خاوند کا ارادہ قسم کا ہو تو اُسے قسم ہی قرار دیا جائے گا۔

میں مسروق سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے ایلاء کیا اور ان کو حرام ٹھہرایا۔ تحریم کرنے پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو متنبہ فرمایا اور قسم کا کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔

لہ ایک نسخہ میں "شافعی" ہے جو کہ غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ روایت شعبی سے منقول ہے۔ شعبی کا نام عامر بن شراحیل ہمدانی کوفی ہے۔ یہ اکابر تابعین میں سے تھے۔ پانچ سو صحابہ کرام سے ملے اور ان سے حدیثیں روایت کیں۔ یہ عظیم فقیہ، حافظ حدیث اور کتاب و سنت کے جید عالم تھے۔ یہ بہت بڑے قاضی بھی تھے۔ ان کے عہد میں ان سے بڑھ کر کوئی فقیہ نہ تھا۔ امام ابو حنیفہ نے ان سے فقہ کا درس لیا۔ ۱۰۰ھ کے بعد اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

سلہ زید بن اسلم عظیم امام اور مدینہ کے بہت بڑے فقیہ تھے۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ اور نسبت العمری تھی۔ مسجد نبوی میں معلم تھے۔ یہ امام مالک، سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ اور بہت سے لوگوں کے استاد تھے۔ انھوں نے ایک تفسیر لکھی تھی جس کو ان کے بیٹے عبد الرحمٰن ان سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے ۱۳۶ھ میں وفات پائی۔

سلہ دیکھیے معانی القرآن للفراء (۳ - ۱۶۵) الفراء کا تعارف آگے آرہا ہے۔

سلہ اس مسئلہ میں بہت سے اقوال ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ تحریم کسی چیز کی ہو بیوی کی یا کسی اور چیز کی اس کا کچھ اثر مترتب نہیں ہوتا۔ نہ تو یہ طلاق ہے نہ ایلاء، نہ قسم اور نہ ظہار۔ (دیکھیے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

مصنف عبدالرزاق (۶ - ۴۰۳) امام شعبی بیوی کو حرام ٹھہرانے کے سلسلے میں کہتے ہیں "میرے نزدیک اس کی اہمیت میرے جوتے کے برابر بھی نہیں "۔

امام مالک اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ :

"یہ قسم نہیں ہے لہٰذا حرام ٹھہرانے والے کے ذمے کچھ بھی دینا نہیں آتا۔ اس لیے کہ جو شخص تحریم کا ارتکاب کرتا ہے وہ شریعت کو بدلنا چاہتا ہے، لہٰذا اس کا یہ فعل لغو اور عبث ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے "یہ میری سوتیلی بیٹی ہے"۔ (تو اس کا کچھ اثر مرتب نہیں ہوتا) المغنی لابن قدامہ (۹ - ۵۱۲)

۲ - دوسری رائے یہ ہے کہ بیوی کو حرام قرار دینے سے اس پر تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔ حضرت علی ابن ابی طالب، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور حسن بصریؒ اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی رائے یہی ہے۔ دیکھیے ابن حزم کی المحلی (۱۱ - ۴۸۴) یہ حضرات تحریم کو طلاق کے کنایہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور تحریم کے لیے طلاق کی اعلیٰ حد تین ہے، لہٰذا تحریم کو طلاق کی اعلیٰ قسم پر محمول کیا جائے گا۔ دیکھیے زاد المعاد (۴ - ۴۷)

۳ - تیسرا قول یہ ہے کہ بیوی اگر مدخولہ ہو تو اس پر تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ اور اگر غیر مدخولہ ہو تو خاوند کی نیت معتبر ہوگی کہ آیا اس کی مراد ایک طلاق ہے یا دو یا تین۔ یہ قول امام مالک سے منقول ہے۔

۴ - چوتھا قول یہ ہے کہ اس کا انحصار خاوند کی نیت پر ہے۔ اگر اس کی نیت تین طلاق کی ہو تو تین ہوں گی۔ اور اگر نیت اس سے کم کی ہو تو ایک بائن طلاق تصور کی جائے گی۔ اور اگر تحریم سے اس کی نیت قسم کی ہو تو اسے قسم قرار دیا جائے گا اور اگر نیت کچھ بھی نہ ہو تو یہ ایلاء ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کی رائے ہے، مگر سفیان ثوری یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خاوند نے کسی چیز کی نیت نہ کی ہو تو اسے کذب پر محمول کیا جائے گا اور خاوند کے ذمے کچھ بھی واجب الادا نہ ہوگا۔ محلی ابن حزم (۱۱ - ۴۸۴)

۵ - پانچواں قول یہ ہے کہ ہر حال میں بیوی پر ایک بائن طلاق واقع ہوگی۔ قتادہ نے ایک شخص سے روایت کی ہے جس نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے سنا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر حرام ہے تو وہ حرام ہو جائے گی اور حلال تب ہوگی جب وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے، اور طلاق کے بعد پھر پہلے خاوند کے عقد زوجیت میں آئے۔ حسن بصری، خلاس ابن عمرو اور جابر بن زید کا قول بھی یہی ہے۔ (مصنف عبدالرزاق (۶ - ۴۰۴)

۶ - اس سے ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ اور حماد بن ابی سلیمان سے اسی طرح منقول ہے (محلی ابن حزم (۱۱ - ۴۸۴)

۷ - ساتواں قول یہ ہے کہ یہ ظہار ہے اور اس میں ظہار کا کفارہ واجب الادا ہے۔ یہ صحیح روایت عبداللہ بن عباسؓ سے بطریق عبدالرحمٰن بن مہدی عن سفیان ثوری عن منصور ابن المعتمر عن سعید ابن جبیر عن ابن عباسؓ نقل کی گئی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ بیوی کو حرام ٹھہرانے اور نذر ماننے کے سلسلے میں ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے۔ یا دو ماہ کے پے در پے روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ سعید بن جبیر، وہب بن منبہ، عثمان البتی اور امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مسلک ہے (محلی ابن حزم (۱۱ - ۴۸۵)

الفراء کہتے ہیں جو لوگ "عَرَفَ" بتخفیف الراء پڑھتے ہیں وہ اسی طرح ہے جیسے کہیں "اس سے نارض ہوا" ___ مثلاً کوئی شخص آپ سے بُرا سلوک کرے اور آپ اسے یوں کہیں کہ "میں تجھ سے سمجھ لوں گا"

۸۔ اس ضمن میں ایک مسلک یہ بھی ہے کہ ایسی عورت کے بارے میں توقف سے کام لیا جائے یعنی ایسی عورت کو خاوند کے لیے نہ حلال ٹھہرا سکتا ہے اور نہ حرام، چنانچہ شعبی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا "میں اس عورت کو اس کے لیے نہ حلال ٹھہرا سکتا ہوں اور نہ ہی حرام، اگر آپ چاہیں تو آگے بڑھیں اور اگر چاہیں تو پیچھے ہٹ جائیں۔ (مصنف عبدالرزاق (۶ - ۴۰۴)

علماء کی یہ چند آراء ہیں جن کا اس ضمن میں ذکر کیا گیا ہے۔

ان آراء کے مطالعہ کے بعد آیت کریمہ "یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ" "قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ" کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حلال کو حرام ٹھہرانے کو قسم قرار دیا ہے اور اس کا کفارہ ادا کرنا واجب ٹھہرایا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی، جو کہ بذاتِ خود اس واقعہ میں شریک ہیں، یہی فرماتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرؓ سے بھی یہی منقول ہے۔ اور یہی بات قرین عقل و قیاس بھی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ان لوگوں کے قول کو ترجیح دی ہے جو کہتے ہیں کہ کسی چیز کی تحریم قسم ہے، لہٰذا اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی اگرچہ اس نے اس حلف سے طلاق کا ارادہ بھی کیا ہو دیکھیے فتاویٰ ابن تیمیہؒ (۱۳ - ۱۹۰)

لہ الفراء کا نام و نسب ابوزکریا یحییٰ بن زیاد بن عبداللہ بن منظور دیلمی المعروف بالفراء۔ کوفی علماء کے امام اور نحو و لغت میں اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

"اگر اہل بغداد و کوفہ کے یہاں علماءِ لغت میں سے الکسائی اور الفراء کے سوا دوسرا کوئی عالم نہ بھی ہوتا تو بھی وہ سب لوگوں پر اظہار تفوق کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ ان دونوں علماء پر علم و فضل کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ الفراء علم نحو کا زندہ پیکر اور دنیائے نحو کے امیر المومنین ہیں"

الفراء نے علم معانی، بیان اور لغت پر متعدد کتب تصنیف کیں۔ ان کی تصنیف "معانی القرآن" عظیم ترین کتاب ہے۔ دارالکتب المصریۃ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جس کا نمبر ۱۰۱ س (قسم التفسیر) ہے۔ بعد ازاں پروفیسر احمد یوسف نجاتی اور محمد علی النجار کی محنت و کاوش سے یہ کتاب دو جلدوں میں مطبع دارالکتب سے ۱۳۷۴ھ میں شائع ہوئی۔

الفراء نے ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔ ان کے مفصل تعارف کے لیے دیکھیے (تاریخ بغداد (۱۴ – ۱۴۹ - ۱۵۵) وفیات الاعیان (۲ - ۲۲۸) اور الاعلام (۹ - ۱۷۸)

امام حسن بصری کہتے ہیں "عَرَفَ بَعْضَہٗ" یعنی واقعہ کے ایک حصّہ کا اقرار کیا۔[2] مطلب یہ ہے کہ ماریہؓ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا حضورؐ نے اس کا اعتراف فرمایا۔ "وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ" یعنی واقعہ کے دوسرے حصّے سے اعراض فرمایا۔ مراد یہ ہے کہ آپؐ نے حضرت حفصہؓ سے جو رازدارانہ بات کی تھی کہ میرے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے اور ان کے بعد حضرت عمرؓ۔ یہ راز بتلا کر آپؐ نے حضرت حفصہؓ سے کہا تھا کہ اس راز کو افشا نہ کریں۔

لہ معانی القرآن میں "عرف" (بتخفیف الراء) ہے۔ "(فراء کی بات ختم ہوئی)

ٹہ ابن حیّان نے "البحر المحیط" (۸ - ۲۹) میں اس کا ذکر کیا ہے، مگر انھوں نے اس کو حسن بصری کی طرف منسوب نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں: "عَرَّفَ" بتشدید الراء ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی "عَرَّفَهَا بَعْضَہٗ" یعنی اس بات کا کچھ حصہ اپنی بیوی کو بتا دیا۔ بعض علماء کے نزدیک وہ حصہ یہ تھا کہ میرے بعد ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے اور ان کے بعد عمرؓ۔ اور جس بات سے حضورؐ نے پہلوتہی فرمائی وہ ماریہؓ کا واقعہ تھا۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ "عَرَفَ" (بتخفیف الراء) کی نسبت حسن بصری کی جانب درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ بتشدید الراء ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے زمخشری کی "الکشاف" بھی دیکھیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو تین سے کم طلاقیں دے پھر اس سے رجوع کرلے

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ امام مالک اور سفیان بن عُیَیْنَہ زُہری سے روایت کرتے ہیں اور زُہری، ابن المسیّب، حُمَید بن عبدالرحمٰن، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ اور سُلیمان بن لیسار سے روایت کرتے ہیں۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ ہم نے ابوہریرہؓ سے سُنا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے حضرت عمرؓ سے سُنا وہ فرماتے تھے جس عورت کو اس کا خاوند ایک یا دو طلاقیں دے دے پھر اس کو چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ پھر دوسرا خاوند مرجائے یا اس عورت کو طلاق دے دے، اور پھر پہلا خاوند اس سے نکاح کرلے، تو وہ عورت پہلے خاوند کے یہاں باقی ماندہ طلاقوں کی بنیاد پر رہے گی۔ (مثلاً پہلے اسے ایک طلاق دی تھی تو مزید دو طلاق دینے سے اس پر تین طلاقیں پڑ جائیں گی)[1]

حضرت علیؓ اور اُبَیّ بن کعب بھی حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق ہیں۔ اسی طرح عمران بن حُصَین و ابوہریرہؓ کا مسلک بھی یہی ہے[2]۔ حضرت عبداللہ بن مبارک، عثمان بن مِقسم سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے نُبَیْہ بن وہب سے سُنا کہ وہ اپنے قبیلے کے ایک شخص سے، جو اصحابِ رسول میں سے تھے، سُن کر حدیث بیان کر رہے تھے کہ رسولِ اکرمؐ نے اس ضمن میں یہ فیصلہ کیا کہ اس عورت کا نکاح باقی ماندہ طلاق کی بنیاد پر ہوگا[3][4]۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۶-۳۵۱)

[2] حسن بصری کا قول بھی یہی ہے۔ اس ضمن میں قاضی شریح کی رائے کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۶-۳۵۲) اور سنن بیہقی (۷-۳۶۵)

[3] ایک نسخہ میں اُبَیّ بن کعب ہے، مگر صحیح نبیہ بن وہب ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں بھی اسی طرح ہے۔ نبیہ بن وہب بن عثمان بن ابی طلحہ مدنی کو نسائی نے ثقہ قرار دیا ہے۔

[4] ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق (۶-۳۵۴، ۳۵۳)۔ اکثر محدثین نے عثمان بن مقسم کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ذہبی "المیزان" (۳-۵۶) میں لکھتے ہیں:

"عثمان بن مقسم البُرّی ابوسلمہ الکندی البصری عظیم ائمہ میں شمار کیے جانے کے باوجود روایتِ حدیث میں ضعیف راوی قرار دیے جاتے ہیں۔ یحییٰ القطان اور عبداللہ بن مبارک اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں۔ امام احمد اس کو منکر الحدیث قرار دیتے ہیں۔ الجوزجانی کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے۔ نسائی اور دارقطنی اس کو متروک قرار دیتے ہیں۔ اس حدیث کی سند میں ایک مجہول راوی بھی ہے۔

امام مالک کا موقف بھی یہی ہے[۱]۔

عبدالرزاق[۲]، ابن التیمی سے بھی روایت کرتے ہیں، وہ اپنے والد سے، وہ ابو مجاز سے، وہ قاضی شریح اور عبداللہ بن عباس سے، کہ ان دونوں حضرات کے قول کے مطابق کہ جب نکاح نیا ہو گا تو طلاق بھی از سر نو شمار کی جائے گی اور حضرات عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور عطاء سے بھی اسی طرح منقول ہے۔

سفیان ثوری اور معمر کہتے ہیں کہ فریقین کی رائے کے مطابق اگر دوسرے خاوند نے اس عورت سے مجامعت نہ کی تو پہلے خاوند سے دوسرے نکاح کی صورت میں اس پر صرف باقی ماندہ طلاقوں ہی کا اطلاق ہو گا۔

معمر کہتے ہیں کہ یہی مسلک امام نخعی نے اختیار کیا ہے اور ہمارے علم کی حد تک اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

---

[۱] فقہاء میں سے امام شافعی، اوزاعی، ثوری، ابن ابی لیلیٰ، محمد بن حسن اور زفر کا یہی مسلک ہے اور صحابہ کرام میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی رائے بھی یہی ہے۔ دیکھئے "المحلی" (۱۱-۶۱۱)

[۲] ان کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح دوسرے خاوند کا اس عورت سے مجامعت کرنا پہلے خاوند کے لیے مباح ہونے کے لیے شرط نہیں، بعینہ اسی طرح طلاق کے سلسلے میں بھی مؤثر نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے شبہ کی بنا پر مجامعت مؤثر نہیں۔ (المہذب مع المجموع (۱۶-۲۸۷)

امام احمد بن حنبل سے اس مسئلہ میں دو روایات منقول ہیں:

۱۔ ایک روایت یہ ہے کہ عورت جب پہلے خاوند سے نکاح کرے گی تو اس پر صرف باقی ماندہ طلاقوں کا اطلاق ہی ہو گا۔ امام مالک اور امام شافعی کا قول بھی یہی ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر تین طلاقوں کا اطلاق ہو گا۔ امام ابو حنیفہ اور قاضی ابو یوسف بھی یہی کہتے ہیں۔

اول الذکر کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ دوسرے خاوند کی مجامعت سے حلت کا اثبات ہوتا ہے، لہٰذا اس سے ایسی حلت کا اثبات ہو گا جس میں تین طلاقوں کی گنجائش ہو۔ جس طرح اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ پہلے خاوند نے تین طلاقیں دی ہوں۔ اس لیے کہ دوسرے خاوند کی مجامعت جب طلاقِ ثلاثہ کو ساقط کر دیتی ہے، تو تین سے کم کو تو بطریق اولیٰ ساقط کر سکے گی۔ دیکھئے "المغنی" (۷-۴۴۳-۴۴۴)

اس لیے کہ اہل علم میں اس بارے میں اتفاق رائے ہے کہ عورت جب تین طلاق کی بنا پر خاوند سے الگ ہو، پھر دوسرے خاوند سے نکاح کرنے کے بعد پہلے خاوند کی جانب لوٹ آئے تو اجماعاً اس کو تین طلاق کا حق ہو گا۔ بنا بریں جب پہلے خاوند سے تین سے کم طلاق لے کر الگ ہوئی ہو تو دوبارہ اس کے یہاں آنے کی صورت میں کیونکر تین طلاق کا حق نہ ہو گا؟ یہ بات المنذر نے بیان کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

[۳] مصنف عبدالرزاق (۶-۳۵۵)

اولاد کی پرورش کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مصنف عبدالرزاق[۲] میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت کو اس کے خاوند نے

---

[۱] الحِضَانۃ: بکسر الحاء وفتح الضاد حَضَنَ کا مصدر ہے۔ الجوہری کہتے ہیں "حَضَنَ الطَّائِرُ بَیْضَۃُ" (پرندے نے انڈا سیا) حِضَانہ پرورش کو کہتے ہیں۔ القاموس میں ہے "حَضَنَ الصَّبِیِّ حِضَانَۃً" (بچے کی پرورش کی) شرعاً حضانہ کا مفہوم چھوٹے بچے یا بچی کی پرورش ہے۔ جیساکہ جامع الرموز میں لکھی ہے۔ (اصطلاحات العلوم الاسلامیہ (۲-۲۹۳).

البتہ بالغ کی پرورش کو شرعاً حضانہ نہیں کہا جاتا۔ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق (۷-۱۵۳)۔ اس کی سند میں مثنّٰی بن الصباح ضعیف راوی ہے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو عمرو بن شعیب کی وجہ سے متروک نہیں قرار دیا ہے، مگر اس سے اختلاط کا ارتکاب ہوا ہے۔ بخاری نے "التاریخ الصغیر" میں اس کا تذکرہ کیا ہے (التاریخ الصغیر ص ۷۰) نسائی نے اس کو ضعیف اور متروک راویوں میں شمار کیا ہے۔ دیکھیے امام نسائی کی کتاب (الضعفاء والمتروکین" ص ۳۰۴)

مگر یہ حدیث دو صحیح سندوں کے ساتھ بھی روایت کی گئی ہے جن میں مثنّٰی بن الصباح شامل نہیں ہے۔ مثلاً امام احمد (۲-۱۸۲) اس حدیث کو ابن جُریج سے روایت کرتے ہیں۔ ابو داؤد (۲-۲۸۳) اور حاکم (۲-۲۰۷) اوزاعی سے۔ پھر ابن جُریج اور اوزاعی دونوں عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے والد سے، وہ ان کے دادا عبداللہؓ بن عمرو سے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ امام ذہبی کی بھی یہی رائے ہے۔ عمرو بن شعیب کی حدیث کو چونکہ قابل حجت تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے یہ حسن کے درجہ سے فروتر نہیں۔ مزید براں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو آپ نے حضرت عمرؓ کی بیوی کے بارے میں فرمایا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "یہ اپنے بچے کے لیے زیادہ رحمدل، زیادہ نرم دل اور شفیق ہے۔ اس لیے جب تک نکاح نہ کرے یہ بچے کی پرورش کی زیادہ حق دار رہے گی"

یہ حدیث عبدالرزاق نے المصنف میں سفیان ثوری سے روایت کی ہے۔ انھوں نے عاصم سے۔ اور انھوں نے عکرمہ سے۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد (۴-۱۲۲) میں لکھتے ہیں:

"اس حدیث کے سلسلے میں لوگ عمرو بن شُعَیب کے محتاج ہیں اور ان کی روایت کردہ حدیث کو قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس حدیث کا انحصار انہی پر ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے سوا دوسری کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ عورت جب نکاح کرے تو حقِ حضانت اس سے سلب ہو جاتا ہے اور ائمہ اربعہ اور دوسرے اہلِ علم کا یہی مسلک ہے"

طلاق دے دی۔ خاوند نے بچے کو اس عورت سے چھین لینا چاہا۔ اس عورت نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا:

"یا رسول اللہؐ! میرا پیٹ میرے بچے کے لیے برتن تھا۔ میرا سینہ اس کے لیے مشک تھا جس سے وہ پانی پیتا تھا۔ میری گود اس کے لیے آرام کی جگہ تھی۔ مگر میرا خاوند اس بچے کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔"

رسول اکرمؐ نے فرمایا "تو بچے کی اس وقت تک زیادہ مستحق ہے جب تک تو دوسرا نکاح نہ کرے۔"

"المدونہ" میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

مصنف عبدالرزاق[1] میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک ماں اور باپ اپنے ایک بیٹے کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ ماں نے کہا "میرا خاوند میرے بچے کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے، حالانکہ بچہ

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق (۷-۱۵۷) ابوداؤد (۲-۲۸۴) کتاب "الطلاق"۔ ترمذی (۳-۶۳۸) کتاب "الاحکام" باب "ماجاء فی تخییر الغلام" ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے نیز دیکھیے ابن ماجہ (۲-۷۸۷) کتاب "الاحکام" باب "تخییر الصبی بین ابویہ"۔ الدارمی (۲-۱۷۰) الحاکم فی المستدرک (۴-۹۷) حاکم کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

الخطابی لکھتے ہیں:

"یہ اس بچے کے بارے میں ہے جو سن شعور کو پہنچنے کی بنا پر ماں کی پرورش سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ اندریں صورت اسے اختیار دیا جائے گا کہ والدین میں سے جس کے ساتھ چاہے رہے۔ اس مسئلہ میں پھر اختلاف رونما ہوا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ بچہ جب سات یا آٹھ سال کا ہو جائے تو اسے اختیار دیا جائے گا کہ جس کے ساتھ چاہے رہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ یہ اختیار اسے بڑا ہونے پر دیا جائے گا۔ اہل الرائے اور سفیان ثوری کا موقف یہ ہے کہ ماں بچے کی نگہداشت کی اس وقت تک زیادہ حق دار ہے جب تک وہ خود اپنے طور پر کھانے اور لباس پہننے کے قابل نہ ہو جائے اور لڑکی کی اس وقت تک جب تک اسے حیض نہ آنے لگے۔ اس کے بعد والد کا حق فائق ہے۔ اس کے برعکس امام مالک کی رائے یہ ہے کہ ماں لڑکیوں کی پرورش کی شادی ہونے تک زیادہ مستحق ہے۔ حیض آنے سے بھی یہ حق ماں سے مسلوب نہیں ہوگا۔ اسی طرح لڑکوں کی تربیت کے سلسلے میں بھی ماں کا حق ان کے بالغ ہونے تک فائق ہے۔"

الخطابی مزید لکھتے ہیں:

"اس امر کا احتمال ہے کہ جن اہل علم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ بچہ جب ماں کی پرورش سے بے نیاز ہو جائے تو باپ کا حق فائق ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں کو حق حضانت اس کے شفیق و لطیف ہونے کی وجہ سے دیا جاتا ہے، لیکن بچہ جب پرورش کی عمر سے تجاوز کر جائے تو امور معاشی اور آداب زندگی سیکھنے کے لیے وہ باپ کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ باپ ماں کی نسبت ان امور کو زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے۔ اور اگر بچے کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے بے کار اور آوارہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دیکھیے (مختصر ابی داؤد (۳-۱۸۵) المدونہ (۲-۳۵۶)

اس ضمن میں ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ والدہ ہر حال میں بالغ ہونے تک بچے کے تحفظ و نگہداشت کی زیادہ مستحق ہے۔ خواہ

اُبُوعِنَبہ[1] کے کنوئیں سے میرے لیے پانی بھی لاتا ہے اور میرے دوسرے کام بھی کرتا ہے۔"
رسول اکرمؐ نے فرمایا: "اے لڑکے! یہ تمھارا باپ ہے اور یہ تمھاری ماں ہے۔ جس کا ہاتھ چاہو پکڑ لو۔" اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔
صحیح بخاریؒ[2] اور صحیح مسلمؒ[3] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عمرۃ القضاء سے فارغ ہوئے اور وہ مدت ختم ہوگئی

اس نے نکاح ثانی کر لیا ہو یا نہیں، اور یا وہ آزاد عورت ہو یا لونڈی۔ نیز یہ کہ والد اس شہر سے کسی دوسری جگہ نقل مکانی کر گیا ہو یا نہیں۔ دیکھیے محلّی (۱۱ - ۲۴۲)

[1] ابوعِنَبہ: - بکسر العین المہملہ وبعدہا النون المفتوحۃ ثم الباء۔ مدینہ منورہ سے ایک میل کے فاصلہ پر کنوئیں کا نام ہے۔ بدر کو جاتے ہوئے حضورؐ اس مقام پر صحابہ سے ملے تھے۔

یاقوت کہتے ہیں کہ العرانی نے عَتَبہ بالتاء بعد العین کہا ہے۔ مگر صحیح تر عِنَبہ بالنون ہے۔ معجم البلدان (۱ - ۳۰۱) اور وفاء الوفاء (۲-۲۴۴)۔ عباس نے "عمدۃ الاخبار" (ص ۲۵۱) میں ابن سید الناس کا قول نقل کیا ہے کہ:

"غالباً یہی کنواں ہے جو آج کل "بیر ودی" کے نام سے معروف ہے۔" القبالی المغرب کے بعد اس کا پانی سب سے میٹھا ہے۔
ابن سید الناس کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عاصم کے بارے میں ان کی نانی کے ساتھ جھگڑا کیا اور یہ معاملہ حضرت ابوبکرؓ کی عدالت میں پہنچا تھا تو حضرت عمرؓ نے کہا تھا "یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ مجھے ابی عِنَبہ کے کنویں سے پانی لا کر دیتا ہے۔"

[2] صحیح بخاریؒ فی الصلح کیف یکتب" (فتح الباری حدیث نمبر ۲۶۹۸) نیز کتاب "المغازی" باب "عمرۃ القضاء (فتح الباری حدیث نمبر ۴۲۵۱)

[3] مصنّف سے تسامح ہوا ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں نہیں ہے بلکہ ان احادیث میں سے ہے جو صرف بخاریؒ نے روایت کی ہیں۔ المنذری نے بھی اس حدیث کو مسلم کی جانب منسوب نہیں کیا۔

نیز دیکھیے ابوداؤد (۲-۲۸۴) کتاب "الطلاق" باب "من احق بالولد"۔ بروایت علیؓ۔ اس روایت میں کہا گیا ہے کہ زید بن حارثہ مکہ گئے اور حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو لائے۔ زیدؓ، علیؓ اور جعفرؓ حضرت حمزہؓ کی بیٹی کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ لڑکی جعفرؓ کو دی جائے۔ اس لیے کہ لڑکی کی خالہ ان کی بیوی ہے۔

ترمذی (۴-۳۱۳) کتاب "البر والصلۃ" باب "ماجاء فی برّ الخالۃ" اس میں یہ الفاظ ہیں کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔" ترمذی کہتے ہیں اس حدیث میں ایک طویل واقعہ مذکور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اس سلسلہ میں مزید ملاحظہ ہو بیہقی (۸-۶)

حضرت حمزہؓ کی بیٹی کا نام حمارہ یا امامہ تھا۔ کنیت امّ الفضل تھی۔ پہلا نام زیادہ مشہور ہے۔ اس حدیث سے متعدد مسائل کا استنباط کیا گیا ہے:

۱- بچے کی پرورش کے سلسلے میں خالہ پھوپھی کے مقابلے میں مقدم ہے۔ اس لیے کہ اس وقت حضرت حمزہؓ کی بہن صفیہؓ بنت عبدالمطلب بھی موجود تھیں، مگر حضورؐ نے بچی خالہ کو دی۔
۲- ماں کے رشتہ دار باپ کے اقارب کے مقابلہ میں مقدم ہیں۔

جو آپؐ نے اہلِ مکہ کے ساتھ طے فرمائی تھی، تو اہلِ مکہ حضرت علیؓ کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے ساتھی (رسول اکرمؐ) سے کہیے کہ اب مکہ سے چلے جائیں۔ جب آپؐ مکہ سے نکلے تو سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی چچا چچا کہتے ہوئے آپؐ کے پیچھے ہولی۔ حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے کہا یہ لو اپنے چچا کی بیٹی۔ ہوا یہ کہ حضرت علیؓ، زیدؓ بن حارثہ اور جعفرؓ بن ابی طالب حضرت حمزہؓ کی بیٹی کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ حضرت علیؓ نے کہا میں نے اس کو اٹھایا ہے اور یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت جعفرؓ نے کہا یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے۔ حضرت زیدؓ نے کہا کہ یہ میری بھتیجی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ یہ بچی اس کی خالہ کو دی جائے اور فرمایا "خالہ ماں کی مانند ہوتی ہے۔"

حضرت علیؓ سے کہا: "تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں"[۲]۔ حضرت جعفرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: "تو جسم و اخلاق میں میرے جیسا ہے"[۳]۔ آپؐ نے زیدؓ سے کہا: "تم میرے بھائی اور ساتھی ہو"[۴]۔

۱۔ بعض اہلِ علم نے اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ترکہ میں سے خالہ کو ماں کی طرح حصہ دیا جائے، مگر ان کا سیاق و سباق صرف بچے کی پرورش سے متعلق ہے، لہٰذا یہ استنباط درست نہیں۔

۲ یعنی نسب، داماد ہونے کے تعلق، سبقت فی الاسلام اور محبت کے اعتبار سے میں تجھ سے ہوں اور تو مجھ سے ہے۔ آپؐ نے یہ بات محض قرابت داری کی بنا پر نہیں فرمائی۔ ورنہ جعفرؓ کا رشتہ بھی وہی تھا جو حضرت علیؓ کا تھا۔

۳ اس میں جعفرؓ بن ابی طالب کی بڑی ستائش کی گئی ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت شکل و صورت میں آنحضورؐ سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس میں مندرجہ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی شامل ہیں:

۱۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ۲۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ۳۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ
۴۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ۵۔ قثم بن عباس رضی اللہ عنہ ۶۔ ابوسفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب
۷۔ مسلم بن عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

یہ سب ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

بنو ہاشم کے علاوہ یہ لوگ حضورؐ کے ہم صورت تھے:

۱۔ السائبؓ بن یزید المطلبی ۲۔ عبداللہؓ بن عامر بن کریز ۳۔ کابس بن ربیعہ بن عدی۔ (علاوہ ازیں صحابہؓ میں سے حضرت مصعب بن عمیرؓ بھی آپ کے ہم شکل تھے۔ مترجم)

غیر صحابہ میں سے یہ لوگ آپ کے ہم شکل تھے:

۱۔ ابراہیم بن الحسن بن الحسن بن علی ابن ابی طالب ۲۔ یحییٰ بن قاسم بن محمد بن جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی۔
۳۔ قاسم بن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب ۴۔ علی بن علی بن عباد بن رفاعہ الرفاعی (فتح الباری (۷، ۵۰۷))

۴ یعنی ہمارے دینی بھائی اور آزاد شدہ ہونے کے اعتبار سے مولیٰ (دوست) ہیں۔ اس لیے کہ کسی قوم کا آزاد کردہ غلام انہی کا ایک فرد شمار ہوتا ہے۔

ظہارؑ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

الزجاج کی کتابؒ المعانی اور دوسری کتابوں میں ہے کہ خولہؓ بنت ثعلبہ انصاریہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

؎ ظہار:- کے معنی ہیں ایک پشت کو دوسری پشت کے ساتھ تشبیہ دینا۔ ظہار میں اس پشت کو جو کہ حلال ہو حرام پشت کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ اسی لیے فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے یوں کہے کہ "تو میرے لیے اس طرح ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ" اسے ظہار کرنے والا کہا جائے گا۔ اکثر فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ "تو میرے لیے یوں ہے جیسے میری بیٹی یا بہن کی پشت" یا دیگر محارم کے ساتھ تشبیہ دے تو اسے بھی مُظاہر (ظہار کرنے والا) قرار دیا جائے گا۔ امام مالک، ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعی سے اس ضمن میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ ایک قول امام مالک کے قول کی طرح کا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنی بیوی کو اس پشت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو ہمیشہ کے لیے اس پر ماں ہی کی طرح حرام ہے۔ امام شافعی کا دوسرا قول ابو ثور نے اُن سے نقل کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ظہار اسی صورت میں قرار دیا جاتا ہے جب ماں کی پشت کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔ قتادہ اور شعبی کا مسلک بھی یہی ہے۔ اس کے برعکس حسن بصری، نخعی، زُہری، اوزاعی اور ثوری نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو (تفسیر قرطبی ۱۷-۲۷۳)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

دیگر اعضاءِ جسمانی کو نظر انداز کر کے ظہار میں پشت کی تحریم کو اس لیے مختص کیا جاتا ہے کہ پشت سوار ہونے کی جگہ ہے اور حالتِ مجامعت میں گویا عورت پر سواری کی جاتی ہے۔ اس لیے جب کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ "تو میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرا تجھ پر سوار ہونا اسی طرح حرام ہے جیسے اپنی ماں پر سوار ہونا۔ سواری کا لفظ اندریں صورت مجامعت کے لیے کنایہ ہوتا ہے۔

؎ یہ حدیث اصحابِ سنن و مسانید نے مختلف الفاظ میں اختصار کے ساتھ بھی روایت کی ہے اور تفصیل کے ساتھ بھی۔ سنن ابی داؤد (۲-۲۶۶) کتاب "الطلاق" باب "الظھار" میں حسن بن علیؒ یحییٰ بن آدم ابن ادریس سے، وہ محمد بن اسحاق سے، وہ معمر بن عبد اللہ بن حنظلہ سے، وہ یوسف بن عبد اللہ بن سلام سے اور وہ خولہؓ بنت مالک بن ثعلبہ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے خاوند اوس بن صامت نے مجھ سے ظہار کیا۔ میں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے جھگڑنے لگے۔ آپ نے فرمایا "خدا سے ڈر وہ تمہارا چچا زاد ہے" میں بار بار آپ سے مطالبہ کرتی رہی حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ — اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند

کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اوس رضی اللہ عنہ بن صامت نے مجھ سے اس وقت شادی کی جب میں جوان اور پر کشش

فِیْ زَوْجِهَا (المجادلۃ ۱) کے بارے میں جھگڑتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تمھارے خاوند کو ایک غلام آزاد کرنا چاہیے۔" خولہ نے کہا۔ "اس کے پاس نہیں ہے۔" آپ نے فرمایا۔ "تو پھر پے در پے دو ماہ کے روزے رکھے۔" خولہ نے عرض کی "حضورؐ! وہ بوڑھا ہے اور روزے رکھنے سے قاصر ہے۔" آپ نے فرمایا۔ "پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔" خولہ نے کہا۔ "صدقہ دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔" اسی اثنا میں حضورؐ کے پاس کھجوروں کا ایک خاص قسم کا ٹوکرا آیا۔ اس نے کہا۔ "یا رسول اللہ! میں ایک اور ٹوکرے کے ساتھ بھی اس کی مدد کر دوں گی۔" آپ نے فرمایا "بہت خوب، اس کو لے جاؤ اور اس کی طرف سے ساٹھ مسکینوں کو کھلا دو۔ اب اپنے چچا زاد (خاوند) کے یہاں چلی جاؤ۔" کہتے ہیں کہ یہ مخصوص قسم کا ٹوکرا ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔

ابوداؤد کہتے ہیں۔ "خولہ نے اپنے خاوند سے مشورہ کیے بغیر کفارہ ادا کر دیا۔" ابوداؤد نے ایک اور روایت حسن بن علی سے، انھوں نے عبدالعزیز بن یحییٰ سے، انھوں نے محمد بن مسلمہ سے اور انھوں نے ابن اسحاق سے سند سابق اور سابقہ الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ یہ خاص قسم کا ٹوکرا تیس صاع پر مشتمل ہوتا ہے۔ ابوداؤد کہتے ہیں یہ روایت یحییٰ بن آدم کی روایت کی نسبت صحیح تر ہے۔ پھر ابوداؤد نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس کی سند میں ابن لہیعہ نامی (ضعیف) راوی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضورؐ کے پاس کچھ کھجوریں لائی گئیں وہ آپؐ نے اس کے خاوند کو دے دیں۔ وہ کھجوریں پندرہ صاع کے قریب تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ "ان کو صدقہ کر دو۔" اس نے کہا یا رسول اللہ! کیا اپنے سے محتاج تر کنبہ پر صدقہ کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ خود کھاؤ اور اپنے اہل خانہ کو کھلا دو۔"

ابوداؤد عطاء سے روایت کرتے ہیں اور وہ اوس بن صامت سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ساٹھ مسکینوں کو کھلانے کے لیے دس صاع جو دیے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ اس لیے کہ عطاء کی ملاقات اوس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ثابت نہیں۔

ابن ماجہ (۱-۶۶۶) نے یہ حدیث اپنی سند کے ساتھ کتاب "الطلاق" باب "الظھار" میں ابوبکر بن ابی شیبہ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے محمد بن ابی عبیدہ سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے اعمش سے، انھوں نے تمیم بن سلمہ سے، انھوں نے عروہ بن زبیر سے اور انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔ وہ فرماتی ہیں اللہ کی ذات بابرکات وہ ہے جو ہر ایک کی ہر بات کو سنتی ہے (مثلاً خولہ بنت ثعلبہ کے معاملہ کو ہی لیجیے) مجھے اب بھی یوں لگتا ہے گویا میں خولہ بنت ثعلبہ کی بعض باتوں کو سن رہی ہوں اور اس کی بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، جب وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنے خاوند کی شکایت کر رہی اور کہہ رہی تھی۔ "یا رسول اللہ! اس نے میری جوانی کھائی۔ میرے بہت سے بچے ہیں۔ جب میں بوڑھی ہو گئی اور بچوں کی ولادت سے فارغ ہو گئی، تو اس نے مجھ سے ظہار کر لیا۔ یا اللہ! میں آپ کے دربار میں فریاد کرتی ہوں۔ وہ اسی طرح محو فریاد تھی کہ سورۃ "المجادلۃ" کی مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی:

یہ حدیث بیہقی نے "السنن الکبریٰ" (۷-۳۸۲) میں اور حاکم نے "المستدرک" (۲-۴۸۱) میں روایت کی اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، مگر صحیحین میں یہ روایت موجود نہیں ہے۔

تھی۔ جب میں بڑھی ہو گئی اور میری اولاد زیادہ ہو گئی تو اس نے مجھے اپنی ماں کی طرح قرار دے لیا۔[1]

یہ سُن کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمھارے معاملے میں مجھ پر کچھ نازل نہیں ہوا۔"

خولہ نے بارگاہِ ربّانی میں شکایت کرتے ہوئے عرض کی: "اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں فریاد کرتی ہوں۔"

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس نے اپنی فریاد میں یہ بھی کہا:

"میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اگر میں اپنے خاوند کو دے دوں تو ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر اپنے پاس رکھوں تو بھوکے رہیں گے۔"

تب اللہ تعالیٰ نے وہ آیت[2] نازل فرمائی جس میں ظہار کے کفّارے کا ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] کہا گیا ہے کہ اوس کے ظہار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پیرانہ سالی کی بنا پر چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ایک روز خولہ کے پاس گئے تو انھوں نے سخت جواب دیا جس سے وہ ناراض ہو گئے اور کہنے لگے "تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔" اس کو ابو داؤد، احمد، ابن المنذر، طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی نے بطریق یوسف بن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے (الدر المنثور ۶ - ۱۷۹)

علاوہ ازیں ابو داؤد میں ہشام بن عروہ سے مروی ہے کہ جمیلہ، اوس رضی اللہ عنہ بن صامت کی بیوی تھی۔ اوس رضی اللہ عنہ عورتوں کا بڑا حریص تھا۔ جب اس کے ذوق و شوق میں مزید اضافہ ہوا تو اس نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا، چنانچہ اس کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں ظہار کے کفارے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں "لَمَم" کا جو لفظ وارد ہوا ہے اس سے عورتوں کی حرص اور شوق مراد ہے۔ پاگل پن اور جنون مراد نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ جنون کی حالت میں ظہار کا مرتکب ہوتا تو اس پر کوئی کفارہ لازم نہیں آ سکتا تھا۔ الخطابی کہتے ہیں اوس پہلا شخص ہے جس نے اسلام میں ظہار کیا۔

[2] وہ آیت مندرجہ ذیل ہے:

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ
يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ
تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ ۝
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ
يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ
ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ

اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں پھر اپنے قول سے رجوع کر لیں تو (اُن کو) ہم بستر ہونے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا (ضروری) ہے۔ (مومنو!) اس (حکم) کے ذریعے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے خبردار ہے۔

جس کو غلام نہ ملے وہ مجامعت سے پہلے متواتر دو مہینے کے روزے رکھے جس کو اس بات کا بھی مقدور نہ ہو اسے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا چاہیے۔ یہ (حکم) اس لیے ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول کے فرمانبردار ہو جاؤ۔ اور یہ خدا کی حدیں ہیں اور نہ ماننے والوں کے لیے درد دینے والا

المفضل نے ذکر کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اوسؓ بن صامت سے فرمایا :

"کیا تم ایک غلام آزاد کر سکتے ہو؟ اُس نے کہا "بخدا نہیں" فرمایا: کیا مسلسل دو ماہ کے روزے رکھ سکو گے؟" اُس نے کہا "بخدا نہیں" فرمایا "کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکو گے؟" اُس نے کہا "نہیں خدا کی قسم! میرے پاس کچھ بھی نہیں" چنانچہ حضورؐ نے اُن کو پہلے پندرہ صاع (غلّہ) دیا۔ دوبارہ پھر اسی قدر (غلّہ) عطا فرمایا۔ اَوسؓ بن صامت نے اسے ساٹھ مسکینوں میں نصف[1] صاع فی مسکین کے حساب سے تقسیم کر دیا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا "میرے پاس ایک ٹوکرہ لاؤ جس میں ساٹھ مدّ (ایک پیمانہ) کھجور ہو۔ حضرت علیؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ رسولِ اکرمؐ نے اوسؓ بن صامت کو کہا کہ کھجوروں کا یہ ٹوکرا اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی طرف سے ساٹھ مسکینوں کو کھلا دو" اوسؓ نے کہا "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مدینہ بھر میں میرے اور میرے اہلِ خانہ سے زیادہ اس ٹوکرے کا مستحق اور کوئی شخص نہیں" یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور فرمایا "لے جاؤ اور اسے خود بھی کھاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی کھلاؤ[2]"۔

"المدونہ[3]" اور دوسری کتابوں میں ہے کہ جو غلّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو دیا تھا وہ جَو تھے۔

اَلِیْمٌ (المجادلۃ: ۳-۴) عذاب ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباس کہتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں ظہار کی وجہ سے عورت کو حرام ٹھہرا دیا جاتا تھا۔ اسلام میں سب سے پہلے جس نے ظہار کیا وہ اَوسؓ بن صامت تھا۔ اس کی بیوی کا نام خولہ تھا۔ یہ حدیث طبرانی اور بزّار نے بھی روایت کی ہے۔ اس کی سند میں ابوحمزہ نامی راوی ضعیف ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۵-۷)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں جن علما کی قرآن فہمی پر اعتماد رکھتا ہوں اُن سے میں نے سنا ہے کہ دورِ جاہلیت میں تین طریقوں سے طلاق دیا کرتے تھے۔ (۱) ظہار (۲) ایلاء (۳) طلاق۔

اللہ تعالیٰ نے طلاق کے حکم کو باقی رکھا۔ ایلاء کرنے والے کو چار ماہ کی مہلت دی۔ اس کے بعد بیوی سے رجوع کر لے یا طلاق دے دے۔

ظہار میں کفارے کا حکم دیا اور یہ کہ اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی (احکام القرآن (۲- ۲۳۴، ۲۳۴)

[1] حافظ زیلعی "نصب الرایۃ" (۳-۲۴۷) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے مگر انھوں نے اس کے غریب ہونے کی وجہ بیان نہیں کی۔ پھر کہتے ہیں کہ طبرانی نے المعجم میں بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں: "تیس صاع ساٹھ مسکینوں کو کھلا دو۔ اوسؓ نے کہا: میں اس کی تعمیل اسی صورت میں کر سکتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ صاع دے کر اس کی امداد فرمائی۔ جبکہ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی امداد کی۔

[2] اس حدیث کے بعض حصے اس باب کے آغاز میں تفصیل سے گزر چکے ہیں۔

[3] "المدونہ" (۳-۲۴) میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

امام مالکؒ کہتے ہیں کفارۂ ظہار میں جو کھانا کھلایا جاتا ہے وہ ہر ایک مسکین کو ایک مُد کے حساب سے دیا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں ہشام کا مُد (مُد کی ایک خاص قسم) معتبر ہے۔ یہ مُد نبی کریمؐ کے ایک تہائی کم دو مُد (۱⅔) کے برابر ہوتا ہے۔ امام مالک سے دوسرا قول یہ منقول ہے کہ ایک مسکین کو دو مُد نبوی دیے جائیں۔[1]

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر مسکین کو ایک مُد گندم یا کوئی اور غلہ دیا جائے۔[2]

امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ ہر مسکین کو نصف صاع گندم یا اس کا آٹا دیا جائے۔ یا ایک صاع کھجور یا جَو دیے جائیں۔

امام شافعی کی دلیل ایک اور حدیث ہے جبکہ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہی حدیث ہے۔[3]

اہل علم کے یہاں یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ آیا کافر لونڈی یا غلام کو کفارہ میں آزاد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ امام مالک اور شافعی کہتے ہیں کہ لونڈی یا غلام کا مومن ہونا ضروری ہے۔[4]

اوس بن صامتؓ نے اپنی بیوی سے ظہار کیا۔ پھر کفارہ ادا کرنے سے قبل ہی اس سے مجامعت کرلی۔ جب حضورؐ کو پتہ چلا تو فرمایا: "تم نے یہ بہت برا کیا۔" پھر آپؐ نے اسے چند صاع جَو دیے اور فرمایا: "اسے ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کر دو۔" یہ بات آپؐ نے اس وقت فرمائی جب اس نے بتایا کہ میں غلام آزاد کرنے اور روزے رکھنے سے قاصر ہوں۔

[1] ملاحظہ ہو المدونہ (۳-۶۸) اور کھانے کی وہ مقدار ہے جو صبح و شام کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے امام مالک نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

[2] امام شافعی حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ماہ رمضان میں اپنی بیوی سے مجامعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔ المہذب کے مصنف کہتے ہیں "جب حدیث کی روشنی میں ثابت ہو گیا کہ رمضان میں جماع کرنے والے پر یہ کفارہ لازم ہے تو ظہار کرنے والے کے معاملہ کو اس پر قیاس کیا جائے گا۔"
اصل حدیث صحیحین میں موجود ہے (المجموع ج ۱۶ ص ۳۷۶)

[3] امام ابوحنیفہ اوس بن صامتؓ کی سابق الذکر روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ اس حدیث میں مذکور ہے کہ "وہ مخصوص ٹوکرا پندرہ صاع پر مشتمل تھا" ابوداؤد نے اس کو اس روایت کے مقابلے میں ترجیح دی ہے جس میں ساٹھ صاع کا ذکر ہے۔ نیز اس لیے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مسکین کی ضرورت پوری کرنا مقصود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نصف صاع گندم یا جَو ایک آدمی کے لیے کافی ہے۔ علاوہ ازیں امام ابوحنیفہ اس کو صدقۂ فطر پر قیاس کرتے ہیں۔ امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن کھانا کھلا دیا جائے تو بھی کافی ہے۔ (شرح فتح القدیر ۳-۲۴۳)

امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ ہر مسکین کو ایک مُد گندم یا نصف صاع کھجور یا جَو دیے جائیں۔ وہ بھی کفارۂ ظہار کو صدقۂ فطر پر قیاس کرتے ہیں۔ دیکھیے ابن قدامہ کی "المغنی" (۷-۵۴۰)

[4] اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قتل کے کفارہ میں مومن غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ دوسرے کفاروں مثلاً ظہار وغیرہ میں مطلقاً غلام آزاد کرنے کا حکم دیا اور ایمان کی شرط نہیں لگائی، لہٰذا جو اہل علم کفارہ میں مومن غلام آزاد کرنے کی شرط لگاتے ہیں وہ اسے کفارۂ قتل پر

اس کے برعکس امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی لونڈی اور غلام کو آزاد کرنا بھی درست ہے۔

(بقیہ حاشیہ)
قیاس کرتے ہیں۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ دونوں قسم کے کفاروں میں فرق کرتے ہیں۔ اس لیے کہ نوعیتِ جرم اور ان کی قباحت کے اعتبار سے سب کفارے یکساں قسم کے نہیں ہیں۔

جو اہلِ علم لونڈی غلام کے ساتھ ایمان کی شرط عائد کرتے ہیں وہ معاویہ بن الحکم کی حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک لونڈی تھی۔ میں اس کو آنحضورؐ کی خدمت میں لایا۔ میں نے عرض کیا حضورؐ! مجھ پر ایک غلام آزاد کرنا واجب ہے۔ کیا میں اس لونڈی کو آزاد کر سکتا ہوں؟ حضورؐ نے اس لونڈی سے دریافت فرمایا "اللہ کہاں ہے؟" اس نے کہا۔ "آسمان پر" پھر آپؐ نے پوچھا "میں کون ہوں؟" وہ بولی "آپ اللہ کے رسول ہیں"۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا۔ "اس کو آزاد کر دو یہ مومنہ ہے"۔ یہ حدیث صحیح ہے اس کو صحیح مسلم نے روایت کیا ہے، مگر اس حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ معاویہ بن الحکم کے ذمہ کس قسم کا کفارہ تھا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ قتل کا کفارہ نہیں تھا تو یہ حدیث امام ابوحنیفہ کے خلاف حجت ہوگی۔

امام شافعی کفارہ میں آزاد کیے جانے والے غلام یا لونڈی کے ہر حال میں مومن ہونے کے بارے میں (اس حدیث سے استشہاد کرتے ہوئے) یہ دلیل بھی دیتے ہیں۔ کہ جیسا کہ قرآن کریم میں گواہوں کے بارے میں دو مقامات پر عادل ہونے کی شرط کا ذکر ہونے اور تین مقامات پر اس شرط کا ذکر نہ ہونے کے باوجود گواہوں کے لیے عادل ہونے کی شرط کو ہر حال میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ (اسی طرح کفارہ میں آزاد کیے جانے والے غلام یا لونڈی کے مسلمان ہونے کی شرط کو بھی مندرجہ بالا حدیث میں بیان کی گئی شرط سے استشہاد کرتے ہوئے ہر حال میں لازم سمجھا جائے گا)

احکام القرآن (۱-۳۳۷) میں امام شافعی کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

" چونکہ شہادت کسی قسم کی بھی ہو وہ شہادت ہی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ اس کے ساتھ جو شرط لگائی ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے، لہٰذا جہاں شہادت کا ذکر مطلقاً (بلا قید عدالت) کیا گیا ہے وہاں یہ شرط ملحوظ رہے گی۔

اس موضوع کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے (کتاب الأم للشافعی (۷-۲۱، ۲۲) اور السنن الکبریٰ للبیہقی (۷-۳۸۷)

لعانؔ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

موطاؔ امام مالک، صحیح بخاریؔ، صحیح مسلمؔ اور نسائیؔ میں زُہری سے مروی ہے کہ سہلؔ بن سعد الساعدی نے ان کو بتایا کہ عُویمرؔ عجلانی، عاصمؔ بن عدی انصاری کے یہاں آیا اور اس سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پائے،

---

[1] لعان کا لفظ لَاعَنَ یُلَاعِنُ لِعَانًا و مُلَاعَنَۃً سے مصدر ہے۔ جیسے قَاتَلَ یُقَاتِلُ قِتَالًا و مُقَاتَلَۃً۔ لعان کے معنی ایک دوسرے پر لعنت کرنے کے ہیں۔ عربی محاورہ میں لَاعَنَ الرَّجُلُ زَوْجَتَہٗ کے معنی ہیں "اس نے اپنی بیوی کو زنا سے متہم کیا"۔ ابن دُرید "الاشتقاق" میں لکھتے ہیں کہ لعان فصیح اسلامی اصطلاح ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لعان ماخوذ ہے "اللعن" سے۔ اس لیے کہ لعان کرنے والا پانچویں مرتبہ کہتا ہے "اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو"۔ قاضی کہتے ہیں لعان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے لازمًا ایک ضرور جھوٹا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو جھوٹا ہوگا وہی لعنت کا مَورد ہوگا۔ لعنت کے معنی دُور کرنے اور پھینک دینے کے ہیں۔

[2] مؤطا امام مالک (۲ - ۲۳ ، ۴۲) کتاب "الطلاق" باب "ماجاء فی اللعان"

[3] صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب "اللعان ومن طلق بعد اللعان (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۳۰۸)

[4] صحیح مسلم (۲ - ۱۱۲۹) باب "اللعان"

[5] نسائی (۲ - ۱۷۰) کتاب "الطلاق" باب "بدء اللعان" نیز ابوداؤد (۲ - ۲۷۳) کتاب "الطلاق" باب "فی اللعان"

[6] سہل بن سعد کا تعارف آگے آرہا ہے۔

[7] عُویمر عجلانی :- ان کو عُویمر بن اشقر بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد میں ہے۔ ایک قول میں ان کا نام عُویمر بن ابیض بھی بتایا گیا ہے۔ (دیکھیے الاستیعاب) خطیب بغدادی نے المبھمات میں ان کا نام عُویمر بن حارث بتایا ہے۔ مشہور مؤرخ ابن جریر طبری "تھذیب الآثار" میں ان کا نسب نامہ یوں بیان کرتے ہیں:

"عویمر بن الحارث بن زید بن الجد بن عجلان"

حافظ ابن حجر فتح الباری (۹ - ۴۴۷) میں لکھتے ہیں :-

"ممکن ہے کہ عُویمر کے والد کا لقب اشقر یا ابیض ہو۔ (دیکھیے عُویمر کا تذکرہ "اسد الغابۃ" (۴ - ۱۵۸)

[8] عاصم بن عدی المدنی العجلانی القضاعی، انصار کے حلیف تھے۔ غزوہ اُحد اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے۔ ۴۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ایک سو بیس (۱۲۰) سال تھی۔ یہ ان صحابہ میں شامل تھے جن کو عدم شرکت کے باوجود بدر کے مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا گیا تھا۔ (دیکھیے "اسعاف المبطا" ص ۱۴)

تو وہ کیا کرے ؟ اگر وہ قتل کر دے تو اس کے قصاص میں تم اس کو مار دو گے اور اگر اس کو قتل نہ کرے تو پھر کیا کرے[1] ؟ عجلانی نے کہا "اے عاصم! میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ضرور دریافت کریں ۔"

---

[1] یہ سوال لعان کا حکم نازل ہونے سے پہلے کیا گیا تھا مگر اشکال ہلال بن امیہؓ کے واقعہ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ آیا لعان سے متعلق آیات ہلال کے واقعہ میں نازل ہوئیں یا عُوَیمر کے بارے میں ۔ ہلال نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بیوی کو شریک بن سحماء کے ساتھ متہم کیا تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: "گواہ پیش کرو ورنہ تمھاری پیٹھ پر حدِ قذف لگائی جائے گی"۔ ہلال نے کہا "حضورؐ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو بدکاری کرتا دیکھے تو وہ جا کر گواہ تلاش کرتا پھرے ؟" حضورؐ نے پھر فرمایا "گواہ لاؤ ورنہ حد لگے گی ۔" ہلال نے کہا "مجھے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر بھیجا میں حق پر ہوں ۔ اللہ تعالیٰ وحی بھیج کر مجھے حد سے لازماً بری فرمائے گا"، چنانچہ جبریل مندرجہ ذیل آیات لے کر نازل ہوئے :

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔	اور جو لوگ اپنی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار خدا کی قسم کھائے کہ بے شک وہ سچا ہے ۔
وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔	اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت ۔
وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔	اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ پہلے چار بار خدا کی قسم کھائے کہ بے شک یہ جھوٹا ہے ۔
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۹) (سورۃ النور۔ ۶ ۔ ۹)	اور پانچویں دفعہ یوں کہے کہ اگر یہ سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔

یہ حدیث بخاری نے کتاب التفسیر سورۃ النور میں روایت کی ہے (فتح الباری حدیث نمبر ۴۷۴۷) صحیح مسلم (۲ ۔ ۱۱۳۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری (۸ ۔ ۴۵۰) میں لکھتے ہیں :۔

یہ مسئلہ ائمہ کے ہاں اختلافی ہے ۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ آیت عُوَیمر کے بارے میں نازل ہوئی اور بعض نے اس خیال کو ترجیح دی کہ یہ ہلال کے بارے میں اتری جبکہ بعض اہلِ علم نے دونوں میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے یہ واقعہ ہلال کو پیش آیا ۔ اتفاقاً عُوَیمر بھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس طرح یہ آیت بیک وقت دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ۔ خطیب بغدادی اور نووی کا رجحان اسی جانب ہے ۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (۹ ۔ ۴۵۰) میں مزید لکھتے ہیں :

"اب مجھے ایک نیا احتمال سوجھا ہے اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے عاصم نے آیت کے نزول سے قبل سوال کیا ہو۔ اس کے بعد ہلال آیا اور اس کے

چنانچہ عاصم نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ آپ نے کثرتِ سوال کو ناپسند فرمایا اور اس پر نکتہ چینی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن کر عاصم کی طبیعت بوجھل ہوگئی۔ جب عاصم گھر پہنچا تو عویمر اس کے پاس آیا۔ اس نے کہا "عاصم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ سے کیا کہا؟" اس نے جواب دیا "عویمر! تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کو ناپسند فرمایا ہے۔" عویمر نے کہا "اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہیں رکوں گا جب تک میں بذاتِ خود آپ سے یہ مسئلہ دریافت نہ کرلوں۔" عویمر آیا اور لوگوں کو چیرتا ہوا آپ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کہنے لگا "یا رسول اللہ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو دیکھے تو کیا اسے قتل کردے؟ اگر وہ ایسا کرے گا تو قصاص میں آپ اسے قتل کرڈالیں گے۔ تو پھر وہ کیا کرے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تیرے اور تیری بیوی کے بارے میں خدا کا فیصلہ نازل ہوچکا ہے۔" صحیح بخاری میں یہ الفاظ ہیں کہ:

قَدْ قَضَى اللّٰهُ فِيكَ وَفِي امْرَأَتِكَ فَاذْهَبْ فَأْتِ بِهَا۔	اللہ نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے بارے میں فیصلہ فرما دیا ہے۔ جاؤ اور اسے لے جاؤ۔

اس حدیث کا راوی سہل کہتا ہے کہ پھر دونوں میاں بیوی نے لعان کیا۔

صحیح بخاری میں یہ اضافہ بھی ہے کہ دونوں نے مسجد میں لعان کیا۔ جب کہ میں یعنی راوی لوگوں سمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا۔ جب دونوں لعان سے فارغ ہوئے تو عویمر نے کہا "یا رسول اللہ! اگر اب بھی میں اس عورت کو اپنے یہاں رہنے دوں تو گویا میں نے اس پر اتہام باندھا۔" چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے ہی عویمر نے اس کو تین طلاقیں دے دیں۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ابن شہاب نے کہا کہ اس کے بعد دونوں لعان کرنے والوں کے مابین یہ سنت جاری ہوگئی۔[1]

سوال کے دوران یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر عویمر دوسری مرتبہ آیا اور کہا "جو بات میں نے آپ سے دریافت کی تھی میں خود اس میں مبتلا ہو گیا ہوں" تب اسے پتہ چلا کہ اس سے پہلے ہلال کے بارے میں یہ آیات نازل ہوچکی ہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ اس ضمن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص بھی اس واقعہ سے دوچار ہو اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔"

[1] یعنی میاں بیوی کے درمیان جدائی کی سنت جاری ہوگئی۔ صحیح مسلم میں بروایت یونس عن ابن شہاب یہ اضافہ ہے کہ آپ نے فرمایا "یہ دو لعان کرنے والوں کے مابین تفریق کا موجب ہے۔" امام نووی شرح مسلم (۱-۴۹۳) میں لکھتے ہیں کہ امام مالک، شافعی اور جمہور علماء کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ دو لعان کرنے والوں کے درمیان فقط لعان ہی تفریق کا موجب ہوتا ہے۔"

اس مسئلہ میں علماء کے دو اقوال ہیں:

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ زوجین میں تفریق تب ہوگی جب حاکم اس کا حکم صادر کرے گا۔ حضرت ابن عباس اور اصحاب الرائے کی یہی رائے ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صرف لعان ہی سے تفریق ہو جاتی ہے۔ امام مالک، زفر اور احمد بن حنبل کا مسلک یہی ہے۔

امام شافعی کے نزدیک طلاق کی طرح تنہا خاوند کے لعان سے ہی تفریق ہو جاتی ہے چنانچہ عورت لعان میں حصہ نہ لے۔

صحیح بخاری[1] میں ہے کہ ابن شہاب نے کہا کہ اس عورت کے بیٹے کو اس کی ماں کے نام پر پکارا جاتا تھا۔ پھر میراث کے بارے میں یہ سنت جاری ہو گئی کہ بیٹا اس کا وارث ہوگا اور وہ اپنے بیٹے سے ورثہ پائے گی۔[2]

سہلؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا اگر اس عورت کے یہاں سرخ رنگ کا میانے قد والا بچہ پیدا ہوا گویا کہ وہ چھپکلی ہے، تو میرا خیال ہے کہ عورت سچی ہے اور آدمی نے اس پر افترا پردازی کی ہے۔ اور اگر عورت کے یہاں سیاہ فام، موٹی آنکھوں والا، موٹے سرین والا بچہ پیدا ہوا تو میرا خیال ہے کہ آدمی سچا ہے۔" پھر اس کے یہاں مؤخرالذکر اوصاف کا حامل لڑکا پیدا ہوا۔

الخطابی کی کتاب میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: وَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَسْحَمَ أَحْتَمَ فَهُوَ لِلْمَكْرُوهِ" اور اگر نہایت سیاہ فام لڑکا پیدا ہوا تو وہ زنا کی پیداوار ہے۔" احتم کے معنی سیاہ کے ہیں۔ سیاہی کی وجہ ہی سے کوّے کو حاتم (سیاہ فام) کہا جاتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کوّے کو حاتم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ جدائی کا یقین دلاتا ہے۔

صحیح بخاری[3] میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کرنے والے میاں بیوی سے کہا "تمہارا محاسبہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ تم میں سے ایک لازماً جھوٹا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی فریق توبہ کرنا چاہتا ہے؟" آپؐ نے تین

---

[1] صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب "التلاعن فی المسجد" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۳۰۹)

[2] تمام کتب حدیث میں اسی طرح ہے۔ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ "ماں اس لڑکے کی وارث ہوگی اور لڑکا اس کا وارث بنے گا۔" حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا یہی مسلک ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ واثلہ بن اسقع کی روایت سے ہم آہنگ ہیں جس میں مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا "عورت تین آدمیوں سے ورثہ پائے گی۔ (۱) اس غلام سے جس کو اس نے آزاد کیا ہو (۲) جو بچہ اسے پڑا ہوا ملا اور اس نے اسے پالا۔ (۳) جس بچے کے بارے میں اس نے اپنے خاوند سے لعان کیا۔"

یہ حدیث سنن اربعہ میں روایت کی گئی ہے۔ آگے کتاب المواریث میں اس کی تخریج آئے گی۔ ابوداؤد (۳-۱۲۵) عمرو بن شعیب سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کرنے والی عورت کے بیٹے کی وراثت اس کی ماں کو دلوائی۔ اور ماں کے بعد اس کے وارثوں کو ملے گی۔

مصنف عبدالرزاق (۷-۱۲۳) میں ابن جریج سے مروی ہے۔ وہ داؤد بن ابی ہند سے، وہ عبداللہ بن عبید بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اہل مدینہ میں سے قبیلہ بنی زریق کے ایک شخص کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ لعان کرنے والی عورت کے بیٹے کا وارث کون ہوگا؟ اس نے جواباً تحریر کیا کہ اس نے صحابہ سے یہی بات دریافت کی تھی اور وہ اس بات پر متفق تھے کہ نبی اکرمؐ نے اس کی ماں کو وارث قرار دیا تھا۔ گویا آپؐ نے ماں کو والدین کے قائم مقام ٹھہرایا۔

ایک روایت میں ہے کہ سفیان ثوری نے کہا کہ اس کی ماں پورے مال کی وارث ٹھہرے گی۔ لعان کرنے والی عورت کے بیٹے کی میراث کے بارے میں دیگر تفصیلات کتاب المواریث میں ملاحظہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[3] صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب "صداق الملاعنۃ" (فتح الباری حدیث نمبر ۵۳۱۱) بروایت سعید بن جبیر۔

مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ لعان کے بعد آپؐ نے میاں بیوی میں تفریق کرا دی۔

المستخرجہ میں اصبغ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو مخاطب کر کے لعان سے قبل فرمایا۔

"خدا سے ڈر۔ جو بات تم نے کہی ہے اسے واپس لے لو۔ اس صورت میں تم پر حدِ قذف لگے گی اور تمھاری توبہ بارگاہِ ربانی میں قبول ہو جائے گی۔" اس شخص نے کہا "مجھے اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر بھیجا ایسا نہیں ہے۔" اس نے یہ الفاظ چار مرتبہ کہے۔ پھر آپؐ نے عورت کی جانب متوجہ ہو کر کہا "اے فلاں عورت! اللہ سے ڈر۔ اپنے گناہ کا اقرار کرے۔ ہم تجھے سنگسار کر دیں گے۔ تو توبہ کرے گی اور تیری توبہ بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہو گی۔"

اس عورت نے کہا "اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر بھیجا ہے ایسا ہرگز نہیں۔ وہ جھوٹا ہے۔"

آپ نے چار مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ (النور-۴) وہ لوگ جو اپنی بیویوں پر بہتان لگاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے فلاں شخص! اُٹھ کر شہادت دو۔" اس نے عرض کی "یا رسول اللہ! میں کیا کہوں؟" آپ نے فرمایا: کہو کہ میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں سچا ہوں۔" چار مرتبہ یہ الفاظ دہراؤ۔ پھر آپ نے فرمایا۔ پانچویں دفعہ بھی کہو۔ اس نے عرض کی "یا رسول اللہ! میں کیا کہوں؟" آپ نے فرمایا "تم کہو کہ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت۔"

پھر آپؐ نے عورت کو بلا کر فرمایا "تو شہادت دے گی یا تجھے سنگسار کر دیا جائے؟" اس نے کہا "میں شہادت دوں گی۔" آپؐ نے فرمایا "کہو کہ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔ چار مرتبہ یہ الفاظ دہراؤ۔ پھر پانچویں مرتبہ کہو: اس عورت نے کہا "میں پانچویں مرتبہ کیا کہوں؟" فرمایا "کہو اگر وہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو۔" عورت نے تعمیلِ ارشاد کر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم دونوں اُٹھ کھڑے ہو۔ میں نے تم دونوں میں تفریق کر دی ہے۔ تم میں سے ایک کے لیے جہنم واجب ہو چکا ہے۔ بچہ[1] عورت کا ہو گا۔"

ابوداؤد[2] میں ہے کہ جب عورت چار مرتبہ یہ الفاظ دہرا چکی اور ابھی پانچویں بار کہنا باقی تھا تو اس عورت سے کہا گیا۔ "خدا[3] سے ڈر۔ اس دفعہ یہ الفاظ دہرانے سے عذاب تجھ پر لازم ہو جائے گا۔" عورت نے تھوڑی دیر توقف کیا۔ پھر کہنے لگی۔ "اللہ کی قسم! میں اپنی قوم کو رسوا نہیں کروں گی۔" پھر اس نے پانچویں مرتبہ بھی یہ شہادت دی۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ اس بچے کا نسب والد کی طرف سے منقطع کیا جائے۔ جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے اور ابن حزم ظاہری کے سوا کوئی اس کا مخالف نہیں۔ امام ابن حزم حدیث "الولد للفراش" سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بچے کا نسب اس شخص سے ثابت ہو گا جس کی وہ منکوحہ تھی۔ (محلّی ابن حزم (۱۰-۱۴۴)

[2] ابوداؤد (۲-۲۷۷) کتاب "الطلاق" باب "اللعان" اس کی تخریج اور تشریح کے لیے اس باب کی آخری حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

[3] ابوداؤد میں یہ الفاظ ہیں کہ "دنیا کا عذاب اخروی عذاب کے مقابلہ میں نہایت خفیف ہے۔"

چنانچہ اس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان تفریق کروا دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب ذیل فیصلہ فرمایا:

"اس عورت کے بچے کو اس کے باپ کے نام پر نہ پکارا جائے اور اس عورت پر اور اس کے بچے پر بہتان طرازی نہ کی جائے۔ جو شخص اس عورت یا اس کے بچے پر تہمت لگائے گا اس پر حد لگائی جائے گی۔"[1]

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس کے خاوند کے ذمے نہ تو اس عورت کے لیے مکان مہیا کرنا ہے اور نہ ہی خوراک۔ اس لیے کہ نہ تو یہ عورت مطلقہ ہے اور نہ وہ فوت شدہ خاوند والی۔ بلکہ ان کے مابین تفریق بلا طلاق ہوئی ہے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اگر اس عورت کے یہاں سرخ رنگ کا، ہلکے سرین اور ابھری پیٹھ والا بچہ پیدا ہوا، جس کی پنڈلیاں باریک ہوں، تو وہ ہلال بن امیہ کا ہے۔ اور اگر گندم گوں، گھونگھریالے بالوں، موٹے جوڑوں اور گوشت سے بھری ہوئی پنڈلیوں اور بھاری سرین والا بچہ پیدا ہوا تو وہ اس شخص کا ہے جس کے ساتھ وہ متہم ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں بعد والی خصوصیات کا حامل لڑکا پیدا ہوا۔[2]

---

[1] اس لیے کہ لعان سے تہمت کا ازالہ ہو گیا، لہٰذا جو شخص اس عورت یا اس بچے پر اتہام طرازی کرے گا اس پر شرعی حد نافذ ہو گی۔ عبدالرزاق المصنف (۷-۱۲۴) میں ثوری سے روایت کرتے ہیں، وہ موسیٰ بن عُبیدہ سے، وہ نافع سے اور وہ عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ "لعان کرنے والی عورت کے بیٹے کو اس کی ماں کے نام سے پکارا جائے اور جس نے اس کی ماں پر بہتان طرازی کی، اور اسے زانیہ کا بیٹا کہا تو اس پر حد لگائی جائے گی۔" جمہور علماء کا موقف یہی ہے۔

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں اگر وہ بچہ موجود نہ ہو جس کے نسب کی اس نے نفی کی ہے تو قاذف پر حد لگائی جائے لیکن اگر وہ بچہ موجود ہو جس کے نسب کی اس نے نفی کی ہے تو قاذف پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ نے بچے کی موجودگی کو زنا میں شبہ کا موجب قرار دیا ہے اور شبہ کی بنا پر اس سے حد ساقط کر دی ہے۔

امام سرخسی نے اس موقع پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے اس وقت لعان کرے جب بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ پھر بچے کے پیدا ہونے کے بعد وہ یا کوئی اور شخص اس عورت پر بہتان لگائے تو اس پر قذف کی حد لگائی جائے گی۔ اس لیے کہ وہ عورت لعان اور تفریق کے بعد محصنہ تھی۔ اس لیے کہ لعان محصنہ ہونے کی بنا پر ہی کیا گیا تھا، لہٰذا وہ محصنہ ہونے سے خارج نہیں ہو گی۔ اور اگر بچے کی موجودگی میں عورت کے ساتھ لعان کیا اور اس کے بعد خاوند یا کسی اور نے اس عورت کو متہم کیا تو قاذف پر نہ حد عائد ہو گی اور نہ ہی لعان۔ اس لیے کہ وہ عورت زانیات کے مماثل ہے کیوں کہ اس کی گود میں ایسا بچہ موجود ہے جس کے والد کا کچھ پتہ نہیں۔ لہٰذا وہ محصنہ نہیں ہو گی۔ (المبسوط ج ۷ ص ۵۳)

[2] سنن ابی داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر قسمیں نہ کھائی گئی ہوتیں تو میں اس عورت کو سخت سزا دیتا۔"

عکرمہ کہتے ہیں (جوان ہو کر وہ بچہ) جب کسی شہر کی امارت پر فائز ہوا تو اس کو باپ کے نام پر نہیں پکارا جاتا تھا۔[2] ہلال بن امیہ اُن تین صحابہ میں شامل تھے جن کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول کی تھی۔
رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ لعان کرنے والی عورت کو اس کا خاوند رہائش مہیا کرنے کا پابند نہیں ہے۔

---

[1] یہ ابوداؤد کی حدیث کا آخری حصہ ہے۔ المنذری "المختصر" (۳-۱۶۹) میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں عبّاد بن منصور ہے۔ اس پر بہت سے محدثین نے جرح کی ہے۔ یہ منکرِ تقدیر تھا اور اس عقیدہ کی تبلیغ بھی کیا کرتا تھا۔
یہ حدیث امام احمد نے مسند (۱-۲۳۸) میں یزید سے روایت کی ہے۔ وہ عبّاد بن منصور سے، وہ عکرمہ سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی روایت اس (متن والی) روایت سے طویل ہے۔ الہیثمی نے یہ حدیث "مجمع الزوائد" (۵-۱۱۰) میں اختصار کے ساتھ روایت کی ہے۔ الہیثمی کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ کی روایت صحیحین میں اختصار کے ساتھ منقول ہے۔ اس حدیث کو ابویعلیٰ اور امام احمد نے مختصراً ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ مگر اس حدیث کا انحصار عبّاد بن منصور راوی پر ہے اور وہ ضعیف ہے۔
امام نسائی نے کتاب "الضعفاء" (ص ۲۲) میں عبّاد بن منصور کو ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب "الجرح والتعدیل" (۳-۱-۸۶) میں عباد بن منصور کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے اپنے والد سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ضعیف ہے تاہم اس کی روایت کردہ احادیث کو تحریر کر لیا جاتا ہے۔"
امام احمد بن حنبل اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ "کان یدلس" (اس میں تدلیس کا عیب پایا جاتا ہے) دیکھیے (۲-۶-۳)۔ نسائی کہتے ہیں "اس (منصور بن عبّاد) کی حالت دگرگوں ہو گئی تھی۔" دیکھیے "الضعفاء" للنسائی۔
مشہور بات ہے کہ تدلیس کی تہمت سماع کی تصریح سے زائل ہو جاتی ہے بشرطیکہ راوی صادق القول ہو۔ عبّاد بن منصور نے بھی عکرمہ سے سماع کی تصریح کی ہے جیسا کہ ابوداؤد طیالسی کی روایت میں ہے۔ (دیکھیے "منحۃ المعبود" (۱-۳۲۰) نیز البیہقی (۷-۳۹۴)۔ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ عبّاد قدریہ میں سے تھا یا یہ کہ اس کی حالت دگرگوں ہو گئی تھی، تو عبّاد کی ان دو عیوب سے براءت کے لیے کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا اس حدیث کی سند پر وہ الزام باقی ہے جو المنذری اور الہیثمی نے عائد کیا ہے۔ الّا یہ کہ کسی اور دلیل سے اس حدیث کی صحت ثابت ہو جائے۔ اور یہ ایک بات تو پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس حدیث کی اصل صحاح اور سنن میں صاف ستھرے طریقے سے موجود اور ثابت ہے۔
ابوداؤد کا یہ قول کہ "کان امیراً علی مصر" (کسی شہر کا امیر بنا) یہاں مصر سے کوئی شہر مراد ہے۔ ابوداؤد طیالسی نے مسند میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ "اسے ملک مصر کا امیر بنایا گیا تھا" اس نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

[2] ہلال بن اُمیہ بن عامر بن قیس بن عبدالاعلم بن عامر بن کعب بن واقف انصاری۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت تک زندہ رہے۔ حتیٰ کہ عکرمہ نے ان کا زمانہ پایا اور ان سے حدیثیں روایت کیں۔ بعض محدثین کہتے ہیں کہ عکرمہ ہلال سے مرسلاً روایت کرتے ہیں اور ان سے مل نہیں سکے۔ (دیکھیے "الضعفاء" (۳-۷-۶)

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ لعان کرنے والی عورت کے لیے سکونت مہیا کرنا ضروری ہے۔ مگر قاضی اسماعیل اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے سکونت نہیں دی جائے گی۔ ابوداؤد اور مسند ابن ابی شیبہ کی حدیث میں بھی اسی بات کی صراحت موجود ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ عاصم بن عدیؓ نے اپنی بیوی سے لعان کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اس مصیبت میں صرف ایک بات کی وجہ سے مبتلا ہوا جو میرے منہ سے نکل گئی۔

صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ سہلؓ بن سعد جب اس لعان کے موقع پر حاضر ہوئے تو اس وقت ان کی

لہ "المدونہ" (۳-۱۱۹) میں ہے کہ امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ آیا لعان کرنے والی عورت کو سکونت مہیا کی جائے گی؟ انہوں نے کہا: "اسے سکونت تو مہیا کی جائے گی مگر نان و نفقہ نہیں دیا جائے گا"۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "اسے نفقہ یا سکونت کوئی چیز بھی نہیں دی جائے گی"۔ امام ابوحنیفہؒ اور محمدؒ بن حسن کہتے ہیں کہ "لعان سے ایک بائن طلاق واقع ہوتی ہے اور عدت کے دوران اسے نفقہ اور سکونت مہیا کی جائے گی"۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:-

"جب بائن طلاق پانے والی عورت کو نفقہ اور سکونت مہیا نہیں کی جاتی تو لعان والی عورت کو بطریق اولیٰ یہ دونوں چیزیں مہیا نہیں کی جائیں گی۔ اس لیے کہ بائن طلاق والی عورت کا خاوند تو عدت کے دوران اس کے ساتھ (دوسری مرتبہ) نکاح کر سکتا ہے۔ مگر لعان والی عورت کے ساتھ اس کا خاوند کسی صورت میں بھی نکاح نہیں کر سکتا۔ نہ عدت کے دوران اور نہ اس کے بعد۔ لہٰذا لعان کرنے والی عورت کے خاوند پر نفقہ و سکونت واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے کہ ان کا تعلق کلی طور پر منقطع ہو چکا ہے۔"

دیکھیے زاد المعاد (۴-۱۰۸)

لہ صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب "قول الامام اللهم بين" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۳۱۱)

لہ سنن ابی داؤد (۲-۲۷۵) میں ہے کہ سہلؓ بن سعد کہتے ہیں کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان دونوں لعان کے وقت موجود تھا۔ میری عمر اس وقت پندرہ برس تھی۔ میرا نام "حزن" تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل کر کے "سہل" رکھ دیا۔

سہلؓ کا نام و نسب حسب ذیل ہے:-

سہل بن سعد بن مالک بن خالد بن ثعلبہ بن حارثہ بن عمرو بن الخزرج بن ساعدۃ بن کعب انصاری الساعدی۔

زہری کہتے ہیں کہ سہل بن سعد نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپؐ کے ارشادات سنتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اس وقت سہلؓ کی عمر پندرہ برس تھی۔

میرا خیال ہے کہ یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ لعان کا واقعہ ۹ھ ماہ شعبان میں پیش آیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے لوٹے تھے۔ دیکھیے "اسد الغابۃ" (۴-۱۵۸) اس بات کی شہادت عبداللہؓ بن جعفر نے دی ہے۔ دیکھیے دارقطنی (۳-۲۷۷) مگر اس کی سند میں واقدی ہے جو مشہور کذاب ہے۔ سہلؓ بن سعد کی عمر جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں مذکور ہے

عمر پندرہ سال تھی۔ اس کے بعد وہ پچاسی برس زندہ رہے۔ اور ایک سو سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے یہ آخری صحابی تھے جنھوں نے مدینہ میں وفات پائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ میں لعان کا واقعہ صرف حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کے عہد خلافت میں پیش آیا۔

اس وقت پندرہ برس تھی۔ بنا بریں سہلؓ کی عمر حضورؐ کی وفات کے وقت سولہ برس ہوگی۔

سہلؓ نے طویل عمر پائی۔ آپ حجاج ثقفی کے زمانے میں زندہ تھے اور اس کے ابتلاء سے گزرے تھے۔ آپ نے ۸۸ھ میں وفات پائی۔ ایک قول یہ ہے کہ ۹۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ایک سو سال تھی۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے سب اصحاب رسول کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

ابو حازمؒ کہتے ہیں کہ میں نے سہلؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا: "اگر میں فوت ہو چکا ہوتا تو تم کسی شخص کو "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہتے نہ سنتے۔"

دیکھیے "اسد الغابۃ" (۲-۳۶۶، ۳۶۷) "الاصابہ" (۲-۸۷) "الاستیعاب" (۲-۴۷۴) اور "تراجم" کی دوسری کتابیں۔

كِتَابُ الْبُيُوعِ

بیع سَلَم، ربا اور اسی طرح کے دوسرے معاملات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے۔ اس

لہ السَّلَم: بفتح السین واللام۔ سَلَم کا لفظ وزن و معنی کے لحاظ سے "سَلَف" کی مانند ہے۔ سَلَم کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کی قیمت پیشگی ادا کر دی جائے اور وہ چیز وقت معین پر وصول کی جائے۔ یہ ایک قسم کی بیع ہے اور اس کا انعقاد بھی بیع کی مقررہ شرائط کے مطابق ہوتا ہے۔ اس بیع میں راس المال کا قبل از وقت ادا کرنا شرط ہے، البتہ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس کی ادائیگی میں ایک دو دن کی تاخیر ہو سکتی ہے۔ مزید براں فروخت کردہ چیز کے سلسلے میں اس کی مقدار یا وزن کی مقدار متعین کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر مقدار یا وزن کے حساب سے اس کا لین دین نہ ہوتا ہو تو اس میں گنتی یا پیمائش کی تعیین از بس ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ تعداد اور پیمائش بھی مقدار اور وزن کا حکم رکھتے ہیں جس طرح مقدار اور وزن کے تعین سے مقدار غیر معلوم نہیں رہتی بعینہٖ اسی طرح عدد اور پیمائش سے بھی اس مقصد کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

بیع سَلَم کتاب و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں بالکل جائز اور درست ہے —— قرآن کریم میں فرمایا :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ۔ (البقرۃ - ۲۸۲)

اے ایمان والو! جب تم آپس میں کچھ مدت کے لیے لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

سعید بن منصور اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا "میں شہادت دیتا ہوں کہ مدت مقررہ تک پیشگی بیع کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا اور اس کی اجازت دی۔ پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی۔ امام شافعیؒ نے اپنی سند کے ساتھ کتاب "الاُم" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح امام حاکمؒ نے "المستدرک" میں اس کو نقل کیا اور صحیح قرار دیا ہے، البتہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود نہیں۔

بیع سَلَم کا جواز سنت سے بھی ثابت ہے۔ اس کی دلیل مذکورہ بالا حدیث اور دوسری احادیث نبویہ ہیں جو اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔

اجماع۔ جہاں تک اجماع امت کا تعلق ہے ابن المنذر لکھتے ہیں :۔

اس بات پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ بیع سلم جائز اور درست ہے۔ اس لیے کہ فروخت کردہ چیز (مبیع) ان دونوں امور میں سے ایک ہے جن پر بیع کا انعقاد ہوا ہے (عقد بیع میں دو چیزیں شامل ہیں (۱) قیمت اور (۲) فروخت کردہ چیز) جس طرح قیمت کسی کے ذمے ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح مبیع کی سپردگی میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس بیع کی ضرورت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کھیتی باڑی کرنے والوں اور تجارت پیشہ لوگوں کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کھیتی باڑی اور باغات کے تحفظ و نگہداشت پر بھی خرچ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ خرچ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں لہٰذا وہ بیع سَلَم کر کے مشتری سے پیشگی رقم وصول کرنے کے مجاز ہیں۔ اسی طرح خریدار کو بھی وہ چیز مقابلۃً کم قیمت پر مل جاتی ہے۔" (لہٰذا بیع سَلَم سے فریقین مستفید ہوتے ہیں) دیکھیے "المغنی" لابن قدامہؒ (۴ - ۲۰۶ - ۲)

لہ صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "السلم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۴۰) لہ صحیح مسلم (۳ - ۱۲۲۶) کتاب "المساقاۃ" باب "السلم"

وقت اہل مدینہ دو تین سال پیشگی کھجوروں کے باغ خرید لیا کرتے تھے۔ اصیلی کی کتاب "الدلائل" میں اس روایت پر ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ آپ نے ان کو منع کر دیا۔

ابوداؤد[۱] میں ہے کہ ایک شخص نے کھجور کے درخت ایک آدمی سے پیشگی خرید لیے۔ اس سال درختوں کو پھل نہ آیا۔ دونوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا اپنا دعویٰ پیش کیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"تم اس کے مال کو اپنے لیے کیسے حلال سمجھتے ہو؟ اس کا مال اسے واپس کر دو"

پھر آپؐ نے فرمایا:

"کھجوروں کے باغ قبل از وقت نہ خرید لیا کرو بلکہ اس وقت خریدو جب ان کے پھلوں کی صلاحیت نمایاں ہو جائے"۔

صحیح بخاری، مسلم اور اصیلی کی "الدلائل" میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ اَسْلَفَ فَلْيُسْلِفْ فِيْ كَيْلٍ مَعْلُوْمٍ وَّوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ۔

اگر کوئی شخص پیشگی خرید و فروخت کا معاملہ کرے تو وہ کیل اور وزن کی تعیین کر لے۔

دونوں کتابوں (صحیح بخاری و مسلم) میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے دیکھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لوگوں کو اس لیے پیٹا جاتا تھا کہ وہ غلہ خرید کر اسی وقت، اسی جگہ اس کو فروخت کر ڈالتے تھے۔ حالانکہ غلہ اس وقت فروخت کرنا چاہیے جب اس کو جائے خرید سے منتقل کر دیا جائے۔

یہ واقعہ سنن نسائی میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے انصار کے قبیلہ بنی عدی کے ایک شخص کو خیبر کا گورنر مقرر فرمایا۔

---

۱ ابوداؤد (۳-۲۷۶) کتاب "البیوع" باب "فی السلم فی ثمرة بعینها"۔ "المنذری" "المختصر" میں لکھتے ہیں کہ اس سند میں ایک مجہول راوی ہے۔

یہ حدیث ابن ماجہ نے (۲-۷۶۷) کتاب "البیوع" باب "اذا سلم فی نخل بعینه" میں روایت کی ہے۔

عبدالحق "الاحکام" میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند منقطع ہے۔ اس کو زیلعی نے "نصب الرایة" (۴-۴۹) میں نقل کیا ہے۔

۲ نسائی (۷-۲۹۰) کتاب "البیوع" باب "السلف فی الثمار"

۳ مؤطا امام مالک (۲-۵۳) کتاب "البیوع" باب "ما یکره من بیع التمر"۔

۴ صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منه" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۰۱، ۲۲۰۲)

۵ بنی عدی قبیلہ اوس کی ایک شاخ کا نام ہے۔ اس شخص کا نام سواد بن غزیہ تھا (دیکھیے دارقطنی ۳-۱۷) یہ وہی شخص ہے جس نے غزوۂ بدر کے موقع پر خالد بن ہشام مخزومی کو قیدی بنایا تھا۔ اس نے بدر کے بعد تمام غزوات میں شرکت کی۔ یہ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حاکم مقرر ہوا تھا۔ دیکھیے "اسد الغابة" (۲-۳۷۴) اور "الاستیعاب" (۲-۶۷۳)

۶ صحیح مسلم (۳-۱۲۱۵) کتاب "المساقاة" باب "بیع الطعام مثلاً بمثل"۔

وہ آپ کی خدمت میں بہت عمدہ کھجوریں لایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کیا خیبر کی سب کھجوریں اسی قسم کی ہیں؟

اس نے کہا "یا رسول اللہ! بخدا نہیں۔ ہم دراصل دو صاع کھجوریں دے کر اس قسم کی ایک صاع عمدہ کھجوریں لے لیتے ہیں۔ یا تین صاع دے کر دو صاع اچھی کھجوریں لے لیتے ہیں" یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یوں نہ کیا کرو۔ اپنی کھجوریں نقد رقم کے عوض فروخت کر کے اسی قیمت سے عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو"[۱]

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور المیزان میں اسی طرح ہے۔ صحیح مسلم میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ تو بالکل سود ہے"۔ ایک اور حدیث میں ہے "یہ سود ہے، اس کو واپس کر دو۔ پھر اپنی کھجوریں بیچو اور ہمارے لیے اس قسم کی کھجوریں خرید کر لاؤ"

مؤطا[۲] میں امام مالک، یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[۱] اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو فقہی احکام کی تطبیق میں حیلہ سے کام لینے اور کسی صحیح مقصد کے حصول کے لیے کوئی راستہ نکالنے کے جواز کے حق میں ہیں۔ اس لیے کہ اس بیع میں محض صورت بدلنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کھجوروں کی بیع کمی بیشی کی صورت میں بھی جائز ہو جاتی ہے۔

احناف میں سے اہل الرائے نے زکوٰۃ، نکاح اور خرید و فروخت کے معاملات میں حیلے سے کام لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ۔ (سورۂ ص۔ ۴۴) — اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا لو اور اسے اس سے مارو اور اپنی قسم نہ توڑو۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے بیماری کی حالت میں کسی بات پر خفا ہو کر قسم کھائی کہ تندرست ہو گئے تو اپنی بیوی کو سو چھڑیاں ماریں گے۔ وہ بیوی تمام حالات میں آپ کے ساتھ رہی تھی اور چنداں قصور وار بھی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرما کر قسم سچا کرنے کا ایک حیلہ ان کو بتلا دیا جو ان ہی کے لیے مخصوص تھا۔ آج اگر کوئی شخص اس طرح کی قسم کھا بیٹھے تو اس کے پورا کرنے کے لیے اتنی بات کافی نہ ہو گی۔ جس حیلہ سے کسی شرعی حکم یا مقصد کا ابطال ہوتا ہو وہ جائز نہیں۔ جیسے اسقاطِ زکوٰۃ وغیرہ کے حیلے جو لوگوں نے ایجاد کیے ہیں۔ البتہ جس حیلہ سے شرعی حکم کا ابطال نہ ہوتا ہو بلکہ کسی معروف کا ذریعہ بنتا ہو وہ جائز ہے۔" (قرآن مجید محشّٰی مولانا شبیر احمد عثمانی ص ۵۹۲)

امام محمد بن حسن شیبانی نے اس موضوع پر باقاعدہ ایک کتاب تصنیف کی ہے جو "کتاب العمل" کے نام سے معروف ہے۔

[۲] مؤطا امام مالک (۲-۵۸) کتاب البیوع باب بیع الذهب بالفضة تبرا وعينا۔ یہی یہ روایت مرسل ہے۔ یہ حدیث ابن وہب نے لیث بن سعد اور عمرو بن الحارث سے روایت کی ہے۔ وہ دونوں یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں۔ یحییٰ نے ان دونوں کو بتایا کہ میں نے عبید اللہ بن ابی سلمہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ (تا آخر) امام سیوطی نے یہ حدیث "تنویر الحوالک شرح موطا" (۲-۵۸) اور زرقانی نے شرح مؤطا (۳-۲۲۲) میں نقل کی ہے۔ زرقانی کہتے ہیں کہا گیا ہے کہ یحییٰ بن سعید کا استاد عبد اللہ بن [illegible]

سعدؓ بن مالک اور سعدؓ بن عُبادہ کو حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے سونے چاندی کے برتن فروخت کر دیں۔
چنانچہ ان دونوں نے تین کو چار کے عوض اور چار کو تین کے بدلے میں فروخت کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم نے سودی کاروبار کیا ہے لہٰذا اس کو واپس کر دو۔"[۲]
صحیح مسلم میں ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر حضورؐ کی خدمت میں ایک ہار پیش کیا گیا جس میں موتی اور سونا تھا۔ یہ مالِ غنیمت

اس حدیث کو عبداللہؓ بن عمر اور دیگر صحابہ سے روایت کرتا ہے۔ امام بخاری کا دعویٰ ہے کہ وہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ کا والد ہے۔ یہ بات ابوعمر نے کہی ہے۔

ف اصل متن میں "سَعْدَین" (دو سعد) کے الفاظ ہیں۔ دو سعد سے یہاں سعد بن مالک اور سعد بن عبادہ مراد ہیں۔ یہ بات امام سیوطی نے ابن عبدالبرؒ کے حوالے سے کہی ہے۔ ابن عبدالبر مزید کہتے ہیں "صحابہ میں سعد بن مالک صرف دو اشخاص ہیں۔ (۱) سعد بن ابی وقاص اور (۲) ابوسعید خدری۔ اغلباً یہاں سعد بن مالک سے سعد بن ابی وقاص مراد ہیں۔ اس لیے کہ ابوسعید خدری اس وقت چھوٹی عمر کے تھے۔ آگے چل کر کہتے ہیں کہ مجھے اس کی دلیل بھی مل گئی ہے۔ اس کا ذکر یعقوب بن شیبہ اور سعد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے بھی کیا ہے۔ یہ دونوں قدامہ بن محمد بن خشرم اشجعی سے، وہ اپنے والد سے، وہ مخرمہؓ بن بکیر سے اور وہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مجھے ابوکثیر جلاح مولیٰ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز بن مروان سے سنا، وہ کہتے ہیں میں نے الحنش صنعانی سے سنا، وہ فضالہ سے روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعدؓ بن ابی وقاص اور سعدؓ بن عبادہ کو مالِ غنیمت کا محافظ مقرر کیا۔ اس کے بعد باقی حدیث بیان کی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح، متصل اور حسن کے درجہ کی ہے۔

ف ابوداؤد (۳ - ۲۴۹) کتاب "البیوع" باب "فی حلیۃ السیف تباع بالدراھم" یہ حدیث ترمذی، نسائی اور دار قطنی نے کتاب البیوع میں نقل کی ہے۔

یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ مسلمان حاکم اگر مالِ غنیمت فروخت کرنے میں مسلمانوں کی کوئی مصلحت سمجھے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ مالِ غنیمت سے حاصل شدہ قیمت مجاہدین میں تقسیم کر دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث میں تو ہے کہ حضورؐ نے بیع کو فسخ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے برعکس غزوۂ خیبر میں آپ کے عامل نے جب دو صاع کھجور کے عوض ایک صاع عمدہ کھجوریں لی تھیں تو آپ نے واپس کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ برتنوں کا مشتری معلوم اور موجود ہوگا لیکن کھجوروں کا خریدار موجود نہ ہوگا۔ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ کھجوروں کی خرید و فروخت سے پہلے آپ نے اس سے منع نہ کیا ہو اس لیے اس بیع کو فسخ کرنے کا حکم نہ دیا ہو، مگر برتنوں کے معاملے میں یہ صورتِ حال نہ ہو۔ مذکورہ حدیث میں فروخت کرنے سے پہلے سونے چاندی کے برتنوں کو توڑنے کا حکم نہیں دیا۔ اس لیے کہ مشتری لامحالہ ان کو توڑے گا۔ وہ تو ان برتنوں سے استفادہ کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ آپ نے فرمایا "جو شخص چاندی کے برتن میں کھاتا پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتا ہے۔ (شرح الموطا للزرقانی)

ف صحیح مسلم (۳ - ۱۲۱۳) کتاب "البیوع" باب "بیع قلادۃ فیھا خرز و ذھب"

یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ سونے کی ایک ایسی چیز کے عوض بیع جائز نہیں جس میں سونے کے علاوہ کچھ اور چیز بھی ہو۔ اس

میں سے تھا اور اس کو فروخت کیا جا رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہار میں جو سونا ہے اس کو الگ کر لیا جائے۔ پھر آپؐ نے فرمایا:
"سونے کو سونے کے عوض برابر برابر فروخت کیا جائے۔"
ابو داؤد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "اس ہار کو اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے جب تک اس میں سے سونا الگ نہ کر لیا جائے۔"

[1] مؤطا امام مالک، صحیح بخاری [2] اور صحیح مسلم [3] میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص پیوند کردہ کھجور کے

صورت میں سونے کو دوسری چیز سے الگ کر کے سونے کو سونے کے عوض برابر برابر فروخت کرنا چاہیے۔ اور دوسری چیز کو جیسے چاہے فروخت کرے۔ اور یہی اصول ان دوسری اشیاء کے بارے میں بھی ملحوظ رکھا جائے گا جن میں "ربا" پایا جاتا ہو، چنانچہ چاندی ہو یا گندم اور نمک ہو یا کوئی دوسری جنس، اس میں اگر کوئی اضافی چیز شامل ہو تو اس کو اپنی ہی جیسی جنس کے بدلے میں فروخت کرنے سے پہلے اس اضافی چیز کو الگ کر دیا جائے گا۔ اور پھر اس جنس کو الگ طور پر اور اس اضافی چیز کو الگ طور پر فروخت کیا جائے گا۔ امام احمد، شافعی اور بعض مالکیہ اس کے قائل ہیں۔

امام ابو حنیفہ اور ثوری کہتے ہیں کہ اس چیز میں جتنا سونا موجود ہے اس سے زیادہ سونے والی چیز کے ساتھ اس کی بیع جائز ہے۔ لیکن اگر دوسری چیز میں بھی اتنا ہی سونا ہو یا اس سے کم ہو تو جائز نہیں۔ طحاوی نے اس حدیث کو قبول کرنے سے اس لیے معذرت چاہی ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے۔ کیونکہ اس کے الفاظ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک روایت میں موتیوں اور سونے کے الفاظ ہیں۔ دوسری میں سونا اور جواہرات ہے۔ تیسری میں ہے کہ موتی سونے کے ساتھ چسپاں تھے۔ اس ہار کی قیمت بعض روایات میں بارہ دینار، بعض میں نو دینار، اور بعض میں سات دینار بیان کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے "التلخیص الحبیر" میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جس چیز سے استدلال کیا جا رہا ہے اس میں کوئی اضطراب نہیں پایا جاتا۔ اور استدلال اس چیز سے کیا گیا ہے کہ سونے کو الگ کیے بغیر ایسی چیز کو فروخت کرنا درست نہیں۔

علامہ سُبکی کہتے ہیں کہ یہ اضطراب ایسا نہیں جو جرح و نقد کا موجب ہو۔ مزید براں اس قسم کے اضطراب کی بنا پر احادیث صحیحہ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

امام مالکؒ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ جو تلوار سونے سے یا اس چیز سے مرصع ہو جو سونے کے حکم میں ہے تو اس کو اس چیز کے عوض فروخت کرنا جائز ہے جس میں سونا پایا جاتا ہو۔ بشرطیکہ جو چیز بیچی جا رہی ہے اس میں جو سونا ہے وہ دوسری چیز کے تابع ہو۔ مثلاً وہ سونا اس چیز کا ایک تہائی یا اس سے کم ہو۔

مندرجہ بالا حدیث اس امر کی صریح دلیل ہے کہ مرصع تلوار کو فروخت کرنا درست نہیں، بلکہ فروخت کے وقت سونے کو تلوار سے الگ کر لینا چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ سونا اس سے کم ہو یا زیادہ۔ لہٰذا اس حدیث پر عمل کرنا مختلف قسم کی تاویلات اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سلف کی ایک جماعت کا مسلک یہی ہے۔

[1] مؤطا امام مالک (۲ - ۵۰) کتاب "البیوع" باب "ماجاء فی ثمر المال یباع اصلہ"۔
[2] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "من باع نخلاً قد ابرت" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۰۲)
[3] صحیح مسلم (۳ - ۱۱۷۲) کتاب "البیوع" باب "من باع نخلا علیها ثمر"۔

درخت فروخت کرے ان کا پھل بائع (فروخت کنندہ) کا ہوگا۔ الا یہ کہ مشتری (خریدار) اس کو سودے میں شامل کرلے۔ اور جو شخص کسی غلام کو فروخت کرے اور غلام کے پاس کچھ مال بھی ہو تو اس کا مال بائع کا ہوگا۔ بجز اس صورت کے کہ مشتری اس کو سودے میں شامل کرنے کی شرط لگائے۔"

اُصَیلی کی کتاب "الدلائل" میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے پیوند کردہ کھجور کے درخت خریدے، آپ کی خدمت میں فریقین نے دعویٰ پیش کیا۔ حضورؐ نے فیصلہ فرمایا:

"درختوں کے پھل کا مالک وہ شخص ہے جس نے ان درختوں کو پیوند کیا۔ الا یہ کہ مشتری نے پھل کی شرط لگائی ہو۔"

مصنف عبدالرزاقؒ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے سے اونٹ خریدا اور

لہ امام بیہقی نے اس حدیث کو "المعرفۃ" میں امام شافعی کے حوالے سے عطاء کی مرسل روایات کے ضمن میں نقل کیا ہے۔

حافظ ابن حجر "التلخیص الحبیر" (۳ - ۲۷) میں لکھتے ہیں:

ابن الطلاع نے اس حدیث کو "الاحکام" میں اُصیلی کی کتاب "الدلائل" کے حوالے سے ابن عمرؓ سے مروی روایات میں شمار کیا ہے اور انھوں نے اس پر کوئی جرح و نقد نہیں کیا۔ ابن ماجہ (۲ - ۷۴۶) نے اس حدیث کو عبادہؓ بن صامت سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا ہے کہ پیوند کردہ کھجوروں کا پھل مالک کا ہوگا۔ الا یہ کہ مشتری نے خریداری کے وقت اس کو سودے میں شامل کرلیا ہو۔ اسی طرح غلام کا مال اسی شخص کا ہوگا جو اس کو فروخت کرے۔ بجز اس صورت کے کہ مشتری اس کی شرط عائد کردے۔"

مگر اس حدیث کی سند منقطع ہے۔ اس لیے کہ اسحاق بن یحییٰ بن ولید نے عبادہؓ بن صامت کا زمانہ نہیں پایا۔ یہ بات امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین نے کہی ہے۔ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص پیوند کردہ کھجور کے درخت فروخت کرے تو اس کا پھل بائع کا ہوگا۔ اور جب درخت پیوند کردہ نہ ہوں تو پھل مشتری کا ہوگا جمہور علماء کا یہی موقف ہے۔ ابوحنیفہ کا مسلک اس کے خلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں:۔

درخت کا پھل مشتری کا ہوگا قطع نظر اس سے کہ درخت پیوند کردہ ہوں یا غیر پیوند کردہ۔"

ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں:۔

"پھل خریدار کا ہوگا۔"

مگر یہ دونوں مسلک باب میں مذکور صحیح حدیث کے خلاف ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اور المذہبیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے اس کی کیا تاویل کی ہے۔

لہ مصنف عبدالرزاق میں یہ روایت مجھے نہیں ملی۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی "التلخیص الحبیر" میں اس کو مصنف عبدالرزاق کی طرف منسوب کیا ہے معلوم نہیں یہ روایت انھوں نے عبدالرزاق سے اخذ کی ہے یا ابن الطلاع کی اس کتاب سے اخذ کرکے عبدالرزاق کا حوالہ دیا ہے۔ ابن الہمام کہتے ہیں کہ اس روایت کو اُبان بن عیاش کی وجہ سے معلول قرار دیا گیا ہے۔ اور اُبان بن عیاش

چار روز تک خیار (واپسی کا اختیار) کی شرط لگائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو باطل قرار دیا اور فرمایا "خیار تین دن تک ہوتا ہے"۔

فیروز بصری ابو اسماعیل العبدی کے نام سے معروف ہے۔ امام ذہبیؒ نے "المیزان" میں اس کا مفصل تذکرہ لکھا اور اس کی مرویات کا ذکر کیا ہے، تاہم انھوں نے اس حدیث کا ذکر نہیں کیا۔

مشہور محدث شعبہؒ کہتے ہیں کہ کوئی شخص زنا کا ارتکاب کرے تو یہ ابان سے روایت کرنے سے بہتر ہے۔

امام احمدؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں۔ وکیعؒ جب اس کی روایت کردہ حدیث کو سنتے تو کہتے کہ وہ ضعیف راوی ہے، مگر میں اس کا نام لینا پسند نہیں کرتا۔ حافظ ابن حجرؒ اس کو متروک راوی قرار دیتے ہیں۔

سلہ خیار کا مسئلہ علماء کے یہاں مختلف فیہ ہے۔ جمہور اہلِ علم اس کے جواز کے قائل ہیں کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے، نیز اس لیے کہ اس کے جواز کے سلسلے میں متعدد احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں، البتہ سفیانؒ ثوری، ابن ابی شبرمہؒ، اور اہلِ ظاہر کا ایک گروہ اس کو جائز تصور نہیں کرتا۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ خرید و فروخت کی بنیاد یہ ہے کہ سودا حتمی ہے اور مشتری کو فروخت شدہ چیز میں تصرف کا حق حاصل ہوگیا ہے مگر خیار اس میں رکاوٹ ہے ۔۔۔۔۔۔ جہاں تک احادیث و آثار کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک یا تو وہ ثابت نہیں یا وہ ان حضرات کے ساتھ مخصوص ہیں جو خرید و فروخت میں دھوکہ کھا جایا کرتے تھے۔

خیار کی مُدّت: پھر جمہور اہلِ علم کے یہاں مدتِ خیار میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس کی کوئی متعین مدت نہیں اور اس کا انحصار فروخت شدہ چیز کی نوعیت اور مقدار پر ہے۔ مثلاً ان کے نزدیک کپڑے کے سلسلے میں ایک دو دن کی مدت کافی ہے۔ لونڈی غلام کے لیے ایک ہفتہ کی مدت اور مکان وغیرہ کے سلسلے میں ایک ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ دیکھیے المدونۃ (۵-۱۷۰)

قاضی ابو یوسفؒ، ابن المنذرؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، اسحاقؒ اور ثورؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ خیار کی مدت صرف تین دن ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: "خیار کے سلسلے میں تمھیں اس سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا جو رسول اللہ نے حبانؓ بن منقذ کو دی تھی یعنی تین دن پھر اگر وہ چاہے تو لے اور اگر چاہے تو ترک کر دے۔ پھر یہ حضرات اتنی محدود مدت کے اس لیے بھی قائل ہیں کہ خیار درحقیقت بیع کے تقاضے کے خلاف ہے۔ خیار سے ملکیت اور سودے کے حتمی ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے جو بیع کا تقاضا ہے۔ خیار کی اجازت صرف اس لیے دی گئی ہے کہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔ خیار اصل میں خلافِ قیاس ہے اس لیے اس کی اجازت صرف اتنی مدت کے لیے چاہیے جو نص میں مذکور ہے (شرح فتح القدیر ۵-۱۱۲)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ خیار اتنی مدت کے لیے جائز ہے جو سودے کے وقت مقرر کر لی جائے۔ یہ مدت چونکہ عقدِ بیع کے اندر شامل ہے لہٰذا متعاقدین (بائع و مشتری) کی تعیین کے مطابق ہوگی۔ ان کے نزدیک حضرت عمرؓ کا قول ثابت نہیں۔ اس کو دارقطنی (۳-۵۴) نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے جو ضعیف راوی ہے (المغنی لابن قدامہ ۳-۵۲۴)

یہ ہشامؒ[1] بن یوسفؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں اسی طرح ہے۔ البتہ اسماعیلی کی المسند لا مثل میں ہے کہ امام شافعی اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ تین دن کے بعد کوئی خیار نہیں۔

اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰؒ کے نزدیک خیار ایک سال یا اس سے کم وبیش کی مدت کے لیے بھی جائز ہے۔

قاضیؒ ابو یوسف اور محمدؒ بن حسن شیبانی بھی امام مالکؒ کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ خیار کی مدت لوگوں کے عرف اور رواج پر موقوف ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مثلاً اگر ایک شخص اگر ایک لمبی چوڑی بستی یا ایک ہزار اونٹ چراگاہ میں سے خریدے تو اس کا معاملہ اس شخص کی طرح نہیں ہوگا جو ایک اونٹ، یا ایک بکری یا ایک کپڑا خریدے۔

ابوبرزہؓ[2] کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا ہے کہ بائع و مشتری کو اس وقت تک بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں۔

مؤطا[3] امام مالک، صحیح بخاری[4] اور صحیح مسلم[5] میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

---

[1] ہشام بن یوسف:- یہ صنعاء یمن کے قاضی، عالم اور مفتی تھے۔ ابوعبدالرحمن صنعانی کے نام سے معروف تھے۔ عبدالرزاق کہتے ہیں: "اگر تمھیں قاضی ہشام بن یوسف حدیث سنائیں تو کسی اور سے روایت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ائمہ حدیث کی ایک جماعت نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے جن میں سے العجلی، ابوحاتم، حاکم اور الخلیلی قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۷ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ امام ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ (۱-۳۴۶) میں اور حافظ ابن حجرؒ نے "التھذیب" (۱۱-۵۷) میں ان کا تعارف لکھا ہے۔

[2] ابوداؤد (۳-۲۷۷) کتاب "البیوع" باب "فی خیار المتبایعین" پوری حدیث ابوالوضی یعنی عبادؒ بن نسیب سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں شرکت کرنے کے لیے گئے۔ ہم نے ایک جگہ قیام کیا۔ ہمارے ایک ساتھی نے اپنا گھوڑا ایک شخص کے پاس فروخت کر دیا۔ پھر ہم دن کا باقی حصہ اور رات بھر اسی جگہ مقیم رہے۔ جب صبح ہوئی تو کوچ کی تیاری ہوئی۔ وہ شخص اٹھ کر اپنا گھوڑا کسنے لگا لیکن اسے یاد آیا کہ وہ تو اسے فروخت کر چکا ہے۔ وہ نادم ہوا اور خریدار کے پاس آ کر گھوڑا واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔ خریدار نے گھوڑا واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابوبرزہؓ ہمارے درمیان ثالث ہیں، چنانچہ دونوں لشکر کے ایک کونے میں ابوبرزہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا بیان کیا۔ ابوبرزہؓ نے کہا کیا تمھیں یہ بات پسند ہے کہ میں تمھارے درمیان وہ فیصلہ کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، حضورؐ نے فرمایا: "بائع و مشتری کو سودا فسخ کرنے کا اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں"۔ ہشام بن حسان کہتے ہیں کہ جمیل نے بیان کیا کہ ابوبرزہؓ نے کہا: "میرا خیال ہے کہ تم ابھی تک ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے"۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابوبرزہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "جب تک الگ نہ ہوں" سے بائع اور مشتری کا جسمانی طور پر الگ ہونا مراد لیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری (۴-۳۳۰) میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ نے بھی یہی مطلب مراد لیا ہے اور صحابہؓ میں سے کسی نے ان سے اختلاف نہیں کیا۔

[3] مؤطا امام مالک (۲-۷۹) کتاب "البیوع" باب "بیع الخیار" عن ابن عمرؓ۔

[4] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "البیعان بالخیار مالم یتفرقا" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۱۱۱)

[5] صحیح مسلم (۳-۱۱۶۳) کتاب "البیوع" باب "ثبوت خیار المجلس للمتبایعین" علاوہ ازیں اصحاب سنن نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

"بائع و مشتری اس وقت تک بیع فسخ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں جب تک وہ ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں۔ البتہ بیع خیار کی صورت میں بیع فسخ کرنے کا اختیار ان کو علیحدہ ہونے کے بعد بھی حاصل رہتا ہے[1]۔"

---

[1] امام مالکؒ سے خیار کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: "بائع و مشتری کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اگرچہ وہ الگ نہ بھی ہوئے ہوں۔ اس لیے کہ سودا بات سے ہوتا ہے۔ جب سودا زبان کے ذریعے ہو گیا تو بات پکی ہو گئی۔ اب بائع و مشتری میں سے کسی کے لیے بھی اس سے انحراف درست نہیں۔ ہمارے نزدیک عبداللہ بن عمرؓ سے مروی حدیث کی کوئی حد معروف نہیں اور نہ ہی اس حدیث پر عمل ہے۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب بائع و مشتری میں اختلاف رُونما ہو تو بائع کے قول کو معتبر سمجھا جائے گا۔ ورنہ وہ بیع فسخ کر لیں"۔ (موطا امام مالک (۲-۷۹) اور المدونہ (۴-۱۸۸)

امام سیوطیؒ تنویر الحوالک (۲-۷۹) میں ابن عمرؓ کی روایت کردہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ ان احادیث میں سے ہے جو امام مالکؒ نے موطا میں روایت کی ہیں مگر اس حدیث پر ان کا عمل نہیں تھا۔

اسی طرح الخطابیؒ "معالم السنن" (۵-۹۵) میں لکھتے ہیں:

"میں نے امام مالک کے ساتھیوں اور تلامذہ سے اس سلسلہ میں اکثر یہ بات سنی ہے کہ وہ اس حدیث پر عمل نہ کرنے کے بارے میں امام مالکؒ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس حدیث پر عمل نہیں کیا جاتا ہے، اور یہ کہ بائع اور مشتری کے جسمانی طور پر الگ ہونے کے لیے کوئی حد مقرر نہیں۔ خطابی کہتے ہیں کہ امام مالک کا یہ قول حجت نہیں ہے۔

امام مالک اور ان کے اصحاب کا یہ قول کہ "ہمارے یہاں اس حدیث پر عمل نہیں کیا جاتا" گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ "میں اس حدیث کو رد کرتا ہوں اور اس پر عمل نہیں کرتا"

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ جب حدیث نبوی حجت ہے تو آپ نے اس کو رد کیوں کیا اور اس پر عمل کیوں نہ کیا؟

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ مالک پر رحم کرے مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے اس حدیث کی سند میں کس کو نقد و جرح کا ہدف بنایا۔ اپنے آپ کو یا نافع کو؟ بہر حال میں یہ بات کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا کہ کیا ان کے نزدیک خود ابن عمرؓ متہم ہیں؟"

(امام شافعیؒ کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کے تینوں راوی (امام مالک، نافع اور ابن عمرؓ) جب صادق القول ہیں تو امام مالک کے اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ کیا ہے۔ مترجم)

ابن ابی ذئبؒ امام مالکؒ کے اس طرز عمل پر اظہار تعجب کیا کرتے تھے۔ امام مالکؒ کے حق میں جو وعید وہ سنایا کرتے تھے زبان اور قلم اس کے اظہار سے قاصر ہے۔ ان کا واقعہ معروف ہے۔" (خطابی کا کلام ختم ہوا)

ابن العربیؒ امام مالکؒ کے قول کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"امام مالک اس حدیث کو اس لیے حجت نہیں مانتے کہ بائع و مشتری کی علیحدگی کا وقت متعین نہیں۔ اس لیے یہ بیع غرر کے مشابہ ہے۔ جیسے بیع ملامسہ جب بائع مشتری کو کہے کہ تم قابل فروخت چیز کو صرف ہاتھ لگا سکتے ہو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتے تو اسے بیع ملامسہ

ابن حبیبؒ "الواضحہ" میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے اور اس کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے "جب بائع و مشتری کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو بائع کا قول معتبر ہے۔ اور اگر مشتری اس کے قول کو تسلیم نہ کرے تو دونوں بیع فسخ کر لیں"۔[1]

"المدوّنہ"[2] میں ہے کہ جب بائع اور مشتری میں نزاع پیدا ہو جائے تو بائع کو حلف دلایا جائے۔ اس کے بعد مشتری کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو بائع کے حلف کے مطابق چیز لے لے اور چاہے تو سودا فسخ کر دے۔

کہا جاتا ہے) اس میں غرر (دھوکہ و فریب) کا احتمال ہوتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ امام مالکؒ خیار شرط کے قائل ہیں۔ اور اس میں انھوں نے وقت کی کوئی تعیین نہیں کی، لہٰذا اس میں غرر موجود ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ خیار مجلس میں کوئی غرر نہیں۔ اس لیے کہ بائع و مشتری دونوں بیع کو قائم بھی رکھ سکتے ہیں اور اپنے قول یا فعل کے ساتھ اس کو فسخ کر دینے پر بھی قادر ہیں۔ (فتح الباری ۴-۲۳۰)

[1] ابن عبدالبر فرماتے ہیں:۔

"امام مالک نے عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کردہ حدیث کو ابن عمرؓ سے مروی حدیث کی تفسیر قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ اختلاف بعض اوقات الگ ہونے سے قبل رونما ہوتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ فروخت شدہ چیز کی واپسی تو اس وقت ہوتی ہے جب بیع مکمل ہو چکی ہو۔ گویا ان کے نزدیک ابن عمرؓ سے مروی حدیث منسوخ ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس پر عمل نہ تھا جب ابن عمرؓ کی حدیث امام مالکؒ کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے فرمایا:

"ممکن ہے یہ حدیث متروک ہو اور اس پر عمل نہ ہو" وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی حدیث منقطع ہے متصل نہیں۔ ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے اس کو منقطع سند کے ساتھ روایت کیا ہے" (ابن عبدالبر کا بیان ختم ہوا)

میں کہتا ہوں عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی حدیث کی تخریج آگے آ رہی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ وہ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کردہ حدیث کے مقابلے میں اس لیے پیش نہیں کی جا سکتی کہ ابن عمرؓ سے مروی حدیث کے صحیح ہونے پر محدثین متفق ہیں۔

یہاں اس بات کی جانب اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک اہل مدینہ کا تعامل صحیح حدیث پر مقدم ہے۔ یہ معاملہ فقہاء کے نزدیک معرکۃ الآراء رہا ہے۔ اولین شخص جس نے قوی دلائل کی روشنی میں امام مالکؒ کے اس موقف کا ابطال کیا وہ امام شافعیؒ ہیں۔ انھوں نے "الرسالۃ" میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مزید براں امام محمدؒ نے بھی "الحجۃ" میں اس مسئلہ پر جامع نوٹ لکھا ہے۔ اصول الفقہ کی کتب میں یہ بحث تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

[2] "المدوّنہ" (۴-۱۸۸) بروایت اسماعیل بن عیاش، وہ اسماعیل بن امیہؒ سے وہ عبدالملک بن عبیدؒ سے اور وہ عبداللہ بن مسعودؓ کے بیٹے سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (تا آخر)

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اسناد اور الفاظ کے اختلاف کے ساتھ منقول ہے۔

مسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں یہ الفاظ ہیں:۔

"جب بائع اور مشتری میں اختلاف رونما ہو اور گواہ موجود نہ ہو تو بائع کا قول معتبر ہوگا۔ ورنہ بیع فسخ قرار پائے گی"۔

اشہبؒ فرماتے ہیں۔ یہ حدیث کہ "بائع اور مشتری کو الگ الگ ہونے سے پہلے بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے"، اس پر عمل نہیں

ابن ماجہ میں یہ اضافہ بھی ہے کہ "جب اختلاف پیدا ہو اور فروخت شدہ چیز بھی بعینہٖ موجود ہو"۔

دارقطنی میں ابو وائلؒ عبداللہ سے روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"جب بائع اور مشتری میں اختلاف پیدا ہو اور فروخت شدہ چیز ضائع ہو چکی ہو تو بائع کا قول معتبر ہوگا۔"

مسند احمد اور نسائی میں حضرت ابوعبیدہؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے یہاں دو آدمی آئے جنھوں نے باہم کسی چیز کا لین دین کیا تھا۔ مشتری کہتا تھا میں نے اتنے کا خریدا اور بائع کہہ رہا تھا میں نے اتنے کا فروخت کیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا کہ اس قسم کا معاملہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ وہ کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بھی ایسا واقعہ پیش ہوا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا: "بائع سے حلف لیا جائے۔ پھر مشتری کو اختیار ہے اگر چاہے تو اس حلف کے مطابق لے لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔"

مسند احمد، نسائی اور دارقطنی میں ابوعبیدہ سے مروی ہے۔ وہ اپنے والد عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ محدثین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ابوعبیدہ کا سماع اپنے والد عبداللہ بن مسعودؓ سے ثابت ہے یا نہیں۔ "المدونہ" کی روایت میں مصنف نے اپنی سند کی جانب اشارہ کیا ہے۔ امام شافعیؒ نے بطریق اسماعیل بن امیہ روایت کی ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کا وہ بیٹا جس نے آپ سے روایت کی ہے ابوعبیدہ ہے۔ اسی طرح امام شافعی اور ترمذی نے بطریق سفیان بن عجلان روایت کی ہے۔ وہ عون بن عبداللہ بن عتبہ سے، وہ ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ سند بھی منقطع ہے۔ اس لیے کہ عون کی ملاقات عبداللہ بن مسعودؓ سے ثابت نہیں۔

دارقطنی بطریق قاسم بن عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے۔ اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ضعیف راوی ہے۔ اسی طرح ابوداؤد بطریق عبدالرحمن بن قیس بن محمد بن الاشعث بن قیس روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے، وہ عبداللہ بن مسعودؓ سے۔ مزید براں ابوداؤد بطریق محمد بن ابی لیلیٰ، قاسم بن عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد سے وہ عبداللہ بن مسعودؓ سے لیکن محمد بن ابی لیلیٰ کی روایت کردہ احادیث کو حجت نہیں مانا جاتا اور عبدالرحمن کا سماع ان کے والد عبداللہ بن مسعودؓ سے ثابت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام شافعی پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ حدیث جن اسناد کے ساتھ بھی عبداللہ بن مسعود سے روایت کی گئی ہے ان میں سے کوئی بھی متصل نہیں۔ امام ابن حزمؒ اور عبدالحقؒ نے بھی اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، مگر بایں ہمہ یہ روایت فقہاء کے یہاں زبان زدِ عام ہے۔ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں:-

"یہ حدیث من حیث السند منقطع ہے مگر علماء کی ایک جماعت کے یہاں مشہور الاصل اور مقبول ہے اور انھوں نے اس حدیث کو بہت سے مسائل کی اساس قرار دیا ہے۔ (نیل الاوطار للشوکانی)

اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ بائع کا قول اس کی قسم سمیت معتبر ہے اور شہادت پیش کرنا مشتری کے ذمہ ہے۔ امام احمدؒ سے بھی یہی منقول ہے جیسا کہ ابن المنذر نے ان سے روایت کی ہے۔ بخلاف ازیں امام ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور ایک قول کے مطابق امام مالکؒ کا موقف یہ ہے کہ مشتری کا قول اس کی قسم کے ساتھ معتبر ہے۔ بشرطیکہ بائع اور مشتری میں سے کسی کے یہاں بھی شاہد موجود نہ ہو۔

ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے اور اس کی ناسخ وہ حدیث ہے جس کے الفاظ ہیں "اہل اسلام اپنی شرطوں کے پابند ہیں" نیز یہ حدیث کہ "جب بائع و مشتری میں اختلاف رونما ہو تو بائع سے قسم کی جائے"
یا یہ حدیث کہ "جب بائع اور مشتری میں اختلاف پیدا ہو تو بائع سے حلف لیا جائے" صحیحین میں موجود نہیں۔ امام مالک نے یہ مرسلاً روایت کی ہے۔ "الدلائل" میں اس حدیث کو یحیٰی بن سعید القطان، ابن عجلان سے، وہ عون بن عبداللہ سے، وہ ابن مسعود سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ نیز بروایت سفیان ثوری عن معن بن عبدالرحمٰن عن قاسم بن عبدالرحمٰن، عن ابن مسعود عن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روایت کی گئی ہے۔
موطا امام مالک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا خشک کھجوروں کی خرید و فروخت

لہ ملاحظہ ہو دارقطنی (۳-۲۷) بروایت عائشہ۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ "جب تک حق کے مطابق ہو"۔ اس کی سند میں عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نامی راوی ہے جس کو امام احمد، نسائی اور ابن حبان نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر "التلخیص الحبیر" (۳-۲۳) میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ یہ حدیث حضرت انس سے بھی مروی ہے۔ مگر اس کی سند بھی نہایت ہی ضعیف ہے۔
صحیح بخاری کتاب "الاجارۃ" باب "اجرا لسمسرۃ" میں حضرت ابوہریرہ سے بلا سند مروی ہے۔
"اہل اسلام اپنی شرائط کے پابند ہیں" یہ ان احادیث میں سے ایک ہے جن کو مصنف نے دوسری جگہ متصل سند کے ساتھ نقل نہیں کیا۔ یہ حدیث عمرو بن عوف المزنی سے بھی روایت کی گئی ہے۔ نیز اسے حاکم نے اپنی مسند میں کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف کی سند سے روایت کیا ہے۔ وہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ اس روایت کے الفاظ بھی وہی ہیں۔ صرف ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ بجز اس شرط کے جس میں کسی حرام چیز کو حلال ٹھہرایا جائے یا حلال چیز کی تحریم کی جائے"۔
اس روایت کی سند میں کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے (فتح الباری ۴-۴۵۱) علاوہ ازیں یہ حدیث ابوداؤد (۳-۳۰۴) نے کتاب "الاقضیۃ" باب "فی الصلح" میں ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے"۔ احمد بن عبدالواحد نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے "مگر وہ صلح جس کی بنا پر کسی حرام چیز کو حلال یا حلال کو حرام ٹھہرایا جائے"۔ سلیمان بن داؤد المہری نے اس حدیث میں "مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں" کا اضافہ کیا ہے۔ ترمذی نے یہ حدیث روایت کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔ ان دونوں کی سند میں کثیر بن عبداللہ ضعیف راوی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے بعض محدثین نے اس کو کذاب ٹھہرایا ہے۔
لہ موطا امام مالک (۲-۹۷) اس روایت میں مذکور نہیں کہ بائع سے حلف لیا جائے۔ جہاں تک "الدلائل" کی مذکورہ حدیث کا تعلق ہے وہ منقطع ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔
لہ ایک نسخہ میں قاسم بن ابی بکر ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ قاسم حضرت عبداللہ بن مسعود کے پوتے تھے نہ کہ حضرت ابوبکر کے بیٹے۔
لہ موطا امام مالک (۲-۳۵، ۴۵) کتاب "البیوع" باب "ما یکرہ من بیع التمر" بروایت زید بن ابی عیاش عن سعد بن ابی وقاص۔ ابوداؤد (۳-۲۵۱) کتاب "البیوع" باب "فی بیع التمر بالتمر" نیز نسائی (۷-۲۶۹) کتاب البیوع

تر کھجوروں کے عوض جائز ہے؟ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا تر کھجوریں خشک ہونے کے بعد وزن میں کم ہو جاتی ہیں؟ صحابہ نے اثبات میں جواب دیا۔ تب آپ نے اس سے منع فرمایا۔

باب "اشتراء التمر بالرطب" ابن ماجہ (۲ - ۷۶۱) کتاب "التجارات باب "بیع الرطب بالتمر"۔

الخطابی "معالم السنن" (۵ - ۳۳) میں لکھتے ہیں :۔

"سعد بن وقاص رضی سے مروی حدیث کی سند پر محدثین نے نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اس کی سند میں زید بن ابی عیاش ضعیف راوی ہے۔ امام شافعی کے مقرر کردہ ضوابط کی روشنی میں ایسی حدیث قابلِ حجت نہیں ہے، مگر امام شافعی کا خیال درست نہیں۔ ابو عیاش بنو زہرہ کا آزاد کردہ غلام اور معروف راوی ہے۔ امام مالک نے موطا میں اس سے روایت کی ہے۔ حالانکہ امام مالک کی معروف عادت ہے کہ وہ ضعیف راویوں سے روایت نہیں کرتے۔" (الخطابی کا بیان ختم ہوا)

المنذری "المختصر" میں اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ابو عیاش کیونکر مجہول راوی ہو سکتا ہے جبکہ دو ثقہ راویوں نے اس سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ایک عبداللہ بن یزید مولیٰ اسود بن سفیان نے اور دوسرے عمران بن ابی انس نے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان دونوں راویوں سے روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں محدثین کے ہاں وہ معروف ہے۔ روایتِ حدیث میں غیر معمولی طور پر محتاط ہونے کے باوجود امام مالک نے اس کی مرویات کو موطا میں جگہ دی ہے۔ حالانکہ وہ راویوں کی چھان پھٹک اور ان کے حالات کا کھوج لگانے کے سلسلے میں بڑے سخت واقع ہوئے ہیں۔ ترمذی نے اس کی روایت کردہ احادیث کو نقل کیا اور انھیں صحیح کہا ہے۔ حاکم بھی اسی کی روایات کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ حاکم کہتے ہیں کہ نسائی اپنی کتاب "الکنیٰ" میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میرے علم کی حد تک کسی نے بھی اس کو ضعیف راوی قرار نہیں دیا۔" (المنذری کا بیان ختم ہوا)

محدثین کے یہاں یہ بات عام طور سے معروف ہے کہ جب دو شخص کسی سے حدیث کی روایت کریں، یا ائمہ حدیث میں سے کوئی امام کسی کو ثقہ قرار دیں تو وہ راوی مجہول نہیں رہتا۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو بیہقی (۵ - ۲۹۴)، دارقطنی (۳ - ۴۹) اور حاکم (۲ - ۳۸) نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی "التلخیص الحبیر" (۳ - ۱۰) میں لکھتے ہیں :۔

"یہ حدیث ابن خزیمہ، ابن حبان اور البزار نے زید بن ابی عیاش سے روایت کی ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے، جن میں طحاوی، طبری، ابن حزم اور عبدالحق جیسے لوگ شامل ہیں، زید بن ابی عیاش کے مجہول ہونے کی بنا پر اس حدیث کو معلول ٹھہرایا ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ دارقطنی نے زید کو ثقہ قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں المنذری کا قول نقل کیا ہے حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام محدثین امام مالک کی عظمت و جلالت کے بارے میں متفق ہیں اور ان کی مرویات سب کے نزدیک قابلِ اعتماد اور صحیح ہیں۔ خصوصاً وہ احادیث جو اہلِ مدینہ سے وہ روایت کرتے ہیں۔ ائمہ حدیث عبداللہ بن یزید سے روایت کرنے کے بارے میں امام مالک کا اتباع کرتے ہیں۔ امام بخاری و مسلم نے زید بن ابی عیاش کی مرویات کو اس لیے نقل نہیں کیا کہ وہ

ابوعمر اشبیلیؒ[1] اور دوسرے اہل علم کہتے ہیں کہ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسئلہ مستنبط ہوتا ہے :۔
صنعت و حرفت کے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اہل صنعت کو اصحاب کہف کی جانب رجوع کرنا چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ گیلی کھجوروں کو خشک کیا جائے تو ان کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے اس معاملے میں ان لوگوں سے دریافت فرمایا جو اس سے اچھی طرح واقف تھے۔

ان کے نزدیک مجہول راوی ہے۔ (حافظ ابن حجرؒ کا بیان ختم ہوا)

ابن القدامہؒ نے المغنی (۴ - ۱۴) میں زید کی مرویات کی صحت کو ترجیح دی ہے سو وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ امام مالکؒ نے ان سے روایت بیان کی ہے۔

جمہور اہل علم کسی حال میں بھی تر کھجوروں کا خشک کھجوروں کے عوض سودا جائز قرار نہیں دیتے۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ اس کو جائز تصور کرتے ہیں۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں:

۱- ایک صورت تو یہ ہے کہ خشک و تر کھجوریں ایک ہی قسم کی ہوں تو اس صورت میں یہ سودا اس لیے جائز ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:
"ہم جنس کھجوروں کی خرید و فروخت ہم جنس کھجوروں کے عوض برابر برابر جائز ہے"

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ہم جنس نہ ہوں تو ان کی خرید و فروخت بھی جائز ہے کیونکہ حضورؐ کا ارشاد ہے "جب اقسام مختلف ہوں تو جیسے چاہو فروخت کرو" اصحاب شافعیؒ میں سے المزنیؒ بھی امام ابوحنیفہ کے ساتھ متفق ہیں۔ ایک قول امام احمدؒ سے بھی اسی قسم کا منقول ہے۔ امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے مگر امام ابوحنیفہؒ کے دونوں شاگرد (محمدؒ بن حسن اور قاضی ابو یوسفؒ) جمہور اہل علم کے ہم خیال ہیں۔

مگر مندرجہ بالا احادیث اس عموم کی تخصیص کرتی ہے۔ غالباً امام ابوحنیفہ کو امام مالکؒ کی روایت کردہ حدیث نہیں پہنچی، یا وہ ایسے طریقے سے پہنچی جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک قابل اعتماد نہ تھا اس لیے انہوں نے یہ موقف اختیار کیا۔ طحاویؒ نے اس حدیث میں بروایت یحییٰؒ بن ابی کثیرؒ "کچی کھجور" کے لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں حضورؐ کا منشا یہ تھا کہ کچی کھجوروں کو پکی کھجوروں کے عوض فروخت نہ کیا جائے۔ نہ یہ کہ تر کھجوروں کی خرید و فروخت خشک کھجوروں کے عوض ممنوع ہے۔

[1] ابوعمر اشبیلی کا نام و نسب احمد بن عبداللہ بن محمد بن علی ابوعمر اشبیلی ہے۔ یہ ابن الباجی کے نام سے معروف تھے۔
ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:۔
"اپنے عصر کے جید عالم اور فقیہ تھے۔ آپ اپنے وقت کے عظیم محدث اور فقہ و حدیث کے جامع عالم تھے۔ دین کے اصول و فروع کے علم میں پورے اندلس میں منفرد عالم تھے۔ آپ حدیث و فقہ اور اسماء الرجال میں یکساں مہارت و بصیرت کے حامل تھے۔ ابوعبید اور ابن قتیبہ کی غریب الحدیث آپ کو زبانی یاد تھیں"
حافظ ابن عبدالبر جیسے عظیم حافظ اور اپنے زمانے کے فقیہ کی طرف ابن الباجی کی توصیف میں یہ جملے بس کرتے ہیں۔ ابوعمر اشبیلی نے ۳۹۲ھ میں وفات پائی۔ الحمیدی نے "جذوۃ المقتبس" (ص ۱۲۸) اور ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (۳ - ۱۰۸۵) میں ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

بیع کی بعض ناجائز قسمیں[1]

موطا امام مالکؒ، صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ اور نسائیؒ میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگے بڑھ کر قافلہ والوں

---

[1] متن میں اس فصل کے عنوان میں بیع کی جن ناجائز صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں (تلقی الرکبان) اور (المصراۃ) کا ذکر بھی ہے۔ یہ دونوں خالص تجارتی اصطلاحات ہیں۔ اس لیے ان کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(ا) (تلقی الرکبان) : تلقی الرکبان کے مفہوم میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس ممانعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ بازار والوں کو نقصان نہ پہنچے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ایک قافلہ سامان فروخت کرنے کے لیے شہر کی جانب آ رہا ہو اور کچھ لوگ آگے بڑھ کر ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھائیں اور سستے داموں ان کا سامان خرید لیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بازار میں داخل ہونے سے قبل ان کے سامان کا سودا کرنا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرے تو سب بازار والے اس سامان میں مشتری کے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے کیونکہ اس سامان پر پورے بازار کا حق ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں اس بیع سے ممانعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ آگے بڑھ کر خریدنے والا بائع کو نقصان نہ پہنچائے۔ اس لیے کہ بائع بازار کے نرخ سے واقف نہیں اور اسے نرخ کا پتہ بازار میں پہنچ کر چلے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر عملاً ایسا ہو جائے تو بائع کو اختیار ہے کہ بازار میں پہنچ کر چاہے تو سودے کو بحال رکھے اور چاہے تو فسخ کر دے۔" (شرح الموطا للزرقانی ۳-۳۰۷)

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس بیع میں کچھ مضائقہ نہیں۔

ابن قدامہ المغنی (۴-۱۹۶) میں لکھتے ہیں :-

"روایت کی جاتی ہے کہ عرب تاجر آگے بڑھ کر بازار پہنچنے سے قبل ہی قافلہ والوں کا سامان خرید لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات قافلہ والوں کو اس سے نقصان پہنچ جاتا۔ اور بعض دفعہ اس سے شہر والوں کو نقصان پہنچتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قافلہ والے تو شہر پہنچ کر فوراً سامان فروخت کر دیا کرتے تھے، لیکن جو لوگ آگے بڑھ کر سودا خرید لیتے تھے وہ جلدی فروخت نہیں کرتے تھے بلکہ سامان کی گرانی کے منتظر رہا کرتے تھے۔"

حدیث میں جو اس کو منع فرمایا گیا ہے اس سے اس قسم کے سودے کے ناجائز ہونے کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے اور اگر ایسا سودا ہو جائے تو بائع کو بیع کے فسخ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔

(ب) "المُصَرَّاۃ" اس کا مصدر "تصریۃ" ہے۔ اس کے معنی تھنوں میں دودھ جمع کرنے کے ہیں۔ مشہور ماہر لغت ازہریؒ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "المصراۃ" اس جانور کو کہتے ہیں جس کا دودھ چند دنوں تک تھنوں میں روک لیا جائے اور اسے اس لیے دوہا نہ جائے کہ خریدنے والا یہ سمجھے کہ یہ زیادہ دودھ دینے والا جانور ہے۔ (النہایۃ ۳-۲۷)

ابن قدامہ "المغنی" (۴-۱۲۱) میں لکھتے ہیں عربی محاورہ ہے "صری الماء فی الحوض" "صری الطعام فی فیہ"

سے سودا نہ خریدو، تم میں سے کوئی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔ قیمت بڑھانے کے لیے بولی نہ دو۔ شہری آدمی دیہاتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۷)

"وصری المارق ظهوه" تمام محاورات میں یہ لفظ ردکرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ بیع میں ایک طرح کا دھوکا ہے۔ اسی لیے ایسے جانور کو فروخت کرنا منع ہے۔ اس کو "المُحَفَّلَة" (ردکی گئی) بھی کہتے ہیں۔ لوگوں کے مجمع کو اسی لیے محفل کہا جاتا ہے کہ لوگ اس میں جمع ہوتے ہیں۔ اگر بائع اس کا مرتکب ہو تو مشتری کو اختیار ہے کہ سودا فسخ کردے یا باقی رہنے دے۔ امام مالکؒ شافعیؒ، احمدؒ اور تابعین کی ایک جماعت کا موقف یہی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور محمدؒ بن حسن کہتے ہیں کہ مشتری کو اختیار حاصل نہیں اس لیے کہ یہ کوئی عیب نہیں، لیکن حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کا سودا جائز نہیں۔ اور جو شخص اس واقعہ سے دوچار ہو اس کو بیع قائم رکھنے یا فسخ کرنے کا اختیار رہے۔

ﮯ موطا امام مالک (۲ - ۸۶) کتاب "البیوع" باب ما ینھی عنہ من المساومة والمبایعة"۔

ﮯ صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب النھی عن تلقی الرکبان" بروایت ابوہریرہؓ۔ حدیث کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے:۔

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر قافلے والوں سے راستے میں سودا خریدنے سے منع کیا ہے۔ نیز اس بات سے بھی منع کیا ہے کہ شہری آدمی دیہاتی کی کسی چیز کو فروخت کرے۔"

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ جو شخص روکے ہوئے دودھ والا جانور خریدے تو اسے واپس کردے اور اس کے ساتھ ایک صاع غلہ بھی دے۔ یہ بھی کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر قافلہ والوں سے سودا خریدنے سے منع فرمایا ہے اور عبداللہ بن عمرؓ سے مروی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

"تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔ اور آگے بڑھ کر راستے میں سودا نہ خرید و جب تک اسے بازار میں نہ لایا جائے۔"

عبداللہؓ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

" ہم آگے بڑھ کر قافلہ والوں سے غلہ خرید لیا کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسا کرنے سے منع فرمایا جب تک کہ وہ غلہ منڈی میں پہنچ نہ جائے۔"

انہی سے مروی دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

" لوگ بازار کے بالائی حصے میں غلہ خریدتے اور اسی جگہ فروخت کردیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ جب تک غلے کو دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے اسے فروخت نہ کیا جائے۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

" آگے بڑھ کر سودا نہ خریدا کرو اور شہری آدمی دیہاتی کی چیز کو فروخت نہ کرے۔"

ﮯ صحیح مسلم (۳ - ۱۱۵۵) کتاب "البیوع" باب "تحریم بیع الرجل علی بیع اخیہ وتحریم التصریة"۔

یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔ اس کے الفاظ بھی تقریباً وہی ہیں جو متن میں مذکور ہیں۔ ان کا ترجمہ بھی متن میں دے دیا گیا ہے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "ایک عورت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے" علاوہ ازیں آپؐ نے قیمت بڑھانے کے لیے بولی دینے

کی چیز فروخت نہ کرے اونٹنی اور بکری کے دودھ کو قیمت بڑھانے کے لیے تھنوں میں روکا نہ کرو۔ جو شخص کسی ایسے جانور کو خرید ے جس کا دودھ تھنوں میں روکا گیا ہو تو اصلی حالت میں جانور کو دوہنے کے بعد دونوں باتوں کا اسے اختیار ہے۔ اگر جانور کو پسند کرے تو اپنے پاس رہنے دے اور اگر ناپسند کرے تو اسے واپس کردے اور اس کے ساتھ بیچنے والے کو ایک صاع کھجوریں بھی دے"۔

ابوداؤد میں ہے کہ اس جانور کو واپس کردے اور اس کے ساتھ جتنا دودھ اس نے پیا ہے اس کے برابر یا اس سے دگنی گندم بھی ادا کرے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸)

اور تھنوں میں دودھ روکنے سے بھی منع فرمایا نیز آپ نے سودے پر سودا کرنے سے بھی منع کیا۔ ایک دوسری روایت میں جو حضرت ابوہریرہؓ ہی سے منقول ہے کہ آگے بڑھ کر قافلہ والوں سے سودا نہ خریدو۔ یہ روایت باب "تحریم تلقی الجلب" میں درج ہے۔

یہ تھے وہ اختلافات جو اس حدیث کے الفاظ میں واقع ہوئے ہیں۔ مصنف نے چونکہ متن میں ان کا تذکرہ اجمالاً کیا تھا اس لیے میں نے مناسب خیال کیا کہ ان کی تفصیل لکھ دوں۔

۵ دیکھیے نسائی (۳-۵۳) کتاب "البیوع" باب "النھی عن المصراۃ"۔

۶ ابوداؤد (۳-۲۷۱) کتاب "البیوع" باب "من اشتری مصراۃ فکرھھا" میں یہ حدیث بروایت عبداللہ بن عمرؓ مثل سابق مذکور ہے نیز المنذریؒ "مختصر" میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے۔ الخطابی کہتے ہیں اس کی سند صحیح نہیں۔ المنذری کہتے ہیں کہ الخطابی کی رائے درست ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی جمیع بن عمیر ہے جس کے بارے میں ابن نمیر کہتے ہیں کہ وہ "اکذب الناس" ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں وہ رافضی تھا اور حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔

میں کہتا ہوں الکنانی نے "تنزیہ الشریعۃ" میں جمیع بن عمیر کو کذاب اور وضاع راویوں میں شمار کیا ہے۔

حافظ ابن حجر "التقریب" (۱-۱۳۳) میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جمیع بن عمیر ابوالاسود کوفی کے نام سے معروف تھا۔ وہ سچا تو تھا مگر اکثر غلطیاں کرنے والا اور شیعہ راوی ہے۔ طبقہ ثالثہ کے راویوں میں شمار ہوتا ہے۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ حدیث ثقہ راویوں سے مروی احادیث کے خلاف ہے۔ حدیث کے راویوں میں سے کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی کہ خریدے ہوئے جانور کو واپس کرتے وقت مشتری اس کے ساتھ دودھ کے برابر یا اس سے دگنی گندم بھی واپس کرے۔ اگرچہ یہ حدیث ان لوگوں کے خیال کی تائید کرتی ہے جو کہتے ہیں کہ دودھ کے برابر معاوضہ دینا چاہیے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جن احادیث میں ایک صاع کھجور بائع کو دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام اہل علم کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ صحیح ہیں۔ مزید براں اس حدیث میں ایک پوشیدہ علت پائی جاتی ہے جس کا تذکرہ حافظ ابن القیم نے کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ "مثل" ایک غیر معروف اور غیر محقق چیز ہے۔ اس لیے کہ عقد بیع کے بعد جو دودھ جانور میں پیدا ہوا وہ اس دودھ کے ساتھ مخلوط ہو گیا جو عقد بیع کے وقت اس میں موجود تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی مقدار معلوم نہیں تاکہ مشتری کو اس کی مثل ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔ اس کی مقدار کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔ بنا بریں لازماً اس کا نتیجہ ربا کی صورت میں برآمد ہوگا اس لیے کہ ربا کی سب سے ادنیٰ قسم یہ ہے کہ مساوات کا فقدان ہو۔

صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم[2] کی ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص ایسا جانور خریدے اسے تین روز تک اختیار ہے کہ اس جانور کو اپنے پاس رکھے اور چاہے تو واپس کر دے۔ اور واپس کرے تو اس کے ساتھ بیچنے والے کو ایک صاع کھجور بھی دے نہ کہ عمدہ قسم کی گندم"۔

مصنف ابن السکن[3] میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

غرض یہ کہ عقدِ بیع کے وقت موجود دودھ اور بعد از عقد پیدا شدہ دودھ کی مقدار کی تعیین نزاع کا موجب ہے۔ لہٰذا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور رفعِ نزاع کے لیے ایک مقدار متعین کر دی جس سے بائع و مشتری تجاوز نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں ایک صاع کھجور کی تعیین دیگر اشیاء کی نسبت دودھ سے قریب تر ہے (اعلام الموقعین ۲-۳۹-۴۰)

[1] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "المنھی للبائع ان یحفل الابل والبقر والغنم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۱۴۸) بروایت ابو ہریرہ عن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس حدیث کے الفاظ پہلی روایت سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ حدیث ابن بکیر سے بھی روایت کی گئی ہے۔ وہ لیث سے، وہ جعفر بن ربیعہ سے، وہ الاعرج سے، وہ اس حدیث کو ابو صالح، مجاہد، ولید بن رباح اور موسیٰ بن یسار سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ ان کی روایت کردہ حدیث میں "وصاع تمر" کے الفاظ ہیں۔ بعض محدثین نے ابن سیرین سے "صاعًا من طعام وھو بالخیار ثلاثًا" (مشتری بائع کو ایک صاع غلہ دے اور تین دن تک اسے خریدے ہوئے جانور کو واپس کرنے کا اختیار رہے) کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ بعض راویوں نے ابن سیرین سے "صاعًا من تمر" کے الفاظ تو نقل کیے ہیں مگر "ھو بالخیار ثلاثًا" کے الفاظ اس روایت میں نہیں ہیں۔ اکثر روایات میں "تمر" کا لفظ وارد ہوا ہے، مگر کسی راوی نے "سمراء" (گندم کی اعلیٰ قسم) کا لفظ روایت نہیں کیا۔

[2] صحیح مسلم (۳-۱۱۵۸) کتاب "البیوع" باب "حکم بیع المصراۃ" بروایت ابو ہریرہؓ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "صاعًا من طعام"، دوسری روایت میں "صاعًا من تمر" کے الفاظ ہیں۔ "سمراء" گندم کو، اس کے رنگ کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔

[3] مصنف ابن السکن کا تعارف اس سے پہلے کروایا جا چکا ہے۔ یہ حدیث ابن الجارود نے "المنتقی" (ص ۱۹۸) میں زید بن اسلم سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو سنا جسے شہر کہتے تھے۔ وہ تجارت پیشہ تھا۔ وہ عبد اللہ بن عمرؓ سے نیلامی کی بیع کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ شہر بن حوشب پر نقد و جرح کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

دارقطنی (۳-۱۱) نے یہ حدیث تین سندوں کے ساتھ روایت کی ہے۔ ایک سند میں شہر بن حوشب ہے۔ دوسری میں ابن لہیعہ اور تیسری میں واقدی۔ واقدی متروک راوی ہے۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ نیلامی صرف مالِ غنیمت اور میراث کے سلسلے میں جائز ہے۔ باقی کسی سودے میں نہیں۔ امام اوزاعی اور اسحٰق کا موقف یہی ہے۔ جمہور اہلِ علم کے نزدیک نیلامی عام طور پر جائز ہے اور اس میں مالِ غنیمت یا وراثت کی کوئی تخصیص نہیں۔ ان کی دلیل حضرت انسؓ سے مروی وہ حدیث ہے جو امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے روایت کی اور ترمذی نے

لَا یَبِیْعُ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ اِلَّا الْغَنَائِمَ وَالْمَوَارِیْثَ	تم میں سے کوئی شخص کسی کے سودے پر سودا نہ کرے، البتہ مالِ غنیمت اور وراثت میں سودے پر سودا کرنا جائز ہے۔

امام بخاریؒ نے باب کا عنوان یوں باندھا ہے "النہی عن تلقی الرکبان" اس قسم کی خرید و فروخت جائز نہیں۔ اور جو شخص شعوری طور پر اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ گنہگار اور نافرمان ہے۔ یہ خرید و فروخت میں ایک قسم کا فریب ہے اور فریب جائز نہیں۔ نسائی میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَلَقَّوُا الْجَلَبَ فَمَنْ تَلَقَّاهُ فَاشْتَرٰی مِنْهُ فَاِذَا اَتٰی سَیِّدُهُ السُّوْقَ فَهُوَ بِالْخِیَارِ۔	آگے بڑھ کر قافلہ والوں سے سودا مت خریدو۔ جس نے آگے بڑھ کر قافلہ والوں سے مل کر سودا خریدا تو بازار میں آنے کے بعد بائع کو اختیار ہے کہ اس سودے کو باقی رکھے یا اسے فسخ کر دے۔

اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا ہے کہ نفع اسی کو ملے گا جو نقصان کا ذمے دار ہو۔[1]

لے حسن کہا ہے۔

اس حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ایک صحابی کے ایک پیالے اور ایک کمبل کی بولی دی۔ ایک آدمی نے کہا "میں ان دونوں کو ایک درہم کے عوض خریدتا ہوں" جبکہ ایک دوسرے شخص نے کہا کہ "میں دو درہم کے عوض خریدتا ہوں" حضورؐ نے یہ دونوں چیزیں اس کو دے دیں لیکن اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبداللہ ابوبکر الحنفی نامی ہے جس کو ابن القطان نے مجہول الحال قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ نے ابن القطان سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ ابوبکر الحنفی کی روایت کردہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

[1] یہ حدیث ایک واقعہ سے متعلق ہے جس کا تذکرہ امام شافعیؒ نے "الرسالۃ" (ص ۴۴۸) میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ایک ثقہ آدمی نے مجھے ابن ابی ذئب سے سن کر بتایا۔ اس نے مخلد بن خفاف سے سنا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریدا اور اس کی کمائی سے فائدہ اٹھایا۔ پھر مجھے اس میں ایک عیب کا پتہ چلا۔ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ انھوں نے فیصلہ دیا کہ میں غلام واپس کردوں اور جو فائدہ میں نے اٹھایا ہے وہ بھی غلام کے مالک کو دے دوں۔ میں حضرت عروہؒ کے یہاں حاضر ہوا اور سارا قصہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں پچھلے پہر عمر بن عبدالعزیزؒ کے یہاں جاکر انھیں بتاؤں گا کہ حضرت عائشہؓ نے مجھے بتایا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے معاملے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ نفع کا مالک وہی شخص ہوگا جو نقصان کا ذمہ دار ہے۔ میں جلدی سے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے یہاں حاضر ہوا اور انھیں بتایا کہ عروہ نے حضرت عائشہؓ کے حوالے سے یہ بات بتائی ہے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا "یہ فیصلہ میرے لیے کس قدر آسان ہوگیا۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے یہ فیصلہ صادر کرنے میں حق کو ملحوظ رکھا تھا۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے سنتِ رسولؐ سے آگاہ کر دیا۔ اب میں اپنا فیصلہ رد کرتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نافذ کرتا ہوں"۔

جب شام کے وقت عروہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ غلام کی کمائی ہوئی جو

اس مسئلہ پر تمام اہلِ اسلام کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ نفع کا مالک وہی ہوگا جو خسارے کا ذمہ دار ہے ۔

رقم غلام کے مالک کو میں نے دی تھی وہ اس سے واپس لے لوں ۔

بیہقی نے یہ حدیث "السنن الکبریٰ" (۵-۳۲۱) میں انہی الفاظ کے ساتھ امام شافعیؒ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے ۔ اکثر علماء نے یہ حدیث ابن ابی ذئب سے مختصراً "الخراج بالضمان" کے الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے ۔

مسلم بن خالد الزنجی نے بھی یہ حدیث ہشام بن عروہ سے بالمعنی روایت کی ہے ۔ وہ اپنے والد سے ، اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں ۔ اس روایت میں ایک اور واقعہ بیان کیا گیا ہے ۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند پہلی روایت کی طرح کی نہیں ہے ۔

ترمذی نے یہ حدیث بروایت ابن ابی ذئب عن مخلد نقل کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں :-

"یہ حدیث حسن صحیح کے درجے کی ہے ۔ اور یہ دوسری سند کے ساتھ بھی روایت کی گئی ہے ۔ پھر ترمذی اس کو مختصراً عمر بن علی المقدمی عن ہشام بن عروہ کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں ۔ وہ اپنے والد سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے ۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ہشام بن عروہ والی سند کے ساتھ صحیح غریب ہے ۔ امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث عمر بن علی والی سند کے ساتھ غریب ہے ۔"

المنذری مختصر ابی داؤد میں لکھتے ہیں :-

"امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے ۔ مخلد بن حفاف سے اور کوئی حدیث مروی نہیں ۔ ترمذیؒ کہتے ہیں کہ "میں نے امام بخاریؒ سے کہا کہ یہ حدیث ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے اور انھوں نے حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کی ہے ۔ اس کے جواب میں امام بخاریؒ نے کہا "یہ حدیث صرف مسلم بن خالد الزنجی نے روایت کی ہے ۔ اور وہ ضعیف راوی ہے ۔"

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میرے والد سے مخلد بن حفاف کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا ابن ابی ذئب کے سوا کسی نے اس سے روایت نہیں کی اور اس قسم کی سند حجت نہیں ہو سکتی ۔ مسلم بن خالد الزنجی سچا لیکن نہایت وہمی تھا ۔ اس کا تعارف آگے آرہا ہے ۔

عمر بن علی ابو حفص عمر بن علی المقدمی البصری ہے ۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ اس کی روایت کو حجت ماننے پر متفق ہیں ۔ یہ حدیث عمر بن علی سے ابو سلمہ یحییٰ بن خلف الجوباری نے روایت کی ہے ۔ ابو سلمہ ان راویوں میں شامل ہے جن سے مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے ۔ حاکم نے یہ حدیث "المستدرک" (۲-۱۵) میں روایت کی اور اسے صحیح قرار دیا ہے ۔ ذہبی بھی حاکم سے متفق ہیں ۔ مخلد سے ابن ابی ذئب کے علاوہ دوسرے راویوں نے بھی حدیثیں روایت کی ہیں ، چنانچہ الذہبیؒ "المیزان" میں اور حافظ ابن حجر التہذیب میں ذکر کرتے ہیں کہ یہ حدیث الہیثم بن جمیل نے یزید بن عیاض سے اور انھوں نے مخلد سے روایت کی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس حدیث کی صحت کا انحصار مخلد بن حفاف الغفاری پر ہے ۔ اس کا باپ اور دادا دونوں صحابی تھے ۔

امام بخاریؒ اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ "فیہ نظر" اور یہ بات معروف ہے کہ یہ جملہ امام بخاریؒ جس حدیث

حدیث نبوی "الخراج بالضمان" سے استدلال کرتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ نے "روکے ہوئے دودھ والی بکری کی واپسی پر مشتمل" حدیث کو رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خریدنے والا اس بکری کو دودھ سمیت یا بلا دودھ کسی طرح بھی واپس کرنے کا مجاز نہیں، البتہ بکری کی قیمت میں اس طلبیب کی وجہ سے جو کمی واقع ہوئی ہے اس پر مشتری کا حق ہے۔

ابوداؤد[۱] میں ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا۔ وہ کچھ عرصہ اس کے یہاں ٹھہرا۔ پھر اس نے اس میں ایک عیب

کے بارے میں کہتے ہیں وہ بہت ہی کم درجہ کی ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کو مقبول کہا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ یہ فیصلہ ابو داؤدؒ کے اس قول کے ساتھ ملتا ہے جو انھوں نے محمد بن خالد الزنجی کی حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ "اسنادہ لیس بذالک" (اس کی سند اتنی اچھی نہیں) اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

[۱] جن شبہات کی اساس پر امام ابو حنیفہؒ نے "حدیث المصراۃ" کو رد کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ یہ خبر واحد ہے اور قیاس کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں دودھ کے تاوان کو واجب قرار دیا گیا ہے جبکہ دودھ کی واپسی ممکن ہے۔

۲۔ حدیث میں دودھ کی قیمت ادا کرنے کو ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ حالانکہ دودھ کے عوض دودھ بھی دیا جا سکتا ہے۔ دودھ نایپد تو نہیں ہو گیا۔

۳۔ اس حدیث میں دودھ کی قیمت کھجور کی شکل میں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ قیمت سونے یا چاندی کی صورت میں ادا کرنی چاہیے۔

۴۔ اس حدیث میں دودھ کی قیمت (ایک صاع کھجور) مقرر کر دی گئی ہے جس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔ حالانکہ قیمت دودھ کی مقدار کے مطابق ہونی چاہیے تھی۔

احناف کی کتابوں میں کچھ مزید شبہات بھی ملتے ہیں جن کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

امام ابو حنیفہ کے اعتراضات کا جواب امام ابو حنیفہؒ کے استدلال کا صحیح جواب یہ ہے کہ اصول دین چار ہیں:

(۱) کتاب اللہ (۲) حدیث نبوی (۳) اجماع امت (۴) قیاس صحیح جو کتاب و سنت سے مطابقت رکھتا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث صحیح بذات خود اصول دین میں سے ایک اصل کی حیثیت رکھتی ہے پھر یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ اصل اپنے آپ کے خلاف ہو۔ علاوہ ازیں قیاس فرع ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اصل کو رد کر کے فرع پر عمل کیا جائے؟ (اعلام الموقعین ۲-۳۸)

جو شخص یہ کہتا ہے کہ "حدیث المصراۃ" ایک دوسری حدیث "الخراج بالضمان" کے خلاف ہے تو اس کے جواب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حدیث "الخراج بالضمان" اگرچہ متعدد سندوں کے ساتھ روایت کی گئی ہے، تاہم ائمہ حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ "مصراۃ" والی حدیث اس کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو حدیث صحت کے اعتبار سے کم تر درجہ کی ہے وہ زیادہ صحیح اور قوی حدیث کی معارض ہو۔

[۱] ابوداؤد کتاب "البیوع" فی الباب السابق"۔ ابو داؤدؒ کہتے ہیں کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔ المنذریؒ "المختصر"

پایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر معاملہ پیش کیا۔ حضورؐ نے وہ غلام بیچنے والے کو واپس کر دیا۔ بائع نے کہا یا رسول اللہ! اس نے میرے غلام سے کام لیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "نفع وہی شخص حاصل کرتا ہے جو نقصان کا ذمہ دار بھی ہو۔"

صحیح بات وہی ہے جس پر امام مالکؒ، شافعیؒ اور دیگر ائمہ متفق ہیں کہ تھنوں میں روکے ہوئے دودھ والے جانور کے بارے میں حضورؐ کا فیصلہ ایک جداگانہ اور مستقل حیثیت کا حامل ہے جس پر دیگر مسائل کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی دلیل اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ بیچی ہوئی چیز میں اگر کوئی عیب نکل آئے تو وہ بائع کو واپس کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ چیز اور عیب موجود ہوں۔ ختم نہ ہو گئے ہوں اور ظاہر ہے کہ تھنوں میں روکے ہوئے دودھ والی بکری کو دوہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوہنے سے ہلاک ہو گئی۔ تاکہ یہ کہا جا سکے کہ اب مشتری کے لیے اس کو اپنے پاس رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ اور مشتری بائع سے صرف عیب کی قیمت وصول کرنے کا حقدار ہے۔ یہ بات درست نہیں[۱]۔

میں کہتے ہیں کہ ابوداؤدؒ کا اشارہ اس جانب ہے کہ امام بخاریؒ نے مسلم بن خالد الزنجی کو ضعیف قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مسلم بن خالد بن فروہ مخزومی ابو خالد الزنجی کو امام بخاری نے منکر الحدیث کہا ہے، تاہم وہ کہتے ہیں کہ اس کی روایات کو لکھا تو جا سکتا ہے مگر ان کو حجت نہیں مانا جا سکتا۔ ابن المدینی کہتے ہیں "وہ کچھ بھی نہیں ہے۔" ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے مسلم بن خالد کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا "وہ ثقہ راوی نہیں، بلکہ منکر الحدیث ہے۔ اس کی روایت کردہ احادیث لکھی جاتی ہیں مگر ان سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ وہ معروف و منکر ہر قسم کی احادیث روایت کرتا ہے۔"

دیکھیے "الجرح والتعدیل" (۸-۱۸۳) حافظ ابن حجرؒ نے "التقریب" میں لکھا ہے کہ "وہ فقیہ اور سچا لیکن نہایت وہمی تھا۔

[۱] اس ضمن میں امام مالکؒ اور شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ خریدی ہوئی چیز کو واپس کرنا بھی درست ہے اور اپنے پاس رکھنا بھی۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ خریدی ہوئی چیز کسی عیب کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر واپس کی جاتی ہے کہ بیچنے والے نے فریب سے کام لیا ہے۔ اصل صورت یہ ہے کہ بائع نے اس چیز میں جو وصف بتایا وہ دراصل اس میں موجود نہیں۔ اس لیے اس نے خریدار کو اپنے قول و فعل کے ذریعے فریب دینے کی کوشش کی۔ لہٰذا بائع کو یہ سزا دی گئی کہ خریدار چاہے تو خریدی ہوئی چیز اپنے پاس رکھے اور چاہے تو بائع کو واپس کر دے۔

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:۔

"اگر شریعت میں اس مسئلے کا ذکر نہ ہوتا تو بھی عقل اور عدل کا تقاضا یہی ہوتا۔ اس لیے کہ خریدار نے اس چیز پر جو رقم خرچ کی وہ اس وصف کی بنا پر کی جو بائع نے اس میں بتلایا تھا۔ اگر مشتری کو پتہ ہوتا کہ وہ چیز ان صفات کی حامل نہیں تو وہ ہرگز اس پر یہ رقم صرف نہ کرتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ چیز کو اس طرح کی فریب دہی کے ساتھ فروخت کرنا حد درجے کا ظلم ہے جس سے شریعت کا دامن پاک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان قافلہ والوں کو بھی بیع فسخ کرنے کا اختیار دیا ہے جو ابھی شہر سے باہر ہوں اور کوئی شخص آگے بڑھ کر ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھائے اور سستے داموں ان کا مال خرید لے۔ شہر میں پہنچ کر اگر انھیں اپنے نقصان کا احساس ہو تو خریدار سے اپنا مال واپس لے سکتے ہیں۔ حالانکہ اس صورت میں نہ تو اس چیز میں کسی عیب کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی بیان کردہ صفت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ جب کہ زیر بحث معاملہ میں بیچنے والے نے عیب بھی چھپایا اور فریب بھی دیا۔" دیکھیے "اعلام الموقعین" (۲-۳۸، ۳۹)

دیوالیہ[1] پن قیمت کی ادائیگی سے پہلے خریدار کی موت اور لاعلمی میں چوری کا مال خریدنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے

صحیح بخاری[2]، مؤطا امام مالک[3]، صحیح مسلم[4] اور نسائی[5] میں روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

---

[1] عربی متن میں (التفلیس) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ التفلیس : فِلس سے باب تفعیل ہے جو سب سے ادنیٰ درجے کے سکہ کا نام ہے۔ یہ درہم دینار سے بہت چھوٹا سکہ ہے۔ اس کی قوتِ خرید بہت کم ہوتی ہے۔ اور اس کے عوض معمولی اشیاء ہی خریدی جا سکتی ہیں۔

شرعاً مفلس (دیوالیہ) اس شخص کو کہتے ہیں جس کا قرضہ اس کے اثاثوں سے زیادہ ہو۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا کہ مفلس کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ "جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو ہم اس کو مُفلس کہتے ہیں"۔ آپ نے فرمایا "مفلس وہ نہیں بلکہ (حقیقی) مُفلس وہ ہے جو قیامت کے روز پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئے گا، مگر اس کے ساتھ ساتھ اُس نے کسی پر ظلم کیا، کسی کو تھپڑ مارا اور کسی کی بے آبروئی کی ہوگی۔ چنانچہ یہ شخص بھی اس کی نیکیوں میں سے لے رہا ہوگا اور وہ بھی۔ اس طرح اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی۔ اگر اس کے بعد بھی اس کے مظالم بچ رہے تو وہ (مظلوم) کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا۔ حتیٰ کہ اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ یہ حدیث مسلم (۴-۱۹۹۷) کتاب البر والصلۃ "باب تحریم الظلم" میں روایت کی گئی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اگرچہ اس کی نیکیاں پہاڑوں کے برابر ہوں گی، مگر اس کے گناہوں سے کم ہوں گی۔ اس لیے قرض خواہوں میں تقسیم کرنے کے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہ رہے گا، بلکہ لوگوں کے قرضے زیادہ نکلیں گے! اس لیے یہ شخص مفلس کہلائے گا۔

[2] صحیح بخاری کتاب "الاستقراض" باب "اذا وجد ماله عند مفلس في البيع والقرض والوديعة فهو احق به" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲-۲۴)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ "جو شخص اپنا مال کسی ایسے شخص کے پاس پائے جو دیوالیہ ہو چکا ہو تو وہ دوسروں کی نسبت اس مال کا زیادہ حق دار ہے۔"

[3] مؤطا امام مالک (۲-۶۷۳) کتاب "البیوع" باب ماجاء في افلاس الغريم"

[4] صحیح مسلم (۳-۱۱۹۳) کتاب "المساقاۃ" باب من ادرك ما باعه عند المشتري وقد افلس فله الرجوع فيه۔

[5] ملاحظہ ہو النسائی (۷-۳۱۱) کتاب "البیوع" باب "الرجل يبتاع البيع فيفلس فوجد المتاع بعينه"۔ اور ابوداؤد (کتاب البیوع) باب "في الرجل يفلس فيجد الرجل متاعه بعينه"۔ اور ترمذی (۳-۵۶۲) کتاب البیوع" باب "ما جاء اذا افلس للرجل غريم فيجد عنده متاعه"۔ ترمذی کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ سے مروی یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

أَيُّمَا رَجُلٍ أَفْلَسَ فَأَدْرَكَ الرَّجُلُ مَالَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ۔

ایک آدمی دیوالیہ ہوجائے اور کوئی قرض خواہ اس کے پاس بعینہٖ اپنا مال پائے تو دوسروں کی نسبت وہ اس مال کا زیادہ حق دار ہے۔

موطا میں[1] امام مالکؒ ابن شہابؒ زہری سے اور وہ ابوبکرؒ بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اپنا کوئی سامان فروخت کرے اور قیمت میں سے ابھی اس نے کچھ بھی وصول نہ کیا ہو اور خریدار دیوالیہ ہوجائے اور اس کا فروخت کردہ سامان اسی طرح مشتری کے پاس موجود ہو تو وہ اس سامان کا زیادہ حق دار ہے۔ اور اگر مشتری فوت ہوچکا ہو تو بائع باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر کا حصہ دار ہوگا۔"

امام مالکؒ نے اسی حدیث پر عمل کیا ہے۔

بعض اہل علم کا عمل اسی پر ہے۔ امام شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ وہ شخص جس کی کوئی چیز بعینہٖ مقروض کے پاس موجود ہو وہ باقی قرض خواہوں کے ساتھ اس میں برابر کا شریک ہے۔ اہل کوفہ کا قول بھی یہی ہے۔ ابن ماجہ اس حدیث کو (۲-۷۹۰) کتاب "الاحکام" باب "من وجد متاعہ بعینہ عند رجل قد افلس" میں بیان کرتے ہیں۔

اس حدیث کی تائید دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے جو عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہیں۔ ابن حبان نے یہ حدیث اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ دیکھیے "موارد الظمآن" (ص ۲۸۳) نسائی اور ابوداؤد نے اس کو سمرہ سے روایت کیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ التلخیص الحبیر (۳-۳۸) میں لکھتے ہیں کہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے:۔

"کہ یہ حدیث ابوہریرہؓ کے علاوہ کسی دوسرے راوی نے روایت نہیں کی" بیہقی نے امام شافعیؒ اور محمدؒ بن حسن سے بھی اسی طرح کی بات نقل کی ہے، مگر یہ بات درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ حدیث عبداللہ بن عمرؓ اور سمرہؓ سے بھی مروی ہے۔"

[1] ملاحظہ ہو موطا امام مالکؒ "گذشتہ باب" یہ حدیث مرسل ہے۔ ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام القرشی المخزومی تابعی فقیہ ہیں۔ ان کے والد نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ وہ رویت (زیارت) کے اعتبار سے تو صحابی ہیں مگر روایت کے لحاظ سے کبار تابعین میں شامل ہیں۔ ان کے دادا افاضل صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ عبدالرزاق نے المصنف (۸-۲۶۴) میں اس کی سند میں حضرت ابوہریرہؓ کا اضافہ کر کے اس کو متصل روایت قرار دیا ہے۔ اسی طرح بیہقیؒ (۶-۴۴) اور امام شافعی نے کتاب الامؒ (۳-۱۹۹) میں بھی اسے نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں ابوداؤد (بحوالہ سابق) اور ابن ماجہ نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں:

"جن محدثین نے یہ حدیث متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے وہ صحیح ہے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیزؒ اس حدیث کو ابوبکرؒ سے وہ ابوہریرہؓ سے اور وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح بشیر ابن نہیک اور ہشام بن یحییٰ دونوں اس حدیث کو حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ تینوں راویوں (ابوبکر، بشیر اور ہشام) نے ابوہریرہؓ سے روایت افلاس کا ذکر کیا ہے۔ مگر موت کا لفظ ان کی روایت میں موجود نہیں۔ میرے علم کی حد تک یہ حدیث ابوہریرہؓ کے سوا دوسرے کسی راوی نے محفوظ سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

امام شافعیؒ ابن ابی ذئبؒ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ ابن ابی ذئب المعتمرؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ عمرؒ بن خلدہ سے اور وہ حضرت ابوہریرہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَیُّمَا رَجُلٍ مَاتَ اَوْ اَفْلَسَ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ اَحَقُّ بِمَتَاعِهِ اِذَا وَجَدَهُ بِعَیْنِهِ۔	کوئی شخص مر جائے یا دیوالیہ ہو جائے اور بیچنے والا شخص اپنا سامان بعینہ خریدار کے پاس پائے تو وہ اپنے سامان کا زیادہ حقدار ہے۔[2]

احمدؒ بن خالد مسند میں لکھتے ہیں[3] کہ زھری کی روایت کردہ حدیث ابن ابی ذئب کی روایت سے متعارض نہیں ہے۔

---

[1] امام شافعیؒ کتاب الام (۳ - ۱۹۹) میں لکھتے ہیں:۔

"ہم دیوالیہ پن کے مسئلہ میں امام مالکؒ بن انس اور عبدالوہاب ثقفی از یحییٰ بن سعید، اور ابنؒ ابی ذئب عن ابوالمعتمر کی روایات سے استدلال کرتے ہیں۔ تفلیس (دیوالیہ پن) سے متعلق ابن ابی ذئب کی روایت کا وہی مفہوم ہے جو امام مالکؒ اور ثقفی کی روایات کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں موت وحیات سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ دونوں روایات صحیح اور متصل ہیں۔ باقی جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد "من ادرك ماله بعينه فهو احق به" کا تعلق ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فروخت کنندہ کو اس بات کا حق دیا ہے کہ اپنی فروخت کردہ چیز کے بعینہ موجود ہونے کی صورت میں اپنا پہلا سودا کالعدم قرار دے سکتا ہے۔

[2] اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث ابن ماجہ، بیہقی (۶ - ۴۶) اور دارقطنی (۳ - ۲۹) نے بھی روایت کی ہے۔ المنذری "المختصر" میں لکھتے ہیں:۔

کہ ابوداؤد سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

"کہ کون ہے جو اس حدیث پر عمل کرے گا جبکہ ابوالمعتمر کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کون ہے؟" ذہبی نے "المیزان" (۴ - ۵۷۵) میں بھی اس کے بارے میں یہی بات لکھی ہے۔ مگر حاکم نے "المستدرك" (۲ - ۵۱) میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

احناف اس حدیث کو اس لیے قبول نہیں کرتے ہیں کہ ان کی رائے یہ ہے کہ "سامان کا بیچنے والا خریدار کی زندگی یا موت کسی صورت میں بھی اس کا زیادہ حق دار نہیں۔ اس لیے کہ جب خریدار نے بائع سے وہ چیز خریدلی تو وہ اس کی ملکیت ہوگئی۔ اب بائع اس کی اس ملکیت سے اسی طرح بے تعلق ہے جس طرح خریدار کی باقی ملکیت کے ساتھ بائع کا کچھ تعلق نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے ("التعلیق الممجد" از مولانا عبدالحی لکھنوی)

[3] احمدؒ بن خالد بن یزید المعروف با بن الحباب کی کنیت ابوعمر ہے۔ عظیم حافظ حدیث اور کثیر الروایۃ تھے۔ امام مالکؒ کی مرویات کو انھوں نے مسند میں جمع کیا تھا۔ ۳۲۲ھ میں وفات پائی۔ قرطبہ میں رہائش رکھتے تھے۔ الحمیدی نے "جذوۃ المقتبس" (تعارف نمبر ۲۰۵) میں ان کا تعارف کروایا ہے۔ البتہ علم حدیث میں انھوں نے جو مسند تصنیف کیا تھا معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا کیا انجام ہوا؟

نسائی کہتے ہیں کہ ابن ابی ذئب ضعیف راوی ہے۔

علامہ الاسمیلی کی "الدلائل" میں اور سنن نسائی میں عکرمہ بن خالد سے مروی ہے کہ اُسید بن حُضیر نے ان کو بتایا کہ

ل نسائی نے کتاب "الضعفاء والمتروکین" میں ابن ابی ذئب کا ذکر نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ نسائی نے ان کے بارے میں جو بات اپنی کتاب "الکنٰی" میں کہی ہے وہ یہ ہے کہ "ہمیں معاویہ نے بتایا کہ میں نے یحیٰی بن معین کو یحیٰی بن سعید کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سُنا کہ وہ ابن ابی ذئب اور ابن جریج کی زہری سے روایت کردہ احادیث کو نہ تو بنظر استحسان دیکھتے اور نہ قبول ہی کیا کرتے تھے"۔

بہرحال اس کا یہ مطلب نہیں کہ نسائی نے ابن ابی ذئب کو ضعیف کہا ہے۔ پھر اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ محدثین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جنھوں نے ان کو ثقہ راوی قرار دیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

۱۔ **احمدؒ بن حنبل**:۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد کو یہ فرماتے سنا کہ ابن ابی ذئب سعید بن المسیب جیسے تھے جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا ان کے وطن میں ان کا کوئی جانشین موجود ہے؟ تو انھوں نے کہا ان کا وطن تو کیا دوسرے علاقوں میں بھی ان کی نظیر نہیں ملتی۔ امام احمدؒ نے مزید فرمایا کہ ابن ابی ذئب کو سچا اور امام مالکؒ سے بھی بہتر راوی تصور کیا جاتا تھا۔ البتہ امام مالکؒ نقد رجال میں ان کی نسبت سختی سے کام لیتے تھے جب کہ ابن ابی ذئب اس بات کا خیال نہیں رکھتے تھے کہ وہ حدیث کس سے اخذ کر رہے ہیں۔

۲۔ **ابن معین**: احمد بن سعید بن ابی مریم یحیٰی بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ ابن ابی ذئب ثقہ راوی ہیں اور ثقہ راویوں سے حدیثیں روایت کرتے ہیں البتہ وہ ابوجابر البیاضی سے بھی وہ روایت کرتے ہیں جو ثقہ نہیں ہے۔

۳۔ **یعقوبؒ بن شیبہ**:۔ ابن ابی ذئب یوں تو سچا راوی ہے مگر بعض محدثین کہتے ہیں کہ اس نے زہری سے جو احادیث روایت کی ہیں ان میں اضطراب پایا جاتا ہے۔

۴۔ امام شافعی فرماتے ہیں:۔ "مجھے کسی سے استفادہ نہ کرنے پر اتنا افسوس نہیں جتنا لیث اور ابن ابی ذئب سے استفادہ نہ کرنے پر ہے"

۵۔ نسائی کہتے ہیں کہ ابن ابی ذئب ثقہ راوی ہے۔

یہ ہیں محدثین کے قول اور ان کی گواہیاں ابن ابی ذئب کے بارے میں جن میں امام نسائی بھی شامل ہیں لہٰذا مجھے نہیں معلوم کہ مصنف نے یہ بات کہاں سے نقل کی کہ نسائی نے ابن ابی ذئب کو ضعیف قرار دیا ہے؟

امام بخاریؒ نے "التاریخ الصغیر" (ص ۱۷۸) میں ابن ابی ذئب کا تذکرہ کیا ہے مگر ان کی ثقاہت یا ضعف کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کو ثقہ، فقیہ اور فاضل قرار دیا ہے۔

جہاں تک ابن ابی ذئب کے امام زہری سے سماع کا تعلق ہے تو وہ علی بن المدینی کے کہنے کے مطابق "عرض" کی صورت میں تھا۔ اس کے باوجود وہ "مقارب الحدیث" راوی ہے۔

ئہ صرف ایک نسخہ میں "سنن نسائی" کا ذکر ہے۔ یہ حدیث نسائی (۷۔ ۳۱۲) کتاب "البیوع" باب "الرجل یبیع السلعة" میں امام نسائی عن عبد الرزاق عن ابن جُریج کی سند کے ساتھ منقول ہے۔ ابن جُریج کہتے ہیں کہ مجھے عکرمہ بن خالد نے بتایا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو لکھا :

" جب کسی شخص کا مال چوری ہو جائے اور وہ شخص بعینہٖ اپنا مال کسی کے پاس دیکھے تو وہ شخص اس مال کا زیادہ حقدار ہے "۔
مروان نے یہ مضمون مجھے (اُسید بن حُضیرؓ کو) لکھ بھیجا۔ میں ان دنوں یمامہ کا حاکم تھا۔ میں نے مروان کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :

اِذَا وُجِدَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ غَيْرِ الْمُتَّهَمِ فَإِنْ شَاءَ سَيِّدُهَا أَخَذَهَا بِالثَّمَنِ وَإِنْ شَاءَ اتَّبَعَ سَارِقَهَا۔	جب چوری شدہ مال کسی دیانت دار شخص کے یہاں پایا ملے تو مالک چاہے تو اس کی قیمت ادا کر کے لے لے اور چور کا تعاقب کرے۔

اس کے بعد حضرات ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم بھی اپنے اپنے عہدِ خلافت میں اس کے مطابق فیصلے صادر کرتے رہے۔
مروان نے میرا یہ خط امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ امیر معاویہؓ نے مروان کو لکھا "تم اور اُسید امورِ مملکت کے بارے مجھے حکم نہیں دے سکتے، البتہ میں تمھیں حکم دے سکتا ہوں لہٰذا میں نے تمھیں جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو "

عکرمہ بن خالد بن العاص ہشام بن مغیرہ القرشی ہے۔ ابن معین، ابوزرعہ اور نسائی نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ انھوں نے صحابہ کی ایک جماعت سے حدیثیں روایت کیں، جن میں ابوہریرہ، ابن عباس، ابن عمر وغیرہم رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی شامل ہیں لیکن کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی کہ عکرمہ نے اُسید بن حُضیر سے روایت یا ملاقات کی ہے۔
یہ حدیث حاکم نے "المستدرک" (۲ - ۳۶) میں امام نسائی والی سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔
ذہبیؒ "التلخیص" میں لکھتے ہیں کہ اُسید نے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔ عکرمہ کی ملاقات اُسید سے ثابت نہیں۔ علاوہ ازیں اُسید نے امیر معاویہؓ کی خلافت کا زمانہ نہیں پایا۔ ابوداؤد (ص ۲۲) نے اس حدیث کو "المراسیل" میں شامل کیا ہے۔ اس حدیث میں یہ صراحت موجود نہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس کے مطابق خود فیصلہ کیا یا کسی اور کو اس کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا، لہٰذا اس حدیث کو "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں" میں شامل کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔
اس حدیث سے متعلق واقعہ وہ ہے جو ابولُبابہ اسلمی نے روایت کیا ہے کہ مجھے ایک اونٹنی ورثہ میں ملی تھی وہ چوری ہو گئی۔ مجھے وہ اونٹنی ایک انصاری کے یہاں مل گئی۔ میں نے کہا یہ میری اونٹنی ہے اور میں نے آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک گواہ بھی پیش کر دیا۔ انصاری نے کہا "میں نے یہ اونٹنی اٹھارہ (دینار) کے عوض طائف کے ایک مشرک سے خریدی ہے"۔ رسول اکرمؐ نے مسکرا کر فرمایا:
" ابولبابہ! جیسے تم چاہو۔ چاہو تو انصاری کو اٹھارہ (دینار) دے کر اونٹنی اس سے لے لو۔ اور چاہو تو اس کے پاس رہنے دو"۔ ابولبابہ کہتے ہیں "یا رسول اللہ! سردست میرے پاس اتنی رقم موجود نہیں۔ کھجور کی فصل پکنے پر میرے پاس اتنی رقم آئے گی"۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے "۔
حافظ الہیثمی کہتے ہیں کہ یہ حدیث البزار نے روایت کی ہے اور اس کی سند میں عبدالغفار بن القاسم متروک راوی ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۴ - ۱۶۴)

اُسَید بن حُضَیر کہتے ہیں کہ مروان نے امیر معاویہؓ کا یہ خط مجھے بھیج دیا۔ میں نے کہا کہ جب تک میں حاکم ہوں میں اس کے مطابق فیصلہ نہیں کروں گا۔

نیشاپوری کہتے ہیں :-

"مجھے نہیں معلوم کہ فقہاء میں سے کسی نے بھی اسحاق بن راہویہ کے علاوہ اُسَید سے مروی حدیث پر عمل کیا ہو"۔

امام احمدؒ بن حنبل سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ اُسید کی روایت کردہ حدیث پر عمل کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا "نہیں" کیونکہ اس حدیث کے بارے میں اختلاف ہے۔ میں اس حدیث پر عمل کرتا ہوں جو ہُشَیمؒ نے موسیٰ بن سائبؒ سے، انھوں نے قتادہؒ سے، انھوں نے حسن بصریؒ سے، انھوں نے سمرہؓ سے اور انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

مَنْ وَجَدَ مَالَهٗ عِنْدَ رَجُلٍ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ[1] ۔ جس شخص نے اپنا مال کسی کے پاس پایا تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

حسنؒ بصری نے سمرہ سے "حدیث العقیقۃ" کے سوا اور کوئی حدیث نہیں سُنی۔

---

[1] نسائی (۷-۳۱۴) اور دارقطنی (۳-۲۸) نے روایت کی ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے "کہ مشتری اس چیز کی قیمت بائع سے وصول کرے گا"۔ شیخ عظیم آبادی المغنی کے حاشیہ میں حافظ ابن حجرؒ سے نقل کرتے ہیں کہ "یہ حدیث احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے روایت کی اور کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے"۔

جہاں تک حسنؒ بصری کے سمرہؓ سے سماع کا تعلق ہے تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ حسن ابن ابی الحسن یسار البصری جن کی کنیت ابوسعید ہے اس وقت پیدا ہوئے جب کہ حضرت عمرؓ کے خلافت کے دو سال باقی تھے۔ آپ نے حضرت علیؓ، طلحہؓ اور عائشہؓ کو دیکھا تھا۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ حسن بصری بہت بڑے عالم، فقیہ، ثقہ راوی، عابد و زاہد، فصیح و بلیغ اور حسین و جمیل شخص تھے۔ آپ نے جو مرفوع متصل احادیث روایت کی ہیں وہ حجت ہیں اور جو احادیث مرسلاً روایت کی ہیں وہ حجت نہیں ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حسن بصری نے عقیقہ کے بارے میں حدیث سمرہ بن جندب سے سُنی تھی۔ ایک رسالہ میں جو احادیث ان سے روایت کی گئی ہیں وہ سب کی سب سنن اربعہ میں موجود ہیں۔ علی ابن المدینی کے نزدیک ان تمام احادیث کا سماع حضرت حسنؒ بصری نے کیا تھا۔ ترمذی نے بخاری سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ یحییٰ القطان اور دیگر محدثین کہتے ہیں کہ وہ احادیث لکھی ہوئی ہیں اور ان میں انقطاع کا احتمال نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو التاریخ الکبیر (۲-۲۰۹) اور تہذیب التہذیب (۲-۲۶۳)

فصلوں اور پھلوں کی مہلک آفات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

صحیح بخاری[1]، صحیح مسلم[2] اور نسائی[3] میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] الجوائح کا واحد "جائحۃ" ہے۔ الجوائح ایسی سماوی آفت یا قحط یا فتنہ کو کہتے ہیں جو مال کو تباہ و برباد کر دے۔ ابو عبید کہتے ہیں "جائحۃ" اس آفت کو کہتے ہیں جو کسی شخص کے مال پر نازل ہو اور سارے مال کو ختم کر دے۔ ابن شمیل کہتے ہیں۔ عربی محاورہ میں بولتے ہیں اصابتھم جائحۃ" یعنی وہ ایسے قحط سے دوچار ہوئے جس نے ان کے مال کو برباد کر دیا اور ان کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اور (دجاح) سے مراد ہے مال وغیرہ کا باقی ماندہ حصہ۔ ملاحظہ ہو لسان العرب (۲-۴۳۱)

[2] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "اذا باع الثمار قبل ان یبدو صلاحھا" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۱۹۸) بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ)

[3] صحیح مسلم (۲-۱۱۹۰) کتاب المساقاۃ باب وضع الجوائح"۔

[4] النسائی (۷-۲۶۴) کتاب "البیوع" باب شراء الثمار قبل ان یبدو صلاحھا۔

حاکم سے تسامح ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیحین میں موجود نہیں۔ ذہبی نے اس تسامح پر متنبہ کیا ہے۔ دیکھیے المستدرک (۲-۳۶، ۳۷)

میں کہتا ہوں کہ امام مالک نے مؤطا (۲-۵۱) کتاب "البیوع" باب "النھی عن بیع الثمار حتی یبدو صلاحھا" میں یہ حدیث مرفوعاً حمید الطویل سے روایت کی ہے۔ حمید حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ بخاری، مسلم اور نسائی نے بھی اس کو حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت کیا ہے۔

مگر اس حدیث کو مرفوع قرار دینا درست نہیں۔ جیسا کہ دارقطنی نے اس کی تصریح کی ہے

دارقطنی کہتے ہیں:

"یہ وہم محمد بن عباد کو ہوا یا عبدالعزیز کو اس وقت ہوا جب اس نے محمد کو یہ حدیث سنائی۔ اس لیے کہ ابراہیم بن حمزہ نے اس کو واضح طور سے عبدالعزیز سے اس صراحت کے ساتھ سنا کہ یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ (صحابی) کا کلام ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے۔ محمد بن عباد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو ساقط کر کے غلطی سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے کلام کو اس طرح پیش کر دیا کہ اس کلام کو حدیث مرفوع تصور کیا جانے لگا۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں میں نے اپنے والد اور ابو زرعہ سے اس حدیث کے بارے میں استفسار کیا جو محمد بن عباد نے عبدالعزیز

أَرَأَيْتَ إِنْ مَنَعَ اللّٰهُ الثَّمَرَةَ بِمَ يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ مَالَ أَخِيهِ۔ | بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک دے تو تم میں سے ایک شخص اپنے بھائی (مشتری) کا مال کیونکر لے سکے گا۔

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:۔

بِمَ يَسْتَحِلُّ أَحَدُكُمْ مَالَ أَخِيهِ۔ | تم میں سے ایک شخص اپنے (مسلمان) بھائی کے مال کو کیسے حلال سمجھتا ہے۔

"الدلائل" میں ہے کہ امام مالکؒ نے مؤطا کے علاوہ دوسری جگہ یہ حدیث متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

نسائی میں ہے اس (بائع) کے لیے حلال نہیں کہ خریدار سے کچھ بھی وصول کرے۔ آخر وہ اس (مشتری) سے ناحق (قیمت) کیوں وصول کرتا ہے؟[1] صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آفات سے تباہ شدہ فصل کی قیمت نہ وصول کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔[2]

امام مالکؒ[3] نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آفت سے جب ایک تہائی فصل تباہ ہو جائے تو اسی قدر قیمت

دراوردی سے، اُس نے حُمید سے اور اُس نے انسؓ سے روایت کی ہے۔ دونوں نے جواب دیا یہ حدیث نہیں بلکہ حضرت انسؓ کا کلام ہے۔ ابوزرعہ کہنے لگے دراوردی اور مالک بن انس اس کو مرفوعاً روایت کرتے ہیں جبکہ ان کے علاوہ دوسرے اس کو حضرت انسؓ کے کلام کی حیثیت سے موقوفاً روایت کرتے ہیں۔ ("العلل" (۱-۸، ۳۷۹،۳)

ان حضرات پر نقد و جرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر فتح الباری (۴-۳۹۹) میں لکھتے ہیں:

"کسی دلیل سے یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ یہ تفسیر مرفوع نہیں۔ اس لیے کہ جو شخص اس کو مرفوعاً روایت کرتا ہے وہ اس شخص کی روایت میں اضافہ کرتا ہے جو اس کو موقوف قرار دیتا ہے۔ جب کہ موقوفاً روایت کرنے والا مرفوع قرار دینے والے کی نفی نہیں کرتا۔ حافظ ابن حجر مزید فرماتے ہیں: مسلم نے بطریق ابوالزبیر عن جابر جو روایت کی ہے اس سے اس حدیث کے مرفوع ہونے کی تائید ہوتی ہے۔" جابرؓ سے روایت کردہ حدیث مصنف نے بھی نقل کی ہے اور وہ آگے آرہی ہے۔

[1] نسائی باب "وضع الجوائح" عن جابر رضی اللہ عنہ۔

[2] صحیح مسلم (حوالہ مذکور)

[3] امام مالکؒ نے اس ضمن میں روایت کردہ متعدد احادیث سے استدلال کیا ہے۔ امام مالکؒ نے ایک تہائی یا اس سے زیادہ پھل تباہ ہونے کی جو شرط لگائی ہے اس کی دلیل مجھے نہیں مل سکی۔ سُحنون نے بھی المدونہ میں اس سلسلے میں کسی ثابت شدہ نص کا ذکر نہیں کیا۔ اس سلسلے میں جو زیادہ سے زیادہ بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ قول اہلِ مدینہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ عبدالرزاق المصنف (۸-۲۶۴) میں لکھتے ہیں کہ معمر نے ہمیں بتایا کہ اہلِ مدینہ آفات (ارضی و سماوی) کے بارے میں ایک خاص طرزِ عمل رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر فصل کا ایک تہائی یا اس سے کم حصہ تباہ ہو تو اس کا بوجھ خریدار پر ہوگا۔ اور اگر تہائی یا اس سے زیادہ ہو تو اس کا نام "حادثہ" ہے۔ اور اس کا بوجھ بائع پر ہوگا۔ وہ صرف فصلوں کے بارے میں آفت کے قائل تھے۔ اور یہ اس طرح کہ میں نے اہلِ مدینہ سے ذکر کیا کہ لبسا اوقات مشتری

کم کردی جائے۔ لیثؒ، سفیانؒ ثوری، امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ اپنے ایک قول کے مطابق فرماتے ہیں کہ اگر پھل پکنے کے بعد خریدا گیا ہو اور وہ کسی آفت سے تباہ ہو جائے تو اس کی قیمت میں کمی نہیں کی جائے گی چاہے وہ آفت کسی بھی نوعیت کی ہو۔

کپڑا خریدتا ہے تو وہ نذرِ آتش ہو جاتا ہے یا غلام خریدتا ہے اور وہ مر جاتا ہے (تو کیا اس کی ذمہ داری بائع پر عائد ہوتی ہے؟) معمر کہتے ہیں مجھے اس شخص نے بتایا جس نے زہری سے سنا تھا اس نے زہری سے دریافت کیا "حادثہ یا آفت کسے کہتے ہیں؟" انھوں نے کہا "جس سے نصف (پھل یا فصل) تباہ ہو جائے"۔

عبدالرزاق کہتے ہیں کہ ہمیں الاسلمی نے بتایا۔ اس نے حسین بن عبداللہ سے سنا، اس نے اپنے باپ سے، اس نے دادا سے، اس نے حضرت علیؓ سے کہ انھوں نے فرمایا۔ آفت وہ ہے جس سے ایک تہائی یا زیادہ فصل تباہ ہو جائے۔ اس صورت میں خریدار اتنی ہی قیمت کم ادا کرے گا۔ اگر اس سے کم فصل تباہ ہو تو اس کا بوجھ خریدار برداشت کرے گا"۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

"جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آفت سے ایک تہائی فصل یا کم و بیش تباہ ہو جائے تو قیمت میں اسی قدر کمی کر دی جائے، تو اس ضمن میں نہ کوئی حدیث ہے، نہ قیاس اور نہ عقلی دلیل۔ اور اگر میں یہ موقف اختیار کرتا تو یہ صرف اسی صورت میں ہوتا۔ جب اس کے لیے کتاب و سنت سے کوئی واضح دلیل ملتی۔ (کتاب الام ۳-۵۳)

اس ضمن میں زیادہ صحیح مسلک امام احمدؒ بن حنبل نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ آفت زدہ فصل زیادہ ہو یا کم قیمت میں اس کے مطابق کمی کر دی جائے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

سلہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

"جب کوئی شخص (باغ کا) پھل خرید کر اس کا قبضہ لے لے۔ پھر پھل پکنے سے پہلے یا اس کے پک چکنے کے بعد لیکن توڑنے سے پہلے کوئی آفت آ جائے۔ قطع نظر اس سے کہ آفت ایک پھل دار درخت کو لاحق ہو یا سارے باغ کو تو ایسے حالات میں دو میں سے ایک صورت پر عمل کیا جائے گا:

۱۔ اگر خریدار کا مال پر مکمل قبضہ نہیں ہوا اور یہ بات واضح تھی کہ پھل پکنے تک وہ بائع کے قبضے میں رہے گا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ابھی تک مال پر پوری طرح قابض نہیں ہوا۔ اس صورت میں خریدار پر صرف اس مال کی ذمہ داری ہوگی جس پر اس کا عملاً قبضہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص دوسرے سے ناپ کر غلّہ خریدتا ہے۔ اس کا ایک حصّہ مشتری اپنے قبضے میں لے لیتا ہے اور کچھ حصّہ بائع کے پاس ہی اس وقت ضائع ہو جاتا ہے جب کہ خریدار نے اس کا قبضہ نہیں لیا، تو مشتری ضائع شدہ مال کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس پر قابض نہیں ہوا۔ اور جو مال اس کے قبضے میں آ گیا تھا اس کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ باغ پر قبضہ کرتے وقت مشتری کو پھل توڑنے یا نہ توڑنے کا اختیار تھا۔ اس صورت میں جو مال اس کے ہاں تباہ ہوا اس سے اسے خود نقصان پہنچا نہ کہ بائع کو۔

ان دونوں صورتوں سے ہٹ کر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ بائع اس صورت میں ضامن ہوگا جب کہ فصل کا ایک تہائی یا اس سے

ائمۂ کرام اس صحیح حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے عہدِ رسالت میں کچھ پھلدار درخت خریدے جن کا پھل کسی آفت کی وجہ سے خراب ہو گیا جس کی وجہ سے حضرت معاذؓ بہت زیادہ مقروض ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تصدقوا علیہ" (معاذ کو صدقہ دو) لوگوں نے صدقہ دیا، مگر اس سے بھی ان کا قرض ادا نہ ہوا تب[1]

زیادہ حصّہ آفت زدہ ہوا اور تہائی سے کم تباہ ہونے کی صورت میں بائع ذمہ دار نہ ہوگا۔ اس لیے کہ مشتری نے وہ مال ایک ہی عقد کے ذریعے خریدا اور ایک ہی دفعہ وہ اس پر قابض ہوا تھا پھر یہ کیسے درست ہے کہ تہائی یا زیادہ کی صورت میں بائع ضامن ہو اور اگر تہائی سے کم مال ضائع ہو تو وہ ضامن نہ ہو۔" (کتاب الام ۳-۵۹)

احمد بن بشریٰ امام شافعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ اگر پانی بند ہو جائے اور اس وجہ سے نقصان پہنچے تو خریدار پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ آفت زدہ ہونے کی صورت میں بھی اسی طرح ہوگا۔ دیکھیے "المجموع" (۱۱-۳۰۸)

ائمۂ کرام کے اس اختلاف کا خلاصہ یہ ہے کہ جو پھل پکنے کے بعد فروخت کیا جائے، اگر بائع اسے مشتری کے سپرد کر دے اور اسے پورا پورا اختیار دے دے کہ جب چاہے اسے توڑ لے اور پھر وہ پھل کسی آسمانی آفت کی وجہ سے توڑنے سے پہلے ضائع ہو گیا تو اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوگی۔ اس صورت میں امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جس قدر مال ضائع ہوا ہے بائع اس کی قیمت میں اتنی کمی کر دے، لیکن تعاون علی البر کے طور پر بائع اگر اتنی رعایت کر دے تو یہ مستحسن ہوگا۔ اس ضمن میں صحیح قول یہی ہے اور اسی کی پیروی ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت صحیح احادیث مروی ہیں جن میں فرمایا گیا ہے ایسے حالات میں اتنی رعایت کر دینی چاہیے جتنا نقصان آفت زدگی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس طرح شرعی نصوص پر کسی تاویل کا تکلف کیے بغیر عمل ہو جائے گا۔

[1] البیہقیؒ "السنن الکبریٰ" (۶-۵۰) میں اس حدیث کا ایک حصّہ نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے بعض الفاظ کو نقل کرنے میں واقدی منفرد ہے۔ حافظ ابن حجرؒ "التلخیص الحبیر" (۳-۳۷) میں لکھتے ہیں:۔

یہ حدیث دارقطنی، حاکم اور بیہقی نے بطریق ہشام بن یوسف عن معمر عن زہری عن ابن کعب بن مالک عن کعب بن مالک روایت کی ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

"معاذ بن جبلؓ کا مال آپؐ نے روک لیا اور ان کے قرض میں فروخت کر دیا"

اس کے برعکس عبدالرزاق اور عبداللہ بن مبارک نے یہ حدیث معمر سے مرسلاً روایت کی ہے۔ اسی طرح ابوداؤد نے "مراسیل" میں یہ حدیث بروایت عبدالرزاق تفصیل کے ساتھ مرسلاً روایت کی ہے۔ عبدالحق کہتے ہیں یہ مرسل متصل کی نسبت زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن کعب کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ یہاں انھوں نے مصنف (ابن الطلاع) کا کلام نقل کیا ہے۔ عبدالحق نے ابن الطلاع کے قول "یا لحدیث الثابت" کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک مصنف کی یہ بات درست ہے۔" (حافظ ابن حجر کا کلام ختم ہوا)

الطبرانی نے "الاوسط" میں اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں کچھ اضافے بھی ہیں۔ اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:۔

حضورؐ نے قرض خواہوں سے فرمایا: "جو ملتا ہے لے لو۔ تمھیں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا۔"

"کعب بن مالکؓ سے مروی ہے ــــــ (کعب ان تین صحابہؓ کے زمرہ میں شامل ہیں جن کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول کی تھی) ــــــ کعبؓ کہتے ہیں کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ عہدِ رسالت میں اتنے مقروض ہوگئے کہ ان کا قرض ان کے پورے مال سے زیادہ ہوگیا۔ معاذؓ بڑے صالح صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ معاذؓ نے کہا یارسولؐ اللہ! اسلام لانے کے بعد میں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میں نے اپنا تمام مال اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے صرف کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں میں مقروض ہوگیا ہوں، لہٰذا آپ میرے قرض خواہوں کو بُلاکر میرے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کے لیے فرمائیے۔ اگر وہ مان جائیں تو ٹھیک ورنہ آپ میرا مال ان کو دے دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قرض خواہوں کو بلاکر ان سے نرمی کے لیے فرمایا۔ وہ بولے "ہم اپنا مال لینا چاہتے ہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاذؓ کا سب مال دے دیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے حضرت معاذؓ کو یمن کے ایک علاقے کا حاکم بناکر بھیجا۔ اس منصب کی وجہ سے حضرت معاذؓ کو یمن سے کچھ مال حاصل ہوا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو معاذؓ اس وقت یمن میں تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یمن کے کچھ لوگ اسلام سے پھر گئے۔ حضرت معاذؓ بن جبل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ دوسرے عمال ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے حتیٰ کہ وہ لوگ پھر سے اسلامؓ کے دائرہ میں داخل ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں معاذؓ بن جبل بہت سا مال لے کر مدینہ آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے مل کر کہا کہ تم بہت سا مال لائے ہو اس لیے حضرت ابوبکرؓ سے اس مال کے بارے میں دریافت کرو۔ اگر وہ اس مال کو تمھارے لیے حلال قرار دیں تو حلال ہے۔ ورنہ یہ مال ان کی تحویل میں دے دینا۔ حضرت معاذؓ نے کہا "عمرؓ! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ حضورؐ نے مجھے یمن اپنے مال کی تلافی کرنے کے لیے بھیجا تھا جب کہ آپؐ نے میرا تمام مال قرض خواہوں کو دے دیا تھا۔ میں جو کچھ اپنے ساتھ لایا ہوں اس میں سے کچھ بھی حضرت ابوبکرؓ کو نہیں دینا چاہتا ہوں۔ اِلّا یہ کہ وہ مجھ سے طلب کریں۔ اگر وہ طلب کریں گے تو میں ان کے حوالے کردوں گا۔ اور اگر انھوں نے نہ لیا تو میں اسے پاس رکھوں گا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں اپنے اور تمھارے لیے صرف بھلائی کا خواہاں ہوں۔ پھر حضرت عمرؓ اٹھے اور پیٹھ پھیر کر جانے لگے۔ حضرت معاذؓ نے پھر آپ کو بلایا اور کہا "میں آپ کی اطاعت کروں گا۔ اس لیے کہ میں نے خواب دیکھا ہے"۔ پھر انھوں نے اپنے خواب کا ذکر کیا۔ اس کے بعد وہی بیان ہے جو مصنف نے ذکر کیا ہے۔

حافظ الہیثمیؒ "مجمع الزوائد" (۴-۱۴۲-۱۴۳) میں لکھتے ہیں:-

"اس حدیث کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اس کے باقی راوی صحیح کے درجہ کے ہیں۔ البتہ ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ میں نے ابن کعب سے سنا اور انھوں نے اپنے والد سے، مگر وہ ابن کعبؓ کے نام کا ذکر نہیں [illegible]۔ صحیح بخاری میں اس مضمون کی اور روایات بھی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کعبؓ بن مالک کی اولاد میں کوئی بھی ضعیف راوی نہیں پایا جاتا۔"

صحیح مسلم (۳-۱۱۹۱) میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عہدِ رسالت میں [illegible] درخت خرید[illegible] جن کا [illegible] آفت کی وجہ سے نقصان ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں وہ شخص مقروض ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس کو صدقہ دو"۔ لوگوں نے صدقہ دیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی "لَيْسَ لَكُمْ إِلَّا ذَالِكَ" (تمھیں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا) میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ مُفلس (دیوالیہ) کو قید میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ حضرت معاذؓ کو دیوالیہ ٹھہرانے کا واقعہ ۹ھ میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا تمام مال قرض خواہوں کو دے دیا۔ قرض خواہوں نے اپنے قرض کا ۵/۷ وصول کر لیا۔ انھوں نے کہا۔ ان (معاذؓ) کو ہمارے پاس فروخت کر دیجیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (معاذؓ) کو یمن بھیجا اور فرمایا۔" اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے نقصان کی تلافی کر دے گا۔"

یہ واقعہ ربیع الآخر ۹ھ میں پیش آیا جب کہ حضرت معاذؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے لوٹے تھے۔ حضرت معاذؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں یمن سے واپس آئے۔ اُن کے ساتھ چند غلام بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے غلام دیکھ کر پوچھا "یہ کون ہیں؟" حضرت معاذؓ نے کہا "یہ غلام یمن کی امارت کے زمانے میں مجھے ملے تھے۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ "یہ کیسے ملے؟" انھوں نے جواب دیا۔" لوگوں نے میری عزت افزائی کے لیے ہدیۃً دیے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔" امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا تذکرہ کیجیے۔" حضرت معاذؓ نے کہا۔" حضرت ابوبکرؓ کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے بعد حضرت معاذؓ جب سوئے تو خواب دیکھا کہ گویا وہ جہنم کے کنارے پر کھڑے ہیں اور عمرؓ پیچھے سے اُن کی کمر پکڑ کر کھینچ رہے ہیں کہ معاذؓ کہیں جہنم میں نہ جا پڑیں۔ حضرت معاذؓ یہ دیکھ کر گھبرا گئے اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ اسی طرح بیان کر دیا جیسے حضرت عمرؓ نے انھیں فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت معاذؓ کو

مگر اس کا قرض ادا نہ ہو سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا۔" جو ملتا ہے لے لو، اس کے سوا تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔

(ابوداؤد (۳-۲۷۶)، نسائی (۷-۲۶۵) اور ابن الجارود "المنتقی" (ص ۲۴۱)۔ کسی نے بھی مقروض کے نام کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً وہ معاذ بن جبلؓ ہی تھے)

طحاوی نے شرح "معانی الآثار" (۵-۱۱۹) میں اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیچی ہوئی چیز کی طے شدہ قیمت پر آفت کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔

وہ لکھتے ہیں:۔

جب پھلوں کے ضائع ہونے سے قرض خواہوں کا قرض ختم نہیں ہوا، حالانکہ ان میں وہ بھی تھے جنھوں نے ان کو فروخت کیا تھا۔ اور ان سے قیمت بھی واپس نہیں لی گئی، تو اس سے معلوم ہوا کہ "وضع الجوائح" (آفت زدہ ہونے کی صورت میں قیمت میں تخفیف) کا حکم عام نہیں ہے۔

الخطابیؒ معالم السنن (۵-۱۱۹) میں لکھتے ہیں:۔" اس حدیث میں حادثہ یا آفت کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس بات کا احتمال ہے کہ پھلوں کو اس وقت نقصان پہنچا ہو جب ان کو توڑ کر ایک جگہ جمع کیا گیا ہو۔ اور نقصان کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ چوری ہو گئی یا ان کی قیمت وصول نہ ہوتی ہو۔ ان تمام صورتوں میں کہا جا سکتا ہے کہ پھلوں پر آفت آ گئی، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کی صورتوں میں بائع کا حق ضائع نہیں ہوتا۔"

اجازت دی کردہ غلاموں کو اپنے پاس رکھ لیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا تھا کہ "امید ہے اللہ تعالیٰ تمہارے نقصان کی تلافی کر دے گا"۔ چنانچہ حضرت معاذؓ نے قرض خواہوں کا باقی ماندہ قرض چکا دیا۔ (تاریخ طبری)

الاُصیلی کہتے ہیں کہ اس حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ کا مسلک درست ثابت ہو کہ فصل کے آفت زدہ ہونے کی صورت میں اس کی قیمت میں کمی نہیں کی جائے گی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آفت کی وجہ سے قیمت میں کمی کرنے کے باوجود جو باقی قیمت خریدار کے ذمے واجب الادا ہوتی ہے وہ اسے ادا کرنے سے قاصر ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَمْسٌ مِنَ الْجَوَائِحِ الرِّيحُ وَالْبَرْدُ وَالْحَرِيقُ وَالسَّيْلُ۔

(پانچ چیزیں آفات میں شمار کی جاتی ہیں)

(۱) آندھی (۲) اولے (۳) آگ (۴) سیلاب (۵) پانچویں چیز بارش یا ٹڈی دل ہے۔[۱]

صحیح بخاری میں حضرت زیدؓ بن ثابت سے مروی ہے کہ عہد رسالت میں لوگ پھل خریدا کرتے تھے۔ جب ادائیگی کا وقت آتا تو خریدار کہتے کہ پھل فلاں بیماری کی وجہ سے پکنے سے پہلے ہی گل سڑ کر بدبودار اور سیاہ ہو گئے ہیں[۲]۔ اور پھر وہ چند بیماریوں کا نام لیتے[۳]۔ جب اس قسم کے جھگڑے کثرت سے ہونے لگے تو آپؐ نے فرمایا: "تم ایسا نہ کیا کرو۔ پھل اس وقت تک نہ خریدا کرو جب تک پک کر تیار ہونے کے مرحلے میں نہ آ جائے۔" یہ آپؐ کی طرف سے ایک طرح کا مشورہ تھا۔

---

[۱] مجھے نہیں معلوم کہ محدثین میں سے کسی نے اس کو مرفوعاً روایت کیا ہو۔ بہرقول تو آفت کی وضاحت کے سلسلے میں صحابہ و تابعین سے نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق (۸-۲۶۳) میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آفات یہ ہیں: بارش، آندھی، ٹڈی دل اور آگ۔ عطاء خراسانی سے منقول ہے کہ "آفت یا حادثہ" ہر بگاڑنے اور تباہ کرنے والی چیز کو کہتے ہیں مثلاً بارش، اولے، ٹڈی دل، آندھی اور آگ۔

خالد بن الیاس، یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابوالزبیر سے اور وہ حضرت جابرؓ سے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آفت کی صورت میں کمی کا حکم دیا۔ اور آفت سے ٹڈی دل، سیلاب، اولے، آگ اور آندھی مراد ہیں۔

ابو حاتم کہتے ہیں یہ حدیث اس سند کے ساتھ منکر ہے۔ اس میں خالد بن الیاس ضعیف راوی ہے۔ یہ حدیث ابن جریج بھی ابوالزبیر سے روایت کرتے ہیں، وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ (العلل ۱-۳۷۱)

یحییٰ بن سعید کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آفت کی یہ تفسیر حضرت جابرؓ سے منقول ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

[۲] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "بیع الثمار قبل بدو صلاحها" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۱۹۳)

عربی متن میں (الدمان) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں خوشے میں سیاہی اور تعفن کا رونما ہونا۔ القزاز کہتے ہیں اس کے معنی ہیں پکنے سے پہلے کھجور کے پھل کا خراب ہو جانا۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اسی طرح لکھا ہے۔

[۳] ان میں سے ایک بیماری کے لیے عربی متن میں (قُشَام) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ "قُشَام" بضم القاف اس کے بعد شین معجمہ ہے یہ کھجوروں کی ایک بیماری کا نام ہے۔ اصمعی کہتے ہیں کہ قشام کے معنی ہیں کہ نیم پختہ ہونے سے پہلے کھجور کا پھل کم ہو جائے۔ اس کے معنی سودے کی واپسی کے بھی ہیں۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں اسی طرح لکھتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا پہلا قول یہ تھا کہ آفت کم ہو یا زیادہ اسی مقدار سے قیمت میں تخفیف کر دی جائے۔ امام احمد بن حنبل اور ابو عبیدؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔[۱]

---

[۱] امام احمدؒ بن حنبل سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا میں یہ نہیں کہتا کہ اگر دس یا بیس دانے آفت سے متاثر ہوں۔ تو بھی اس پر آفت کا اطلاق ہوگا۔ اسی طرح مجھے نہیں معلوم کہ ثلث کیا ہوتا ہے۔ لیکن عرفِ عام میں اگر آفت کا اطلاق ایک تہائی، چوتھائی یا پانچویں حصے پر ہوتا ہو تو اس کے مطابق قیمت میں کمی کی جائے۔ (المغنی ۴/۹۵)

ابن قدامہ مزید لکھتے ہیں۔ "احادیث کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ آفت زدگی کی بنا پر قیمت میں کمی کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس عموم میں ایک تہائی سے کم بھی شامل ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی قیمت میں تخفیف ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ پھل ابھی خریدار کے قبضے میں نہیں آیا، لہٰذا جتنا بھی ضائع ہوا وہ بیچنے والے کے مال میں سے ہوا۔ اگرچہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔"

الدرداوردی نے "الانصاف" (۵/۷۴) میں امام احمدؒ بن حنبل کے اکثر ساتھیوں سے نقل کیا ہے کہ آفت کی صورت میں خریدار یہ نقصان بائع سے وصول کرے گا۔ قطع نظر اس سے کہ مال ایک تہائی ضائع ہوا ہو یا اس سے کم یا زیادہ۔ البتہ نقصان کم ہونے کی صورت [illegible] درگزر سے کام لینا نسبتاً آسان تر ہوگا۔ الزرکشی کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کے اکثر ساتھیوں نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ "الوجیز" میں یہ بات پورے وثوق سے انھوں نے لکھی ہے۔" (الدراوردی کی بات ختم ہوگئی)

آفات کے بارے میں جو احادیث نقل ہوئی ہیں ان کے پیشِ نظر صحیح مسلک یہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو سودے میں دھوکہ کھا جاتا ہو

موطأ[1] امام مالکؒ، صحیح بخاری[2] اور صحیح[3] مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سودے میں اکثر دھوکا کھا جاتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سودا کرنے لگو تو کہہ دیا کرو کہ اس میں دھوکہ نہ ہو"۔ اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ جب لین دین کا معاملہ کرتا تو کہتا "اس میں دھوکا نہ ہو"۔ ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں یہ الفاظ ہیں کہ "سودا کرنے لگو تو کہہ دیا کرو کہ دھوکا نہ ہو۔ اور سودا کرنے کے بعد تین دن تک تمھیں واپس کرنے کا اختیار ہے"۔ اس شخص کا نام حَبَّان[4] بن مُنْقِذ تھا۔

المدونہ[5] میں حضرت عمرؓ سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ میں نے تمھارے لین دین کے معاملات پر غور کیا ہے۔ میں تمھارے

---

[1] موطا امام مالک ج ۲ ص ۸۶ کتاب "البیوع" باب "جامع البیوع"۔

[2] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "مَا یُکْرَہُ مِنَ الْخِدَاعِ فِی الْبُیُوْعِ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۱۱۷)

[3] صحیح مسلم (۳-۱۱۶۵) کتاب "البیوع" باب مَنْ یُخْدَعُ فِی الْبُیُوْعِ" ابوداؤد (۳-۲۸۲) کتاب "البیوع" باب "فِی الرَّجُلِ یقول عند البیع لاخلابة" ترمذی (۳-۵۵۲) کتاب "البیوع" باب "مَا جَاءَ فِیْ مَنْ یُخْدَعُ فِی الْبُیُوْعِ" نسائی (۷-۲۵۲) کتاب "البیوع" باب المخدیعة فی البیع۔

[4] یہ حَبَّان بن مُنْقِذ بن عمر انصاری تھے جبکہ بعض محدثین کہتے ہیں کہ یہ حبان کے والد منقذ بن عمرو تھے جو دھوکہ کھا جاتے تھے۔ ان کی عمر ایک سو تیس[130] سال تھی۔ کسی غزوہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ قلعے پر ان کے سر پر پتھر لگا جس سے سر میں زخم آ گیا۔ اس کی وجہ سے دماغ بھی متاثر ہوا اور زبان بھی تاہم حواس قائم تھے۔ (شرح مسلم للنووی (۱۰-۱۷۷)

ابن الجارود "المنتقی" (ص ۱۹۷) میں لکھتے ہیں کہ حَبَّان بن مُنْقِذ کے سر میں زخم آجانے کی وجہ سے ان کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے خرید و فروخت کے معاملات میں دھوکا کھا جاتے تھے۔

یہ حدیث دارقطنی نے بھی (۳-۵۵) نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد بن یحییٰ بن حبان نے مجھے بتایا کہ میرے دادا مُنْقِذ بن عمرو تھے۔ ان کے سر میں زخم آجانے کی وجہ سے زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی اور دماغ میں بھی خلل آ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ دھوکہ کھاتے مگر اس کے باوجود تجارت کا پیشہ نہیں چھوڑتے تھے۔

[5] المدونہ (۴-۱۹۴) میں ابن لہیعہ سے مروی ہے کہ اسے حَبَّان بن واسع نے محمد بن یزید بن رُکانہ کے حوالے سے بتایا۔ یہ حدیث دارقطنی اور طبرانی نے بطریق محمد بن طلحہ بن یزید بن رُکانہ روایت کی ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے خرید و فروخت کے بارے میں گفتگو کی۔ اس کے

لیے اس طرح کی میں کوئی گارنٹی نہیں پاتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حبان بن منقذ کو دلائی تھی اور وہ گارنٹی یہ تھی کہ جو چیز وہ خریدتا اسے تین روز تک اس کے واپس کرنے کا اختیار ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر بھی اسی کے مطابق فیصلہ صادر کیا کرتے تھے۔

ابوداؤد میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "غلام خریدنے والے کو تین دن تک واپس کرنے کی اجازت ہے۔"

آگے وہی الفاظ ہیں جو اس حدیث کے ہیں۔ دیکھیے "الدرایۃ" (۲ - ۱۴۸)

لہ ابوداؤد (۳ - ۲۸۴) کتاب "البیوع" باب "فی عھدۃ الرقیق" بروایت حسن عن عقبہ بن عامر۔ ابوداؤد کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "اگر تین دن کے اندر غلام میں بیماری پائے تو شہادت پیش کیے بغیر اسے واپس کر دے۔ اور اگر تین دن کے بعد غلام میں بیماری پائے تو اُسے شہادت پیش کرنی ہوگی کہ جب اس نے یہ غلام خریدا تو اس میں فلاں بیماری موجود تھی۔" ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ قتادہ کا قول ہے۔ حاکم نے اسے "المستدرک" (۲ - ۲۱) میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حسن کا سماع عقبہ سے ثابت نہیں۔

المنذری مختصر ابوداؤد (۵ - ۱۵۰) میں لکھتے ہیں کہ ابن المدینی اور ابوحاتم نے لکھا ہے کہ حسن کا سماع عقبہ بن عامر سے ثابت نہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں اضطراب پایا جاتا ہے، چنانچہ امام احمد نے مسند میں یہ حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے "غلام کی واپسی کا حق چار دنوں تک ہے۔" ابن ماجہ نے یہ حدیث حسن سے روایت کی ہے اور وہ عقبہ سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں۔ "چار دنوں کے بعد واپسی کا حق باقی نہیں رہتا۔" ابن ماجہ ہی میں یہ حدیث سمرہ یا عقبہ سے شک کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اس حدیث کے متن اور سند دونوں میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ بیہقی کہتے ہیں "یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حدیث حسن سے مروی ہے اور وہ سمرہ سے روایت کرتے ہیں مگر یہ سند محفوظ نہیں ہے۔"

ابوبکر الأثرم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ آپ کب تک سودا واپس کرنے کا حق محفوظ سمجھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا اس ضمن میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ اس مسئلے میں حسن اور سعید بن ابی عروبہ سے ایک حدیث منقول ہے۔ سعید کو شک ہے کہ یہ حدیث سمرہ سے منقول ہے یا عقبہ سے۔" (المنذری کا بیان ختم ہوا)

ابن ابی حاتم "العلل" (۱ - ۳۹۵) میں لکھتے ہیں کہ میرے والد نے فرمایا کہ یہ حدیث میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ میری رائے میں یہ حدیث مرسل ہے۔"

امام مالکؒ مؤطا میں فرماتے ہیں کہ مجھے عبداللہ بن ابی بکر نے بتایا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابان بن عثمان اور ہشام بن اسماعیل کو سنا کہ وہ دونوں منبر پر خطبہ دے کر لوگوں کو بتلاتے تھے کہ سودے کی واپسی کا حق تین دن تک اور (غلام یا لونڈی کی خرید کی صورت میں یہ حق) ایک سال تک باقی رہتا ہے۔

امام محمد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم تین روز یا ایک سال کی مدت تک واپسی کے حق کو نہیں جانتے۔ بجز اس صورت کے کہ خریدار بائع سے تین دن رات یا ایک سال کی مہلت مقرر کرے۔ یہ ان کی مقرر کردہ شرط کے مطابق ہوگا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو واپسی کا اختیار صرف تین روز تک باقی رہتا ہے۔ (مؤطا مالک بروایت محمد بن حسن ص ۲۸۱)

حضرت علیؓ ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ لونڈی اگر کوڑھی یا بیمار ہو تو خریدار اسے ایک سال تک واپس کر سکتا ہے[1]۔
امام شافعیؒ اور ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ تین دن رات یا ایک سال تک سودا واپس کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔
امام بخاریؒ[2] العداء بن خالدؓ[3] سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تحریر کر کے دیا

امام محمد بن حسنؒ نے اپنی کتاب "الحجۃ" (۲-۹-۵، ۵۱۴) میں غلام اور حیوان کی واپسی کے سلسلے میں امام مالکؒ اور اہل مدینہ کے مسلک کی تردید کی ہے۔

غلام کی ضمانت کا مطلب یہ ہے کہ جب خریدار بائع سے کوئی لونڈی یا غلام خریدے اور بائع یہ شرط نہ عائد کر دے کہ لونڈی یا غلام میں کوئی عیب یا بیماری نہیں تو اس صورت میں اگر خریدار تین دن کے اندر اس میں کوئی عیب پائے تو گواہی پیش کیے بغیر وہ اسے واپس کر دے۔ ابوداؤد نے قتادہ کی اسی توضیح کو نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ بائع عیب سے بری ہونے کی شرط نہ لگائے۔ الخطابی نے "معالم السنن" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

[1] مجھے یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ کس نے اس کا ذکر کیا ہے۔ "المصنف" (۸-۱۵۲) میں ہے کہ علی بن حسینؓ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ خریدار لونڈی سے جماع کرے پھر وہ اس میں کوئی عیب پائے تو وہ خریدار ہی کے پاس رہے گی اور بائع اتنی رقم واپس کرے گا جو بیماری کی وجہ سے لونڈی کی قیمت میں سے کم ہوئی۔

بیہقی (۵-۳۲۲) نے بھی علیؓ بن حسین سے روایت کیا ہے، مگر یہ مرسل روایت ہے۔ اس لیے کہ علی بن حسینؓ اپنے دادا حضرت علیؓ سے نہیں ملے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے مسند (۲-۲۹) میں یہ حدیث الہیثم بن حبیب صیرفی سے روایت کی ہے۔ وہ شعبی سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت علیؓ سے۔ ابن الترکمانی "الجوہر النقی" میں کہتے ہیں کہ یہ ایک عمدہ سند ہے۔

الخطابی "المعالم" میں لکھتے ہیں کہ جنون، جذام اور برص کی بنا پر غلام یا لونڈی کے خریدار کو ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے۔ جب ایک سال گزر جائے تو اسے خریدے ہوئے غلام یا لونڈی کو واپس کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔"

[2] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "إِذَا بَيَّنَ الْبَيِّعَانِ وَلَمْ يَكْتُمَا وَنَصَحَا" (فتح الباری میں باب ۱۹) بخاری نے یہ حدیث بلا سند نقل کی ہے۔ ترمذی (۳-۵۲۰) کتاب "البیوع" باب "مَا جَاءَ فِي كِتَابَةِ الشُّرُوطِ" میں یہ حدیث متصلاً روایت کرتے ہیں۔ نیز ابن ماجہ سنن (۲-۷۵۶) میں، ابن الجارود "المنتقٰی" (ص ۲۴۳) میں، طحاوی "مشکل الآثار" (۲-۲۳۲) میں اور ابن عبدالبر (الاستیعاب) (۳-۱۶۱) میں بھی یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ یہ تمام محدثین عباد بن لیث سے روایت کرتے ہیں اور وہ عبدالمجید بن وہب سے، وہ العداء بن خالد سے، ان تمام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بائع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خریدار العداء بن خالد تھے۔ مگر بخاری نے اس کے برعکس روایت بیان کی ہے۔ ابن المطلاع، الاصیلی اور ابن النقی رنے اس بات کا اضافہ کیا ہے۔ کہ ان تمام محدثین کا بیان امام بخاری کے برعکس ہے اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ امام بخاری کی عبارت میں "اشتریٰ" کا لفظ "باع" (فروخت کیا) کے معنی میں واقع ہوا ہے۔

[3] العداء بروزن العطار۔ اس کا نام ونسب العداء بن خالد بن ہوذہ بن خالد بن عمرو بن عامر بن صعصعہ العامری ہے۔ ہشام بن الکلبی نے اس کا نسب لکھا ہے اور اس کو اور اس کے والد کو مؤلفۃ القلوب میں شمار کیا ہے۔ العداء نے غزوہ حنین کے بعد

"یہ خرید و فروخت کا وہ معاملہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العداء بن خالد کے ساتھ کیا۔ یہ ایک مسلم کا دوسرے مسلم کے ساتھ معاملہ ہے۔ جس میں نہ بیماری ہے، نہ کھوٹ اور نہ خیانت کاری"۔

صحیح بخاری کے علاوہ دیگر کتابوں میں بھی ہے۔ اور الاُصیلی نے بھی کتاب الفوائد میں اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ العداء بن خالد بن ہوذہ نے رسول اکرمؐ سے ایک غلام خریدا اور اس کے بارے میں یہ تحریر لکھی گئی کہ نقص نکلنے کی صورت میں رسول اللہ ذمہ دار ہوں گے۔

ابن المغتار ابن العطار کے رد میں لکھتے ہیں کہ العداء بن خالد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (ایک غلام) خریدا تھا اور حضورؐ نے اسے یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔

"یہ وہ معاملہ ہے جو العداء بن خالد اور محمد رسول اللہ کے درمیان ہوا۔ العداء نے انؐ سے ایک لونڈی یا غلام خریدا"۔ راوی کو شک ہے کہ اس کے استاد نے لونڈی کا لفظ کہا یا غلام کا۔ اس روایت میں العداء کا نام حضورؐ کے نام سے پہلے ہے۔ یہ سب بخاری کی روایت کے خلاف ہے۔

غزوہ اوطاس میں جب قیدی تقسیم کیے گئے تھے تو حضورؐ نے فرمایا:

"حاملہ عورت سے وضع حمل تک مجامعت نہ کی جائے۔ اور جو حاملہ نہیں ہے اس کے ساتھ اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اسے حیض نہ آجائے"۔

اپنے باپ اور بھائی حرملہ کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ اس نے طویل عمر پائی۔ مسند احمد میں ہے کہ العداء یزید بن مہلب کے خروج تک زندہ رہا۔ مہلب نے خروج ۱۰۱ھ یا ۱۰۲ھ میں کیا تھا دیکھیے "الاستیعاب" (۳ - ۱۶۱) "الاصابۃ" (۲ - ۴۵۹)

۱ ابن المغتار کا نام محمد بن عمر بن یوسف قرطبی ہے۔ یہ مشہور حافظ حدیث اور اندلس میں مالکیہ کے قائد تھے۔ ابن بشکوال کہتے ہیں کہ یہ عظیم عالم، ذہین اور حافظ حدیث تھے۔ ائمہ کے مسالک اور علماء کی آراء سے اچھی طرح باخبر تھے۔ "المدونہ" کے حافظ تھے اور ہمارا نظریہ ہی سے اس کے حوالے دیتے تھے۔ ابن حیان کہتے ہیں کہ ابن المغتار نے بلنسیہ کے شہر میں ۴۱۹ھ میں وفات پائی۔ دیکھیے "الصلۃ" (ص ۸۰) "الدیباج" (۲ - ۲۳۲)

۲ ابن العطار کا تعارف گزر چکا ہے۔

۳ یہ حدیث اس کتاب کے تمام نسخوں میں موجود ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس باب کے ساتھ اس کی مطابقت کیا ہے۔ ابوداؤد (۲ - ۲۴۸) نے یہ حدیث عمرو بن عون سے روایت کی ہے۔ وہ اس کو شریک سے روایت کرتے ہیں۔ وہ قیس بن وہب سے، وہ ابوالوداک سے اور وہ ابوسعید خدری سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"حاملہ عورت سے وضع حمل سے پہلے مجامعت نہ کی جائے اور غیر حاملہ سے اس وقت تک جب تک اسے ماہواری نہ آجائے"۔

المنذری "مختصر ابی داؤد" (۳ - ۷۵) میں لکھتے ہیں:۔

"اس کی سند میں قاضی شریک ہے جس پر اس سے پہلے جرح ہو چکی ہے۔ اس جرح سے ان کا اشارہ اس تبصرہ کی طرف ہے جو باب "حق الزوج علی المراۃ" میں کیا جا چکا ہے۔ وہاں وہ فرماتے ہیں۔ شریک بن عبداللہ القاضی پر متعدد محدثین نے جرح کی ہے۔ مسلم

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے ادھار غلہ خریدا اور اپنی لوہے کی زرہ اس کے یہاں گروی رکھ دی۔ اس حدیث پر امام بخاریؒ نے مندرجہ ذیل تین باب باندھے ہیں:۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھار سودا خریدنا۔ "شراء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنسیئة۔"

۲۔ بیع سلم میں ضامن۔ "الکفیل فی السلم"

۳۔ بیع سلم میں رہن رکھنا۔ "الرھن فی السلم"

صحیح بخاری ہی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی۔

نے "المتابعات والشواھد" میں اس کی مرویات کو نقل کیا ہے"۔

حافظ ابن حجرؒ "تقریب التھذیب" (۱-۳۵۱) میں لکھتے ہیں:

"شریک بن عبداللہ نخعی کوفی پہلے واسط پھر کوفہ میں تعینات تھے۔ سچ بولنے والے لیکن بہت زیادہ غلطیاں کرنے والے تھے۔ جب کوفہ کے قاضی بنے تو ان کا حافظہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ نہایت عادل، فاضل، عابد و زاہد اور اہل بدعت کے مقابلے میں سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ آٹھویں درجے کے راویوں میں شمار ہوتے ہیں"۔

البتہ ایک دوسری حدیث بھی اس کی ہم معنی اور مؤید ہے۔ رُوَیفع بن ثابت انصاری کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوۂ حنین میں فرماتے سنا کہ:

"کسی شخص کے لیے، جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، حلال نہیں ہے کہ دوسرے کی کھیتی کو اپنے پانی سے سینچے (حاملہ عورت سے مجامعت کرے) اور اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے کے لیے حلال نہیں کہ قیدی عورت سے مجامعت کرے جب تک اسے ایک حیض نہ آجائے"۔

ابوداؤد نے یہ حدیث باب سابق میں نقل کی ہے۔ ترمذی (۳-۴۳۷) نے اسے کتاب "النکاح" باب "ما جاء فی الرجل یشتری الجاریة وھی حامل" میں روایت کیا ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔

لہ صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "شراء الطعام الی اجل" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۰۰) باب "السلم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۵۱) کتاب "البیوع" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۵۲)

مصنف نے چوتھے اور پانچویں باب کا ذکر نہیں کیا۔ جو یہ ہیں۔ کتاب "الرھن" باب "من رھن درعه" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۰۹) اور باب "الرھن عند الیھود وغیرھم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۱۲)

ان سب ابواب میں یہ روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

لہ صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب "وفاة النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۴۶۷)

اسماعیل کی "الاحکام" میں بیس صاع جَو کا ذکر ہے۔ جو آپ نے اپنے اہلِ خانہ کے لیے لیے تھے۔ اور مصنف[1] ابن السکن" میں ایک وسق ، ایک پیمانہ) جَو لکھا ہے جو آپؐ نے اپنے اہلِ خانہ کے لیے لیے تھے۔

"المدونۃ" میں زید بن اسلم سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرض کا تقاضا کرنے کے لیے آیا اور آپؐ سے درشتی سے پیش آیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا تم اللہ کے رسولؐ کے بارے میں یہ کہہ رہے ہو؟ یہ سُن کر آپؐ نے فرمایا "دَعْهُ فَاِنَّهُ طَالِبُ مُحِقٍّ"[2] اسے چھوڑ دو۔ یہ اپنا حق مانگ رہا ہے۔"

پھر آپؐ نے ایک شخص سے کہا۔ فلاں شخص کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ باہر سے مال آنے تک ہمیں کچھ غلہ ادھار پر دے دے۔ یہودی نہ مانا۔ اس نے کہا "میں رہن رکھے بغیر غلہ فروخت نہیں کروں گا" یہ سُن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

اِذْهَبْ اِلَيْهِ بِدِرْعِيْ، اَمَا وَاللّٰهِ لَاَمِيْنٌ فِي السَّمَاءِ وَاَمِيْنٌ فِي الْاَرْضِ۔ "یہ میری زرہ لے جا کر اسے دے دو۔ اللہ گواہ ہے کہ میں آسمان و زمین میں امین ہوں"۔

صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رات کو آنے والے ایک مہمان کے واسطے لیے تھے۔ بعدازاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کا معاوضہ ادا کر دیا تھا۔

---

[1] مصنف ابن السکن کا نام "التصحیح المنتقی" بھی ہے۔ اس کو "السُّنَنُ الصِّحَاحُ الْمَأْثُوْرَةُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" بھی کہا جاتا ہے۔ احادیث کا یہ مجموعہ اندلس میں بہت مقبول ہے۔

ابن السکن! یہ ابوعلی سعید بن عثمان بن سعید السکن البغدادی ہیں۔ انھوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے ۳۵۳ھ میں وفات پائی۔ اس سے پہلے ان کا مفصّل تعارف گزر چکا ہے۔

ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں ابن السکن کی کتاب "الصحیح" کا تذکرہ کیا ہے۔ دیکھیے تذکرۃ الحفاظ للذہبی (۳-۹۳۷، ۹۳۸) اور "کشف الظنون" از حاجی خلیفہ (۲-۷۶)

الکتانی ابن السکن کی کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:۔

"مگر اس کتاب میں اسناد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دیکھیے "الرسالۃ المستطرفۃ" (ص ۲۵)

مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کتاب کہاں موجود ہے۔

[2] رسول کریمؐ کا ارشاد گرامی "ان لصاحب الحق مقالاً" (صاحبِ حق کے لیے بات کہنے کی گنجائش ہے) ایک دوسرے واقعہ کے سلسلے میں روایت کیا گیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بدو سے ایک اونٹنی ادھار خریدی۔ یہ مشہور واقعہ ہے۔ دیکھیے "منحۃ المعبود" (۱-۲۷۲)

فروخت کرتے وقت ماں اور اس کی اولاد کو اکٹھا رکھنے اور سودے میں شرط عائد کرنے نیز غیر مسلم گائڈ کی خدمات حاصل کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا تُوَلَّهُ وَالِدَةٌ عَنْ وَلَدِهَا" "کسی والدہ کو (اس کے بچے سے جدا کر کے) پریشان نہ کیا جائے"۔ حضورؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ وَالِدَةٍ وَوَلَدِهَا فَرَّقَ اللّٰهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَحِبَّتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔	جو شخص والدہ اور اس کی اولاد میں جدائی ڈالے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اور اس کے احباب کے درمیان جدائی ڈالیں گے[1]۔

---

[1] حافظ ابن حجرؒ نے "التلخیص الحبیر" (۳ - ۱۵) میں اس روایت کو بیہقی کی جانب منسوب کیا۔ (مگر سنن بیہقی میں متوقع مقامات پر یہ حدیث مجھے نہیں ملی) یہ حدیث بروایت ابی بکر ضعیف سند کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ابو عُبَید نے اپنی غریب الحدیث میں زہری کی مُرسل روایت کی حیثیت سے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ زہری سے روایت کرنے والا راوی ضعیف ہے۔ طبرانی نے اس کو "المعجم الکبیر" میں نقادہ کی سند کے ساتھ ایک طویل حدیث کے طور پر نقل کی ہے۔ ابن الصلاح نے "مشکل الوسیط" میں ذکر کیا ہے کہ نقادہ ابو سعید سے روایت کرتا ہے مگر وہ غیر معروف راوی ہے۔ اور اس کی ثقاہت محلِ نظر ہے۔ ابن الصلاح نے اسی طرح کہا ہے مگر وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ مسند الفردوس کے مصنف نے اس کو ابو سعید کی سند کے ساتھ طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے۔ الجبلی نے شرح التنبیہ میں اس حدیث کو رزین کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث حضرت انسؓ سے بھی روایت کی گئی ہے۔ جس کا ابن عدی نے ایک ضعیف راوی مبشر بن عُبَید کے تعارف کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ابن عدی نے یہ حدیث اسماعیل بن عیاش کے تعارف میں بروایت حجاج بن ارطاۃ عن زہری عن انس ان الفاظ کے ساتھ بھی روایت کی ہے "لَا تُوَلَّهَنَّ وَالِدَةٌ عَنْ وَلَدِهَا" "کہ والدہ کو اولاد سے جدا کر کے پریشان نہ کیا جائے"۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اسمٰعیل کے علاوہ کسی دوسرے راوی نے روایت نہیں کی۔ اور اسماعیل شامیوں کے علاوہ دوسرے کے ہاں ضعیف راوی سمجھا جاتا ہے۔ (ابن حجرؒ کا بیان ختم ہوا)

[2] یہ حدیث ترمذی (۳ - ۵۸۰) نے کتاب "البُیُوع" "بَابُ مَاجَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ أَنْ يُفَرَّقَ بَيْنَ الْأَخَوَيْنِ" میں ابو ایوب سے روایت کی ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اس حدیث کی سند میں حیّی بن عبد اللّٰہ المعافری سچا راوی ہے۔ مگر وہ وہم کے مرض میں مبتلا ہے۔

"المدونہ" میں جعفر بن محمد سے روایت ہے۔ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ جب (باہر سے) قیدی آتے تو آپ ان کو قطار میں کھڑا کر کے غور سے دیکھتے۔ اگر آپ دیکھتے کہ قیدیوں میں سے کوئی عورت رو رہی ہے تو آپ اُس سے رونے کی وجہ پوچھتے۔ اگر وہ کہتی کہ "میری بیٹی اور بیٹے کو (دوسری جگہ) فروخت کر دیا گیا ہے۔" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ دونوں کو اس کے پاس واپس لایا جائے"۔

جعفرؒ بن محمد سے مروی ہے، وہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ ابو اسید انصاری بحرین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیدی لائے۔ آپؐ ان کو قطار میں کھڑا کر کے دیکھنے لگے۔ آپؐ نے دیکھا کہ ایک عورت رو رہی ہے۔ آپؐ نے پوچھا: مایبکیك تم کیوں رو رہی ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ میرے بیٹے کو بنو عبس کے قبیلہ والوں کے پاس فروخت کر دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو اسید کو حکم دیا کہ سوار ہو کر جاؤ اور اس کے بیٹے کو واپس لے کر آؤ۔ آپؐ نے انھیں اس کو خریدنے کے لیے ساتھ رقم بھی دی۔ ابو اُسید سوار ہوا اور جا کر اسے لے آیا۔

یہ حدیث امام احمد نے مسند (۵-۴۱۳) میں حسیّٰ بن عبد اللہ سے روایت کی ہے۔ نیز دیکھیے دارقطنی (۳-۶۷)۔ الحاکم (۲-۵۵) حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ذہبی نے اس پر کچھ تبصرہ نہیں کیا۔ اس کی سند میں حیی بن عبد اللہ ہے جس کے بارے میں امام بخاری کہتے ہیں کہ "وہ ثقہ راوی نہیں" امام احمد کہتے ہیں اس کی روایت کردہ احادیث منکر ہیں، امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس سے روایت نقل نہیں کی۔

تاہم الدارمی (۲-۲۲۷) میں عبد الرحمٰن بن جنادہ نے حیی بن عبد اللہ کی تائید کی ہے۔ امام شوکانی اور حافظ ابن حجر نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔ اس کی مؤید ایک اور روایت المدونہ (۴-۲۷۹) میں بروایت ابن وہب عن جبیر بن عبد اللہ الجبلی موجود ہے۔ یہ حدیث بیہقی نے بھی ایک دوسری سند کے ساتھ بروایت علاء بن کثیر عن ابو ایوب روایت کی ہے، مگر علاء بن کثیر کا سماع ابو ایوبؓ سے ثابت نہیں، تاہم کثرتِ طرق کی بنا پر یہ حدیث حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

لہ المدونہ (۴-۲۸۰) میں ہے کہ سحنون کہتے ہیں کہ مجھے انس بن عیاض اللیثی نے جعفر بن محمد کے حوالے سے بتایا اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کی۔

اور جعفر کا نام جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علیؓ بن ابی طالب الہاشمی العلوی ہے۔ کنیت ابو عبد اللہ اور نسبت المدنی ہے۔ وہ اپنے والد محمد الباقر ابو جعفر سے روایت کرتے ہیں۔ البتہ ان کی ملاقات ان کے پردادا علیؓ ابن ابی طالب کے ساتھ ثابت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات تو خارج از بحث ہے، لہٰذا اس روایت میں انقطاع اور ارسال کا عیب پایا جاتا ہے۔

لہ حوالہ مذکورہ بالا بروایت ابن وہب عن ابن ابی ذئب وانس بن عیاض اللیثی عن جعفر۔ یہ حدیث عبد الرزاق نے المصنف (۸-۳۰۸) میں بروایت ابن جُریج عن جعفر نقل کی ہے۔ بیہقی نے یہ حدیث "السنن" (۹-۱۲۹) میں بطریق ابن ابی ذئب روایت کی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اگرچہ اس حدیث میں ارسال کا عیب پایا جاتا ہے تاہم "یہ مرسل حسن" ہے۔ اور جو روایت اس سے پہلے اسی مضمون کی گزر چکی ہے یہ اس کی تائید کرتی ہے۔

یونسؒ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو ایک فوجی دستے کا قائد بنا کر بھیجا۔ اس فوجی دستے کو کچھ مالِ غنیمت ملا۔ اسی دوران میں ان لوگوں کو بھوک لگ گئی تو حضرت علیؓ نے ایک لونڈی (جس کی ماں بھی موجود تھی) دے کر اس کے عوض ایک بکری خریدی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا تو حضورؐ نے فرمایا۔

"علیؓ! کیا تم نے لونڈی کو اس کی ماں سے جدا کر دیا ہے؟ تم اس غلطی کا ازالہ کرو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کو برابر دہراتے رہے حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے کہا: "میں جاتا ہوں اور بکری دے کر اسے واپس لاتا ہوں اور یہ کام کرنے سے پہلے میں اپنے سر کے قریب پانی نہیں آنے دوں گا۔"

حسینؒ بن عبداللہ بن ضمیرہ سے مروی ہے۔ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد ضمیرہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُمِّ ضمیرہ کے پاس سے گزرے تو وہ رو رہی تھی۔ آپؐ نے پوچھا: تم کیوں رو رہی ہو؟ کیا تمھیں بھوک لگی ہے یا تمھارے

ؔ دیکھیے المدونہ (۴ - ۲۸۰) بروایت ابن وہب عن ابن لہیعہ، عن عبیداللہ ابن ابی جعفر، عن یونس بن عبدالرحمٰن۔
سنن ابوداؤد کتاب "الجہاد" میں اس کے ساتھ ایک ملتا جلتا واقعہ بروایت یزید بن ابی خالد الدالانی عن الحکم بن عُتیبہ عن میمون بن ابی شبیب عن علیؓ نقل ہوا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے ایک لونڈی اور اس کے بچے کو الگ کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع کیا اور اس سودے کو واپس فرمایا۔
ابوداؤد نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ میمون بن ابی شبیب کی حضرت علیؓ سے ملاقات ثابت نہیں یہ حدیث حاکم نے "المستدرک" (۲ - ۵۰) میں نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔

ؔ المدونہ (۴ - ۲۸۱) ابن وہب اس حدیث کو ابن ابی ذئب سے روایت کرتے ہیں اور وہ حسین بن عبداللہ سے۔ دونوں روایات کا مفہوم ایک ہی ہے۔ مگر "المدونۃ" میں اس کتاب والی عبارت موجود نہیں۔
ابن الاثیر نے اس کا "اسد الغابۃ" (۳ - ۴۰) میں اور البزار نے مسند میں ذکر کیا ہے۔ الہیثمی نے اس کا (مجمع الزوائد (۴ - ۱۰۷) میں ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسین بن عبداللہ بن ضمیرہ کذاب اور متروک الحدیث راوی ہے۔ ابن عبدالبر "الاستیعاب" (۴ - ۱۰۷) میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحت نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر "الاصابۃ" (۲ - ۲۰۶) میں لکھتے ہیں کہ ابن وہب ابن ابی ذئب سے روایت کرتے میں منفرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن صاعد نے اسے مُعلّل قرار دیا ہے البتہ حسین بن عبداللہ بن ضمیرہ کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں کہا۔

اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ ماں اور اس کے بچوں کے درمیان تفریق ڈالنی اس وقت تک حرام ہے جب تک کہ بچہ بالغ ہو کر والدین سے بے نیاز نہ ہو جائے۔ اس پر اہلِ علم کا اجماع ہے۔ امام شوکانی نے البحر سے اسی طرح نقل کیا ہے، البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس صورت میں بیع منعقد ہوتی ہے یا نہیں؟ امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ بیع منعقد نہیں ہوتی۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں اور امام شافعی کا دوسرا قول بھی یہی ہے کہ بیع منعقد ہو جاتی ہے۔

پاس کپڑے نہیں"۔ اُم ضمیرہ بولی "یارسول اللہ! مجھ کو میرے بیٹے سے جدا کر دیا گیا ہے"۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

لَا یُفَرَّقُ الْوَالِدَةُ وَوَلَدُهَا بچے کو اس کی والدہ سے جدا نہ کیا جائے۔

جس شخص کے پاس ضمیرہ تھی آپ نے پیغام بھیج کر اس کو بلایا اور اس سے ضمیرہ کو ایک کنواری لونڈی کے عوض خرید لیا۔
ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ پھر اس نے مجھے ایک خط پڑھنے کے لیے دیا جس میں لکھا تھا :

"اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے۔ یہ خط محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ابوضمیرہ اور اس کے اہلِ خانہ کی جانب تحریر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا ہے۔ اور اب ان کی حیثیت ایک عربی گھرانے کی سی ہے۔ وہ چاہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ٹھہریں۔ اور چاہیں تو اپنے وطن لوٹ جائیں۔ کسی جائز حق کے بغیر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ اہلِ اسلام میں سے جو بھی انھیں ملے ان سے نیک سلوک کرے۔" یہ خط اُبی بن کعب نے تحریر کیا تھا۔

عُروہ بن زُبیر[1] سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ جب ہجرتِ مدینہ کے ارادہ سے چلے تو دونوں کا گزر بکریوں کے ایک چرواہے کے پاس سے ہوا۔ دونوں نے اس سے ایک بکری خریدی اور یہ طے کر لیا کہ اس کی کھال اس کو دے دی جائے گی۔

صحیح بخاری[2] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے (سفرِ ہجرت میں) قبیلہ بنی ہُذَیل کے ایک ماہر کافر کو رہنمائی کے لیے ملازم رکھا۔ انھوں نے اپنی دونوں سواریاں اس کے حوالے کر دیں اور تین راتوں کے بعد غارِ ثور میں آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ تیسری رات کی صبح کو وہ حسبِ وعدہ دونوں اونٹنیاں لے کر غارِ ثور میں پہنچ گیا۔

امام بخاریؒ نے اس حدیث کو بابُ اِذَا اسْتَأْجَرَ اَجِیْرًا لِیَعْمَلَ بَعْدَ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ اَوْ بَعْدَ شَهْرٍ اَوْ بَعْدَ سَنَةٍ جَازَ وَهُمَا عَلٰى شَرْطِهِمَا الَّذِیْ شَرَطَاهُ اِذَا جَآءَ الْاَجَلُ" (جب کوئی شخص کسی کو اس شرط پر ملازم رکھے کہ وہ تین دن یا ایک ماہ یا ایک سال کے بعد کام کرے گا تو یہ جائز ہے۔ دونوں آدمی اپنی شرطوں کے پابند ہوں گے۔ مقررہ وقت

بدرقت کی شرط سلمہ بن اکوع کی ایک لمبی حدیث سے ماخوذ ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ سلمہ چند قیدی لائے جن میں ایک عورت اور اس کی بیٹی بھی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ لڑکی سلمہؓ بن اکوع کو دے دی۔ سلمہ جب مدینہ پہنچے تو انھوں نے یہ لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی۔ اس دوران سلمہؓ نے اس لڑکی کا پردہ تک نہیں اٹھایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لڑکی مسلمانوں کے فدیہ میں مکہ بھیج دی۔ مسلم اور ابوداؤد نے یہ روایت بیان کی ہے۔

[1] مجھے اس حدیث کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکا۔

[2] صحیح بخاری کتاب "الاجارۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۶۴)

آ نسے پہ دہ آدمی کام شروع کر دیں گے) میں شامل کیا ہے۔

امام بخاریؒ نے جو یہ لکھا ہے "او بعد سنة" (یا ایک سال بعد) تو اس پر عمل نہیں۔ ایک سال کی مدت مقرر کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں دھوکے کا احتمال ہے۔

راستہ بتانے والے اس شخص کا نام اُرَیقط اور بعض کے نزدیک اُرَیقط تھا۔[1][2]

امام مالکؒ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں مدینہ کے قریب ایک اونٹ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے خریدا۔ اس سودے میں یہ شرط بھی تھی کہ حضرت جابرؓ مدینہ تک اس پر سفر کر سکیں گے۔[3]

صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ میں نے اپنا اونٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ فروخت کر دیا اور یہ شرط عائد کی کہ میں اس پر سوار ہو کر مدینہ جاؤں گا۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وَلَكَ ظَهْرُهُ إِلَى الْمَدِينَةِ" تم اس پر سوار ہو کر مدینہ تک جانے کے مجاز ہو"[4]

---

[1] حافظ ابن حجرؒ فتح الباری (۴ - ۴۴۳) میں لکھتے ہیں:

اسمٰعیلی نے اس باب کے لیے عنوان قائم کرنے پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ اس حدیث میں یہ بات مذکور نہیں ہے کہ وہ شخص تین دن کے بعد کام شروع کرے گا۔ اس کے برعکس اس میں تو یہ بات مذکور ہے کہ آپؐ نے اس کو ملازم رکھا اور اس نے اسی وقت سے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اس لیے کہ حضورؐ نے اور حضرت ابوبکرؓ نے دونوں اونٹنیاں اس کے سپرد کر دی تھیں۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ انھیں چرائے گا اور ان کے سفر ہجرت پر روانہ ہونے تک ہر طرح کی نگرانی کرے گا۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ کے قائم کردہ عنوان میں وہ الفاظ ہی موجود نہیں جن کی وجہ سے اسماعیلی نے امام بخاریؒ پر تنقید کی ہے۔ بخلاف ازیں باب کے عنوان میں وہی الفاظ ہیں جو واقعہ سے متعلق ہیں یا قی جو شخص اس بات کا مدعی ہے کہ اجارہ کے وقت اگر اجیر اپنے کام کا آغاز نہ کرے تو اس سے اجارہ باطل ہو جاتا ہے تو اسے اپنے دعویٰ کی دلیل پیش کرنی چاہیے"

[2] موسیٰ بن عقبہ اور ابن سعد نے اس کا نام "عبداللہ بن اُرَیقط" بالقاف والطاء بتایا ہے۔ ابن ہشام کے مطابق ابن اسحاق نے اس کا نام عبداللہ بن ارقد بتایا ہے۔ الاموی نے ابن اسحاق سے اُرَیقد (بالدال بدل الطاء) نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ "المعتبیۃ" میں اس کا نام رقیط بتاتے ہیں، مگر سب سے مشہور "اُرَیقط" ہے۔ دیکھیے شرح المواھب (۱ - ۳۰۹)

[3] یہ روایت مجھے مؤطا امام مالک میں نہیں ملی۔

[4] صحیح بخاری کتاب "الشروط" باب إِذَا اشْتَرَطَ الْبَائِعُ ظَهْرَ الدَّابَّةِ إِلَى مَكَانٍ مُسَمًّى جَازَ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۱۸)

بروایت ابن نعیم عن زکریا عن عامر عن جابرؓ بیان کردہ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں "میں نے اونٹ اس شرط پر فروخت کیا کہ مدینہ پہنچنے تک میں اس پر سواری کروں گا"

[5] صحیح بخاری کتاب "الوکالۃ" باب إِذَا وَكَّلَ رَجُلٌ أَنْ يُعْطِيَ شَيْئًا وَلَمْ يُبَيِّنْ كَمْ يُعْطِي فَأَعْطَى عَلَى مَا يَتَعَارَفُهُ النَّاسُ۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۳۰۹) بروایت مکی بن ابراہیم عن ابن جریج عن عطاء بن ابی رباح عن جابر بن عبداللہؓ: اس

ابوالزبیر[1] نے حضرت جابرؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "أَفْقَرْنَاكَ ظَهْرَهُ إِلَى الْمَدِينَةِ" "ہم نے تمھیں مدینہ تک اس پر سوار ہونے کی اجازت دی"۔

اعمش[2] نے سالم سے اور انھوں نے حضرت جابرؓ سے حضورؐ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "تَبَلَّغْ عَلَيْهِ إِلَى أَهْلِكَ"۔ "تم اس پر سوار ہو کر اپنے اہلِ خانہ کے پاس جا سکتے ہو"۔

صحیح بخاری[3] میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے کہا "قیمت اور اونٹ دونوں تمھارے ہوئے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اونٹ ایک اوقیہ (وزن کا پیمانہ) میں خریدا[4]۔ یہ بات وہب اور زید بن اسلم نے کہی ہے۔ عطاء[5] کہتے ہیں کہ آپؐ نے یہ اونٹ چار دینار میں خریدا تھا۔ دینار دس درہم کا ہوتا ہے۔ لہٰذا چار دینار اور ایک اوقیہ دونوں برابر ہیں[6]۔

سالم[7] کہتے ہیں کہ ایک اوقیہ سونے میں خریدا۔ یہ حدیث اعمش نے سالم سے، اور سالم نے جابرؓ سے روایت کی ہے۔ اس میں دو سو درہم کے الفاظ ہیں[8]۔ وہ کہتے ہیں کہ دو سو درہم چار اوقیہ کے برابر ہوتے ہیں۔

کے الفاظ یہ ہیں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اونٹ میرے پاس بیچ دو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ اونٹ آپؐ ہی کا ہے، آپؐ نے فرمایا "نہیں، تم اسے میرے پاس فروخت کردو۔ میں نے چار دینار میں یہ اونٹ تم سے لے لیا۔ اور تم اس پر سوار ہو کر مدینہ جا سکتے ہو"۔

[1] ایک نسخہ میں "ابن الزبیر" ہے جو کہ غلط ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری کتاب "الشروط" میں محولہ بالا باب میں مروی ہے۔ البیہقی (۵-۳۳۷) نے یہ حدیث حماد بن زید عن ایوب عن ابوالزبیر متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ امام مسلمؒ نے بھی یہ حدیث اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[2] صحیح بخاری حوالہ مذکور۔ امام مسلمؒ نے یہ حدیث الاعمش کی متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[3] صحیح بخاری کتاب "المظالم" بَابُ مَنْ عَقَلَ بَعِيْرَهُ عَلَى الْبَلَاطِ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۷۰)

[4] صحیح بخاری کتاب "الشروط" مذکورہ بالا باب، عن عبید اللہ وابن اسحاق عن وہب عن جابرؓ۔ زید بن اسلم نے اس کی تائید میں ایک دوسری روایت بھی بیان کی ہے۔ عبید اللہ سے ابن عمر العمری مراد ہے۔ مصنف نے اس کو کتاب "البیوع" بابُ شِرَاءِ الدَّوَابِّ وَالْحُمُرِ" میں متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن اسحاق کی سند بارے میں حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ امام احمد، ابو یعلیٰ اور البزار نے اسے متصل سند کے طور پر روایت کیا ہے۔ وہب سے مراد وہب بن کیسان ابونعیم المدنی ہے۔ وہ ثقہ راوی اور معلم تھے۔ زید بن اسلم کی روایت البیہقی (۵-۳۳۷) نے متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[5] امام بخاریؒ نے یہ حدیث کتاب "الوکالة" میں متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[6] یہ امام بخاری کا قول ہے اور اس سے ان کا مقصد دو روایتوں کے مابین تطبیق پیدا کرنا ہے۔

[7] امام مسلم اور دیگر محدثین نے یہ حدیث متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[8] یہ حدیث ابو اسحاق نے سالم سے، اور سالم نے جابرؓ سے روایت کی ہے۔ داؤد بن قیس، عبید اللہ بن مقسم سے روایت کرتے ہیں۔

ابونضرہؓ نے حضرت جابرؓ سے بیس دینار میں خریدنے کے الفاظ نقل کیے ہیں امام بخاری کہتے ہیں کہ شعبی کا قول کہ ایک اوقیہ میں خریدا زیادہ مشہور ہے۔ اور سواری کی شرط زیادہ مشہور اور زیادہ صحیح ہے۔

اور وہ عابر ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"حضورؐ نے یہ اونٹ جابرؓ سے غزوۂ تبوک سے لوٹتے وقت میرے خیال میں چار اوقیہ میں خریدا تھا"

حافظ ابن حجر کو معلوم نہیں ہو سکا کہ کس نے اس حدیث کی تخریج کی اور کس نے یہ متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

لہ یہ حدیث ابن ماجہ (۲-۳۴۳) نے الجریری کے طریق سے متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک دینار بڑھاتے گئے۔ حتیٰ کہ بیس دینار تک پہنچ گئے"

مسلم (۳-۱۲۲۳) نے یہ حدیث بروایت ابی نضرہ عن جابرؓ روایت کی ہے۔ مگر اس روایت میں اونٹ کی قیمت کا تعین نہیں۔

لہ حافظ ابن حجر فتح الباری (۵-۳۲۱) میں لکھتے ہیں :-

"ان سب روایات کا حاصل یہ ہے کہ اکثر روایات میں ایک اوقیہ کا لفظ آیا ہے اور بعض میں چار دینار کے الفاظ ہیں۔ ان دونوں روایات میں کوئی تضاد نہیں۔ اس لیے کہ اوقیہ چار دینار کا ہوتا ہے۔ دوسری روایات میں اسی طرح ہے۔

۱۔ بعض روایات میں سونے کا اوقیہ اور بعض میں چار اوقیہ کے الفاظ ہیں۔

۲۔ بعض میں پانچ اوقیہ ہے۔

۳۔ بعض میں دو سو درہم ہیں۔

۴۔ بعض میں بیس دینار کی رقم ہے۔

یہ اختلاف ابن الطلاع کے مطابق مختلف روایات میں پایا جاتا ہے۔

قاضی عیاض ان روایات میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"اختلاف کا سبب یہ ہے کہ راویوں نے روایت بالمعنیٰ کی ہے۔ اوقیہ سے مراد سونے کا اوقیہ ہے۔ چار اور پانچ اوقیہ میں فرق اس کی قیمت کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ حقیقی اختلاف نہیں۔ چار دینار اور بیس دینار کا فرق وزن اور عدد کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں چالیس درہم اور دوسری میں دو سو درہم ہے۔ یہ فرق بھی وزن اور عدد کے اختلاف پر مبنی ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ عقد بیع کے وقت چاندی کا نام لیا گیا ہو اور ادائیگی سونے کے سکے میں کی گئی ہو اور اس کے برعکس کا بھی احتمال ہے"

كِتَابُ الأَقْضِيَةِ

ظاہری دلائل کی بنا پر حقوق کا فیصلہ کرنے کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام

مؤطا امام مالک[1]، صحیح بخاری[2] اور صحیح مسلم[3] میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

[1] مؤطا امام مالک (۲ - ۱۰۶) کتابُ الاَقضیة" بابُ التَّرغِیبِ فِی القَضَاءِ بِالحَقِّ" بروایت اُمّ المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔

[2] صحیح بخاری کتابُ" الشهادات" بابُ مَن اَقَامَ البَیِّنَةَ بَعدَ الیَمِینِ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۶۸۰) بخاری کتابُ" الحیل" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۹۶۷) نیز بخاری کتابُ" الاحکام" بابُ مَوعِظَةِ الاِمَامِ لِلخُصُومِ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۷۱۶۹)

[3] صحیح مسلم (۳ - ۱۳۳۷) کتابُ الاَقضیة" بابُ الحُکمِ بِالظَّاهِرِ"۔

ابوداؤد (۳ - ۳۰۱) کتاب الاَقضیة" باب فِی قَضَاءِ القَاضِی إِذَا اَخطَأَ"

ترمذی (۳ - ۳۲۴) کتابُ" الاحکام" باب مَا جَاءَ فِی التَّشدِیدِ عَلَی مَن یُقضَی لَهُ بِشَیءٍ"۔ حدیثٌ حَسَنٌ صَحِیحٌ"

نسائی (۸ - ۲۲۳) کتابُ" القضاۃ" بابُ الحُکمِ بِالظَّاهِرِ"۔

اس حدیث کی تائید میں روایات مندرجہ ذیل کتب میں بھی ہیں:

ابن ماجہ (۲ - ۷۷۷) اور مسند احمد (۲ - ۲۳) بروایت عن ابو ہریرہؓ۔ طبرانی فی الاوسط بروایت عن ابن عمرؓ۔ مگر اس سند میں قاسم بن عبید متروک راوی ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۴ - ۱۹۴)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قاضی اپنے فیصلے سے کسی حرام چیز کو حلال اور حلال کو حرام نہیں بنا سکتا۔ امام مالکؒ، اوزاعیؒ، شافعیؒ، احمدؒ، اسحاقؒ، ابوثورؒ اور محمد بن حسن شیبانیؒ کا مسلک یہی ہے۔

جمہور ائمہ کے خلاف امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ قاضی جب کسی معاملہ کے عقد یا فسخ یا طلاق کا حکم صادر کرے تو اس کا فیصلہ ظاہری اور باطنی طور پر نافذ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دو شخص اگر دانستہ کسی شخص کے بارے میں جھوٹی شہادت دیں کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ اور گواہوں کی ظاہری حالت کی بنا پر قاضی میاں بیوی میں تفریق کروا دے تو عدت گزرنے کے بعد ان دونوں گواہوں میں سے ایک گواہ اس عورت کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی عورت کے بارے میں دعویٰ کرے کہ وہ اس کی منکوحہ بیوی ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے، پھر وہ دو جھوٹے گواہ پیش کرے جن کی شہادت کی بنا پر قاضی اس کے حق میں فیصلہ صادر کر دے، تو وہ عورت اس بنا پر اس کے لیے

"میں بھی ایک انسان ہوں۔ تم اپنے جھگڑے چکانے میرے پاس آتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں کوئی شخص اپنے مدعا کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کر سکتا ہو۔"

صحیح بخاری کی ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں :-

حلال ہوگی اور اس کی بیوی قرار پائے گی۔

ابن المنذرؒ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ یہ بات کہتے ہیں منفرد ہیں کہ اگر کوئی عورت پیسے دے کر دو گواہ کھڑے کر لے اور وہ شہادت دیں کہ اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی ہے ——— حالانکہ وہ اپنے جھوٹ اور جعل سازی سے بخوبی آگاہ ہیں ——— اور حاکم ان کی شہادت کی بنا پر اس کی طلاق کا فیصلہ صادر کر دے تو اس صورت میں وہ عورت نکاح (ثانی) کی مجاز ہے۔ اور ان دو گواہوں میں سے کوئی ایک اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

طحاوی نے شرح معانی الآثار (۲ - ۱۵۶) میں اس کی دلیل میں حدیث لعان پیش کی ہے۔ طحاوی لکھتے ہیں :-

" اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتا کہ زوجین میں سے جھوٹا کون ہے تو ان کے مابین تفریق یا لعان نہ کرواتے۔ اسی طرح اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ عورت سچی ہے تو قاذف ہونے کی وجہ سے خاوند پر حد قذف لگائی جاتی اور اگر آپ جانتے ہوتے کہ خاوند سچا ہے تو عورت پر زنا کے ارتکاب کی بنا پر شرعی حد لگائی جاتی۔ پس جب حاکم کو یہ معلوم نہ ہو کہ دونوں میں سے سچا کون ہے تو دوسرا حکم واجب النفاذ ہوگا، چنانچہ اسی بنا پر اس عورت کی شرمگاہ ظاہر و باطن میں خاوند کے لیے حرام ٹھہرائی گئی اور اسے صرف باطن تک محدود نہیں رکھا گیا۔

یہاں متن کتاب میں جو حدیث ہے اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مالی معاملات کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی دلیل حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ "مَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ" (جس کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے دینے کا فیصلہ صادر کروں) اس سے تملیک مال مراد ہے۔

طحاوی نے لعان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ لعان کی وجہ سے زوجین میں جو تفریق ہوتی ہے وہ خاوند کی صداقت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ حدیث مالی معاملات کے ساتھ مخصوص ہے تو اگرچہ حدیث کے الفاظ اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں تاہم اس حدیث کا اصل مقصد یہ ہے کہ حاکم ظاہری دلائل کی بنا پر جو فیصلہ صادر کرتا ہے اس کی بنا پر نہ حرام چیز کو حلال ٹھہرایا جا سکتا ہے اور نہ حلال کو حرام۔ اس لیے خلاف حقیقت ہونے کی صورت میں حاکم کا فیصلہ کسی چیز کی تحلیل و تحریم کا موجب نہیں ہو سکتا اور اس میں ہر قسم کے فیصلے شامل ہیں۔ امام شافعیؒ نے اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ حاکم کا فیصلہ کسی حرام چیز کو حلال نہیں کر سکتا۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ احناف شرمگاہ کی حلت و حرمت کے بارے میں اموال کی نسبت زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ (پھر حیرت ہے کہ اس صورت میں وہ اس عورت کو کیونکر نکاح کی اجازت دیتے ہیں؟ مترجم)

"میں بھی ایک انسان ہوں۔ فریقین میرے یہاں آتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں ایک دوسرے کی نسبت زیادہ فصیح ہو۔ اور میں اس کی چرب زبانی کی بنا پر خیال کروں کہ وہ سچا ہے اور اس کے حق میں فیصلہ صادر کر دوں۔ تو یاد رکھو کہ جس شخص کو میں اس کے بھائی کا حق کاٹ کر دے دوں تو وہ اس میں سے کچھ نہ لے۔ اور یہ سمجھ لے کہ میں اس کو جہنم کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔"

صحیح بخاری کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "جس کو میں نے کسی دوسرے مسلمان کا حق دے دیا تو گویا اسے جہنم کا ایک ٹکڑا دیا گیا۔ اب اس کی مرضی ہے کہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔"

سنن ابوداؤد (کتاب القضاء، باب کیف القضاء) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

۱؎ ابوداؤد (۳-۱۰۳) کتاب "القضاء" باب "کَیْفَ الْقَضَاءُ"۔ علاوہ ازیں یہ حدیث مندرجہ ذیل کتب میں بھی موجود ہے البیہقی (۱۰-۱۴۰) ترمذی (۳-۶۱۸) کتاب "الاحکام" باب "مَا جَاءَ فِی الْقَاضِیْ لَا یَقْضِیْ بَیْنَ الْخَصْمَیْنِ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَھُمَا" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ نیز دیکھیے "الحاکم فی المستدرک" (۴-۹۳) حاکم کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے، مگر بخاری اور مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ نیز دیکھیے ابوداؤد الطیالسی "منحۃ المعبود" (۱-۲۸۶)

ان سب روایات کی سند میں حنش نامی راوی پایا جاتا ہے۔ یہ حنش ابن المعتمر الکنانی الکوفی ہے جو حضرت علیؓ کا رفیق تھا۔ المنذری کہتے ہیں اس کی روایت کردہ حدیث کو ترمذی نے حسن قرار دیا اور اس کی تائید کی ہے۔ حافظ ابن حجر "التقریب" میں فرماتے ہیں کہ "حنش سچا مگر وہم کا مریض ہے۔"

ابن حزم نے اس کو ضعیف قرار دیا اور کہا کہ وہ ساقط الاعتبار راوی ہے۔ دیکھیے "المحلّٰی" (۱۰-۵۱۹) یہ حدیث ابن ماجہ (۲-۷۷۴) نیز الحاکم اور البزار نے بطریق ابی البختری عن علیؓ روایت کی ہے۔ علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی بنا کر یمن بھیجا تو میں اس وقت نوجوان تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ فیصلہ کیسے کیا جاتا ہے۔ (تا آخر)

مگر ابوحاتم اور بعض دوسرے محدثین کہتے ہیں کہ ابوالبختری نہ تو حضرت علیؓ سے ملا اور نہ اس نے ان سے حدیثیں روایت کیں۔ ابوالبختری کا نام سعید بن فیروز ہے۔ یہ حدیث البزار نے بطریق حارثہ بن مضرب عن حضرت علیؓ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے سلسلے میں یہ حضرت علیؓ سے بہترین سند ہے جو نقل کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر "الدرایۃ" (۲-۱۶۵) میں لکھتے ہیں:

"ابن حبان نے یہ حدیث ایک دوسری سند کے ساتھ بروایت ابن عباسؓ عن علیؓ روایت کی ہے۔ اس میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک علاقہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ میں نے عرض کیا حضورؐ! آپ مجھے ذمہ داری دے کر بھیج رہے ہیں میں بالکل نوعمر ہوں۔ لوگ مجھ سے مسائل دریافت کریں گے اور مجھے معلوم نہیں ہوگا کہ میں کیا جواب دوں؟ (تا آخر)

الحاکم نے یہ حدیث دوسری سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یمن بھیجا اور فرمایا کہ اہل یمن کو شرعی احکام سکھائیں اور ان کے جھگڑوں کے فیصلے کریں۔

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ مجھے قاضی بنا کر بھیج رہے ہیں، جبکہ میں ایک نوجوان آدمی ہوں اور مقدمات کے فیصلے کرنے کا طریقہ مجھے نہیں آتا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ تمھارے دل کی رہنمائی کرے گا اور تمھاری زبان کو حق پر قائم رکھے گا۔ جب فریقین تمھارے سامنے بیٹھیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرنا جب تک دوسرے فریق کا نقطۂ نظر اسی طرح نہ سُن لو جیسے تم نے فریقِ اوّل کی بات سنی ہے۔ اس طرح فیصلہ کرنا تمھارے لیے آسان ہوجائے گا۔"

حضرت علیؓ کہتے ہیں اس کے بعد میں وہاں قاضی رہا اور فیصلہ کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔[1]

---

[1] بعض ضعیف العقل معتزلہ اور جہمیہ، جو دین میں عقل کو معیار بناتے ہیں، حضرت علیؓ کے اس قول کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل ہی کا سب کچھ ہے۔ جو بات عقل کے معیار پر پوری اترتی ہے اس کو قبول کرتے ہیں اور جو اس کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ شرعی احکام حکمت پر مبنی ہیں۔ جو بعض اوقات عقلِ انسانی کی سمجھ میں آجاتی ہے اور بعض اوقات وہ اس کے فہم وادراک سے قاصر رہتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا بھی سبب بنے۔ اپنے ان گھڑت اور گمراہ کن اصولوں کی بنا پر انھوں نے حضورؐ کی اس دعا پر، جو آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے فرمائی، چند شکوک وشبہات عائد کیے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی محلّ نظر ہے کہ "اس کے بعد مجھے فیصلہ کرنے میں کبھی دشواری پیش نہیں آئی۔" وہ کہتے ہیں:

"یہ حضرت علیؓ کا ایسا دعویٰ ہے جو خلافِ عقل ہونے کے ساتھ ساتھ خلافِ واقعہ بھی ہے۔

خلافِ عقل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے لیے یہ دعا کیسے کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زبان کو غلط فیصلہ صادر کرنے سے محفوظ رکھے۔ اس لیے کہ خطا ونسیان انسانی فطرت ہیں۔

اور خلافِ واقعہ اس لیے ہے کہ حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد متعدد فیصلے کیے اور پھر ان سے رجوع کیا۔ صحابہ کی ایک جماعت ان فیصلوں کے خلاف تھی اور فقہاء اور تابعین نے بھی ان کو سند نہیں مانا۔ مثلاً مندرجہ ذیل فیصلے:

۱۔ حضرت علیؓ نے امہات الاولاد کے بارے میں ایک فیصلہ کیا اور پھر اس سے رجوع کیا۔

۲۔ "جدّ" کے بارے میں مختلف قسم کے فیصلے صادر کیے۔

۳۔ حضرت علیؓ کو جب ابن عباسؓ کا فتویٰ پہنچا تو انھوں نے مرتدین کو آگ میں ڈالنے کی سزا دینے پر اظہارِ ندامت کیا۔

۴۔ آپ نے حاطب کی آزاد کردہ لونڈی کو رجم کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن جب حضرت عثمان کا یہ قول سنا کہ "حدِ شرعی تو اس پر لگائی جاتی ہے جو اسے جانتا ہو اور یہ لونڈی عجمی ہونے کی وجہ سے اس سے آشنا نہیں" تو آپؓ نے حضرت عثمانؓ کے موقف کو تسلیم کر لیا۔

۵۔ شراب نوشی کے جرم میں ایک شخص کو اسّی کوڑے لگائے تو اس کی موت واقع ہوگئی۔ حضرت علیؓ نے اس کی دیت ادا کی اور فرمایا یہ دیت میں نے اس لیے ادا کی ہے کہ اسی کوڑے میں نے اپنی مرضی سے مارے تھے۔

۶۔ آپؓ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا کہ اگر کوئی شخص کہہ دے کہ تو مجھ پر حرام ہے تو تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ آپ نے اس سے بھی رجوع کیا کہ چوری کے جرم میں

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"جو شخص اس لیے جھوٹی قسم کھائے کہ وہ ناجائز طور پر کسی کا مال بٹور لے تو اللہ تعالیٰ سے وہ اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا۔"

اسی ضمن میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ (آل عمران - ۷۷)

جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔

ہاتھ انگلیوں تک کاٹا جائے اور اگر چوری بچہ کرے تو اس کی انگلیوں کو رگڑ دیا جائے۔ آپ نے بچوں پر بچوں کی گواہی بھی قبول کی۔

ابن قتیبہؒ نے "تاویل مختلف الحدیث" (ص ۱۵۹) میں ان تمام اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔

ابن قتیبہؒ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علیؓ کے دل اور ان کی زبان کی رہنمائی کے لیے دعا فرمائی تو آپ کا مقصد یہ نہ تھا کہ کبھی ان سے لغزش سرزد نہ ہوگی۔ نہ یہ کہ ان سے سہو و نسیان اور غلطی کسی حالت میں بھی نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ یہ ایسی صفات ہیں جو کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ صفات تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ اس دعا سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ حق و صواب ان پر غالب رہے گا اور ان کے اکثر فیصلے عدل و انصاف کے تقاضوں پر مبنی ہوں گے۔ اس قسم کی دعا آپؐ نے حضرت ابن عباسؓ کے حق میں بھی فرمائی تھی کہ "اے اللہ! ان کو تفسیر قرآن کا علم اور دین کا فہم عطا کر"۔ مگر آپ کی دعا کے باوجود حضرت ابن عباسؓ پورے قرآن کے معانی و مطالب سے آگاہ نہ تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

"مجھے معلوم نہیں کہ "حنانا"، "الاواہ"، "الغسلین" اور "الرقیم" کے کیا معنی ہیں"۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ نے بہت سے مقدمات کے ایسے درست فیصلے صادر کیے کہ ان کو حل کرنے سے بڑے بڑے صحابہ قاصر رہے تھے، چنانچہ صحابہ میں حضرت فاروق جیسے جلیل القدر صحابہ بھی تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمر تباہ ہو جاتا"۔

ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ "میں ہر اس پیچیدہ مسئلے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جس کو حل کرنے کے لیے علیؓ موجود نہ ہو"۔

ابن قتیبہ کی یہ رائے بڑی مناسب ہے۔

(ابن قتیبہؒ کا کلام ختم ہوا)

حاصل صحابہ کرام کے حق میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں فرمائی ہیں ان کو اسی بات پر محمول کرنا چاہیے۔ یہ دعائیں حضرت عمر بن الخطاب، ابوہریرہ، حسان بن ثابت، معاویہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں منقول ہیں۔ ان سب دعاؤں کو اغلب و اکثر پر محمول کرنا چاہیے نہ کہ استقصار پر۔

لہ صحیح بخاری کتاب "الخصومات" باب "کلام الخصوم بعضهم الی بعض" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۱۸)

یہ حدیث صحیح بخاری میں دوسرے ابواب میں بھی ہے۔ مثلاً کتاب "الرھن" باب "اذا اختلف الراھن والمرتھن" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۱۶) کتاب "الشہادات" میں متعدد ابواب میں اسی طرح کتاب التفسیر باب "فی تفسیر سورۃ آل عمران" میں۔

الاشعث ابن عبداللہؓ نے صحابہؓ کو بتایا کہ یہ آیت میرے اور ایک اور شخص کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یہ آیت میرے اور میرے چچا زاد بھائی کے بارے میں نازل ہوئی۔ میرا کنواں اس کی زمین میں تھا۔[1] اس کے بارے میں میرے اور اس کے درمیان جھگڑا پیدا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا "تمھارے پاس گواہ ہے؟" میں نے عرض کیا "نہیں" آپؐ نے فرمایا "تو وہ شخص حلف اٹھائے" میں نے عرض کیا "وہ تو حلف اٹھا لے گا"

صحیح مسلم[2] میں یہ اضافہ ہے کہ "اس کے علاوہ تمھارے لیے کوئی چارہ نہیں" تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ شخص یہودی تھا اور اشعث کے ساتھ اس کا جھگڑا تھا۔ بخاری نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔

اشعث نے روایت بیان کی ہے کہ حضر موت کے ایک شخص کا نام جریر بن معدان تھا، وہ خفشیش[3] (بالجیم اوالحا اوالخا) کے نام سے معروف تھا۔ اس کا یمن کی ایک زمین کے بارے میں قبیلہ کندہ کے ایک شخص کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ دونوں نے اپنا معاملہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرمی نے کہا "حضورؐ! یہ میری زمین تھی اور اس شخص کے والد نے غصب کر لی تھی" کندی نے کہا "یا رسول اللہ! یہ میری زمین ہے اور میں نے اپنے والد سے اسے ورثے میں پایا تھا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرمی سے فرمایا "تمھارا کوئی گواہ ہے؟" اس نے عرض کیا "گواہ تو نہیں ہے البتہ میرا حریف قسم کھا کر کہہ دے کہ یہ زمین میری نہیں جو اس کے والد نے چھین لی تھی" کندی قسم کھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ دیکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص جھوٹی قسم کھا کر کسی کا مال ہڑپ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس پر ناراض ہوگا"

چنانچہ کندی قسم کھانے سے باز رہا۔[4]

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ وہ شخص یہودی تھا اور اس کا جھگڑا اشعث کے ساتھ ہوا تھا۔

[2] صحیح مسلم (۱-۱۲۴) کتاب "الایمان" باب وَعِيْدِ مَنِ اقْتَطَعَ مِنْ مُسْلِمٍ بِيَمِيْنٍ فَاجِرَةٍ بِالنَّارِ۔

[3] اسماء الرجال کی کتابوں میں اس کا نام جفشیش (بالجیم) بن نعمان الکندی ہے۔ محدث ابن مندہ نے اس کا یہی نام لکھا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس کا نام بالجیم اوالحا اوالخا تینوں طرح سے لیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ نام بکسر الاول والضم دونوں طرح درست ہے۔ الکلبی اور ابن سعد اس کا نام معدان بن الاسود بن معدیکرب بن ثمامہ بن الاسود لکھتے ہیں۔ آگے چل کر حافظ ابن حجر نے یہ حدیث ابن عبدالبر کے حوالے سے نقل کی اور اس کو ابوداؤد کی جانب منسوب کیا ہے۔ دیکھیے "الاصابۃ" (۱-۲۴۱)

[4] ابوداؤد (۳-۲۲۰) کتاب "الایمان" باب "فِي مَنْ حَلَفَ لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَالًا" ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ کندی نے کہا یہ حضرمی کی زمین ہے۔ دیکھیے ابوداؤد کتاب "القضاء" باب "الرَّجُلُ يَحْلِفُ عَلٰى عِلْمِهِ فِيْمَا غَابَ عَنْهُ" ابن الجارود "المنتقیٰ" (ص ۳۳۵) میں اور ابن اثیر "اسد الغابۃ" (۴-۲۹۱) میں وائل بن حجر سے یہ روایت نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ الطبرانی "المعجم الکبیر" میں لکھتے ہیں کہ "حضورؐ نے اس شخص سے حلف لیا جو زمین پر قابض تھا" الطبرانی اس حدیث کو عدی بن عدی الکندی سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد (۴-۲۰۴)

کندی کا نام امرؤ القیس بن عابس تھا۔ یہ شاعر تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف کا ماموں تھا کیونکہ ابوسلمہ کی والدہ تماضر تھیں۔

مصنف عبدالرزاق میں عن الثوری عن سماک بن حرب عن تمیم بن طرفہ کی سند سے اور

ا؎ مصنف کے اس قول کی سند کہ کندی سے مراد امرؤ القیس شاعر ہے" مجھے نہیں ملی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے یہ بات کہی ہو۔ چنانچہ حافظ ابن حجر "الاصابۃ" (۱ - ۷۷) میں لکھتے ہیں :-

"النسائی، احمد بن حنبل اور البغوی نے بطریق رجاء بن حیوہ از عدی بن عمیرہ روایت بیان کی ہے کہ :

"امرؤ القیس اور حضر موت کے ایک شخص کے درمیان جھگڑا تھا۔ دونوں نے یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ حضورؐ نے حضرمی سے کہا کہ گواہ پیش کرو ورنہ تمہارے حریف سے قسم لی جائے گی" حضرمی نے کہا "یا رسول اللہ! وہ تو حلف اٹھا کر میری زمین لے جائے گا" یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا "جس نے جھوٹی قسم کھا کر کسی کا مال اڑایا تو جب وہ اللہ سے ملے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا" امرؤ القیس نے کہا "یا رسول اللہ! اس شخص کو کیا ملے گا جو اپنے آپ کو سچا سمجھنے کے باوجود اپنے دعویٰ سے دست بردار ہو جائے؟" حضورؐ نے فرمایا "جنت" امرؤ القیس نے کہا "تو میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے یہ دعویٰ ترک کر دیا"۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ اور الکندی کے حریف کا نام ربیعہ بن عیدان ہے۔

حافظ ابن حجرؒ ربیعہ کے تعارف میں "الاصابۃ" (۱ - ۴۹۷) میں لکھتے ہیں :

"ربیعہ کا نام و نسب ربیعہ بن عیدان (بفتح العین وسکون الیاء) ابن ذی العرف بن وائل بن ذی طواف الحضرمی یا الکندی ہے۔ الطبرانی عبدالملک بن عمیر کی سند کے ساتھ، وہ علقمہ بن وائل سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا۔ اسی اثناء میں دو شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک امرؤ القیس بن عابس تھا اور دوسرا ربیعہ بن عیدان۔ ان میں سے امرؤ القیس نے کہا "حضورؐ! اس شخص نے دورِ جاہلیت میں میری زمین چھین لی تھی" اس حدیث کی اصل صحیح مسلم میں بروایت علقمہ موجود ہے۔ مگر اس میں فریقین کا نام مذکور نہیں ہے۔ یہ حدیث متعدد طریقوں سے روایت ہوئی ہے"۔ (حافظ ابن حجر کا بیان ختم ہوا)

اس بیان سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ امرؤ القیس، جریر بن معدان کا حریف نہ تھا۔ لہٰذا یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔ ایک جریر بن معدان المعروف الجفشیش کا معاملہ جس کے حریف کا نام معلوم نہیں ہے اور دوسرا امرؤ القیس اور اُن کے مخالف ربیعہ بن عیدان کا مقدمہ۔ "واللہ تعالیٰ اعلم"

۲؎ مصنف عبدالرزاق (۸ - ۲۷۶) بروایت ثوری، عن سماک بن حرب، عن تمیم بن طرفہ۔ نیز بروایت ثوری عن اسرائیل۔ محدث ابن ابی شیبہ اپنی "مصنف" میں بروایت ابوالاحوص، عن سماک، عن تمیم بن طرفہ نقل کرتے ہیں کہ دو آدمیوں نے ایک ہی اونٹ کے بارے میں دعویٰ کیا کہ وہ اس کا ہے۔ دونوں نے گواہ بھی پیش کر دیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جھگڑے کا فیصلہ فرمایا۔ بیہقیؒ نے یہ حدیث "المعرفۃ" میں الحاکم سے ان کی سند کے ساتھ بروایت ابوعوانہ عن سماک نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں

"المدونہ" میں ہے کہ دو شخص ایک اونٹ کے بارے میں اپنا مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دو دو گواہ پیش کر دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اونٹ دونوں میں تقسیم کر دیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ان دونوں کی قسموں کے بعد معاملہ کسی ایک کے حق میں ثابت نہ ہوا۔

"المحلی" میں ہے کہ دو شخص اپنا جھگڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لے گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں دو دو عادل گواہ پیش کر دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان قرعہ اندازی کی اور دعا کی: "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَقْضِيْ بَيْنَهُمَا" "اے اللہ! ان کے درمیان تو فیصلہ فرما۔"

کہ یہ منقطع روایت ہے۔ دیکھیے "نصب الرایۃ" (۴-۱۰۹)

بر روایت محدثین نے مرسلاً روایت کی ہے۔ الطبرانی "المعجم الکبیر" میں اسے بطریق تمیم بن طرفہ عن جابر بن سمرۃ روایت کرتے ہیں کہ دو شخص ایک اونٹ کے بارے میں اپنا مقدمہ عدالت نبوی میں لے گئے۔ دونوں نے گواہ پیش کیے کہ اونٹ کا مالک وہ ہے۔ حضور نے وہ اونٹ دونوں کو مشترکہ طور پر دے دیا، مگر اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ راوی مدلس ہے۔ اس نے سماک بن حرب سے عن عن کے ساتھ روایت بیان کی ہے۔

الطبرانی نے یہ حدیث ایک دوسری سند کے ساتھ بروایت یٰسین الزیات عن سماک بن حرب انہی الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے، مگر یٰسین الزیات متروک الحدیث ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۴-۲۰۳)

جابر رضی اللہ عنہ سے اس ضمن میں ایک اور روایت بھی مروی ہے جو اس کے خلاف ہے۔ میں نے اسی کتاب کے "استدراکات" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

لہ "المدونہ" (۵-۱۸۸) بروایت سماک بن حرب۔ حافظ ابن حزم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ سماک بن حرب ضعیف راوی ہے۔ اس لیے کہ قراءت حدیث کے دوران کوئی شخص ان کی تصحیح کرتا تو وہ اس کے "لقمہ" کو فوراً قبول کر لیتا۔ المحلی (۱۰-۵۱۹) اس حدیث کی تائید ایک اور صحیح حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ دیکھیے مستدرک الحاکم (۴-۹۵)۔ وہ حدیث یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ روایت کرتے ہیں کہ دو شخص حضور کی خدمت میں ایک ہی اونٹ کے بارے میں اپنا اپنا دعویٰ پیش کر رہے تھے۔ دونوں نے گواہ بھی پیش کر دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اونٹ دونوں میں تقسیم کر دیا۔

یہ حدیث ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے۔ المنذری کہتے ہیں کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ سے ایک اور روایت بھی منقول ہے جو اس حدیث کے بالکل برعکس ہے۔ بعض ائمہ کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے "الاستدراکات" میں لکھا ہے کہ یہ دو مختلف واقعات ہیں، جب کہ بعض اہل علم نے ان کو ایک واقعہ بھی قرار دیا ہے۔

لہ بیہقی (۱۰-۲۵۹) بروایت ابن ابی مریم، عن لیث، عن بکیر بن عبداللہ، عن سعید بن المسیب مرسلاً۔ یہ حدیث ابوداؤد نے المراسیل میں روایت کی ہے۔ عبدالرزاق نے بھی "المصنف" میں مرسلاً روایت کی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ گواہ جب مساوی ہوں تو فریقین کے درمیان قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جائے۔ عبدالحق نے اس حدیث کو "الاحکام" میں نقل کیا اور کہا ہے

ایک دوسری روایت میں ہے کہ خرید و فروخت کے ایک معاملے میں دو شخص آپس میں جھگڑ رہے تھے ۔ گواہ کسی کے پاس بھی نہ تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ ہر دو شخص قسم کھائے گا جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلے ۔ خواہ یہ بات انھیں پسند ہو یا ناپسند۔ [۱]

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی معاملے میں کچھ لوگوں کو قسم کھانے کے لیے کہا ۔ وہ سب جلدی سے قسم کھانے کے لیے تیار ہو گئے ۔ آپ نے فرمایا ۔ قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جائے گا کہ حلف کون اٹھائے گا۔ [۲]

صحیح مسلم اور دوسری کتب حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ پیش کرنے اور اس کے ساتھ حلف اٹھانے والے کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا (یعنی حلف کو دوسرے گواہ کا قائم مقام قرار دیا)۔ [۳]

کہ یہ حدیث مرسل اور ضعیف ہے ۔ اس کی سند میں ابراہیم بن ابی یحیٰی الاسلمی متروک الحدیث راوی ہے ۔ دیکھیے "نصب الرایۃ" (۴-۱۰۸)

الطبرانی نے "الاوسط" میں یہ حدیث حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ابومصعب اسے روایت کرنے میں منفرد ہے ۔ ابوہریرہ سے ایک اور حدیث مروی ہے جو اس کے خلاف ہے ۔ میں نے "استدراک" میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ (حوالہ مذکور)

[۱] ابن ماجہ (۲-۷۸۶) بروایت جمیل بن الحسن العتکی عن عبدالاعلیٰ عن سعید بن ابی عروبہ عن قتادہ عن خلاس عن ابو رافع، ابوہریرہ ۔ ایک دوسری روایت میں جو ابوبکر بن ابی شیبہ، عن خالد بن الحارث عن سعید بن ابی عروبہ کی سند کے ساتھ منقول ہے ۔ یہ صراحت پائی جاتی ہے کہ یہ جھگڑا ایک چوپائے کے بارے میں ہوا تھا ۔ اس روایت میں "تمھیں پسند ہو یا ناپسند" کے الفاظ موجود نہیں ۔ (ابن ماجہ (۲-۷۸۱)

دارقطنی (۴-۲۱۱) میں یہ حدیث سعید بن ابی عروبہ سے روایت کی گئی ہے ۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جمیل بن الحسن سچا ہے ۔ مگر غلطیاں کرتا رہتا ہے ۔ اور خالد بن حارث الہجیمی ابوعثمان البصری ثقہ راوی ہے ۔

[۲] صحیح بخاری کتاب "الشہادات" باب "اِذَا تَسَارَعَ قَوْمٌ فِی الْیَمِیْنِ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۶۷۴)

مصنف عبدالرزاق (۸-۲۷۹) میں یہ الفاظ ہیں کہ "فریقین حلف اٹھانے میں عجلت سے کام لینے لگے"

حافظ ابن حجر فتح الباری (۵-۲۸۶) میں لکھتے ہیں :-

"حلف وہی معتبر ہے جب حلف دلانے والے کی تلقین کے مطابق ہو ۔ حضورؐ نے قرعہ اندازی کر کے ان کے باہمی نزاع کی جڑ کاٹ دی کہ جس کے نام قرعہ میں نکلے گا وہی حلف اٹھائے گا۔"

[۳] ملاحظہ ہو صحیح مسلم (۳-۱۳۳۷) کتاب "الاقضیۃ" باب "اَلْقَضَاءُ بِالْیَمِیْنِ وَالشَّاھِدِ" عن ابن عباس ۔

ابوداؤد (۳-۳۰۸) کتاب "القضاء" باب "اَلْقَضَاءُ بِالْیَمِیْنِ وَالشَّاھِدِ" ۔

امام شافعیؒ کی کتاب الام (۶-۲۵۴)

امام شافعی نے حضرت سعد بن عبادہؓ کی تحریروں کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم کی بنا پر مدعی کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا تھا ۔

امام مالکؒ مؤطا میں جعفر بن محمد سے اور وہ اپنے والد (محمد الباقرؒ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور حلف کی بنا پر مدعی کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔

لہ مؤطا امام مالکؒ (۲ - ۱۰۸) کتاب "القضاء" باب "القضاء بالیمین مع الشاھد" مؤطا میں یہ روایت مرسل ہے۔

ترمذی (۳ - ۶۲۷) کتاب "الاحکام" باب "ما جاء فی الیمین مع الشاھد" بروایت عبدالوہاب ثقفی عن جعفر بن محمد عن محمد، عن جابرؓ۔ ترمذی کہتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث بروایت جعفر بن محمد عن محمد الباقر مرسل ہے۔ سفیان ثوری نے بھی یہ حدیث جعفر بن محمد سے مرسلاً روایت کی ہے۔ عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور یحییٰ بن سلیم نے یہ حدیث جعفر بن محمد کے والد سے روایت کی ہے۔ وہ حضرت علیؓ سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ بعض اہلِ علم صحابہ اور غیر صحابہ کا عمل اسی حدیث پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حقوق اور مالی معاملات کے سلسلے میں ایک گواہ کے ساتھ قسم کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق کا مسلک یہی ہے۔ البتہ بعض اہلِ کوفہ اس پر عمل نہیں کرتے۔" (امام ترمذی کا بیان ختم ہوا)

یہ حدیث صحابہ کی ایک کثیر جماعت نے روایت کی ہے۔ میں نے ان صحابہ کا تفصیلی تذکرہ اپنی کتاب (ابوھریرۃ فی ضوء مرویاتہ) میں کیا ہے۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں:

۱ - جابر بن عبداللہؓ (ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد)

۲ - عبداللہ بن عباسؓ (مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، مسند احمد)

۳ - عمارہ بن حزمؓ (احمد، الطبرانی فی المعجم الکبیر)

۴ - سُرَّق (بضم السین وتشدید الراء) ابن اسد الجہنیؓ (ابن ماجہ)

۵ - بلال بن الحارثؓ (الطبرانی فی المعجم الکبیر)

۶ - زید بن ثابتؓ (الطبرانی فی المعجم الکبیر)

۷ - ابو سعیدؓ (الطبرانی فی المعجم الصغیر والاوسط)

۸ - عبداللہ بن عمرؓ (الطبرانی فی الاوسط)

۹ - ابوہریرہؓ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

۱۰ - سعد بن عبادہؓ (احمد، ترمذی)

۱۱ - حضرت علیؓ (مؤطا امام مالک، مسند احمد)

۱۲ - زید بن ثابتؓ (ابو حاتم، ابو زرعہ)

۱۳ - سہل بن سعدؓ (ابوبکر بن ابی شیبہ)

المنذری مختصر ابی داؤد (۵ - ۲۲۵) میں فرماتے ہیں کہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کرنا مالیات کے ساتھ مخصوص ہے دیگر امور و معاملات میں نہیں۔ اس لیے کہ راوی نے اس کو مالیات کے اندر محدود قرار دیا ہے۔ اور جو حکم خاص ہو وہ نہ تو اپنے محل سے تجاوز

قاضی ابن زرب[1] ذکر کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اقرار کیا۔ پھر وہ اقرار سے منحرف ہوگیا اور کہنے لگا: کس کے سامنے میں نے آپ کے پاس اقرار کیا تھا؟ حضورؐ نے اسے بالکل زجر و توبیخ نہ کی یہاں تک کہ خزیمہ[2] بن ثابت آئے اور انھوں نے کہا "یا رسول اللہ! میں نے اس کو اقرار کرتے ہوئے سُنا تھا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کرتا ہے اور نہ ہی کسی اور حکم کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے عام معنی مراد لینا اس لیے بھی جائز نہیں کہ اس میں ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اور واقعہ میں عموم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کو ایک خاص معاملے تک محدود رکھنا واجب ٹھہرا۔ جب اس حدیث کے راوی نے صاف کہہ دیا کہ "ھو فی الاموال" (اس کا تعلق مالیات کے ساتھ ہے) تو یہ فیصلہ مالی معاملات تک ہی محدود رہے گا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ یہ امر پیشِ نظر رہے کہ جلیل القدر صحابہ، اکثر تابعین اور فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے۔" (المنذری کا بیان ختم ہوا)

امام ابن القیمؒ "الطرق الحکمیہ" (ص ۸۲) میں لکھتے ہیں:۔

"المنذری کہتے ہیں کہ جس حدیث میں ہے کہ ایک گواہ اور قسم کی بنا پر حضورؐ نے فیصلہ فرمایا، وہ بہت سے صحابہؓ نے روایت کی ہے۔ مثلاً حضرت عمر، علی، ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر، سعد بن عُبادہ، مغیرہ بن شعبہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔ علاوہ ازیں عمرو بن حزم اور زینب بنت ثعلبہ نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ حضرت عمرؓ، علیؓ ابن ابی طالب، قاضی شُریح اور عمرؒ بن عبدالعزیز اسی حدیث کی روشنی میں مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ لیث بن سعد یحییٰ بن سعید سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں اسی معروف سنت پر عمل کیا جاتا تھا۔"

مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے بھی اس کو عام حکم قرار دے کر غیر مالی معاملات میں جاری و ساری کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی خون اور شرمگاہوں کی حلت و حرمت کے سلسلے میں زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علماءِ اصول کا جو عام قاعدہ ہے کہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خاص ہونے کا نہیں۔ یہ حدیث اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اور یہاں فقہاء نے حکم کو ایک خاص سبب کے اندر محدود کر دیا ہے۔ الفاظ کے عموم کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے عام نہیں کیا۔

اس ضمن میں اہلِ کوفہ نے باقی فقہاء سے جو اختلاف کیا ہے ان کے دلائل کے لیے فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیجیے۔ اس اختلاف کے اسباب ان شاء اللہ آگے آئیں گے۔

[1] قاضی ابن زرب ان کا نام محمد بن یُبقی بن زرب (بفتح الزاء والراء) اور کنیت ابوبکر ہے۔ یہ قُرطبہ کے جلیل القدر قاضی اور اُندُلس کے عظیم خطیب تھے۔ الحُمیدی کہتے ہیں کہ یہ عظیم فقیہ اور جلیل القدر عالم تھے۔ انھوں نے فقہ پر ایک کتاب تحریر کی جس کا نام "الخصال" ہے۔ یہ بنی عامر کی سلطنت کے آغاز میں زندہ تھے۔ انھوں نے ۳۸۱ھ میں قرطبہ میں وفات پائی جب کہ یہ وہاں کے قاضی تھے۔ دیکھیے "جذوۃ المقتبس" (ص ۹۳)، "قضاۃ اُندُلُس" (ص ۷۷)، "الدیباج" (ص ۲۶۸)، "الفہرست لابی بکر" (ص ۲۴۶)

[2] خزیمہؓ بن ثابت الانصاری اَوسی اپنے فضائل و مناقب کے لحاظ سے بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کو دو شہادتوں کے برابر قرار دیا تھا اس لیے صحابہ میں "ذوالشہادتین" کہلاتے تھے۔

ان کی شہادت قبول کی اور فرمایا :

إِنَّ شَهَادَتَهُ كَشَهَادَتَيْنِ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ — اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خزیمہ کی ایک شہادت دو شہادتوں کے برابر ہے ۔

دوسرے محدثین نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بدوی سے ایک گھوڑا خریدا تھا ۔

غزوۂ بدر اور دیگر غزوات میں شریک ہوئے ۔ فتح مکہ کے موقع پر علمبردار تھے ۔ ۳۷ھ میں جنگ صفین کے موقع پر یہ حضرت علیؓ کے ساتھی تھے ۔ جب حضرت عمارؓ بن یاسر جنگ صفین میں شہید ہو گئے تو حضرت خزیمہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا تھا " ایک باغی گروہ عمار کو قتل کرے گا " پھر تلوار نیام سے نکالی اور لڑتے لڑتے مارے گئے ۔ دیکھیے ابن عبدالبر کی " الاستیعاب " (۱ - ۱۷۴)

ابن عساکر نے اپنی " تاریخ " میں الحکم بن عُیَینہ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا کہ " کیا خزیمہؓ بن ثابت " ذوالشہادتین " نے جنگ جمل میں شرکت کی تھی ؟ " انھوں نے کہا " نہیں ! وہ خزیمہ بن ثابت دوسرے تھے ۔ " ذوالشہادتین " تو حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں انتقال کر گئے تھے ۔ "

حافظ ابن حجر " الاصابة " (۱ - ۴۲۵) میں لکھتے ہیں کہ ابن عساکر نے یہ روایت سیف صاحب الفتوح عن محمد بن عبیداللہ عن الحکم کی سند کے ساتھ نقل کی ہے ۔ مگر خطیب بغدادی " الموضح " میں اس روایت کو ضعیف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ اس بات پر علماء سیرت کا اجماع ہے کہ " ذوالشہادتین " جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی رفاقت میں لڑتے ہوئے مارے گئے تھے ۔ سیف صاحب الفتوح جب دوسروں کے خلاف روایت کرے تو اسے حجت تصور نہیں کیا جاتا ۔ "

۱؎ عبدالرزاق نے " المصنف " (۸ - ۳۶۷) میں اس واقعہ کا ایک اور سبب بیان کیا ہے ۔ وہ معمر سے روایت کرتے ہیں ۔ وہ زہری یا قتادہ سے یا دونوں سے نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی اپنے قرض کا تقاضا کرنے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میں نے تمھارا قرض ادا کر دیا ہے " یہودی نے کہا " گواہ پیش کرو ۔ " اسی اثناء میں خزیمہؓ انصاری آئے اور انھوں نے کہا " میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارا قرض ادا کر دیا ہے ۔ " آپؐ نے دریافت کیا " تمھیں کیسے معلوم ہے کہ میں نے قرض ادا کر دیا ہے ؟ " خزیمہؓ نے کہا " میں تو اس سے بڑے معاملات میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں ۔ آپؐ ہمیں آسمانی خبریں بتاتے ہیں اور میں ان کو تسلیم کرتا ہوں " چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کو دو شہادتوں کے برابر ٹھہرایا ۔

یہ روایت مرسل ہے ۔

۲؎ عبدالرزاق " المصنف " (۸ - ۳۶۶) میں اس کو ابن جریج سے اور وہ محمد بن عمارہ بن خزیمہؓ بن ثابت سے روایت کرتے ہیں ۔ ابوداؤد (۳ - ۳۰۸) کتاب " البیوع " باب إِذَا عَلِمَ الْحَاكِمُ صِدْقَ الشَّاهِدِ الْوَاحِدِ يَجُوزُ لَهُ أَنْ يَحْكُمَ بِهِ ۔ ابوداؤد یہ روایت زہری کی عمارہ بن خزیمہ سے اور وہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں ۔

وہ بدوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اُس نے انکار کر دیا۔ حضرت خُزیمہ نے اس پر شہادت دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کو تسلیم کر لیا۔ اسی بنا پر خزیمہ ذُو الشہادتین کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ ابوداؤد نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ اس میں ہے کہ زہری نے کہا "خزیمہ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی حمایت میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔"

ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ صادر کرنا امام مالک اور شافعی کے نزدیک مالی معاملات کے ساتھ مخصوص ہے۔ امام شافعی نے اس پر "العتق" (غلام آزاد کرنے کے معاملہ) کا اضافہ کیا ہے عمرو بن دینار نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کیا ہے۔ عمرو بن دینار[2] کہتے ہیں یہ مالی معاملات کے ساتھ مخصوص ہے۔

امام ابوحنیفہ کسی قسم کے معاملات میں بھی ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کرنے کو درست خیال نہیں کرتے۔[3]

یہ روایت نسائی (۷۔ ۲۰۱) نے بھی کتاب "البیوع" باب "التسهيل في ترك الإشهاد على البيع" میں اسی سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ ابن الاثیر نے جامع الاصول ۱۰۔ ۵۶۲ میں اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے ترمذی کی مخصوص علامت کا بھی ذکر کیا ہے مگر حسب عادت حدیث کے آخر میں صراحۃً ترمذی کا نام نہیں لیا۔ بلکہ ابوداؤد اور نسائی کا نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح المنذری نے بھی اس حدیث کو ترمذی کی جانب منسوب نہیں کیا بلکہ صرف نسائیؒ کا نام لیا ہے۔ اس طرح ابن الاثیر سے علامت کے سلسلے میں تسامح ہوا ہے۔

[1] اس بدوی کا نام سواء بن حارث النجاری اور بعض کے نزدیک سواء بن قیس تھا۔ درحقیقت یہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ ابن شاہین نے دونوں کو الگ الگ اشخاص قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ ابن الاثیر نے "أسد الغابة" (۲۔ ۳۷۳، ۳۷۴) میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ حافظ ابن حجر نے "الاصابة" میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، البتہ انھوں نے یہ واقعہ بیان نہیں کیا۔ اس کے برعکس ابن الاثیر نے اس کے تعارف کے سلسلے میں اونٹ کے سودے کا ذکر کیا ہے۔

[2] عمرو بن دینار المکی ابو محمد الاثرم الجُمحی عظیم ائمہ میں سے تھے۔ یہ اپنے عہد میں مکہ کے مفتی تھے۔ صحابہ کی ایک جماعت سے انھوں نے روایت کی ہے۔ سنہ ۱۲۶ھ میں وفات پائی۔ سب محدثین ان سے روایت کرتے ہیں۔ (دیکھیے "تهذيب التهذيب" (۸۔ ۲۸، ۲۹)

[3] اس مسئلہ میں اختلاف کی وجہ دلائل کا اختلاف ہے۔ جو اہل علم ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں۔ وہ مندرجہ بالا حدیث اور اس مضمون کی دوسری احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ احادیث حضرات ابوہریرہ، زید بن ثابت، جابر، علی، عمارہ بن حزم، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن عمرو ابن العاص اور مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں:-

"اس سلسلے میں صحیح ترین حدیث عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس کی سند نقد و جرح سے بالا ہے اور اہل علم اس کی صحت کے بارے میں متفق ہیں۔

ابوہریرہؓ، جابرؓ اور دیگر صحابہ کی مرویات حسن کے درجہ کی ہیں۔"

(بقیہ حاشیہ)

امام نوویؒ صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"امام ابوحنیفہؒ اور ان کی رائے سے اتفاق کرنے والے فقہاء مثلاً سفیان ثوری، اوزاعی اور دیگر اہل عراق اور مالکیہ میں سے کیبث اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں:۔

فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (البقرۃ - ۲۸۲)	اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ پسند کرو۔

یہ آیت حصر کی مقتضی ہے۔ اس پر اضافہ کرنا نسخ کا حکم رکھتا ہے۔ اور قرآن کو صرف سنت متواترہ ہی کے ذریعے منسوخ ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مزید براں وہ اشعث بن قیس کی روایت کردہ حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اشعث بیان کرتے ہیں کہ میرے اور ایک شخص کے درمیان کسی معاملے میں جھگڑا تھا۔ ہم دونوں نے اپنا معاملہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا "مدعی دو گواہ پیش کرے ورنہ مدعا علیہ حلف اٹھائے گا"۔ میں نے عرض کیا حضورؐ! وہ شخص تو فوراً حلف اٹھا لے گا؟ آپ نے فرمایا "جو شخص کسی کا مال ہڑپ کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھائے گا تو وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس سے ناراض ہوگا"۔

یہ حدیث صحیح بخاری کتاب "الشہادات" باب "الْيَمِينُ عَلَى الْمُدَّعَى عَلَيْهِ فِي الْأَمْوَالِ وَالْحُدُودِ" میں مروی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۔ ۲۶۷)

امام ابوحنیفہؒ اور ان سے اتفاق کرنے والے حضرات، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ عباس الدوری یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حدیث محفوظ نہیں ہے۔ طحاوی نے اس حدیث کو اس لیے معلل کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم عمرو بن دینار سے روایت کرنے والا قیس نامی شخص کون ہے؟ امام ترمذی العلل میں کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد امام محمد بن اسماعیل بخاری سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا "یہ حدیث عمرو نے ابن عباسؓ سے نہیں سنی"۔ بعض حفاظ حدیث نے عمروؒ اور ابن عباسؓ کے درمیان طاؤس کو داخل کیا ہے۔ چنانچہ دارقطنی نے یہ حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔ اور بعض محدثین نے اس کی سند میں جابر بن زید کا اضافہ کیا ہے۔

اسی لیے زبیدی کہتے ہیں کہ ابن عبدالبرؒ کا یہ قول کہ "اس حدیث کی سند پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا" محل نظر ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ نے اس حدیث کو معمول بہ نہیں بنایا۔ اس کے برعکس انھوں نے قرآن کی ظاہری نص پر عمل کیا ہے۔

(عقود الجواہر المنیفہ ج ۲ ص ۲۷)

کیفیتِ حلف کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

ابوداؤد[1] نے مسدد سے، اس نے ابوالاحوص سے، اس نے عطاء بن السائب سے، اس نے ابویحیٰی سے، اور اس نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے ان الفاظ میں حلف لیا۔ میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اس کی کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے۔"

امام مالک بن انس اسی کے قائل ہیں[2]۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کی بھی یہی رائے ہے۔ ہاں اگر قاضی حلف

---

[1] ابوداؤد (۳۰۴۰/۳۱) کتاب "القضاء" باب "كَيْفَ الْيَمِيْن" - ابوداؤد کہتے ہیں کہ ابویحیٰی کا نام زیاد کوفی ہے۔ وہ ثقہ راوی ہے۔
امام ابن حزمؒ اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔
"یہ حدیث دو وجہ سے ساقط الاعتبار ہے۔ ایک اس لیے کہ اس کی سند میں ابویحیٰی اعرج ہے جو غالی شیعہ تھا ——————
—————— اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ابوالاحوص نے عطاء بن السائب سے حدیثیں اس وقت سنیں جب عطاء کا حافظہ خراب ہوگیا تھا۔ عطاء کی صحت کے زمانہ میں ان سے سفیان، شعبہ اور حماد بن زید نے استفادہ کیا تھا۔ دیکھیے "المحلّیٰ" (۱۰ - ۳۵۴)۔

المنذری نے عطاء کی وجہ سے اس حدیث کو معلّل ٹھہرایا ہے۔ انھوں نے صرف یہ کہا ہے کہ "فیہ مقال" امام بخاریؒ نے بھی عطاء سے ایک حدیث روایت کی ہے مگر اس میں عطاء کے ساتھ ابوبشر بھی شریک ہے۔" (اقتباس ختم ہوا)

حافظ ابن حجر کہتے ہیں:۔
"عطاء بن السائب کی کنیت ابومحمد یا ابوالسائب الثقفی الکوفی ہے۔ صادق القول ہے۔ طبقہ خامسہ کے راویوں میں شمار ہوتا ہے۔ آخر میں اس کا حافظہ خراب ہوگیا تھا۔"

[2] اس لیے کہ حلف کے ان الفاظ سے مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل حضرت عمرؓ کی یہ روایت ہے کہ انھوں نے حضرت اُبیؓ کو یقین دلانے کے لیے حلف اٹھایا تھا: "مجھے اس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ کھجور کے یہ درخت میری ملکیت ہیں۔ اور اُبیؓ کا ان کے ساتھ کچھ تعلق نہیں ہے۔"
ابن المنذر کہا کرتے تھے کہ ابن عباسؓ کی روایت میں حلف کے جو الفاظ ہیں وہ مجھے زیادہ پسند ہیں۔

[3] احناف کے نزدیک حلف کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تفصیلات ملحوظ ہیں:۔
۱۔ قاضی کو حلف کے الفاظ کو سخت یا نرم کرنے کا اختیار ہے۔

اٹھانے والے پر اعتماد نہ کرتا ہو تو وہ حلف کے الفاظ میں مزید شدت پیدا کر سکتا ہے۔ مثلاً وہ کہے کہ تم یوں حلف اٹھاؤ: "میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ وہ رحم کرنے والا نہایت مہربان ہے۔ وہ طالب اور غالب ہے۔ وہ پوشیدہ اسرار سے بھی آگاہ ہے اور ظاہر سے بھی"۔

امام شافعی اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ حلف کے الفاظ یہ ہونے چاہئیں کہ میں اس خدا کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ظاہر، باطن کو جاننے والا ہے۔ وہ رحم کرنے والا مہربان ہے اور راز کی باتیں بھی جانتا ہے اور علانیہ بھی۔

اہل علم کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ صرف اتنا کافی ہے کہ وہ کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔ امام بخاریؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ انھوں نے صحیح بخاری میں مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے جو لعان کرنے والوں کی قسم کے بارے میں وارد ہوئی ہے:

فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ — تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار خدا کی

۲۔ بعض مشائخ حنفیہ کہتے ہیں کہ حلف اٹھانے والے کی حالت کو پیش نظر رکھا جائے۔ اگر وہ ایسا شخص ہے جس سے جھوٹی قسم کھانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تو اس سے سادہ الفاظ میں قسم لی جائے گی۔ اگر ایسی جرأت اس سے کچھ بعید نہیں تو اس سے سخت الفاظ میں حلف لیا جائے گا اس لیے کہ عوام میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جھوٹی قسم کھانے سے زیادہ احتراز نہیں کرتے۔ لیکن قسم کے الفاظ کو اگر سخت بنا دیا جائے تو وہ قسم کھانے سے باز رہتے ہیں۔

۳۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ جس مال کے بارے میں جھگڑا ہو وہ اگر کم ہو تو اس میں سادہ حلف لینا کافی تصور کیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ زیادہ ہو تو حلف کے الفاظ کو زیادہ مؤکد بنا دیا جائے۔ ("بدائع الصنائع" ۶-۲۲۷)

لہ امام شافعی کے ساتھیوں کے نزدیک ان الفاظ میں حلف اٹھانا صرف مستحب ہے۔ ابو اسحاق "المھذب" میں کہتے ہیں کہ قسم کے الفاظ میں تاکید پیدا کرنا مستحب ہے۔ اس کے بعد وہ حلف کے الفاظ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس تاکید کی وجہ یہ ہے کہ قسم کا مقصد دروغ گوئی سے باز رکھنا ہے۔ اور یہ الفاظ جھوٹ بولنے کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں، تاہم اگر کوئی شخص "واللہ" (خدا کی قسم) کے الفاظ پر اکتفا کرے تو جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رکانہ سے حلف لیا تھا تو آپؐ نے "واللہ" پر اکتفا کیا تھا۔ ("المجموع" ۱۸-۴۵۳)

ابوالخطاب کہتے ہیں کہ امام احمدؒ بن حنبل فرماتے ہیں کہ قسم لینے والا حاکم اگر چاہے تو قسم کے الفاظ میں شدت پیدا کر سکتا ہے۔ المیمونی کی روایت میں امام موصوف نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ("المغنی" ۱۰-۲۹۲)

اس ضمن میں اصول یہ ہے کہ حلف کے الفاظ سخت یا نرم ہونے کا انحصار اس معاملہ کی نوعیت پر ہے جس کے بارے میں حلف لیا جا رہا ہے۔ اگر معاملہ کا تعلق انسانی جان یا عصمت یا بہت زیادہ مال کے ساتھ ہو تو قسم کے الفاظ میں شدت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ شدت زمان و مکان کے لحاظ سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے (مثلاً حلف مسجد میں یا ماہ رمضان میں لیا جائے۔ مترجم) اور اگر معاملہ کا تعلق تھوڑے مال سے ہو تو شدت کی ضرورت نہیں، بلکہ قسم کے سادہ الفاظ ہی کافی ہیں۔ اسی لیے فقہاء کے یہاں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ محض اس ضمن میں ہے کہ افضل طریق کار کون سا ہے۔

لَمِنَ الصَّادِقِيْنَ (النور-۶) قسم کھائے کہ بے شک وہ سچا ہے۔

حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلَا يَحْلِفُ" (قسم کھانے والے کو چاہیے کہ وہ قسم نہ کھائے) اور دوسری روایت میں ہے کہ جو شخص قسم کھانا چاہے اسے چاہیے کہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک غلام کسی کے پاس اس شرط کے ساتھ فروخت کیا کہ اس میں کوئی عیب یا بیماری نہیں۔ مشتری نے کہا غلام میں ایک بیماری پائی جاتی ہے جس کا ذکر حضرت عبداللہؓ نے فروخت کرتے وقت نہیں کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا کہ ابن عمرؓ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ جب غلام فروخت کیا تھا تو یہ بیماری ان کے علم میں نہ تھی۔ ابن عمرؓ نے قسم کھانے سے انکار کیا اور وہ غلام واپس لے لیا۔ اس کے بعد انھوں نے وہ غلام پہلے کی نسبت زیادہ قیمت میں فروخت کیا۔

صحیح مسلم میں حضرت براءؓ بن عازب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک یہودی گزرا جس کا منہ سیاہ کر کے اس کو کوڑے مارے گئے تھے۔ آپؐ نے یہودیوں کو بلا کر پوچھا: "هٰكَذَا تَجِدُوْنَ حَدَّ الزَّانِيْ فِيْ كِتَابِكُمْ"

لے صحیح بخاری کتاب "الشهادات" باب "كَيْفَ يُسْتَحْلَفُ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۶۷۹)
صحیح مسلم (۳-۱۲۶۷) کتاب "الأيمان" باب "النَّهْيُ عَنِ الْحَلْفِ لِغَيْرِ اللهِ" عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ عمرؓ اپنے باپ کی قسم کھا رہے ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ باپ دادا کی قسمیں کھانے سے منع کرتا ہے۔ جو شخص قسم کھانا چاہے وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے۔"
یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور امام مالکؒ نے موطا میں مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے۔ (جامع الاصول ۱۱-۲۹۴)

لے عبدالرزاق نے مصنف (۸-۱۶۲-۱۶۳) میں یہ حدیث متعدد طرق سے روایت کی ہے ان میں ایک طریقہ امام مالک کے واسطے بھی ہے جو موطا (۲-۶۰۸) کتاب "البيوع" باب "العيب في الرقيق" میں مذکور ہے اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ عبداللہؓ بن عمرؓ نے پہلے یہ غلام تین سو درہم میں فروخت کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک ہزار پانچ سو درہم میں بیچا۔
البیہقی (۵-۳۲۸) نے یہ حدیث اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں امام شافعی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو ایک غلام یا کوئی حیوان اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ اس میں کوئی عیب یا بیماری نہیں۔
امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں ہم نے وہی موقف اختیار کیا ہے جو حضرت عثمانؓ نے کیا تھا۔ وہ موقف یہ ہے کہ جو عیب بائع کو معلوم نہ ہو اس سے تو وہ بری الذمہ ہے، البتہ جو عیب اسے معلوم ہوا اور فروخت کرتے وقت اس نے بتایا نہ ہو اس سے وہ بری الذمہ نہ ہوگا۔

لے صحیح مسلم (۳-۱۳۲۷) کتاب "الحدود" باب "رَجْمُ الْيَهُوْدِيِّ"۔
اس معاملے کا تعلق اہل ذمہ سے ہے۔ جمہور اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اہل ذمہ سے مؤکد الفاظ میں قسم لی جائے۔ اگر یہودی ہو تو اس کی قسم کا وہی طریقہ ہے جو صحیح مسلم کی روایت میں ہے۔ اور اگر نصرانی یا مجوسی ہو تو اس کی قسم کا طریقہ آگے آرہا ہے۔ اور اگر بت پرست ہو اور اللہ کی عبادت نہ کرتا ہو تو اس سے مجوسی کی طرح قسم لی جائے، البتہ غیر اللہ کی قسم نہ لی جائے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جو شخص قسم کھانا چاہے وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے۔"

(تمھاری کتاب (تورات) میں زانی کے لیے یہی حد ہے؟)

انھوں نے کہا "جی ہاں"! پھر آپ نے یہودی علماء میں سے ایک کو بلایا اور کہا "میں تجھے اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو موسیٰ پر نازل فرمایا کیا تمھاری کتاب میں زانی کے لیے یہی سزا ہے؟" اس نے کہا "نہیں، اگر آپ مجھے قسم نہ دیتے تو میں ہرگز آپ کو یہ بات نہ بتاتا۔ ہماری کتاب میں زانی کے لیے رجم کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ پھر باقی حدیث بیان کی۔"

سنن ابوداؤد میں محمد بن عبدالاعلیٰ، از سعید بن ابی عروبہ، از قتادہ، از عکرمہ کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صوریا (ایک یہودی عالم) سے فرمایا۔ "میں تمھیں اللہ کی ذات یاد دلا کر قسم دیتا ہوں جس نے تمھیں فرعون سے نجات دلائی، سمندر کے پانی کو تمھارے لیے پھاڑ دیا۔ بادل سے تم پر سایہ کیا۔ تم پر من وسلویٰ نازل کیا اور موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری۔ یہ بتاؤ کہ تمھاری کتاب (تورات) میں یہ سزا موجود ہے؟"

ابن صوریا نے کہا۔ "آپ نے مجھے ایک عظیم ذات کی یاد دلا کر قسم دی ہے۔ اس لیے اب مجھے دروغ گوئی سے کام نہیں لینا چاہیے" (تا آخر)

امام مالکؒ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں اگر مقصد قسم میں تاکید پیدا کرنا ہو تو یوں کہے۔ "میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

امام شافعیؒ اور ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہودی سے اس ذات کی قسم لی جائے جس نے حضرت موسیٰ پر تورات نازل کی نصرانی کو اس اللہ کی قسم دی جائے جس نے حضرت عیسیٰ پر انجیل اتاری۔ اور مجوسی کو اس اللہ کی جس نے آگ کو پیدا کیا۔

اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ حدود اللہ میں قسم نہ لی جائے۔

مصنف عبدالرزاق میں معمر سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے زہری اور حماد بن ابی سلیمان سے "قاذف (کسی پر زنا کی تہمت لگانے والا) کے بارے میں دریافت کیا۔ زہری نے کہا کہ اس سے حلف لیا جائے۔ جب کہ حماد کی رائے یہ تھی کہ اس سے حلف نہ لیا جائے۔ معمر کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ شہادت کی عدم موجودگی میں قاذف سے حلف لیا کرتے تھے اور عبدالرزاق اسی بات سے استدلال کرتے ہیں۔

لہ ابوداؤد (۳۱۴-۳۱۳/۳) کتاب "الاقضیۃ" باب "کَیْفَ یَحْلِفُ الذِّمِّیُّ" یہ حدیث مرسل ہے۔ اس پر ابوداؤد اور منذری نے سکوت اختیار کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ اس کی تائید دوسری حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے (۱۵۵-۴) کتاب الحدود میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "میں تمھیں اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی کہ یہ بتاؤ کہ تورات میں شادی شدہ زانی کے لیے کون سی سزا مقرر کی گئی ہے؟ مگر اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے۔ اس لیے کہ زہری کہتے ہیں کہ یہ حدیث قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے اس وقت بتائی جب کہ ہم سعید بن المسیبؒ کے پاس تھے اس شخص نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی روایت کی۔

لہ اس کتاب کے تمام نسخوں میں "محمد بن عبدالاعلیٰ" لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ صحیح یوں ہے کہ محمد بن المثنیٰؒ نے کہا کہ ہمیں عبدالاعلیٰ نے بتایا ہے۔

بنجر اراضی کی آبادی اور پانی کی تقسیم وغیرہ امور کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

سنن ابوداؤد[۱] اور صحیح بخاری[۲] میں صحیح حدیث ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَحْيَا اَرْضًا مَيْتَةً لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهِيَ لَهُ۔ — جو شخص ایسی بنجر زمین کو آباد کرے جو کسی کی ملکیت نہ ہو تو وہ آباد کرنے والے کی ملکیت ہوگی۔

صحیح بخاری[۳] میں یہ اضافہ ہے کہ "ایسی زمین جو کسی مسلمان کی ملکیت نہ ہو۔"

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"جو شخص ایسی بنجر زمین کو آباد کرے جس کا مالک کوئی نہ ہو تو وہ اسی کی ہوگی۔ اور جو شخص مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی زمین

---

[۱] ابوداؤد (۳ - ۱۷۸) کتاب "الامارۃ" باب "فِی اِحْیَاءِ الْمَوَاتِ" بروایت سعید بن زید۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "جو شخص بنجر زمین آباد کرے تو وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔" اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ظلم کرنے والے کو کوئی حق حاصل نہیں۔"

ترمذی (۳ - ۶۶۲) کتاب "الاحکام" باب "مَا ذُكِرَ فِی اِحْیَاءِ اَرْضِ الْمَوَاتِ" بروایت سعید بن زید و جابر بن عبداللہ۔ حضرت جابرؓ کی روایت میں وہ اضافہ نہیں ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مؤطا امام مالک (۲ - ۱۲۰) میں یہ ہشام بن عروہ عن عروہ کی سند کے ساتھ مرسل روایت کی گئی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس مرسل کو اس لیے صحیح قرار دیا ہے کہ عروہ سے روایت کرنے والوں کی سندوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، مگر ابن عبدالبر کا یہ قول محلِ نظر ہے کیوں کہ محدثین نے ہشام عن عروہ عن سعید بن زید کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

[۲] صحیح بخاری کتاب "الحرث" باب "مَنْ اَحْيَا اَرْضًا مَوَاتًا" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۳۳۵) بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے عہدِ خلافت میں اسی پر عمل کیا کرتے تھے۔

مؤطا امام مالک (۲ - ۱۰۲) کتاب "الاقضیۃ" باب "اَلْقَضَاءِ فِی عِمَارَۃِ الْمَوَاتِ" بروایت عبداللہ بن عمرؓ کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "جو شخص بنجر اراضی کو آباد کرے گا وہ اسی کی ہوگی۔" نیز کتاب "الاموال لِاَبِی عُبَیْد" ص ۳۰۴۔

[۳] صحیح بخاری کتاب "الحرث" باب مذکور میں یہ حدیث بلا سند روایت کی گئی ہے۔ اسحاق بن راہویہ نے یہ حدیث متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ یہ حدیث ابوعامر العقدی عن کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ کثیر اپنے والد عبداللہ سے اور وہ اپنے والد عمروؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا تا آخر (فتح الباری ۵ - ۱۹)۔ بیہقی (۶ - ۱۴۲)، یحییٰ بن آدم کتاب الخراج (ص ۸۸) اور طحاوی "شرح معانی الآثار" (۲ - ۱۵۲) میں یہ حدیث متصل سند کے

میں تصرف یا محنت کرے تو اس کا اس پر کوئی حق نہیں ہے[۱]"

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ فیصلہ اس زمین کے بارے میں ہے جو صحرا میں ہو۔ باقی رہی وہ زمین جو آبادی کے قریب ہو تو اسے حکومت کی اجازت کے بغیر آباد نہیں کیا جا سکتا۔[۲]

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ حکومتِ وقت کی اجازت کے بغیر افتادہ زمین آباد نہیں کی جا سکتی چاہے وہ زمین آبادی کے قریب

ساتھ روایت کرتے ہیں سب کی سند میں کثیر بن عبداللہ موجود ہے جو کہ ضعیف راوی ہے۔ اس کا تعارف اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

۱؎ "ولیس لعرق ظالم حق" امام مالکؒ موطا میں فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مملوکہ اراضی میں کنواں کھودا جائے یا درخت کاشت کیا جائے یا کسی طرح سے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے۔" ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ ذکر کرتے ہیں کہ ہشام نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی زیرِ ملکیت زمین میں اس لیے کام کرے کہ اپنے آپ کو ایسی چیز کا مستحق ثابت کرے جو اس کی ملکیت نہیں ہے۔"

ابوعُبیدؒ نے کتاب "الاموال" میں اور یحییٰ بن آدم نے "کتاب الخراج" میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں:-

"اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی زمین میں درخت کاشت کرے تاکہ وہ اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر سکے۔ اسی طرح کسی دوسرے کی زمین میں عمارت تعمیر کرنا، حوض یا کنواں کھودنا، کان نکالنا سب اسی حکم میں داخل ہیں۔ اس کو عرق (رگ) اس لیے کہا گیا ہے کہ آباد کرنے کے اعتبار سے یہ گھوڑے کی رگ اور نسل کے مماثل ہے جو گھوڑے سے اگلی پشتوں تک چلتی ہے۔

۲؎ زرقانی شرح الموطا (۴-۲۵۰) میں کہتے ہیں کہ اشہب اور ہمارے بہت سے دوسرے مالکیوں کے نزدیک ہر شخص حکومت کی اجازت کے بغیر زمین آباد کرنے کا مجاز ہے۔ یہ بات سحنون نے کہی ہے۔

۳؎ امام ابوحنیفہؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی سے استدلال کرتے ہیں کہ آدمی صرف وہی چیز لے سکتا ہے جس کے لینے کی اجازت حکومتِ وقت دے۔" (شرح فتح القدیر ۸-۱۳۶)

مگر صاحبین کی رائے اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص بنجر زمین آباد کرے وہ اسی کی ہے"۔ تو اس میں حکومت کی اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شواہد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دیکھیے سمندروں اور دریاؤں میں جو پانی ہے اسے جو شخص لے لے وہ اس کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ حکومتِ وقت نے اس کو اس کی اجازت نہ بھی دی ہو۔ اسی طرح جو شخص شکار کرتا ہے وہ اس کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں قطعاً حکومت کی اجازت یا تملیک کی ضرورت نہیں، بلکہ اس سلسلے میں حکومت اور عوام مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

صاحبین فرماتے ہیں جس زمین کا کوئی مالک نہ ہو اس کی حیثیت اس پرندے کی سی ہے جو کسی کی ملکیت نہیں۔ جو شخص بھی اس کو پکڑ لے گا وہی اس کا مالک ہو گا اور اس میں حکومت کی اجازت کی اسی طرح ضرورت نہ ہو گی جس طرح پانی اور شکار کی ملکیت کے لیے سلطانِ وقت کی اجازت کی شرط نہیں ہے۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی ۲-۱۵۲)

ہو یا اس سے دُور۔

امام شافعیؒ[1] فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیہ آپ کے بعد آنے والی حکومتوں کے عطیے سے زیادہ معتبر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ زمین آبادی سے قریب ہو یا دُور۔

ابوعُبیدؒ کی کتاب[2] الاموال میں ہے کہ اس حدیث کے راوی نے کہا۔ میں نے قبیلۂ بنو بیاضہ کے دو شخصوں کو دیکھا جنھوں نے

---

[1] امام شافعیؒ کتاب الاُمّ (۴-۴۳) میں فرماتے ہیں :-

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیہ بعد میں آنے والی حکومتوں یا لوگوں کے عطیوں کی نسبت مقدم ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں :-

اسلامی علاقوں کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) آباد (۲) غیر آباد۔ جہاں تک آباد شہروں کا تعلق ہے وہاں کے رہنے والے ہر اس چیز کے مالک ہیں جن سے آبادی بڑھتی اور ترقی پذیر ہوتی ہے۔ مثلاً راستہ، صحن، پانی کی گزرگاہ وغیرہ۔ اور وہاں کے رہنے والوں کی اجازت کے بغیر کوئی شخص ان کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

" الموات" بنجر اور غیر آباد زمین کو کہتے ہیں۔ اس کا نام میتۃ، مَوَات اور مَوتانًا یا مُوتان (بفم المیم وسکون الواؤ) بھی ہے۔ المُوتان۔ بار بار اور کثرت سے واقع ہونے والی موت کو کہا جاتا ہے۔ عربی محاورہ میں بولتے ہیں "رَجُلٌ مَوْتَانُ القلبِ" (مُردہ دِل آدمی) یعنی بے بصیرت اور احمق شخص۔

پھر بنجر زمین کی دو قسمیں ہیں :-

۱- ایک قسم وہ ہے جو کسی ایسے شخص کی ملکیت ہو جس کا مسلمان ہونا معروف و معلوم ہو اور وہ پہلے آباد رہی ہو اور پھر بنجر ہو جائے تو آباد زمین کی طرح اس کا مالک وہی شخص ہوگا جس کی وہ ملکیت تھی یا وہ شخص جس کو مالک اس کی ملکیت کی اجازت دے دے۔

۲- دوسری قسم کی بنجر زمین وہ ہے جس کا کوئی مسلمان مالک معلوم و معروف نہ ہو۔ دورِ جاہلیت میں بھی وہ پہلے آباد رہی ہو۔ یا کسی کی ملکیت نہ رہی ہو اور یہی وہ بنجر زمین ہے جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا "جو شخص بنجر زمین کو آباد کرے وہی اس کا مالک ہے۔ دیکھیے "المجموع" (۴ا-۴۵۸)

[2] کتاب الاموال (ص ۴۰۴) عُروہؒ کہتے ہیں کہ مجھے اس شخص نے بتایا جس نے مجھے یہ حدیث سنائی تھی۔ ابوداؤد میں بھی اسی طرح ہے۔ اس بات سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ عُروہؓ نے یہ حدیث بھی کسی صحابی سے سنی، اور یہ قصہ بھی، اور جہاں تک اس میں صحابی کے نام کا ذکر نہ ہونے کا تعلق ہے، تو صحابی کا غیر معروف ہونا حدیث کی قبولیت کے لحاظ سے نقصان دہ نہیں ہے، لہٰذا یہ حدیث متصل ہے مرسل نہیں ہے۔

ابوداؤد نے بھی یہ حدیث احمد بن سعید الدارمی سے، اس نے وہب بن جُریر بن حازم سے، اس نے اپنے والد سے اور اس نے ابن اسحاق سے اسی سند اور مفہوم کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اصحاب رسولؐ میں سے ایک نے کہا "میں نے اس شخص کو دیکھا کہ کھجور کے درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا چلا رہا تھا" اس بات میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ عُروہؓ نے یہ حدیث صحابی سے سُنی تھی۔ شیخ احمد شاکر نے یحیٰی ابن آدم کی کتاب الخراج (ص ۸۳، ۸۴) کے حاشیہ پر اسی طرح لکھا ہے۔

ایک زمین کے بارے میں اپنا مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ زمین ایک شخص کی ملکیت تھی۔ دوسرے نے اس میں کھجور کے درخت لگائے تھے۔ حضورؐ نے فیصلہ کیا کہ زمین کا مالک تو زمین لے لے اور جس نے کھجور کے درخت لگائے تھے وہ اپنے درخت اکھاڑ لے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے خود دیکھا کہ کھجور کے بلیے بڑھے ہوئے درختوں کی جڑوں کو کلہاڑوں سے کاٹا جا رہا تھا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں "عرقِ ظالم" سے مراد یہ ہے کہ کسی اور کی زمین میں بلا اجازت عمارت تعمیر کی جائے یا درخت بو یا جائے"۔

ربیعہ فرماتے ہیں:۔

"عروق چار ہوتے ہیں۔ دو ظاہری اور دو باطنی۔ دو ظاہری عرق تو عمارت اور درخت ہیں۔ اور دو باطنی عرق سے مراد پانی اور کانیں ہیں"۔

مؤطا امام مالک میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی مہزور اور وادی مذینب کے بارے میں فرمایا کہ ان کا پانی کھیت میں یہاں تک روکا جائے کہ ٹخنوں تک پہنچ جائے۔ پھر اوپر والے کھیت سے نیچے والے کھیت میں پانی چھوڑ دیا جائے۔ ابن حبیبؒ

له مؤطا امام مالک (۲-۱۲۱) کتاب "الاقضیۃ" باب "القضا فی المیاہ" بروایت عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (تا آخر)

زرقانی شرح مؤطا (۴-۲۲۶) میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ حدیث کسی سند کے ساتھ بھی متصل ہو۔ حالانکہ یہ حدیث اہلِ مدینہ سے مروی اور ان کے یہاں مستعمل، معروف اور معمول بہ ہے۔ ابوبکرؒ البزار سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا: اس بارے میں ان الفاظ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں:

اس کے بعد زرقانیؒ کہتے ہیں کہ یہ بات کوتاہی اور کم علمی پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ دارقطنی نے الغرائب میں یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اسی طرح حاکمؒ نے "المستدرک" میں اس کو روایت کیا ہے۔ دارقطنیؒ اور حاکمؒ دونوں اس کو صحیح حدیث قرار دیتے ہیں۔ نیز دیکھیے ابوداؤد (۳-۳۱۶) کتاب "الاقضیۃ" باب "فی القضاء" ابن ماجہ (۲-۸۳۰) بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ" (زرقانی کی بات ختم ہوئی)

المنذریؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث عمروؒ بن شعیب سے عبدالرحمٰن بن حارث مخزومی نے روایت کی ہے اور امام احمدؒ نے عبدالرحمٰن پر نقد و جرح کی ہے۔

سه عیسٰی بن دینار اور سحنونؒ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سحنونؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ دونوں وادیاں کسی کی ملکیت نہ تھیں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور انصاری دونوں سیلاب کے پانی سے اپنے کھیتوں کو سیراب کرتے تھے۔ جب سیلاب کا پانی آتا تو پہلے وہ شخص اپنے باغ کو سیراب کرتا جو بالائی جانب ہوتا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ شخص جس کا باغ اس کے قریب ہوتا تھا۔

(المنتقی للباجی (۶-۳۳)

کہتے ہیں کہ مہزور اور مذینب مدینہ کی دو وادیوں کا نام ہے۔

صحیح بخاری میں عروہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ حضرت زبیرؓ کا حرہ کے پانی کی نالیوں کے بارے میں ایک انصاری کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زبیر! پہلے تم اپنے کھیت کو سیراب کرو پھر پانی اپنے پڑوسی کی جانب چھوڑ دو۔"

انصاری نے کہا: "یہ فیصلہ آپؐ نے اس لیے کیا کہ زبیر آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں"۔ یہ سن کر حضورؐ کا رنگ بدل گیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

"زبیر! اپنے کھیت کو خوب سیراب کرو۔ پھر پانی کو روکے رکھو۔ یہاں تک کہ کھیت کے کناروں تک پہنچنے لگے۔ اس کے بعد پانی کو اپنے پڑوسی (کے کھیت) کی طرف جانے دو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب انصاری نے حضورؐ کے بارے میں ناروا بات کہی تو آپ نے زبیرؓ کو اپنا پورا حق وصول کرنے کا حکم دیا۔ جبکہ اس سے پہلے آپؐ نے جو حکم دیا تھا اس میں دونوں کے لیے زیادہ وسعت تھی۔

حضرت زبیر کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ اسی واقعہ میں نازل ہوئی:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ (النساء - ۶۵)

نہیں۔ تیرے رب کی قسم وہ اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے جب تک آپ کو اپنے معاملات میں حکم نہ بنائیں جو ان میں رونما ہوا۔

ابن شہابؒ زہری کہتے ہیں کہ اس انصاری نے اور دوسرے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے بعد پانی کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ کھیت میں ٹخنوں تک پہنچ گیا تھا۔

لہ صحیح بخاری کتاب "المساقاۃ" باب "سکر الانهار" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۳۶۰) یہ حدیث امام مسلمؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ نے بھی روایت کی ہے۔

ٹہ ابوالحسن بن مغیث کہتے ہیں کہ اس کا نام ثابت بن قیس بن شماس تھا۔ اکثر مفسرین، جن میں النقاش، مکی اور المہدوی شامل ہیں، کہتے ہیں کہ وہ حاطبؓ بن ابی بلتعہ مہاجر تھے۔ العراقی نے اپنی کتاب "المستفاد" (ص ۹۰) میں بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

تہ بخاریؒ نے یہ حدیث کئی مقامات پر روایت کی ہے۔ جن میں سے ایک کا ذکر ابھی اوپر کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث صحیح بخاری باب "شُرْبِ الْأَعْلَىٰ قَبْلَ الْأَسْفَلِ" باب "شُرْبِ الْأَعْلَىٰ إِلَى الْكَعْبَيْنِ" باب "الصلح" اور باب "إِذَا أَشَارَ الْإِمَامُ بِالصُّلْحِ فَأَبَىٰ حَكَمَ عَلَيْهِ بِالْحُكْمِ الْبَيِّنِ" میں بھی روایت کی گئی ہے۔

امام مالکؒ کے ساتھیوں نے اس حدیث کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ ابن حبیبؒ نے، ابن وہبؒ، مطرف اور ابن الماجشونؒ سے روایت کی ہے کہ جس شخص کا باغ بالائی جانب ہو وہ سارا پانی اپنے باغ میں چھوڑ دے اور اسے خوب اچھی طرح سیراب کرے۔

"المستخرجة" کتاب "الجامع" میں ہے کہ ابنؒ القاسم نے امام مالکؒ سے سنا ــــ وہ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے سوال کیا گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی مُہزور اور مُذَینب کے بارے میں فیصلہ کیا تھا تو کیا ان دنوں ان میں کھجور کے درخت تھے؟ ــــ تو امام مالکؒ نے اثبات میں جواب دیا۔

مؤطا میں یحییٰ امام مالکؒ سے اور وہ ابن شہاب زُہری سے روایت کرتے ہیں۔ زُہری حرام بن سعد بن مُحیصہ سے نقل کرتے ہیں:

حتیٰ کہ پانی باغ میں کھڑے ہونے والے کے ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اسے بند کر دے۔ ابن کنانہ کہتے ہیں جب سیلاب میں اپنی کھیتی سیراب کرنا مقصود ہو تو پانی کو کھیت میں چھوڑ دے حتیٰ کہ پانی جوتے کے تسمہ تک پہنچ جائے۔ اور جب کھجوروں، درختوں اور جڑ دار پودوں کو سیراب کرنا چاہے تو پانی کو اس وقت تک روکے رکھے جب تک ٹخنوں تک نہ پہنچ جائے۔ یہ بات ہمیں زیادہ پسند ہے کہ کھیتی، کھجور کے درختوں اور جڑ دار پودوں کو اس حد تک سیراب کرے کہ پانی ٹخنوں تک پہنچ جائے۔ کیوں کہ اس طرح درخت اچھی طرح سیراب ہو جاتے ہیں۔ (المنتقی للباجی (۶-۴۴)

کھیتی کو سیراب کرتے وقت پانی کے تھوڑے یا زیادہ ہونے کا فیصلہ دراصل کھیتی باڑی کرنے والوں کی رائے پر موقوف ہے۔ اس لیے کہ وہ طویل تجربہ کی بنا پر ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔

لہ مؤطا امام مالک (۲-۱۲۳) کتاب "الاقضیۃ" باب "فی الضواری والحریسۃ"۔

ابوداؤد (۳-۲۹۸) کتاب "البیوع" باب "المواشی تفسد زرع قوم" بروایت حرام ابن مُحیصہ۔ ایک دوسری روایت میں وہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:

"دن کے وقت کھیتی اور باغ کی حفاظت ان کے مالکوں کے ذمے ہے۔ اور مویشیوں کے مالک رات کو ان کی حفاظت کے ذمے دار ہیں"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"دن کے وقت باغات کی حفاظت ان کے مالکوں پر ہے۔ اسی طرح رات کے وقت مویشیوں کی نگہداشت ان کے مالکوں کی ذمہ داری ہے۔ اگر مویشی رات کے وقت کوئی نقصان کر دیں تو ان کے مالک اس کے ضامن ہیں"

حرام بن سعد بن مُحیصہ ثقہ تابعی ہیں۔ ان کے دادا معروف صحابی تھے۔ ان کے والد کو بھی بعض اہل علم صحابی قرار دیتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کے والد نے حضورؐ کو دیکھا تھا مگر آپؐ کی صحبت سے مستفید نہیں ہوئے۔

امام مالکؒ اور زہریؒ کے ساتھی جب حرامؒ بن سعد سے روایت کرتے ہیں تو وہ روایت مرسل ہوتی ہے۔ عبدالرزاقؒ نے یہ حدیث معمرؒ سے اس نے زہریؒ سے، اس نے حرامؒ سے اور اس نے اپنے والد سے روایت کی ہے۔ مگر محدثین اس ضمن میں عبدالرزاقؒ کی تائید نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے قول "عن ابیہ" کو ہدف نقد و جرح بنایا گیا ہے۔ ابوداؤدؒ لکھتے ہیں کہ محمد بن یحییٰ الذہلی نے کہا کہ یہ حدیث اس سند کے ساتھ روایت کرنے میں محدثین نے معمرؒ کی تائید نہیں کی۔ گویا انھوں نے معمرؒ کو غلطی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس حدیث کو ان مرسل روایات میں شمار کیا گیا ہے جن کو ثقہ راوی روایت کرتے ہیں۔ اہل حجاز بالعموم اور اہل عراق کا ایک گروہ اس حدیث کو قبول کرتا ہے۔ اور اس حدیث پر اہل کوفہ کا بھی عمل ہے۔ دیکھیے زرقانی کی شرح مؤطا (۴-۳۴)

"حضرت براءؓ بن عازب کی اونٹنی نے ایک آدمی کے باغ میں داخل ہو کر اسے نقصان پہنچایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ دن کے وقت باغات کی حفاظت ان کے مالکوں کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر رات کے وقت مویشی کسی کا نقصان کر دیں تو اس کی ذمہ داری مویشیوں کے مالکوں پر ہوگی۔"

الدلائل[۱] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص طبیب ہونے کا دعویٰ کرے مگر اسے جانتا نہ ہو تو وہ

---

[۱] یہ عجیب بات ہے کہ مصنف غیر معروف مراجع کا ذکر کرتا ہے حالانکہ یہ حدیث ابوداؤدؒ نے (۴-۵۹۵) کتاب "الدیات" باب فی من تطبب بغیر علم میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جو شخص طبیب ہونے کا دعویٰ کرے اور اسے جانتا نہ ہو تو اس کے ذمہ ضمان ہوگا۔

ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ حدیث صرف ولیدؒ نے روایت کی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آیا یہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں۔ اس سے ابوداؤدؒ کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ولیدؒ بن مسلم جب ابن جریجؒ سے روایت کرتے ہیں تو اس میں تدلیس کا نقص پایا جاتا ہے اور ابن جریجؒ بھی مدلس ہے کیونکہ اس نے یہ حدیث عن عن کے ساتھ عمروؒ بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کی ہے۔ تاہم ولیدؒ جب ابن جریجؒ سے سماع کی صراحت کرتا ہے تو تدلیس کا عیب اس سے زائل ہو جاتا ہے۔ دارقطنی (۳-۲۱۶)، حاکم (۴-۲۱۲) اور ابن ماجہ (۲-۱۱۴۸) کی روایتوں میں بھی یہ صراحت موجود ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ تدلیس کا عیب ولید کے بجائے ان کے استاد ابن جریجؒ میں پایا جاتا ہے۔ مگر دارقطنیؒ نے اس حدیث میں ایک اور علت کی نشاندہی کی ہے اور وہ یہ کہ یہ حدیث ابن جریجؒ سے صرف ولیدؒ ہی نے مرفوعاً روایت کی ہے۔ دوسرے راوی یہ حدیث ابن جریجؒ سے بطریق عمروؒ بن شعیب مرسلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ مگر اس کی بنا پر حدیث میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ولیدؒ ثقہ راوی ہے اور اس پر تدلیس کا جو داغ تھا اس کا ازالہ ہو چکا ہے، لہٰذا اس حدیث کی سند حسن کے درجے سے کم نہیں۔ واللہ اعلم۔

"المطبب" طب کا لفظ عربی میں مندرجہ ذیل معانی میں بولا جاتا ہے:۔

۱۔ اصلاح = عربی میں بولتے ہیں "طَبَبْتُهُ" (میں نے اس کی اصلاح کر لی ہے)

ایک شاعر کہتا ہے:۔

واذا تغیر من تمیم امرھا ... کنتُ الطبیب لھا برأیٍ ثاقب

(اور جب بنو تمیم کے حالات بدل جاتے ہیں تو میں اپنی دانش مندی کے ساتھ ان کی اصلاح کر دیتا ہوں)

۲۔ دانائی اور مہارت = جوہری ماہر لغت کہتے ہیں کہ ہر دانا آدمی طبیب کہلاتا ہے۔ ابوعُبیدؒ کہتے ہیں طب کے اصل معنی اشیاء میں مہارت وبصیرت کے ہیں کسی آدمی کو طبیب اس وقت کہتے ہیں جب وہ کسی کام میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو۔ ضروری نہیں کہ اس لفظ کو مریض کے علاج کے لیے ہی استعمال کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "من تطبّب" کے اندر تکلف کا مفہوم شامل ہے، یعنی بتکلّف اپنے آپ کو

مریض کو پہنچنے والے نقصان کا ذمہ دار ہوگا

صحیح البخاری (کتاب المظالم، باب اذا کسر قصعۃ او شیئا لغیرہ) میں بروایت حضرت انس اور

طبیب ظاہر کرتا ہے جب کہ درحقیقت ایسا نہ ہو۔ جیسے تحکم اور تشجیع کے الفاظ میں تکلف کا مفہوم شامل ہے۔ اس بات پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ جو شخص کسی کا علاج معالجہ کرے حالانکہ وہ اس کا مجاز نہ ہوا اور اس کے غلط علاج کی وجہ سے مریض کو نقصان پہنچ جائے تو علاج کرنے والا مریض کے نقصان کا ضامن ہوگا۔ اگر جان بوجھ کر اس نے مریض کو نقصان پہنچانا چاہا تو وہ شعوری طور پہ اس فعل کا مرتکب ہوا۔ اور اگر اس نے نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں کیا تو وہ خطا کار ہے۔ اور دونوں حالتوں میں اسے ضامن ٹھہرایا جائے گا۔ دیکھیے شرح الزرقانی علی مختصر خلیل" (۸ - ۱۱۶)

مویشیوں کا ڈاکٹر، حجام اور ختنہ کرنے والا سب طبیب کے حکم میں شامل ہیں۔ غلط علاج کی صورت میں طبیب کی طرح ان کو بھی ضامن ٹھہرایا جائے گا۔

فقہاء کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ جو حاذق طبیب علاج کرنے کا مجاز ہو اگر اس کے علاج کی وجہ سے مریض کو نقصان پہنچے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوگا۔

اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ مسئولیت ختم ہونے یعنی طبیب حاذق کے ذمہ دار نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اختلاف کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مستند طبیب پر سے ذمہ داری اٹھ جانے کے دو وجوہ ہیں:۔

۱۔ لوگوں کو اس سے علاج کروانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مریض یا اس کے سرپرست نے اس کو علاج کرنے کی اجازت دی تھی۔

امام احمد اور شافعی نے دوسری وجہ کو اختیار کیا ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ طبیب کے ذمہ دار نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو حاکم وقت نے اسے علاج کی اجازت دی اور پھر مریض اور اس کے ولی نے اسے علاج کی اجازت دی۔ حکومت کی اجازت کی بنا پر طبیب یہ پیشہ اختیار کرنے کا مجاز ہوا۔ اور مریض کی اجازت کی وجہ سے طبیب کے لیے یہ جائز ٹھہرا کہ ہر وہ کام کرے جس میں مریض کا بھلا ہو۔ (بدائع الصنائع (۷ - ۳۰۵) مواہب الجلیل (۶ - ۳۲۱)

طبیب کے نقصان کا ذمہ دار نہ ہونے کے سلسلے میں مروجہ وضعی قوانین میں بھی یہ شق موجود ہوتی ہے، البتہ اس کی بعض جزئیات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

لہ صحیح بخاری کتاب "المظالم" باب "اِذَا كَسَرَ قَصْعَةً أَوْ شَيْئًا لِغَيْرِهِ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۸۱)
نیز بخاری کتاب "النکاح" باب "الْغَيْرَة" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۲۵) بروایت انسؓ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بیوی کے ہاں تشریف فرما تھے۔ امہات المومنین میں سے ایک نے خادم کے ہاتھ لکڑی کا ایک پیالہ بھیجا۔ جس میں کھانا تھا۔ گھر والی نے ہاتھ مار کر پیالہ توڑ دیا۔ آپؐ نے پیالہ جوڑ کر اس میں دوبارہ کھانا رکھ دیا۔ اور فرمایا "کھاؤ" آپؐ نے خادم کو روک لیا۔ یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہوئے۔ پھر آپؐ نے ثابت پیالہ واپس کیا اور ٹوٹا ہوا رکھ لیا۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی بیوی کے یہاں مقیم تھے۔ امہات المومنین میں سے ایک نے اپنے خادم کے ہاتھ پیالے میں کھانا بھیجا۔ گھر والی نے ہاتھ مارا (جس سے پیالہ گر کر ٹوٹ گیا)

صحیحین کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں ہے کہ پیالے پر پتھر کا دستہ مارا۔ ایک روایت میں ہے کہ گھر والی نے اس کی چادر کھینچی۔ جس کی وجہ سے پیالہ گر کر ٹوٹ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے کے ٹکڑوں کو جوڑا اور اس میں کھانا ڈال دیا۔ اور فرمایا۔ "غَارَتْ اُمُّکُمْ" "تمھاری ماں کو غیرت آگئی" (غیرت کی وجہ سے پیالہ توڑ کر کھانے کو ضائع کر دیا)

ابوداؤد میں ہے کہ حماد بن سلمہ نے ثابت البنانی سے اور انھوں نے ابو المتوکل سے روایت کی کہ حضرت ام سلمہؓ حضرت عائشہؓ کی باری کے دن ایک پیالہ لائیں جس میں کھانا تھا۔ انھوں نے وہ کھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے سامنے رکھ دیا۔ آپؐ اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ حضرت عائشہؓ نے چادر اوڑھی اور پیالے کو ہاتھ مار کر توڑ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے کے دونوں ٹکڑوں کو جوڑا اور کھانا اس میں رکھ دیا۔ پھر فرمایا "غَارَتْ اُمُّکُمْ" "تمھاری ماں کو غیرت آگئی"۔ صحابہ نے کھانا کھا لیا۔ پھر حضرت عائشہؓ کھانے کی پلیٹ لائیں۔ انھوں نے وہ بھی کھا لیا۔ بعد ازاں آپؐ

دوسری روایت میں ہے کہ پیالہ گر کر ٹوٹ گیا۔ آپؐ نے پیالے کے ٹکڑے جوڑے اور دوبارہ اس میں کھانا رکھ دیا۔ پھر فرمایا۔ "تمھاری ماں کو غیرت آگئی"۔ آپؐ نے خادم کو روک لیا۔ اور جس بیوی کے گھر میں تھے اس بیوی سے نیا پیالہ منگوایا۔ نیا پیالہ خادم کے ہاتھ بھیج دیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ توڑنے والی کو دے دیا۔"

ترمذی (۳-۴۰۶) کتاب "الاحکام" باب "مَا جَاءَ فِیْ مَنْ یُکْسَرُ لَہٗ شَیْءٌ" میں یہ الفاظ ہیں کہ "ایک بیوی نے پیالے میں کھانا بھیجا۔ عائشہؓ نے ہاتھ مار کر پیالہ توڑ دیا"

یہ کھانا حضرت زینبؓ بنت جحش نے بھیجا تھا۔ جیسا کہ ابن حزم نے محلّٰی میں بسند خود روایت کیا ہے کہ زینبؓ بنت جحش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کا تحفہ بھیجا۔ آپؐ اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تھے اور ان ہی کی باری کا دن بھی تھا۔ کھانا کھجوروں میں مکھن اور پنیر ڈال کر بنایا گیا تھا اور حضرت زینبؓ نے وہ پیالے میں ڈال کر بھیجا تھا۔ مترجم)

نسائی (۷-۱۰۱) بروایت ابو المتوکل ہے کہ کھانا بھیجنے والی حضرت ام سلمہؓ تھیں اور جسرہ بنت دجاجۃ کی روایت میں ہے کہ وہ حضرت صفیہؓ تھیں۔ ان روایات میں تطبیق اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک سے زیادہ واقعات کے متعلق ہیں۔

لہ مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ یہ روایت صرف بخاری میں ہے اور مسلم نے یہ نقل نہیں کی۔

لہ نسائی (۷-۷۱) میں حضرت ام سلمہ کی روایت ہے کہ "عائشہؓ آئیں، اور ان کے ہاتھ میں ایک پتھر کا دستہ تھا اور اس سے انھوں نے پیالہ توڑ دیا"

لہ ابوداؤد (۳-۲۹۷) کتاب "البیوع" باب "فِیْ مَنْ اَفْسَدَ شَیْئًا یُغْرَمُ مِثْلَہٗ" حضرت انسؓ کی روایت ہے۔ اس میں الفاظ وہی صحیح بخاری والے ہیں۔ ام سلمہؓ کی وہ روایت مجھے نہیں مل سکی جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے، البتہ نسائی میں وہ روایت موجود ہے جس کا تذکرہ میں نے کیا ہے۔

نے ٹوٹا ہوا پیالہ حضرت عائشہؓ کو دے دیا اور جو ٹھیک تھا وہ حضرت ام سلمہؓ کے گھر بھیج دیا۔[1]

صحیح بخاری میں یہ الفاظ ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "کھاؤ" اور آپؐ نے خادم کو روک لیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ بھی وہیں رہا۔ حتیٰ کہ آپؐ اور صحابہ کھانا کھا کر فارغ ہو گئے۔

ابوداؤد[2] میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میں نے صفیہؓ سے بہتر کھانے پکانے والی نہیں دیکھی۔ ایک دن حضرت صفیہؓ نے کھانا پکا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ یہ دیکھ کر میں بے قابو ہو گئی اور میں نے برتن توڑ دیا۔ پھر میں نے آپؐ سے دریافت کیا "اس کا کیا کفارہ ادا کروں؟" فرمایا "برتن کا برتن اور کھانے کا کھانا۔"

ابن شیبان[3] کی کتاب میں ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک جھونپڑی کے بارے میں اپنا مقدمہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔

نسائی نے کتاب الاسماء والکنیٰ میں ذکر کیا ہے کہ یمامہ میں دو شخصوں کے درمیان ایک باغ کی ملکیت کے سلسلے میں جھگڑا پیدا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہؓ بن یمان کو ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت حذیفہؓ نے اس شخص کے حق میں فیصلہ دیا جس کی جھونپڑی اس کے ساتھ ملتی تھی۔

حضرت حذیفہؓ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا فیصلہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا "تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔" نسائی میں یہ اضافہ ہے کہ "تم نے درست فیصلہ کیا۔"[4]

روایت میں ہے کہ دو بھائی ایک باڑے کے مالک تھے۔ وہ دونوں فوت ہو گئے۔ دونوں کے وارث موجود تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ باڑہ اس کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جھگڑا چکانے کے لیے حضرت حذیفہؓ کو بھیجا۔[5]

---

[1] الخطابی کہتے ہیں کہ پیالے کی واپسی شرعی احکام میں سے نہیں بلکہ آپؐ نے اصلاح کے جذبے سے ایسا کیا تھا۔

[2] ابوداؤد (۳-۲۹۷) اور نسائی دونوں میں مذکورہ بالا الفاظ ہیں۔ دونوں کی سند میں فلیت العامری نامی راوی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا نام افلت بن خلیفہ اور کنیت ابوحسان ہے۔ وہ ثقہ راوی ہے۔

[3] دارقطنی (۴-۲۲۹) نے یہ روایت بیان کی ہے۔ اس کی سند میں دہشم بن قران نامی راوی ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ یہ حدیث دہشم کے سوا دوسرے کسی راوی نے روایت نہیں کی اور وہ ضعیف راوی ہے۔ اس حدیث کی سند میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر دہشم کو متروک الحدیث قرار دیتے ہیں۔

یہ حدیث ابن ماجہ (۲-۷۸۵) نے اسی سند کے ساتھ روایت کی۔ البوصیری "الزوائد" میں کہتے ہیں کہ ابن القطان کے قول کے مطابق اس کی سند میں نمران بن جاریہ مجہول راوی ہے۔

[4] نسائی کی کتاب "الاسماء والکنیٰ" کے بارے میں مجھے یاد نہیں کہ وہ کہاں ہے، البتہ ذہن میں یہ بات محفوظ ہے کہ میں نے یہ کتاب دیکھی ہے اور اس سے استفادہ کیا ہے۔

[5] دارقطنی نے (۴-۲۲۹) یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس کی سند میں دہشم نامی راوی ہے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے وہ متروک الحدیث ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے۔

شفعہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مؤطا[1] امام مالک اور دوسری کتب میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (جائداد) کے بارے میں شفعہ کا فیصلہ کیا جو

---

[1] شفعہ کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ ایک حصہ دار کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کے شریک کا حصہ کسی دوسرے شخص کی جانب منتقل ہو جائے تو وہ اس سے واپس لے سکے۔ شفعہ کے لغوی معنی اضافہ کے ہیں۔ شفعہ کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ شفعہ کرنے والا گویا بیچی ہوئی چیز کو اپنی ملکیت میں شامل کر کے اپنے مال میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پہلے اس کا مال اکیلا (طاق) تھا اور اب وہ "زوج" اور "شفعہ" (جفت) بن گیا۔ (النہایۃ ۲-۴۸۵)

شفعہ حدیث و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ ابن المنذر کہتے ہیں کہ اس بات پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ غیر تقسیم شدہ اراضی، مکان اور باغ وغیرہ جب فروخت کر دیا جائے تو حصہ دار کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔ ان کے علم کی حد تک اَلْاَصم کے سوا کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اَلْاَصم کہتے ہیں کہ شفعہ اس لیے جائز نہیں کہ یہ ملکیت والوں کے لیے موجب ضرر ہے۔" دیکھیے (المغنی ۵-۲۵۵)

حق شفعہ کے بارے میں علماء نے چار شرطیں عائد کی ہیں:۔

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جائداد مشترکہ اور غیر تقسیم شدہ ہو۔ پڑوسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔ صحابہ، تابعین اور فقہاء کی ایک جماعت کا مسلک یہی ہے۔ ابن شبرمہ، ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور اصحاب الرائے کہتے ہیں کہ شفعہ کا اولین استحقاق ملکیت میں اشتراک کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ پھر راستہ میں اشتراک کی بنا پر اور اس کے بعد پڑوسی ہونے کے باعث۔ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ شریک کا حق شفعہ سب پر مقدم ہے۔ اگر شریک نہ ہو اور راستہ مشترکہ ہو مثلاً ایک تنگ سی گھاٹی ہو جس سے آگے راستہ نہ نکلتا ہو، تو اس صورت میں گھاٹی میں شریک سب لوگوں کو شفعہ کا حق حاصل ہوگا۔ اس میں الاقرب فالاقرب کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اگر قریب تر شخص شفعہ نہ کرنا چاہے تو پھر اس کے بعد اس شخص کا حق ہے جو اس کے بعد قریب تر ہے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ بیچی ہوئی چیز زمین کی قسم کی ہو۔ اس لیے کہ یہ باقی رہنے والی چیز ہے اور اس کا ضرر بھی دائمی ہے۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ فروخت شدہ چیز قابل تقسیم ہو۔ اگر اس قسم کی زمین ہو جو تقسیم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً چھوٹا حمام، چھوٹی چکی، چوکھٹ، تنگ راستہ اور تنگ جگہ تو اس میں امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کے نزدیک شفعہ نہیں ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ اس میں بھی شفعہ کے قائل ہیں۔

۴۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ شفعہ اس جائداد میں ہوتا ہے جو قیمت کے عوض کسی کے ہاتھ فروخت کی گئی ہو۔ جو جائداد بلا معاوضہ کسی کی طرف منتقل کی گئی ہو مثلاً ہبہ کے طور پر یا صدقہ، وصیت اور وراثت کی حیثیت سے تو اس میں شفعہ نہیں ہے۔ ایک روایت میں امام مالک سے منقول ہے کہ ان صورتوں میں بھی شفعہ ہو سکتا ہے۔

[2] مؤطا امام مالک (۲-۷۰۳) کتاب الشُّفْعَة "باب الشُّفْعَةِ فِيْ مَا لَمْ يُقْسَمْ" از ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف مرسلاً۔

ابھی اس کے حصہ داروں میں تقسیم نہ ہوئی ہو۔ جب تقسیم ہو کر حدیں قائم ہو جائیں اور راستے تبدیل ہو جائیں تو کوئی شفعہ نہیں (صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ "اذا وقعت الحدود فلا شفعة" (جب حدیں قائم ہو جائیں تو شفعہ کا حق باقی نہیں رہتا) اس بات کی دلیل ہے کہ شفعہ اسی چیز میں ہو سکتا ہے جس کی حدود ہوں۔ مثلاً گھر اور جائداد وغیرہ۔

ابو عبید نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے کہ مندرجہ ذیل اشیاء میں شفعہ نہیں ہو سکتا:

۱- گھر کا صحن۔

۲- سڑک یا راستہ۔

۳- تنگ راستہ جو دو گھروں کے درمیان ہو۔ (المنفعة)

۴- گھر کا گوشہ جو پچھلی جانب ہو۔ (المسوکح)

۵- جوہڑ جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہو (المزھو)

ابو عبید کہتے ہیں "المنفعة" اس تنگ راستہ کو کہتے ہیں جو دو گھروں کے درمیان ہو اور جس میں چلنا ممکن نہ ہو۔ "المسوکح" اس گوشے کو کہتے ہیں جو گھر کی پچھلی طرف ہو۔ بعض اوقات وہ کھلا صحن ہوتا ہے اور اس میں کوئی عمارت نہیں ہوتی۔

"المزھو" جوہڑ کو کہتے ہیں جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جہاں کنویں کا پانی جمع ہوتا ہو اس جگہ کو اور جوہڑ کو فروخت نہ کیا جائے"

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ان پانچ جگہوں میں شریک ہو مگر خود گھر میں حصہ دار نہ ہو تو اس اشتراک کی بنا پر اسے شفعہ کا حق حاصل نہ ہوگا۔

یہ اہل مدینہ کا مسلک ہے، یعنی ان کے نزدیک شفعہ کا حق صرف اس شخص کو حاصل ہے جو گھر یا زمین کی ملکیت میں

صحیح بخاری کتاب "الشفعة" باب "الشفعة فی مالم یقسم" میں یہ متصل سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کی گئی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۵۷) طحاوی کی "شرح معانی الآثار" (۲-۲۶۶) ترمذی (۱-۳-۲۵۰) کتاب "الاحکام" باب "الشفعة" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابوداؤد (۳-۲۸۵) کتاب البیوع باب "الشفعة"۔

لہ ابو عبید کا یہ قول مجھے نہیں مل سکا۔

لہ اہل مدینہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "الشفعة فی کل شرک لم یقسم" میں لام جنس کا ہے اور مسند الیہ کو لام جنس کے ساتھ معرف کرنے سے قصر المسند الیہ علی المسند کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں کہ "الائمة من القریش" (یعنی امام و خلیفہ صرف قبیلہ قریش ہی سے ہو سکتا ہے) اسی لیے اہل مدینہ کہتے ہیں کہ شریک

شریک ہو۔ لیکن اہلِ عراق[۱] کے نزدیک قرب و جوار میں رہنے والے پڑوسی کو بھی شفعہ کا حق حاصل ہے اگرچہ وہ ملکیت میں حصہ دار نہ بھی ہو۔

ابوعبیدؒ کی کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں میں یہ الفاظ ہیں کہ حضورؐ نے پڑوسی کے حق میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا۔" یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"پڑوسی[۲] شفعہ کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔"

نسائی[۳] میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میری زمین میں دوسرا کوئی آدمی حصہ دار نہیں، البتہ میرے پڑوسی ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا۔ پڑوسی شفعہ کرنے کا زیادہ حق دار ہے۔"

صحیح مسلم[۴] میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایسی چیز میں شفعہ کرنے کا فیصلہ کیا جو مشترکہ ہو اور تقسیم نہ ہوئی ہو، چاہے گھر ہو،[۵]

کے سوا کسی شخص کو شفعہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ امام شافعی کا مسلک بھی یہی ہے۔

[۱] اہلِ عراق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ "اَلْجَارُ اَحَقُّ بِسَقَبِہٖ" (پڑوسی شفعے کا زیادہ حق دار ہے)، صحابہؓ نے عرض کیا "سقبہ" کے کیا معنی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "اس کے معنی شفعہ کے ہیں"۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "پڑوسی شفعہ کا زیادہ حق دار ہے"۔ کیونکہ اس کی مملوکہ چیز ہمیشہ کے لیے بائع کی ملکیت کے قریب واقع ہے، لہٰذا اسے شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ شرعی اعتبار سے وہ اس چیز میں ایک قسم کے شریک کی حیثیت رکھتا ہے اور شریعت نے اس کے قرب کی بنا پر اسے حق دیا ہے کہ اسے ضرر نہ پہنچے جبکہ یہ بیع اس کے حق میں موجب ضرر ہو سکتی ہے اور اس کے ازالے کی یہی صورت ممکن ہے کہ پڑوسی کو حق شفعہ دے دیا جائے۔ (الھدایۃ مع شرح فتح القدیر ۷-۴۱۰)

[۲] صحیح بخاری کتاب "الشفعۃ" باب "عَرْضِ الشُّفْعَةِ عَلٰی صَاحِبِهَا" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۵۸)
حضرت ابورافعؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ روایت ان سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے۔

[۳] نسائی (۷-۳۲۰) کتاب "البیوع" باب ذِکْرِ الشُّفْعَةِ وَاَحْکَامِهَا۔

[۴] مسلم (۳-۱۲۲۹) کتاب "المساقاۃ" باب "الشفعۃ" بروایت جابرؓ۔ ابوداؤد (۳-۲۸۵) کتاب "البیوع" باب "فِی الشُّفْعَةِ" نسائی (۷-۳۰۱) کتاب "البیوع" باب فِی بَیْعِ الْمَشَاعِ۔

[۵] عربی میں یہ لفظ "الرَّبْعِ" (بفتح الراء واسکان الباء) ہے۔ جس کا مطلب ہے گھر، جائے سکونت، زمین وغیرہ۔ دراصل یہ لفظ اس گھر کے لیے بولا جاتا تھا جس میں عرب موسم بہار گزارا کرتے تھے۔ "الربعۃ" اس کی مؤنث ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "رَبْعَةٌ" واحد ہے اور "رَبْعٌ" اس کی جمع ہے۔ جس طرح "ثَمْرَةٌ" واحد ہے اور "ثَمْرٌ" جمع ہے۔

امام نوویؒ شرح صحیح مسلم (۱۰-۴۶) میں لکھتے ہیں:

"شوافع کے نزدیک فروخت کرتے وقت شریک کو آگاہ کرنا مستحسن ہے اور اسے مطلع کیے بغیر فروخت کرنا مکروہ تنزیہی ہے، حرام نہیں۔ وہ حدیث کو اسی پر محمول کرتے ہیں۔ مکروہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ حلال نہیں ہے جب کہ حلال کے معنی مباح کے ہیں۔

یا کوئی اور چیز۔ ایک شریک کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی چیز فروخت کرے جب تک کہ وہ اپنے شریک کو باخبر نہ کرے۔ پھر اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ وہ چاہے تو وہ چیز خرید لے اور نہ چاہے تو نہ خریدے۔ اگر کوئی شخص اپنے حصہ دار کو آگاہ کیے بغیر وہ چیز فروخت کر دے تو اُن کا وہ حصہ دار اس چیز کا زیادہ حق دار ہے۔

اور مکروہ وہ ہوتا ہے جسے ترک کرنا بہتر ہوتا ہے۔

اہل علم کے یہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر مالک حصہ دار کو سودا کرنے سے پہلے مطلع کر دے اور وہ اس کی اجازت بھی دے دے لیکن جب وہ اس چیز کو فروخت کر دے تو پھر شریک شفعہ کر کے لے لینا چاہے تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ اس ضمن میں امام شافعیؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی، عثمان البتی، ابن ابی لیلیٰ وغیرہم کا مسلک یہ ہے کہ شفعہ کر کے وہ چیز لے سکتا ہے۔ جبکہ الحکم، ثوریؒ، ابو عُبیدؒ اور محدثین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اسے شفعہ کا حق حاصل نہیں۔ امام احمدؒ بن حنبل سے اس ضمن میں دو قول منقول ہیں۔" (امام نوویؒ کا بیان ختم ہوا)

مشترکہ ملکیت کی باہمی تقسیم اور مزارعت[1] کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے

اسماعیلی کی کتاب "الاحکام"[2] میں ہے کہ دو شخص ایک وراثت کی تقسیم کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ جائداد کو منصفانہ طریقے سے تقسیم کرنے کی کوشش کرو اور پھر قرعہ اندازی کرلو۔

اسماعیلی کہتے ہیں حصہ داروں کو اپنی مشترکہ ملکیت آپس میں اس طرح تقسیم کرنی چاہیے۔ جب کوئی گھر یا زمین ان کی ملکیت ہو تو اس کے منصفانہ طریقے سے حصے کیے جائیں۔ پھر قرعہ اندازی کی جائے۔ جس کے نام قرعہ نکلے وہ اپنا حصہ لے لے۔ اسی طرح غیر منقسم زمین میں جس شخص کا جتنا حصہ ہوگا وہ اسے مل جائے گا۔

الاحکام کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا تَعْضِيَةَ فِي الْقَسْمِ" یعنی تقسیم

---

[1] مزارعۃ زراعت سے باب مفاعلہ ہے۔ صاحب الاکلیل کہتے ہیں کہ مزارعہ زرع سے ماخوذ ہے۔ القاموس میں ہے کہ مزارعہ کے معنی ہیں پیداوار میں شریک ہو کر کسی کی زمین کاشت کرنا۔ جب کہ بیج زمین کا مالک دے۔

المقدسی کہتے ہیں:۔

"مزارعت کے معنی یہ ہیں کہ زمین کسی کو اس لیے دی جائے کہ وہ اس میں کاشت کرے اور پیداوار مشترکہ ہو"۔ (المغنی ۵-۳۴۳)

مزارعت کے جائز ہونے پر سب اہل علم کا اتفاق ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ حصہ مقرر ہو۔ مثلاً نصف یا ایک تہائی یا ایک چوتھائی وغیرہ۔ اگر حصہ مقرر نہ ہو تو جائز نہیں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ فلاں جگہ سے جو پیداوار حاصل ہو وہ میری ہے تو یہ جائز نہیں ہوگا۔

[2] یہ حدیث دارقطنی (۴-۲۳۹) نے اپنی سند کے ساتھ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ وہ عبداللہ بن رافع رضی اللہ عنہ مولی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اور وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھی تھی کہ دو آدمی چند پرانی بوسیدہ موروثی اشیاء کی تقسیم کے سلسلے میں جھگڑتے ہوئے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس معاملے میں مجھ پر وحی نازل نہیں ہوتی میں اس میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں، پس جس کے حق میں میں نے اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کیا اور اس فیصلے کی بنا پر اس نے از راہِ ظلم کسی کا حق دبا لیا، تو گویا اس نے اپنے لیے جہنم کا ایک ٹکڑا لے لیا اور جب وہ قیامت کے دن حاضر ہوگا تو وہ چیز اس کے گلے میں معلق ہوگی۔

راوی کہتا ہے کہ یہ بات سن کر دونوں شخص رونے لگے۔ ان میں سے ہر ایک کہنے لگا کہ جس حق کا میں مطالبہ کرتا تھا وہ میں نے اپنے ساتھی کو دیا۔ حضور نے فرمایا "یوں نہیں، بلکہ تم جا کر منصفانہ طریقے سے ان چیزوں کو تقسیم کرنے کی کوشش کرو اور پھر قرعہ اندازی کر کے ہر ایک اپنا حصہ لے لو۔ اس کے بعد تم میں سے ہر کوئی دوسرے کے لیے اس چیز کو حلال کر دے جو اس کے حصے میں آئے"۔

کے وقت کسی چیز کو پارہ پارہ نہ کیا جائے۔"[۱]

المتعضیۃ کے معنی تفرقہ یعنی الگ الگ کرنے کے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں فرمایا:

اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (سورۃ الحجر۔ ۹۱)   یعنی جنھوں نے قرآن کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔

یعنی بعض لوگوں نے قرآن کو جادو کہا۔ بعض نے اسے گزری ہوئی قوموں کا افسانہ قرار دیا اور بعض نے حضور کو شاعر اور کاہن کہا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمھارے یہاں جب راستہ کی پیمائش میں جھگڑا ہو جائے تو اس کی چوڑائی سات ہاتھ مقرر کر لیا کرو۔"[۲] دوسری روایت کے الفاظ بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔

حاکم نے اس کو "المستدرک" (۴۔ ۹۵) میں دو طریقوں سے روایت کیا ہے جن میں سے ایک کے بارے میں کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے مگر صحیحین نے یہ حدیث روایت نہیں کی۔ دوسری سند کے بارے میں کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ مگر بخاری اور مسلم نے یہ روایت بیان نہیں کی۔ امام ذہبی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

[۱] دارقطنی نے (۴۔ ۲۱۹) یہ حدیث اس سند کے ساتھ روایت کی ہے: حسین بن اسماعیل عن خلاد بن اسلم عن روح بن عبادہ عن ابن جریج عن صدیق بن موسیٰ عن محمد بن ابی بکر عن ابیہ عن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ترکہ کی ہر چیز کو پارہ پارہ نہ کیا جائے بلکہ صرف اسی چیز کو تقسیم کیا جائے جو تقسیم کی متحمل ہو سکتی ہو۔"

صدیق بن موسیٰ بن عبداللہ بن زبیر کو ثقہ نہیں سمجھا جاتا۔ دیکھیے المیزان (۲۔ ۳۱۴)

ابو عبیدہ کہتے ہیں:۔

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص ترکہ چھوڑ کر مر جائے اور اس کے ورثاء ترکہ کو باہم تقسیم کرنا چاہیں، مگر وہ چیز ایسی ہو کہ تقسیم کرنے سے اس کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو آپ نے فرمایا کہ اس صورت میں سے تقسیم نہ کیا جائے۔

"التعضیۃ" کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں۔ یہ اعضاء سے ماخوذ ہے۔ عربی میں کہتے ہیں "عضیت اللحم" (اس نے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کیا)

ابن الاثیر "النہایۃ" (۳۔ ۲۵۶) میں لکھتے ہیں کہ بعض چیزیں تقسیم کرنے سے خراب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جواہرات، قیمتی کپڑے، حمام اور اس قسم کی اشیاء۔ یہ حدیث ایسی ہی چیزوں کے بارے میں ہے۔ (شرح غریب الحدیث ۲۔ ۷)

[۲] صحیح بخاری کتاب "المظالم" باب اِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِی الطَّرِیْقِ الْمِیْتَاءِ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۷۳) بروایت ابوہریرہؓ۔ صحیح مسلم کتاب "المساقاۃ" باب "قَدْرِ الطَّرِیْقِ اِذَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ" ابوداؤد (۳۔ ۳۱۴) کتاب القضاء باب فی القضاء۔ ترمذی (۳۔ ۶۳۷) کتاب "الاحکام" باب مَا جَاءَ فِی الطَّرِیْقِ اِذَا اخْتُلِفَ فِیْہِ کَمْ یُجْعَلُ۔

"الطریق المیتاء" بکسر المیم و سکون الیاء بروزن مفعال۔ الوعم شیبانی کہتے ہیں: "المیتاء" بڑے اور کشادہ راستے کو کہتے ہیں جو عام لوگوں کی گزرگاہ ہو۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس سے مراد کشادہ راستہ ہے۔ جب کہ بعض دوسروں کے نزدیک اس سے آباد راستہ مراد ہے۔ فتح الباری (۵۔ ۱۱۸)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم[2] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کے ساتھ طے کیا کہ وہ زمینوں پر اس شرط پر کام کریں کہ جو غلہ یا کھجوریں وغیرہ پیدا ہوں گی اس کا نصف انھیں دیا جائے گا۔ آپؐ اس پیداوار میں سے ازواج مطہرات کو اسّی وسق (ایک پیمانہ) کھجور اور بیس وسق جو دیا کرتے تھے۔

"الواضحۃ"[3] میں ہے کہ حضورؐ کے دور میں چار آدمیوں نے شرکہ کا روبار شروع کیا۔ ایک نے کہا میں زمین دوں گا۔ دوسرے نے بیج دینے کا وعدہ کیا۔ تیسرے نے کہا میں بیلوں کی جوڑی دوں گا۔ چوتھے نے کہا میں زمین میں کام کروں گا۔ جب کھیتی پک گئی اور کاٹ لی گئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے زمین کے مالک کو تو کچھ نہ دیا، البتہ بیلوں کے مالک کو ایک خاص حصہ دیا۔ کام کرنے والے کو ایک درہم یومیہ کے حساب سے دیا۔ باقی ماندہ غلہ بیج دینے والے کو دیا۔

ابن حبیب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے مالک کو اس لیے کچھ نہ دیا کہ ان دنوں زمین کا کرایہ یا اس کی اجرت نہیں ہوتی تھی۔

"المدونۃ"[4] میں ہے کہ میں نے ابن القاسم سے کہا کہ اگر ایسا ہو کہ دو آدمی بیج ڈالیں اور تیسرے آدمی کی زمین ہو اور سب کام بھی وہی کرے تو کیا یہ شرعًا درست ہے؟ اس نے کہا اس میں کچھ بھلائی نہیں۔ میں نے کہا پھر اس صورت میں پیداوار کس کو دی جائے گی؟ وہ کہنے لگے زمین کے مالک اور کام کرنے والے کو۔ بیج والوں کو بیج واپس کر دیا جائے گا۔ میں نے کہا کیا یہ امام مالک کا قول ہے؟ کہنے لگے نہیں یہ میری ذاتی رائے ہے۔

"راستے کا عرض سات ہاتھ مقرر کرنے میں یہ حکمت مضمر ہے کہ بوجھ لے کر آنے جانے والے آسانی سے گزر سکیں۔ اور ضروری چیزیں لے کر راستے سے گزریں اور گھر کے دروازے تک لے جائیں۔ جو شخص راستے کے درمیان بیٹھ کر کوئی چیز فروخت کرتا ہو تو اس کے بارے میں یہ ہے کہ اگر راستہ سات ہاتھ سے زیادہ چوڑا ہو تو اسے میان میں بیٹھنے سے منع نہ کیا جائے، البتہ اس سے کم ہونے کی صورت میں اسے منع کیا جائے۔ تاکہ گزرنے والوں کے لیے راستہ تنگ نہ ہو۔"

میں کہتا ہوں یہ حکم عرف عام کے تابع ہے۔ شارع سے صرف یہ بات اخذ کرنے کی ضرورت ہے کہ راستہ کشادہ ہونا چاہیے۔ باقی رہا مقدار کا تعین تو یہ حالات اور لوگوں کی ضرورت پر موقوف ہے۔

[1] صحیح بخاری کتاب "الحرث" باب "المزارعۃ بالشطر" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۳۲۸) بروایت عبداللہ بن عمرؓ۔

[2] صحیح مسلم (۳-۱۱۸۶) کتاب المساقاۃ باب المساقاۃ والمعاملۃ بجزء من الثمر والزرع۔

[3] مجھے نہیں معلوم کہ یہ حدیث کس نے مرفوعًا روایت کی ہے۔ امام محمد بن حسن شیبانی نے یہ حدیث "الآثار" (ص ۱۳۳) میں روایت کی ہے۔ الخوارزمی نے اس کا مسند ابوحنیفہ میں ذکر کیا ہے۔ امام محمد اس کو عبدالرحمن الاوزاعی سے روایت کرتے ہیں، وہ واصل بن ابی جمیل سے، وہ مجاہد سے (تا آخر) واصل بن ابی جمیل کا تعارف حافظ ابن حجرؒ نے "التہذیب" (۱۱-۱۰۲) میں کرایا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے فرمایا کہ اوزاعی کے سوا کسی نے بھی ابو جمیل سے روایت نہیں کیا۔ لہٰذا ابو جمیل مجہول راوی ہے۔

[4] یہ روایت مجھے کہیں نہیں ملی۔

ابن وہبؒ اور ابن القاسمؒ امام مالکؒ سے روایت کرتے ہیں کہ پیداوار کا مالک کاشتکار ہے، البتہ زمین کا کرایہ اور کام کرنے والے کی محنت کا معاوضہ اسے دینا ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اَلزَّرْعُ لِصَاحِبِ الزَّرِيْعَةِ وَلِلْآخَرِيْنَ أُجُوْرُ مِثْلِهِمْ۔" — پیداوار کا مالک کھیتی والا ہے اور باقیوں کو ان کی اُجرت دی جائے گی۔

"الواضحة" میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فیصلہ مذکور ہے۔

سنن ابو داؤدؒ میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کھیتی بوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر وہاں سے ہوا جبکہ وہ کھیتی کو پانی دے رہے تھے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا: لِمَنِ الزَّرْعُ وَلِمَنِ الْأَرْضُ، یہ کھیتی کس

ؔ ابوداؤد (۳-۲۶۱) کتاب "البیوع" باب "فی التشدید فی ذالک" اس حدیث کی سند میں بکر بن عامر راوی ہے جس پر ایک سے زیادہ محدثین نے جرح و نقد کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ "التقریب" (۱-۱۰۸) میں لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف راوی ہے۔ طحاوی نے "شرح معانی الآثار" میں یہ حدیث اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ (شرح معانی الآثار (۲-۲۵۷)

اس کی مؤید حدیث ابوداؤد (۳-۲۶۲) میں موجود ہے۔ جو حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "المخابرۃ" سے منع فرمایا۔ میں نے عرض کیا "مخابرۃ" کیا ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ زمین کو نصف، تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض دینے کو مخابرہ کہتے ہیں۔ اُسید بن ظہیر سے مروی حدیث بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ اُسیدؓ کہتے ہیں ہم میں سے کوئی شخص جب اپنی زمین سے بے نیاز ہوتا اور وہ خود اسے کاشت نہ کرتا یا کسی اور کو زمین کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنی زمین نصف یا ایک تہائی، یا ایک چوتھائی پیداوار کے عوض کسی کو دے دیا کرتا تھا۔ زمین کا مالک یہ شرط عائد کرتا کہ تین نالوں کے کناروں پر واقع زمین کی پیداوار وہ خود لے گا۔ اسی طرح گاہنے کے بعد (خوشوں میں جو دانے باقی رہ جائیں گے) وہ بھی اسی کے ہوں گے، نیز موسم بہار کی بارشوں کے پانی سے جو فصل سیراب ہوگی وہ بھی اسی کی ہوگی۔ مزارع اس میں سخت محنت کرتا اور پھر کچھ فائدہ اٹھاتا۔ ایک دن رافعؓ بن خدیج ہمارے یہاں آئے اور کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے کام سے روک دیا ہے جو تمھارے لیے بڑا نفع بخش تھا۔ اور حضورؐ کی اطاعت تمھارے لیے سب چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ آپؐ نے زمین کو بٹائی پر دینے سے منع کیا ہے" ابن ماجہ (۲-۸۲۴)

ابوداؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ "جو شخص اپنی زمین بٹائی پر دینے کی عادت ترک نہ کرے وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جائے"۔

سنن ابوداؤد ہی میں زید بن ثابتؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین بٹائی پر دینے سے منع کیا ہے۔

صحیح مسلم (۳-۱۱۷۴) کتاب "البیوع" باب "النھی عن المحاقلۃ" میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "محاقلہ، مزابنہ اور مخابرہ" سے منع فرمایا۔ اسی طرح ثابت بن ضحاک سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین بٹائی پر دینے سے منع فرمایا ہے۔

ان سے اور ان کی ہم معنی دوسری احادیث سے نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین کو بٹائی پر دینا جائز نہیں ہے مگر ان سے زیادہ صحیح احادیث

کی ہے اور زمین کس کی؟"

سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر کے ساتھ یہ معاملہ طے کیا کہ وہ نصف پیداوار کے عوض زمین کاشت کرتے رہیں۔ اور اس بارے میں یہ صحیح ترین حدیث ہے۔

جلیل القدر صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت اسی حدیث پر عمل پیرا تھی۔ امام بخاری قیس بن مسلم سے اور وہ ابوجعفر سے نقل کرتے ہیں کہ مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو ایک تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض زمین کی کاشت نہ کرتا ہو۔ حضرت علیؓ، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، آلِ ابوبکر، آلِ علی اور آلِ عمر رضی اللہ عنہم اجمعین سب یہ کام کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ لوگوں سے اس شرط پر معاملہ کرتے تھے کہ اگر وہ (حضرت عمرؓ) بیج خود ڈالیں تو نصف پیداوار لیں گے اور اگر بیج دوسرے ڈالیں تو ان کا اتنا حصہ ہوگا۔

یہ روایت ابنؒ ابی شیبہ، عبدالرزاقؒ اور البیہقیؒ نے متصل سند کے ساتھ نقل کی ہیں۔

بظاہر ان احادیث میں تعارض پایا جاتا ہے لیکن ان میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے علماء نے درج ذیل مختلف طریقے اختیار کیے ہیں:

۱۔ جن احادیث میں مزارعت سے روکا گیا ہے وہاں نہی کو کراہت پر محمول کیا جائے۔ مگر اس باب میں مذکور حدیث میں اس احتمال کی گنجائش اس لیے موجود نہیں کہ اس میں "اَرْبَیْتُمَا" (تم نے ربا کا معاملہ کیا ہے) کے الفاظ ہیں اور ظاہر ہے کہ ربا اجماعاً حرام ہے۔ اس لیے یہاں کراہت اور حرمت کو جمع کرنا ممکن نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اس لیے حجت نہیں کہ اس کی سند پر نقد و جرح کی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ ان صحیح احادیث کے خلاف ہے جو متعدد طرق سے روایت کی گئی ہیں اور ان میں بٹائی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

امام شوکانی "نیل الاوطار" (۵-۲۱۲) میں لکھتے ہیں:

"مزارعت کو ربا کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ حضورؐ کی پوری زندگی میں اس پر عمل کیا جاتا رہا۔ اسی طرح جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت بھی اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا رہی۔ اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا معاملہ کریں جو مکروہ ہو اور پھر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک آپؐ اسی پر عمل کرتے رہیں۔ مگر احادیث کے باہمی تعارض کو دور کرنے کے لیے ہم اس قول کو اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اور اس مسئلہ میں اسی موقف کو ترجیح دیتے ہیں۔

اسی طرح جن احادیث میں مزارعت کو جائز قرار دیا گیا ہے ان کے بارے میں یہ رائے درست نہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص تھیں۔ اس لیے کہ یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو خصوصی طور پر کسی بات سے منع کیا ہو اور خود اس پر عمل کرتے ہوں تو وہ عمل آپ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ مخصوص ہوگا، لیکن اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہاں نہی امت کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک جماعت کو خیبر میں مزارعت پر مامور فرمایا اور جب تک حضورؐ بقیدِ حیات رہے صحابہ اس پر قائم رہے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد بھی جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت اس پر قائم رہی۔ اور یہ بات بعید از قیاس ہے

رافعؓ نے کہا: یہ میری کھیتی ہے۔ میں نے اس میں بیج ڈالا ہے اور کام بھی میرے ذمے ہے۔ اس طرح نصف حصہ میں لوں گا۔

کہ صحابہ اس کی حرمت سے آگاہ نہ ہوئے ہوں۔ (امام شوکانی کا بیان ختم ہوا)

احادیث کا باہمی تعارض دور کرنے کے لیے کچھ اور جوابات بھی دیے گئے ہیں:

۲۔ مثلاً یہ کہ جن احادیث میں مزارعت سے منع کیا گیا ہے وہ اس صورت پر محمول ہیں جب کہ زمین کا مالک اپنے لیے کسی خاص جگہ کی پیداوار متعین کرلے۔ وہ اس سلسلے میں رافع بن خدیج کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں کہ ہمارے پاس دوسرے انصار مدینہ کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں اراضی زمینیں تھیں اور ہمارا یہ معمول تھا کہ ہم زمین کو کرایہ پر دیتے وقت طے کر لیا کرتے تھے کہ اراضی کے فلاں حصے کی پیداوار ہماری ہوگی اور فلاں حصے کی پیداوار دوسرے شخص کی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک حصہ میں فصل ہوتی اور دوسرے میں نہ ہوتی، لہٰذا حضورؐ نے ہمیں اس سے روک دیا۔ البتہ چاندی کے عوض زمین کرایہ پر دینے سے نہیں روکا۔ (بخاری و مسلم)

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہمارے پاس مدینہ بھر میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں تھیں۔ اور ہمارا یہ معمول تھا کہ زمین بٹائی پر دیتے وقت ہم زمیندار کے لئے ایک خاص حصے کی پیداوار متعین کر لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ حصہ خراب ہو جاتا اور دوسرے حصے میں زیادہ فصل ہوتی اور بعض اوقات معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے روک دیا۔ ان دنوں سونے چاندی کے عوض زمین کو کرائے پر دینے کا رواج نہ تھا۔ (بخاری)

صحیح مسلم (۳-۱۱۸۳) میں یہ الفاظ ہیں:-

"عہدِ رسالت میں زمیندار اپنی زمین اس شرط پر دیتے تھے کہ کنوئیں کی نالیوں اور نہر کے آس پاس کی پیداوار ہماری ہوگی۔ بعض اوقات (جب بارش زیادہ ہوتی) تو فصل کا یہ حصہ تباہ ہو جاتا اور دوسرا حصہ مقابلۃً بہتر ہوتا۔ بعض اوقات (جب بارش کم ہوتی) تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ اور لوگوں کے یہاں زمین کو بٹائی پر دینے کی صرف یہی صورت رائج تھی۔ اس لیے حضورؐ نے اس سے منع فرمایا۔ البتہ اگر صورتِ حال ایسی نہ ہو اور کرایہ جانا پہچانا ہو تو مزارعت میں کچھ حرج نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ایسی مزارعت سے صرف اس لیے منع کیا گیا کہ یہ دھوکا اور جہالت پر منتج ہوتی ہے۔

۳۔ ان احادیث کے تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ کہا جائے کہ سونے چاندی کے عوض زمین کرایہ پر دینا جائز ہے۔ اس کی دلیل ابوداؤد (۳-۲۶۱) میں مروی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کھیتی باڑی تین آدمی کرتے ہیں:

(۱) وہ آدمی جس کی اپنی اراضی ہو (۲) وہ شخص جس کو کوئی آدمی ہدیۃً بلامعاوضہ اراضی عطا کرے (۳) وہ آدمی جو سونے چاندی کے عوض زمین کرایہ پر لے۔

لیکن تعارض ختم کرنے کے لیے یہ ضعیف ترین احتمال ہے۔ مزید برآں محاقلہ اور مزابنہ سے نہی کی حدیث خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ مگر حدیث کا باقی حصہ سعید بن المسیب کے کلام میں ملا جلا ہے چنانچہ امام نسائی نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

ایک اور حدیث حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں ہم کچی فصل فروخت کر دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات فصل کو نقصان

اور نصف حصہ فلاں شخص کا ہے۔ اس لیے کہ زمین اس کی ہے۔ یہ سُن کر حضورؐ نے فرمایا:

اَرْبَيْتُمَا فَرُدَّا الْأَرْضَ عَلٰى أَهْلِهَا وَخُذْ نَفَقَتَكَ۔

تم دونوں نے سودی معاملہ کیا ہے۔ زمین اس کے مالک کو واپس کر دو اور تم نے جو کچھ اس پر خرچ کیا ہے وہ لے لو۔

پہنچ جاتا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص کی زمین ہو وہ یا تو اسے خود کاشت کرے، یا کاشت کرنے کے لیے کسی بھائی کو دے دے، ورنہ اسے چھوڑ دے۔" (صحیح مسلم ۳-۱۱۷)

اہل علم کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عمومی نہیں خصوصی نوعیت کا ہے، اور اس میں اس بات کو مستحب قرار دیا گیا ہے کہ زمین کو خود کاشت کیا جائے یا دوسرے مسلمان بھائی کو دے دیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ زمین بے کار پڑی رہے۔ یہ تاویل اس لیے کرنی پڑی کہ اس پر اجماع ہے کہ کوئی چیز عاریۃً دینا واجب نہیں ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ کرایہ پر کوئی چیز دینا جائز ہے۔

۴۔ حضرت ابن عباسؓ سے تطبیق کی ایک اور صورت منقول ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو بٹائی پر دینے سے منع نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ نے ترغیب دلائی ہے کہ دوسرے مسلمان بھائی کو زمین بلا معاوضہ دی جائے اور اس سے حصہ وصول نہ کیا جائے۔

ترمذی نے یہ روایت نقل کی اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

لہ یہ حدیث مختلف روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔ میں نے اپنی کتاب "ابوھریرۃ فی ضوء مرویاتہ" میں ان میں سے بعض کو یکجا کر دیا ہے۔ فائدہ کے پیش نظر یہاں ان روایات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رہن رکھی ہوئی چیز کو بند نہ رکھا جائے۔

دیکھیے ابن ماجہ (۲-۸۱۶) موطا امام مالک (۲-۱۱۲) میں سعید بن المسیب سے مرسل سند کے ساتھ۔ نیز ملاحظہ ہو المستدرک للحاکم (۲-۵۱) حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیحین کی شرائط کے مطابق ہے۔ تاہم صحیحین میں یہ روایت نہیں ہے۔ اس لیے کہ زہری کے تلامذہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے

میں کہتا ہوں کہ اس اختلاف کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

۱۔ زیاد بن سعد، از زہری، از سعید، از ابو ہریرہ مرفوعاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا یغلق الرھن له غنمه وعلیه غرمه"۔ موارد الظمآن (۲۷۴) میں ہے کہ الحاکم (۲-۵۱)، بیہقی (۶-۳۹)، دارقطنی (۳-۳۲) اور ابن حبان نے اسے روایت کیا ہے۔

۲۔ مالک، از زہری، از سعید، از ابو ہریرہ مرفوعاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا یغلق الرھن له غنمه وعلیه غرمه" (الحاکم ۲-۵۱)
مالک، از زہری، از سعید مرسلاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا یغلق الرھن" (موطا امام مالک ۲-۱۱۲)

۳۔ ابن ابی ذئب، از زہری، از سعید مرسلاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا یغلق الرھن من صاحبه الذی رھنه له غنمه وعلیه غرمه" مسند شافعی (۲-۱۶۴) البیہقی (۶-۳۹) مصنف عبدالرزاق (۸-۲۳۷)

۴۔ ابن ابی ذئب از زہری، از سعید، از ابو ہریرہ مرفوعاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا یغلق الرھن لصاحبه غنمه وعلیه غرمه" الحاکم (۲-۵۱) البیہقی (۶-۳۹) دارقطنی (۳-۳۳)

ابن شعبان کی کتاب میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الرَّهْنُ مُرْتَهَنَةٌ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ۔ — رہن رکھی ہوئی چیز صرف رہن ہوتی ہے اور اس کے نفع اور نقصان کا حق دار ہوگا جو چیز کا اصل مالک ہے۔

یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں گروی تھی۔

ابن ابی ذئب، از زہری، از سعید، از ابوہریرہ مرفوعاً۔ الفاظ یہ ہیں: "لا یغلق الرهن له غنمه وعليه غرمه" دارقطنی (۳-۳۳)

ابن ابی ذئب، از زہری، از سعید و ابی سلمہ، از ابوہریرہ مرفوعاً۔ بدیں الفاظ "لا يغلق الرهن، الرهن لمن رهنه وعليه غرمه" الحاکم (۲-۵۱) دارقطنی (۳-۳۳) ابن حزم فی "المحلی"۔

۴- سلیمان بن ابی داؤد، از زہری، از سعید، از ابوہریرہ مرفوعاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا يغلق الرهن حتى يكون غنمه لك وعليه غرمه" الحاکم (۲-۵۱) دارقطنی (۳-۳۳)

۵- محمد بن ولید الزبیدی، از زہری، از سعید، از ابوہریرہ مرفوعاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا يغلق الرهن له غنمه وعليه غرمه" الحاکم (۲-۵۱) دارقطنی (۳-۳۳)

۶- معمر بن راشد، از زہری، از سعید، از ابوہریرہ مرفوعاً۔ بدیں الفاظ "لا يغلق الرهن لك غنمه وعليه غرمه" الحاکم (۲-۵۱) البیہقی (۶-۴۰)

معمر بن راشد، از زہری، از سعید مرسلاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا يغلق الرهن له غنمه وعليه غرمه" دارقطنی (۳-۳۳)

۷- سلیمان بن داؤد الرقی، از زہری، از سعید، از ابوہریرہ مرفوعاً۔ بدیں الفاظ "لا يغلق الرهن حتى يكون له غنمه وعليه غرمه" دارقطنی (۳-۳۳)

۸- یحییٰ بن ابی انیسہ، از زہری، از سعید، از ابوہریرہ مرفوعاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا يغلق الرهن من صاحبه الذي رهنه له غنمه وعليه غرمه" مسند شافعی (۲-۱۶۴)

۹- ابوحمزہ، از زہری، از سعید مرسلاً۔ الفاظ یہ ہیں "لا يغلق الرهن" البیہقی (۶-۴۴)

۱۰- طاؤس روایت کرتے ہیں کہ زہری سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کسی کے پاس کوئی چیز رہن رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میں فلاں روز تک یہ چیز تمہیں نہ دوں تو رہن رکھی ہوئی چیز کو جیسے چاہو کرو۔ زہری نے جواب دیا "رہن رکھی ہوئی چیز کو فروخت نہیں کیا جا سکتا جس کے پاس رہن رکھی گئی ہو وہ اپنا حق وصول کر کے زائد حصہ اصل مالک کو واپس کر دے۔ (مصنف عبدالرزاق (۸-۲۳۸) بروایت ابن عیینہ از عمرو بن دینار از زہری۔

فوائد۔ "رهن" کے لغوی معنی ٹھہراؤ اور دوام کے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں "مَاءٌ رَاهِنٌ" (ٹھہرا پانی) "نعمة راهنة" (دائمی نعمت) بعض اہل علم کے نزدیک "رهن" کے معنی حبس (بند کرنا) کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے "كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ" (الطور-۲۱) (ہر شخص اپنے اعمال میں پھنسا ہوا ہے)

دوسری جگہ فرمایا "كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ" (المدثر-۳۸) (ہر جان اپنے اعمال میں گرفتار ہے)

رہن کے شرعی معنی اس مال کے ہیں جو قرض خواہ کو اعتماد دلانے کے لیے دیا جاتا ہے کہ اگر اسے قرض کی رقم واپس نہ ملے تو وہ رہن رکھی گئی۔

(بقیہ حاشیہ)

چیز سے وصول کر لے۔ رہن رکھنے کا جواز کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ۔ (البقرۃ - ۲۸۳)

اگر تم سفر پر ہو اور دستاویز لکھنے والا نہ مل سکے تو (کوئی چیز) رہن با قبضہ رکھ کر (قرض لے لو)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھ کر اس سے غلہ خرید لیا تھا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

رہن کے جواز پر تمام اہل اسلام کا اجماع ہے۔

رہن سفر و حضر تمام حالات میں جائز ہے۔ ابن المنذر کہتے ہیں کہ مجاہد کے سوا کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ رہن رکھنا صرف سفر میں جائز ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے رہن کے سلسلے میں سفر کی شرط عائد کی ہے۔

اس کی تردید میں کہا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضر کی حالت میں اپنی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھی تھی، لہٰذا حضورؐ کے عمل سے حضر میں رہن کا جواز ثابت ہوا۔ باقی جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن کریم میں اس کے ساتھ سفر کی شرط کا ذکر کیا گیا ہے، تو یہ قید اس وجہ سے ہے کہ سفر کی حالت میں کاتب کے نہ ہونے کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح سے اس سے عہدہ برآ ہونے کا طریق کار بتایا گیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ اس لیے کہ شارع نے چیز کے اصل مالک کو ہی نفع و نقصان کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ جمہور مالکیہ، شوافع اور احناف کا یہی مسلک ہے۔ اس کے برعکس امام احمدؒ، اسحاقؒ، لیثؒ اور حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ جس کے پاس کوئی چیز رہن رکھی گئی ہو وہ اس سے فائدہ اٹھانے کا مجاز ہے بشرطیکہ وہ مرہونہ چیز کی حفاظت و نگہداشت میں حصہ لیتا ہو۔ یہ روایت رکھنے والے حضرات، حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سواری کا جانور جس کے پاس رہن رکھا گیا ہو وہ خرچ کرنے کے عوض اس پر سواری کر سکتا ہے۔ دودھ دینے والا جانور اگر رہن رکھا گیا ہو تو اس پر خرچ کرنے کے بدلے میں اس کا دودھ پیا جا سکتا ہے۔ جو شخص جانور پر سواری کرتا ہے یا اس کا دودھ پیتا ہے اس پر خرچ کرنا اسی کے ذمے ہے۔" (صحیح بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

مسند احمد میں یہ الفاظ ہیں:۔

"جب سواری کا جانور رہن رکھا گیا ہو تو اس کا چارہ مرتہن کے ذمہ ہے۔ دودھ دینے والے جانور کا دودھ پیا جا سکتا ہے۔ دودھ پینے والے کے ذمے اس کا چارہ ہے۔"

دارقطنی اور الحاکم میں یہ الفاظ ہیں:۔

"رہن رکھے ہوئے جانور پر سواری بھی کی جا سکتی ہے اور اس کا دودھ بھی پیا جا سکتا ہے۔"

مندرجہ بالا احادیث امام احمدؒ بن حنبل اور دیگر محدثین کے اختیار کردہ مسلک کی مؤید ہیں۔ اس کے برعکس اس باب میں جو حدیث آئی ہے اس کے بارے میں محدثین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ متصل ہے یا مرسل اور یہ کہ یہ مرفوع حدیث ہے یا موقوف؟ محدثین کا یہ اختلاف حدیث کی صحت کو بڑی حد تک متاثر کرتا ہے۔

مساقاة[1] اور دیگر امور کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

امام مالکؒ[2] مؤطا میں ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں۔ وہ سعید بن المسیبؓ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر فتح کیا تو یہود کو فرمایا: میں تمھیں خیبر میں اس وقت تک ٹھہرنے کی اجازت دیتا ہوں جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو اجازت[3] ہے۔ خیبر میں تمھارا قیام اس شرط پر ہوگا کہ درختوں کا پھل ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک

---

[1] المساقاة: کا مادہ سَقْیٌ (پلانا) ہے۔ مساقاة کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص اپنا باغ کسی کو دے کر کہے کہ تم اس کی رکھوالی کرو اور اس کو پانی دو اور تمھیں پھل کا اتنا حصہ دیا جائے گا۔ مُساقاة سَقْیٌ (مصدر) سے باب مفاعلہ ہے جس میں اشتراک کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کو مساقات اس لیے کہا جاتا ہے کہ اہل حجاز کے ہاں درختوں کو پانی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔ آبپاشی ان کے یہاں کنوؤں کے پانی سے کی جاتی تھی۔ لہٰذا اس کو مساقاة (باہم سیراب کرنا) کہنے لگے۔ (المغنی ۵-۳۲۳)

مساقاة کا جواز حدیث، سنت اور اجماع دونوں سے ثابت ہے۔ البتہ امام شافعیؒ اس کو کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں کے ساتھ مختص قرار دیتے ہیں۔ امام احمد کے نزدیک مساقاة کھجور کے درختوں، انگور کی بیلوں اور دیگر درختوں میں جائز ہے۔

امام مالکؒ نے اس میں مزید وسعت پیدا کر دی ہے۔ ان کے نزدیک ہر جڑ دار پودے اور درخت میں مساقات جائز ہے، البتہ ان کے نزدیک سبزیاں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ظاہریہ "مساقاة" کو صرف کھجور ہی تک محدود کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مساقات کسی چیز میں بھی جائز نہیں۔ ان اقوال کی تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو مؤطا امام مالک (۲-۷۰۹) کتاب المساقاة، باب "ما جاء فی المساقاة" زرقانی شرح مؤطا (۴-۱۴۳) میں لکھتے ہیں:

"ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مؤطا کے تمام راویوں اور ابن شہاب کے تلامذہ نے یہ حدیث مرسلاً روایت کی ہے، البتہ اہل علم کا ایک گروہ اس کو متصل کہتا ہے۔ اس کی متصل سند میں ایک راوی صالح بن ابی اخضر ہے جو ضعیف ہے۔ صالح نے اس میں ابوہریرہؓ کا اضافہ کیا ہے۔"

طحاوی نے یہ حدیث "شرح معانی الآثار" (۲-۳۸) میں ایک دوسری سند کے ساتھ نافعؒ سے روایت کی ہے اور وہ رافعؓ بن خدیج سے روایت کرتے ہیں۔

[3] اہل علم کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں معاہدہ کی مدت کی جانب اشارہ ہے۔ حضورؐ کا مقصد یہ ہے کہ جب تک ہم چاہیں گے تمھیں خیبر میں ٹھہرنے کی اجازت دیں گے۔ جب چاہیں گے نکال دیں گے۔ اس لیے کہ آپ کفار کو جزیرۂ عرب سے نکال دینا چاہتے تھے۔ جیسا کہ عمر کے آخری حصے میں حضورؐ نے کفار کو جزیرۂ عرب سے نکالنے کا حکم صادر کیا تھا۔ (شرح صحیح مسلم للنووی)۔

ہوگا" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ رضؓ بن رواحہ کو خیبر بھیجا کرتے تھے۔ وہ درختوں پر پھل کا اندازہ لگا کر تقسیم کرتے۔ پھر اس کے بعد کسی ایک حصہ کے بارے میں یہودیوں کو کہتے کہ چاہے تم لے لو اور چاہو تو مجھے دے دو۔ چنانچہ یہودی کوئی ایک حصہ لے لیا کرتے۔

سنن[۱] ابو داؤد میں ہے کہ عبداللہ بن رواحہ نے اندازہ لگایا کہ کل پھل چالیس ہزار وسق ہوگا۔ یہودیوں نے کہا کہ ہم یہ پھل لے لیتے ہیں اور آپ کو بیس ہزار وسق (ایک پیمانہ) کھجوریں دے دیں گے۔ یہ اضافہ مصنف عبدالرزاق[۲] اور بعض دوسری کتب حدیث میں موجود ہے۔

صحیح مسلم[۳] میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں "ہم جب تک چاہیں گے تمہیں خیبر میں ٹھہرنے دیں گے"۔
ایک دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں[۴] کہ "فیصلہ یہ ہوا کہ یہودی اپنا مال خرچ کر کے زمینوں میں کاشت کریں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیداوار کا نصف حصہ دیں گے۔

ان کے قول "علی ان یعتملوھا من اموالھم" میں اس بات کی دلیل ہے کہ اراضی کا مالک کاشت کے لئے زراعت کی عملی مدد بھی نہیں کرے گا۔ امام مالکؒ[۵] فرماتے ہیں کہ "مساقاۃ" ہر پھل دار درخت میں جائز ہے۔ مثلاً کھجور کے درخت، انگور، انجیر، زیتون، انار، شفتالو، اخروٹ، بادام، گلاب اور اسی قسم کی دوسری اشیا۔ جن شرائط پر بھی فریقین راضی ہو جائیں۔ امام مالک کے نزدیک ان کے مطابق معاملہ طے کیا جا سکتا ہے۔

امام شافعیؒ[۶] فرماتے ہیں کہ مساقاۃ صرف کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں میں نصف حصہ کے عوض جائز ہے۔ اس لیے

---

۱ ابو داؤد (۳-۲۶۴) کتاب "البیوع" باب "الخرص" بروایت جابرؓ بن عبداللہ۔ المنذری نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے۔

۲ مصنف عبدالرزاق (۸-۱۰۳) نیز طحاوی فی "شرح معانی الآثار" (۲-۳۹)

۳ صحیح مسلم (۳-۱۱۸۷) کتاب "المساقاۃ" باب "المساقاۃ والمعاملۃ بجزء من الثمر والزرع"

۴ صحیح مسلم

۵ "المدونہ" (۵-۲۲) امام مالکؒ فرماتے ہیں "مساقاۃ" کا معاملہ ہر جڑ دار پودے کے سلسلے میں جائز ہے۔ اس میں چنبیلی، گلاب، اور کپاس سب شامل ہیں۔ "مواھب الجلیل" (۵-۳۷۲) میں ہے:

"جس چیز میں بھی محنت و مشقت کی ضرورت ہو اور نگرانی کے بغیر اس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو اس میں مساقاۃ جائز ہے۔ اور اگر اس میں محنت کی ضرورت نہ ہو بلکہ صرف اس کی حفاظت مطلوب ہو۔ یا صرف کاٹنے اور کاٹنے کی ضرورت ہو تو اس میں مساقاۃ جائز نہیں۔ اس کو اجارۂ فاسدہ تصور کیا جائے گا"

۶ کتاب الام (۴-۱۱) اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں میں مساقاۃ جائز ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تخمینہ کے ذریعے ان دونوں کا حصہ وصول کیا کرتے تھے۔ آپ کے ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں پھل صاف نمایاں ہوتے ہیں ان میں کوئی پردہ نہیں ہوتا، جس کی بنا پر اس کا تخمینہ آسان ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے پھل اس طرح نہیں ہوتے۔ عام طور پر پھلوں پر چھلکا ہوتا ہے اور وہ الگ الگ

کہ عہدِ رسالت میں یہی حصہ مقرر تھا۔ امام شافعی کا ایک[1] دوسرا قول یہ بھی ہے کہ مساقاۃ ہر جڑ دار درخت میں جائز ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ مساقاۃ اس لیے بالکل جائز نہیں کہ یہ مجہول معاوضہ ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہ مسلک خیبر کے معاملے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے عمل کے بظاہر خلاف ہے لیکن ان کا استدلال یہ ہے کہ جب خیبر کا علاقہ فتح ہوا تو وہاں کے باشندے گویا غلام قرار پائے۔ اور آقا و غلام کے مابین بعض وہ معاملے بھی جائز ہوتے ہیں جو دو آزاد آدمیوں کے درمیان جائز نہیں ہوتے[2]

ہوتے ہیں یکجا نہیں ہوتے۔ اس لیے کھجور کے درختوں اور انگوروں کی بیلوں کے سوا کسی دوسرے پھل میں مساقاۃ جائز نہیں کھیتی میں تو مساقاۃ بالکل روا نہیں ہے۔

[1] امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ مساقاۃ ہر جڑ دار پودے میں جائز ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ دوسرے درخت بھی کھجور کی مانند ہوتے ہیں۔ کھجور ہی کی طرح ان کی بھی جڑیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا جس طرح کھجور کے درختوں میں مساقاۃ جائز ہے۔ اسی طرح یہ دوسرے درختوں میں بھی جائز ہے۔ مزید برآں یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ خیبر میں کھجوروں کے علاوہ اور قسم کے درخت بھی تھے اور کوئی روایت حضورؐ سے ایسی منقول نہیں کہ ان درختوں کو کھجوروں سے الگ کیا گیا ہو، لہٰذا تمام قسم کے پودوں میں مساقاۃ جائز ٹھہری۔ لغوی طور پر بھی مساقاۃ میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ہر وہ پودا جس کو سیراب کرنے کی ضرورت ہو۔ دیکھیے "المجموع" (۱۴-۲۳۵)

[2] "العنایۃ" کے مصنف کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ مساقاۃ کو مزارعت پر قیاس کرکے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں آپؐ نے "بیع المخابرہ" سے منع فرمایا ہے۔ ان کی دلیل یہ بھی ہے کہ مساقاۃ اجارہ کی قسم کا ایک معاملہ ہے جو پیداوار کے عوض مدت مقررۃ تک کیا جاتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے پن چکی (گھراٹ) کو اجارہ پر دینے کا مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک اس کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر پیداوار ہو تو اس کی مقدار کا پہلے سے پتہ نہیں ہوتا۔ اور اگر پیداوار سرے سے ہو ہی نہیں تو ایسی چیز کو اجرت پر دیا گیا جس کا کوئی وجود ہی نہیں اور یہ دونوں ہی صورتیں ناجائز ہیں۔

اہل خیبر کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ کیا تھا اس کا جواب امام ابوحنیفہ یہ دیتے ہیں کہ یہ خراج مقاسمہ کی قسم کا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی جو پیداوار ہوتی حضورؐ اس کو تقسیم کر دیا کرتے تھے اور یہ فریقین کے مابین مصالحت کے طور پر تھا، اور یہ جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین کی ساری پیداوار بھی لے لیتے تب بھی یہ جائز تھا کیونکہ خیبر کی ساری زمین مال غنیمت تھی۔ آپؐ جو کچھ بھی اہل خیبر کو دیتے تھے وہ آپؐ کا ان پر فضل و احسان تھا۔ خیبر کے معاملہ کو مساقاۃ قرار نہ دینے کی دوسری وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ اس کے لیے مدت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس بات پر علماء کا اجماع قائم ہو چکا ہے کہ مساقاۃ کا معاملہ مدت کے تعین کے بغیر درست نہیں ہے۔" دیکھیے العنایہ برحاشیہ فتح القدیر (۸-۳۴۳)

احناف کچھ مزید دلائل بھی پیش کرتے ہیں جو اسی اساس پر مبنی ہیں کہ مساقاۃ کے عدم جواز کی وجہ اس میں غرر (دھوکہ فریب) کے امکان کا پایا جانا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک کے خلاف دلیل یہ ہے کہ اہل خیبر غلام نہ تھے۔ کیونکہ وہ تو عہد رسالت اور خلافت صدیقی میں اور پھر خلافت فاروقی کے اوائل میں بھی اس وقت تک مساقاۃ پر قائم رہے جب تک کہ حضرت عمرؓ نے ان کو خیبر سے جلا وطن نہ کر دیا۔ نہ توان کو فروخت کیا گیا اور نہ ہی آزاد کیا گیا۔ محدثین میں سے بھی کسی نے ایسی کوئی روایت نقل نہیں کی جس سے پتہ چلتا ہو کہ اہل خیبر سے جو کچھ وصول کیا گیا وہ جزیہ تھا یا نہیں۔ البتہ ایک بات ہے کہ سورۃ "التوبۃ" چونکہ غزوۂ خیبر کے بعد نازل ہوئی تھی لہٰذا اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خیبر والوں سے جزیہ وصول کیا گیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

امام شافعیؒ کے اس مسلک کے خلاف کہ کھجور اور انگور کے سوا دوسرے پودوں میں مساقاۃ جائز نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کے ساتھ نصف پیداوار کے عوض معاملہ طے کیا تھا۔ خواہ وہ پیداوار غلہ ہو یا پھل۔ لہٰذا امام شافعی کا یہ موقف خلاف نص ہے کہ کھیتی میں مساقاۃ جائز نہیں۔ امام شافعی انگور کی بیلوں کو کھجور کے درختوں پر قیاس کر کے ان میں مساقاۃ کے قائل ہیں۔ حالانکہ انگوروں کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں۔ اس کے برعکس کھیتی کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے، مگر امام شافعی اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا جمہور علماء امام شافعی کی اس رائے کے خلاف ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی پیداوار میں سے ازواج مطہرات کو ہر سال اسّی وسق کھجور اور بیس وسق جو (کل سو وسق سالانہ) دیا کرتے تھے۔[1]

امام مالکؒ فرماتے ہیں خیبر کی بنجر زمین کم تھی اور وہ سرسبز علاقہ کے آس پاس واقع تھی۔[2]

"الواضحہ" میں ہے کہ خیبر میں بے آباد زمین آج تک کم ہے۔ امام مالک کا یہ قول "المدونۃ" اور دوسری کتابوں میں مذکور ہے: "مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ ویران زمین کو کاشتکار کے لیے چھوڑ دیا جائے"۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ امام مالک یہ کیسے کہتے ہیں کہ مزارعہ سے بنجر زمین کا معاوضہ وصول نہ کیا جائے جبکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر سے کھیتی اور پھل کا نصف حصہ لیا تھا، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ امام مالک نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ[3] سے منع فرمایا تھا۔ مخابرہ کے معنی ہیں زمین کو گندم کے عوض کرایہ پر دینا۔ امام مالک کا خیال یہ تھا کہ یہ نہی آپ نے فتح خیبر

---

[1] صحیح مسلم (۳-۱۱۸۶) کتاب "المساقات" باب "المساقاۃ والمعاملۃ بجزء من الثمر والزرع"۔

[2] المدونۃ (۵-۲۰۰)

[3] المُخَابَرَۃُ:- خبیر بروزن فعیل سے مشتق ہے۔ اس کے معنی مزارع اور کسان کے ہیں۔ ابو عُبَید اور اکثر لغوی اور فقہاء یہی کہتے ہیں۔ اہل علم کی ایک دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ "الخبار" (بفتح الخاء وتخفیف الباء) سے مشتق ہے۔ اس کے معنی نرم زمین کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ "الخُبْرَۃ" (بضم الخاء) سے نکلا ہے۔ خُبرہ مچھلی یا گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ابن الاعرابی کا قول ہے کہ یہ خیبر سے مشتق ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کا معاملہ سب سے پہلے خیبر میں ہوا تھا۔

امام شافعی کے ساتھی اور شاگرد کہتے ہیں کہ مخابرہ زمین کی پیداوار کے عوض اس میں اس شرط پر کام کرنے کو کہتے ہیں کہ مزارع اس میں بیج خود ڈالے گا۔ السبکی "المجموع" (۱۱-۳۵) میں لکھتے ہیں کہ مخابرہ کی یہ تعریف امام شافعی کے مسلک کے عین مطابق ہے۔

کے بعد صادر فرمائی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فرمان پر عمل کیا جاتا ہے جو سب سے آخر میں دیا گیا، مزید جب بے آباد اراضی کا حصہ مزارع کے ذمہ واجب الادا نہیں تو اس سے اشکال کا ازالہ ہو گیا۔ اور اگر تو آباد زمین کی پیداوار کا حق دار مزارع اور مالک دونوں کو ٹھہرایا جائے تو بھی درست ہے۔ یہ بات ابو محمد بن دحوان نے کہی ہے۔

الاُقلیشی سے منقول ہے کہ یہ بات مجھے ابو عمر ابن القطان نے بتائی ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے عبد اللہ بن ابی حَدرد سے مسجد میں قرض کا تقاضا کیا۔ ان دونوں کی آوازیں اتنی بلند ہوئیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں وہ سنیں۔ آپ نے دروازے کا پردہ اٹھا کر کعب بن مالک کو آواز دی۔ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں؟ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ نصف قرض معاف کر دو۔ حضرت کعب نے

اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کے ساتھ طے کیا تھا کہ انھیں کھیتی اور باغ کا نصف حصہ ملے گا بشرطیکہ وہ اس میں محنت کریں۔ عربی محاورہ میں بولتے ہیں "خَابَرَهُمْ" (ان کے ساتھ اہل خیبر والا معاملہ کیا)

ؔ۱ امام بخاری نے اس حدیث کا اپنی صحیح میں متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ چند مقامات کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے:

۱۔ بخاری کتاب "الصلوٰۃ" باب "التقاضی والملازمۃ فی المسجد" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۵۷)

۲۔ کتاب الصلوٰۃ باب "رفع الصوت فی المسجد" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۷۱)

۳۔ کتاب "الخصومات" باب "کلام الخصوم بعضهم فی بعض" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۱۸)

۴۔ کتاب الخصومات باب "الملازمۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۲۴)

۵۔ کتاب "الصلح" باب "هل یشیر الامام بالصلح" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۰۶)

۶۔ باب "الصلح بالدین والعین" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۱۰)

ؔ۲ صحیح مسلم (۳۔ ۱۱۹۱) کتاب "المساقاۃ" باب "استحباب الوضع من الدین" ابوداؤد (۳۔ ۳۰۴) کتاب "الاقضیۃ" باب فی الصلح۔ نسائی (۸۔ ۲۳۹) کتاب "القضاۃ" باب "حکم الحاکم فی دارہ"۔

فوائد۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل مستنبط ہوتے ہیں:۔

۱۔ مسجد میں قرض کی واپسی کا تقاضا کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ حق دار کی سفارش جائز ہے۔

۔ جن لوگوں میں جھگڑا ہو ان کے درمیان صلح کرانا جائز ہے۔

۴۔ سفارش اگر گناہ پر مبنی نہ ہو تو اسے قبول کرنا جائز ہے۔

۵۔ اشارہ سے مطلب سمجھانا اور دوسرے کا اس کے مطابق عمل کرنا درست ہے۔ شرح للنووی (۱۰۔ ۲۲۰)

ؔ۳ عبد اللہ بن ابی حَدرد۔ ابو حَدرد کا نام سلامہ ہے۔ بعض کے نزدیک عُبید بن عُمیر بن ابی سلامہ اسلمی اور کنیت ابو محمد ہے عبد اللہ کے والد صحابی تھے۔ ابن مندہ کہتے ہیں ان کے صحابی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دیکھیے "الاصابۃ" (۲۔ ۲۸۶)

عرض کی "یا رسول اللہ! میں نے تعمیل ارشاد میں نصف قرض معاف کر دیا۔" پھر آپ نے عبداللہ سے کہا "اٹھو اور باقی قرض ادا کر دو۔"
دوسری روایت میں[1] یہ الفاظ ہیں کہ "آپ نے یوں اشارہ کیا گویا فرما رہے ہیں کہ نصف قرض معاف کر دیں۔"

احادیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے قبیلہ خثعم کی جانب ایک فوجی دستہ بھیجا۔ اس قبیلے کے لوگ جان بچانے کے لیے سجدہ ریز ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے بارے میں رسول اکرمؐ نے نصف دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔[2]

بعض اہل عراق کہتے ہیں کہ حضورؐ نے نصف دیت دینے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ ممکن ہے کہ انھوں نے مشرف بہ اسلام ہونے کی بنا پر سجدہ کیا ہو۔ اس صورت میں ان کے قتل کی پوری دیت واجب الادا ہوگی اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ ان کا سجدہ مسلمان ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ دھوکہ دینے کے لیے ہو۔ اس صورت میں ان کے قتل کی بنا پر کسی قسم کی دیت ادا نہیں کی جائے گی۔

ابوداؤد[3] میں حضرت سمرہؓ بن جندب سے مروی ہے کہ ایک انصاری کے باغ میں ان کے کھجوروں کے کچھ درخت تھے۔ باغ میں انصاری کے اہل و عیال بھی مقیم تھے۔ حضرت سمرہ جب اپنے کھجور کے درختوں کو دیکھنے جاتے تو انصاری کو تکلیف ہوتی اور انھیں

---

[1] صحیح بخاری کی سابق الذکر روایت میں راوی الاعرج نے اس کی تصریح کی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۰۶)

[2] ابوداؤد (۳-۵۴) کتاب "الجہاد" باب "النہی عن القتل من اعتصم بالسجود" بروایت ہناد بن السری، عن معاویہ، عن اسماعیل، عن قیس، عن جریر بن عبداللہ۔ اس حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو مسلمان مشرکین کے درمیان رہتا ہو میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ صحابہؓ نے سوال کیا "یا رسول اللہ! کیوں؟" آپؐ نے فرمایا "دونوں ایک دوسرے کی آگ جلتی ہوئی نہ دیکھ پائیں۔"
ابوداؤد کہتے ہیں یہ حدیث ہشیم اور معمر نے روایت کی ہے۔ ایک نسخہ میں ہے کہ یہ حدیث معتمر، خالد واسطی اور راویوں کی ایک جماعت نے روایت کی ہے، مگر انھوں نے جریر کے نام کا ذکر نہیں کیا۔ ترمذی (۴-۱۵۵) کتاب "السیر" باب "ما جاء فی کراھیۃ المقام بین اظہر المشرکین"۔ بروایت ہناد مثل سابق۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث عبدہ نے اسماعیل سے روایت کی ہے، مگر اس میں جریر کا ذکر نہیں کیا اور یہ زیادہ صحیح ہے۔ امام ترمذی مزید کہتے ہیں کہ میں نے (اپنے استاد) امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کو یہ کہتے سنا ہے کہ قیس کی روایت مرسل ہے۔
اس سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف کے دعوے کے برعکس یہ حدیث ثابت نہیں۔
سمرہؓ بن جندب سے مروی ایک حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ سمرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا "مشرکوں میں رہائش نہ رکھا کرو اور ان کے ساتھ اکٹھے رہا کرو۔ جس شخص نے ان کے درمیان بود و باش رکھی یا ان کے ساتھ مل جل کر رہا تو اسے انہی کے زمرہ میں شمار کیا جائے گا۔"
حدیث کے الفاظ یہ ہیں: لَا تُسَاكِنُوا الْمُشْرِكِينَ وَلَا تُجَامِعُوهُمْ فَمَنْ سَاكَنَهُمْ أَوْ جَامَعَهُمْ فَهُوَ مِنْهُمْ "
ترمذی نے یہ حدیث جامع ترمذی کتاب "السیر" باب مذکور میں بلا سند روایت کی ہے۔ اس کے علاوہ ابوداؤد (۳-۲۸۹) کتاب "الجہاد" باب "فی الاقامۃ بارض الشرک" میں یہ حدیث مرفوع سند کے ساتھ مذکور ہے۔ اس کی سند میں سلیمان بن سمرہ راوی ہے جو صادق القول مگر قدرے ضعیف ہے۔

[3] ملاحظہ ہو ابوداؤد (۳-۳۱۵) کتاب "القضاء" باب "فی القضاء"۔ اس کی سند میں ابوجعفر محمد بن علی ہے جو سمرہ بن جندب سے روایت کرتا ہے۔ مگر اس کا سماع سمرہ سے ثابت نہیں۔ ابوجعفر ۵۶ھ میں پیدا ہوا۔ اس لیے صحابہ سے اس نے مرسل روایتیں کی ہیں۔

سخت ناگوار گزرتا۔ انصاری نے کہا یہ درخت میرے پاس فروخت کر دیں۔ مگر سمرہ نہ مانے۔ اس نے کہا کہ ان کے عوض دوسری جگہ کھجور کے درخت لے لیں۔ سمرہ پھر بھی راضی نہ ہوئے۔ تب انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپ کو سارا واقعہ سنایا۔ حضورؐ نے سمرہؓ سے کہا کہ وہ درخت بیچ دیں یا اُن کے عوض دوسری جگہ درخت لے لیں۔ سمرہؓ ان باتوں پر راضی نہ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ درخت مجھے دے دو اور تمھیں اس کا بدلہ جنت میں ملے گا۔ سمرہؓ اس پر راضی نہ ہوئے تو آپؐ نے ان کو مخاطب کرکے فرمایا "تم تو ضرر رساں آدمی ہو۔" پھر آپؐ نے انصاری سے فرمایا "جاؤ اور اس کے درخت کاٹ دو۔" آپؐ کے الفاظ یہ ہیں: "اِذْهَبْ فَاخْلَعْ نَخْلَهُ"

حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ دو شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں جھگڑتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کے کھجوروں کے چند درخت تھے اور جھگڑا ان درختوں کی حدود کا تھا۔ حضورؐ نے اس جگہ کو ناپنے کا حکم دیا۔ وہ جگہ سات گز کے رقبہ پر مشتمل تھی۔ دوسری روایت میں پانچ گز کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے پیمائش کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ عبدالعزیز[۲] کہتے ہیں کہ ان درختوں کی ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی کے ساتھ اس جگہ کو ناپا گیا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

تذہیب التہذیب (۸-۳۵۱) میں ہے کہ محمدؐ بن علی نے چند صحابہ سے یہ روایت مرسلاً بیان کی ہے مگر انھوں نے یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ جابر، اور عبداللہ بن جعفر سے روایت نہیں کی۔ المنذری کا قول ہے کہ محمدؐ بن علی کے سمرہؓ سے حدیثیں سننے میں شک ہے۔

[۱] ابوداؤد بحوالہ مذکور۔ المنذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔

[۲] یہ عبدالعزیز ابن محمد دراوردی ہیں۔ عبدالعزیز نے یہ حدیث ابو طوالہ سے روایت کی ہے جو سچا راوی ہے، مگر وہ دوسروں کی کتابوں سے دیکھ کر حدیثیں روایت کیا کرتا تھا اس لیے غلطی کر جایا کرتا تھا۔

اس روایت کی مزید ایک دوسری روایت بھی ہے جو حضرت عبادہؓ بن صامت سے منقول ہے۔ حضرت عبادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ اگر راستے کے قریب کسی کی زیر ملکیت کھلی جگہ ہو اور وہ اس پر عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ سات گز راستہ چھوڑ کر باقی حصے میں عمارت بنالے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اگر کسی شخص کے کھجور کے ایک یا دو یا تین درخت ہوں۔ تو کھجور کے ہر درخت کے اردگرد اتنی جگہ چھوڑی جائے جہاں تک اس درخت کی ٹہنیاں پہنچتی ہوں۔

عبداللہ بن احمد نے یہ پوری حدیث زوائد المسند میں روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں محدث ابو عوانہ نے، اور الطبرانی نے المعجم الکبیر میں بھی اس کو روایت کیا ہے۔ (عون المعبود ۱۰-۷۰)

الہیثمی "مجمع الزوائد" (۴-۲۰۵) میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن احمد نے یہ حدیث عبادہ بن صامت سے روایت کی ہے۔ مگر اسحاق نے عبادہؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ المعجم الکبیر للطبرانی میں ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے درخت کا حریم (رقبہ) اس کی شاخوں کی طوالت کے برابر مقرر کیا، مگر اس کی سند میں منصور سقیر نامی راوی ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد ۴-۶۹)

كتاب الوصايا

وصیت سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

عربی متن میں "الوصیۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو "الیصاءُ" اور "توصیۃٌ" سے اسم ہے۔ عربی محاورہ میں کہتے ہیں "اَوصٰی فُلَانٌ وَوَصّٰی فُلَانٌ بِکَذَا مِنَ الْمَالِ اَوِ الْعَمَلِ" (فلاں شخص نے اتنے مال یا فلاں کام کی وصیت کی) نیز "وَصّٰی لِفُلَانٍ وَاَوصٰی لَہٗ کَذَا مِن مالٍ اَو منفعۃٍ" (فلاں شخص کے لیے اتنے مال یا نفع کی وصیت کی) وصیت کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ	تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت
الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ	آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہو تو ماں باپ
لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا	اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے
عَلَى الْمُتَّقِينَ (البقرہ: ۱۸۰)	(خدا سے) ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے۔

اس آیت کریمہ میں علماء نے "خیراً" سے مال کثیر مراد لیا ہے۔ کثرت کا مفہوم "خیراً" کے نکرہ ہونے سے پیدا ہوا ہے۔ دیکھیے بیضاوی (۱-۴۳)۔ اس مفہوم پر حضرت علیؓ کی اس روایت سے استدلال کیا گیا ہے کہ آپ کے ایک آزاد کردہ غلام نے وصیت کرنا چاہی۔ اس کے پاس صرف سات سو درہم تھے۔ آپ نے اسے منع کیا اور فرمایا قرآن میں "اِنْ تَرَكَ خَيْرًا" کے الفاظ ہیں۔ اور خیر مال کثیر کو کہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق مروی ہے کہ ایک شخص نے وصیت کرنا چاہی۔ ام المومنینؓ نے دریافت کیا کہ تمھارے پاس کتنا مال ہے؟ اس نے کہا "تین ہزار" آپ نے پھر دریافت کیا "تمھارے کنبہ کے کتنے افراد ہیں"؟ اس نے کہا "چار" حضرت عائشہؓ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تو "اِنْ تَرَكَ خَيْرًا" فرمایا ہے اور یہ مال نہایت قلیل ہے۔ یہ اپنے عیال ہی کے لیے رہنے دو"

اس بات میں اختلاف ہے کہ "کثیر" کا اطلاق کس قدر مال پر کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر میت سات سو درہم ترکہ چھوڑے تو اس میں وصیت نہ کرے۔ دیکھیے البیہقی (۶-۲۷۰)

اس سے معلوم ہوا کہ مال جب سات سو درہم سے زیادہ ہو تو مرنے والے کو وصیت کرنا چاہیے۔

افضل یہ ہے کہ مال کو کسی خاص مقدار تک محدود نہ کیا جائے اس لیے کہ قلت و کثرت ایک اضافی چیز ہے جو زمان و مکان، افراد اور حالات کے اختلاف سے تبدیل ہو جاتی ہے۔

جمہور اہل علم کے ہاں اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ آیت میراث یا ابو امامہ باہلی کی روایت کردہ حدیث "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ" (وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں) سے منسوخ ہو گئی ہے یا نہیں۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

"یہ حکم آغاز اسلام میں تھا۔ لیکن آیت میراث اور حدیث "لا وصیۃ لوارث" سے منسوخ ٹھہرا۔" آگے مزید لکھتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ)

"مگر یہ بات محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ آیتِ میراث اس کی معارض نہیں بلکہ اس کی مؤکد ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وصیت کی جائے اور ترکہ بعد میں تقسیم کیا جائے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے تو وہ خبرِ واحد ہے۔ اس لیے وہ قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ حدیث مقبولِ عام ہے، مگر مقبولِ عام ہونے کی بنا پر اس کو حدیثِ متواتر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔"

قاضی بیضاوی کی رائے درست ہے۔ اس لیے کہ کسی دلیل سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ آیتِ میراث "آیتِ وصیت" کے بعد نازل ہوئی تھی کہ اسے اس کا ناسخ قرار دیا جائے۔ مزید برآں دونوں آیتوں میں مطابقت پیدا کرنا بالکل ممکن ہے اور وہ یوں کہ وصیت اس رشتہ دار کے حق میں کی جائے جو وارث نہ ہو۔ گویا آیتِ وصیت میں اقربین سے غیر وارث رشتہ دار مراد ہیں۔ اس عدمِ وراثت کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرنے والا مسلم ہو اور اس کے قریبی عزیز کافر ہوں۔ مثلاً کافر مسلمان ہو جائے اور اس کی موت کا وقت قریب ہو اور اس کے والدین کافر ہوں، تو وہ شخص کافر والدین کے حق میں وصیت کرنے کا مجاز ہے تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ

(العنکبوت: ۸)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے لیکن (اے مخاطب) اگر تیرے ماں باپ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک بنائے جس کی حقیقت سے تجھے واقفیت نہیں تو ان کا کہنا نہ مانیو۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ

(سورۃ لقمان - ۱۵)

اور اگر وہ دونوں تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا۔ ہاں دنیا (کے کاموں میں) ان کا اچھی طرح ساتھ دینا اور جو شخص میری طرف رجوع کرے اس کے راستے پر چلنا۔

ابو امامہ باہلی کی روایت کردہ حدیث کا ترمذی نے (۴ - ۴۳۳) کتاب "الوصایا" باب "ما جاء فی لا وصیۃ لوارث" میں ذکر کیا ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔ اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش نامی راوی ضعیف ہے۔ ترمذی نے اسماعیل کی روایت کردہ حدیث کو اس لیے حسن کہا ہے کہ یہ حدیث انھوں نے شامی راویوں سے نقل کی ہے۔ اور اسماعیل جب اہلِ شام سے روایت کرتا ہے تو بعض محدثین اس کی روایت کو قوی قرار دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ترمذی میں ایک اور حدیث عمرو بن خارجہ سے مروی ہے۔ اس کو ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے۔ اس کی سند میں شہر بن حوشب ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد محمد بن اسماعیل بخاری سے شہر بن حوشب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اسے ثقہ راوی قرار دیا۔ اور فرمایا کہ ابن عون اس پر نقد و جرح کرتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں شہر بن حوشب سے روایت کرنے

موطا[1] امام مالک، صحیح بخاری[2] اور صحیح مسلم[3] میں زہری سے منقول ہے۔ وہ عامر بن سعد بن ابی وقاص سے روایت کرتے

میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

بایں ہمہ یہ احادیث متواتر کے درجہ کی نہیں ہیں کہ قرآن کریم کی نص قطعی کو منسوخ کر سکیں بخصوصاً جب کہ صحیحین کی ایک صحیح حدیث بھی ان کی معارض ہے۔ اس حدیث کے راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ بات کسی مسلم کو زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی چیز کے بارے میں وصیت کرنا چاہتا ہو اور پھر وہ بلا وصیت کیے دو راتیں بسر کرے۔ اِلّا یہ کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود ہو" یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

امام ابن حزمؒ "المحلّی" (۱۰-۴۱۷) میں لکھتے ہیں:

"ہم نے وصیت کے وجوب کے بارے میں ایک حدیث بطریق ابن مبارک، عن عبداللہ بن عون، عن نافع عن ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ مزید براں ایک روایت ہم نے بروایت عبدالرزاق، عن حسن بن عبیداللہ بھی روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ وصیت کے بارے میں نہایت سختی سے کام لیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابی اوفیٰ، طلحہ بن مطرف، طاؤس، شعبی اور دیگر اہل علم کا موقف بھی یہی ہے"۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (۵-۳۸۵) میں لکھتے ہیں:۔

"بعض علمائے سلف وجوب وصیت کے قائل ہیں۔ وہ اپنے موقف پر آیت وصیت اور ابن عمرؓ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ زہری، عطاء اور ابو مجلز انہی علماء میں سے ہیں۔ البیہقی نے امام شافعی کا قدیم قول یہی نقل کیا ہے۔ اسحاق، داؤد، ابو عوانہ اسفرائینی، ابن جریر اور دیگر علماء کا مسلک بھی یہی ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت میراث نے اس آیت کو منسوخ نہیں کیا۔ اس لیے کہ دونوں آیات میں سرے سے کوئی تعارض پایا ہی نہیں جاتا، بلکہ آیت میراث اس آیت کی مؤید ہے۔ اس بات کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ آیت میراث بعد میں نازل ہوئی اس لیے وہ اس آیت کی ناسخ نہیں ہو سکتی ہے۔

اسی طرح یہ حدیث بھی آیت وصیت کی ناسخ نہیں ہو سکتی، لہٰذا یہ آیت محکم ہے اور اس کا حکم باقی ہے (تفسیر المنار ۲-۱۴۱)

[1] موطا امام مالک (۲-۱۳۱) کتاب "القضاء" باب "الوصیۃ فی الثلث لا یتعدیٰ"

[2] صحیح بخاری کتاب "الوصایا" باب "الوصیۃ بالثلث" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۴۴)

[3] صحیح مسلم (۳-۱۲۵) کتاب "الوصیۃ" باب "الوصیۃ بالثلث"۔

ابوداؤد (۳-۱۱۳) کتاب "الوصیۃ" باب "ما جاء فیما لا یجوز للموصی فی مالہ"۔

نسائی (۲-۱۴۲) کتاب "الوصیۃ" باب "الوصیۃ بالثلث" مصنف عبدالرزاق (۷-۶۴)

شرح معانی الآثار للطحاوی (۲-۴۱۹) طحاوی نے یہ حدیث متعدد اسناد کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علماء نے اس ضمن میں گفتگو کی ہے کہ کیا کوئی شخص اپنے تہائی مال کی وصیت کر سکتا ہے یا اسے اس سے کم کی وصیت کرنا چاہیے؟ علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ حسب مرضی اپنے ایک تہائی مال کی وصیت کرنے کا مجاز ہے۔ وہ حضرت سعدؓ کی روایت

ہیں اور وہ اپنے والد سے۔ انھوں نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع والے سال میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں سخت درد میں مبتلا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں سخت درد میں مبتلا ہوں۔ میں مالدار شخص ہوں اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کے طور پر دے سکتا ہوں؟ یہ حدیث امام مالک، سفیان بن عُیَینہ اور ابراہیم بن سعد نے زہری سے روایت کی ہے۔ وہ عامر بن سعد سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد سعد سے۔ اس میں "اتصدق" (کیا میں صدقہ کر سکتا ہوں) کے الفاظ ہیں۔

یہی حدیث عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور معمر نے بھی زہری سے روایت کی ہے۔ وہ عامر سے اور وہ اپنے والد سے "اُوصی" (کیا میں وصیت کروں) کے الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح اس حدیث کو عُروہ اور حضرت عائشہؓ نے سعد سے روایت کیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں یہ دونوں لفظ موجود ہیں۔

دونوں کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "آیا میں سارا مال صدقہ کروں"؟ حضورؐ نے فرمایا "نہیں"۔ حضرت سعدؓ نے کہا "دو تہائی"؟ فرمایا "نہیں"۔ عرض کی تو کیا نصف مال صدقہ کر دوں؟ فرمایا "نہیں" کہا "ایک تہائی"؟ فرمایا "ہاں! ایک تہائی مال صدقہ کر سکتے ہو اور ایک تہائی بھی زیادہ ہی ہے"۔

اب ہم مؤطا امام مالک کی روایت کے الفاظ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں" میں نے عرض کیا کیا نصف مال صدقہ کر دوں؟ فرمایا "نہیں" پھر آپ نے فرمایا "تم ایک تہائی مال صدقہ کر سکتے ہو۔ اور ایک تہائی بھی زیادہ ہی ہے۔ اور اگر تم اپنے ورثاء کو تونگری کی حالت میں چھوڑ جاؤ تو اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں تنگدست چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ یاد رکھو کہ تم رضائے الٰہی کے حصول کے لیے جو خرچ بھی کرو گے تمھیں اس کا اجر دیا جائے گا۔

مؤطا امام مالک میں یحییٰ بن یحییٰ کی روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ "تمھیں اجر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ تمھیں اس مال کا بھی اجر ملے گا جو تم اپنی بیوی پر خرچ کرو"۔

صحیح مسلم میں الفاظ یہ ہیں "حتیٰ کہ اس لقمے کا بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو"۔ حضرت سعدؓ کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں اپنے رفقاء کے بعد بھی زندہ رہوں گا؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم اپنے رفقاء

سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک تہائی مال میں وصیت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ قبل ازیں اس سے زیادہ مال کی وصیت کرنے سے آپ نے منع کیا تھا۔ دوسرا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ وصیت ایک تہائی مال سے کم میں کرنا چاہیے اس لیے کہ حضور کا ارشاد ہے "والثلث کثیر" (تہائی مال بہت زیادہ ہے) (طحاوی کا بیان ختم ہوا)

امام ابن حزم المحلّی (۱۰-۴۲۵) میں فرماتے ہیں:-

" ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں قطع نظر اس سے کہ وصیت کرنے والے کا کوئی وارث ہو یا نہ ہو اور وارث اس کو اس امر کی اجازت دیں یا نہ دیں" ابن حزم اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

کے بعد زندہ رہے تو نیک کام کرتے رہنا۔" مسلم میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے تم جو خرچ بھی کرو گے اس سے تمھارے درجات بلند ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ تم اپنے احباب کے بعد زندہ رہو اور کچھ لوگوں کو تمھارے ذریعے فائدہ پہنچے اور کچھ لوگوں کو نقصان پہنچے[1]۔

اس کے بعد آپؐ نے دعا فرمائی "اے اللہ! میرے صحابہؓ کو ہجرت کی تکمیل کی توفیق دے اور ان کو اپنی ہجرت سے روگردانی کرنے سے بچا۔"

(اس موقع پر آپؐ نے ایک دوسرے صحابی حضرت سعد بن خولہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا)[2] "آہ! بیچارے سعدؓ بن خولہ جو مکہ میں ہی فوت ہو گئے۔ ان کے بارے میں اللہ کے رسول کو سخت صدمہ ہے۔"

---

[1] یہ حدیث رسول اکرمؐ کے معجزات میں سے ہے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بعد میں زندہ رہے حتیٰ کہ آپؓ کے ہاتھوں عراق فتح ہوا۔ بہت سے لوگوں نے دین و دنیا میں آپ سے فائدہ اٹھایا۔ کفار کو دین و دنیا میں آپ کے ہاتھوں نقصان پہنچا۔ آپ نے انھیں قتل کر کے واصل جہنم کیا۔ ان کے بیوی بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ ان کا مال و اسباب غنیمت ٹھہرا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص عراق کے والی بنے۔ بہت سے لوگوں نے آپ کے ہاتھوں ہدایت پائی اور کفار ترک کفر اٹھانے پر مجبور ہوئے (شرح مسلم للنووی (۱۱ - ۷۸)

[2] سعد بن خولہ کے واقعہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عیسٰی بن دینار کہتے ہیں کہ سعدؓ بن خولہ نے ہجرت نہیں کی تھی اور مکہ ہی میں وفات پائی۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ سعدؓ بن خولہ نے ہجرت کی اور غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ پھر مکہ لوٹ گئے اور وہیں وفات پائی۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ سعدؓ بن خولہ نے دوسری دفعہ حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ وہ بدر اور دیگر غزوات میں بھی شریک ہوئے تھے۔ سعدؓ بن خولہ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سنہ ۱۰ھ میں مکہ میں وفات پائی۔ ایک قول کے مطابق سنہ ۷ھ میں وفات پائی جب کہ وہ مدینہ سے چل کر مکہ پہنچے تھے۔ عیسٰی بن دینار کے قول کے مطابق سعدؓ بن خولہ کے اوپر افسوس کھانے کی وجہ ان کا اپنی مرضی سے مدینہ سے نکلنا، ان کی ہجرت کا ضائع ہونا اور مکہ میں وفات پانا تھا۔ دیگر علماء کے قول کے مطابق سعدؓ پر افسوس کھانے کی وجہ ان کی مکہ میں وفات تھی۔ قطع نظر اس سے کہ یہ بات ان کے اختیار میں نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ دار الہجرت مدینہ میں وفات پانے کے اجر و ثواب سے محروم رہے۔ اور وہاں سے دور مکہ میں وفات پائی۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں:-

"اس حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعدؓ بن ابی وقاص کے ساتھ ایک آدمی کو مقرر کر دیا اور اسے حکم دیا کہ اگر سعد مکہ میں وفات پا جائیں تو ان کو وہاں دفن نہ کریں۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ سعدؓ بن ابی وقاص اس بات سے ڈرتے تھے کہ جس سرزمین سے انھوں نے ہجرت کی ہے کہیں وہ اس میں وفات نہ پا جائیں۔ جس طرح سعد بن خولہ مکہ میں فوت ہوئے تھے۔ سعدؓ بن خولہ سُبَیعَہ اسلمیہ کے خاوند تھے (شرح مسلم للنووی (۱۱ - ۸۰)

ابن الاثیرؒ "اسد الغابۃ" (۲ - ۲۴۷) میں لکھتے ہیں:-

"اہل علم کے یہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ سعد بن خولہ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں فوت ہوئے تھے۔ البتہ طبری نے ذکر کیا ہے کہ سعد نے سنہ ۷ھ میں وفات پائی، مگر پہلی بات ہی صحیح ہے۔

ابن مزین نے شرح مؤطا میں لکھا ہے کہ سعدؓ مکہ ہی میں مقیم رہے اور انھوں نے وہیں وفات پائی۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ نہ آسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند کیا اور اس پر صدمے کا اظہار فرمایا مگر یہ ابن مزین کی غلطی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سعد نے ہجرت کی تھی اور غزوہ بدر میں بھی شرکت کی تھی اور حضورؐ کے ان پر ترس کھانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہجرت کے بعد مکہ لوٹ گئے تھے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔ امام بخاری و مسلم اور دیگر محدثین نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ سعد قبیلہ قریش کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کہیں باہر گئے ہوئے تھے کہ ان کی والدہ نے وفات پائی۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میری والدہ میری عدم موجودگی میں وفات پا گئیں اور وہ کوئی وصیت بھی اس لیے نہ کر سکیں کہ میں ان کے پاس موجود نہ تھا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں یا غلام آزاد کردوں تو کیا میری والدہ کو اس کا اجر ملے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیا۔ عبدالرحمٰنؓ نے ان کی طرف سے دس غلام آزاد کیے۔[1]

امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ اس بارے میں متفق ہیں کہ وصیت کرنا فرض نہیں مستحب ہے[2] جب کہ دوسرے اہل علم اس کو فرض قرار دیتے ہیں۔

اس بات پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو وہ وصیت کردہ چیز کا مالک وصیت کرنے والے کی وفات کے بعد بنے گا۔[3] اس بات پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ وصیت کنندہ کے وفات پا جانے کے بعد "موصٰی لہٗ" کو اس بات کا اختیار ہو گا کہ وصیت کردہ چیز کو قبول کرے یا اسے رد کر دے۔ اور اگر وہ اسے رد کر دے تو اس چیز کو باقی ترکہ میں شامل کر کے ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۹-۶۰) بروایت ابن جریج از عبید اللہ بن عُمیر، عن عبداللہ بن عبداللہ، عن ابن عُمیر۔ اس کی سند میں مجہول راوی ہیں۔

[2] ان کا خیال ہے کہ آیت وصیت منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ آیت میراث ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

[3] دیکھیے "المغنی" (۶-۸۸) نیز "بدایۃ المجتہد" (۲-۲۵۲)

اوقاف کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

"الواضحہ[1] میں بروایت الواقدی[2] از حصین بن عبدالرحمان بن سعد بن معاذ منقول ہے کہ ہم نے سوال کیا کہ اسلام میں سب سے پہلا وقف کونسا ہوا تھا؟ ایک شخص نے جواب دیا وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف کیے تھے۔ یہ جواب انصار نے دیا۔ مہاجرین نے کہا اسلام میں سب سے پہلا وقف وہ تھا جو حضرت عمرؓ نے کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں کچھ کشادہ زمین قبائل زہرہ، اہلِ رائج[3] اور حسکہ والوں کی ملکیت تھی۔ ان لوگوں کو حضور کی تشریف آوری سے تھوڑا عرصہ پہلے مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ کچھ لوگ، وہ بھی تھے جن کو حضورؐ کے مدینہ آنے کے بعد وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ لوگ بڑا وسیع رقبہ چھوڑ گئے تھے۔ اس میں سے کچھ قابل کاشت زمین تھی اور کچھ ردی قسم[4] کی تھی جس کو سیراب نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کو خشاشیر کہتے تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے ثمغ نامی زمین حضرت عمرؓ کو دے دی۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے اسی سے ملحقہ زمین یہود سے خرید لی تھی۔ حضرت عمرؓ اس جائداد کو بہت پسند کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میری کچھ جائداد ہے جو مجھے بہت عزیز ہے تو میں اسے کیا کروں؟ حضورؐ نے فرمایا: "اصل جائداد محفوظ رکھو اور اس کا پھل اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا کرو۔" حضرت عمرؓ نے تعمیلِ ارشاد کی۔

مُطرِف[5]، العمری سے، وہ نافع سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ثمغ[6] نامی زمین اولین صدقہ ہے جو ظہورِ اسلام کے بعد کیا گیا۔

ل متن میں "المحبس" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی میں "اطلاق" کی ضد ہے۔ یہ لفظ وقف مال کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے نہ فروخت کیا جائے نہ ہبہ کیا جائے۔ جمہور فقہاء میں سے کسی نے بھی وقف کے بجائے "المحبس" کا عنوان قائم نہیں کیا۔ یہ صرف مغربی علماء کی اصطلاح ہے۔

ٹ ابن ابی شیبہ نے "المصنف" میں اور الخصاف نے "احکام الوقف" (ص ۴) میں اس کو واقدی سے، بروایت عُتبہ بن جُبیرہ، عن الحُصَین بن عبدالرحمٰن بن عمرو بن سعد ابن معاذ نقل کیا ہے اور الواقدی مشہور کذاب ہے۔

ٹ الخصاف میں "اہل برائح" مرقوم ہے۔ غالباً یہ براح سے محرف ہے۔ لسان العرب میں ہے: "ارض براح" وہ کشادہ زمین جس میں کوئی سرسبزی نہ ہو۔ براح کا لفظ متن میں آگے آرہا ہے۔

ٹ الخصاف میں ہے کہ اس کو وادی "الخشاشیر" کہا جاتا تھا۔ خشاشیر مدینہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے۔

ھ امام احمد نے مسند میں حماد بن خالد سے یہ روایت کی ہے۔ وہ (حماد) العمری سے روایت کرتے ہیں۔

ٹ ثَمغ بفتح الثاء وسکون المیم۔ مدینہ کے قریب ایک زمین کا نام ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی ملکیت تھی۔

حضرت عمرؓ نے جب اس جائداد کو صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ضمن میں مشورہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ جائداد اپنے پاس رکھو اور اس کا پھل خدا کی راہ میں وقف کر دو[1]

مسور بن رفاعہ کعب القرظیؓ[2] سے روایت کرتے ہیں کہ اسلام میں اولین صدقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقف کردہ اموال ہیں۔ میں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ سب سے پہلا صدقہ حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ تو کعب نے کہا کہ مُخَیریقؓ[3] حضورؐ کے مدینہ تشریف لانے کے بائیس ماہ بعد غزوہ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری موت کے بعد میرا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] حدیث کے اس ٹکڑے کو نسائی نے (۶-۲۳۲) کتاب "الاحباس" باب "حبس المشاع" میں شمار کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کا مکمل واقعہ بخاری نے کتاب "الوصایا" باب "الوقف" میں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو خیبر میں کچھ زمین ملی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھے خیبر میں ایسی زمین ملی ہے کہ اس سے بہتر جائداد مجھے آج تک نہیں ملی۔ آپ اس بارے میں مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا چاہو تو زمین اپنے پاس رہنے دو اور اس کی پیداوار وقف کر دو۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے وہ اراضی اس شرط پر وقف کر دی کہ اسے نہ فروخت کیا جائے۔ نہ ہبہ کیا جائے، نہ کسی کو وراثت میں دی جائے۔ اس زمین کی پیداوار کو فقراء، اقارب، غلاموں، مہمانوں اور مسافروں کے لیے راہ خدا میں وقف کیا جاتا ہے۔ جو شخص اس جائداد کا متولی بنے وہ مناسب طریقہ سے اس میں سے کھا سکتا اور اپنے ضرورت مند دوست کو کھلا سکتا ہے۔

صحیح مسلم (۳-۱۲۵۵) کتاب "الوصیة بالوقف"۔

بخاری نے صخر بن جویریہ کی روایت میں تصریح کی ہے کہ اس زمین کا نام ثمغ تھا۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۶۴) نیز دارقطنی (۴-۱۸۷) نے بھی اس کا یہی نام لکھا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ثمغ ان اراضی میں سے تھی جو حضرت عمرؓ کو خیبر کے مالِ غنیمت سے حاصل ہوئی تھیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اولین صدقہ وہ تھا جو مخیریقؓ نے کیا تھا جو حضورؐ کی مدینہ میں تشریف آوری کے بائیس ماہ بعد غزوہ احد کے موقع پر شہید کر دیے گئے تھے لہٰذا مصنف نے جو روایت نقل کی ہے وہ درست نہیں ہے۔

[2] یہ حدیث الخصاف نے "احکام الوقف" (ص ۲) میں پہلے تو ابن ابی سبرہ عن المسور کی سند کی ساتھ اختصار کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس کے بعد صالح بن جعفر عن المسور کی سند کے ساتھ تفصیل سے روایت کی ہے۔ دونوں جگہ "عن ابن کعب" کہا ہے۔ (احکام الوقف ص ۴)

[3] مُخَیریق کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ذہبی واقدی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ قبیلہ بنی نضیر سے تعلق رکھتے تھے اور یہودی علماء میں سے تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے متعلق پیشگوئیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ ذہبی نے ان کو صحابہ کے زمرہ میں شمار کیا ہے مگر الخصاف نے واقدی سے نقل کیا ہے کہ وہ مشرف باسلام نہیں ہوئے۔ انھوں نے یہودی ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حمایت میں جنگ کی۔ اور جب قتل ہو گئے تو مسلمانوں کے قبرستان کے ایک گوشے میں مدفون ہوئے۔ ان کی نماز جنازہ ادا نہیں کی گئی تھی۔

ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ انھوں نے وصیت کی تھی کہ میرا مال میری موت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا جائے۔ غزوۂ اُحد میں شرکت کی اور وہیں شہید ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مخیریق یہود میں سے سبقت کرنے والا تھا سلمانؓ فارسیؓ

کو دے دیا جائے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حسب فرمان جہاں چاہیں اسے صرف کریں۔ وہ سات باغات تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وقف کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے ثمغ کی اراضی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیبر سے واپس آنے کے بعد ۷ھ میں وقف کیا تھا۔ خیبر کا واقعہ ۷ھ میں پیش آیا تھا۔

زہریؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات باغات قبیلہ بنی نضیر کی جائدادوں میں سے وقف کیے تھے۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اُحد سے واپس آئے تو آپ نے مخیریق کے اموال کو تقسیم کر دیا تھا۔

محمد بن سہل بن ابی حثمہ سے مروی ہے کہ قبیلہ بنی نضیر کی جائدادوں میں سے حضورؐ نے سات باغات صدقہ کیے تھے۔[۲] ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) الاعراف (۲) الصافیہ (۳) الدلال (۴) المیثب (۵) بُرقہ (۶) حُسنیٰ (۷) مَشربہ اُمّ ابراہیم (یہ نام اس لیے کہ اُمّ ابراہیم اس میں سکونت پذیر تھیں) یہ مال سلام بن مشکم کا تھا جو قبیلہ بنو نضیر سے تعلق رکھتا تھا۔

واقدی کہتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ یہ سات باغات تھے اور ان کے نام یہی تھے جو ذکر کیے گئے۔

سنن نسائی میں قتیبہ بن سعید، عن ابوالاحوص، عن ابواسحاق، عن عمرو بن الحارث کی سند کے ساتھ روایت ہے کہ رسول اکرم

میں سابق الاسلام، اور بلال حبشیوں میں پہلے اسلام لانے والے تھے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخیریق اسلام لائے اور شہادت سے سرفراز ہوئے تھے۔ واللہ اعلم (خلاصۃ الوفاء ص ۲۴۷)

[۱] الخصاف نے واقدی سے بروایت ضحاک بن عثمان عن زہری کی سند کے ساتھ اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

[۲] الخصاف نے یہ حدیث محمد بن عمر حارثی سے لی، انھوں نے محمد بن سہل سے روایت کی ہے۔ انھوں نے ان کا نام محمد بن سہل بن ابی حثمہ ذکر کیا ہے اور الاعراف کی بجائے وہ الاعواف لکھتے ہیں۔ سلام کا نام انھوں نے سلام بن مشکم النضیری نقل کیا ہے۔

باغات کے نام الخصاف نے مندرجہ ذیل دیے ہیں:

۱۔ اَلْاَعْوَاف۔ بالعین والواو آخرھا فاءٌ۔

۲۔ اَلصَّافِیَۃ۔ بالصاد المھملۃ والفاء۔

۳۔ الدَّلَال۔ علی وزن سحاب بالدال المھملۃ۔

۴۔ اَلْمِیْثَب۔ بکسر المیم وسکون الیاء وفتح الثاء وآخرھا باء موحدۃ۔

۵۔ بُرْقَۃ۔ بضم الباء وسکون القاف۔

۶۔ حُسْنیٰ۔ بفتح الحاء وسکون السین وبعد النون الف مکسورۃ۔

۷۔ مَشْرَبَۃ۔ بفتح الراء۔

[۳] دیکھیے سنن نسائی (۲-۲۲۹) کتاب الاحباس، دارقطنی (۴-۱۸۵) عن محمد بن عبداللہ بن زکریا عن نسائی۔ امام بخاری نے یہ

نے اپنی وفات کے بعد نہ تو کوئی لونڈی غلام پیچھے چھوڑا اور نہ ہی درہم و دینار البتہ آپؐ نے سفید رنگ کا ایک خچر چھوڑا تھا جس پر آپ سواری فرمایا کرتے تھے۔ کچھ اسلحہ باقی چھوڑا اور کچھ زمین تھی جو آپؐ نے اللہ کی راہ میں دے دی تھی۔

نسائی کی ایک اور روایت میں جو قتیبہ بن سعید ہی سے منقول ہے، صدقہ کا لفظ ہے کہ آپؐ نے وہ زمین صدقہ کر دی تھی۔

امام نسائی[۲] بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وہ زمین صدقہ کی تھی جو انھیں خیبر میں ملی تھی اور آپؓ نے صدقہ کرتے وقت تحریر فرما دیا تھا کہ:

"اصل زمین نہ تو فروخت کی جائے، نہ ہبہ کی جائے، نہ ہی ورثہ میں کسی کو منتقل کی جائے۔ یہ اراضی فقراء، مقروض لوگوں، غلاموں، مہمانوں، مسافروں اور فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں کے لیے وقف ہے۔ جو شخص اس کا متولی ہو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ وہ اس میں سے جائز طور پر خود بھی کھائے اور اپنے نادار دوستوں کو بھی کھلائے۔

کتاب "الوصایا" میں روایت کی گئی ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۳۹) بروایت ابراہیم بن الحارث، عن یحییٰ بن ابی بکر عن زہیر بن معاویہ الجعفی عن ابو اسحاق و عمرو بن الحارث۔ یہ عمرو بن الحارث حضرت جویریہؓ بنت الحارث کے بھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر نسبتی تھے۔

[۲] نسائی (۲-۲۳۱) الخصاف نے "احکام الوقف" (ص ۵) میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔

صدقہ اور ہبہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور اُن کا اجر و ثواب

مؤطا[1] امام مالک میں ہے کہ ایک انصاری صحابی نے جو بنی حارث ابن الخزرج کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، اپنے والدین پر صدقہ کیا۔ یہ صدقہ کھجور کے درختوں پر مشتمل تھا۔ جب والدین نے وفات پائی تو وہی مال اس کو وراثت میں واپس مل گیا۔ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ضمن میں سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا: "تمھیں تمھارے صدقے کا اجر و ثواب مل گیا۔ اب تم اپنے والدین کے وارث کی حیثیت سے اس میں سے اپنا حصہ لو"۔

مصنف ابن[2] ابی شیبہ کی کتاب "الاقضیۃ" میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری عورت کو اس کے بیٹے کا کھجوروں کا ایک باغ ہبہ کر دیا۔ جب اس عورت نے وفات پائی تو اس کے بیٹے نے کہا کہ میں نے تو اپنی والدہ کو یہ باغ اس کی زندگی تک دیا تھا۔ اس شخص کے کچھ بھائی بھی تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ باغ زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی اسی عورت کا ہے۔" لڑکے نے کہا: "میں نے صدقہ کے طور پر یہ باغ اپنی والدہ کو دیا تھا۔" آپؐ نے فرمایا: "اب یہ باغ اسی کا ہے اور تم سے وہ بہت دور ہے۔"

سفیانؒ بن عیینہ، عمروؒ بن دینار سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہؓ بن زید جنھوں نے اذان کے بارے میں خواب دیکھا تھا۔

---

[1] مؤطا امام مالک (۲-۷۳۰) کتاب "الاقضاء" باب "صدقۃ الحی من المیت"۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے۔ یہاں انصاری سے مراد عبداللہؓ بن زید بن عبدربہ انصاری خزرجی صاحب الاذان ہیں۔ (شرح موطا للزرقانی (۴-۶۵))
مصنف کا خیال ہے کہ یہ اور صحابی کا واقعہ ہے۔ اور عبداللہؓ بن زید کا واقعہ چند سطروں کے بعد آ رہا ہے۔

[2] سنن ابو داؤد (۳-۲۹۵) کتاب "البیوع" باب "فی العمری"۔ المنذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔ الہیثمی کہتے ہیں کہ امام احمد نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد (۴-۲۳۲))

[3] اس حدیث کے بارے میں ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ متعدد طرق سے مروی ہے اور یہ ان میں سے پہلی سند ہے۔ اس حدیث کا ذکر عبدالرزاق نے عمرو بن دینار اور عبداللہ بن ابی بکر و حمید الاعرج کے حوالے سے کیا ہے۔ یہ سب ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ ان کے والد کو دے دیا۔ پھر والدین نے وفات پائی تو وہ باغ آپؐ نے عبداللہ بن زید کو واپس کر دیا۔

دوسری سند جس کے ساتھ یہ حدیث عبدالرزاق نے روایت کی ہے وہ بطریق معمر، عن ایوب، عن عمرو بن دینار، عن ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم منقول ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک انصاری نے اپنا باغ صدقہ کر دیا الخ دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۹-۱۲۱)

انھوں نے اپنا باغ صدقہ کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کو اس باغ کا متولی قرار دیا۔ ان کے والدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ عبداللہ بن زید کے پاس اس باغ کے سوا دوسرا کوئی مال نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ ان (عبداللہ کے والدین) کو دے دیا۔ بعدازاں وہ دونوں فوت ہوگئے اور وہ باغ وراثت میں عبداللہ بن زید کو مل گیا۔

موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ میرے والد مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک غلام تھا وہ میں نے اپنے بیٹے کو دے دیا۔ حضور نے پوچھا کہ تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟ صحیح مسلم میں یونس اور معمر نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ کیا تم نے سب بیٹوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟" انھوں نے کہا "نہیں"۔ آپ نے فرمایا "تو پھر اس سے بھی واپس لے لو"۔

صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ "خدا سے ڈرا کرو اور اولاد میں عدل سے کام لیا کرو"۔ نعمان کی والدہ کا نام عمرہ بنت رواحہ تھا۔ اس نے پہلے تو خاوند بشیر سے کہا "اپنے ہبہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا لیجیے"۔ بشیر نے ہبہ کرنے میں ایک سال کی تاخیر کردی۔ نعمان کی والدہ نے کہا "میں اس وقت تک اسے پسند نہیں کرتی جب تک کہ تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر گواہ نہیں بنا لیتے"۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں ظلم پر مبنی کام کا گواہ نہیں بننا چاہتا"۔

حنفیہ اس بیٹے کو ہبہ کرنے کے سلسلے میں یہ حدیث بنیادی حکم رکھتی ہے۔ اس کے برعکس جب والد اپنے بالغ بیٹے یا کسی

طبرانی نے یہ حدیث ایک تیسری سند کے ساتھ بروایت بشر بن محمد بن عبداللہ بن زید نقل کی ہے۔ بشر کہتے ہیں کہ ہم نے اسے وراثت میں پایا۔ الہیثمی "مجمع الزوائد" (۴-۲۳) میں لکھتے ہیں کہ "بشر" کا تعارف مجھے کہیں نہیں مل سکا۔

۱ موطا امام مالک (۲-۱۲۵) کتاب "القضاء" باب "ما لا یجوز من النحل"۔

۲ صحیح بخاری کتاب "الھبۃ" باب "الھبۃ للولد" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۸۶)

نیز صحیح بخاری کتاب "الاشھاد علی الھبۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۸۷) مزید براں صحیح بخاری کتاب "الشھادات" باب "لا یشھد علی شھادۃ جور اذا اشھد" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۶۵۰)

۳ صحیح مسلم (۳-۱۲۴۱) کتاب "الھبۃ" باب "کراھیۃ تفضیل بعض الاولاد فی الھبۃ"۔

۴ جو اہل علم اولاد کے مابین مساوات کو ضروری قرار دیتے ہیں انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ امام بخاری نے اس کی تصریح کی ہے۔ طاؤس، ثوری، احمد، اسحاق اور بعض مالکیہ کا یہی مسلک ہے۔ ان علماء کے نزدیک اگر کوئی شخص عدم مساوات کرے تو اس کا فعل باطل ہوگا۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اس کا یہ فعل اگرچہ صحیح ہے مگر اس سے رجوع کرنا واجب ہے۔ امام احمد یہ بھی فرماتے ہیں کہ معقول وجہ کی بنا پر اولاد کے درمیان ترجیحی سلوک درست ہے۔ مثلاً کوئی بچہ اپاہج اور معذور ہو۔ یا نسبتاً زیادہ دیندار ہو تو اس کے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھا جا سکتا ہے۔

قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ اگر کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے ایک بچے کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے تو وہ ناجائز ہوگا اور اس

اجنبی کو کوئی چیز ہبہ کرے تو ہبہ کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ شخص جس کو ہبہ کیا گیا یا جس پر صدقہ کیا گیا، اس چیز کا قبضہ لے لے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کو جو کچھ فرمایا تھا اسے اس ضمن میں اصل قرار دیا گیا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا۔ "اگر تم اس ہبہ پر قابض ہوتیں تو وہ تمھارا ہوتا لیکن اب تو وہ وارث کا مال ہے"۔[1]

جب سورۃ التکاثر نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:[2]

"آدم کا بیٹا کہتا ہے میرا مال۔ حالانکہ تیرا مال تو وہی ہے جو تو کھا پی کر ختم کردے۔ یا پہن کر اسے پرانا کردے، یا صدقہ کرے اور اسے صدقہ لینے والے کے قبضہ میں دے دے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: یَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ مَالِی - وَهَلْ لَكَ مِنْ مَالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے قبضہ کو ضروری قرار دیا ہے جس پر وہ صدقہ کیا گیا ہو۔ اس کی مثال قرض یا بیع سلف کی مانند ہے کہ اس کی تکمیل قبضہ کے ساتھ ہوتی ہے یا جیسے وصیت کہ اسے اس وقت مکمل قرار دیا جائے گا جب وصیت کنندہ وفات پا جائے۔

مصنف عبدالرزاق میں طاؤس سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا آپ نے بھی سے

صورت میں مساوات واجب ہوگی۔

اس ضمن میں جمہور اہل علم کا موقف یہ ہے کہ مساوات مستحب ہے۔ ترجیحی سلوک کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن ناپسندیدہ ہے۔ ایسی صورت میں جلد از جلد مساوات قائم کرنا یا اس طرز عمل سے رجوع کر لینا چاہیے۔ دیکھیے فتح الباری (۵-۲۱۴)

[1] مصنف عبدالرزاق (۹-۱۰۳) بروایت عطاء عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ آپ بیان کرتی ہیں کہ میرے والد نے مجھے کچھ عطیہ دیا تھا۔ جب ان کی وفات کا وقت آیا تو مجھے بلا کر فرمانے لگے "بیٹی! تو مجھے سب لوگوں سے زیادہ عزیز ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ تجھے دیا تھا وہ مجھے واپس دے دے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا بہتر۔

[2] صحیح مسلم (۴-۲۲۷۳) کتاب "الزھد" بروایت مُطرِّف از والد خود۔

جامع ترمذی (۴-۵۷۲) باب "ما جاء فی الزھد فی الدنیا" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

سنن نسائی (۲-۲۳۸) کتاب "الوصایا" باب "الكراهية فی تاخير الوصية" حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ اس کی روایت امام احمدؒ نے مسند (۲-۳۶۸-۴۱۲) میں کی ہے۔ نیز صحیح مسلم کتاب "الزھد" میں بھی اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ کہتا ہے میرا مال، میرا مال۔ حالانکہ اس کی ملکیت صرف تین چیزیں ہیں۔ جو کچھ اس نے کھایا اور اسے فنا کر دیا۔ یا پہن کر پرانا کر دیا، یا صدقہ کے طور پر دیا اور اسے توشۂ عاقبت بنا لیا۔ اس کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ فانی ہے اور وہ اسے لوگوں کے لیے چھوڑ جائے گا"۔

[3] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۹-۱۰۵) طاؤس تابعی ہیں آپ کی وفات ۱۰۶ھ میں ہوئی۔ وہ ثقہ راوی اور بڑے فاضل تھے۔ یہ روایت مرسل ہے۔

تحفہ دیا مگر وہ خوش نہ ہوا۔ آپؐ نے اور دیا وہ پھر بھی راضی نہ ہوا۔ آپؐ نے مزید دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ آپؐ نے تین مرتبہ تحائف دیئے مگر وہ خوش نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا "میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ میں کسی کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا"[1]

اس حدیث کے راوی عمر کہتے ہیں کہ شاید آپؐ نے یہ فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں صرف کسی قرشی، یا انصاری یا ثقفی شخص ہی سے تحفہ لیا کروں۔ ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ "یا قبیلۂ دوس کے کسی آدمی سے ہی تحفہ لیا کروں"[2]

ابو اصیلی کی کتاب الدلائل میں ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو وصیل اونٹنی تحفے کے طور پر دی۔ آپؐ نے اس کے بدلے میں اسے چھ کم عمر اونٹنیاں عطا کیں، مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اس کے بعد حضورؐ نے مندرجہ بالا بات ارشاد فرمائی۔

صحیح بخاری میں عبداللہ بن یوسف، عن عبداللہ بن وہب، عن یونس عن ابن شہاب، عن انس بن مالک کی سند کے ساتھ روایت ہے کہ جب مہاجرین مکہ سے مدینہ آئے تو وہ خالی ہاتھ تھے۔ جبکہ انصار زمینوں اور جائدادوں کے مالک تھے۔ انصار

---

[1] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۹-۱۰۶) بروایت سعید المقبری عن ابو ہریرہؓ اور ترمذی (۵-۳۱) کتاب "المناقب" باب "فی ثقیف و بنی حنیفۃ" بروایت ایوب عن سعید المقبری عن ابو ہریرہؓ۔ ایوب کا پورا نام ایوب بن ابی مسکین ہے۔ وہ سچا راوی ہے۔ مگر وہم کا مریض تھا۔ یہ حدیث ایک اور سند کے ساتھ احمد بن خالد الحمصی سے منقول ہے۔ احمد ثقہ راوی ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث یزید بن ہارون یعنی ایوب کی روایت کردہ حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔

نسائی (۶-۲۷۹) فی العمریٰ "باب "عطیۃ المرأۃ بغیر اذن زوجھا" بسند عبدالرزاق مختصراً۔

عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی حدیث اس کی مؤید ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تحفہ دیا۔ آپؐ نے اس کے بدلے میں اسے بھی ہدیہ دیا اور دریافت کیا کہ کیا تم راضی ہو؟ اس نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے اور دیا۔ پھر پوچھا "کیا تم راضی ہو؟" اس نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے اور دیا اور پوچھا کیا اب راضی ہو؟" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے پختہ عزم کر لیا ہے کہ کسی قرشی، انصاری یا ثقفی کے سوا دوسرے کا عطیہ قبول نہ کروں گا۔ البتہ آپؐ نے "دوسی" کا ذکر نہیں کیا۔ یہ حدیث احمد اور البزار نے روایت کی ہے۔ احمد کی روایت میں "ذھب" کے بجائے "اھدیٰ" کے الفاظ مذکور ہیں۔ طبرانی نے المعجم الکبیر میں بھی روایت کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ اعرابی نے حضورؐ کو ایک اونٹنی کا ہدیہ پیش کیا۔ آپؐ نے بھی اس کو بدلے میں ہدیہ دیا۔ مسند احمد کی اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۴-۱۴۸)

[2] مسند احمد (۲-۲۹۲) بروایت ابی معشر عن سعید بن ابی سعید المقبری عن ابو ہریرہؓ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک اعرابی نے حضورؐ کو ایک اونٹنی تحفہ کے طور پر پیش کی۔ آپؐ نے اس کے عوض اس کو چھ اونٹنیاں عطا کیں۔

ابو معشر ضعیف راوی ہے۔ وہ اپنی کنیت سے مشہور تھا۔ اس کا نام نجیح بن عبدالرحمٰن السندی المدنی ہے۔

حاکم (۲-۶۲) نے یہ حدیث ابن عجلان عن ابی سعید المقبری عن ابو ہریرہؓ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔

[3] صحیح بخاری کتاب "الھبۃ" باب "فضل المنیحۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۶۳۰)

نے زمینیں مہاجرین کو اس شرط پہ دے دیں کہ وہ ان میں محنت و مشقت کریں گے۔ اور انصار اس کے عوض انھیں پیداوار کا حصہ دیا کریں گے۔ انسؓ بن مالک اور عبداللہ بن ابی طلحہ کی والدہ امّ سُلیمؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجوروں کا ایک باغ دیا تھا۔ حضورؐ نے وہ باغ اسامہؓ بن زید کی والدہ امّ ایمن کو دے دیا۔ ام ایمنؓ پہلے لونڈی تھیں جو بعد میں آزاد ہو گئیں۔

ابن شہاب زُہری کہتے ہیں کہ مجھے انسؓ بن مالک نے بتایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر سے فارغ ہو کر مدینہ آئے تو مہاجرین نے انصار کو باغات اور اراضی کے وہ عطیے واپس کر دیے جو انصار نے ان کو دے رکھے تھے، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کھجوروں کا وہ باغ انسؓ کی والدہ کو واپس کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امّ ایمنؓ کو اپنے باغ میں سے کچھ حصّہ عطا کیا۔ یہ حدیث صحیح مسلمؒ میں بھی روایت کی گئی ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ ایمن کو سابق باغ سے قریباً دس گنا بڑا باغ عطا کیا۔

ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ امّ ایمن اسامہؓ بن زید کی والدہ تھیں۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کی لونڈی تھیں۔ یہ حبشہ کی رہنے والی تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو آپؐ کے والد محترم وفات پا چکے تھے۔ امّ ایمن آپؐ کی پرورش کیا کرتی تھیں۔ آپؐ نے بڑے ہو کر امّ ایمن کو آزاد کر دیا اور زید بن حارثہ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پانچ ماہ بعد امّ ایمنؓ نے وفات پائی۔ واقدی کہتے ہیں کہ اُمّ ایمنؓ کا نام برکۃؓ تھا۔

الاُصیلی کی کتاب کے مطابق یہ حدیث ابن شہاب زُہری سے صرف یونس نے روایت کی ہے۔[۴]

مؤطا امام مالکؒ میں جابرؓ بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی کو کوئی چیز عمریٰ کی کہ وہ اس کی اور اس کے وارثوں کی ہے، تو وہ اسی شخص کی ہو گی جس کو وہ دی گئی۔ وہ کسی صورت

---

[۱] عبداللہ بن ابی طلحہ ماں کی طرف سے انسؓ بن مالک کے بھائی تھے۔ ایک نسخہ میں ابو عبداللہ بن طلحہ ہے۔

[۲] صحیح مسلم (۳-۱۳۹۱) کتاب الجھاد، باب رد المھاجرین الی الانصار منائحھم من الشجر والثمر حین استغنوا عنھا بالفتوح۔

[۳] برکۃ بنت ثعلبۃ بن عمرو۔ ان کو ام الظباء بھی کہا جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ محترمہ کے بعد امّ ایمنؓ میری ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ امّ ایمن حضرت خدیجہؓ کی بہن کی ملکیت میں تھیں۔ انھوں نے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھیں۔

[۴] یہ بات درست ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں بھی اسی طرح ہے۔

[۵] مؤطا امام مالک (۲-۷۵۶) کتاب القضاء، باب القضاء فی العمریٰ۔

[۶] العمریٰ:- اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی یوں کہے کہ میں نے فلاں شخص کو یہ مکان دیا کہ وہ عمر بھر اس میں رہے۔ اس کی وفات کے بعد اس گھر کا مالک میں ہوں گا۔ دورِ جاہلیت میں اسی طرح کیا جاتا تھا۔ اسلام نے آکر اس کو باطل قرار دیا۔ اب جو شخص کسی کو کوئی چیز تاحیات دے تو اس شخص کی وفات کے بعد وہ اس کے وارثوں کو ملے گی۔ اور دینے والے کو واپس نہیں کی جائے گی۔ دیکھیے المنھایۃ (۳-۲۹۸)

ہمانہیں دینے والے کی طرف نہیں لوٹے گی۔ اس لیے کہ اس نے ایسا عطیہ دیا ہے جس پر وراثت کا اطلاق ہو گا۔
ابن القاسم اور القعنبی کی روایت میں "کسی صورت میں بھی" کے الفاظ نہیں ہیں۔

حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ جس "عمریٰ" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کہے کہ یہ چیز میں نے تجھے اور تیرے وارثوں کو دی ہے، اور اگر یوں کہے کہ یہ چیز میں نے تمھیں تمھاری زندگی تک دی ہے تو اس کی موت کے بعد وہ چیز دینے والے کو واپس مل جائے گی۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "عمریٰ" اسی شخص کے لیے ہے جس کو وہ چیز عطا کی گئی ہو۔"

عُمریٰ کی اقسام | عمریٰ کی تین قسمیں ہیں :

۱- ایک شخص دوسرے کو کہتا ہے کہ یہ گھر میں نے عمر بھر کے لیے تمھیں دیا۔ تمھاری وفات کے بعد یہ تمھارے وارثوں کا ہو گا۔ اس قسم کا "عمریٰ" بلا اختلاف و نزاع درست ہے۔ ان الفاظ کے استعمال کرنے کی صورت میں وہ گھر اس شخص کے پاس ہبہ کی صورت میں رہے گا۔ اس کی موت کے بعد وارثوں کو ملے گا۔ اگر اس کا کوئی وارث نہ ہو تو بیت المال کی ملکیت ہو جائے گا مگر ہبہ کرنے والے کو ہرگز نہیں ملے گا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اس صورت میں وہ ہبہ کرنے والے کو واپس مل جائے گا۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ واہب صرف یہ الفاظ کہے کہ فلاں چیز میں نے تجھے عمر بھر کے لیے عطا کی۔ اور اس کے بعد کے بارے میں کچھ نہ کہے۔ اس معاملے کی صحت کے بارے میں امام شافعی کے دو قول ہیں۔

۱- ان میں سے صحیح تر ان کا بعد والا قول ہے اور وہ یہ کہ اس طرح سے معاملہ کرنا صحیح ہے۔ اور اس شخص کی موت کے بعد یہ ہبہ اس کے وارثوں کی ملکیت ہو گا اور ہبہ کرنے والے کو واپس نہیں دیا جائے گا۔

۲- امام شافعی کا دوسرا قول جو کہ پہلے کا ہے یہ ہے کہ اس طرح کا عقد باطل ہے۔

۳- عُمریٰ کی تیسری قسم یہ ہے کہ ہبہ کرنے والا کہے کہ فلاں چیز میں نے تمھیں عمر بھر کے لیے دی ہے، تمھاری وفات کے بعد یہ مجھے یا میرے وارثوں کو مل جائے گی۔ اس کی صحت کے بارے میں امام شافعی کے تلامذہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ اسے باطل قرار دیتا ہے۔ مگر صحیح تر بات یہ ہے کہ یہ معاملہ ان کے نزدیک درست ہے اور پہلی صورت کی طرح یہ چیز موہوب لہٗ کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کو ملے گی۔ انھوں نے اس ضمن میں ان صحیح احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں عمریٰ کو علی الاطلاق جائز قرار دیا گیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ناجائز اور غیر شرعی شرائط کو صحیح نہیں مانتے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ عمریٰ جس میں کوئی قید نہ ہو وہ درست ہے، مگر وہ عُمریٰ جس میں وقت کی شرط ہو وہ جائز نہیں ہے۔ امام مالک سے مشہور ترین روایت یہ ہے کہ عُمریٰ بہر حال میں کسی شخص کو کسی مکان کے منافع کا مالک بنانے کا نام ہے۔ موہوب لہٗ کسی صورت میں بھی گھر کے رقبہ کا مالک نہیں ہو گا۔

چنانچہ "المدونہ" (۶-۹۱) امام مالک کا یہ قول نقل کیا گیا ہے :

" وہ چیز موہوب لہٗ کی موت کے بعد واہب یا اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ امام شافعی کی طرح امام ابو حنیفہؒ

صحیح مسلم[1] میں یحییٰ بن یحییٰ، عن امام مالک، عن جابر رضی کی سند کے ساتھ جو روایت ہے۔ اس میں "ابدا" کا لفظ موجود نہیں۔ صحیح مسلم ہی میں یحییٰ بن یحییٰ و محمد بن رمح، عن لیث، عن ابن شہاب، عن ابو سلمہ، عن جابر بن عبداللہ کی سند کے ساتھ روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا جس نے کسی شخص کو کوئی چیز عمر بھر کے لیے دی اور کہا کہ یہ چیز اس کے بعد اس کے وارثوں کی ہوگی تو اس کی اس بات نے خود ہی اس چیز سے اس کا حق منقطع کر دیا۔ یہ چیز اس شخص کی ملکیت ہو گی جس کو دی گئی۔ اور اس کے بعد اس کے وارثوں کو ملے گی۔"

ایک اور روایت اسحاق بن ابراہیم اور عبد بن حُمید سے منقول ہے۔ اور الفاظ عبد بن حُمید کے ہیں۔ دونوں عبدالرزاق سے روایت کرتے ہیں۔ وہ معمر سے، وہ زہری سے، وہ ابوسلمہ سے اور وہ حضرت جابر رضی سے۔ انھوں نے فرمایا کہ جس عُمریٰ[2] کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا تھا وہ یہ ہے کہ تم یوں کہو: "یہ چیز تمھاری اور تمھارے وارثوں کی ہے۔" اور اگر یوں کہے کہ "میں یہ چیز تمھیں عمر بھر کے لیے دیتا ہوں" تو وہ چیز موہوب لہٗ کی موت کے بعد واہب کی طرف لوٹ آئے گی۔

معمر کہتے ہیں کہ زہری یہی فتویٰ دیا کرتے تھے۔

ابوسلمہ حضرت جابر رضی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جو شخص کسی کو تاحیات اور بعد ازاں اس کے وارثوں کے لیے کوئی چیز عطا کرے تو وہ چیز حتمی طور پر موہوب لہٗ کی ہوگئی۔ موہوب کے لیے اس میں کوئی شرط ٹھہرانا یا استثناء کرنا اب جائز نہیں۔

ابوسلمہ فرماتے ہیں:۔

" اس لیے کہ واہب نے ایک ایسا عطیہ کیا ہے جس کے حقے بخرے ہو کر ورثاء میں تقسیم ہوگئے۔ اس وجہ سے اس کی عائد کردہ شرط ناقابل عمل ٹھہری[3]۔"

ایک دوسری حدیث میں حضرت جابر رضی[4] سے مروی یہ الفاظ ہیں کہ حضور نے فرمایا:۔

" عُمریٰ اسی شخص کے لیے ہے جس کو کوئی چیز عطا کی گئی۔"

ابن ابی زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "وہ چیز واہب کو واپس ہرگز نہیں ملے گی"

سفیان ثوری، حسن بن صالح اور ابو عُبید بھی عُمریٰ کی صحت کے قائل ہیں۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے (شرح مسلم للنووی (۱۱-۷۰)، المجموع (۱۵-۲۷)، المغنی (۵-۱۹۶)، شرح فتح القدیر (۷-۱۴۳)

[1] صحیح مسلم (۳-۲۴۵) کتاب "الہبات" باب "العُمریٰ"۔

[2] مصنف عبدالرزاق (۹-۱۹) نیز صحیح مسلم بروایت جابر۔

[3] مسلم نے یہ روایت ابن ابی ذئب، عن ابن شہاب کی سند کے ساتھ بیان کی ہے اور یہ ابوسلمہ کا قول ہے۔ دیکھیے "تنویر الحوالک للسیوطی" (۲-۱۲۸)

[4] صحیح مسلم حوالہ مذکور بالا۔

کے معنی یہ ہیں کہ جب تک موہوب لہٗ کے ورثاء میں سے کوئی شخص بھی موجود ہے وہ چیز اس کے پاس رہے گی۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے تو وہ چیز واہب کی جانب لوٹ آئے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے کہ "جو عطیہ عمر بھر کے لیے کسی کو دیا جائے وہ اسی شخص کے لیے ہے جس کو وہ دیا جائے" تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس چیز کا نفع موہوب لہٗ کو ملے گا نہ کہ وہ اصل چیز۔ یہ ہے اس بات کی دلیل کہ موہوب لہٗ کے وارث کو اصل ہبہ کردہ چیز نہیں ملتی تو وہ یہ ہے کہ موہوب لہٗ کی بیوی اور وہ شخص جو اس کا وارث ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں اس میں شامل نہیں ہو گا۔

"اعمرتك" (تجھے عمر بھر کے لیے دیا) عمر سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں طبعی عمر اور "عمر مشروط" میں کچھ فرق نہیں۔ اہل مدینہ اسی پر عمل پیرا ہیں۔ امام مالک کا بھی یہی موقف ہے۔ (ابن ابی زید کا قول ختم ہوا)

امام شافعی اور بعض اہل علم نے مندرجہ بالا احادیث کی تشریح یہ کی ہے کہ عمر بھر کے لیے ہبہ کردہ چیز موہوب لہٗ اور اس کے ورثاء کی ملکیت ہوتی ہے۔ اور وہ چیز واہب کو واپس نہیں ملتی۔ اگرچہ موہوب لہٗ اور اس کے وارث ختم بھی ہو جائیں۔[1] امام شافعی کی اس تاویل کے متحمل حدیث کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔

امام شافعی، ابو حنیفہ، سفیان ثوری اور احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ عمریٰ ہبہ کی مانند ہے اور یہ اس کی ملکیت

---

[1] امام شافعی نے مذکورہ بالا حدیث کی تشریح خود نہیں بیان کی بلکہ جب ان سے اس ضمن میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: میں اس حدیث کو امام مالک سے ابن شہاب سے نقل کرتا ہوں، انھوں نے اسے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے سنا اور انھوں نے جابر بن عبداللہ سے سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔۔۔ الخ۔ پھر فرمایا ہم اسی سے استدلال کرتے ہیں اور مدینہ کے اکابر اہل علم کے سوا سب لوگ اسی پر عمل پیرا ہیں۔

جابر بن عبداللہ کے علاوہ زید بن ثابت نے بھی یہ حدیث رسول کریم سے روایت کی ہے۔ دیکھیے کتاب الام (۴-۶۳) نیز دیکھیے صحیح مسلم (۳- ۱۲۴۸) بروایت حضرت جابر باب "العمرى ميراث لاهلها" حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث بھی اس کے مانند ہے۔ زید بن ثابت سے مروی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

"عمریٰ میراث کی مانند ہوتا ہے۔"

یہ حدیث ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ دیکھیے التلخیص الحبیر (۳-۷۱)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام شافعی نے اس حدیث کی تاویل نہیں کی بلکہ اس سے استدلال کیا ہے۔ اس کے برعکس اس حدیث کی تاویل ان لوگوں نے کی ہے جو ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

امام احمد بن حنبل سے اس ضمن میں دو روایات منقول ہیں:۔

۱- پہلی روایت یہ ہے کہ شرط کے ساتھ عمریٰ کا معاملہ درست ہے اور موہوب لہٗ کی موت کے بعد یہ عطیہ واہب کو واپس مل جاتا ہے۔

۲- دوسری روایت یہ ہے کہ یہ عطیہ موہوب لہٗ اور اس کے وارثوں کی ملکیت ہے۔ اور واہب کی جانب واپسی کی شرط ساقط ہو جائے گی۔ دیکھیے المغنی (۵-۷۳)

ہے جس کو وہ دیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ موہوب لہٗ کے وارث ہوں یا نہ ہوں۔ یا یہ کہ واہب نے اپنی جانب لوٹنے کی شرط عاید کی ہو یا نہ کی ہو۔ اگر اس نے یہ شرط عائد کی ہو تو یہ باطل ہو گی، اور وہ چیز کبھی اس کی طرف لوٹ کر نہیں آئے گی۔ موہوب لہٗ اگر چاہے تو اپنی دوسری چیزوں کی طرح اس چیز کو فروخت بھی کر سکتا ہے۔ اس طرح عُمریٰ کے بارے میں یہ تینوں اقوال صحیح ہیں:-

۱۔ امام مالک قول

۲۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے ہم خیال اہل علم کا قول۔ جیسے طارق نے حضرت جابرؓ کی شہادت کے مطابق فیصلہ کیا تھا۔

۳۔ تیسرا قول ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ عمریٰ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک قسم کا عُمریٰ یہ ہے کہ کوئی چیز موہوب لہٗ اور اس کے بعد اس کے وارثوں کو دی جائے۔ یہ چیز واہب کی جانب لوٹ کر نہیں آئے گی۔

۲۔ عُمریٰ کی دوسری قسم یہ ہے کہ موہوب لہٗ کو صرف تاحیات کوئی چیز دی جائے۔ اس کی وفات کے بعد یہ چیز واہب کی جانب لوٹ آئے گی۔

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ ہی سے مروی ہے کہ مدینہ کی ایک عورت نے اپنا ایک باغ اپنے ایک بیٹے کو عُمریٰ کے طور پر دیا۔ وہ لڑکا فوت ہو گیا اور اس کی والدہ کی وفات اس کے بعد ہوئی۔ اس عورت نے ایک اور بیٹا زندہ چھوڑا، اس لڑکے کے چند اخیافی بھائی بھی تھے جو عُمریٰ کے طور پر دینے والی عورت کے بیٹے تھے۔ اس عورت کے بیٹے نے کہا کہ اس کی وفات کے بعد باغ ہماری جانب لوٹ آیا۔ اور موہوب لہٗ کے بیٹوں نے کہا کہ یہ باغ تاحیات اور بعد از موت ہمارے والد کی ملکیت ہے۔ وہ اپنا مقدمہ طارق کے پاس لے گئے جو حضرت عثمان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ طارق[۲] نے حضرت جابرؓ کو بلایا۔ انھوں نے شہادت دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا تھا کہ عُمریٰ کے طور پر دی ہوئی چیز ہمیشہ کے لیے اسی کی ہے جس کو دی جائے۔ چنانچہ طارق نے اس کے مطابق فیصلہ صادر کر دیا اور پھر خلیفہ عبدالملک کو اس واقعہ اور حضرت جابرؓ کی شہادت سے آگاہ کیا۔ عبدالملک نے لکھا کہ جابرؓ نے سچ کہا، چنانچہ طارق نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ باغ آج تک موہوب لہٗ کی اولاد کی ملکیت چلا آتا ہے۔

اس حدیث میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ اس عورت نے یہ باغ اپنے بیٹے کو اور اس کے بعد اس کے وارثوں کو دیا تھا۔

---

[۱] صحیح مسلم (۳/ ۱۲۴۷) حوالہ مذکورہ بالا۔ محمد بن رافع و اسحاق بن منصور عن عبدالرزاق کی سند کے ساتھ (مصنف عبدالرزاق ۹/ ۱۸۹)

[۲] طارق مولیٰ عثمان طارق بن عمرو ہے۔ ان کو خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حضرت عبداللہ بن زبیر کے بعد مدینہ کا والی مقرر کیا تھا۔

جیسا کہ سابق الذکر احادیث میں ہے۔ حضرت جابرؓ کے ان الفاظ کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں کہ جب واہب یوں کہے کہ یہ چیز میں تمھیں زندگی بھر کے لیے دیتا ہوں تو یہ چیز موہوب لہٗ کی موت کے بعد واہب کی جانب لوٹ جائے گی۔

اور مسند کی ایک روایت میں جو یحییٰ، عن سفیان، عن سفیان، عن حُمید الاعرج، عن ابن ابراہیم التیمی، عن جابرؓ کی سند کے ساتھ منقول ہے کہ ایک انصاری نے اپنی ماں کو ایک باغ زندگی بھر کے لیے دیا۔ وہ عورت فوت ہو گئی۔ الخ اس کے بعد یہ حدیث اسی طرح بیان کی گئی ہے جس طرح اسے صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ امام مالکؒ کے مسلک کی مؤید ہے۔[1]

---

[1] یہ حدیث امام احمدؒ نے مسند (۳-۲۹۹) میں بھی نقل کی ہے، مکمل حدیث یوں ہے:
"اس شخص کے بھائی آئے اور انھوں نے کہا کہ ہم اس باغ میں برابر کے شریک ہیں۔ اس نے انکار کیا۔ وہ اپنا مقدمہ عدالت نبوی میں لے گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ کو اس عورت کا ترکہ تصور کر کے ان کے درمیان تقسیم کر دیا۔" التنقیح میں ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں۔ حافظ زیلعی نے "نصب الرایۃ" (۴-۱۲۸) میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ نیز دیکھیے "الدرایۃ" (۲-۱۸۵)۔ اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

مشتبہ چیزوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

موطا[1] امام مالک، صحیح بخاری[2] اور صحیح مسلم[3] میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص (فاتح ایران) سے عہد لیا تھا کہ زمعہ کی لونڈی کا بیٹا میرا (میری پشت سے) ہے اس لیے آپ اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے روز سعد بن ابی وقاص نے اس لڑکے کو پکڑ لیا اور کہا یہ میرا بھتیجا ہے۔ میرے بھائی (عتبہ) نے مجھ سے اس کے بارے میں عہد لیا تھا۔ اسی اثنا میں عبد بن زمعہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اور میرے والد کی لونڈی کے بطن سے اسی کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔

حضرت سعد اور عبد بن زمعہ دونوں اس بچے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لے گئے۔ سعد نے کہا "یا رسول اللہ! یہ میرا بھتیجا ہے۔ میرے بھائی نے مجھ سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ میں اس بچے کو اپنی حفاظت میں لے لوں۔ ابن زمعہ نے کہا یہ میرا بھائی ہے۔ میرے والد کی لونڈی کے بطن سے ہے اسی کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عبد بن زمعہ! یہ تمھارا بھائی ہے۔" پھر فرمایا:

---

[1] موطا امام مالک (۲-۱۱۸) کتاب "القضاء" باب "القضاء بالحاق الولد بابیہ" بروایت ابن شہاب عن عروہ بن زبیر عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔

[2] صحیح بخاری کتاب "الفرائض" باب "من ادعی اخا او ابن اخ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۶۵) بروایت قتیبہ بن سعید عن لیث، عن ابن شہاب۔ نیز بخاری کتاب "الحدود" باب "للعاھر الحجر" عن ابو الولید، عن لیث۔ نیز بخاری کتاب "الاحکام" باب "من قضی لہ بحق اخیہ فلا یاخذہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۷۱۸۲) بروایت اسماعیل عن امام مالک۔

[3] صحیح مسلم (۲-۱۰۸۰) کتاب "الرضاع" باب "الولد للفراش" بروایت قتیبہ بن سعید عن لیث۔

ابوداؤد (۲-۲۸۳) کتاب "الطلاق" باب "الولد للفراش"۔

ابن ماجہ (۱-۶۴۶) کتاب "النکاح" باب "الولد للفراش"۔

یہ حدیث بیس صحابہ سے مروی ہے۔ میں نے اپنی کتاب "ابوھریرۃ فی ضوء مرویاتہ" (ص ۱۶۶-۱۶۷) میں ان کے اسمائے گرامی نقل کیے ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل صحابہ شامل ہیں:۔

حضرات ابوہریرہ، عثمان، عمر، عبداللہ بن عمر، عمرو بن خارجہ، عبداللہ بن مسعود، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عباس، عبادہ بن الصامت و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔

"بیٹا اس کا رہے گا جس کے بستر پر پیدا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے"۔ پھر آپ نے ام المومنین سودہؓ بنت زمعہ سے فرمایا:" اس لڑکے سے پردہ کیا کرو"۔ اس لیے کہ آپ نے دیکھا کہ اس کی شکل عُتبہ بن ابی وقاص سے ملتی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ لڑکا جب تک زندہ رہا اس نے حضرت سودہؓ کو نہیں دیکھا۔ حضرت سودہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں آخری جملے کا ذکر نہیں کیا۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔

۱۔ کافر کی وصیت کو پورا کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ عُتبہ کفر کی حالت میں مرا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے غزوہ اُحد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کیے تھے۔ حضورؐ نے اس کے حق میں بددعا کی تھی کہ سال گزرنے سے پہلے کفر کی حالت میں مرجائے اور ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ عُتبہ مر گیا۔

عبدالرزاقؒ نے "مصنف" میں ذکر کیا ہے کہ عُتبہ کفر کی حالت میں مرا تھا۔ ابن ابی خیثمہ نے بھی یہ بات نقل کی ہے۔

۲۔ اس حدیث سے دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ بھائی اپنے بھائی کے الحاق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے۔[2] البتہ بیٹے کے الحاق کا مطالبہ کرنے میں تو سرے سے کوئی اختلاف ہی نہیں پایا جاتا۔

---

[1] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۵-۲۹۱) اس کی سند میں مقسم بن بجرہ ہے۔ اس کو ابوالقاسم ابن نجدہ بھی کہا جاتا ہے۔ محدثین نے اس پر نقد کیا ہے۔ بخاری نے اس کو ضعفا کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ یہ حدیث موقوف ہے۔ بخاری نے یہ مرفوعاً روایت نہیں کی۔ معمر کہتے ہیں کہ میں نے زُہری کو اس حدیث کا ایک حصہ بیان کرتے سُنا ہے۔ پھر انھوں اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے غزوۂ احد میں حضورؐ کے دندان مبارک شہید کیے اور چہرے کو زخمی کیا تھا۔ آپؐ نے اس کے حق میں یہ بددعا فرمائی کہ:

"اے اللہ! ایک سال گزرنے سے پہلے اس کو کفر کی حالت میں ہلاک فرما"۔

چنانچہ ایک سال گزرنے سے پیشتر عُتبہ واصل جہنم ہوگیا تھا۔

عُتبہ کا حضورؐ کے دندان مبارک شہید کرنے اور آپ کے سر کو زخمی کرنے کا ذکر صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت میں موجود ہے، البتہ امام بخاری نے اس کا ذکر سند کے بغیر کیا ہے۔

[2] اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں کسی دوسرے شخص کے نسب کے اثبات کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب باپ سے اس کا نسب ثابت ہوجائے اور والد اس کا اعتراف کرے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فلاں شخص اس کا ماں کی طرف سے بھائی ہے مگر اس کا والد اور دوسرے بھائی اس کی تصدیق نہ کریں تو اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔ اور چچا کا الحاق بھی اسی طرح ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد بن ابیہ کو اپنا بھائی ثابت کرنا چاہا، مگر آپ کی ہمشیرہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان نے اس کو تسلیم نہ کیا اور وہ اس سے پردہ کیا کرتی تھیں۔ اس پر لوگ حضرت معاویہ پر تنقید کرتے اور ان کو معتوب ٹھہراتے تھے۔ (الفخری فی الآداب السلطانیہ ص ۱۰۰/۱۰۳ مختصراً)

الفخری لکھتے ہیں: "یہ شریعت کے احکام کو علی الاعلان مسترد کردینے کی پہلی مثال تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو یہ تھا کہ بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو اور زانی کو رجم کیا جائے گا۔" زیاد کو دور جاہلیت میں بھی زیاد بن ابوسفیان نہیں کہا جاتا تھا۔ بلکہ اس کو عُبید کی جانب منسوب کرکے زیاد بن عُبید (یا زیاد بن ابیہ) کہا جاتا تھا۔

۳- امام مالکؒ نے اس حدیث سے "سدِ ذرائع" کے سلسلے میں "استدلال" کیا ہے۔ "سدِ ذرائع" کا مطلب یہ ہے کہ حرام سے بچنے کی خاطر مباحات سے بھی احتراز کیا جائے۔[1]

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (النور-۳۱)

اور عورتیں اپنے پاؤں کو زمین پر مار کر نہ چلیں تاکہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر نہ ہونے پائے۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو "راعنا" کا لفظ کہنے سے منع فرمایا۔ حالانکہ ان کا مقصد صرف حضورؐ کو متوجہ کرنا ہوتا تھا۔ لیکن کیونکہ یہود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "راعنا" کہا کرتے تھے جس سے ان کا مقصد "یا رعن" (اے احمق) کہنا ہوتا تھا۔ اس لیے اس کا سدِ باب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اس کے بجائے ایک اور لفظ کہنے کی ہدایت کی۔ جس میں توہین کا احتمال نہیں پایا جاتا۔

"سدالذرائع" کی ایک اور مثال یہ ہے کہ یہود کو جب ہفتہ کے روز مچھلیوں کا شکار کرنے سے منع کیا گیا تو انھوں نے اس حیلہ سازی سے کام لیا کہ ہفتہ کے علاوہ کسی اور دن مچھلیوں کو پکڑ کر پانی میں بند رکھتے اور ہفتہ کے روز پانی سے نکال لیتے۔ اس حیلہ سازی پر یہود کو سزا دی گئی اور اس حرکت سے انھیں منع کیا گیا۔

---

[1] الذریعة: "التذریع" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ذریعہ اور وسیلہ بنانے کے ہیں۔ (القاموس)

ذریعہ کے شرعی معنی یہ ہیں کہ کوئی کام فی نفسہٖ جائز ہو مگر حرام تک پہنچنے کا ذریعہ بنتا ہو۔ القرافی نے "سدِ ذریعہ" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: "فساد کو روکنے کے لیے اس کے وسائل و ذرائع کو بھی ممنوع قرار دینا۔"

اگر "سدالذرائع" سے یہ مفہوم لیا جائے تو اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔

لہٰذا القرافی کہتے ہیں۔

"سدالذرائع صرف مالکی مسلک کی خصوصیت ہی نہیں ہے جیسا کہ بہت سے مالکیہ کہتے ہیں۔ ذرائع کی تین قسمیں ہیں۔

۱- ذرائع کی ایک قسم بالاجماع ممنوع ہے۔

۲- دوسری قسم وہ ہے جو بالاجماع جائز اور درست ہے۔

۳- تیسری قسم کے بارے میں اہل علم میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تیسری قسم ہی سدِ ذرائع کے سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف کا سبب ہے۔ مالکی فقہ میں اس قسم کے سدِ ذرائع کی بڑی کثرت ہے جبکہ شافعی فقہ میں اس کی قلت ہے۔ اس لیے لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ امام شافعی سدِ ذرائع کے قائل نہیں ہیں۔

علامہ القرافی کے قول سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"سدِ ذرائع کا اصول صرف مالکی فقہ کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ اصول امام مالکؒ کے ہاں دیگر فقہاء کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سدالذرائع کا اصول اجماعاً ثابت ہے۔ (الفروق للقرافی ص ۲/۳۲، ۳۳)

اسی طرح[1] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بنت زمعہ کو کہا تھا کہ زمعہ کا بیٹا ان کا بھائی ہے۔ کیونکہ وہ ان کے والد کے گھر میں پیدا ہوا ہے، تاہم آپؐ نے حضرت سودہؓ کو زمعہ کے بیٹے سے احتیاط کی بنا پر پردہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس طرح اس سلسلے میں حضورؐ نے دو حکم دیے۔ ایک حکم کا تعلق ظاہر سے تھا اور دوسرے کا باطن سے۔

---

[1] امام نوویؒ شرح صحیح مسلم (۱۰-۳۹) میں لکھتے ہیں:-

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہؓ کو احتیاط کی بنا پر اس سے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس لیے کہ حضرت سودہؓ کے والد کے ساتھ الحاق کرنے کے بعد ظاہری شرع کے اعتبار سے وہ ان کا بھائی تھا، لیکن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اس کی شکل عتبہ سے ملتی ہے تو آپؐ کو یہ خدشہ ہوا کہ کہیں اس کی پشت سے ہونے کی بنا پر یہ حضرت سودہؓ سے اجنبی نہ ہو۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری (۱۲-۳۷) میں فرماتے ہیں:-

"جمہور اہل علم نے حنفیہ کے اس استدلال کی تردید کی ہے کہ آپؐ نے اس بچے کا الحاق زمعہ کے ساتھ نہیں کیا تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ حضرت سودہؓ کا بھائی ٹھہرتا۔ اور بھائی سے پردہ کا حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ جمہور اہل علم کہتے ہیں کہ پردہ کا حکم احتیاط کی بنا پر تھا اس لیے کہ آپؐ نے اس بچے کو سودہ کا بھائی قرار دے دیا تھا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ اے عبد بن زمعہ یہ بچہ تمہارا بھائی ہے" اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ بچہ باپ کی طرف سے عبد بن زمعہ کا بھائی ہے، تو وہ حضرت سودہؓ کا بھی باپ کی طرف سے بھائی ٹھہرا، لیکن اس کے باوجود جب حضورؐ نے دیکھا کہ اس کی شکل و صورت عتبہ کے ساتھ ملتی ہے تو احتیاطاً آپؐ نے حضرت سودہؓ کو اس سے پردہ کرنے کا حکم صادر کیا۔

الخطابی فرماتے ہیں کہ اس میں امہات المومنین کی اس خصوصیت کی جانب اشارہ ہے۔ کہ ان کو دوسری عورتوں کی نسبت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شبہ بعض مواقع پر معتبر ہوتا ہے۔ لیکن جب شبہ سے زیادہ قوی چیز موجود ہو تو شبہ پر عمل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً بعض واقعات کے بارے میں قیاس کی بنا پر فیصلہ صادر کیا جاتا ہے مگر پھر نص مل جانے کی بنا پر قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ "سودہ اس لڑکے سے پردہ کیا کرو کیونکہ وہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔" مگر یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ امام نوویؒ بھی الخطابی کے ہمنوا ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ اضافہ غیر مقبول ہے۔

مگر اس رائے پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ یہ اضافہ نسائی (۶-۱۸۰) میں بروایت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ منقول ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ اس روایت کے الفاظ یوں ہیں:-

"زمعہ کی ایک لونڈی تھی جس سے وہ مجامعت کیا کرتا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ کوئی اور آدمی بھی اس کے ساتھ ہمبستر ہوتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کی شکل اس آدمی سے ملتی تھی جس کے بارے میں زمعہ کو شک تھا جب زمعہ مر گیا تو حضرت سودہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ سودہؓ! تم اس سے پردہ کیا کرو۔ کیونکہ وہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔

اس روایت کی سند کے راوی مجاہد کے شیخ کے سوا صحیح ہیں۔ مجاہد کے شیخ کا اصلی نام یوسف ہے۔ وہ آل زبیر کا آزاد کردہ غلام تھے۔ البیہقی اس

امام شافعی نے اس ضمن میں یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ "سد الذرائع" کی بنا پر کوئی حکم دینا باطل ہے۔ ان کے نزدیک ایک چیز کے بارے میں دو نہیں بلکہ ایک ہی حکم دیا جا سکتا ہے۔ باقی رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سودہؓ کو اس نوجوان سے پردہ کرنے کا حکم دینے کا معاملہ تو اس بارے وہ فرماتے ہیں کہ آدمی اپنی بیوی کو یہ حکم دے سکتا ہے کہ وہ اپنے بھائی سے نہ ملے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہؓ کو احتیاط کی بنا پر اس سے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا مگر یہ بات اس عمل سے مختلف ہے جو آپؐ نے ابو القعیس کے بھائی أفلح کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا کہ یہ تمہارا چچا ہے لہٰذا تمہارے گھر میں آسکتا ہے حالانکہ وہ حضرت عائشہؓ کا رضاعی چچا تھا اور جب رضاعی چچا سے پردہ کی ضرورت نہیں تو بیوی کو یہ حکم کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بھائی سے نہ ملے۔

امام بخاریؒ نے یہ حدیث باب "تفسیر المشتبہات" میں حدیث "دع ما یریبک" کے ساتھ نقل کی ہے۔ یہ حدیث بھی امام مالک کے مسلک کی مؤید اور امام شافعی کے مسلک کے خلاف ہے۔

حدیث کی سند پر جرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں جریر نامی راوی ہے جس کا حافظہ عمر کے آخری حصے میں خراب ہو گیا تھا۔ اس کی سند میں یوسف نامی راوی غیر معروف ہے۔ اگر اس حدیث کو ثابت شدہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی یہ حضرت عائشہؓ کی روایت کردہ حدیث کی معارض نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی صحت متفق علیہ ہے۔

البیہقی کے مندرجہ بالا بیان پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ اس حدیث کی سند میں جو جریر ہے اس کا حافظہ عمر کے آخری حصے میں خراب نہیں ہوا تھا۔ جس کا حافظہ خراب ہوا وہ جریر بن حازم ہے۔ نیز یہ کہ دونوں احادیث میں تطبیق ممکن ہے۔ اس لیے اس میں ترجیح کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مزید براں یوسف مجہول نہیں بلکہ آل زبیر کے موالی میں معروف آدمی ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی تاویل کی جائے گی۔ اور جب یہ اضافہ روایات میں ثابت ہے تو اس لڑکے کے حضرت سودہؓ کے بھائی نہ ہونے اور اس سے پردہ کرنے کا حکم احتیاط پر مبنی ہوگا۔

لہ مصنف کے اس بیان سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ امام بخاری نے أفلح سے متعلق حدیث باب "تفسیر المشتبہات" میں روایت کی ہے لیکن یہ شبہ صحیح نہیں۔ اس سے مراد زمعہ کے بارے میں سابق الذکر حدیث ہے جو امام بخاری نے یحییٰ بن قزعہ عن امام مالک عن ابن شہاب کی سند کے ساتھ کتاب "البیوع" میں نقل کی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۰۵۳)

أفلح سے متعلق حدیث امام بخاری نے کتاب "النکاح" باب "ما یحل من الدخول والنظر الی النساء" میں روایت کی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۲۳۹) امام بخاری نے یہ حدیث عبد اللہ بن یوسف عن مالک عن ہشام بن عروہ عن عروۃ عن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرا رضاعی چچا آیا اور اندر آنے کی اجازت مانگی۔ میں نے اس وقت تک اجازت دینے سے انکار کر دیا جب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل نہ کر لوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا "وہ تمہارا چچا ہے اس کو اندر آنے کی اجازت دے دو" میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! مجھے عورت نے دودھ پلایا ہے نہ کہ مرد نے۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ تمہارا چچا ہے۔ اس کو اندر آنے کی اجازت دے دو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی "للعاھر الحجر" (زانی کو پتھر ملیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ بچہ زانی کو نہیں ملے گا۔ بلکہ بچہ کو اس کی جانب منسوب بھی نہیں کیا جائے گا۔ جیسے عربی محاورہ میں کہتے ہیں "بفیک الحجر" (تیرے منہ میں پتھر) یعنی تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ داؤدی کہتے ہیں "للعاھر الحجر" کا مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کر دیا جائے گا۔[۲]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ وہ مزید فرماتی ہیں کہ "رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت سے حرام ہوتے ہیں"۔ صحیح بخاری میں بروایت ابن شہاب از عروہ بن الزبیر اس بات کی نصریح ہے کہ حضرت عائشہؓ کے رضاعی چچا کا نام افلح تھا اور وہ ابو القعیس کا بھائی تھا۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۱۰۳) صحیح مسلم (۲-۱۰۷۰) بسند عراک بن مالک عن عروہ کتاب الرضاعۃ "باب تحریم الرضاع من ماء الفحل"۔

ابوداؤد (۲-۲۲۲) کتاب النکاح "باب فی لبن الفحل"۔

ترمذی (۲-۴۵۳) کتاب الرضاع "باب ماجاء فی لبن الفحل"

نسائی (۲-۹۹) کتاب النکاح "باب ما یحرم من الرضاع" ابن ماجہ (۱-۶۲۷)

[۱] یہ بات علامہ داؤدی نے شرح مؤطا میں تحریر کی ہے۔ یہ شرح ہمیں نہیں مل سکی۔

[۲] امام نووی شرح صحیح مسلم (۱۰-۳۷) میں لکھتے ہیں:

"للعاھر الحجر کے یہ معنی ہیں کہ اسے سنگسار کیا جائے گا۔ ضعیف قول ہے۔ اس لیے کہ ہر زانی کو رجم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ صرف شادی شدہ زانی کو رجم کیا جاتا ہے۔ نیز اس لیے کہ رجم کرنے سے بچے کی نفی لازم نہیں آتی"۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (۱۲-۳۶) میں لکھتے ہیں:۔

کہ "للعاھر الحجر" کا مطلب یہ ہے کہ زانی خائب و خاسر رہے گا۔ "العَھَر" کے معنی زنا کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ رات کے زنا کرنے کو "العَھَر" کہتے ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ زانی جس بچے کا مدعی ہے وہ اس سے محروم رہے گا۔ جو شخص ناکام رہے اس کے بارے میں عربی محاورے میں کہتے ہیں "لہ الحجر وبفیہ الحجر"۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ "للعاھر الحجر" کے معنی یہ ہیں کہ اسے رجم کیا جائے گا۔ پھر انھوں نے ذکر کیا ہے کہ امام نووی اس قول کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ آگے چل کر حافظ ابن حجر نے علامہ السبکی کا قول نقل کیا ہے کہ پہلا مفہوم سیاقِ حدیث سے قریب تر ہے۔ اس لیے کہ نامرادی ہر زانی کے حصے میں آتی ہے۔ رجم کرنے کی دلیل دوسری جگہ سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا بلا وجہ تخصیص کی ضرورت نہیں۔

علاوہ ازیں امام احمد اور الحاکم کی زید بن ارقم سے مروی حدیث بھی پہلے معنی کی مؤید ہے۔ یہ حدیث مرفوعاً روایت کی گئی ہے۔ اس میں بیان کردہ الفاظ کا مفہوم یہ ہے۔

"بچہ تو اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا، اور زانی کے منہ میں پتھر یعنی وہ خائب و خاسر ہو گا"۔

صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"بچہ تو اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کے لیے پتھر یا مٹی باقی رہی" یعنی وہ خائب و خاسر ہوا۔ (حافظ ابن حجر کا بیان ختم ہوا۔

امام شافعیؒ کا موقف یہ ہے کہ حرام کا ارتکاب کسی حلال چیز کو حرام نہیں بنا سکتا[1] اور جہاں تک حضرت سودہؓ کو اس لڑکے سے پردہ کرنے کے حکم کا تعلق ہے تو وہ حضورؐ نے احتیاطاً کی بنا پر دیا تھا۔

---

[1] امام شافعی اس مسئلہ میں آیت کریمہ ﴿وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ﴾ (النساء ۲۴) (اس کے سوا باقی عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں) اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو ابن ماجہ (۱-۶۴۹) نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ کتاب "النکاح" میں یحییٰ بن معلّٰی بن منصور، عن اسحاق بن محمد الفزاری عن عبداللہ بن عمرؓ عن نافع، عن ابن عمرؓ کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حرام کا ارتکاب کسی حلال چیز کو حرام نہیں بنا سکتا۔"

اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن عمرؓ بن حفص بن عاصم بن عمرؓ بن الخطاب العدوی المدنی ہے۔ جس کو نسائی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں وہ ضعیف راوی ہے۔ میں اس سے کچھ بھی روایت نہیں کرتا۔ یحییٰ بن سعید نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ بخاری نے یہ حدیث عبداللہ بن عباسؓ سے کتاب "النکاح" باب "ما یحل من النساء وما یحرم" میں بلا سند روایت کی ہے۔ البیہقی (۷-۱۶۸) نے یہ حدیث موصولاً ہشام، عن قتادہ، عن عکرمہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

علاوہ ازیں امام شافعی حضرت عائشہؓ سے مروی اس مرفوع حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو پہلے ایک عورت کے ساتھ حرام کاری کا ارتکاب کرتا ہے۔ پھر اس عورت کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرتا ہے۔ یا اس کے برعکس پہلے بیٹی سے بدکاری کرتا ہے اور پھر اس کی ماں کے ساتھ نکاح کرتا ہے اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

حرام کا ارتکاب کرنے سے کوئی حلال چیز حرام نہیں ہو جاتی۔ وہ حرام تو اسی صورت میں ہوتیں جبکہ ان میں سے کسی سے حلال طریقے سے نکاح کیا گیا ہوتا۔

البیہقی (۷-۱۶۹) اور دارقطنی (۳-۲۶۸) نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی عثمان بن عبدالرحمٰن الوقاصی ہے جسے یحییٰ بن معین، ابوحاتم اور نسائی نے اس کو کاذب قرار دیا ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ (تہذیب التہذیب ۷-۱۴۲)

محدث عبدالرزاق نے، حارث بن عبدالرحمٰن کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ میں نے سعید بن المسیب اور عروہ بن زبیر سے پوچھا کہ ایک آدمی ایک عورت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کرتا ہے کیا اس عورت کی ماں اس کے لیے حلال ہے؟ دونوں نے جواب دیا۔ حرام کا ارتکاب کرنے سے حلال چیز حرام نہیں ٹھہرتی۔" معمر زہری سے بھی اسی طرح کی حدیث روایت کرتے ہیں۔

البیہقی (۷-۱۶۹) یونس ابن یزید کے حوالے سے زہری سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے ایک آدمی کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ وہ ایک عورت کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کرتا ہے۔ کیا وہ اس عورت کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے؟ زہری نے کہا بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک حرام فعل کی وجہ سے حلال کو حرام نہیں کرتا۔"

اس کی وجہ یہ بھی کہ زنا کرنے سے عورت "فراش" (بیوی) نہیں بن جاتی۔ لہٰذا زنا کے ساتھ حرمت مصاہرت قائم نہیں ہوتی۔ جس طرح کوئی شخص بلا شہوت کسی کے ساتھ مباشرت کرے تو اس سے حرمت مصاہرت قائم نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی شخص کسی لڑکے کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب

امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ زنا سے حرمتِ مصاہرت قائم ہو جاتی ہے۔

امام مالک سے اس ضمن میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ حرام کا ارتکاب کرنے سے حلال چیز حرام نہیں بن جاتی۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حلال چیز حرام کے ارتکاب سے حرام نہیں ہو جاتی! البتہ آپ اور آپ کے اصحاب سے منقول مشہور تر قول یہی ہے کہ حرام کا ارتکاب کرنے سے حلال چیز حرام نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

کرے تو اس پر اس کی ماں یا بیٹی حرام نہ ہوگی اسی طرح اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ زنا کرے اور اس سے لڑکی پیدا ہو تو امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس شخص کا اس لڑکی کو اپنے نکاح میں لانا میرے نزدیک ناپسندیدہ ہے تاہم اگر وہ شخص اس لڑکی سے نکاح کرے تو میں اسے فسخ نہیں کروں گا۔ کراہت اس اندیشے کی بنا پر ہے کہ مبادا وہ اس کے نطفے سے ہو۔ جمہور اہل علم کا یہی مسلک ہے۔ اس لیے کہ نکاح کا اطلاق ایک عورت کے ساتھ شرعی طریقے سے عقد باندھنے پر کیا جاتا ہے مطلق جماع پر نہیں۔ مزید براں زنا میں عدت، مہر یا میراث کا کوئی سوال نہیں۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ جب زانی اس عورت کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے جس کے ساتھ اس نے زنا کیا ہو تو اس عورت کی ماں یا بیٹی کے ساتھ کیوں نہیں کر سکتا؟

امام ابوحنیفہ کے نزدیک کسی عورت کی ماں کے ساتھ مباشرت کرنے یا اس کی شرمگاہ کو دیکھنے ہی سے اس کے ساتھ نکاح حرام ٹھہرتا ہے، البتہ امام ابوحنیفہ کے ساتھی اس کی علتِ تحریم کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ متقدمین کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ نکاح اس لیے حرام ہے کہ وہ اس عورت کی بیٹی ہے جس کے ساتھ اس نے زنا کیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ زنا کی پیداوار ہے۔ متاخرین کے نزدیک حرمت کی علت یہ ہے کہ وہ اس کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے۔ امام احمد بھی اس کو حرام ٹھہراتے ہیں۔ عمران بن حُصین، حسن بصری، عطاء، طاؤس، مجاہد، شعبی، نخعی، ثوری اور اسحاق سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

اس کے برعکس حضرت ابن عباس، سعید بن المسیب، یحییٰ بن یعمر، عُروہ، زہری، ابوثور اور ابن المنذر اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

امام مالک، امام شافعی کی طرح اس کی حلت کے قائل ہیں۔ مگر ابن القاسم امام مالک سے نقل کرتے ہیں کہ وہ امام ابوحنیفہ کی طرح اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ سحنون کہتے ہیں کہ امام مالک کے ساتھی ابن القاسم کی رائے کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک صحیح قول وہ ہے جو مؤطا امام مالک میں مرقوم ہے۔ ابن رشد فرماتے ہیں:۔

اس میں اختلاف کی وجہ نکاح کے لفظ میں ہر دو معنوں کے اشتراک کا پایا جانا ہے۔ لفظ نکاح لغوی اعتبار سے ہم بستری کے معنوں میں بولا جاتا ہے جبکہ شرعی اصطلاح کے مطابق اس سے مراد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا ہے۔ لہٰذا جو شخص آیت کریمہ وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم میں لغوی معنی کو ملحوظ رکھتا ہے اس کے نزدیک زنا سے حرمتِ مصاہرت قائم ہو جاتی ہے اور جو شخص اس آیت میں نکاح کے شرعی معنی یعنی عقد نکاح کو پیش نظر رکھتا ہے اس کے نزدیک زنا سے حرمتِ مصاہرت قائم نہیں ہوتی۔ (بدایۃ المجتہد ۲-۲۶)

اس مسئلہ میں ائمہ کا مسلک معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ فرمائیے:

المغنی (۷-۲۹) المجموع (۵-۳۷۵) المدونۃ (۲-۲۷۷) شرح فتح القدیر (۲-۳۶۵)

مختلف حالات میں غلاموں کے متعلق احکام

مصنف عبدالرزاقؒ میں حضرت علیؓ بن ابی طالب سے مروی ہے کہ میری موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرمایا کرتے تھے کہ قرض وصیت پر عمل کرنے سے پہلے ادا کیا جائے۔ تم یہ آیت کریمہ پڑھتے ہو۔

" مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ (النساء: ۱۱) یعنی (وراثت کی تقسیم) وصیت پر عمل درآمد اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔

اہل علم کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرض وصیت پر عمل درآمد کرنے سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے۔

اشہب کہتے ہیں کہ ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ وصیت پر عمل کا آغاز "عتق" یعنی غلاموں کو آزاد کرنے سے کیا جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا۔ اشہب کہتے ہیں کہ "عتق" کی تقدیم اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

" جس شخص نے کسی غلام میں سے اپنے حصے کو آزاد کر دیا اس کے لیے ضروری ہے اس غلام کی قیمت طے کرنے کے بعد اسے پوری طرح خرید کر آزاد کر دے۔[2]

اور اگر کسی نے کپڑے میں سے اپنا حصہ کسی ایسے قریبی عزیز پر صدقہ کر دیا جو کہ محتاج اور برہنہ تھا تو تمام علماء کے اجماع کے مطابق سارے کپڑے کی قیمت طے نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح وصیتوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں عتق سے آغاز کیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ غلام اس کی ملکیت میں رہا ہو۔ اس سلسلہ میں امام مالک کا قول ہمیں بہت پسند ہے۔

---

[1] یہ حدیث مجھے مصنف عبدالرزاق میں نہیں ملی۔ بیہقی (۶-۲۶۷) نے یہ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وصیت سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ نیز یہ کہ ماں کی طرف سے بھائی وارث ہوں گے۔ اور ان کی موجودگی میں باپ کی طرف سے بھائی وارث نہیں ہوں گے۔

[2] یہ حدیث صحاح اور سنن میں الفاظ کے اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔ دیکھیے صحیح بخاری کتاب "العتق" باب اذا اعتق عبداً بین اثنین" بروایت ابن عمر (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۲۲) اس کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے:

اگر ایک شخص کسی غلام میں سے اپنے حصے کو آزاد کر دے اور اس کے پاس غلام کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت بھی ہو تو غلام کی عادلانہ قیمت طے کی جائے اور اس میں جو حصے دار ہیں ان کے حصص ادا کر دیے جائیں۔ اس طرح پورا غلام اس کی جانب سے آزاد کیا جائے گا اور اگر وہ باقی حصوں کی قیمت ادا نہیں کر سکتا تو اس کے حصے میں سے غلام جتنا آزاد ہو سکتا ہے آزاد سمجھا جائے گا۔ نیز ملاحظہ ہو (صحیح مسلم ۲-۱۱۳۹) کتاب العتق)

یہ حدیث اصحاب سنن اربعہ، دارقطنی اور امام احمد نے روایت کی ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے۔

" پھر غلام سے کہا جائے کہ وہ محنت کر کے باقی حصے داروں کے حصے کی قیمت ادا کر دے، مگر غلام کو زیادہ مشقت کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔"

مؤطا امام مالک[1] اور دوسری کتب حدیث میں حسن بصری اور محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ عہد رسالت میں ایک شخص نے چھ غلام اپنی موت کے وقت آزاد کر دیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غلاموں میں قرعہ اندازی کر کے ان میں سے ایک تہائی کو آزاد کر دیا۔

امام مالک فرماتے ہیں مجھے پتہ چلا ہے کہ اس شخص کے پاس ان غلاموں کے علاوہ دوسرا کوئی مال نہ تھا۔ یہ حدیث مؤطا کے علاوہ بعض دوسری کتب میں مرفوعاً بروایت حسن بصری وابن سیرین عن عمران بن حُصَین روایت کی گئی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں:

"یہ بات سن کر حضورؐ ناراض ہوئے اور فرمایا میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس شخص کی نمازِ جنازہ نہ پڑھاؤں"۔[2]

---

[1] مؤطا امام مالک (۲ - ۳۸۰) کتاب العتق والولاء باب من اعتق رقیقاً لا یملک مالا غیرھم۔ ابن وہب نے "المدونہ" (۳ - ۱۷۶) میں اسی طرح روایت کی ہے۔ اس حدیث کی سند میں موجود بعض رجال کا تعارف حسب ذیل ہے۔

الحسن: حسن ابن یسار ابوالحسن البصری مشہور فقیہ تابعی تھے۔ زیادہ تر مرسل روایات بیان کرتے تھے۔ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ انھوں نے بکثرت ایسے صحابہ سے حدیثیں روایت کی ہیں جن سے ان کا سماع ثابت نہیں۔

محمد بن سیرین: مشہور تابعی اور ثقہ راوی تھے۔ ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ آپ ایک غلام ہونے کے باوجود بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے۔

ملحوظ رہے یہ روایت مرسل ہے۔

[2] نسائی (۴ - ۶۴) نے یہ حدیث علی بن حجر عن ہشیم عن منصور بن زاذان، عن حسن عن عمران بن حصین کی سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ ایک شخص نے چھ غلام اپنی موت کے وقت آزاد کر دیے۔ اس کے پاس ان کے سوا کوئی مال نہ تھا۔ جب حضورؐ کو پتہ چلا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا "میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس کا جنازہ نہ پڑھاؤں"۔ پھر آپؐ نے اس کے غلاموں کو بلا کر تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں قرعہ اندازی کر کے دو کو آزاد کر دیا اور چار کو غلام رہنے دیا۔

مسلم (۳ - ۱۲۸۸) کتاب "الایمان" باب ثواب العبد واجرہ اذا نصح لسیدہ "ہشام بن حسان، از محمد بن سیرین کی سند کے ساتھ۔

ابوداؤد (۴ - ۲۸) کتاب "العتق" باب فیمن اعتق عبیداً لہ" اس میں یحیی بن عتیق اور ایوب محمد بن سیرین سے روایت کرتے ہیں اور وہ عمران بن حُصَین سے۔

اس حدیث کے بارے میں دارقطنی مسلم پر نقد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"عام طور سے کہا جاتا ہے کہ عمران بن حُصَین سے محمد بن سیرین کا سماع ثابت نہیں جبکہ ابن سیرین نے یہ حدیث خالد الحذاء، عن ابوقلابہ، عن ابوالمہلب، عن عمران بن حصین کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

امام نووی شرح صحیح مسلم (۱۱ - ۱۴۰) میں اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ محمد بن سیرین نے عمران بن حُصَین سے نہیں سنا۔ اور اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس سے اس حدیث کی صحت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اور نہ ہی امام مسلم پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس لیے کہ امام مسلم نے

مصنف عبدالرزاق[1] میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر مجھے پتہ چلتا تو میں اس شخص کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنے دیتا" آپؐ نے ان غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی کر کے دو کو آزاد کر دیا اور چار کو غلام رہنے دیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک انصاری عورت نے چھ غلام آزاد کیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منگوا کر ان میں قرعہ اندازی کی اور دو کو آزاد کر دیا۔ دوسری کتب حدیث میں ہے کہ آپ نے غلاموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ دو کو آزاد کر دیا اور چار کو غلام رہنے دیا۔

اسماعیل القاضی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کی قیمت طے کی تھی۔

سلیمان بن موسیٰ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کی قیمت طے کی تھی۔ اسماعیل القاضی

پہلے یہ حدیث واضح صحیح اسناد کے ساتھ نقل کی ہے۔ اور بعد ازاں اس سند کے ساتھ بطور تائید کے پیش کی ہے"۔

مزید براں ابن سیرین کا سماع عمران بن حُصَین سے ثابت ہے۔ شیخ ربیع بن ہادی نے اپنے رسالہ (THESIS) بین الامامین مسلم و دارقطنی" میں جو کچھ تحریر کیا ہے میں اس سے نقل کرتا ہوں۔ یہ کتاب انھوں نے مکہ کی جامعۃ الملک عبدالعزیز، اب جامعۃ ام القریٰ سے ایم اے کی ڈگری لینے کے لیے تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میرے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ یہ سند متصل ہے اور مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث محمد بن سیرین نے بذاتِ خود عمران بن حصین سے سنی ہے:

۱ - ابن سیرین کا سماع عمران بن حُصَین سے ثابت ہے جیسا کہ اکابر ائمہ حدیث نے جن میں سے امام احمد بن حنبل بھی ہیں، اس کی تصریح کی ہے۔ العلائی نے جامع التحصیل میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یحییٰ بن معین کے نزدیک بھی ابن سیرین کا سماع عمران بن حُصین سے ثابت ہے، چنانچہ ابن ابی حاتم نے "الجرح والتعدیل" میں اور ابن سعد نے "الطبقات" میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ کسی محدث نے دارقطنی کے اس دعویٰ کی تائید نہیں کی کہ ابن سیرین نے عمران بن حُصَین سے نہیں سنا۔

۲ - محمد بن سیرین تدلیس کے عیب سے پاک ہیں۔ اور جب عمران بن حُصَین سے اُن کا سماع ثابت ہے تو ان کے عَنْ عَنْ کے الفاظ کے ساتھ حدیث روایت کرنے کو سماع و اتصال پر محمول کیا جائے گا۔

۳ - ابن سیرین سے روایت کرنے والا راوی نہایت ثقہ ہے۔ علاوہ ازیں دوسرا ثقہ راوی ایوب بھی اس کی تائید کرتا ہے جو انتہائی ثقہ راویوں میں شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں دو اور ثقہ راوی یعنی یحییٰ بن عتیق اور حبیب بن الشہید بھی ان دونوں کے مؤید ہیں۔ اس طرح یہ چار نہایت ثقہ راوی ہیں۔ ان کے مقابلے میں صرف ایک راوی اشعث نامی ہے جس کے بارے میں دارقطنی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آیا وہ اشعث الحمرانی ہے یا اشعث الحدانی۔ (ملخص از رسالہ مذکور ج ۲ ص ۴۵-۴۶)

[1] ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق (۹-۱۵۹) نیز اس حدیث کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

ترمذی (۳-۶۴۵) کتاب "الاحکام" باب "ما جاء فیمن یعتق ممالیکہ عند موتہ" ترمذی کہتے ہیں کہ عمران بن حصین سے روایت کردہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

کہتے ہیں اگر سلیمان کی بات صحیح ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غلاموں کی قیمت برابر تھی۔ ورنہ قیمت طے کرنا اس لیے ضروری تھا کہ دو آزاد کردہ غلاموں کی قیمت ایک تہائی ترکہ سے زیادہ نہ ہو جائے۔

پہلی حدیث صحیح مسلم میں ابن سیرین، ابوہریرہ و عمران بن حُصَین کی سند کے ساتھ مرفوعاً بھی روایت کی گئی ہے۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ وصیت ایک تہائی مال تک کی جا سکتی ہے۔

۲۔ غلاموں کو قرعہ ڈال کر بھی آزاد کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جو شخص وصیت میں ایک تہائی سے تجاوز کر جائے اس کی وصیت کو ایک تہائی تک محدود کیا جائے۔

۴۔ مرض کی حالت میں غلام آزاد کرنے کو وصیت کا حکم حاصل ہے۔

۵۔ جو معاملہ حاکم کی موجودگی میں پیش ہوا سے وہ خود نمٹائے کسی دوسرے کو تفویض نہ کرے۔

۶۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاکم وقت غلام اور اس کے آقا کے مابین معاملات کو نمٹا سکتا ہے۔

۷۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہائی تک وصیت غیر اقارب کے لیے بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس طاؤس اور بعض دوسرے اہل علم سے روایت نقل کی گئی ہے کہ جو شخص غیر اقارب کے لیے تو وصیت کرے لیکن اقارب کے لیے نہ کرے تو اس کی وصیت باطل ہے۔ علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جو شخص غیر اقارب کے لیے وصیت کرے اس کی وصیت کا ایک تہائی اس کے اقارب کو دیا جائے۔

امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ وصیت فرض نہیں ہے۔ ان کے برعکس بعض دوسرے اہل علم وصیت کو فرض قرار دیتے ہیں[۲]

مصنف عبدالرزاق میں عکرمہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:[۳]

---

[۱] مصنف سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ مسلم نے یہ حدیث ابوہریرہ سے نہیں بلکہ عمران بن حُصَین سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ حضرت ابوہریرہ سے منقول حدیث البیہقی (۱۰-۲۸۶) نے اسرائیل عن عبداللہ بن مختار عن محمد بن زیاد عن ابوہریرہ کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کی ہے۔ البیہقی نے اس کو مسلم کی جانب منسوب نہیں کیا۔

[۲] وصیت کی فرضیت و عدم فرضیت کے بارے میں قبل ازیں گفتگو ہو چکی ہے۔

[۳] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۹-۷۰) بروایت عمرو بن خارجہ عن معمر عن مطر الوراق عن شہر بن حوشب عن عکرمہ۔ البیہقی (۶-۲۶۴) نے یہ حدیث بروایت شہر بن حوشب عن عبدالرحمٰن بن غنم بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ حدیث حماد بن سلمہ نے قتادہ سے اور انھوں نے عمرو سے روایت کی ہے۔ مگر یہ سند ضعیف ہے۔ علاوہ ازیں بیہقی نے یہ حدیث اسماعیل بن مسلم عن حسن عن عمرو کی سند کے ساتھ بھی روایت کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ "وارث اجازت دیں تو مرنے والا وصیت کر سکتا ہے"۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ایک اور سند کے ساتھ بھی مروی ہے۔

"وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں ..... عورت اپنے مال میں اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کرسکتی"

عمرو بن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ "ایک تہائی مال میں وصیت کی جاسکتی ہے"[1]۔

صحیح البخاری[2] (کتاب البیوع) اور صحیح مسلم[3] (کتاب الایمان) میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم نے

دار قطنی (۴-۱۵۲) نے یہ حدیث قتادہ عن شہر بن حوشب کی سند کے ساتھ ذکر کی ہے۔ ترمذی (۴-۴۳۳) نے یہ حدیث اسی سند کے ساتھ کتاب "الوصایا" باب "ماجاء لا وصیۃ لوارث" میں روایت کی ہے۔ ابن ماجہ (۲-۹۰۵) نے اس کو "الوصایا" میں نقل کیا ہے۔

مزید براں یہ حدیث احمد، البزار، ابو یعلی الموصلی، اور حارث بن ابی اسامہ نے اپنی اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں"

نیز طبرانی نے یہ حدیث اپنی معجم میں بھی روایت کی ہے۔ البزار کہتے ہیں:

"ہم نہیں جانتے کہ عمرو بن خارجہ نے اس کے علاوہ بھی کوئی حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہو۔ دیکھیے نصب الرایۃ (۴-۴۰۴)

اس کی مؤید وہ حدیث ہے جو دار قطنی (۲-۹۹۷) نے بسند عطاء الخراسانی عن عبد اللہ بن عباسؓ روایت کی ہے۔ مگر عطاء کی ملاقات حضرت ابن عباس کے ساتھ ثابت نہیں۔ لہٰذا یہ ضعیف روایت ہے۔ اسی طرح اس کی مؤید ایک دوسری حدیث وہ ہے جو ابن ماجہ (۲-۹۹۶) نے بروایت انس بن مالک کتاب "الوصایا" باب "لا وصیۃ لوارث" میں نقل کی ہے۔

[1] اس کتاب کے دوسرے نسخوں میں بخاری و مسلم کی حضرت جابرؓ سے مروی حدیث کے الفاظ عمرو بن شعیب سے منقول حدیث کے ساتھ مخلوط ہوگئے ہیں جو کہ ایک قسم کی تحریف ہے۔

[2] صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "بیع المدبر" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۳۰) نیز کتاب "العتق" باب "بیع المدبر" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۳۴) صحیح بخاری کتاب "الاحکام" باب "بیع الامام علی الناس اموالھم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۷۱۸۶) اس میں یہ الفاظ ہیں کہ "اس غلام کو آٹھ سو درہم کے عوض فروخت کر دیا۔ اور اس کی قیمت مالک کے پاس بھیج دی"۔

[3] صحیح مسلم (۳-۱۸۹) کتاب "الایمان" باب "جواز بیع المدبر" اس میں مندرجہ ذیل تفصیلات بھی ہیں۔

"ایک انصاری نے مرض وفات میں کہا کہ میں اپنے غلام کو اپنی موت کے بعد آزاد کرتا ہوں۔ اس کے پاس غلام کے سوا دوسرا کوئی مال نہ تھا۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو آپ نے فرمایا "اس غلام کو کون خریدے گا؟ چنانچہ نعیم بن عبد اللہ نے اور ایک روایت کے مطابق ابن النحام نے آٹھ سو درہم کے عوض اسے خرید لیا۔ وہ رقم آپ نے انصاری کو بھجوا دی۔

عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ کو یہ کہتے سنا کہ ایک قبطی غلام ہجرت کے پہلے سال وفات پا گیا۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں، جو انھوں نے کتاب "الزکوٰۃ" باب "الابتداء فی النفقۃ بالنفس" میں بروایت ایوب، عن ابی الزبیر، عن جابر نقل کی ہے کہ اس

ایک "مدبّر"[1] غلام کو فروخت کر دیا تھا۔ صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس شخص کے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی مال نہ تھا۔[2]

ابن شعبانؒ کی کتاب میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ایک انصاری نے وصیت کی کہ اس کی وفات کے بعد اس کا غلام آزاد کر دیا جائے حالانکہ وہ انصاری محتاج اور مقروض تھا۔ حضورؐ نے اس غلام کو آٹھ سو درہم کے عوض فروخت کر دیا۔ وہ رقم آپؐ نے انصاری کو دے دی اور فرمایا: "اپنا قرض ادا کرو اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو۔"

امام مالکؒ اور دوسرے اہل علم نے اس کی تاویل کی ہے کہ پہلی حدیث زیادہ صحیح ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کو یا تو اس کے مالک کی وفات کے بعد فروخت کیا تھا اور یا اس کی زندگی میں غلام کو "مدبّر" بنانے سے قبل۔

ابن ابی زید کہتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی روایت کردہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کو قرض ادا کرنے کے لیے فروخت کیا تھا۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپؐ نے غلام کو بلا کر کہا کہ کون ہے جو اس کو

انصاری کا نام ابو مذکور اور غلام کا نام یعقوب تھا۔

ابوداؤد (۴ - ۲۷) نے اس حدیث کا ذکر کتاب "العتق" باب "فی بیع المدبر" میں کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ اس غلام کو سات سو یا نو سو درہم کے عوض فروخت کیا گیا تھا۔ صحیح مسلم کی طرح اس میں آزاد کرنے والے اور غلام کے نام بھی مذکور ہیں اور اس پر محدثین کا اتفاق ہے کہ ابو مذکور صحابی تھے۔ الذہبیؒ نے "تجرید اسماء الصحابۃ" (۲ - ۲۰۰) میں ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ابو مذکور صحابی تھے۔ آپ نے اپنی وفات کے بعد ایک غلام آزاد کرنے کا اعلان کیا تھا۔"

حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابۃ" (۴ - ۱۷۷) میں صرف اتنا کہا ہے:۔

"ابو مذکور صحابی ہیں۔ ان کا ذکر "بیع المدبر" والی حدیث میں آیا ہے جو امام مسلمؒ نے ایوب عن ابو الزبیر عن جابرؓ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ دوسری روایات میں ان کا نام مذکور نہیں۔ ابن الاثیرؒ "اسد الغابۃ" (۵ - ۲۹۴) میں مسلم کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس کو شعبہ نے بروایت عمرو بن دینار، عن جابرؓ نقل کیا ہے۔ حضرت جابرؓ اپنی قوم کے ایک شخص کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ اس نے اپنے ایک غلام کو آزاد کیا تھا۔ ابن الاثیرؒ کہتے ہیں کہ یہ روایت ابن مندہ اور ابو نعیم نے نقل کی ہے۔

[1] غلام کا مالک جب یہ کہے کہ میری موت کے بعد یہ آزاد ہے تو ایسے غلام کو "مدبّر" کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ موت حیات کے پیچھے ہے۔ یا اس لیے کہ غلام کا مالک اپنی دنیا و آخرت کے معاملہ کو "مدبّر" کرتا ہے یعنی اس کی تدبیر کرتا ہے۔ دنیا تو اس لیے کہ وہ تاحیات غلام سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ اور آخرت اس لیے کہ اسے اپنی موت کے بعد آزاد کرنے سے اسے اجر و ثواب ملتا رہے گا۔

[2] حافظ ابن حجر فتح الباری (۴ - ۳۲۲) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث نسائی نے اعمش عن سلمہ بن کہیل کی سند کے ساتھ اسی طرح روایت کی ہے مگر نسائی کی سنن صغریٰ میں یہ حدیث مجھے نہیں ملی ممکن ہے سنن کبریٰ میں موجود ہو۔

خریدے گا ، جب یہ بات طے شدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بلا وجہ فروخت نہیں کر سکتے تھے تو پھر اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ آپؐ نے یہ فیصلہ اس سلسلہ میں شریعت کے احکام پر عمل درآمد کے لیے فرمایا۔

حضرت جابرؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ اس انصاری کے پاس اس غلام کے سوا دوسرا کوئی مال نہ تھا۔ جب انصاری فوت[1] ہو گئے تو حضورؐ نے فرمایا۔ کون ہے جو اسے مجھ سے خریدے گا۔

حضرت جابرؓ سے روایت کرنے والوں کے بیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض راوی کہتے ہیں کہ غلام کے مالک نے اس کو آزاد کر دیا تھا جب کہ بعض راویوں کا بیان ہے کہ اس نے اپنی موت کے بعد اس کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مختصر ابن ابی زید میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ غزوہ اوطاس میں ہم نے چند عورتوں کو قیدی بنایا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! عزل (فرج سے باہر انزال) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس لیے کہ ہم ان لونڈیوں کو فروخت کر کے قیمت حاصل کرنا چاہتے ہیں[2]۔ اس کے جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عزل کو حرام نہیں قرار دیا۔

---

[1] البیہقی (۱۰-۳۱۱) لکھتے ہیں یہ حدیث شریک بن عبداللہ نے سلمہ بن کہیل ، از عطاء ، از ابو الزبیر ، از جابر کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک شخص فوت ہو گیا۔ اس نے ایک مدبر غلام اور قرض چھوڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس غلام کو اس کے قرض میں فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کو آٹھ سو درہم کے عوض فروخت کر دیا گیا۔

بیہقی کے مطابق ابو بکر نیشاپوری کا قول ہے کہ اس حدیث کے راوی شریک کا یہ کہنا درست نہیں "کہ غلام کا مالک فوت ہو گیا تھا۔" اس لیے کہ اعمش کی روایت کردہ حدیث میں سلمہ بن کہیل سے یہ الفاظ منقول ہیں "کہ غلام کی قیمت حضورؐ نے اس کے مالک کو دے دی اور فرمایا کہ اس سے اپنا قرض ادا کر دو۔"

اسی طرح عمرو بن دینار اور ابو الزبیر حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ غلام کا مالک اس روز زندہ تھا جب اسے فروخت کیا گیا۔

بیہقی کہتے ہیں کہ محدثین کو اس حدیث میں شریک کی غلطی کا یقین ہے۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ ابو الزبیر اور عمرو بن دینار کا بیان ہے کہ جابر بن عبداللہ نے ان کو بتایا کہ ایک انصاری نے اپنی موت کے بعد اپنے غلام کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ فوت ہو گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کو بلا کر بنی عدی بن کعب کے ایک شخص نعیم بن عبداللہ کے پاس فروخت کر دیا۔ یہ حدیث مسلم (۳-۱۲۹) نے ابو غسان سے روایت کی ہے ، مگر مسلم نے اس کی عبارت نقل نہیں کی بلکہ حماد بن زید کی روایت کا حوالہ دے کر اس پر اکتفا کیا ہے۔

[2] یہ حدیث تمام صحاح وسنن میں موجود ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "بیع الرقیق" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۲۹) میں زہری ، ابن محیریز سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! لونڈیاں ہمارے قبضہ میں آتی ہیں اور ہم انھیں فروخت کر کے قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں عزل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کیا تم ایسا کرتے ہو؟ ایسا نہ کرنے سے تمھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جس روح کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا ہونا مقدر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گی۔ نیز صحیح بخاری کتاب "النکاح" باب "العزل" (فتح الباری کی حدیث نمبر ۵۲۱۰) میں یہ الفاظ ہیں "کہ ہم عزل کیا کرتے تھے۔"

صحابہؓ کے قول "نحب الاثمن" (ہم لونڈیوں کو فروخت کرنا چاہتے ہیں) میں اس بات کی دلیل ہے کہ حاملہ ہونے یا بچہ جننے کی

عزل کے بارے میں اختلافِ آراء:۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۹ - ۳۰۸) میں لکھتے ہیں:۔

"عزل کے بارے میں علمائے سلف کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ علماء کے ہاں اس ضمن میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ آزاد منکوحہ بیوی کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل درست نہیں۔ اس لیے کہ مجامعت اس کا جائز حق ہے جس کا وہ مطالبہ کر سکتی ہے۔ اور معروف جماع وہی ہے جو مع الانزال ہو۔ ابن ہبیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے:۔

اس اجماع پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ بیوی جب عزل پر راضی نہ ہو تو شوافع اس کے ممنوع ہونے کے قائل ہیں۔ اور اگر بیوی عزل پر راضی ہو تو اس میں دو آراء ہیں۔ اور ان دونوں میں سے صحیح تر عزل کا جواز ہے۔ یہ مسلک آزاد عورت کے بارے میں ہیں۔ لونڈی کے بارے میں رائے یہ ہے کہ اگر وہ منکوحہ ہو تو اس کو آزاد عورت پر قیاس کیا جائے گا۔ اگر عزل، آزاد عورت کے ساتھ جائز ہے تو منکوحہ لونڈی کے ساتھ بھی یقیناً جائز ہے۔ اور اگر آزاد عورت کے ساتھ جائز نہیں تو منکوحہ لونڈی کے بارے میں دو صورتیں ہیں۔ ان دونوں میں سے صحیح تر صورت عزل کے جواز کی ہے تاکہ غلام بچے پیدا نہ ہوں۔

لونڈی کے ساتھ عزل کے جائز ہونے پر اتفاق ہے۔ البتہ الرویانی کہتے ہیں کہ عزل مطلقاً ناجائز ہے۔ امام ابن حزم کا بھی یہی مسلک ہے۔ اگر لونڈی اُمّ ولد ہو تو اس کے بارے میں راجح مذہب عزل کا مطلقاً جائز ہونا ہے۔ اس لیے کہ وہ باقاعدہ منکوحہ کی طرح نہیں ہے۔ بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ اُمّ ولد لونڈی منکوحہ لونڈی کا حکم رکھتی ہے۔

تین ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ آزاد عورت کی اجازت کے بغیر اس کے ساتھ عزل جائز نہیں جبکہ لونڈی کی اجازت کے بغیر اس کے ساتھ عزل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ منکوحہ لونڈی کے بارے میں اختلاف ہے۔ مالکیہ کے نزدیک اس کے مالک سے اذن لینے کی ضرورت ہے۔ امام ابو حنیفہ کا موقف بھی یہی ہے اور محمد بن حسن کا راجح قول بھی یہی ہے۔ امام احمد اور قاضی ابو یوسف کے نزدیک اس منکوحہ لونڈی کی اجازت پر موقوف ہے۔ امام احمد سے ایک روایت تو یہی ہے جبکہ ان سے دوسری روایت یہ نقل کی گئی ہے کہ عزل مطلقاً جائز ہے۔ اور انہی سے تیسری روایت یہ نقل کی گئی ہے کہ عزل مطلقاً ممنوع ہے۔"

(حافظ ابن حجر کا بیان ختم ہوا)

صورت میں لونڈی کو بیچا نہیں جا سکتا۔ یہ اس بارے میں ایک واضح دلیل ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ابراہیم کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس کے بچے نے اسے آزاد کروا دیا۔[1]

"الواضحہ" میں سعید بن المسیب سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات الاولاد (وہ لونڈیاں جو صاحب اولاد ہو جائیں) کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا کہ نہ انھیں وصیت میں دیا جائے اور نہ ہی قرض میں۔"[2]

---

[1] ملاحظہ ہو ابن ماجہ (۲-۱۴۱) عن ابی بکر بن ابی سبرہ، عن حسین بن عبداللہ بن عبیداللہ بن عباس عن عکرمہ عن ابن عباس کی سند کے ساتھ۔

اس سند میں ابوبکر بن ابی سبرہ نامی راوی ضعیف ہے۔ اور حسین بن عبداللہ متروک الحدیث ہے۔ الاثرم امام احمد سے نقل کرتے ہیں کہ حسین منکر حدیثیں روایت کرتا ہے اور ابن ابی خیثمہ، ابن معین سے نقل کرتے ہیں کہ حسین ضعیف ہے۔ بخاری کا قول ہے کہ ان کے استاد علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں نے حسین سے حدیث روایت کرنا ترک کر دیا ہے اسی طرح امام احمد نے بھی اس کو ترک کر دیا تھا۔

حافظ ابن حجر "التلخیص الحبیر" (۴-۲۱۸) میں لکھتے ہیں:-

"اس کی سند میں حسین بن عبداللہ نہایت ہی ضعیف راوی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ ابو عباس نے فرمایا کہ حسین کی روایت معلول ہوتی ہے۔ یہ حدیث مسروق نے عکرمہ، عن عمرو، عن خصیف، عن عکرمہ، عن ابن عمر، عن عمر کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اس سند کے مطابق حدیث کے اصل راوی حضرت عمرؓ ہیں۔

البیہقی (۱۰-۳۴۷) نے ایک دوسری سند (ابن لہیعہ، عن عبیداللہ بن ابی جعفر) کے ساتھ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ابراہیم سے کہا "تمھیں تمھارے بچے نے آزاد کروا دیا" یہ روایت مُعضَل ہے۔

اس کی مؤید دوسری حدیث ہے جو دارقطنی (۴-۱۳۴) نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح روایت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"جب کسی شخص کی لونڈی ام ولد بن جائے، اور وہ شخص فوت ہو جائے تو وہ آزاد ہو جاتی ہے۔"

دارقطنی کہتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے اور مرفوع حدیث نہیں۔ البیہقی اور عبدالحق نے بھی اسی طرح کہی ہے۔ امام مالک نے بھی مؤطا (۲-۹۱۳) میں اسی طرح روایت کی گئی ہے۔

[2] البیہقی (۱۰-۳۴۴) بروایت جعفر بن عون، عن عبدالرحمان بن زیاد، عن مسلم بن یسار عن سعید بن المسیب۔ جعفر کہتے ہیں کہ یہ حدیث کسی اور نے روایت نہیں کی۔ "الجامع" میں سفیان ثوری سے یہ حدیث عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم، عن مسلم بن یسار کی سند کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے سعید بن المسیب سے امہات الاولاد کو آزاد کرنے کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں حضرت عمر پہلے شخص تھے جنھوں نے امہات الاولاد کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ ان سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آزاد کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان کو نہ تو وصیت میں دیا جائے۔ اور نہ قرض کی ادائیگی کے لیے فروخت کیا جائے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسلم بن لیسار کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے دریافت کیا کہ امہات الاولاد کو آزاد کرنے کے بارے میں حضرت عمرؓ کی کیا رائے تھی؟ انھوں نے فرمایا "حضرت عمرؓ نے ان کو آزاد کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ان کو آزاد کر دیا جائے۔ نہ وہ وصیت میں دی جائیں اور نہ قرض کی ادائیگی کے لیے انھیں فروخت کیا جائے۔"

کتاب "رجال الموطا" للبرقیؒ میں سعید بن عبدالعزیز سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیمؑ کی والدہ ماریہ نے تین ماہ (آزاد عورتوں کے برابر) عدت گزاری۔ البرقی کہتے ہیں کہ ماریہؓ نے سنہ ۱۶ھ میں وفات پائی۔

صرف بیہقی اور دارقطنی (۴-۱۳۲) نے یہ حدیث عبدالرحمٰن افریقی عن مسلم بن لیسار عن سعید بن المسیب کی سند کے ساتھ موصولاً روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے امہات الاولاد کو آزاد کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کیا تھا۔ البیہقی کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن افریقی اس کے روایت کرنے میں منفرد ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔ جہاں تک سعید بن المسیب کی حضرت عمرؓ سے روایت کا تعلق ہے وہ منقطع ہے لیکن امام احمد بن حنبل کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ روایت اس لیے صحت ہے کہ سعید نے حضرت عمرؓ کو دیکھا اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

لہ البرقی :۔ محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم بن ابی ذرعہ البرقی مولیٰ بنی زہرہ۔ ابن فرحون کہتے ہیں کہ البرقی نے تاریخ، طبقات الفقہاء اور مؤطا کے راویوں پر لکھا ہے ۔۔۔۔۔۔ انھوں نے سنہ ۲۴۹ھ میں وفات پائی۔

البرقی کے سوانح اور تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔

(ترتیب المدارک قاضی عیاض (۱-۲۰۰) اور (۳-۴۰) "الاکمال" لابن ماکولا (۱-۴۷۲) اور "الدیباج" لابن فرحون (ص ۲۳۰))

نوٹ :۔ رجال مؤطا پر البرقی کی کتاب مجھے نہیں مل سکی۔

البرقی کے علاوہ بکثرت اہلِ علم نے مؤطا امام مالک کے راویوں اور رجال پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کتاب کو اہلِ علم کی نظروں کا مرکز و مرجع بنا دیا۔ اس کتاب کے لیے اللہ تعالیٰ نے دوام مقدر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے اس کتاب کی اتنی قدر و منزلت کی کہ کسی اور دینی کتاب کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں :۔

"لوگوں نے مؤطا کے لیے جس قدر اہتمام کیا وہ حدیث یا دین کی کسی اور کتاب کے لیے نہیں کیا گیا۔"

ابن فرحون کہتے ہیں :۔

"متعدد مالکی اور دیگر اہلِ علم نے مؤطا امام مالک کی احادیث اور رجال پر گفتگو کی اور ان کے بارے میں کتب تصنیف کی ہیں۔"

قاضی عیاض نے اس ضمن میں نوے اہلِ علم کے نام گنائے ہیں جن اہلِ علم نے مؤطا کے راویوں اور رجال کو موضوعِ سخن بنایا ہے ان میں سے بعض اہلِ علم کے نام مثال کے طور پر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

۱۔ قاضی محمد ابوعبداللہ بن یحییٰ بن محمد بن الحذاء التمیمی۔ آپ سنہ ۳۴۷ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۴۱۰ھ میں وفات پائی۔ آپ نے "التعریف برجال الموطا" چار جلدوں میں تحریر کی۔

۲۔ ابوعمر الطلمنکی۔ ان کا نام و نسب احمد بن محمد بن ابی عبداللہ بن ابی عیسیٰ المعافری ہے۔ آپ نے متعدد کتب تحریر کی ہیں۔ نیز مؤطا کے

صحیح احادیث میں ہے کہ بریرہؓ (لونڈی) نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ رقم کی درخواست کی تاکہ وہ رقم ادا کر کے آزادی حاصل کر سکے۔ وہ رقم ۹ اوقیہ (ایک وزن) تھی ہر سال اسے ایک اوقیہ ادا کرنا تھا۔ بریرہ نے اس میں سے کچھ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ صحیح بخاریؒ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ بریرہ نے حضرت عائشہؓ سے مدد طلب کی۔ اس کے ذمے پانچ اوقیہ واجب الادا تھے۔ وہ ہر سال ایک اوقیہ قسط ادا کرتی تھی۔

اس ضمن میں تمام احادیث بروایت عروہ عن عائشہ منقول ہیں۔

مؤطا امام مالکؒ اور صحیح بخاریؒ میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا اگر تیرے مالک چاہیں کہ میں ساری رقم ان کو یکمشت

راویوں پر بھی آپ نے ایک کتاب تحریر کی۔

۳۔ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ۔ انھوں نے "اسعاف المبطأ برجال الموطا" کے نام سے کتاب تحریر کی۔

۴۔ ابو عبداللہ بن الفرج۔ دیکھیے مقدمہ "تنویر الحوالک" نیز مقدمہ "اوجز المسالک" ص ۷۵۔

۱؎ بریرہ کے آزاد ہونے کا واقعہ پہلے کتاب "النکاح" میں گزر چکا ہے۔

۲؎ صحیح بخاری کتاب "المکاتب" باب "المکاتب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۶۰)

۳؎ موطا امام مالک (۲-۲۴) کتاب "العتق" باب مصیر الولاء لمن اعتق۔

۴؎ صحیح بخاری کتاب "المکاتب" باب "استعانۃ المکاتب وسؤالہ الناس"۔

حضرت عائشہؓ سے عمرہ کی جس روایت کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے وہ امام بخاری نے کتاب "الصلوٰۃ" باب "ذکر البیع والشراء علی المنبر والمسجد" میں روایت کی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۵۶) بروایت سفیان عن یحییٰ عن عمرہ عن عائشہؓ نیز آپ فرماتی ہیں کہ بریرہ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بدل کتابت ادا کرنے کی درخواست کی۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اگر تیرے مالک چاہیں تو میں یہ رقم یکمشت ان کو اس شرط پر ادا کر دوں کہ تمھارا حق ولاء مجھے حاصل ہوگا۔ اس کے مالکوں نے کہا کہ آپ چاہیں تو جو رقم باقی رہتی ہے وہ آپ بریرہ کو دے دیں۔ اس حدیث کے راوی سفیان بعض اوقات یوں کہتے ہیں کہ مالکوں نے کہا کہ اگر حضرت عائشہؓ چاہیں تو بریرہ کی رقم ادا کر کے اسے آزاد کر دیں اور اس کا حق ولاء ہمیں حاصل ہوگا۔"

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے سارا واقعہ آپ کو سنایا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "بریرہؓ کو خرید کر آزاد کر دو۔ اور ولاء کا حق صرف آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔" پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے۔ حدیث کے راوی سفیان بعض دفعہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے اور فرمایا۔ کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں مذکور نہیں ہیں؟ جو شخص ایسی شرط عائد کرے جو کتاب اللہ میں مذکور نہ ہو تو وہ اسے حاصل نہیں ہوگی چاہے وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ لگائے۔"

بخاری نے یہ حدیث کتاب "العتق" باب "بیع المکاتب اذا رضی" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۵۶۴) میں امام مالک عن یحییٰ بن سعید، عن عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بریرہ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مکاتبت میں معاونت کی درخواست کی۔ آپؓ نے فرمایا۔ اگر تیرے مالک چاہیں تو میں ساری رقم ایک ہی مرتبہ ادا کر کے تجھے آزاد

ادا کردوں اور تمھارا حق ولاء مجھے حاصل ہو جائے تو میں اس کے لیے تیار ہوں"۔ بریرہ نے مالکوں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ بریرہ حضرت عائشہؓ کے پاس واپس آئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ بریرہ نے کہا کہ میں نے اپنے مالکوں سے یہ بات کہی مگر انھوں نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ وہ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ حق ولاء ان کو ملے گا۔ یہ بات آپؐ نے بھی سن لی۔ پھر آپ نے بریرہ کا معاملہ دریافت کیا تو حضرت عائشہؓ نے آپؐ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بریرہ کو خرید لو اور اس کے مالکوں پر شرط عائد کرو کہ وہ تمھارا حق ولاء تسلیم کریں کیونکہ ولاء تو اسے ملے گی جو اُسے آزاد کرے گا"[1]

حضرت عائشہؓ نے اس ارشاد پر عمل کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد منبر پر تشریف لائے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ "یہ کیا بات ہے کہ لوگ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں مذکور نہیں"۔ مؤطا کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "جو شرط اللہ کی کتاب میں مذکور نہیں وہ باطل ہے۔ وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ کا فیصلہ زیادہ سچا ہے اور اللہ کی مقرر کردہ شرط مضبوط تر ہے۔ ولا آزاد کرنے والے کے لیے ہوگا"۔

کروا لوں"۔ بُریرہ نے اپنے مالکوں سے اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا ہم اس شرط پر ایسا کریں گے کہ حق ولاء ہمیں حاصل ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں یحییٰ نے کہا کہ بقول عمرہ، حضرت عائشہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ بریرہؓ کو خرید کر آزاد کر دو۔ ولاء کا حق آزاد کرنے والے ہی کو حاصل ہوگا"۔

امام بخاری کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے۔ مگر پہلی روایت سے اس کا متصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

[1] "اشترطی لهم" اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ طحاوی کہتے ہیں المزنی نے امام شافعی سے اس کی جگہ "اشرطی" روایت کیا ہے یعنی ہمزۂ قطعی کے ساتھ اور تاء کے بغیر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ولاء کا حکم ان کو بتادو"۔ اشراط کے معنی اظہار کے ہیں۔ اوس بن حجر کہتے ہیں:

فاشرط فيها نفسه وهو معصم۔

یہاں اشراط کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں۔

طحاوی مزید کہتے ہیں کہ اگر "اشترطی لهم" کے لفظ کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کی تاویل یہ کی جائے گی کہ اس کے معنی "اشترطی علیهم" کے ہیں جس طرح آیت کریمہ "فان اسأتم فلها" میں "فلها" کے معنی "فعلیها" کے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ المزنی سے یہی مشہور ہے۔ الخطابی نے بڑے وثوق کے ساتھ ان سے یہی روایت بیان کی ہے۔ امام شافعی سے یہی روایت مشہور ہے۔ البیہقی نے "المعرفۃ" میں یہ ابو حاتم رازی عن حرملہ عن شافعی کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

دوسرے اہل علم کہتے ہیں کہ "اشترطی لهم" میں امر اباحت کے لیے ہے۔ گویا تنبیہ کے طور پر ان سے کہا گیا کہ بے شک بریرہ کے اہل خانہ اپنے لیے ولاء کی شرط لگا لیں، مگر انھیں اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ اس شرط کا عدم و وجود ان کے لیے برابر ہے۔ میرے خیال میں یہی بات زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ دیکھیے فتح الباری (۵-۱۶۱)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کہ کُلُّ شرط لیس فی کتاب اللّٰہ" (ہر شرط جو کتاب اللہ میں موجود نہ ہو) کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شرط جو کتاب اللہ کے خلاف ہو۔

نیز حضرت عائشہؓ سے آپ کا یہ ارشاد فرمانا کہ "ان کے لیے ولاء کی شرط طے کرلو"۔ تو اس سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ ان پہ ولاء کی شرط عائد کر دو، یعنی یہاں "لھم" میں "ل" "علی" کے معنوں میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

اُولٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ (الرعد - ۲۵) سے اصل مراد اُولٰئك علیھم اللعنۃ ہے یعنی یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

اس حدیث سے جو مسائل مستنبط ہوتے ہیں ان کا ذکر اس سے پہلے کتاب "الطلاق" میں اس لونڈی کے ضمن میں ہو چکا ہے جو کسی کی منکوحہ ہو۔

حضرت عائشہؓ نے بریرہ کو اس وقت خریدا تھا جب وہ بدلِ کتابت ادا کرنے سے قاصر رہی تھی۔ یہ بات مطرف اور دیگر اہلِ علم نے کہی ہے۔

ابن شعبان کی کتاب میں ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اسلام میں اولین مکاتب تھے۔ انھوں نے اپنے آقا سے مکاتبت کا معاملہ کیا تھا کہ وہ (سلمان فارسی) ان کے لیے کھجور کا ایک سو پودا لگائیں گے۔ اور وہ سب پودے اُگ آئیں گے تو وہ آزاد ہوں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب پودے لگانے ہوں تو مجھے بتانا"۔ چنانچہ پودے لگانے کے بعد حضرت سلمانؓ نے آپ کو آگاہ کیا۔ آپ نے دعا فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب پودے اُگ آئے اور ایک پودا بھی ضائع نہ ہوا۔[۱]

---

[۱] یہ حدیث امام احمد نے مسند (۵-۴۴۰) میں عفان سے روایت کی ہے۔ حماد بن سلمہ کہتے ہیں کہ مجھے علی بن زید نے بتایا کہ انھوں نے ابوعثمان النہدی سے سنا، انھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے مالکوں سے معاہدہ کیا کہ میں ان کے لیے کھجوروں کے پانچ سو پودے لگاؤں گا۔ جب وہ پودے کونپلیں نکال لیں گے تو مجھے آزاد کر دیا جائے گا۔ میں نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا "ان کے ساتھ یہ شرط طے کرلو اور جب پودے کاشت کرنے ہوں تو مجھے بتانا"۔ حضرت سلمان کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو اطلاع دی۔ آپؐ تشریف لائے اور ایک کے سوا سب پودے آپ نے لگائے۔ ایک پودا میں نے لگایا۔ سب پودے اُگ آئے مگر وہ نہ اُگا۔

مسند احمد (۴۴۳-۵) میں دوسری روایت یوں ہے کہ سلمان فارسی کو آشوبِ چشم کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر و احد میں شرکت نہ کر سکے۔ پھر آپ نے فرمایا "سلمان! اپنے مالک کے ساتھ بدلِ کتابت طے کرلو"۔ تعمیل ارشاد میں میں نے اپنے مالک سے معاملہ طے کر لیا کہ میں ان کے لیے کھجور کے تین سو پودے زمین سے لا کر لگاؤں گا اور چالیس اوقیہ سونا ادا کروں گا۔ حاکم نے المستدرک (۲-۲۱۸) میں یہ حدیث بطریق عاصم بن زید و علی بن زید عن ابی عثمان روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث بروایت عاصم بن الاحول بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ذہبی بھی حاکم کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ بیہقی (۱۰-۳۲۱) نے بھی اپنی سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔

سلمان ایک آزاد شخص تھے۔ قبیلہ کلب کے چند تاجر ان کے پاس سے گزرے اور انھیں اپنے ساتھ اٹھا لائے۔ جب وہ لوگ وادی القریٰ میں پہنچے تو انھیں ایک یہودی کے پاس فروخت کر دیا۔ امام بخاری نے ان کے متعلق کچھ واقعات کا ذکر کتاب "البیوع" باب

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلام میں اولین مکاتب وہ شخص تھا جس کی کنیت ابو مؤمل تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ابو المؤمل کی مکاتبت میں مدد کرو، چنانچہ صحابہ نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ بدل کتابت ادا کرنے کے بعد بھی کچھ رقم ان کے پاس بچ رہی۔ ابو مؤمل نے اس رقم کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔

الزجاج نے کتاب المعانی میں حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ابو اُمیہ کو مکاتبت کا معاملہ طے کرنے کے لیے کہا۔ یہ پہلا غلام تھا جس نے اسلام لانے کے بعد مکاتبت کا معاہدہ کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسے پہلی قسط دی اور فرمایا اس کو بدل کتابت ادا کرنے کے لیے استعمال کرو۔ اس نے کہا اگر آپ اس رقم کو آخری قسط کی ادائیگی تک پوری کرتے تو بہتر ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے یہ اندیشہ ہے کہ شاید یہ رقم بعد میں میں تمھیں نہ دے سکوں۔

شراء المملوك من الحربي" میں کیا ہے۔ احمد اور طبرانی نے بروایت ابن اسحاق، عن عاصم بن عمر، عن محمود بن لبید، عن سلمان کی سند کے ساتھ متصلاً روایت کیا ہے۔ اس روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان سے کہا کہ اپنے مالک کے ساتھ مکاتبت کا معاملہ طے کر لو۔ سلمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے مالک کے ساتھ کھجور کے تین سو پودے لگانے کا معاملہ طے کر لیا۔

ابن حبان اور حاکم نے بھی اپنی کتابوں میں زید بن صوحان عن سلمان کی سند کے ساتھ اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے۔

؎ محدث ابن خزیمہ بریرہ کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"کہا گیا ہے کہ بریرہ اسلام میں پہلی مکاتبہ تھیں۔ مدینہ میں دورِ جاہلیت میں بھی مکاتبت کا رواج پایا جاتا تھا۔ مردوں میں پہلے مکاتب سلمان فارسی تھے۔ ابن التین بیان کرتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلے مکاتب ابو المؤمل تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ بدل مکاتبت کی ادائیگی میں اس کی مدد کرو۔"

امر واقعہ یہ ہے کہ ابو امیہ اسلام میں پہلا مکاتب نہیں تھا بلکہ عہد رسالت کے بعد کا پہلا مکاتب تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر کہتے ہیں۔

"عہد رسالت کے بعد پہلا مکاتب ابو امیہ مولیٰ عمر تھا اور اس کے بعد سیرین مولیٰ انس۔"

(دیکھیے فتح الباری ۵/ ۱۴۰)

اس غلام کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ جس کے چہرے پر تھپڑ مارے جائیں یا اُسے مُثلہ کیا جائے

"المدونہ"[1] میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ زنباع کا ایک غلام تھا جس کا نام سُندر یا ابن سُندر تھا۔ زنباع نے اسے اپنی لونڈی کا بوسہ لیتے دیکھا تو پکڑ کر اسے خصی کر دیا اور اس کی ناک اور کانوں کو چھید ڈالا۔ سُندر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا بیان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنباع کو بلا کر ارشاد فرمایا:۔

---

[1] یہ روایت متوقع جگہ پر مجھے المدونہ میں نہیں ملی۔ امام احمد نے مسند (۲۔۲۲۵) میں معمر بن سلیمان الرقی، عن حجاج اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس نے اپنے غلام کا مُثلہ کیا، یا اسے آگ سے جلانے کی سزا دی تو وہ غلام آزاد ہے اور اسے اللہ اور اس کے رسول کا مولیٰ سمجھا جائے گا" آپ کی خدمت میں ایک غلام کو پیش کیا گیا جسے خصی کیا گیا تھا اس کو سندر کہا جاتا تھا۔ آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؓ نے اس کے ساتھ نیک سلوک کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؓ بھی اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے۔ پھر اس نے مصر جانا چاہا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاص کو لکھا کہ اس کے ساتھ نیک سلوک کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل کیجیے۔

اس حدیث کا ذکر الہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۴۔۲۳۹) میں بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث احمد اور طبرانی نے بیان کی ہے اس کے راوی ثقہ ہیں۔ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ نامی راوی اگرچہ مدلس ہے تاہم وہ ثقہ ہے۔ مصنّف نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے امام احمد نے اس کو مسند (۲۔۱۸۲) میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ الہیثمی "مجمع الزوائد" (۶۔۲۸۸) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ابوداؤد اور احمد نے مختصراً روایت کی ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ جس روایت کی طرف الہیثمی نے اشارہ کیا ہے وہ کتاب "الدیات" باب "من قتل عبدہ او مثل بہ" (۴۔۱۷۶) میں مذکور ہے۔

البزار اور الطبرانی نے مندر سے روایت کیا ہے کہ وہ زنباع بن سلامہ کے پاس تھا۔ اس سے غلطی سرزد ہوئی جس کے نتیجے میں زنباع نے اسے خصی کر دیا اور اس کی ناک اور اس کے کان کاٹ دیے۔ اس نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر ماجرا بیان کیا۔ آپ نے زنباع کو بلا کر اسے سختی سے ڈانٹا اور سندر کو آزاد کر دیا۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے بارے میں حسن سلوک کی نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا میں تیرے بارے میں ہر مسلمان کو حسن سلوک کی نصیحت کرتا ہوں۔" اس کا ذکر الہیثمی نے

"غلاموں پر کام کا اتنا ہی بوجھ ڈالو، جتنا وہ برداشت کر سکیں۔ جو خود کھاتے ہو وہی انھیں کھلاؤ۔ اور جیسا خود پہنتے ہو ویسا انھیں پہناؤ۔ جس غلام کو ناپسند کرو اسے فروخت کر دو، جو پسند ہو اسے اپنے پاس رکھو اور اللہ کی مخلوق کو عذاب نہ دو۔"

آپ نے مزید فرمایا:

"جس غلام کا مثلہ کیا گیا یا اسے آگ کے ذریعے عذاب دیا گیا وہ آزاد ہے اور اللہ اور رسول کا مولی سمجھا جائے گا۔ پھر حضورؐ نے اس کو آزاد کر دیا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے بارے میں لوگوں کو نیک سلوک کی نصیحت فرمائیے۔" آپؐ نے فرمایا:

میں تمھارے متعلق ہر مسلمان کو حسنِ سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔"

صحیح مسلم[1] میں ہے کہ سُوید بن مُقرّن کی لونڈی کو کسی نے تھپڑ مارا۔ سُوید نے اُسے کہا: "کیا تُمھیں یہ بات معلوم نہیں کہ چہرہ قابلِ احترام چیز ہے؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم سات بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ ہمارا صرف ایک ہی خادم تھا۔ ہم میں سے ایک نے اس کو تھپڑ مارا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔"

ایک دوسری[2] روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس کوئی اور غلام نہیں۔ یہ سُن کر آپؐ

---

* "مجمع الزوائد" (۴-۲۳۹) میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند میں عبداللہ بن سندر مجہول راوی ہے۔ دوسرے راوی ثقہ ہیں۔

حافظ ابن حجر "الاصابۃ" (۲-۲۲۲) میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جب سندر کو عہدِ رسالت میں خصّی کیا گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بیٹے کو حضورؐ کی صُحبت و زیارت کا شرف حاصل ہوا ہوگا۔ میں نے ابن الحکم کی کتاب "فتوح مصر" میں دیکھا ہے کہ عہدِ رسالت میں وہ بڑی عمر کا تھا۔"

ابن الحکم نے اپنی کتاب "فتوح مصر" میں یہ واقعہ (ص ۱۲۷) میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"جب حضرت ابوبکرؓ نے وفات پائی تو سندر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو یاد رکھیے۔ آپ نے فرمایا "بہت اچھا! اگر آپ یہاں قیام کرنا چاہیں تو جو وظیفہ عہدِ رسالت میں آپ کو ملتا تھا میں وہ جاری رکھوں گا۔ ورنہ جہاں بھی کوئی زمین آپ پسند کریں گے میں آپ کو لکھ کر دے دوں؟" سندر نے کہا مصر کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو عمرو بن العاص امیر مصر کے نام خط لکھ دیا۔ آپ نے اس میں تحریر کیا کہ سندر کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کی تعمیل کیجیے۔ عمرو بن العاص نے سندر کو مصر میں وسیع قطعۂ زمین اور ایک مکان عطا کیا جس میں سندر سکونت پذیر رہا۔ جب اس نے وفات پائی تو اراضی کو سرکاری ملکیت میں شامل کر لیا گیا۔

[1] صحیح مسلم (۳-۱۲۸۰) کتاب الایمان" باب "صحبۃ الممالیک"۔

[2] صحیح مسلم (۳-۱۲۷۹) حوالہ مذکورہ۔ بروایت معاویہ بن سُوید۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک غلام کو تھپڑ مارا۔ پھر میں

نے فرمایا "اس سے فی الحال خدمت لیتے رہو۔ جب تمھیں دوسرا غلام مل جائے تو اسے آزاد کر دو۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے اپنے غلام پر حد لگائی اور اسے سزا دی حالانکہ غلام نے اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دے۔"

بھاگ گیا اور ظہر سے قبل آ کر اپنے والد کے پیچھے نماز ادا کی۔ میرے والد نے مجھے اور غلام کو بلایا اور کہا "اس سے بدلہ لو۔" لیکن غلام نے مجھے معاف کر دیا۔

پھر کہنے لگے عہد رسالت میں ہم بنی مقرن کا صرف ایک ہی غلام تھا۔ ہم میں سے کسی نے اسے تھپڑ مارا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا پتہ چلا تو آپؐ نے فرمایا "اسے آزاد کر دو۔" ہم نے عرض کیا ہمارا صرف ایک ہی غلام ہے۔ آپؐ نے فرمایا "تو اس سے خدمت لو اور جب دوسرا غلام مل جائے پر اس کی ضرورت باقی نہ رہے تو اسے آزاد کر دو۔"

گری[1] پڑی چیز کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

موطا[2] امام مالک، صحیح بخاری[3] اور صحیح مسلم[4] میں ہے کہ ایک آدمی (اور صحیح بخاری میں ہے کہ ایک اعرابی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپؐ سے گری پڑی چیز کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا اس کے توشہ دان اور تسمے کو اچھی طرح پہچان رکھو۔ پھر ایک سال تک اس کی تشہیر[5] کرو۔ اس دوران میں اگر اس کا مالک آجائے تو اس

---

[1] لُقَطَۃ : خلیل بن احمد نے اس کو لُقَطَۃ بفتح القاف ضبط کیا ہے۔ اس کے معنی گری پڑی چیز کو اٹھانے والے کے ہیں۔ اس لیے کہ جو لفظ فُعَلَۃ کے وزن پر آتا ہے وہ اسم فاعل کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے "ھُمَزَۃ لُمَزَۃ" وغیرہ۔

"لُقْطَۃ" بسکون القاف گری پڑی چیز کو کہتے ہیں۔ مثلاً ضُحْکَۃ (جس کی ہنسی اڑائی جائے) "ھُزْأَۃ" (جس کا مذاق اڑایا جائے)

اصمعی، ابن الاعرابی اور الفراء کہتے ہیں کہ لُقَطَۃ بفتح القاف گری پڑی چیز کو کہتے ہیں۔

ابن درید نے الجمھرۃ (۳-۱۱۳) میں اور زمخشری نے الفائق (۱-۳۶۵) میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ مگر عام لوگ اس کو بسکون القاف پڑھتے ہیں۔

ابوعبید اللقطۃ اور الضالۃ میں یہ فرق کرتے ہیں کہ ضالۃ گم شدہ حیوان کو کہتے ہیں اور لقطۃ کا اطلاق دوسری گری پڑی چیزوں پر کیا جاتا ہے۔ ضالۃ اس چیز کو کہتے ہیں جو خود بخود گم ہو جائے۔ مگر طحاوی اور دیگر علماء اس تفریق کو تسلیم نہیں کرتے۔ فریقین کے دلائل کے لیے دیکھیے التمھید (۳-۱۱۰)

[2] موطا امام مالک (۲-۱۲۸) کتاب "الاقضیۃ" باب "القضاء فی اللقطۃ"

[3] صحیح بخاری کتاب اللقطۃ باب اذا لم یوجد صاحب اللقطۃ بعد سنۃ فھی لمن وجدھا بروایت امام مالک (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۲۹)

[4] صحیح مسلم (۶-۱۳۴) کتاب "اللقطۃ"

[5] "عرفھا" یعنی لوگوں میں اس کی تشہیر کی جائے۔ اہل علم کہتے ہیں کہ محافل و مجالس، مساجد کے دروازوں اور بازاروں میں اس کی تشہیر کی جائے۔ مثلاً یوں کہے کہ کس کی فلاں چیز ضائع ہوئی ہے۔ اس چیز کی شکل و صورت نہ بیان کی جائے۔ "سَنَۃً" یعنی مسلسل ایک سال تک اس کی تشہیر کی جائے۔ اگر وقفہ وقفہ سے تشہیر کرے تو وہ ناکافی متصور ہوگی۔ علماء کا قول ہے کہ پہلے ہر روز دو دفعہ آواز دے کر تشہیر کرے۔ پھر ہر ہفتہ ایک دفعہ۔ اس کے بعد ہفتہ میں ایک دفعہ۔ پھر ہر ماہ میں ایک دفعہ۔ تشہیر خود کرنا ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے نمائندہ بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے فتح الباری (۵-۸۲)

عصر حاضر میں گم شدہ چیز کی تشہیر شہروں میں اخبارات و رسائل، ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعے کی جا سکتی ہے، البتہ دیہات میں ضروری ہے کہ بازاروں، مساجد کے دروازوں اور مناسب مقامات پر تشہیر کی جائے۔

کو دے دو اور مالک کا پتہ نہ چلے تو تم اس کے بارے میں سوچا ہوا کرو۔

اس نے دریافت کیا گم شدہ بکری کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا "وہ تمہاری ہے۔ یا اس کا مالک آ کر لے جائے گا ورنہ اسے بھیڑیا لے جائے گا۔" اور دیگر کتب میں ہے "کہ اپنے بھائی کو اس کا گم شدہ جانور واپس کر دو۔"

پھر اس نے گم شدہ اونٹ کے بارے میں سوال کیا۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر اس قدر ناراض ہوئے کہ آپؐ کے رخسار سرخ ہو گئے۔ یا یہ الفاظ ہیں کہ آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔" ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپؐ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ گم شدہ اونٹ سے تمہیں کیا غرض؟ اس کا مشکیزہ اور جوتا اس کے ساتھ ہے۔ وہ پانی پیتا اور درختوں کے پتے کھاتا رہے گا حتیٰ کہ اس کا مالک آ جائے۔"

ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ امام مالک کے علاوہ دیگر راویوں نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے "کہ اپنے مسلمان بھائی کا گم شدہ جانور اسے واپس کر دو۔"

لہ "الضالۃ" کا اطلاق صرف گم شدہ حیوان پر کیا جاتا ہے۔ عربی محاورہ میں کہتے ہیں "ضل الانسان والبعیر وغیرھما من الحیوان" (انسان، اونٹ اور کوئی اور حیوان گم ہو گیا) حیوان کے علاوہ دیگر گم شدہ اشیاء کے لیے "لقطۃ" کا لفظ بولتے ہیں۔

ٹہ اس میں اشارہ ہے کہ گم شدہ بکری کو اپنی تحویل میں لے لینا چاہیے۔ آپؐ کا مقصد یہ ہے کہ ضعیف ہونے کی بنا پر بکری آپ اپنی حفاظت نہیں کر سکتی بلکہ اس کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر وہ اسی طرح آوارہ پھرتی رہی تو پھر یا تو تم اسے اپنی حفاظت میں لے لو گے۔ یا اس کا مالک آ کر اسے پکڑ لے جائے گا اور اگر دونوں میں سے کوئی بات نہ ہوئی تو بھیڑیا اسے کھائے گا۔ بخاری کی ایک روایت میں اس بات کی تصریح ہے کہ گم شدہ بکری کو اپنی تحویل میں لے لینا چاہیے۔ (بخاری کتاب اللقطۃ باب "ضالۃ الغنم" فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۲۸) اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:۔

"بکری کو پکڑ لو۔ اس لیے کہ وہ یا تو تمہاری ہے، یا تمہارے بھائی کی ورنہ بھیڑیے کی۔"

امام مالکؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ گم شدہ بکری کو پکڑنے سے وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور اس کا مالک آ جائے تو پکڑنے والے پر تاوان وغیرہ لازم نہیں ہو گا۔ امام مالک کے نزدیک تملیک کے اعتبار سے بکری کو پکڑنے والا اور بھیڑیا دونوں برابر ہیں۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "لک" میں "لام" برائے تملیک نہیں۔ بکری کو پکڑنے والا اسی صورت میں اس کا مالک ہو گا کہ وہ اس کے ضمان کا ذمہ دار بھی ہو۔ (دیکھیے فتح الباری ۵ - ۸۲)

سہ صحیح بخاری کتاب "اللقطۃ" باب "اذا جاء صاحب اللقطۃ بعد سنۃ ردھا الیہ لانھا ودیعۃ عندہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۳۶)

ٹہ صحیح مسلم (۳ - ۱۳۴۹) ۔ کتاب اللقطہ۔

ابوداؤد (۲ - ۱۳۵) کتاب "اللقطۃ" ترمذی (۳ - ۶۵۶) کتاب "الاحکام" باب "ماجاء فی اللقطۃ"

ابن ماجہ (۲ - ۸۳۶) کتاب "اللقطۃ"۔

ھہ ابن عبدالبرؒ:۔ یہ یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر النمری القرطبی ہیں۔ کنیت ابوعمر اور لقب جمال الدین ہے۔ ۳۶۸ھ میں

طحاویؒ کہتے ہیں اہل علم میں سے کسی نے امام مالک کے اس موقف کی تائید نہیں کی کہ گم شدہ بکری کو اپنی تحویل میں لینے والا اگر اسے خطرناک جگہ میں پائے اور اسے کھالے تو اس پر اس کا تاوان نہیں ہوگا۔ طحاوی کہتے ہیں "ھی لک او لاخیک او للذئب" کے الفاظ سے امام مالک کا استدلال درست نہیں۔ اس لیے کہ حضورؐ کے قول "لک" سے تملیک ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ بھیڑیا اسے اپنی ملکیت بنا کر نہیں کھاتا۔ بلکہ بکری اس وقت بھی اپنے مالک کی ملکیت ہوتی ہے۔ اسی طرح بکری کو پکڑنے والا

مرکز علم و ادب قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ اکابر علماء کے علم اور ان کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ حتیٰ کہ عظیم حافظ حدیث، متبحر عالم اور فقیہ قرار پائے۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ یہ مغرب کے بخاری تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "التمھید" ستر جلدوں میں تصنیف کی۔ اس کو امام مالک کے شیوخ و اساتذہ کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا۔ متاخرین و متقدمین میں سے کسی نے ان جیسی شرح مؤطا تحریر نہیں کی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ مراکش کی حکومت نے اس کو شائع کرنا شروع کر دیا ہے اور اب تک اس کی تین جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آگئی ہیں۔

حافظ ابن عبدالبرؒ نے ۴۶۳ھ میں پچانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ نے ساری عمر تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ محدثین ان کی تصانیف سے استفادہ کرتے ہیں۔ تراجم و طبقات کی تمام کتابوں میں ان کا تعارف موجود ہے۔

"تمہید" کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ہماری اس کتاب "اقضیۃ رسول اللہ" کے مصنف شیخ امام ابوعبداللہ ابن الطلاع نے مالکی مذہب کے نقطۂ نظر اور محدثانہ نکات کی توضیح میں ابن عبدالبر پر بہت اعتماد کیا ہے، البتہ ان کے نام کا ذکر صرف اسی جگہ کیا ہے۔

یہ حدیث ابن عبدالبرؒ نے "التمھید" (۳-۱۱۰) میں اپنی سند کے ساتھ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کی ہے۔

لہ ابن عبدالبرؒ نے "التمھید" (۳-۱۳۵) میں طحاوی کا بیان نقل کر کے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے:۔

"ھی لک او لاخیک او للذئب" ان الفاظ میں "الاخ" (بھائی) سے بکری کا مالک بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مقصود یہ ہو کہ تم یا کوئی اور شخص اسے پکڑ لے۔ دونوں صورتوں میں "او للذئب" (یا بھیڑیا اسے کھالے) سے بکری کا ضیاع اور تلف ہو جانا مراد ہے۔ حضورؐ کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم یا تمھارے جیسا کوئی اور شخص بکری کو اپنی تحویل میں نہیں لے گا تو بھیڑیا اسے کھالے گا۔ اور تم یا کوئی دوسرا آدمی آخر بھیڑیئے سے تو بہتر ہی ہو۔ گویا آپؐ نے بکری کو اس کے پکڑنے والے کے لیے کھانے کی چیز قرار دیا۔ جب صورت حال یہ ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عطا کردہ کھانے کے لیے ضمانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

الطحاوی :۔ یہ احمد بن محمد بن سلامۃ بن سلمۃ ازدی طحاوی ابوجعفر مصنف کتاب "شرح معانی الآثار" ہیں۔ ۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ امام شافعی کے شاگرد رشید المزنی کی صحبت و رفاقت سے مستفید ہوئے۔ ان سے فقہ شافعی کا درس لیا۔ پھر شافعی مسلک چھوڑ کر حنفی مسلک اختیار کیا۔ اور ساری عمر حنفی فقہ کا دفاع کرنے میں بسر کر دی۔ ۳۲۱ھ میں وفات پائی۔

امام طحاوی کے تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیے:۔

(الجواھر المضیۃ (۱-۱۰۲) الوفیات لابن خلکان (۱-۱۹) لسان المیزان (۱-۲۷۴) البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر (۱۱-۱۷۴)

اگر اسے کھالے تو بھی وہ اصل مالک ہی کی ملکیت ہوگی[1] (لہٰذا اس پر اس کا ضمان ہوگا)
صحیح بخاری[2] اور مسلم[3] میں سوید[4] بن غفلہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اُبی بن کعب سے ملا تو انھوں نے بتایا کہ مجھے ایک

---

[1] امام مالک کے اس موقف کی بعض تفصیلات "المدونہ" (۶-۱۷۵) اور ابن حزم کی کتاب "المحلّٰی" (۹-۱۵۹) میں مذکور ہیں۔ جو یہ ہیں -

"امام مالک سے گمشدہ بکری کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر بکری دیہات کے قریب ہو تو وہ اسے کھائے نہیں بلکہ جو گاؤں قریب تر ہو وہاں پہنچا کر اس کے بارے میں اعلان کرے اور اگر جنگل میں ملے تو اسے اعلان کے بغیر بھی کھا سکتا ہے اس کے بعد اگر بکری کا مالک آ جائے تو اسے اس کی کوئی قیمت نہیں ادا کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد انھوں نے مذکورہ بالا حدیث بیان کی"۔

امام مالک کے موقف کی تردید میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت کردہ حدیث میں ثابت شدہ اضافہ سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ اپنے بھائی کا گمشدہ جانور اسے واپس کر دو۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ گمشدہ بکری کا شمار کیونکہ قیمتی متاع میں ہوتا ہے اس لیے فطری طور پر انسان میں اس کے حصول کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے مالک کے آنے کی صورت میں بکری کا ضمان ادا کیا جانا چاہیے۔ نیز اس لیے کہ بکری اپنے مالک کی ملکیت ہے۔ لہٰذا دوسرا کوئی شخص مالک کی مرضی اور اسے معاوضہ ادا کیے بغیر اس کا مالک نہیں بن سکتا۔

جیسے مزید براں بکری ایک محسوس عینی چیز ہے، لہٰذا موجود ہونے کی صورت میں اس کی واپسی ضروری ہے۔ اور تلف ہو جائے تو اس کا تاوان ادا کرنا چاہیے۔ اگر گرا پڑا سونا مل جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "ھی لک" (یہ تیری ہے) کا یہ مطلب نہیں کہ تاوان ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ سونا چاندی کے لقطہ کے بارے میں بھی امام مالک کا یہی موقف ہے کہ اس کی تشہیر کے بعد اس کو استعمال کرنا درست ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ سونا چاندی دیگر اموال کی مانند ہیں، تاہم اس کا ضمان ادا کرنے پر تمام اہل علم کا اجماع ہو چکا ہے، تو بکری کے بارے میں بھی یہی موقف اختیار کرنا چاہیے"۔ دیکھیے المغنی (۶-۳۹)

[2] صحیح بخاری کتاب "اللقطۃ" باب "اذا اخبرہ رب اللقطۃ بالعلامۃ دفع الیہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۲۶)

[3] صحیح مسلم (۳-۱۳۵۰) کتاب "اللقطہ"۔

[4] ایک نسخہ میں سوید بن عقلہ ہے جو صحیح نہیں۔ صحیح سوید بن غفلہ (بفتح الغین والفاء) ہے۔ ان کی کنیت ابو امیہ اور نسبت الجعفی ہے۔ بڑے جلیل القدر تابعی تھے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے پائے۔ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا۔ یہ عہد رسالت میں بالغ تھے اور زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے۔ صحیح روایت یہی ہے کہ انھوں نے آپ کو دیکھا نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آپ کی اقتدا میں نماز پڑھی تھی مگر یہ بات ثابت نہیں ہو سکی۔ صحیح روایت کے مطابق یہ اس وقت مدینہ آئے جب لوگ حضورؐ کو دفن کر کے واپس آ رہے تھے۔ پھر اکثر فتوحات میں شرکت کی اور کوفہ میں سکونت پذیر رہے۔ کوفہ ہی میں ۸۰ھ میں یا اس کے بعد وفات پائی۔

مصنف نے متن میں جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ درست ہے۔ اس واقعہ کی اصل روایت صحیحین (بحوالہ مذکور) میں موجود ہے۔ سلمہ بن کہیل کہتے ہیں کہ میں نے سوید بن غفلہ سے سنا۔ وہ بیان کرتے تھے کہ میں ایک غزوہ میں سلمان بن ربیعہ اور زید بن صوحان کے ساتھ تھا۔ مجھے ایک چابک پڑا ہوا ملا۔ دونوں نے مجھ سے کہا اسے پھینک دو۔ میں نے کہا نہیں۔ اگر اس کا مالک مجھے مل گیا تو اسے دے دوں گا ورنہ

تھیلی ملی جس میں ایک سو دینار تھے۔ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا "ایک سال تک اس کی تشہیر کرو"۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ مگر مجھے کوئی شخص نہ ملا جس کو اس تھیلی کا پتہ ہو۔ میں پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا "مزید ایک سال تک اس کی تشہیر کرو"۔ میں نے تشہیر کی مگر مجھے اس کا مالک نہ ملا۔ میں اس کو لے کر پھر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا "اس کی تھیلی اور تسمے کو سنبھال کر رکھو۔ ان (دیناروں) کو گن رکھو۔ اگر ان کا مالک آ جائے تو اسے دے دو۔ ورنہ اس سے فائدہ اٹھاؤ"۔

چنانچہ میں نے ان کو استعمال کر لیا۔ حدیث کے راوی شعبہ کہتے ہیں کہ بعد میں میں سلمہ بن کہیل سے مکہ میں ملا۔ وہ کہنے لگے مجھے یہ یاد نہیں کہ سوید بن سلمہ نے تین سال کی تشہیر کا بتایا تھا یا ایک سال کی تشہیر کا۔

اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ غزوہ سے واپس آ کر ہم حج کرنے گئے۔ (واپسی پر) میرا گزر مدینہ منورہ سے ہوا۔ میں نے چابک کے بارے میں ابی بن کعب سے دریافت کیا۔ (تا آخر) روایت کے الفاظ بخاری کے ہیں۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۳۷)

[1] مسند ابو داؤد الطیالسی ص ۷۵۔ شعبہ کے علاوہ راویان حدیث کی ایک جماعت نے یہ حدیث سلمہ سے بھی روایت کی ہے مگر اس میں شک کا ذکر نہیں ہے۔ دیکھیے صحیح مسلم (۳۔ ۱۳۵۱) مثلاً اعمش، ثوری، زید بن ابی انیسہ اور حماد بن سلمہ یہ سب شعبہ کی طرح سلمہ بن کہیل سے روایت کرتے ہیں۔ البتہ ان کی روایت کردہ حدیث میں تین سال کے الفاظ ہیں۔ بجز حماد بن سلمہ کے کہ اس کی روایت میں بطور شک کے دو یا تین سال کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

لقطہ کے بارے میں اختلاف مسالک گم شدہ چیز کی تشہیر کے بارے میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک قول المنذری کا ہے وہ کہتے ہیں کہ اہل فتویٰ ائمہ میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ تین سال تک گم شدہ چیز کی تشہیر کی جائے۔ صرف حضرت عمرؓ سے یہ قول منقول ہے۔ الماوردی نے بھی یہ قول غیر معروف فقہاء میں سے کسی ایک آدھ سے نقل کیا ہے۔ ابن المنذر نے اس ضمن میں حضرت عمرؓ کے چار اقوال روایت کیے ہیں۔

۱۔ تین سال تک تشہیر کی جائے۔

۲۔ صرف ایک سال۔

۳۔ تین ماہ

۴۔ تین دن

یہ اختلاف لقطہ کے اہم یا معمولی ہونے پر مبنی ہے۔ امام ابن حزم نے حضرت عمرؓ کا پانچواں قول بھی نقل کیا ہے اور وہ چار ماہ ہے۔ ابن الجوزی اور ابن حزم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ اضافہ غلط ہے۔ سلمہ پہلے بھول گیا تھا۔ بعد ازاں ہمیشہ پورے جزم و وثوق کے ساتھ ایک سال کہتا رہا۔ استدلال اسی روایت سے کیا جاتا ہے جس کا راوی شک میں مبتلا نہ ہو۔ لہٰذا صحیح ایک سال ہی ہے اور دوسرے اقوال باطل ہیں۔ (محلی ابن حزم (۹۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴))

پورے ایک سال تک لقطہ کی تشہیر کرنے کے بعد اسے استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

اس کے بارے میں اہل علم کے مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب اللہ کے فضل سے مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

اس بات پر اہل علم کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ تنگدست آدمی ایک سال کے بعد لُقطہ کو استعمال میں لا سکتا ہے۔ اور اگر اس کے بعد مالک آ جائے تو اسے اس کا ضمان دینا پڑے گا۔

مالدار کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ امام مالک کہتے ہیں کہ مالدار کو چاہیے کہ ایک سال کے بعد اسے صدقہ کر دے۔ اگر اس کے بعد مالک آ جائے تو اسے تاوان ادا کرنا ہوگا۔

۲۔ اوزاعی کہتے ہیں کہ مال زیادہ ہو تو ایک سال کے بعد اسے بیت المال میں داخل کر دے۔

۳۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ مالدار ایک سال کے بعد بھی اسے ہرگز نہ کھائے۔ البتہ تنگدست آدمی اسے کھا لے اور غنی صدقہ کر دے۔ اگر لُقطہ کا مالک آ جائے تو اسے اختیار ہے کہ کھانے والے تنگدست اور صدقہ کرنے والے غنی سے تاوان وصول کرے یا اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب پائے اور دونوں سے کچھ تعرض نہ کرے۔

۴۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ غنی ہو یا فقیر ایک سال گزرنے کے بعد وہ لُقطہ کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔

زید بن خالد الجُہنی سے مروی حدیث اس کی مؤید ہے۔ اس حدیث میں مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لُقطہ اٹھانے والے سے فرمایا "ایک سال گزرنے پر جیسے چاہو کرو۔"

رسول کریمؐ نے غنی و فقیر کے مابین کوئی امتیاز قائم کیا اور نہ ہی آپ نے تاوان کی ادائیگی کا حکم صادر کیا۔ یہ قول اقرب الی الصواب ہے۔ (التمہید ۳-۱۱۸)

لے مصنف نے مختلف روایتوں میں اختلاف الفاظ کا ذکر کرنے کے سلسلے میں نہایت تفصیل سے کام لیا ہے۔ میں یہاں پہلے صحیح بخاری کی مکمل روایت نقل کروں گا۔ اور اس کے بعد اختلاف الفاظ پر روشنی ڈالوں گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کتاب العلم باب کتابۃ العلم (فتح الباری میں حدیث نمبر ۱۱۲) میں ابونُعیم الفضل بن دُکین سے روایت کرتے ہیں۔ وہ شیبان سے، وہ یحییٰ سے، وہ ابن سلمہ سے اور وہ ابوہریرہؓ سے بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ والوں نے فتح مکہ والے سال اپنے ایک مقتول کے بدلے میں بنو لیث کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو آپ نے اپنی ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مکہ سے ہاتھیوں کو یا قتل کو روک دیا (امام بخاری کے استاد ابونُعیم کو شک ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور اہل ایمان کو مکہ پر مسلط فرمایا۔ مکہ میں خونریزی نہ پہلے کبھی حلال تھی نہ بعد میں جائز ہوگی۔ صرف اس دن کے چند لمحات کے لیے اس کی اجازت دی گئی تھی۔ پھر اس کے بعد یہ بدستور حرام ہے۔ آگاہ رہو کہ حدود حرم سے نہ کانٹا توڑا جائے۔ نہ اس میں سے درختوں کو کاٹا جائے۔ اس میں سے گری پڑی چیز صرف وہی شخص اٹھائے جو اس کی تشہیر کرنا چاہتا ہو۔ جو شخص کسی کو قتل کر دے ورثا کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے۔ (۱) اسے مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا (۲) یا وہ مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرے گا۔

"اللہ تعالیٰ نے مکّہ سے ہاتھیوں کو روک[۱] لیا۔"

اہلِ یمن میں سے ایک شخص نے آکر عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ خطبہ مجھے لکھوا دیجیے۔" آپ نے فرمایا "ابو فلاں کو یہ خطبہ تحریر کر دیجیے۔" ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! حدودِ حرم سے اذخر (گھاس) کاٹنے کی اجازت دی جائے۔ اس لیے کہ ہم اسے اپنے گھروں پر اور قبروں میں ڈالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "ہاں! اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت ہے۔" ابو عبداللہ سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کو کیا چیز لکھ کر دی گئی تھی؟ انھوں نے جواب دیا "یہ خطبہ"۔

صحیح بخاری کتاب "الدیات" باب "من قتل له قتیل فهو بخیر النظرین" میں بروایت شیبان (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۸۸۰) منقول ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مکّہ سے ہاتھی والوں کو روک دیا۔" اس روایت میں شک پر مشتمل الفاظ نہیں ہیں یمنی آدمی کا نام ابوشاہ ہے۔ ابوداؤد (۲-۲۰۲) کتاب المناسک باب تحریم مکة میں بروایت اوزاعی "الفیل" کی تصریح پائی جاتی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ:

"حرم میں شکار کو نہ بھگایا جائے اور وہاں کی گری پڑی چیز کو حلال تصوّر نہ کیا جائے۔"

پھر حضرت عباسؓ کھڑے ہوئے یا انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔

ترمذی (۴-۲۱) کتاب "الدیات" باب "ما جاء فی حکم ولی المقتول فی القصاص والعفو" عن الاوزاعی مختصراً۔

صحیح مسلم (۲-۹۸۸) کتاب "الحج" باب تحریم مکة وصیدها اوزاعی وشیبان۔

اس کی ایک مؤید حدیث صحیح بخاری (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۳۱۳) کتاب "المغازی" میں بروایت ابن عباس موجود ہے۔ نیز بخاری کتاب "اللقطة" باب "کیف تعرف لقطة اهل مکة" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۴۳۳)

صحیح بخاری کتاب "البیوع" باب "ما قیل فی الصواغ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۰۹۰)

صحیح مسلم (۲-۹۸۶) کتاب الحج باب تحریم مکة وصیدها۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اب ہجرت نہیں ہے، البتہ جہاد اور حسنِ نیت باقی ہے اور جب تم سے جہاد کی خاطر گھر سے نکلنے کے لیے کہا جائے تو نکل پڑو۔

اس شہر کو اللہ نے اس وقت حرام ٹھہرایا جس روز زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا تھا۔ یہ روزِ قیامت تک حرام ہی رہے گا۔ مجھ سے پہلے کسی شخص کو اس میں قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔ مجھے بھی صرف اسی دن کے لیے اس کی اجازت ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حرام ٹھہرانے کی وجہ سے یہ تا قیامت حرام ہی رہے گا۔ نہ اس کا کانٹا توڑا جائے، نہ اس کے شکار کو بھگایا جائے۔ اس میں گری پڑی چیز کو وہی شخص اٹھائے جو اس کی تشہیر کرنا چاہتا ہو۔ اس کی گھاس بھی نہ کاٹی جائے۔ حضرت عباسؓ نے کہا یا رسول اللہ! اذخر کی اجازت دیجیے۔ اس کو لوہار اور سنار استعمال کرتے ہیں۔ نیز یہ گھروں میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا "ہاں اذخر کی اجازت ہے۔" یہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں۔ نسائی (۵-۲۲۱) نے اس حدیث کو کتاب "الحج" باب "النهی عن ان ینفر صید الحرم" میں مختصراً بیان کیا ہے۔

[۱] فیل کو روکنے سے اصحابِ فیل کو روکنا مراد ہے۔ اس مشہور واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو اتوار کے روز، سترہ محرم آٹھ سو بیاسی سن رومی اسکندری، دو سو سولہ سن عربی، اور ایرانی بادشاہ نوشیروان بن قباد کے سن چوالیس ۴۴ میں وقوع پذیر ہوا۔ المقدسی نے اپنی کتاب

۔ صحیح بخاری میں اصیلی کی روایت میں یہی الفاظ ہیں۔ اور ابن القابسی کی روایت میں "قتل" کا لفظ ہے۔ (یعنی مکہ میں قتل وغارت کو روک دیا) پوری حدیث یوں ہے۔

" اللہ تعالیٰ نے مکہ پر اپنے رسول اور مومنین کو مسلط کیا۔ حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے مکہ کو حلال نہیں کیا گیا۔ اور میرے لیے بھی دن کے تھوڑے سے وقت کے لیے اس کو حلال کیا گیا۔ میرے بعد کسی کے لیے اس میں خونریزی وغیرہ کو مباح نہیں کیا جائے گا، لہٰذا اس کے شکار کو بھاگنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس کے درختوں کو کاٹا نہ جائے" اور دوسری روایت میں ہے کہ اس کی کانٹے دار جھاڑی کو بھی نہ کاٹا جائے"۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "اس کی جھاڑیوں کو کاٹا نہ جائے، اور اس کی گم شدہ چیز کو حلال نہ سمجھا جائے" ایک اور روایت میں ہے کہ "اس کی گری پڑی چیز اٹھانا اسی شخص کے لیے جائز ہے جو اس کی تشہیر کا ارادہ رکھتا ہو" ایک روایت میں یوں ہے کہ "لقطہ اٹھانا اسی شخص کے لیے جائز ہے جو اس کی تشہیر کرنا چاہتا ہو۔ اور جس کے کسی عزیز کو قتل کر دیا جائے اسے دو باتوں میں سے ایک بات کے انتخاب کا اختیار ہے۔ اسے یا تو دیت ادا کی جائے، یا قاتل سے قصاص لیا جائے"۔[۱]

"البدء والتاریخ" (۴۔۱۳۱، ۱۳۲) میں اسی طرح تحریر کیا گیا ہے۔

اس لشکر کا سپہ سالار شاہ حبشہ کی طرف سے یمن کا گورنر ابرہہ تھا۔ وہ مکہ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حملہ کو روک دیا اور پرندوں کے غولوں کو ان پر مسلط کیا جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔

بعض مستشرقین اور ان کے ہمنوا مسلمان مصنفین نے اس واقعہ میں تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے جلیل القدر استاذ ڈاکٹر ابوشہبہ نے اپنی کتاب "السیرة النبویة فی ضوء القرآن" (ص ۱۴۷، ۱۵۷) میں ان کی خوب تردید کی ہے جس سے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

[۱] حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو یہ خصوصیت عطا کی ہے کہ اس میں گری پڑی چیز کو اٹھانا صرف اسی شخص کے لیے جائز ہے جو اس کی تشہیر کا ارادہ رکھتا ہو۔ امام نووی شرح صحیح مسلم (۹۔۱۲۶) میں لکھتے ہیں:۔

"مکہ میں گری پڑی چیز کا اٹھانا اس شخص کے لیے جائز نہیں جو ایک سال تک اس کا اعلان کرنے کے بعد اس چیز کا مالک بن جانے کا ارادہ رکھتا ہو جیسا کہ دوسرے شہروں اور مقامات میں جائز سمجھا جاتا ہے مکہ میں لقطہ اٹھانے کی صرف اسی شخص کو اجازت ہے جو ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور کسی وقت بھی اس چیز کا مالک نہ بن سکے گا۔ یہ امام شافعی کا مسلک ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت اسی قسم کی منقول ہے۔ عبدالرحمن بن مہدی ابو عبید اور دیگر اہل علم کا موقف بھی یہی ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک حل و حرم کے لقطہ میں کوئی فرق نہیں۔ طحاوی حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "اس میں احتمال بھی ہے کہ حرم میں لقطہ کا اعلان بھی اسی طرح کیا جائے جس طرح دوسری جگہوں پر کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کر کے کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت عائشہؓ کا وہ قول مل گیا ہے جو اس ضمن میں ہم نے ان سے نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عورت نے جب ان سے حرم میں گم شدہ چیز کے بارے میں سوال کیا تو آپؓ نے فرمایا "اس سے فائدہ اٹھاؤ"

حضرت عباسؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! اذخر[1] گھاس کاٹنے کی اجازت دیجیے۔ اس لیے کہ ہم اسے قبروں میں ڈالتے ہیں۔ اور ہمارے سنار بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ حضرت عباسؓ نے کہا کہ ہم اسے قبروں میں ڈالتے اور گھروں میں استعمال کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اذخر کی اجازت ہے۔"

اہل یمن میں سے ابوشاہ نامی ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا "یا رسول اللہ! مجھے یہ لکھوا دیجیے۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوشاہ[2] کو تحریر کر دو۔"

میں نے اوزاعی سے دریافت کیا کہ ابوشاہ کا مقصد کیا تھا؟ انھوں نے کہا جو خطبہ اس نے حضورؐ سے سنا تھا وہ اسے لکھوانا چاہتا تھا۔

اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ حرم کا لقطہ دوسرے مقامات ہی کی طرح حلال ہے اور یہ کہ اس ضمن میں حل و حرم کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔"

[1] اِذخر (بکسر الہمزہ والخاء) ایک خوشبودار گھاس کا نام ہے۔

بعض اہل علم نے یہاں یہ اشکال پیش کیا ہے کہ پہلے آپؐ نے ہر قسم کے نباتات کو کاٹنے سے منع فرمایا۔ پھر سوال کرنے کے بعد اِذخر کو مستثنیٰ قرار دیا۔ حالانکہ آپؐ وحی کے بغیر کچھ نہیں کہتے تھے۔ تو آپؐ نے وحی آئے بغیر یہ استثناء کیسے کر دیا؟

اہل علم نے اس کے مندرجہ ذیل جوابات دیے ہیں:

۱۔ شاید آپؐ کو فوری طور پر بذریعہ وحی اِذخر کے استثنا سے آگاہ کیا گیا ہو۔

۲۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبل ازیں بذریعہ وحی آپؐ سے کہا گیا ہو کہ اگر کوئی شخص آپؐ سے کسی چیز کے استثناء کا مطالبہ کرے تو آپؐ استثناء کر دیں۔

۳۔ ممکن ہے آپؐ نے اجتہاد کیا ہو اور آپؐ کا اجتہاد حکم خداوندی سے ہم آہنگ ثابت ہوا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے استثناء کے بارے میں سکوت فرمایا ہے۔

[2] ابوشاہ۔ اس کے آخر میں ہاء الوقف ہے، تاء مربوطہ نہیں ہے۔ اس کا اصل نام معلوم نہیں۔ اپنی کنیت سے مشہور رہے تھے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک وہ قبیلہ کلب کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ بعض کہتے ہیں وہ فارسی الاصل تھے۔ اور ان لوگوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو سیف بن ذی یزن کی امداد کے لیے یمن آئے تھے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ ابوشاہ کی ہاء اصلی ہے۔ اور فارسی میں اس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔

(دیکھیے "الاصابہ" (۴-۱۰۱)

یہ بات صحیح ہے چنانچہ اسی سے شاہنشاہ (ملک الملوک) اور شاہ جہان (ملک العالم) وغیرہ بنے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو یہ کہے کہ میرا باغ فی سبیل اللہ صدقہ ہے

مؤطا امام[1] مالک اور صحیح بخاری[2] میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ابوطلحہ انصار صحابہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے۔ ان کے کھجوروں کے کئی باغات تھے جن میں سے بیرحا نامی باغ ان کو بہت عزیز تھا۔ یہ باغ مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ میں تشریف لے جاتے اور اس کا لذیذ پانی پیتے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں جب سورہ آل عمران کی آیت کریمہ

---

[1] مؤطا امام مالک (۲-۲۵۷) کتابٌ الجامع "بابٌ الترغیب فی الصدقة"

[2] صحیح بخاری کتابٌ الزکوٰة "بابٌ الزکوٰة علی الاقارب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۱۴۶۱) نیز کتابُ الوکالة "بابٌ اذا قال الرجل لوکیله ضعه حیث اراك الله" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۳۱۸) نیز کتابُ الوصایا "باب من تصدق الی وکیله ثم رد الوکیل الیه (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۵۸) اس میں یہ اضافہ بھی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ کے سایہ میں تشریف رکھتے اور اس کا پانی پیا کرتے تھے۔ ابوطلحہ نے وہ باغ اپنے اقارب کو دے دیا۔ حضرت اُبی بن کعب اور حسانؓ بن ثابت بھی ان کے اقارب میں سے تھے راوی کہتا ہے کہ حسانؓ نے اپنا حصہ حضرت معاویہؓ کے پاس فروخت کر دیا۔ حسان سے کہا گیا کہ کیا آپ ابوطلحہ کا صدقہ فروخت کر رہے ہیں؟ حسانؓ نے کہا۔ کیا میں کھجوروں کا ایک صاع ایک صاع دراہم کے عوض بھی فروخت نہ کروں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ باغ قصر بنی حدیلہ کی جگہ واقع تھا جس کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے تعمیر کیا تھا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ محمد بن حسن مخزومی کی کتابٌ اخبار المدینة المنورة" میں ہے کہ حسان کے حصے کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی۔ جو انھوں نے حضرت معاویہ سے وصول کی۔

صحیح مسلم (۲-۶۹۳) کتابٌ الزکوٰة "بابٌ فضل النفقة والصدقة علی الاقربین والزوج"

[3] بیرحاء:- یہ لفظ کئی طرح سے ضبط کیا گیا ہے:

۱- بفتح الباء وکسرہا یعنی بَیرحاء و بِیرحاء۔

۲- بفتح الراء وضمہا یعنی بیرَحاء و بیرُحاء۔

۳- بالف ممدودہ و مقصورہ۔ (دیکھیے النهایة (۱-۱۱۴)

زمخشری الفائق (۱-۷۶) میں لکھتے ہیں:-

" یہ لفظ فَیعَلیٰ کے وزن پر البراح سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھلی زمین کے ہیں۔ بیابان۔ ویرانہ۔ آج کل اس جگہ کو قصر بنی حدیلہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔ (آل عمران - ۹۲)
تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک راہ خدا میں وہ چیزیں بھی صرف نہ کرو جو تمھیں عزیز ہیں۔

نازل ہوئی تو ابو طلحہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنی کتاب میں فرمایا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔

اور مجھے اپنے سارے مال میں سے بیرحاء زیادہ عزیز ہے۔ میں راہ خدا میں اس کو صدقہ کر کے اس کا اجر و ثواب حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جیسے چاہیں اس کو صدقہ کر دیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا" بہت خوب یہ مال تو تمہ بڑے نفع بخش کاروبار میں لگا دیا ہے۔

ایک روایت میں "رَابِحٌ" ہے[1]۔ فرمایا "ذَالِكَ مال رابح" (اس مال کا اجر تمھیں آخرت میں ملے گا) پھر آپ نے فرمایا: تم نے باغ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ میں نے سُن لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ باغ اپنے اقارب کو دے دو۔ ابوطلحہ نے کہا "میں تعمیل ارشاد کروں گا" چنانچہ ابوطلحہ نے یہ باغ اپنے اقارب اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا یہ باغ اپنے غریب رشتہ داروں کو دے دو۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ابوطلحہ نے وہ باغ حسان بن ثابت اور ابُیّ بن کعب کو دے دیا۔ یہ دونوں ابوطلحہ کے مجھ سے زیادہ قریبی رشتہ دار تھے۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ جو شخص یہ کہے کہ میں نے اپنا مکان صدقہ کے طور پر دیا۔ اور یہ نہ کہے کہ فقراء کو یا کسی اور کو دیا ہے تو اس کا ایسا کرنا جائز ہے وہ جس کو چاہے یہ مکان دے دے۔ اقارب کو یا جن کو دینا چاہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ یہ اس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ نہ کہے کہ وہ مکان میں فلاں کو دے رہا ہوں، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

۲۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اپنی زمین صدقہ کر دے اور اس کی حدود واضح نہ کرے تو ایسا کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ زمین مشہور ہو[2]۔ یہ سب روایات صحیح بخاری میں موجود ہیں۔

---

[1] رَابِحٌ بالباء المعجمة والحاء المھملة۔ مؤطا کے شارح الباجی کہتے ہیں کہ یہ الفاظ یحییٰ بن یحییٰ اور راویوں کی ایک جماعت کی روایت کردہ حدیث میں ہیں۔ ابن دینار کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ صدقہ کرنے والے کی موت کے بعد بھی اس صدقہ کا اجر صدقہ کرنے والے کو ملتا رہے گا۔ الباجی اس کا مفہوم یہ بتاتے ہیں کہ یہ ایسا مال ہے جس کا ثواب اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ الباجی مزید کہتے ہیں کہ مطرف اور ابن الماجشون نے اپنی اپنی روایت میں "رَابِحٌ" (بالباء) نقل کیا ہے۔ یحییٰ بن دینار کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مال صدقہ کرنے والے کے لیے آخرت میں نفع بخش ہے۔ دیکھیے المنتقی شرح المؤطا (۵ - ۳۲۰)

امام بخاری نے کتاب "الوصایا" میں تصریح کی ہے کہ رابح یا رایح کے درمیان شک اس حدیث کے راوی عبداللہ بن مسلمۃ القعنبی کو ہوا ہے۔

[2] اس حدیث سے کچھ اور مسائل بھی مستنبط ہوتے ہیں جن کا ذکر حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۵ - ۹۷) میں کیا ہے۔

امام مالکؒ موطا (کتاب الحج باب ما یجوز للمحرم اکلہ من الصید) میں یحییٰ بن سعید عن محمد بن ابراہیم بن حارث التیمی، عن

۱۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وقف کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ جس کے لیے وقف کیا گیا ہے وہ اسے قبول بھی کرے۔

۲۔ یہ کہ ایک زندہ شخص مرض وفات سے پہلے ایک تہائی مال سے زیادہ بھی صدقہ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطلحہ سے دریافت نہیں فرمایا تھا کہ تم نے کتنا مال صدقہ کیا ہے؟

۳۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک عالم فاضل آدمی بھی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ مجھے فلاں چیز یا فلاں مال سے محبت ہے۔ (جیسے ابوطلحہؓ نے کہا تھا) نیز یہ کہ اس سے اس کے مرتبہ میں کچھ کمی نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بارے میں فرمایا ہے کہ: إِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (انسان مال سے شدید محبت رکھتا ہے) اجماعاً اس آیت میں "الخیر" سے مال ہی مراد ہے۔

۴۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باغات وغیرہ تیار کرنا، اہل علم کا باغات میں جا کر اس کے پھل اور سایہ سے لطف اندوز ہونا نیز سیر و سیاحت، جسمانی راحت کا حصول، یہ سب چیزیں جائز اور مستحب ہیں۔ جب کوئی شخص عبادت کی تھکاوٹ دور کرنے اور اپنے جسم میں عبادت کے لیے قوت پیدا کرنے کے لیے ان لذات سے مستفید ہو تو یہ باعث اجر و ثواب ہے۔

۵۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک شخص اپنے دوست کے گھر سے اس کی غیر موجودگی میں بھی پانی وغیرہ پی سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ اس سے خوش ہوگا اور بُرا نہیں مانے گا۔

۶۔ اس حدیث سے پتہ چلا کہ دولت مند آدمی کو اگر بلا سوال نفلی صدقہ مل جائے تو وہ اس سے متمتع ہو سکتا ہے۔

نیز کچھ مزید فوائد ہیں جن کا ذکر حافظ ابن حجرؒ نے کیا ہے۔ ہم نے صرف خلاصہ بیان کیا ہے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی بعض فوائد کا ذکر کیا ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے ان سے وہ فوائد و نکات نقل کیے ہیں۔ دیکھیے۔ التمہید (۱-۲۰۰)

ؒ موطا امام مالک (۱-۳۵۰) کتاب "الحج" باب ما یجوز للمحرم اکلہ من الصید۔

نسائی (۵-۱۸۳) کتاب "الحج" باب ما یجوز للمحرم اکلہ من الصید۔

ابن ماجہ (۲-۱۰۳۳) کتاب "المناسک" باب "رخصۃ اکل الصید اذا لم یصد لہ" بروایت طلحہ بن عُبید اللہ۔

البوصیری زوائد ابن ماجہ میں کہتے ہیں کہ اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔

الاطراف میں ہے کہ یعقوب بن شیبہ نے کہا کہ میرے علم کی حد تک یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ یحییٰ بن سعید سے ابن عیینہ کے سوا کسی نے روایت نہیں کی۔ یعقوب کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ انھوں نے اختصار کرنا چاہا مگر ان سے غلطی سرزد ہوئی۔ باقی سب لوگوں نے ان کی مخالفت کی ہے اور یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ اس کو اپنے رفقاء میں تقسیم کر دیں۔ حالانکہ وہ سب احرام باندھے ہوئے تھے۔ (البوصیری کا بیان ختم ہوا)

جلال الدین سیوطی تنویر الحوالک میں لکھتے ہیں:۔

"ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ امام مالک سے روایت کرنے والوں نے اس حدیث کی سند میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ البتہ یحییٰ بن سعید کے تلامذہ نے اختلاف کیا ہے۔ راویوں کی ایک جماعت نے یہ حدیث امام مالک کی طرح روایت کی ہے۔ ہُشیم، یزید بن ہارون اور علی بن مُسہر

عیسیٰ[1] بن طلحہ بن عبیداللہ عن عُمیر[2] بن سلمہ الضمری عن زید بن کعب[3] البہزی کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھ کر مدینہ سے عازمِ مکہ ہوئے۔ جب الرَّوحاء[4] پہنچے تو اچانک ایک زخمی گورخر نمودار ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آگاہ کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا "اسے رہنے دو ممکن ہے اس کا شکار کرنے والا آجائے۔" چنانچہ اس کا شکاری

سب نے یہ حدیث یحییٰ بن سعید سے، محمد بن ابراہیم عن عیسیٰ بن طلحہ عن عُمیر ابن سلمہ کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کی ہے۔ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ عُمیر بن سلمہ کبار صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عُمیر بن سلمہ نے یہ حدیث مرفوعاً روایت کی ہے۔ ان کے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کسی اور راوی کا واسطہ نہیں ہے۔

موسیٰ بن ہارون کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے یہ حدیث اس طرح منقول نہیں۔ اس لیے کہ راویوں کی ایک جماعت نے یہ حدیث یحییٰ بن سعید سے امام مالک کی طرح ہی روایت کی ہے۔ اس کی ذمہ داری یحییٰ بن سعید پر عائد ہوتی ہے، جو کبھی یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث "البہزیؓ" سے مروی ہے۔ اور بعض دفعہ کہتا یحییٰ البہزیؓ سے۔

یہ حدیث البیہقی نے "السنن الکبریٰ" (٥ - ١٨٨) میں البہزیؓ کے ایک شخص سے روایت کی ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ہُشیم کی جس روایت کی طرف ابن عبدالبرؒ نے اشارہ کیا ہے وہ مسند احمد (٣ - ٤١٨) میں موجود ہے۔ وہ عُمیر بن سلمہ الضمری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر العرج کے مقام سے ہوا۔ یزید بن ہارون کی جو روایت مسند احمد (٣ - ٤٥٢) میں ہے اس میں بھی ہے کہ البہز کے ایک شخص سے روایت ہے۔

الہیثمی "مجمع الزوائد" (٣ - ٢٣٠) میں لکھتے ہیں کہ نسائی نے یہ حدیث عُمیر سے روایت کی ہے۔ وہ بہز کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں۔ مسند احمد کے سب راوی ثقہ ہیں۔

[1] عیسیٰ بن طلحہ بن عُبیداللہ التیمی کو نسائی، ابنِ معین اور العجلی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ عیسیٰ بن طلحہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ ان کے تعارف کے لیے دیکھیے "اسعاف المبطا" ص ٢٤۔

یہ تینوں اصحاب یعنی یحییٰ بن سعید انصاری، محمد بن ابراہیم بن حارث التیمی القرشی اور عیسیٰ بن طلحہ المدنی ثقہ تابعین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

[2] عُمیر بن سلمہ بن منتاب بن طلحہ بن جدی بن حمزہ۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ وہ کبار صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ دیکھیے شرح الزرقانی (٣ - ٨٩) اور اسعاف المبطا للسیوطی ص ٢٢)

[3] زید بن کعب السہمی صحابی ہیں۔ زرقانی نے صرف اتنا ہی لکھا ہے اور ان کا مفصل تعارف نہیں کرایا۔ سیوطی نے "اسعاف المبطا" میں ان کا تعارف نہیں کروایا۔ البتہ ابن مندہ، ابونُعیم اور ابن عبدالبرؒ نے ان کا تعارف کرایا ہے۔ ابن الاثیرؒ "اسد الغابۃ" (٢ - ٢٣٩) میں ان سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زید بن کعب السہمی ثمّ البہزی اس زخمی جنگلی گدھے کے مالک تھے۔ بغوی وغیرہ نے ان کا نام ذکر کیا ہے۔

[4] الرَّوحاء:۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ مدینہ سے مکہ کی سڑک پر چالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

کرنے والا[1] البہزی حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! اس گورخر کو آپ جیسے چاہیں کام میں لائیں۔ آپ نے حضرت ابوبکر کو حکم دیا اور انھوں نے (اسے ذبح کر کے اس کا گوشت) رفقائے سفر میں تقسیم کر دیا۔ پھر سفر پر روانہ ہوگئے۔ حضور الرُّوَیثہ[1] اور العَرج[2] کے درمیان اُثایہ[3] کے مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک ہرن سایہ میں کھڑا ہے۔ اس کے جسم میں ایک تیر پھنسا ہوا تھا۔ آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ ہرن کے پاس کھڑا رہے تاکہ کوئی آدمی اسے ایذا نہ پہنچائے۔ یہاں تک کہ سب لوگ اس کے پاس سے گزر جائیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب شکار محرم کے لیے نہ کیا گیا ہو تو وہ اس میں سے کھا سکتا ہے[4]۔

نیز اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشترکہ ہبہ[5] جائز ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ اس کو جائز نہیں سمجھتے۔

---

[1] الرُّوَیثَة:۔ رُوثَة کی تصغیر ہے۔ اس کا واحد روث یا رَوْثَة (لید۔ گوبر)۔ روثة الانف ناک کا ایک حصہ۔ ابن الکلبی کہتے ہیں جب تُبّع اہل مدینہ کے ساتھ لڑائی لڑ کر مکّہ جا رہا تھا تو راستے میں اس نے رُوَیثہ کے مقام پر قیام کیا۔ اس سفر میں چونکہ اسے دیر ہوگئی تھی اس لیے اس نے اس جگہ کا نام رُوَیثہ رکھا۔ یہ راث یریث سے ہے جس کے معنی تاخیر کے ہیں۔ یہ جگہ مدینہ سے ایک دن کے سفر کے فاصلے پر ہے۔ الازہری کہتے ہیں کہ رُوَیثہ مکّہ مدینہ کے درمیان ایک چشمے کا نام ہے۔ دیکھیے معجم البلدان (۳ - ۱۰۵)

[2] العَرْج (بفتح الاول وسکون الثانی) مکّہ اور مدینہ کے درمیان ایک گھاٹی کا نام ہے۔ ابن الکلبی اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ جب تُبّع اہل مدینہ سے لڑ کر مکّہ جا رہا تھا تو اس نے چوپایوں کو اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا تو اس نے اس جگہ کا نام العرج رکھ دیا۔ (معجم البلدان ۴ - ۹۸)

[3] الأُثَایَة بضم الہمزۃ وکسرہا۔ مدینہ سے مکّہ جاتے ہوئے ایک جگہ کا نام ہے جیسا کہ سیوطی نے شرح نسائی میں تحریر کیا ہے۔

[4] امام ابوحنیفہ اس کے لیے کفارہ کی ادائیگی ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فتح القدیر (۲ - ۲۵۵) میں ہے :۔

"اگر محرم مردار یا شکار میں سے کسی ایک کے کھانے پر مجبور ہو تو امام زفر کے نزدیک شکار کی حرمت کے متعدد الوجوہ ہونے کی وجہ سے مردار قابل ترجیح ہوگا۔ جبکہ امام ابوحنیفہ اور قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ اس صورت میں شکار کھا لے اور کفارہ کے طور پر قیمت ادا کر دے کیونکہ مردار کی حرمت میں زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شکار کی حرمت احرام سے نکلنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے مگر مردار کی حرمت باقی رہتی ہے اور اس لیے کہ شکار کی حرمت محرم کے لیے وقتی اور ہنگامی ہے، لہٰذا محرم وہ چیز استعمال کرے جس کی حرمت خفیف تر ہے نہ کہ شدید تر۔ علاوہ ازیں شکار ممنوع ہے حرام نہیں لیکن عند الضرورت ممانعت اٹھ جاتی ہے۔ پس محرم شکار کو ذبح کر کے کھالے اور اس کا تاوان ادا کر دے۔ (المبسوط للسرخسی)

[5] مشترکہ ہبہ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت وہ ہے جس میں موہوبہ چیز کی تقسیم کا احتمال ہو مثلاً اس کو دو، تین یا چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسی چیز کا مشترکہ ہبہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ہبہ موہوبہ چیز کے تمام اجزا پر یکساں طور پر محیط ہوتا ہے اور اس کے ہر نصف، تہائی اور چوتھائی حصے پر اس کا یکساں طور پر اطلاق ہوتا ہے، البتہ امام ابو یوسف کا موقف اس سلسلے میں یہ ہے کہ موہوبہ چیز کو برابر برابر حصوں میں ہبہ کرنے کا حکم الگ ہے اور کم و بیش حصوں میں ہبہ کرنے کا حکم الگ، وہ مشترکہ ہبہ کے سلسلے میں موہوبہ چیز کو برابر برابر حصوں میں تقسیم کر کے دینے کو تو جائز سمجھتے ہیں لیکن کم و بیش حصوں میں تقسیم کر کے دینے کو ناجائز، مثلاً یہ صورت جائز نہیں ہے کہ موہوبہ چیز کا ایک حصہ ایک شخص کو دیا جائے اور دو دوسرے کو۔

جہاں تک اس سلسلے میں امام محمد کے موقف کا تعلق ہے اس بارے میں علماء کے اقوال میں اختلاف ہے۔ سمرقندی کہتے ہیں کہ اگر ایک آدمی یہ کہے کہ میں یہ گھر تم دو آدمیوں کو ہبہ کرتا ہوں۔ ایک تہائی اس کو، اور دو تہائی اس دوسرے کو، تو یہ بات امام محمد کے نزدیک تو جائز ہے لیکن امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ناجائز ہے۔ شمس الائمہ سرخسی المبسوط میں لکھتے ہیں: امام محمد کے نزدیک قابل تقسیم چیزوں کا مشترکہ وقف جائز نہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک کسی چیز کے وقف کی تکمیل کے لیے اس پر اس شخص کا قبضہ ضروری ہے جس کو وہ وقف کی گئی ہو، لیکن کسی قابل تقسیم چیز کے، ایک سے زیادہ افراد کے

علاوہ ازیں اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر موجود شخص کا مال حرام ہے، نیز یہ کہ تقسیم کے لیے دوسرے شخص کو نمائندہ بنایا جا سکتا ہے۔

یہ حدیث اس امر کی بھی دلیل ہے کہ مسلمانوں کا امام اور امیر کسی دوسرے شخص کا ہدیہ قبول کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

لیے تنف کی صورت میں ان افراد کو اپنے اپنے حصے کا پورا قبضہ اس لیے نہیں مل سکتا کہ ان کے حصے اس پوری چیز میں پھیلے ہوتے ہیں، اور ان کا تعین کر کے ان کو الگ الگ مجتمع کرنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن العنایہ (شرح الہدایہ) کے مصنف کا قول اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ تنف کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ شروع ہی سے ہر حصے دار کے حصے کا الگ الگ ذکر کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ پہلے اجمالی طور پر ہبہ کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد ہر حصہ دار کا حصہ الگ الگ ذکر کر دیا جائے۔ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے وہ کسی لحاظ سے بھی جائز نہیں ہے۔ چاہے اس کی کیفیت یہ ہو کہ تنف کردہ حصوں میں کمی بیشی ہو، مثلاً ہبہ کرنے والا ایک شخص سے یہ کہے کہ میں تمھیں اس چیز کا دو تہائی ہبہ کرتا ہوں اور دوسرے سے یہ کہے کہ میں تمھیں اس کا ایک تہائی ہبہ کرتا ہوں، اور چاہے اس کی کیفیت یہ ہو کہ ہبہ کردہ چیز میں تمام حصہ داروں کے حصے باہم برابر ہوں۔ مثلاً ہبہ کرنے والا ایک شخص سے یہ کہے کہ میں تمھیں اس چیز کا نصف حصہ ہبہ کرتا ہوں۔ اور دوسرے سے یہ کہے کہ اس کا باقی نصف حصہ میں تمھیں ہبہ کر رہا ہوں۔ اس صورتِ حال کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں ہدایہ میں کچھ بھی نہیں کہا گیا ہے، اور اگر صورت یہ ہو کہ ہبہ کرنے والا موہوبہ چیز کو پہلے مختلف افراد کو اجمالی طور پر ہبہ کر دے اور پھر ان کے الگ الگ حصوں کا ذکر کرے تو یہ صورتِ حال امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے، چاہے ان افراد کے حصے جنھیں وہ چیز ہبہ کی گئی ہے کم و بیش رکھے گئے ہوں، یا برابر برابر، چنانچہ اس سلسلے میں ان کے اصولی موقف کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اور امام محمدؒ اس کو مطلقاً جائز سمجھتے ہیں، اس سلسلے میں ان کے اصولی موقف کا ذکر بھی اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ جہاں تک امام ابو یوسفؒ کا تعلق ہے، ان کے نزدیک اس صورت میں برابر حصوں کا حکم الگ ہوگا، اور کم و بیش حصوں کا الگ: یہاں صاحب العنایہ کی بات ختم ہو جاتی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ حنفی علماء اس تعارض کو کیسے دور کرتے ہیں؟

ہبہ کردہ چیز کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو قابلِ تقسیم نہیں ہوتی۔ جیسے کوئی شخص ایک غلام دو آدمیوں کو ہبہ کر دے۔ یا کوئی ایسی چیز جسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا تو یہ ہبہ اجماعاً جائز ہے۔ اس لیے کہ جو چیز سرے سے قابلِ تقسیم ہی نہیں اس کے مشترکہ ہبہ کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

(تحفة الفقهاء باب الهبة (۳۰۹/۲۵) المبسوط (۳۱/۷۲) العناية مع شرح فتح القدير (۱۲۸/۷)

جمہور اہلِ علم کا موقف یہ ہے کہ غیر منقسم چیز کا ہبہ مطلقاً جائز ہے۔ امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ابو ثور، ابراہیم نخعی، اور ان کے تمام اصحاب کا مسلک یہی ہے۔

یہ حضرات ابو طلحہؓ اور جابر بن عبداللہؓ کی روایت کردہ حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قریشِ مکہ کے تجارتی قافلہ پر نظر رکھنے کے لیے مامور فرمایا اور ابو عبیدہؓ کو ہمارا امیر مقرر کیا۔ علاوہ ازیں حضورؐ نے کھجوروں کا ایک تھیلا ہمیں زادِ راہ کے طور پر دیا۔ اس کے سوا ہمارے پاس کھانے کے لیے اور کچھ نہ تھا۔ ابو عبیدہؓ اس میں سے ہمیں ایک ایک کھجور دیا کرتے تھے۔ ابن حزم کہتے ہیں پھل کا یہ عطیہ سب کے لیے مشترکہ تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے کچھ اور اقوال و آثار بھی ذکر کیے ہیں۔ (محلی ابن حزم ۱۰/۱۳۰)

امانتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

احکام ابن زیاد[1] میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَيْسَ عَلَى أَمِينٍ غُرْمٌ" امین پر تاوان نہیں ہے"۔ اہل علم کہتے ہیں کہ بجز اس صورت کے کہ وہ امانت میں بے جا تصرف کرے۔ دوسری کتابوں میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عَلَى كُلِّ يَدٍ رَدُّ مَا قَبَضَتْ" "ہر ہاتھ کے ذمہ اس چیز کو واپس کرنا واجب ہے جو اس نے لے لی ہو[2]"

---

[1] عربی متن میں الودائع والامانات کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

ہر الودائع: کا واحد "ودیعة" اور امانات کا واحد "امانة" ہے۔ جمہور اہل علم کے نزدیک ودیعت اور امانت ایک ہی چیز ہے، مگر بعض اہل علم نے ان میں فرق کیا ہے۔ ان کے نزدیک ودیعت وہ چیز ہے جو قصداً کسی کو دی جائے۔ اور امانت وہ ہے جو غیر ارادی طور پر کسی کے ہاتھ لگ جائے۔ مثلاً ہوا چلنے سے کوئی کپڑا اڑ کر کسی کی گود میں جا گرے۔

صاحب العنایة کہتے ہیں:۔

"ودیعت کے معنی ہیں کسی شخص کو کسی چیز کی حفاظت تفویض کرنا۔ یہ معاملہ باقاعدہ طے کرنے سے ہوتا ہے۔ جبکہ امانت میں اس سے زیادہ عموم پایا جاتا ہے۔ امانت میں باقاعدہ معاہدہ طے کرنا ضروری نہیں ہے۔ (شرح فتح القدیر، ۸۹)

[2] سنن دارقطنی (۳ - ۴۱) میں ہے:۔

"کسی چیز کو عاریۃً لینے والے پر ضمان نہیں۔ بشرطیکہ وہ اس میں خیانت نہ کرے۔ اسی طرح امین پر بھی ضمان نہیں۔ جب کہ وہ اس میں کسی قسم کی خیانت نہ کرے" یہ حدیث بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا سے بیان کی گئی ہے۔

دارقطنی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں عمرو اور عُبَیدہ دو راوی ضعیف ہیں، نیز یہ حدیث شریح قاضی سے بھی موقوفاً روایت کی گئی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ "امین پر کوئی ضمان نہیں ہے" حافظ ابن حجر کہتے ہیں اس کی سند ضعیف ہے۔ دیکھیے التلخیص الحبیر (۳-۹۷)

ابن ماجہ (۲ - ۸۰۲) کتاب "الصدقات" باب "الودیعة" میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

"جس کے پاس کوئی امانت رکھی گئی اس پر ضمان نہیں ہے"

البوصیری کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ المثنّٰی بن الصباح اور اس سے روایت کرنے والا دونوں ضعیف راوی ہیں۔

[3] ابوداؤد (۳-۲۹۶) کتاب "البیوع" باب "فی تضمین العاریة" میں بروایت حسن عن سمرہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاتھ جس چیز کو پکڑ لیتا ہے اسے واپس کرنا اس پر لازم ہے"

پھر حسن بھول کر یوں کہا کرتے تھے کہ وہ شخص جس کے پاس تم امانت رکھتے ہو تمہارا امین ہے لہذا اس پر ضمان نہیں ہے۔

ترمذی (۳ - ۵۶۶) کتاب "البیوع" باب "ماجاء ان العاریة مؤداة" ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اہل علم صحابہ وغیرہ

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ ادائیں ضمان واجب الاداء ہوتا ہے اس لیے کہ حضور نے فرمایا ہر ہاتھ پر ہر اس چیز کی واپسی لازم ہے جو اس نے پکڑی ہو۔ حضور کے اس ارشاد میں عموم پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (النساء - ۵۸) — اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کو امانت ادا کر دو۔

ابن سلام وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب حضرت عباسؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کعبہ کی چابی انھیں دینے کی درخواست کی تھی۔ لہٰذا حضور نے اس آیہ کریمہ کے مطابق یہ چابی اس کے اصل مالک عثمان بن ابی طلحہ کو واپس کر دی۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ حضور نے چابی شیبہ بن عثمان کو دی۔

پہلا قول امام مالک کا ہے اور یہی مشہور تر ہے[۱]۔

فقہاء میں سے بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ متعار لینے والے پر مستعار لی ہوئی چیز کا ضمان ہوگا۔ امام شافعی اور احمد کا یہی مسلک ہے۔ بخلاف ازیں صحابہ اور دیگر اہل علم میں سے بعض نے یہ پہلا اختیار کیا ہے کہ مستعار لینے والے پر ضمان نہیں ہے۔ الا یہ کہ وہ مستعار لی ہوئی چیز میں بے جا تصرف کرے۔ ثوری، اسحاق اور اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ابن ماجہ (۲ - ۸۰۲) دارقطنی (۲ - ۲۶۴) حاکم، احمد اور طبرانی نے اس کو بروایت حسن عن سمرہ روایت کیا ہے۔ المنصب الرایۃ (۲ - ۲۰۰)

میں کہتا ہوں حسن کے سمرہ سے سماع کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تین اقوال نقل کیے ہیں:

۱۔ حسن بصری کا سماع سمرہ سے مطلقاً ثابت ہے۔ یہ علی بن المدینی، بخاری اور ترمذی کی رائے ہے۔

۲۔ حسن کا سماع سمرہ سے مطلقاً ثابت نہیں۔ یہ یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن معین اور ابن حبان کا قول ہے۔

۳۔ حسن کا سمرہ سے صرف عقیقہ کے ذکر پر مشتمل حدیث کا سماع ثابت ہے، نہیں۔ یہ نسائی اور ابن عساکر کا زاویہ نگاہ ہے۔

عقیقہ سے متعلق حدیث بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔ حبیب بن سعید نے حسن بصری سے دریافت کیا کہ آپ نے عقیقہ سے متعلق حدیث کس سے سنی تھی؟ انھوں نے کہا: سمرہ بن الجندب سے۔"

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حسن بصری نے سمرہ سے یہ حدیث خود نہیں سنی بلکہ وہ اسے سمرہ کی کتاب سے روایت کرتے ہیں۔ یہ چوتھا قول ہے جو محدثین کے اقوال کا خلاصہ حسن بصری کے سمرہ سے سماع کے بارے میں!

[۱] یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر (۱ - ۵۱۴) میں فرماتے ہیں:۔

" اکثر مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ کے بارے میں اتری ہے۔ عثمان کے دادا ابو طلحہ کا نام عبداللہ بن عبدالعزیٰ بن عثمان بن عبدالدار بن قصی بن کلاب بن قرشی صاحب الکعبہ تھا۔ عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ جس کی نسل میں حجابت کا منصب آج تک چلا آتا ہے۔ عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصہ میں مشرف باسلام ہوا تھا۔ خالد بن ولید اور عمرو بن العاصؓ بھی اسی زمانہ میں اسلام لائے۔ عثمانؓ بن طلحہ بن ابی طلحہ کا چچا عثمان بن ابی طلحہ وہی شخص ہے جو غزوہ احد میں مشرکین مکہ کا علمبردار تھا۔ وہ غزوہ احد میں کفر کی حالت میں مارا گیا تھا۔"

ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عثمان کہاں ہے؟ حضرت عثمانؓ بن عفان (خلیفہ ثالث) نے ہاتھ بڑھایا۔ عثمانؓ بن طلحہ پست قامت تھے۔ قبیلہ بنی حضرمی کے ایک شخص نے عثمان بن طلحہ کو اٹھایا۔ اس نے حضورؐ کو چابی دے دی۔ کنجی پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ آپؐ نے بھی اس پر غلاف چڑھا دیا۔ پھر فرمایا:

اس آیت کی شانِ نزول فتح مکہ کا یہ واقعہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمانؓ بن طلحہ سے کعبہ کی چابی لی اور پھر اسے واپس دے دی۔ محمد بن اسحاق فتح مکہ کے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد بن جعفر بن زبیر عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن ابی ثور عن صفیہ بنت شیبہ کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ فتح ہونے کے بعد وہاں کچھ دنوں کے لیے قیام پذیر ہوگئے اور لوگ مطمئن ہوگئے تو آپ خانۂ کعبہ کی طرف تشریف لائے۔ اپنی ناقہ پر سوار ہو کر کعبہ کے گرد آپ نے سات چکر لگائے۔ آپؐ کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس کے ساتھ آپ حجرِ اسود کا استلام فرما رہے تھے۔ جب طواف سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا۔ اس سے کنجی لے کر کعبہ کا دروازہ کھولا، کعبہ میں داخل ہوئے تو اس میں لکڑی کی بنی ہوئی ایک کبوتری دیکھی۔ آپ نے اسے اپنے ہاتھ سے توڑ کر پھینک دیا اور کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ لوگ مسجد میں امن و اطمینان سے بیٹھے تھے۔ راوی نے اس کے بعد حضورؐ کے خطبہ کا ذکر کیا جو فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے دیا تھا۔ اسی اثنا میں حضرت علیؓ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں کعبہ کی کنجی تھی۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! "سقایۃ" کے ساتھ ساتھ ہمیں "حجابۃ" کا منصب بھی عطا فرمائیے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا۔ عثمانؓ بن طلحہ کہاں ہے؟ آپؐ نے بلا کر اسے کہا "عثمان! یہ کنجی لے لو۔ آج کا دن ایفائے عہد اور نیکی اور احسان کا دن ہے۔"

ابن کثیر کہتے ہیں کہ ابن مردویہ نے کلبی عن ابو صالح کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ وہ ابن عباسؓ سے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں روایت کرتے ہیں کہ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کو بلایا۔ جب عثمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا: "مجھے کعبہ کی کنجی دکھاؤ۔" وہ کنجی لے آیا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو حضرت عباسؓ نے کھڑے ہو کر کہا: "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، حاجیوں کو پانی پلانے کے ساتھ ساتھ کنجی برداری کا منصب بھی مجھے عطا فرمائیے۔" اس پر عثمان نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا "عثمانؓ مجھے کنجی دکھاؤ۔" اس نے کنجی دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت عباسؓ نے پہلے الفاظ پھر دہرائے۔ عثمان نے پھر ہاتھ سمیٹ لیا۔

یہ دیکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے عثمان! اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو کنجی مجھے دے دو۔" اس نے کہا۔ "یہ لیجیے یہ اللہ کی امانت ہے۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور آپؐ نے کعبہ کا دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ان کے ہاتھ میں تیر ہیں جن سے وہ فال نکال رہے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مشرکین کو خدا غارت کرے۔ ابراہیمؑ کو فال کے تیروں سے کیا تعلق؟" پھر آپؐ نے ایک ٹب منگوایا جس میں پانی تھا اور ان تصویروں کو پانی سے دھو ڈالا۔ مقامِ ابراہیم کعبہ کے اندر تھا اس کو باہر نکالا اور کعبہ کی دیوار کے ساتھ چسپاں کر دیا۔ پھر فرمایا "لوگو! قبلہ یہ ہے۔"

پھر آپؐ نے کعبہ کے باہر آ کر کعبہ کے گرد ایک یا دو چکر لگائے۔ اسی دوران میں جبریلؑ چابی واپس کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر نازل ہوئے۔ پھر آپؐ نے آیت کریمہ "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا" تلاوت فرمائی۔ ابن کثیر کہتے ہیں یہی وہ مشہور واقعہ ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

"اے بنی طلحہ! اب یہ چابی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس رہے گی۔ تم کو کوئی ظالم ہی اس (منصب) سے محروم کرے گا۔"[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ کوئی کافر ہی تمہیں اس سے محروم کرے گا۔"

یہ حجۃ الوداع کے سال کا واقعہ ہے۔ عثمانؓ کے والد طلحہ کو حضرت علیؓ نے غزوہ احد کے موقع پر چیلنج کے طور پر ہونے والے انفرادی مقابلہ میں تہ تیغ کیا تھا۔ اس کے بعد کعبہ کی کنجی ان کی لونڈی سلافہ کے پاس رہی۔ سلافہؓ[2] عثمان بن طلحہ کی والدہ تھی۔

اس ضمن میں امام مالک، شافعی اور ابو حنیفہ کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ جب امین امانت کے تلف ہو جانے کا دعویٰ کرے تو اس سے حلف لیا جائے یا نہیں؟ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ امین سے حلف صرف اس صورت میں لیا جائے جب اس کی امانت و دیانت مشکوک ہو۔[3]

جبکہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ چاہے وہ امانت دار ہو تب بھی اس سے حلف لیا جائے۔[4]

---

[1] الازرقی نے اخبار مکۃ (۲ - ۲۶۵) میں بروایت زُہری و واقدی یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ واقدی اپنے اساتذہ سے روایت کرتا ہے۔ مجھے اس کی پوری سند کا پتہ نہیں چل سکا کہ اس کی تحقیق کی جاتی۔

[2] سلافہ بنت سعد بن شہید نے غزوۂ احد میں کفار مکہ سے مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ فتح مکہ کے روز حلقہ بگوش اسلام ہوگئیں۔ دیکھیے الطبری (۳ - ۱۳۸۶) اور الاصابۃ (۴ - ۳۲۳)

[3] مختصر خلیل کے حاشیہ الخرشی (۶ - ۱۱۷) میں ہے کہ امین اگر متہم نہ ہو تو تلف کے دعویٰ کی صورت میں اس سے حلف نہ لیا جائے۔ البتہ اگر اس کا دعویٰ یہ ہو کہ اس نے امانت واپس کر دی ہے تو اس صورت میں اس سے بہر حال حلف لیا جائے چاہے اس کی دیانت پر شبہ ہو یا نہ ہو۔

[4] امام شافعی کے مسلک کے سلسلے میں پوری تفصیلات قابل ذکر ہیں۔ امام نووی المنھاج (۳ - ۹۱) میں لکھتے ہیں:۔

"جس کے پاس امانت ہے اگر وہ اس کے تلف ہو جانے کا دعویٰ کرے اور اس کا سبب یا تو بیان ہی نہ کرے، اور یا کوئی سبب بتائے مثلاً چوری کا دعویٰ کرے تو حلف اٹھانے کی صورت میں اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اور اگر وہ کوئی ظاہری سبب بیان کرے۔ مثلاً یوں کہے کہ امانت جل کر ضائع ہو گئی تو اس صورت میں اگر آگ لگنے کے واقعہ سے عام لوگ آگاہ ہوں تو بلا قسم اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اور اگر عام لوگ آگاہ نہ ہوں تو حلف اٹھانے کی صورت میں اسے درست تسلیم کیا جائے گا۔ اور اگر سبب معلوم نہ ہو تو ثبوت کا مطالبہ کیا جائے گا اور امانت کے تلف ہو جانے پر اس سے قسم لی جائے گی۔

[5] فقیہ سمرقندیؒ تحفۃ الفقہاء (۳ - ۲۷۹) میں لکھتے ہیں:۔

"جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اگر وہ یوں کہے کہ امانت مجھ سے ضائع ہو گئی، یا میں نے تجھے واپس کر دی ہے لیکن امانت رکھنے والا اس سے انکار کرے اور کہے کہ تو نے ضائع کر دی ہے۔ اس صورت میں جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اس کا قول معتبر ہوگا۔ اس لیے کہ وہ امین ہے۔ مگر اس سے حلف لیا جائے گا۔ کیونکہ اگر وہ اس کا اقرار کرے تو اسے وہ چیز ادا کرنی پڑے گی۔

[6] حسب عادت مصنف نے امام احمد بن حنبل کا مسلک بیان نہیں کیا۔ ان کا مشہور قول یہ ہے کہ امین (جس کے پاس امانت رکھی گئی) یہاں اگر حلف اٹھائے تو اس کے قول کو معتبر تصور کیا جائے۔ امام شافعی اور ابو حنیفہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام احمد کے سب سابقین

ابن المنذر الاشراف میں لکھتے ہیں کہ حلف لینا ہی زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔

المبسوط[1] میں ابن نافع کے حوالے سے امام مالکؒ کی یہ رائے نقل کی گئی ہے کہ جب قرض دار دعویٰ کرے کہ سارا مال یا اس کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا ہے تو اس سے ہر حال میں حلف لیا جائے۔ وہ متہم ہو یا غیر متہم۔ ابن المواز کی رائے بھی یہی ہے۔

الواضحہ میں ہے کہ اس سے حلف صرف اس صورت میں لیا جائے جب کہ اس کی امانت و دیانت مشکوک ہو۔

المبسوط میں ہے کہ امانت کے تلف ہو جانے کی صورت میں بہرحال حلف لیا جائے گا۔

ابن القاسم "المدونہ" میں امام مالک سے نقل کرتے ہیں کہ ہر حال میں حلف لیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی امانت میں شک ہو یا نہ ہو۔

کا یہی موقف ہے۔ "الوجیز" اور دوسری کتابوں میں بھی اسی طرح ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اگر اس کی دیانت پر شبہ نہ ہو اور وہ امانت کے واپس کرنے یا اس کے تلف ہو جانے کا دعویٰ کرے تو اس سے حلف نہ لیا جائے۔ "الخرقی" اور ابن ابی موسیٰ نے "الوکیل" میں اسی طرح کہا ہے۔ دیکھیے الانصاف (۶- ۳۳۹، ۳۴۰)

[1] یہ بات معلوم نہیں ہو سکی ہے کہ المبسوط سے یہاں اسماعیل بن اسحاق کی المبسوط مراد ہے یا ابن المنذر کی۔ اس لیے کہ دونوں حضرات نے المبسوط کے نام سے کتابیں تحریر کی ہیں۔ مگر میرے نزدیک اقرب الی القیاس یہ ہے کہ اس سے مشہور مالکی فقیہ اسماعیل بن اسحاق کی المبسوط ہی مراد ہے۔ حافظ ابن عبدالبر اور دیگر اہل علم نے اپنی تصنیفات میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔

مستعار لی ہوئی چیز کی ضمان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

موطا امام مالک[2] میں ابن شہاب زہری سے مروی ہے کہ عہد رسالت میں بعض خواتین اپنے علاقے میں اسلام لائیں مگر

---

[1] العاریة: بتشدید الیاء۔ عربی محاورہ میں بولتے ہیں۔ تعاوروا الشئی واعتوروہ۔ تداولوہ (یعنی کسی چیز کو ایک دوسرے کے درمیان اس طریقے سے لیا دیا گیا ہو۔ کہ کبھی وہ ایک کے پاس ہو اور کبھی دوسرے کے پاس۔ العاریۃ اسی سے مشتق ہے۔

عاریۃ کا لغوی مفہوم: الازہری "تھذیب اللغۃ" میں کہتے ہیں کہ یہ "العارۃ" سے ماخوذ ہے جو کہ الاعارۃ سے اسم ہے۔ عربی میں کہتے ہیں "اعرتہ الشئ اعارۃ وعارۃ" جیسے "اطعتہ اطاعۃ وطاعۃ"۔

لیث کہتے ہیں اس کو "عاریۃ" اس لیے کہتے ہیں کہ یہ طلب کرنے والے کے لیے عار کا موجب ہے۔ جوہری نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

عاریۃ کا اصلاحی مفہوم: فقہاء کی اصطلاح میں "العاریۃ" کے معنی ہیں کسی چیز سے استفادہ کو کسی کے لیے مباح ٹھہرانا۔

الجرجانی "العاریۃ" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

کسی چیز سے بلا معاوضہ فائدہ اٹھانے کا حق دینے کو "العاریۃ" کہتے ہیں۔ تملیک کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ اگر کسی شخص سے معاوضہ لے کر اس کو کسی چیز کا مالک بنایا جائے تو اسے بیع کہتے ہیں۔

۲۔ اگر کسی کو بلا معاوضہ مالک بنایا جائے تو اس کا نام ہبہ ہے۔

۳۔ معاوضہ لے کر کسی کو انتفاع کا حق دینے کو اجارہ کہتے ہیں۔

۴۔ اگر بلا معاوضہ کسی کو انتفاع کی اجازت دی جائے تو اس کا نام "عاریۃ" ہے۔ (التعریفات للجرجانی ص ۱۵۰)

کسی کو کوئی چیز عاریۃً دینا موجب اجر و ثواب ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدۃ-۲) نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو دوسروں کو روزمرہ زندگی میں استعمال کی اشیاء نہیں دیتے۔ (ویمنعون الماعون-۷) یہاں "ماعون" سے مستعار اشیاء مراد ہیں۔ جیسا کہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے۔

اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی کو عاریۃً کوئی چیز دینا مستحب اور موجب اجر و ثواب ہے۔

[2] موطا امام مالک (۲-۱۳) کتاب النکاح "باب نکاح المشرک اذا اسلمت زوجتہ قبلہ"

زرقانی شرح موطا (۴-۵۱) میں ابن عبدالبرؒ سے نقل کرتے ہیں کہ:

"میرے علم کی حد تک یہ حدیث کسی صحیح سند کے ساتھ منقول نہیں۔ البتہ اہل سیرت کے نزدیک یہ حدیث عام طور سے معروف ہے۔

ہجرت نہ کرتی تھیں۔ان کے مشرف باسلام ہونے کے باوجود ان کے شوہر کافر ہوا کرتے تھے۔ان خواتین میں سے ایک ولید بن مغیرہ کی بیٹی تھیں۔ وہ صفوان بن اُمیّہ کی بیوی تھیں۔ فتح مکّہ کے روز وہ مشرف باسلام ہوئیں۔ ان کا خاوند اسلام لانے کے ڈر سے کہیں بھاگ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان کے چچا زاد بھائی وہب بن عمیر کو امان کی علامت کے طور پر اپنی چادر دے کر اس کے پاس بھیجا۔ آپؐ نے صفوان کو اسلام کی دعوت دی اور اپنے پاس آنے کے لیے پیغام بھیجا اور فرمایا، اگر صفوان کو یہ بات پسند ہو تو اسے قبول کرے۔ ورنہ اسے دو ماہ تک چلنے پھرنے کی مہلت دی جائے گی۔ جب صفوان حضورؐ کی چادر لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں کے سامنے اس نے پکار کر کہا: "محمدؐ! یہ وہب بن عمیر ہے جو میرے پاس آپ کی چادر لے گیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آپؐ نے مجھے بلایا ہے۔ اگر میں چاہوں تو اسلام قبول کر لوں ورنہ آپؐ مجھے صرف دو ماہ تک دنیا میں چلنے پھرنے کی اجازت دیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابو وہب! اتر آؤ۔" اس نے کہا: بخدا ہرگز نہیں۔ جب تک آپ میرے بارے میں وضاحت نہیں کریں گے میں نہیں اتروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں چار ماہ تک چلنے پھرنے کی اجازت ہے۔" پھر آپ غزوۂ حنین کے لیے قبیلہ ہوازن کی جانب روانہ ہوئے۔ آپؐ نے صفوان کو پیغام بھیجا اور اس سے اسلحۂ جنگ عاریۃً طلب فرمایا۔ صفوان نے کہا: "کیا آپ خوشی سے طلب کرتے ہیں یا جبرًا؟" آپؐ نے فرمایا: "برضا و رغبت" صفوان کے پاس جو آلات تھے اس نے وہ عاریۃً دے دیئے۔ اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

یحییٰ کی روایت میں ہے کہ "صفوان پھر لوٹ آیا"۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ صحیح یہی ہے کہ "صفوان پھر چلا گیا۔" دیگر تمام راویوں نے اسی طرح روایت کی ہے۔ پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ حنین کی طرف چلا گیا۔ اس طرح صفوان نے حالتِ کفر میں غزوۂ حنین و طائف میں شرکت کی۔ صفوان کافر تھا مگر اس کی بیوی مسلمان ہو چکی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاوند بیوی کے درمیان تفریق نہیں کروائی تھی[1] بعد ازاں صفوان مشرف باسلام ہوا اور اس کی بیوی بدستور اس کے نکاح میں رہی۔ دونوں کے اسلام لانے میں تقریبًا ایک ماہ کی مدت کا فرق تھا۔

مصنف عبد الرزاق میں صفوان بن اُمیّہ کے بعض بیٹیوں سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان سے دو قسم کی چیزیں مستعار لی تھیں۔ ایک قسم ضمان والی چیزوں کی اور دوسری قسم بغیر ضمان کے چیزوں کی۔[2]

کتب سیرت میں ہے اور ابن شعبان نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے صفوان سے ایک سو زرہ متعلقہ سامان سمیت مستعار لی تھیں۔ اہلِ سیرت لکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے صفوان سے کہا تھا کہ یہ اسلحہ ہمارے یہاں پہنچا دیں۔ اس نے اس کی تعمیل کر دی تھی۔[3]

ابن شہاب زہری اور شعبی اہل السیر کے امام ہیں۔ اس حدیث کی شہرت اس کی سند کی نسبت قوی تر ہے۔

[1] قبل ازیں یہ بحث گزر چکی ہے کہ خاوند اگر بیوی کے بعد اسلام لائے تو بیوی کے ساتھ اس کا نکاح قائم رہتا ہے یا نہیں۔

[2] مصنف عبد الرزاق (۸-۱۸۰) بروایت معمر از بعض بنی صفوان۔

[3] سیرت ابن ہشام (۲-۴۴۰) المستدرک للحاکم (۳-۴۹)

نسائی[1] میں ہے کہ صفوان نے یہ اسلحہ تیس[30] اونٹوں پر لاد کر بھیجا تھا۔

موطا کے ۔۔۔ اور دوسری کتب حدیث میں ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان سے اسلحہ طلب فرمائے تو اس نے دریافت کیا کہ کیا آپ یہ اسلحہ مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں؟ فرمایا "نہیں۔ ہم عاریۃً لینا چاہتے ہیں اور واپس کر دیں گے"۔[2]

متکلمین کے نزدیک عاریۃً لینے والا ضامن ہے۔ اس چیز کی واپسی اس کے لیے ضروری ہے اور اگر وہ چیز تلف ہو جائے اور اسے اس کے تلف ہو جانے کا علم بھی ہو تو بھی اس کی ضمان اس سے ساقط نہ ہوگی۔ اس لیے کہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہی ہے۔[3]

امام مالک[4] اور دیگر اہل علم یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شاہد مستعار چیز کے تلف ہو جانے کی شہادت دے تو ضمان ساقط ہو جاتی ہے۔ اور اگر مستعار چیز ایسی ہو جس کو غائب نہ کیا جا سکتا ہو تو اس کے ضائع ہونے کی صورت میں مستعار لینے والے پر ضمانت نہیں ہے۔ اور تلف کا دعویٰ کرنے کی صورت میں اگر وہ حلف اٹھا لے تو اس کی تصدیق کی جائے گی بشرطیکہ اس کا جھوٹ واضح نہ ہو۔

---

[1] یہ روایت مجھے سنن صغریٰ میں نہیں ملی ممکن ہے سنن کبریٰ میں ہو۔ یہ اضافہ صرف ایک نسخہ میں ہے۔

[2] ملاحظہ ہو ابوداؤد اور دوسری کتب حدیث۔

[3] امام شافعی اور احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ کسی چیز کو عاریۃً لینے والا ضامن ہے۔ اگر اس کے پاس وہ چیز ضائع ہو جائے تو اسے اس کی ضمان ادا کرنا ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ اور عطا کا مسلک کا بھی یہی ہے۔ دیکھیے المرقات (۲-۱۲۲) اور مصنف عبدالرزاق (۸-۱۸۰)

صنعانی کے نزدیک حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ عاریۃً لینے والے پر ضمان اس وقت لازم ہوگی جب اسے ضامن ٹھہرایا گیا ہو۔ وہ کہتے ہیں عاریت کی دو قسمیں ہیں (۱) عاریت مضمونہ (۲) عاریت مؤداۃ۔

۱۔ "عاریۃ مضمونہ" وہ ہے جس کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنی پڑے۔

۲۔ "عاریۃ مؤداۃ" یہ ہے کہ اگر اصل چیز ادھار لینے والے کے پاس موجود رہے تو وہ اسے واپس کرے گا۔ اور اگر وہ ضائع ہو جائے تو اس کی قیمت واجب الادا نہیں ہوگی۔ (سبل السلام ۳-۹۶)

[4] المدونہ (۴-۱۶۳) میں ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں: "جس نے کسی سے سامان مستعار لیا اور اسے توڑ ڈالا، یا پھاڑ دیا، یا اس کے چوری ہو جانے یا جل جانے کا دعویٰ کیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا۔ اور اگر کسی قدرتی آفت کی وجہ سے اسے نقصان پہنچا۔ اور اس کے پاس اس کا شاہد بھی موجود ہو تو اس پر کوئی ضمان نہیں۔ اور اگر بے جا تصرف کے سبب یا اس کی غلطی کی وجہ سے وہ چیز تلف ہوئی تو اسے ضمان ادا کرنا پڑے گی۔"

امام ابن حزم فرماتے ہیں:۔

"امام مالکؒ نے ثقہ اور غیر ثقہ کے مابین فرق و امتیاز قائم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عاریۃً لینے والا اگر ثقہ آدمی ہے تو اس سے حلف نہیں لیا جائے گا۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعیٰ علیہ پر حلف کو واجب قرار دیا ہے۔ اور ثقہ و غیر ثقہ کی تفریق نہیں کی۔ حضورؐ نے فرمایا ہے: مدعیٰ علیہ کے ذمہ حلف اٹھانا ہے۔" (المحلّیٰ ۹-۱۶۸)

ابوداؤد میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
"صفوان! کیا تمھارے پاس اسلحہ موجود ہیں؟ اس نے عرض کی کیا آپ مستعار لینا چاہتے ہیں یا غصب کرنے کا ارادہ ہے؟ آپ نے فرمایا" میں مستعار لینا چاہتا ہوں" چنانچہ صفوان نے تیس چالیس کے لگ بھگ زرہیں دے دیں۔ غزوہ حنین بپا ہوا۔ اور کفار نے شکست کھائی پھر جب صفوان کی زرہیں اکٹھی کی گئیں تو ان میں سے چند ایک گم تھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان سے کہا" تمھاری چند زرہیں گم ہوگئی ہیں کیا ہم ان کا تاوان ادا کریں؟ صفوان نے کہا: "نہیں یا رسول اللہ! اس لیے کہ میرا دل آج دولتِ ایمان سے مالا مال ہے جب کہ اس روز یہ کیفیت نہیں تھی۔
ابوداؤد کہتے ہیں:" صفوان نے یہ اسلحہ اسلام لانے سے قبل مستعار دیے تھے"۔
العیلی کی" الدلائل" میں ہے کہ امام مالک نے فرمایا کہ مستعار چیز کی ضمان نہیں بجز اس چیز کے جو ضائع یا غائب کی جاسکتی ہو اگر اس کے ضائع ہونے میں ادھار لینے والے کا کچھ دخل نہ ہو تو اس پر ضمان نہیں ہے۔

لہ دیکھیے ابوداؤد (۳-۲۹۶) کتاب" البیوع" باب" تضمین العاریۃ" یہ حدیث آل عبداللہ بن صفوان کے چند لوگوں سے منقول ہے۔ المنذری مختصر ابی داؤد (۵-۱۹۹) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے اور اس میں متعدد مجہول راوی ہیں۔ البیہقی نے سنن (۶-۸۹) میں یہ حدیث متعدد طرق سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں سے بعض روایات اگرچہ مرسل ہیں لیکن کثرتِ شواہد کی وجہ سے ان میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ وہ متصل کے ہم پلہ ہوجاتی ہیں۔ واللہ اعلم۔
المنذری کی اس سے مراد حضرت جابرؓ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ جو حاکم نے المستدرک (۳-۴۸، ۴۹) میں روایت کی ہے۔ بیہقی (۶-۸۹) یہ حدیث ابن اسحاق عن عاصم بن عمر بن قتادہ عن عبدالرحمن بن جابر عن جابر کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عازمِ حنین ہوئے تو آپ نے صفوان کو بلا کر اس سے چند زرہیں طلب کیں۔ اس کے پاس ایک سو زرہیں متعلقہ سامان سمیت موجود تھیں۔ صفوان نے کہا" اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ غصب کرنا چاہتے ہیں؟" حضورؐ نے فرمایا "نہیں بلکہ مستعار لینا چاہتا ہوں اور تمھیں واپس کردوں گا اور اگر ضائع ہوگئیں تو تاوان ادا کردوں گا"۔
حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ذہبی نے بھی ان سے اتفاق کیا ہے۔ اس کی سند میں ابن اسحاق کا مدلس ہونا اس لیے قابلِ اعتراض نہیں کہ اس نے "حدثنا" کی صراحت کی ہے۔
حضرت ابن عباس کی روایت کردہ حدیث حاکم نے بھی نقل کی ہے۔ بیہقی نے یہ حدیث اسحاق بن عبدالواحد القرشی عن خالد بن عبداللہ عن خالد الحذاء عن ابن عباس کی سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ غزوہ حنین میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان سے زرہیں اور کچھ اسلحہ جنگ مستعار لیے تھے۔ اس نے پوچھا کیا یہ مستعار ہے اور واپس کردیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں"۔
مگر اس کی سند میں اسحاق بن عبدالواحد متروک الحدیث ہے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ وہ بہت ضعیف راوی ہے۔ حافظ ابن حجر "بلوغ المرام" (ص ۱۶۵) میں لکھتے ہیں کہ جابرؓ کی روایت کردہ حدیث کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ حاکم نے بروایت ابن عباس اس کی ایک مؤید حدیث بھی روایت کی ہے۔ مگر وہ ضعیف ہے۔

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ مستعار چیز میں ضمان نہیں قطع نظر اس سے کہ اس کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو یا نہ ہو۔[1] امام شافعی فرماتے ہیں کہ مستعار چیز کی ہر حال میں ضمانت ادا کی جائے گی۔[2]

---

[1] اس لیے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قرض امانت کی طرح ہے۔ اگر اس کے تلف ہونے میں مستعار لینے والے کا کوئی دخل نہ ہو تو اس پر ضمانت لازم نہیں ہے۔ دیکھیے شرح فتح القدیر (۷۔۱۰۳)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عاریۃ امانت کی طرح ہے لہٰذا اس میں ضمان نہیں۔ الا یہ کہ مستعار لینے والے کی زیادتی سے تلف ہو تو اس صورت میں اسے تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۸۔۱۷۹)

امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ نخعی، زہری اور عمر بن عبدالعزیز کا یہی مسلک ہے۔

[2] دیکھیے "کتاب الام للشافعی" (۳۔۲۴۵) امام شافعی فرماتے ہیں:۔

مستعار لی ہوئی کوئی چیز بھی ہو اس کا تاوان ادا کیا جائے گا۔ مثلاً چوپائے، لونڈی غلام یا کپڑے وغیرہ۔ اس قسم میں سب اشیاء یکساں ہیں، لہٰذا جو شخص کسی سے کوئی چیز مستعار لے اور اس کے یہاں ضائع ہو جائے تو وہ اس کا ضامن ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کے ضائع ہونے میں مستعار لینے والے کا کوئی دخل ہو یا نہ ہو۔

اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) وہ اشیاء جن کے ضائع ہونے کی صورت میں ان کا تاوان ادا کیا جاتا ہے۔ (۲) دوسری قسم کی اشیاء وہ ہیں جن کا تاوان ادا نہیں کیا جاتا۔ پہلی قسم کی چیزوں میں غصب کردہ یا اسی نوع کی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ ان چیزوں کے تلف ہونے کی صورت میں غصب کرنے والے کو لازماً تاوان دینا ہوگا۔ چاہے وہ چیز سرعام ضائع ہوئی ہو، یا پوشیدہ طور پر، اور چاہے اس کے ضائع ہونے میں اس شخص کا اپنا کوئی قصور ہو یا نہ ہو۔ دوسری قسم کی وہ اشیاء ہیں جن کا تاوان ادا نہیں کیا جاتا۔ مثلاً وہ اشیاء جو کسی کے پاس امانت رکھی گئی ہوں۔ ایسی چیز خواہ ظاہراً ضائع ہوئی ہو یا پوشیدہ اس کے بارے میں اس شخص کے قول کو معتبر تصور کیا جائے گا جس کے پاس اسے امانت رکھا گیا ہو۔ البتہ اس سے حلف بھی لیا جائے گا۔

مستعار چیز کے بارے میں بعض اہل علم ہمارے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ مستعار لینے والا صرف اس چیز کا ضامن ہوگا جو اس کی زیادتی سے تلف ہوئی ہو۔ ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے؟ اگر وہ یوں کہیں کہ قاضی شریح نے یہ بات کہی ہے اور پھر ہم سے ضامن ہونے کی دلیل طلب کرے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان سے جنگی آلات مستعار لیے اور فرمایا تھا کہ ان کے تلف ہو جانے کی صورت میں ہم اس کا تاوان ادا کریں گے۔" (امام شافعی کا بیان ختم ہوا)

<u>مستعار چیز کی ضمانت کے بارے میں اختلاف مسالک</u> : مستعار چیز کی ضمانت کے بارے میں علماء کے پانچ مذاہب ہیں:۔

۱۔ امام شافعی کے نزدیک مستعار چیز کی ضمان ادا کی جائے گی۔ خواہ وہ چیز متعلقہ شخص کے ہاتھ سے ضائع ہوئی ہو یا آسمانی آفت سے۔ صحابہ میں سے حضرات ابن عباس، عائشہ صدیقہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک ہے۔ امام احمد بن حنبل اور تابعین میں سے عطاء کا یہی مسلک ہے۔

۲۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ادھار لینے والا صرف اس صورت میں ضامن ہوگا جب وہ چیز اس کی غلطی سے تلف ہو۔ حسن بصری، سفیان ثوری، نخعی، اور اوزاعی کا بھی یہی موقف ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی تو یہ ہے:۔

"ہاتھ پر اس چیز کو واپس کرنا لازم ہے جو اس نے لی۔"

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث حسن نے سمرہ سے روایت کی ہے اور حسن کی روایت سمرہ سے حجت نہیں ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ حسن کے نزدیک مستعار چیز کا تاوان ادا نہیں کیا جاتا۔

اگر سوال کیا جائے کہ صفوان کی روایت کردہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ "یہ مستعار ہے اور اس کا تاوان ادا کیا جائے گا" تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر یہ الفاظ ثابت بھی ہوں تو بھی ان سے مستعار چیز کا قابلِ ضمان ہونا لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ امام شافعی فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چیزیں حضور نے صفوان سے اس وقت لی تھیں جب وہ مشرف باسلام نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا تاوان کی ادائیگی کا التزام صفوان کے ساتھ ایفاء عہد کے طور پر تھا۔ لیکن کفار کے مال وجان کے تحفظ کی ذمہ داری اور اس کے ایفا کے لیے کیے گئے اقدامات سے تعرض کرنے احکام کے بارے میں استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

قاسم بن اصبغ نے ابن وضاح عن سحنون عن ابن وہب، عن عمر بن قیس، عن حمزہ بن ابی حمزہ الصیبنی کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے کہ حضور نے فرمایا:

"جس شخص نے کسی کے احاطہ میں اس کی اجازت سے مکان تعمیر کیا اور وہ شخص اس کو اس مکان سے نکال دینا چاہتا ہو تو اسے مکان کی قیمت ادا کی جائے گی اور جس نے بلا اجازت کسی کے احاطہ میں مکان تعمیر کیا تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔"[1]

اس سند میں عمر بن قیس اور حمزہ الصیبنی راویوں پر جرح کی گئی ہے۔

۳۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اگر مستعار چیز پوشیدہ طور پر تلف ہوئی تو مستعار لینے والا ضامن ہوگا۔ اور لوگوں کے سامنے تلف ہوئی تو نہیں۔

۴۔ اگر مستعار چیز مر جانے کی وجہ سے ضائع ہوئی تو مستعار لینے والا ضامن نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی اور وجہ سے تلف ہوئی تو ضامن ہوگا۔ یہ اہل تشیع کا نقطۂ نظر ہے۔

۵۔ اگر مستعار دینے والا ضمان کی شرط عائد کرے تو مستعیر ضامن ہوگا ورنہ نہیں۔ یہ قتادہ، عبیداللہ الحسن العنبری اور داؤد کا موقف ہے۔ الماوردی نے ان مذاہب کا تذکرہ "الحاوی" میں کیا ہے اور "المجموع" (۱۴-۲۷) کے مصنف نے اس سے نقل کیا ہے۔

[1] بیہقی (۶-۹۱) نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر بن قیس ضعیف راوی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سند میں دیگر راوی بھی ضعیف ہیں۔ عمر بن قیس کی کنیت ابو جعفر ہے اور وہ سندل کے نام سے معروف تھا۔ امام نسائی، احمد اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ یحییٰ بن معین اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ الجوزجانی کہتے ہیں وہ ساتویں طبقے کا راوی ہے اور ساقط الاعتبار ہے۔

ایک نسخہ میں عمرو بن قیس اور دوسرے میں ابن قیس ہے۔

حمزہ بن ابی حمزہ: اس کے والد کا نام میمون الجعفی ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اس کی روایت کردہ احادیث بے کار ہیں۔ بخاری اور ابو حاتم اسے منکر الحدیث قرار دیتے ہیں۔ ترمذی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ نسائی اور دار قطنی کہتے ہیں کہ وہ متروک الحدیث اور ساتویں طبقے کا راوی ہے۔ ترمذی نے اس سے صرف ایک حدیث روایت کی ہے۔

میراث کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام

نحاس کی کتاب "معانی القرآن" میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا خاوند آپ کی معیت میں کفار کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گیا اور پیچھے مجھے، دو بیٹیوں اور اپنے والد کو چھوڑ گیا اور عورتوں کے ساتھ مال کے لالچ میں نکاح کیا جاتا ہے۔ (بعض روایات میں باپ کی جگہ بھائی کا لفظ ہے۔ یعنی بھائی کو چھوڑ گیا) مگر صحیح روایت کے مطابق باپ ہے[۱] اور وہ ربیع تھے) اب باپ نے اس کے سارے مال پر قبضہ کر لیا ہے۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع کو بلا کر کہا کہ "سعد کی بیوی کو آٹھواں حصہ اور اس کی بیٹیوں کو دو تہائی حصہ ترکہ دو اور اس کے بعد جو بچ جائے وہ تم لے لو"[۲]

---

[۱] یہ حدیث حاکم نے "المستدرک" (۴-۳۴۳) میں روایت کی اور کہا کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ مگر صحیحین میں یہ روایت نہیں ہے۔ ذہبی بھی حاکم سے متفق ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کا نام ثابت بن قیس تھا، مگر بیہقی کے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ وہ سعد بن ربیع تھے۔ دیکھیے السنن الکبریٰ (۶-۲۲۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیچھے رہنے والا ان کا بھائی تھا نہ کہ والد جس کا نام ربیع تھا۔

تمام اہلِ سیر کا اتفاق ہے کہ ثابت بن قیس جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔ غزوۂ احد میں شہید ہونے والے سعد بن ربیع تھے۔ دیکھیے سنن ابی داؤد (۳-۱۲۱) کتاب "الفرائض" باب "ما جاء فی میراث الصلب"

ابوداؤد کہتے ہیں کہ بشر بن مفضل نے اس روایت میں غلطی کی ہے۔ وہ سعد بن ربیع کی بیٹیاں تھیں کیونکہ ثابت بن قیس تو غزوۂ احد میں نہیں بلکہ جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔ پھر ابنِ وہب کی روایت نقل کر کے ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ زیادہ صحیح ہے۔

الخطابی "المعالم" میں لکھتے ہیں :-

"یہ بعض راویوں کی غلطی ہے۔ دراصل وہ سعد بن ربیع کی بیوی اور ان کی دونوں بیٹیاں تھیں۔ سعد غزوۂ احد میں شہید ہوئے جبکہ ثابت بن قیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے خلافت صدیقی میں جنگ یمامہ میں شرکت کی۔ الخطابی کہتے ہیں کہ اسی طرح یہ حدیث عبیداللہ بن عمرو نے بھی عبدالکریم، عن ابن عقیل، عن جابرؓ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے پھر انھوں نے حدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی یہ روایت بیان کی ہے ان کی روایت میں سعد بن ربیع کا ذکر ہے۔ المنذری نے المختصر میں بھی یہ روایت کی ہے۔ سعد بن ربیع خزرجی انصار کے نقیبوں میں سے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عبدالرحمٰن بن عوف کا بھائی بنایا تھا۔ اہلِ سیرت کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ ان کی بیوی کا نام عمرہ بنت حزم

محمد بن سحنون نے اپنی تصنیف کے باب "کتاب الفرائض" میں ذکر کیا ہے کہ جب سعدؓ کی بیوی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ عورتوں کے ساتھ ان کے مال کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کو تمہاری بیٹیوں کی حالت معلوم ہے۔ اگر اس کی مشیت مقتضی ہوئی تو ان کے بارے میں وحی نازل کر دے گا"

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دن انتظار فرمایا۔ پھر آپؐ نے سعد کی بیوی کو پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اور تمہاری بیٹیوں کے بارے میں وحی نازل کی ہے۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:[1]

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ.	خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔ اور اگر میت کی اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا دو سے
(النساء - ۱۱)	زیادہ) تو کل ترکے میں ان کا دو تہائی ہے۔

ہے۔ دیکھیے الاصابة (۳-۲۵۰) اور اُسد الغابة (۲-۲۷۷)

قاضی بیضاوی اپنی تفسیر (ص ۱۳۳) میں لکھتے ہیں کہ دو بیٹیوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ دونوں ایک بیٹی کے حکم میں ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دو سے زائد بیٹیوں کے لیے ——— خواہ وہ تین ہوں یا اس سے زیادہ ——— ترکے کا دو تہائی حصہ مقرر کیا ہے۔ جبکہ دوسرے اہلِ علم کہتے ہیں کہ دو لڑکیوں کو دو سے زائد لڑکیوں کا مقام حاصل ہے۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا ہے۔ مثلاً ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث ہوں تو لڑکے کو دو تہائی حصہ ملے گا اور لڑکی کو ایک تہائی۔ تو اس کا تقاضا ہے کہ جب دو لڑکیاں ہوں تو ان کو دو تہائی حصہ دیا جائے، مگر اس سے یہ وہم پڑ سکتا ہے کہ اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کو دو تہائی سے زیادہ حصہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے "فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ" کہہ کر اس وہم کا ازالہ کیا۔ یہ بات اس کی مؤید ہے کہ جب ایک لڑکی اپنے بھائی کی موجودگی میں ایک تہائی حصہ لیتی ہے تو دوسری بہن کے ہوتے ہوئے بھی اسے ایک تہائی ضرور ملنا چاہیے۔

جمہور اہلِ علم کے نزدیک دو بیٹیوں کو ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ اس ضمن میں ابن عباسؓ کی روایت شاذ ہے۔ ابن قدامہ نے المغنی (۶-۲۲۸) میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے علماء اس ضمن میں سعدؓ بن ربیع کی بیٹیوں کے واقعے سے استدلال کرتے ہیں۔ ابنِ قدامہ کہتے ہیں کہ یہ اس آیت کی وہ تفسیر ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے۔

[1] ابن جریر الطبری نے اپنی تفسیر (۴-۲۷۵) میں اس آیت کا شانِ نزول کچھ اور بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"دورِ جاہلیت میں لڑکیوں اور چھوٹی عمر کے لڑکوں کو ترکوں میں سے حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ شاعرِ رسولؐ حضرت حسانؓ کا بھائی عبدالرحمٰن فوت ہو گیا۔ اس نے امّ کحہ نامی بیوی اور پانچ بہنیں پیچھے چھوڑیں۔ جب وارث اس کا مال لینے کے لیے آئے تو عبدالرحمٰن کی بیوی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کی بیوی کو آٹھواں حصہ، دو بیٹیوں کو دو تہائی اور باپ کو باقی ماندہ ترکہ دیا اس طرح سعد بن ربیع انصاری کی میراث سب سے پہلی میراث تھی جو اسلام کے قانون کے مطابق تقسیم کی گئی ۔ سحنون ابن وہب اور داؤد بن قیس وغیرہ ، عن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب ، عن جابر بن عبداللہ کی سند کے ساتھ کہتے ہیں کہ سعد کی بیوی نے (تا آخر)

صحیح بخاری[1] میں ہے کہ ہذیل بن شرحبیل نے کہا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص مر گیا ۔ اس نے ایک بیٹی ، ایک بہن اور ایک پوتی پیچھے چھوڑی ۔ اس کے ترکہ کو ان میں کس طرح تقسیم کیا جائے گا ؟ ابو موسیٰ نے کہا بیٹی اور بہن کو نصف نصف ملے گا (اور پوتی محروم رہے گی) انھوں نے مزید کہا کہ جا کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے دریافت کرو وہ بھی میری تائید کریں گے ۔ جب عبداللہ بن مسعود سے یہ مسئلہ پوچھا گیا اور ان کو حضرت ابو موسیٰ کے فتویٰ سے آگاہ کیا گیا تو انھوں نے کہا " اگر میں بھی وہی فتویٰ دوں جو ابو موسیٰ نے دیا ہے تو میں گمراہ ٹھہروں گا اور ہدایت یافتہ نہیں ہوں گا ۔ اس مسئلے میں میں وہی فیصلہ کروں گا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا ۔ وہ فیصلہ یہ ہے کہ بیٹی کو نصف ملے گا اور پوتی کو $\frac{1}{6}$ ۔ اس طرح دو تہائی ترکہ پورا ہو جائے گا اور جو باقی بچا (یعنی $\frac{1}{3}$) وہ بہن کو ملے گا " یہ فیصلہ سننے کے بعد ہم حضرت ابو موسیٰ کے پاس آئے اور ان کو عبداللہ بن مسعود کے فتویٰ سے آگاہ کیا ۔ وہ کہنے لگے " جب تک یہ حبر[2] (عالم) یعنی عبداللہ بن مسعود تمھارے اندر موجود ہیں مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو "۔

---

[1] صحیح بخاری ، کتاب " الفرائض " باب " میراث ابنۃ ابن مع ابنۃ " (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۳۶)

حاکم کا گمان ہے کہ یہ حدیث بخاری میں موجود نہیں ، لہٰذا انھوں نے " المستدرک " (۴-۳۳۴) میں یہ نقل کی اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے ، مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا " ۔

ابوداؤد (۳ - ۱۲۰) کتاب " الفرائض " باب " ما جاء فی میراث الصلب "

ترمذی (۴ - ۱۵۴) کتاب " الفرائض " باب " ما جاء فی میراث بنت الابن مع بنت الصلب "

ابن ماجہ (۲ - ۹۰۹) الدارمی (۲ - ۳۴۹)

ان تمام محدثین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ جب حضرت ابو موسیٰ سے یہ سوال کیا گیا تو سلمان بن ربیعہ ان کے پاس موجود تھے ۔

[2] الحبر (بفتح الحاء والکسر) الجوہری نے کسر الحاء کو ترجیح دی ہے ۔ الفراء کہتے ہیں کہ یہ لفظ بکسر الحاء ہے ۔ دراصل حِبر روشنائی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ پھر اس کا اطلاق صاحب علم پر کیا جانے لگا ۔

ابو عبید کہتے ہیں " تحبیر " کے معنی تزئین کے ہیں ۔ عالم کو حبر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کلام کو مزین کرتا ہے ۔ تمام محدثین کے نزدیک یہ لفظ بفتح الحاء ہے ۔ ابوالہیثم کہتے ہیں کہ بکسر الحاء درست نہیں ۔ الراغب کہتے ہیں عالم کو " حِبر " (روشنائی) اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے علمی آثار اس کی موت کے بعد بھی باقی رہتے ہیں ۔

صحیح بخاری[1] و صحیح مسلم[2] میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وراثت کے مقررہ حصے ان کے حصہ داروں کو ان کے حصے[3] دے دو۔ جو بچ رہے وہ اس مرد کو ملے گا جو اقرب ہو۔ اہل علم نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ ان

۱۔ صحیح بخاری کتاب "الفرائض" باب "میراث الولد من ابیہ وامہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۳۲)

نیز بخاری باب "میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۳۵)

بخاری باب "میراث الجد مع الاب والاخوۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۳۷)

بخاری باب ابنی عم احدھما اخ للأم والآخر زوج (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۴۶)

۲۔ صحیح مسلم (۳-۱۲۳۳) کتاب "الفرائض" باب "الحقوا الفرائض باھلھا" نیز ملاحظہ ہو۔

ترمذی (۴-۱۸۴) کتاب "الفرائض" باب "ما جاء فی میراث العصبۃ" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

بعض محدثین اس حدیث کو ابن طاؤس سے وہ اپنے والد سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (۱۲-۱۱) میں لکھتے ہیں:۔

"محدثین کہتے ہیں کہ وہیب اس حدیث کو متصل سند کے ساتھ روایت کرنے میں منفرد ہے۔ سفیان ثوری نے یہ بات مرسلاً ابن طاؤس سے روایت کی ہے۔ انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ حدیث نسائی اور طحاوی (۳-۲۵۴) نے بھی روایت کی ہے نسائی نے اشارہ کیا ہے کہ اس کا مرسل ہونا راجح ہے۔ اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم نے اس حدیث کے متصل ہونے کو ترجیح دی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کے ہاں اس حدیث کو وہیب کے علاوہ روح بن القاسم نے بھی روایت کیا ہے۔ صحیح مسلم میں اس کی تائید میں ایک دوسری روایت یحییٰ بن ایوب کی بھی ہے۔ جبکہ دارقطنی میں زیاد بن سعد اور صالح کی روایت کردہ احادیث بھی اس کی تائید میں ہیں علاوہ ازیں اس حدیث کو عبدالرزاق نے معمر سے متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے، لیکن معمر کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

یہ حدیث مسلم، ابوداؤد، ترمذی، اور ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے۔ عبداللہ بن مبارک نے یہ حدیث معمر اور ثوری سے مرسلاً روایت کی ہے۔ طحاوی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس امر کا احتمال ہے کہ اس نے معمر کی روایت کو ثوری کی روایت پر محمول کیا ہو۔ بہرحال دونوں نے اس روایت کو اس لیے صحیح قرار دیا ہے کہ ثوری اگرچہ ان سب سے بڑھ کر حافظ حدیث ہیں۔ لیکن ان کے مقابلہ میں راویوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ اور جب متصل اور مرسل روایات باہم متعارض ہوں اور ان میں سے کوئی بھی راجح نہ ہو تو متصل روایت کو ترجیح دی جاتی ہے۔"

۳۔ عربی متن میں (الفرائض) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور اس سے وراثت کے وہ حصے مراد ہیں جو کتاب اللہ میں (ان کے ارباب) کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اور یہ کل چھ فروض (حصص) ہیں

(۱) نصف ($\frac{1}{2}$) (۲) ربع ($\frac{1}{4}$) (۳) ثمن ($\frac{1}{8}$)

سلہ عصبات کے بارے میں ہے اور عصبات سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جو صرف مرد ہونے کی صورت میں وراثت کے حقدار

---

(۴) ثلثان ($\frac{2}{3}$) (۵) ثلث ($\frac{1}{3}$) (۶) سدس ($\frac{1}{6}$)

اہل علم ان کو بیان کرنے کے لیے دو طریقے استعمال کرتے ہیں۔

۱۔ طریق التدلی (بطریق نزول) یعنی اوپر سے نیچے کو۔ جیسے یوں کہا جائے۔

نصف۔ نصف النصف یعنی $\frac{1}{4}$۔ نصف النصف کا نصف یعنی $\frac{1}{8}$۔ ثلثان یعنی $\frac{2}{3}$۔ اس کا نصف یعنی ثلث $\frac{1}{3}$۔
ثلث کا نصف یعنی سدس ($\frac{1}{6}$)

۲۔ طریق الترقی (یعنی نیچے سے اوپر کو:

(۱) ثمن ($\frac{1}{8}$) (۲) اس کا دوگنا یعنی ربع ($\frac{1}{4}$) (۳) اس کے دوگنے کا دوگنا یعنی نصف ($\frac{1}{2}$)

(۴) سدس ($\frac{1}{6}$) (۵) اس کا دوگنا یعنی ثلث ($\frac{1}{3}$) (۶) اس کے دوگنے کا دوگنا یعنی ثلثان ($\frac{2}{3}$)

حدیث کے متن میں اہل الفرائض کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے مراد ترکہ کے حق دار ہیں۔

پانچ وارثوں کو نصف ملتا ہے۔ یعنی۔

خاوند، بیٹی، پوتی، حقیقی بہن، علاتی بہن (جو والد کی طرف سے ہو)

رُبع $\frac{1}{4}$ | دو وارثوں کو ملتا ہے۔

(۱) خاوند (۲) بیوی۔

ثُمن $\frac{1}{8}$ | صرف ایک وارث کو ملتا ہے اور وہ بیوی ہے۔

ثلثان $\frac{2}{3}$ | چار وارثوں کو ملتا ہے۔

(۱) دو یا دو سے زیادہ صُلبی بیٹیوں کو۔

(۲) دو یا دو سے زیادہ پوتیوں اور پڑپوتیوں کو۔

(۳) دو یا دو سے زیادہ حقیقی بہنوں کو۔

(۴) دو یا دو سے زیادہ علاتی بہنوں کو (جو باپ کی طرف سے ہوں)

ثلث $\frac{1}{3}$ | دو وارثوں کو ملتا ہے۔

(۱) ماں (۲) بھائی اور بہنیں جو ماں کی طرف سے ہوں۔

سدس $\frac{1}{6}$ | سات وارثوں کو ملتا ہے۔

(۱) باپ (۲) حقیقی دادا (۳) ماں (۴) پوتی (۵) علاتی بہن (۶) حقیقی دادی (۷) ولد الام یعنی بھائی جو ماں کی طرف سے ہو۔

سلہ عربی متن میں العصبۃ کا لفظ آیا ہے جس کے لغوی معنی گروہ یا جتھے کے ہیں۔ عربی محاورہ ہے "عصب القوم بالرجل" یعنی کچھ لوگوں نے کسی کی حفاظت کے لیے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ طاقتور جماعت کو "عصبۃ" کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

ہوتے ہیں جیسے چچے بھتیجے، چچازاد بھائی وغیرہ۔ ترکہ کی تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے وہ ان میں سے مردوں کو ملتا ہے، عورتوں کو نہیں۔ اگر میت اپنے پیچھے ایک بیٹی، ایک حقیقی بہن اور ایک حقیقی بھائی چھوڑے اس صورت میں بیٹی کو ترکے کا نصف حصہ ملے گا اور دوسرا نصف بہن بھائی میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے گا۔

اسی طرح اگر میت اپنے پیچھے ایک بیٹی، اور باپ کی طرف سے ایک بھائی اور ایک بہن چھوڑے تو اس صورت میں بھی ترکہ کی تقسیم حسب سابق ہوگی، مگر اس صورت میں بھائی کو بہن سے زیادہ حصہ نہیں دیا جائے گا۔

صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں حضرت ابن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے ایک بیٹی اور بہن کے بارے میں منقول ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ نصف ترکہ بیٹی کو ملے گا اور نصف عصبہ کو اور بہن محروم رہے گی۔

قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ (یوسف - ۱۴) انھوں نے کہا اگر اس کو بھیڑیے نے کھا لیا جبکہ ہم طاقتور جماعت ہیں (تو ہم تو بالکل بیکار ٹھہرے)

اخفش کہتے ہیں "العصبۃ والعاصبۃ" کے معنی جماعت کے ہیں۔ اس کا واحد کوئی نہیں۔ علم الفرائض کی اصطلاح میں ترکہ میں جس کا حصہ مقرر نہ ہو اس کو عصبہ کہتے ہیں۔ الازہری کہتے ہیں "عصبۃ الرجل" سے کسی شخص کے مرد ورثاء مراد ہوتے ہیں۔

علم الاصول کے ماہرین نے عصبہ کی یہ تعریف کی ہے :۔

"عصبہ اس شخص کو کہتے ہیں جو تنہا ہونے کی صورت میں تمام ترکہ کا وارث قرار پاتا ہے۔ اور دیگر ورثاء کی موجودگی میں ان کے حصص ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے وہ لیتا ہے۔ مثلاً بیٹا، پوتا، حقیقی بھائی، علاتی بھائی اور حقیقی چچا۔

عصبہ دو قسم کا ہوتا ہے :۔

۱۔ عصبہ نسبیہ :۔ جو نسب کی وجہ سے عصبہ ہو۔ اس کی تین قسمیں ہیں :۔

۱ - عصبہ بنفسہٖ ۲ - عصبہ بغیرہٖ

۳ - عصبہ مع غیرہٖ

۲۔ عصبہ سببیہ :۔ جو آزاد کرنے کی بنا پر عصبہ قرار پائے۔ اس لیے کہ وارث موجود نہ ہونے کی صورت میں آزاد کرنے والا شخص اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات کتب فقہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

لہ بیہقی (۶-۲۳۳) نے عبداللہ بن زبیر کے فیصلے کا ذکر کیا ہے۔ ان کا یہ فیصلہ سن کر اسود بن یزید نے کہا کہ معاذ بن جبل نے یمن میں فیصلہ کرتے ہوئے بیٹی کو نصف اور بہن کو دوسرا نصف دلایا تھا۔ عبداللہؓ بن زبیر نے کہا تم میرے قاصد بن کر جاؤ اور عبداللہ بن عُتبہ کو حضرت معاذؓ کے فیصلے سے آگاہ کرو۔ عبداللہ بن عُتبہ ان دنوں کوفہ کے قاضی تھے۔

بخاری نے کتاب "الفرائض" باب میراث الاخوات" میں معاذؓ کے فیصلے کا ذکر کیا ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۴۱)

مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۲۵) میں بھی اس فیصلے کا ذکر کیا ہے۔ عبدالرزاق نے معمر عن زہری عن ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کے فیصلے کا بھی ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں بیہقی نے بھی عبدالرزاق کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا گیا کہ حضرت عمرؓ بیٹی کو نصف اور دوسرا نصف بہن کو دیا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں ابن عباسؓ نے کہا "تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ؟"

معمر کہتے ہیں کہ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس اختلاف کی کیا وجہ ہے۔ حتیٰ کہ میں ابن طاؤس سے ملا۔ انھوں نے اپنے والد سے روایت کی کہ انھوں نے ابن عباسؓ کو یہ کہتے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ (النساء - ۱۷۶) — اگر ایک آدمی مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو لیکن ایک بہن ہو تو اسے ترکہ کا نصف ملے گا۔

ابن طاؤس کہتے ہیں کہ میرے والد عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے تھے، ابن عباس ایک شخص سے اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ طاؤس اس شخص کو پسند نہیں کرتے تھے، لہٰذا وہ اس روایت کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے اور اس ضمن میں کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔

شعبی کہتے ہیں کہ اگر میت ایک بیٹی اور ایک بہن چھوڑے تو تمام صحابہ کے نزدیک نصف بیٹی کو دیا جائے گا اور دوسرا نصف بہن کو، مگر عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیر اس کے خلاف ہیں۔ ابن زبیر نے آخر میں اس مسلک سے رجوع کر لیا تھا۔

---

[۱] المستدرک للحاکم (۴-۳۳۹) حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے بھی حاکم سے اتفاق کیا ہے۔

ابن قدامہ "المغنی" (۶ - ۲۲۷) میں لکھتے ہیں :-

"جس آیت سے حضرت ابن عباسؓ نے استدلال کیا ہے اس سے ان کا موقف ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے تو صرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں بہن کو نصف حصہ نہیں دیا جائے گا اور ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن بیٹی کی موجودگی میں بہن کو جو کچھ دیا جاتا ہے وہ اس کا مقررہ حصہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ عصبہ ہونے کی وجہ سے بھائی کے ترکہ سے یہ ورثہ پاتی ہے۔ دوسری طرف حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ بہن کی اولاد ہوتے ہوئے بھی بھائی اس کا وارث ہوگا۔

حالانکہ ارشادِ ربانی ہے :-

وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ (النساء - ۱۷۶) بھائی بہن کا وارث ہوگا جب کہ بہن کی اولاد نہ ہو۔

ابن عباس کا یہ موقف خلافِ اجماع ہے۔ اس لیے کہ بھائی کے وارث ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ بہن بے اولاد ہو۔ مزید براں اس صورت میں جب کہ میت ایک بہن، ایک بیٹی اور ایک پوتی پیچھے چھوڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہن کو ترکہ کی تقسیم کے بعد باقی ماندہ ایک تہائی دلایا تھا۔ اگر میت اپنے پیچھے دو بیٹیاں، ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑے تو دو بیٹیوں کو دو تہائی ملے گا۔ پوتی محروم رہے گی اور جو ایک تہائی ترکہ بچ گیا ہے وہ بہن کو ملے گا۔ اور اگر بیٹیوں کے ساتھ میت کی ماں بھی ہو تو $\frac{1}{6}$ اسے ملے گا۔ اور باقی ماندہ $\frac{1}{6}$ بہن کو ملے گا۔ اگر ماں کے بجائے میت کا خاوند موجود ہو اس صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ ۱۲ میں سے $\frac{1}{4}$ حصہ (یعنی تین) خاوند کو ملے گا۔ دونوں بیٹیوں کو بارہ کا دو تہائی (یعنی آٹھ) ملے گا۔ اور بہن کے لیے $\frac{1}{12}$ (یعنی ایک) بچ رہے گا۔ اگر ان کے ساتھ ماں بھی ہو تو بہن محروم رہے گی۔"

امام مالک موطأ[1] میں بروایت ابن شہاب عن عثمان بن اسحاق بن خرشہ[2] عن قبیصہ بن ذویب نقل کرتے ہیں کہ ایک دادی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر میراث کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا "تمہارے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حصہ مقرر نہیں کیا گیا۔ اور میرے علم کی حد تک سنت رسول میں بھی تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم واپس چلی جاؤ میں تمہارے بارے میں لوگوں سے دریافت کروں گا، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں لوگوں سے دریافت کیا۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ نے کہا کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھا۔ آپ نے دادی کو چھٹا حصہ دلایا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا؟ محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) نے کھڑے ہو کر مغیرہ کی تائید کی، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دادی کو ۱/۶ حصہ دلوایا۔

بعد ازاں ایک نانی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں میراث طلب کرنے کے لیے حاضر ہوئی۔ فرمایا تمہارے لیے کتاب اللہ میں کچھ نہیں۔ اور (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے) جو فیصلہ کیا تھا وہ تمہارے لیے نہیں تھا بلکہ دادی کے لیے تھا) اور میں وراثت کے حصوں میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہ چھٹا حصہ موجود ہے جس میں تم دونوں (دادی و نانی) شریک ہو گی۔ اور اگر تم دونوں میں سے ایک موجود ہو گی تو سارا حصہ اسے مل جائے گا۔

---

[1] دیکھیے موطا امام مالک (۲-۵۱۳) کتاب "الفرائض" باب "میراث الجدۃ"

علاوہ ازیں المروزی (ص ۱۸۹) نے یہ حدیث بروایت زہری عن قبیصہ بن ذویب نقل کی ہے۔ نیز ترمذی (۲-۱۹۱) نے اس حدیث کو ابواب "الفرائض" باب ما جاء فی میراث الجدۃ میں دو طریقوں سے روایت کیا ہے، اولاً امام مالک کے طریقے سے اور ثانیاً سفیان بن عیینہ کے طریقے سے۔ اس کے بارے میں ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور امام مالک کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ المستدرک للحاکم (۴-۳۳۹) میں ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے، مگر صحیحین میں یہ حدیث روایت نہیں کی گئی۔ ذہبی نے حاکم کی تائید کی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ اس لیے کہ قبیصہ بن ذویب کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات بعید از قیاس ہے۔ قبیصہ کی ولادت فتح مکہ والے سال یعنی ۸ھ میں ہوئی۔ لہٰذا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو اس وقت قبیصہ کی عمر تقریباً چار برس تھی۔

حافظ ابن حجر "التلخیص الحبیر" (۳-۸۲) میں لکھتے ہیں:

"یہ حدیث مالک، احمد، اصحاب سنن، ابن حبان اور حاکم نے اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے اس کی سند صحیح اور اس کے راوی ثقہ ہیں، مگر ظاہری صورت کے اعتبار سے یہ مرسل حدیث ہے۔ اس لیے کہ قبیصہ کا سماع حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں، اور وہ اس واقعہ کے وقت موجود نہ تھے۔ ابن عبد البر نے بھی یہی کہا ہے۔ قبیصہ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے مگر صحیح یہ ہے کہ وہ فتح مکہ والے سال پیدا ہوئے۔ ابن حزم کے اتباع میں عبد الحق نے بھی اس کو منقطع روایت قرار دیا ہے۔ ابن حزم "المحلی" میں کہتے ہیں کہ قبیصہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، نہ ہی مغیرہ اور محمد بن مسلمہ سے یہ حدیث سنی۔ (حافظ ابن حجر کا بیان ختم ہوا)

[2] ایک نسخہ میں (حرشہ) بالحاء المہملۃ ہے جو کہ غلط ہے۔ اسحاق بن خرشہ القرشی، العامری، المدنی کو ابن معین نے ثقہ قرار دیا ہے۔

مصنف[1] عبدالرزاق میں منصور عن ابراہیم کی سند کے ساتھ ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین جدات (دادیوں اور نانیوں) کو چھٹا حصہ دلوایا۔ منصور کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے پوچھا کہ تین دادیوں نانیوں سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ اس کے باپ کی دادی اور نانی اور اس کی اپنی نانی۔

حماد بن سلمہ روایت کرتے ہیں کہ ثابت[2] بن الدحداح نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاصم بن عدی سے دریافت فرمایا کہ تم ثابت کے اہل خاندان سے واقف ہو؟ انھوں نے کہا نہیں، البتہ اس قدر جانتا ہوں کہ عبدالمنذر نے ثابت کی بہن کے ساتھ نکاح کیا تھا اور اس کے بطن سے ابولبابہ پیدا ہوئے، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ترکہ ان کے بھانجے ابولبابہ کو دے دیا[3]۔

محمد بن نصر المروزی[4] کی کتاب میں ابوامامہ بن سہل بن حنیف سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے کو تیر مارا جس سے

---

[1] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۷۳،۲) یہ روایت مرسل ہے، بیہقی نے سنن (۶-۲۳۶) میں روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے بیہقی نے بحدیث ابراہیم، عن عبدالرحمٰن بن یزید، عن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سند کے ساتھ بھی روایت کی ہے۔ یہ روایت بھی مرسل ہے۔

[2] امام شافعی نے روایت کی ہے کہ ثابت بن الدحداح غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ اس وقت تک تقسیم میراث کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے زخم مندمل ہوگئے تھے اور جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس آئے تو وہ طبعی موت مرے۔ وہ ثابت ہی تھے جو غزوۂ اُحد میں پکار رہے تھے کہ اے گروہِ انصار! اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی، لہٰذا اپنے دین کا دفاع کرتے ہوئے لڑائی جاری رکھو۔ انھوں نے اپنے رفقاء کو جرأت دلائی۔ اسی اثناء میں خالد بن ولید نے انھیں نیزہ مارا جو بدن سے پار ہوگیا اور وہ شہید ہوکر گر پڑے۔ یہ واقدی کی روایت ہے۔ دیکھیے الاصابۃ (۱-۱۹۱) اور اسد الغابۃ (۱-۲۲۱)

[3] مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۸۴) میں ثوری، عن محمد بن اسحاق، عن محمد بن یحییٰ بن حبان کی سند کے ساتھ مروی ہے۔ وہ اپنے چچا واسع سے روایت کرتے ہیں کہ ثابت بن الدحداح (قبیلہ انیف یا بنی العجلان میں باہر سے آکر آباد ہوئے تھے) جب انھوں نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ثابت کا کوئی وارث ہے؟ جب کوئی وارث نہ ملا تو آپؐ نے اس کا ترکہ ان کے بھانجے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو دے دیا۔

دارمی (۲-۳۸۱) نے یہ حدیث یعلیٰ بن محمد، عن محمد بن اسحاق نیز سعید بن منصور، عن ابن شہاب، عن محمد بن اسحاق کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

بیہقی اس حدیث کو معاویہ و ہشام و عبداللہ بن الولید عن سفیان اور عباد بن عباد عن سفیان کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ منقطع روایت ہے۔

[4] محمد بن نصر المروزی: ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ یہ حدیث و فقہ کے جید عالم تھے۔ صحابہ و تابعین کے اختلافی مسائل پر نگاہ رکھتے تھے۔

اس کی موت واقع ہوگئی۔ مقتول کا وارث صرف اس کا ماموں تھا۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے خط لکھ کر حضرت عمرؓ کو اس سے آگاہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں لکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :۔

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اللہ و رسول اس کے سرپرست ہیں اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث ہے۔"[۱]

بغداد میں پیدا ہوئے اور نیشاپور میں پلے بڑھے۔ طلب علم میں خوب گھومے پھرے اور پھر سمرقند میں ڈیرے ڈال دیے۔ سمرقند ہی میں وفات پائی۔ متعدد کتب تصنیف کیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں :۔

۱۔ القسامۃ فی الفقہ۔

۲۔ المسند فی الحدیث۔

۳۔ ما خالف بہ ابوحنیفۃ علیاً و ابن مسعود۔

المقریزی نے ان تین تصانیف کو مختصر کر کے ایک جلد میں یکجا کر دیا ہے۔ جو "قیام اللیل وقیام رمضان والوتر" کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ ان کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور ۲۹۴ھ میں وفات پائی۔

ابن الجوزی المنتظم (۶ - ۶۴) میں لکھتے ہیں :۔

"محمد بن نصر نے یحییٰ، ابن راہویہ، اہل خراسان اور عراق، حجاز، شام اور مصر کے بے شمار لوگوں سے حدیثیں سنیں۔ متعدد کتب تصنیف کیں۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (۹ - ۴۸۹) اور ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (۲ - ۶۵۰) میں ان کا تعارف لکھا ہے۔

[۱] دیکھیے دارقطنی (۴ - ۸۵) - ترمذی (۴ - ۴۲۱) کتاب "الفرائض" باب "ماجاء فی میراث الخال مختصراً"

ابن ماجہ (۲ - ۹۱۴) اور بیہقی (۶ - ۲۱۴) ان تمام محدثین کی سند میں عبدالرحمٰن بن حارث بن عیاش نامی راوی ہے جس کے بارے میں امام احمد کہتے ہیں کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ نسائی کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر اس کے بارے میں "التقریب" میں لکھتے ہیں :۔

"سچا راوی مگر وہمی آدمی ہے۔" البزار کہتے ہیں کہ ابو امامہ بن سہل کی روایت کردہ حدیث کو نسائی نے مضطرب قرار دیا ہے جبکہ دارقطنی اور بیہقی کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ دیکھیے "التلخیص الحبیر" (۳ - ۸۰، ۸۱)

اس حدیث کی مؤید احادیث بھی ہیں جو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث ہے۔

ترمذی نے یہ حدیث روایت کی ہے اور کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے جبکہ بعض محدثین نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہے اور حضرت عائشہؓ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

دارقطنی نے (۴ - ۸۵) اس حدیث کا ذکر حضرت عائشہؓ کی موقوف روایت کے اعتبار سے کیا ہے۔

بیہقی نے (۶ - ۲۱۵) یہ روایت کی اور کہا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت نہیں۔

ابوداؤد نے (۳ - ۱۲۳) یہ الفرائض میں المقدام الکندی سے روایت کی ہے۔

وکیع ابن خالد سے روایت کرتے ہیں اور وہ شعبی سے کہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی کا آزاد کردہ غلام فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے ایک اپنی بیٹی اور ایک حضرت حمزہؓ کی بیٹی چھوڑی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ترکہ میں سے نصف اس کی بیٹی کو اور نصف حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو دلوایا۔[1]

شعبی کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ یہ احکامِ میراث نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے یا اس کے بعد کا۔ سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو سنہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء والے سال حضرت علیؓ مکہ سے لائے تھے۔ تقسیم میراث کے احکام غزوہ احد ۳ھ کے تھوڑا عرصہ بعد نازل ہوئے تھے۔

بیہقی نے یہ (۶-۲۱۴) میں روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث کسی حد تک ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجرؒ "التلخیص الحبیر" (۳-۸۰) میں لکھتے ہیں کہ المقدام کی روایت کردہ حدیث کے بارے میں ابن ابی حاتم نے ابوزرعہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ بیہقی نے اس حدیث کو مضطرب قرار دیا ہے۔ یحییٰ بن معین سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اس ضمن میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔"

یہ حدیث حاکم نے "المستدرک" (۴-۳۴۴) میں روایت کی اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیحین کی شرائط کے مطابق ہے۔ مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ذہبی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام احمد علی بن ابی طلحہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ منکر حدیثیں روایت کرتا ہے۔ امام بخاری نے اس سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔

میں کہتا ہوں کہ اس قدر ضعف قابلِ برداشت ہے اور اس کی تلافی ممکن ہے۔

[1] ابن ماجہ (۲-۹۱۲) نے یہ روایت ایک دوسری سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اسی طرح دارقطنی نے بھی اس کو ایک مختلف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (دارقطنی ۴-۸۳)

حافظ ابن حجرؒ "التلخیص الحبیر" میں لکھتے ہیں:۔

"اس حدیث کی سند میں قاضی ابن ابی لیلیٰ ہے۔ نسائی کہتے ہیں کہ وہ مرسل روایات بیان کرتے تھے۔ نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں کہ اس روایت کا مرسل ہونا ہی صحیح تر ہے۔ حاکم نے مستدرک میں تصریح کی ہے کہ حمزہ کی بیٹی کا نام امامہ تھا۔ امام احمد نے یہ المسند میں قتادہ عن سلمہ بنت حمزہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے (تا آخر)

بیہقی کہتے ہیں کہ اس امر پر سب راویوں کا اتفاق ہے کہ اس غلام کو آزاد حضرت حمزہؓ کی بیٹی نے کیا تھا۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کا آزاد کردہ غلام فوت ہو گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ترکہ میں سے نصف حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو دیا۔ مگر یہ غلط ہے۔

اس کے آگے حافظ ابن حجر نے دارقطنی کی روایت کا ذکر کر کے کہا ہے کہ "مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی کا نام فاطمہ تھا۔" یہ حدیث الطبرانی نے "المعجم الکبیر" میں بھی روایت کی ہے۔

الہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۴-۲۳۶) میں طبرانی کی روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طبرانی نے یہ ایسی سند کے ساتھ روایت

ابن نصر کہتے ہیں بعض اہل علم کا خیال ہے کہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی جب مکہ سے نکلیں تو نابالغ تھیں۔ اگر اس کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی بلوغت اسی دور میں ہوئی ہوگی۔ اسی دوران میں انھوں نے اپنے غلام کو آزاد کیا ہوگا اور پھر اس کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ اس وقت تقسیم میراث کے احکام نازل ہو چکے تھے۔ اس واقعہ سے اس شخص کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ ترکہ کو وارثوں میں تقسیم کرنے کے بعد جو حصہ بچ جائے اسے دوبارہ انہی وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک روایت میں ہے کہ آزاد کردہ غلام حضرت حمزہؓ کا تھا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا غلام تھا۔

واثلہ بن اسقع، جن کی کنیت ابو قرصافہ[1] ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

عورت تین آدمیوں سے ورثہ حاصل کرتی ہے:۔

۱ - جس کو اس نے آزاد کیا ہو۔

۲ - جس بچے کو پڑا ہوا پایا اور اس کی پرورش کی۔

۳ - وہ بچہ جس کے بارے میں اس نے اپنے خاوند کے ساتھ لعان کیا۔[2]

کی ہے جس کے بعض روایت کرنے والے صحیحین کے رُواۃ و رجال میں سے ہیں۔ امام احمد نے بھی اس کو اسی قسم کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے مگر قتادہ کا سماع سلمی سے ثابت نہیں۔

[1] ایک نسخہ میں ابو صافہ ہے جو کہ محرّف ہے اور صحیح ابو قرصافہ ہے بالقاف والراء ان کے بعد ضاد مہملہ ہے۔ واقدی نے ان کی یہی کنیت لکھی ہے۔ دوسرے اہل علم ان کی کنیت ابو الاسقع یا ابو الخطاب یا ابو محمد یا ابو شداد بیان کرتے ہیں۔

[2] ابوداؤد (۳ - ۱۲۵) کتاب "الفرائض" باب "میراث ابن الملاعنۃ"

ترمذی (۴ - ۹ ۴م) کتاب "الفرائض" باب "ما یرث النساء من الولاء" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

ہمارے علم کی حد تک یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ محمد بن حرب کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کی ہے۔

اس حدیث کو ابن ماجہ (۲ - ۹۱۶) نے بھی روایت کیا ہے نیز المستدرک (۴ - ۳۴۱) میں حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر بخاری اور مسلم نے یہ روایت نہیں کی ہے ذہبی نے ان کی تائید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث سنن اربعہ میں بطریق عمر بن رؤبہ مروی ہے۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ عمر بن رؤبہ ضعیف راوی ہے۔ ابو حاتم رازی سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ صالح الحدیث ہے۔ جب دریافت کیا گیا کہ کیا اس کی روایت حجت ہے؟ تو ابو حاتم نے کہا "نہیں، مگر وہ اچھا راوی ہے۔" الخطابی کہتے ہیں یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت نہیں۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کے نزدیک صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کے بعض راوی مجہول ہیں۔ دیکھیے مختصر ابی داؤد للمنذری (۴ - ۵۵)

جمہور فقہاء اس ضمن میں متفق ہیں کہ عورت اس بچے سے ورثہ پائے گی جس کے بارے میں اس نے اپنے خاوند سے لعان کیا اور وہ بچہ اس عورت کا وارث ہوگا۔ صحیح بخاری نے اس کے لیے مستقل باب باندھا ہے "میراث الملاعنۃ" اور اس میں انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی حدیث مرفوعاً نقل کی ہے۔ دیکھیے صحیح بخاری کتاب "الفرائض" باب "الحاق الولد بالمرأۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۴۸) ہے۔

محمد بن سحنون (کتاب : عزائنفس) اپنے والد سے، وہ ابن وہب سے، وہ محمد بن عمرو سے، وہ ابن جریج سے اور وہ عمرو بن منیث سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث کی تقسیم کے بارے میں مندرجہ ذیل فیصلے فرمائے[1]

۱۔ حقیقی بھائی علاتی بھائی سے میراث کا زیادہ حق دار ہے۔

۲۔ علاتی بھائی حقیقی بھائی کے بیٹے سے زیادہ حق دار ہے۔

۳۔ جب حقیقی بھائی اور علاتی بھائی نسب کے اعتبار سے مساوی درجہ کے حامل ہوں تو حقیقی بھائی علاتی بھائیوں سے ورثہ پانے کے اعتبار سے زیادہ حق دار ہیں۔

۴۔ جب علاتی بھائی حقیقی بھائیوں سے بلحاظ نسب ارفع ہوں تو علاتی بھائی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں۔

۵۔ جب نسب میں برابر ہوں تو حقیقی بھائی علاتی بھائیوں سے اقرب ہیں۔

۶۔ حقیقی چچا جو باپ اور ماں دونوں کے اعتبار سے باپ کا بھائی ہو اس چچا سے اقرب ہے جو والد کا علاتی بھائی ہو۔

۷۔ وہ چچا جو باپ کا علاتی بھائی ہو وہ حقیقی بھائی کے بیٹوں سے اقرب ہے۔

۸۔ جب حقیقی بھائی اور علاتی بھائی نسب کے لحاظ سے مساوی درجہ رکھتے ہوں تو حقیقی بھائی علاتی بھائیوں سے ورثہ پانے کے زیادہ اہل ہیں۔

۹۔ چچا اور اس کے بیٹے نیز بھائی اور اس کے بیٹے اس وقت تک وارث نہ ہوں گے جب تک کوئی ایسا شخص موجود ہو جو میراث کا ان سے زیادہ حق دار ہو۔

۱۰۔ جو شخص تنہا ہو اس کے ورثاء کتاب اللہ کے مطابق اپنے مقررہ حصے وصول کریں گے۔

محمد بن سحنون کہتے ہیں اس حدیث پر اہل علم کا اجماع ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم بالصواب۔

---

[1] دیکھیے بیہقی (۶-۲۳۸) بیہقی نے اس حدیث کے ایک جزو کو زید بن ثابتؓ کی موقوف روایت کے اعتبار سے نقل کیا ہے۔ جبکہ مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۳۳) میں اس کو متصل سند کے ساتھ بروایت عمرو بن شعیب نقل کیا گیا ہے۔

[2] مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۴۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اَلوَلَدُ لِلفِراش کے بارے میں[۱]

محمد بن نصر المروزی کی کتاب میں ہے کہ علماءِ حجاز، عراق، شام اور مصر اس بارے میں متفق ہیں کہ زنا سے نسب ثابت نہیں

---

[۱] شرعاً نسب چار امور کی بنا پر قائم ہوتا ہے:

۱ - منکوحہ یا لونڈی ہونے کی بنا پر۔

۲ - استلحاق[۲] کی بنا پر۔

۳ - شہادت کی بنا پر۔

۴ - قیافہ کی بنا پر۔

اول الذکر تینوں امور کے بارے میں جمہور اہلِ علم متفق ہیں البتہ چوتھی صورت کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اس ضمن میں اہلِ علم کے یہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ نکاح سے "الفراش" کا اثبات ہوتا ہے لیکن لونڈی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جمہور کے نزدیک لونڈی ہونے سے بھی "الفراش" کا اثبات ہوتا ہے۔

علماء کے یہاں اس امر میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ بیوی "فراش" کیونکر بنتی ہے۔ اس میں اہلِ علم کے تین اقوال ہیں:

۱ - پہلا قول یہ ہے کہ بیوی نفسِ عقد کے ساتھ ہی "فراش" قرار پاتی ہے۔ البتہ اس بات کا بھی علم ہو کہ خاوند بیوی یکجا نہیں ہوئے حتیٰ کہ خاوند نکاح کے بعد اگر اسی مجلس میں طلاق دے دے تو بھی بیوی کو فراش کا حکم حاصل ہو جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہ کا موقف ہے۔ وہ نکاح کے لفظ سے اپنے اس موقف پر استدلال کرتے ہیں۔

۲ - دوسرا قول یہ ہے کہ بیوی کے فراش بننے کے لیے نکاح کے بعد صرف مجامعت کا امکان کافی ہے۔ امام شافعی و احمد کا مسلک یہی ہے۔

۳ - تیسرا قول یہ ہے کہ بیوی اس وقت فراش قرار پاتی ہے جب کہ عقد کے بعد دخول کا یقینی امکان موجود ہو۔ اگر چہ اس میں شک کی گنجائش ہو۔ یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مسلک ہے۔

امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ حرب کی روایت کے مطابق امام احمد نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ حرب نے اپنی روایت میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ جو شخص بیوی کو اپنے گھر میں آباد کرنے سے قبل طلاق دے دے۔ پھر اس کی بیوی کے یہاں بچہ پیدا ہو اور اس کا خاوند بچے کا انکار کرے تو اس صورت میں لعان کے بغیر ہی اس شخص سے بچے کے نسب کی نفی کی جائے گی۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

[۲] "استلحاق" "لحوق" سے مشتق ہے جس کے معنی ملانے اور چسپاں کرنے کے ہیں۔ "استلحقہ" یعنی اس نے اس کو اپنے ساتھ

ہوتا۔ اسحاق بن راہویہ کی رائے یہ ہے کہ زنا کے نتیجے میں بچہ اگر ایسی عورت سے پیدا ہو جس کا خاوند یا آقا اس کو اپنا بچہ قرار نہ دیتا ہو اور زانی اس کا باپ ہونے کا مدعی ہو تو اس کو زانی کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا۔ انھوں نے حدیث رسول "الولد للفراش وللعاهر الحجر" کا یہی مطلب[1] بیان کیا ہے۔

ثالثاً۔ استلحاق کی کچھ شرائط ہیں۔ ان میں سے بعض شرائط کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ استلحاق کی ایک شرط یہ ہے کہ باپ اس کی تصدیق کرے۔

۲۔ بچہ مجہول النسب ہو۔

۳۔ بچے کا الحاق کرنے کی ایک شرط یہ ہے کہ اس عمر کا آدمی ایسے بچے کا باپ ہو سکتا ہو۔

۴۔ جس کے ساتھ بچے کا الحاق کیا گیا ہے وہ خود باپ ہونے کا دعویٰ کرے اور یہ نہ کہے کہ اس نے اس کی والدہ کے ساتھ زنا کیا ہے۔

استلحاق متبنّٰی بنانے سے الگ بلکہ اس کے برعکس معاملہ ہے۔ اسلام نے تبنّی (متبنّٰی بنانے) کو قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں نے غلطی سے دونوں کو ایک چیز تصور کیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ تبنّی کی صورت میں ایک شخص کا الحاق دوسرے کے نسب کے ساتھ کر دیا جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نسب معروف ہو یا مجہول۔ دورِ جاہلیت یا اسی وجہ سے لوگ تبنّی کے ذریعے نسب کو پسند نہیں کیا کرتے تھے۔ اسی رسم کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہؓ کو اپنا متبنّٰی بنایا تھا۔ لوگ اس کو زیدؓ بن محمد کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اسی الحاق کی بنا پر قریش مکہ زیدؓ کو آپ کا بیٹا تصور کیا کرتے تھے۔ اسی بنا پر زیدؓ نے (حضرت زینبؓ) کے ساتھ نکاح کیا جو ایک قریشی خاتون تھیں۔

پھر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبنّٰی کی مطلقہ سے نکاح کیا اور قریش نے جاہلی رسم و رواج کی بنا پر آپ پر اعتراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے تبنّی کی رسم کو واضح طور پر ختم کرنے کے لیے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل فرمائی:

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ (الاحزاب: ۴)	تمھارے منہ بولے بیٹوں کو اس نے تمھارا بیٹا نہیں بنایا۔ یہ صرف تمھارے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ سچی بات کہتا ہے اور وہ سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

متبنّٰی کی بیوہ یا مطلقہ کے ساتھ نکاح کرنے کو اللہ تعالیٰ نے درست قرار دیتے ہوئے فرمایا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ (الاحزاب-۴۰)	محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یوں تبنّی اور استلحاق کا فرق اس طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

[1] حافظ ابن القیم زاد المعاد (۴-۱۱۹) میں لکھتے ہیں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ اس وقت فرمایا تھا جب زانی اور صاحب الفراش باہم جھگڑ رہے تھے۔ حسن بصری کا موقف

اسحاق بن راہویہ حسن بصری کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ زنا کرے۔ اس کے یہاں بچہ پیدا ہو اور زانی اس بچے کا دعویٰ دار ہو، تو زانی کو غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں کوڑے مارے جائیں گے اور بچے کا اس کے ساتھ الحاق کر دیا جائے گا۔ اسی طرح عُروہ اور سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ جو شخص کسی بچے کے بارے میں دعویٰ کرے کہ وہ اس کا بیٹا ہے اور اس نے اس کی والدہ کے ساتھ زنا کیا ہے۔ اور اس کے سوا اس بچے کا دوسرا کوئی دعویٰ دار نہ ہو تو بچہ اس کا وارث قرار پائے گا۔

اس سلسلہ میں سلیمان اس بات سے استدلال کرتے تھے کہ حضرت عمرؓ زمانۂ جاہلیت کی اولاد کا نسب اس شخص کے ساتھ ملحق کر دیا کرتے تھے جو دورِ اسلام میں اس کا مدعی ہوتا تھا۔

مصنف عبدالرزاق[1] میں بروایت عمرو بن شعیب اور سنن ابوداؤد[2] میں بروایت عمرو بن شعیب (عن ابیہ عن جدہ کے اضافہ کے ساتھ) بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا:

بھی یہی ہے۔ عُروہ بن زبیر اور سلیمان بن یسار بھی اسی کے قائل ہیں۔ ان دونوں سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا۔ جو شخص کسی لڑکے کے بارے میں دعویٰ کرے کہ وہ اس کا بیٹا ہے کیونکہ اس نے اس کی والدہ کے ساتھ زنا کیا تھا۔ دوسرا کوئی شخص اس بچے کا مدعی نہ ہو تو وہ زانی کو ہی دیا جائے گا۔ سلیمان نے حضرت عمرؓ کے قول سے استدلال کیا تھا جو آگے آرہا ہے۔ یہ مسلک اگرچہ بڑا قوی اور واضح ہے مگر جمہور نے اسے اختیار نہیں کیا۔ یہ مسلک اس شخص کا ہے جو اس کا اولین قائل ہے، مگر قیاس صحیح سے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں بچے کا باپ دو زنا کرنے والوں (بچے کی ماں اور اس کا زانی باپ) میں سے ایک ہے۔ اگر بچے کا الحاق اس کی ماں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ بچہ اس عورت کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے وارث ٹھہرتے ہیں۔ بچے اور اس کی ماں کے اقارب میں نسب کا اشتراک بھی ہوتا ہے حالانکہ اس عورت نے اس مرد کے ساتھ زنا کیا تھا اور بچہ زنا کی پیداوار ہے، تو پھر اس بچے کا الحاق اس کے والد کے ساتھ کیوں نہ کیا جائے خصوصاً جب کہ دوسرا کوئی اس کا مدعی بھی نہیں ہے۔

یہ محض قیاس آرائی ہے۔ جیسا کہ جُریج نے اس بچے سے دریافت کیا تھا جس کی ماں نے چرواہے کے ساتھ زنا کیا کہ تمھارا باپ کون ہے؟ بچے نے جواب دیا فلاں چرواہا۔ اللہ تعالیٰ نے بچے میں قوتِ گویائی پیدا کر دی تھی جس میں کذب کا احتمال نہیں ہے۔ اگر سوال کیا جائے کہ ابوداؤد نے سنن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اسلام میں زنا کا جواز نہیں۔ جس شخص نے دورِ جاہلیت میں زنا کیا اس کے بچے کا الحاق اس کے ساتھ ہو گیا۔ جس نے (دورِ اسلام میں) زنا سے پیدا شدہ بچے کا دعویٰ کیا تو بچہ نہ اس کا وارث ہوگا اور نہ وہ بچے کا۔

ابن القیم فرماتے ہیں اس حدیث کی سند میں ایک مجہول راوی ہے۔ اس لیے یہ حدیث قابلِ حجت نہیں۔ پھر انھوں نے عمرو بن شعیب کی روایت کردہ حدیث نقل کی ہے۔ یہ حدیث آگے آرہی ہے۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۸۹) بروایت ابن جُریج میں کہا گیا ہے کہ عمرو بن شعیب نے کہا (تا آخر)

[2] ابوداؤد (۲-۲۷۹) کتاب "الطلاق" باب "فی ادّعاء ولد الزنا"

المنذری کہتے ہیں کہ یہ حدیث عمرو بن شعیب سے محمد بن راشد بن مکحول نے روایت کی ہے اور وہ ضعیف ہے۔

"اگر بچے کے والد کی وفات کے بعد اس کا وارث اس کے ساتھ بچے کے الحاق کا مطالبہ کرے تو آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اگر بچے کی والدہ اس کے والد کی مملوکہ تھی۔ اور اس حالت میں اس کے والد نے اس کے ساتھ مجامعت کی تو بچے کا الحاق والد کے ساتھ ہو جائے گا، مگر اسے اپنے باپ کے ورثہ میں سے کچھ نہیں ملے گا، البتہ وہ وارث جس نے اس کے الحاق کا مطالبہ کیا ہے اگر چاہے تو اسے اپنے حصہ میں شریک کر لے۔ ہاں جو ترکہ اس کے الحاق کے بعد تقسیم کیا جائے اس کو اس میں سے حصہ ملے گا۔

مگر یہ کہنا ہوا کہ محمد بن راشد بن مکحول خزاعی دمشقی کو ابن معین، احمد اور نسائی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن معین اس کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں حدیث نبوی میں اسے چنداں مہارت نہ تھی۔ وہ منکر حدیثیں روایت کرتا ہے۔ اسی لیے اس کو متروک الحدیث قرار دیا گیا ہے۔ ابن خراش نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ الساجی کہتے ہیں وہ قدریہ عقائد رکھتا تھا اس لیے محدثین نے اس پر جرح کی ہے۔

مصنف عبدالرزاق کی سند میں ابن جریج ہے۔ ان کا نام عبدالملک بن عبدالعزیز اموی ہے۔ یہ دراصل بنو امیہ کے موالی میں سے ہونے کی وجہ سے اموی کہلاتے ہیں۔ ان کی کنیت ابو الولید اور ابو خالد مکی ہے۔ روم کے رہنے والے ثقہ راوی اور فقیہ تھے البتہ ان میں تدلیس اور ارسال کا عیب پایا جاتا ہے۔ ترمذی نے بخاری سے نقل کیا ہے کہ ابن جریج کا سماع عمرو بن شعیب سے ثابت نہیں ہے۔

اس حدیث کے مفہوم کے متعلق الخطابی کہتے ہیں:

"اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان احکام کا تعلق آغاز اسلام کے ساتھ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عہد جاہلیت میں زنا پیشہ لونڈیاں ہوا کرتی تھیں نیز ان کے مالک بھی ان کے ساتھ مجامعت کیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو بعض اوقات لونڈی کا آقا اور زنا کرنے والا دونوں اس کا دعویٰ کرتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بچے کا الحاق لونڈی کے آقا کے ساتھ فرما دیتے۔ اس لیے کہ لونڈی حرّہ کی طرح "فراش" کا حکم رکھتی ہے۔ اگر آقا مر جاتا اور اس بچے کو اپنے نسب میں شامل نہ کرتا۔ تو اس کے وارث اس کے بعد اس کے الحاق کا دعویٰ کرتے اور بچے کو اس کے ساتھ ملحق کر دیا جاتا۔" دیکھیے "النہایۃ لابن الاثیر" (۴-۲۳۸)

ابن القیم زاد المعاد (۴-۱۲۰) میں لکھتے ہیں:۔

یہ حدیث چند مسائل پر مشتمل ہے:

ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب بچے کو اس کے والد کے ساتھ اس کی وفات کے بعد ملحق کیا جائے اور اس کے الحاق کا دعویٰ اس کے وارثوں نے کیا ہو، تو اس صورت میں اگر بچہ اس لونڈی سے پیدا ہوا ہے جس کے ساتھ مجامعت کرنے والا بوقت جماع اس کا مالک تھا تو اس کا الحاق اس کے مرحوم والد کے ساتھ ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ لونڈی کے متوفی مالک کے وارثوں نے جب اس کے الحاق کا دعویٰ کیا تو اس روز سے اس بچے کو مرحوم کا بیٹا قرار دیا جائے گا۔ اس سے قبل جو ترکہ تقسیم ہو چکا ہے اسے اس میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ اس کے نسب کی تجدید کی گئی ہے اور اس کا نسب فیصلہ کے روز سے ثابت ہوا ہے، لہٰذا قبل ازیں تقسیم شدہ ترکہ میں سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ قبل ازیں اس کا بیٹا ہونا ثابت نہ تھا، البتہ جو ترکہ ہنوز تقسیم نہیں ہوا وہ اس میں سے اپنا حصہ پائے گا۔ اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ جو شخص میراث کی تقسیم سے قبل اسلام لائے تو اسے علماء کے ایک قول کے مطابق وراثت میں سے حصہ ملے گا۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ اور اگر ترکہ کی

حضورؐ نے فیصلہ بھی کیا کہ اگر وہ بچہ ایسی لونڈی کے بطن سے ہو جو اس کے باپ کی مملوکہ نہ تھی یا ایسی آزاد عورت کے بطن سے ہو جس کے ساتھ اس کے والد نے زنا کیا، تو اس بچے کا الحاق اس کے والد کے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔ نہ ہی وہ بچہ اس کا وارث ٹھہرے گا۔ اگرچہ والد جس کے ساتھ بچے کو منسوب کیا جاتا ہے خود بھی اس کا مدعی ہو۔ وہ بچہ زنا کی پیداوار ہے اور اس کے سرپرست اس کی ماں کے اقارب ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی والدہ لونڈی ہو یا آزاد عورت۔ واضح رہے کہ بچہ اس کا ہے جس کی منکوحہ یا لونڈی ہو اور زانی کو پتھر ملیں گے۔

تقسیم کے بعد مشرف باسلام ہو تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔ اس صورت میں تقسیم میراث کے سلسلے میں نسب کا ثبوت اس طرح ہے جیسے مشرف باسلام ہونا۔

جب بچے کا والد جس کے نام سے اس کو پکارا جاتا ہے، بچے کی نفی کر چکا ہو تو اس صورت میں بچے کا الحاق اس کے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وارثوں کے یہاں بچے کے الحاق کا معاملہ متنازع تھا۔ پہلی صورت یہ ہے کہ بچے کے والد کے ورثاء اس کے باپ سے الحاق کا مطالبہ کریں جس کے نام سے اسے پکارا جاتا ہے اور یہ وہ صورت ہے جب وارث بچے کے الحاق کا مطالبہ کریں مگر بچے کا والد اس کی نفی کرتا ہو۔ اس صورت میں والد کے ساتھ بچے کا الحاق ممکن نہیں۔ اس لیے کہ والد اصل ہے اور وارث اس کے جانشین ہیں۔ جب اصل والد بچے کا منکر ہو تو اس کے انکار کے باوجود بچے کا الحاق اس کے ساتھ کیونکر ہو سکتا ہے؟

یہ اس صورت میں ہے جب بچہ کسی کی مملوکہ لونڈی سے پیدا ہوا ہو۔ اگر غیر مملوکہ لونڈی یا آزاد عورت سے پیدا ہوا ہو جس کے ساتھ مرد نے زنا کیا تو اس کا الحاق نہیں ہو سکے گا۔ بچہ وارث بھی نہیں ہو گا۔ اگرچہ مجامعت کرنے والا اس کا دعویٰ بھی کرے۔ اسے ولد الزنا تصور کیا جائے گا خواہ وہ لونڈی کے بطن سے ہو یا آزاد عورت کے۔

یہ اسحاق اور اس کے ہم خیال لوگوں کے خلاف جمہور کی دلیل ہے۔ جمہور کا موقف یہ ہے کہ زانی شخص بچے کا دعویٰ کرے تو بھی بچے کا الحاق اس کے ساتھ نہیں کیا جائے گا۔ نہ ہی بچہ اس کا وارث ٹھہرے گا۔ وہ زنا کی پیداوار ہے اور اس کے سرپرست اس کی ماں کے اقارب ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ آزاد عورت ہو یا لونڈی۔ البتہ اس کے مطابق وراثت کی جو تقسیم اسلام سے پہلے ہو چکی، اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ یہ حدیث ابن اسحاق اور ان کے ہم خیال علماء کی تردید کرتی ہے مگر اس کی سند میں محمد بن راشد ضعیف راوی ہے۔ ہم عمرو بن شعیب کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے حدیث کو معتل قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اگر اس حدیث کی صحت ثابت ہو جائے تو اس پر عمل ناگزیر ہے ورنہ اسحاق اور ان کے ہمنوا اہل علم کے قول پر عمل کیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ علم القیافہ کے اثبات میں

صحیح بخاری[1] اور مسلم[2] میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز میرے یہاں تشریف لائے۔ آپ کا چہرۂ مبارک خوشی سے دمک رہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجزز[3] نے

---

[1] دیکھیے صحیح بخاری کتاب "الفرائض" باب "القائف" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۷۷۰، ۶۷۷۱)

[2] ملاحظہ ہو صحیح مسلم (۲-۱۰۸۱-۱۰۸۲) کتاب "الرضاع" باب "العمل بالحاق القائف الولد" علاوہ ازیں یہ حدیث مندرجہ ذیل کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔

نسائی (۶-۱۸۴) کتاب "الطلاق" باب "القافة"

ترمذی (۴-۴۰۰) ابواب "الولاء والهبة" باب "ما جاء فی القافة" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابوداؤد (۲-۲۸۰) کتاب "الطلاق" باب "فی القافة"

امام نودی شرح مسلم (۱۰-۴۱) میں لکھتے ہیں:-

دورِ جاہلیت میں لوگ حضرت اسامہؓ کے نسب پر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ اس لیے کہ اسامہؓ سیاہ فام تھے اور ان کے والد زیدؓ بن حارثہ سفید فام تھے۔ ابوداؤد نے احمد بن صالح سے یہی بات روایت کی ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں قیافہ شناس کے قول پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ لہٰذا جب اس قیافہ شناس نے باپ بیٹے کی رنگت کے اختلاف کے باوجود نسب کا اثبات کیا تو حضورؐ بہت خوش ہوئے۔ اس لیے کہ آپ لوگوں کو کسی کے نسب پر طعن کرنے کے بارے میں عتاب فرمایا کرتے تھے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ احمد بن صالح کے علاوہ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ زیدؓ بن حارثہ کا رنگ گورا تھا اسامہؓ کی والدہ سیاہ فام تھیں۔ ان کا نام برکہ اور کنیت اُمّ ایمن تھی۔

[3] مُجَزِّز: بضم المیم وفتح الجیم وکسر الزاء مشہور یہی لفظ ہے بعض کے نزدیک یہ لفظ بسکون الحاء المهملة وکسر الراء بعدہا زاء یعنی مُحْرِزٌ ہے۔ یہ مجزز بن اعور بن جعدہ المُدلجی ہے۔ اس کی نسبت مُدلج بن مُرّہ بن عبد مناف بن کنانہ کی طرف کی گئی ہے۔ قاسم بن ثابت نے الدلائل میں موسیٰ بن ہارون سے روایت کیا ہے اور انھوں نے مصعب الزبیری سے کہ اس کا نام مُجزز نہ تھا، بلکہ اس کو مُجزِّز (کاٹنے والا) اس لیے کہا جاتا تھا کہ جب کسی کو قیدی بناتا تو اس کی پیشانی کے بال کاٹ کر اس کو رہا کر دیتا۔

اس کے مشرف باسلام ہونے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ صحابہ پر کتابیں مرتب کرنے والوں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ مثلاً ابن مندہ وغیرہ، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فیصلہ پر جس اعتماد اور مسرت کا اظہار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام لا چکا تھا۔ اور اگر وہ کافر ہوتا تو ایک شرعی معاملہ میں آپ اس پر اعتماد نہ کرتے۔ دیکھیے "الاصابة" (۳-۱۶۵)

ابھی تو زید بن حارثہؓ اور اُسامہ بن زید کو دیکھا۔ دونوں نے اپنا سر چادر سے ڈھانپ رکھا تھا اور پاؤں ننگے تھے۔ اس نے کہا یہ پاؤں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

" اختلاف العلماء " للمروزی میں ہے کہ جو فقط قیافہ کے مطابق فیصلہ کرنے کے قائل ہیں ان میں امام مالک، لیث، اوزاعی،

۱؎ زید بن حارثہؓ:- بنی کلب کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ دورِ جاہلیت میں قید ہوئے۔ پھر حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے خرید لیا۔ حضرت خدیجہ نے انھیں رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ابن اسحاق نے ان کا تذکرہ کیا ہے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کے والد اور چچا مکہ آئے اور انھوں نے فدیہ دے کر ان کو آزاد کروانا چاہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو اختیار دیا کہ اگر جانا چاہیں تو چلے جائیں اور اگر چاہیں میرے یہاں ٹھہریں۔ زیدؓ نے حضورؐ کے یہاں مقیم رہنے کو ترجیح دی۔ ترمذی میں ہے کہ زیدؓ نے کہا یا رسول اللہؐ میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا "۔

زیدؓ غزوہ موتہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

۲؎ **قیافہ کے بارے میں اختلاف مسالک** قیافہ ایک صحیح علم ہے اور نسب کے سلسلے میں اس کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے اگر یہ حدیث اس کے وجوب کی دلیل ہے حضرت انس بن مالک کا یہی مسلک ہے۔ حضرت عمرؓ سے بھی صحیح تر روایت یہی ہے۔ امام مالک، عطاء، اوزاعی، لیث، امام شافعی، احمد اور ابو ثور کا موقف بھی یہی ہے۔

سعید بن منصور عن سفیان، عن سعید بن سلیمان بن لیسار کی سند کے ساتھ حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت کے ساتھ دو آدمیوں نے طہر کی حالت میں مجامعت کی۔ اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔ قیافہ شناس نے فیصلہ کیا کہ بچہ دونوں کا مشترکہ ہے۔ شعبی کہتے ہیں حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ وہ ان دونوں کا بیٹا ہے۔ اور وہ دونوں اس کے باپ ہیں۔ دونوں اس کے وارث ہوں گے۔ اثرم نے سعید بن المسیب سے دو آدمیوں کے بارے میں روایت کی ہے کہ دونوں نے ایک ہی طہر میں ایک عورت کے ساتھ مجامعت کی۔ اس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہوئی اور اس نے ایک بچے کو جنم دیا جس کی شکل و صورت ان دونوں سے ملتی تھی۔ جناب فاروق اعظمؓ کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش کیا گیا۔ آپ نے قیافہ شناسوں کو بلایا۔ انھوں نے دیکھ کر کہا کہ بچے کی شکل دونوں سے ملتی ہے۔ چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ یہ بچہ دونوں کا ہے۔ یہ دونوں کا وارث ہوگا اور دونوں اس کے وارث ہوں گے۔

عبدالرزاق عن معمر عن ایوب سختیانی عن محمد بن سیرین کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی عدالت میں ایک بچے کا مقدمہ پیش کیا گیا۔ ایک عجمی شخص اور ایک عربی دونوں اس کے دعویدار تھے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے قیافہ شناسوں کو بلایا انھوں نے بچے کو دیکھ کر عربی سے کہا آپ ہمیں اس عجمی کی نسبت سے عزیز تر ہیں مگر یہ آپ کا بیٹا نہیں۔ لہٰذا اس بچے کا خیال ترک کر دیں۔ یہ اس کا بیٹا ہے "۔

شافعی، احمد اور اسحٰق کے اسماء گرامی شامل ہیں۔

امام شافعی کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیافہ کو علم قرار دیا ہے اور اس کا انکار نہیں کیا۔ اور اگر یہ غلط ہوتا تو آپ اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے۔ اس لیے کہ قیافہ کی بنا پر پاکدامن خواتین پر اتہام باندھا جاتا ہے اور نسب کی نفی کی جاتی ہے۔

اُصیلی کی کتاب الدلائل میں حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب جب یمن میں تھے تو آپ

اہل کوفہ قیافہ کی بنا پر فیصلہ کرنے کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک بدعت ہے جو شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔ رہی یہ حدیث تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قیافہ کی اساس پر فیصلہ صادر کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت اسامہؓ کا نسب اس سے پہلے ثابت تھا اور اس کے اثبات کے لیے شارع کو کسی کے قول کی ضرورت نہ تھی۔ حضورؐ نے مُجَزِّز کے قیافہ پر اس طرح اظہارِ تعجب و مسرت کیا جس طرح اس آدمی کے ظن پر اظہارِ تعجب کیا جاتا ہے جس کا اندازہ حقیقت سے بالکل ہم آہنگ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس اندازے کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کیا جاتا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیافہ شناس کی بات کی تردید اس لیے ضروری نہ سمجھی کہ وہ اس کے کوئی ایسی بات ثابت نہیں کر رہا تھا جو قبل ازیں ثابت نہ تھی۔ قرآن کریم میں فرمایا :

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (بنی اسرائیل - ۳۶) جس بات کا تمھیں علم نہیں اس کے پیچھے نہ چلو۔

امام بیہقی سے منقول ہے کہ قیافہ سے متعلق حدیث منسوخ ہے لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اصل عدم نسخ ہے اور نسخ ہونے کا دعویٰ دلیل کے بغیر بے کار ہے نہ اس سے مدعی کو فائدہ ہوتا ہے اور نہ مدعا علیہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ دیکھیے العمدۃ للعینی (۱۱-۲۳) اور نیل الاوطار للشوکانی (۶-۳۱۸)

امام ابن حزم نے محلّی (۱۰-۱۴۶) میں تفصیلی دلائل دینے کے بعد ان الفاظ میں حنفیہ کی تردید کی ہے :-

"اس میں شبہ نہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی حجت ہے لہٰذا آپ کبھی ظن کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں فرماتے تھے جیسا کہ حنفیہ نے کہا ہے۔"

امام شوکانی فرماتے ہیں :-

"رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیافہ شناس کے قول پر جس مسرت کا اظہار فرمایا وہ بجائے خود تقریری حدیث کا درجہ رکھتا ہے جس کا انکار مخالف بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر یہ بات شرعاً نا روا ہوتی تو آپ بروقت فرما دیتے کہ یہ جائز نہیں ہے۔"

حافظ ابن القیم نے قیافہ کی بنا پر اثباتِ حکم کے سلسلے میں نہایت عمدہ گفتگو کی ہے۔ دیکھیے زاد المعاد (۲-۱۱۷)

ابن القیم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چار چیزوں کی بنیاد پر نسب کا اثبات ہوتا ہے :

(۱) الفراش (۲) استلحاق (۳) شہادت (۴) قیافہ

وہ فرماتے ہیں کہ پہلی تین باتیں متفق علیہ ہیں۔

۱ یہ واقعہ ابوداؤد (۲-۲۸۱) میں بھی ہے۔ دیکھیے کتاب "الطلاق" باب "من قال بالقرعة اذا تنازعوا فی الولد"۔

کے پاس تین آدمی لائے گئے۔ یہ تینوں ایک بچے کے دعویدار تھے۔ آپ نے ان میں قرعہ اندازی کی اور جس کے نام قرعہ نکلا اس

یحییٰ، عن الاجلح، عن شعبی، عن عبداللہ بن الخلیل، عن زید بن ارقم کی سند کے ساتھ۔ اس روایت میں ہے کہ جب آپؐ نے دو آدمیوں سے کہا کہ تم دونوں اس شخص کو بچہ کی مبارکباد دو، تو دونوں نے شور مچانا شروع کیا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان دونوں نے زبردستی کرنے کی کوشش کی جس پر آپؐ نے فرمایا: تم شرکاء اس میں جھگڑ رہے ہو لہذا میں تمہارے درمیان قرعہ اندازی کروں گا۔"

یہ روایت خشیش بن اصرم، عن عبدالرزاق، عن ثوری، عن صالح ہمدانی، عن شعبی، عن عبد خیر، عن زید بن ارقم کی سند کے ساتھ بھی ہے۔ اس روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپؐ نے ان میں سے دو آدمیوں سے دریافت کیا کہ کیا تم اس شخص کے لیے اس بچے کا اقرار کرتے ہو؟ دونوں نے کہا نہیں۔ حتیٰ کہ آپؐ نے باری باری سب سے یہ سوال کیا۔ آپ جن دو آدمیوں سے بھی یہ سوال کرتے تو وہ انکار کر دیتے۔ چنانچہ آپؐ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی۔

اس کے علاوہ یہ روایت عبداللہ بن معاذ عن ابیہ، عن شعبہ، عن سلمہ، عن شعبی، عن خلیل، یا ابن الخلیل کی سند کے ساتھ بھی ہے۔ اس میں قسم کا ذکر نہیں اور نہ حضورؐ کے اس ارشاد کا کہ "تم دونوں اس شخص کو بیٹے کی مبارکباد دو"۔

ابن ماجہ (۲-۷۸۶) نے یہ عبدالرزاق کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ امام احمدؒ نے بھی مسند (۴-۳۷۴) میں یہ حدیث عبدالرزاق، عن سفیان عن اجلح کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

المنذری مختصر ابی داؤد (۳-۱۷۸) میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے۔ بعض محدثین نے یہ مرسلاً روایت کی ہے۔ نسائی کہتے ہیں اس کا مرسل ہونا اقرب الی الصواب ہے۔" المنذری مزید لکھتے ہیں:

" الخطابی کہتے ہیں کہ بعض محدثین نے زید بن ارقم سے مروی حدیث پر نقد و جرح کی ہے ہو سکتا ہے کہ اس سے الخطابی کی مراد عبداللہ بن الخلیل سے مروی حدیث ہو۔ جہاں تک عبد خیر سے مروی حدیث کا تعلق ہے اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مگر اس کا مرسل ہونا اقرب الی الصواب ہے۔ واللہ اعلم۔" (المنذری کا کلام ختم ہوا)

احمد شاکر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں اور اس کے مرسل ہونے کے قول کے راجح ہونے کے بارے میں المنذری کا دعویٰ بلا دلیل ہے اور مرفوع ہونا زیادہ ثقہ ہے۔ پھر المنذری نے اس حدیث کے مرسل ہونے کی سند بھی ذکر نہیں کی کہ ہم دیکھتے کہ دونوں سندوں میں کون سی سند زیادہ قوی ہے مزید برآں یہ حدیث جو اس سند کے ساتھ روایت کی گئی ہے سابق الذکر حدیث کی مؤید ہے اور یہ بات کافی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ احمد شاکر نے اس ضمن میں ابن حزم کی پیروی کی ہے۔ ابن حزم فرماتے ہیں:

" اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی سند میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ کیونکہ شعبہ نے اسے بطریق سلمہ بن کہیل، عن شعبی، عن مجہول مرسلاً روایت کیا ہے۔ اور ابو اسحاق شیبانی نے اسے شعبی پر موقوف کیا ایک شخص سے، اور اس نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ سفیان نے یہ حدیث متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اور سفیان، شعبہ سے کم درجہ کا راوی نہیں ہے۔ سفیان اس حدیث کو بروایت صالح بن حی، عن عبد خیر، عن زید بن ارقم روایت کرتے ہیں اور یہ

کو بچہ دے دیا اور کہا کہ اپنے دونوں ساتھیوں کو دو تہائی دیت کے برابر ادائیگی کر دو۔ زید بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کو حضرت علیؓ کا فیصلہ بتایا تو آپ اس قدر ہنسے کہ آپؐ کے دانت نظر آنے لگے۔

یہ واقعہ ابو داؤد میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

محمد بن نصر المروزی کی کتاب میں بروایت یحییٰ بن ابی کثیر، عن عکرمہ، عن ابن عباس منقول ہے کہ ایک مکاتب دو غلام

سب راوی ثقہ ہیں۔ دیکھیے المحلی (۱۱-۳۰۴)

حاکم المستدرک (۲-۲۰۷) میں یہ حدیث روایت کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بخاری و مسلم دونوں اجلح بن عبد اللہ الکندی کی روایت کردہ حدیث کو حجت نہ ماننے کے بارے میں متفق ہیں۔ دونوں نے اس پر عبد اللہ بن بریدہ سے مروی حدیث کی بنا پر گرفت کی ہے لیکن تین ثقہ راویوں نے اس حدیث کی تائید کی ہے اس لیے یہ حدیث صحیح ہے۔ اگرچہ شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ذہبی نے بھی حاکم کی تائید کی ہے۔

حافظ ابن القیمؒ "تہذیب السنن" (۳-۱۷۸) میں لکھتے ہیں:۔

یہ حدیث دو باتوں پر مشتمل ہے: ایک یہ کہ جب بچے کی ولدیت کے بارے میں نزاع پایا جائے اس کے الحاق کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔ اسحاق بن راہویہ کا یہی مسلک ہے۔ بچے کے دعویٰ میں وہ اس کو سنت قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی کا قدیم مسلک بھی یہی ہے۔ امام احمد اور مالک کے نزدیک قیافہ شناسی پر مشتمل حدیث اس سے مقدم ہے۔ جب امام احمد سے زید بن ارقمؓ سے مروی اس حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے قیافہ سے متعلق حدیث زیادہ محبوب ہے۔ امام ابو حنیفہ قیافہ اور قرعہ سے متعلق کسی حدیث کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

اس حدیث میں دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص پر جو دو تہائی دیت کا ادا کرنا واجب ٹھہرایا گیا جس کے حق میں بچے کا قرعہ نکلا تھا تو یہ بات بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے اپنے استاد (شیخ الاسلام ابن تیمیہ) سے اس ضمن میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس کی ایک خاص وجہ ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ لیکن الحمیدی شیخ نے یہ حدیث اپنے مسند میں دوسرے الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے جس سے اشکال کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ الحمیدی کہتے ہیں کہ جس کے حق میں بچے کا قرعہ نکلا تھا اسے کہا گیا کہ اپنے دو ساتھیوں کو لونڈی کی دو تہائی قیمت ادا کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس شخص کے ساتھ بچے کا الحاق کیا گیا تو لونڈی اس کی اُمِ ولد ٹھہری۔ جبکہ اس سے پہلے وہ ایک تہائی لونڈی کا مالک تھا، لہٰذا وہ لونڈی کی دو تہائی قیمت بطور تاوان اپنے دو ساتھیوں کو ادا کرے گا کیونکہ اب وہ ان کی لونڈی نہیں رہی۔ غالباً یہی الفاظ صحیح ہیں۔ بچے کی دو تہائی دیت کا ذکر راوی کا وہم ہے۔ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ لونڈی کی قیمت کو دیت سے تعبیر کیا گیا ہو۔ اس لیے کہ یہ دراصل وہ قیمت ہے جو اس کی دیت کے طور پر ادا کی جاتی ہے اس لیے دونوں میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔" (ابن القیم کا کلام ختم ہوا)

احمد شاکر کو یہ تاویل پسند نہیں آئی۔ اس لیے انھوں نے ایک اور توجیہ کی اور آخر میں وہ کہتے ہیں کہ بہر کیف جو بھی صورت ہو لیکن "سنت صحیحہ سے جو حکم بھی ثابت ہو ہمیں اسے قبول کرنا چاہیے اگرچہ اس کی حکمت و مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئے۔"

یہ تبصرہ قابلِ تحسین ہے اور تمام شرعی احکام میں جن کی حکمت و مصلحت ہماری سمجھ سے بالاتر ہو ہمیں اسی بنیاد کو معمول بہ بنانا چاہیے۔

جس نے اپنے مالک سے معاہدہ کر رکھا ہو کہ اتنی رقم دے کر آزاد ہو جائے گا) قتل ہو گیا۔ اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ جس قدر وہ آزاد ہو چکا ہے اس قدر اس کی دیت آزاد آدمی کے برابر ادا کی جائے گی۔[1]

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مکاتب پر غلام کی حد قائم کی جائے گی۔

حماد بن زید، ایوب سے روایت کرتے ہیں اور وہ عکرمہ سے کہ عہدِ رسالت میں ایک مکاتب قتل ہو گیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جس قدر وہ آزاد ہو چکا ہو اس قدر اس کی دیت آزاد آدمی کے برابر ادا کی جائے اور جس قدر وہ غلام رہ گیا ہو اس قدر اس کی دیت غلام کی دیت کے برابر ادا کی جائے۔

ابوداؤدؒ میں بھی یہ حدیث اسی طرح روایت کی گئی ہے۔[2]

محمد بن نصر المروزی کی کتاب میں بروایت سفیان بن عیینہ، عن عمرو بن دینار، عن عوسجہ، عن عبداللہ بن عباس منقول ہے کہ عہدِ رسالت میں ایک شخص فوت ہو گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا کوئی وارث نہ ملا۔ صرف ایک غلام تھا جس کو اس شخص نے آزاد کیا تھا۔ آپؐ نے اس کا ترکہ اس غلام کو دے دیا۔[3]

---

[1] نسائی (۸-۴۵) کتاب "القسامة" باب "دية المكاتب" بروایت یحییٰ، عن عکرمہ، عن عبداللہ بن عباس۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:
"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکاتب کے بارے میں فیصلہ کیا اگر وہ قتل ہو جائے تو جتنا وہ آزاد ہو چکا ہو اس قدر اس کی دیت آزاد کی دیت کے مطابق ادا کی جائے۔"

ابوداؤد (۴-۱۹۴) کتاب "الديات" باب "في دية المكاتب"۔

المنذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔ الخطابی "معالم السنن" (۶-۳،۴) میں لکھتے ہیں:

"عام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مکاتب پر جب تک ایک درہم بھی واجب الادا ہے وہ غلام ہے اور اس پر غلام کے احکام نافذ ہوں گے چاہے اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو یا دوسرے نے اس کے خلاف جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ ہمارے علم کی حد تک اہل علم میں سے صرف نخعی نے اس حدیث کو اختیار کیا ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی اس ضمن میں ایک روایت منقول ہے۔ لیکن حدیث کی صحت ثابت ہو جائے اور وہ منسوخ نہ ہوا ور نہ ہی کسی صحیح تر حدیث کی معارض ہو تو اس پر عمل واجب ہوتا ہے۔"

[2] المنذری مختصر ابی داؤد (۶-۴،۳) میں فرماتے ہیں کہ نسائی نے یہ مرفوعاً و مرسلاً دونوں طرح روایت کی ہے لیکن جس مرسل کی طرف المنذری نے اشارہ کیا ہے وہ مجھے نہیں ملی ہے ممکن ہے وہ "السنن الکبریٰ" میں ہو۔

[3] دیکھیے ترمذی، ابواب "الفرائض" باب "میراث المولیٰ" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اہل علم کا طرزِ عمل اس مسئلہ میں یہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کے ترکہ کو بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث مسند خرجی کتب حدیث میں بھی ہے۔

ابوداؤد (۳-۲۳۴) کتاب "الفرائض" باب "میراث ذوی الارحام"۔

ابن ماجہ (۲-۹۱۵)۔ ابوداؤد الطیالسی "منحة المعبود" (۱-۲۸۵)

یہ تمام محدثین اس حدیث کا ذکر بروایت عوسجہ مولیٰ ابن عباس کرتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس حدیث کے بارے میں محدثین کے ہاں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ حدیث نبوی الولاء لمن اعتق ہے۔ یعنی آزاد کردہ غلام کی میراث (کوئی وارث نہ ہونے کی صورت میں) اس شخص کی ہے جس نے اس کو آزاد کیا ہے۔ جبکہ بعض دوسرے اہل علم یہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کی صورت یہ ہوئی ہوگی کہ آزاد شدہ غلام نے بعد میں اپنے آزاد کرنے والے کے والد کو خرید کر آزاد کر دیا ہوگا جس کی وجہ سے اس کی حیثیت آزاد کردہ غلام کے بجائے آزاد کرنے والے کی ہو گی۔ (لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ترکہ کا مستحق قرار دے دیا)۔

عبدالرزاق، ابن جریج سے اور وہ عمرو بن دینار سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص مر گیا۔ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس کا وارث تلاش کرو۔" مگر کوئی وارث نہ ملا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ترکہ ایک ایسے شخص کو دے دیا جسے ایک شخص نے اپنی موت کے بعد آزاد قرار دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے بھی اسی کے مطابق فیصلہ کیا تھا۔

سلیمان بن یسار سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حبشہ کے رہنے والے ایک شخص کا ترکہ لایا گیا جس کا کوئی وارث نہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا "حبشہ کے جو مسلمان یہاں رہتے ہیں ان کو دیکھو اور اس کا ترکہ ان کو دے دو۔"[۱]

حافظ ابن حجر "التقریب" (۲-۸۹) میں لکھتے ہیں:-

"عَوْسَجَۃ بفتح العین وسکون الواو وفتح السین والجیم مولی ابن عباس مشہور راوی نہیں ہے۔ چوتھے درجے کے راویوں میں سے تھا۔ امام بخاری اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ عمرو بن دینار نے اس سے روایت کی ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ابوحاتم رازی کہتے ہیں کہ عوسجہ مشہور نہیں ہے۔ نسائی کہتے ہیں کہ عمرو بن دینار کے سوا کسی نے اس سے روایت نہیں کی۔ ابوزرعہ نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔

یہ حدیث امام احمد نے مسند (۱-۲۲۱) میں اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

یہ حدیث المستدرک للحاکم (۴-۳۴۶) میں عکرمہ عن ابن عباس کی سند کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری ومسلم کی شرط کے مطابق ہے۔ مگر دونوں نے اس کو روایت نہیں کیا البتہ حماد بن سلمہ اور سفیان بن عُیَینہ نے یہ حدیث بطریق عمرو بن دینار عن عوسجہ عن ابن عباسؓ روایت کی ہے۔ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے اور پھر حماد بن سلمہ اور سفیان بن عُیَینہ کی روایت نقل کی ہے۔

بیہقی (۶-۲۴۲) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:-

"بعض راویوں نے یہ حدیث بطریق عمرو بن دینار، عن عکرمہ عن ابن عباس روایت کی ہے۔ مگر یہ سند بلاشک وشبہ غلط ہے۔"

[۱] ابوداؤد (۳-۱۲۴) میں اس سے ملتی جلتی ایک دوسری روایت کتاب "المیراث" باب فی میراث ذوی الارحام" میں موجود ہے۔ ابوداؤد نے عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس قبیلہ ازد کے ایک آدمی کا ترکہ ہے۔ اور مجھے کوئی ازدی آدمی نہیں ملتا جسے میں یہ ترکہ سونپ دوں۔ آپؐ نے فرمایا "جاؤ اور ایک سال تک قبیلہ ازد کا کوئی آدمی تلاش کرو۔" وہ شخص ایک سال کے بعد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "یا رسول اللہ! مجھے کوئی ازدی آدمی نہیں ملا جسے میں یہ ترکہ تفویض کر دوں۔" آپؐ نے فرمایا۔ جاؤ اور قبیلہ خزاعہ کا پہلا شخص جو تم سے ملے اسے یہ ترکہ دے دو۔" جب یہ شخص پیٹھ پھیر کر چل دیا تو آپؐ نے فرمایا "اس شخص کو میرے پاس بلاؤ۔" جب وہ آیا تو آپؐ نے فرمایا۔ قبیلہ خزاعہ میں سے بڑی عمر کا آدمی دیکھو اور اسے یہ ترکہ دے دو۔"

اس کی سند میں جبریل بن احمد ہے جو ضعیف راوی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مصنف عبدالرزاق میں عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ دورِ جاہلیت میں جو شخص حلف اٹھا کر کسی کا حلیف بنا اسلام کے بعد بھی وہ اس پر قائم رہے گا۔ وہ اپنے حلیف کی دیت میں سے اپنا حصہ ادا کرے گا۔ اس کی میراث اس کے عصبات کو ملے گی وہ جو بھی ہوں۔ اسلام میں حلیف بننے کا طریقہ نہیں، البتہ دورِ جاہلیت کے حلف پر قائم رہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام میں اس کو اور مضبوط کر دیا ہے۔[۲]

یہاں مصنف[۳] نے "میراث ذوی الارحام" کا عنوان قائم کیا ہے۔

عبدالرزاق[۴] بطریق ابن جُریج، عن عبدالکریم روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میرا والد مجھ سے مال طلب کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: "سے دے دو۔ اس نے کہا" میرا باپ چاہتا ہے کہ میں اس کے حق میں اپنے مال سے دست بردار ہو جاؤں "آپ نے فرمایا: تم دست بردار ہو جاؤ"۔

راوی نے کہا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

"اپنے والدین کی نافرمانی نہ کر۔ اگر وہ تجھ سے مطالبہ کریں کہ تو ان کے حق میں اپنی جائداد سے دست بردار ہو جائے تو اُن کے حق میں دست بردار ہو جا"

مصنف عبدالرزاق میں ابن جریج سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی حسین کو یہ کہتے سنا کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک شخص نے اپنے والد کا مقدمہ پیش کیا[۵]۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اور تمھارا مال تمھارے والد کا ہے" پھر

بیہقی نے (۶-۲۴۴) یہ حدیث اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے اور لکھا ہے کہ جبریل بن احمد سے مراد ابوبکر الاحمری ہے۔

ابوداؤد طیالسی نے یہ حدیث اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ دیکھیے منحۃ المعبود (۱-۲۸۵)

[۱] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۱۰-۳۰۷) بروایت ابن جُریج، عن عمرو بن شعیب۔ یہ منقطع روایت ہے۔ اس لیے کہ ابن جریج کا سماع عمرو بن شعیب سے ثابت نہیں ہے۔

[۲] پوری حدیث یوں ہے۔ عمرو کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ جو شخص کسی قوم کا حلیف ہو یا ان کا ایک فرد تصوّر کیا جاتا ہو۔ وہ لوگ اس کی طرف سے دیت ادا کرتے اور اس کے ساتھ تعاون کرتے ہوں تو اس کا ورثہ ان کو ملے گا۔ بشرطیکہ اس کا کوئی وارث معلوم نہ ہو۔

[۳] یہ جملہ کسی کے نسخہ میں موجود نہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ یہاں سے ذوی الارحام کی میراث سے متعلق احکام کا آغاز ہو گا۔ مصنف نے حسبِ عادت یہاں جلی قلم سے باب کا عنوان قائم نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ جگہ کی تنگی ہے۔

[۴] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۹-۱۳۲) اس کی سند منقطع ہے۔ اس کی تخریج آگے آ رہی ہے۔

[۵] عبدالکریم ابن مالک الجزری ابوسعید مولی بنی امیہ شیخ ابن جریج چھٹے درجے کا ثقہ راوی ہے۔

[۶] ابوداؤد (۳-۲۸۹) کتاب "البیوع" باب "فی الرجل یاکل من مال ولدہ" بروایت عمرو بن شعیب وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میرا والد میرے مال کو برباد کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"تم اور تیرا مال سب کچھ تیرے والد کا ہے۔ تمھاری اولاد تمھاری پاکیزہ کمائی ہیں، لہٰذا اپنی اولاد کی کمائی سے کھا لیا کرو" (باقی اگلے صفحہ پر)

فرمایا اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ اگر یہ تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو مجھے بتانا میں تمہاری مدد کروں گا۔[ا]

ابن ماجہ نے (۲-۷۶۹) بروایت محمد بن المنکدر، عن جابر بن عبداللہ اسی طرح نقل کیا ہے۔ المنذری مختصر ابی داؤد میں کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کے متعلق اس سے پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ ابن ماجہ کی روایت کے بارے وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں، البوصیری کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام بخاری کی شرائط پر پوری اترتی ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ الطبرانی نے "المعجم الصغیر" میں یہ دوسری سند کے ساتھ تفصیل سے روایت کی ہے۔ اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایک حدیث مروی ہے جو ابن حبان نے بطریق عبداللہ بن کیسان عن عطاء عن عائشہ رضی اللہ روایت کی ہے۔ مزید براں یہ حدیث حضرت سمرہ سے بھی منقول ہے۔ جیسے البزار، الطبرانی اور عقیلی نے عبداللہ بن اسماعیل تعارف میں روایت کیا ہے۔ نیز یہ حدیث حضرت عمرؓ سے بھی منقول ہے جسے البزار، اور ابن عدی نے الکامل میں سعید بن بشیر کے تعارف میں نقل کیا ہے نیز الکامل، المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں یہ حدیث عبداللہ بن مسعود سے روایت کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ابو یعلیٰ اور البزار دو مختلف سندوں کے ساتھ یہ حدیث عبداللہ بن عمر سے بھی روایت کی ہے۔ دیکھیے الدرایۃ (۲-۱۰۲)۔

ان شواہد کی بنا پر یہ حدیث الصحیح لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔

فقہ الحدیث :- اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکا مالدار ہو تو اس پر والدین کا نفقہ واجب ہے۔ امام شافعی کہتے کہ باپ کا نفقہ اس صورت میں لڑکے پر واجب ہوگا۔ جب کہ باپ تنگدست، اپاہج یا معذور ہو۔ اگر وہ مالدار ہو یا صحت مند اور معذور نہ ہو تو اس کا نفقہ بیٹے پر واجب نہیں۔ باقی فقہاء کے نزدیک والدین کا نفقہ بیٹے پر ہر حال میں واجب ہے۔ امام شافعی نے جو شرط کی ہے وہ کسی دوسرے فقیہہ نے نہیں لگائی۔ (الخطابی)

ذوی الارحام کی میراث کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مصنف عبدالرزاق[1] میں بروایت معمر، عن زید بن اسلم منقول ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ! ایک شخص فوت ہو گیا۔ اس نے ایک خالہ اور ایک پھوپھی پیچھے چھوڑی ہے۔ (ان کو اس شخص کے ترکہ سے کیا ملے گا؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بار بار "پھوپھی اور خالہ، پھوپھی اور خالہ" کے الفاظ دہراتے رہے۔ آپؐ اس ضمن میں نزول وحی کے منتظر تھے۔ جب وحی نازل نہ ہوئی تو آپؐ نے فرمایا "مجھ پر ان کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا"

ایک دوسری روایت میں صفوان بن سُلیم سے منقول ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:
"یا رسول اللہ! ایک آدمی نے اپنے پیچھے ایک پھوپھی اور ایک خالہ چھوڑی ہے، انھیں کیا ملے گا؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اے اللہ! ایک آدمی نے اپنے پیچھے ایک پھوپھی اور ایک خالہ چھوڑی"۔ اس سے زیادہ آپؐ نے کچھ نہ فرمایا۔

---

[1] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۱۸) سنن بیہقی (۶-۲۱۲) بروایت زید بن اسلم عن عطاء بن یسار۔

دارقطنی (۴-۹۸) بطریق الدراوردی، عن زید بن اسلم، عن عطاء بن یسار۔

ابوداؤد فی المراسیل ص ۲۹ - حاکم نے المستدرک (۴-۳۴۳) میں ابوسعید کے تعارف کے سلسلے میں متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ "التلخیص الحبیر" (۳-۸۱) میں لکھتے ہیں:-

اس حدیث کی سند میں ضعف پایا جاتا ہے۔ الطبرانی نے "المعجم المصغیر" میں یہ حدیث محمد بن حارث المخزومی کے تعارف میں ابوسعید کی متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس کے سوا اس کی سند میں دوسرا کوئی راوی ایسا نہیں ہے جس پر نقد و جرح کی گئی ہو۔ دارقطنی نے یہ ابوسلمہ عن ابوہریرہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مسعدہ بن الیسع الباہلی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ جو اس کو محمد بن عمر سے روایت کرتا ہے۔ حاکم اس کو بروایت عبداللہ بن دینار، عن عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ روایت صحیح ہے۔ البتہ اس کی سند میں عبداللہ بن جعفر المدینی ہے جو کہ ضعیف راوی ہے۔ حاکم نے اس کی مؤید ایک حدیث بطریق شریک بن عبداللہ بن ابی نمر، عن حارث بن عبد روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ اس کے بعد یہ حدیث ذکر کی گئی ہے لیکن اس کی سند میں سلیمان بن داؤد شاذکونی ہے جو کہ متروک الحدیث ہے۔ دارقطنی نے یہ حدیث ایک دوسری سند کے ساتھ شریک سے مرسلاً روایت کی ہے؟ (حافظ ابن حجر کا بیان ختم ہوا)۔

اس بیان سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ حدیث کسی معتمد سند سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی بلکہ یہ ایک مرسل روایت ہے۔ دارقطنی پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے۔

آخر میں فرمایا "انھیں کچھ نہیں ملے گا۔"

ایک دوسری روایت میں معمر، ابن طاؤس کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ میں نے مدینہ میں سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کا کوئی مولیٰ نہ ہو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس کے مولیٰ (دوست، سرپرست) ہیں۔ اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث ہے۔" [1] عمرو بن شعیب اس حدیث کو اپنے والد سے، وہ اپنے والد سے اور وہ نبی کریم سے روایت کرتے ہیں۔

السہیلی کی "الدلائل" میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پھوپھی اور خالہ کی وراثت کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ اس وقت آپ اونٹ پر سوار ہو کر بنی عمرو بن عوف کے قبیلے کی طرف جا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "اونٹ کو ٹھہراؤ" پھر آپؐ نے سر اٹھا کر فرمایا "اے اللہ! ایک شخص مر گیا اور اس نے اپنے پیچھے ایک پھوپھی اور ایک خالہ چھوڑی (ان کو کتنا حصہ ملے گا؟)"

دوسری مرتبہ فرمایا "سائل کہاں ہے؟ ان کو کچھ نہیں ملے گا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ سے دریافت کیا گیا تو تھوڑی دیر تک آپ چلتے رہے پھر فرمایا:

"جبریل علیہ السلام نے مجھے بتایا کہ ان دونوں کو میراث میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔" [2]

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۱۰ - ۲۸۵) یہ سند منقطع ہے۔ ابن جریج کی روایت میں ہے کہ ابن طاؤس نے یہ حدیث ایک صادق القول آدمی سے سنی اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ ایک روایت ہی یوں ہے کہ ابن جریج نے اس کو عمرو بن مسلم، عن طاؤس، عن عائشہ صدیقہ کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اس کو مرفوعاً روایت نہیں کیا۔ البتہ ترمذی نے یہ حدیث مرفوعاً روایت کی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ مگر عمرو شعیب عن ابیہ عن جدہ کی مرفوع روایت مجھے نہیں مل سکی۔

[2] ذوی الارحام کو ورثہ دینے کے سلسلے میں علماء کے کئی مسلک ہیں۔ ذوی الارحام سے ایسے اقارب مراد ہیں جن کے نہ تو وراثت میں باقاعدہ حصے مقرر ہوں اور نہ حیثیت "عصبہ" ہونے کی وجہ سے وراثت میں سے حصہ مل سکتا ہو، اور "عمدۃ کل فارض" (۲ - ۱۵) میں ہے کہ ذوی الارحام ایسے اقارب کو کہتے ہیں جن کا ترکہ میں سے نہ تو حصہ مقرر ہو اور نہ ہی وہ عصبہ ہونے کی وجہ سے حصہ لے سکتے ہوں، اس کتاب کے شارح لکھتے ہیں کہ ان سے مراد وہ سب اقارب ہیں جو ان پچیس اقارب میں شامل نہیں، جن کے وراثت میں حصہ دار ہونے پر اجماع ہے اور یہ غیر وارث گیارہ قسم کے ہیں جن میں پھوپھی اور خالہ بھی شامل ہیں۔

اکثر صحابہ مثلاً حضرات عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، ابوعبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، اور ایک روایت کے مطابق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین ذوی الارحام کو ورثہ دینے کے قائل تھے بشرطیکہ خاوند بیوی کے سوا دوسرے اصحاب الفرائض اور عصبات موجود نہ ہوں۔ شریح، عمر بن عبدالعزیز، عطاء، علقمہ، ابن سیرین، مجاہد اور مسروق کا بھی یہی موقف ہے۔ ائمہ میں سے امام ابوحنیفہ، احمد بن حنبل اور آخری قول کے مطابق امام شافعی بھی اسی کے قائل ہیں۔

وہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ (الانفال - ۷۵)	اللہ کی کتاب میں ذو الارحام ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

(بقیہ حاشیہ)

ابن قدامہ (۶ - ۲۸۲) اور شارح عمدۃ الفارض (۲ - ۱۷) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱- آغاز اسلام میں حلف کی بنا پر وراثت حاصل کیا جاتا تھا۔ ایک شخص دوسرے سے کہتا: "میرا خون تیرا خون اور میرا مال تیرا مال ہے۔ تو میری مدد کرے گا میں تیری مدد کروں گا۔ میں تیرا وارث ہوں گا تو میرا وارث ہوگا" پھر حلف کے ذریعے اس معاہدے کو پختہ کر دیتے۔ اور اسی حلف کی بنا پر ورثہ تقسیم کیا جاتا قرابت داری کی اساس پر نہیں۔

اسی ضمن میں قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ (النساء ۳۳) اور جن لوگوں سے تم عہد کر چکے ہو ان کو ان کا حصہ دو۔

پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا اور ہجرت اور اسلام کو وارث ہونے کی اساس قرار دیا گیا۔

اگر کسی شخص کا بیٹا ہوتا اور وہ ہجرت نہ کرتا تو مہاجرین اس کے وارث قرار پاتے اور اس کا لڑکا وراثت سے محروم رہتا۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔ (الانفال ۷۲)

اور جو لوگ ایمان لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم سے اور ان کے درمیان "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بعد ازاں مندرجہ ذیل آیت نے اس کو منسوخ کر دیا:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ (الانفال ۷۵)

اور رشتہ دار خدا کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ سہل بن حنیف سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے کو تیر مارا اور اسے قتل کر دیا۔ مقتول کے پیچھے صرف اس کا ماموں باقی رہ گیا تھا۔ ابو عبیدہ ابن الجراح نے اس ضمن میں حضرت عمرؓ کو لکھا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو ماموں اس کا وارث ہے۔

ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔

ابوداؤد (۳ - ۱۲۳) میں ہے کہ حضرت مقداد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جس کا کوئی وارث نہ ہو ماموں اس کا وارث ہے۔ وہ اس کی دیت بھی ادا کرے گا اور اس کا ورثہ بھی پائے گا۔

۲- اس ضمن میں دوسرا مسلک یہ ہے کہ ذوی الارحام کو ورثہ نہ دیا جائے اور ترکہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ زید بن ثابتؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا یہی مسلک ہے۔ سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، امام مالک، اوزاعی، ابوثور، داؤد اور ابن جریر کی رائے بھی یہی ہے۔ ابن حزم لکھتے ہیں:

"ماموں کی وراثت کے بارے میں کوئی صحیح نص وارد نہیں ہوئی۔ جب ذوی الفرائض کے حصے ادا کرنے کے بعد کچھ ترکہ بچ رہے۔ اور عصبات میں سے بھی کوئی موجود نہ ہو۔ آزاد کرنے والا (معتق) بھی نہ ہو اور کوئی ایسا شخص بھی نہ ہو جو بحیثیت عصبہ یا معتق بھی ہو تو باقی ماندہ ترکہ اہل اسلام

(بقیہ حاشیہ)

کے مصالح پر صرف کی جائے۔ اس میں دوبارہ نہ تو ذوی الفروض کو کچھ دیا جائے نہ ہی ذوی الارحام کو۔ اس لیے کہ یہ بات کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت نہیں ہے۔ اگر ذوی الارحام تنگدست ہوں تو ان کی ضرورت کے مطابق ان کو دیا جائے۔ اور باقی رقم مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کی جائے۔

محلّی ابن حزم (۹-۳۱۶)

چونکہ پھوپھی اور بھائی کی بیٹی اپنے اپنے بھائی کی موجودگی میں ورثہ نہیں پاتیں اس لیے تنہا ہونے کی صورت میں بھی اجنبی عورت کی طرح ان کو ورثہ نہیں دیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھائی کے ان کے ساتھ مل جانے سے ان کو تائید و تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پوتیاں اور علاتی بہنیں اپنے بھائیوں کی موجودگی میں عصبہ بن جاتی ہیں۔ بیٹیوں اور حقیقی بہنوں کو ان کے مقررہ حصص ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ جائے وہ ان کو ملتا ہے لیکن تنہا ہونے کی صورت میں ان کو ورثہ نہیں دیا جاتا۔ جب یہ دونوں (پھوپھی اور بھائی کی بیٹی) اپنے بھائیوں کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتیں تو ان کی عدم موجودگی میں بالاولیٰ وارث نہیں ہوں گی۔ نیز اس لیے کہ وراثت کا اثبات نص کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ان کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان دونوں کو میراث نہیں ملے گی۔

جو اہل علم ذوی الارحام کے وارث ہونے کے قائل ہیں وہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ذوی الفروض اور عصبات کی موجودگی میں ان کو حصہ نہیں ملے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ ماموں تب وارث ہوگا جب کوئی اور وارث نہ ہو۔ جو اہل علم ذوی الارحام کے وارث ہونے کے قائل ہیں، وہ اس ضمن میں مختلف الرائے ہیں کہ ذوی الارحام کو ورثہ کس معیار کے مطابق دیا جائے۔ اس میں تین مسلک پائے جاتے ہیں:

۱۔ **مذھب اھل التنزیل**:۔ ان کے نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ ذوی الارحام میں سے ہر ایک کو اصل وارثوں میں سے اس وارث کی سطح پر رکھا جائے جس سے اس کا قریب ترین رشتہ ہے اور پھر اسی کا مقررہ حصہ دیا جائے۔ امام احمد، علقمہ، مسروق، شعبی، نخعی، حماد، نُعیم، شریک، ابن ابی لیلیٰ، ثوری اور دیگر اہل علم کا یہی موقف ہے۔

۲۔ **مذھب اھل الرحم**:۔ ان کی رائے یہ ہے کہ تمام ذوی الارحام کو یکساں ورثہ دیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ قریب ہوں یا بعید، مرد ہوں یا عورت۔ یہ نوح بن دراج کا مسلک ہے جو کہ متروک ہے۔ "عمدۃ الفارض" کے مصنف نے اپنی کتاب (۲-۱۸۰) میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

۳۔ **مذھب اھل القرابۃ**:۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ عصبات کو اقرب فالاقرب کے اصول پر ترتیب دیا جائے۔ مثلاً پہلے میت کی اولاد کی اولاد نیچے تک۔ پھر دونوں والدین یا ایک کی اولاد نیچے تک۔ پھر دادا و نانا کی اولاد نیچے تک۔ امام ابو حنیفہ سے مشہور روایت یہی ہے۔

امام احمد سے بھی ایک روایت کے مطابق یہی منقول ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا

ابو محمد بن ابی زید کہتے ہیں کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق قاتل قتل کی بنا پر وراثت سے محروم ہو جاتا ہے، سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ مریض جب مرض الموت میں بیوی کو طلاق دے دے تو اس کی بیوی میراث پانے سے محروم نہ ہو۔ (اس لیے کہ جس طرح قاتل مقتول کی وراثت کو ناجائز طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے، مرض الموت کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دینے والا شخص بھی اسے ناجائز طور پر اپنی وراثت سے محروم کرنا چاہتا ہے) عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قاتل کو میراث میں سے کچھ نہیں ملے گا۔

لہ ابوداؤد (۴- ۱۸۹) کتاب "الدیات" باب "دیات الاعضاء" ابوداؤد کہتے ہیں میں نے شیبان کی کتاب میں یہ روایت دیکھی تھی۔ میں نے براہ راست اس سے سُنی نہیں۔ ہمارے ایک ثقہ ساتھی ابوبکر نے اس کا شیبان عن محمد بن راشد عن سلیمان بن موسیٰ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ ذکر کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قاتل کو کچھ نہیں ملے گا اگر مقتول کا کوئی قریبی وارث نہ ہو تو اس کے وارث دوسرے رشتہ دار ہو جائیں گے مگر قاتل کو کچھ نہیں ملے گا۔"

المنذری کہتے ہیں کہ نسائی اور ابن ماجہ نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس کی سند میں محمد بن راشد الدمشقی المکحولی ہے جس کو بعض لوگ ثقہ قرار دیتے اور بعض اس پر نقد و جرح کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں اس سے پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔

بیہقی (۲۲۰-۶) نے یہ حدیث دو طریقوں سے روایت کی ہے ایک کی سند میں اسماعیل بن عیاش ہے جو بطریق ابن جُریج عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ روایت کرتا ہے۔ مگر اسماعیل بن عیاش ضعیف راوی ہے۔

مؤطا امام مالک میں یہ روایت عمرو بن شعیب سے منقول ہے اور وہ عمرؓ بن الخطاب سے تفصیل کے ساتھ روایت کرتے ہیں، مگر یہ روایت منقطع ہے اس لیے کہ عمرو بن شعیب نے حضرت عمرؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ مسند احمد (۱-۴۹) میں اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہُشیم و یزید عن یحییٰ بن سعید عن عمرو بن شعیب کی سند کے ساتھ منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"اگر میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات نہ سنی ہوتی کہ قاتل کو ترکہ میں سے حصہ نہیں دیا جاتا تو میں تجھے وارث بنا دیتا۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مقتول کے ماموں کو بلایا اور اسے اونٹ دے دیے۔ مگر یہ روایت بھی منقطع ہے۔

بعض راویوں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ کی موقوف روایت کے طور پر بھی نقل کی ہے، چنانچہ ابوالمنذر اسد بن عمرو نے یہ

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی کو خطاءً (مثلاً شکار پر گولی چلائی اور آدمی کو جا لگی) قتل کر دے تو قاتل مقتول کے مال سے ورثہ پائے گا مگر اسے دیت میں سے ورثہ نہیں دیا جائے گا اور جب عمداً قتل کرے تو مال ہو یا دیت کسی سے بھی ورثہ نہیں ملے گا۔

حجاج بن أرطاۃ، عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن عمر بن الخطاب کی سند کے ساتھ روایت کی ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اسد بن عمرو ضعیف راوی ہے ضعیف ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اسد بن عمرو، حجاج بن ارطاۃ سے روایت کرنے میں متردد ہے۔

یہ حدیث یعقوب بن ابراہیم بن سعد، عن ابیہ، عن ابن اسحاق عن عبداللہ بن ابی نجیح و عمرو بن شعیب عن مجاہد بن جبیر، عن عمرؓ بن الخطاب کی سند کے ساتھ بھی روایت کی گئی ہے، مگر یہ روایت بھی منقطع ہے۔ اس لیے کہ مجاہد نے حضرت عمرؓ کا زمانہ نہیں پایا۔

مگر اس کی کچھ مؤید احادیث بھی ہیں۔ مثلاً جامع ترمذی (۴-۲۲۵) بروایت ابوہریرہؓ (ابواب الفرائض" باب "ماجاء فی ابطال میراث القاتل" میں مرفوع حدیث ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "قاتل وارث نہیں ہوتا" لیکن اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ ہے۔ ترمذی کہتے ہیں بعض محدثین اس کو متروک الحدیث قرار دیتے ہیں جن میں امام احمد بن حنبل بھی شامل ہیں۔

دارقطنی (۴-۹۶) نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسحاق متروک الحدیث ہے۔ دارقطنی (۴-۹۶) نے اس کو بروایت عبداللہؓ بن عباس بھی نقل کیا ہے، مگر اس کی سند میں کثیر بن سلیم ضعیف راوی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کو "التلخیص الحبیر" (۳-۸۵) میں نقل کیا ہے۔

عبدالرحمٰن بن حرملہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک شخص نے بتایا جس کو عدی کہا جاتا تھا کہ اس کے گھر دو عورتوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ اس نے ایک عورت کو پتھر مار کر ہلاک کر دیا۔ پھر سوار ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ اس وقت تبوک میں مقیم تھے۔ اس نے آپؐ سے مقتول عورت کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا "تم اس کی دیت ادا کرو گے اور اس کے وارث نہیں ہو گے"۔

یہ حدیث ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں روایت کی ہے (المطالب العالیہ) الہیثمیؒ "الزوائد" (۴-۲۲۰) میں لکھتے ہیں کہ اس کے راوی صحیحین کے رواۃ و رجال میں سے ہیں، مگر اس کی سند میں ایک راوی کے نام کا ذکر نہیں کیا گیا۔

بیہقی نے (۶-۲۱۹) یہ حدیث عبدالرحمٰن بن حرملہ سے روایت کی ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے بہت سے لوگوں نے بتایا کہ عدی الجذامی (تا آخر) مگر اس کی سند تابعی کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

کثرتِ متابعات و شواہد کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

لہ امام مالک کے نزدیک قتلِ عمد میں شبہ عمد بھی شامل ہے۔ اس لیے کہ وہ قتل کی صرف دو قسمیں بیان کرتے ہیں (۱) قتلِ عمد اور (۲) قتلِ خطاء۔ قتلِ خطاء ان کے نزدیک قاتل کو مقتول کی میراث سے نہیں صرف اس کی دیت سے محروم کرتا ہے جو قتل کی وجہ سے واجب الادا ہوتی ہے۔ البتہ صغیر اور مجنون جب قتلِ عمد کا ارتکاب کریں تو بعض علماء کے نزدیک ان کو میراث سے محروم نہیں کیا جاتا۔ اس لیے کہ ان کا

امام ابوحنیفہ اور شافعی[1] فرماتے ہیں کہ قاتل کسی کو خواہ عمداً قتل کرے یا خطأً اس کو نہ مقتول کے ترکہ سے ورثہ ملے گا نہ اس کی دیت سے۔

قتل عمد بھی خطا کی مانند ہے، مگر بعض اہل علم کے نزدیک وہ میراث سے محروم رہتے ہیں۔

جب کوئی شخص کسی کو عمداً قتل کرے مگر اس میں تعدی نہ پائی جاتی ہو تو قاتل میراث سے محروم نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص اپنا دفاع کرتے ہوئے کسی کو قتل کرے۔ یا جیسے کوئی شخص اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو وہ اس کا وارث ہوگا۔ اسی طرح وہ حاکم جو اپنے بیٹے پر حد یا قصاص نافذ کرے وہ بھی اس کا وارث ہوگا۔ دیکھیے "مواہب الجلیل" (۶ - ۴۲۲) نیز اس کی شرح "الثمر الدانی" ص ۶۳۹۔

[1] امام ربیع امام شافعی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: بعض لوگ اس ضمن میں ہمارے ہمنوا ہیں کہ غلام ایک عمداً یا خطأً قتل کرنے والا شخص اور کافر کسی چیز کے بھی وارث نہیں ہوتے۔ دیکھیے "الام" (۴ - ۷۳)

امام شافعی کے ساتھی قتل مضمون وغیر مضمون کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ قتل مضمون کی صورت میں قاتل وارث نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے بلا وجہ قتل کیا اور غیر مضمون کی صورت میں وارث ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے حق کی بنا پر قتل کا ارتکاب کیا ہے، لہٰذا وہ قتل کی بنا پر وراثت سے محروم نہیں رہے گا۔ بعض اصحاب شافعی کا قول ہے کہ اگر مقتول پر زنا کا الزام ہو اور قاتل حاکم ہو اور شہادت کی بنا پر زنا کے جرم میں وہ اسے رجم کرے تو وہ (قاتل) اس کا وارث نہیں ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے جلدی ورثہ لینے کے لیے اسے قتل کیا ہے اور اگر مقتول پر الزام نہ ہو بلکہ زنا کا اقرار کرنے کی وجہ سے اسے رجم کیا گیا ہو تو قاتل وارث ہوگا۔ اس لیے کہ اس صورت میں قاتل پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے جلد میراث پانے کے لیے اسے قتل کیا۔

امام شافعی کے بعض اصحاب یہ کہتے ہیں کہ قاتل کسی صورت میں بھی وارث نہ ہوگا۔ (المہذب مع الشرح) شافعیہ کے نزدیک راجح مسلک یہی ہے کہ قاتل کو ہر حال میں میراث سے محروم رکھا جائے گا۔ قطع نظر اس سے کہ اس نے عمداً قتل کیا ہو یا خطأً، حق کی بنا پر قتل کیا یا ناحق، نیز یہ کہ وہ عاقل و بالغ ہو یا صغیر و مجنون۔ تاکہ اس راستہ ہی کو بند کر دیا جائے اور کوئی شخص جلد میراث حاصل کرنے کے لیے مورث کی جان کے ساتھ نہ کھیلنے لگے۔

حضرت عمر بن الخطاب، حضرت عبداللہ بن عباس اور عمر بن عبدالعزیز سے بھی یہی منقول ہے۔ امام احمد بن حنبل کا مسلک بھی یہی ہے۔ وہ صغیر و کبیر اور قتل عمد و خطاء میں کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھتے۔ صغیر اور مجنون کے عاقل و بالغ نہ ہونے کے باوجود میراث سے محروم رہنے کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ غیر مکلف ہونے کی وجہ سے ان کے قاتل ہونے کی صورت میں اس پر حد تو قائم نہیں کی جائے گی، لیکن غیر مکلف ہونے کی بنا پر قصاص نہ لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے میراث سے بھی محروم نہ کیا جائے۔ احتیاط اور تحفظ جان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو میراث سے محروم ٹھہرایا جائے۔ (الاقناع ۳ - ۱۲۳)

جہاں تک ایسے قتل کا تعلق ہے جس کی ضمان قاتل پر نہیں مثلاً کسی کو حد و قصاص یا اپنا دفاع کرنے کے لیے قتل کیا۔ یا باغی کو قتل کیا یا کسی کی بھلائی کے لیے دوا پلائی یا مرہم پٹی کی اور وہ مر گیا تو ان تمام صورتوں میں قاتل مقتول کا وارث ہوگا۔ (المدونہ ۶ - ۳۴۸)

[1] اس باب پر سب اہلِ علم کا اجماع ہے کہ عمداً قتل کرنے والا مقتول کے مال یا دیت کا وارث نہیں ہوگا۔[2] جو اختلاف بھی پایا جاتا ہے وہ قتلِ خطا کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے۔

امام ابو حنیفہ قتلِ عمد و شبہ عمد میں امام شافعی اور احمد کے ہم خیال ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں ان کی ایک شرط تو یہ ہے کہ قتل براہ راست کیا گیا ہو، لیکن اگر قتل بالواسطہ طور پر کیا گیا ہو تو قاتل قتلِ عمد کا مرتکب ہونے کے باوجود وراثت سے محروم نہیں ہوگا۔ انھوں نے دوسری شرط یہ عائد کی ہے کہ قاتل عاقل و بالغ ہو۔ صغیر یا مجنون ہو تو وراثت سے محروم نہیں رہے گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ قتل مبنی بر ظلم و تعدی ہو، بنا برحق نہ ہو۔ مثلاً قاتل کسی کو دفاع کے نقطۂ نظر سے قتل کرے، تو ایسی صورت میں قتل کی وجہ سے میراث سے محروم نہیں ہوگا۔ دیکھیے البحر الرائق (۸-۴۸۸)

[2] البتہ سعید المسیّب اور ابن جُبیر کے نزدیک عمداً قتل کرنے والا بھی وارث ہوگا۔ خوارج کا موقف بھی یہی ہے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ آیت میراث عام ہے۔ اس میں قاتل کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا، لہٰذا اس پر عمل کرتے ہوئے قاتل کو وارث قرار دیا جائے گا۔

ابن قُدامہ المغنی (۶-۲۳۷) میں لکھتے ہیں:-

سعید بن المسیب وغیرہ کا قول شاذ اور ناقابلِ عمل ہے۔ اس لیے کہ اس کے خلاف دلائل قائم ہو چکے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن قتادہ المدلجی کی دیت اس کے بھائی کو دی تھی والد کو نہیں۔ اس لیے کہ ابن قتادہ کے والد نے اس کو قتل کیا تھا۔ صحابہ میں یہ واقعہ مشہور ہوا اور کسی نے اس پر نقد و جرح نہ کی، لہٰذا اس پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ حضرت عمرؓ کا فیصلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی پر مبنی تھا۔ "قاتل کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔"

وَلاَءؔ کی میراث کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

حدیث نبوی میں ہے کہ ولاءؔ کا حق آزاد کرنے والے کے بڑے بیٹےؔ کو حاصل ہوگا۔ اہل مدینہ، حضرت عمرؓ، علیؓ اور زیدؓ

لہ الوَلاد البفتح (الواد والمد) یہ اہل مغرب کی اصطلاح ہے۔ شرعاً اس کے معنی یہ ہیں کہ جب کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کرتا ہے تو آزاد کرنے کی وجہ سے وہ آزاد کردہ غلام کا عصبہ بن جاتا ہے اور جب نسب کے اعتبار سے اس غلام کا کوئی عصبہ نہ ہو تو آزاد کرنے والا اس کا ورثہ پاتا ہے۔ اس کو حق ولاء کہتے ہیں۔ "عمدۃ کل فارض" (۳-۲-۱) میں شیخ ازہری کہتے ہیں۔

"ولاء" کا تعلق عصبہ کے تعلق کی طرح ہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد کرنے والا شخص آزاد کردہ غلام پر خصوصی احسان کرتا ہے، چنانچہ اس کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان نسب کی طرح کا تعلق قائم ہوجاتا ہے، لہٰذا اسے فروخت نہیں کیا جاسکتا۔ مرفوع حدیث میں ہے کہ ولاء نسب کی طرح کا تعلق ہے جس کو نہ فروخت کیا جاسکتا ہے نہ ہبہ کے طور پر کسی کو دیا جاسکتا ہے۔

یہ حدیث حاکم نے "المستدرک" (۴-۱۴۳) میں روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ ابن دقیق العید نے اس کو "الالمام" (ص ۳۸۳) میں نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ابویعلیٰ موصلی اور ابن حبان نے روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ "بلوغ المرام (ص)" میں لکھتے ہیں کہ ابن حبان نے اس کو صحیح اور بیہقی نے معلول قرار دیا ہے

لہ مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ حدیث مرفوعاً کس نے روایت کی ہے۔ عبدالرزاق (۹-۳۰) اور الدارمی (۲-۳۷۵) نے یہ حضرت عمرؓ، علیؓ اور زیدؓ سے (موقوفاً) روایت کی ہے۔ دارمی کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا "حق ولاء بڑے بیٹے کو ملتا ہے"۔ ابن قدامہ نے "المغنی" (۶-۴۱۶) میں یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ابی بن کعب، ابومسعود البدری، اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا موقف بھی یہی ہے۔ صاحبین (ابویوسف اور محمد بن حسن) بھی یہی فرماتے ہیں۔ طحاوی نے "المختصر" (ص ۴۰۰) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی تشریح یہ ہے کہ ولاء کا حق میت کے بڑے بیٹے کو حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آزاد کرنے والے کا بیٹا بھی موجود ہو اور پوتا بھی تو آزاد کردہ غلام کی وراثت اس کے بیٹے کو ملے گی۔

تہ الکبر (بضم الکاف) اس سے مراد آزاد کرنے والے کا بڑا بیٹا ہے۔ القاسم بن حزم سرقسطی نے "غریب الحدیث" میں یعقوب سے یہی بات نقل کی ہے۔ القاسم لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آزاد کرنے والا شخص فوت ہوجائے تو ولاء کا حق اس کے سب سے قریبی عزیز کو حاصل ہوگا۔ الزیلعی نے "نصب الرایۃ" (۴-۱۵۵) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اور "النھایۃ" میں ہے کہ ولاء کا حق آزاد کنندہ کے سب سے بڑے بیٹے کو حاصل ہوگا۔

مؤطا امام مالک (۲-۱۴۴) باب "میراث الولاء" میں ہے کہ عبدالملک بن ابی بکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ عاص بن ہشام مرگیا اور اس نے تین بیٹے اپنے پیچھے چھوڑے۔ ان میں سے دو ایک ماں سے تھے اور ایک دوسری ماں سے۔ بعد میں دونوں حقیقی بھائیوں میں سے ایک مرگیا اور اس نے اپنے پیچھے کچھ مال اور آزاد کردہ غلام چھوڑے۔ اس کا

کا قول بھی یہی ہے۔[۱]

حقیقی بھائی اس کے مال اور آزاد کردہ غلاموں کی ولاء کا وارث قرار پایا۔ پھر یہ شخص جو مال اور ولاء کا وارث بنا تھا مر گیا۔ اس نے ایک بیٹا اور ایک علاتی بھائی پیچھے چھوڑا۔ اس کے بیٹے نے کہا کہ اپنے باپ کے مال اور ولاء کا وارث میں ہوں۔ بھائی نے کہا یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بے شک تم اپنے باپ کے مال کے وارث ہو البتہ غلاموں کی ولاء کے مالک نہیں ہو۔ تم تو اگر میرا بھائی آج فوت ہوتا تو کیا میں اس کا وارث نہ ہوتا؟ انھوں نے اپنا مقدمہ حضرت عثمانؓ کی عدالت میں پیش کیا۔ آپؓ نے میت کے بھائی کے حق میں ولاء کا فیصلہ کیا۔

زیلعی نے بھی اس واقعہ پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔

۱ حضرت عثمان سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ بیہقی نے (۱۰-۳۰۳) میں اور دارمی نے (۲-۳۷۵) میں اس کو سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے مصنف (۹-۳۰) میں اس کو بروایت ثوری عن منصور عن ابراہیم نقل کیا ہے کہ حضرات علی، عمر اور زید رضی اللہ عنہم ولاء کا حق بڑے لڑکے کو دیتے تھے۔ پھر سفیان ثوری کی اس توضیح کا ذکر کیا ہے جس پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔

سنن دارمی میں ہے کہ "الکُبر" سے مراد وہ رشتہ دار ہے جو باپ یا ماں کی وجہ سے قریب تر ہو۔ اس کی مثال امام احمد کی وہ روایت ہے جو انھوں نے بسند خود زیاد بن ابی مریم سے نقل کی ہے۔ کہ ایک عورت نے اپنا ایک غلام آزاد کیا۔ پھر وہ فوت ہو گئی اور اس نے اپنے پیچھے ایک بیٹا اور ایک بھائی چھوڑا۔ اس کے بعد اس کا آزاد کردہ غلام بھی فوت ہو گیا۔ عورت کا بھائی اور بیٹا اس کی میراث کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا "آزاد کردہ غلام کی میراث عورت کے بیٹے کو ملے گی۔ عورت کے بھائی نے کہا اگر آزاد کردہ غلام کسی جرم کا ارتکاب کرتا تو اس کی پاداش میں مجھے سزا بھگتنا ہوتی، مگر اس کی وراثت اسی (میری بہن کے بیٹے) کو مل رہی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں ایسا ہی ہے"

عبدالرزاق ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور زید بن ثابتؓ نے ایک ایسے شخص کے بارے میں فیصلہ کیا جو مر گیا اور اس نے اپنے پیچھے ایک حقیقی بھائی ایک علاتی بھائی اور ایک آزاد کردہ غلام چھوڑا۔ انھوں نے ولاء کا حق علاتی بھائی کے بجائے حقیقی بھائی کو ملے گا۔ دونوں نے فرمایا کہ حقیقی بھائی کی موت کی صورت میں ولاء کا حق علاتی بھائی کی جانب لوٹ آئے گا۔

جمہور فقہاء کے مابین اس ضمن میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ عورتوں کو صرف اسی لونڈی یا غلام کا حق ولاء ملتا ہے جس کو وہ خود آزاد کریں۔ یا ان کی آزاد کردہ لونڈی یا غلام کی اولاد کا حق ولاء ملے گا۔ البتہ مسروق سے منقول ہے کہ حق ولاء مردوں کے ساتھ مختص نہیں بلکہ مرد اور عورتیں اس میں مساوی ہیں۔ ابن المنذر نے طاؤس سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

عبدالرزاق معمر سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابن طاؤس سے، اور وہ اپنے والد سے کہ وہ کہا کرتے تھے "عورت ولاء کی وارث ہو سکتی ہے" دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۹-۳۷) فتح الباری (۱۲-۴۸)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:-

"جمہور اہل علم کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت ولاء کی وارث نہیں ہو سکتی۔ اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ

سفیان ثوری کہتے ہیں اس کی وضاحت یہ ہے کہ ایک شخص مرگیا۔ اس نے دو بیٹے اور چند آزاد کردہ غلام اپنے پیچھے چھوڑے۔ پھر ایک بیٹا مرگیا۔ اور اپنے پیچھے چند بیٹے چھوڑ گیا۔ ولاء کا حق ان کے چچا کو مل گیا۔ پھر چچا فوت ہو گیا اور پانچ بیٹے اپنے پیچھے چھوڑے۔ پہلے مرنے والے بھائی کے سات بیٹے تھے۔ اس صورت میں ولاء کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ گویا یوں سمجھیے کہ دادا فوت ہوا تھا اور وہ اس کے وارث قرار پائے۔

عورت فرائض (وراثت کے مقررہ حصص) کی بنا پر سارے مال کی وارث نہیں بن سکتی ہے، حالانکہ فرائض (وراثت کے مقررہ حصص) کی اہمیت عصبہ کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اس لیے ولاء کو عورت کے مقابلہ میں مرد کے ساتھ مختص کر دیا گیا ہے جو پورے مال کا وارث بن سکتا ہے۔ البتہ کسی کو آزاد کرنے کی صورت میں عورت اس لیے اس کی وارث ہوتی ہے کہ اس کا تعلق امر کی اپنی ذات کے ساتھ ہے۔ اس کا سبب وراثت سے بالواسطہ طور پر حصہ پانا نہیں۔"

شارح عمدۃ الفارض (۲-۱۱۰) میں لکھتے ہیں:-

"ولاء نسب کے ساتھ ملتی جلتی چیز ہے۔ اور آزاد کردہ غلام میت کے بھتیجے یا چچا زاد بھائی کی مانند ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے صرف مرد ہی ورثہ حاصل کرتے ہیں۔"

ابن قدامہ "الکافی" (۲-۵۷) میں اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فرض کیجیے ایک شخص مرگیا۔ اس نے اپنے پیچھے دو بیٹے اور ایک آزاد کردہ غلام چھوڑا۔ اس کے بعد ایک بیٹا مرگیا اور وہ اپنے پیچھے ایک بیٹا چھوڑ گیا۔ اس کے بعد آزاد کردہ غلام مرگیا۔ اس صورت میں اس کی وراثت آزاد کرنے والے شخص کے بیٹے کو ملے گی۔ اس لیے کہ حق ولاء بڑے بیٹے کو ملتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آزاد کردہ غلام کا ورثہ اس شخص کو ملے گا جو اس کی موت کے روز اس کے آقا کا قریب ترین رشتہ دار تھا۔ اس لیے کہ حق ولاء نسب کی طرح کا ایک رشتہ ہے جو وراثت میں منتقل نہیں ہوتا۔ اس کی بنا پر ورثہ شخص آزاد کردہ غلام کے ساتھ قریبی تعلق کی وجہ سے ملتا ہے۔ اس لیے واجب ٹھہرا کہ حق ولاء بڑے بیٹے کو دیا جائے کیونکہ وہ اقرب ہوتا ہے (ابن قدامہ کا بیان ختم ہوا)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی میراث

ابن جریجؒ عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہؓ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ حضرت عائشہؓ کے وارث ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر حضرت عائشہ سے پہلے فوت ہو گئے تھے لہٰذا ان کے بیٹے عبداللہ بن عبدالرحمٰن حضرت عائشہؓ کے وارث ہوئے۔ پھر عبداللہ فوت ہو گئے اور اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑ رہے۔ حضرت عائشہؓ کا آزاد کردہ غلام جب فوت ہوا تو قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ اس وقت بقید حیات تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے دونوں بیٹوں کو ذکوان کا وارث ٹھہرایا اور قاسم کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ قاسم ان سے زیادہ حق دار تھے۔ عطاء کہتے ہیں کہ اس بنا پر عبداللہؓ بن زبیر تنقید کا نشانہ بھی بنے۔

---

[1] دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۹-۳۲) اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ قاسم اس پر تنقید کیا کرتے تھے۔
نیز بیہقی (۱۰-۳۰۵) مختصراً۔

عبدالرزاق یہ حدیث بطریق معمر عن ایوب، عن عبداللہ بن ابی مُلیکہ روایت کرتے ہیں۔ ابن ابی مُلیکہ اس سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں کہ جب عبدالملک خلیفہ بنا تو قاسم سے کہا گیا کہ وہ مقدمہ دائر کریں تو ان کا حق مل جائے گا۔ قاسم نے کہا "میں نے پہلے مطالبہ کیا تھا۔ اگر اس وقت کوئی چیز مل جاتی تو لے لیتا، مگر اب میں مطالبہ نہیں کروں گا"۔
بیہقی نے اس کو بروایت اسماعیل، عن ایوب مختصراً نقل کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

(۱) ایک مسلم کی وصیّت کے بارے میں جس پر دو عیسائی گواہ تھے (۲) اس غلام کے بارے میں جس کا کان کاٹ دیا گیا تھا اور (۳) اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے مرد کو پائے

ابن سلام کی تفسیر میں ہے کہ کلبی[1] نے کہا کہ بنی سہم کا ایک آزاد کردہ غلام تجارت کے سلسلے میں باہر گیا۔ اس کے ہمراہ تمیم داری[2] اور ایک اور آدمی تھا۔

ناسخ و منسوخ کے متعلق ابو عُبید کی کتاب میں ہے کہ اس کے ہمراہ تمیم داری اور اس کا بھائی[3] ابو ہند تھا۔ یہ قبیلہ لخم سے تعلق رکھتے تھے اور دونوں عیسائی تھے۔ وصیّت کرنے والا ماریہ کا بیٹا تھا جو عمرو بن العاص السہمی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ جس بستی میں وہ اکٹھے ہوئے اس کا نام دقوقا[4] تھا۔

---

[1] کلبی کا نام محمد بن السائب ابو النضر ہے۔ نہایت ضعیف اور کذاب راوی ہے۔ اس کا تعارف آگے آ رہا ہے مختصر تعارف پیچھے گزر چکا ہے۔

[2] تمیم الداری: تمیم بن اوس بن خارجہ اللخمی اپنے دادا الدار بن ہانی بن حبیب بن نمارہ بن لخم کی جانب منسوب ہیں۔ ۹ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے پہلے یہ عیسائی تھے۔

[3] واقدی کہتا ہے کہ عدی بن بدا تمیم داری کا بھائی تھا۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (۵-۴۱۱) میں لکھتے ہیں:-

"ممکن ہے کہ عدی، تمیم داری کا ماں کی طرف سے یا رضاعی بھائی ہو۔"

اکثر روایات سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ عدی بن بدا تمیم داری کا بھائی تھا۔ اس کے برعکس بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہی عیسائی تھے اور مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے۔ ایک تمیم الداری اور دوسرا یمنی تھا۔

[4] ابن ماریہ، عمرو بن العاص السہمی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اس کا نام بدیل بن ابی مریم لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" (۱-۱۴۵) میں اس کا نام "بدیل" (بالدال) لکھا ہے۔ اس کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے بعض بریل (بالراء) بعض بدیل (بالدال) اور بعض بذیل (بالذال) کہتے ہیں۔ بعض بُریر بھی کہتے ہیں۔ ابن ماکولا، ترمذی اور طبری نے اس کو بدیل (بالدال) لکھا ہے۔ یہ مہاجرین میں سے تھا۔

[5] دَقُوقا (بفتح الاوّل وضم الثانی) واو کے بعد دوسرا قاف ہے۔ اربل اور بغداد کے درمیان ایک شہر کا نام ہے۔ یاقوت الحموی، "معجم البلدان" (۲-۴۵۹) میں لکھتے ہیں۔ فتوحات کے ضمن میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہاں خوارج کی ایک لڑائی بھی ہوئی تھی۔

السہیلی کی کتاب الدلائل میں ہے کہ تمیم داری کے ساتھی کا نام عدیؓ بن بداء تھا۔

اُصیلی کی تفسیر میں ہے کہ یہ دونوں عیسائی تھے۔ جب سہمی کی موت کا وقت آیا تو اس نے وصیت لکھائی۔ وصیت نامہ اس نے اپنے سامان میں رکھ دیا اور کہا کہ اسے میرے گھر والوں تک پہنچا دینا۔ وہ دونوں اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے۔ انھوں نے اس کی موت کے بعد اس کا سامان کھولا اور اس میں سے جو چیز پسند آئی لے لی[۲]۔ جب سفر سے واپس آئے تو سامان اس کے گھر والوں کو دے دیا۔ جب انھوں نے سامان کا جائزہ لیا تو کچھ سامان غائب تھا۔ پھر انھوں نے وصیت نامہ دیکھا تو پورے سامان کی وصیت موجود تھی۔ انھوں نے تمیم اور اس کے ساتھی سے دریافت کیا کہ "ہمارے آدمی نے سامان کا کچھ حصہ فروخت کیا تھا؟ دونوں نے کہا "نہیں" انھوں نے کہا اس سامان میں سے بعض چیزیں غائب ہیں؟" دونوں نے جواب دیا "ہمیں معلوم نہیں کہ وصیت میں کیا لکھا ہے۔ اس نے ہمیں سامان دیا جو ہم نے تمھاری تحویل میں دے دیا۔ مرنے والے کے گھر والوں نے اپنا مقدمہ عدالت نبوی میں پیش کیا[۳]۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ ۔ (المائدہ ۵ ـ ۱۰۶)	اور اگر تم سفر کر رہے ہو اور اس وقت تم پر موت کی مصیبت واقع ہو تو اپنے گواہ نہ ملنے کی صورت میں کسی دوسرے مذہب کے دو شخصوں ہی میں سے گواہ بنا لو (اگر تم کو گواہوں کی نسبت کچھ شک ہو تو) ان کو (عصر کی) نماز کے بعد کھڑا کرو۔ (تا آخر)

چنانچہ دونوں نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بعد از نماز عصر حلف اٹھایا۔ پھر ان کو چھوڑ دیا گیا۔ بعد ازاں تمیم کے پاس چاندی کا ایک نقش و نگار والا برتن دیکھا گیا۔ جس پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا۔

الدلائل میں ہے کہ وہ برتن[۴] تمیم کے پاس مکہ مکرمہ میں دیکھا گیا تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ وہ برتن ایک ہزار درہم کے عوض فروخت کیا گیا تھا۔ اس میں سے پانچ سو درہم تمیم نے اور پانچ سو عدی بن بداء نے لیے تھے۔

---

[۱] عدی بن بدّاء۔ (دال کی تشدید کے ساتھ) یہ نصرانی تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اسلام لے آیا تھا، مگر راجح یہ ہے کہ وہ نصرانی فوت ہوا۔

[۲] اکثر روایات میں اس بات کی تصریح پائی جاتی ہے کہ وہ چاندی کا جام تھا۔ سہمی اسے بادشاہ کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ طبری میں بھی اسی طرح ہے۔

[۳] طبری کی ایک روایت میں ہے کہ حلف کے الفاظ یہ تھے:

"اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا ہمارے پاس اس کا کوئی سامان نہ تھا اور ہم نے کوئی چیز نہیں چھپائی۔"

[۴] ابن جریر الطبری کی روایت میں ہے۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ ان دونوں کے قبضہ میں چاندی کا ایک لوٹا ہوا برتن موجود ہے جس پر زر کاری کی گئی ہے۔ میت کے گھر والوں نے کہا "یہ اس کے سامان ہی سے ہے۔" دونوں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا ہم نے اسے خرید لیا تھا اور حلف اٹھاتے وقت اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے تھے۔ بعد ازاں ہم نے جھوٹا کہلانا پسند نہ کیا اور یہ برتن ہمارے پاس ہی رہا۔ چنانچہ مرحوم کے گھر والوں نے یہ مقدمہ عدالت نبوی میں پیش کیا۔ اس موقع پر اگلی آیت "فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا" نازل ہوئی۔ رسول اللہ

مرحوم کے گھر والوں نے کہا کہ یہ برتن ہمارے ساتھی کا ہے جسے وہ گھر سے جاتے وقت ساتھ لے گیا تھا۔ تم دونوں نے خود کہا ہے کہ اس نے کوئی خرید و فروخت نہیں کی۔ دونوں نے کہا ہم نے یہ برتن اس سے خریدا تھا اور تمھیں بتانا بھول گئے تھے۔ ان دونوں کا مقدمہ عدالت نبوی میں پیش کیا گیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی :

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا
فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ
الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ
فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ
شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ اِنَّاۤ اِذًا
لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

(المائدۃ ۵ - ۱۰۷)

پھر اگر معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے (جھوٹ بول کر) گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو جن لوگوں کا انھوں نے حق مارنا چاہا تھا ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ کھڑے ہوں (جو میت سے قریبی تعلق رکھتے ہوں) پھر وہ خدا کی قسمیں کھائیں کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے بہت سچی ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ ایسا کیا ہو تو ہم بے انصاف ہیں۔

مرحوم کے اہل خانہ میں سے عبداللہ بن عمرو اور مطلب بن ابی وداعہ سہمی نے کھڑے ہو کر حلف اٹھایا اور کہا کہ اس نے اپنی وصیت میں جو کچھ لکھا ہے درست ہے۔ تمیم اور اس کے ساتھی نے خیانت کی ہے۔ جب اس خیانت کا پتہ چل گیا تو تمیم اور اس کے ساتھی کو وصیت میں مذکور اشیاء کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔[۱]

= نے میت کے ورثاء میں سے دو آدمیوں سے کہا کہ وہ حلف اٹھا کر کہیں کہ ان دونوں نے فلاں چیز کو چھپایا ہے اور اس کا ذکر نہیں کیا، تو وہ چیز ان کو مل جائے گی۔ بعدازاں تمیم داری اسلام لائے اور آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ وہ کہا کرتے تھے "اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا۔ وہ برتن میں نے لیا تھا۔"

اس واقعہ کو جلال الدین السیوطی نے الدر المنثور (۲ - ۳۴۲) میں نقل کر کے ابن المنذر کی طرف منسوب کیا ہے۔

[۱] اصل واقعہ جامع ترمذی (۵ - ۲۵۸) میں سورۃ المائدہ کی تفسیر میں الفاظ کے اختلاف کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ ترمذی نے اس کو محمد بن سلمہ الحرانی عن محمد بن اسحاق عن ابو النضر عن باذان مولی ام ہانی عن عبداللہ بن عباس عن تمیم داری کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابو النضر جس سے محمد بن اسحاق یہ روایت بیان کرتے ہیں، میری تحقیق کے مطابق، محمد بن السائب کلبی ہے جس کی کنیت ابو النضر تھی۔ اور محدثین کے نزدیک وہ ایک متروک راوی ہے۔ ابو نضر محمد بن السائب کلبی نے ایک تفسیر بھی لکھی ہے، میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری کو یہ فرماتے سنا ہے :

محمد بن سائب کلبی کی کنیت ابو النضر ہے۔ ہمارے علم کی حد تک سالم ابو النضر نے ابو صالح مولی ام ہانی سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک دوسری سند کے ساتھ اختصار سے اس حدیث کا کچھ حصہ روایت کیا گیا ہے۔ امام ترمذی کا بیان ختم ہوا۔

میں اس پر یہ اضافہ کرتا ہوں کہ جوزجانی نے کلبی کو کاذب قرار دیا ہے۔ دارقطنی اور محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک وہ =

زجاج نے اپنی کتاب معانی القرآن میں ایک انصاری کا واقعہ لکھا ہے۔ اس انصاری کا سنے جس کو

= متروک الحدیث ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا کلبی کی تفسیر کا مطالعہ جائز ہے؟ انھوں نے فرمایا "نہیں"۔ کلبی خود کہا کرتا تھا کہ "میں سبائی ہوں"۔

معمر بن سلیمان، سلیمان سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد سے کہ کوفہ میں دو کذاب ہیں۔ (۱) ایک کلبی (۲) دوسرا سدی۔ سفیان ثوری سے منقول ہے کہ کلبی نے کہا: "جو حدیثیں میں نے بروایت ابو صالح عن ابو العباس روایت کی ہیں وہ سب جھوٹ ہیں۔ ان کو روایت نہ کیا کرو"۔

ابو حاتم لکھتے ہیں:۔

"کلبی کی مرویات کو ترک کرنے پر سب لوگوں کا اتفاق ہے"۔

دیکھیے تہذیب التہذیب (۹-۸۰) اور میزان الاعتدال (۳-۵۵۶)

جہاں تک امام بخاری کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ سالم ابو النضر نے ابو صالح مولیٰ ام ہانی سے کوئی حدیث روایت نہیں کی، تو اس سے ان کی مراد سالم ابو النضر بن ابی امیہ مولیٰ عمر بن عبید اللہ تیمی ہے۔ البتہ اس سند میں جس ابو النضر کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ محمد بن سائب کلبی ہے۔ اس کی روایت ابو صالح باذان سے معروف ہے۔ سالم ابو النضر بن ابی امیہ مولیٰ عمر بن عبید اللہ التیمی دوسری شخصیت ہے۔ وہ ثقہ راوی ہے۔ اس نے ابو صالح باذان مولیٰ ام ہانی سے روایت نہیں کی۔

جس روایت کی طرف ترمذی نے اشارہ کیا ہے وہ سفیان بن وکیع عن یحییٰ بن آدم، عن ابن ابی زائدہ عن محمد بن ابی القاسم، عن عبد الملک بن سعید بن جبیر، عن سعید بن جبیر، عن عبد اللہ بن عباس کی سند کے ساتھ منقول ہے۔ اس روایت میں یہ اضافہ ہے کہ وہ جام بعد میں مکہ میں پایا گیا۔ اور جن لوگوں کے پاس وہ تھا جب ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے اسے تمیم اور عدی سے خریدا تھا۔ سہمی کے قاربین میں سے دو آدمیوں نے حلف اٹھا کر کہا کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ سچی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جام ہمارے آدمی کا ہے۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ...... الخ (المائدة ۵-۱۰۶)	مومنو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو شہادت (کا نصاب) یہ ہے کہ ..... الخ

ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث بروایت ابن ابی زائدہ حسن غریب ہے۔

بخاری نے یہ حدیث اسی سند کے ساتھ بطریق علی بن عبد اللہ عن یحییٰ بن آدم کتاب "الوصایا" میں روایت کی ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۷۸۰) ابو داؤد (۳-۳۰۷) کتاب "القضاء" باب شهادة اهل الذمة والوصية في السفر؟ بیہقی (۱۰-۱۶۵) الناسخ والمنسوخ از ابو جعفر النحاس (ص ۱۲۳) تفسیر ابن جریر الطبری۔ ا الدر المنثور للسیوطی (۲-۳۴۲) سیوطی نے اس حدیث کو صرف صحیح بخاری اور تاریخ بخاری کی طرف منسوب کیا ہے۔

[1] دیکھیے معانی القرآن (۲-۱۱۰) نیز تفسیر ابن جریر الطبری و تفسیر القرطبی اور جامع ترمذی (۵-۲۳۶) کتاب "التفسیر"

ابوطعمہ[1] یا طعمہ کہتے تھے ایک زرہ چرائی اور اسے آٹے کے ایک تھیلے میں رکھا۔ تھیلہ پھٹا ہوا تھا، لہٰذا جہاں سے اس نے آٹا چرایا تھا وہاں سے لے کر اس کے گھر تک آٹا گرتا گیا۔ اس کے نتیجے میں اسے زرہ کا چور تصور کیا گیا۔ اس نے زرہ کو ایک یہودی[2] کے یہاں لے جا کر امانت رکھ دیا۔ پھر اپنی قوم کے پاس آیا اور انھیں بتایا کہ جب مجھ پر زرہ کی چوری کا الزام لگایا گیا تو اس کی تحقیق کی گئی۔ معلوم ہوا کہ زرہ ایک یہودی کے پاس ہے لہٰذا اسی کو چور سمجھا گیا۔ انصاری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ابوطعمہ کو بے قصور ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیونکہ زرہ یہودی نے چرائی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بے قصور قرار دینے کا ارادہ کر لیا تھا کہ وحی نازل ہوئی اور آپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا گیا کہ انصاری خائن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطعمہ کی صفائی کرنے سے روکا اور مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا۔ نیز آپ کو پابند فرمایا کہ صرف اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کیا کریں۔ فرمایا: وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ (النساء:۱۰) (یعنی تم ان لوگوں کی حمایت نہ کرو جو خیانت کار ہیں) یعنی ابوطعمہ اور اس کی قوم کے لوگ جو اس کو چور سمجھنے کے باوجود اس کی مدد کر رہے تھے۔

نقل کیا گیا ہے کہ ابوطعمہ اسلام سے مرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں اس نے چوری کرنے کے لیے ایک دیوار میں نقب لگائی۔ دیوار اس پر گر گئی اور وہ مر گیا۔

---

[1] ابوطعمہ: اس کا نام بشیر بن اُبیرق تھا۔ یہ منافق تھا اور صحابہ کی شان میں ہجویہ اشعار کہا کرتا تھا۔ یہ اپنے اشعار کو دوسرے شعراء کی جانب منسوب کر دیا کرتا تھا۔ مسلمان کہا کرتے تھے کہ یہ اس خبیث کے اشعار ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر میں اس منافق نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہتا ہے ؎

اوکلما قال الرجال قصیدۃ   نحلت وقالوا ابن الابیرق قالھا

(جب دوسرے لوگ کوئی قصیدہ کہتے ہیں تو (مسلمان) اسے میری طرف منسوب کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ ابنِ اُبیرق نے کہا ہے)

ضحاک کہتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا۔ وہ رئیس آدمی تھا۔ یہودی مسلح ہو کر آئے اور اسے لے کر بھاگ گئے۔ طبری اور قرطبی نے اپنی اپنی تفسیر میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

[2] "الاستیعاب" لابن عبدالبر میں ہے کہ اس نے یہ زرہ لبید بن سہل کے گھر میں پھینک دی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ زید بن السمین کے گھر میں۔ لبید مسلمان تھا۔ الطبری کہتے ہیں کہ اس نے زرہ ابو ملیل انصاری کے گھر میں پھینکی تھی۔

[3] ترمذی بسند عاصم بن عمر بن قتادہ عن ابیہ عن جدہ قتادہ بن نعمان (تا آخر) میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابوطعمہ جو کہ چور تھا، بھاگ کر مکہ مکرمہ چلا گیا اور وہاں سُلافہ بنت سعد بن شُہید کے یہاں مقیم ہوا۔ اس پر حضرت حسان بن ثابت نے ان دونوں کے باہمی تعلق کے بارے میں بعض ہجویہ اشعار کہے، جب یہ اشعار سلافہ کو پہنچے تو اس نے ابوطعمہ سے کہا کہ تو میرے لیے حسان کے ہجویہ اشعار کا "تحفہ" لے کر آیا ہے، اور پھر اس کے ساتھ ہی اس نے ابوطعمہ کا کجاوہ اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔ ابوطعمہ اسلام سے منحرف ہو کر خیبر چلا گیا۔ ایک رات اس نے چوری کے ارادہ سے نقب لگائی۔ دیوار اس پر گر پڑی اور وہ نیچے دب کر مر گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیبر میں مرا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ

ابوداؤد[1] بطریق احمد بن حنبل، عن معاذ بن ہشام، عن ہشام، عن قتادہ، عن ابی نضرہ عن عمران بن حُصین روایت کرتے ہیں کہ تنگدست آدمیوں کے ایک غلام نے دولتمند لوگوں کے ایک غلام کا کان کاٹ دیا۔ اس کے مالکوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: کہ "یا رسول اللہ! ہم تنگدست ہیں" چنانچہ آپ نے اُن پر کوئی دیت عائد نہ کی۔

ابو عُبید کتاب الاموال[2] میں کہتے ہیں "حدیث نبوی میں ہے کہ ابیض بن حمال المازنی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

دوسری بار مکہ میں آیا ہو اور دیوار گرنے کا واقعہ وہیں مکہ میں پیش آیا ہو۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔ محمد بن سلمہ حرانی کے سوا کسی نے یہ مرفوعاً روایت نہیں کی۔ اس کے علاوہ یونس بن بکیر اور دوسرے متعدد راویوں نے یہ محمد بن اسحاق، عن عاصم بن عمر بن قتادہ کی سند کے ساتھ مرسلاً یہ حدیث روایت کی ہے۔ لیکن اس میں انھوں نے عن ابیہ عن جدہ کی سند کا نہیں کہا (ترمذی کا بیان ختم ہوا)

البتہ حاکم نے "المستدرک" (۴ - ۳۸۵) میں بطریق یونس بن بکیر تا قتادہ بن نعمان یہ حدیث مرفوعاً روایت کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ مگر صحیحین نے اسے روایت نہیں کیا۔

[1] دیکھیے ابوداؤد (۴ - ۱۹۶) کتاب "الدیات" باب "جنایۃ العبد یکون للفقراء" المنذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔ نسائی (۸ - ۲۵) نے یہ حدیث کتاب "القسامۃ" باب "سقوط القود بین الممالیک" میں بروایت اسحاق بن ابراہیم، عن معاذ بن ہشام مختصراً روایت کی ہے۔ الخطابی فرماتے ہیں:

"اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جرم کرنے والا غلام آزاد ہو چکا تھا۔ جرم اس سے سہواً سرزد ہوا تھا، اور دیت ادا کرنے والے تنگدست تھے۔ دیت ادا کرنے والے خوشحال ہوں تو وہ دیت ادا کرتے ہیں، افلاس و غربت کی حالت میں نہیں۔ اسی طرح جس غلام کا کان کاٹا گیا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ بھی آزاد ہو چکا ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ غلام ہوتا تو بوجہ معذرت کی نفی تھی اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ اکثر اہل علم کے مطابق دیت ادا کرنے والے نہ تو غلام کی دیت کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوتے ہیں، نہ عمداً کیے جانے والے جرم کی، اور نہ ایسے جرم کی جس کا ارتکاب کرنے والے اپنے جرم کا خود اعتراف کریں۔

[2] کتاب الاموال (ص - ۲۹۰) میں اسماعیل بن عیاش، عن عمرو بن یحییٰ بن قیس المازنی عن ابیہ کی سند کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ یحییٰ بن قیس اس شخص سے روایت کرتے ہیں جس نے اس کو ابیض بن حمال سے سُن کر بیان کیا تھا کہ ابیض بن حمال نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مارب میں نمک کی جو کان ہے وہ مجھے عطا کی جائے۔ آپ نے وہ عطا فرما دی۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے اسے کیا چیز عطا کی ہے؟ آپ نے اسے سدا جاری رہنے والا پانی کا چشمہ عنایت فرمایا ہے۔" چنانچہ آپ نے وہ کان اس سے واپس لے لی۔

ابو عبید کہتے ہیں کہ اسماعیل بن عیاش کے علاوہ دوسرے راوی اس حدیث کو یحییٰ بن قیس، عن ثمامہ بن شراحیل، عن سمی بن قیس عن شمیر، عن ابیض بن حمال کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ ابیض نے کہا میں نے عرض کی "یا رسول اللہ! اراک

(بقیہ حاشیہ)

(پیلو کے درخت) کے کون سے حصہ پر حمی (چارے کے لیے مختص کردہ حصہ) کا اطلاق ہو گا۔ آپؐ نے فرمایا، جو حصہ اونٹوں کی پہنچ سے باہر ہو۔ یعنی جہاں تک اونٹوں کی رسائی ہو سکے کھالیں اور اس کے اوپر والا حصہ محفوظ رہے۔

اسماعیل بن عیاش کے علاوہ دوسرے راویوں کی جس روایت کا تذکرہ ابو عُبَید نے کیا ہے اس سے اس کی مراد ترمذی (۳-۶۶۴) کی وہ روایت ہے جو انھوں نے کتاب "الاحکام" باب "ما جاء فی القطائع" میں نقل کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

امام ترمذی فرماتے ہیں میں نے اپنے شیخ قتیبہ بن سعید سے دریافت کیا کہ محمد بن یحییٰ بن قیس المازنی نے یہ حدیث آپ کو سنائی ہے؟ قُتَیبہ نے کہا میرے والد نے مجھے ثمامہ بن شراحیل سے سُن کر اسی طرح بتایا۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپؐ نے اسے جاری پانی کا چشمہ عطا کیا۔ حدیث کے آخر میں ہے کہ قُتَیبہ نے اس کا اعتراف کیا اور کہا ہاں! مطلب یہ ہے کہ ترمذی نے یہ حدیث اپنے اُستاد قُتَیبہ کو پڑھ کر سُنائی تو انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور حدیث کے اخذ کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے۔

امام نووی "التقریب" میں لکھتے ہیں:۔

"جب کوئی حدیث شیخ کو پڑھ کر سنائی جائے اور کہا جائے کہ آپ کو فلاں راوی نے یہ حدیث سنائی ہے۔ اور شیخ اسے توجہ سے سُن اور سمجھ رہا ہو اور اس کا انکار نہ کرے تو سماع کی یہ صورت صحیح ہے اور اس کی بنا پر روایت کرنا جائز اور درست ہے۔ جمہور محدثین کے ثابت شدہ مسلک کے مطابق اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ شیخ زبان سے بھی اس کی توثیق کرے، البتہ بعض شوافع اور ظاہریہ نے شیخ کی طرف سے اس کی زبانی توثیق کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ (تدریب الراوی ص ۴۰۲) اس حدیث میں ترمذی کے شیخ نے اس کی زبانی توثیق کی۔ ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے"

یحییٰ بن آدم نے "کتاب الخراج" (ص ۱۰۷) میں معمر عن یحییٰ بن قیس، عن شخص، عن ابیض بن حمّال کی سند کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے اس کی سند میں بعض مجہول راوی ہیں۔ ترمذی اور دیگر محدثین نے تصریح کی ہے کہ وہ ثمامہ بن شراحیل عن سمی بن قیس عن شمیر ہیں۔

ابن القطان کہتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر نے "التلخیص الحبیر (۳-۶۴)" میں اس کے سبب ضعف کی نشاندہی نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ ضعف کا سبب سُمّی بن قیس کا مجہول راوی ہونا ہے۔ ذہبی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سے صرف ثمامہ بن شراحیل نے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے التقریب میں اس کو مجہول قرار دیا ہے۔

شمیر ابن عبد المدان الیمانی کو بعض محدثین اسم تصغیر کے وزن پر شُمَیر کہتے ہیں یہ مقبول راوی ہے۔

ابو داؤد نے یہ حدیث (۳-۱۷۴) کتاب "الامارۃ" باب "فی اقطاع الارض" میں روایت کی ہے۔ ابن ماجہ (۲-۷۲) اور ابن حبان نے اپنے طریقے کے مطابق اس حدیث کے مجہول راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اور اس روایت کو اپنی الصحیح میں شامل کیا ہے حافظ الہیثمی نے "موارد الظمآن فی زوائد ابن حبان" (ص ۲۷۸) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

جمہور محدثین کا موقف یہ ہے کہ راوی کے مجہول ہونے کی علت تب زائل ہوتی ہے جب دو مشہور راوی اس سے روایت کریں۔ ابن عبد البر نے محدثین سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ خطیب بغدادی کا قول بھی یہی ہے۔ دیکھیے

مجھے معلوم ہوا ہے کہ دارقطنی ۳-۲۷ اور ۴-۲۲۱ اور الکفایہ (ص: ۸۵) نے یہ حدیث دو سندوں کے ساتھ روایت کی ہے۔

سے مأرب میں نمک کی کان عطا کرنے کی درخواست کی تھی۔ آپ نے عنایت فرما دی۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں آپ نے اس کو کیا چیز عطا کی ہے؟ وہ پانی کا چشمہ ہے جو مسافروں کے لیے وقف ہے، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے واپس لے لیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاکم جب کوئی غلط فیصلہ صادر کر دے تو اس کو اس سے رجوع کرنا چاہیے۔

موطا[۳] امام مالک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث المزنی کو قبلیہ کی کانیں عطا کیں۔ یہ

ایک تو سابق الذکر سند کے ساتھ اور دوسرے بروایت فرج بن سعید بن علقمہ بن ابیض بن حمال عن عمہ ثابت بن سعید بن ابیض بن حمال، عن سعید بن ابیض بن حمال، عن ابیہ ابیض۔ یہ سند صحیح اور ثابت ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس کے بدلے میں آپ نے ابیض بن حمال کو زمین اور کھجوروں کا باغ عطا کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمک کی کان اس مشہور قاعدہ کی بنا پر واپس لی کہ لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں یعنی پانی، گھاس اور آگ۔"

ابو علیہ کہتے ہیں "الماء العد" اس چشمے یا کنوئیں کو کہتے ہیں جس کے پانی کا خزانہ زمین میں موجود ہو۔ دیگر اہل لغت کہتے ہیں کہ "الماء العد" اس پانی کو کہتے ہیں جو زیر زمین جمع اور تیار رہے۔ اگر ایسے سرچشمے کو جاگیر کے طور پر دے دیا جائے تو حکم نافذ العمل نہیں ہوگا۔ اس میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں گے۔ جو بھی وہاں پہنچے گا اس سے استفادہ کرنے کا مجاز ہوگا۔ "الاحکام السلطانیہ للماوردی" ص ۱۹۷، اور معجم ما استعجم (۴-۱۱۷۰)

[۱] "المأرب" (بفتح الاول والثانی) اس کے بعد الف پھر راء مہملہ مکسورہ پھر باء معجمہ ہے۔ یمن میں ایک جگہ کا نام ہے۔ حسن بن احمد بن یعقوب کہتے ہیں کہ یہ عاد کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ یہ مقام اسی نام سے موسوم ہوا۔ (معجم ما استعجم ۴-۱۱۷۰)

[۳] موطا امام مالک (۱-۱۹۰) کتاب الزکوٰۃ" باب زکوٰۃ المعادن" بروایت ربیعہ بن ابی عبد الرحمن، متعدد راویوں سے مروی ہے

جلال الدین سیوطی "تنویر الحوالک" میں لکھتے ہیں:۔

" ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ موطا امام مالک کی یہ حدیث سب راویوں کے نزدیک مرسل ہے۔ البزار نے یہ عبد العزیز الدراوردی، عن ربیعہ، عن حارث بن بلال بن حارث المزنی عن بلال بن حارث کی متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث ابوداؤد (۳-۱۷۳) کتاب "الامارۃ" باب "فی اقطاع الارضین" میں امام مالک کی سند کے ساتھ مرسلاً مذکور ہے۔ المنذری نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد نے عباس کی متصل سند کے ساتھ بھی روایت کی ہے۔ عباس بطریق حسین محمد، عن ابو العباس اویس، عن کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف المزنی، عن ابیہ، عن جدہ روایت کرتے ہیں۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ حضور نے اسے اس علاقے کا بلند اور نشیبی حصہ سب عطا کر دیا۔"

عباس کے علاوہ دوسرے راویوں نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ آپ نے بلال بن حارث کو اس علاقہ کی نشیبی و بالائی جو زمین قابل کاشت تھی عطا کی۔ آپ نے اسے کسی مسلمان کا حق نہیں دیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک

کانیں الفرع کے نواح میں واقع تھیں۔ ابن سحنون کی کتاب میں ابن نافع کا قول منقول ہے اور ابن ابی زید نے النوادر میں بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ کسی کو الاٹ نہیں کی گئی تھیں، بلکہ یوں ہی پڑی ہوئی تھیں۔

لیکن الاُصیلی کہتے ہیں یہ اراضی مملوکہ تھی اور مدینہ کے قریب واقع تھی۔

ابوداؤدؒ اور ابوداضحہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

دستاویز لکھوا کر دی جس میں تحریر تھا:

" اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جو رحم کرنے والا مہربان ہے۔ یہ وہ تحریر ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث المزنی کو دی۔ میں نے اسے القبلیہ کی کانیں اور وہاں کا نشیبی اور بالائی رقبہ عطا کیا۔"

ابوداؤدؒ نے بطریق ثور بن زید مولیٰ بنی الدیل بن بکر بن کنانہ، عن عکرمہ، عن ابن عباسؓ اسی طرح ہی روایت بیان کی ہے۔ المنذری کہتے ہیں کہ ابوعمرو کے مطابق یہ حدیث بروایت ابن عباسؓ غریب ہے۔ اس کو کوئی بھی ابواویس عن ثور کی سند کے ساتھ روایت نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی ثقہ راوی نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

امام مسلم نے ابواویس عبداللہ بن عبداللہ سے صرف کسی دوسری صحیح حدیث کی تائید میں کوئی حدیث روایت کی ہے جبکہ اکثر لوگوں نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

یہ حدیث حاکم نے "المستدرک" (۵ - ۵۱۷) میں اور الطبرانی نے المعجم الکبیر میں روایت کی ہے۔ یاقوت حموی نے اس روایت کو معجم البلدان (۷ - ۳۹) میں حمید بن صالح عن الحارث بن یحییٰ و بلال بن یحییٰ عن ابیہما عن جدہما بلال بن الحارث کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں حاکم نے یہ حدیث المستدرک (۱ - ۴۰۴) میں زبیر عن حارث بن بلال بن حارث عن ابیہ کی سند کے ساتھ بھی روایت کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر صحیحین نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ذہبی نے بھی اس بات سے موافقت کی ہے۔

یحییٰ بن آدم نے "کتاب الخراج" (ص ۸۹) میں یہ حدیث اسماعیل، عن حسن، عن یحییٰ، عن یونس، عن محمد بن اسحاق، عن عبداللہ بن ابی بکر کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل اضافہ بھی ہے

" جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپؓ نے بلالؓ سے کہا تم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وسیع اراضی کا مطالبہ کیا تھا جو آپؐ نے پورا کر دیا۔ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ سائل جو کچھ بھی مانگتا آپ اس کو عطا فرما دیتے۔ لیکن جس زمین پر تم قابض ہو اسے تم کاشت نہیں کر سکتے۔ اس نے اعتراف کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جس قدر اراضی سے تم استفادہ کر سکتے ہو وہ رکھ لو اور جو تمہارے بس میں نہیں وہ ہمیں واپس کر دو تاکہ ہم اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ بلالؓ نے کہا۔ بخدا جو چیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا کی ہے میں اسے واپس نہیں کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ بخدا تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔" چنانچہ جس زمین کو وہ آباد نہ کر سکے تھے وہ آپؓ نے ان سے واپس لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دی۔"

له ابوداؤد (۲ - ۲۲۰) کتاب "النکاح" باب "النھی عن تزویج من لم یلد من النساء" میں یہ حدیث بروایت الحسین بن واقد، عن عمارہ بن ابی حفصہ، عن عکرمہ، عن عبداللہ بن عباس روایت کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں نسائی (۲ - ۱۰۷) کتاب "الطلاق" باب "ماجاء فی الخلع" میں یہ حدیث دو سندوں کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ =

کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ! میری بیوی کسی چھونے والے کے ہاتھ کو نہیں روکتی"۔

ایک بطریق حسین بن واقد اور ثانیاً بطریق نضر بن شمیل، عن حماد بن سلمہ، عن ہارون بن رئاب، عن عبداللہ بن عبید بن عمیر، عن عبداللہ بن عباس۔ نسائی کہتے ہیں یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔

المنذری مختصر ابی داؤد میں اس حدیث کو نسائی کی جانب منسوب کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس کی سند میں مذکور راویوں کو بخاری و مسلم دونوں نے ثقہ قرار دیا ہے۔ دارقطنی نے ذکر کیا ہے کہ حسین بن واقد اس کو عمارہ بن ابی حفصہ سے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ اسی طرح فضل بن موسیٰ شیبانی اس کو حسین بن واقد سے تنہا روایت کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

"ابن الجوزی امام احمد بن حنبل سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ بھی ثابت نہیں ہے اور اس حدیث کی کوئی اصل نہیں جس سے استدلال کیا جا سکے۔ ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوعات کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے اس کو صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، یعنی ابوداؤد کی مذکورہ بالا سند کے ساتھ۔ اس کی ایک اور سند بھی ہے، ابن ابی حاتم کہتے ہیں میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا جس کو معقل نے بروایت ابوالزبیر عن جابر نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ حدیث بروایت محمد بن کثیر، عن معمر، عن عبدالکریم، عن ابی الزبیر، عن مولیٰ بنی ہاشم سنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی آیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی۔ (تا آخر)

یہ حدیث سفیان ثوری نے بھی روایت کی ہے۔ انھوں نے اس آدمی کا نام ہشام مولیٰ بنی ہاشم بتایا ہے۔ یہ حدیث الخلال، الطبرانی اور البیہقی نے بسند دیگر عُبید اللہ بن عمرو سے بھی روایت کی ہے۔ عُبید اللہ اس کو بروایت عبدالکریم بن مالک، عن ابی الزبیر، عن جابر نقل کرتے ہیں۔ اس روایت کے الفاظ ہیں کہ "چھونے والے کے ہاتھ کو روکتی نہیں"۔ دیکھئے التلخیص الحبیر (۳-۲۲۵)

بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام ثابت اَزدی اور کنیت ابو روح یا ابوالحکم ہے۔ امام احمد، ابن معین، ابوزرعہ، ابن سعد اور نسائی نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ سلیمان بن سعید الیمامی نے اس کی تعریف کی ہے۔ ابن حبان نے اس کو ثقہ راویوں کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔

لہ اصل متن میں لَا تَمْنَعُ یَدَ لَامِسٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جو شخص اس سے بدکاری کرنا چاہتا ہے اسے روکتی نہیں۔ دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اس سے اس کے خاوند کی کوئی چیز طلب کرتا ہے وہ اسے دے دیتی ہے۔

پہلا مفہوم ابوعُبید، الخلال، نسائی، ابن العربی، الخطابی، الغزالی اور نووی سے منقول ہے۔ دوسرا مفہوم امام احمد، اصمعی اور محمد بن ناصر سے منقول ہے۔

بعض اہل علم اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ جو شخص اپنا ہاتھ بڑھا کر اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اسے روکتی نہیں ہے

حضورؐ نے فرمایا "اسے طلاق دے دو"۔ مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اسے دفع کرو"۔ اس شخص نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ میرا نفس اس کا پیچھا کرے گا"۔ الواضحہ میں ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا"۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو اس سے فائدہ اٹھاتے رہو"۔[1]

سعد بن عبادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! یہ فرمائیے کہ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو قابلِ اعتراض حالت میں پاؤں تو کیا اسے قتل کر دوں یا اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چار گواہوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(کَفٰی بِالسَّیْفِ شَـ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم دراصل فرمانا یہ چاہتے تھے "کَفٰی بِالسَّیْفِ شَاهِدًا (تلوار کافی گواہ ہے) مگر "شا" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا: کہیں ایسا نہ ہو کہ غیرت مند اور نشہ میں سرشار لوگ یونہی ایسا کرنے لگیں۔ واللہ اعلم۔

اور اگر اسے جماع سے کنایہ قرار دیا جائے تو بہتان لگانے والا قاذف ٹھہرے گا۔ یا یہ مطلب کہ اس کے خاوند کا یہ خیال تھا کہ اگر کوئی شخص اس سے برائی کرنا چاہے تو اسے روکتی نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع اس طرح کرتی ہے۔ (ملاحظہ ہو تلخیص الحبیر)

[1] بعض روایات میں اس کی جگہ "تو اسے روکے رکھو" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو تلخیص الحبیر (۳-۲۲۵) — حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بعض متاخرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی جنسی خواہش کی تسکین کا اس حد تک خیال رکھو کہ وہ زنا سے رکی رہے۔ اسی طرح اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اپنے مال کی اس قدر حفاظت اور اپنی بیوی کی اس قدر نگرانی کرو کہ وہ بے جا خرچ کرنے سے باز رہے۔

[2] یہ حدیث بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے۔ اس حدیث کی شرح اور اس سے متعلقہ احکام کے بارے میں اہل علم کے اختلاف کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

کتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام

"شرف المصطفیٰ" اور دوسری کتابوں میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شکاری کتے کے تاوان کے بارے میں چالیس درہم کا فیصلہ کیا تھا اور کھیتی کی نگرانی کرنے والے کتے کے تاوان کے بارے میں غلے کا ایک فرق (ایک پیمانہ) اور بکریوں کی رکھوالی کرنے والے کتے کے تاوان کے بارے میں ایک بکری کا[1]۔

"المدونہ"[2] "کتاب الغصب" میں ہے کہ میں نے دریافت کیا کیا امام مالک کتوں کے تاوان کی مقدار مقرر کیا کرتے تھے، مثلاً

---

[1] مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ حدیث کس نے مرفوعاً روایت کی ہے، البتہ دارقطنی (۴-۲۴۳) نے بروایت اسماعیل عن عبداللہ بن عمرو کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ کہ آپ نے شکاری کتے کے تاوان کے بارے میں چالیس درہم کا، بکریوں کے محافظ کتے کے تاوان کے بارے میں ایک بکری اور کھیتی کی نگرانی کرنے والے کتے کے تاوان کے بارے میں ایک فرق غلہ کا اور گھریلو کتے کے تاوان کے بارے میں ایک فرق مٹی کا فیصلہ کیا تھا۔ کتے کو مارنے والے کے ذمے یہ قیمت واجب الادا ہے۔ کتے کا مالک یہ قیمت قاتل سے وصول کرے۔ اس کے علاوہ اس سے کتے کو مارنے والے شخص کو جو گناہ ہوگا وہ الگ بات ہے۔

لیکن اس حدیث کی سند میں اسماعیل بن جستاس راوی ہے جس کو ازدی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ بخاری نے بھی اس کو ضعیف کہا ہے۔ (دیکھیے المیزان للذہبی (۱-۲۵۵) المغنی (۱-۸۰) اور ابن ابی حاتم فی الجرح والتعدیل (۲-۱۶۴)

الزبیدی نے "الجواھر المنیفۃ" (۲-۵) میں سعید بن منصور کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ ابن عدی نے الکامل میں امام بخاری کا قول نقل کرنے کے بعد ذکر کیا ہے کہ بخاری نے جو کچھ ذکر کیا ہے مجھے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔

طحاوی نے دعویٰ کیا ہے کہ مندرجہ ذیل آیت نازل ہونے کے بعد کتے کا تاوان وصول کرنے کی حرمت منسوخ ہو چکی ہے۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ	لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے حلال کیا گیا ہے۔ کہو تمہارے لیے
وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا	ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اور جن شکاری جانوروں کو
عَلَّمَكُمُ اللَّهُ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ۔ (المائدہ: ۴)	تم نے سدھایا ہو وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو۔

طحاوی کہتے ہیں: اس آیت نے سدھائے ہوئے کتوں کو ان جانوروں کے زمرہ میں شامل کر دیا ہے جن کا رکھنا جائز ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو پالنا، ان کی قیمت وصول کرنا اور ان کو ہلاک کرنے والے سے تاوان وصول کرنا سب کچھ صحیح اور جائز ہوا۔ اس ضمن میں صحابہ و تابعین سے یہی مروی ہے۔ پھر انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔ (شرح معانی الآثار ۴-۵۷)

[2] المدونۃ (۵-۳۶۶)

کھیتی کی حفاظت کرنے والے کتے کا تاوان ایک فرق غلہ، چوپایوں کی نگرانی کرنے والے کتے کا تاوان ایک بکری اور شکاری کتے کا تاوان چالیس درہم؛ راوی نے جواب دیا کہ امام مالک اس قسم کی تعیین نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ فرمایا کرتے تھے کہ کتے کے مارنے والے پر اس کا تاوان واجب الاداہے۔ امام مالک کے اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث تو معروف تھی البتہ انھوں نے اس سے باقاعدہ احکام کا استنباط نہیں کیا۔

قاضی ابن زیاد اپنی کتاب "الاقضیہ والاحکام" میں کہتے ہیں کہ کتوں کے بارے میں وارد احکام سے پتہ چلتا ہے کہ آبادیوں میں پائے جانے والے پالتو کتے اکثر لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔ وہ انھیں کاٹ کھاتے ہیں، خصوصاً بچوں کو زخمی کر دیتے ہیں، چنانچہ سگ گزیدہ لوگ اکثر عدالتوں میں مقدمات دائر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے حاکم وقت کو چاہیے کہ پالتو کتوں مثلاً شکار، یا کھیتی اور چوپایوں کی نگرانی کے لیے پالے ہوئے کتوں کو چھوڑ کر باقی سب کو ہلاک کروا دے۔ اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جس نے شکار کرنے والے اور چوپایوں اور کھیت کی نگرانی کرنے والے کتے کے علاوہ کوئی اور کتا پالا تو اس کے اجر و ثواب میں سے ہر روز ایک قیراط کم ہوتا رہے گا۔"[1]

---

[1] بخاری نے یہ حدیث کتاب الحرث والمزارعة "باب اقتناء الکلب للحرث" میں عن ابی ہریرہ کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث ۲۳۲۲) حدیث کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

جس نے کھیتی باڑی اور مویشیوں کی حفاظت کے علاوہ کسی اور غرض سے کتا پالا اس کے اعمال میں سے ہر روز ایک قیراط (ایک پیمانہ) کم ہوتا رہے گا۔

ابن سیرین اور ابو صالح ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بکریوں اور کھیتی کی حفاظت کرنے والے اور شکاری کتے کو چھوڑ کر"

ابو حازم حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں "شکاری اور چوپایوں کے محافظ کتے کو چھوڑ کر"

ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث اکثر محدثین نے نقل کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث میں "کلب زرع" (کھیتی کا محافظ کتا) کے اضافی الفاظ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ تنقید کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم (۳-۱۲۰۲) کتاب المساقاة "باب الامر بقتل الکلاب" میں عمرو بن دینار عن عبداللہ بن عمر منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شکار کرنے والے اور بکریوں کے محافظ کتے کو چھوڑ کر باقی کتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ابو ہریرہ تو کہتے ہیں کہ کھیتی کی نگرانی کرنے والا بھی مستثنیٰ ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عبداللہؓ نے فرمایا: ابو ہریرہ یہ بات اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے پاس کھیت ہیں۔

کہا گیا ہے کہ اس سے حضرت ابن عمر کا مقصد حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کی تائید و تقویت ہے یعنی وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہ زراعت پیشہ تھے۔ اس لیے انھوں نے زراعت سے متعلق الفاظ کو خاص طور سے ذہن میں محفوظ رکھا۔ اس لیے کہ جو شخص کسی پیشہ سے وابستہ ہوتا ہے وہ اس سے متعلق شرعی احکام کو جاننے کا زیادہ خواہاں ہوتا ہے۔ (فتح الباری ۵-۶)

مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے جس شخص کو اس کام پر مامور فرمایا اس کا گزر ایک نابینا عورت کے گھر کے پاس سے ہوا جس نے ایک کتا پال رکھا تھا۔ اس نے کتے کو ہلاک کرنا چاہا لیکن وہ عورت آڑے آئی۔ وہ عورت کہنے لگی تم دیکھ رہے ہو کہ میں نابینا عورت ہوں۔ یہ کتا مجھ کو درندوں سے بچاتا اور آنے والوں کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔" اس شخص نے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عورت کے حالات سے آگاہ کیا۔ آپ نے اس کے باوجود اس کتے کو ہلاک کرنے کا حکم دیا اور اس عورت کا کوئی عذر قبول نہ کیا۔ یہ بات محمد بن عمر بن لبابہ اور دیگر اہل علم نے بھی بوجوہ تفصیل بیان کی ہے۔[1]

بعض شارحین کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کا مقصد اس سے کثرت روایات کی بنا پر ابوہریرہؓ کو مطعون کرنا ہے۔ بہرکیف ابن عمرؓ کا مقصد کچھ بھی ہو دیگر صحابہ سے ایسی روایات منقول ہیں جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی مؤید ہیں۔ اور ان میں "کلب زرع" کے الفاظ موجود ہیں۔ اس سے اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے جس کا تذکرہ میں نے ابوہریرہؓ کے دفاع سے متعلق اپنی کتاب "ابوھریرۃ فی ضوء مرویاتہ" میں کیا ہے۔ ذیل میں اس حدیث کی مؤید بعض روایات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ کا پہلا مؤید سفیان بن ابی زہیر ہے۔ امام بخاری نے اسی باب میں اور مسلم نے سائب بن یزید (ایک صغیر السن صحابی) سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے سفیان بن ابی زہیر (ازد شنوءۃ قبیلے کے ایک صحابی) سے سنا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

"جس نے کھیتی اور مویشیوں کی حفاظت کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے کتا پالا ہر روز اس کے اعمال میں سے ایک قیراط کی کمی ہوتی رہے گی۔"

سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کیا تم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات خود سنی تھی؟ سفیان نے کہا "ہاں! اس مسجد کے رب کی قسم میں نے یہ بات حضور سے خود سنی تھی۔

۲۔ دوسرے شاہد عبداللہ بن مغفل ہیں۔ مسلم اور ترمذی نے عبداللہ بن مغفل سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر جب حضور خطبہ دے رہے تھے تو آپ کے چہرہ مبارک سے درخت کی ٹہنیاں اوپر اٹھائے رکھنے والوں میں سے میں بھی تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر کتے خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق نہ ہوتے تو میں ان کو ہلاک کرنے کا حکم صادر کر دیتا۔ ہر کالے رنگ کے کتے کو ہلاک کر دیا کرو۔ جو گھر والے کتے کو پالیں ان کے اعمال میں سے ہر روز ایک قیراط کی کمی ہو جاتی ہے۔ بجز شکاری کتے کے یا وہ کتا جو کھیت یا بکریوں کی حفاظت کے لیے پالا گیا ہو۔" یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔

ان دو تائیدی روایات سے حضرت عبداللہ بن عمر کے قول سے پیدا ہونے والے اشکال کا ازالہ ہو جاتا ہے اور حضرت ابوہریرہ کی روایت میں موجود اضافہ کی تائید ہوتی ہے۔

[1] میں نے مسند ابو یعلیٰ میں بروایت ابو رافع اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ دیکھا ہے۔ ابو رافع کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ میں جس کتے کو دیکھتا ہلاک کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کتا گھوم رہا ہے۔ اسے

(بقیہ حاشیہ)

ہلاک کرنے کے لیے میں آگے بڑھا۔ تو گھر کے اندر سے آواز آئی کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا اس کتے کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا میں ناتواں عورت ہوں۔ یہ کتا مجھے درندوں سے بچاتا اور آنے والے سے آگاہ کرتا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے مجھے اس کتے کو ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ (المطالب العالیہ۔ (۲-۲۹۴) اور "شرح معانی الآثار" (۴-۵۳)

مسند الحارث میں ابورافع سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ مدینہ کے ہر کتے کو ہلاک کر ڈالو بقیع کے نزدیک چند خواتین نے ایک کتا پال رکھا تھا۔ انھوں نے کہا ابورافع! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے مردوں کو جنگ میں شرکت کرنے کے لیے بھیج دیا۔ یہ کتا ہماری حفاظت کرتا ہے اور کسی کو ہمارے پاس آنے نہیں دیتا اور جب کوئی ہمارے پاس آنا چاہتا ہے تو ہم میں سے ایک کتے کو روکے رکھتی ہے، لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات عرض کریں۔" چنانچہ ابورافع نے یہ ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا ابورافع اسے ہلاک کر دو۔ خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ (حوالہ مذکور)

الہیثمی "مجمع الزوائد" (۴-۴۴) میں لکھتے ہیں کہ البزار اور احمد نے یہ حدیث ایسی سندوں کے ساتھ روایت کی ہے۔ جن میں سے بعض کے راوی صحیحین کے راویوں میں سے ہیں۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابورافع کو کتوں کے ہلاک کرنے پر مامور فرمایا تھا۔

کنوئیں کے حریم[1] کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

ابن ابی زید کی کتاب "النوادر" میں ہے کہ ابن نافع نے کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے[2] کہ پرانے کنوئیں کا حریم پچاس

---

[1] الحریم :۔ ابن الاثیر "النہایۃ" میں لکھتے ہیں :۔

حریم کنوئیں کے ارد گرد کی زمین کو کہتے ہیں جہاں کنواں کھودتے وقت اس کی مٹی ڈالی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص بنجر زمین میں کنواں کھودے وہاں کسی دوسرے شخص کو اس میں اترنے یا کھودنے والے سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو حریم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا داخلہ یا تصرف ممنوع ہوتا ہے۔ یا اس لیے کہ کنوئیں کے مالک کو اس میں تصرف سے روکنا ممنوع ہے۔

کنوئیں کئی قسم کے ہوتے ہیں :۔

۱۔ بئر الناضح :۔ رہٹ جس سے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔

۲۔ بئر العطن :۔ جس سے چوپایوں کو پانی پلایا جاتا ہے۔

۳۔ بئر العادیۃ :۔ بتشدید الیاء۔ پرانا کنواں اسے عاد کی جانب نسبت کی وجہ سے "العادیۃ" کہتے ہیں۔ عاد سے یہاں قدیم ہونا مراد ہے۔ حقیقتاً قوم عاد مراد نہیں۔

۴۔ بئر البدی :۔ نیا کنواں جس کا پہلے کوئی نشان نہ ہو۔

کنوئیں تین مقاصد کے لیے کھودے جاتے ہیں :۔

۱۔ مسافروں کے لیے۔ اس کا پانی مشترک ہوتا ہے اور کھودنے والے کا حق بھی اس میں دوسروں کے برابر ہی ہوتا ہے۔

۲۔ ایسا کنواں جو صرف استفادہ کرنے کے لیے کھودا جائے۔ مثلاً بدوی لوگ جب کسی چراگاہ میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں تو اپنے اور اپنے مویشیوں کے لیے پانی کے حصول کی غرض سے کنواں کھود لیتے ہیں۔ پھر جب تک وہاں رہتے ہیں وہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کے زیادہ حقدار ہوتے ہیں البتہ انھیں چاہیے کہ وہ زائد از ضرورت پانی دوسروں کو دے دیا کریں۔ اور جب وہ وہاں سے کوچ کر جائیں تو سب مسافر اس سے یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح ابتدا میں تو وہ کنواں پرائیویٹ ہوتا ہے، مگر بعد میں پبلک بن جاتا ہے اور اگر یہ کنواں کھودنے والے لوگ کبھی دوبارہ وہاں آئیں تو وہ اور دوسرے لوگ کنوئیں میں برابر کے شریک ہوں گے، جو آدمی پہلے وہاں پہنچے گا وہ دوسروں کی نسبت کنوئیں کا زیادہ مستحق ہوگا۔

۳۔ وہ کنواں جو ذاتی ملکیت کے طور پر کھودا جاتا ہے، جب تک اس سے پانی نہ نکلنے لگے تب تک اس کی ملکیت پختہ نہیں ہوتی۔

(الاحکام السلطانیہ للماوردی (ص ۱۸۲/۱۸۳) - (الاحکام السلطانیہ لابی یعلیٰ (ص ۲۰۱)

[2] یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ابن نافع عن ابن ذئب پر مشتمل روایت کا ماخذ کیا ہے البتہ یحییٰ ابن آدم کتاب الخراج (ص ۱۰۱) میں ابن المبارک -

ہاتھ اور نئے کا پچیس ہاتھ ہے۔ یہ حدیث ابن ابی ذئب نے ابن شہاب سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

عن یونس، عن زہری، عن سعید بن المسیب کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"نئے کنوئیں کا حریم چاروں طرف سے پچیس ہاتھ اور پرانے کنوئیں کا حریم چاروں طرف سے پچاس ہاتھ ہوتا ہے۔ آب پاشی والے کنوئیں کا حریم چاروں طرف سے تین سو ہاتھ ہوتا ہے۔"

زہری کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ چشموں کا حریم پانچ سو ہاتھ ہوتا ہے۔

معمر نے بھی زہری سے اسی طرح کی روایت بیان کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے سنا ہے کہ چشموں کا حریم پانچ سو ہاتھ ہوتا ہے۔

اور ابو حماد، سعید بن سفیان، اسماعیل بن اُمیہ سے۔ وہ زہری سے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت بیان کرتے ہیں۔ اس میں بھی نئے اور پرانے کنوئیں کی تفصیل موجود ہے۔ سعید نے اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ آب پاشی والے کنوئیں کا حریم تین سو ہاتھ ہوتا ہے۔

زہری کہتے ہیں کہ چشمے کا حریم تین سو ہاتھ ہوتا ہے۔

ابو حماد الحنفی ضعیف راوی ہے۔ اس کا نام مفضل بن صدقہ ہے۔ نسائی اسے متروک الحدیث کہتے ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ سنہ ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔

حاکم نے یہ حدیث "المستدرک" (۴-۹۷) میں یحیٰی عن سعید بن المسیب کی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کی ہے۔ حاکم مزید کہتے ہیں کہ یہ حدیث عمر بن قیس نے زہری، عن سعید، عن ابی ہریرہ کی متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

عمر بن قیس نہایت ضعیف راوی ہے۔ یہ سندل کے نام سے معروف ہے۔ نسائی، ابوداؤد اور دیگر محدثین نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ اس کا تعارف پہلے گزر چکا ہے۔

دارقطنی (۴-۲۲۰) نے یہ حدیث دو متصل سندوں کے ساتھ روایت کی ہے (۱) حسن بن ابی جعفر، عن معمر، عن زہری، عن سعید بن المسیب، عن ابوہریرہ (۲) محمد بن یوسف بن موسیٰ المقرئ، عن اسحاق بن ابی حمزہ، عن یحییٰ بن ابی الخطیب، عن ہارون بن عبدالرحیم، عن ابراہیم بن ابی عبلہ، عن زہری از سعید بن المسیب عن ابوہریرہ۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ جاری چشمے کا حریم تین سو ہاتھ ہوتا ہے۔ اور جس چشمہ سے کھیتوں کو سیراب کیا جائے اس کا حریم چھ سو ہاتھ ہے۔

دارقطنی کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث بروایت سعید بن المسیب مرسل ہے جس نے اس کو متصل روایت کیا اس نے غلطی کی۔

میں کہتا ہوں کہ پہلی سند میں حسن بن ابی جعفر ہے جو کہ ضعیف راوی ہے۔ ابن المدینی، احمد اور نسائی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ بخاری کہتے ہیں کہ یہ منکر الحدیث ہے۔ ذہبی نے "المیزان" (۱-۴۸۲) میں اس کا تعارف کرایا ہے۔ بخاری نے کتاب "الضعفاء الصغیر" (ص ۲۵۶) میں اور نسائی نے "الضعفاء والمتروکین" (ص ۲۸۸) میں اس کا تعارف درج کیا ہے۔

دوسری سند میں محمد بن یوسف بن موسیٰ ہے جس پر احادیث وضع کرنے کا الزام ہے۔ دارقطنی نے بھی اس کو وضاع قرار دیا ہے۔

بیہقی نے ایک اور سند کے ساتھ یہ روایت ابوہریرہ متصل سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ایسا ہے جس کا نام مذکور نہیں۔ ابوعبید نے کتاب الاموال (ص ۴۱۰) میں یہ حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔

روایت کی ہے۔

اشہب کہتے ہیں کہ سفیان نے یہ حدیث بروایت ابن شہاب عن سعید بن المسیب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نقل کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کھیتی سیراب کرنے والے کنویں کا حریم پانچ سو ہاتھ ہوتا ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ "حریم بئر الزرع" کے الفاظ حدیث کے ہیں یا یہ سعید بن المسیب کا قول ہے۔

ابن وہب نے یہ حدیث بطریق یونس عن ابن شہاب عن سعید بن المسیب روایت کی ہے۔

نئے اور پرانے کنویں کے سلسلے میں اس کی چاروں اطراف کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ

"کھیتی کو سیراب کرنے والے کنویں کا حریم تین سو ہاتھ ہوتا ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ چشموں کا حریم پانچ سو ہاتھ ہوتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہروں کا حریم ایک ہزار ہاتھ ہوتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس حدیث کی مرفوع اسناد میں سے کوئی بھی ضعیف یا متروک راویوں سے خالی نہیں ہے۔ اور صحیح بات وہی ہے جو دارقطنی نے کہی ہے کہ یہ حدیث بروایت سعید بن المسیب مرسل ہے۔ اسی لیے ابوداؤد نے اس کو "المراسیل" (ص ۴۴) میں شامل کیا ہے۔

یہ حدیث مختلف اسناد میں مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ ابن ماجہ (۲-۸۳۱) نے اپنے طریقے سے عبداللہ بن مغفل کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے کنواں کھودا اس کو چالیس ہاتھ جگہ اپنے چوپایوں کو پانی پلانے کے لیے دی جائے گی مگر اس حدیث کی سند میں اسماعیل بن مسلم ضعیف راوی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے یہ حدیث مسند میں بروایت ابوہریرہ ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے:

"جس نے کسی ایسی جگہ کنواں کھودنے میں سبقت کی جہاں کنواں کھودنے میں کسی دوسرے مسلمان نے سبقت نہ کی ہو تو وہ کنواں اسی کا ہے۔ اس کو پچاس ہاتھ زمین ہر جانب سے بطور حریم بھی دی جائے گی۔"

اس سے واضح ہوا کہ اس حدیث کے الفاظ میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ اصحاب احمد میں سے قاضی عیاض اور ابوالخطاب کہتے ہیں۔

"اس سے حریم کی تحدید مقصود نہیں۔ کنویں کا حریم اسی قدر ہونا چاہیے جتنا اس کے پانی کی سطح کو بلند کرنے کے لیے مطلوب ہو۔ اگر رہٹ ہو تو اس کا حریم اتنا ہونا چاہیے جو بیلوں وغیرہ کے چکر لگانے کے لیے کافی ہو۔ اور اگر آبپاشی کا کنواں ہو تو حریم اس کی گہرائی کی مناسبت سے ہوگا۔ دیکھیے المغنی ۵-۴۸۵"

امام مالک کے نزدیک حریم کی کوئی لگی بندھی حد نہیں ہے۔ بلکہ وہ حسب ضرورت اس قدر ہونی چاہیے جتنی کنویں کو نقصان پہنچنے سے بچانے کے لیے ضروری ہو۔"

اسی طرح شہری کنویں کے حریم کے بارے میں بھی امام مالک نے اسی طرح کی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں کنواں کھودا۔ بعد ازاں اس کے پڑوسی نے بھی اپنے ہاں کنواں کھودا، تو اگر اس کے نتیجہ میں پہلے کنویں کا پانی دوسرے کنویں کی جانب منتقل ہو گیا، تو اس صورت میں پڑوسی کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنا کنواں وہاں سے منتقل کر دے۔

یہ بات ابوعبید نے بیان کی ہے۔

ابن وہب کی ایک اور روایت میں جو انھوں نے حضرت عمرؓ سے نقل کی ہے کہ پرانے اور نئے کنوئیں کے بارے میں وہی الفاظ منقول ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔

چشموں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ ان کا حریم پانچ سو ہاتھ ہوتا ہے اور وہ کنواں جس میں سے سانڈنی کے ذریعے پانی نکال کر کھیتوں کو سیراب کیا جائے اس کا حریم تین سو ہاتھ ہوتا ہے۔

ابن شہاب جن اہل علم سے ملے وہ فیصلہ کیا کرتے تھے کہ جو چشمے دلدل والی زمین میں ہوں ان کا حریم نو سو ہاتھ ہوتا ہے۔ اور اگر پتھریلی زمین ہو تو چار سو پچاس ہاتھ

= امام شافعی کے ساتھی حریم کے معاملہ کو عرف و عادت پر چھوڑتے ہیں۔ ابو اسحاق شیرازی نے المہذب میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"شافعیہ میں سے امام نووی نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جو کنواں صحرا میں کھودا جائے اس کا حریم اتنا ہونا چاہیے جو رہٹ چلانے والے اونٹ کے لیے کافی ہو۔ الرملی نے کہا ہے کہ آیا یہ اندازہ چاروں جانب سے معتبر ہے یا صرف ایک طرف سے۔ اس سلسلے میں اقرب الی القیاس عرف و عادت کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اس لیے کنوئیں کا حریم اس کی چاروں طرفوں سے اتنا ہونا چاہیے جو وہاں کام کرنے کے لیے کافی ہو۔ اور مناسب ہے کہ کنوئیں کے حریم کو حسب ضرورت توسیع دی جائے۔ دیکھیے "شرح المہذب" (۴ - ۷۰)

امام ابوحنیفہ نے اس ضمن میں وہی موقف اختیار کیا ہے جو حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

"جس کنوئیں سے اونٹوں اور بکریوں کو پانی پلایا جائے اس کا حریم چالیس ہاتھ ہے"

امام شعبی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث ابو عبید نے اپنی سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے۔

امام ابوحنیفہ کے شاگرد قاضی ابویوسف نے مندرجہ ذیل فیصلہ کیا ہے:۔

۱- کنواں اگر چوپایوں کو پانی پلانے کے لیے کھودا گیا ہو تو اس کا حریم چالیس ہاتھ ہے۔

۲- اور اگر اس میں سانڈنی کو جوتا جاتا ہو تو اس کا حریم پچاس ہاتھ ہے۔

۳- چشمے کا حریم پانچ سو ہاتھ ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ کنواں ایسے صحرا میں کھودا گیا ہو جو کسی مسلم یا معاہد غیر مسلم کی ملکیت نہ ہو۔ (کتاب الخراج قاضی ابویوسف ص ۱۱۹)

کسی چیز کی خرید و فروخت کے لیے مقرر کردہ وکیل کے کمائے گئے نفع کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

لہ "الوکیل" کا مصدر "وکالۃ" (بفتح الواؤ وکسرہا) ہے۔ اس کے معنی سپرد کرنے اور حفاظت کرنے کے ہیں۔ عربی محاورہ میں کہتے ہیں "وکلت فلانا" یعنی میں نے اسے حفاظت کا کام تفویض کیا۔

وکالت کتاب وسنت اور اجماع کی رُو سے جائز اور درست ہے:۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا (التوبۃ - ۶۰)

صدقات فقراء، مساکین اور اس سلسلے میں کام کرنے والوں کے لیے ہیں۔

قاضی ابوبکر ابن العربی کہتے ہیں کہ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو زکوٰۃ فراہم کرنے پر مامور کیا جاتا ہے۔ القرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو حکومت زکوٰۃ فراہم کرنے کے لیے وکیل بنا کر اطراف ملک میں بھیجتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ (سورۃ الکہف - ۱۹)

اپنے میں سے ایک کو یہ سکے دے کر شہر بھیجو۔ وہ دیکھے کہ کون سا کھانا بہت عمدہ ہے۔ وہ اس میں سے تمہارے لیے کھانا لائے اور نرمی سے کام لے۔

ابن العربی "احکام القرآن" میں لکھتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقدِ وکالت جائز ہے۔ عقدِ وکالت ایک قسم کا عقدِ نیابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ضرورت و مصلحت کے پیش نظر اس کی اجازت دی ہے۔

اسی طرح سنت سے بھی وکالت کا جواز ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ابو داؤد اور ابن ماجہ زبیر بن الخریت، عن ابی لبید، عن عروہ بن الجعد کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں ایک تجارتی کاروان آیا۔ آپؐ نے مجھے ایک دینار دے کر قافلہ والوں سے ایک بکری خریدنے کا حکم دیا، چنانچہ میں قافلہ والوں کے پاس گیا اور ایک دینار میں دو بکریوں کا سودا کیا۔ جب میں انھیں اپنے ہمراہ لا رہا تھا تو راستہ میں مجھے ایک آدمی ملا۔ میں نے ایک دینار کے عوض ایک بکری اس کے پاس فروخت کر دی۔ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بکری اور ایک دینار لے کر حاضر ہوا۔ میں نے عرض کیا حضورؐ یہ ہے آپؐ کا دینار اور یہ ہے آپؐ کی بکری۔ آپؐ نے فرمایا یہ کیسے!

امام مالکؒ اور شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے خرید و فروخت کے لیے وکیل مقرر کیا اور وکیل نے کوئی ایسی چیز خریدی یا فروخت کی جس میں لوگ بعض اوقات خسارہ اٹھاتے ہیں اور بعض اوقات نہیں، تو اس کی خرید و فروخت جائز ہو گی۔ وہ فسخ نہیں ہو گی اور وکیل کے لیے جائز نہیں کہ وہ (جان بوجھ کر) مؤکل کو سودے میں نقصان پہنچائے۔

میں نے ماجرا عرض کیا۔ آپؐ نے میرے حق میں دعا فرمائی:

"اے اللہ! اس کی تجارت میں برکت فرما" (یہ حدیث آگے آ رہی ہے)

غرضیکہ بکثرت احادیث سے وکالت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح وکالت اجماع سے بھی ثابت ہے، چنانچہ خرید و فروخت میں وکالت کو کسی نے بھی ممنوع قرار نہیں دیا۔ اس لیے کہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔

ابن قدامہؒ المغنیؒ (۵-۸۷) میں لکھتے ہیں:

"وکالت کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کے پاس مال تو ہوتا ہے مگر وہ خرید و فروخت کے انداز سے واقف نہیں ہوتے۔ یا ان کے پاس کاروبار کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا ہے یا ان کے لیے کاروبار کرنا عملاً ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک خاتون جو خود تجارت نہیں کر سکتی۔ یا ایک ایسا شخص کہ کاروبار کرنا اس کے شایان شان نہ ہو۔ غرضیکہ شریعت نے بوقت ضرورت انسان کی، جسے عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مصلحت اور بہتری کے پیش نظر کاروبار میں توکیل کو جائز قرار دیا ہے۔

یہ بیان اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ خرید و فروخت کے معاملات میں وکالت کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کے مطابق شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح عقد نکاح، طلاق اور مطالبہ حقوق کے سلسلے میں بھی علماء نے وکالت کو جائز قرار دیا ہے، البتہ کسی ایسے کام میں وکالت جائز نہیں جس میں کسی کو وکیل بنانے سے اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ مثلاً عبادات میں وکالت درست نہیں۔ اس لیے کہ عبادت کی غایت عجز و نیاز اور اظہار عبودیت ہے۔ ظاہر ہے کہ وکیل کے خشوع و خضوع سے مؤکل کا عجز و انکسار لازم نہیں آتا۔ اس لیے عبادات میں وکیل بنانے سے ان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، لہٰذا عبادات میں وکالت کو جائز قرار نہیں دیا گیا۔ دیکھیے الفروق للقرافی (۲/۴-۲۶)

۱؎ عبدالرحمٰن بن القاسم کہتے ہیں کہ امام مالک نے اس کی مثال یہ بیان کی ہے کہ مؤکل وکیل کو لونڈی فروخت کرنے کے لیے دے لیکن اس کی قیمت نہ بتائے، وکیل اسے چار یا پانچ دینار کے عوض فروخت کر دے، حالانکہ لونڈی گراں قیمت ہو تو یہ جائز نہیں۔ دیکھیے المدونۃ (۴/۲۴۴-۲۴۴) اس کو فقہاء کی اصطلاح میں "غبن فاحش" کہتے ہیں۔ دیکھیے التعریفات للجرجانی (ص ۱۶۲)

۲؎ اس کی وجہ یہ ہے کہ وکیل کو مؤکل کی ضرر رسانی سے منع کیا گیا اور اس کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا حکم دیا گیا ہے، اگر اس کی کوئی چیز بازار سے کم قیمت پر فروخت کی جائے یا اس کے لیے کوئی چیز بازار کے بھاؤ سے مہنگے داموں خریدی جائے تو اس میں مؤکل کا نقصان ہے۔ مزید براں عرف عام میں خرید و فروخت کے وقت مارکیٹ کے نرخ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ (المہذب مع شرحہ المجموع (۱۳-۵۸۲)

امام مالک اور شافعی اس ضمن میں دوسرے اہل علم کے ساتھ متفق ہیں[1] کہ یتیم کی جانب سے وکالت کرنے والے کے لیے کسی ایسی چیز کی خرید و فروخت جائز نہیں جس میں عام طور سے خسارہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے :-

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرۃ - ۲۲۰)

اور تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان کی اصلاح بہتر ہے اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ مفسد کون ہے، اور مصلح کون اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

"الواضحۃ"[2] میں ابن المغیرہ، عن سفیان ثوری، عن ابی حُصَین عن حکیم بن حزام کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اکرم

امام احمد کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مؤکل جب وکیل کو خرید و فروخت کی بلا شرط اجازت دے دے تو اسے ہر قیمت پر خرید و فروخت کی اجازت ہے۔ اس لیے کہ مؤکل نے وکیل کو بلا شرط اجازت دی ہے۔ لہٰذا اسے کھلی رخصت پر محمول کرنا چاہیے، مگر صاحبین (امام یوسف اور امام محمد) امام ابو حنیفہ کے ساتھ اس بارے میں متفق نہیں ہیں۔

[1] المغنی (۵ - ۱۱۲)

[2] نیز دیکھیے ابوداؤد (۳ - ۲۵۶) کتاب "البیوع" بروایت ابو حُصَین عن شیخ من المدینۃ عن حکیم بن حزام۔ علاوہ ازیں ملاحظہ ہو دارقطنی (۳ - ۹) اور ترمذی (۳ - ۵۵۸) کتاب "البیوع" امام ترمذی صراحت کرتے ہیں کہ مدینہ کے اس شیخ کا نام حبیب بن ثابت ہے نیز یہ کہ یہ حدیث ہمارے علم کی حد تک صرف اسی سند کے ساتھ مروی ہے البتہ میرے نزدیک حبیب بن ثابت کا سماع حکیم بن حزام سے ثابت نہیں ہے۔

المنذری مختصر ابی داؤد میں کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے حبیب بن ثابت کے بارے میں امام ترمذی کا تبصرہ نقل کیا ہے اور آگے چل کر البارقی کی روایت کردہ حدیث پر گفتگو کی ہے۔

البارقی کی حدیث بخاری نے کتاب "المناقب" میں روایت کی ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۶۴۲) بروایت علی بن عبداللہ عن سفیان، عن شبیب۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک گروہ کو سنا جو عروہ سے روایت کرتا ہے۔ پھر حسب سابق الفاظ روایت کیے ہیں۔ سفیان کہتے ہیں کہ حسن بن عمارہ نے یہ حدیث ہمیں سنائی۔ حسن نے کہا یہ حدیث شبیب نے عروہ سے سنی لیکن سفیان کا بیان ہے کہ میں شبیب کے یہاں حاضر ہوا تو اس نے کہا کہ یہ حدیث میں نے عروہ سے نہیں سنی، بلکہ چند لوگوں سے سنا کہ وہ عروہ سے اس حدیث کو روایت کر رہے تھے۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (۶ - ۶۳۵) میں لکھتے ہیں :-

مجہول الحال راویوں کی بنا پر یہ حدیث ضعیف ہے۔ مگر اس کی مؤید ایک دوسری روایت ہے۔ جو احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بطریق سعید بن زید، عن زبیر بن خریت، عن ابی لبید، عن عروہ البارقی نقل کی ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے۔

نے ان کو ایک دینار دے کر قربانی کا جانور خریدنے کے لیے بھیجا۔ حکیم نے ایک دینار کے عوض قربانی کا جانور خریدا اور دو دینار کے بدلے اس کو فروخت کر دیا۔ پھر ایک دینار کے عوض ایک اور جانور خرید لیا۔ پھر قربانی کا جانور اور ایک دینار لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے وہ دینار صدقہ کر دیا اور حکیم کے لیے تجارت میں برکت کی دعا فرمائی۔

"الواضحہ" میں ہے کہ اس کے بعد حکیم بن حزام کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر وہ مٹی بھی خریدتے تو اس میں نفع ہوتا۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی چیز اس کی اجازت کے بغیر فروخت کر دے اور اس چیز کا مالک اس سودے کو جائز ٹھہرائے تو یہ بیع جائز ہے۔ اس کی مؤید وہ روایت[1] ہے جس میں ان تین اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے بارش کی وجہ سے ایک غار میں پناہ لی تھی۔ آخر میں پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا تھا۔ ان تینوں میں سے

البتہ ابو حماد سعید بن زید کے ابو لبید سے روایت کرنے کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ المزنی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ ان کے نزدیک البارقی سے مروی حدیث ثابت نہیں ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ امام شافعی نے البارقی کی روایت کو اس لیے ضعیف قرار دیا ہے شبیب بن غرقدہ نے اس کو ایک غیر معروف جماعت سے روایت کیا ہے۔ الخطابی کہتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں متصل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ حکیم بن حزام کی روایت میں ایک مجہول راوی ہے جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ کون ہے اور عروہ البارقی سے منقول روایت اس نے ایک گروہ سے روایت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی روایت حجت نہیں ہوتی۔

حافظ ابن حجر نے "التلخیص الحبیر" (۳-۵) میں بیہقی اور خطابی کا تبصرہ نقل کر کے اس پر سکوت اختیار کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک دونوں کا تبصرہ بجا اور درست ہے۔

[1] بخاری نے یہ حدیث کتاب "البیوع" باب "اذا اشتری شیئًا لغیرہ بغیر اذنہ" میں روایت کی ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۲۱۵)

جبکہ مسلم نے یہ حدیث کتاب "الذکر والدعاء" "فی قصۃ اصحاب الغار الثلاثۃ" میں بروایت ابن عمرؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:-

تین آدمی سفر پر روانہ ہوئے۔ راستہ میں بارش نے آلیا۔ وہ پناہ لینے کے لیے ایک غار میں چلے گئے۔ اچانک اوپر سے ایک پتھر لڑھک کر غار کے منہ کے سامنے آ گرا۔ (جس سے غار سے باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا) وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے اپنا سب سے بہتر عمل یاد کر کے اللہ کے حضور میں دعا کرو کہ وہ اس پتھر کو راستے سے ہٹا دے۔

ایک نے کہا میرے اللہ! میرے بوڑھے والدین تھے۔ میں بکریاں چرانے چلا جاتا اور واپس آ کر انھیں دوہتا۔ پھر دودھ لا کر پہلے والدین کو پلاتا اس کے بعد اپنے بیوی بچوں کو۔ ایک رات میں دیر سے گھر پہنچا۔ دیکھا تو والدین سو چکے تھے۔ میں نے انھیں جگانا مناسب نہ سمجھا جبکہ بچے بھوک سے تلملا رہے تھے۔ میں دودھ لیے کر انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ اے اللہ! اگر تو سمجھتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا تھا تو اس پتھر کو ہٹا دے تاکہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ راوی کا بیان ہے کہ پتھر تھوڑا سا ہٹ گیا۔

ایک نے ذکر کیا کہ میرے ایک مزدور نے اپنی مزدوری میرے پاس چھوڑ دی تھی۔ میں نے اس سے چند گائیں بھی خرید یں۔ اور ان کو چرانے کے لیے ایک چرواہا بھی۔ پھر جب وہ مزدور اپنی اجرت لینے کے لیے دوبارہ میرے پاس آیا تو میں نے یہ گلّہ اسے دے دیا۔

یہ امام مالک کا موقف ہے جبکہ دیگر اہلِ علم کے نزدیک یہ بیع جائز نہیں۔ چاہے اس چیز کا مالک اس کو درست بھی قرار دے دے اس لیے کہ یہ عقدِ فاسد ہے[1]۔

صحیح بخاری کتاب "المناقب" باب "سوال المشرکین ان یُریَھُم آیۃ" میں ہے کہ نبی کریمؐ نے انشقاقِ قمر کا معجزہ دکھایا۔

دوسرے شخص نے کہا "میرے اللہ! میں اپنے چچا کی بیٹی سے شدید محبت کرتا تھا جیسے کہ ایک آدمی ایک عورت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبت کر سکتا ہے۔ میرے چچا نے کہا تمھارا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک تم اسے ایک سو دینار نہ دو۔ میں نے محنت کر کے سو دینار کمائے اور اس کی نذر کیے۔ جب میں بدکاری کے لیے تیار تھا تو عین وقت پر اس نے کہا "خدا سے ڈر" اور ناحق یہ مُہر شکنی نہ کر"، میں اس کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اللہ! اگر یہ کام میں نے تیری رضا کے لیے کیا تھا تو اس پتھر کو ہٹا دے۔ راوی کا بیان کہ پتھر غار کے منہ سے دو تہائی ہٹ گیا۔

تیسرے شخص نے کہا اے اللہ میں نے ایک مزدور کو مکئی کی خاص مقدار کے عوض کام پر لگایا تھا جو میں نے اسے دے دی۔ اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس غلّے کو کاشت کیا اور جو پیداوار حاصل ہوئی اس کو فروخت کر کے چند گائیں اور ان کا چرواہا خریدا۔ وہ شخص پھر آیا اور اس نے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا جاؤ اور گایوں کا گلّہ اور چرواہا لے لو یہ سب کچھ تمھارا ہے۔ اس نے کہا کیا تم میرا مذاق اڑاتے ہو؟ میں نے کہا میں تمھارا مذاق نہیں اُڑاتا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ تمھارا ہے۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لیے انجام دیا تھا تو اس پتھر کو غار سے ہٹا دے۔ چنانچہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا۔

[1] ایسی خرید و فروخت کو فقہی اصطلاح میں "فضولی بیع" کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ اس طرح کی بیع مالک کی اجازت پر موقوف ہے اور جدید قول کے مطابق وہ باطل ہے۔ ابو ثور، ابن المنذر اور زیادہ صحیح روایت کے مطابق امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے جبکہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک فروخت کرنا درست ہے مگر خریداری ناجائز ہے۔

امام مالک کا مسلک، جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے۔ یہ ہے کہ اسی طرح کی بیع و شراء اور نکاح سب جائز ہیں۔ شافعیہ اس ضمن میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ حضورؐ نے اس چیز کو فروخت کرنے سے منع کیا ہے جو بائع کی ملکیت میں نہ ہو۔ مالکیہ عروہ البارقی کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ حدیث امام ابو حنیفہ کے خلاف حجت ہے جو بیع اور شراء میں فرق کرتے ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو صحیح بخاری "فی المناقب" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۶۳۷) بروایت انس بن مالک۔ حدیث کا مضمون یہ ہے کہ اہلِ مکہ نے جب رسول کریمؐ سے کوئی نشانی دکھانے کی فرمائش کی تو آپؐ نے انشقاقِ قمر کا معجزہ دکھایا۔ امام بخاری نے اس ضمن میں عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کردہ احادیث بھی نقل کی ہیں۔ انشقاقِ قمر کا واقعہ حضرت علیؓ، حذیفہ، جبیر بن مطعم، عبداللہ بن عمرؓ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۶ - ۶۳۲) میں لکھتے ہیں:-

کتاب "علامات النبوۃ" میں اور ابن شعبان کی کتاب میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ البارقی کو ایک دینار قربانی کا جانور خریدنے کے لیے دیا۔ انھوں نے دو جانور خریدے۔ پھر ایک جانور کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا اور آپ کے پاس ایک دینار اور قربانی کا جانور لے کر حاضر ہوئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے تجارت میں برکت کی دعا فرمائی۔ اس کے بعد ان کا معاملہ یہ ہوا کہ اگر مٹی بھی خرید لیتے تو اس میں نفع حاصل ہوتا۔

ابن شعبان نے حکیم بن حزام سے متعلق بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے، مگر "الواضحۃ" میں حکیم سے متعلق اس کے برعکس روایت منقول ہے جو زیادہ صحیح روایت "الواضحۃ" میں حکیم سے متعلق منقول ہے۔

وکالت کے جواز پر سب مسلمانوں کا اجماع منعقد ہوا ہے۔ وکیل موکل کے لیے رقم وصول بھی کر سکتا ہے اور اس کی طرف سے ادائیگی کرنے کا بھی مجاز ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات وصول کرنے کے لیے عمال کو بھیجا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کے جو مال وغیرہ ادا کرنے ہوتے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو وصول کرنے کے لیے صحابہ کو والی بنا کر بھیجا کرتے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضور نے بیت المال کی حفاظت کے لیے مامور فرمایا تھا۔ زکوۃ کے سلسلے میں جمع شدہ غلہ کی حفاظت پر حضرت ابوہریرہ کو متعین فرمایا تھا۔[1]

"انس اور ابن عباس تو واقعہ انشقاق قمر کے وقت موجود نہ تھے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ مکہ میں ہجرت سے پانچ سال پہلے وقوع پذیر ہوا تھا۔ عبداللہ بن عباس تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ انس اس وقت مدینہ میں تھے اور ان کی عمر اس وقت چار یا پانچ سال سے زیادہ نہ تھی، ممکن ہے کہ کوئی اور صحابی اس وقت موجود ہوں۔"

نوٹ:۔ انشقاق قمر سے متعلق احادیث کا ذکر "باب الوکالۃ" میں کرنے کی مناسبت میری سمجھ میں نہیں آئی۔

[1] حضرت ابوہریرہ کو مال زکوٰۃ کا محافظ مقرر کرنے کا واقعہ امام بخاری نے کتاب "الوکالۃ" باب "اذا وکل رجلا فترک الوکیل شیئا فاجازہ الموکل" میں نقل کیا ہے۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۳۱۱) صحیح بخاری کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زکوٰۃ (صدقۃ الفطر) کی حفاظت پر مامور فرمایا۔ (رات کے وقت) ایک شخص آیا اور غلہ اٹھانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا "خدا میں تمہارا معاملہ بارگاہ نبوی میں پیش کر دوں گا۔" اس نے کہا میں تنگدست اور کثیر العیال آدمی ہوں۔ اور مجھے سخت ضرورت ہے۔" میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی اور میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا "ابوہریرہ تمہارے گزشتہ رات والے قیدی کا کیا ہوا؟" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس نے تنگدستی اور کثیر عیال ہونے کا عذر کیا۔ مجھے اس پر رحم آیا۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔" آپ نے فرمایا "اس نے جھوٹ بولا لا محالہ وہ پھر آئے گا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی بنا پر مجھے اس کے دوبارہ آنے کا یقین تھا۔ اس لیے میں گھات میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے آ کر پھر غلہ اٹھانا شروع کیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تیرا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اس نے کہا "مجھے چھوڑ دیجیے۔ اس لیے کہ میں فقیر بے نوا اور کثیر العیال ہوں۔ میں نے اس پر رحم کھا کر اسے پھر چھوڑ دیا۔

(بقیہ حاشیہ)

صبح ہوئی اور میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابو ہریرہ! تمھارے قیدی کا کیا ہوا؟" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس نے فقر و فاقہ اور کثرت عیال کا عذر کیا اور مجھے اس پر رحم آیا کہ اسے چھوڑ دیا۔ آپؐ نے فرمایا "اس نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ پھر آئے گا۔"

میں تیسری مرتبہ رات کو اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آکر غلہ اٹھانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا میں تمہارا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کروں گا۔ یہ تیسری اور آخری دفعہ ہے۔ تم نہ آنے کا وعدہ کرکے پھر آدھمکتے ہو۔ اس نے کہا "مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں آپ کو ایسے کلمات سکھا دوں گا جن سے تمھیں بہت فائدہ پہنچے گا۔" میں نے پوچھا "وہ کیا ہیں؟" اس نے کہا جب رات کو سونے لگو تو مکمل آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو۔ اللہ کی طرف سے تم پر ایک محافظ مقرر ہو جائے گا اور صبح تک شیطان تمھارے قریب نہیں پھٹک سکے گا۔" میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا "تمھارے رات والے قیدی کا کیا ہوا؟" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس نے مجھے مفید کلمات سکھائے اس لیے میں نے اسے رہا کر دیا۔" آپؐ نے دریافت فرمایا "وہ کیا؟" میں نے عرض کیا کہ اس قیدی نے کہا "جب تم رات کو سونے لگو تو پوری آیۃ الکرسی آخر تک پڑھ لیا کرو۔ اللہ کی طرف سے تم پر ایک محافظ مقرر ہو جائے گا۔ اور صبح تک شیطان تمھارے نزدیک نہ آسکے گا۔" صحابہ نیکی کے بہت حریص تھے۔ لہٰذا ابوہریرہ اس بات سے خوش ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ جھوٹا تھا مگر سچی بات کہہ گیا۔ ابوہریرہ کچھ معلوم بھی ہے کہ تین راتوں سے تمھیں کس سے پالا پڑا ہے؟" میں نے عرض کیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ فرمایا "وہ شیطان تھا۔"

مختلف امور کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے

صحیح بخاری[1] اور مسلم[2] میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمرے میں جھانکا۔ دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمرے کے دروازے میں سے جھانکا۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک چیز تھی جس سے آپ سر کھجلا رہے تھے۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا:

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو تو میں یہ چیز تمہاری آنکھ میں چبھو دیتا۔ آنکھ سے دیکھنے اور جھانکنے سے روکنے کے لیے ہی تو اذن لینے کا حکم دیا گیا ہے۔"

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"اگر کوئی شخص بلا اجازت تمہارے گھر میں جھانکے اور تم کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر کچھ مواخذہ نہیں ہے۔"[3]

---

[1] دیکھیے صحیح بخاری کتاب "الاستیذان" باب "الاستیذان من اجل البصر" بطریق سفیان۔ زہری نے کہا سہل بن سعد سے سن کر اسے اس طرح حفظ کیا جس طرح تمہارا یہاں موجود ہونا یقینی ہے (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۲۴۱) لیث کی روایت میں اس بات کی صراحت ہے کہ سہل بن سعد نے یہ حدیث زہری کو سنائی تھی۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۹۰۰)

بخاری نے انس بن مالک سے بھی روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمرے میں جھانکا۔ حضورؐ تیر لے کر اس کی طرف یوں بڑھے گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ اسے تیر چبھونا چاہتے تھے۔

ابن بشکوال، ابوالحسن بن الغیث سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جھانکنے والا شخص مروان کا والد حکم بن ابی العاص تھا۔ الفاکہی نے "کتاب مکہ" میں یہ حدیث ابو سفیان (عن زہری) وعطاء خراسانی کی مرفوع سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ صحابہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ حکم بن ابی العاص پر لعنت بھیج رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے "اس نے جب میرے گھر میں جھانکا تو میں اپنی فلاں بیوی کے ساتھ تھا۔ اس نے میرے سامنے ترش روئی کا مظاہرہ بھی کیا۔"

حافظ ابن حجر فتح الباری (۱۲-۲۴۴) میں لکھتے ہیں کہ یہاں اس بات کی صراحت موجود نہیں۔

[2] صحیح مسلم (۳-۱۶۹۸) کتاب "الآداب" باب "تحریم النظر فی بیت غیرہ" بروایت سہل بن سعد، نسائی (۸-۶۱) کتاب "القسامۃ"۔ دارمی (۲-۱۹۷)

[3] یہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں۔ جو صحیحین میں موجود ہے۔ دیکھیے صحیح بخاری کتاب "الدیات" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۸۸۸، ۶۹۰۲) اور صحیح مسلم (۳-۱۶۹۸) کتاب "الآداب"۔

اور یہ ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مروان کے والد حکم بن ابو العاص کو مدینہ سے نکال دیا تھا اور وہ آپ کی وفات تک طائف میں مقیم رہا۔[1]

حافظ ابن حجر فتح الباری (۱۱-۳۴۲) میں لکھتے ہیں:۔

یہ اس لیے کہ اذن طلب کرنے والا اگر بلا اجازت داخل ہو جاتا تو شاید وہ چیز دیکھتا جو اسے ناپسند ہوتی۔" بخاری نے "الادب المفرد" میں جو روایت نقل کی ہے اس میں اس کی تصریح موجود ہے۔ وہ روایت ابوداؤد اور ترمذی میں بھی موجود ہے۔

[1] سیرت نگاروں نے حکم بن ابو العاص کو مدینہ سے طائف جلاوطن کرنے کے چند اسباب کا ذکر کیا ہے:

۱۔ اس نے حضور کے حجرے میں جھانکا تھا جب کہ آپ اپنی ایک بیوی کے ساتھ تھے۔ الفاکہی نے سابق الذکر روایت میں اسی طرح لکھا ہے۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی نشر و اشاعت اور کفار سے مقابلے کے بارے میں جو مشورے کرتے اور پروگرام بناتے حکم اس سے کفار مکہ اور منافقین کو آگاہ کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے راز افشا کرنے کا مجرم تھا۔ دیکھیے لامتیقہ لابن عبد المسید (۱-۲۱۶) اور العبر للذہبی (۱-۳۲)

۳۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ڈھال اور حرکات کی نقل اتارا کرتا تھا۔ سیرت نگار ذکر کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جھک کر چلا کرتے تھے۔ حکم بن ابو العاص اس کی نقل اتارا کرتا تھا۔ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا تو وہ آپ کی نقل اتار رہا تھا۔ آپ نے فرمایا "تم اسی طرح ہو جاؤ گے۔" اسی روز سے وہ اختلاج میں مبتلا ہو گیا اور اس کا جسم کانپنے لگا۔

حاکم، بیہقی اور طبرانی عبد الرحمن بن ابی بکر سے روایت کرتے ہیں اور حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے کہ حکم بن ابو العاص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا کرتا تھا۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بات کرتے تو وہ اپنا منہ ہلایا کرتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا کرے تم اسی طرح ہو جاؤ۔" چنانچہ وہ اختلاج کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور مرنے تک اس مرض میں مبتلا رہا۔ دیکھیے الخصائص الکبریٰ للسیوطی (۲-۶۱۳)

بیہقی نے مالک بن دینار اور ہند بن خدیجہ کی سند کے ساتھ روایت بیان کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر حکم بن ابو العاص کے پاس سے ہوا تو وہ آپ کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا "اے اللہ! اسے رعشہ کے عارضہ میں مبتلا کر دے۔"

البغوی نے یہ روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ حکم سے مراد مروان کا والد ہے۔

امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبد اللہ نے "زوائد مسند احمد" میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ جونہی وہ کھڑا ہوا تو کانپنے لگا۔" (حوالہ مذکور) اسی پر بس نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو مدینہ سے جلاوطن کیا اور اس کے لیے بددعا فرمائی بلکہ آپ اس پر لعنت بھی فرمایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی حرکتوں سے آپ کو ایذا پہنچایا کرتا تھا۔

احمد اور البزار اسے ابن زبیر سے اور طبرانی نے عمرو بن مرہ الجہنی سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کو طائف سے بھی نکال دیا، چنانچہ آپ کے دورِ خلافت میں وہ جلاوطن ہی رہا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے حکم کو اس جگہ سے بھی دور بھیج دیا جہاں وہ خلافتِ صدیقی میں مقیم تھا۔ خلافتِ فاروقی میں وہ اسی جگہ رہا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے اسے مدینہ بلا لیا۔ جب حکم ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: "ایک غریب الوطن قرابت دار کی آمد مبارک۔"

المبرّد نے اپنی کتاب "الکامل" میں ذکر کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حکم کو جلاوطن کر دیا تو حضرت عثمانؓ نے خلافت پر فائز ہونے کے بعد اسے مدینہ بلانے کی اجازت طلب کی تھی۔ فقہا نے اس روایت کا تذکرہ کیا ہے۔

احمد بن خالد نے ذکر کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا تو آپ نے فرمایا: "میں نے نجاشی شاہِ حبشہ کو کپڑوں کا ایک جوڑا اور چند اوقیہ کستوری بھیجی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نجاشی مر چکا ہے۔ اگر یہ تحائف واپس آگئے تو میں تمھیں دے دوں گا۔"

چنانچہ جس طرح حضورؐ نے فرمایا تھا اسی طرح واقعہ ہوا۔[1]

= نے فرمایا اس (الحکم) پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اپنی سند کے ساتھ قاسم بن اصبغ سے، انھوں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے اور انھوں نے رسول اکرم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "ابھی ایک ملعون آدمی تمھارے پاس آئے گا۔" اسی دوران میں حکم بن ابو العاص داخل ہوا۔

احمد اور البزّار نے اپنے اپنے مسند میں، اور طبرانی نے المعجم میں یہ روایت بیان کی ہے۔ الہیثمی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ غرض یہ کہ حکم بن ابو العاص عہدِ رسالت، خلافتِ صدیقی، خلافتِ فاروقی اور خلافتِ عثمانی کے ابتدائی سالوں میں مدینہ سے جلاوطن رہا اور حضورؐ نے اس پر لعنت فرمائی۔

طبرانی نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو ان سے حکم کی سفارش کی گئی کہ اسے طائف سے مدینہ لایا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: "جو گرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھی تھی میں اسے کھول نہیں سکتا۔" حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے حکم کو مدینہ بلا لیا اور یہ عذر پیش کیا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حکم کی سفارش کی تھی اور حضورؐ نے اس کی واپسی کا وعدہ فرمایا تھا۔

ابن سعد نے واقدی سے، اس نے ثعلبہ بن ابی مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں جب حکم بن ابی العاص مر گیا تو شدید گرمی کی وجہ سے اس کی قبر پر خیمہ لگا دیا گیا۔ جب لوگوں نے اس پر تنقید کی تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ عمر فاروقؓ کے دور میں جب زینب بنت جحش کی قبر پر خیمہ نصب کیا گیا تھا تو کیا کسی نے تنقید کی تھی؟

غرض اسی طرح حضرت عثمانؓ بنو امیہ کا دفاع کرتے اور ان کو امارت و وزارت پر فائز کرتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں فتنہ و فساد کا ایک ایسا باب وا ہوا جو بعد ازاں بند نہ ہو سکا۔ اور حضرت عثمانؓ اس کی وجہ سے اسلام کی راہ میں شہید ہو گئے۔

[1] یہ حدیث مسند احمد ۶/۴۰۴ میں مسلم بن خالد، عن موسیٰ بن عقبہ عن عقبہ، عن ابیہ عقبہ ام کلثوم کی سند کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک کو ایک اوقیہ کستوری عطا کی۔ باقی ماندہ کستوری اور اور کپڑوں کا جوڑا ام سلمہؓ کو دے دیا۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہدیہ واپس لینا درست ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ ہدیہ اس آدمی کے قبضے میں نہ آیا ہو جس کو دیا گیا ہو، البتہ صدقہ واپس لینا ناجائز ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ صحیح بخاریؒ میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنا ہدیہ واپس لینے والا اسی طرح ہے جیسے کُتا قے کرکے پھر اسے کھا لیتا ہے۔" "المدونۃ"، الواضحہ اور الدلائل میں ہے کہ قاضی شریح سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو دوسرے کی طرف کوئی چیز بھیجے اور وہ شخص چیز وصول کرنے سے قبل فوت ہو جائے۔ قاضی شریح نے عبیدہ کی طرف یہ مسئلہ

میرے والد کہتے ہیں کہ مجھے حسین بن محمد نے مسلم کے حوالے سے بتایا (اس کے بعد انھوں نے یہ حدیث بیان کی) — اسی طرح انھوں نے اپنی والدہ ام کلثوم بنت ابی سلمہ کے حوالے سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔

الہیثمیؒ نے یہ حدیث "مجمع الزوائد" میں روایت کی ہے کہ ابن معین نے مسلم بن خالد الزنجی کو ثقہ راوی قرار دیا ہے۔ مگر محدثین کی ایک جماعت اسے ضعیف کہتی ہے۔ میں اُمِ موسیٰ بن عقبہ سے آشنا نہیں ہوں۔ اس کے دیگر راوی صحیحین کے رواۃ و رجال میں سے ہیں۔ طبرانی نے اسے "المعجم الکبیر" میں نقل کیا ہے۔

لہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ کے اس ارشاد گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پورا ہدیہ حضرت ام سلمہ کو دے دیا جس سے بعض لوگوں کو یہ سمجھنے میں مشکل پیش آئی ہے کہ آپؐ نے وہ کستوری ازواجِ مطہرات میں تقسیم کردی تھی حافظ ابن حجرؒ "الاصابۃ" میں کہتے ہیں کہ معاملہ یوں نہیں۔ دراصل حضورؐ کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ کپڑوں کا جوڑا تم لے لو۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ پورا ہدیہ تمھارا ہے۔ ابن حبان کی روایت سے یہی معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اب کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ دیکھیے الفتح الربانی (۱۵-۱۷۱)

ٹہ ابن قدامہؒ "المغنی" (۵-۵۴۳) میں لکھتے ہیں کہ ابوطالب اور ابوالحارث کی روایت کے مطابق امام احمدؒ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کسی کو ہدیہ ارسال کرے اور وہ ہدیہ وصول کرنے سے پہلے وفات پا جائے تو یہ ہدیہ بھیجنے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔ پھر انھوں نے حضرت ام سلمہؓ کی روایت کردہ حدیث بیان فرمائی۔ وہ کہتے ہیں کہ قاضی عیاضؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ ایک جائز عقد تھا جو طرفین میں سے ایک کی موت کی وجہ سے باطل ہو گیا ہے۔ جیسے وکالت اور شراکت کا معاملہ۔

سلہ صحیح بخاری کتاب "الھبۃ" باب "لایحل لاحد ان یرجع فی ھبتہ و صدقتہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۶۲۱) بروایت ابن عباس مرفوعاً۔ حضرت ابن عباس ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ بُری مثال ہمیں زیب نہیں دیتی۔ جو شخص ہبہ کرکے واپس لے لے وہ کتے کی طرح ہے جو قے کرکے اسے کھا لیتا ہے

صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کا واقعہ مذکور ہے کہ انھوں نے اپنا گھوڑا خدا کی راہ میں ہبہ کر دیا تھا، مگر آپ نے جس کو وہ گھوڑا دیا اس نے اس کی حفاظت نہ کی۔ حضرت عمرؓ نے یہ سمجھ کر وہ اسے ارزاں فروخت کردے گا اس سے خرید لینا چاہا۔ اس ضمن میں جب انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا۔ "وہ شخص اگر گھوڑا تمھیں ایک درہم کے عوض بھی دے تو مت لو۔ اس لیے کہ صدقہ کرکے واپس لینے والا کُتے کی مانند ہے جو قے کرکے پھر اسے کھا لیتا ہے۔"

دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے کہا اگر اس نے یہ صدقہ کے طور پر بھیجی تھی اور وہ شخص اس کو وصول کرنے سے پہلے مر گیا تو وہ چیز بھیجنے والے کو واپس مل جائے گی۔ شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے حکم سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ اگر بھیجنے والے نے اپنے آدمی کے ہاتھ بھیجی تھی تو وہ چیز اس کی طرف لوٹ آئے گی۔ اور اگر اس شخص کے قاصد کے ہمراہ بھیجی جس کو وہ چیز بھیجی تھی تو وہ چیز میت اور اس کے وارثوں کو ملے گی۔

صحیح بخاری[1] اور دوسرے کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک مہم پر بھیجا اور آپ نے قریش کے دو آدمیوں کا نام لے کر فرمایا کہ جب تم ان دونوں سے ملو تو ان کو آگ سے جلا دو لیکن بعد میں جب ہم الوداعی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو فرمایا۔

"میں نے کہا تھا کہ فلاں فلاں شخص کو آگ سے جلا دو۔ لیکن اگر تم ان پر قابو پا لو تو ان کو قتل کر دو۔ آگ کے ساتھ عذاب دینا صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔"

ان دونوں میں سے ایک شخص ابن الاسود اور دوسرا نافع[2] بن عبد عمرو تھا۔

البزار نے مسند میں اور ابن اسحاق نے سیرت کی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ اس دوسرے شخص کا نام نافع بن عبد قیس الفہری تھا۔ غزوہ بدر کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ جب مکہ سے عازم مدینہ ہوئیں تو قریش کے چند آدمیوں نے ان کا تعاقب کیا۔ سب سے پہلے جو شخص حضرت زینبؓ کو ملا وہ ہبار اور اس کا ساتھی تھا۔ یہ دونوں ذی طویٰ میں ان سے ملے۔ حضرت زینب حمل سے تھیں اور ایک اونٹ پر سوار تھیں۔ ہبار نے اونٹ کو نیزہ سے کچوکا دیا جس کے نتیجے میں حضرت زینب نیچے گر پڑیں اور حمل ساقط ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہبار نے نیزہ ہلا کر ان کو خوف زدہ کیا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا۔

حضرت زینبؓ کے خاوند ابو العاص بن ربیع کا بھائی کنانہ بن ربیع ان کے اونٹ کی نکیل تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پاس تیر کمان بھی تھے۔ جب کفار حضرت زینب کے قریب پہنچ گئے تو کنانہ نے اونٹ کی باگ چھوڑ دی اور ترکش میں سے تیر نکال لیے۔ اور کہا بخدا جو شخص بھی میرے قریب آئے گا میں اسے تیر سے زخمی کر دوں گا۔ چنانچہ لوگ ہٹ کر واپس چلے گئے۔ ابو سفیان چند قریشیوں کے ساتھ آیا اور اس نے کنانہ سے کہا کہ اپنے تیر کو روک تاکہ ہم تم سے گفتگو کر سکیں۔ ابو سفیان آگے

---

[1] صحیح بخاری کتاب "الجہاد" باب "التودیع" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۲۹۵۴) نیز باب "لا یعذب بعذاب اللہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۳۰۱۶) ابو داؤد (۳-۵۵) کتاب "الجہاد" باب "فی کراھیۃ حرق العدو بالنار"

[2] مجھے سیرت کی کسی کتاب میں اس کا نام نافع بن عبد عمرو نہیں ملا۔ حافظ ابن حجر فتح الباری (۶-۱۵۰) میں لکھتے ہیں :۔

"ابن السکن نے اپنی روایت میں ابن اسحاق کے حوالے سے دوسرے آدمی کا نام نافع بن عبد قیس ذکر کیا ہے۔ ابن ہشام نے بھی "زوائدہ علی السیرۃ" میں بڑے وثوق سے یہی بات کہی ہے۔ سہیلی نے مسند البزار سے نقل کیا ہے کہ اس کا نام خالد بن عبد قیس تھا۔ ممکن ہے کہ یہ کاتب کی غلطی کی وجہ سے ہو کیونکہ اس کا نام نافع تھا۔ مسند البزار کے معتمد نسخہ جات میں بھی نافع ہی مذکور ہے۔ ابن بشکوال نے بھی مسند البزار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم زینب رضی کو لے کر مکّہ سے علانیہ نکلے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے ہم کن مصائب سے دوچار ہیں۔ تم جب علانیہ ہماری موجودگی میں ان کی بیٹی لے کر مکّہ سے مدینہ جا رہے ہو تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری ذلّت اور کمزوری کی دلیل ہے۔ زینب کو اس کے والد سے جُدا رکھنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہمیں اس زبردستی سے کوئی دلچسپی ہے۔ اس وقت تم اسے لے کر واپس چلے جاؤ۔ جب ماحول پرسکون ہو جائے اور لوگ کہیں کہ ہم نے ان کو واپس مکہ بھیج دیا تو ان کے ساتھ مشورہ کر کے تم ان کو ان کے والد کے پاس پہنچا دو۔ چنانچہ کنانہ بن ربیع نے اسی طرح کیا۔

حضرت زینب رضی نے مکّہ میں چند راتیں گزاریں۔ جب ماحول پرسکون ہوا تو کنانہ حضرت زینب رضی کو لے کر رات کے وقت نکلا اور ان کو زید بن حارثہ اور ان کے ساتھی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ان دونوں نے آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیا۔[1]

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے منجنیق کے ذریعے جن پر پتھر پھینکے وہ اہل طائف تھے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ طائف کی فصیل کے نزدیک جب معرکہ ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ دبّابہ کے نیچے داخل ہو گئے اور اسے طائف کی فصیل تک بلند کیا تاکہ اسے نذرِ آتش کر دیں۔ قبیلہ ثقیف والوں نے لوہے کی سلاخیں گرم کر کے ان پر پھینکیں۔ صحابہ اس کے نیچے سے نکل آئے۔ ثقیف والوں نے ان پر تیراندازی شروع کی اور چند آدمیوں کو شہید کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ثقیف والوں کی انگور کی بیلیں کاٹنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے یہ کام شروع کر دیا۔ ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ نے طائف کی طرف آگے بڑھ کر پکارا۔ اے بنی ثقیف! ہمیں امان دو، ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے امان دی۔ دونوں نے قریش اور بنی کنانہ کی عورتوں کو اپنے پاس بلایا۔ انھیں ڈر تھا کہ ثقیف والے ان کو قیدی نہ بنا لیں مگر عورتوں نے انکار کر دیا۔ ان انکار کرنے والی خواتین میں ہند بنت ابی سفیان بھی تھیں جو عُروہ بن مسعود کی بیوی تھیں۔ ان کے بطن سے داؤد بن عروہ پیدا ہوئے۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ داؤد کی ماں میمونہ بنت ابی سفیان ابومُرّہ بن عُروہ بن مسعود کے نکاح میں تھی۔ اس کے بطن سے داؤد بن ابومُرّہ پیدا ہوا۔ جب عورتوں نے آنے سے انکار کیا تو اسود بن مسعود کے بیٹے نے ان دونوں سے کہا: ابوسفیان اور مغیرہ! کیا میں تمھیں اس سے بہتر کام نہ بتاؤں جس کے لیے تم دونوں آئے ہو؟ اور وہ یہ کہ تمھیں بنی اسود کی اراضی کے بارے میں معلوم ہے؟ اس وقت رسول کریم طائف اور بنی اسود کی اراضی کے درمیان اس جگہ مقیم تھے جس کو وادئ عقیق کہا جاتا ہے۔ اور بنی اسود کی یہ اراضی کچھ اس قسم کی تھی کہ اس کا سیراب کرنا اور آباد کرنا اور اس سے استفادہ کرنا طائف بھر کی تمام اراضیات کے مقابلے میں زیادہ مشکل تھا، اس لیے ان کا یہ خیال تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین میں سے کچھ حصہ کسی کو جاگیر کے طور پر دیں گے تو وہ شخص اس کو کبھی آباد نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا انھوں نے ان دونوں سے کہا کہ تم اس ضمن میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بات کرو۔ اگر وہ اپنے لیے اس اراضی کو لینا چاہیں تو لے لیں ورنہ اللہ تعالیٰ اور قرابت داروں کے لیے اس کو چھوڑ دیں ہمارے

---

[1] سیرت ابن ہشام (۲۔ ۴۸۳، ۴۸۵)

[2] سیرت ابن ہشام (۲۔ ۴۸۳)

ان کے درمیان جو قرابت داری ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لیے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مال سے دست بردار ہو کر اسے ان کے لیے چھوڑ دیں گے۔

اسی دوران میں محاصرے کے اندر گھرے ہوئے لوگوں میں موجود غلام باہر نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ جب اہل طائف مشرف باسلام ہوئے تو ان میں سے ایک گروہ نے ان غلاموں کے بارے میں گفتگو کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ سب اللہ کے لیے آزاد ہیں۔"

صحیح بخاری[1] میں ہے کہ مروان بن الحکم اور مسور بن مخرمہ نے عروہ کو بتایا کہ جب قبیلہ ہوازن کا وفد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ وفد نے اپنے مال اور قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: "تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ یہ لوگ بھی ہیں (یعنی میں تنہا نہیں ہوں کہ جیسے چاہوں کروں) بلکہ ان کے ساتھ مشورہ کیا ہے اور سب سے اچھی بات وہ ہوتی جو سچی ہو، لہٰذا تم دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرو۔ اور وہ یہ ہے کہ یا مال لے لو یا اپنے قیدی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ طائف سے لوٹے تھے تو آپ نے دس سے اوپر کچھ راتوں تک ان کا انتظار کیا تھا۔

جب وفد پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ آپ دو چیزوں میں سے صرف ایک چیز واپس کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہم اپنے قیدی واپس لینا چاہتے ہیں۔ آپ خطبہ دینے کے لیے لوگوں میں کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

حمد و صلوٰۃ کے بعد تمھارے بھائی (قبیلہ ہوازن والے) ہمارے پاس توبہ کر کے حاضر ہوئے ہیں۔ میں ان کے قیدی واپس کرنا چاہتا ہوں۔ تم میں سے جو ایسا کرنے پر راضی ہے وہ بخوشی اس پر عمل کرے۔ اور جو شخص اپنا حصہ وصول کرنے پر مصر ہے ہم اسے جب پہلا مال غنیمت آئے گا تو اس میں سے اس کے حصہ کی قیمت ادا کر دیں گے۔"

یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ ہم نے بخوشی اپنا حصہ دے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہمیں نہیں معلوم کہ کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی، لہٰذا تم لوگ واپس چلے جاؤ اور سرداران قبیلہ آکر تمھارے بارے میں ہمیں مطلع کریں۔"

چنانچہ لوگ واپس چلے گئے۔ قبیلوں کے سرداروں نے ان کے ساتھ بات چیت کی۔ پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر انھوں نے آپ کو بتایا کہ لوگوں نے برضا و رغبت مال غنیمت میں سے اپنا حصہ ترک کر دیا ہے۔

ہوازن کے قیدیوں کے بارے میں یہ [illegible]

اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ جو چیز [illegible] ۵۰۰ [illegible] ہبہ کے طور پر کسی کو دی جا سکتی ہے۔ (صحیح بخاری)

---

[1] صحیح بخاری کتاب "المغازی" باب قولہ تعالیٰ "ویوم حنین"۔ (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۳۱۸-۴۳۱۹) ابن اسحاق نے "السیرۃ" (۲-۴۸۹) میں یہ حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ روایت کی ہے۔

دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی کی حیثیت کے بارے میں علماء کا اختلاف

۱۔ اہل ظاہر[1] اور بعض اہل حدیث کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر فرض اور نواہی حرام کی حیثیت رکھتے ہیں اس اعتبار سے قرآن کریم میں اور ان میں کچھ فرق نہیں ہے۔

---

[1] اس لیے کہ اہل ظاہر کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول کے حکم میں کچھ فرق نہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی دلیل یہ آیت ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب: ۳۶)

کسی مومن مرد اور عورت کو زیب نہیں دیتا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حکم دیں تو انھیں اپنے معاملے میں کچھ اختیار باقی ہے۔

امام ابن حزم کا موقف ابن حزم فرماتے ہیں:۔

رسول کریم کے دیے ہوئے احکام کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کی چوتھی قسم نہیں ہے۔

۱۔ واجب۔ اور یہ ہمارا مذہب ہے۔

۲۔ اس فعل کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے "أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ" فرما کر اس اختیار کو باطل ٹھہرایا ہے۔

۳۔ یہ کہ آپ کے حکم پر عمل نہ کرنا معصیت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا۔ (الاحزاب۔ ۳۶)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔

یہ بات حضرت عائشہؓ کی لونڈی بریرہ کو بھی معلوم تھی کہ نبی کریم کا حکم واجب الاتباع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب نبی کریم نے سے ایک خاص آدمی کے ساتھ نکاح کے بارے میں کہا تو اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ میں سفارش کر رہا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی سفارش واجب الاتباع نہیں ہے لیکن امر کی یہ حیثیت نہیں بلکہ اس میں وجوب کے سوا دوسرا کوئی پہلو موجود ہی نہیں۔

امام ابن حزم مزید کہتے ہیں کہ بعض علماء نے اللہ اور اس کے رسول کے اوامر میں فرق کیا ہے مگر یہ موقف غلط ہے اور اس کی غلطی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔

جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

(الاحکام لابن حزم ۱۔ ۲۷۵، ۲۷۷)

اسی طرح رسول کریم کی نواہی کے بارے میں امام ابن حزم فرماتے ہیں:۔

۲۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ نواہی، اوامر کے مقابلہ میں زیادہ شدید ہیں۔ آپؐ کے اوامر میں سے کچھ تو فرض ہیں اور کچھ فرض نہیں ہیں، لیکن نواہی سب کی سب حرام ہیں۔

۳۔ علماء کی ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی رائے یہ ہے کہ:

۱۔ آپؐ کے جن اوامر کو علماء نے فرض پر محمول کیا ہے وہ فرض ہیں۔

۲۔ جن کو سنت پر محمول کیا وہ سنت ہیں۔

۳۔ جن اوامر کو مستحب قرار دیا وہ مستحب ہیں۔

۴۔ آپ کی تمام نواہی حرام ہیں۔

امام مالک کے بعض اصحاب نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث سے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو چاہیے کہ ہاتھ برتن میں ڈالنے سے پہلے انھیں تین مرتبہ دھولے۔ اس لیے کہ اسے معلوم نہیں کہ رات بھر اس کا ہاتھ کہاں پھرتا رہا۔"[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص وضو کرے وہ ناک میں پانی ڈال کر صاف کرے اور جو شخص ڈھیلے استعمال کرے وہ طاق استعمال کرے۔"[2]

قرآن کریم اور کلام رسولؐ میں جو نواہی ہیں ہم ان کے ظاہری معانی کو اختیار کرکے انھیں وجوب پر محمول کرتے ہیں۔ یہ نواہی فوری طور پر واجب التعمیل ہیں۔ جو شخص ان کی تاویل کرتا ہے یا ان کی حیثیت کو کم کرکے انھیں مستحب قرار دیتا ہے، یا ان پر عمل در آمد میں پس و پیش کرتا ہے، تو ہمارے نزدیک اس کا قول باطل ہے۔ تمام اصحاب ظاہر کا یہی مذہب ہے کہ حضورؐ کے اوامر پر عمل واجب اور نواہی سے احتراز لازم ہے جب تک کوئی قطعی دلیل ان کو وجوب و حرمت کے درجہ سے نکال کر استحباب، کراہیت اور اباحت کی سطح پر نہ لے آئے۔" (الاحکام ۱-۲۵۹)

[1] متفق علیہ ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب "الوضوء" باب "الاستجمار وترا" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۱۶۲) اور صحیح مسلم (۱-۲۳۳) کتاب "الطھارۃ" باب "کراھیۃ غمس المتوضئ وغیرہ یدہ المشکوک فی نجاستھا فی الاناء قبل غسلھا ثلاثا"

اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، دارمی اور مؤطا امام مالک نے بھی روایت کیا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:-

"جمہور اہل علم کے نزدیک یہاں امر استحباب کے لیے ہے، مگر امام احمد اس کو رات کی نیند سے بیداری کے سلسلے میں وجوب پر اور دن کی نیند سے بیداری کے وقت استحباب پر محمول کرتے ہیں۔" (فتح الباری ۱-۲۶۳)

[2] متفق علیہ صحیح بخاری کتاب "الوضوء" باب "الاستنثار فی الوضوء" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۱۶۱) صحیح مسلم (۱-۲۱۲) کتاب "الطھارۃ" باب "الایتار فی الاستنثار والاستجمار"

حالانکہ نیند سے بیدار ہونے وقت ہاتھ دھونا اور وضو کے دوران میں ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا اکثر کے نزدیک فرض نہیں ہے۔

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اوامر ایسے ہیں جو فرض نہیں ہیں۔ مثلاً آپ کا یہ حکم کہ:

"جب امام "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے تو "ربنا ولک الحمد" کہا کرو"[1]

دوسری حدیث میں ہے:

"جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہا کرو، اور جب مؤذن کو اذان دیتے سنو تو اس طرح کہو جس طرح مؤذن کہتا ہے"[2]

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل اوامر[3]:

۱۔ دروازہ بند کرنا۔

۲۔ مشک کا تسمہ باندھنا

۳۔ برتن اوندھے منہ رکھنا

۴۔ چراغ بجھانا۔

آپ نے یہ سب حکم دیے ہیں مگر یہ فرض نہیں ہیں۔

اسی طرح حضور نے فرمایا:

"سائل کو کچھ دو اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے"۔[4]

---

[1] متفق علیہ: صحیح بخاری فی الاذان "فی ایجاب التکبیر وافتتاح الصلوٰۃ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۷۳۲)
صحیح مسلم (۱-۲۹۳) کتاب "الصلوٰۃ" باب "استحباب رفع الیدین حذو المنکبین مع تکبیرۃ الاحرام والرکوع وفی الرفع من الرکوع وان لا یفعلہ اذا رفع من السجود"
یہ اصحاب السنن اور امام مالک نے بھی روایت کی ہے۔

[2] متفق علیہ: صحیح بخاری کتاب "الاذان" فی باب "جہر الامام بالتأمین" (حدیث کا جزو اول)
صحیح بخاری (۱-۳۰۷) کتاب "الصلوٰۃ" باب "التسمیع والتحمید والتأمین" (حدیث کا جزو اول)
یہ حدیث اصحاب السنن اور امام مالک نے بھی روایت کی ہے۔
آمین کے بلند یا آہستہ کہنے کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ شوافع وحنابلہ کے نزدیک آمین سری نمازوں میں آہستہ اور جہری نمازوں میں اونچی آواز سے کہی جائے۔
احناف کے نزدیک تمام نمازوں میں آہستہ کہی جائے۔

[3] متفق علیہ: صحیح بخاری کتاب "الاشربۃ" باب "تغطیۃ الاناء" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۶۲۴)
صحیح مسلم (۳-۱۵۹۴) کتاب "الاشربۃ" باب "الامر بتغطیۃ الاناء"۔

[4] مؤطا امام مالک (۲-۲۸۵) فی الترغیب فی الصدقۃ "بروایت زید بن اسلم"۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی :-

"جب تم میں سے کوئی شخص جوتا پہننے لگے تو دائیں پاؤں سے آغاز کرے"[۱]

حضورؐ کے اس قسم کے اوامر دراصل آداب اور ترغیبات پر مشتمل ہیں۔

چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا :

"جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو جس حد تک ممکن ہو اس پر عمل کرو۔ اور جب کسی چیز سے روکوں تو اس سے پوری طرح رک جاؤ"[۲]

مندرجہ ذیل حدیث امام مالک کے موقف کی تائید کرتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کو صحابہ کرام کی صوابدید پر محمول کیا جائے گا جس کو انھوں نے واجب سمجھا وہ واجب ہیں اور جن کو انھوں نے مستحب سمجھا وہ مستحب ہیں۔

مثلاً حضرت ابوہریرہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا :-

"تم میں سے کوئی شخص اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار پر اپنا شہتیر رکھنے سے منع نہ کرے"

یہ حدیث روایت کرنے کے بعد ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے "یہ کیا بات ہے کہ تم اس حدیث پر عمل کرنے سے انحراف کر رہے ہو۔ بخدا میں اس کو تمھارے اندر مشہور کر کے رہوں گا"[۳]

حضورؐ نے جمعہ کے روز غسل کا حکم دیا تھا مگر صحابہ نے اس کو فرض پر محمول نہیں کیا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ دو کھجوریں ملا کر نہ کھاؤ، یا یہ کہ پلیٹ کے درمیان سے نہ کھاؤ، راستہ

ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں :-

"میرے علم کی حد تک اس ضمن میں اس حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حدیث قاسم بن اصبغ نے سفیان عن مصعب بن محمد، عن یعلی بن ابی یحیٰی، عن فاطمہ بنت حسین، عن حسین کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا :

"سائل کا حق ہے چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہی کیوں نہ آئے"

سیوطی کہتے ہیں کہ احمد اور ابوداؤد نے بھی یہ حدیث مذکورہ سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[۱] دیکھیے صحیح مسلم (۳-۱۶۶۰) کتاب "اللباس" باب استحباب لبس النعل فی الیمین اولاً۔

ابوداؤد (۴-۷۰) کتاب "اللباس" باب فی الانتعال"۔ ترمذی (۴-۲۴۵) کتاب "اللباس" باب "ما جاء بای رجل یبدأ" ابن ماجہ (۲-۱۹۵) کتاب "اللباس" باب لبس النعال و خلعها"

[۲] متفق علیہ۔ صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالسنۃ۔

اور صحیح مسلم (۴-۱۸۳۰) کتاب "الفضائل" باب "فی توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم"

[۳] صحیح بخاری کتاب "المظالم" باب "لا یمنع جار جارہ ان یغرز خشبۃ فی جدارہ"۔ صحیح مسلم (۳-۱۲۳۰) کتاب "المساقاۃ" باب غرز الخشب فی جدار الجار۔ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مؤطا امام مالک اور مسند احمد بن حنبل۔

برداشت بسر کرو اور اسی قسم کے دیگر نواہی ۔ ان اور اس طرح کے دیگر نواہی کو اہل علم نے حرمت پر محمول نہیں کیا ہے۔

جبکہ مندرجہ ذیل نواہی کو اہل علم نے حرمت پر محمول کیا ہے :

۱ ۔ حضورؐ نے مثلہ کرنے سے منع فرمایا۔

۲ ۔ چوپایوں کو باہم لڑانے کی ممانعت

۳ ۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت

۴ ۔ نجومیوں پر اعتماد کرنے سے منع فرمایا

۵ ۔ نوحہ گری کی ممانعت

۶ ۔ تصاویر کی ممانعت بجز اُن کے جو کپڑے وغیرہ پر ہوں ۔

اور اسی قسم کے دیگر نواہی ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل نواہی کے بارے میں اہل علم میں اختلاف رائے ہے کہ یہ حرمت پر محمول ہیں یا نہیں ۔

۱ ۔ شغار یعنی ادلے بدلے کے نکاح کے بارے میں نہی ۔

۲ ۔ دانتوں میں جکڑ کر کھانے والے درندوں کی حرمت ۔

۳ ۔ افطار کیے بغیر مسلسل دو دو تین تین دن روزہ رکھنا ۔

۴ ۔ ایسا کرتا پہننے کی ممانعت جس کے بازو نہ ہوں، اس لیے کہ اس میں سے ہاتھ باہر نکالنے کے لیے اس کو اوپر اٹھانا ہوگا اور اس سے ننگا ہونے کا خدشہ ہے۔

۵ ۔ متعہ کی ممانعت

۶ ۔ شہر سے باہر جا کر تجارتی قافلے سے سودا کرنے کی ممانعت

۷ ۔ احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ۔

۸ ۔ کتے کی قیمت وصول کرنے کی ممانعت ۔

۹ ۔ زائد از ضرورت گھاس کو سیراب کرنے کے لیے ضرورت سے زائد پانی کو روکنے کی ممانعت

۱۰ ۔ عورتوں کو مساجد سے روکنے کی ممانعت ۔ ۱۱ ۔ کدو اور رال والے برتن میں نبیذ بنانے کی ممانعت ۔

ان نواہی کو اکثر اہل علم نے حرمت پر محمول کیا ہے ۔ البتہ بغیر بازؤوں کے کرتا ایسی صورت میں حرام نہیں جب اس کے علاوہ کوئی اور کپڑا بھی پہنا ہوا ہو اور برہنہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو ۔ اس صورت میں اس کی ممانعت زیادہ شدید نہیں ۔ اس ضمن میں امام مالک سے مختلف اقوال مروی ہیں ۔ ایک قول یہ ہے کہ اگر اس نے دوسرا کپڑا نہ پہن رکھا ہو تو حرام ہے ۔ اس لیے کہ اس صورت میں برہنہ ہونے کا خدشہ ہے ۔ اس کی مزید تائید ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے ایک ہی کپڑے کو اس طرح اوڑھنے سے منع فرمایا ہے جس سے برہنہ ہونے کا خدشہ ہو ۔

صحیح بخاری کتاب البیوع میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریمؐ نے دو قسم کا لباس اوڑھنے سے منع فرمایا ۔ اولاً یہ کہ انسان اپنے جسم پر اس طرح سے کپڑا لپیٹے کہ اس کی شرمگاہ ننگی رہ جائے اور ثانیاً یہ کہ ایسا کرتا پہنا جائے جس کے بازو نہ ہوں ۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمانا ہے۔ عبداللہ بن ابی اوفیٰ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ ابھی ان میں سے خمس نہیں لیا گیا تھا، جبکہ دوسرے فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ آپ نے ان کو قطعی طور پر حرام قرار دے دیا تھا، راوی کہتا ہے کہ میں نے سعید بن جبیر سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ آپؐ نے ان کو قطعی حرام ٹھہرایا۔ امام بخاری نے "کتاب الجہاد" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

خاتمۂ کتاب | بحمداللہ یہ کتاب اللہ کی توفیق سے ماہ شوال کے آغاز میں مکمل ہوئی۔

سببِ تالیف | فقیہ ابوعبداللہ محمد بن فرج فرماتے ہیں کہ جس بات نے مجھے اس کتاب کی تالیف پر آمادہ کیا وہ یہ ہے کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ "صاحب المسند" کی ایک تصنیف دیکھی جس کا نام تھا "اقضیۃ رسول اللہ" یہ ایک مختصر کتاب تھی جس میں حضورؐ کے صرف چند فیصلوں کا تذکرہ کیا گیا تھا۔

ابو محمد الباجی رحمہ اللہ نے احمد بن خالد سے اور انھوں نے ابن وضاح سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم نے ان فیصلوں کو تلاش کیا جو حضورؐ نے خود کیے یا جن امور کے بارے میں حضورؐ نے فیصلہ کرنے کا حکم صادر فرمایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ایسی احادیث کی تعداد جن میں حضورؐ کے فیصلے ہیں ایک سو کے لگ بھگ ہے۔

چنانچہ میں نے برکت و محبت کے جذبے سے حضورؐ کے فیصلوں کی تحقیق و جستجو اور جمع و تدوین کا بیڑا اٹھایا، تاکہ ان کی پیروی کی جائے اور آپؐ کے اوامر و نواہی پر عمل درآمد ہو جائے۔ کیوں کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر: ۷)

اللہ کا رسول جو چیز تمھیں دے وہ لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔

نیز فرمایا:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ (النور: ۶۳)

جو لوگ آپؐ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

چنانچہ اس کتاب کی تالیف میں میں نے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے۔

مآخذ و مصادر | (۱) موطا امام مالک (۲) تفسیر ابن اسلام (۳) معانی الزجاج (۴) معانی القرآن للنحاس (۵) معانی القرآن للمفضل (۶) الاحکام لاسماعیل القاضی (۷) الہدایۃ از مکی (۸) صحیح بخاری (۹) صحیح مسلم (۱۰) مصنف عبدالرزاق (۱۱) سنن نسائی (۱۲) مسند ابن ابی شیبہ (۱۳) مسند البزار (۱۴) سیرۃ ابن ہشام (۱۵) شرح الحدیث لابی عبید (۱۶) المدونہ (۱۷) معالم السنن (۱۸) الکامل للمبرد (۱۹) مختصر ابن ابی زید (۲۰) المستخرجۃ (۲۱) الواضحۃ (۲۲) النوادر (۲۳) کتاب ابن شعبان (۲۴) الدلائل للاصیلی (۲۵) احکام ابن زیاد (۲۶) تاریخ ابن ابی خیثمہ (۲۷) شرف المصطفیٰ (۲۸) کتاب الاموال لابی عبید (۲۹) کتاب الاموال لاسماعیل (۳۰) کتاب محمد بن نصر المروزی (۳۱) شرح الموطا لابن مزین (۳۲) شرح الموطا از داودی (۳۳) شرح الموطا از قنازعی۔ (۳۴) سنن ابوداؤد۔ یہ چونتیس ۳۴ کتابیں ہیں۔

والحمد للہ رب العالمین۔ وصلی اللہ علی محمد وآلہ وسلم۔

اساتذہ | ۱۔ مؤطا امام مالک کی روایت میں میرے شیخ ابوالولید، یونس بن عبداللہ بن مُغیث قاضی قرطبہ ہیں۔ اور وہ ابو عیسیٰ یحییٰ بن عبداللہ بن ابی عیسیٰ، عن عبیداللہ بن یحییٰ، عن یحییٰ بن یحییٰ، عن امام مالک کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۲۔ سنن نسائی میں بھی میرے شیخ قاضی یونس بن عبداللہ ہیں جو ابوبکر محمد بن معاویہ المعروف بابن الاحمر القرشی، عن احمد بن شعیب نسائی۔

۳۔ صحیح بخاری کی روایت میں میرے شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن عابد ہیں جو ابو محمد عبداللہ بن ابراہیم الاصیلی، عن ابی زید محمد بن احمد المروزی، عن ابی عبداللہ محمد بن یوسف الفربری، عن ابی عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۴۔ صحیح مسلم کی روایت میں میرے شیخ قاری فقیہ ابو محمد مکی بن ابی طالب ہیں جو ابوالعباس احمد بن محمد بن زکریا النسوی، عن محمد بن ابراہیم الکسائی، عن ابراہیم بن محمد بن سفیان، عن ابی الحسین مسلم بن الحجاج کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۵۔ سنن ابوداؤد کی روایت میں میرے شیخ فقیہ ابو محمد عبداللہ بن ولید مصری ہیں جو ابوموسیٰ عیسیٰ بن حنیف قیروانی، عن ابی بکر محمد بن ابی بکر بن داسہ، عن ابی داؤد کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۶۔ مصنف عبدالرزاق کی روایت میں میرے شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن عابد ہیں جو قاضی ابوعبداللہ محمد بن احمد بن المفرج قاضی بالقصر، عن قاضی صنعاء، عن اعلیٰ بن محمد، عن اسحاق بن ابراہیم بن عباد الدبری، عن عبدالرزاق بن ہمام کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۷۔ مسند ابن ابی شیبہ کی روایت میں میرے شیخ حاتم بن محمد طرابلسی ہیں جو احمد بن محمد المقری الطلمنکی، عن احمد بن عون اللہ، عن قاسم بن اصبغ، عن ابن وضاح، عن ابن ابی شیبہ ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ کی سند سے روایت کرتے ہیں۔ نسائی کہتے ہیں محمد بن ابراہیم، ابوبکر بن ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ کے والد ہیں۔ محمد بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ اور قاسم بن ابی شیبہ تینوں بھائی تھے۔ ان میں سے ابوبکر ثقہ ہے۔ عثمان کی مرویات قبول کرنے میں بھی حرج نہیں۔ مگر قاسم ثقہ نہیں ہے۔

۸۔ مسند البزار کی روایت میں میرے شیخ حاتم بن محمد المقری الطلمنکی ہیں، جو ابوعبداللہ محمد بن احمد بن مفرج القاضی عن الصموت محمد بن ایوب البرقی، عن ابی بکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۹۔ سیرۃ ابن ہشام کی روایت میں میرے شیخ ابو محمد بن الولید ہیں، جو ابو محمد عبداللہ بن محمد القروی الیمانی، عن عبداللہ بن جعفر بن الورد، عن عبدالرحیم البرقی، عن ابن ہشام کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۱۰۔ غریب الحدیث لابی عُبید میں میرے شیخ ابن الولید ہیں، جو ابوالحسن علی بن اسحاق بن ابراہیم، عن ابی بکر احمد بن محمد بن ابی الموت المکی، عن علی بن عبدالعزیز، عن ابی عبید القاسم بن سلام کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۱۱۔ معانی القرآن للزجاج کی روایت میں میرے شیخ احمد بن علی بن الحسین المعروف بالکسائی ہیں جو ابوالحسن احمد بن محمد بن الحسن المقری البغدادی، عن الزجاج کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۱۲۔ معانی القرآن للنحاس کی روایت میں میرے شیخ ابن الولید ہیں، جو ابوالحسن علی بن ابراہیم الحوفی، عن ابی بکر محمد بن علی الادفوی، عن نحاس کی سند سے روایت کرتے ہیں۔

۱۳۔ کتاب الاموال لاسماعیل القاضی۔ میں نے ابوعمر احمد بن محمد بن سعدی سے پڑھی ہے جو انھوں نے لاہری محمد بن عبداللہ

بن ابی عمر القاضی سے روایت کی ہے اور انھوں نے اسماعیل قاضی سے روایت کی۔

۱۴۔ ابن شعبان کی کتاب کو میں نے بروایت ابو عمرو احمد بن محمد بن جمہور المرشامی، عن محمد بن احمد ابو شاعہ ابن شعبان نقل کیا ہے۔

۱۵۔ کتاب الشرف میں نے ابو عمرو سے پڑھی ہے جو انھوں نے مؤلف ابو سعید عبدالملک بن ابی عثمان نیشاپوری سے روایت کی ہے

۱۶۔ المدونہ میں نے فقیہ شیخ ابو علی الحداد حسن بن ایوب سے پڑھی ہے جو انھوں نے محمد بن عبدون عن ابن وضاح، عن سحنون کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

۱۷۔ المستخرجہ میں نے فقیہ ابو المطرف عبدالرحمٰن بن سعید بن شریح سے پڑھی ہے۔ جو انھوں نے ابو مزین، عن ابی ابراہیم اسحاق بن ابراہیم، عن ابن لبابہ محمد بن عمر، عن محمد بن احمد العتبی کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

المستخرجہ کا ایک جزو میں نے قاضی ابو الولید یونس بن عبداللہ سے پڑھی ہے۔ جو انھوں نے ابو عیسیٰ یحییٰ بن عبداللہ، عن ابو عیسیٰ، عن محمد بن عمر بن لبابہ، عن العتبی کی سند کے ساتھ روایت کی ہے میرے پاس مکی المقری عن ابی زید کی سند کے ساتھ بھی اس کی اجازت موجود ہے۔

۱۸۔ تاریخ ابن ابی خیثمہ میں نے معاویہ بن محمد العقیلی، عن ابن بایل، عن قاسم بن اصبغ، عن ابن ابی خیثمہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

۱۹۔ الخطابی کی کتاب میں نے اسفاقسی، عن محمد بن علی بن عبدالملک الفسوی الرواسی عن الخطابی کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

۲۰۔ الواضحہ میں نے مکی ابن ابی طالب، عن ابن ابی زید، عن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن مسرور، عن یوسف بن یحییٰ المعالی، عن ابن حبیب کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

والحمد للہ وحدہٗ۔ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وعترتہ الطاھرین وسلم تسلیماً کثیراً۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب

محمدؐ بن عبداللہ[1] بن عبدالمطلب[2] بن ہاشم[3] بن عبدمناف[4] بن قصی[5] بن کلاب[6] بن مُرّہ[7] بن کعب[8] بن لوی[9] بن غالب[10] بن فہر[11] بن مالک[12]

---

[1] یہ عبدالمطلب کے دسویں بیٹے تھے۔

[2] ان کا نام شیبۃ الحمد تھا۔ ولادت کے وقت ان کے سر میں کچھ سفید بال تھے اس لیے ان کو شیبہ کہا جاتا تھا۔

[3] ہاشم کا نام عبدالعلا یا عمرو تھا۔

[4] عبدمناف کا نام مُغیرہ تھا اور ان کے حسن وجمال کی وجہ سے ان کو قمر البطحاء کہا جاتا تھا۔

[5] قصی کا نام زید یا مجمع تھا۔ اس لیے کہ قبائل قریش کو پراگندہ ہونے کے بعد اس نے جمع کیا تھا۔

[6] کلاب کا نام دراصل حکیم تھا۔ چونکہ شکاری کتوں سے محبت کرتا تھا اس لیے کلاب کہلایا۔ یہ کتوں کو جمع کرتا تو دیکھنے والا حیران رہ جاتا اور پوچھتا کہ یہ کس کے ہیں۔ اسے بتایا جاتا کہ یہ کتے کلاب بن مُرّہ کے ہیں۔ اسی بنا پر یہ کلاب بن مُرّہ کے نام سے مشہور ہوا یہ پہلا شخص ہے جس نے سونے سے ملمع کی ہوئی دو تلواریں کعبہ کو ہدیہ دیں۔

[7] مُرّہ کا نام مخشیہ اور کنیت ابو یقظہ تھی۔

[8] کعب: قریش میں عالی مرتبہ ہونے کی وجہ سے کعب کہلائے اس لیے کہ کعب بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ پہلے شخص ہیں جس نے لوگوں کو جمعہ کے روز جمع کیا۔ دورِ جاہلیت میں اس دن کو یوم العروبۃ (روزِ جمعہ) کہا جاتا تھا۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا خردہ سنایا کرتے تھے۔ حافظ ابن نُعیم دلائل النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ ان کے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان پانچ سو ساٹھ برس کا عرصہ ہے۔

[9] لُوَی (بضم اللام وتشدید الواؤ) کی کنیت ابو کعب ہے۔ اس نے اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے ——— کعب، عامر، سعد اور خزیمہ۔ بنو عامر، بنو سعد اور بنو خزیمہ وغیرہ قبائل اسی کی اولاد سے ہیں۔

[10] غالب کی کنیت ابو تیم ہے۔

[11] فہر۔ فہر کے معنی طویل پتھر کے ہیں۔ اس کا نام قریش تھا۔ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک جن میں سے زہری بھی ہیں۔ قریش اسی کی طرف منسوب ہیں، لہٰذا فہر سے پہلے لوگ قریشی نہیں بلکہ صحیح تر الفاظ میں کنانی ہیں۔

[12] مالک کی کنیت ابو الحارث ہے۔

بن النضرؒ بن کنانہؒ بن خزیمہؒ بن مدرکہؒ بن الیاسؒ بن مضرؒ بن نزارؒ بن معدؒ بن عدنانؒ۔

لہ النضر کا نام قیس ہے۔ چونکہ اس کا چہرہ ہر وقت تروتازہ رہتا تھا لہٰذا اس کو النضر کہتے گئے۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ وہ قریشی ہے۔ امام شافعی کا قول بھی یہی ہے۔ العراقی نے اس قول کو اکثر اہل علم کی جانب منسوب کیا ہے۔

امام نووی کہتے ہیں کہ صحیح یہی ہے۔ حافظ العلائی نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس بات کے قائل اشعث بن قیس کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ جب وہ کندہ کے وفد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہا یا رسول اللہ! کیا آپ ہم میں سے نہیں ہیں؟ حضور نے فرمایا "ہم بنو النضر بن کنانہ میں سے ہیں"۔ اس کو ابن ماجہ، ابونعیم اور ابن عبدالبر نے روایت کیا ہے۔

بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا کہ قبیلہ کندہ کے کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہیں اور ہم ان میں سے ہیں۔ آپ نے فرمایا عباس اور ابوسفیان بھی یہی بات کہا کرتے تھے۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد سے انکار نہیں کرتے۔ ہم بنو النضر بن کنانہ کے خاندان میں سے ہیں"۔

علماء کی ایک جماعت نے دونوں اقوال میں یوں تطبیق دی ہے کہ فہر نے قریش کی شیرازہ بندی کی ہے۔ اس کے باپ مالک کی اولاد فہر کے سوا اور کوئی نہ تھی۔ اسی طرح النضر کی اولاد مالک کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس طرح دونوں اقوال کے مابین کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔ (شرح المواہب)

لہ کنانہ کی کنیت ابوالنضر ہے۔ وہ مژدہ سنایا کرتا تھا کہ مکہ سے ایک نبی مبعوث ہوں گے۔ اس کے چودہ بیٹے تھے۔

لہ خزیمہ، خزمہ کی تصغیر ہے۔ اس کی کنیت ابو اسد تھی۔

لہ مدرکہ کا نام عمرو تھا۔ مدرکہ اس لیے کہا جاتا تھا کہ اسے عز و شرف کا مقام حاصل تھا اور کسی چیز کے حاصل کرنے کو عربی زبان میں ادراک کہتے ہیں۔

لہ الیاس (بکسر الہمزۃ و فتحہا) یہاں ہمزۃ الوصل ہے۔ الیاس "الرجاء" (امید) کی ضد ہے۔ اس کی کنیت ابوعمرو ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جو قربانی کو ہانک کر خانہ کعبہ کی جانب لایا کرتا تھا۔

لہ مضر (بکسر المیم و فتح الضاد والمعجمۃ) علم اور عدل ہونے کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ اس کا نام عمرو تھا۔ مضر کھٹے دودھ کو کہتے ہیں۔ یہ کھٹا دودھ پینا پسند کرتا تھا اس لیے مضر کے نام سے مشہور ہوا۔

لہ نزار (بکسر النون) کا نام خلدان اور کنیت ابوایاد ہے۔ نزار (قلیل) کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب یہ پیدا ہوا تو اس کا والد بہت خوش ہوا۔ اس نے جانور ذبح کیے اور لوگوں کو کھانا کھلایا۔ اس موقع پر اس نے کہا ھذا کلہ نزر (یہ بہت تھوڑا ہے) السہیلی بھی یہی کہتے ہیں۔ ابوالفرج اصبہانی کہتے ہیں یکتائے روزگار ہونے کی بنا پر اسے نزار کہتے ہیں۔ فتح الباری اور ارشاد الساری میں بھی اسی طرح ہے۔

لہ معد (بفتح المیم والعین وتشدید الدال) بنی اسرائیل کے خلاف جنگجوئی اور غارت گری کی وجہ سے معد کہلائے۔ جس سے بھی لڑتا اس پر غالب آتا۔ کنیت ابوقضاعہ ہے۔

لہ عدنان۔ عدن سے فعلان کے وزن پر ہے۔ عدن کے معنی اقامت کے ہیں۔ زبیر نقل کرتے ہیں کہ عدنان اولین شخص ہے جس نے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نسب فقہاء نے بیان کیا ہے۔ جبکہ سیرت نگاروں اور مؤرخین نے عدنان سے اوپر کا شجرۂ نسب بھی بیان کیا ہے جو یوں ہے:

عدنان بن اُدد بن مقوم، بن ناحور، بن میرح بن یعرب، بن یشجب، بن ثابت بن اسماعیل، بن ابراہیم، بن تارح یعنی آذر، بن ناحور، بن ساروغ، بن ارعو، بن فالغ، بن عیبر، بن شالح بن ارفخشد بن سام بن متوشلخ، بن خنوخ، بن برد، بن مہلائیل، بن قینان، بن انوش، بن شیث بن آدم۔

حرم کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا اور کعبہ کو غلاف پہنایا۔ یا اس کے زمانہ میں پہنایا گیا۔ بلاذری کہتے ہیں جس نے کعبہ کو سب سے پہلے غلاف پہنایا وہ عدنان تھا۔

حضورؐ کا یہ وہ نسب نامہ ہے جس پر تمام علمائے انساب متفق ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب مناقب الانصار باب مبعث النبیؐ میں بھی اسی نسب نامے کا تذکرہ کیا ہے۔

ابوالخطاب بن دحیہ کہتے ہیں :۔

"اس امر پر تمام اہلِ علم کا اجماع ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شجرۂ نسب کو عدنان پر ختم فرمایا کرتے تھے اور اس سے آگے کا شجرۂ نسب بیان نہیں کیا کرتے تھے۔ ابن سعد نے الطبقات (۱-۵۶) میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا نسب بیان کرتے تو معد بن عدنان سے آگے نہ بڑھتے۔"

علمائے انساب اس بارے میں متفق ہیں کہ عدنان کا نسب حضرت اسماعیل بن ابراہیم تک پہنچتا ہے۔ حضرت اسماعیل حضورؐ کے جدِ امجد تھے، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے کنانہ کو اولادِ اسماعیل میں سے چُنا۔ پھر کنانہ میں سے قریش کو منتخب کیا۔ قریش میں سے بنی ہاشم کو برگزیدہ بنایا اور مجھے بنی ہاشم میں سے منتخب کیا۔

البتہ علمائے انساب کے یہاں اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ عدنان اور حضرت اسماعیل کے درمیان کتنی پشتیں پائی جاتی ہیں۔ حاکم اور طبرانی نے حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ عدنان کے آگے شجرۂ نسب یوں ہے:

"عدنان بن اُدد بن زید بن بری، ابن اعراق الثری۔ اور اعراق الثری سے حضرت اسماعیل مراد ہیں۔"

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ عدنان تا اسماعیل شجرۂ نسب کے بارے میں یہ صحیح ترین روایت ہے۔ ابن سعد نے یہ روایت کریمہ بنت المقداد سے نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ عدنان سے حضرت اسماعیل تک شجرۂ نسب کے بارے میں دس مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ دس اقوال انھوں نے ذکر بھی کیے ہیں۔ ان کے نزدیک اس ضمن میں صحیح ترین قول وہ ہے جو حاکم اور طبرانی سے منقول ہے۔" دیکھیے فتح الباری (۶-۵۳۸)

لہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدنان کے آگے نسب بیان کرنے کے سلسلے میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں :۔

"اس ضمن میں صحیح ترین نام وہ ہیں جو میں نے علی بن عُبید کوفی سے نقل کیے ہیں۔ یہ ثعلب محمد بن عبداللہ کے شاگرد ہیں۔

انوس پہلا شخص ہے جس نے کھجور کا درخت بویا، کعبہ کو غلاف پہنایا اور غلہ کاشت کیا۔ وہ دانائی کی باتیں کرتا تھا۔[1]
الفاکہی[2] کہتے ہیں کہ مکہ میں وہ مکان جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی محفوظ تھا لیکن حجاج بن یوسف

یہ نسب نامہ یوں ہے :۔
"عدنان بن اُدد، بن یزید بن یقدد، بن المقوم، بن الیسع، بن قیدار بن ناحور بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن تارح بن شاروخ، بن ارعو، بن نالغ بن عابر، بن شالخ بن ارفخشد، بن سام بن نوح، بن لامک بن متوشلخ، بن حنوخ بن برد، بن مہلاییل، بن قینن، بن انوس، بن شیث بن آدمؑ" (ملاحظہ ہو تلقیح فہوم اہل الاثر لابن الجوزی ص ۹)
ان ناموں میں کس طرح کی بیشی اور تحریف معلوم ہوتی ہے۔

[1] حافظ ابن حجر فتح الباری میں بروایت عبدالرزاق عن ابن جُریج بیان کرتے ہیں کہ تبع پہلا شخص ہے جس نے کعبہ کو غلاف پہنایا۔ ہمارے بعض اہل علم کہتے ہیں کہ سب سے پہلے کعبہ کو غلاف حضرت اسماعیلؑ بن ابراہیمؑ نے پہنایا تھا۔ زبیر بن بکار نے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے عدنان نے کعبہ کو غلاف پہنایا تھا، یا اس کے زمانہ میں پہنایا تھا۔
بلاذری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے کعبے کو چمڑے کا غلاف پہنایا وہ عدنان بن اُدد تھا۔ الفاکہی نے وہب بن منبّہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسعد کو برا بھلا کہنے سے اس لیے منع کیا کہ اس نے سب سے پہلے کعبہ کو غلاف پہنایا تھا۔ (حافظ ابن حجر کا بیان ختم ہوا)
کعبہ کو سب سے پہلے غلاف پہنانے والے کے بارے میں یہ جو اختلاف رونما ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے کی تاریخ مدوّن نہیں ہوئی۔ عرب لکھنے پڑھنے سے ناآشنا لوگ تھے جس نے جو کچھ اپنے باپ دادا سے سنا اسے حفظ کر لیا۔

[2] بحوالہ "تاریخ مکہ" از الفاکہی۔ مگر یہ مکمل کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ ہم تک جو کتاب پہنچی ہے وہ اس کا خلاصہ ہے جس کا نام "المنتقیٰ مِنْ اَخْبَارِ اُمِّ القُریٰ" ہے۔ یہ کتاب "اخبار مکہ للازرقی" اور "شفاء الغرام باخبار البلد الحرام للفاسی" کے ساتھ یکجا چھپی ہے۔ اس کے ساتھ "الجامع اللطیف فی فضائل مکۃ وبناء البیت الشریف" لابن ظہیرہ اور "الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام" للنہروالی بھی شامل ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ معجم المطبوعات (۲ - ۱۴۳۱) میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
الفاکہی اور امام، علامہ، مورخ محمد بن اسحاق، ابن عباس الفاکہی المکی ہیں۔ جو تیسری صدی ہجری کے فضلاء میں سے تھے۔ ازرقی کے معاصر تھے لیکن ان کی وفات ازرقی کے بعد ہوئی۔
الفاسی العقد الثمین (۱ - ۴۰۰) میں لکھتے ہیں :۔
"مجھے اُن کی تاریخ وفات معلوم نہیں، البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ۲۷۲ھ میں بقید حیات تھے۔ اس لیے کہ انھوں نے مذکورہ سال کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے جس کا تعلق مسجد الحرام سے ہے۔ اس کے سوا مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔"
الفاکہی نے حضورؐ کی ولادت سے متعلق جس مکان کا تذکرہ کیا ہے الازرقی نے "اخبار مکہ" (۲ - ۱۹۸ - ۱۹۹) میں اس کے متعلق لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مکان کو "دار البیضاء" کہا جاتا ہے۔ یہ روایت انھوں نے اپنے دادا کی طرف منسوب کی ہے۔ اب وہاں

کے بھائی محمد بن یوسف نے اپنی حویلی تعمیر کی تو وہ اس کے اندر آگیا۔ ہارون الرشید کے عہد تک یہ اسی صورت میں رہا حتیٰ کہ خلیفہ موسیٰ ؒ ہارون کی والدہ خیزران مکہ آئی اور اس نے اس مکان کو حویلی سے باہر نکال کر مسجد میں تبدیل کر دیا جس میں لوگ نماز پڑھا کرتے تھے۔ بعض اہلِ مکہ نے ذکر کیا ہے کہ کچھ لوگ اس مکان میں وقتاً فوقتاً سکونت پذیر بھی رہے پھر نقل مکانی کر کے چلے گئے۔ ان کا بیان ہے کہ اس مکان میں رہتے ہوئے وہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ تھے۔ لیکن جب وہاں سے نکلے تو آلام و مصائب سے دوچار ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے والد عباسؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ میں نے رات آپؐ کے یہاں بسر کی۔ میں نے سنا کہ آپ یہ دعا کر رہے تھے۔

"اے اللہ! میں تیری رحمت کا طلب گار ہوں جس سے میرا دل رہنمائی حاصل کرے، مجھے سکونِ قلب اور اطمینان حاصل ہو، جس کے ذریعے تو مجھ سے فتنوں کو دور کرے اور میری حالت کو سنوارے جو میرے غائب کی حفاظت کرے میری موجودہ حالت کو بہتر کرے اور میرے چہرے کو بارونق بنائے۔ اس کے ساتھ میرے اعمال کو پاکیزہ بنائے مجھے نیکی کا الہام کرے اور مجھے ہر برائی سے محفوظ رکھے۔ اے اللہ! مجھے ایمان صادق اور ایسا یقین عطا کر جس کے بعد کفر کا خدشہ باقی نہ رہے۔ ایسی رحمت عطا کر کہ میں دنیا و آخرت میں تیری بزرگی کا شرف حاصل کر سکوں۔ اے اللہ! میں موت کے وقت کامیابی کا طلبگار ہوں۔ مجھے شہداء جیسی مہمانی اور سعادت مندوں کی زندگی عطا فرما۔ مجھے انبیاء کی رفاقت اور دشمنوں پر غلبہ عطا کر۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بروز سوموار، ۱۲ ربیع الاول عام الفیل ۲۲ اپریل ۵۷۱ء[1] میں پیدا ہوئے۔

نئی عمارت تعمیر ہو چکی ہے جسے "مکتبۃ مکۃ" کہا جاتا ہے۔

شیخ محمد طاہر الکردی لکھتے ہیں:-

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش والے مکان کی جگہ پر مختلف اوقات میں مختلف عمارات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو مسجد بنا دیا گیا تھا جس میں لوگ نماز پڑھتے تھے۔ ترکی حکومت کے زمانہ میں وہاں ایک امام اور مؤذن مقرر تھے۔ ۱۳۴۳ھ میں اس کو مسمار کر دیا گیا، جس کی وجہ سے یہ جگہ ایک کھلے میدان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ یہاں بتفصیل بیان کرنا ضروری نہیں ہے کہ اس سے پہلے گزشتہ ادوار میں اسے کس کس نے تعمیر اور آباد کیا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کی ساری تفصیل موجود ہے، مگر یہ امر ضروری ہے کہ موجود عمارت جو آج ہمارے زمانہ میں موجود ہے اس کا کچھ تذکرہ کیا جائے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ ولادت مکہ کے "سوق اللیل" میں ہے جو کہ شعب علی میں واقع ہے۔ اب یہاں ایک بڑی خوبصورت عمارت بنی ہوئی ہے، جسے مکہ مکرمہ کے سابق میئر شیخ عباس بن یوسف القطان المتوفی ۱۲ رجب ۱۳۷۰ھ نے اپنی جیب خاص سے تعمیر کرایا تھا۔ تاکہ یہاں ایک ایسی پبلک لائبریری قائم کی جائے جس سے علماء و طلبہ سب استفادہ کر سکیں۔ جب انھوں نے وفات پائی تو ان کے بیٹے شیخ امین نے اس عمارت کی تکمیل کرائی۔ شیخ عباس اپنی وفات سے قبل شیخ کامل بن ماجد الکردی اور ان کے بھائیوں کے ساتھ یہ طے کر چکے تھے، کہ وہ اپنے قائم کردہ مکتبہ ماجدیہ کو اس نو تعمیر شدہ عمارت میں منتقل کر دیں تاکہ اسے ایک عام لائبریری بنا دیا جائے۔ (التاریخ القویم لمکۃ وبیت اللہ الکریم ۱/۱۰۰)

[1] محمود پاشا فلکی نے حضورؐ کی ولادت کی تاریخ ۲۲ اپریل ۵۷۱ء قرار دی ہے۔ ہمارے استاذ محترم جناب ابو شہبہ نے اپنی کتاب "السیرۃ النبویۃ" کے حاشیہ میں ص ۱۷۶ پر تحریر کیا ہے کہ مشہور مستشرق کوسان دی پرسفال نے عربوں سے متعلق اپنی مشہور کتاب میں لکھا ہے کہ

اصحاب الفیل تحریر، ۱ر محرّم کو بروز اتوار حملہ آور ہوئے تھے۔ محرّم کا آغاز جمعہ کے روز ہوا تھا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم جناب عبداللہ نے وفات پائی تو حضورؐ کی والدہ محترمہ امید سے تھیں[1]۔ آپؐ کے چچا جناب ابوطالب نے آپ کی ولادت کی خوشخبری دی تھی[1]۔

ایک قول کے مطابق جناب عبداللہ کی وفات کے وقت حضورؐ کی عمر مبارک اٹھائیس ماہ تھی[2]۔ دوسرے قول کے مطابق ۹ ماہ اور تیسرے قول کے مطابق دو ماہ تھی۔

سیف بن ذی یزن کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ جب حضورؐ کے والدین نے وفات پائی تو آپ کے چچا اور دادا آپ کے کفیل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضورؐ کی والدہ محترمہ نے وفات پائی تو آپ کی عمر اس وقت سات برس تھی[3]۔

حضورؐ اگست ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب "حیات محمدؐ" (ص ۱۰۹) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

[1] اہل سیرت اور مؤرخین کے نزدیک مشہور روایت یہی ہے کہ حضورؐ کے والد محترم جناب عبداللہ نے شادی کے بعد عربوں کے عام رواج کے مطابق تین دن تک اپنی زوجہ محترمہ آمنہ بنت وہب کے والدین کے یہاں مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ پھر زوجہ محترمہ کو لے کر اپنے والدین کے یہاں مکہ مکرمہ میں تشریف لائے۔ وہاں چند روز قیام کیا۔ پھر ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں عازم شام ہوئے۔ حضرت آمنہ ان دنوں امید سے تھیں۔ جناب عبداللہ نے چند ماہ سفر میں بسر کیے۔ شام سے لوٹتے وقت مدینہ منورہ میں اپنے والد جناب عبدالمطلب کے ننھیال بنی نجار کے یہاں چند روز سفر کی تھکان دور کرنے کے لیے ٹھہر گئے۔

اتفاق سے جناب عبداللہ مدینہ میں بیمار پڑ گئے اور ان کے رفقاء مکہ لوٹ آئے۔ جب جناب عبدالمطلب کو ان کی علالت کا پتہ چلا تو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینہ بھیجا کہ ان کو ساتھ لائیں لیکن جب حارث مدینہ پہنچے تو انھیں جناب عبداللہ کی وفات کا پتہ چلا۔ آپ کو بنی نجار کے محلہ دار النابغہ میں دفن کیا گیا۔ یہ حادثہ ماہ شعبان میں واقعہ الفیل سے چار ماہ قبل رونما ہوا۔ جناب عبداللہ کی وفات کے دو ماہ بعد حضورؐ کی پیدائش ہوئی۔

یہ ابن اسحاق اور دوسرے مورخین کا بیان ہے۔ جناب عبداللہ کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی۔ (شرح المواہب (۱-۱۳۱)

ابن سعد کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی۔ سُہیلی کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ جناب عبداللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دو ماہ بعد فوت ہوئے۔

[2] طبقات ابن سعد (۱-۱۰۰) بروایت از کلبی و عوانہ بن الحکم۔ پھر کہتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ آپؐ کی ولادت سے پہلے آپؐ کے والد وفات پا چکے تھے۔ واقدی، بلاذری، ذہبی، ابن کثیر اور اہل علم کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے۔ دیکھیے شرح المواہب (۱-۱۰۹)

[3] ابن سعد نے متعدد اسناد کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی والدہ محترمہ آمنہ بنت وہب کے ساتھ مقیم تھے۔ جب چھ برس کے ہوئے تو والدہ محترمہ آپؐ کو مدینہ منورہ اپنے میکے بنی عدی بن النجار کے یہاں لے جانے کے لیے تیار ہوئیں۔ آپ کے ہمراہ ام ایمن بھی تھیں جو آپؐ کی تربیت کرتی تھیں۔ یہ لوگ دو اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ پہنچے اور دار النابغہ میں قیام کیا۔ آپ ایک ماہ تک اپنی والدہ کے ساتھ وہاں ٹھہرے۔ یہاں جو چیزیں =

امام مالک اور دیگر اہل علم فرماتے ہیں کہ چالیس سال کی عمر میں بروز سوموار آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔[۱]
مؤطا امام مالک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بروز سوموار وفات پائی۔ منگل کے دن آپ کو دفن کیا گیا۔ لوگوں نے انفرادی طور پر آپ کی نماز جنازہ ادا کی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کو منبر کے پاس دفن کیا جائے۔[۲] دوسروں نے کہا کہ آپ کو بقیع میں دفن کیا جائے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ ہر نبی کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں اس نے وفات پائی۔[۳] چنانچہ آپ کے لیے قبر کھودی گئی۔ مدینہ میں دو آدمی قبریں کھودتے تھے جن میں سے ایک لحد کھودا کرتا تھا۔ اسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی لحد کھودی۔

محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم البرقی کہتے ہیں کہ جب آپ پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تو آپ کی عمر اس وقت تینتالیس

= دیکھی تھیں وہ آگے چل کر بھی آپ کے حافظہ میں محفوظ رہیں۔ جب آپ نے بنی عدی بن النجار کا قلعہ دیکھا تو اسے پہچان لیا اور فرمایا "میں اس قلعہ پر انیسہ نامی ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا"

پھر آپ کی والدہ محترمہ آپ کو ہمراہ لے کر عازمِ مکہ ہوئیں۔ جب الابواء کے مقام پر پہنچیں تو وفات پا گئیں۔ اسی جگہ انھیں دفن کیا گیا۔ اُم ایمن آپ کو لے کر مکہ پہنچیں۔ (الطبقات (۱-۱۱۲)

غرض یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چھ سال کی عمر میں والدین کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

[۱] حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے جب یہ کہا جائے کہ آپ کی بعثت اسی ماہ میں ہوئی جس میں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ جمہور کے نزدیک آپ کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی اور ماہ رمضان میں آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ بنا بریں بعثت کے وقت آپ کی عمر چالیس سال چھ ماہ یا انتالیس سال چھ ماہ کی ہوگی۔ جس نے چالیس سال کہا اس نے کسر کو نظر انداز کر دیا یا اس کو پورا کر کے چالیس قرار دیا۔ المسعودی اور ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ آپ کی بعثت ربیع الاول میں ہوئی۔ اس طرح بعثت کے وقت آپ کی عمر پورے چالیس سال ہوگی۔ دیکھیے فتح الباری (۶-۵۷۰)

[۲] مؤطا (۱-۲۳۱) کتاب "الجنائز" باب "دفن المیت"

[۳] الباجی شارح مؤطا لکھتے ہیں:۔

"آپ کی نماز جنازہ انفرادی طور پر اس لیے ادا کی گئی تاکہ کوئی شخص مسلمانوں کی متفقہ رائے کے بغیر ان کی امامت پر فائز نہ ہو جائے۔ اس وقت یہ بات طے شدہ نہ تھی کہ خلافت کے منصب پر کوئی غیر قریشی فائز نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انصار نے اس کا دعویٰ کیا تھا۔ انھوں نے کہا "ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے۔" پھر دلائل کی بنا پر اس جھگڑے کو طے کر دیا گیا اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر سب لوگ متفق ہو گئے۔" (المنتقی (۲-۲۱)

[۴] ابن سعد اور البیہقی نے اس کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ ایک شخص نے کہا آپ کو مسجد میں دفن کیا جائے۔ (الخصائص للسیوطی (۳-۳۹۷)

برس تھی۔[1] امام مالک فرماتے ہیں کہ آپ نے بروز سوموار بارہ[12] ربیع الاول کو وفات پائی۔ آپ کی عمر اس وقت ساٹھ برس تھی۔[2] امام مالک نے یہ روایت بطریق ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔ امام بخاریؒ[3] اور دیگر محدثین نے اس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جب حضورؐ نے وفات پائی تو آپ کی عمر اس وقت تریسٹھ[63] برس تھی۔

مسلم[4] حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے پینسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ مکہ مکرمہ میں (البعثت کے بعد) پندرہ سال اور مدینہ میں دس سال مقیم رہے۔

ابن عبدالبر نے کتاب التمہید میں ولید بن مسلم، عن شعیب، عن عطا خراسانی، عن عکرمہ، عن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جناب عبدالمطلب نے ولادت کے ساتویں روز حضورؐ کا ختنہ کرایا۔ ایک دعوت کا اہتمام کیا اور آپ کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجویز کیا۔

کتاب "سبل الخیرات" میں مرقوم ہے کہ آپ مختون[5] پیدا ہوئے۔ آپ کی ناف بھی کٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کے

---

[1] حاکم نے بھی یحییٰ بن سعید، عن سعید بن المسیب کے حوالے سے بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ جب آپ پر قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو آپ کی عمر اس وقت تینتالیس برس تھی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:-

"یہ شاذ روایت ہے۔ الواقدی کا قول بھی یہی ہے۔ بلاذری اور ابن ابی عاصم نے بھی اسی کی پیروی کی ہے۔ یعقوب بن سفیان وغیرہ کی تاریخ میں مکحول سے مروی ہے کہ آپ کی بعثت بیالیس سال کی عمر کے بعد ہوئی"

اہل علم کے نزدیک صحیح اور مشہور روایت یہ ہے کہ آپ کی بعثت بروز سوموار سترہ رمضان المبارک کو ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک چالیس برس تھی۔ یہ آغاز فروری ۶۱۰ء کا واقعہ ہے۔

[2] دیکھیے مؤطا امام مالک (۱-۱۷۸) کتاب "الجنائز"

[3] دیکھیے صحیح بخاری باب "وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۴۴۶۵)

وفات کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے تعین کے سلسلے میں حافظ ابن حجر نے علماء کے اختلاف کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ آپ کی عمر مبارک اس وقت تریسٹھ[63] برس تھی (فتح الباری ۸-۱۵۱)

حضرات انس، عائشہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے اسی طرح منقول ہے۔ سعید بن المسیب، شعبی اور مجاہد کا قول بھی یہی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ہمارا موقف بھی یہی ہے۔

[4] صحیح مسلم کتاب "الفضائل" باب "کم سن النبی صلی اللہ علیہ وسلم"

[5] ابن الجوزی نے "تلقیح فھوم اھل الاثر" (ص ۷) میں کعب الاحبار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ حاکم اور ابن الجوزی نے بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں "بلاشبہ آپ مختون پیدا ہوئے تھے"

القطب الخیضری کہتے ہیں کہ میرے نزدیک راجح یہی ہے۔ اس کے دلائل ضعیف ہونے کے باوجود دوسرے دلائل کے مقابلے =

دادا عبدالمطلب بہت خوش ہوتے۔

ابن وضاح کی روایت کے مطابق قریش نے پوچھا۔ "آپ نے ان کا نام محمد کیوں رکھا۔ کیا وجہ ہے کہ ان کا نام اپنے باپ دادا کے نام پر نہیں رکھا؟ انھوں نے جواب دیا "تاکہ تمام زمین و آسمان والے ان کی مدح و توصیف کریں۔"

میں مضبوط ہیں۔" شرح المواہب (۱-۱۲۶)

المواہب کے مصنف لکھتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کے بارے میں تین اقوال ہیں۔

۱۔ آپ مختون پیدا ہوئے۔

۲۔ آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کا ختنہ کرایا۔

۳۔ آپ کی دایہ حلیمہ سعدیہ نے آپ کا ختنہ کرایا۔

حافظ ابن القیم، دمیاطی اور مغلطائی نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

۴۔ جبریلؑ نے شق صدر کے وقت آپ کا ختنہ کیا تھا۔ یہ شاذ قول ہے۔ طبرانی نے المعجم الاوسط میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ذہبی اس کو تسلیم نہیں کرتے۔

لہ بیہقی نے "الدلائل" (۱-۹۳) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"میں نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر اور اس کی مخلوق زمین پر ان کی تعریف کرے۔"

حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" میں ذکر کیا ہے کہ چونکہ عرب اکثر ملک شام کی طرف جایا کرتے تھے۔ وہاں انھوں نے کاہنوں سے سنا تھا کہ اس زمانہ میں ایک نبی مبعوث ہوں گے جن کا اسم گرامی محمد ہوگا۔ جس نے یہ بات سنی اس نے اپنے بچے کا نام محمد تجویز کیا۔ حافظ ابن حجر نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سولہ اشخاص کے نام گنائے ہیں جن کا نام محمد تھا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفین و تدفین

موطاؑ[1] امام مالک اور دوسری کتابوں میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین سفید یمنی کپڑوں کا کفن پہنایا گیا۔ جن میں قمیص اور عمامہ نہ تھا[2] کہا جاتا ہے کہ ان میں ایک دھاری دار لنگی بھی تھی۔ ابنِ ابی زید نے النوادر[3] میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ان کپڑوں میں ایک وہ بھی تھا جو بیماری کی حالت میں آپ نے پہن رکھا تھا۔ بروایت ابن مفوج نے ابو منصور محمد بن سعد، عن سفیان بن موسیٰ، عن ایوب، عن عبدالرحمٰن بن القاسم، عن القاسم، عن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سند کے ساتھ بیان کی ہے کہ غسل دیتے وقت جب لوگوں نے قمیص اتارنا چاہی تو ایک آواز سنائی دی کہ "قمیص مت اتارو" چنانچہ قمیص سمیت آپ کو غسل دیا گیا۔[4]

الواضحہ اور دوسری کتابوں میں ہے کہ زہری نے سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو غسل دیا اور قبر میں اتارا وہ حضرات عباسؓ، علیؓ بن ابی طالب، فضلؓ بن عباس اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام شقران تھے۔ شقران کا نام صالح تھا۔ شعبی کہتے ہیں کہ چھٹے شخص عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔[5] موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں

---

[1] مؤطا امام مالک (۱-۲۲۳) کتاب "الجنائز" باب "ما جاء فی کفن المیت"۔

[2] حضرت عائشہؓ کا یہ قول کہ ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھے اس کے دو معنی ہیں (۱) پہلا مطلب یہ ہے کہ جن کپڑوں کا آپ کو کفن دیا گیا ان میں قمیص اور عمامہ شامل نہ تھے۔ بلکہ صرف تین کپڑے تھے (۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ قمیص اور عمامہ کو ان میں شمار نہیں کیا گیا۔ اگرچہ یہ کفن میں شامل تھے۔ اسی وجہ سے علماء کا اس ضمن میں اختلاف رائے ہے۔ امام مالک اور ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ میت کو قمیص اور عمامہ پہنایا جائے۔ جبکہ امام شافعی اس سے منع کرتے ہیں۔

[3] سعید بن المسیب، علی بن حسین اور جعفر بن محمد سے بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔ ابن سعد نے اس کا ذکر کیا ہے۔

[4] امام مالک نے مؤطا میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے یہ طبقات میں مختلف اسناد کے ساتھ روایت کی ہے۔

[5] ابن سعد محمد بن عمر سے وہ محمد بن عبداللہ سے، وہ زہری سے اور وہ سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علیؓ نے غسل دیا اور چار اشخاص نے کفن پہنایا یعنی علی، عباس، فضل اور شقران نے۔ ابن سعد کی ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ حضرت عباسؓ نے آپ کو غسل دینے میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پردہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ عمرو بن حریم کی روایت میں ہے کہ حضرت عباسؓ دروازے پر تھے۔ وہ کہتے تھے غسل دینے میں شرکت کرنے سے مجھے صرف یہ بات مانع ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے شرمایا کرتے تھے کہ میں بلا قمیص ۔

کہ چوتھے اُسامہ بن زید تھے۔[۱]

سیرت ابن ہشام میں[۲] ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب، عباس، فضل بن عباس، قثم بن عباس، اسامہ بن زید اور آپ کے آزاد کردہ غلام شقران نے حضورؐ کو غسل دیا تھا۔ حضرت علیؓ نے آپ کو اپنے سینے کے ساتھ ٹیک دی تھی۔ حضرت عباسؓ، فضلؓ اور قثمؓ آپؐ کی کروٹ بدلتے تھے۔ اُسامہ اور شقران پانی ڈالتے تھے۔ حضرت علیؓ قمیص سمیت آپ کو غسل دیتے تھے۔ حضرت علیؓ قمیص سمیت آپؐ کے جسم کو ملتے تھے اور اُن کا ہاتھ آپ کے جسم کے ساتھ نہیں لگتا تھا۔ حضرت علیؓ کہہ رہے تھے:

"میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں آپؐ زندگی میں بھی کتنے پاکیزہ تھے اور بعد از وفات بھی کس قدر پاکیزہ ہیں۔"

آپ کو قباء میں واقع سعد بن خیثمہ کے کنوئیں کے پانی سے غسل دیا گیا۔ اس کو بئر الغرس کہتے ہیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو کپڑوں اور ایک دھاری دار چادر میں کفنایا گیا۔ ان کپڑوں میں آپؐ کے جسدِ اطہر کو لپیٹ دیا گیا تھا۔

مؤطا امام مالک میں[۳] ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوموار کے روز وفات پائی اور منگل کے دن آپ کو دفن کیا گیا۔ لوگ انفرادی طور پر نمازِ جنازہ ادا کرتے تھے۔ کسی نے بھی امامت نہیں کروائی تھی۔[۴] بعض لوگوں نے کہا کہ آپؐ کو منبر کے پاس دفن کیا جائے۔ دوسروں نے کہا آپؐ کو بقیع کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اسی اثناء میں حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لائے۔ انھوں نے کہا "میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ انبیاء جہاں فوت ہوتے ہیں ان کو اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے۔"[۵]

ننگے بدن ان کو دیکھوں۔

مگر یہ بات اس لیے صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ دوسری روایات میں ہے کہ آپؐ کو قمیص سمیت غسل دیا گیا۔ لہٰذا حضرت عباسؓ کے اس قول کا مطلب یہ لینا چاہیے کہ شروع میں وہ شریک نہیں ہوئے تھے لیکن جب انھیں پتہ چل گیا کہ آپ کو قمیص سمیت غسل دیا جا رہا ہے تو اس میں شریک ہو گئے۔

[۱] ابن سعد نے حارث التیمی سے روایت کیا ہے کہ غسل میں ایک پانچواں شخص بھی شامل تھا جس کا نام اَوس بن خَولی تھا۔

[۲] سیرت ابن ہشام (۲-۶۶۲) نیز طبقات ابن سعد

[۳] مؤطا امام مالک (۱-۱۷۸، ۱۷۹) کتاب "الجنائز" باب "دفن المیت"، یحییٰ امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ ان تک یہی روایت پہنچی۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ میرے علم کی حد تک یہ حدیث اس انداز میں صرف بلاغات مالک کی حیثیت سے روایت کی گئی ہے اور کسی طریقے سے یہ مروی نہیں ہے۔ مگر مختلف دلائل کی بنا پر یہ صحیح ہے۔

[۴] لوگوں نے تنہا نمازِ جنازہ ادا کی۔ بیہقی نے یہ حدیث عبداللہؓ بن عباس سے متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ ابن سعد نے یہ حدیث سہل بن سعد الساعدی سے روایت کی ہے۔

[۵] ابن سعد نے یہ داؤد بن الحُصین، عن عکرمہ، عن عبداللہ بن عباس کی متصل سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں ابن سعد

چنانچہ اسی جگہ آپ کے لیے قبر کھود دی گئی۔

مدینہ میں دو آدمی قبر کھودنے کا کام کرتے تھے جن میں سے لحد کھودا کرتا تھا۔ رسولِ کریم کے لیے بھی لحد کھود دی گئی۔ مؤطا کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں ہے کہ ابوطلحہؓ انصاری لحد کھودا کرتے تھے اور ابوعبیدہؓ بن الجراح لحد نہیں کھودتے تھے۔[1]

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر اٹھا کر اس جگہ قبر کھود دی گئی۔ پھر لوگ گروہوں کی صورت میں آکر آپؐ کی نمازِ جنازہ ادا کرتے تھے۔ پہلے مرد آتے رہے جب وہ فارغ ہوئے تو خواتین آنے لگیں۔ پھر بچے آنے شروع ہوئے۔ بدھ کی رات کو نصف شب کے وقت حضورؐ کی تدفین عمل میں آئی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ایک روایت میں ہے کہ سرخ رنگ کی جو مخملی چادر آپؐ اوڑھا کرتے تھے وہ آپ کی قبر میں بچھا دی گئی۔ قاسم بن اصبغ نے اپنی مسند میں اس کا ذکر کیا ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں، بعض مؤرخین نے اور امام ابن حزم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا "یا رسول اللہ! آپ پر اللہ کا سلام اور اس کی رحمت و برکت ہو۔ اے اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ پر جو کچھ اتارا گیا تھا وہ آپ نے آگے ہم تک پہنچا دیا۔ آپ نے اپنی امت کی خیرخواہی کی۔ اللہ کی راہ میں جہاد کر کے اس کے دین کو غالب کیا۔ میں صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہوں۔ اس کا کوئی شریک نہیں"۔ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں شامل کر جو اس نورِ ہدایت کی پیروی کرتے ہیں جو آپؐ پر نازل ہوا۔ اور ہمیں قیامت کے دن جنت میں اکٹھا کر دے تاکہ وہ وہاں پر ہمیں پہچان لیں اور ہم انھیں۔ حضورؐ مومنوں پر بڑے مہربان تھے۔ آپؐ پر ایمان لانے کا ہم کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔ نہ ہی اس کی کوئی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں"۔ حضرت ابوبکرؓ یہ الفاظ کہتے اور لوگ آمین

نے یہ ہشام بن عروہ عن عروہ عن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

[1] ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لحد ابوطلحہؓ انصاری نے کھودی تھی۔ قبر میں چادر آپ کے آزاد کردہ غلام شقران نے بچھائی تھی۔ احمد، ابن سعد اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب لوگوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قبر کھودنا چاہی تو پتہ چلا کہ مدینہ میں دو آدمی ہیں۔ ایک ابوعبیدہؓ قبر کھودتے ہیں اور لحد نہیں بناتے۔ دوسرے ابوطلحہؓ ہیں جو قبر میں لحد بناتے ہیں۔ حضرت عباسؓ نے دونوں کی طرف ایک ایک آدمی بھیج کر ان کو بلایا۔ پھر کہا اے اللہ! دونوں میں سے اپنے نبی کے لیے ایک کو پسند کر لے۔ بلانے والے کو ابوطلحہؓ مل گئے اور وہ انھیں لے آئے۔ ابوطلحہؓ نے لحد کھودی۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ لوگوں میں اس بارے میں اختلاف پیدا ہوا کہ آپؐ کی قبر میں لحد کھودی جائے یا نہیں؟ لوگوں نے کہا "اے اللہ! اپنے نبی کے لیے وہی بات اختیار کر جو تجھے پسند ہے۔ پھر انھوں نے ابوعبیدہؓ اور ابوطلحہؓ کو بلایا اور کہا کہ دونوں میں سے جو پہلے آجائے وہ اپنے طریقے سے قبر بنائے۔ چنانچہ ابوطلحہ پہلے پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا بخدا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے وہی بات پسند کی ہے جو اسے محبوب تر ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب لحد دیکھتے تو اسے بہت پسند کیا کرتے تھے۔

دیکھیے الخصائص (۲-۳۹۸)

کہتے تھے۔ پھر وہ چلے جاتے اور دوسرے لوگ آجاتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔۔ الخ (الاحزاب۔ ۵۶) پھر فرمایا اے اللہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و رحمت بھیج اور ان کو شرف و عظمت عطا فرما۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں، ان کی باری کے دن اور سر مبارک ان کی گود میں رکھے ہوئے آپ نے وفات پائی۔ اس وقت کافی دن چڑھ آیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم وفات امام مالک فرماتے ہیں حضور نے سوموار کے دن بارہ ربیع الاوّل کو وفات پائی۔[۱]

صحیح بخاری[۲] میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ صحت کی حالت میں فرمایا کرتے تھے:

"کسی نبی کو اس وقت تک فوت نہیں کیا جاتا جب تک وہ جنت میں اپنی جگہ دیکھ نہ لے۔

اور بیماری کی حالت میں جب آپ کا سر مبارک میری ران پر تھا تو آپ پر غشی طاری ہوگئی۔ آپ پھر ہوش میں آئے اور نگاہیں چھت کی طرف کرکے فرمایا:

"اے اللہ! میں رفیق اعلیٰ کو اختیار کرتا ہوں۔"

میں نے کہا گویا آپ ہمارے پاس رہنا اختیار نہیں فرما رہے ہیں۔ تب مجھے وہ حدیث یاد آئی جو آپ اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ آخری الفاظ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلے یہی تھے کہ "اے اللہ! میں رفیق اعلیٰ کو اختیار کرتا ہوں۔"

اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ جنت کے بلند مرتبہ رفقا کے پاس جانے کا متمنی ہوں۔

حضرت ابوبردہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہمیں ایک چادر اور موٹے کپڑے کا ایک تہبند دکھایا اور فرمایا کہ حضور

---

[۱] جمہور اہل علم کے نزدیک مشہور روایت یہی ہے، ابن اسحاق، ابن سعد، ابن حبان، ابن عبد البر، ابن الصلاح، امام نووی اور دیگر ائمہ اسی کے قائل ہیں۔

لیکن علامہ سہیلی اس سے اختلاف کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

یہ بات صحیح نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بارہ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی، بلکہ تیرہ، چودہ یا پندرہ ربیع الاوّل بھی آپ کا یوم وفات ہوسکتا ہے۔ کیونکہ تمام اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حجۃ الوداع میں وقوف عرفہ کا واقعہ بروز جمعہ ۹ ذوالحجہ کو وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یکم ذوالحجہ کو جمعرات کا دن تھا۔ اس طرح یکم محرم کو جمعہ یا ہفتہ کا دن ہوگا۔ اگر جمعہ ہوا تو ماہ صفر کی پہلی تاریخ کو ہفتہ یا اتوار ہوگا۔ اگر ہفتہ ہوا تو یکم ربیع الاوّل کو اتوار یا سوموار کا دن ہوگا۔ غرض یہ کہ اس کو پیش نظر رکھ کر کسی طرح سے بھی حساب کیا جائے بارہ ربیع الاوّل کو سوموار کا دن نہیں ہوسکتا۔

(الروض الانف ج ۷ ص ۵۷۹)

الخضری اپنی کتاب نور الیقین ص ۲۷۳ میں لکھتے ہیں:۔

"حضورؐ کی وفات بروز سوموار تیرہ ربیع الاوّل مطابق ۸ جون ۶۳۳ھ کو ہوئی تھی۔"

[۲] صحیح بخاری کتاب "الرقاق" "باب" من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۵۰)

کی رُوحِ مبارک ان دو کپڑوں میں قبض کی گئی تھی۔[۱]

صحیح بخاریؒ میں ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ (بیماری کی حالت میں) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک برتن رکھا تھا جس میں پانی تھا۔ آپؐ اس میں ہاتھ ڈال کر اپنے منہ پر ملتے اور فرماتے "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بے شک موت کے وقت غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔" پھر آپؐ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر فرمایا "میں رفیقِ اعلیٰ کو اختیار کرتا ہوں۔" حتّٰی کہ آپؐ نے وفات پائی اور دستِ مبارک نیچے جھک گیا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی تدفین منگل کے روز عمل[۲] میں آئی۔ کہا گیا ہے کہ آپ کو دن ڈھلے دفن کیا گیا۔ آپؐ کو حضرت علیؓ، عباسؓ، فضل بن عباس اور آپؐ کے آزاد کردہ غلام شقرانؓ اور ایک روایت کے مطابق صالح نے غسل دیا۔ یہی لوگ آپؐ کی قبر میں اترے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ اسامہ بن زید اور اوسؓ بن خولی بھی تھے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کا آغاز حضرت میمونہؓ بنت حارث کے گھر میں بدھ کے روز ہوا۔ اس وقت ماہِ صفر کے ختم ہونے میں دو دن باقی تھے۔ پھر حضرت عائشہؓ کے گھر میں منتقل ہو کر بیماری کے دن وہیں گزارے اور وہیں وفات پائی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علالتِ طبع کے زمانہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دس سے کچھ اوپر (دنوں) تک لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔ اور آجری کی کتاب میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو نو دن نماز پڑھائی۔

یہاں کتاب مکمل ہوئی۔

والحمد للہ رب العالمین، ولا قوۃ الا باللہ العظیم، وصلی اللہ علی رسولہ المصطفیٰ وعلیٰ آلہ وسلم

اس نسخہ کی کتابت کی تکمیل ۲۵ جمادی الاولیٰ ۷۲۷ھ (سن سات سو ستائیس ہجری) کو ہوئی۔

اس نسخہ کی کتابت فقیر الی اللہ، طالبِ رحمتِ ربّانی احمد بن علی بن محمد بن الصفی نے کی۔

حامداً للہ ومصلّیاً علیٰ نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب "اللباس" باب الاکسیۃ والخمائص - صحیح مسلم (۳-۱۶۴۹) کتاب "اللباس" باب "التواضع فی اللباس"

[۲] صحیح بخاری کتاب "الرقاق" باب "سکرات الموت" (فتح الباری میں حدیث نمبر ۶۵۱۰)

[۳] مؤرخین واہلِ سیرت کے یہاں مشہور روایت یہی ہے۔ ابن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدھ کی رات نصف شب کے وقت دفن کیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ منگل کا دن گزرنے کے بعد جو رات آتی ہے اس میں آپؐ کی تدفین عمل میں آئی۔ جس نے یہ کہا کہ حضورؐ کو دن ڈھلے دفن کیا گیا اس کا قول حضرت عائشہؓ کی روایت کے خلاف ہے۔

جلال الدین سیوطی نے "الخصائص" (۲-۴۹۶) میں ابو نعیم سے روایت کیا ہے کہ آپ کو جمعہ کی رات کو دفن کیا گیا۔ ابن سعد سے مروی ہے کہ آپؐ نے بروز سوموار وفات پائی اور بدھ کے دن آپؐ کو دفن کیا گیا، مگر ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی نبیہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

الاستدراكات

على

أقضية النبي صلى الله عليه وسلم

لأبي عبد الله محمد بن فرج المعروف بابن الطلاع

کتاب الحدود والدیات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ کہ جب مقدمہ امام کی عدالت میں پہنچ جائے، تو پھر اس کے لیے حد قائم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

امام احمدؒ نے ابو ماجد الحنفی سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا انھوں نے کہا مجھے وہ شخص اچھی طرح یاد ہے جسے حضورؐ نے سب سے پہلے قطع ید کی سزا دی تھی، ہوا یوں کہ ایک چور کو آپؐ کے پاس لایا گیا تو آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر تاسف کے اثرات ہیں۔ لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ! ایسے لگتا ہے گویا آپؐ نے اس شخص کے ہاتھ کاٹنے کو ناپسند کیا ہے" آپؐ نے فرمایا:

میرے نزدیک اس میں کیا امر مانع ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی کے خلاف شیطان کی مدد کرنے لگو، شرعی حد کا معاملہ جب حاکم کے پاس پہنچ جائے تو اس پر حد کا قائم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے اور وہ معافی کو پسند کرتا ہے۔ تمھیں بھی عفو و درگذر سے کام لینا چاہیے۔ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

امام احمدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص اپنے بھتیجے کو حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پاس لایا اور ان سے کہا کہ اس نے چوری کی ہے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا "میرے علم کے مطابق اسلام میں سب سے پہلی حد ایک ایسی عورت پر قائم کی گئی جس نے چوری کی تھی۔ لہٰذا اس کو قطع ید کی سزا دی گئی۔ اس روایت کے اس کے بعد کے الفاظ مندرجہ بالا روایت سے ملتے جلتے ہیں۔

لہ دیکھیے مسند احمد نیز ابو یعلیٰ نے بھی اپنے مسند میں اس حدیث کو اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے۔ الہیثمی کہتے ہیں کہ اس میں ابو ماجد الحنفی ضعیف راوی ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۶ - ۲۷۵) حاکم نے یہ حدیث المستدرک (۴ - ۳۸۲) میں امام احمدؒ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے، مگر وہ ابو ماجد کے بجائے ابو ماجدہ بزیادہ التاء کہتے ہیں۔ ابو ماجد، ابو ایوب کا استاد ہے مگر غیر معروف ہے۔ حاکمؒ نے ابو ماجد اور ابو ماجدہ کو خلط ملط کر دیا ہے۔ صحیح ابو ماجد ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام عائذ بن نضلہ ہے۔ ابو ماجد، عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتا ہے اور اس سے یحییٰ الجابر روایت کرتے ہیں۔ علی بن المدینی اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس سے صرف یحییٰ بن جابر نے روایت کیا ہے۔ بنا بریں جمہور کے نزدیک ابو ماجد کو مجہول راویوں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا حاکم کے اسے صحیح قرار دینے سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ اس ضمن میں ان کا تساہل مشہور ہے۔

جس عورت نے چوری کی تھی جب اس کا معاملہ حضورؐ کی عدالت میں پیش ہو گیا تو آپؐ نے اس کے اہل خانہ کی طرف سے فدیہ قبول نہیں فرمایا بلکہ اس کا ہاتھ کاٹنے کی حد نافذ کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ یاد رہے کہ یہ بنی مخزوم کی وہی مشہور عورت ہے جس کا واقعہ کتاب الحدود میں گزر چکا ہے۔

رسول اللہؐ کا یہ فیصلہ کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت پر حد قائم نہیں کی جائے گی

دارقطنیؒ نے اپنی سند کے ساتھ حجاج سے، اس نے عبدالجبار بن وائل سے اور اس نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک عورت کے ساتھ جبراً زنا کیا گیا تو آپؐ نے عورت پر حد قائم نہ کی البتہ

---

[1] یہ حدیث احمد نے اپنی مسند میں بیان کی ہے لیکن اس کی سند میں ابن لہیعہ (ضعیف راوی) ہے اس کی روایت کردہ حدیث حسن کے درجے کی ہوتی ہے ہیثمی نے اس کو مجمع الزوائد (۶-۲۷۶) میں نقل کیا ہے۔ اس قسم کی احادیث سے جمہور اہل علم نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جب معاملہ حاکم مجاز تک پہنچ جائے تو اسے شرعی حد نافذ کر دینی چاہیے۔ ابن عبدالبر نے اس پر علماء کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

[2] دیکھیے دارقطنی (۳-۹۲-۹۳) ابن ماجہ (۲-۸۶۶) کتاب "الحدود" باب "المستکرۃ"۔ بیہقی (۸-۲۳۵)

بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث دو وجہ سے ضعیف ہے۔ (۱) حجاج کا سماع عبدالجبار سے ثابت نہیں۔ (۲) عبدالجبار نے اپنے والد سے نہیں سنا۔ یہ بات امام بخاری نے کہی۔

جامع ترمذی (۲-۵۵) کتاب "الحدود" باب "ما جاء فی المرأۃ اذا استکرھت علی الزنا" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند متصل نہیں ہے۔ یہ حدیث ایک دوسری سند کے ساتھ بھی منقول ہے۔ پھر ترمذی نے اس کو سماک بن حرب، عن علقمہ بن وائل الکندی عن ابیہ وائل الکندی کی سند کے ساتھ زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے علقمہ بن وائل بن حجر کا سماع اپنے والد سے ثابت ہے۔

اہل علم میں سے کسی نے بھی اس امر میں اختلاف نہیں کیا کہ جس کو زناکاری پر مجبور کیا جائے اس پر حد نافذ نہیں کی جائے گی۔ عہد رسالت سے لے کر عصر حاضر تک اہل اسلام اس پر عمل کرتے چلے آئے ہیں، چنانچہ اس یمنی عورت کے بارے میں اسی حدیث کی روشنی میں فیصلہ کیا گیا تھا جس عورت کا بیان تھا کہ میں سو رہی تھی اور اس وقت بیدار ہوئی جب ایک شخص میری عزت لوٹ چکا تھا۔ دیکھیے بیہقی (۸-۲۳۶)

موطا امام مالک میں ہے کہ ایک غلام نے ایک لونڈی کے ساتھ جبراً بدکاری کا ارتکاب کیا۔ حضرت عمرؓ نے غلام پر حد جاری کی اور اسے جلاوطن کر دیا لیکن لونڈی پر حد نہ لگائی کیونکہ اس پر جبر کیا گیا تھا۔ بخاری نے اس حدیث کو معلقاً بروایت لیث عن نافع عن صفیہ بنت ابی عبید اسی طرح بیان کیا ہے۔

اس آدمی پر آپؐ نے حد قائم کی جس نے اس سے زبردستی زنا کیا تھا۔

اس ضمن میں رسولِ اکرمؐ کا فیصلہ کہ نفاس اور بیماری کی حالت میں عورت پر حد مؤخر کی جائے

صحیح مسلم میں سعد بن عُبَیدہ: عن ابی عبد الرحمٰن السُلمی کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! اپنے غلاموں پر حد نافذ کیا کرو، قطع نظر اس سے کہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لونڈی نے زنا کا ارتکاب کیا تو آپؐ نے مجھے اس پر حد قائم کرنے کا حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ چند روز پہلے اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا اور وہ حالتِ نفاس میں تھی۔ مجھے یہ خدشہ ہوا کہ اس حالت میں حد نافذ کرنے سے کہیں اس کی موت واقع نہ ہو جائے۔ میں نے اس کا تذکرہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: "تم نے بہت اچھا کیا"۔[1]

دوسری روایت میں شادی شدہ یا غیر شادی شدہ کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ اس میں یہ اضافہ ہے:

"اسے مہلت دو حتیٰ کہ صحت بحال ہو جائے۔"

رسولِ اکرمؐ کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو کسی عورت کے ساتھ زنا کرے اور عورت منکر ہو

ماعز اسلمی کے جس واقعہ کا شیخ ابن الطلاع نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ماعزؓ نے اس عورت کا نام نہیں لیا تھا جس سے اس نے زنا کیا تھا۔ لیکن مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ماعزؓ نے اس عورت کا نام بتایا تھا۔ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر اس سے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ چنانچہ حضورؐ نے ماعز پر حد جاری کر دی اور اس عورت کو چھوڑ دیا۔[2]

---

[1] صحیح مسلم (۲-۱۳۳۰) کتاب "الحدود" باب "تاخیر الحد عن النفساء"۔ ابوداؤد الطیالسی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے دیکھیے منحۃ المعبود (۱-۳۰۰) نیز ملاحظہ ہو مسند احمد (۱-۹۵) بیہقی (۸-۲۲۹) دارقطنی (۳-۱۵۹)

جمہور فقہاء کا اسی حدیث پر عمل ہے۔ امام شافعی کے بعض ساتھیوں کا قول ہے کہ اگر وہ متحمل ہو سکے تو اسے کھجور کی شاخوں کے گچھے سے پیٹا جائے لیکن حدیث کے ظاہری مفہوم کا تقاضا یہی ہے کہ غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں، حد کو ملتوی کیا جائے، لیکن اگر وہ شادی شدہ ہوا اور اس پر رجم واجب ہو چکا ہو تو اسے مؤخر نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ اس کو ہلاک کرنا مطلوب ہے۔

[2] مسند احمد (۵-۲۳۹) ابوداؤد طیالسی کی "منحۃ المعبود" (۱-۲۹۹) دارقطنی (۳-۹۹) حاکم نے المستدرک (۴-۳۷۰) حاکم کہتے ہیں کہ یہ صحیح الاسناد ہے، مگر اس کی سند میں ابومصعب مدنی ہے جس کا نام عبد السلام بن حفص ہے۔ ابنِ معین اور دیگر محدثین نے تو اس کو ثقہ قرار دیا ہے لیکن ابوحاتم رازی کہتے ہیں وہ مجہول راوی ہے۔

امام مالکؒ اور شافعی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص کسی خاص عورت کے ساتھ زنا کا اعتراف کرے اس پر زنا کی حد لگائی جائے قذف کی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ قبیلہ بنی بکر بن لیث کے ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر زنا کا چار دفعہ اعتراف کیا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا، آپؐ نے اس کو سو کوڑے لگوائے۔ پھر آپؐ نے اُس عورت کے خلاف گواہ پیش کرنے کے لیے کہا۔ عورت نے کہا "اللہ کی قسم! اس نے جھوٹ بولا" اس کے نتیجے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی پر اسی کوڑے حد قذف جاری کی۔

چوری کا اعتراف کرنے کے بعد ہاتھ کاٹنے کے بارے میں رسول اکرمؐ کا فیصلہ

ابن ماجہ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ عمرو بن سمرہ بن حبیب بن عبد الشمس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے فلاں قبیلے کا اونٹ چرا لیا ہے۔ مجھے پاک کیجیے "جن کا اونٹ گم ہوا تھا آپ نے اُن کو بلایا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ایک اونٹ گم ہے۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔

ایک حدیث جو ابو امیہ سے مروی ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا جس نے چوری کا اعتراف کیا تھا۔ اس کے پاس مسروقہ سامان نہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرا خیال ہے تم نے چوری نہیں کی" اس نے کہا کی ہے "حضورؐ نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ اس نے دوبارہ اعتراف کیا، چنانچہ آپؐ کے حکم پر اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ آپؐ نے فرمایا اب کہو "میں اللہ سے بخشش مانگتا اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں" چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ آپؐ نے دعا فرمائی "اے اللہ! اس کی توبہ قبول فرما"

لہ دیکھیے المستدرک للحاکم (۴-۳۷۰) حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے مگر ذہبی اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند میں القاسم بن فیاض انباری ضعیف راوی ہے۔ طبرانی نے یہ حدیث المعجم میں اپنی سند کے ساتھ القاسم بن فیاض سے روایت کی ہے۔ دیکھیے نصب الرایہ (۴-۱۰۷) نیز بیہقی (۸-۲۲۸) بیہقی کی سند دوسری ہے۔

اس حدیث پر مبنی امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اس شخص پر زنا اور قذف کی دو حدیں جاری کی جائیں۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اس پر صرف حد قذف لگائی جائے۔ اس لیے کہ عورت کا انکار شک و شبہ کا موجب ہے جس کی بنا پر حد نافذ نہیں ہونی چاہیے۔

لکہ دیکھیے ابن ماجہ (۲-۸۶۳) کتاب "الحدود" اس کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہے۔ یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔

یہ حدیث ابن عبد البر نے "الاستیعاب" (۲-۵۳۱) میں بھی روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں عمرو بن سمرہ، جن کا ہاتھ کاٹا گیا تھا، صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ حدیث ابو نعیم اور ابو موسیٰ نے بھی روایت کی ہے۔ دیکھیے "اسد الغابۃ لابن الاثیر" (۴-۱۱۱) عمرو بن سمرہ بن حبیب بن عبد شمس القرشی ہیں۔ یہ عبد الرحمٰن بن سمرہ کے بھائی تھے۔

سلہ دیکھیے ابن ماجہ (۲-۸۶۶)۔ دارمی (۲-۱۷۳)۔ بیہقی (۸-۲۷۶) ابو داؤد (۴-۱۳۴)۔ بلوغ المرام ص ۲۳۲۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ احمد اور نسائی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔

چور کا ہاتھ کاٹ کر اُسے داغنا

حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چور لایا گیا جس نے ایک چادر چرائی تھی۔ لوگوں نے کہا "حضور! اس نے چوری کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اس کو لے جاؤ، اس کا ہاتھ کاٹو، پھر داغ دو اور پھر اسے میرے پاس لاؤ۔" ہاتھ کاٹنے کے بعد اسے داغا گیا اور پھر اس شخص کو آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا "اللہ کے حضور توبہ کرو۔" اس نے کہا "میں توبہ کرتا ہوں"۔ آپ نے دعا فرمائی "اے اللہ! اس کی توبہ قبول فرما۔"

سفیان ثوری نے یہ حدیث یزید بن خصیفہ سے مرسلاً روایت کی ہے۔

= امام احمد اور قاضی ابو یوسف نے اس قسم کی احادیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک مرتبہ چوری کا اعتراف کافی نہیں ہے۔ بلکہ دو تین مرتبہ اعتراف کرانا چاہیے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ ایک مرتبہ اعتراف کو کافی تصور کرتے ہیں۔ بظاہر امام احمد کا موقف صحیح نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اس امر کا احتمال ہے کہ سارق دوسری مرتبہ اقرار سے رجوع کر لے اور اس کی بنا پر حد ساقط ہو جائے۔ پھر وہ بارگاہ الٰہی میں توبہ کرے اور اس کی توبہ قبول ہو جائے۔ اس لیے کہ اسلام میں اصل بات امکانی حد تک حد کو ساقط کرنا ہے۔

لہ دیکھیے مستدرک حاکم (۴-۳۸۱) حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ مگر صحیحین میں اس کو روایت نہیں کیا گیا۔ بیہقی نے اس کو "السنن الکبریٰ" (۸-۲۷۱) میں نقل کیا ہے۔

حافظ زیلعی لکھتے ہیں:-

"ابوداؤد نے یہ حدیث "المراسیل" (ص ۲۶) میں بروایت ثوری نقل کی ہے۔ عبدالرزاق نے مصنف میں بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ ابن القطان کہتے ہیں "یزید بن خصیفہ اپنے دادا کی جانب منسوب ہے۔ اصل نسب یزید بن عبداللہ بن خصیفہ بفتح الخاء ہے بلاشبہ وہ ثقہ راوی ہے۔ دیکھیے "نصب الرایۃ" (۳-۳۷۱)

ہیثمی نے یہ حدیث البزار کی جانب منسوب کی ہے۔ البزار اس کو اپنے شیخ احمد بن ابان القرشی سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ دیگر راوی بھی ثقہ ہیں۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۶-۲۷۶)

ابوعبید کہتے ہیں:-

"قطع ید کے بعد اس کو داغنے کے بارے میں دوسری احادیث میں کچھ مذکور نہیں۔ صرف اسی حدیث میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ داغنا واجب ہے تاکہ زیادہ خون نکلنے سے اس کی موت واقع نہ ہو جائے۔"

امام شوکانی فرماتے ہیں:-

اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے بعد داغنا واجب ہے تاکہ زیادہ خون نہ نکل جائے۔ اگر خون کو بہنے دیا جائے تو اس سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

وہ اشیاء جن کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاتی

امام احمد نے مسند میں عُمیر مولیٰ آبی اللحم سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے مالکوں کے ساتھ ہجرت کا ارادہ کیا۔ جب مدینہ کے قریب پہنچے تو وہ مدینہ میں داخل ہو گئے اور مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔ مجھے سخت بھوک لگی۔ چند آدمیوں سے میری ملاقات ہوئی جو مدینہ سے آ رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مدینہ کے کسی باغ میں داخل ہو کر کھجوریں کھا لو، چنانچہ ایک باغ میں داخل ہو کر میں نے کھجوروں کے دو گچھے کاٹے۔ باغ کا مالک آیا اور مجھے پکڑ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔ اس نے سارا واقعہ بیان کیا۔ میں نے دو کپڑے اوڑھ رکھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ دونوں میں سے اچھا کپڑا کون سا ہے؟ میں نے ایک کپڑے کی جانب اشارہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنے پاس رکھ لو اور دوسرا کپڑا باغ والے کو دے دو۔ یہ کہہ کر آپؐ نے مجھے چھوڑ دیا۔[1]

ابو داؤد طیالسی ابو البشر کے حوالے سے عَباد بن شُرحبیل سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ میں مدینہ پہنچا تو مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں ایک باغ میں گیا اور کھجوروں کا گچھا لے کر اسے کھانے لگا اور کچھ کھجوریں کپڑے میں باندھ لیں۔ باغ والا آیا اور مجھے پیٹنے لگا۔ کپڑے میں جو کھجوریں تھیں وہ اس نے لے لیں۔ ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اگر یہ جاہل تھا تو تم نے اسے علم سے روشناس کیوں نہ کرایا؟ اور اگر بھوکا تھا تو تم نے اسے کیوں نہ کھلایا؟"

پھر آپؐ نے باغ والے کے لیے آدھا وسق (ایک پیمانہ) جو دینے کا حکم دیا۔[2]

طبرانی کی المعجم الکبیر میں ابو سعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بعض صحابہ کو سخت بھوک لگی۔

ــــه البحر الرائق میں ہے کہ اگر چور داغنے کو پسند نہ کرے تو نہ داغا جائے۔ داغنا مستحب کے درجہ میں ہے۔ اگر داغنے کے عمل کو ترک کرنے سے اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو اس کی مرضی کے خلاف بھی اس کو داغا جائے اور اس کی خواہش کا احترام نہ کیا جائے۔

نیل الاوطار للشوکانی (۷-۳۱۰)

[1] مسند احمد (۵-۲۲۳) الہیثمی کہتے ہیں کہ طبرانی نے المعجم الکبیر میں یہ روایت بیان کی ہے۔ امام احمد کی ایک دوسری روایت عُمیر سے منقول ہے کہ میں ذات الجیش نامی جگہ میں مویشی چرا رہا تھا کہ مجھے سخت بھوک لگی۔ میں نے بعض صحابہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے مجھے انصار کے ایک باغ کا پتہ بتایا۔ میں نے اس سے چند خوشے کاٹے۔ وہ مجھے پکڑ کر رسول اکرمؐ کے پاس لے گئے۔ میں نے اپنی ضرورت کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے ایک خوشہ مجھے دے دیا اور باقی خوشے باغ والے کو واپس کر دیے۔

دوسری حدیث کی سند میں ابن لہیعہ نامی ضعیف راوی ہے۔ یہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔ پہلی حدیث کی سند میں ابو بکر بن مُہاجر ہے۔ ابن ابی حاتم نے اس کا ذکر کیا ہے مگر اس پر نقد و جرح نہیں کی۔ اس کے دیگر راوی ثقہ ہیں۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۶-۲۷۳)

[2] منحۃ المعبود (۱-۳۰۲)

ان میں سے دو آدمی باغات میں جھانکنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک باغ میں کھجوریں لگی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک باغ میں اتر گیا اور دوسرا باہر رہا۔ اندر والے نے سیر ہو کر کھجوریں کھائیں۔ جب وہ اپنے کپڑے میں کھجوریں ڈال رہا تھا اس وقت باغ کا مالک آ گیا۔ اس نے کپڑا چھین لیا اور اس کو کھجور کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر ایک چھڑی لے کر اسے خوب پیٹا اور بعد ازاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ باغ کے مالک نے کہا کہ میں نے اسے اپنے باغ میں پایا۔ اس نے سیر ہو کر کھجوریں کھائیں اور پھر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگا۔ ملزم نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم دونوں بھوکے تھے۔ میں تو باغ میں چلا گیا اور میرا ساتھی الگ رہا۔ میں نے کھجوریں کھائیں اور کچھ اپنے ساتھی کے لیے لے لیں۔ یہ صاحب آئے اور میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ یہ سُن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ کپڑا اس کو دے دو اور تم نے جو اسے مارا ہے اس کے عوض اس کو ایک وسق کھجوریں دو۔"[۱]

رسول اکرمؐ کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو ایسے مال میں سے چرائے جس میں اس کا حق ہو

ابن ماجہ اپنی سند کے ساتھ میمون بن مہران سے اور وہ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ خمس کے غلاموں میں سے ایک نے خمس کے مال میں سے چوری کی۔ جب اس کا مقدمہ عدالت نبوی میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دیا اور ارشاد فرمایا:

یہ غلام بھی خمس کا ہونے کی وجہ سے اللہ کے مال کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا اس کا خمس کے مال میں سے چوری کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک چیز کا ایک حصہ دوسرے حصے کی چوری کرے۔[۲]

---

[۱] ہیثمی کہتے ہیں کہ اس میں عبداللہ بن عرادہ نامی راوی ہے۔ اس کو ابو داؤد نے ثقہ قرار دیا ہے، مگر محدثین کی ایک جماعت اس کو ضعیف قرار دیتی ہے۔ مجمع الزوائد (۴-۲۶۵)

[۲] ابن ماجہ (۲-۸۶۴) کتاب الحدود" باب "العبد یسرق" بروایت جُبارہ بن المغلس عن حجاج بن تمیم عن میمون بن مہران۔

جُبارہ بن المغلس: جبارہ (بضم الجیم) ابن المغلس (لام ثقیلہ مکسورہ) الحمانی (بکسر المہملہ و تشدید المیم) اس کی کنیت ابو محمد اور نسبت کوفی ہے۔ یہ ضعیف راوی ہے۔

اس روایت کو مصنف عبدالرزاق (۱۰-۲۱۲) مرسلاً عن میمون بن مہران اور بیہقی (۸-۲۸۲) مرسلاً روایت کرتے ہیں۔ عبدالرزاق کہتے ہیں یہ حدیث متصل سند کے ساتھ بھی روایت کی گئی ہے مگر اس کی [illegible] ضعیف ہے۔ بعد ازاں انھوں نے جُبارہ سے مروی متصل روایت نقل کی ہے۔

جبارہ نے بھی بطریق حجاج بن تمیم، از میمون بن مہران از ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کی ہے۔

البوصیری نے الزوائد میں اس سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن القطان بھی اپنی کتاب میں اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ دیکھیے نصب الرایۃ (۳-۳۶۸)

اس حدیث کی مرسل سند متصل کی نسبت صحیح تر ہے۔ میمون بن مہران الجزری عن ابو ایوب مولیٰ بنی اسد کو ابو حاتم، ابو زرعہ اور دوسرے

جو شخص رسول اکرم کے فیصلے پر راضی نہ ہو اس کے بارے میں حکم

ابواسحاق اپنی تفسیر میں شعیب بن شعیب عن ابی المغیرہ، عن عتبہ بن ضمرہ کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد ضمرہ نے ان دو آدمیوں سے سنا جو اپنا مقدمہ عدالت نبوی میں لے گئے۔ انھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سچے کے حق میں جھوٹے کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے کہا مجھے یہ فیصلہ پسند نہیں۔ مدعی نے کہا تم کیا چاہتے ہو۔ اس نے کہا ہمیں ابوبکر صدیقؓ کے پاس جانا چاہیے۔" چنانچہ دونوں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

جس کے حق میں فیصلہ ہوا تھا اس نے کہا "ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپؐ نے میرے حق میں اپنا فیصلہ صادر کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "تمہارا فیصلہ وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔" مگر دوسرے نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ ہم عمرؓ بن الخطاب کے پاس جائیں گے۔ چنانچہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مدعی نے کہا "ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپؐ نے میرے حق میں فیصلہ کیا تھا مگر یہ شخص راضی نہ ہوا۔ پھر ابوبکرؓ کے یہاں آئے تو انھوں نے فرمایا تمہارا فیصلہ وہی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، مگر یہ شخص پھر بھی نہ مانا۔ حضرت عمرؓ نے اس شخص سے دریافت کیا تو اس نے اپنے ساتھی کی بات کی تائید کی۔ حضرت عمرؓ گھر کے اندر داخل ہوئے اور ہاتھ میں ننگی تلوار لیے باہر آئے۔ اور فیصلہ نہ ماننے والے کو قتل کر دیا۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی[1]

= محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ دیکھیے "الجرح والتعدیل" (۴-۱، ۲۳)

جمہور فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے اس حدیث سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ جو شخص بیت المال سے چوری کرے اور اس میں اس کا حق بھی ہو تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ حضرت عمرؓ، علیؓ اور صحابہ کی ایک جماعت کا یہی موقف ہے۔ امام مالک اور ابن المنذر کہتے ہیں کہ قرآن کے ظاہری حکم کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ وہ اس حدیث سے اس لیے استدلال نہیں کرتے کہ اس کی سند پر تنقید کی گئی ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جمہور کا مسلک زیادہ قوی ہے۔

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ یہ اگرچہ مرسل روایت ہے، مگر ایک دوسری قابل اعتماد روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ابواسحاق عن الجوزجانی، عن ابی الاسود، عن ابن لہیعہ، عن ابی الاسود عن عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ تلوار لے کر نکلے اور اس شخص کو قتل کر دیا۔ دوسرا شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا "یا رسول اللہ! عمرؓ نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا اور اگر اس کا بس چلتا تو مجھے بھی تہ تیغ کر دیتا۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عمرؓ ایک مومن کو قتل کرنے کی جسارت کرے گا؛ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو اس قتل سے بری ٹھہرایا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء: ۶۵)

نہیں، اور تیرے رب کی قسم، یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو ان تمام امور میں حکم نہ مانیں، جن میں ان کے درمیان نزاع پیدا ہو۔

شاتم رسولؐ کے مباح الدم ہونے کے بارے میں رسول اکرمؐ کا فیصلہ

شیخ ابن الطلاع نے اس نابینا شخص کا واقعہ نقل کیا ہے جس نے اپنی اس بیوی کو قتل کر دیا تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ حضورؐ نے اس کے قتل کا خون بہا ساقط فرما دیا۔

طبرانی نے عُمیر بن اُمیّہ سے روایت کی ہے کہ ان کی ایک بہن تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلتے تو وہ آپ کو گالیاں دیتی۔ وہ مشرکہ تھی۔ عُمیر نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بیٹے چلا چلا کر کہنے لگے کہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں۔ تم لوگوں نے ہماری ماں کو قتل کر دیا ہے حالانکہ ان لوگوں کے باپ دادا اور ان کی مائیں سب مشرک ہیں۔ جب عُمیر کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ وہ لوگ اپنی ماں کے بدلے میں قاتل کے بجائے کسی اور کو قتل کر دیں گے تو انھوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "کیا تُو نے اپنی بہن کو قتل کر دیا؟" اس نے کہا "جی ہاں" آپؐ نے فرمایا "کس لیے؟" اس نے کہا "وہ آپ کو بُرا بھلا کہہ کر مجھے ایذا دیتی تھی"۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولہ کے بیٹوں کو بُلا کر پوچھا۔ انھوں نے اصل قاتل کے بجائے کسی اور شخص کا نام بتایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حقیقت سے آگاہ کیا اور ان کی ماں کو مباح الدم قرار دیا۔[۲]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے خطمہ قبیلے کی ایک عورت کا واقعہ بیان کیا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیتی اور آپؐ کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا کرتی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا "کون ہے جو اس عورت کا کام تمام کرے؟" عُمیر بن عدی آدھی رات کو اٹھ کر اس عورت کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس کے ارد گرد بچے سو رہے تھے۔ دودھ پیتا بچّہ اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ انھوں نے بچے کو الگ کیا۔ پھر تلوار اس کے سینے میں گھونپ دی جو پیٹھ تک اُتر گئی۔ عُمیر نے نماز فجر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں ادا کی۔ حضورؐ نے نماز سے فارغ ہو کر عُمیر کی طرف دیکھا اور فرمایا "کیا تُو نے بنت مروان کو قتل کر دیا ہے؟" عُمیر نے کہا "جی ہاں! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں"۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر حاضرین سے کہا:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ واقعہ ان دو سندوں کے علاوہ دوسری اسناد کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ ابو عبداللہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں ابن لہیعہ کی روایت کردہ حدیث محض اعتبار واستدلال کے لیے تحریر کرتا ہوں۔ دیکھیے (الصارم المسلول ص ۳۹)

[۲] مجمع الزوائد (۶-۲۶۰)

"جو شخص ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی غیبی مدد کی ہے وہ عُمیر بن عدی کو دیکھ لے۔"[1]

مصنف عبدالرزاق میں ابن جُریج، عن رجل، عن عکرمہ مولیٰ ابن عباس کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی۔ آپ نے فرمایا: "کون ہے جو مجھے میرے دشمن سے بچائے؟" حضرت زبیرؓ نے کہا "میں"۔ چنانچہ حضرت زبیرؓ نے اسے للکارا اور قتل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کا سامان حضرت زبیرؓ کو دلوا دیا۔[2]

سنن بیہقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا کرتی تھی۔ ایک آدمی نے گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو ساقط قرار دیا۔[3]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس آدمی کو قتل کر دیا تھا جو رسولِ اکرم کو گالیاں دیا کرتا تھا۔[4]

اس قتل کی نوعیت کے بارے میں فقہاء کے فیصلے کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔

وہ امور جن میں قصاص نہیں

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں باب کا عنوان یہی قائم کیا ہے۔ ابن ماجہ ایک ضعیف سند کے ساتھ عن دہثم بن قران عن نمران بن جاریہ عن جاریہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے دوسرے کی کلائی پر تلوار ماری جس سے اس کی کلائی جوڑ والی جگہ کے علاوہ دوسری جگہ سے کٹ گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے قصاص کی درخواست کی۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کو دِیت ادا کی جائے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! میں قصاص چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: "دِیت لے لو اللہ اس میں برکت نازل کرے گا۔" آپ نے قصاص ادا کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔[5]

---

[1] الصارم المسلول ص ۹۵۔ الواقدی و ابن سعد کی روایت کا خلاصہ۔

[2] مصنف عبدالرزاق (۵-۳۰۷) [3] سنن بیہقی (۷-۶۰)

[4] سنن بیہقی (۸-۲۰۳)

[5] ابن ماجہ (۲-۸۸۰) حافظ ابن القیم نے "اعلام الموقعین" (۴-۴۸۴) میں اس کو ابن ماجہ کی جانب منسوب کیا ہے۔ البوصیری "الزوائد" میں کہتے ہیں کہ اس کی سند میں دہثم بن قران الیمانی ہے۔ اس کو ابوداؤد نے ضعیف قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں مصنف ابن ماجہ میں جاریہ سے اس کے سوا دوسری کوئی حدیث روایت نہیں کی گئی، دوسری کتب حدیث میں بھی جاریہ سے کوئی حدیث روایت نہیں کی گئی۔ وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ ابن حبان نے اس کو ثقہ راویوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ابن القطان اس کو مجہول الحال کہتے ہیں۔ السندی کہتے ہیں کہ دہثم بن قران متروک الحدیث ہے۔ ابن حبان کا اس کو ثقہ راویوں میں شمار کرنا ایک شاذ بات ہے۔ دیکھیے ابن ماجہ (۲-۸۸۵)

پتھر کے ساتھ قتل کرنے والے کے بارے میں قصاص کا حکم

بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ زیاد بن علاقہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان شیوخ نے بتایا ہے، جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ زیاد بن علاقہ مرداس سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی پر پتھر پھینک کر اسے ہلاک کر دیا۔

قاتل کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو آپ نے اس سے قصاص لینے کا حکم دیا[1]۔

= ذہبی کہتے ہیں کہ ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دے کر زیادتی کی ہے۔ ابن القطان کا اس کو ضعیف قرار دینا درست ہے۔ دیکھیے "المیزان" (۲-۲۹)

فقہ الحدیث اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کلائی کو جوڑ والی جگہ کے علاوہ دوسری جگہ سے کاٹ دیا جائے تو اس صورت میں قصاص لازم نہیں آتا۔

[1] بیہقی "السنن الکبریٰ" میں مسند عن محمد بن جابر عن زیاد بن علاقہ عن سراقہ بن مالک کی سند کے ساتھ۔

حافظ ابن حجر "الاصابة" (۳-۳۷۹) میں مرداس بن عروہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بخاری، ابن السکن اور بیہقی نے یہ حدیث ولید بن ابی ثور عن زیاد بن علاقہ عن مرداس بن عروہ کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں اسی طرح کی ایک حدیث محمد بن جابر نے زیاد سے بھی روایت کی ہے جسے بغوی اور ابو نعیم نے مسدد عن مرداس بن عروہ سے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حافظ ابن حجر کے الفاظ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ امام بخاری نے یہ حدیث اپنی صحیح میں نقل کی ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ اصل میں امام بخاری نے یہ حدیث "التاریخ الکبیر" (۴-۴۳۵) میں روایت کی ہے۔ مرداس بن عروہ سے مروی کوئی حدیث صحیح بخاری میں موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ خود ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

مرداس بن مالک اسلمی سے صحیح بخاری میں صرف ایک حدیث (یذہب الصالحون) مروی ہے۔

یہاں ابن حجر نے یہ بات تحریر نہیں کی کہ مرداس سے منقول یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے۔

بیہقی نے سنن میں جہاں اس حدیث کو نقل کیا ہے وہاں اس کو امام بخاری کی جانب منسوب نہیں کیا۔ اسی طرح المقدسی نے اپنی کتاب "الجمع بین رجال البخاری ومسلم" اور "افراد البخاری" میں کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ مرداس بن عروہ صحیح بخاری کے رواۃ و رجال میں سے ہے۔ تاہم جہاں اس حدیث کے پائے جانے کا گمان ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کو بخاری میں تلاش کیا ہے مگر یہ حدیث نہیں مل سکی۔ مثلاً باب "من اقاد بحجر" کتاب الدیات میں۔

اس باب میں بخاری نے صرف وہ حدیث نقل کی ہے جس میں ایک یہودی کے ایک لونڈی کو قتل کرنے کا واقعہ مذکور ہے جبکہ بخاری میں اس حدیث کو نقل کرنے کی اصل جگہ یہی تھی۔ ان دلائل کی بنا پر میرے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کی مراد "التاریخ الکبیر" ہے۔ اگرچہ ان کے

والد سے قصاص نہیں لیا جا سکتا

ترمذی[1] نے سُراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہا ہوں میں نے دیکھا کہ آپ بیٹے سے باپ کا قصاص لیتے تھے۔ مگر باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیتے تھے۔

الفاظ قاری کو اس وہم میں مبتلا کر سکتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔

فقہ الحدیث اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ پتھر وغیرہ کے ساتھ قتل کرنے سے قصاص لازم آتا ہے جمہور کا مسلک یہی ہے اس کی تفصیل کتاب الحدود میں گزر چکی ہے، مگر احناف اس کو تسلیم نہیں کرتے۔

[1] ترمذی (۴ - ۱۸) کتاب "الدیات" باب ماجاء فی الرجل یقتل ابنہ یقاد منہ ام لا"۔ مگر ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث سراقہ سے صرف اسی سند کے ساتھ منقول ہے۔ اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ اسماعیل بن عیاش نے المثنیٰ بن الصباح سے یہ روایت کی ہے، مگر المثنیٰ ضعیف راوی ہے۔ ابو خالد الاحمر نے یہ حدیث الحجاج، عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا عن عمر کی سند کے ساتھ روایت کی ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ یہ حدیث عمرو بن شعیب سے مرسلاً بھی روایت کی گئی ہے مگر اس حدیث کے صحیح ہونے میں شک پایا جاتا ہے، لیکن اہل علم اسی حدیث پر عمل پیرا ہیں اور کہتے ہیں کہ باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو اس کے عوض باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر باپ بیٹے پر زنا کی تہمت لگائے تو باپ پر حدِ قذف جاری نہیں کی جائے گی۔" (ترمذی کا بیان ختم ہوا)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

"عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کردہ اس حدیث میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض نے اسے عمر سے روایت کیا ہے اور بعض نے سراقہ سے بعض نے بلا واسطہ روایت کی ہے۔ اس کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے (التلخیص الحبیر ۴ - ۱۶) اور یہ بات معروف ہے کہ ابن لہیعہ کی روایت کو حسن کا درجہ حاصل ہے۔

سراقہ بن مالک سے مروی حدیث کی مزید روایات بھی موجود ہیں۔ ان میں سے حضرت عمرؓ کی یہ روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ نامی راوی کا مُدلّس ہے۔

مصنف صاحب کہ حجاج نے عمرو بن شعیب سے عن عن کہہ کر روایت نقل کی ہے۔ دوسری مزید حدیث حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ "مسجدوں میں حد نہ لگائی جائے اور نہ ہی والد سے بیٹے کا قصاص لیا جائے" یہ حدیث احمد، حاکم اور ترمذی نے روایت کی ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث مذکورہ سند کے ساتھ مرفوعاً صرف اسماعیل بن مسلم المکی نے روایت کی ہے بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اسماعیل کا حافظہ کمزور تھا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ حسن بن عبید اللہ العنبری نے یہ حدیث عمرو بن دینار سے روایت کی ہے۔ جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے۔ ان شواہد کی بنا پر اس حدیث کو تقویت حاصل ہوتی۔ اور یہ حدیث حسن لغیرہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

دیت کی مقدار اور مشرک کی دیت کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ عہدِ رسالت میں ایک آدمی کو قتل کیا گیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار (درہم) مقرر کی۔[1]

ابو داؤد[2] نے ہلال بن سراج بن مجاعہ سے روایت کیا ہے۔ وہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بھائی کی دیت طلب کی جس کو بنی ذہل کی ایک شاخ بنو سدوس والوں نے قتل کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر میں کسی مشرک کی دیت ادا کرنے کے حق میں ہوتا تو تمہارے بھائی کی دیت ادا کرنے کا حکم صادر کرتا۔ البتہ میں تجھے اس کا کچھ معاوضہ ادا کروں گا۔"

---

[1] دیکھیے سنن البیہقی (۸-۷۰) اور دارقطنی (۳-۱۳۰) بروایت محمد بن مسلم، عن عمرو بن دینار، عن عکرمہ، عن ابن عباسؓ، لیکن ابن عیینہ نے جو کہ محمد بن مسلم سے زیادہ ثقہ راوی ہے، اس کی مخالفت کی ہے اور اس کی سند میں ابن عباسؓ کا ذکر نہیں کیا۔ محمد بن میمون کہتے ہیں کہ اس نے صرف ایک مرتبہ ابن عباس کا نام لیا تھا جبکہ اکثر وہ یہی کہتا تھا کہ عکرمہ اس حدیث کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ ابن الترکمانی "الجوہر النقی" میں کہتے ہیں کہ نسائی نے یہ حدیث ابن میمون سے اپنی سند کے ساتھ عکرمہ سے روایت کی ہے اور ابن میمون ثقہ راوی نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ یہ مرسل روایت ہے۔ یہ بات نسائی نے بھی کہی ہے اور عبدالحق بھی کہتے ہیں کہ زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔

ابن الاثیر نے جامع الاصول (۵-۱۷۵) میں یہ حدیث ابوداؤد اور ترمذی کی جانب منسوب کی ہے۔ امام مالک اور شافعی نے دیت کی مقدار کے بارے میں اسی حدیث کو اختیار کیا ہے۔ جبکہ دوسرے اہل علم کے نزدیک دیت کی تعداد دس ہزار درہم ہے۔ اہل علم اس بارے میں بھی اختلاف رائے رکھتے ہیں کہ دیت کی اساس کیا ہے۔ امام شافعی نے عمرو بن حزم کی روایت کردہ حدیث کے پیش نظر انسانی جان کی قیمت ایک سو اونٹ مقرر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیت کی دوسری مقداروں کا تعین شرعی لحاظ سے نہیں بلکہ مصالحت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ دیت کے سلسلے میں اونٹوں کا تعین نص کی بنا پر ہے جبکہ سونے چاندی کے سکوں میں قیمت کا تعین اسی کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مرنے والے کی دیت کی مقدار کا تعین سونے اور چاندی کے سکوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔

[2] ابوداؤد (۳-۱۵۱، ۱۵۲) کتاب "الامارۃ" فی بیان مواضع قسم الخمس"

المنذری کہتے ہیں کہ مجاعہ سے صرف اس کے بیٹے سراج بن مجاعہ نے روایت کیا ہے۔ الخطابی کہتے ہیں ممکن ہے کہ اس کو یہ معاوضہ اس کی یا اس کی قوم کی تالیفِ قلب کے لیے دیا گیا ہو۔ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ اس نے صدقہ کے اموال سے دیت کا مطالبہ کیا ہو اور رسول اکرمؐ نے اسے مسترد کر دیا ہو اور اس کو صدقہ کے اموال ہی سے معاوضہ دینے کا حکم دیا اس لیے کہ اس مال میں مشرک کی دیت کے لیے کوئی حصہ موجود نہیں ہے۔

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بنو ذہل کے مشرکین کے مال میں سے جو پہلا خمس نکالا جائے اس میں سے سو اونٹ مجاعہ کو دیے جائیں۔ مجاعہ نے اس میں سے کچھ حصہ لے لیا۔ اسی دوران میں قبیلہ بنو ذہل والے مشرف باسلام ہوگئے۔ بعد ازاں مجاعہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر پیش کر کے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے باقی ماندہ اونٹوں کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے تحریر کر دیا کہ جب یمامہ سے زکوٰۃ کا مال آئے تو اس میں سے بارہ ہزار صاع غلہ مجاعہ کو دیا جائے۔ چار ہزار صاع گندم، چار ہزار صاع جو اور چار ہزار صاع کھجوریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ان الفاظ پر مشتمل تھی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"یہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہے۔ مجاعہ بن مرارہ بن سلیم کے حق میں کہ مشرکین بنو ذہل کے مال سے جو پہلا خمس وصول ہو اس میں سے ایک سو اونٹ اس کو دیے جائیں۔ یہ اس کے مقتول بھائی کے قتل کا معاوضہ ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر دانستہ افترا باندھنے والے کو قتل کرنے کا حکم

صحیح احادیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص دانستہ جھوٹی بات میری طرف منسوب کرے وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کہ مسلم کو کافر کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا

شیخ ابن الطلاع نے اس باب کے تحت فتح مکہ کے بعض واقعات کا ذکر کیا ہے۔

البزار اور طبرانی نے ایسے راویوں سے روایت نقل کی ہے جن کو ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔ وہ عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں بنو ہذیل کے ایک آدمی نے بنو خزاعہ کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ الہذلی چھپا ہوا تھا۔ فتح مکہ کے روز الہذلی جب باہر نکلا تو قبیلہ خزاعہ کے ایک آدمی نے اسے بکری کی طرح ذبح کر دیا۔ اس آدمی سے پوچھا گیا۔ کیا تم نے اسے منادی کیے جانے کے بعد قتل کیا یا اس سے پہلے؟ اس نے کہا کہ منادی کیے جانے کے بعد۔ اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اگر میں کسی مومن کو کافر کے عوض قتل کرتا تو اسے قتل کر دیتا۔"

چنانچہ اس کی دیت ادا کی گئی۔ یہ اسلام میں ادا کی جانے والی پہلی دیت تھی۔

جمہور اہل علم کا مسلک یہ ہے کہ مسلم کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔ کتب حدیث میں اس کے متعدد دلائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل وہ حدیث بھی ہے جو حضرت علیؓ کے جمع کردہ مجموعۂ حدیث میں مرقوم ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔[2]

نیز عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے بھی یہ حدیث منقول ہے کہ مسلم کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔[3]

حازمی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ بیلمانی[4] سے مروی حدیث کی صحت اگر تسلیم کر لی جائے تو وہ اس حدیث کی بنا پر منسوخ ہے جو فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ارشاد فرمائی کہ "مسلم کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے"۔[5]

عطاء بن السائب کی کنیت ابو محمد الکوفی ہے۔ کسی نے اس پر کذب اور وضع حدیث کی تہمت نہیں لگائی تاکہ یہ کہا جا سکے کہ ابن الجوزی کا اس حدیث کو موضوعات میں شمار کرنا درست ہے۔ عطاء میں صرف یہ عیب پایا جاتا ہے کہ بعض ائمہ کی طرح آخری عمر میں اس کا حافظہ خراب ہو گیا تھا لیکن جن لوگوں نے اس سے پہلے اس سے حدیثیں سنی ہیں وہ صحیح ہیں۔ ائمہ حدیث میں سے شعبہ، سفیان اور حماد بن زید نے اس سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں۔ یحییٰ القطان، بخاری اور دیگر محدثین نے صراحت کی ہے کہ ان کی روایت کردہ احادیث صحیح ہیں۔ نسائی کہتے ہیں عطاء اپنی پرانی روایات کے اعتبار سے ثقہ ہے۔

یہ حدیث عطاء سے داؤد بن الزبرقان نے روایت کی ہے۔ کسی نے اس امر کی تصریح نہیں کی کہ یہ حدیث اس نے عطاء سے اس کا حافظہ کمزور ہونے کے بعد سنی تھی۔ داؤد بن الزبرقان ضعیف راوی ہے، لہٰذا اس کی وجہ سے اس حدیث کی سند ضعیف ہو سکتی ہے لیکن دوسری مؤید روایت مل جانے کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہٖ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

[1] الہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۶-۲۹۲) میں بھی یہ روایت کی ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

[2] یہ حدیث بخاری، احمد، ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے روایت کی ہے۔

[3] یہ حدیث احمد، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کی ہے۔ [4] بیلمانی کی روایت کردہ یہ حدیث اگلے صفحہ پر آ رہی ہے۔

[5] الناسخ والمنسوخ (ص ۱۹۰) اس کے بعد حازمی نے امام شافعی کے مسلک کی تائید میں چند دوسری احادیث بھی ذکر کی ہیں۔

جمہور اہل علم کے اس سلسلہ میں کچھ اور دلائل بھی ہیں جن کا یہاں احاطہ کرنا مشکل ہے۔

مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل کرنے کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ عبدالرحمان بن بیلمانی سے روایت کی ہے وہ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو ایک ذمی کے عوض قتل کیا اور فرمایا "جو لوگ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں میں ان میں سب سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا ہوں[1]"

ابراہیم نخعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان کو کافر کے عوض قتل کیا جائے گا، مگر جمہور اہل علم ان سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے دلائل ابھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ حدیث ان ائمہ کرام کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

---

[1] دیکھیے سنن بیہقی (۸ - ۳۰) دارقطنی (۳-۱۳۵) ابوداؤد فی المراسیل (ص ۲۷) بروایت سلیمان بن بلال، از ربیعہ عن عبدالرحمٰن بن بیلمانی نیز طحاوی نے شرح معانی الآثار (۳-۱۹۵) میں محمد بن المنکدر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے اسی طرح کی ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے۔

بیہقی کہتے ہیں کہ اس میں دو غلطیاں ہیں۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر کے واسطے سے یہ حدیث متصل سند کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ اس کو بروایت ابراہیم عن ربیعہ نقل کیا گیا ہے۔ حالانکہ ابراہیم نے یہ حدیث ابن المنکدر سے روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں عمار بن مطر الرہاوی پر اعتماد کیا گیا ہے جو اسانید کو الٹ پلٹ کر دیا کرتا تھا۔ وہ احادیث کو چرانے کا بھی عادی تھا۔ اس کی مرویات میں سرقہ کی بہتات ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ساقط الاعتبار راوی قرار دیا گیا ہے۔ بیہقی سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا کہ یہ حدیث ابن ابی یحییٰ یعنی ابراہیم کے سوا کسی نے بھی مرفوعاً روایت نہیں کی۔ حالانکہ ابراہیم ضعیف راوی ہے۔"

ابوداؤد نے المراسیل میں یہ حدیث ایک دوسرے طریقے سے ابن وہب عن عبداللہ بن یعقوب عن عبداللہ بن عبدالعزیز بن صالح حضرمی کی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غزوۂ خیبر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلم کو کافر کے عوض قتل کیا تھا مسلمان نے اس کافر کو دھوکے سے قتل کیا تھا۔

دیگر کتب میں ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ حُنین میں ہوا تھا۔

ابن القطان کہتے ہیں کہ عبداللہ بن یعقوب اور عبداللہ بن عبدالعزیز دونوں مجہول راوی ہیں۔ دیکھیے نصب الرایۃ (۴-۳۳۵) یہ مرسل روایت عبدالرحمان بن بیلمانی کی روایت کردہ حدیث کی مؤید ہے۔ "الجواهر المنیفۃ" کے مصنف نے امام ابوحنیفہ کے مسلک کی حمایت میں مسلم کو کافر کے عوض قتل کرنے کے سلسلے میں صحابہ کے متعدد اقوال و آثار ذکر کیے ہیں۔

(الجواهر المنیفۃ (۲ - ۱۳۰ تا ۱۳۷)

رسول اکرمؐ کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جس کی ایک آنکھ ہو اور وہ دوسرے آدمی کی آنکھ پھوڑ دے

عصمہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ حضورؐ نے دریافت کیا تجھے کس نے مارا ہے؟ اس نے کہا فلاں شخص نے میری ایک آنکھ ضائع کر دی۔ اس شخص کو بلایا گیا۔ وہ آ گیا تو آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تو نے اس کی آنکھ پھوڑی ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ حضورؐ نے اس کو دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے فرمایا "اس کی آنکھ نہ پھوڑو کہ یہ نابینا ہو جائے گا"۔

ل یہ حدیث طبرانی نے یہ روایت کی ہے۔ اس کی سند میں فضل بن مختار راوی ضعیف ہے (مجمع الزوائد ۷-۲۹۵)

فضل بن مختار کی کنیت ابو سہل اور نسبت بصری ہے (المیزان للذہبی ۳-۳۵۸) ذہبی کہتے ہیں کہ ابو حاتم کا کہنا ہے کہ یہ منکر اور باطل حدیثیں روایت کرتا ہے۔ الازدی کہتے ہیں یہ سخت منکر الحدیث راوی ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی روایت کردہ اکثر احادیث منکر ہیں۔ دوسری کسی حدیث سے ان کی تائید و حمایت نہیں ہوتی۔ میں نے فضل بن مختار کی روایت کردہ حدیث اس لیے ذکر کر دی ہے کہ شاید اس کی کوئی موید حدیث مل جائے اس لیے کہ وہ کذاب نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم ہو سکا کہ علماء نے اس حدیث کی شرح میں کیا کہا ہے۔

کتاب الجہاد

حربی کافر مسلمان ہو کر آجائے تو اس کے بارے میں رسول اللہؐ کا فیصلہ

عثمان بن ابی حازم سے روایت ہے۔ وہ صخر بن العلیہ (یا بعض کے نزدیک العیلہ) سے بیان کرتے ہیں کہ میں مغیرہ بن شعبہ کی پھوپھی کو پکڑ کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے صخر! جب کوئی قوم مسلمان ہو جاتی ہے تو ان کے خون اور مال محفوظ ہو جاتے ہیں، لہٰذا یہ خاتون ان کے حوالے کر دیجیے۔"

قبیلہ بنی سلیم کا ایک چشمہ تھا وہ مشرف با سلام ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چشمے کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا:

"اے صخر! جب کوئی قبیلہ اسلام لے آئے تو وہ اپنی جان اور مال محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ چشمہ ان کو دے دو۔ چنانچہ میں نے وہ چشمہ انھیں واپس کر دیا۔[1]

طبرانی نے "المعجم الکبیر" میں زینب بنت ثعلبہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بھیجا۔ انھوں نے قبیلہ بنی العنبر کے کچھ لوگوں کو پکڑ کر لونڈی غلام بنا لیا۔ وہ مخضرم[2] (جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہو) تھے۔ مگر اب مشرف با سلام ہو چکے تھے۔ ان میں سے زبیب نامی شخص اپنی اونٹنی پر سوار ہوا۔ اور باقی لوگوں کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ اس نے آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ کے صحابہ نے بنی العنبر کے لوگوں کو قیدی بنا لیا ہے حالانکہ وہ مخضرم تھے اور اب اسلام لا چکے ہیں۔" رسولِ اکرمؐ نے

---

[1] دیکھیے دارمی (۲-۲۲۸) ابن تیمیہ "المنتقی" میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث احمد اور ابو داؤد نے اسی مفہوم کے ساتھ روایت کی ہے۔ ان کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ کوئی قوم جب مسلمان ہو جائے تو اس کی جان اور اس کا مال محفوظ ہو جاتے ہیں۔ (نیل الاوطار ۸-۱۵۸)

حافظ ابن حجر بلوغ المرام (ص ۱۴۲) میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔

[2] مخضرم اس شخص کو کہتے ہیں جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات یا آپ کو دیکھنے کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو، خواہ حضورؐ کی زندگی میں اسلام لایا ہو یا اس کے بعد۔ اہل علم کے نزدیک ایسا شخص صحابی نہیں کہلائے گا۔

فرمایا۔ زبیب! کیا تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟" اس نے کہا "جی ہاں!" چنانچہ سمرہ نے شہادت دی اور زبیب نے حلف اٹھایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک گدّے کے سوا بنی العنبر والوں کی ہر چیز واپس کر دو۔" یہ ایک طویل حدیث ہے۔ آگے یہ بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زبیب کے قریب ہوئے۔ اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا حتیٰ کہ اس کی ناف تک لے گئے۔ زبیب کہتے ہیں "حتیٰ کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کی۔ پھر آپؐ نے فرمایا "اے اللہ! اس کو عفو اور عافیت عطا فرما۔" اس کے بعد زبیب تلوار لے کر لوٹ آئے۔ اور اسی کو زکوٰۃ کی دو اونٹنیوں کے عوض فروخت کر دیا۔ وہ اونٹنیاں زبیب کے پاس رہیں۔ ان کی نسل اتنی بڑھی کہ سو سے زیادہ ہو گئیں۔[1]

عورتوں کو قتل کرنے کی ممانعت

حنظلہ کاتب کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم ایک غزوہ کے لیے گئے۔ آپؐ کا گزر ایک مقتول عورت کے پاس سے ہوا جس کے پاس لوگ جمع تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر لوگ ہٹ گئے۔ آپؐ نے فرمایا:

"یہ عورت جنگ کرنے والوں میں تو شامل نہ تھی۔" پھر آپؐ نے ایک آدمی سے کہا "جا کر خالدؓ بن ولید سے کہو کہ رسول اللہ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ بچوں، عورتوں، مزدوروں اور غلاموں کو قتل نہ کریں۔

احمد اور طبرانی نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کو پکڑ کر قیدی بنا لیا۔ اس عورت نے اس سے تلوار چھیننا چاہی سو اس نے اس عورت کو قتل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر وہاں سے

---

[1] مجمع الزوائد (۴ - ۲۰۳) ہیثمی کہتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس ضمن میں ایک اور حدیث روایت کی ہے مگر اس کے الفاظ مختلف ہیں۔ اس میں مذکور ہے کہ صحابہ نے ان کا نصف مال واپس کر دیا تھا اور یہاں یہ ہے کہ سب مال ان کو لوٹا دیا تھا۔ اس حدیث میں سمرہ کی شہادت کا ذکر ہے مگر وہاں نہیں ہے۔ ہیثمی کہتے ہیں کہ طبرانی کی روایت میں وہ راوی بھی ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔

[2] ابن ماجہ (۲ - ۹۴۸) بیہقی (۹ - ۷۷، ۸۲، ۹۱)

المستدرک للحاکم (۲ - ۱۲۲) اور العلل لابن ابی حاتم (۱ - ۳۰۵)

حافظ ابن حجر نے اس کو احمد، ابن حبان اور نسائی کی جانب منسوب کیا ہے۔ دیکھیے الدرایۃ (۲ - ۱۱۹)

ہیثمی نے مجمع الزوائد (۵ - ۳۱۶) میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ نامی راوی مدلس ہے۔ اس لیے یہ حدیث معلل ہے۔

ہوا تو اس نے ماجرا عرض کیا۔ آپ نے یہ سن کر عورتوں کو قتل کرنے سے منع کیا۔

مراسیل ابی داؤد میں عکرمہ سے مروی ہے کہ غزوہ طائف میں حضورؐ کا گزر ایک مقتول عورت کے پاس سے ہوا۔ آپ نے فرمایا "اُس کو کس نے قتل کیا؟" ایک آدمی نے کہا "یا رسول اللہ! اسے میں نے قتل کیا ہے۔ میں نے اسے پکڑ کر اپنے پیچھے بٹھا لیا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ مسلمانوں کو شکست ہوگئی ہے تو اس نے مجھے قتل کرنے کے لیے تلوار پر قبضہ کرنا چاہا، لہٰذا میں نے اسے قتل کر دیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کچھ تعرض نہ فرمایا اور اس کو ڈھانپنے کا حکم صادر فرمایا۔[۱]

اس حدیث سے لڑنے والی عورت کے قتل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ احادیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ غزوہ حُنین میں دُرَید بن الصمہ کو قتل کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ دُرَید بوڑھا آدمی تھا اور لڑنے کے قابل نہ تھا۔ اس سے مشورہ لینے اور برکت حاصل کرنے کے لیے کفار اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جو شخص لڑنے کے قابل نہ ہو اور مشورہ دینے کا اہل بھی نہ ہو اسے قتل کرنا ممنوع ہے۔ تمام اہل علم اس بارے میں متفق ہیں اور اس مسئلہ میں ان کے یہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

غلام کو مالِ غنیمت میں سے کچھ دینے کا حکم

قبل ازیں کتاب الجہاد میں اس پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے کہ عورتوں اور غلاموں کو مالِ غنیمت سے حصہ دینے کے سلسلے میں علماء کی آراء کیا ہیں۔

ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں محمد بن زید بن قُنفُذ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عُمَیر مولیٰ ابی اللحم (قبیلہ غفار کی ایک شاخ کا نام ہے) نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنے مالک کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شرکت کی۔ جب خیبر فتح ہوا تو میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے بھی مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے۔ آپ نے اس میں سے حصہ دینے سے تو انکار کر دیا البتہ کچھ گھریلو سامان مجھے عطا کیا۔[۲]

---

[۱] دیکھیے مراسیل ابی داؤد (ص ۳۶، ۳۷)

[۲] دیکھیے منحۃ المعبود (۱-۲۳۹) ابوداؤد (۳-۷۵) کتاب الجہاد۔ ترمذی (۴-۱۲۷) کتاب "السیر" ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

جمہور فقہاء، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ سب اسی کے قائل ہیں۔ حسن بصری، ابوثور اور عمر بن عبدالعزیز نے یہ شاذ مذہب اختیار کیا ہے کہ غلام کو مالِ غنیمت میں سے آزاد کی طرح حصہ دیا جائے۔ کتاب الجہاد میں اس پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

مقتول کا مالِ غنیمت اس کے قاتل کو دیا جائے

حضرت علیؓ اور محمد بن مسلمہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مرحب یہودی کے چھینے ہوئے سامان کے بارے میں اپنا اپنا مقدمہ پیش کیا۔ محمد بن مسلمہ نے کہا یا رسول اللہ! میں نے اس کے پاؤں کاٹ کر اسے موت کا مزہ چکھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا حالانکہ میں اس کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اس نے سچ کہا۔ پہلے اس نے مرحب کے پاؤں کاٹے پھر میں نے اس کی گردن اڑا دی"۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہ کو مرحب کی تلوار، نیزہ، ڈھال اور خود عطا کر دیا۔[1]

مشرکین کے تحائف قبول کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

مُصعب بن ثابت بن عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے۔ وہ اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ قُتیلہ بنت العُزّیٰ اپنی بیٹی اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما کے یہاں آئیں۔ ظہورِ اسلام سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو طلاق دے دی تھی۔ وہ بہت سے تحائف لائیں جن میں گھی اور پنیر شامل تھا۔ حضرت اسماءؓ نے نہ تو اس کے تحفے قبول کیے اور نہ ہی اسے اندر آنے کی اجازت دی۔

حضرت اسماءؓ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا کہ اس بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے تحائف قبول کریں اور اسے اندر آنے کی اجازت دیں۔ اس ضمن

---

[1] صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت علیؓ نے مرحب کو قتل کیا تھا۔ موسیٰ بن عُقبہ نے جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ مرحب کو محمدؓ بن مسلمہ نے قتل کیا تھا۔ جابرؓ نے اپنی روایت میں کہا ہے کہ مرحب یہودی خیبر کے قلعہ سے مسلح ہو کر رجز پڑھتا ہوا نکلا۔ وہ کہہ رہا تھا کون میدان میں نکلے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کون اس کا مقابلہ کرے گا؟" محمدؓ بن مسلمہ نے کہا "یا رسول اللہ! میں انتقام کی آگ میں جل رہا ہوں۔ کل انھوں نے میرے بھائی محمودؓ بن مسلمہ کو قتل کیا تھا" آپؐ نے فرمایا "جاؤ اور اس کا مقابلہ کرو۔ اے اللہ! مرحب کے خلاف اس کی مدد کر"۔

جب وہ ایک دوسرے کے قریب آئے تو ایک درخت ان کے درمیان آڑے آیا۔ جب ان میں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتا تو وہ اس درخت کی پناہ لیتا۔ پناہ لیتے وقت وہ درخت کی شاخیں کاٹ دیتا۔ نتیجے کے طور پر درخت کی اوٹ جاتی رہی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے نمایاں ہو گئے اور وہ درخت یوں نظر آنے لگا جیسے آدمی کھڑا ہو۔ اس میں کوئی ٹہنی باقی نہ رہی۔ مرحب نے محمدؓ بن مسلمہ پر وار کیا۔ محمدؓ نے ڈھال سے وار کو روکا۔ مرحب کی تلوار گر کر ٹوٹ گئی۔ محمدؓ بن مسلمہ نے وار کر کے اسے تہ تیغ کر دیا۔ دیکھیے زاد المعاد (۲-۱۳۴، ۱۳۵)

میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:[1]

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ
فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ
تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنۃ ۔ ۸)

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی
اور نہ تم کو تمھارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی
اور انصاف کا سلوک کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا۔
خدا تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سے پہلے کتاب الجہاد میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات کفّار کے تحائف قبول کرتے تھے اور بعض اوقات رد کر دیتے تھے۔ وہاں میں نے دونوں کے درمیان جمع و تطبیق کی وجہ بیان کر دی تھی۔

---

[1] المستدرک للحاکم (۲ - ۴۸۵ - ۴۸۶) حاکم کہتے ہیں کہ یہ صحیح الاسناد ہے، مگر بخاری اور مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ذہبی حاکم سے متفق ہیں۔
ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے یہ حدیث مصعب بن ثابت سے اسی طرح روایت کی ہے۔
الہیثمی کہتے ہیں کہ احمد اور دوسرے محدثین نے مصعب کو ضعیف قرار دیا ہے، البتہ ابن حبان اس کو ثقہ ٹھہراتے ہیں۔ یہ حدیث احمد نے مسند میں اور طبرانی نے "المعجم الکبیر" میں روایت کی ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۴-۱۵۲) نیز (۸-۱۴۴)

کتاب النکاح والطلاق

یتیم لڑکی کے نکاح کے سلسلے میں اس سے اجازت لینے کا حکم

امام احمد بن حنبل نے ابن اسحاق، عن عمر بن حسین بن عبداللہ مولی آل حاطب، عن نافع مولی عبداللہ بن عمر، عن عبداللہ بن عمرؓ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ عثمان بن مظعون فوت ہو گئے اور اپنے پیچھے ایک بیٹی چھوڑی جو خُویلہ بنت حکیم بن اُمیّہ بن حارثہ کے بطن سے تھی۔ عثمان نے اپنے بھائی قدامہ بن مظعون کو (لڑکی کے بارے میں) وصیت کی تھی۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ عثمان اور قُدامہ دونوں میرے ماموں تھے۔ میں نے قُدامہ سے اپنے لیے عثمان کی بیٹی کا رشتہ طلب کیا۔ اس نے میری درخواست منظور کر لی۔

اسی دوران میں مُغیرہ بن شُعبہ لڑکی کی والدہ کے یہاں گئے اور اسے مال کا لالچ دیا، چنانچہ اس نے لڑکی کی نسبت مُغیرہ سے کر دی۔ لڑکی بھی اپنی والدہ کی ہم خیال ہو گئی۔ لڑکی اور اس کی والدہ دونوں نے عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ رشتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جب معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو قدامہ نے کہا یا رسول اللہ! یہ میری بھتیجی ہے۔ میرے بھائی نے اس کو میری تحویل میں دیا تھا۔ میں نے اس کا رشتہ اس کے پھوپھی زاد عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ طے کر دیا ہے۔ میں نے اس کی فلاح و بہبود اور کفو کے تلاش کرنے میں کوتاہی سے کام نہیں لیا، مگر یہ عورت ہے کہ اپنی ماں کے پیچھے لگ گئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ یتیم لڑکی ہے اور اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔"

عبداللہ بن عمرؓ نے کہا "بخدا، میں اس کا مالک بن چکا تھا مگر وہ مجھ سے چھن گئی اور اس کا نکاح مُغیرہ بن شُعبہ کے ساتھ کر دیا گیا[1]۔"

---

[1] دیکھیے مسند احمد (۲ - ۱۳۰) عمر بن حسین الجُمحی المکّی مدینہ کے قاضی تھے۔ یہ ثقہ راوی ہیں۔ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل (۳ - ۱ - ۱۰۴) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ بخاری نے "التاریخ الصغیر" (ص ۱۴۳) میں اس کا تعارف کروایا ہے مگر اس پر نقد و جرح نہیں کی۔

یہ حدیث دارقطنی (۳ - ۲۲۹) نے ابن اسحاق سے اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ نیز بیہقی (۷ - ۱۱۳) نے اس کو عن ابن اسحاق کی سند سے روایت کیا ہے۔

مرض الموت کی حالت میں نکاح کرنے والے کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

دار قطنی نے صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن معقل سے روایت کیا ہے کہ ایک انصاری نے مرض الموت کی حالت میں نکاح کیا۔

لوگوں نے کہا کہ یہ نکاح جائز نہیں ہے، لہٰذا اس کو ایک تہائی مال میں سے حقوق ملیں گے۔

جب یہ معاملہ عدالت نبوی میں پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا

یہ نکاح جائز ہے اور اسے ایک تہائی مال میں سے نہیں بلکہ پورے مال میں سے حقوق ملیں گے۔

المستدرک للحاکم (۲-۱۶۷)، دار قطنی (۳-۲۲۹) اور بیہقی (۷-۱۲۱) میں یہ روایت کران ابی ذئب عن عمر بن حسین، عن نافع عن عبداللہ بن عمر کی سند کے ساتھ اختصار کے ساتھ روایت کی گیا ہے۔

ذہبی اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

ہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۴-۲۸۰) میں یہ حدیث مسند احمد سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کا ایک جزو روایت کیا ہے۔

لہ دیکھیے سنن الدار قطنی (۳-۲۵۰) شیخ عظیم آبادی کہتے ہیں کہ اس کی سند میں کوئی مجروح راوی نہیں ہے اور دار قطنی کے سوا مجھے معلوم نہیں کہ کسی اور نے یہ حدیث روایت کی ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "ولا یکون من الثلث" کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کی وجہ سے عورت کو صرف ایک تہائی مال میں سے نہیں بلکہ خاوند کے پورے مال میں سے حقوق ملیں گے لہٰذا خاوند پورے مال میں سے جس قدر چاہیے اس کا مہر مقرر کر دے۔ اسی طرح خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں دوسرے وارثوں کی طرح وہ وراثت میں سے اپنا حصہ وصول کرے گی۔ جمہور صحابہ و تابعین کا یہی مسلک ہے۔ فقہاء میں ابو حنیفہ، شافعی اور ظاہریہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام مالک کہتے ہیں کہ دخول سے قبل اور بعد دونوں صورتوں میں اس کا نکاح فسخ تصور کیا جائے گا۔ اگر دخول کی نوبت نہ آئی ہو تو عورت کو کچھ نہیں ملے گا، اور اگر مجامعت کی ہو تو ایک تہائی مال میں سے اس عورت کو مہر مثل ادا کیا جائے گا۔ اس لیے کہ مریض نے اس کی شرمگاہ کو اپنے لیے حلال کیا ہے، مگر اسے وراثت میں سے حصہ ہرگز نہیں دیا جائے گا۔ اگر نکاح فسخ ہونے سے قبل خاوند فوت ہو جائے تو عورت عدت گزارے گی مگر اسے ورثہ نہیں ملے گا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مریضہ کے لیے بھی نکاح کرنا درست نہیں۔ نکاح کرنے والا شخص اس کا وارث نہیں ہوگا خواہ مجامعت کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ اگر اس نے مجامعت کی ہو تو اس کے ذمے مہر واجب الادا ہوگا۔ (محلّٰی ابن حزم (۱۱-۲۰۹))

یہ حدیث امام مالک اور ان کے ساتھیوں کے خلاف حجت ہے۔

جوتوں کو مہر قرار دے کر نکاح کرنے والے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

ترمذی اپنی سند کے ساتھ عامر بن ربیعہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو فزارہ کی ایک عورت نے جوتوں کے ایک جوڑے کے عوض نکاح کیا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اسے فرمایا:

"اپنی جان اور مال کے عوض کیا تو نے جوتوں کے ایک جوڑے کو پسند کر لیا؟ اس نے کہا جی ہاں" چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کو درست قرار دیا۔[1]

مندرجہ بالا حدیث سے حضور کے اس ارشادِ گرامی کی تائید ہوتی ہے:

"اگر ایک شخص مٹھی بھر غلہ کے عوض کسی عورت سے نکاح کرے تو اسے مہر تصور کیا جائے گا"۔[2]

اس کے برعکس بعض فقہاء کم از کم مہر دس درہم قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیلات کتاب النکاح میں گزر چکی ہیں۔

رسول اللہ کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو اسلام لائے اور اس وقت اس کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں ہوں

مصنف نے غیلان بن سلمہ ثقفی کا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب وہ اسلام لایا تو اس کی دس بیویاں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا کہ ان میں سے چار منتخب کر لو اور باقی کو طلاق دے دو۔

ابن ابی حاتم نے سفیان ثوری، عن محمد بن سعید، عن حمیصہ بن شمردل، عن قیس بن حارث کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب وہ اسلام لایا تو اس کی آٹھ بیویاں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ ان میں سے چار کو منتخب کر لو۔[3]

---

[1] ترمذی (۳-۲۰۴) کتاب "النکاح"۔ ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔
ابن ماجہ (۱-۶۰۸) کتاب "النکاح" باب "مھور النساء"۔
بیہقی (۷-۱۳۸، ۲۳۹)

[2] ابوداؤد و بیہقی

[3] العلل لابن ابی حاتم (۱-۳۹۹) ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا وہ کہتے تھے کہ یہ سند درست نہیں ہے۔ سند صحیح یوں ہے۔ ثوری، عن محمد السائب الکلبی، عن حمیصہ بن شمردل عن قیس بن حارث، اور کلبی مشہور کذاب ہے۔
ابوداؤد (۲-۲۷۲) کتاب "الطلاق" عن ابن ابی لیلی عن حمیصہ علاوہ ازیں ابن ماجہ (۱-۶۲۸) اور بیہقی (۷-۱۴۹) نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔
ابن ابی لیلی کو ثقہ یا ضعیف قرار دینے کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ مگر اس کی سند کلبی کی سند سے بہتر ہے۔

بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ عروہ بن سعید سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب میں اسلام لایا تو میری دس بیویاں تھیں۔ ان میں سے چار قبیلہ قریش میں سے تھیں جن میں ایک ابوسفیان کی بیٹی بھی تھیں۔ آپ نے فرمایا" ان میں سے چار کو منتخب کرلو اور باقی کو چھوڑ دو۔" چنانچہ میں نے چار کو منتخب کرلیا ان میں سے ایک ابوسفیان کی بیٹی بھی تھیں۔ ؎

امام شافعی نے نوفل بن معاویہ سے روایت کیا ہے کہ جب وہ اسلام لائے تو ان کی پانچ بیویاں تھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" چار کو اپنے پاس رکھ لو اور باقی کو چھوڑ دو" ؎

رسول اللہ کا فیصلہ کہ اگر باپ بیٹے کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دے تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہیے

ابوداؤد ؎، ترمذی ؎، ابن ماجہ ؎، حاکم ؎، اور امام احمد ؎ نے ابن ابی ذئب، عن حارث بن عبدالرحمٰن عن حمزہ بن عبداللہ

؎ بیہقی (۷-۱۸۴)

؎ بیہقی (۷-۱۸۴)

مذکورہ بالا احادیث اور دیگر آثار و اقوال سے جمہور اہل علم نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اسلام میں چار بیویوں سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ مگر اہل ظاہر اور بعض شیعہ نے یہ شاذ موقف اختیار کیا ہے کہ بیک وقت نو بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ انھوں نے آیت کریمہ "مثنیٰ وثلٰث وربٰع" سے استدلال کیا ہے اس لیے کہ ان کا مجموعہ نو ہوتا ہے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ آپ کی بیک وقت نو یا گیارہ بیویاں تھیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے) وہ کہتے ہیں کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بیک وقت نو بیویوں سے نکاح کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے محل بحث و نظر ہے۔

مگر قولی اور فعلی اجماع امت سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی کے بارے میں بھی منقول نہیں کہ انھوں نے چار بیویوں سے زیادہ کے ساتھ نکاح کیا ہو۔ نہ ہی کسی سے منقول ہے کہ اس نے چار سے زیادہ بیویوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دی ہو۔ مذکورہ بالا احادیث پر اگرچہ نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مگر بحیثیت مجموعی امت مسلمہ نے ان کو قبول عام سے نوازا ہے۔

؎ ابوداؤد (۴-۳۳۵-۳۳۶) کتاب "الادب" باب "بر الوالدین"

؎ ترمذی (۳-۴۹۴) کتاب "الطلاق" باب "ما جاء فی الرجل یسأل ابنه ان یطلق زوجته"

؎ ابن ماجہ (۱-۶۷۵) کتاب "الطلاق" باب "الرجل یأمره ابوه بطلاق امراته"

؎ المحاکم (۲-۱۹۷) حاکم کہتے ہیں کہ امام بخاری اور مسلم کی شرائط کے مطابق یہ روایت صحیح ہے۔ ذہبی بھی ان سے متفق ہیں۔

؎ احمد (۲-۲۰/۴۲/۵۳/۱۵۷)

بخاری اور مسلم نے حارث بن عبدالرحمٰن سے روایت نہیں کی۔ احمد اور نسائی کہتے ہیں کہ اس سے روایت کرنے میں کچھ

بن عمر عن عبداللہ بن عمرؓ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ میری ایک بیوی تھی جسے میں بہت پسند کرتا تھا۔ میرے والد حضرت عمرؓ اسے ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اسے طلاق دے دو۔ میں نے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ اس بیوی کو طلاق دے دوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کہ مطلّقہ عورت وضعِ حمل کے بعد الگ ہو جائے

ابن ماجہ[1] نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے۔ وہ اپنے والد سے اور وہ حضرت زبیرؓ بن عوام سے نقل کرتے ہیں کہ

مقام ثقہ نہیں لیکن ابن ابی ذئب کے علاوہ کسی اور نے ان سے روایت نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر اس کو سچا قرار دیتے ہیں۔ اس بنا پر یہ روایت حسن کے درجہ کی ہے صحیح کے درجہ کی نہیں۔ حاکم نے بخاری و مسلم پر اس حدیث کا جو استدراک کیا ہے حافظ ابن حجر اس سے متفق نہیں ہیں۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جب والد اپنے بیٹے کو حکم دے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اسے طلاق دے دینی چاہیے۔ اگرچہ وہ اسے پسند کرتا ہو۔ بیوی کے ساتھ محبت اس کو اپنے یہاں ٹھہرانے کے لیے عذر نہیں بن سکتی۔ شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں کہ والدہ کا بھی وہی حکم ہے جو والد کا ہے۔ اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق والدہ کا حق والد سے زیادہ ہے۔ دیکھیے تحفۃ الاحوذی (۴-۳۶۸)

[1] دیکھیے ابن ماجہ (۱-۶۵۳) کتاب "الطلاق" باب المطلقۃ الحامل اذا وضعت بانت۔

نیز دیکھیے بیہقی (۷-۴۲۱) حافظ زیلعی اور ابن حجر نے اس کو ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق کی طرف منسوب کیا ہے۔ ابن ماجہ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ دیکھیے نصب الرایۃ (۳-۲۵۸) اور الدرایۃ (۲-۷۸)

البوصیری الزوائد میں لکھتے ہیں :

" اس حدیث کے راوی اگرچہ ثقہ ہیں مگر یہ منقطع روایت ہے۔ اس لیے کہ میمون بن مہران کی حضرت زبیر سے روایت مرسل ہے۔ المزی "التھذیب" میں لکھتے ہیں کہ حاکم نے یہ حدیث "المستدرک" (۲-۲۰۹) میں دوسری سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب مگر صحیح الاسناد ہے۔ بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ابوالملیح الرّقی اپنے دور میں اہل جزیرہ کا امام تھا۔ وہ وضاح نہیں تھا۔

ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط وہی عورت ہے جس سے اس کے بیٹے حمید بن عبدالرحمٰن نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ "جو شخص لوگوں میں صلح کروانے کے لیے مصلحۃً کوئی جھوٹی بات کہتا وہ کذاب نہیں ہے۔"

میں کہتا ہوں ابوالملیح الرقی اس ابوالملیح الہذلی سے الگ شخصیت ہے جس کا تذکرہ بخاری نے "التاریخ الصغیر" (ص ۱۴۴) میں کیا ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ ابن مہدی اس سے روایت نہیں کرتے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ حاکم نے اس سے المستدرک باب الملاعنہ میں روایت کیا ہے۔ وہ مجہول راویوں میں شمار ہوتا ہے۔ دیکھیے المیزان (۴-۵۷۶)

ام کلثوم بنت عقبہ ان کی بیوی تھیں اس نے حالت حمل میں کہا کہ مجھے طلاق دے دو۔ میں اسی میں اپنی بہتری سمجھتی ہوں۔" ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ حضرت زبیر عورتوں کے معاملہ میں سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ اُم کلثوم کو یہ بات ناپسند تھی۔ اس لیے اس نے حمل کی حالت میں طلاق کا مطالبہ کیا۔ حضرت زبیر نے طلاق دینے سے انکار کیا جب اُم کلثوم کو دردِ زِہ شروع ہوا تو اس نے طلاق پر اصرار کیا تو حضرت زبیرؓ ایک طلاق دے دی۔ زبیر نماز ادا کرنے کے لیے گئے جب واپس آئے تو دیکھا کہ ام کلثوم نے بچے کو جنم دے رکھا ہے۔ حضرت زبیرؓ نے کہا۔ "اس نے مجھ سے دھوکا کیا خدا اس کو دھوکے کی سزا دے۔" پھر وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ وضع حمل کی وجہ سے اس کی عدت مقررہ میعاد سے پہلی ہی پوری ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب تم اسے دوبارہ نکاح کی دعوت دو۔ ابن ابی شیبہ کی روایت ہے کہ حضرت زبیرؓ نے کہا کہ میرے ساتھ ہرگز دوبارہ نکاح نہ کرے گی۔"

حاملہ کی عدّت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

امام احمدؒ نے عبدالرزاق عن معمر عن زہری عن عبیداللہ بن عبداللہ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ مروان نے عبداللہ بن عتبہ کو سُبَیعہ بنت الحرث کے پاس یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں کیا فتویٰ دیا تھا؛ سُبَیعہ نے بتایا کہ وہ سعد بن خولہ کے نکاح میں تھیں جو بدری صحابی تھے۔ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر وفات پا گئے۔ ان کی وفات پر چار ماہ دس دن کا عرصہ گزرنے سے قبل ہی ان کے یہاں بچے کی ولادت ہو گئی۔

سُبَیعہ جب نفاس سے پاک ہوئی تو اسے ابوالسنابل ابن بعکک ملا۔ سُبَیعہ نے سُرمہ لگا رکھا تھا۔ ابوالسنابل نے کہا۔ ابھی کچھ عرصہ مزید انتظار کرو۔ شاید تم نکاح کرنا چاہتی ہو۔ خاوند کی وفات سے لے کر تمھیں چار ماہ دس دن کا عرصہ بطور عدت گزارنا پڑے گا۔" سُبَیعہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ سے عرض کیا کہ ابوالسنابل نے مجھے یہ۔

لہ دیکھیے مسند احمد (۶-۴۳۲) اصل واقعہ صحیحین میں موجود ہے۔ دیکھیے صحیح بخاری کتاب "الطلاق" باب قولہ تعالیٰ (واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن۔ الطلاق-۴) فتح الباری میں حدیث نمبر ۵۳۱۸-۵۳۱۹-۵۳۲۰

اور صحیح مسلم (۲-۱۱۲۲) کتاب "الطلاق" باب انقضاء عدۃ المتوفیٰ عنھا زوجھا وغیرھا لوضع الحمل۔

ابوداؤد طیالسی فی منحۃ المعبود (۱-۳۲۴)

ابن الجارود فی السنن (۱-۲۵۴) دارمی فی السنن (۲-۱۶۵، ۱۶۶) والشافعی فی المسند (۲-۵۱)

ہیثمی نے سُبَیعہ کے واقعہ کے سلسلے میں متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۵-۲۰۳)

جمہور سلف اور ائمہ کا مسلک یہی ہے کہ حاملہ کا خاوند فوت ہو جائے تو وضع حمل سے اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ ابعد الاجلین (وضع حمل اور چار ماہ دس دن میں سے جو مدت زیادہ ہو) کے قائل ہیں۔ فقہاء میں سے سحنون مالکی کے سوا کوئی بھی اس رائے سے متفق نہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلے کی تفصیلات موجود ہیں۔

مسئلہ بتایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بچہ جننے کے ساتھ ہی تمہاری عدت پوری ہو گئی۔"

دوسری روایات میں ہے کہ حضور نے فرمایا "ابوالسنابل نے جھوٹ کہا" یا آپ نے فرمایا "اس طرح نہیں جیسے ابوالسنابل نے کہا تمہاری عدت پوری ہو گئی لہٰذا تم نکاح کر سکتی ہو۔"

ابوداؤد طیالسی کی ایک روایت میں صراحت ہے کہ خاوند کی وفات کے تین ماہ بعد اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا تھا۔

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ اسی جگہ عدت گزارے جہاں وہ وفات کے وقت مقیم تھی

اصحاب سنن نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں کہ فریعہ بنت مالک بن سنان ابوسعید خدری کی بہن تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بتایا کہ میرا شوہر اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کی تلاش میں نکلا۔ جب وہ "قدوم" نامی جگہ کے قریب پہنچے تو میرے خاوند نے انھیں جا لیا۔ وہاں غلاموں نے اسے قتل کر دیا۔ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں اپنے میکے جانا چاہتی ہوں اس لیے کہ میرے خاوند نے کوئی گھر نہیں چھوڑا جس میں سکونت اختیار کر سکوں۔ مزید براں میرے پاس نفقہ بھی نہیں۔

فریعہ کہتی ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اثبات میں جواب دیا، چنانچہ میں وہاں سے نکل آئی جب میں حجرہ یا مسجد کے قریب پہنچی تو آپؐ نے مجھے بلایا۔ یا آپؐ کے حکم پر مجھے بلایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا "تم نے کیا بات کہی تھی؟" میں نے اپنے خاوند کی موت کا واقعہ دہرایا یہ سن کر آپؐ نے فرمایا "عدت پوری ہونے تک اپنے اسی گھر میں ٹھہری رہو۔"

فریعہ نے کہا "میں نے وہاں چار ماہ دس دن بسر کیے۔"

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انھوں نے پیغام بھیج کر مجھے بلوایا اور اس مسئلے کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے بتایا تو انھوں نے رسول اللہ کی پیروی کی اور اس کے مطابق فیصلہ صادر کیا۔[1]

---

[1] ابوداؤد (۲-۲۹۱)۔ ترمذی (۳-۵۰۸)۔ ابن ماجہ (۱-۶۵۵)۔ نسائی (۶-۱۹۹)۔ دارمی (۲-۱۶۸)۔ الشافعی فی المسند (۲-۵۳) "منحۃ المعبود" (۱-۳۲۴)۔ حاکم (۲-۲۰۸)۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

حافظ ابن القیم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے اور اصحاب سنن نے اس کو نقل کیا ہے۔ دیکھیے اعلام الموقعین (۴-۳۵۵)

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ احمد، اسحاق اور ابویعلیٰ نے یہ روایت بیان کی ہے۔ ترمذی، ابن حبان، حاکم اور الذہلی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے الدرایہ (۲-۸۰)

جمہور فقہا امام مالک، ابوحنیفہ، شافعی، اوزاعی اور اسحاق کا یہی مسلک ہے، البتہ اگر عورت درشت مزاج ہو اور خاوند کے اقارب کو ایذا دیتی ہو تو وہ دوسرے گھر میں عدت گزار سکتی ہے۔ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیس کو عبداللہ ابن ام مکتوم کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے پہلے کتاب النکاح میں اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

غلام کو طلاق کا مالک بنانے کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

ابن ماجہ نے ابن لہیعہ، عن موسیٰ بن ایوب، عن عکرمہ، عن عبداللہ بن عباس کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میرے آقا نے اپنی لونڈی کے ساتھ میرا نکاح کر دیا تھا لیکن اب وہ میرے اور اس کے درمیان تفریق کرانا چاہتا ہے۔" یہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"اے لوگو! یہ کیا بات ہے کہ تم پہلے اپنے غلام کا نکاح اپنی لونڈی سے کر دیتے ہو، پھر ان میں تفریق کروانا چاہتے ہو؟ طلاق دینے کا اختیار تو وہ شخص رکھتا ہے جو اس کا خاوند ہوتا ہے۔

ـه ابن ماجہ (۱-۲/۶۷) کتاب "الطلاق"۔

ابن لہیعہ کی روایت کردہ حدیث حسن ہوتی ہے۔ مگر خود وہ ضعیف راوی ہے۔ دارقطنی (۴-۳۷) نے یہ حدیث، اسی طرح روایت کی ہے۔ دارقطنی نے اس کو بطریق ابو الحجاج المہری، عن موسیٰ بن ایوب بھی روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ابو عتبہ احمد بن الفرج ضعیف راوی ہے۔ محمد بن عوف الطائی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن ابی حاتم اس کو صادق القول کہتے ہیں۔ پھر انھوں نے یہ حدیث فضل بن مختار عن عبیداللہ بن مُوہب عن عصمہ بن مالک کی سند کے ساتھ اسی طرح روایت کی ہے۔

الہیثمی "مجمع الزوائد" (۴-۳۳۴) میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد فضل بن مختار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فضل بن مختار ضعیف ہے۔" انھوں نے یہ قول کسی کی طرف منسوب نہیں کیا۔ ذہبی نے المیزان (۳-۳۵۸) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے فضل بن مختار پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اس کا تعارف اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

کثرت اسناد کی بنا پر ابن لہیعہ کی روایت کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور وہ روایت صحیح لغیرہ کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ اس لیے امام شوکانی فرماتے ہیں۔ "اس کی اسناد ایک دوسرے کی مؤید ہیں۔" دیکھیے نیل الاوطار (۷-۲۵)

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:۔

"ابن عباس کی روایت کردہ حدیث پر اگرچہ نقد و جرح کی گئی ہے مگر قرآن کریم سے اس کی تائید ہوتی ہے۔" قرآن کریم میں فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ ۔ (الاحزاب-۴۹)	اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں طلاق دو۔

دوسری جگہ فرمایا:

إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (البقرۃ-۲۳۱)	جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو یا تو انھیں معروف طریقے سے اپنے نکاح میں رہنے دو یا مناسب طریقے سے رخصت کر دو۔

اس آیت میں طلاق کا حق نکاح کرنے والے کو دیا ہے۔ دیکھیے زاد المعاد (۴-۶۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کہ اگر باپ مسلمان اور ماں کافر ہو تو بچہ کس کی تحویل میں دیا جائے

ابوداؤد[1]، نسائی[2]، حاکم[3] اور دارقطنی[4] نے عبدالحمید بن جعفر عن ابیہ عن جدہ لا کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے مگر ان کی بیوی نے اسلام لانے سے انکار کر دیا۔ ان کا ایک چھوٹی عمر کا بیٹا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رافع کو ایک طرف اور بیوی کو دوسری طرف بیٹھنے کا حکم دیا۔ بچے کو درمیان میں بٹھایا۔ پھر ان کو حکم دیا کہ بچے کو بلائیں۔ بچے کا میلان ماں کی طرف تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی "اے اللہ! اس کو ہدایت فرما" چنانچہ بچہ باپ کی جانب لوٹ آیا۔ اور اس نے بچے کو سنبھال لیا۔

دارقطنی کہتے ہیں کہ وہ بچی تھی اور اس کا نام عُمیرہ تھا۔

نسائی، ابن ماجہ، احمد، اسحاق اور البزار نے عبدالحمید بن سلمہ سے، انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ والدین ایک بچے کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کو اختیار دیا کہ جس کے ساتھ چاہے چلا جائے۔ بچہ والدین میں سے کافر کی جانب متوجہ ہوا۔ آپؐ نے دعا فرمائی "اے اللہ! اسے ہدایت فرما" چنانچہ وہ اس سے مسلمان کی طرف مائل ہو گیا۔ آپؐ نے وہ بچہ مسلمان کو دے دیا[5]۔

غالباً یہ دو واقعات ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ میں لڑکے کو اختیار دیا اور دوسرے میں لڑکی کو۔

الخطابی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ چھوٹا بچہ جب مسلم اور کافر کے درمیان مشترک ہو تو مسلمان اس کا زیادہ حق دار ہے۔ امام شافعی کا موقف بھی یہی ہے۔

اصحاب الرأی کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ جب خاوند اور بیوی میں طلاق کی وجہ سے تفریق ہو جائے اور بیوی ذمّی بھی ہو تو والدہ اولاد کی زیادہ حق دار ہے۔ تاوقتیکہ وہ عقد ثانی نہ کرے۔ اس سلسلے میں ذمی اور مسلمان عورت میں کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا[6]۔

---

[1] ابوداؤد (۲-۲۷۳) کتاب "الطلاق" باب اذا اسلم احد الابوین مع من یکون الولد"۔

[2] النسائی (۶-۱۸۵) کتاب "الطلاق" باب اسلام احد الزوجین وتخییر الولد۔

[3] الحاکم فی المستدرک (۲-۲۰۶-۲۰۷) حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ ذہبی بھی ان سے متفق ہیں۔

[4] دارقطنی (۴-۴۳-۴۴)

[5] نصب الرایۃ (۳-۲۷۰)۔ الدرایۃ (۲-۸۲)

[6] تھذیب السنن (۳-۱۵۹)

کتاب البیوع

تنگدست کو قرض کا کچھ حصّہ معاف کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم

امام احمد نے ابن ابی حدرد اسلمی سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی نے ان سے چار درہم قرض لینا تھا یہودی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ میرے چار درہم اس پر قرض ہیں اور یہ مجھے ادا نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا "اس کا حق اسے دے دو"۔ میں نے کہا: "مجھے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر مبعوث کیا مجھ میں ادا کرنے کی قدرت نہیں ہے"۔ آپ نے دوبارہ ادائیگی کا حکم دیا۔ میں نے پھر وہی الفاظ دہرائے اس کے بعد میں نے عرض کیا "میں نے اس کو بتایا ہے کہ آپ ہمیں خیبر بھیجنے والے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے کچھ مال غنیمت ملے گا تو میں اس کا حق ادا کر دوں گا"۔ آپ نے پھر فرمایا "اس کا حق اسے ادا کر دو"۔

راوی کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تین بار کوئی بات کہتے تو پھر اسے بار بار نہ دہراتے تھے۔ اس کے بعد ابن ابی حدرد اسے بازار لے گئے۔ ان کے سر پر پگڑی تھی اور ایک لنگی کا تہبند باندھا ہوا تھا۔ پگڑی سر سے اتار کر اس کا تہبند باندھ لیا اور چادر اتار کر کہا یہ چادر مجھ سے خرید لو۔ چنانچہ وہ چادر چار درہم کے عوض یہودی کے پاس فروخت کر دی۔ اس طرف سے ایک بڑھیا کا گزر ہوا۔ اس نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی! کیا بات ہے؟ انھوں نے ماجرا بیان کیا۔ وہ کہنے لگی میری چادر لے لو کیونکہ تم نے اپنی چادر اس کو دے دی ہے۔

سلہ دیکھیے مسند امام احمد (۳-۴۲۳) ہیثمی کہتے ہیں کہ یہ حدیث احمد نے مسند میں اور طبرانی نے المعجم الصغیر اور المعجم الاوسط میں روایت کی ہے اس کے راوی ثقہ ہیں، مگر میرے علم کی حد تک محمد بن ابی یحییٰ نے صحابہ سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ لہٰذا یہ حدیث اگرچہ صحیح ہے مگر مرسل ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد (۴-۱۳۰)

مجمع الزوائد اور حافظ ابن حجر کی کتاب "الاصابۃ" میں ابن ابی حدرد کے بجائے ابی حدرد کے الفاظ ہیں۔ دونوں روایتیں انھوں نے امام احمد کی طرف منسوب کی ہیں۔ یہ حدیث مسند میں بعنوان "حدیث ابی حدرد الاسلمی" منقول ہے۔ مگر متن حدیث میں اسے ابن ابی حدرد سے روایت کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ واقعہ دونوں میں سے کس کو پیش آیا۔ باپ کو یا بیٹے کو۔ حافظ ابن حجر نے باپ بیٹے دونوں کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔

قدرتی آفت کی وجہ سے فروخت کردہ چیز میں جو کمی ہو جائے وہ معاف کر دی جائے

امام احمدؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: "میرے ماں باپ آپ پہ قربان! میں نے اور میرے بیٹے نے فلاں شخص سے اس کے باغ کے پھل خریدے تھے ہم نے ان کی حفاظت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو مکرم و محترم بنایا ہمیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ سوائے اس کے جو ہم نے کھا لیا۔ یا برکت حاصل کرنے کے لیے کسی مسکین کو کھلا دیا۔ چنانچہ ہمیں اس میں بہت زیادہ خسارہ ہوا ہے۔ ہم نے اس شخص سے کہا کہ وہ خسارے کے مطابق پھلوں کی قیمت میں کمی کر دے لیکن اس نے قسم کھالی کہ وہ اس میں کمی نہیں کرے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اس نے قسم کھالی ہے کہ وہ نیکی نہیں کرے گا؟" آپ نے یہ بات تین بار فرمائی۔ یہ بات جب باغ کے مالک کو معلوم ہوئی تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہوا اور اس نے عرض کی "میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں اگر آپ چاہیں تو جتنا خسارہ ان کو ہوا ہے میں اسی قدر قیمت میں کمی کر دوں گا، بلکہ اگر آپ فرمائیں تو اصل رقم میں بھی تخفیف کر سکتا ہوں۔" چنانچہ اس نے خسارے کے مطابق قیمت میں کمی کر دی۔

بالغ اولاد کو والدین سے جدا کیا جا سکتا ہے

صحیح مسلمؒ میں حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت میں قبیلہ فزارہ سے جنگ کرنے کے لیے نکلے۔ ہم نے جنگ کی اور ہم ان کے کچھ لوگوں کو پکڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس لایا۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کی بیٹی نہایت حسین و جمیل تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی بیٹی مجھے مال غنیمت میں سے حصے کے طور پر دے دی۔ میں مدینہ پہنچا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے سلمہ! یہ عورت مجھے دے دو" میں نے عرض کیا وہ میں نے آپ کو دے دی۔" آپؐ نے وہ دے کر اس کے عوض مکہ سے اپنے قیدی چھڑوا لیے۔

سنن ابی داؤدؒ میں باب کا عنوان یوں ہے "الرخصة فی المدرکین یفرق بینھم" (بالغوں میں تفریق جائز ہے) اس سے

لہ مسند احمد (۶-۶۹) الہیثمی مجمع الزوائد (۴-۱۲۴) میں لکھتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں، البتہ عبدالرحمٰن بن ابی الرجال پر نقد و جرح کی گئی ہے۔ تاہم وہ ثقہ راوی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عبدالرحمٰن بن ابی الرجال کے والد کا نام محمد بن عبدالرحمٰن انصاری ہے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ ابن معین اور دیگر محدثین نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے، مگر ابو حاتم اسے ضعیف کہتے ہیں۔

ابن عدی کہتے ہیں کہ اس سے روایت اخذ کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ دیکھیے المیزان (۲-۵۶)

ٔلہ صحیح مسلم (۳-۵، ۱۳) کتاب "الجہاد" باب "التنفیل وفداء المسلمین بالاساری"

ٔلہ ابوداؤد (۳-۶۴) کتاب "الجہاد" باب "رخصۃ فی المدرکین یفرق بینھم"

معلوم ہوا کہ نابالغ بچوں کو والدین سے الگ کرنا ممنوع ہے۔ جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ جہاں تک بالغ بچوں کا تعلق ہے ان کو والدین سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت کردہ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت عبادہ فرماتے ہیں:۔

" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے اور اس کی والدہ میں تفریق کرنے سے منع فرمایا۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا "یا رسول اللہ! کب تک؟" فرمایا "حتّٰی کہ لڑکا بالغ ہو جائے اور لڑکی کو ماہواری آنے لگے۔"

دو بھائیوں میں تفریق کا مسئلہ

سنن ترمذی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو غلام عطا کیے جو آپس میں بھائی بھائی تھے۔ میں نے دونوں میں سے ایک فروخت کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا "علیؓ! تمہارا غلام کیا ہوا؟" میں نے واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا "اسے واپس لے لو" یہ بات آپؐ نے دو مرتبہ فرمائی۔

لہ المستدرک للحاکم (۲-۵۵) حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ مگر ذہبی کہتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے اور عبد اللہ بن حسان راوی کذاب ہے۔"

لہ ترمذی (۳-۵۸۱) کتاب "البیوع" باب "ماجاء فی کراھیۃ ان یفرق بین الاخوین" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

ابوداؤد طیالسی فی "منحۃ المعبود" (۱-۲۶۵)۔ ابن ماجہ (۲-۷۵۶) کتاب "التجارات" باب "النھی عن التفریق بین السبی"۔ بطریق حجاج بن ارطاۃ، عن حکم بن عُتَیبہ، عن میمون بن ابی شبیب، عن علی رضی اللہ عنہ۔

امام احمد نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ دیکھیے "الفتح الربانی" (۱۵-۵۴)

دارقطنی (۳-۶۵) مستدرک للحاکم (۲-۵۴، ۵۵) بروایت الحکم بن عُتَیبہ، عن عبد الرحمن بن ابی لیلی، عن علی بن ابی طالب۔

ابوحاتم اس سند کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی صحیح سند حکم عن میمون بن ابی شبیب ہے۔

(العلل ۱-۲۸۶)

ہیثمی اور حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ مسند احمد کے راوی ثقہ ہیں۔ ابن خزیمہ، ابن الجارود، ابن حبان، حاکم، طبرانی اور ابن القطان اس کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

تعلیمِ قرآن کی اُجرت

ابوداؤد[1]، ابنِ ماجہ[2] اور حاکم[3] نے عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے کہ میں نے اہلِ صُفّہ میں سے چند آدمیوں کو قرآن مجید کی تعلیم دی۔ ان میں سے ایک نے مجھے کمان کا ہدیہ پیش کیا۔ میں نے سوچا یہ مال نہیں ہے اور میں اس کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کروں گا پھر میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

" اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آگ کا طوق پہنائے تو اسے قبول کر لو"

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ جب کوئی مہاجر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں پہنچتا تو اسے ایک انصاری کے یہاں بھیج دیتے کہ وہ اسے قرآن کریم کی تعلیم دے۔ اسی طرح آپ نے ایک مہاجر کو میرے پاس بھیجا جسے میں نے قرآن کریم کی تعلیم دی۔ میں اپنے گھر چلا آیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کے ذمے میرا حق واجب الادا ہے، چنانچہ اس نے ایک کمان تحفے کے طور پر مجھے دی۔ میں نے ایسی عمدہ کمان آج تک نہیں دیکھی تھی۔ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس ضمن میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

" یہ آگ کا انگارہ ہے جسے تم نے اپنی گردن میں حمائل کر رکھا ہے"

ابنِ ماجہ میں ابی بن کعب سے اسی طرح مروی ہے۔ اہلِ علم کہتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ وہ اس حدیث کو کبھی عبادہ بن صامت کی طرف منسوب کرتا ہے اور کبھی اُبی بن کعب کی طرف۔

یہ حدیث منسوخ العمل ہے۔ اس کی ناسخ وہ حدیث ہے جو حضرت ابوسعید خدری سے صحیحین میں منقول ہے۔ اس حدیث کے مطابق بعض صحابہ کرامؓ نے سانپ کے ڈسے ہوئے ایک شخص سے اس کو دم کرنے کے بدلے میں ایک بکری اجرت کے طور پر لی تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کو جائز قرار دیا تھا۔ اسی طرح صحابہؓ کا اپنا عمل بھی اس حدیث کے مطابق نہیں تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عمال کو لکھا تھا "لوگوں کو تعلیم قرآن کی اجرت دیا کرو"

بیہقی نے "المعرفۃ" میں اس کا ذکر کیا ہے[4]۔

بھاگ جانے والے اونٹ کے بارے میں رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم

دارقطنی اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ بشیر غفیری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک

---

[1] ابوداؤد (۳-۲۶۴) کتاب "البیوع" باب "فی کسب المعلم"

[2] ابن ماجہ (۲-۷۲۹) کتاب "التجارات" باب "الاجر علی تعلیم القرآن"

[3] دیکھیے المستدرک للحاکم (۲-۴۱) کتاب "البیوع"۔ حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔

[4] "نصب الرایۃ" (۴-۱۳۷)

خاص جگہ بیٹھا کرتے تھے کبھی دوسری جگہ نہ بیٹھتے لیکن ایک بار مسلسل تین روز تک نشست خالی رہی۔ اس کے بعد جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بشیر! میں نے تین دن تمھیں یہاں نہیں دیکھا۔" اس نے کہا "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ میں نے ایک شخص سے اونٹ خریدا تھا۔ وہ چند روز میرے پاس رہا پھر بھاگ گیا۔ میں نے اسے لا کر اس شخص کے حوالے کر دیا جس سے لیا تھا۔ اس نے اسے قبول کر لیا۔" آپ نے فرمایا: "کیا اس شخص کے ساتھ واپسی کی شرط پہلے سے طے تھی؟" بشیر نے کہا "نہیں لیکن اس نے اس کے باوجود اونٹ کا واپس لینا قبول کر لیا ہے۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں کہ بھاگنے والے اونٹ کو اس کو فروخت کرنے والے کو واپس کیا جا سکتا ہے؟" دوسری روایت میں بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔

لہ دارقطنی (۲۴۱-۲۴۳) اس کی سند میں عبد السلام بن عجلان راوی ہے جس پر جرح کی گئی ہے۔ اس کی کنیت ابو الخلیل ہے۔ وہ ابن عجلان الہجیمی کہلاتا تھا۔ مگر صحیح ابن عجلان ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا "وہ بصری شیخ ہے اس کی روایت کردہ حدیث لکھنے کے قابل ہوتی ہے۔" ابن حبان نے اس کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "ابن عجلان غلطی کرتا ہے بعض اوقات اصول روایت کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔"

ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل (۳-۱-۴۶) میں اس کا تعارف کروایا ہے۔ نیز لسان المیزان لابن حجر (۴-۱۶) حافظ ابن حجر "الاصابۃ" میں لکھتے ہیں:

"یہ حدیث حسن بن سفیان، ابن شاہین اور ابن مردویہ نے کتاب تفسیر میں اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس دن کیا حالت ہو گی جس کا اندازہ پچاس ہزار سال کے برابر ہے جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" عبد السلام بن عجلان ضعیف راوی ہے۔ مولانا عظیم آبادی نے حاشیہ دارقطنی میں بھی یہ حوالہ دیا ہے۔

اس کی ایک مؤید روایت ابن عباس سے مروی ہے جو امام احمد نے مسند (۱-۳۰۲) میں روایت کی ہے۔ وہ یہ حدیث بروایت اسود بن عامر، ایوب بن عتبہ، عن یحیی بن ابی کثیر، عن عطاء، عن عبد اللہ بن عباس نقل کرتے ہیں کہ اس حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] ان میں سے ایک بھاگ جانے والے اونٹ کو فروخت کرنا بھی ہے۔ اس کی سند میں ایوب بن عتبہ ضعیف راوی ہے۔ بخاری نے التاریخ الصغیر (ص ۲۰۵) اور الضعفاء (ص ۲۵۲) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الھبۃ

بیوی خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو تحفہ دینے کی مجاز نہیں

ابن ماجہ[1] نے عبداللہ بن یحییٰ سے روایت کی (عبداللہ بن یحییٰ حضرت کعب جن کی اولاد میں سے ہیں)۔ وہ اپنے والد

---

[1] ابن ماجہ (۲-۷۹۴) کتاب الھبات نیز طحاوی نے شرح معانی الآثار (۴-۳۵۱) میں لیث بن سعد، عن عبداللہ بن یحییٰ انصاری کی سند کے ساتھ بھی اسی طرح کی حدیث روایت کرتے ہیں۔ طحاوی کہتے ہیں یہ ایک شاذ حدیث ہے اور ثابت نہیں ہے۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے اور یہ حجت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں عبداللہ بن یحییٰ انصاری اور اس کے والد ہیں جن کے بارے میں البوصیری کہتے ہیں کہ یحییٰ، کعب بن مالک کی اولاد میں غیر معروف شخص ہے۔ حافظ ابن حجر التقریب میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ اور اس کا باپ دونوں مجہول ہیں۔

مگر اس حدیث کے متعدد شواہد و دلائل ہیں۔ جن میں سے ایک روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مرفوعًا نقل کی گئی ہے کہ کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو کوئی عطیہ دے۔

یہ حدیث احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

اسی طرح ابوامامہ باہلی کی روایت کردہ وہ حدیث بھی ہے جو ترمذی نے نقل کی ہے کہ "بیوی اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں سے کچھ بھی خرچ نہیں کر سکتی۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! کھانا بھی نہیں دے سکتی؟ فرمایا "یہ تو بہترین مال ہے۔"

اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش الحمصی ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں سے روایت کرنے میں سچا ہے۔ اسماعیل نے یہ حدیث شرحبیل بن مسلم خولانی سے روایت کی ہے جو اس کا ہم وطن شامی ہے۔ حافظ ابن حجر التقریب میں کہتے ہیں کہ اسماعیل سچا راوی ہے مگر اس میں کچھ ضعف پایا جاتا ہے۔

الخلاصہ (ص ۱۶۵) میں لکھا ہے کہ العجلی اور امام احمد نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے، مگر ابن معین اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

اس کی مؤید ایک اور حدیث واثلہ بن اسقع سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"عورت کو اس بات کی اجازت نہیں کہ خاوند کے گھر سے بلا اذن کوئی چیز بھی خرچ کرے۔"

ہے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی دادی خیرہ جو کعب بن مالک کی بیوی تھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ زیور لے کر حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں "یا رسول اللہ! میں نے اسے صدقہ کیا۔" آپؐ نے فرمایا:

"عورت اپنے مال میں سے خاوند کی اجازت کے بغیر صدقہ نہیں کر سکتی۔ کیا تو نے کعب سے اجازت لی ہے؟" اس نے کہا جی ہاں! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب کو بلا کر دریافت کیا کہ "تم نے خیرہ کو زیور صدقہ کرنے کی اجازت دی ہے؟" انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کر لیا۔

جلال الدین السیوطی نے یہ حدیث "الجامع الصغیر" میں نقل کی اور اس کو طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس پر انھوں نے کوئی تنقید نہیں کی۔

یہ شواہد اس حدیث کے مؤید ہیں۔

کتاب القضاء

حکم کے فیصلے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی

ابن شاہین نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ بنو عنبر نے اپنی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ پھر وہ اس جگہ سے کوچ کر کے اپنے ننھیال قبیلۂ خزاعہ کے یہاں مقیم ہو گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی فراہمی کے لیے اپنے ایک نمائندے کو قبیلۂ خزاعہ والوں کے پاس بھیجا۔ اس نے بنو خزاعہ اور پھر بنو عنبر سے زکوٰۃ وصول کی۔ جب بنو عنبر نے دیکھا کہ زکوٰۃ کا مال جمع ہو چکا ہے تو انھوں نے حضورؐ کے نمائندے پر حملہ کر کے وہ مال چھین لیا۔ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ بنو عنبر والوں نے زکوٰۃ کا مال چھین لیا ہے۔ حضورؐ نے عیینہ بن حصن کی قیادت میں ایک سو ستر آدمیوں کا دستہ بھیجا۔

عیینہ نے دیکھا کہ بنو عنبر اطاعت سے منحرف ہو چکے ہیں، چنانچہ انھوں نے ان کے نو مردوں، گیارہ عورتوں اور چند بچوں کو قیدی بنا لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ بنو عنبر کو پتہ چلا تو ان میں سے ستر آدمی سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ ان میں اقرع بن حابس اور اعور بن بشامہ عنبری بھی شامل تھے۔ اعور بن بشامہ سب سے کم عمر تھے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو عورتیں اور بچے ان کو دیکھ کر جمع ہو گئے۔ وہ لوگ حضورؐ کے حجروں کے پاس جمع ہو گئے۔ آپؐ اس وقت قیلولہ فرما رہے تھے۔ وہ لوگ چلا چلا کر کہنے لگے "اے محمدؐ! آپؐ ہماری عورتوں کو قیدی کیوں بنالائے ہیں، حالانکہ ہم نے آپؐ کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف نکلے اور فرمایا "میرے اور اپنے درمیان کسی کو ثالث بنا دو۔" انھوں نے کہا "ہم اعور بن بشامہ کو ثالث بناتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "ابن عمرو زیادہ موزوں ہے۔" انھوں نے اعور بن بشامہ پر اصرار کیا، چنانچہ آپؐ نے اسے حکم تسلیم کر لیا۔ اعور نے فیصلہ کیا کہ ان میں سے نصف کو آزاد کر دیا جائے اور نصف کا فدیہ وصول کیا جائے۔[1]

---

[1] الاصابۃ لحافظ ابن حجر (۱-۶۹) حافظ ابن حجر نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی۔ قبل ازیں ابن عبدان کے بارے کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک غیر معروف راوی ہے۔ البتہ ابن شاہین کی سند کے بارے میں انھوں نے سکوت اختیار کیا ہے۔

اپنے علم کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے پر اپنے حق کا دعویٰ کیا۔ وہ دونوں اپنا مقدمہ عدالت نبوی میں لے گئے۔ آپ نے شہادت طلب کی۔ مدعی نے کہا میرے پاس شہادت نہیں ہے۔ آپ نے دوسرے سے کہا "حلف اٹھاؤ" اس نے حلف اٹھا کر کہا کہ "بخدا میرے پاس اس کی کوئی چیز نہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ چیز تمہارے پاس موجود ہے، اس کا حق اسے دے دو" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "اگر تم یہ شہادت دے دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو تمہاری قسم کا کفارہ ادا ہو جائے گا"۔

جس کے پاس شہادت نہ ہو اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے سعید بن ابی عُروہ، عن قتادہ، عن ابی موسیٰ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ دو آدمیوں

لہ المستدرک للحاکم (۴-۹۶) حاکم نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی بھی ان سے متفق ہیں۔
ذہبی "المیزان" (۳-۳۷) میں لکھتے ہیں کہ ابوداؤد اور نسائی نے یہ روایت بیان کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابویحییٰ زیاد ہیں، ان کو ابن معین اور ابوداؤدؒ نے ثقہ قرار دیا ہے۔
حافظ ابن حجرؒ "التلخیص الحبیر" (۴-۲۰۹) میں لکھتے ہیں:۔
"امام احمد نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ جبرئیل رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اس کے ذمے اس شخص کا حق واجب الادا ہے۔ آپ نے اسے حق ادا کرنے کا حکم دیا"۔
ابن حزم نے اس روایت کو ابویحییٰ کی وجہ سے معلل قرار دیا ہے۔ ابن عساکر نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ المزی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہم ہے۔ ابویحییٰ کا نام زیاد ہے۔ امام احمد، بخاری، ابوداؤد نے بھی اس کا نام یہی ذکر کیا ہے۔
ذہبی کہتے ہیں کہ زیاد ثقہ راوی ہے۔

سہ ابوداؤد (۳-۳۱۰) کتاب "الاقضیۃ" باب الرجلین یدّعیان شیئاً ولیست لهما بَیِّنَۃٌ۔

سہ ابن ماجہ (۲-۷۸۰) کتاب "الاحکام" باب الرجلین یدّعیان السلعۃ ولیس بینهما بینۃٌ۔
یہ روایت سابق الذکر روایت کے خلاف ہے جو ابوموسیٰ سے منقول ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک نے دو دو گواہ پیش کئے۔ جب کہ پہلی روایت میں ہے کہ کسی کے پاس بھی گواہ موجود نہ تھا۔ اسی لیے بعض علماء نے ان کو دو واقعات پر محمول کیا ہے۔ حافظ زیلعی لکھتے ہیں:۔
"المنذری نے اپنے حواشی میں کہا ہے کہ ممکن ہے ایک ہی واقعہ ہو۔ اور اس امر کا بھی احتمال ہے کہ یہ دو مختلف واقعات ہوں

نے حضور کی عدالت میں ایک اونٹ یا سواری کے کسی جانور کا دعویٰ پیش کیا کسی کے پاس بھی گواہ نہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو اس کا مالک قرار دے دیا۔

جس کے پاس شہادت ہو اس کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

اسحاق بن راہویہ نے مسند میں، ابن حبان نے صحیح میں عبد الصمد، عن حماد بن سلمہ، عن قتادہ، عن النضر بن انس، عن بشیر بن نہیک، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہم کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ دو آدمیوں نے سواری کے ایک جانور کا دعویٰ کیا۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ہر ایک نے دو دو گواہ پیش کیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جانور ان کے درمیان برابر تقسیم کر دیا[1]

جو شخص کسی چیز پر قابض ہو اس کے بارے میں شرعی حکم

دار قطنی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ دو شخص ایک اونٹنی کے بارے میں جھگڑتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں میں سے ہر ایک نے کہا کہ یہ اونٹنی میرے گھر پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی

چونکہ ان کے متن و سند میں کمال درجہ کی یکسانی پائی جاتی ہے لہٰذا ابن عساکر نے دونوں کو ایک ہی حدیث قرار دیا ہے، اور اس حدیث کو سنن ثلاثہ (ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ) کی طرف منسوب کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں اس لیے کہ نسائی اور ابن ماجہ نے دو گواہ پیش کرنے والی حدیث روایت نہیں کی۔ نصب الرایۃ (۴ - ۱۰۹)

یہ حدیث حاکم نے المستدرک (۴ - ۹۵) میں روایت کی ہے۔ نیز بیہقی نے بھی السنن الکبریٰ (۲ - ۶۷) میں نقل کی ہے۔ حاکم اور ذہبی اس کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

[1] نصب الرایۃ (۴ - ۱۰۹)

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ شیخ ابن الصلاح نے اپنی کتاب میں اس موضوع سے متعلق ایک مختصر روایت ذکر کی ہے جس میں مذکور ہے:

"جب دونوں میں سے ہر ایک نے ثقہ گواہ پیش کیے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دونوں میں تقسیم کر دیا۔"

میں نے وہاں مصنف کی عبارت کی تشریح کی اور بتایا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف منسوب ہے۔ مزید برآں اس کا راوی ابو مصعب اس حدیث کے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ دونوں روایتوں میں واضح تضاد پایا جاتا ہے۔ اس روایت میں مذکور ہے کہ دونوں کو اس کی ملکیت میں شریک کر دیا۔ جب کہ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ان میں آدھا آدھا بانٹ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے مصنف پر استدراک کرتے ہوئے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔

پھر اس کے ثبوت میں شہادت بھی پیش کر دی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے حق میں فیصلہ صادر کیا جس کے قبضہ میں اونٹنی تھی۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے فیصلہ کی توثیق فرمائی

الماوردی نے ذکر کیا ہے کہ دو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں میں سے ایک نے کہا کہ میرے پاس ایک گدھا تھا اور اس کے پاس ایک گائے تھی۔ اس کی گائے نے میرے گدھے کو ہلاک کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا "ان کے درمیان فیصلہ کرو"۔ انھوں نے کہا کہ چوپایوں پر تاوان نہیں۔ پھر حضرت عمرؓ سے کہا "ان کے درمیان فیصلہ کرو"۔ انھوں نے بھی اسی طرح کہا۔ پھر حضرت علیؓ کو فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے دریافت کیا کیا دونوں کھلے تھے؟" دونوں نے کہا "نہیں" پھر پوچھا "کیا دونوں بندھے ہوئے تھے؟" دونوں نے کہا "نہیں"۔ پھر پوچھا "کیا گائے بندھی ہوئی تھی اور گدھا کھلا تھا؟" دونوں نے کہا "نہیں"۔ پھر سوال کیا "کیا گدھا بندھا ہوا تھا اور گائے کھلی تھی؟" دونوں نے کہا "جی ہاں"۔ حضرت علیؓ نے کہا "گائے کا مالک تاوان ادا کرے"۔[2]

---

[1] دارقطنی (۴-۲۰۹) اس کی سند میں یزید بن نعیم ہے۔ شیخ عظیم آبادی کہتے ہیں کہ میں نے بعض قابل اعتماد حواشی میں دیکھا ہے کہ ابن القطان یزید بن نعیم کو مجہول راوی قرار دیتے ہیں۔ ذہبی نے بھی "المیزان" میں اس کا ترجمہ درج نہیں کیا۔

امام شافعی نے مسند (۲-۱۸۰) میں ایک اور سند کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے۔

حافظ ابن حجر "التلخیص الحبیر" (۴-۱۸۰) میں کہتے ہیں کہ دارقطنی اور بیہقی نے بھی حضرت جابرؓ سے یہ روایت بیان کی ہے۔ مگر اس کی سند ضعیف ہے۔

شیخ ابن الطلاع نے کتاب "الاقضیۃ" میں جو حدیث نقل کی ہے وہ اس حدیث سے متعارض ہے۔ اس میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو ان کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا۔ میں نے وہاں لکھا ہے کہ جابر سے مروی حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر ابو موسیٰ کی صحیح روایت اس کی مؤید ہے، لہٰذا یہ حدیث استدلال کے اعتبار سے کم درجہ کی ہوگی۔

[2] دیکھیے "ادب القاضی" للماوردی (۲-۳۸۷)۔ الماوردی نے اس کی سند ذکر نہیں کی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ ماخذ معلوم ہونے کی صورت میں اس کی سند کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔

فقہاء میں سے کسی نے بھی اس کے مطابق فتویٰ نہیں دیا۔ امام مالک اور شافعی کا مسلک یہ ہے کہ چوپایہ رات کے وقت جو نقصان کرے مالک اس کا ضامن ہوگا۔ دن کے نقصان کا ضامن نہیں ہوگا۔ قاضی شریح کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ امام شعبی اونٹنی کے ذکر پر مشتمل سابق الذکر حدیث کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ مویشی پر ضمان کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ ان کی دلیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے "العجماء جرحها جبار" (چوپایہ کسی کو زخم کر دے تو اس پر تاوان نہیں ہوگا) البتہ وہ کہتے ہیں کہ مالک پر تعزیر عائد کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ چوپائے کے مالک کو کہا جائے گا کہ اسے باندھ کر رکھے۔ اگر باندھ لے تو بہتر ورنہ فروخت کر کے اس کی قیمت مالک کو دے دی جائے گی۔

کتاب الفرائض والعتق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس شخص کے ترکہ کے بارے میں جس کی بہنیں ہوں لیکن اولاد نہ ہو

ابوداؤد[1] اور بیہقی[2] نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ میں بیمار پڑ گیا اور میری سات بہنیں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف لائے۔ آپؐ نے میرے چہرے پر پھونک ماری تو میں ہوش میں آ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ! کیا میں اپنی بہنوں کے لیے دو تہائی مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟" آپؐ نے فرمایا "بہت اچھا" میں نے عرض کیا۔ کیا میں نصف مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟" آپؐ نے فرمایا "بہت خوب"۔ پھر آپؐ باہر تشریف لے گئے۔ اور جاتے ہوئے آپؐ نے فرمایا "جابر! میرا خیال ہے کہ تم اس بیماری سے فوت نہیں ہو گے"۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہنوں کے بارے میں حکم نازل کیا ہے اور ان کے لیے دو تہائی حصہ مقرر کیا ہے۔"

حضرت جابرؓ فرمایا کرتے تھے کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ میرے بارے میں نازل ہوئی:

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ....الخ

(النساء: ١٧٦)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس شخص کی میراث کے بارے میں جو کسی کے ہاتھ پر اسلام لائے

اسحاق بن راہویہ نے مسند میں بقیہ بن ولید، عن کثیر بن مرۃ النہرانی، عن شیخ من باہلہ، عن عمروؓ بن العاص کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "فلاں شخص میرے ہاتھ پر اسلام لایا اور اس کے پاس مال تھا۔ اب وہ فوت ہو چکا ہے"۔ آپ نے فرمایا "تم اس کے وارث ہو"[3]۔

---

[1] ابوداؤد (٣-١١٩) کتاب "الفرائض" المنذری نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔

[2] بیہقی (٦-٢٣١) اصل حدیث صحیحین میں موجود ہے۔ یہ حدیث ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے۔

[3] حافظ زیلعی نے نصب الرایۃ (٤-١٥٧، ١٥٨) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ طبرانی نے یہ حدیث المعجم میں روایت کی ہے۔ ہیثمی کہتے ہیں کہ اگر بقیہ کا سماع کثیر بن مرہ سے ثابت ہو تو یہ حدیث صحیح ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد (٤-٢٣٢) اسحاق بن راہویہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ وراثت میں خاوند اور حقیقی بہن کے حصہ کے بارے میں

زید بن ثابت رضی سے وراثت میں خاوند اور حقیقی بہن کے حصے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے نصف خاوند کو اور نصف بہن کو دلوایا۔ دریافت کیے جانے پر انھوں نے بتایا کہ میری موجودگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح سے فیصلہ کیا تھا۔

دیت کی ورثا میں تقسیم کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

شیخ ابن الطلاع نے ذکر کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُشیم الضبابی کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دلایا تھا۔ بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ قرہ بن دُعموص النمیری سے روایت کیا ہے کہ میں اور میرا چچا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میرے والد کی دیت میرے چچا کے پاس ہے اسے ادا کرنے کا حکم دیجیے" آپ نے فرمایا "اس کے والد کی دیت اسے دے دو" اسے جاہلیت کے زمانہ میں قتل

نے یہ حدیث اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ اس میں بقیہؒ کے سماع کی تصریح موجود ہے۔ مگر اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے۔

احادیث صحیحہ اس فیصلہ کی مؤید ہیں۔ سنن اربعہ میں ہے کہ تمیم داری نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا جو کسی شخص کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ آپ نے فرمایا "وہ شخص زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اس کا سب سے زیادہ قریبی سمجھا جائے گا" یعنی اس کا وارث ہوگا۔ بخاری نے اس حدیث کو کتاب "الفرائض" میں بلا سند نقل کیا ہے۔

امام احمد اور اسحاق کا مسلک بھی یہی ہے۔ اسحاق سے دوسری روایت یہ منقول ہے کہ وہ وارث نہیں ہوگا۔ اکثر اہل علم اسی مسلک کے قائل ہیں۔ مثلاً امام مالک، شافعی اور ابو حنیفہ کا یہی مسلک ہے۔

سعید ابن المسیب کہتے ہیں کہ اگر وہ شخص اس نو مسلم کی دیت ادا کرنے کا ذمہ دار ہو تو وارث ہوگا ورنہ نہیں لیکن صحیح بات وہی ہے جو امام احمد نے کہی ہے اور بہت سے دلائل اسی کی تائید کرتے ہیں۔

لہ مسند احمد (۵ - ۱۸۸) الساعاتی کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ امام احمد کے سوا کسی اور نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ دیکھیے الفتح الربانی (۱۵ - ۱۹۵)

ہیثمی مجمع الزوائد (۴ - ۲۲۸) میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ابو بکر بن ابی مریم ہے۔ اس کا حافظہ خراب ہوگیا تھا۔

ٹہ سنن البیہقی (۸ - ۱۳۴) تاریخ بخاری (۴ - ۱۸۰)

حافظ ابن حجرؒ "الاصابة" (۳ - ۲۲۴) میں لکھتے ہیں کہ الباوردی، عمرو بن شبیہ، ابن مندہ، ابو نعیم اور بخاری نے تاریخ میں یہ روایت کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک سند کے ساتھ واقعہ کا کچھ حصہ ذکر کیا ہے۔

کیا گیا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میری والدہ کو بھی اس میں سے کچھ ملے گا؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں" اس کے والد کی دیت سو اونٹ تھی۔

حجاج الصواف کہتے ہیں کہ میں نے ابو قلابہ کے چچا زاد بھائی معاویہ کی کتاب میں ابو قلابہ کی تصانیف کے حوالے سے پڑھا ہے کہ محمد بن ثابت کو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ دیت کی رقم وارثوں میں اللہ کے مقرر کردہ حصوں کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔

آزاد کردہ غلام کی وراثت جس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو

شیخ ابن الطلاع قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی کا آزاد کردہ ایک غلام فوت ہو گیا تھا۔ اس نے صرف ایک بیٹی پیچھے چھوڑی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی بیٹی اور مرحوم کی بیٹی کو نصف نصف ترکہ دے دیا۔ مرحوم کی بیٹی کو نصف سے زیادہ نہیں دیا گیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ آقا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے۔

ترمذیؒ، ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ ایک غلام کھجور کے درخت سے گر کر فوت ہو گیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا "دیکھو اس کا کوئی وارث ہے؟" لوگوں نے کہا "نہیں"۔ فرمایا "اس کا ترکہ اس کے گاؤں کے کسی آدمی کو دے دو۔"

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے واقعے کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آزاد کردہ غلام کا ترکہ

لہ حوالہ مذکورہ بالا یہ حدیث امام احمد نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ بیان کی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیت کا مال مقتول کے وارثوں میں مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ ہیثمی نے اس حدیث کے رجال کو ثقہ قرار دیا ہے۔ دیکھیے "مجمع الزوائد" (۴-۲۳۰)

لہ ترمذی (۴-۲۲۴) کتاب "الفرائض" باب "ما جاء فی الذی یموت ولیس لہ وارث" ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

لہ ابوداؤد (۳-۱۲۳-۱۲۴) کتاب "الفرائض" باب "فی میراث ذوی الارحام" المنذری نے اس کو ابن ماجہ اور نسائی کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔

مگر مجھے یہ روایت نسائی کی "سنن صغریٰ" میں نہیں ملی۔ ممکن ہے "السنن الکبریٰ" میں موجود ہو۔

لہ ابن ماجہ (۲-۹۱۲) کتاب "الفرائض" باب "میراث الولاء"۔ بیہقی (۶-۲۴۳) بیہقی کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ آپؐ کا غلام تھا مگر آزاد کردہ نہ تھا۔ اس لیے آپؐ نے اس کا ترکہ قبول نہ کیا اور مصلحت کی بنا پر اس کو بستی والوں میں تقسیم کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عمدہ توجیہ ہے بشرطیکہ کوئی ایسی نص موجود ہو جس سے ثابت ہو سکے کہ وہ آزاد کردہ نہ تھا۔

لینے کے حق دار تھے" مگر اس کے باوجود آپؐ نے نہ لیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آقا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے۔

جو شخص اپنے زیرِ کفالت یتیم کے لیے ایک سو اونٹ کی وصیت کرے اس کا شرعی حکم

امام احمد ابو سعید مولیٰ بنی ہاشم، عن ذیال بن عتبہ بن حنظلہ، عن حنظلہ بن حذیم کی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ اس کے دادا حنیفہ نے حذیم سے کہا کہ میرے بیٹوں کو جمع کرو، میں افضل وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ ان کو جمع کر دیا گیا۔ حنیفہ نے کہا "میری پہلی وصیت یہ ہے کہ میں اپنے اس زیرِ کفالت یتیم کو وہ ایک سو اونٹ دینا چاہتا ہوں۔ جنھیں دورِ جاہلیت میں ہم "المطیبۃ" (بہترین اونٹ) کہا کرتے تھے۔ حذیم نے کہا "ابا جان! میں نے سنا ہے کہ آپ کے بیٹے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنے والد کے سامنے تو اس کا اقرار کر لیں گے لیکن جب ہمارا والد فوت ہو جائے تو ہم یہ اونٹ واپس لے لیں گے۔

حنیفہ نے کہا کہ اس بات کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔ حذیم نے کہا "ہم اس پر راضی ہیں"۔ حذیم، حنیفہ اور حنظلہ سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ وہ یتیم لڑکا بھی تھا۔ وہ حذیم کے پیچھے سوار تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر انھوں نے سلام عرض کیا۔ آپؐ نے دریافت کیا "ابو حذیم! کیسے آنا ہوا؟" اس نے کہا "اس کی وجہ سے آیا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ حذیم کی ران پر مارا۔ اور پھر کہا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اچانک مجھ پر بڑھاپا طاری ہو جائے یا میں مر جاؤں اس لیے میں نے وصیت کا ارادہ کیا ہے۔ میری اولین وصیت یہ ہے کہ میں اپنے زیرِ کفالت اس یتیم کو وہ ایک سو اونٹ دے دیے جائیں جنھیں ہم دورِ جاہلیت میں "المطیبۃ" کہا کرتے تھے۔ رسول اکرمؐ یہ بات سن کر سخت ناراض ہوئے حتیٰ کہ غصہ کے آثار چہرۂ مبارک پر نمودار ہو گئے۔ آپؐ سیدھے بیٹھے ہوئے تھے پھر دو زانو ہو گئے اور فرمایا۔

لہ مسند احمد (۵ - ۶۷، ۶۸) اس کی سند صحیح ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد للہیثمی (۴ - ۲۱۱)

ہیثمی اور حافظ ابن حجر نے اس کو احمد کی جانب منسوب کیا ہے (الاصابۃ ۱ - ۳۵۸) حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن بن سفیان نے مسند میں ایک اور سند کے ساتھ ذیال سے یہ روایت بیان کی ہے۔ نیز یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ اس یتیم کا نام فریس بن قطیعہ تھا اور وہ بالغ ہونے کے قریب تھا۔ طبرانی نے یہ حدیث ایک منقطع سند کے ساتھ روایت کی ہے ابو یعلیٰ نے یہ اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے مگر وہ پوری حدیث بیان نہیں کرتے۔ یعقوب بن سفیان المنجنیقی نے بھی اپنی مسند میں روایت بیان کی ہے۔ نیز دوسرے محدثین نے بھی یہ لکھی ہے۔

لہ ذیال بن عتبہ لکھنا غلط ہے اور صحیح ذیال بن عُبید ہے۔ دیکھیے الاصابۃ۔ التقریب۔ التہذیب۔ المیزان بحوالہ الفتح الربانی (۱۵ - ۱۸۲)

"نہیں، نہیں، نہیں۔ صدقہ پانچ اونٹ ہے یا دس یا پندرہ یا بیس یا پچیس۔ ورنہ تیس یا پینتیس اور بہت زیادہ ہوں تو چالیس۔"

راوی نے کہا پھر آپؐ نے ان کو رخصت کیا۔ یتیم کے پاس ایک لاٹھی تھی جس کے ساتھ وہ اونٹ کو ہانک رہا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ لاٹھی تو بہت بڑی ہے" حنظلہ کہتے ہیں میرے والد مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لے گئے اور کہا "میرے اور بھی بیٹے ہیں جو جوان ہیں۔ یہاں سب سے چھوٹا ہے، اس کے حق میں دعا فرمائیے"۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ تجھ پر برکت نازل کرے۔"

ذیال کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ حنظلہ کے پاس کسی ایسے آدمی کو لایا جاتا جس کا چہرہ سوجا ہوا ہوتا یا کسی جانور کو لایا جاتا جس کے تھن متورم ہوتے تو حنظلہ اپنے ہاتھوں پر تھتکارتے اور کہتے "بسم اللہ" پھر اپنا ہاتھ اپنے سر پر اس جگہ رکھتے جہاں حضورؐ نے اپنا دست مبارک رکھا تھا۔ پھر اپنے ہاتھ کو اس متورم جگہ پر پھیرتے تو ورم دور ہو جاتا۔

امِّ ولد کو فروخت کرنے کی ممانعت

دارقطنی[1] نے اپنی سند کے ساتھ خوات بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے اسے وصیت کی۔ اس نے

---

[1] دارقطنی (۴-۴۳ ۱۳۴) اس کی سند میں رشدین بن سعد المہری ابوالحجاج مصری ہے۔ ابوزرعہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں یہ منکر الحدیث اور غفلت کا عادی ہے۔ یہ ثقہ راویوں کے نام سے منکر احادیث روایت کرتا ہے۔ سیوطی نے اس حدیث کو الجامع الصغیر میں روایت کیا اور اشارہ کیا ہے کہ یہ ضعیف حدیث ہے۔ سیوطی نے اس کو المعجم الکبیر للطبرانی کی طرف منسوب کیا ہے، مگر سعید بن ابی مریم اور عبداللہ بن محمد بن اسحاق الفہمی البیطاری دونوں نے رشدین بن سعد کی تائید میں ابن لہیعہ سے ایک دوسری روایت نقل کی ہے، لیکن ابن لہیعہ ضعیف راوی ہے اور اس کی روایت کردہ حدیث حسن کے درجہ کی ہے۔ سعید بن ابی مریم کا نام و نسب سعید بن الحکم بن محمد بن سالم بن ابی مریم ابو محمد الجمحی ہے۔ البتہ "ولاء" کے تعلق کی وجہ سے "الجمحی" کہا جاتا تھا۔ یہ دسویں طبقے کا ثقہ اور فقیہ راوی ہے۔ (التقریب ۱-۲۹۴)

بخاری نے "التاریخ الصغیر" (ص ۲۲۹) میں اس کا تعارف درج کیا ہے مگر نقد و جرح نہیں کی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سیوطی اس سند سے آگاہ نہیں ہیں۔

فقہ الحدیث | المناوی شارح "الجامع الصغیر" لکھتے ہیں:

"ام ولد کو فروخت کرنا جائز نہیں۔ عہدِ رسالت میں پہلے ام ولد کو فروخت کیا جاتا تھا۔ پھر یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔ خلافتِ صدیقی

ایک اُمّ ولد اور ایک آزاد بیوہ پیچھے چھوڑی تھی۔ اُمّ ولد اور اس آزاد عورت کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تو اس نے اُمّ ولد کو پیغام بھیجا کہ میں تجھے فروخت کر کے رہوں گی۔ حوّات نے یہ ماجرا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بیان کیا۔ آپ نے فرمایا اس کو فروخت نہیں کیا جائے گا، پھر آپ نے اس کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔

(بقیہ حاشیہ)

میں بھی منسوخ ہونے کو زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب نسخ کا چرچا ہوا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُمّ ولد کو فروخت کرنے سے منع کر دیا تو جو اہلِ علم اس کو جائز تصور کرتے تھے انھوں نے بھی اپنے مسلک سے رجوع کر لیا۔ اگر انھیں اس بات کا علم ہوتا کہ حضرت عمرؓ اپنی رائے سے یہ فتویٰ دے رہے ہیں تو وہ ان سے اختلاف کرتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات صحیح نہیں کہ انھوں نے اُمّ ولد کو فروخت کرنے کا حکم دیا یا فیصلہ کیا تھا۔ اس ضمن میں آخری بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مسئلے میں متردد تھے اور انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں قاضی شریح کو حکم دیا تھا کہ اس ضمن میں جو فتویٰ آپ دیا کرتے تھے وہی دیا کریں تاکہ لوگوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو۔"

والحمد للہ رب العالمین۔

فهرس المراجع والمصادر

١- التفسير

١- أحكام القرآن: لابن العربي (أبي بكر محمد بن عبد الله المعروف بابن العربي) المتوفى سنة ٥٤٣هـ ـ مطبعة الحلبي بالقاهرة - ١٣٨٧هـ.

٢- أحكام القرآن: للجصاص (أبي بكر احمد بن على الحنفي الجصاص) المتوفى سنة ٣٧٠هـ ـ مطبعة الاوقاف الاسلامية - ١٣٣٥هـ.

٣- أحكام القرآن: للشافعي (أبي عبد الله محمد بن إدريس الشافعي الإمام) المتوفى سنة ٢٠٤هـ ـ مطبعة دار الكتب العلمية ببيروت - ١٣٩٥هـ.

٤- أنوار التنزيل وأسرار التأويل: للبيضاوي (ناصر الدين عبد الله بن محمد الشيرازي البيضاوي) المتوفى سنة ٧٩١هـ ـ مطبعة مكتبة الجمهورية بالقاهرة.

٥- البحر المحيط: لابن حيان (محمد بن يوسف بن على بن يوسف بن حيان) المتوفى سنة ٧٥٤هـ ـ مطبعة السعادة بالقاهرة - الطبعة الأولى - ١٣٢٨هـ.

٦- تفسير ابن كثير: لابن كثير (عماد الدين اسماعيل بن كثير الدمشقي) المتوفى سنة ٧٧٤هـ ـ مطبعة فجالة الجديدة القاهرة - ١٣٨٤هـ.

٧- تفسير فتح القدير: للشوكاني (محمد بن على بن محمد بن عبد الله الشوكاني) المتوفى سنة ١٢٥٠هـ ـ مطبعة الحلبي بالقاهرة - ١٣٨٣هـ.

٨- تفسير المنار: رشيد رضا (السيد محمد رشيد رضا) المتوفى سنة ١٣٥٤هـ ـ مطبعة دار المعارف ببيروت.

٩- الجامع لأحكام القرآن: للقرطبي (محمد بن احمد الانصاري القرطبي) المتوفى سنة ٦٧١هـ ـ مطبعة دار الكتب المصرية بالقاهرة - ١٣٥٣هـ.

١٠- جامع البيان في تفسير القرآن: للطبري (محمد بن جرير الطبري) المتوفى سنة ٣١٠هـ ـ مطبعة الحلبي بالقاهرة - ١٣٧٣هـ.

۱۱۔ الدر المنثور فی تفسیر بالمأثور: للسیوطی (جلال الدین عبد الرحمٰن السیوطی) المتوفی سنة ۹۱۱ھ ـــــ المطبعة الیمنیة بالقاهرة۔ ۱۳۱۴ھ۔

۱۲۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی: للآلوسی (محمود الآلوسی البغدادی) المتوفی سنة ۱۲۷۰ھ ـــــ دار احیاء التراث العربی بیروت۔

۱۳۔ الکشاف عن وجوہ التنزیل وعیون الأقاویل فی وجوہ التأویل: للزمخشری (محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی) المتوفی سنة ۵۳۸ھ ـــــ مطبعة الحلبی بالقاهرة۔ ۱۳۸۵ھ۔

۱۴۔ معانی القرآن وإعرابه: للزجاج (ابراهیم بن السری بن سهل الزجاج) المتوفی سنة ۳۱۱ھ ـــــ المطابع الامیریه بالقاهرة۔

۱۵۔ معانی القرآن: للفراء (یحیٰی بن زیاد الفراء) المتوفی سنة ۲۰۷ھ ـــــ مطبعة دار الکتب المصریة۔ ۱۳۷۴ھ

۱۶۔ مفاتیح الغیب الشهیر بالتفسیر الکبیر: للرازی (فخر الدین محمد بن عمر الرازی) المتوفی سنة ۶۰۶ھ ـــــ المطبعة البهیة بالقاهرة۔

۱۷۔ الناسخ والمنسوخ: لابن سلامة (هبة الله بن سلامة) المتوفی سنة ۴۱۰ھ ـــــ مطبعة الحلبی بالقاهرة۔ ۱۳۸۷ھ۔

۱۸۔ الناسخ والمنسوخ: للنحاس (محمد بن احمد بن اسماعیل النحاس) المتوفی سنة ۳۳۸ھ ـــــ مطبعة المکتبة الاعلامیه بالقاهرة۔ ۱۳۵۷ھ۔

(۲) الحدیث ومصطلحاته

۱۔ الآثار: للشیبانی (محمد بن الحسن الشیبانی صاحب ابی حنیفة) المتوفی سنة ۱۸۹ھ ـــــ المطبع الاسلامی بدلهی۔ ۱۹۱۱م۔

۲۔ الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة: للقاری (نور الدین علی بن محمد بن سلطان المشهور بملا علی قاری) المتوفی ۱۰۱۴ھ ـــــ مطابع دار القلم بیروت۔ ۱۳۹۱ھ۔

۳۔ الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار: للحازمی (محمد بن یوسف الحازمی الهمدانی) المتوفی سنة ۵۸۴ھ ـــــ مطبعة الاندلس بحمص۔ ۱۳۸۶ھ۔

۴۔ الالمام باحادیث الأحکام: لابن دقیق العید (القاضی تقی الدین أبو الفتح محمد بن علی) المتوفی ۷۰۲ھ ـــــ دار الثقافة الاسلامیة بالریاض۔ الطبعة الاولٰی۔ ۱۳۸۳ھ۔

۵۔ الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث: لابن کثیر (عماد الدین اسماعیل بن کثیر الدمشقی)

المتوفی سنۃ ۲۷۹ھ بتعلیق احمد شاکر ـــ الطبعۃ الثالثۃ بالقاھرہ۔

۶۔ بلوغ المرام فی أدلۃ الأحکام: للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنۃ ۸۵۲ھ ـــ مطبعۃ طارق اکیڈمی بپاکستان۔ ۱۳۹۵ھ۔

۷۔ بین الامامین مسلم والدارقطنی: للھادی (الشیخ ربیع بن ھادی) رسالۃ مقدمۃ لنیل درجۃ الماجستیر بجامعۃ الملک عبد العزیز۔ مکۃ المکرمۃ۔

۸۔ تأویل مختلف الاحادیث: لابن قتیبۃ (عبد اللہ بن مسلم بن قتیبۃ) المتوفی سنۃ ۲۷۶ھ ـــ مطبعۃ دار الجلیل ببیروت۔ ۱۳۹۳ھ۔

۹۔ تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی: للمبارکفوری (عبد الرحمن بن عبد الرحیم المبارکفوری) المتوفی سنۃ ۱۳۵۳ھ ـــ مطبعۃ المدنی۔ الطبعۃ الثانیۃ بالقاھرۃ۔ ۱۳۸۳ھ

۱۰۔ تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف: للمزی (یوسف بن الزکی عبد الرحمن بن یوسف المزی) المتوفی سنۃ ۷۴۲ھ ـــ مطبعۃ الدار القیمۃ۔ الطبعۃ الاولی۔ بمبای۔ ۱۳۸۴ھ۔

۱۱۔ تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی: للسیوطی (جلال الدین بن عبد الرحمن السیوطی) المتوفی سنۃ ۹۱۱ھ ـــ الطبعۃ الاولیٰ بالمدینۃ المنورۃ۔ ۱۳۷۸ھ۔

۱۲۔ الترغیب والترھیب من الحدیث الشریف: للمنذری (محمد ذکی الدین عبد العظیم المنذری) المتوفی سنۃ ۶۵۶ھ ـــ مطبعۃ السعادۃ۔ الطبعۃ الأولی بالقاھرہ۔ ۱۳۷۹ھ۔

۱۳۔ التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر: للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنۃ ۸۵۲ھ ـــ مطبعۃ الطباعۃ الفنیۃ بالقاھرۃ۔ ۱۳۸۴ھ

۱۴۔ التمھید لما فی الموطا من المعانی والاسانید: لابن عبد البر (یوسف بن عبد اللہ) المتوفی سنۃ ۴۶۳ھ ـــ مطبعۃ وزارۃ الاوقاف المغربیۃ۔

۱۵۔ تنویر الحوالک شرح موطأ الامام مالک: للسیوطی (جلال الدین عبد الرحمن السیوطی) المتوفی ۹۱۱ھ ـــ مطبعۃ المکتبۃ التجاریۃ بالقاھرۃ۔

۱۶۔ جامع الاصول من احادیث الرسول: لابن الاثیر (مبارک بن محمد بن الاثیر) المتوفی سنۃ ۶۰۶ھ ـــ مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ۔ الطبعۃ الاولی بالقاھرہ۔ ۱۳۶۸ھ۔

۱۷۔ الجوھر النقی (مع سنن البیھقی): لابن الترکمانی (علاء الدین بن علی بن عثمان) المتوفی سنۃ ۷۴۵ھ ـــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد۔ ۱۳۴۴ھ۔

۱۸۔ الخصائص الکبریٰ: للسیوطی (جلال الدین عبد الرحمن السیوطی) المتوفی سنۃ ۹۱۱ھ ـــ مطبعۃ دار الکتب الحدیثۃ بالقاھرۃ۔ ۱۳۸۷ھ۔

۱۹۔ الدرایة فی تخریج الهدایة : للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنة ۸۵۲ھ ـــــ مطبعة الفجالة الجدیدة بالقاهرة ۔ ۱۳۸۴ھ۔

۲۰۔ دلائل النبوة : للبیهقی (احمد بن الحسین بن علی البیهقی) المتوفی سنة ۴۵۸ھ ـــــ دارالنصر للطباعة بالقاهرة ۔ الطبعة الاولی ۔ ۱۳۸۹ھ۔

۲۱۔ رموز الاحادیث : للکمشخانوی (احمد ضیاء الدین الکمشخانوی) المتوفی سنة ۱۳۱۱ھ ـــــ مطبعة قشلة بآستانة ۔ ۱۳۷۵ھ۔

۲۲۔ الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل : للکهنوی (محمد عبدالحی اللکهنوی) المتوفی سنة ۱۳۰۴ھ تحقیق عبدالفتاح ابوغدة ـــــ مطبعة مکتب المطبوعات الاسلامیه بحلب ۔

۲۳۔ سبل السلام شرح بلوغ المرام : للصنعانی (محمد بن اسماعیل الصنعانی) المتوفی سنة ۱۱۸۲ھ ـــــ مطبعة الحلبی ۔ الطبعة الرابعة بالقاهرة ۔ ۱۳۷۹ھ۔

۲۴۔ سنن ابن ماجة : لابن ماجة (محمد بن یزید القزوینی) المتوفی سنة ۲۷۳ھ ۔ تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی ـــــ مطبعة الحلبی بالقاهرة ۔

۲۵۔ سنن ابی داؤد : لأبی داؤد (سلیمان بن الاشعث السجستانی) المتوفی سنة ۲۷۵ھ ـــــ دار احیاء السنة النبویة بالقاهرة ۔

۲۶۔ سنن الترمذی : للترمذی (محمد بن عیسی بن سورة الترمذی) المتوفی سنة ۲۷۹ھ تحقیق احمد شاکر و محمد فؤاد عبدالباقی و ابراهیم عطوة عوض ـــــ المکتبة الاسلامیه ۔

۲۷۔ سنن الدارقطنی : للدارقطنی (علی بن عمر بن مهدی الدارقطنی) المتوفی سنة ۳۸۵ھ ـــــ مطبعة دار المحاسن بالقاهرة ۔

۲۸۔ سنن الدارمی : للدارمی (عبدالله بن عبدالرحمن الدارمی) المتوفی سنة ۲۵۵ھ ـــــ دار احیاء السنة النبویة بالقاهرة ۔

۲۹۔ السنن الکبری : للبیهقی (احمد بن الحسین بن علی البیهقی) المتوفی سنة ۴۵۸ھ ـــــ مطبعة دائرة المعارف النظامیه بحیدرآباد ۔ ۱۳۴۴ھ

۳۰۔ السنن الکبری : للنسائی (احمد بن شعیب بن دینار النسائی) المتوفی سنة ۳۰۳ھ ۔ تحقیق عبدالصمد شرف الدین ـــــ مطبعة الدار القیمة ۔ بمبائی ۔ ۱۳۹۱ھ

۳۱۔ سنن النسائی (المجتبی) للنسائی (احمد بن شعیب بن دینار النسائی) المتوفی سنة ۳۰۳ھ ـــــ مطابع الشرکة العامة بالقاهرة ۔ ۱۳۴۸ھ ۔

۳۲۔ شرح السنة : للبغوی (الحسین بن مسعود الفراء البغوی) المتوفی سنة ۵۱۶ھ تحقیق شعیب الارناؤط

وزهير الشاويش ـــ المكتب الاسلامى بيروت - ۱۳۹۱ھ -

۳۳ - **شرح مسلم** : للنووى (يحيى بن شرف بن مرى الحزامى النووى) المتوفى سنة ۶۷۶ھ ـــ المطبعة المصرية بالقاهرة - ۱۳۴۹ھ -

۳۴ - **شرح معانى الآثار** : للطحاوى : (احمد بن محمد بن سلامة الطحاوى) المتوفى سنة ۳۲۱ھ ـــ مطبعة الانوار المحمدية بالقاهرة -

۳۵ - **شرح المواهب اللدنيه** : للزرقانى (محمد بن عبد الباقى الزرقانى) المتوفى سنة ۱۱۲۲ھ - ـــ المطبعة الازهريه بالقاهرة - ۱۳۲۵ھ -

۳۶ - **شرح الموطأ** : للزرقانى (محمد بن عبد الباقى الزرقانى) المتوفى سنة ۱۱۲۲ھ - ـــ مطبعة الحلبى - الطبعة الاولى بالقاهرة - ۱۳۸۱ھ -

۳۷ - **صحيح البخارى (مع فتح البارى)** للبخارى (محمد بن اسماعيل البخارى) المتوفى سنة ۲۵۶ھ ـــ المطبعة السلفية بالقاهرة - ۱۳۸۰ھ -

۳۸ - **صحيح مسلم** : لمسلم (مسلم بن الحجاج بن مسلم القشيرى) المتوفى سنة ۲۶۱ھ - تحقيق محمد فؤاد عبد الباقى ـــ مطبعة دار احياء التراث العربى بيروت - ۱۳۷۴ھ

۳۹ - **عقود الجواهر المنيفة فى ادلة مذهب الامام ابى حنيفة** : للزبيدى (السيد محمد مرتضى الزبيدى) المتوفى سنة ۱۲۰۵ھ ـــ مطبعة الشبكشى بالازهر القاهرة -

۴۰ - **علل الحديث** : لابن ابى حاتم (عبد الرحمٰن بن ابى حاتم محمد بن ادريس) المتوفى سنة ۳۲۷ھ ـــ المطبعة السلفية بالقاهرة - ۱۳۴۴ھ -

۴۱ - **علوم الحديث** : لابن الصلاح (عثمان بن عبد الرحمٰن الشهرزورى) المتوفى سنة ۶۴۳ھ - تحقيق الدكتور نور الدين عتر ـــ طبعة المدينة المنورة - ۱۳۸۶ھ -

۴۲ - **عمدة القارى شرح صحيح البخارى** : للعينى (بدر الدين ابو محمد محمود بن احمد العينى) المتوفى سنة ۸۵۵ھ ـــ المطبعة العامرة بالقاهرة - ۱۳۰۸ھ -

۴۳ - **عون المعبود شرح سنن ابى داؤد** : للعظيم آبادى (محمد شمس الحق ابو الطيب العظيم آبادى) المتوفى سنة ۱۳۲۹ھ ـــ المكتبة السلفيه بالمدينة المنورة الطبعة الثانية - ۱۳۸۸ھ -

۴۴ - **فتح البارى شرح صحيح البخارى** : للحافظ احمد بن على بن محمد بن حجر العسقلانى المتوفى سنة ۸۵۲ھ ـــ المطبعة السلفية بالقاهرة - ۱۳۸۰ھ -

۴۵ - **الفتح الربانى لترتيب مسند احمد بن حنبل الشيبانى** : للساعاتى (احمد عبد الرحمٰن البنا الساعاتى) ـــ مطبعة الاخوان المسلمين بالقاهرة - ۱۳۵۹ھ -

۴۶- فیض القدیر شرح الجامع فی احادیث البشیر النذیر: للمناوی (محمد عبد الرؤوف المناوی) المتوفی ۱۰۳۱ھ ـــ مطبعۃ دار المعرفۃ ببیروت ۱۳۹۱ھ

۴۷- الکفایۃ فی علم الروایۃ: للخطیب (احمد بن علی بن ثابت المعروف بالخطیب) المتوفی سنۃ ۴۶۳ھ ـــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیہ بحیدرآباد ۱۳۵۷ھ۔

۴۸- کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال: للمتقی الهندی (علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین) المتوفی سنۃ ۹۷۵ھ ـــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۱۲ھ۔

۴۹- مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: للهیثمی (نور الدین علی بن ابی بکر الهیثمی) المتوفی سنۃ ۸۰۷ھ ـــ دار الکتب ببیروت ـ الطبعۃ الثانیۃ ـ ۱۹۶۷م۔

۵۰- المراسیل: لابی داؤد (سلیمان بن الاشعث السجستانی) المتوفی سنۃ ۲۷۵ھ ـــ المطبعۃ العلمیۃ ـ الطبعۃ الاولی بالقاهرۃ ۱۳۱۰ھ۔

۵۱- مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح: للقاری (علی بن سلطان محمد القاری) المتوفی سنۃ ۱۰۱۴ھ ـــ المطبعۃ المیمنیۃ بالقاهرۃ ۱۳۰۶ھ۔

۵۲- مختصر سنن ابی داؤد ـ للمنذری: (محمد زکی الدین عبد العظیم المنذری) المتوفی سنۃ ۶۵۶ھ ـــ مطبعۃ انصار السنۃ المحمدیہ بالقاهرۃ ۱۳۶۷ھ۔

۵۳- المستدرک علی الصحیحین فی الحدیث: للحاکم (محمد بن عبد اللہ المعروف بالحاکم) المتوفی سنۃ ۴۰۵ھ ـــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۳۴ھ۔

۵۴- المستفاد من مبهمات المتن والاسناد: للعراقی (ولی الدین احمد بن زین الدین عبد الرحیم) المتوفی سنۃ ۸۰۶ھ ـــ مطابع الریاض

۵۵- مسند ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ: للمروزی (احمد بن علی بن سعید الاموی المروزی) المتوفی سنۃ ۲۹۲ھ ـــ من مطبوعات المکتب الاسلامی ببیروت۔

۵۶- مسند ابی داؤد: للطیالسی (سلیمان بن داؤد بن الجارود) المتوفی سنۃ ۲۰۴ھ ـــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ۔

۵۷- مسند احمد بن حنبل: للامام احمد (احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی) المتوفی سنۃ ۲۴۱ھ ـــ المطبعۃ المیمنیۃ بالقاهرۃ ۱۳۱۳ھ

۵۸- مسند احمد: شرح احمد محمد شاکر المتوفی سنۃ ۱۳۷۷ھ ـــ منشورات دار المعارف بالقاهرۃ ۱۹۵۴م

۵۹- مسند الحمیدی: للحمیدی (عبد اللہ بن الزبیر الحمیدی) المتوفی سنۃ ۲۱۹ھ ـــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۸۲ھ۔

۶۰۔ مسند الشافعی : للسندی (محمد عابد السندی) المتوفی سنة ۱۲۵۷ھ ــــ مطبعة السعادة بالقاهرة۔ ۱۹۵۱م

۶۱۔ مشکل الآثار : للطحاوی (احمد بن محمد بن سلامة المعروف بالطحاوی) المتوفی سنة ۳۲۱ھ ــــ مطبعة دائرۃ المعارف العثمانیه بحیدرآباد ۔ ۱۳۳۳ھ۔

۶۲۔ منحة المعبود ترتیب مسند ابی داؤد : للساعاتی (الشیخ احمد عبد الرحمان البنا الساعاتی) ــــ المطبعة المنیریه بالازهر بالقاهرہ ۔ ۱۳۷۲ھ۔

۶۳۔ مصنف ابن ابی شیبة : (عبد الله بن محمد بن ابی شیبة العبسی مولاهم الکوفی) المتوفی سنة ۲۳۵ھ ــــ المطبعة العزیزیه بحیدرآباد ۔ ۱۳۸۶ھ۔

۶۴۔ مصنف عبد الرزاق : للصنعانی (عبد الرزاق بن همام الصنعانی) المتوفی سنة ۲۱۱ھ۔ ــــ المجلس العلمی الهندی ببیروت ۔ الطبعة الاولی ۔ ۱۳۹۰ھ۔

۶۵۔ المطالب العالیه بزوائد المسانید الثمانیة : للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنة ۸۵۲ھ ــــ المطبعة العصریة بالکویت ۔ الطبعة الاولی ۔ ۱۳۹۰ھ۔

۶۶۔ معالم السنن (مع مختصر المنذری) للخطابی (احمد بن محمد بن ابراهیم بن خطاب) المتوفی سنة ۳۸۸ھ ــــ مطبعة انصار السنة المحمدیة بالقاهرة ۔ ۱۳۶۷ھ۔

۶۷۔ مقدمه اوجز المسالك الی موطأ الامام مالك ۔ للکاندلوی (الشیخ محمد زکریا الکاندلوی الهندی) ــــ مطبعة ندوة العلما لکهنؤ ۔ الطبعة الثالثة ۔

۶۸۔ المنتقی شرح الموطأ : للباجی (سلیمان بن خلف الباجی) المتوفی سنة ۴۷۱ھ ــــ مطبعة السعادة بالقاهرة ۔ ۱۳۳۲ھ۔

۶۹۔ المنتقی من السنن المسندة : لابن الجارود (عبد الله بن علی بن الجارود النیسابوری) المتوفی سنة ۳۰۷ھ ــــ مطبعة الفجالة الجدیدة بالقاهرة ۔ ۱۳۸۳ھ۔

۷۰۔ موارد الظمآن إلی زوائد ابن حبان : للهیثمی (نور الدین علی بن ابی بکر الهیثمی) المتوفی سنة ۸۰۷ھ ــــ المطبعة السلفیة بالقاهرة ۔

۷۱۔ الموضوعات : لابن الجوزی (ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی) المتوفی سنة ۵۹۷ھ ــــ مطبعة المجد بالقاهرة ۔ الطبعة الاولی ۔ ۱۳۸۶ھ۔

۷۲۔ موطأ الامام مالك (مع تنویر الحوالك) للامام مالك (مالك بن انس بن مالك بن انس) المتوفی سنة ۱۷۹ھ۔

۷۳۔ موطأ الامام مالك : بروایة الامام محمد بن الحسن الشیبانی المتوفی سنة ۱۸۹ھ۔

من مطبوعات المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیۃ بالقاهرة۔

۷۴۔ نصب الرایۃ لاحادیث الهدایۃ: للزیلعی (جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف) المتوفی سنۃ ۷۶۲ھ — من مطبوعات المجلس العلمی الهندی بمصر۔ الطبعۃ الثانیۃ۔ ۱۳۹۳ھ۔

۷۵۔ نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار: للشوکانی (محمد بن علی بن محمد الشوکانی) المتوفی سنۃ ۱۲۵۰ھ۔ مطبعۃ الحلبی بالقاهرة۔

۳۔ رجال الحدیث ورواتہ

۱۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب رضی اللہ عنهم (مع الاصابۃ): لابن عبدالبر (یوسف بن عبداللہ المعروف بابن عبدالبر) المتوفی سنۃ ۴۶۳ھ — مطبعۃ السعادۃ بالقاهرة۔ ۱۳۲۸ھ۔

۲۔ اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ رضی اللہ عنهم: لابن الاثیر (علی بن عبدالکریم الجزری المعروف بابن الاثیر) المتوفی سنۃ ۶۳۰ھ — المطبعۃ الوهبیۃ بالقاهرة۔ ۱۲۸۰ھ۔

۳۔ اسعاف المبطأ برجال الموطأ (مع تنویر الحوالک): للسیوطی (جلال الدین عبدالرحمن السیوطی) المتوفی سنۃ ۹۱۱ھ — مطبعۃ المکتبۃ التجاریۃ بالقاهرة۔

۴۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ رضی اللہ عنهم: للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنۃ ۸۵۲ھ — مطبعۃ السعادۃ بالقاهرة۔ ۱۳۲۸ھ۔

۵۔ الاکمال فی رفع الارتیاب عن المؤتلف من الأسماء والکنی والانساب: لابن ماکولا (علی بن هبۃ اللہ الشهیر بابن ماکولا) المتوفی سنۃ ۴۷۵ھ — مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد۔ ۱۳۸۱ھ۔

۶۔ التاریخ الصغیر: للبخاری (محمد بن اسماعیل البخاری) المتوفی سنۃ ۲۵۶ھ۔ — مطبعۃ المکتبۃ الأثریۃ بپاکستان۔

۷۔ تجرید اسماء الصحابۃ رضی اللہ عنهم: للذهبی (محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز الذهبی) المتوفی سنۃ ۷۴۸ھ — مطبعۃ الدار القیمۃ۔ بمبای۔ ۱۳۸۹ھ۔

۸۔ الجمع بین کتابی ابی نصر الکلاباذی وابی بکر الاصبهانی فی رجال البخاری ومسلم: للمقدسی (محمد بن طاهر بن علی المقدسی) المتوفی سنۃ ۵۰۷ھ — مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ بحیدرآباد۔ ۱۳۲۳ھ۔

۹۔ تذکرۃ الحفاظ: للذهبی (محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز الذهبی) المتوفی سنۃ ۷۴۸ھ — من منشورات دار احیاء التراث العربی ببیروت۔ ۱۳۷۴ھ۔

۱۰۔ تقریب التهذیب: للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنۃ ۸۵۲ھ

ــــ مطابع دار الکتاب العربی بالقاہرۃ ـ ۱۳۸۰ھ۔

۱۱۔ تہذیب التہذیب: للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنۃ ۸۵۲ھ ــــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ـ ۱۳۲۵ھ۔

۱۲۔ تہذیب الکمال: للمزی (یوسف بن الزکی عبد الرحمٰن بن یوسف المزی) المتوفی سنۃ ۷۴۲ھ ــــ المصور۔

۱۳۔ الجرح والتعدیل: لابن ابی حاتم (عبد الرحمٰن بن ابی حاتم محمد بن ادریس) المتوفی سنۃ ۳۲۷ھ ــــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ ـ الطبعۃ الاولیٰ بحیدرآباد ـ ۱۳۸۱ھ۔

۱۴۔ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال: للخزرجی (صفی الدین احمد بن عبد اللہ الخزرجی) المتوفی سنۃ ۹۲۳ھ ــــ من منشورات مکتب المطبوعات الاسلامیہ بحلب ـ ۱۳۹۱ھ۔

۱۵۔ دیوان الضعفاء والمتروکین: للذہبی (محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز الذہبی) المتوفی سنۃ ۷۴۸ھ ــــ من منشورات مکتبہ النہضۃ الحدیثۃ بمکۃ المکرمۃ ـ ۱۳۸۷ھ۔

۱۶۔ الضعفاء والمتروکون (مع التاریخ الصغیر للبخاری) للنسائی (احمد بن شعیب بن دینار النسائی) المتوفی سنۃ ۳۰۳ھ ــــ المکتبۃ الاثریۃ بپاکستان۔

۱۷۔ کتاب الضعفاء الصغیر (مع التاریخ الصغیر لہ): للبخاری (محمد بن اسماعیل البخاری) المتوفی ۲۵۶ھ ــــ المکتبۃ الاثریۃ بپاکستان۔

۱۸۔ الکاشف: للذہبی (محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز الذہبی) المتوفی سنۃ ۷۴۸ھ۔ ــــ مطبعۃ دار التألیف بالقاہرۃ۔

۱۹۔ لسان المیزان: للحافظ (احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی) المتوفی سنۃ ۸۵۲ھ ــــ مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ بحیدرآباد ـ ۱۳۳۱ھ۔

۲۰۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال: للذہبی (محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز الذہبی) المتوفی سنۃ ۷۴۸ھ ــــ مطبعۃ الحلبی ـ الطبعۃ الاولیٰ ـ ۱۳۸۲ھ۔

(۴) الفقہ واصولہ

۱۔ آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی (الفقہ المقارن): للزحیلی (الدکتور وہبہ الزحیلی) ــــ المطبعۃ العلمیۃ بدمشق ــــ الطبعۃ الثانیۃ ـ ۱۳۸۵ھ۔

۲۔ ادب القاضی (الفقہ الشافعی): للماوردی (علی بن محمد بن حبیب ابو الحسن الماوردی) المتوفی سنۃ ۴۵۰ھ ـ تحقیق محیی ہلال السرحان ــــ مطبعۃ العانی ببغداد ـ ۱۳۹۲ھ۔

۳۔ الاحکام السلطانیہ : لابی یعلی (محمد بن الحسین ابی یعلی الفراء) المتوفی سنۃ ۴۵۸ھ۔
ــــ مطبعۃ الحلبی ۔ الطبعۃ الثانیۃ بالقاھرۃ ۔ ۱۳۸۶ھ ۔

۴۔ الاحکام السلطانیۃ (الفقہ الشافعی) : للماوردی (علی بن محمد بن حبیب ابوالحسن الماوردی) المتوفی سنۃ ۴۵۰ھ ــــ مطبعۃ الحلبی ۔ الطبعۃ الثانیۃ بالقاھرۃ ۔ ۱۳۸۶ھ۔

۵۔ احکام الاوقاف (الفقہ الحنفی) : للخصاف (احمد بن عمرو ابی بکر الشیبانی) المتوفی سنۃ ۲۶۱ھ ــــ مطبعۃ الاوقاف المصریۃ بالقاھرۃ ۔ ۱۳۲۲ھ۔

۶۔ احکام اھل الذمۃ (الفقہ الحنبلی) : لابن القیم (محمد بن ابی بکر شمس الدین) المتوفی سنۃ ۷۵۱ھ ۔ تحقیق الدکتور صبحی صالح ــــ مطبعۃ جامعۃ دمشق ۔ الطبعۃ الاولی ۔ ۱۳۸۱ھ۔

۷۔ الاحکام فی اصول الاحکام (الظاھری) لابن حزم (محمد بن علی بن محمد بن حزم) المتوفی سنۃ ۴۵۶ھ ــــ مطبعۃ العاصمۃ بالقاھرۃ ۔

۸۔ الاحکام فی اصول الاحکام (الحنبلی) للآمدی (سیف الدین ابوالحسن علی بن ابوعلی) المتوفی سنۃ ۶۳۱ھ ــــ مطبعۃ النور بالریاض ۔ الطبعۃ الاولیٰ ۔ ۱۳۸۷ھ۔

۹۔ اختلاف الفقہاء (الفقہ المقارن) للطبری (محمد بن جریر الطبری، ابوجعفر) المتوفی سنۃ ۳۱۰ھ ــــ طبع لیدن ۔ ۱۹۳۳م باھتمام الدکتور یوسف شاخت ۔

۱۰۔ اختلاف الفقہاء (الفقہ الحنفی) للطحاوی (احمد بن سلامۃ الطحاوی) المتوفی سنۃ ۳۲۱ھ تحقیق الدکتور محمد صغیر حسن المعصومی ــــ مطبعۃ معھد الدراسات الاسلامیۃ باسلام آباد۔

۱۱۔ اعلام الموقعین عن رب العلمین (الفقہ الحنبلی) لابن القیم (محمد بن ابی بکر شمس الدین) المتوفی سنۃ ۷۵۱ھ ــــ مطبعۃ دار الجیل ببیروت ۔ ۱۹۷۳م ۔

۱۲۔ الاقناع (الفقہ الحنبلی) للمقدسی (شرف الدین موسی الحجاوی المقدسی) المتوفی سنۃ ۹۶۸ھ ــــ المطبعۃ المصریۃ بالازھر ۔ ۱۳۵۱ھ ۔

۱۳۔ الأم (الفقہ الشافعی) للشافعی (ابی عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی الامام) المتوفی سنۃ ۲۰۴ھ ــــ الطبعۃ الثانیۃ ببیروت ۔ ۱۳۹۳ھ۔

۱۴۔ الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف علی مذھب الامام احمد بن حنبل (الفقہ الحنبلی للمرداوی) : علاء الدین ابوالحسن علی بن سلیمان المرداوی) المتوفی سنۃ ۸۸۵ھ ــــ المطبعۃ المحمدیۃ بالقاھرۃ ۔ المطبعۃ الاولی ۔ ۱۳۷۳ھ ۔

۱۵۔ انوار البروق فی انواع الفروق (الفقہ المالکی) : للقرافی (شھاب الدین ابوالعباس احمد بن ادریس) المتوفی سنۃ ۶۸۴ھ ــــ دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر ببیروت ۔

۱۶- الاموال (فقہ السنۃ): لابی عبید (القاسم بن سلام ابوعبید البغدادی الفقیہ) المتوفی سنۃ ۲۲۴ھ۔ تحقیق د۔ محمد خلیل هراس ــــ مطبعۃ دار الشروق ۔ الطبعۃ الاولی ۔ ۱۳۸۸ھ۔

۱۷- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (الفقہ الحنفی): للکاسانی (علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی) المتوفی سنۃ ۵۸۷ھ ــــ مطبعۃ شرکۃ المطبوعات بالقاھرۃ۔ الطبعۃ الاولی ۔ ۱۳۸۸ھ۔

۱۸- بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد (الفقہ المالکی): لابن رشد (محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن رشد) المتوفی سنۃ ۵۹۵ھ ــــ دار الفکر بیروت۔

۱۹- تبصرۃ الحکام فی اصول الاقضیۃ و مناھج الاحکام (الفقہ المالکی): لابن فرحون (محمد بن فرحون الیعمری) المتوفی سنۃ ۷۹۹ھ ــــ مطبعۃ الحلبی بالقاھرۃ ۔ ۱۳۰۲ھ۔

۲۰- تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق (الفقہ الحنفی): للزیلعی (فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی) المتوفی سنۃ ۷۴۳ھ ــــ المطبعۃ الامیریۃ بالقاھرۃ ۔ ۱۳۱۳ھ۔

۲۱- تحفۃ الفقہاء (الفقہ الحنفی): للسمرقندی (علاء الدین محمد بن احمد بن ابی السمرقندی) المتوفی سنۃ ۵۳۹ھ ــــ مطبعۃ جامعۃ دمشق ۔ ۱۳۷۷ھ۔

۲۲- التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیۃ (الفقہ المقارن): للدکتور عبد العزیز عامر ــــ دار الکتاب العربی بالقاھرۃ ۔ الطبعۃ الثانیۃ ۔ ۱۳۷۵ھ۔

۲۳- الثمر الدانی فی تقریب المعانی، شرح رسالۃ ابن ابی زید القیروانی (الفقہ المالکی): للأزهری (الشیخ صالح عبدالسمیع الآبی الأزهری) ــــ مطبعۃ الحلبی بالقاھرۃ۔

۲۴- حاشیۃ البجیرمی علی منہاج الطلاب المسمی بالتجرید لنفع العبید (الفقہ الشافعی): للبجیرمی (سلیمان بن محمد بن عمر) المتوفی سنۃ ۱۲۲۱ھ ــــ مطبعۃ الحلبی بالقاھرۃ۔

۲۵- حاشیۃ رد المختار (الفقہ الحنفی): لابن عابدین (محمد امین الشہیر بابن عابدین) المتوفی سنۃ ۱۲۵۲ھ ــــ مطبعۃ الحلبی بالقاھرۃ ۔ الطبعۃ الثانیۃ ۔ ۱۳۸۶ھ۔

۲۶- حاشیۃ علی الشرح الکبیر للدردیر (الفقہ المالکی): للدسوقی (محمد بن احمد بن عرفۃ الدسوقی) المتوفی سنۃ ۱۲۳۰ھ ــــ مطبعۃ الحلبی بالقاھرۃ ۔ ۱۳۷۳ھ۔

۲۷- الحجۃ علی اھل المدینۃ (الفقہ الحنفی): للشیبانی (محمد بن الحسن الشیبانی) المتوفی سنۃ ۱۸۹ھ ــــ مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ بحیدرآباد ۔ ۱۳۸۵ھ۔

۲۸- الخراج (الفقہ الحنفی): لأبی یوسف (القاضی ابویوسف یعقوب بن ابراھیم) المتوفی سنۃ ۱۸۲ھ ــــ المطبعۃ السلفیۃ ۔ الطبعۃ الرابعۃ بالقاھرۃ ۔ ۱۳۹۲ھ۔

۲۹- الخراج (الفقه المقارن): ليحيى بن آدم - المتوفى سنة ۲۰۳ ھ - تحقيق احمد محمد شاکر - المطبعة السلفية بالقاهرة - الطبعة الثانية - ۱۳۴۷ھ -

۳۰- الرسالة (الفقه الشافعي): للشافعي (محمد بن ادريس الشافعي الامام) المتوفى سنة ۲۰۴ھ - تحقيق احمد شاکر - مطبعة الحلبي بالقاهرة - ۱۳۵۸ھ -

۳۱- روضة الناظر وجنة المناظر (الحنبلي): للمقدسي (موفق الدين ابو عبد الله محمد بن احمد) المتوفى سنة ۶۲۰ھ -

۳۲- شرح فتح القدير (الفقه الحنفي): لابن الهمام (كمال الدين ابن الهمام محمد) المتوفى سنة ۸۶۱ھ - المطبعة الاميرية بالقاهرة - الطبعة الاولى - ۱۳۱۵ھ -

۳۳- الشرح الكبير على مختصر خليل (الفقه المالكي): للدردير (احمد بن محمد بن احمد العدوی الشهير بالدردير) المتوفى ۱۳۰۹ھ - المطبعة الازهرية بالقاهرة - ۱۳۰۹ھ

۳۴- الشرح الكبير المسمى بالشافي في شرح المقنع (الفقه الحنبلي): للمقدسی (عبدالرحمن بن ابی عمر محمد بن احمد بن قدامه) المتوفى ۶۸۲ ھ - المطبعة السلفية بالقاهرة - ۱۳۴۲ھ -

۳۵- الصارم المسلول على شاتم الرسول (الفقه الحنبلي): لابن تيميه (احمد بن عبد الحليم بن عبد السلام الحرانی) المتوفى سنة ۷۲۸ھ - مطبعة السعادة بالقاهرة - ۱۳۷۹ھ -

۳۶- الطرق الحكمية في السياسة الشرعية (الفقه الحنبلي): لابن قيم الجوزية (محمد بن ابی بکر شمس الدين) المتوفى سنة ۷۵۱ھ - المطبعة المنيرية بالقاهرة - الطبعة الاولى - ۱۳۱۷ھ -

۳۷- العذب الفائض شرح عمدة كل فارض (الفقه الحنبلي): للازهری (صالح بن حسن الازهری الحنبلی) - الطبعة الاولى - ۱۳۳۹ھ -

۳۸- الفتاوى الهندية (الفقه الحنفي): لجماعة من علماء الهند برئاسة عبد الرحمن الحنفی البغدادی - المطبعة الاميرية ببولاق - ۱۳۱۰ھ -

۳۹- قوانين الاحكام الشرعية (الفقه المالكي): للغرناطی (محمد بن احمد بن جزی الغرناطی المالکی) المتوفى سنة ۷۴۱ھ - طبعة دار العلم للملايين ببيروت -

۴۰- الكافي (الفقه الحنبلي): للمقدسی (موفق الدين عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامة) المتوفى ۶۲۰ھ - من مطبوعات المكتب الاسلامی بدمشق -

۴۱- المبسوط (الفقه الحنفي): للسرخسی (محمد بن احمد بن ابی سهل ابو بکر) المتوفى سنة ۴۸۳ھ - مطبعة السعادة بالقاهرة - ۱۳۲۴ھ -

۴۲- المجموع شرح المهذب (الفقه الشافعي): للنووی (محيی الدين يحيى بن شرف الدين

بن مری النووی) المتوفی سنۃ ۶۷۶ھ وتکملۃ المجموع لعلی بن عبد الکافی السبکی المتوفی سنۃ ۷۵۶ھ. والتکملۃ الثانیۃ للمجموع للشیخ محمد نجیب المطیعی — مطبعۃ الامام بالقاھرۃ۔

۴۳- مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ (الفقہ الحنبلی): — مطابع الریاض - ۱۳۸۲ھ۔

۴۴- المحلی (الفقہ الظاھری): لابن حزم (علی بن احمد بن سعید بن حزم) المتوفی سنۃ ۴۵۶ھ — دار الاتحاد العربی للطباعۃ۔ القاھرۃ - ۱۳۹۰ھ۔

۴۵- مختصر الطحاوی (الفقہ الحنفی): للطحاوی (احمد بن محمد بن سلامۃ الطحاوی) المتوفی سنۃ ۳۲۱ھ — مطبعۃ دار الکتاب العربی بالقاھرۃ - ۱۳۷۰ھ۔

۴۶- مختصر المزنی (الفقہ الشافعی) مع الأم: للمزنی (اسماعیل بن یحییٰ بن اسماعیل) المتوفی سنۃ ۲۶۴ھ — طبع بیروت - ۱۳۹۳ھ۔

۴۷- معین الحکام فیما یتردد بین الخصمین من الاحکام (الفقہ الحنفی): للطرابلسی (علی بن خلیل الطرابلسی الحنفی) المتوفی سنۃ ۸۴۴ھ۔ الطبعۃ الاولیٰ - ۱۳۰۰ھ۔

۴۸- المدونۃ الکبریٰ (الفقہ المالکی): لمالک (مالک بن انس بن مالک بن انس) المتوفی سنۃ ۱۷۹ھ (بروایۃ سحنون بن سعید التنوخی) المتوفی سنۃ ۲۴۰ — مطبعۃ السعادۃ بالقاھرۃ - ۱۳۲۳ھ۔

۴۹- المغنی (الفقہ الحنبلی): لابن قدامۃ (موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن محمد) المتوفی سنۃ ۶۲۰ھ — مطبعۃ الامام بالقاھرۃ۔

۵۰- المقدمات الممھدات لبیان ما اقتضتہ رسوم المدونۃ (الفقہ المالکی): لابن رشد (محمد بن احمد بن رشد ابو الولید) المتوفی سنۃ ۵۲۰ھ — مطبعۃ السعادۃ بالقاھرۃ۔

۵۱- منھاج الطالبین وعمدۃ المفتین (الفقہ الشافعی) للنووی (یحیی بن شرف الدین النووی) المتوفی سنۃ ۶۷۶ھ — المطبعۃ الامیریۃ ببولاق۔

۵۲- مواھب الجلیل لشرح مختصر خلیل (الفقہ المالکی): للحطاب (محمد بن محمد المغربی المعروف بالحطاب) المتوفی سنۃ ۹۵۴ھ — مطبعۃ السعادۃ بالقاھرۃ - ۱۳۲۸ھ۔

۵- العقائد

۱- تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری: لابن عساکر (ابو القاسم علی بن الحسن بن ھبۃ اللہ) المتوفی سنۃ ۵۷۱ھ — مطبعۃ التوفیق بدمشق - ۱۳۴۷ھ۔

۲- شرح العقیدۃ الطحاویۃ: للطحاوی (احمد بن محمد بن سلامۃ الازدی) المتوفی سنۃ ۳۲۱ھ

ـــــ من مطبوعات المكتب الاسلامی ببیروت - ۱۳۹۲ھ -

۳- العقیدة والشریعة فی الاسلام : لجولد زھیر - ترجمة الدکتور محمد یوسف موسیٰ

ـــــ دار الکتاب المصریه بالقاھرة - ۱۹۴۲م -

۴- الملل والنحل : للشہرستانی (محمد بن عبد الکریم بن ابی بکر احمد) المتوفی سنة ۵۴۸ھ

ـــــ مطبعة الحلبی بالقاھرة - ۱۳۸۱ھ -

۲- السیرة النبویة والتاریخ العام

۱- الآثار الاندلسیه الباقیة : لعنان (محمد عبد اللہ عنان) ـــــ مطبعة لجنة التألیف والترجمة والنشر بالقاھرة - الطبعة الثانیة - ۱۳۸۱ھ -

۲- اخبار مکة : للازرقی (محمد بن عبد اللہ بن احمد الازرقی) المتوفی سنة ۲۲۳ھ

ـــــ مطابع دار الثقافة بمکة المکرمة - ۱۳۸۵ھ -

۳- الآداب السلطانیه والدول الاسلامیه : لابن الطقطقی (محمد بن علی) المتوفی سنة ۷۰۹ھ ـــــ مطبعة الموسوعات بالقاھرة - ۱۳۱۷ھ -

۴- الاکتفاء فی مغازی رسول اللہ والثلاثة الخلفاء : للکلاعی (سلیمان بن موسیٰ ابو الربیع الکلاعی) المتوفی سنة ۶۳۴ھ - تحقیق الدکتور مصطفیٰ عبد الواحد ـــــ مطبعة الخانجی بالقاھرة - ۱۳۸۷ھ -

۵- البدأ والتاریخ : للمقدسی (مطھر بن طاھر المقدسی) المتوفی سنة ۳۵۵ھ ـــــ طبعة بیروت.

۶- تاریخ الاسلام وطبقات المشاھیر والاعلام : للذھبی (محمد بن احمد بن عثمان شمس الدین) المتوفی سنة ۷۴۸ھ ـــــ من مطبوعات مکتبة المقدسی بالقاھرة - ۱۳۶۷ھ -

۷- تاریخ الامم والملوك : للطبری (محمد بن جریر ابو جعفر الطبری) المتوفی سنة ۳۱۰ھ

ـــــ من مطبوعات مکتبة خیاط ببیروت -

۸- تاریخ الاندلس فی عھد المرابطین والموحدین : لاشباخ (المؤرخ الألمانی یوسف اشباخ) ترجمة محمد عبد اللہ عنان - مطبعة الخانجی بالقاھرة - الطبعة الثانیة - ۱۹۷۷ء

۹- تاریخ بغداد : للخطیب (احمد بن علی بن ثابت المعروف بالخطیب) المتوفی بسنة ۴۶۳ھ

ـــــ دار الکتاب العربی ببیروت -

۱۰- التاریخ القویم لمکة وبیت اللہ الکریم : للکردی (الشیخ محمد طاھر بن عبد القادر بن محمود الکردی) ـــــ الطبعة الاولی بمکة المکرمة - ۱۳۸۵ھ -

۱۱- التاریخ الکبیر: لابن عساکر (علی بن الحسن بن ھبۃ اللہ) المتوفی سنۃ ۵۷۱ھ ـــــ مطبعۃ روضۃ الشام- ۱۳۲۹ھ۔

۱۲- تلقیح فھوم اھل الاثر فی عیون التاریخ والسیر: لابن الجوزی (عبدالرحمن بن الجوزی) المتوفی سنۃ ۵۹۷ھ ـــــ المطبعۃ النموذجیۃ بالقاھرۃ۔

۱۳- جوامع السیرۃ: لابن حزم (علی بن احمد بن سعید بن حزم) المتوفی سنۃ ۴۵۶ھ ـــــ مطبعۃ دار المعارف بالقاھرۃ۔

۱۴- الحلۃ السیراء: (لابن الابار (محمد بن عبداللہ بن ابی بکر القضاعی) المتوفی سنہ ۶۵۸ھ تحقیق الدکتور حسین مونس ـــــ الشرکۃ العربیۃ للطباعۃ والنشر۔ الطبعۃ الاولیٰ- ۱۹۶۳م۔

۱۵- حیات محمدؐ: لھیکل (الدکتور محمد حسین ھیکل) ـــــ مکتبۃ النھضۃ المصریۃ - الطبعۃ السادسۃ - ۱۹۵۶م۔

۱۶- رسل الملوک: لابن الفراء (الحسین بن محمد المعروف بابن الفراء) من علماء القرن الرابع تحقیق الدکتور صلاح الدین المنجد - طبع القاھرۃ - ۱۳۶۶ھ۔

۱۷- الروض الأنف شرح السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: للسھیلی (عبدالرحمن بن عبداللہ بن احمد الخثعمی) المتوفی سنۃ ۵۸۱ھ ـــــ دار النصر للطباعۃ بالقاھرۃ- الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۸۷ھ۔

۱۸- زاد المعاد فی ھدی خیر العباد: لابن القیم (محمد بن بکر شمس الدین) المتوفی سنۃ ۷۵۱ھ ـــــ مطبعۃ الحلبی بالقاھرۃ - ۱۳۵۹ھ۔

۱۹- سواطع الانوار فی خلاصۃ ما جاء فی ھجرتی الصحابۃ الیٰ ارض الحبشۃ للحفنی (احمد الحفنی القناٸی بن محمد کرام) من علماء القرن الرابع عشر ـــــ طبع بولاق - ۱۳۲۱ھ۔

۲۰- سیر أعلام النبلاء: للذھبی (محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز) المتوفی سنۃ ۷۴۸ھ ـــــ من مطبوعات دار المعارف بالقاھرۃ۔

۲۱- السیرۃ النبویۃ: لابن ھشام (عبدالملک بن ھشام بن ایوب الحمیری) المتوفی سنۃ ۲۱۸ھ ـــــ مطبعۃ الحلبی بالقاھرۃ۔

۲۲- السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ: لابی شھبۃ (الدکتور محمد بن محمد ابوشھبۃ) ـــــ دار الطباعۃ المحمدیۃ بالازھر - ۱۳۹۰ھ۔

۲۳- شرح السیر الکبیر لمحمد بن الحسن: للسرخسی (محمد بن احمد بن ابی سھل السرخسی) المتوفی سنۃ ۴۸۳ھ- تحقیق الدکتور صلاح الدین المنجد ـــــ مطبعۃ شرکۃ الاعلانات الشرقیۃ ۱۹۷۱م۔

۲۴- العبر و ديوان المبتدأ والخبر في ايام العرب والعجم والبربر: لابن خلدون (عبدالرحمٰن بن خلدون المغربی) المتوفی سنة ۸۰۸ھ ـــ الطبعة الثانية ببيروت- ۱۹۶۱م ۔

۲۵- العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین: للفاسی (محمد بن احمد الحسنی ابوالطیب التقی) المتوفی سنة ۸۳۲ھ ـــ مطبعة السنة المحمدية بالقاهرة - ۱۳۷۹ھ ۔

۲۶- عمدة الأخبار فی مدينة المختار: للعباسی (احمد بن عبد الحمید العباسی) الطبعة الخامسة ـــ طبع اسعد درابزونی الحسینی۔

۲۷- عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر: لابن سید الناس (ابوالفتوح محمد بن محمد الیعمری) المتوفی سنة ۷۳۴ھ ـــ دار المعرفة ببیروت۔

۲۸- فتوح مصر واخبارها: لابن عبدالحکم (عبدالرحمٰن بن عبد الله بن عبد الحکم) المتوفی سنة ۲۵۷ھ ـــ مطبعة مجلس المعارف الفرنساوی بالقاهرة - ۱۹۱۴م۔

۲۹- فقه السيرة: للغزالی (الشيخ محمد الغزالی) ـــ طبع دولة قطر۔

۳۰- الكامل فی التاريخ: لابن الاثیر (عزالدین ابوالحسن علی بن الاثیر) المتوفی سنة ۶۳۰ھ ـــ طبع بیروت - ۱۳۸۱ھ۔

۳۱- المحبر: لابن حبیب (محمد بن حبیب ابوجعفر) المتوفی سنة ۲۴۵ھ ـــ مطبعة دائرة المعارف النظامية بحيدرآباد - ۱۳۶۱ھ۔

۳۲- مروج الذهب: للمسعودی (ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی) المتوفی سنة ۳۴۶ھ ـــ دارالاندلس بیروت - ۱۳۸۵ھ۔

۳۳- مغازی رسول الله (صلی الله علیه وسلم) للواقدی (محمد بن عمر ابوعبدالله الواقدی) المتوفی سنة ۲۰۷ھ ـــ مطبعة السعادة بالقاهرة - الطبعة الاولیٰ - ۱۳۶۷ھ۔

۳۴- المغرب فی حلی المغرب: لجماعة من علماء اندلس- تحقیق الدکتور شوقی ضیف ـــ دار المعارف بالقاهرة ۔

۳۵- مقدمه ابن خلدون: لابن خلدون (عبدالرحمٰن بن خلدون المغربی) المتوفی سنة ۸۰۸ھ ـــ الطبعة الرابعة ببیروت۔

۳۶- المنتظم فی تاریخ الملوك والامم: لابن الجوزی (عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی) المتوفی سنة ۵۹۷ھ ـــ مطبعة دائرة المعارف النظامیة - الطبعة الاولیٰ بحیدرآباد- ۱۳۵۷ھ۔

۳۷- النجوم الزاهرة فی ملوك مصر والقاهرة: لابن تغری بردی (جمال الدین

ابوالمحاسن یوسف) المتوفی سنة ۸۷۴ھ ــــ مطبعة دارالکتاب بالقاهرة - ۱۹۳۰م -

۳۸- نظام الحکومة النبویة المسمی بالتراتیب الاداریة : للکتانی (الشیخ عبدالحی بن عبدالکبیر بن محمد الحسنی) ــــــــــــ طبعة بیروت -

۳۹- نفح الطیب من غصن الاندلس فی رطیب : للمقری (احمد بن محمد المقری التلمسانی) المتوفی سنة ۱۰۴۱ھ تحقیق محمد محیی الدین عبدالحمید ــــ مطبعة السعادة بالقاهرة - ۱۳۶۹ھ -

۴۰- نوراليقین فی سیرة سیدالمرسلین : للخضری (الشیخ محمد الخضری بیک) المتوفی ۱۳۴۵ھ ــــ المکتبة التجاریة الکبری بالقاهرة - الطبعة الثامنة - ۱۳۶۷ھ -

۴۱- وفاءالوفاء فی اخبار دارالمصطفی (صلی الله علیه وسلم) للسمهودی (الشریف نورالدین علی بن السید الشریف) المتوفی سنة ۹۱۱ھ ــــ مطبعة الآداب بالقاهرة - ۱۳۲۶ھ -

۷- التراجم والطبقات والمعارف العامة

۱- اخبارالقضاة : لابن حیان (وکیع بن محمد بن خلف بن حیان) المتوفی سنة ۳۰۶ھ ــــ مطبعة الاستقامة بالقاهرة - الطبعة الاولی - ۱۳۶۱ھ -

۲- الاشتقاق : لابن درید (ابوبکر محمد بن الحسن بن درید) المتوفی سنة ۳۲۱ھ ــــ مطبعة السنة المحمدیة بالقاهرة - ۱۳۷۸ھ -

۳- الأعلام، قاموس تراجم لأشهر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین : للزرکلی (خیرالدین الزرکلی) المتوفی سنة ۱۳۹۶ھ ــ الطبعة الثانیة -

۴- انباه الرواة علی أنباء النحاة) : للقفطی (جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف) المتوفی سنة ۶۲۴ھ ــــ مطبعة دارالکتب المصریة بالقاهرة - ۱۹۵۰م -

۵- الانساب : للسمعانی (ابوسعد عبدالکریم بن محمد بن منصور) المتوفی سنة ۵۶۲ھ ــــ النسخة المصورة -

۶- ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون : للبغدادی (اسماعیل باشا بن محمد امین) المتوفی سنة ۱۳۳۹ھ ــــ الطبعة الثالثة بطهران - ۱۳۷۸ھ -

۷- بغیة الملتمس فی تاریخ رجال اهل الاندلس : للضبی (احمد بن یحیی بن احمد بن عمیرة) المتوفی سنة ۵۹۹ھ ــــ مطبعة دارالکاتب العربی بالقاهرة - ۱۹۶۷م -

۸- تاریخ الادب العربی : لکارل بروکلمان - ترجمة الدکتور عبدالحلیم النجار ــــ من مطبوعات دارالمعارف بالقاهرة -

۹۔ تاریخ التراث العربی: (لفؤاد سزکین) ــــ الهیئۃ المصریۃ العامۃ للتألیف و المترجمۃ بالقاهرۃ ۔ ۱۹۷۱م

۱۰۔ تاریخ علماء الاندلس: لابن الفرضی (عبداللہ بن محمد بن یوسف الازدی) المتوفی سنۃ ۴۰۳ھ ــــ مطبعۃ الدار المصریۃ للتألیف والترجمۃ بالقاهرۃ ۔ ۱۹۶۶م ۔

۱۱۔ تاریخ العلماء والرواۃ للعلم بالاندلس: لابن الفرضی (عبداللہ بن محمد بن یوسف الازدی) المتوفی سنۃ ۴۰۳ھ ــــ مطبعۃ الخانجی بالقاهرۃ ۔ ۱۳۷۳ھ ۔

۱۲۔ تاریخ قضاۃ الاندلس: للنباهی (ابوالحسن بن عبداللہ بن الحسن النباهی) المتوفی سنۃ ۷۹۲ھ ــــ دار الکتاب العربی بالقاهرۃ ۔ ۱۹۴۸م

۱۳۔ ترتیب المدارک وتقریب المسالک: للقاضی عیاض بن موسیٰ بن عیاض ۔ المتوفی سنۃ ۵۴۴ھ ــــ دار مکتبۃ الحیاۃ ببیروت و دار مکتبۃ الفکر بطرابلس ۔ ۱۳۸۷ھ ۔

۱۴۔ تهذیب الاسماء واللغات: للنووی (ابوزکریا محیی الدین بن شرف النووی) المتوفی سنۃ ۶۷۶ھ ــــ المطبعۃ المنیریہ بالقاهرۃ ۔

۱۵۔ جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس: للحمیدی (محمد بن ابی نصر فتوح بن عبداللہ) المتوفی سنۃ ۴۸۸ھ ــــ مطبعۃ الدار المصریۃ للتألیف والترجمۃ بالقاهرۃ ۔ ۱۹۶۶م

۱۶۔ الجواهر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ: لأبی الوفاء (عبدالقادر بن ابی الوفاء القرشی) المتوفی سنۃ ۷۷۵ھ ۔

۱۷۔ حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء: لابی نعیم (احمد بن عبداللہ الاصفهانی) المتوفی سنۃ ۴۳۰ھ ــــ مطبعۃ السعادۃ بالقاهرۃ ۔ ۱۳۵۱ھ ۔

۱۸۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ: لجماعۃ من المستشرقین (الترجمۃ العربیۃ) ــــ الطبعۃ الثانیۃ بالقاهرۃ ۔ ۱۳۵۳ھ۔

۱۹۔ الدیباج المذهب فی معرفۃ اعیان علماء المذهب: لابن فرحون (محمد بن فرحون الیعمری المدنی) المتوفی سنۃ ۷۹۹ھ ــــ مطبعۃ المعاهد ۔ الطبعۃ الاولی بالقاهرۃ ۔ ۱۳۵۱ھ ۔

۲۰۔ الرسالۃ المستطرفۃ لبیان مشهور کتب السنۃ المشرفۃ: للکتانی (السید شریف محمد بن جعفر الکتانی) المتوفی سنۃ ۱۳۴۵ھ ــــ مطبعۃ دار الفکر بدمشق ۔ الطبعۃ الثالثۃ ۔ ۱۳۸۳ھ ۔

۲۱۔ ریاض النفوس فی طبقات علماء القیروان والافریقیا: لابی بکر (عبداللہ بن ابی عبداللہ المالکی) المتوفی سنۃ ۳۳۳ھ ــــ مکتبۃ النهضۃ المصریۃ ۔ الطبعۃ الاولی ۔ ۱۹۵۱م

۲۲۔ شذرات الذهب فی اخبار من ذهب: لابن العماد (ابوالفلاح عبدالحی بن العماد)

المتوفی سنۃ ۱۰۸۹ھ ــــ مطبعۃ المقدسی بالقاہرۃ - ۱۳۵۰ـ

۲۳- صفۃ الصفوۃ: لابن الجوزی (عبد الرحمٰن بن علی بن محمد) المتوفی سنۃ ۵۹۷ھ ــــ مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیہ بحیدرآباد - ۱۳۵۵ھ۔

۲۴- الصلۃ: لابن بشکوال (ابوالقاسم خلف بن عبد الملک) المتوفی سنۃ ۵۷۸ھ ــــ مطبعۃ الدار المصریۃ للتألیف والترجمۃ بالقاہرۃ - ۱۹۶۶ھ۔

۲۵- طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: للسبکی (تاج الدین ابونصر عبد الوہاب بن علی) المتوفی سنۃ ۷۷۱ھ ــــ مطبعۃ الحلبی بالقاہرۃ - الطبعۃ الاولیٰ - ۱۳۸۳ھ۔

۲۶- طبقات علماء افریقیۃ و تونس: لابی العرب (محمد بن احمد بن تمیم القیروانی) المتوفی سنۃ ۳۳۳ھ ــــ الدار التونسیۃ - ۱۹۶۸م۔

۲۷- طبقات فحول الشعراء: لابن سلام (ابوعبداللہ محمد بن سلام بن عبیداللہ - المتوفی سنۃ ۲۳۲ھ ــــ طبعۃ بیروت - ۱۹۷۰م۔

۲۸- طبقات الفقہاء: للشیرازی (ابواسحاق الشیرازی الشافعی) المتوفی سنۃ ۴۷۶ھ ــــ طبعۃ بیروت - ۱۹۷۰م۔

۲۹- الطبقات الکبریٰ: لابن سعد (محمد بن عبد اللہ بن سعد البصری) المتوفی سنۃ ۲۳۰ھ ــــ طبعۃ بیروت - ۱۳۷۶ھ

۳۰- الطبقات الکبریٰ: للشعرانی (عبد الوہاب الشعرانی) متوفی سنۃ ۹۷۳ھ ــــ مطبعۃ الحلبی بالقاہرۃ - ۱۳۵۹ھ۔

۳۱- طبقات النحویین واللغویین: للزبیدی (ابوبکر محمد بن الحسن الزبیدی) المتوفی سنۃ ۳۷۹ھ ــــ مطبعۃ الخانجی بالقاہرۃ - ۱۳۷۳ھ۔

۳۲- العبر فی خبر من غبر: للذہبی (محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز) المتوفی سنۃ ۷۴۸ھ، تحقیق الدکتور صلاح الدین المنجد ــــ طبع الکویت - ۱۹۶۰م۔

۳۳- غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء: لابن الجزری (شمس الدین ابوالخیر محمد بن محمد) المتوفی سنۃ ۸۳۳ھ ــــ مطبعۃ السعادۃ بالقاہرۃ - ۱۳۵۱ھ

۳۴- فتوح البلدان: للبلاذری (احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد) المتوفی سنۃ ۲۷۹ھ ــــ مطبعۃ السعادۃ بالقاہرۃ - ۱۹۵۹م۔

۳۵- فہرست: لابن خیر (ابوبکر محمد بن خیر بن عمر بن خلیفۃ الاموی) المتوفی سنۃ ۵۷۵ھ ــــ الطبعۃ الثانیۃ - القاہرۃ - ۱۳۸۲ھ۔

۳۶- الفهرست: لابن ندیم (ابوالفرج احمد بن اسحاق الندیم) المتوفی سنة ۳۷۸ھ
ــــ طبع بیروت۔

۳۷- فهرس المخطوطات المصورة: ــــ جامعة الدول العربیة۔

۳۸- فہرس دار الکتب المصریة: ــــ مطبعة دار الکتب بالقاھرة - ۱۳۴۲ھ

۳۹- اللباب فی تهذیب الانساب: لابن الاثیر (عزالدین ابوالحسن علی بن محمد بن محمد) المتوفی سنة ۶۳۰ھ ــــ مکتبة القدسی بالقاهرة - ۱۳۵۷ھ۔

۴۰- مرآة الجنان وعبرة الیقظان: للیافعی (عبد الله بن اسعد بن علی بن سلیمان) المتوفی سنة ۷۶۸ھ ــــ مطبعة مؤسسة الاعلی ببیروت - الطبعة الثانیة - ۱۳۹۰ھ۔

۴۱- المعارف: لابن قتیبة (عبد الله بن مسلم بن قتیبة) المتوفی سنة ۲۷۶ھ تحقیق الدکتور ثروت عکاشة - الطبعة الثانیة - دار المعارف بالقاهرة۔

۴۲- معجم الادباء المعروف بارشاد الاریب الی معرفة الادیب: للبغدادی (شهاب الدین یاقوت بن عبد الله الرومی) المتوفی سنة ۶۲۶ھ ــــ المطبعة الهندیة بالقاهرة - الطبعة الاولی - ۱۹۲۵م۔

۴۳- معجم البلدان: لیاقوت (یاقوت بن عبد الله الحموی الرومی) المتوفی سنة ۶۲۶ھ
ــــ دار صادر و دار بیروت - ۱۳۷۴ھ۔

۴۴- المعجم فی اصحاب القاضی ابی علی الصوفی: لابن الابار (محمد بن عبد الله بن ابی بکر القضاعی) المتوفی سنة ۶۵۸ھ ــــ مطابع سجل العرب بالقاهرة - ۱۳۸۷ھ۔

۴۵- معجم قبائل العرب القدیمة والحدیثة: لکحالة (عمر رضا کحالة) ــــ طبعة دار العلم للملایین ببیروت ۱۳۸۸ھ۔

۴۶- معجم ما استعجم من اسماء البلاد والمواضع: للبکری (عبد الله بن عبد العزیز البکری الاندلسی) المتوفی سنة ۴۸۷ھ ــــ مطبعه لجنة التألیف والترجمة بالقاهرة - ۱۳۶۸ھ۔

۴۷- معجم المطبوعات العربیة والمعربة: لسرکیس (یوسف الیاس سرکیس) ــــ مطبعة سرکیس بالقاهرة - ۱۳۴۶ھ۔

۴۸- مفتاح السعادة ومصباح السیادة: لطاش کبری زاده (عصام الدین ابوالخیر احمد بن مصطفی) المتوفی سنة ۹۶۸ھ ــــ مطبعه دار الکتب الحدیثة بالقاهرة۔

۴۹- موسوعات اصطلاحات العلوم الاسلامیه: للتهانوی (المولوی محمد بن علی بن علی التهانوی) من علماء القرن الثانی عشر ــــ طبعة دار صادر بیروت - ۱۹۶۶م۔

۵۰- **نكت الهميان**: للصفدى (صلاح الدين خليل بن ايبك) المتوفى سنة ۷۶۴ھ ـــــ المطبعة الجمالية بالقاهرة - ۱۳۲۹ھ -

۵۱- **الوافى بالوفيات**: للصفدى (صلاح الدين خليل بن ايبك) المتوفى سنة ۷۶۴ھ ـــــ دارالنشر فرانز شتاينر بفيسبادن - ۱۳۸۱ھ -

۵۲- **وفيات الاعيان وانباء ابناء الزمان**: لابن خلكان (ابوالعباس شمس الدين احمد بن محمد) المتوفى سنة ۶۸۱ھ ـــــ مطبعة السعادة بالقاهرة - ۱۳۶۷ھ -

۵۳- **يتيمة الدهر فى محاسن اهل العصر**: للثعالبى (ابومنصور عبدالملك بن محمد بن اسماعيل) المتوفى سنة ۴۲۹ھ ـــــ مطبعة السعادة بالقاهرة - ۱۳۷۵ھ -

۸- الادب واللغة

۱- **الاغانى**: للاصفهانى (ابى الفرج على بن الحسين القرشى الاصفهانى) المتوفى سنة ۳۵۶ھ ـــــ دارالثقافة ببيروت - ۱۳۸۱ھ -

۲- **جمهرة اللغة**: لابن دريد (محمد بن الحسن بن دريد الازدى) المتوفى سنة ۳۲۱ھ ـــــ مطبعة دائرة المعارف العثمانية بحيدرآباد - ۱۳۴۵ھ -

۳- **خزانة الادب ولب لباب لسان العرب**: للبغدادى (عبد القادر بن عمر البغدادى) المتوفى سنة ۱۰۹۳ھ ـــــ المطبعة المنيرية - ببولاق الطبعة الاولى -

۴- **صبح الاعشى**: للقلقشندى (ابوالعباس احمد القلقشندى) المتوفى سنة ۸۲۱ھ ـــــ المطبعة الاميرية بالقاهرة - ۱۳۳۱ھ -

۵- **الصحاح**: للجوهرى (اسماعيل بن حماد الجوهرى) المتوفى سنة ۳۹۳ھ -

۶- **عيون الاخبار**: لابن قتيبة (عبدالله بن مسلم بن قتيبة) المتوفى سنة ۲۷۶ھ ـــــ الهيئة المصرية العامة للكتاب بالقاهرة - ۱۹۷۳م -

۷- **غريب الحديث**: لابى عبيد (ابوعبيد القاسم بن سلام الهروى) المتوفى سنة ۲۲۴ھ ـــــ مطبعة دائرة المعارف النظامية بحيدرآباد - الطبعة الاولى - ۱۳۸۴ھ -

۸- **الغريبين، غريبى القرآن والحديث**: لابى عبيد (احمد بن محمد بن محمد) المتوفى سنة ۴۰۱ھ ـــــ المجلس الاعلى للشئون الاسلامية بالقاهرة - ۱۳۹۰ھ -

۹- **الفائق فى غريب الحديث**: للزمخشرى (محمود بن عمر الزمخشرى) المتوفى سنة ۵۳۸ھ ـــــ مطبعة داراحياء الكتب العربية بالقاهرة - ۱۳۶۴ھ -

۱۰- القاموس المحیط: للفیروز آبادی (مجد الدین محمد بن یعقوب) المتوفی سنہ ۸۱۷ھ۔

۱۱- الکامل فی اللغۃ والادب: للمبرد (ابو العباس محمد بن یزید) المتوفی سنۃ ۲۸۵ھ۔
—— مطبعۃ المعارف ببیروت۔

۱۲- الکتاب: لسیبویہ (عمر بن عثمان ابو بشر المعروف بسیبویہ) المتوفی سنۃ ۱۸۰ھ۔
—— المطبعۃ الامیریۃ ببولاق۔ الطبعۃ الاولی ۱۳۱۶ھ۔

۱۳- لسان العرب: لابن منظور (ابو الفضل جمال الدین الافریقی) المتوفی سنۃ ۷۱۱ھ
—— طبع بیروت ۱۳۷۴ھ۔

۱۴- معاهد التنصیص علی شواہد التلخیص: للعباسی (عبد الرحمٰن بن احمد العباسی)
المتوفی سنۃ ۹۶۳ھ —— مطبعۃ السعادۃ بالقاہرۃ ۱۳۶۷ھ۔

۱۵- نزہۃ الجلیس ومنیۃ الادیب الانیس: للموسوی (العباس بن علی بن نور الدین
المکی الموسوی) المتوفی سنۃ ۱۱۴۸ھ —— المطبعۃ القدیمۃ۔

۱۶- النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر: لابن الاثیر (مبارک بن محمد الجزری)
المتوفی سنۃ ۶۰۶ھ —— مطبعۃ الحلبی بالقاہرۃ ۱۳۸۳ھ۔

ادارۂ معارف اسلامی